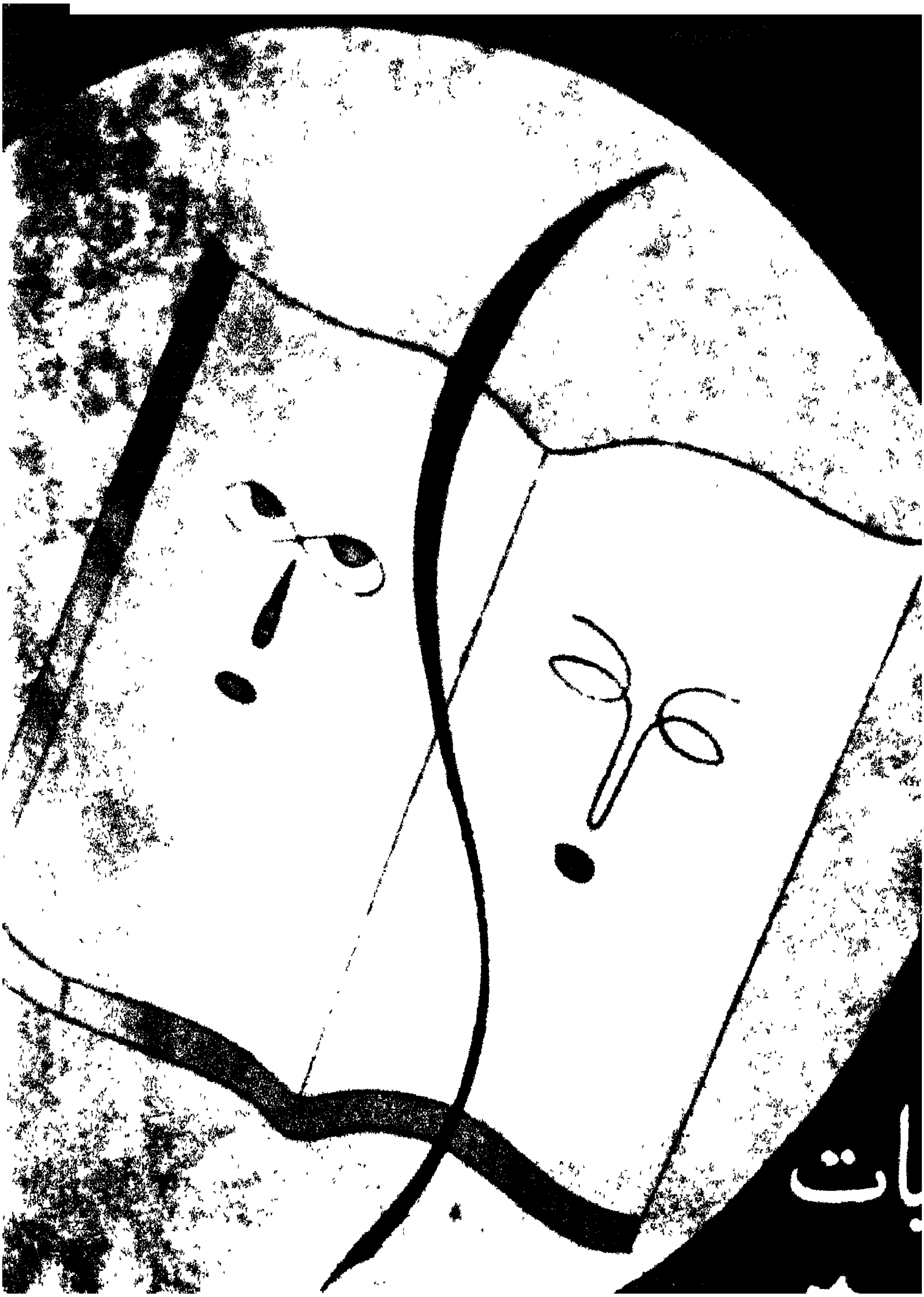
بات

ہماری مطبوعات

(۱) عشاق کے سمند	عمر ابوالنصر	۶/-
(۲) اندازے	فراق گورکھپوری	۴/-
(۳) اردو غزل گوئی	فراق گورکھپوری	۲/۴/-
(۴) امراؤجان ادا	مرزا رسوا	۲/۸/-
(۵) قول و قرار	عدم	۲/۸/-
(۶) نقش و ...	عدم	۳/-
(۷) اصحاب کہف	نیاز فتحپوری	۱/۱۲/-
(۸) انتقادیات نیاز	نیاز فتحپوری	۲/۸/-
(۹) بازار حیات	احمد ندیم قاسمی	۳/-
(۱۰) صاحب	محمد طفیل	۳/-
(۱۱) منٹو	ابوسعید قریشی	۳/-
(۱۲) سرکنڈوں کے پیچھے	منٹو	۳/-
(۱۳) عزیزہ کے نام	ڈاکٹر [illegible]	۲/۸/-
(۱۴) حال غم	سرور لکھنوی	۲/۸/-
(۱۵) آنچل	احمد ندیم قاسمی	۳/-
(۱۶) پانچ ناولٹ	مرتبہ وقار عظیم	۳/-
(۱۷) پتھر اکسی	رشید احمد تھانوی	۳/-

تصانیف شوکت تھانوی

(۱۸) مولانا	۳/-	(۲۵) [illegible]	۲/۴/-
(۱۹) سسرال	۲/۴/-	(۲۶) خدا نخواستہ	۳/-
(۲۰) مضامین شوکت	۲/۸/-	(۲۷) [illegible]	۳/۸/-
(۲۱) غراہ	۶/-	(۲۸) وغیرہ وغیرہ	۲/۸/-
(۲۲) قاضی جی (مکمل)	۱۰/۸	(۲۹) مابدولت	۳/-
(۲۳) غالب کے ڈرامے	۲/۸/-	(۳۰) السلام	۳/-
(۲۴) جوڑ توڑ	۳/-	(۳۱) بیوی	۳/-

ہماری تازہ مطبوعات

(۱) ہماری داستانیں وقار عظیم ۳/-

(۲) انتقاد عابد علی عابد ۳/-

(۳) مضامین جمال الدین افغانی ۵/-
جمال الدین افغانی

(۴) سیاست الٰہیہ ۲/۸/-
امام ابن تیمیہ

(۵) نقوش لطیف ۹/-
مرتبہ احمد ندیم قاسمی

زیر طبع

(۱) بار خاطر شوکت تھانوی ۴/-

(۲) نبیٔ امی عمر ابوالنصر ۴/-

(۳) لین بدر عمر ابوالنصر ۳/-

(۴) رم آہو قتیل شفائی ۲/۸/-

ادارہ فروغ اردو لاہور

(ایبک روڈ انارکلی)

ورلڈ لائٹ پریس، لاہور

[illegible]

نقوش

59 to 60

شخصیات نمبر ۲

۵۹ ، ۶۰

اکتوبر سنہ ۱۹۵۶ء

مرتب

محمد طفیل

قیمت مجلد [illegible] روپے

سادہ قیمت ۲۰ روپے

ادارہ فروغ اردو — لاہور

[illegible]

مکاتیب نمبر

نقوش نے کئی اہم موضوعات پر نمبر چھاپے ہیں۔ جو اپنی اپنی حیثیت میں منفرد باقی رہیں گے۔ جن میں غزل نمبر، شخصیات نمبر، افسانہ نمبر خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

ادھر ایک سال سے ہم مکاتیب نمبر مرتب کر رہے ہیں۔ ہزاروں اہم اور تاریخی خطوط (غیر مطبوعہ) جمع کئے جا چکے ہیں۔ جن میں سرسید، حالی، اکبر، اقبال، مولانا محمد علی، ڈپٹی نذیر احمد، حکیم اجمل خاں، محسن الملک، وقار الملک، شبلی، سلیمان ندوی اور ابوالکلام آزاد ایسے تمام زندہ اور مرحوم مشاہیر کے سینکڑوں ادبی اور سیاسی خطوط ضروری حواشی کے ساتھ مرتب کئے جا چکے ہیں۔

ہمارا ارادہ ہے کہ خطوط کی شکل میں جتنا سرمایہ ادھر اُدھر بکھرا پڑا ہے وہ سب کا سب ایک جگہ جمع ہو جائے۔ تاکہ تمام علمی و ادبی اور سیاسی دستاویزیں یکجا ہو کر آئندہ نسلوں کے بھی کام آئیں۔

اگر یہ سرمایہ اکٹھا نہ کیا گیا تو اس بات کا ڈر ہے کہ آئندہ تلف ہی نہ ہو جائے۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں ہمارا کتنا ہی قیمتی اور نایاب سرمایہ ضائع ہو چکا ہے۔ ویسے بھی علم و ادب کے انفرادی سرمائے سے اجتماعی سرمایہ اردو ادب کے تمام طالب علموں کے لئے مفید بھی ہوگا اور اس طرح محفوظ بھی ہو جائے گا۔

مجھے خدا کے فضل اور آپ کے تعاون سے پوری امید ہے کہ ہم پانچ ہزار سے کچھ زیادہ ہی نادر خطوط جمع کر لیں گے۔

میرے تمام احباب نے اس اہم خدمت کے سلسلے میں مجھ سے بھرپور تعاون فرمایا ہے۔ احباب کے تعاون ہی سے ہم نے ہزاروں نادر خطوط جمع کر لئے ہیں۔ جس پر ادارۂ نقوش کو ہمیشہ فخر رہے گا۔ مستدعی ہوں کہ آپ کے پاس بھی جتنے زندہ اور مرحوم مشاہیر کے خطوط ہوں، وہ سب (بذریعہ رجسٹری) مرحمت فرما دیں۔ میں اس نمبر کی تکمیل کے بعد وہ تمام خطوط بصد شکریہ واپس کر دوں گا۔ اگر اصل خطوط دینے میں تامل ہو تو ان کی نقل ہی عنایت فرما دیں۔

تمام اہم خطوط کو فوٹو آفسٹ سے شائع کیا جا رہا ہے۔

محمد طفیل

ترتیب

(۱)

* شخصیات نمبر حصہ اول صفحہ ۷۰۰ پر ختم ہوا تھا۔ اس حصہ دوم کو صفحہ نمبر ۷۰۱ سے شروع کیا گیا ہے

انتظاریہ

طلوع

۱۹۵۵ء میں شخصیات نمبر کی پہلی جلد پیش کی گئی تھی اور اب ۱۹۵۶ء میں دوسری جلد۔ اس وقفہ میں جتنے بھی دن رات گذرے، ان میں اس نمبر کی ترتیب و تدوین سے غافل نہیں رہا۔

جس طرح پہلی جلد کے بعد دوسری جلد کا اعلان کر کے میں نے آج سرخروئی حاصل کی ہے اسی طرح اب تیسری جلد کا بھی عزم ہے تاکہ میری جد و جہد کے باوجود جو نمایاں شخصیتیں رہ گئی ہیں۔ وہ سب آجائیں۔

اس ضخیم نمبر میں ایک دو معمولی مضمون بھی شامل ہیں۔ لکھنے والوں سے زیادہ اصرار نہ چلا ادھر پرچہ جلد مکمل نہ ہو سکا۔ دونوں کی مجبوریوں سے آپ درگذر فرمائیں۔

اس پرچے میں چند ایک مضمون اصل موضوع سے ہٹ گئے ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں جو کسی طرح مکمل نہیں کئے جا سکتے۔ مگر میں نے ان کی شمولیت بعض وجوہ سے ضروری سمجھی ——— ترتیب وہی ہے جو پہلے حصے کی تھی۔

نقوش کا آئندہ شمارہ عام نمبر ہوگا ——— اس کے بعد مکاتیب نمبر!

طفیل

داغ دہلوی

امیر مینائی

نواب وقار الملک

نواب محسن الملک

اکبر الہ آبادی

شاد عظیم آبادی

احسن مارہروی

چکبست

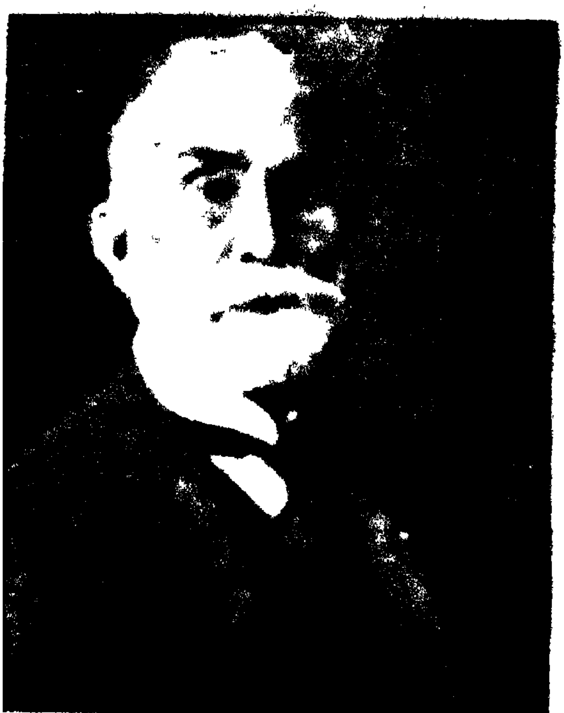

عماد الملک حسین بلگرامی

سید امداد امام اثر

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ

سید علی بلگرامی

سائل دہلوی

سلطان حیدر جوش

دل شاہجہان پوری

صفی لکھنوی

مولانا محمد علی جوہر

امتیاز علی تاج

مالک رام

عرشی رامپوری

سیماب اکبرآبادی

مسعود حسن رضوی

جوش ملسیانی

تلوک چند محروم

صوفی تبسم

علی عباس حسینی

اختر شیرانی

اختر انصاری

حفیظ ہوشیارپوری

شاد عارفی

معین احسن جذبی

عبد الحمید عدم

(۱)

رفتید، ولے نہ از دلِ ما

(فیضی)

داغ دہلوی

جوش ملسیانی

تقریباً سات آٹھ سال پہلے جس زوردار شاعر کی گرمیِ کلام کا چرچا دلّی میں ہو کر بہت سے [illegible] کے بعض [illegible] اشعار کی [illegible] شعرا اور [illegible] اور خود بادشاہ ظفر نے وجدانی کیفیت میں آکر داد دی وہ داغ دہلوی تھے۔ جو آگے چل کر [illegible] ہندوستان کا [illegible] فصیح الملک استاد حضور بندگانِ عالی آصف جاہ نظام دکن کے خطاب سے ملقب ہوئے۔ اور جنہوں نے اپنی گراں مایہ شاعری [illegible] حقیقی [illegible] ہونے کی وجہ سے اتنی شہرت پائی کہ اردو نظم کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

یہ نواب شمس الدین والی ریاست فیروزپور جھرکہ کے فرزند تھے۔ ۱۸۳۱ء میں پیدا ہوئے۔ صغر سنی میں یتیم ہو گئے۔ والدہ کی [illegible] کر قلعہ معلّی میں پناہ گیر ہوئیں۔ ان دنوں کی پریشانیاں اور مصائب ایسے تھے کہ آپ کی تعلیم [illegible] باقی [illegible] نہ تھا۔ لیکن آپ کی والدہ ماجدہ نے آپ کی تعلیم میں [illegible] کوشش فرمائی۔ یہاں [illegible] شہزادوں کی صحبت میں رہے اور بیگمات کی گود میں پرورش پا کر جوان کو پہنچے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زبان نہایت معتبر، نہایت مستند اور ٹکسالی تسلیم کی گئی۔ انہیں خود بھی اس امتیازی خصوصیت پر ناز تھا۔ دیکھئے یہ شعر انہوں نے کس زور سے کہا ہے ؎

غیروں کا اختراع و تصرف غلط ہے داغ اردو ہی وہ نہیں جو ہماری زبان نہیں

اسی زمانے میں ان کا کہا ہوا یہ شعر ؎

[illegible] کے شمع [illegible] جلتے ہیں ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے

مولانا غالب کو کسی نے سنایا تو وجد میں آگئے۔ [illegible] کی بازی چھوڑ کر دیر تک کیفیت کے عالم میں رہے اور پوچھا کہ یہ شعر کس نے کہا۔ بہ حیثیت شاعر جب انہیں بادشاہ ظفر کے سامنے پیش کیا گیا تو ان کی عمر بیس سال کے قریب تھی۔ قلعہ معلّی کے مشاعروں میں خاص شعرا ہی شامل ہوتے تھے۔ عام لوگوں کو یہاں آنے کی اجازت نہ تھی۔ صرف [illegible] تھا۔

کوئی دشمن نہیں ہے اپنا دشمن آپ ہم نکلے

اسی زمین میں مرزا غالب کی غزل بھی ہے۔ استاد پڑھ چکے تو داغ کو حضور میں پیش کیا گیا۔ تعارف ہو چکا۔ تو انہوں نے بھی طرحی غزل سنانی شروع کی۔ اسی غزل کا ایک شعر یہ ہے ؎

ہوئے مغرور وہ جب آہ میری بے اثر دیکھی
کسی کا اس طرح یارب نہ دنیا میں بھرم نکلے

یہ شعر سن کر تمام اہلِ دربار جھوم اٹھے۔ شاہ ظفر نے بھی داد دی اور فرمایا۔ کیا اچھی طبیعت پائی ہے۔

انہیں دنوں میں ان کا یہ شعر بھی تمام اربابِ ذوق کی زبان پر تھا ؎

لگ گئی چپ تجھے اے داغِ حزیں کیوں ایسی
مجھ کو کچھ حال تو کم بخت سنا تو اپنا

اسی طرح یہ مطلع بھی جس میں دلِ بے تاب کی چار تشبیہیں ایک جگہ جمع کر دی ہیں بہت مقبول ہوا ؎

شرر و برق نہیں شعلہ و سیماب نہیں
کس لئے پھر یہ ٹھہرتا دلِ بے تاب نہیں

اگرچہ وہ بہت زندہ دل، بہت شگفتہ طبع، بہت بذلہ سنج اور شوخ طبیعت کے آدمی تھے مگر ان کے ایوانِ شخصیت کے سب سے بڑے ستون ان کی زندگی بخش شاعری، ان کی ڈھلی ہوئی اور بے تکلف ٹکسالی زبان اور اس ٹکسالی زبان میں ان کا تغزل یا معاملہ بندی یہ تین چیزیں ہی ہیں جو ان کی عظمت و شہرت کے لئے پرِ پرواز ثابت ہوئیں۔ انہی کی بدولت وہ صاحبِ طرز کہلائے اور انہی کے ذریعہ اتنی قدر و عزت پائی۔ ان کی اس قدر و عزت کے اسباب میں اور باتیں بھی شامل ہیں مثلاً قلعۂ معلیٰ میں رہنے کی وجہ سے درباری آداب سے واقف ہونا۔ ان کے اخلاقِ حمیدہ جو انہوں نے دلی کی پرانی تہذیب اور شرفا سے سیکھے۔ ان کا وسیع المشرب ہونا۔ مگر یہ دوسرے درجے کی باتیں ہیں۔ بنیادی باتیں وہی ہیں جن کا ابھی ذکر ہوا۔

دلی ان کو عمر بھر نہیں بھولی۔ اس کی یاد میں ہمیشہ بے چین رہے۔ غدر کے مصائب اور دلی کی تباہی سے بیزار ہو کر بادلِ ناخواستہ اسے چھوڑنا پڑا۔ اس عالم میں جو غزل کہی اس کا ایک ایک شعر ان کے مجروح احساسات کا ترجمان ہے۔ یہ مطلع اسی غزل کا ہے ؎

تھا مرا نام و نشاں نام و نشانِ دہلی
یوں مٹا جیسے کہ دہلی سے گمانِ دہلی

اس مطلع کا پہلا مصرع دلی کی تباہی کا مکمل بیان اور اسی ضمن میں اپنی بربادی کی مکمل شرح ہے۔ اسی پر آشوب زمانے میں ان کا بہت سا ابتدائی کلام بھی تلف ہو گیا۔ دلی سے نکلے تو آنولہ ضلع بریلی میں وہاں کے ایک رئیس کے ہاں دو سال قیام پذیر رہے۔ انہوں نے حضرت داغ کی اتنی خاطر و مدارات کی کہ ان کے آلام و افکار بہت حد تک دور ہو گئے۔ آخر انہی کی وساطت سے رام پور پہنچے اور نواب یوسف علی خاں کی ادب نوازی و شرفا پروری سے مستفیض ہو کر فکرِ معاش سے فارغ ہو گئے۔

رام پور ان دنوں دلی اور لکھنؤ کا خلاصہ بنا ہوا تھا۔ دن رات شعر و شاعری کی محفلیں گرم رہتی تھیں۔ اسیر، امیر مینائی، جلال لکھنوی، خواجہ قلق، تسلیم لکھنوی، منیر شکوہ آبادی یہ سب مشاہیر رام پور میں جمع تھے۔ داغ نے یہاں آکر اس شگفتہ گلزار کو اور بھی پر بہار بنا دیا اور وہ یہاں خوب پنپے۔ نواب کلب علی خاں کے عہد میں جب رام پور کی ادبی شان بڑھتی ہی چلی گئی اور اس کے ساتھ ساتھ حضرت داغ کی شاعرانہ توقیر و منزلت بھی چار چند ہوتی گئی۔

غزل تو ان کا خاص میدان تھا ہی۔ باقی اصنافِ سخن پر حیرت انگیز قدرت حاصل تھی۔ قصائد میں بھی زبان کا وہی رنگ ہے جو ان کی غزل

[illegible]

[illegible]

جب [illegible] شاعری کا یہ کمال نہیں [illegible] داغ [illegible] چاہتا ہے [illegible] کہ اگر وہ غزل کو چھوڑ کر نظم کی طرف متوجہ ہوتے تو اس میدان میں بھی [illegible] جاتے۔

مرزا غالب نے آموں پر ایک نظم لکھی ہے۔ داغ نے بھی لکھی ہے۔ اس میں [illegible] وہی حسن بیان [illegible] ہے۔ ان کے دوست میر ناظر حسین [illegible] جب ایک مدت کے بعد [illegible] سے ملے تو [illegible] کہ آپ کے جیسا شاعر [illegible] کر کے دو شاعری کا [illegible] نظم گوئی کی طرف پھیر دیا۔ اس کے جواب میں حضرت داغ نے جو کچھ فرمایا وہ [illegible] قابل ہے۔

کہنے لگے۔ تم کو پتہ ہے میں کیا کر رہا ہوں۔ جو کام [illegible] مطالب [illegible] نہیں [illegible]۔ انہوں نے پوچھا۔ وہ کام کیا ہے۔ فرمانے لگے کہ [illegible] اسی طرح [illegible] اردو [illegible] زبان [illegible] ہے۔ [illegible] کوشش یہ ہے کہ دلی کی [illegible] زبان تمام ہندوستان میں پھیل جائے۔ اور ہر شہر میں ایسی ہی اردو زبان بولی جائے۔ جیسی دلی میں بولی جاتی ہے۔ مجھے اس کوشش میں بہت کامیابی ہوئی ہے۔ مگر ابھی اس امر کی تکمیل نہیں ہوئی۔ [illegible] کہ [illegible] ہندوستان کے ہر [illegible] سے جو غزلیں اصلاح کے لئے آتی ہیں ان میں [illegible] اصلاح [illegible] کر دی جائیں۔ اگر تمام ہندوستان کی زبان دلی کے مطابق ہو جائے تو یہ بھی بہت بڑا کام ہے۔ شوکت صاحب کو اپنے خیالات کے پکے تھے۔ لیکن داغ صاحب کی یہ بات انہیں بہت پسند آئی اور مان لیا کہ وہ بہت بڑا کام کر رہے ہیں۔

اصلاح کا ذکر چلا ہے تو اس کی کچھ تفصیل پر بھی [illegible]۔ شاگردوں کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے کم نہ تھی۔ [illegible] نام [illegible] رجسٹر میں درج ہوتے تھے۔ ذات پات کی تمیز انہوں نے کبھی گوارا نہیں کی۔ ان کے شاگردوں میں بہت سے ہندو شعرا شامل تھے۔ وہ صاحب دیوان بھی ہوئے اور استاد بھی کہلائے۔ مثلاً پروفیسر [illegible] پرشاد [illegible] جن کو نواب سائل نے جانشینی داغ کی سند بھی عطا کی تھی۔ اس [illegible] میں انہوں نے حضرت داغ کے دو [illegible] اور شاگرد بھی شامل کر لئے تھے۔ [illegible] اس طرح [illegible] منشی [illegible] اور راقم الحروف بھی اسی جماعت میں شامل ہیں۔

شاگردوں کی اتنی کثیر تعداد ان کی شاعرانہ شخصیت کا روشن ثبوت ہے۔ ان میں بہت سے [illegible] فارغ الاصلاح تھے۔ بہت سے ایسے تھے جو خود ہی اپنے آپ کو فارغ الاصلاح سمجھ رہے تھے۔ پھر بھی [illegible] اصلاح طلب [illegible] تک پہنچتے تھے۔ بڑی بات یہ تھی کہ اصلاح کا کام ہمیشہ خود ہی کرتے تھے اور اپنے ان فارغ الاصلاح [illegible] پر جو شرف ملاقات حاصل کرنے کے لئے آتے [illegible] ان کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ یہ کام ہرگز نہ چھوڑتے تھے۔ [illegible] غزل کے اشعار پڑھتے جاتے اور یہ اصلاح لکھواتے جاتے تھے۔ جو شعر [illegible] ہوتا اسے قلم زد کرنے کے لئے کہہ دیتے اور جو اچھا ہوتا اسے سن کر کہہ دیتے کہ آگے پڑھو۔ دو تین گھنٹے میں اس کام سے فارغ ہو جاتے تھے۔ ایک دو لفظوں ہی کی تبدیلی سے شعر میں [illegible] پیدا کر دیتے تھے۔ مثلاً میرا ایک شعر یہ تھا ؎

حد پر آیا مرا دل نہ پری پر آیا   یہ مجنوں پر نہیں معلوم کیوں کر آیا

مصرع ثانی میں پہلا لفظ بدل کر "ان" رکھ دیا (ان مجنوں پر) اس تبدیلی سے ایک تو متروک لفظ خارج ہو گیا۔ دوسرے اس [illegible] کی تکرار جو اس مصرع میں باعث گرانی تھی وہ بھی نہ رہی۔ تیسرے یہ کہ اس تبدیلی سے [illegible] رنگ پیدا ہو کر مصرع کی شان ہی کچھ اور ہو گئی۔

اس کام میں ایک خصوصیت یہ تھی کہ جب رامپور سے [illegible] تو [illegible] محبوب علی خان [illegible] کی غزل [illegible]

میں یہ غرضِ اصلاح آتے تھی۔ اس میں قابلِ ترمیم ٹکڑے کو قلم زد نہیں کرتے تھے نہ ترمیم کے لفظ لکھ دیتے تھے۔ صاحب [illegible] یہ کلام ہمیشہ تنہائی میں بیٹھ کر کرتے تھے۔ پھر اصلاح شدہ کاغذ سر بہ مہر کر کے چوب دار کے حوالے کر دیتے تھے۔ کس صاحب شاگرد کی [illegible] شعر کاٹ کے اور اصلاح کیا ہے۔ بعض دفعہ دن میں چار پانچ بار چھپ کر سر پر نظر ڈالتا اس کی اصلاح پھر جانچ سے جا [illegible] حضرت جلیل کو پہرہ ہوئی۔ تو وہ قابلِ ترمیم ٹکڑے کو قلم زد کرنے لگے۔ اس پر احسن صاحب نے جب یہ کہا کہ جلیل اصلاح [illegible] مجھ کو حقیقتِ حال سے آگاہ ہو کر متنبہ ہو گئے۔

تمام حیدرآباد کبھی کبھی بات کو خود بھی ان سے ملنے کے لئے آجاتے تھے۔ دربار میں بھی ان کو بیٹھنے کی اجازت تھی۔ [illegible] جو بہت کم اشخاص کو نصیب ہوتا تھا۔

بیگمی کا یہ عالم تھا کہ رام پور میں ایک مشاعرے کا اہتمام انہی کے سپرد تھا۔ درباری مصروفیتوں کی وجہ سے طرح کی غزل کہنے کا موقع [illegible] منعقد ہوا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ پڑھنے والوں کے اچھے اشعار کی داد بھی دے رہے ہیں۔ مہمانوں کی خاطر مدارات اور مشاعرہ کے حسنِ انتظام کی بھی نگرانی فرما رہے ہیں اور طرح کی غزل بھی کہہ رہے ہیں۔

پڑھنے کا انداز اگرچہ تحت اللفظ تھا۔ مگر بہت دل کش تھا۔ اس زمانے میں دیکھنے والوں نے ریاض خیرآبادی کے سوا کسی شاعر کو اس ڈھنگ سے پڑھتے نہیں دیکھا۔

ہر صاحبِ کمال کے حاسد ضرور ہوتے ہیں۔ ان کے کلام پر بھی ان کی زندگی میں اعتراض ہوتے رہے۔ وسط ہند کے ایک شخص نے اپنا نام پردے میں رکھ کر اودھ اخبار میں بہت سے اعتراض شائع کئے، مگر ان کی مرنجاں مرنج طبیعت کا تقاضا ہمیشہ یہی رہا کہ خاموش رہیں۔ فرماتے تھے کہ کوئی اس طرح خوش ہوتا ہے تو ہو لینے دو۔ یہی وجہ ہے کہ ان اعتراضات کا دندان شکن جواب ان کے قابل شاگرد نسیم بھرت پوری نے اپنے جذبات سے اثر پذیر ہو کر کتابی صورت میں شائع کیا اور معترض کی خوب خبر لی۔ اس کتاب کا نام تازیانہ تھا۔ اور مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے بلاشبہ اسم بامسمیٰ تھی۔ صرف ایک مثال سن لیجئے۔ داغ صاحب کا مطلع یہ تھا ؎

دیکھ لے گا یہ مزا حشر میں ہو جائے گا
آپ جو حکم کریں گے وہی ہو جائے گا

معترض کا قول یہ تھا کہ حکم کریں گے کی جگہ یہاں حکم دیں گے کہنا چاہئے۔ نسیم صاحب نے سعدی کا یہ قطعہ بطور سند پیش کر دیا ؎

خواجہ با بندۂ پری رخسار
چوں بیاید بہ بازی و خندہ

چہ عجب گر چو خواجہ حکم کند
وے کشد بار ناز چوں بندہ

دوسرا اعتراض یہ تھا کہ داغ صاحب نے صیغۂ قرار کے لئے فعل واحد استعمال کیا تھا۔ معترض نے کہا کہ جمع کا فعل آنا چاہئے۔ نسیم صاحب نے جواب میں دو مثالیں پیش کر دیں۔

۱۔ آپ کو وسط ہند کی آب و ہوا موافق نہیں ہے۔

۲۔ وہاں کا آب و دانہ قسمت میں تھا۔

اس کے بعد یہ بھی لکھا کہ اصول و قواعد یا فن کی کسی بات پر اعتراض ہو تو سنا جا سکتا ہے۔ جس شخص نے بیگمات کی گود میں پرورش پائی اور شہزادوں کی صحبت میں رہ کر جوان ہوا۔ وسط ہند کے رہنے والوں کو اس کی زبان پر اعتراض کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

کلام کا بہت سا حصہ سہلِ ممتنع ہے۔ زبان کی بے تکلفی اور بیان کی صفائی کے لئے یہ ایک مطلع بطور مثال کافی ہے ؎

حضرتِ دل آپ ہیں کس دھیان میں
مر گئے لاکھوں اسی ارمان میں

[illegible]

[illegible] ہے —

[illegible] — نکلت ہو [illegible] آ جا [illegible]

[illegible] قسم کی [illegible] زبان اور کے [illegible] ہے۔ یہی پختہ تجربوں [illegible]

[illegible] ہے

اپنے شاگردوں کا وہ بہت قدر دان تھے۔ بہت سے اساتذہ کو دیکھا ہے کہ مشاعرے میں صم بکم ہو کر بیٹھے رہتے ہیں اور کوئی داد ہی نہیں دیتے۔ اگر کوئی شاعر کسی کو مخاطب کر کے شعر پڑھتا ہے تو فقرہ سا مار دیتے ہیں اور بس۔ مگر حضرت داغ اچھے شعر پر خود بے تاب ہو جاتے تھے۔ اور مکرر پڑھواتے تھے۔ اگرچہ وہ خوش شاعر ہیں کی [illegible] اخلاقی بھی اسی ساخت کا ایک حصہ تھی۔ مگر یہ بھی شاگردوں کی تاکید تھی کہ صرف اصلاح شدہ غزل ہی مشاعرے میں پڑھا کریں اور [illegible] میں ڈالا گیا۔

طبیعت بہت انصاف پسند اور منکسر المزاج واقع ہوئی تھی۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک دفعہ حضرت ریاض خیرآبادی اپنے استاد حضرت امیر مینائی کی بیماری کی وجہ سے حیدرآباد آئے اور کئی ہفتے وہاں ٹھہرے۔ کبھی کبھی حضرت داغ کی خدمت میں بھی نیاز مندانہ سلام کے لئے حاضر ہو جاتا معمول تھا۔ ایک دن حاضر ہوئے تو حضرت داغ کے پاس چند احباب بھی بیٹھے تھے۔ رسمی گفتگو کے بعد داغ صاحب نے کچھ سنانے کی فرمائش کی۔ ریاض صاحب نے اظہار معذرت کیا اور کہا آپ کے سامنے کیا پڑھوں۔ داغ صاحب نے احباب سے کہا یہ ہم ہی سے کسی کو [illegible] نہیں سمجھتے۔ ریاض صاحب نے یہ ہوئی عرض کی کہ آپ مجھے شرمندہ کرتے ہیں۔ میں اپنے استاد کے سامنے کبھی نہیں پڑھتا۔ آپ کا بھی ویسا ہی احترام کرتا ہوں۔ مگر یہ عذر قبول نہ ہوا۔ مزید اصرار پر ریاض صاحب نے [illegible] ایک غزل سنائی جس کے دو تین شعر یہ ہیں —

نہیں مرکز ترا زمیں بھی نہیں — اب ٹھکانا کہیں کہیں بھی نہیں

آ کے بہت فلک کے پتے — آسماں بھی نہیں زمیں بھی نہیں

چپ ہیں وہ کس کے [illegible] — کہ ان ہے ہاں بھی نہیں نہیں بھی نہیں

کون [illegible] مطلب سے — جو [illegible] آب [illegible] بھی نہیں

داغ صاحب نے بہت داد دی۔ بہت خوش وقت ہوئے۔ چند روز کے بعد ریاض صاحب پھر ملاقات کے لئے آئے تو فرمایا کہ دو روز [illegible] آ گئی تھی۔ میں نے بھی غزل کہی ہے مگر تمہاری غزل کے سامنے پست معلوم ہوتی ہے۔ فرمائش اور اصرار پر غزل سنانے لگے۔ ریاض صاحب [illegible] کہ غزل بلند پایہ تھی۔ مگر پھر بھی یہ فرمایا کہ مجھے پسند نہیں۔ یہ کہہ کر کاغذ میرے سامنے پھاڑ ڈالا۔

اس واقعہ کا آخری حصہ غلط ہو یا درست۔ پھر بھی اخلاقی انصاف پسندی اور فراخ دلی کا یہ اچھا ثبوت پیش کرتا ہے۔

اپنے ہم عصروں کا بڑا احترام کرتے تھے۔ مثال میں یہ شعر کافی ہے —

[illegible] — اے امیر احمد و تسلیم [illegible] ہے

اسی سلسلے میں حضرت امیر مینائی کا یہ شعر بھی قابل ذکر ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ اپنے ہم عصروں کا بڑا لحاظ اور ان کے ساتھ بہت خلوص تھا

امیرؔ اچھی غزل ہے داغؔ کی جس کا یہ مطلع ہے ۔۔۔ بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں

اُن سے نکلا۔ شان سے نکلا۔ اس زمین میں حضرت داغ کی ایک غزل ہے۔ حضرت امیر نے اس غزل کی تعریف میں نصف صدی کی تھی۔ احباب کو اس کا مطلع بھی سنایا تھا اور فرمایا تھا کہ اس مطلع کا جواب نہیں ہو سکتا۔ وہ مطلع یہ ہے ؎

خاطر حسرت بیان سے نکلا ۔۔۔ دل کا کانٹا زبان سے نکلا

حیدرآباد میں ایک مشاعرہ تھا۔ یہ خود تو شامل نہیں ہو سکے۔ ان کے کئی شاگرد شامل مشاعرہ تھے۔ ان کے خواہر تاش سید ظہیر ایک منچلے کام تھا۔ انہوں نے اصرار کیا کہ مجھے پڑھوا دیا جائے۔ مگر بار بار کہنے پر بھی مہتمم مشاعرہ نے احتراماً انہیں نہ پڑھوایا۔ اور کہا آپ کے بعد کوئی اور شاعر پڑھنا گوارا نہ کرے گا۔ مشاعرہ خراب ہو گا۔ انہوں نے مزید اصرار کیا۔ مگر شنوائی نہ ہوئی۔ تو غصے میں دونوں غزلیں چاک کر دیں اور چلے مشاعرے میں سناٹا چھا گیا۔ مہتمم مشاعرہ نے باقی شعرا کی منت خوشامد کی اور ان کو پڑھوا دیا۔ داغ صاحب کو اس کا علم ہوا تو اگلے دن اپنے سب شاگردوں کو ڈانٹا اور کہا کہ جب ظہیر صاحب نے غزل نہیں پڑھی اور اٹھ کر چلے گئے تو تم نے یہ بے ادبی کیوں گوارا کی۔ تم بھی اٹھ کر چلے آتے۔ اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ وہ اپنے ہم عصروں اور مشاہیر کا کتنا احترام کرتے تھے۔

رامپور میں ان کی شاعرانہ شخصیت کا یہ عالم تھا۔ کہ ہر مشاعرے پر چھا جاتے تھے۔ حضرت امیر مینائی خود کہا کرتے تھے کہ غزل پڑھنے کرنے سے پہلے معلوم ہے مشاعرہ تو داغ ہی کے ہاتھ رہے گا۔ نواب کلب علی خاں والئ رامپور نے بارہا ایسا کیا کہ خفیہ طور پر چند آدمی یہ معلوم کرنے کے لئے مقرر کر دیے۔ کہ مشاعرہ ختم ہونے پر جب حاضرین رخصت ہوں۔ تو ان کی گفتگو مشاعرہ کے متعلق سنیں اور دیکھیں کہ وہ لوگ چلتے چلتے کس شاعر کی تعریف کرتے اور کس کے اشعار کو دہراتے ہیں۔ ان کی رپورٹ بھی ہمیشہ حضرت داغ ہی کے حق میں ہوتی تھی۔ وہ لوگ انہی کے اشعار کو مزے لے لے کر پڑھتے پائے جاتے تھے۔ حیدرآباد میں بھی ان کے کلام کی قبولیت کا یہی عالم تھا۔ اخیر عمر میں تو وہ پہلا شعر بھی کسی مشاعرے یا اور کسی صحبت میں پڑھ دیتے تھے تو اس پر بھی خاصی داد واہ ہو جاتی تھی۔

حیدرآباد میں ان کی ابتدائی تنخواہ ۴۵۰ تھی۔ پھر ایک ہزار ہو گئی۔ پھر ڈیڑھ ہزار۔ مگر ہر ایک ترقی روز اول ہی سے شمار کی گئی۔ ایک دفعہ انہیں پندرہ ہزار روپے اسی ترقی کے حساب میں ملے تھے۔ آئے دن کے انعامات و اکرامات اس کے علاوہ تھے۔ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کی سرپرستی میں بھی بہت کچھ خرچ کرتے تھے۔ ایک دفعہ نظام حیدرآباد نے یہ سنا کہ داغ سات ہزار کے مقروض ہیں۔ انہوں نے یہ قرضہ ادا کرنے کے لئے کل رقم بھیج دی۔ ان کی منہ بولی بیٹی نازلی بیگم کا بھی وظیفہ مقرر تھا۔ یہ لڑکی دراصل ان کی سالی کی بیٹی تھی۔ جو بعد میں نواب سائل دہلوی سے بیاہی گئی اور ابھی تک بہ قید حیات ہے۔

شاگردوں کی کثیر تعداد میں جیسے بیخود دہلوی۔ بیخود بدایونی۔ نوح ناروی۔ نواب سائل۔ رسا رامپوری۔ نسیم بھرت پوری۔ احسن مارہروی۔ طیش مارہروی۔ مہر گوالیاری۔ نواب عزیز یار جنگ۔ حضرت اقبال۔ ضیا گلاوٹھی۔ ناطق گلاوٹھی۔ احسن سنبھلی۔ مبارک عظیم آبادی۔ بسمل شاہجہانپوری۔ سہا مجددی۔ جھنجھانوی۔ نازاں دہلوی۔ رعد گوالیاری۔ ثاقب اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خود نظام دکن شامل ہوں۔ تو اس سے بڑھ کر ان کی شاعرانہ عظمت کا ثبوت اور کیا ہو گا۔ کلام اس قدر مقبول ہوا کہ اس گئے گزرے زمانے میں بھی ان کے صدہا اشعار لوگوں کی زبان پر ہیں۔ چار دیوان شائع ہوئے۔ گلزار داغ آفتاب داغ اور مہتاب داغ تو ان کی زندگی ہی میں منظر عام پر آ گئے تھے۔ اور تمام دنیائے ادب سے خراج تحسین وصول کر چکے تھے۔ مثنوی فریاد داغ ان کے علاوہ ہے۔ چوتھا دیوان یادگار داغ ان کے بعد حضرت احسن مارہروی نے شائع کیا۔ اس کے علاوہ فصیح اللغات بھی ان کی زیر نگرانی مرتب ہو رہی تھی۔ مگر عمر نے وفا نہ کی اور ۱۳۲۲ھ یا فروری ۱۹۰۵ء میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ مزار حیدرآباد نامپلی میں ہے۔

[illegible] وقت سے [illegible]

[illegible] تمام شب [illegible]

[illegible]

(۱۳۲۲ھ) کے [illegible]

[illegible]

بلبلِ ہندوستاں [illegible]

[illegible] ۱۳ [illegible] ۲۲

اکبر الہ آبادی

عبدالماجد دریابادی

تھے معزز شخص لیکن ان کی لائف کیا لکھوں
گفتنی درجِ گزٹ باقی جو ہے ناگفتنی!

اکبر کا یہ الہامی شعر دوسروں کے حق میں جس حد تک بھی صحیح ہو، خود ان کے حق میں تو بہر حال صحیح نہیں۔ ان کے درجِ گزٹ حالات و معاملات گفتنی یقیناً ہیں، باقی جو گزٹ یا ہر یا مسل سے باہر ہیں وہ بھی چاہے سب کے سب مثالی، معیاری، ملکوتی نہ ہوں، پھر بھی ناگفتنی کہنے کے لائق تو کسی طرح بھی نہیں۔

یہ بھی تو فرما گئے ہیں ؎

اکبر کی برائی اچھائی پوچھ اس کے محلہ والوں سے
ہاں شعر وہ اچھا کہتے ہیں، دیوان تو ان کا دیکھا ہے

لیکن محلہ والوں کی شہادت ان شاء اللہ ان کی صفائی ہی میں گزرے گی۔ استغاثہ کو وہاں سے مدد ذرا نہ ملے گی۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہ خوب سمجھ لیجئے کہ جن حضرت اکبر کو ہم آپ جاننے پہچاننے نکلے ہیں وہ اپنی پبلک زندگی میں ایک شاعر تھے اور خالص شاعر۔ اول بھی شاعر اور آخر بھی شاعر۔ یوں بے شک اکبر حسین وکیل تھے اور پھر منصف ہوئے، سب جج ہوئے، عدالت خفیفہ کے جج ہوئے اور سشن جج ہوئے اور ہائی کورٹ کی ججی کی منزل تک پہنچتے پہنچتے رہ گئے۔ ان سے ہم کو آپ کو کوئی سروکار نہیں۔ ان سے اگر کچھ واسطہ ہے بھی تو بالواسطہ، اور بہت گھوم پھر کر ـــــ کہنے والے کہتے ہیں کہ ان کی سرکاری زندگی کا بھی ورق روشن ہی رہا، صاف اور بے داغ رہا، کام کو کیا دیانت سے کیا، محنت سے کیا، قابلیت سے کیا، فہم سلیم کے ساتھ کیا۔ فرض کو فرض سمجھ کر کیا۔

شاعر کی ذاتی زندگی کو، شاعر کی شخصیت کو جب جانچا جائے گا تو اسے اسی کے پیمانہ سے ناپا جائے گا۔ یہ نہ ہوگا کہ جانچا تو جائے الہامی شاعر کو اور عینک لگا لی جائے پبلک لیڈر والی، عالم دین والی، مرشد وقت والی۔

[illegible] حضرت علامہ [illegible]
[illegible] حضرت [illegible]
[illegible]
[illegible] بہت [illegible]
[illegible] حضرت [illegible] شہادت [illegible]
[illegible] حضرت اکبر کی خدمت میں حاضر ہوں —— [illegible] حضرت [illegible]
[illegible] ایک [illegible] اس [illegible]
[illegible]
[illegible] سال [illegible]
[illegible]

اس وقت [illegible] سال کی [illegible] اس [illegible]
[illegible] سال [illegible] حاصل [illegible]
[illegible] کے قبل [illegible]
[illegible] معلومات و بیانات سے ماخوذ ہے۔

جسمانی حیثیت سے حضرت اکبر بہت ہی لاغر اور کم سنی سے [illegible]
[illegible] چہرہ میں کوئی ایسی بات نہ تھی جو انھیں عوام سے ممتاز کرتی۔ آنکھوں میں [illegible] چمک [illegible] لباس [illegible] سادگی [illegible]
اور اسی کے ساتھ ایک علامت [illegible]
کے تقوے اور [illegible] سے [illegible] خوب [illegible] اردو [illegible]
[illegible] بس [illegible] دو چار [illegible] کھاتے [illegible] بہت [illegible]
ثقیل غذاؤں سے بچنے کی احتیاط رکھتے۔ [illegible] تصویروں میں البتہ [illegible] چہرہ [illegible]
[illegible] اس عمر میں کھانا [illegible] لباس بھی [illegible] رہتا۔

عام طور پر [illegible] ایک بڑے ہوشیار [illegible] میں [illegible] اس وقت جب وہ [illegible]
تھا۔ انتقال ہوا اور اس کی ماں حضرت اکبر کی محبوب بیوی اس سے قبل ہی رحلت کر چکی تھیں۔ یہ پہلی بیگم تھیں۔ [illegible]
[illegible] رہی۔ اسباب اور [illegible] حالات کا [illegible] علم ہے بہرحال [illegible] حضرت اکبر کے [illegible]
پھر اس [illegible] کے لئے [illegible] کیا کرتے کہ بڑے صاحبزادہ [illegible] ایک [illegible]
حضرت اکبر [illegible]
[illegible] میں رہا کرتے۔

آخر عمر میں [illegible]

[illegible] سے ضرر غذاؤں سے بھی شدید نقصان کا وہم قائم کر لیتے طبیب کو علاج میں خاصی دقت ہوتی۔ یہ اس کے تجویز کئے ہوئے نسخوں میں بار بار [illegible] کر دیتے جس سے [illegible] نہیں آ سکتی۔

ان ذاتی حالات کے علاوہ ملکی و ملی انتشار بھی حضرت اکبر کی جمعیت خاطر کو پراگندہ کئے ہوئے تھا۔ دیکھ رہے تھے کہ مسلمان اپنے عقائد کو خیرباد کہہ کر تجدد، روشن خیالی، نیچریت اور مغربیت کے سیلاب میں بہے چلے جا رہے ہیں، اور ان کے ذکی الحس شخص کو اس سے قلق ہوتا بالکل قدرتی تھا۔ پھر سیاسی حیثیت سے بھی یہ انہیں گوارا نہ تھا کہ مسلمان بدستور انگریزوں کی سیادت [illegible] قبول کئے بیٹھے رہیں اور نہ حکومت سے مقابلہ کے گاندھی جی کے اصول اور کانگرس کے طریق کار سے متفق تھے اور مسلم لیگ بھی جیسی کہ وہ اس وقت تھی کچھ ان کی مرضی کے مطابق نہ تھی۔ یہ سارا سماں دیکھ کر وہ اندر ہی اندر کڑھتے اور گھٹ گھٹ کر رہتے۔ کھل کر کچھ کہنے کا یا اعلانیہ میدان عمل میں آ جانے کی نوبت اپنے میں پاتے اور نہ اسے کچھ زیادہ مفید یا مناسب ہی سمجھتے۔ کوئی دوسرا ان کے خیالات و جذبات کی ترجمانی میں کچھ لکھ دیتا تو اس سے بہت خوش ہوتے، خوب داد دیتے اور خود بس اشارے کنایے ہی شاعری میں کرتے رہ جاتے اور کلام کے چہرے پر مزاح و ظرافت کا نقاب اسی غرض و مقصد سے ڈالے رہتے۔ کہہ بھی تو گئے ہیں ؎

سرد موسم تھا ہوائیں چل رہی تھیں برفبار
شاہد معنی نے اوڑھا ہے ظرافت کا لحاف

ظرافت و شوخی [illegible] اصلی و طبعی رنگ بھی تھا اور [illegible] اس لئے بھی اختیار کیا کہ اس کی آڑ میں دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع مل جائے گا۔ وہی مرشد شفیق کی ہدایت پر عمل کہ "سر دلبراں، بیان کرنا ہو تو پیرایہ حدیث دیگراں" کا انتخاب کرو۔

غرض ان کی مستقل افسردگی اور مستقل تکلیف، متعدد اور گوناگوں ذاتی و ملی حالات کے مجموعہ کا نتیجہ تھی۔ کوئی دوسرا ہوتا تو اس مزاج میں جھلاہٹ و طبیعت میں چڑچڑاپن ضرور پیدا ہو جاتا۔ اکبر کے ہاں یہ کچھ نہ ہوا۔ البتہ ایک مستقل اداسی سی رہنے لگی اور غم غلط کرنے کا ایک نسخہ انہوں نے اپنی ظریفانہ شاعری کو بنایا۔ مجلسوں اور صحبتوں میں گفتگو بہت زیادہ نہ کرتے کہ دوسروں کو بولنے کا موقع ہی نہ ملے اور نہ ایسے خاموش رہتے کہ بس دوسرے ہی بولتے رہیں اور یہ چپکے سنتے ہی رہ جائیں۔ گفتگو میں خود بہت کم ہنستے۔ دوسروں کو البتہ ہنساتے رہتے۔ نظم تو گویا ان کے گھر کی کنیز تھی اور قافیے جیسے ہاتھ باندھے سامنے حاضر رہتے۔ شعر برجستہ اور فی البدیہہ کہہ ڈالتے۔ گفتگو عام [illegible] تذکروں و وقتی چرچوں کے علاوہ سب اپنی مرضی کے مطابق کرنے۔ نیا تازہ کلام سناتے اور یا پھر توحید و معرفت کا ذکر چھیڑ دیتے۔ آخر زمانہ میں ان کا سب سے دل پسند موضوع یہی تھا۔ پھر نامطلوبی گفتگو سے گھبراتے، بات ختم کر دیتے۔ بات کا بیشتر حصہ یا عارفانہ و حکیمانہ ہوتا اور یا پھر شعر و ادب کے کسی نکتہ پر مشتمل۔ مخاطب کی دلجوئی کا بڑا لحاظ رکھتے اور بحث و مباحثہ مذہبی کیا معنی، سیاسی بھی حتی الامکان کسی قسم کا نہ پیدا ہونے دیتے بلکہ جب دیکھتے کہ مناظرانہ رنگ آیا ہی چاہتا ہے تو کوئی لطیفہ یا چٹکلہ درمیان میں لا کر بات وہیں ختم کر دیتے۔

مذہبی عقائد میں بڑے پختہ تھے۔ معاصر علما میں سب سے زیادہ قائل و معتقد حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے تھے۔ عام عقیدت اہل اللہ سے زیادہ تھی۔ عملاً بھی مذہب کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ نماز اول وقت پڑھنے کا خاص اہتمام رکھتے اور وقت آنے کے منتظر و مشتاق رہا کرتے۔ بار بار گھڑی دیکھتے جیسے کوئی عازم سفر اسٹیشن جانے کے لئے گھڑی دیکھتا رہتا ہے۔ اپنے ملازموں وغیرہ کو ساتھ لے کر حتی الامکان چھوٹی سی جماعت کا بھی التزام رکھتے بلکہ نئے ملازم سے اسے رکھتے ہوئے کہہ بھی دیتے کہ تمہیں نماز میرے ساتھ پڑھنا ہوگی۔ میں نے اپنے الحاد سے نکلنے کے بعد جب پہلی بار نماز ان کے ساتھ پڑھی ہے تو بے انتہا خوش ہوئے۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ کوئی دولت خود ان کو مل گئی ہے۔ نماز کے بعد پھر تلاوت قرآن مجید کے شائق نہیں عاشق تھے۔ وقت پابندی کے ساتھ قرآن پڑھتے۔ ایک بعد نماز فجر، دوسرے بعد نماز ظہر۔ عربی کی باضابطہ استعداد کچھ زیادہ نہ تھی۔ فرماتے تھے کہ مجھ کو کچھ عربی آتی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ۔

ہمارا اندازہ ہے کہ نعتیہ مضامین کا ایسا [illegible] رنگ [illegible] اور بحث اس [illegible] ۔ ایک روز فضائل رسول کا تذکرہ [illegible] جاری تھا [illegible] چار منٹ تک تو دلچسپی [illegible] اس کے بعد بول اٹھے: جی ہاں! ہمارے [illegible] کی کاریگری کا کیا کہنا [illegible] جیسا جامع کمالات رسول پیدا کر دیا ۔ [illegible] کے بعد دوسرے [illegible] موضوع تذکرہ آخرت تھا ۔ [illegible] ذکر خود بھی کرنا چاہتے اور دوسروں سے بھی سننا چاہتے ۔ گو ظاہر ہے کہ ان سے دلچسپی رکھنے والے لوگ ہی انہیں کتنے اور کہاں ملتے ۔

اس سے خیال یہ نہ گزرے کہ اکبر کوئی خشک قسم کے انسان تھے ۔ جی نہیں، گفتگو بڑی دلچسپ کرتے اور علمی، ادبی، سیاسی، معاشرتی ہر عنوان پر گفتگو فرما لیتے ۔ انگریزی کی استعداد اچھی خاصی تھی اور علاوہ انگریزی اخبارات کے ادبی انگریزی کتابیں بھی پڑھتے رہتے ۔ بیشک بڑے مکتب بینوں میں ان کا شمار نہ تھا یعنی یہ نہ تھا کہ ہر وقت کتاب کے کیڑے بنے رہتے لیکن یہ بھی نہ تھا کہ اس مذاق سے کورے ہوں ۔ مطالعہ میں اکثر فلسفہ کی کتابیں رکھتے خصوصاً روحانی فلسفہ کی اور اس بارے میں مدد انہیں اپنے صاحبزادہ سے مل جاتی ۔ عشرت صاحب آخر کیمبرج کے گریجویٹ تھے اور اپنا استفادہ [illegible]

[illegible] کی فلسفیانہ کتابیں سے اپنے طلباء کو برابر باخبر رکھتے۔ پادلیر، برگساں (وغیرہ) وغیرہ کی کتابیں بھی بہت [illegible] مذہب اور تصوف کی تائید میں خوب خوب نکتے ان لوگوں کے ہاں سے پیدا کیا کرتے۔ شاید ڈاکٹر صاحب ہی نے [illegible] کے مقالات کا اردو میں ترجمہ کیا۔ برگساں کے فلسفہ کا خلاصہ یہ ہے کہ "مرور دہر" تحلیل ہو کر "معیت" پہ پڑتی ہے اور اس کے معنی [illegible] بے معنی ہے۔ اکبر اس فلسفہ کو سن کر بڑے خوش ہوئے اور فرمایا کہ یہی تو ہم اسے مغربی شعور سے لکھتے آ رہے ہیں کہ سامنے [illegible] علم بامعنی ہی ہے" ــــ ایسے ایسے نکتے دن رات پیدا کرتے رہتے، پڑھتے کرتے، سوچتے، نیا مسئلہ اور کتابی معلومات سے [illegible] اپنے ذہن و دماغ پر رکھتے۔

گاندھی جی سے کچھ زیادہ حسن ظن نہیں تھے مگر اور نہ ان کی تحریک ترک موالات کے بھی زیادہ قائل تھے۔ یہ سب علی برادران بہاس [illegible] کی عقیدت و عظمت پوری طرح چھائی ہوئی تھی اور علی برادران تو ان کی صف سیاسی رہنمائی اور سوجھ بوجھ کے قائل تھے لیکن یہی انہیں روحانی پیشوا کے درجہ پر رکھنے لگا تھا۔ جولائی ۱۹۲۱ء میں تحریک خلافت و ترک موالات کے شباب کے زمانہ میں حضرت اکبر سے مولانا محمد علی گاندھی جی کی روحانیت اور روحانی عظمت کے قصے بیان کرنے۔ کچھ دیر بعد حضرت اکبر فرماتے کیا ہیں کہ "کیوں صاحب! ان کی انجمن میں شریک ہونے کے لئے پہلی شرط تو توحید الٰہی کی ضرور ہو گی" ــــ اس کا جواب بن ہی کیا پڑتا۔

گفتگو میں نازک موقعوں پر لطیفہ گوئی سے خوب کام نکال لیتے۔ ۱۹۱۵ء، ۱۹۱۶ء میں یوپی کے چیف سیکریٹری مسٹر پوڈر [illegible] تھے۔ بڑے صاحب اثر و اقتدار، فارسی کے ماہر اور اردو سے بھی واقف تھے۔ اکبر صاحب ملنے گئے تو ان سے بولا کہ "اب مسلمانوں نے بھی آزادی کے لئے بڑا ایجی ٹیشن شروع کر دیا ہے، آپ کیا کہتے ہیں۔" اکبر کو تجا جواب خلاف مصلحت نظر آیا جھٹ سے بولے کہ "میں تو اور کچھ نہیں جانتا یہ جانتا ہوں کہ 'آدم زاد' میں جب تک 'دم' ہے 'آزاد' کہاں ہو سکتا ہے۔ 'آزاد' تو جبھی ہو گا جب 'دم' نکل جائے گا۔" انگریز حاکم کہاں تو غصہ میں تھا کہاں اس ادبی لطیفہ پر ہنس پڑا۔

دوسروں کو چاہے وہ ان کے خوردہی کیوں نہ ہوتے روک نہیں سکتے نہیں عموماً لطیف و شستہ پیرایہ اختیار کرتے۔ لکھنؤ میں ایک بار ایک جوان عمر سرکاری عہدہ دار ملنے آئے اور یہ تربیت نسواں کے بڑے علمبردار تھے۔ اکبر صاحب کا مسلک دوسرا۔ آزادی نسواں کے مطالب کی تائید میں فرمایا کہ لوگ سید احمد خاں کو بڑا آزاد خیال کا معلم بتلاتے ہیں لیکن عورتوں کی آزادی کے مسئلہ پر وہ بھی پردہ مانگتے تھے۔" وہ صاحب یکایک بول اٹھے کہ سرسید کی رائے اس معاملہ میں تو بہت قابل ترمیم تھی۔" اکبر صاحب ذرا رکے اور اپنے سلسلہ بیان کو اسی طرح جاری رکھتے ہوئے بولے "آپ نے سچ کہا سرسید کی رائے اس معاملہ میں کیا بہت سے معاملات میں قابل ترمیم تھی اور رائے و خیال کیا معنی وہ خود ہی قابل ترمیم تھے۔ دیکھئے زمانہ نے انہیں ترمیم کر دیا۔ وہ رخصت ہو گئے اور ان کی جگہ آپ کو پیدا کر دیا۔"

عقائد میں اتنے پختہ و متشدد ہونے کے باوجود مذہبی بحث و مباحثہ کیا معنی مذہبی تبلیغ بھی براہ راست اور کھلم کھلا نہ کرتے بس اشارہ و کنایہ میں کر جاتے۔ میرا دور الحاد تھا، ایک روز فرمایا "کیوں صاحب آپ نے تو کالج میں عربی لی تھی نا؟ اور عربی تو ایک اعلیٰ زبان ہے کیوں نہ اس سے مناسبت قائم رکھئے۔ جہاں اتنی انگریزی کتابیں پڑھتے رہتے ہیں وہاں چند منٹ کے لئے قرآن مجید کو بھی کھول کر بیٹھ جایا کیجئے، ادب کی بہترین کتاب تو اسے یورپ والے بھی تسلیم کرتے ہیں۔ بس اس کے ادب کا خیال کر کے دو چار صفحے اس کے روز پڑھ لیا کیجئے۔ جو آیتیں بہ ظاہر بے جا ہوں انہیں جانے دیجئے اور سمجھ لیجئے کہ وہ آپ کے لئے نہیں۔ کسی نہ کسی آیت کا مضمون تو آپ کے دل کو بھی کھینچے گا بس ایسی آیت جب آ جائے تو اس کی دو چار بار تکرار کر لیا کیجئے۔ اور آپ کے لئے کوئی قید نماز وغیرہ کی بھی نہیں" ــــ یہ ایک نمونہ ہے ان کے حکیمانہ انداز تبلیغ کا اسلام

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

زہر ہوتا ہے مزا [illegible]   رنگ بدلا کیا زمانے کا
شوخی [illegible]   کٹ گئی عمر [illegible]
[illegible]   [illegible]

[illegible] اس رنگ [illegible] ہو گئے تھے

[illegible]   مگر ان [illegible] کی کچھ پرانی شان باقی ہے
[illegible]   بس [illegible] کچھ ایمان باقی ہے
[illegible]   [illegible] ہماری جان باقی ہے
[illegible]   [illegible]

[illegible] ابھی [illegible] نہیں آیا
یہ سچ ہے کٹ گئے ہیں پاؤں لیکن جان باقی ہے

وقارالملک

مولانا غلام رسول مہر

سرسید مرحوم کے رفیقانِ خاص نہ صرف اپنے ہی عہد میں بے مثال نہ تھے بلکہ ان جیسی شخصیتیں کسی بھی عہد میں بہت ہی کم ملیں گی۔ محسن الملک، وقارالملک، حالی، شبلی، نذیر احمد، اعظم یار جنگ، ان میں سے کون سی شخصیت ہے جو علم و فضل، مکارمِ اخلاق، وسعتِ نظر اور جذبۂ خدمت ملک و ملت میں انتہائی اونچے مقام پر فائز نہیں؟ لیکن ان میں سے وقارالملک اور حالی کی فرزانگی اور فضائل کی جامعیت کے اعتبار سے بہت ممتاز ہیں۔ میں نے شخصیتوں کے اس نظامِ شمسی پر جب کبھی غور کیا ان میں سے دو کو بالکل یگانہ اور نادر پایا: ایک مولانا حالی، دوسرے نواب وقارالملک۔ مولانا حالی بہت ہی پاکیزہ صفات انسان تھے۔ سراپا سوز و گداز، سراپا محبت و شفقت اور سراپا ایثار و انکسار، تاہم ان کا حلقۂ عمل صرف علم و ادب اور شعر و سخن تک محدود تھا۔ وقارالملک کا دائرۂ کار بہت زیادہ وسیع تھا۔ انہوں نے ہر مقام پر حسنِ عمل کے جو نقوش چھوڑے، ان کی آب و تاب اب تک ہر صاحبِ بصیرت کا دامنِ نگاہ اپنی طرف کھینچ رہی ہے اور جب تک فضائل کے اصلاحی معیار اس دنیا میں قائم ہیں، یہ آب و تاب ماند نہیں پڑ سکتی۔

اُن کے انتقال پر مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے "معارف" میں لکھا تھا:

> نواب محسن الملک کی وفات پر ہم نے تدبر و سیاست کا ماتم کیا۔ مولانا نذیر احمد کے مرنے پر بحر نگاری اور بزم آرائی کا مرثیہ پڑھا۔ مولانا شبلی کی موت پر ہم نے علم کے فقدان کا نوحہ کیا۔ مولانا حالی کو رخصت کرتے ہوئے ہم نے سخن وری اور نکتہ سنجی پر آنسو بہائے۔ لیکن نواب وقارالملک کی رحلت پر ہم قوم کا ماتم کرتے ہیں اور اولوالعزمانہ اخلاق کی گم شدگی پر فریاد۔

یہ احساسات بے شائبۂ ریب بالکل بجا اور درست تھے۔

میں نے نواب وقارالملک کو دسمبر ۱۹۰۹ء میں پہلی اور آخری مرتبہ دیکھا تھا، جب میں غالباً آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ وہ ہوشیار پور

یہ مولوی وقار الملک بہادر تھے جو کئی روز سے حیدرآباد سے تشریف لائے تھے۔ انہوں نے ہی جالندھر ہو کر شملہ پہنچ کے دیہاتی لیڈ
شملہ ہی جالندھر میں لائل گورنمنٹ کی کمیٹی سے رشتہ جوڑا تھا۔ نیز انہی کے عہد میں مسلمانوں کے حقوق پہنچے
ہوئے تھے۔ نواب صاحب نے جلسہ کیا۔ یہ ناچیز ان کی صحبت کا شرف حاصل ہے۔ وہ منظر بیس برس کی مدت کے بعد اب
تک اسی طرح آنکھوں کے سامنے تازہ ہے گویا کل پیش آیا تھا۔

قد میانہ تھا۔ جسم نہ دبلا نہ موٹا۔ اسی وجہ سے وہ بہت خاص نظر آتے تھے۔ رنگ سانولا۔ چہرہ بھرا ہوا۔ سر پر بال
ترشے ہوئے۔ داڑھی منڈی اور بالکل سفید۔ اس وقت ان کی عمر ستر کے قریب تھی میں نے جب انہیں دیکھا تو سر پر ترکی ٹوپی کہنہ
سی گرم شیروانی اور پتلون پہنے ہوئے تھی۔ جو بھی ان سے مصافحہ کرتا بڑے تپاک حسن سلوک اور محبت و شفقت سے ملتے۔ ان کے چہرے پر
متانت کا غلبہ تھا۔ مگر کوئی جلال نمایاں نہ تھی۔

اس زمانے کے لیڈر یہ شاندار ہوتے تھے انہوں نے ملک میں نئی روح پیدا کی اور جو ہر وقت سے بڑی بڑی مشکلات میں مدد
اضافہ ہوتا رہا۔ ملکی حالات میں وقار الملک کا استقبال بہت دھوم دھام سے کیا گیا۔ ذکر ہے دیکھتے ہی ان پر پھول برسائے
ہوتی رہی۔

واضح رہے کہ اس وقت مجھے وقار الملک کی عظیم الشان شخصیت اور ان کے مقام بلند کے متعلق پورا علم نہ تھا لہٰذا تقریب استقبال میں
شامل ہونے کی خوش نصیبی کا اندازہ نہ کر سکتا تھا۔ جب ہوش سنبھالا تو دنیا کے جن واقعات کو اپنے سامنے ہوتے ہوئے دیکھتا رہا ہوں ان میں ایک یہ واقعہ
بھی ہے۔

وقار الملک ۱۹ محرم ۱۲۵۷ھ (۲) مارچ ۱۸۴۱ء کو پیدا ہوئے۔ مشتاق حسین نام رکھا گیا۔ والد کا نام فضل حسین تھا۔ قوم
کمبوہ۔ وطن سنبھل۔ والدہ امروہہ کی تھیں۔ مشتاق حسین صرف چھ مہینے کے تھے جب ان کے والد نے وفات پائی۔ والدہ یتیم بچے کو لے کر
امروہہ چلی گئیں اور یہی مقام مشتاق حسین کا وطن بن گیا۔ جو آگے چل کر نواب انتصار جنگ وقار الملک نواب مشتاق حسین خان بہادر انتصار جنگ
بننے والے تھے۔

چھ سال کی عمر میں قرآن ختم کیا۔ پھر عربی اور فارسی پڑھی ۱۸۵۸ء میں دس روپے ماہوار پر مدرس ہو گئے۔ پھر انگریزی کی تعلیم اور حصول
ملازمت کی۔ بعد ازاں منصفی میں سررشتہ دار بن گئے۔ تحصیل داری کا امتحان بھی پاس کر لیا لیکن ایک واقعے کے باعث جس کا ذکر آگے آئے گا
ملازمت سے استعفا دے دیا اور سر سید کی سفارش پر ریاست حیدرآباد میں ۲۰۰ روپیہ ماہانہ پر ملازم ہو گئے۔ وہاں سے ایک
مرتبہ بعض مقامی کشمکشوں کے باعث ملازمت سے جواب دے دیا تھا۔ دوبارہ بلائے گئے اور ترقی کرتے کرتے صوبہ دار کے عہدے پر
معتمد عدالت و کوتوالی بنے۔ سر آسمان جاہ بہادر کی وزارت میں پولیٹیکل سیکرٹری بھی رہے۔ ۱۸۹۲ء میں پنشن
لے کر وطن واپس آ گئے اور قوم کے تعلیمی و سیاسی کاموں میں حصہ لیتے رہے۔ انہی کی کوشش سے مسلم لیگ کی بنیاد پڑی۔ نواب محسن الملک
کی وفات پر علی گڑھ کالج کے سیکرٹری بن گئے۔ انہی کے عہد میں مسلم یونیورسٹی کی تجویز پیش کی گئی۔ ۱۹۱۲ء میں ضعف
اور علالت کے باعث استعفا دے دیا لیکن قوم کے سیاسی مقاصد سے دلچسپی آخری دم تک جاری رہی۔ ۲۷ اور ۲۸ جنوری ۱۹۱۷ء
کی درمیانی شب میں پونے دس بجے وفات پائی اور امروہہ میں دفن ہوئے۔

یہ حالات زندگی کا سرسری مرقع ہے۔ میرا مقصد یہ نہیں کہ ان کے حالات تفصیلاً لکھوں بلکہ ان اولوالعزمانہ اخلاق کی چند جھلکیاں
دکھانا چاہتا ہوں جو وقار الملک کی عظمت کا سرچشمہ تھے اور جن کی بنا پر حق شناسوں کے نزدیک ان کا ماتم قوم کا ماتم قرار پایا۔

وقار الملک نے [illegible] میں ۳۰ روپے ماہانہ کی عدالت سے مستقل زندگی کا آغاز کیا تھا۔ اس وقت کسی کو کیا معلوم تھا کہ اس نوجوان کو خدا نے کیسی نادر صلاحیتیں ودیعت کی ہیں۔ سرسید علی گڑھ میں صدر الصدور کے عہدے پر مامور تھے، جب وقار الملک کو سررشتہ دار کی حیثیت میں ان کے ماتحت کام کرنا پڑا۔ سرسید علی گڑھ سے تبدیل ہو کر بنارس گئے تو وقار الملک کی سروس بک میں انہوں نے جو جملے لکھے وہ اس عظیم انسان کے گوناگوں اوصاف کا پہلا اعتراف تھا۔ فرماتے ہیں:

> منشی مشتاق حسین سررشتہ دار عدالت ہذا نہایت لائق، نہایت محنتی، نہایت کارگزار، نہایت فہیم اور نہایت عمدہ نویس و خوش خط افسر ہے۔ اس افسر کی دیانت داری پر مجھ کو ایسا یقین ہے جیسا کہ اپنی موت پر۔ ... جس عہدے پر یہ شخص نوکر ہے، اس سے بہت زیادہ بڑے عہدے کی نہایت عمدہ لیاقت اس میں موجود ہے۔

واضح رہے کہ سرسید صدر درجہ متوازن رائے کے آدمی تھے اور ان کی طبیعت میں احتیاط بہت تھی، تاہم وہ وقار الملک کے بلند اوصاف سے اس قدر متاثر ہوئے کہ کوئی بھی وصف "نہایت" کی صفت کے بغیر بیان نہ کیا، حالانکہ اس وقت تک وقار الملک معمولی سررشتہ دار تھے اور سررشتہ داری کے محدود دائرے میں ان کی تمام قابلیتیں ٹھیک ٹھیک بروئے کار نہ آ سکتی تھیں۔

علی گڑھ کے جج بیلے صاحب بھی وقار الملک کی دیانت و محنت کے بہت معترف تھے۔ وہ تبدیل ہوئے تو ان کی جگہ مسٹر مارٹن جج مقرر ہو کر آئے۔ انہوں نے طے کر لیا کہ وہ مسٹر بیلے کی رائے سے اختلاف کریں گے یہاں تک کہ ہر اس شخص کو برا سمجھیں گے جو مسٹر بیلے کی نظروں میں اچھا تھا۔ چونکہ بیلے کی نظروں میں وقار الملک معزز تھے لہذا مارٹن صاحب نے موصوف کی سروس بک میں بے وجہ خراب ریمارک درج کر دیئے۔ وقار الملک کو اپنی راستی کا یقین تھا لہذا مارٹن صاحب سے کہا کہ یا تو ریمارک واپس لے لیجئے یا اس کی وجہ بتائیے۔ مارٹن صاحب نے کوئی توجہ نہ کی تو وقار الملک نے باقاعدہ درخواست پیش کر دی، جس میں لکھا:

۱۔ عدالت کے تمام وکلاء، پورے عملہ اور حاضرین سے میرا حال دریافت کیا جائے۔

۲۔ میں نے اب تک جو کام کیا ہے، اس کا جائزہ لیا جائے۔

۳۔ میری تحریر کردہ کیفیتوں سے جن لوگوں کو نقصان پہنچا ہے انہیں بلا کر میرے چال چلن کی صفائی کی تصدیق کر لی جائے۔ یہ طریقہ اگرچہ میرے لئے خطرناک ہے، لیکن تحقیقات کی غرض سے میں اس پر بھی راضی ہوں۔

مارٹن صاحب اس پر بھی رضامند نہ ہوئے تو وقار الملک نے کلکٹر کے سامنے درخواست پیش کر دی اور اس میں لکھا: تحقیقات سے جج کا اعتراض خود ظاہر کرتا ہے کہ ریمارک صحیح نہیں، تاہم آپ بھی میرے پیش کردہ ذریعوں کے مطابق پوری چھان بین کرائیں۔ ہر طرح اطمینان ہو جائے تو یہ ریمارک میری سروس بک سے قلمزد کر دیا جائے۔

مشہور مثل ہے: آں را کہ حساب پاک است، از محاسبہ چہ باک۔ وقار الملک اپنی زندگی کے ابتدائی دور ہی میں اس کا عملی نمونہ بنے ہوئے تھے۔ ان کا عہدہ جج کے مقابلے میں بہت چھوٹا تھا، تاہم سچی بات میں جج کا مقابلہ کرتے وقت ایک لمحے کے لئے بھی تامل نہ کیا اور یہ اس زمانے کی بات ہے جب انگریزوں کے سامنے کسی کو ایک لفظ بھی زبان پر لانے کا حوصلہ نہ تھا۔

[illegible] میں وہ مسٹر کالون کلکٹر کے ماتحت کام کر رہے تھے۔ جب نماز کا وقت آتا، مقررہ معمول کے مطابق دفتر سے اٹھ کر مسجد میں چلے جاتے۔ کالون صاحب کو ان کا یہ طریقہ پسند نہ آیا۔ اس نے منع کیا تو انہوں نے کہا کہ نماز مذہباً مجھ پر فرض ہے، میں اسے چھوڑ نہیں سکتا۔ البتہ اس کی وجہ سے کام میں کوئی خلل پیدا ہو تو آپ مجھ سے جواب طلب کر سکتے ہیں۔ کالون کام سے قطع نظر کرتے ہوئے صرف نماز کا مخالف

تھا۔ جب وقار الملک نے درخواست دی کہ انہیں اسے فن کے متعلق کی غیر معمولی محنت کیوں جائے۔ یا غیر معمولی کے وقت
کی تنخواہ کاٹ لی جائے یا ان کو بے تنخواہ رخصت مل جائے۔ اگر ان میں سے کوئی صورت منظور نہ ہو تو ان کی معافی کی درخواست کو منظور کیا جائے
بیس پچیس سال کی ملازمت سے دست بردار ہونے کو بے تکلف تیار ہو گئے لیکن نماز میں تاخیر گوارا نہ کی۔

سر سید کو یہ حالات معلوم ہوئے تو وقار الملک کو لکھا:

> نماز پڑھنا کا فرض ہے۔ اس کو ہم اپنی شامت اعمال سے جس طرح سے ہو ادا کریں یا قضا کریں لیکن کوئی شخص اگر کہے کہ تم نماز نہ پڑھو، اس کا ہم ایک حرف بھی نہیں سن سکتے۔ یہ بات ہرگز نہیں ہو سکتی۔ میری سمجھ میں نماز نہ پڑھنا ایسا گناہ ہے جس کے بخشے جانے کی توقع ہے مگر کسی شخص کے منع کرنے سے نہ پڑھنا ایسی گستاخی ہے جو میری سمجھ میں کفر ہے، جو کبھی بخشا نہ جائے گا۔ تم نے پہلے ہی اپنی طرف سے ایسا ذکر کیا۔ مجھ کو امید ہے کہ تم کو اس قسم کی بحث نہ کرنی اور جب ایک طریقہ اختیار نہیں کیا تو یہ بہتر تھا کہ اول مرتبہ حضور نظام سے ہی وہ خواہش میں کہتا واجبات تھا۔ شاق ہوتی، استعفا دینا تھا اور صاف کہہ دینا تھا کہ میں اپنے عظیم الشان قادر مطلق کے حکم کی ملامت کروں گا۔ ذرا آپ کی ... اور کسی مصیبت نہ آتی۔ نہایت اچھا ہوگا۔

چھ مہینے کی رخصت ہو گئے۔ اسی زمانے میں سر سید نے سر سالار جنگ وزیر اعظم حیدرآباد کو لکھا اور وقار الملک کے لئے حیدرآباد میں پانچ سو روپیہ ماہانہ کی ملازمت کا انتظام ہو گیا۔ لطف یہ ہے جس انگریز افسر نے نماز پر جھگڑا کر کے رخصت اور استعفے تک نوبت پہنچائی تھی اس نے آپ کی کارگزاری کے متعلق نہایت عمدہ رائے دی اور اس میں اقرار کیا کہ وہ پابندی سے نماز پڑھتے تھے جس سے مجھے تکلیف ہوتی تھی۔ وہ اپنے علاقے چھوڑنے پر راضی نہ ہوئے، میں اس صورت کو قبول نہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ انہیں دوسری جگہ ملازمت مل گئی۔

حیدرآباد میں وہ بہت جلد ترقی کر کے محکمۂ عدالت و کوتوالی کے معتمد بن گئے اور ایک ہزار روپیہ ماہانہ تنخواہ مقرر ہو گئی۔ عدالت و کوتوالی کے صدر المہام یعنی وزیر متعلقہ نواب بشیر الدولہ تھے، جنہیں بعد میں آسمان جاہ کا خطاب ملا اور وہ مدار المہام بن گئے تھے۔ وقار الملک نے بہت جلد ان کا خاص اعتماد حاصل کر لیا۔ اس زمانے میں میر محبوب علی خاں نظام حیدرآباد کمسن تھے اور انتظام ریاست کے لئے کونسل آف ریجنسی بنی ہوئی تھی جس کے صدر امیر کبیر نواب شمس الامرا تھے۔ وہ نظام کے قریبی رشتہ دار ہوتے تھے۔ بشیر الدولہ ان کے بھتیجے تھے۔ شمس الامرا کو ایک طرف سر سالار جنگ وزیر اعظم سے کاوش تھی، دوسری طرف بھتیجے سے مقدمہ بازی کا سلسلہ جاری تھا، اور وہ ہر اس شخص کے مخالف تھے جو بشیر الدولہ اور سالار جنگ کے نزدیک معتمد علیہ تھا۔ اسی وجہ سے وقار الملک ان کے عتاب کا ہدف بن گئے۔ ایک موقع پر وقار الملک رخصت لے کر وطن جاتے ہوئے گرا دیا اور وہاں کے انگریز ریزیڈنٹ کو بشیر الدولہ کا ایک ذاتی پیغام پہنچا دیا۔ اسی بنا پر شمس الامرا کو ناراضگی کے اظہار کا بہانہ مل گیا اور سالار جنگ کو ریاست کے عمومی مصالح کی بنا پر یہی مناسب معلوم ہوا کہ وقار الملک کو ملازمت سے برخاست کریں۔

وقار الملک کے لئے یہ واقعہ سراسر تعجب انگیز تھا لیکن کچھ مدت بعد ایک دوست کے ذریعے سے سالار جنگ کی مجبوریوں کا علم ہوا تو بے تکلف لکھ دیا کہ میں اپنے فائدے کے لئے شمس الامرا اور سالار جنگ کے درمیان کسی کشمکش کا معاون نہیں ہو سکتا۔ مجھے اپنی برطرفی بہ دل و جان منظور ہے۔

نواب بشیر الدولہ کو جب یہ علم ہوا کہ وقار الملک صرف ان کے ایک ذاتی کام کی وجہ سے عتاب میں آئے اور ملازمت گنوائی تو فوراً منظم

جیسا کہ میں اتنی ہی تنخواہ پر اپنی جاگیر میں ملازم رکھتا ہوں۔ وقار الملک نے لکھ دیا کہ مجھے یہ منظور نہیں۔ اگر سالار جنگ کے ہاں کوئی ملازمت کرتا تو میں یہ پیشکش قبول کر سکتا تھا۔ جب انہی کی وجہ سے مجھے نوکری ملی اور انہی نے مروت کیا تو میری غیرت اس امر کی متحمل نہیں کہ میں حیدرآباد میں دوسری جگہ تعلق قبول کر لوں۔

وقار الملک ملازمت پر آمادہ نہ ہوئے تو نواب بشیر الدولہ نے لکھ بھیجا کہ آپ گھر میں بیٹھے رہیں، ایک پانچ سو روپیہ ماہانہ وہاں بھیجا جائے گا۔ وقار الملک نے یہ پیشکش بھی قبول نہ کی اور لکھ دیا کہ میں نے نواب ممدوح کی کوئی ایسی بڑی خدمت انجام نہیں دی، جس کے معاوضے میں ان کا اس قدر نقصان جائز سمجھوں۔ نواب بشیر الدولہ نے وقار الملک کی صاحبزادی کے نکاح کی تقریب پر چار ہزار روپے کی رقم نیوتے کے طور پر بھیج دی۔ وقار الملک نے ایک عزیز دوست کی وساطت سے عرضی بھیجی کہ سالار جنگ سے استصواب کیے بغیر یہ رقم قبول نہیں کر سکتا۔ وہاں سے جواب آیا کہ روپیہ واپس کر دو۔ چنانچہ وقار الملک نے بے تامل واپس کر دیا۔ اس عزیمت عمل پر سالار جنگ نے لکھا: مولوی مشتاق حسین سے بڑھ کر کیا وہ کسی دوسرے سے نہ ہو سکتا تھا۔ امید ہے کہ ایک دن وہ اپنے حسن عمل نیک کا صلہ حاصل کریں گے۔

ان واقعات کے بعد سالار جنگ نے خود لکھا: میں چار سو روپے ماہوار آپ کو بھیجتا رہوں گا، آپ خاطر جمع رکھیں۔ حالات بدل جائیں گے تو آپ کو نعم البدل حاصل ہو گا اور اس امداد کو بہ صیغۂ راز رکھیں۔

وقار الملک کو سالار جنگ کا یہ خط ملا تو چار سو روپے کی پیشکش کے سلسلے میں دو باتیں عرض کیں: اول یہ کہ روپے کی مقدار کم کر دی جائے اس لئے کہ میں کفایت سے گزارہ کر سکتا ہوں۔ دوسرے اسے قرض سمجھا جائے۔ زمانہ میری مساعدت کرے گا تو یہ قرض ادا کر دوں گا۔

سالار جنگ نے چند ہی روز میں سررشتۂ مال کا دستور العمل وقار الملک کے پاس اصلاح و نظر ثانی کے لئے بھیج دیا۔ اس طرح ذاتی امداد سرکاری کارگزاری کی شکل اختیار کر گئی۔ اس وقت وقار الملک نے چار سو روپے ماہانہ کی رقم بہ اطمینانِ خاطر قبول کی۔

وقار الملک اخلاقی جرأت میں ضرب المثل تھے۔ جس زمانے میں سالار جنگ اعظم دولتِ آصفیہ کے مختار کل تھے۔ نواب بشیر الدولہ عدالت اور کوتوالی دونوں کے صدر المہام یا وزیر تھے اور وقار الملک ان کے ماتحت معتمدی (سکرٹری شپ) کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ سالار جنگ نے ایک معاملے کے متعلق وقار الملک کے سامنے اپنی رائے ظاہر کی اور فرمایا کہ اسی رائے کو اپنی رائے کے طور پر نواب بشیر الدولہ کے روبرو پیش کر دیں۔ وقار الملک اگرچہ سالار جنگ کے آوردہ تھے۔ اپنی ملازمت اور ترقی کو انہی کا احسان سمجھتے تھے، لیکن صاف کہہ دیا کہ میری رائے یہ نہیں۔ سالار جنگ کو یہ امر طبعاً ناگوار گزرا۔ وقار الملک گھر واپس آئے تو فوراً ملازمت سے استعفا پیش کر دیا اور حیدرآباد سے روانگی کے لئے تیار ہو گئے۔ سالار جنگ نے انہیں بلا کر اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور کہا کہ واقعی اپنی رائے آپ پر ٹھونسنے کا مجھ کو کوئی حق نہ تھا۔

سالار جنگ وفات پا چکے تھے اور بشیر الدولہ سر آسمان جاہ کی مدار المہامی کا زمانہ تھا۔ وقار الملک وقتاً فوقتاً ان سے صاف صاف کہتے رہتے تھے کہ میں کسی خدمت میں حتی الامکان کوتاہی نہ کروں گا، لیکن مجھے ریاست میں ملازمت نواب سالار جنگ کی وجہ سے ملی اور میری عقیدت کا پہلا مرجع انہی کا خاندان ہے۔

سر آسمان جاہ بہت نیک دل، نیک مزاج اور شریف انسان تھے۔ بعض اوقات لوگ تملق و خوشامد سے کام لے کر ان سے ایسے احکام جاری کرا لیتے جو انتظامی نقطۂ نگاہ سے مناسب نہ تھے۔ وقار الملک نے ایک عرضداشت ان کی خدمت میں پیش کی۔ اس میں صاف صاف لکھ دیا:

> جن کو چور اور دشمن سمجھتے ہیں، ان کو بھی خدمتوں پر لگایا جاتا ہے۔ یہ اعلیٰ درجے کی کریم النفسی تو ہے یا یہ کہ ان کی خوشامد کا خیال کیا جاتا ہے یا طبیعت کی کمزوری ہے، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اول قوت و انتظام ضعیف ہوتا ہے، دوم انٹریگ (سازباز) بڑھتی ہے، سوم دوسرے عہدہ داروں پر برا اثر پڑتا ہے۔ یہ

خلاف ِ حکومت ہے اور انصاف کے خلاف ہے۔

وقار الملک سرسید کے بہت معتقد تھے اور ان کی بڑی عزت کرتے تھے، تاہم بعض معاملات میں انہوں نے سرسید کی رائے سے بے تکلف اختلاف کیا، یہاں تک کہ ایک معاملے میں سرسید نے ان کے اختلاف پر ناراض ہو کر لکھ دیا:

مجھ کو یقین تھا کہ آپ میرے اُن ابنائے جنس میں سے ہیں جو منحرف ہونے والے نہیں، جیسا کہ مجھے خود آپ کی نسبت کوئی توقع برخلاف اس کے کرنے کی، آپ میری طاقت تھی۔

کالج کے انتظامات سنبھالنے کے بعد وقار الملک نے ایک بہت بڑا اندرونی [illegible] جس کی طرف عام طور سے توجہ نہیں [illegible]۔ سرسید کے زمانے میں حالات مختلف تھے اور وہ کالج کی ترقی کے پیش نظر [illegible] انگریزی سٹاف کی رعایت بہت ملحوظ رکھتے تھے۔ محسن الملک کے زمانے میں انگریزی سٹاف مختار مطلق بن گیا اور انتظامی معاملات میں کالج زیادہ تر ان کے رحم و کرم پر رہ گیا۔ وقار الملک نے چاہا کہ پرنسپل کی حیثیت بحال کرنے کی کوشش کی جائے [illegible] انگریزی سٹاف سے جا رہے سلسلوں کی مخالفت مصروف [illegible] ہو گئی۔ پرنسپل کے کردار نے انگریزی سٹاف کی تائید کی اور [illegible] کے صورت حال پیدا ہو گئی۔ وقار الملک نے ٹرسٹیوں کو ہم راستے بتا کر فیصلہ دیا کہ جب تک انگریز پرنسپل اور انگریزی سٹاف انتظامی معاملات میں ٹرسٹیوں کی مختاری تسلیم نہ کرے گا اور ملازم کی حیثیت میں نہ رہے گا، وہ اطمینان سے نہ بیٹھیں گے۔ چنانچہ انہوں نے بڑی دانش مندی، تدبر، صبر اور استقامت سے اس معاملے میں کوششیں شروع کر دیں۔ یہاں تک کہ گورنر نے اپنی رائے بدل لی اور سٹاف وقار الملک کی رائے کے مطابق کام جاری رکھنے پر آمادہ ہو گیا۔ کالج کو انگریزی اثرات سے محفوظ کرنے کی یہ پہلی بہت اہم کامیاب کوشش تھی۔

وقار الملک کی سیکرٹری شپ کے زمانے میں کالج کی مذہبی فضا بہت خوشگوار ہو گئی۔ انہوں نے ایک موقع پر طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے کہا نماز کی خوبی یا اس کا وجوب یا اس سے اخلاق و اصلاح کا بیان مقصد نہیں۔ کہا:

"آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس امر کی ذمہ داری کس قدر میری اپنی ذمہ داریوں میں سے سخت [illegible] ہے۔ آپ یہاں کس غرض سے آتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ تعلیم، اخلاق کی اصلاح اور تہذیب حاصل کرنے کے لئے۔ میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آپ کی توجہ ضروری باتوں کی طرف مائل کروں۔ آپ جانتے ہیں کہ زمانہ تغیر پذیر ہے۔ پرانوں کی جگہ نئے آتے ہیں۔ قوم کا بڑے بڑے ستون رخصت ہوتے جاتے ہیں۔ اب یہ بار آپ کو اپنے کندھوں پر اٹھانا پڑے گا۔ یہ زمانہ آپ کی تحصیل کا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے کہ آپ اس آئندہ وقت کے لئے تیار ہوں۔ کوشش کیجئے اور سخت کوشش کہ آپ مسلمانوں کے لئے اچھے نمونہ ثابت ہوں۔ وہ روش اختیار کیجئے اور ایسے پاک و صاف مذہبی طریقے پر چلئے کہ اسلام آپ پر بھروسا کرے۔ حقیقت میں آپ کسی طرح قوم کے لیڈر نہیں ہو سکتے اگر آپ اسلامی شعائر کے پابند نہیں۔"

وقار الملک سے پیشتر نماز میں غیر حاضری پر جرمانے کا قاعدہ جاری تھا۔ موصوف نے نماز کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے یہ قاعدہ منسوخ کیا اور طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

اس طرح نماز کا استہزا ہوتا ہے، مگر یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ غیر حاضری مسجد کے لئے اب کوئی سزا نہیں۔ سزا ہے اور وہ یہ ہے کہ جو صاحب حاضر مسجد نہ ہوں گے اور نماز کی پابندی نہ کریں گے، ان کو کالج سے علیحدہ ہو جانا پڑے گا۔ میں یہ کسی طرح جائز نہیں رکھتا کہ ایک مچھلی سارے تالاب کو گندہ کر دے۔

وقار الملک اپنے ماتحت ملازمین کا خاص خیال رکھتے تھے۔ کوئی فوت ہو جاتا تو اس کے متعلق پوری معلومات بہم پہنچاتے۔ ماہوار رقم جاری رکھنے کا بندوبست کرتے۔ اس کے لڑکوں کے لئے وسائل معاش کا خیال رکھتے۔ غیر شادی شدہ لڑکیوں کی شادی کا انتظام کرا دیتے۔ بیواؤں کے وظائف مقرر کراتے۔

جب وہ ورنگل کے صوبہ دار تھے: ایک موقع پر دورہ کرتے ہوئے ایک گاؤں سے گزرے، جہاں ہیضہ پھیلا ہوا تھا۔ انہوں نے گاؤں کے قریب پہنچتے ہی سواری روک لی اور اپنے تمام ساتھیوں کو اجازت دے دی کہ جس کا جی چاہے آگے چلا جائے۔ خود ڈاکٹر کو لے کر کوئی سات بجے گاؤں میں داخل ہوئے۔ تمام مریضوں کی دیکھ بھال کی۔ اُن کی تیمارداری اور علاج کا انتظام کرایا۔ ساڑھے تین بجے فارغ ہو کر جائے قیام پر پہنچے۔

ایک دورے میں ایک اہلکار جو ساتھ تھا کسی مقام پر بے پتا ہو گیا۔ وقار الملک نے منزل پر پہنچ کر پولیس اور سواروں کو چاروں طرف روانہ کر دیا۔ شام کے چار بجے تک اس کا پتا نہ مل سکا۔ وقار الملک نے اس وقت تک کھانا نہ کھایا۔

جب وہ حیدرآباد میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے تو عوام اور اکابر سے ملاقات کے لئے الگ الگ جگہیں مقرر کر رکھی تھیں۔ جہاں عوام سے ملاقات کرتے تھے، وہ جگہ کوٹھی کے صحن میں پھاٹک کے قریب تھی۔ ایک شامیانہ نصب کرا لیا تھا اور نشست گاہیں خاصی پُر تکلف تھیں۔ جہاں اکابر سے ملاقات کرتے تھے، وہاں لکڑی کی معمولی کرسیاں پڑی رہتی تھیں۔ نماز سے فارغ ہوتے ہی عوام سے ملاقات کی جگہ پہنچ جاتے اور سب سے گھل مل جاتے۔ ہر ایک کی بات توجہ سے سنتے۔ اس اثناء میں کوئی بڑا عہدہ دار آ جاتا، تو فرماتے کہ ملاقات کی جگہ چل بیٹھئے۔ عوام سے فارغ ہو کر بڑے لوگوں سے ملتے۔

وقار الملک کو اگرچہ بڑے عہدوں پر رہنے کا موقع ملا اور وہ خاصی بڑی تنخواہ پاتے تھے لیکن ان کی آمدنی کا بڑا حصہ عزیزوں اور غریبوں کی امداد یا قومی کاموں میں صرف ہوتا۔ خود عموماً تنگ دست رہتے اور سادگی سے گزارہ کرتے۔

وہ وقتاً فوقتاً اعلیٰ حضرت نظام کی پیشی میں جایا کرتے تھے۔ ایک موقع پر اعلیٰ حضرت نے ان کا چشمہ دیکھا تو فرمایا: مولوی صاحب! چشمے کا فریم تو بہت خراب ہے۔ وقار الملک نے عرض کیا:

پیر و مرشد! اگر اتفاق سے یہ چشمہ کہیں رہ جائے تو لوگ اسے لا کر دے دیں گے کیونکہ اس کی قیمت صرف چھ آنے ہے اور یہ مشتاق حسین کی آنکھیں ہیں۔

اعلیٰ حضرت نے نہایت قیمتی اور اعلیٰ درجے کا فریم بنوا کر وقار الملک کو مرحمت فرمایا۔ اسے انہوں نے کبھی استعمال نہ کیا اور ایک عزیز یادگار کے طور پر اپنے پاس رکھا۔

مستند بیان ہے کہ محسن الملک نے حیدرآباد میں اپنے لئے کوٹھی بنوائی تو اس کا فرنیچر ولایت سے تیار ہو کر آیا جس پر ستر ہزار روپے خرچ ہوئے۔ وقار الملک کو اپنا مکان بنوانے کی بھی استطاعت نہ ہوئی۔ سر آسمان جاہ کی تحریک پر اعلیٰ حضرت نے انہیں ایک کوٹھی عنایت فرما دی۔ جب وہ سر آسمان جاہ کے ساتھ علی گڑھ آئے تھے تو اُن کی پتلون میں پیوند لگے ہوئے تھے۔

اُن کی طبیعت میں انکسار بہت تھا۔ اس سلسلے میں میں صرف ایک واقعہ پیش کروں گا۔ حیدرآباد میں کسی مسجد کے ایک نابینا کا کھانا ان کے ہاں سے مقرر تھا۔ ایک مرتبہ شدت سے بارش ہوئی۔ ملازم رات کا کھانا نابینا کو پہنچا نہ سکا۔ وقار الملک کو بڑی دیر میں معلوم ہوا تو خود اٹھے اور پیدل کھانا نابینا کے پاس لے کر گئے۔ وہ بھوکا بیٹھا تھا۔ بہت بڑبڑایا اور خفا ہوا کہ آدھی رات کو روٹی لے کر آئے ہو۔ جا ہم نہیں کھاتے۔ وقار الملک نے بڑی خوشامد اور منت سماجت سے اسے راضی کیا اور کھانا کھلا کر واپس آئے۔ تاہم اس پر قطعاً ظاہر نہ ہونے دیا کہ خود کھانا لے کر آئے تھے۔

دوسروں کو مصیبت میں دیکھ کر بے اختیار اشکبار ہو جاتے۔ ایک مرتبہ علالت کے باعث پہاڑ پر چلے گئے۔ وہاں سنا کہ ان کے صوبے میں بارش نہ ہونے کے باعث عوام کی حالت بہت خراب ہو گئی ہے اور غریبوں کے فاقے ہو رہے ہیں۔ فوراً پہاڑ سے واپس آ گئے۔ جب کہ نماز کے بعد

[illegible] بھی [illegible] جیسے [illegible] دیکھی [illegible] تھے۔ یہ وسیلہ خاص سے بڑی ہوئی تھی۔ [illegible]
[illegible] گئے ہی [illegible] سے [illegible]۔ اس قسم کی [illegible] پڑا اور مقام [illegible] کے پہونچے۔

[illegible] کے انتقال، اسلام کی صورت چند جملوں میں جو سرسید [illegible] پیش کردی گئی ہے۔ انہیں سامنے رکھ کر خود دیکھئے کہ
[illegible] اور [illegible] کی حیثیت کے [illegible] تھے۔ ان کے انتقال کا [illegible] پر بحث کرنے کے لئے ایک مستقل مقالہ چاہیے شائبہ [illegible] بلکہ یہ کہا
ہے کہ [illegible] جس نظام حکومت پر پہنچتی ہیں، اس کی تربیت [illegible] میں سب سے [illegible] ملک [illegible] تھا۔ انہوں نے
حکومت کی [illegible] سے [illegible] حقوق [illegible] کی [illegible] کی راہ [illegible] سے [illegible] پیش کیا۔ جس کی مثالیں
کسی بھی ملک میں بہت ہی کم ملیں گی۔ سرسید کے [illegible] میں ایسے جامع [illegible] کا [illegible] دوسرا کوئی نہ تھا۔

نواب عماد الملک (مولوی سید حسین بلگرامی)

ڈاکٹر عبدالحق

اٹھارھویں صدی میں ہندوستان کو ایک نئی قوم اور ایک نئی تہذیب سے سابقہ پڑا۔ یوں تو یورپ سے سب سے پہلے پرتگالی آئے، اس کے بعد ولندیزی اور فرانسیسی۔ لیکن ان کا کوئی زیادہ اثر ملک پر نہیں ہوا۔ پرتگالی ہندوستان میں دو مقصد سے آئے تھے۔ مسالوں کی تجارت سے روپیہ کمانے اور عیسائی مذہب پھیلانے۔ ان دونوں مقصدوں کے حصول میں انھوں نے بڑے ظلم و جبر اور سفاکی سے کام لیا۔ ان کی یادگار اب ان کے کچھ لفظ اور کچھ دیسی عیسائی اور کچھ دوغلے مرد و زن باقی رہ گئے ہیں۔ ولندیزوں اور فرانسیسیوں کا کوئی قابل ذکر نشان باقی نہیں رہا۔ البتہ انگریزوں کے قدم یہاں ایسے جمے کہ وہ اکاس بیل کی طرح سارے ملک پر چھا گئے۔

اس سے قبل جتنے فاتح ہندوستان میں آئے وہ شمال مغرب کی طرف سے داخل ہوئے۔ مگر یورپی قومیں سمندر کے راستے تجارت کے بھیس میں آئیں اور تجارت کی کوٹھیاں بناتے بناتے قلعے بنانے اور لشکر جمع کرنے لگیں۔ اورنگ زیب عالمگیر کے بعد سلطنت دہلی میں انحطاط شروع ہو گیا تھا۔ رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ بادشاہ صرف نام کا بادشاہ رہ گئے۔ صوبے خود مختار ہو گئے۔ کبھی آپس میں لڑ مرتے، کبھی غیروں کی مدد سے ایک دوسرے پر حملہ کرتے، کبھی مل کر غیروں سے جا بھڑتے اور کبھی غداری کر کے خود اپنی جڑ کاٹنے پر آمادہ ہو جاتے۔ انگریز ان حالات کا ایک شاطر کی طرح مطالعہ کرتا رہا اور کبھی موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ کبھی ایک کے ساتھ ہو گیا اور دوسرے کو شکست دی اور اس کمک کے معاوضے میں مصارف کے نام سے گراں قدر علاقہ لے لیا اور کچھ حصہ ملک کا بھی ہتیا لیا۔ کبھی کسی کو بڑھتا ہوا دیکھ کر چھیڑ خانی شروع کر دی اور اس کے حریفوں سے مل کر اس کے خلاف چڑھائی کر دی اور بندر بانٹ کے قدیم اصول پر اچھا حصہ اپنے لیے رکھ لیا اور سد راہ کے طور پر ایک ایک ٹکڑا ساتھیوں کے سامنے ڈال دیا۔ کبھی بادشاہ سے فرمان حاصل کر کے مقبوضہ علاقے کے قبضے کو جائز قرار دے لیا۔ ہمارے اسلاف ان فرنگیوں کو کبھی خاطر میں نہ لائے۔ ان کا لباس، کھانا پینا، رہنا سہنا، عادات و اطوار، ان کی زبان، غرض ان کی ہر بات ان کی نظروں میں نامانوس اور ناشائستہ تھی۔ ہمارے ایک لغت نویس نے فرنگی کی عجیب و غریب تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

"یکے از جانوران دریائی کہ گاہ گاہ بہ ساحل نمودار می شود"

اس میں "گاہ گاہ بہ ساحل نمودار می شود" کا کلمہ خاص طور پر قابل غور ہے۔ ہمارے بزرگ زیادہ سے زیادہ ان کی تعریف یہ کرتے تھے کہ کار گیا چھچھا بندوق،

تب گوری و شرف خوب بنا جانتے ہیں۔ صاحب علم ہیں۔ ساری سیدوں سے خوش نہ تھے۔ سپاہ منتشر ہوا نہیں کرتے تھے۔ اس کے علاوہ

ایسا ہوا کہ یہ جانتا تھا اس کے سلطنت ہو نہ سکے [illegible] ہوا تھا۔ ان کے سیدوں سے بد گمان تھے [illegible]۔ اصل سے تبادلہ میں

غضب ہے صاحب وہ انصاف حاصل اور مکتب سے ایک قصہ تھا یا اور ساتھ کر سلاطین کی قدر سے بہ مقصد بنا لیا اس نے سیدوں کے دل

میں ان کی طرف سے نفرت پیدا کر دی۔ ان کے خلیفہ اول اور دوسرے [illegible] تھے۔ مسلمانوں کا اپنے معاملات تہذیب ہوا تھا

اور علم و فضل پر توجہ تھا۔ وہ اس طرف کے خان دریا کرتے تھے۔ انہوں نے [illegible] جنہوں نے ملک کی دیانت داری اور وجود

زوال سلطنت کے بعد مسلمانی اقتدار کو قائم رکھا اور انگریز سے سامنے نہیں جھکے۔ وہ [illegible] ہیں۔

چراغ کا ایک خاص ہوا ہے۔ اس تقاضے کو کہنا ہے کہ [illegible] ہیں بلکہ اس کا وہ حیات میں سمجھتے تھے

اور کامیاب ہونے کے لئے ضروری ہے۔ [illegible] وہ ملک [illegible] پر چھٹے سید ونشاں میں سیدوں سے

یہ پہلا موقع تھا۔ [illegible] کا تحفہ ملتا [illegible] جنہوں نے اس کشش کے ساتھ

دو میں رہنے کے [illegible] اپنی حیثیت اور [illegible] ہیں ہی [illegible] ان میں ایک مرد

سید حسین بلگرامی کا خاندان تھا۔ [illegible] کا ذکر کیا انگریزی ملازمت کا تقرر حاصل کیا۔

بلگرام اودھ کا نہایت قدیم قصبہ ہے۔ اس خاک سے ایسے جلیل القدر عالم و فاضل اٹھے ہیں کہ ان کے نام ہمیشہ علم و فضل کی وجہ سے بھی

دنیا میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ سید حسین کے دادا سید کرم حسین [illegible] حاصل کیا [illegible] ۱۲۲۳ — ۱۲۹۵ھ

سرکار اودھ کی طرف سے سفیر ہو کر کلکتے گئے۔ [illegible] سید [illegible] حسین

حسین نے صاحبزادے بیشنگر کے بنارس کے مدرسہ عالیہ میں علوم مشرقیہ کی تکمیل کی اور [illegible] انگریزی کی تعلیم بھی۔ یہ

پہلے مسلمان شریف زادے تھے جو اس بدعت کے مرتکب ہوئے اور باقاعدہ انگریزی تعلیم حاصل کی۔

سید حسین کے چچا اعظم الدین حسین نے انگریزی حکومت میں بڑا اعزاز اور عہدہ حاصل کیا [illegible] پر مامور رہے۔ ابتدا میں

وارن ہیسٹنگز کے [illegible] اور ترجمان رہے۔ اس کے بعد وہ سندھ میں حکومت کی [illegible] سندھ کا [illegible]

سندھ تعینات ہوئے۔ یہ عہدہ انگریزوں کے لئے مخصوص تھا مگر یہاں سندھ اپنے ملک میں انگریز کا آنا پسند نہ کرتے تھے۔ سندھ میں سیدوں اور پیروں

کی بے حد تعظیم و تکریم کی جاتی ہے اس لئے وہاں کے لوگ ان کا بہت احترام کرتے۔ ہاتھ چومتے اور قدم چھوتے۔ نواب عماد الملک فرماتے تھے کہ وہ

کبھی کسی کے سامنے انگریزی کتاب نہ پڑھتے تاکہ لوگوں کو بدگمانی نہ ہو۔ اکثر سندھی ان کی خدمت میں تعویذ لینے کے لئے حاضر ہوتے تھے۔ ان کے سب

کبھی کوئی عربی شعر یاد آتا یا آیت قرآنی تو وہ کاغذ پر لکھ کر ایک ٹوکری میں ڈال دیا کرتے تھے۔ جب لوگ تعویذ مانگنے آتے تو اس ٹوکری میں سے نکال

نکال کر دے دیا کرتے۔ کچھ عرصے کے بعد کسی بد نفس نے یہ افواہ پھیلا دی کہ یہ شخص دراصل انگریز ہے مسلمان بنا ہوا ہے۔ آدمی نے گرے پڑے لوگ

یقین آ گیا اور شور و شر برپا ہو گئی۔ اس سے ان کی جان کا خطرہ ہو گیا اور وہ راتوں رات جہاز میں بیٹھ کر نکل بھاگے۔ اس کے بعد ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ

بہار میں پرگنہ کی خدمت پر مامور ہوئے۔ دربار لیجسلیٹو کونسل بنگال کے ممبر نامزد ہوئے۔ حکومت سے سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب عطا کیا۔

سید اعظم الدین حسین کے دوسرے بھائی سید زین الدین حسین نے محکمہ مال میں ملازمت اختیار کی۔ ۱۸۴۰ء میں ڈپٹی کلکٹر اور ڈپٹی مجسٹریٹ کے

عہدے پر فائز ہوئے۔ اس ملازمت کے دوران میں انہیں ایک مدت تک اضلاع بہار و بنگال میں رہنے کا اتفاق ہوا چنانچہ مولوی سید حسین کی ولادت

بھی ننھیال کے جنم بھومی ضلع گیا کے قصبہ صاحب گنج میں ہوئی۔ سید صاحب ۱۸۸۵ء میں پنشن لے کر ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔

مولوی سید حسین کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ ابھی چھ سات برس کے تھے کہ ان کو عربی شروع کرائی گئی۔ وہ کہتے تھے کہ میری تعلیم کی ابتدا عربی اور

[illegible] میں علم کی کر حساب اور اقلیدس بھی عربی میں پڑھی۔ چودہ پندرہ برس کی عمر میں وہ فارسی عربی کی تحصیل سے فارغ ہو کر بھاگلپور [illegible]
کے انگریزی مدارس میں تعلیم پاتے رہے ۱۸۶۱ء میں میٹرکولیشن کی سند حاصل کی، ۱۸۶۶ء میں [illegible] میں آنرز کے ساتھ بی۔ اے [illegible]
ان کے والد کی خواہش تھی کہ وہ سب سے پہلے کسی معقول سرکاری ملازمت میں منسلک ہو جائیں لیکن نوجوان سید نے [illegible] سے [illegible]
علمی ذوق کی بناء پر اس سر رشتے کو پسند نہ کیا جو عام سرکاری سر رشتوں میں کم حیثیت سمجھا جاتا ہے اور ایک صدی گزرنے پر بھی اب تک [illegible]
نے ڈپٹی کلکٹری پر معلمی کو ترجیح دی اور کیننگ کالج لکھنؤ میں عربی زبان کی پروفیسری قبول کر لی اور اس طرح انہیں لکھنؤ میں مستقل طور پر رہنے کا موقع مل گیا۔
اس دوران میں ان [illegible] تہذیب و آداب [illegible] کا اچھا موقع [illegible] کے علاوہ [illegible]
سے مستفید ہوئے۔ [illegible] لکھنؤ [illegible] تعلیم [illegible]
کے زمانے میں انہیں لکھنؤ [illegible] ان کا [illegible]
زمانے میں گورنمنٹ نے [illegible] اندیشہ تھا۔ اس لئے [illegible] کے تحت [illegible]
رجحہ سرکاری اخبار سمجھا جاتا تھا اس [illegible]
کی۔ [illegible] حکومت سے لئے [illegible] پروفیسر [illegible]
[illegible] کی طرف [illegible]
وہاں سے واپسی پر [illegible] کو [illegible]
کی جاتی تھی۔ [illegible] حیدر آباد [illegible] لکھنؤ میں
نواب [illegible]
کا تعارف بھی نواب صاحب سے کرا دیا اور [illegible] علمی و ادبی قابلیت [illegible]
اور ان اصلاحات کے پیش نظر جو وہ حیدر آباد کی ریاست میں کرنا چاہتے تھے [illegible]
چنانچہ سید حسین سے ملنے کے بعد [illegible] ریاست کی ملازمت [illegible] حیدر آباد [illegible]
رہ گئے۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ فطرتاً ان کے مزاج میں [illegible] دوسری وجہ [illegible] معلوم ہوتی ہے کہ لوگ ریاست کی نوکری [illegible]
کے مقابلہ میں کم [illegible] ناقابل اعتبار سمجھتے تھے۔ نواب سر سالار جنگ کی [illegible] اور جب وہ اس قسم کی [illegible]
کیونکہ انھوں نے اپنی ریاست کو منظم اور باضابطہ بنانے میں بڑی حکمت اور تدبر سے کام لیا تھا اور اس کام میں انہیں ایسی ایسی مشکلات سے مقابلہ کرنا پڑا ہوگا
اس وقت تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ خود نواب صاحب نے اصرار کر کے بلا بھیجا۔ اس کے بعد بھی پس و پیش کرتے رہے اور آخر ۱۸۷۳ء میں حیدر آباد
آئے اور آتے بھی تو تین مہینے کی رخصت لے کر۔ حیدر آباد پہنچے تو نواب سر سالار جنگ نے ان کے حال پر اس قدر شفقت اور حمایت فرمائی کہ وہ ہمیشہ کے لئے
یہیں کے ہو گئے۔

ابتداء میں نواب صاحب نے انہیں اپنا پرسنل اسسٹنٹ (مددگار خصوصی) بنایا۔ یہ خدمت بڑے اعتماد کی تھی۔ ریاستوں کے ساتھ برٹش گورنمنٹ کا یہ
معاہدہ تھا کہ وہ کسی انگریز کو بغیر اجازت گورنمنٹ آف انڈیا ملازم نہیں رکھ سکتے۔ اس وقت حیدر آباد میں انگریزی معتمد (سیکرٹری) ایک انگریز مسٹر [illegible] تھا
گورنر جنرل ڈلہوزی جو دیسی ریاستوں کا سخت مخالف تھا اور کئی ریاستوں کو ہڑپ کر چکا تھا۔ اس نے اس بنا پر کہ حیدر آباد کنٹجنٹ کے مصارف کی رقم [illegible]
سے ادا نہیں ہوئی تھی ریاست کے زرخیز علاقہ برار پر عارضی قبضہ کر لیا تھا۔ حضور نظام، ان کے امراء اور اہل حیدر آباد کو اس کا بہت صدمہ تھا اور یہ داغ ایسا
تھا جو دولت آصفیہ کے دل پر آخر دم تک ہرا رہا اور ہر چند اس داغ کے مٹانے کی کوشش کی گئی، [illegible] اور دوسرے [illegible] کا معاملہ تھا [illegible]

[illegible]

کرنل مارشل [illegible] کے بعد [illegible] میں [illegible] صاحب [illegible]

[illegible]

> نواب عماد الملک بہادر [illegible]
> [illegible]
> [illegible]
> [illegible]

[illegible]

[illegible]

چند سال کے بعد ۱۹۰۲ء میں دوسرے مناصب سے کنارہ کش ہو کر وہ صرف [illegible] پر متمکن ہوئے اور آخر تک اسی عہدہ پر فائز رہے۔ ہر چند بعض اوقات اس سے بڑے مناصب پر سرفراز کئے گئے لیکن انہوں نے نظامت تعلیمات کو کبھی نہ چھوڑا اور ہر حال میں اپنے ساتھ لگائے رکھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انہیں بالطبع تعلیم اور علم و ادب سے خاص لگاؤ تھا۔ دوسرے وہ یہ سمجھتے تھے کہ [illegible] پر [illegible] نظر پڑتی ہے اور [illegible] کے سفارشوں اور سازشوں کی مدد سے ان کے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں [illegible] کوئی نہیں دیکھتا۔ نظامت تعلیمات ایک معمولی عہدہ ہے، تنخواہ بھی زیادہ نہیں [illegible] بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے اور دوسرے [illegible] فوائد سے بھی محروم ہے۔ باوجود اس کے نواب عماد الملک کا وقار اور علم و فضل اور اخلاقی سیرت کچھ ایسا تھا کہ ان کے ماتحت افسر اور بڑے بڑے امراء و وزراء ان کا احترام کرتے تھے۔ وہ تقریباً ۲۳ سال تک دوسری خدمات کے ساتھ بلا وقفہ اس عہدے پر رہے۔ ریاست حیدرآباد میں باقاعدہ

تعلیم کا جو خاکہ آپ پہلے سے رکھتے تھے اور سررشتۂ تعلیم کی جدید تنظیم آپ ہی کے ہاتھوں ہوئی۔ مدارس اور طلبہ میں بہت کافی اضافہ ہوا۔ علاوہ اس کے فنی تعلیم کے مدرسے کھلے اور محبت سے حیدرآباد میں علمی ذوق کو بہت فروغ ہوا۔ صنعت و حرفت کے مدارس بھی ریاست میں آپ ہی نے قائم کئے۔ دیسی صنعت کی سرپرستی کی۔

حیدرآباد میں ان کے علمی ذوق کی دو بڑی قابل یادگاریں ایسی ہیں جن کی افادیت اور اہمیت کبھی کم نہ ہوگی۔ ایک کتب خانہ سرکار عالی اور دوسرا دائرۃ المعارف۔ اس کتب خانے کے لئے مطبوعہ کتب کے علاوہ نادر و نایاب قلمی کتابیں اس قدر جمع کیں کہ اس کا شمار ہندوستان کے بہترین کتب خانوں میں ہو گیا۔ یہ نادر مخطوطات زیادہ تر عربی زبان کی ہیں۔ ان میں سے بعض ایسی ہیں کہ جن کا کوئی دوسرا نسخہ دنیا کے کسی کتب خانے میں نہیں۔ قلمی کتاب کی دوسری چیزوں کی طرح کوئی خاص قیمت نہیں ہوتی۔ یہ قدردانی پر ہے۔ بعض وقت سودا کرنے میں نادر کتاب ہاتھ سے جاتی رہتی ہے اور [illegible]۔ نواب عماد الملک کتب کے بڑے قدردان تھے اور ان کی قدردانی کا شہرہ تھا کہ جب کوئی ایسی کتاب آ گئی [illegible]۔ ان کی فیاضی کی بدولت کتب فروش یا جن کے پاس کوئی اچھی یا نادر کتاب ہوتی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ جو لوگ کتاب کی قدر و قیمت سے واقف نہیں تھے وہ اس پر بہت جھنجھلاتے اور اسے اسراف سے منسوب کرتے اور طعن کرتے کہ مولوی صاحب سرکاری روپیہ ان چیزوں پر ضائع کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک بار جب انہوں نے چار پانچ عربی کتابیں آٹھ ہزار روپے میں خریدیں اور جب رقم کی منظوری کے لئے مدار المہام کو لکھا۔ حالی نواب وقار الامراء کی خدمت میں پیش ہوئی تو کسی صاحب نے چپکے سے کہہ دیا کہ سرکار مولوی سید حسین صاحب کی عادت ہے کہ وہ کتابیں خریدنے میں سرکاری روپیہ بیدردی سے خرچ کرتے ہیں اور جو جتنی قیمت مانگتا ہے دے دیتے ہیں۔ نواب عماد الملک کو بھی اس کی خبر پہنچ گئی۔ انہوں نے مدار المہام سے کہا کہ کتابیں واپس دے دی جائیں میں انہیں خود خرید لوں گا اور یورپ بھیج کر اس سے چار گنی قیمت وصول کروں گا۔ مدار المہام نواب وقار الامراء نے جو بہت بامروت اور باپاس شخص تھے بہت معذرت کی اور فوراً رقم ادا کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ ایک ایسا ہی واقعہ ہمارے سامنے پیش آیا۔ نواب عماد الملک نے کچھ کتابیں خریدیں اور رقم کی منظوری کے لئے ہوم آفس کو لکھا۔ سررشتۂ تعلیمات ہوم آفس کے تحت تھے۔ اس وقت ہوم سیکرٹری فضل العلماء نواب عبید اللہ خان فرزند مولوی سمیع اللہ خاں تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ بعض کتابیں جو مطبع نولکشور سے چند روپے میں مل سکتی ہیں ان کی قیمت [illegible] دو دو سو روپے لکھی ہے تو انہیں تعجب ہوا اور لکھا کہ کتابیں ملاحظہ کے لئے بھیج دی جائیں۔ نواب عماد الملک نے لکھا کہ کتابیں کسی کے پاس نہیں جائیں گی جسے دیکھنا ہو یہاں آکر دیکھے۔ ہوم سیکرٹری صاحب نے بے چون و چرا منظوری دے دی۔ [illegible] افضل العلماء صاحب کیا جانیں کہ ایک کتاب جو بازار میں دو چار روپے میں مل جاتی ہے وہی کتاب اگر مصنف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہو یا اس کا کوئی قدیم صحیح نسخہ مل جائے تو اس کی قدر و قیمت کس قدر ہو جاتی ہے۔ اس طرح نواب عماد الملک نے نایاب کتابوں کا بڑا اچھا ذخیرہ سرکاری کتب خانہ میں جمع کر دیا۔

علمی لحاظ سے نواب صاحب کا دوسرا بڑا کام دائرۃ المعارف کا قیام ہے۔ اس کا مطبع بھی ہے۔ اس ادارے نے عربی کی بہت سی نادر کتابیں طبع و شائع کی ہیں۔ یہ ایسی کتابیں ہیں جن کے قلمی نسخے نایاب تھے اور دو ایک سے زیادہ دنیا میں کسی دوسری جگہ نہیں پائے جاتے تھے۔ ان کی قدر اور شہرت ہندوستان سے زیادہ عرب ممالک اور بلاد یورپ میں ہوئی۔ اس ادارے کا قیام ۱۳۰۶ھ (۱۸۸۸ء) میں ہوا۔ اس وقت پانچ سو روپے ماہانہ اس کے مصارف کے لئے مقرر ہوئے۔ اس کے بعد نواب صاحب کی تحریک پر اعلیٰ حضرت نے ۱۳۴۹ھ (۱۹۲۱ء) میں ایک لاکھ روپیہ اور ایک سال بعد پانچ لاکھ روپے عطا فرمائے۔ بھارت کے ناجائز قبضے کے بعد ریاست حیدرآباد پر جو آفات نازل ہوئیں ان میں دو ایسی ہیں جن کا صدمہ کبھی نہیں بھول سکتے۔ ایک عثمانیہ یونیورسٹی کی تخریب اور دوسری دائرۃ المعارف کا خاتمہ۔ افسوس نواب عماد الملک کی یہ بے نظیر علمی یادگار ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔ لیکن اس نے جو قابلِ قدر کام کیا ہے وہ ہمیشہ یادگار رہے گا اور کبھی نہیں مٹ سکتا۔

نواب صاحب کو عربی زبان سے بے حد محبت تھی۔ دائرۃ المعارف اسی محبت کا نتیجہ تھا۔ مولوی عبد الحلیم شرر لکھتے ہیں:

مجھے ایک مدت تک بالذات ان کی روزانہ صحبتوں میں شریک ہونے کی عزت حاصل رہی ہے اور ان کے

[illegible] ذوقِ [illegible] علم و ادب [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

حیدرآباد [illegible] فرماتے ہیں:

"[illegible] ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا [illegible] اور آپ کی ساری محنت اکارت جائے گی [illegible] کی قوم [illegible] زبان [illegible] حاصل ہے۔"

اس کے بعد اس کی تفصیل بیان کی:

"[illegible] حاصل ہو گئی [illegible] بغیر یاد دہانی یا تقاضے کے وقت پر میرے پاس چیک آ جاتا تھا۔"

مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی (نواب صدر یار جنگ) نے مرحوم نواب صاحب کے علم و ادب کے شغف کے متعلق ایک تقریر میں یہ واقعہ بیان فرمایا:

"جس سال آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس گجرات میں منعقد ہوئی [illegible] ایک اپیل شائع کی کہ روپیہ کی امداد سے [illegible] نواب [illegible] بہادر مرحوم نے اپیل پڑھ کر [illegible] افسوس ہے کہ اس وقت میرے پاس روپیہ نہیں، اس لئے ایک ہزار روپے کا چیک پیش کرتا ہوں [illegible]"

اسی طرح نواب اسحاق خان مرحوم سیکرٹری مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ نے امیر خسرو کی تصانیف کی اشاعت کا اعلان کیا تو نواب عماد الملک بہادر نے بہت مسرت کا اظہار کیا اور مالی امداد کا بھی وعدہ فرمایا۔ اس قسم کے علمی و ادبی کاموں کی امداد کے لئے وہ بغیر طلب اور تقاضے کے آمادہ ہو جاتے تھے۔

وہ اس قسم کے تمام علمی کاموں میں بڑی خوشی اور فیاضی سے مدد دینے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ چنانچہ ١٩١۴ء میں نواب صاحب نے نواب محمد اسحٰق خان آنریری سیکرٹری مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ کو خط لکھ کر امیر خسرو کی تصانیف کی نشر و اشاعت کی طرف رہبری فرمائی جس کے بعض اقتباسات درج ذیل ہیں:

"نہایت وثوق کے ساتھ بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی ہندوستان میں کوئی مصنف ایسا نہیں گزرا ہے جس کی تصانیف اس درجہ لائق حفاظت و اشاعت ہوں جیسی کہ امیر خسرو۔ اگر آپ کی کوشش سے

اس مسودہ [illegible] مصنف کا پورا کلام نظم و نثر شائع ہو کر جب تیار ہوگا تو یہ قوم کی ایک بڑی عظیم الشان خدمت ہوگی جس کا صحیح اندازہ [illegible] ہوگا اور کوشش کرنے والوں کے نام کو بھی [illegible] یادگار بنا رہے گی۔

میں دولت مند نہیں ہوں۔ اگر میرے پاس دولت ہوتی تو میں اس کام کے لئے اس کو وقف کر دیتا۔ [illegible] جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا میں اس کام میں مالی مدد دوں گا اور [illegible] صاحب سے بھی کچھ نہ کچھ دلواؤں گا۔ کام شروع کرنے کے لئے فوراً ایک ہزار [illegible] وقت [illegible] ایک [illegible] ادا کر دوں گا۔

اس کے بعد نواب اسحاق خاں [illegible] آمادہ ہو گئے۔ نواب عماد الملک نے [illegible] مولانا حالی [illegible] ایک ہزار، مولوی انوار اللہ خاں صاحب نصیلت جنگ نے پانسو [illegible] دینے گئے۔

اسی طرح وہ اہلِ علم کی مدد کرتے تھے۔ [illegible] ان کے علم میں آجاتا کہ فلاں عالم کوئی مفید علمی کام کر رہا ہے تو مناسب [illegible] سرکار سے امداد دلوانے میں دریغ نہ کرتے۔

مولانا محمود الحسن ٹونکی مرحوم ایک عالم متبحر تھے۔ علوم اسلامیہ پر ان کی نظر بہت وسیع اور گہری تھی۔ بہت روشن خیال اور نہایت نیک دل اور خوش مزاج بزرگ تھے۔ وہ مصنفین اسلام پر ایک کتاب کیا انسائیکلوپیڈیا لکھ رہے تھے۔ پہلی جلد [illegible] میں طبع ہو چکی تھی اور اہلِ علم نے اسے بہت پسند فرمایا تھا۔ دوسری جلد کی نوبت نہیں آئی تھی کہ جنگ عظیم کی آفت نازل ہوئی اور وہ [illegible] ہو لئے۔ جب نواب عماد الملک بہادر سے اس کا تذکرہ کیا تو انہوں نے فوراً اعلیٰ حضرت حضور نظام کو لکھ کر منظوری حاصل کی اور مولانا کو حیدرآباد طلب فرما کر اس کام پر مامور کر دیا۔ [illegible] معقول تنخواہ ان کے لئے مقرر ہو گئی اور ایک مختصر سا عملہ بھی دے دیا گیا۔ یہ بہت وسیع اور عظیم الشان کام تھا۔ مولانا دن رات اس میں مصروف رہتے تھے۔ چند حصے دائرۃ المعارف میں طبع بھی ہوئے۔ باقی مجلدات عثمانیہ یونیورسٹی کے ادبی اسبار میں پڑی سڑ رہی ہیں جن کا اب کوئی قدردان نہیں۔ اس تصنیف کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جب اس کے بعض حصے ڈاکٹر کرینکو کی نظر سے گزرے جو عربی علوم کے محقق فاضل تھے تو انہیں یقین نہ آتا تھا کہ اتنا بڑا اور ایسا مشکل کام ایک فردِ واحد کا کیا ہوا ہے۔

اسی طرح جب مولوی عبدالجبار خاں ملکاپوری نے [illegible] کی مبسوط تاریخ لکھنی شروع کی تو نواب صاحب نے سفارش کر کے دولتِ آصفیہ سے چھ ہزار روپے منظور کرا لئے۔

مولوی عبداللہ خاں نے بعض بہت مفید علمی کتابیں چھپوا کر شائع کیں۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور کتب خانہ آصفیہ ہی میں رہتے تھے۔ نواب صاحب نے ان کی سرپرستی فرمائی اور سروِ آزاد اور مآثر الکرام جیسی کتابوں کی اشاعت پر اپنی جیب سے مختلف اوقات میں کئی ہزار روپے عنایت کئے اور اعلیٰ حضرت سے سفارش کر کے تاحیات پچاس روپیہ وظیفہ مقرر کرا دیا۔

ایسے ہی ایک دو صاحبوں کا جو علمی یا مذہبی کام کر رہے تھے میں نے ان سے ذکر کیا اور انہوں نے اعلیٰ حضرت سے سفارش کر کے منصب یعنی دوامی وظیفہ مقرر کرا دیا۔

طالب علموں کی اکثر مدد کرتے رہتے تھے۔ اگر کسی تعلیم کے شوقین نادار طالب علم کی سفارش کی جاتی تو تعلیمی وظیفہ مقرر کر دیتے۔ ایک روز مجھ سے فرمانے لگے کہ دلّی سے ایک نوجوان عبدالرؤف کا خط آیا ہے جو ابھی انگلستان سے بیرسٹری کی ڈگری لے کر آئے ہیں لیکن بوجہ کم استطاعتی اپنا کام شروع نہیں کر سکتے۔ انہوں نے مجھ سے مالی مدد طلب کی ہے۔ میں نے کہا یہ نوجوان میرن صاحب کے نواسے ہیں۔ ان کو اس کا علم نہ تھا۔ لیکن وہ اس نوجوان کے [illegible] تحریر سے اس قدر متاثر ہوئے کہ فوراً لکھ بھیجا کہ تمہیں کس قدر رقم کی ضرورت ہے اطلاع دو کہ اس کا انتظام کر دیا جائے۔ [illegible]

ترتیب، نفس مضمون [illegible] ہے جیسا کہ یہاں [illegible] ہو گیا ہے۔ آپ [illegible] کے [illegible] [illegible] کی [illegible] ہیں [illegible] تھے۔ [illegible] سے [illegible] کی [illegible] [illegible] کے سکتا ہے۔

نواب صاحب کا اصلی ذوق ادبی تھا۔ فارسی [illegible] کے [illegible] [illegible] اور انگریزی [illegible] [illegible] روزنامچوں سے فارسی میں اور [illegible] گفتگو کرتے تھے۔ جب [illegible] [illegible] کا [illegible] کی [illegible] نواب محسن الملک سے یہ صاحب کی [illegible] [illegible] فارسی [illegible] [illegible] عربی ادب کے [illegible] کے متعلق نواب صاحب کی [illegible] [illegible] [illegible] کا کلام پسند نہیں کرتے تھے۔ فارسی [illegible] [illegible] [illegible] کی شاعری بہت نا پسند تھی۔ [illegible] لفظی صنائع [illegible] [illegible] [illegible] زبانوں [illegible] فارسی [illegible] [illegible] ایک قسم کی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] نواب صاحب بھی بعض [illegible] لفظی رعایت اور [illegible] لفظی رعایتوں اور صنائع بدائع کو پسند کرتے تھے [illegible] مصالحوں اور [illegible] [illegible] [illegible] اصطلاحات [illegible] [illegible] اصطلاحات کے وسیع [illegible] اپنے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] بحث کی ہے اور اس مسئلے کے متعلق بعض [illegible] نواب صاحب کی جگہ [illegible] [illegible] [illegible] مسلمانوں کا ایک وفد آغا خان کی [illegible] شملہ [illegible] کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ یہ مسلمانوں کا بہت اہم اور تاریخی وفد تھا جس [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] مسلمانوں میں عام طور پر بیداری اور [illegible] کی [illegible] ہوئی تھی۔ وفد کی تجویز نواب محسن الملک کے [illegible] [illegible] تھی جو اپنے وقت کے نہایت [illegible] روشن خیال سیاست دان تھے۔ انہوں نے آغا خان کو گھیرا اور نواب عماد الملک [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] میں پیش [illegible] والا تھا۔

سیاست میں وہ سر سید احمد خان کے پیرو تھے۔ جب سر سید نے انڈین نیشنل کانگرس کی [illegible] [illegible] مخالفت کی تو [illegible] [illegible] ایک [illegible] انگریزی زبان میں لکھ کر شائع کی۔ وہ انگریزی حکومت کو ملک کے حق میں باعث برکت سمجھتے تھے۔ پرانے رنگ کے [illegible] خیال کے تھے [illegible] اپنے زمانے کی طوائف الملوکی اور دیسی حکمرانوں کی بدنظمی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] تھے۔ انگریزوں نے ریلیں جاری کیں، [illegible] ڈاک جاری [illegible]۔ عدالتیں قائم کیں، [illegible] [illegible] [illegible] تعلیم [illegible] اور مدرسے اور کالج [illegible] [illegible] سڑکیں [illegible] آسانیاں پیدا ہو گئیں، انصاف ہونے لگا، امن و امان قائم ہو گیا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر وہ انگریزوں سے بہت خوش تھے اور ان کی عقل و دانش اور انتظامی صلاحیت کی بہت تعریف کرتے تھے۔ ان بزرگوں کو ملک کے اقتصادی اور سیاسی حالات سے کچھ بحث نہ تھی اور نہ وہ ان مسائل کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ یہ تو گیا جسٹس رانا ڈے تک نے اپنے ایک خطبے میں انگریزوں کی آمد کو مشیت ایزدی [illegible] ملک کے حق میں باعث خیر قرار دیا تھا [illegible] [illegible]

بھی مل سکتے تھے۔ شروع شروع میں انڈین نیشنل کانگریس کا بھی یہی خیال تھا۔ اس وقت کانگریس والے صرف اتنا چاہتے تھے کہ انہیں حکومت میں عہدے
کے عہدے ملیں اور حکومت کے نظم و نسق میں ان کا بھی دخل رہے۔ حالات کے مطالعہ اور اقتصادی اور سیاسی امور میں غور کے سلسلے میں حل نکل سکے
چلنے سے ان کا نقطہ نظر بدل گیا۔ ہمارے بزرگ جو زمیندار قسم کے تھے اپنے پرانے خیال سے ہٹے۔ ان میں بہت کم ایسے تھے جنہوں نے کچھ عرصہ
کو غور سے دیکھا ہو اور ان میں بصیرت حاصل کی ہو۔ مولوی قسم کے لوگ جو انگریزوں سے نفرت کرتے تھے اور ان کو مسلمانوں کا دشمن سمجھتے تھے ان کی
نفرت کچھ تو مذہبی تعصب پر مبنی تھی اور کچھ اس وجہ سے کہ مسلمانوں کی حکومت اور وقار کو ان سے نقصان پہنچا تھا۔ بات بہت دیر میں سمجھ میں آئی کہ
انگریز حکومت سے اصل نقصانات کیا پہنچے اور بعض اسے آخر تک نہ سمجھے۔ اس بارے میں نواب عماد الملک کا ذاتی خیال اس ایک مثال سے ظاہر
ہوگا کہ جس زمانے میں وہ انڈین لیجسلیٹو کونسل کے ممبر تھے انہوں نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ ابھی حکومت میں [illegible] کی ضرورت ہے۔ یہ بھی
پرانا خیال ہے جس کا اظہار ہمارے بزرگ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ مقابلے کے امتحان میں ایسے ایسے لوگ کامیاب ہو کر آ جاتے ہیں اور میرے خیال میں بہت اہمیت دیتے
دیئے جاتے ہیں جو شریفانہ اطوار و آداب سے عاری ہوتے ہیں۔ نواب عماد الملک کو خاندانی شرافت کا بڑا خیال تھا اور اسے بہت اہمیت دیتے
تھے۔ قصباتی شرفا اس معاملے میں بہت سخت ہوتے ہیں۔ گو انہیں بلگرام میں رہنے کا زیادہ اتفاق نہیں ہوا تھا مگر قصباتی شرفا کی خوبیاں ان میں موجود
تھیں۔ ایک دن اتفاق سے میں ان کے ہاں گیا تو دیکھا ایک صاحب سے باتیں کر رہے ہیں۔ جب وہ رخصت ہو کر چلے گئے تو کہنے لگے یہ شخص
شریف نہیں معلوم ہوتا۔ میں نے کہا بظاہر تو ایسا نہیں معلوم ہوتا۔ آدمی تعلیم یافتہ ہیں۔ کہنے لگے بعض الفاظ کا تلفظ غلط کر رہا تھا۔ مجھے یہ سن کر کسی قدر
تعجب ہوا اور سوچنے لگا کہ یہ شرافت کی پرکھ بھی عجیب ہے۔ ایک مولانا حالی ہو گئے ہیں ـــ

کچھ اور آؤ بن کر تم اے نبیرہ مرزا
نہیں پوچھتے یاں حسب اور نسب کچھ

میں نے مولانا سے پوچھا "کچھ اور آؤ بن کر" سے کیا مراد ہے۔ فرمایا "مزدور" دونوں اشراف ہیں اور قصباتی ہیں۔ ایک نہ صرف وقت کے
تقاضے کو بلکہ انسانیت کے تقاضے کو بھی سمجھتا تھا اور دوسرا قدیم رسم و راہ اور وضع کا پابند تھا۔ جہاں تھا وہیں رہا۔

امیرانہ شان سے رہتے تھے لیکن اس میں تصنع نہ تھا۔ عالی شان کوٹھی تھی اور اسی مناسبت سے اس کا فرنیچر اور سامان تھا۔ مزاج میں بہت
نفاست تھی۔ صفائی کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ریاست میں ان کا کوئی بہت بڑا عہدہ نہ تھا۔ لیکن نظام ملازمت میں اور خدمت سے سبکدوش
ہونے کے بعد بھی ان کی خودداری اور وقار ایسا تھا کہ تمام عہدہ دار اور امراء و وزراء ان کا بہت ادب و احترام کرتے تھے اور اس طرح ملتے تھے
جیسے کوئی خورد کسی بزرگ سے ملتا ہے۔

ان کی امیرانہ شان و شوکت اور ظاہری رکھ رکھاؤ اور رعب داب کو دیکھ کر لوگ ان کے پاس جاتے ہوئے گھبراتے تھے لیکن وہ بہت صاف باطن
با مروت اور منکسر المزاج تھے۔ خاص کر اہل علم سے مل کر بہت خوش ہوتے تھے اور بے تکلف علمی باتیں کرتے تھے۔ ایسے وقت میں کوئی بڑا شخص
آ جاتا تو ملنے سے صاف انکار کر دیتے۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ ان کے فرزند نواب عقیل جنگ ان سے ملنے آئے۔ اس وقت نواب صاحب
کے پاس مولوی ہاشم ندوی بیٹھے ہوئے تھے جو نواب صاحب کے کتب خانے کی ترتیب وغیرہ کا کام کرتے تھے۔ نواب عقیل جنگ نشست کے
کمرے میں آتے تو مولوی صاحب سے مخاطب ہو کر کہنے لگے "یہ کیا ہے؟ آپ کا جھٹکا کھڑا ہے؟" جھٹکا دکن میں ایک ادنیٰ قسم کی سواری ہے۔
یہ سنتے ہی نواب صاحب سخت برہم ہوئے اور کہنے لگے "تم اہل علم کی توہین کرتے ہو؟ تم بھول گئے تمہارا باپ ایک زمانے میں جوتیاں چٹخاتا پھرتا تھا۔"
غرض اس بری طرح ڈانٹا کہ وہ پانی پانی ہو گئے۔ عقیل جنگ کا منشا طعن کرنا نہ تھا۔ بات یہ ہے کہ مولوی صاحب کا جھٹکا پورٹیکو [illegible]
کے عین سامنے کھڑا تھا جس سے آنے جانے والوں اور دوسری سواریوں کو زحمت ہوتی تھی۔ غرض یہ کہ اس معاملے میں نواب عماد الملک بہت

[illegible] ہے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible] ہندوستان کے [illegible]

[illegible]

[illegible] کے ذریعہ [illegible]

[illegible] تعداد [illegible] سکول [illegible]

[illegible] مدرسے میں سیکھتے ہیں [illegible]

[illegible] ملکوں کے مشہور [illegible]

[illegible] یورپ [illegible]

[illegible] سلطنت [illegible]

[illegible] زبان ہے [illegible]

حالات سے بالکل [illegible] زیادہ [illegible]

[illegible] مغربی دنیا [illegible] مغربی [illegible] قومی [illegible]

اور پاکیزہ تہذیب چھوڑ کر مغربی اخلاق اختیار کر لیتے ہیں۔ [illegible]

انگریزی [illegible] انگریزی قسم کا پسند کرتے ہیں [illegible]

[illegible] اپنی زبان [illegible]

فضا سے کی بھرمار کر دیتے ہیں۔ بہتوں کو نماز نہیں آتی، سورے یاد نہیں۔ ایک صاحب کو میں نے سنا ہے
کہ توحید تک معلوم نہ تھا کہ کیا شے ہے اور کس کا نام ہے"

کالجوں میں انگریزی ذریعہ تعلیم کے متعلق فرماتے ہیں:

"اگر یہی ذریعہ قائم رہا تو ہماری آبائی زبان یعنی اردو ایک جاہلانہ زبان رہ جائے گی اور عام طور پر ہمارے ہم وطن و ہم مذہب علوم مغربیہ سے ہمیشہ ناآشنا رہیں گے۔ اگر اس مبارک عثمانیہ یونیورسٹی میں جامعہ عثمانیہ کو جس میں خاص اردو زبان واسطۂ تعلیم علوم و فنون قرار دی گئی ہے حسب امید کامیابی ہوئی تو یہ عیب مٹ جائے گا اور ہماری زبان قلیل مدت میں دولت علمیہ سے مالا مال ہو جائے گی۔"

جب ۱۹۱۳ء میں انجمن ترقی اردو کا کام مجھے تفویض ہوا تو میں نے صدارت کے لئے نواب صاحب کا نام پیش کیا۔ انجمن کی مجلس انتظامی نے بالاتفاق منظور کیا اور حقیقت یہ ہے کہ ہر اعتبار سے کوئی دوسرا شخص ان سے بہتر انجمن کی صدارت کے لئے نہیں مل سکتا تھا۔ انجمن کو ان سے مفید ادبی علمی مشوروں کے علاوہ ہر قسم کی مدد ملی۔ میں نے ایک دن عرض کیا کہ اگر آپ ہز ہائی نس آغا خان سے انجمن کی امداد کی تحریک فرمائیں تو امید ہے کہ معقول عطیہ مل جائے۔ کیونکہ وہ قومی اور علمی کاموں کی امداد میں بہت فیاض ہیں۔ انھوں نے فوراً قلم اٹھا کر فارسی زبان میں خط لکھ دیا مگر آغا خان نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس زمانے میں آغا خان یورپ میں تھے۔ اس کے کچھ دنوں بعد سید صاحب نے انگلستان کا قصد کیا۔ میں نے ان سے کہا آغا خان بھی آج کل وہیں تشریف رکھتے ہیں ذرا ان کو کھٹکھٹائیے گا۔ حضرت نے نواب عماد الملک کے خط کا جواب تک نہ دیا۔ سید صاحب سفر سے واپس آئے تو کہا۔ آغا خان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے فرمایا کہ فلاں تاریخ کو بمبئی پہنچ جاؤں گا وہاں ملئے۔ چنانچہ اس تاریخ کو میں اور سید صاحب بمبئی پہنچے۔ معلوم ہوا کہ وہ پونا تشریف لے گئے ہیں، اور یہ کہہ گئے ہیں کہ پونے آکر ملئے۔ میں نے سید صاحب سے کہا بس آپ تشریف لے جائیے۔ مجھے معاف رکھئے۔ وہ گئے۔ ہز ہائی نس آغا خان تپاک سے ملے۔ انجمن کا معاونہ منظور فرمایا۔ اپنے کارندۂ خاص کو بلایا۔ حکم دیا کہ انجمن کو ایک ہزار روپیہ ماہانہ کے حساب سے دس ہزار کا تخمینہ ہماری طرف سے دیا جائے۔ اس نے فوراً یہ حکم اپنی یادداشت میں ٹانک لیا۔ اس کے بعد کئی بار یاد دہانی کی گئی جواب ندارد۔ بڑے آدمیوں کے وعدے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جو جتنا بڑا ہوتا ہے اس کے وعدے کے ایفا کرنے میں اتنی ہی دیر لگتی ہے۔ میرے پاس ایسے بہت سے شاندار وعدے موجود ہیں۔ اس دنیا میں تو ان کی کچھ پوچھ گچھ نہ ہوگی۔ ایک روز وہ داور محشر کے آگے پیش کرنے پڑیں گے۔

اسی طرح جب میں حیدرآباد سے وطن (شمالی ہند) جانے لگا تو نواب صاحب سے عرض کی کہ اگر مناسب ہو تو انجمن کی امداد کے سلسلے میں ایک خط نواب صاحب رامپور (نواب حامد علی خان) کے نام عنایت فرمایا جائے۔ آپ نے ایک خط فارسی زبان میں والیٔ ریاست رامپور کے نام لکھ کر دیا جس میں انجمن کے کاموں کا مفصل ذکر تھا۔ میں نے یہ خط لے جا کر نواب صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ چند سطریں پڑھ کر اپنے معتمد خاص کے حوالے کر دیا۔ میں نے چاہا کہ انجمن کے متعلق کچھ عرض کروں لیکن انھوں نے نواب عماد الملک کی توصیف و ثنا شروع کر دی۔ وہ ان کا نام بڑے ادب سے لیتے تھے اور ان کی باتوں سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ ان کو نواب عماد الملک سے خلوص ہے۔ وہ ملتجیانہ لہجے میں مجھ سے بار بار کہتے رہے کہ کسی طرح آپ انھیں یہاں لائیے۔ مجھے بے حد مسرت ہوگی۔ میری بڑی تمنا ہے کہ وہ کچھ دن میرے پاس آکر رہیں۔ میں نے کہا ان کی ٹانگ کو جب سے صدمہ پہنچا ہے انھیں اٹھنے بیٹھنے میں بہت تکلیف ہوتی ہے۔ جب کسی سے ملاقات کرنی ہوتی ہے تو اپنے خاص کمرے سے پہیئے دار کرسی پر باہر آتے ہیں۔ ایسی حالت میں ان کا یہاں آنا محال ہے۔ کہنے لگے آپ کسی طرح انھیں بمبئی تک لے آئیے میں بمبئی پہنچ کر نہایت آسائش و آرام کے ساتھ یہاں لے آؤں گا۔ غرض میں وہاں تین چار روز رہا۔ بہت خوشی سے ملتے۔ بلکہ بعض اوقات دور ہی سے دیکھ کر بڑے تپاک سے "آئیے آئیے مولوی صاحب آئیے" کہتے اور دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہتے لیکن انجمن کا معاملہ کبھی بیچ میں نہ آنے دیتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو غیر ضروری اور بے جا کاموں میں [illegible] ہزاروں روپے

[illegible] [illegible] کے لئے جیسا کہ [illegible] اسکول [illegible] صاحب [illegible]۔ ایک دن [illegible] وقت [illegible] کیا [illegible] آپ کا قیام [illegible] کہ [illegible] قریب ہی [illegible] فرمایا [illegible] میں [illegible]۔ آخر [illegible] اس وقت [illegible] ایک [illegible] سے [illegible] نواب [illegible] ہے [illegible] قریب [illegible] بیٹھے [illegible] ڈاک میں [illegible]۔ میں نے [illegible] گیا۔ دوسرے دن [illegible] نواب عماد الملک نے [illegible] ہے۔ [illegible] فرمایا اس کا [illegible] اور [illegible] ہیں [illegible] آپ [illegible] صحت ہے۔ [illegible] طرف اشارہ کر کے فرمایا [illegible] نہیں دیا۔ اس کی تشریح [illegible] نہیں [illegible] سے واقف ہیں وہ سمجھ گئے ہوں گے۔

رسالہ اردو کو بالالتزام پڑھتے تھے۔ بعض اوقات بعض مضامین کے متعلق رائے یا مشورہ دیتے اور کبھی کبھی الفاظ کی صحت و غلطی کے متعلق رائے لکھ بھیجتے۔

جب نواب یوسف علی خان سالار جنگ ثالث مدار المہام ہو کر اس عہدے پر سرفراز ہوئے اور [illegible] سیاست کا تجربہ نہیں رکھتے تھے نواب عماد الملک ان کے مشیر مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں آپ نے ایک گشتی [illegible] جاری فرمایا جس میں [illegible] سرکاری [illegible] کے نام [illegible] ہدایت کی کہ اردو مراسلوں میں بلا وجہ انگریزی الفاظ استعمال نہ کئے جائیں۔

انہیں جھوٹ سے سخت نفرت تھی اور جھوٹے کو کبھی منہ نہیں لگاتے تھے۔ [illegible] مروت میں آ کر یا [illegible] قرب کی خاطر یا اس خیال سے کہ دل شکنی نہ ہو [illegible] یا جھوٹ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یا ایسے کام کی حامی بھر لیتے ہیں جو وہ نہیں کر سکتے یا اس کا کرنا ان کے ضمیر کے خلاف ہے۔ اس کا نتیجہ کذب یا پشیمانی ہوتا ہے۔ نواب عماد الملک کا مسلک بالکل صاف تھا۔ جب وہ کسی کام کو نہیں کر سکتے تھے یا نہیں کرنا چاہتے تھے یا اسے اپنے اصول اور ضابطے کے خلاف سمجھتے تھے تو صاف انکار کر دیتے تھے۔ انہوں نے حیدرآباد آنے کے بعد [illegible] رسالہ نکالا تھا اس میں ان کا ایک مضمون "راستی و راست بازی" شائع ہوا تھا۔ اسے پڑھ کر ان کی سیرت سامنے آ جاتی ہے [illegible] اور صاف گوئی میں نیک نام نہیں بدنام تھے۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خان نے برسبیل تذکرہ اپنے مصاحبوں اور اعلیٰ ارکان ریاست سے جو اس وقت حاضر تھے پوچھا کہ لوگوں کا میری نسبت کیا خیال ہے۔ ان مصاحبوں نے عرض کیا کہ رعایا حضور کی فیاضی [illegible] قدردانی، سیاست و تدبر، کاردانی اور عالی دماغی کے بے حد مداح ہیں۔ غرض ہر ایک نے تعریف کے پل باندھ دئے۔ نواب عماد الملک خاموش بیٹھے رہے۔ آخر اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔ مولوی صاحب آپ نے کچھ نہیں کہا۔ نواب صاحب نے کہا "لوگ کہتے ہیں کہ آپ شراب پیتے رہتے ہیں۔ کام کی طرف بالکل توجہ نہیں کرتے۔ سرکاری کارروائیاں کئی کئی مہینے پڑی رہتی ہیں۔ ریاست کا انتظام خراب ہو رہا ہے" یہ سننا تھا کہ دربار میں سناٹا چھا گیا۔ اعلیٰ حضرت فوراً اٹھ کر اندر چلے گئے۔ جن لوگوں نے ہمارے سابق بادشاہوں کے حالات پڑھے ہیں انہیں معلوم ہے کہ ان کے حضور میں خفیف سے اختلاف میں بھی جان کی خیر نظر نہیں آتی تھی۔ یہی حال دولت آصفیہ کے فرمانرواؤں اور ان سے [illegible] کے درباروں کا تھا۔ ایسی جسارت تو کجا خفیف سے خفیف اختلاف کی بھی مجال نہ تھی۔ اہل دربار مولوی صاحب کی صاف بیانی سن کر دنگ

ہوگئے اور ڈر رہے تھے کہ دیکھئے اعلیٰ حضرت تدر قیمت کا کیا عتاب نازل ہوتا ہے۔ دوسرے روز اعلیٰ حضرت نے نواب صاحب کو [illegible]
جب حاضر ہوئے تو فرمایا "آپ کو سب کے سامنے ایسا نہیں کہنا چاہئے تھا" نواب صاحب نے عرض کیا کہ حضور نے سب کے سامنے
دریافت فرمایا تھا۔ اگر میں سب کے سامنے ایک بات کہتا اور علیٰحدہ میں دوسری تو یہ بحث اور منافقت ہوتی"۔ اعلیٰ حضرت صاحب [illegible]
باہر تشریف لائے شیشے قرآن کی ایک سطر بند تھی۔ نواب صاحب کا جواب سننے کے بعد اعلیٰ حضرت نے مٹھی کھولی اور الماس کی ایک [illegible]
انگوٹھی عطا فرمائی۔ نواب صاحب کے فرزند نواب مہدی یار جنگ نے مجھے وہ انگوٹھی دکھائی تھی۔

اب آپ اس شریف المنفس اور پر خلوص فرمانروا کے فرزند اور جانشین آصف جاہ سابع میر عثمان علی خان کا حال سنئے کہ ہم نے نواب صاحب
کی ریاست کوئی کا کیا صلہ دیا۔ کرشن پرشاد ہو یا مجھے یاد نہیں رہا کہ راجہ شیام یا مہاراجہ یا راجہ کرشن کوئی اور ریاست کے مہمان تھے۔ اعلیٰ حضرت نے
ان کے اعزاز میں اپنے محل میں ایک بڑا ڈنر دیا۔ کھانے کے بعد باتوں باتوں میں مسئلہ ازدواج پر بحث چھڑ گئی۔ اس میں کہیں اعلیٰ حضرت نے یہ
کہہ دیا کہ اسلام میں اس بارے میں بہت سہولت اور آزادی ہے۔ نواب صاحب نے فوراً ٹوکا کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ اسلام نے اس معاملہ پر
ایسی کڑی شرط رکھی ہے کہ آدمی ایک سے زیادہ بیویاں نہیں رکھ سکتا۔ ان دونوں کا اختلاف کی تاب کہاں۔ حضور برہم ہوگئے اور طیش میں آ کر کہا
کہ آپ یہاں سے چلے جائیے۔ نواب صاحب فوراً اٹھ کر چلے گئے۔ دوسرے روز صبح اعلیٰ حضرت کے معتمد پیشی غیاث الدین جنگ
نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ اعلیٰ حضرت نے فرمایا ہے کہ آپ ریاست حیدرآباد سے چلے جائیے اور آپ کو کونسل آف
اسٹیٹ کی معتمدی کی جو تنخواہ اب تک ملتی رہی ہے وہ بھی واپس کر دیجئے۔ نواب صاحب نے کہا کہ وہ رقم بطور امانت بنک میں جمع ہے۔ میں
اس کا ایک حبہ بھی اپنے تصرف میں نہیں لایا۔ وہ آج ہی واپس ہو جائے گی۔ اور اسی روز حیدرآباد کو الوداع کہہ کر علی گڑھ تشریف لے گئے۔ یہ
شخصی حکومت کے فرمانرواؤں کا ادنیٰ نمونہ ہے۔ منقول۔ مغضوب الغضب۔ متکبر۔ چاہے کمزوری جتنی ہی بھی شدید ہو وہ گھر میں شیطان۔ ہر شخص نہیں
یہ خط لکھتا ہے "عماد الملک بہادر فخر الاماثل والاقران۔ آپ کے ساتھ ہم کلامی و ہم طعامی نہ ہو سکا ایک زمانہ گذر گیا ہے لہٰذا کل سے دس بجے تک
بریک فاسٹ پر ہوں تو باعث مسرت ہے"۔ ایک خط میں نواب صاحب کے انڈیا کونسل سے مستعفی ہونے پر لکھتے ہیں "اسی وقت سے
سے دفعتہً استعفیٰ دے دینا تمام مسلمانانِ ہند کے لئے ایک بدقسمتی کا باعث ہے کیونکہ آپ جیسا مدبر صاحب رائے تجربہ کار و واقف
اسرار پھر دوسرا شخص اس خدمت پر مقرر ہونا محالات سے معلوم ہوتا ہے۔۔۔" یہ وہ الفاظ ہیں جن سے وہ اپنی ریاست کے بڑے سے
بڑے امیر یا وزیر کو مخاطب نہیں کرتے وہی شخص ان کے روبرو استاد بھی ہے۔ دربار سے نکال دیتا ہے اور دربار ہی سے نہیں حیدرآباد
سے خارج البلد کر دیتا ہے۔

دوسرے روز جب صاحب ریزیڈنٹ کو معلوم ہوا تو وہ اعلیٰ حضرت سے ملے اور بہت افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ نواب عماد الملک
معمولی شخص نہیں۔ مسلمانانِ ہند کے دلوں میں ان کی بڑی عزت و وقعت ہے اور حکومتِ ہند بھی ان کو بڑی عزت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ ان کے
ساتھ جو ناروا برتاؤ ہوا ہے اس سے لوگوں میں آپ کی طرف سے بہت ناراضی اور بدگمانی پیدا ہوگئی۔ چنانچہ فوراً ان کو واپسی کا فرمان بھیجا گیا۔
وہ اس واقعہ سے بہت آزردہ خاطر ہو گئے تھے اور آنا نہیں چاہتے تھے لیکن اپنے فرزندوں اور احباب کے اصرار پر واپس آگئے۔ جس روز
حیدرآباد پہنچے تو اعلیٰ حضرت نے فوراً ملاقات کے لئے طلب فرمایا۔ نواب صاحب نے کہلا بھیجا کہ میں تھکا ہوا ہوں اس وقت نہیں آ
سکتا۔ لیکن اعلیٰ حضرت نے جب بہت اصرار کیا تو وہ گئے۔ کوٹھی گئے۔ دور ہی سے بلند آواز میں جیسا کہ ان کا قاعدہ ہے) مائی ڈیئر، ڈیئر،
مائی ڈیئر کہہ کر استقبال کیا۔

انجمن کی معتمدی کے ابتدائی زمانے میں میں نے ایک یادداشت بغرض امداد انجمن پیشی کے ذریعے اعلیٰ حضرت میں پیش کی تھی۔ راجہ سر [illegible]

[illegible] صاحب کی [illegible] ریاست [illegible]
[illegible] سے [illegible] تعلقات تھے۔

[illegible] سب سے [illegible] ریاست تھی۔ اس کی تہذیب اور [illegible] ریاست [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] بہت [illegible] [illegible] [illegible] جنگ [illegible] [illegible] [illegible] ریاست [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] مسلمانوں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

پاک ہیں [illegible] سے [illegible]

جیسے ہیں دنیا میں سب کے درمیاں [illegible]

انھوں نے اپنا [illegible] اور اقتدار سے بھی [illegible] [illegible] جنگ [illegible] نواب عماد الملک [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کا انتخاب فرمایا جائے۔

[illegible] کے سامنے اور ان کے بعد بہت سے بڑے بڑے [illegible] نواب عماد الملک [illegible] حیدرآباد میں رہے اور ہر دور میں ان کا اعزاز پہلے سے زیادہ ہوتا رہا۔

برٹش انڈیا اور گورنمنٹ آف انڈیا میں بھی ان کا ایسا ہی اعزاز تھا۔ چنانچہ لارڈ کرزن نے [illegible] ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے حالات کی تحقیق اور اصلاح کے لئے [illegible] مقرر کیا تھا اس کے ایک رکن نواب صاحب کو منتخب کئے گئے تھے۔ اس سلسلے میں پورے ہندوستان کا دورہ کیا۔ ۱۹۰۲ء میں [illegible] امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے [illegible] ء میں [illegible] نے پہلی بار وزیر ہند کی کونسل کے لئے دو ہندوستانی ممبروں کا انتخاب کیا۔ ایک نواب عماد الملک تھے۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے دو بار صدر منتخب ہوئے۔ ایک بار [illegible] ء میں [illegible] کے اجلاس میں [illegible] اور دوسری بار [illegible] کانفرنس کا اجلاس رام پور میں ہوا۔ ۱۹۱۶ء میں [illegible] یونیورسٹی کے [illegible] خطبہ صدارت پڑھا۔

مجھے یہ دیکھ کر بعض اوقات تعجب ہوتا اور مزا بھی آتا [illegible] کا ذکر نہیں [illegible] بزرگوں نے انگریزی معاشرت کی پسندیدگی کا اظہار کیا تھا اور اپنے رہنے سہنے میں بہت کچھ تبدیلی کر لی تھی وہ کھانا [illegible] سر سید احمد خاں، نواب محسن الملک، نواب عماد الملک کے دسترخوان

میں سفیدی رنگ رکھا۔ ظاہر ہے کہ انگریزی اُبلے ہوئے کھانوں میں وہ ذائقہ اور چٹخارہ کہاں جو ہمارے کھانوں میں ہے۔ اب تو رنگ وہ کھانے بھلا گئے تا حد تک یاد نہیں۔ اس کے پکانے والے رہے اور نہ پکانے والوں کے قدر دان۔ اب جو کھانے کھاتے ہیں وہ نہ انگریزی ہیں نہ مغلئی بلکہ کھانا سب ہی کھاتے ہیں لیکن اونچے کہتے ہیں جو کھانے کا ذائقہ، لطافت اور آب و نمک کا صحیح ذوق رکھتے ہوں۔ نواب عمادالملک بہت نفیس اور عمدہ کھانا کھاتے تھے۔ لیکن ان کے کھانے بہت مرغن ہوتے تھے۔ خدا جانے یہ لوگ یہ کھانے کس طرح ہضم کر لیتے تھے۔ جبکہ کسی قسم کی ورزش کے بھی عادی نہ تھے۔ ایک بار وہ مجھے اپنے ساتھ وقار آباد لے گئے جہاں ان کا ایک اچھا سا باغ اور بنگلہ تھا۔ کھانا ان کے ساتھ کھاتا تھا۔ شب کو کھانے پر وہ بار بار کہتے تھے کہ جیسے جوان ہونے سے تم بڑھا ہی آپ سے دگنا کھا [illegible] ان کے اصرار پر بھی میں نے کھانا بہت احتیاط سے کھایا۔ لیکن یہ مرغن کھانا اس پر بھی [illegible] مجھے راس نہ آیا اور رات بھر بے چینی رہی۔ صبح ہوتے ہی میں نے [illegible] کی شکایت۔ مگر نواب صاحب نے جانے نہ دیا اور ٹھہرنے پر اس قدر اصرار کیا کہ میں مجبور ہو گیا۔ کھانا جب سامنے آتا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ نواب صاحب میرے کم کھانے پر ہنستے اور طعن کرتے تھے۔ انہیں کیا خبر کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔ تیسرے دن تو میں نے ایک [illegible] اور حیدرآباد جا کر ہی دم لیا۔ نواب صاحب کھانا تو بہت اچھا کھاتے ہی تھے لیکن کھانے کی خوبی اور اس کی باریکیوں کو بھی خوب سمجھتے تھے۔ بعض [illegible] پکاتے تھے۔ خاص اور ہر کی دال جس میں مرچ کی لاگ رہتے تھے بہت لذیذ ہوتی تھی۔ قدر دان بھی ایسے ہی تھے۔ ایک روز جو میں ان کے ہاں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک صاحب ان کے ساتھ صوفے پر بیٹھے ہیں اور وہ ان سے بے تکلف باتیں کر رہے ہیں۔ جس وقت میں پہنچا تو نواب صاحب ان سے کھانے کی تعریف کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ میٹھے چاول تم نے خوب پکائے تھے لیکن شکر کی کمی [illegible] گرم ہوتی ہے۔ اس نے کہا آپ نے سچ فرمایا اس وقت پرانی شکر نہ مل سکی [illegible] استعمال کرنی پڑی۔ معلوم ہوا کہ یہ حضرت باورچی تھے۔ نواب صاحب کے ملازموں میں [illegible] باورچی سے کھانے کے ساتھ ایک صوفے پر بیٹھ کر اس طرح باتیں کرتے۔ کمال کی قدر ہو تو ایسی ہو۔

ان کے خاص دوست اور ملنے والے بہت کم تھے۔ مگر جس سے رابطہ [illegible] کے ساتھ [illegible] سے مل کر بہت خوش ہوتے تھے اور ایسے اشخاص پر جن میں طالب علمانہ جستجو اور صحیح ذوق ہوتا بہت مہربان تھے اور ان کے لئے جو کچھ بھی ممکن ہوتا کرنے کو تیار ہو جاتے تھے جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔

ہمارے لوگوں میں ایک بات یہ بھی تھی کہ جس پر ایک بار اعتبار کر لیا بس اس کے ہو گئے۔ ہزار کوئی اس کے خلاف کہے وہ نہیں سنتے تھے یہی کیفیت سر سید احمد خان کی تھی۔ اس اعتماد کا نتیجہ تھا کہ ان کے انگریز کلارک نے ایک لاکھ کا غبن کر دیا۔ نواب صاحب کے دفتر میں ان کے ایک ۔ ڈاکٹر عبداللہ بیگ صاحب تھے۔ میں نے ایک روز نواب صاحب سے کہا کہ اس شخص کی دیانت مشتبہ ہے اور جہاں تک معلوم ہوا ہے یہ آدمی اچھا نہیں ہے۔ یہ سن کر بہت برہم ہوئے اور کہنے لگے جو ایسا کہتے ہیں وہ خود ایسے ہیں۔ وہ بہت اچھا آدمی ہے لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد جب دفتر کے حسابات کی تنقیح ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ بہت سا سرکاری روپیہ اپنے تصرف میں لے آیا ہے اور غبن کے الزام میں خدمت سے برطرف کر دیا گیا۔ اس تذکرے سے یہ مقصد نہیں کہ ان کے معتمد علیہ ایسے ہی تھے۔ بعض اشخاص جن پر ان کا اعتماد تھا، حقیقت اپنی سیرت، کردار اور قابلیت کے اعتبار سے بہت قابل قدر تھے۔

مذہباً شیعہ تھے۔ لیکن اہل تشیع کے بعض عقائد مثلاً تبرے اور تقیے کے سخت مخالف تھے اور کہتے تھے کہ یہ جاہلوں کے عقیدے ہیں۔ نواب [illegible] مرحوم عماد علی خان جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں نواب عمادالملک بہادر کا بے حد ادب و احترام کرتے تھے۔ ایک ملاقات کے وقت جب ان کا ذکر آیا تو کہنے لگے کہ ایک بات میں ہمیں ان سے اختلاف ہے اور کسی طرح وہ اس معاملے میں ہم سے اتفاق کرنے پر آمادہ نہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ اختلاف معاملہ تقیے کا تھا حالانکہ ہم نے بعض شیعہ علما اور نہایت قابل اور روشن خیال اشخاص کو یہ کہتے سنا ہے "والتقیہ دینی و دین آبائی" [illegible]

ہو [illegible] کیونکہ وہ سیاسی نظریہ سے الگ کسی قسم کا تعصب نہیں رکھتے تھے۔ مولانا صاحب [illegible] تھے [illegible]
گئے [illegible] شائع کیا تو اس کا ایک نسخہ نواب صاحب کی خدمت میں بھیجا [illegible] آپ
اپنے خیالات ظاہر فرمائیں۔ اس کے جواب میں انہوں نے تحریر فرمایا کہ گذشتہ [illegible]
[illegible] اسلام کی خدمت ہی جو آپ نے ادا کی [illegible] تفسیر بہت وسیع [illegible]
انہوں نے کبھی مذہبی یا سیاسی [illegible] کام نہیں لیا۔ اس معاملہ میں بہت [illegible] عیسائی مشنریوں [illegible]
اشاعت [illegible] کا کام کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً [illegible] دیتے رہے۔

آخر زمانے میں انہیں [illegible] کرتے تھے [illegible]
عمل سے زیادہ [illegible] دیتے ہیں اور [illegible] مذہب [illegible] اسلام [illegible]
سے [illegible] والد [illegible] ان کے مختلف اضلاع [illegible]
واعظ اشاعت اسلام کی خاطر بنگال کے اضلاع [illegible] کرتے تھے [illegible]
کیے۔ [illegible] کشتیوں میں سفر کرتے [illegible] اسلام [illegible] پیش کرتے تھے [illegible] مسلمان ہو گئے۔
[illegible] بڑے مخلص اور سچے مسلمان تھے۔ جس وقت [illegible] کا وقت [illegible] کوئی
[illegible] جاتا۔ [illegible]
میں بہت رائج تھے [illegible] کرتے تھے۔ [illegible]
مجاہدوں [illegible] مختلف [illegible]
[illegible] کے ثمرات کے تعارف [illegible] اسلامی [illegible] قائل ہے۔ [illegible]

[illegible] اسلام کی [illegible]
بیان کیا کرتے تھے۔ ایک روز مولانا انوار اللہ خاں صاحب [illegible]
دوران گفتگو میں فرمایا کہ لوگوں نے [illegible]
ہے کہ وہ [illegible] اسلام کی تبلیغ کو بہت [illegible] اسلامی خدمت [illegible]
خواجہ صاحب اور ان کے رفقا نے تبلیغ کا کام [illegible] مختلف ممالک میں کیا [illegible] خواجہ صاحب کو
مالی امداد بھی مل گئی۔

ایک روز مجھ سے کہنے لگے کہ ہندوستان کا [illegible] مذہب کے [illegible] گاندھی جی [illegible]
[illegible] نواب صاحب کی پیشین گوئی یاد آئی [illegible] انڈین نیشنل کانگریس [illegible] کوئی رابطہ
نہ تھا۔ گاندھی جی اپنی قوم کے مزاج کو خوب پہچانتے تھے۔ [illegible]
وہ ننگے سر ننگے پاؤں رہتے۔ گھٹنوں سے اوپر ایک [illegible] باندھ لیتے اور کندھے اور سینہ چھپانے کے لئے کھدر کا [illegible] چادر
ڈال لیتے۔ اس کے بعد سے ان کی زندگی درویشانہ اور زاہدانہ ہو گئی اور وہ [illegible] گاندھی سے "مہاتما گاندھی" ہو گئے۔ ہندو خلقت ان
کی پوجا کرنے لگی اور ان کے ایک ایک لفظ کو [illegible] سمجھنے لگی۔ کانگریس کا دروازہ سب کے لئے کھل گیا۔ انگریزی کی جگہ ہندی [illegible]
[illegible] لگیں۔ ہندو تو ہندو مسلمانوں کو خلافت کے [illegible] ایسا لگا کہ ان کے سرگروہ اور [illegible] گاندھی جی کا دم بھرنے لگے۔ گاندھی جی نے مذہب کو سیاست

میں ایسا ہوا کہ وہ تھوڑے ہی عرصے میں ہندوستان کے مادی اور روحانی پیشوا ہو گئے۔

خطوں کا جواب باقاعدہ دیتے تھے اور اپنے قلم سے لکھتے تھے۔ کبھی دوسرے سے نہیں لکھواتے تھے اور کبھی کوئی خوشنویس استعمال نہ کیا۔ تمام تحریریں اردو انگریزی سب خود لکھیں اور اپنے قلم سے لکھیں۔ ایسے زمانے میں بھی جب وہ ضعیف ہو گئے تھے اور کسی قدر ضعف بصارت کا بھی عارضہ تھا انہوں نے کبھی یہ نہ چاہا یا اپنی تحریر کسی دوسرے سے لکھوانی گوارا نہ کی۔

میانہ قد، کھلا گندمی رنگ، خوبرو آدمی تھے۔ خضاب کرتے تھے۔ آخر زمانے میں ترک کر دیا تھا۔ سفید داڑھی سر پر بھلی تھی۔ حقہ پیتے تھے، پیچوان سامنے لگا رہتا تھا۔ سگریٹ سگار بہت نا پسند کرتے تھے۔ کہتے تھے جہاز کے سفر میں ایک بار سگریٹ سگار پینے کی کوشش کی۔ اس کی بو سے بہت تکلیف ہوئی اور حلق میں بھی جلن سی معلوم ہوئی۔ زبان میں ہلکی سی لکنت تھی۔ جامہ زیب تھے۔ ہمیشہ ہندوستانی لباس پہنتے تھے۔ جب امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے ممبر ہوئے تو لباس میں تبدیلی کرنی پڑی لیکن یہ تبدیلی عارضی تھی۔ انڈیا کونسل کے ممبر ہوئے اور لندن میں رہنا ہوا تو انگریزی لباس اختیار کرنا پڑا۔ ان کے قویٰ بہت اچھے تھے۔ صحت قابل رشک تھی۔ لندن میں ایک حادثے سے ٹانگ میں چوٹ لگ گئی۔ زخم اچھا ہو گیا مگر ٹانگ کا جوڑ نہ بیٹھا۔ اس سے انہیں اٹھنے بیٹھنے میں تکلیف رہتی تھی۔ اگر یہ صدمہ نہ ہوتا تو کئی سال اور زندہ رہتے۔ پھر بھی ۸۴ برس کی عمر پائی۔ کبھی کبھی بے تکلف دوستوں کے ساتھ شطرنج بھی کھیل لیتے تھے۔ کسی زمانے میں ستار کا بھی شوق تھا۔

ان کی یادگار یہ چند تصانیف ہیں :-

۱۔ سوانح سر سالار جنگ۔ یہ نواب سر سالار جنگ کی مختصر سوانح عمری انگریزی زبان میں ہے۔ ۱۳۰۰ھ میں جو نواب صاحب کی وفات کا سال ہے لکھی گئی۔ سر سالار جنگ ان کے محسن تھے اور ان کا ذکر بڑے خلوص اور محبت سے کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ سیاست عالی، معاملہ فہمی و مردم شناسی کا جو مادہ عالمگیر میں اورنگ زیب کے بعد کوئی شخص ہوا ہے تو وہ سر سالار جنگ تھے۔ اس کا ترجمہ اردو میں بھی ہو گیا تھا۔

۲۔ DESCRIPTIVE SKETCHES OF THE NIZAM'S DOMINION اس میں ریاست حیدرآباد دکن کے جغرافی، تاریخی واقعات، انتظامی حالات، آبیات کی صنعت و حرفت وغیرہ کا دلچسپ بیان ہے۔ اس کتاب کی تالیف میں مسٹر ولبر ولمٹ بھی شریک تھے۔ یہ کتاب دو ضخیم جلدوں میں ہے۔

۳۔ رسائل عماد الملک۔ اس میں نواب صاحب کے وہ تمام مضامین، خطبات و مقالات ہیں جو وقتاً فوقتاً اردو میں تحریر کئے۔

۴۔ انگریزی مضامین، مقالات و خطبات اور انگریزی نظموں کا مجموعہ۔

۵۔ قرآن پاک کا ترجمہ۔ یہ نواب صاحب کا سب سے بڑا اور قابل قدر کام ہے۔ یہ ترجمہ آپ نے نہایت تحقیق و کاوش اور محنت سے کیا تھا اور اس کے لئے خاص اہتمام کیا تھا اور ایک بڑا ذخیرہ تفاسیر و احادیث اور لغات اور علمائے ادب کی تصانیف کا جمع کر لیا تھا۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ ترجمے میں حتی الامکان اصل کی سی سادگی، شان اور قوت باقی رہے۔ مزاج میں بہت احتیاط تھی۔ بہت غور و فکر کرتے تھے اور ایک ایک لفظ کو جانچتے اور تولتے تھے۔ اس کے ساتھ لفظی پابندی کا خیال رکھتے۔ ان کے پیش نظر پامیکل کا انگریزی ترجمہ تھا۔ سولہ پاروں کا ترجمہ مکمل کر لیا تھا اور غالباً بعض حصے چھپا بھی لیا تھا۔ نظر ثانی کے وقت مولوی عبدالحق صاحب سے بھی مشورہ کرتے تھے۔ افسوس کہ پیرانہ سالی، ضعف بصارت اور ناسازی صحت کے سبب سے یہ کام جو مرحوم کے فضل و کمال کا بہترین نمونہ تھا جاری نہ رہ سکا۔

نواب عماد الملک بہادر کی شخصیت اس زمانے میں بعض اعتبار سے عجیب سی معلوم ہوگی۔ وہ مشرقی اور مغربی تہذیب کے جامع تھے۔ آدمی کو علم، دولت، آسائش و آرام محنت سے مل جاتا ہے لیکن صحیح ذوق بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ یہ دولت نہ علم سے ملتی ہے نہ مال و زر سے اور نہ محنت سے۔ یہی ذوق زندگی کی جان ہے۔ اس سے زندگی کے ہر شغل و شعبے میں ایک نرم اور سہانی سی روشنی آجاتی ہے جو رواداری، اعتدال اور اطمینان قلب پیدا کر دیتی ہے اور باوجود نشیب و فراز اور گھمبیر گھاٹیوں کے سفر حیات کے طے کرنے میں بہت کچھ سہولت ہو جاتی ہے۔ حسن ذوق نواب عماد الملک کی زندگی کے تقریباً ہر پہلو میں پایا جاتا ہے۔ اور ظاہری شان ایسی تھی کہ لوگ ان کے پاس جاتے ہوئے جھجکتے تھے۔ وہ ایسے لوگوں سے جو ذوق علم اور ذوق تمدن سے عاری ہوتے گریزاں رہتے تھے۔

[illegible]

[illegible] اس طرح [illegible] زندگی میں ایک [illegible] پیدا کر دیا تھا۔

ان کی صحبت [illegible] سے تھی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] سرچشمہ اور صحبت سے جو فیض دوسروں کو پہنچا وہ ان کی تالیفات سے کہیں [illegible] تھا۔

وہ جس خدمت پر مدت دراز تک فائز رہے [illegible] اس کا انہیں خود بھی احساس تھا۔ اس کی وجہ ہے [illegible] جد و جہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ [illegible] کی کوشش ان کے امکان سے باہر تھی۔

ان کے علم و فضل، وسیع معلومات، علمی و ادبی ذوق اور عربی، فارسی، انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کے گہرے مطالعہ کو دیکھتے ہوئے [illegible] سے کہیں بہتر ان سے کی جاتی تھی۔ حیدرآباد کے [illegible] حالات اور ماحول کی [illegible] لیکن [illegible] اعلیٰ سیرت اور بے لوث کردار کی وجہ سے وہ دولت آصفیہ حیدرآباد دکن کی تاریخ میں ہمیشہ عزت کے ساتھ یاد رہیں گے۔

ڈاکٹر ضیاء الدین احمد

محمد حسین خاں زبیری

تذکرہ ہے لفٹننٹ کرنل ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد ملک، کے ٹی۔ سی آئی ای۔ ایم اے (کنٹب) پی ایچ ڈی (گوٹنگن) ڈی ایس سی (الہ آباد) سر آئزک نیوٹن اسکالر (کیمبرج)، پروفیسر و پرنسپل ایم اے او کالج، پرو وائس چانسلر و وائس چانسلر و ریکٹر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ، ممبر سینٹرل اسمبلی۔ ممبر آل انڈیا مسلم لیگ کونسل، ممبر وائسرائے ڈیفنس کونسل کا

برصغیر ہند و پاکستان میں جب مسلمانوں کی فتوحات شروع ہوئیں تو عرب، عراق، ایران وغیرہ ممالک سے اکثر قبائل بھی بغرض ملازمت و تجارت یہاں آنے لگے اور یہیں آکر آباد ہو گئے۔ ان ہی قبائل میں ایک عرب الاصل قبیلہ بھی تھا جس کی نسبت حضرت زبیرؓ سے کی جاتی ہے۔ اس قبیلہ کے افراد سندھ، ملتان، پنجاب، دہلی اور دہلی کے متصلہ علاقوں میں آباد ہوئے اور کنبوہ کے لقب سے مشہور ہوئے۔ ان کی جو بستیاں دہلی، میرٹھ، مراد آباد، امروہہ، سنبھل، بریلی اور مارہرہ وغیرہ میں قائم ہوئیں ان میں زمینداریاں بھی تھیں اور شاہی ملازمت و اعزاز کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ ان میں بڑے بڑے علما، صوفیا، مصنفین، شعرا اور اطبا وغیرہ پیدا ہوئے جن کے کارناموں سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی اپنی کتاب "خزانہ عامرہ" میں تحریر فرماتے ہیں کہ "خدمات شرعیہ و امارت عمدہ دہلی مثل قضا و افتا اکثر بہ قوم کنبوہ تعلق داشت و دارد۔"

ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کا تعلق بھی اسی قبیلے سے تھا۔ وہ ۱۸۷۷ء میں بمقام میرٹھ پیدا ہوئے اسی سال ایم اے او کالج علیگڑھ کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اور اس مادر علمی کا وہ فرزند رشید جو اس کی خدمات کے لحاظ سے اپنے معاصرین اور رفقا میں فرد فرید ہے ساتھ ہی ساتھ اس عالم وجود میں منصۂ شہود پر آیا۔ ڈاکٹر صاحب کے والد حافظ معین الدین احمد محکمہ مال میں ملازم تھے اور انہوں نے تحصیلداری تک ترقی کی۔ وہ جو مثل ہے کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات ڈاکٹر صاحب مشکل سے چار برس کے ہوں گے کہ ان میں یہ عادت تھی کہ گھر میں بچوں کے کھلونے جو ٹوٹ جاتے تھے ان کے ٹکڑے جمع کر کے ان کو پھر جوڑنے کی کوشش کرتے اور اکثر کامیاب ہو جاتے تھے۔ جب عمر تعلیم کے قابل ہوئی تو میرٹھ کے قومی مدرسہ میں ان کا داخلہ کرایا گیا یہ مدرسہ مکتبی طرز کا تھا جسے اسی قبیلہ کے ایک بزرگ حافظ محمد رحمت اللہ خاں نے جاری کیا تھا اور

اس کے بعد چند روز وقت گزرا تھا۔ یہاں ڈاکٹر صاحب کی ابتدائی تعلیم کا آغاز ہوا۔ اس مدرسہ میں مولوی حبیب الرحمن اور مولوی سعید احمد ڈاکٹر صاحب کے بہنوئی اور مولوی احمد علی مدرسے میں پڑھاتے تھے اور ڈاکٹر صاحب کے چچا تھے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخل ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب کی ابتدا ہی سے ریاضی میں بہت شغف اور دلچسپی تھی گویا ریاضی کی باتیں ہی سب کچھ تھیں۔ جب ٹہلنے پر بیٹھتے تو انگلیوں اور مٹی کے ذریعہ حساب کے سوال حل کر لیتے تھے۔ اور جماعتوں کا بیشتر حصہ مدرسے میں گزارتے تھے۔ جو شروع ہی سے ضبط و نظم اور ترتیب رشید کا طرز تھا اس لئے ان کے والد نے تیرہ سال کی عمر میں ان کی تعلیم کی ذمہ داری ان کے سپرد کر دی تھی۔ وہ نہایت اہتمام سے اپنے خاندان کی سنگت اور کالج میں رہتے تھے۔ اساتذہ کے کہنے پر جو سبق ان کو دیئے جاتے تھے جب مکمل ہو جاتے تو وہ ایک ایک سبق یاد کر لیتے تھے۔

جب وہ مڈل کلاس میں آ گئے جس کا امتحان بھی ان دنوں یونیورسٹی سے ہوتا تھا تو ان کے ایک ہم جماعت نے ان کو بہت کم سمجھا اور مقابلہ نہیں کر سکتے۔ وہ خاموش رہے اور اپنے کام میں مصروف رہے۔ جب امتحان کا وقت آیا تو ریاضی کے پرچے میں الجبرا کے چند سوال تھے جن میں سے کوئی دو سوال کرنے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے چاروں سوال نہایت عمدہ طریقہ پر حل کئے اور کچھ وقت بعد دیکھ لئے ہوں گے۔ اس طرح وہ اپنے حریف سے بازی لے گئے اور اول درجہ میں کامیاب ہوئے اور یونیورسٹی میں وظیفہ بھی حاصل کیا۔

۱۹۰۰ء میں وہ ایم اے او کالج سے ملحقہ اسکول میں داخل ہوئے اور اپنے بڑے بھائی کے ساتھ جو پہلے سے وہاں پڑھتے تھے ہاسٹل میں داخل ہو گئے۔ یہاں ان کے نمایاں ہم جماعت سیٹھ یعقوب حسن مرحوم اور غالباً مولوی عبد الحق صاحب تھے۔ جب انٹرنس کے امتحان کا وقت قریب آیا تو اساتذہ میں خیال آرائیاں شروع ہوئیں کہ دیکھئے امتحان میں اول کون آتا ہے۔ سیٹھ صاحب کا خیال تھا کہ یعقوب حسن اول آئے گا اور بعض عبد الحق کے متعلق قیاس آرائی کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا کسی کو خیال بھی نہ تھا۔ انہوں نے بھی یہ سب گفتگو سن لی اور اپنی محنت اور کوشش میں اضافہ کر دیا۔ اور امتحان میں سب ساتھیوں پر بازی لے گئے۔ اول درجہ میں کامیاب ہوئے اور کالج سے میڈل ملا اور سررشتہ تعلیم سے وظیفہ ملا۔ چونکہ اس وقت تک کالج میں سائنس کی تعلیم کا انتظام نہ تھا اور ڈاکٹر صاحب سائنس پڑھنا چاہتے تھے اس لئے علی گڑھ چھوڑ کر میور سنٹرل کالج الہ آباد میں داخل ہو گئے۔ یہاں بھی انٹرمیڈیٹ اول درجہ میں نہایت امتیاز کے ساتھ پاس کیا اور سرکاری وظیفہ حاصل کیا۔ اس کے بعد پھر علی گڑھ واپس آ گئے اور ۱۹۰۵ء میں اعلیٰ ریاضی لے کر بی اے درجہ اول میں پاس کیا اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ سر سید مرحوم کی ...

قومی ہمدردی کا جوش ان کے سینہ میں فطرت نے ودیعت کیا تھا چنانچہ اس کا اظہار مختلف صورتوں میں طالب علمی کے زمانے سے ہوتا رہتا تھا۔ چنانچہ میر ولایت حسین صاحب جو ان کے استاد تھے ایک موقع پر لکھتے ہیں:۔

"ڈاکٹر صاحب نے بی اے کی تعلیم کے زمانے میں ہی نمایاں ہونا شروع کر دیا تھا۔ وہ کھیلوں میں بھی شریک ہوتے تھے اور علی گڑھ کی دوسری تحریکوں مثلاً ڈیوٹی سوسائٹی یا قیام مدارس کی تحریک میں حصہ لیتے تھے چنانچہ ان کی کوشش سے مارہرہ میں مدرسہ اسلامیہ اسکول قائم ہوا۔"

یہ قصبہ ایک قدیم مردم خیز بستی ہے جو کبھی مشرقی علوم کا گہوارہ تھا لیکن لوگوں کو جدید تعلیم سے نفرت تھی۔ یہاں کنبوہ اور سادات عظام کی آبادی نمایاں تھی۔ چونکہ علی گڑھ کے قریب واقع ہے ڈاکٹر صاحب نے ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک قرارداد کے بموجب یہاں کا تعلیمی سروے کیا اور اپنے ذاتی اثر و رسوخ سے اپنے اعزا کو آمادہ کر کے یہاں ایک جدید مدرسہ قائم کرا دیا۔

بی اے کا امتحان دینے کے بعد ہی ڈاکٹر صاحب کا تقرر کالجیٹ اسکول میں بمشاہرہ سولہ روپیہ ماہوار اسسٹنٹ ماسٹری پر تقرر ہو گیا۔ نتیجہ نکلنے کے بعد ان کو اسسٹنٹ پروفیسر ریاضی کی جگہ مل گئی جہاں پہلے چالیس روپیہ اور بعد کو ساٹھ روپیہ ماہانہ تنخواہ ہو گئی۔ سر تھیوڈور

بجٹ رپورٹ میں ان کے متعلق تحریر کیا کہ:

"اگر وہ حقیقتاً کسی میں ترقی پا گیا اور اپنے تئیں ایک اچھا پروفیسر ثابت کر گیا اور ہمارے کالج میں رہ کر کام چلا سکا تو
ہے ہم اس کی ترقی کا خیال رکھیں گے"

اس زمانے میں بی اے پاس کرنے کے بعد ڈپٹی کلکٹری کا عہدہ معراج ترقی خیال کیا جاتا تھا۔ کالج کی طرف سے پرنسپل مسٹر بک صاحب کا نام اس عہدہ کے لئے گورنمنٹ میں بھیج دیا اور بہت سفارش کی۔ پرنسپل اور ان کے اہل خاندان تو چاہتے تھے کہ وہ ڈپٹی کلکٹر بن جائیں مگر وہ خود اسے ناپسند کرتے تھے اور کالج ہی میں رہ کر قوم کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔ غرض کچھ دنوں کے بعد جب ڈاکٹر صاحب کو کالج سے متعلق ہونا پڑا اور انہوں نے ڈپٹی کلکٹری سے اپنا نام واپس لے لیا۔ جب وہ کالج میں مستقل پروفیسر ہو گئے تو سرسید نے ایک معاہدے کا مسودہ تیار کیا جس کا مضمون یہ تھا کہ وہ پانچ سال کالج کی ملازمت ترک نہیں کر سکیں گے جب یہ مسودہ ڈاکٹر صاحب کو دیا گیا کہ اس پر دستخط کردیں تو انہوں نے سرسید کی خدمت میں عرض کیا کہ میرا مقصد تو یہی پوری زندگی علی گڑھ میں صرف کرنے کا ہے۔ معاہدہ کی پابندی کریں گے بحث ہوں اور میرے خیال میں کسی معاہدہ کی بنا پر قومی خدمت نہیں کرنی چاہئے بلکہ اپنے خود اپنے دل کے تقاضے سے یہ اہم کام انجام دینا چاہئے۔ سرسید پر اس جواب کا ایسا اثر ہوا کہ انہوں نے فوراً اسی وقت معاہدہ کا مسودہ چاک کر دیا اور فیاضانہ کام کرتے ڈاکٹر صاحب کالج کی جماعتوں کو ریاضی پڑھاتے تھے۔ ۱۸۹۶ء کی بجٹ رپورٹ میں سرسید نے ان کے متعلق لکھا کہ:

"جو ٹرسٹی کہ روزمرہ کالج کے حالات دیکھتے ہیں وہ بخوبی واقف ہوں گے کہ ضیاء الدین احمد کے کالج میں ہونے سے ہمارے کالج کو کس قدر علمی شوق بڑھتا جاتا ہے اور اس کا اس کالج میں رہنا طالب علموں کی ترقی تعلیم کے لئے کس قدر مفید ہے۔ باالفعل یہ امر پیش آیا ہے کہ پرنسپل صاحب نے حسب قاعدہ دو طالب علموں کا نام ڈپٹی کلکٹری کے لئے گورنمنٹ میں بھیجا ہے جس میں ایک ضیاء الدین احمد ہے اگرچہ اس کے دوستوں نے بہت ترغیب دی مگر خود ضیاء الدین احمد نے علمی شوق سے ڈپٹی کلکٹری کے شغل سے علمی ترقی اور ہمارے کالج میں رہنے کو پسند کیا اور پرنسپل کو اطلاع کی کہ گورنمنٹ میں رپورٹ کر کے اس کا نام ڈپٹی کلکٹری سے خارج کرا دیا جائے پس ایسی حالت میں ضیاء الدین احمد ٹرسٹیوں کی توجہ کا بلحاظ قومی ترقی و تعلیم کس قدر مستحق ہے اور جب موقع ملے گا ٹرسٹی ضرور اس کی ترقی پر توجہ فرمائیں گے۔"

اس زمانے میں انٹرمیڈیٹ میں منطق کا مضمون لازمی تھا مگر پروفیسر آرنلڈ جو اس مضمون کو پڑھایا کرتے تھے مستعفی ہو کر لاہور چلے گئے تھے ان کے اور مضامین تو مختلف پروفیسروں میں تقسیم کر دیئے گئے لیکن اس مضمون کو کوئی پڑھانے والا نہ ملا۔ بجٹ میں جدید تقرر کی گنجائش نہ تھی اس لئے ایک سخت قسم کا تردد تھا اس موقع پر ڈاکٹر صاحب آگے بڑھے اگرچہ انہوں نے خود یہ مضمون نہ پڑھا تھا لیکن اس بار کو اپنے ذمہ لے لیا۔ مطالعہ کے بعد پہلے نوٹ تیار کرتے اور پھر لکچر دیتے تھے اور بقول میر ولایت حسین "ایسی پڑھائی کہ امتحان یونیورسٹی میں اعلیٰ نمبروں سے طلبا پاس ہوئے" اور اس سال یونیورسٹی ممتحن کی رپورٹ یہ تھی کہ منطق کی تعلیم علی گڑھ میں بہترین ہوتی ہے۔

مسلمان طلبا عموماً ریاضی سے خائف رہتے تھے اور اس لئے انجینئری وغیرہ کی تعلیم سے انہیں واسطہ نہ تھا ڈاکٹر صاحب نے علاوہ اپنے فرائض منصبی کے یہ انتظام کیا کہ طلباء کی باقاعدہ تربیت و تعلیم کی جانے لگی اور وہ رڑکی انجینئرنگ کالج و نیز محکمہ جنگلات کے مقابلہ کے امتحانوں میں شریک ہونے لگے۔ انہوں نے اس کام کے لئے مساحت پر ایک کتاب بھی لکھ ڈالی۔ علاوہ ازیں امتحان کے قریب گھر پر پڑھایا کرتے تھے اور ہفتہ میں دو مرتبہ عموماً ان کے گھر رات کو ایک جلسہ ہوا کرتا تھا اور باتوں باتوں میں وہ مشکل سے مشکل مسائل ریاضی اپنے طلباء کے ذہن نشین کر دیا کرتے تھے۔ اس قسم کے غیر معمولی کاموں کا انہوں نے کبھی کوئی معاوضہ طلب نہیں کیا۔

سرسید کی وفات کے بعد مدرسۃ العلوم فنڈ کی جانب [illegible] کی تحریک شروع ہوئی ڈاکٹر صاحب نے اس سلسلے میں جس
چارہ جوئی سے کام لیا اسے جاننے کے لئے محسن الملک کی تقریر کا اقتباس کافی ہے۔ نواب صاحب نے کہا کہ:

"مرحوم کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ کانفرنس کا اجلاس کلکتہ میں ہو لیکن تیرہ سال تک کسی قسم کا اسباب [illegible] ہوئی آخر یہ قرار پایا کہ
کانفرنس کلکتہ بھیجا جائے [illegible] مسلمانوں پر [illegible] ایک شخص ہے جس کو [illegible] حق [illegible]
اس نے محض قومی بھلائی کے خیال سے [illegible] سفر [illegible] سرسید [illegible] اس [illegible]
[illegible] اگر وہ [illegible] کلکتہ [illegible] اس وقت پانچ سو [illegible] کلکتہ [illegible]
[illegible] کلکتہ [illegible] کسی سے [illegible] کانفرنس [illegible]
[illegible] وہاں [illegible] سرسید [illegible] کلکتہ میں [illegible]
مسلمانوں کی [illegible] ایک گروہ کی کوشش [illegible] بھلائی کے لئے کی جاتی ہے [illegible]
[illegible] مسلمانوں [illegible]
وہاں بھی موجود ہے [illegible] سرسید [illegible] کے
کمیٹی کی بنا پڑی اور وہاں کے [illegible] اصحاب نے محمڈن [illegible] کانفرنس [illegible]
میں کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا۔ [illegible] اس حصے میں [illegible] بھلائی کے [illegible]
نہایت کامیاب اور نتیجہ خیز ثابت ہوا۔"

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی تحریک سے کالج میں انجمن [illegible] قائم ہوئی جس کا [illegible] غریب طلبا کی امداد کے لئے
روپیہ جمع کرنا تھا۔ طلبا اپنے تعطیل کے زمانے میں انفرادی طور پر جمع کرتے تھے اور انگریزی تعلیم [illegible] مسلمانوں کو رغبت دلاتے تھے [illegible]
[illegible] ترقی ہو جاتی تھی [illegible] مقصد [illegible] مسلمانوں [illegible] انگریزی تعلیم کی ضرورت کا [illegible]
کردیا اور مسلمانوں کے خیالات کالج کی طرف سے [illegible] ڈاکٹر صاحب انجمن کے [illegible] مقرر ہوئے تو انہوں نے بجائے
انفرادی کوشش کے طلبا کو مختلف مقامات پر وفد کی صورت میں روانہ کیا۔ تاکہ وہ بڑے بڑے شہروں اور قصبوں میں جلسے کریں اور کالج
کے متعلق تقاریر کے ذریعے لوگوں پر ضرورت اور اہمیت کا اظہار کریں۔ اس سلسلے میں وہ [illegible] تقریر کرنے کی صلاحیت کو تربیت
کرکے ابھارتے تھے اور اچھے مقررین کے لئے انعام بھی مقرر کرتے تھے۔ ان وفود کا یہ نتیجہ نکلا کہ جہاں آٹھ سال میں ۱۸۹۵ء تک انجمن
کو قریب پانچ ہزار روپیہ کے ملا تھا وہاں پانچ سال میں یعنی ۱۸۹۵ء سے ۱۹۰۱ء تک قریباً اکیس ہزار روپیہ وصول ہوا۔ وہ انجمن سے بیس سال
تک متعلق رہے۔ اس عہد میں انجمن کو تین لاکھ تریپن ہزار کی آمدنی ہوئی۔ انہوں نے اپنی آخری رپورٹ میں لکھا تھا کہ:

"ڈیوٹی کا فرض ہے کہ وہ اس قدر روپیہ جمع کرے جس سے مستقل طور پر کم از کم ایک ہزار طالب علم بلا کسی قسم کا خرچ کئے
ہوئے تعلیم پا سکیں ورنہ خوف ہے کہ مسلمان پورے طور پر اس مجوزہ محمڈن یونیورسٹی سے فائدہ اٹھانے سے معذور
رہیں گے۔"

وہ نادار اور ہونہار طلبا کی امداد کے لئے طرح طرح کی ترکیبیں سوچتے رہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے بار بار پرنسپل اور کارکنان کالج
پر زور دیا کہ نادار طلبا کو تعلیم اور اقامت کے اخراجات میں رعایت ملنی چاہئے چنانچہ ان کی مساعی بار آور ہوئیں اور وظائف [illegible] جاری ہو
گئی [illegible] کا کل خرچ دس روپیہ ماہوار اور ایف اے کا [illegible] روپیہ ماہوار مقرر کر دیا گیا۔ تنخواہ کی کمی کے باعث اساتذہ مشکل سے [illegible]

لہٰذا ڈاکٹر صاحب کی کوشش سے یہ طے پایا کہ جو اساتذہ ہاسٹل میں رہنا پسند کریں ان سے صرف ۵ روپیہ [illegible]۔

(۲)

ڈاکٹر صاحب نے باوجود کثیر مشاغل و فرائض منصبی کے ۱۸۹۵ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے اور ۱۸۹۸ء میں [illegible] کیا اور ۱۹۰۱ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے ڈی ایس سی اوّل درجہ میں پاس کیا۔ مسٹر ماریسن پرنسپل نے اپنی سالانہ رپورٹ میں لکھا کہ

"امتحانات یونیورسٹی کا ایک نتیجہ علی گڑھ میں نہایت اطمینان کا باعث ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ پروفیسر ضیاء الدین احمد نے ڈی ایس سی کا امتحان اوّل ڈویژن میں پاس کیا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین نے کالج اور مسلمانوں کی قوم کے متعلق اس قدر کام اپنے ذمہ لئے ہیں کہ اس بات کا سمجھنا مشکل ہے کہ انہوں نے اپنے پرائیوٹ مطالعہ کے لئے کب وقت نکالا ہوگا۔ انہوں نے ایسے طریقہ پر یہ وقت نکال لیا کہ وہ یونیورسٹی الٰہ آباد کی تعریف و توصیف کے مستحق ہوئے ہم یقیناً اس بات کی امید کر سکتے ہیں کہ ڈاکٹر ضیاء الدین کیمبرج میں تحصیل علوم کے لئے عنقریب انگلستان کے واسطے روانہ ہو سکیں گے اور اگرچہ علی گڑھ کی سوسائٹی کو ان کے چلے جانے سے نقصان پہنچے گا مگر ہم میں ہر شخص اس بات کے خیال سے خوش ہوگا کہ ان کو موقع ملے گا کہ انگلستان جا کر اپنی اعلیٰ قابلیتوں کو اوّل درجہ کے ہندسیں کی نگرانی میں اصل تحقیقات میں صرف کریں اور جب کہ کیمبرج میں تین برس تعلیم پا کر کالج کو واپس آویں گے تو ہمارے ٹیچنگ اسٹاف کو بڑا استحکام حاصل ہوگا۔"

حکومت نے اعلیٰ تعلیم کے لئے ڈاکٹر صاحب کو وظیفہ دیا ان ہی دنوں سر آغا خاں نے تین ہزار روپیہ سالانہ کالج کے لئے منظور کئے لیکن اس رقم میں سے نصف ڈاکٹر صاحب کے لئے مخصوص کر دی تاکہ وہ یورپ میں زیادہ عرصہ رہ کر مزید قابلیت حاصل کر سکیں۔ اکتوبر ۱۹۰۱ء میں ڈاکٹر صاحب نے ٹرنٹی کالج کیمبرج میں داخلہ لیا اور وہاں سے ریاضی آنرز میں ڈگری حاصل کی تمام پاس شدہ امیدواروں میں ان کا نمبر اوّل تھا۔ ۱۹۰۲ء میں انہیں سر آئزک نیوٹن سکالرشپ ملا وہ پہلے ہندوستانی تھے جنہیں یہ اعزاز حاصل ہوا۔ کیمبرج میں انہوں نے سید علی بلگرامی کی سرپرستی میں ایک مسلم سوسائٹی قائم کی جہاں ہفتہ میں ایک بار کسی مشہور مسلمان کی زندگی اور کارناموں پر مضامین پڑھے جاتے تھے۔

ٹرنٹی کالج میں ایک لطیفہ یہ ہوا کہ جتنی بڑی داڑھی ڈاکٹر صاحب کی تھی اتنی ہی ان کے ٹیوٹر کی تھی۔ ایک دن ٹیوٹر نے کہا کہ یہ بڑی دلچسپ اور مضحکہ خیز بات ہے کہ یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ میں تمہارا ٹیوٹر ہوں یا تم میرے ٹیوٹر ہو۔ [illegible] معلوم کرکے ڈاکٹر صاحب نے اپنے ٹیوٹر کی خاطر داڑھی منڈوا دی لیکن وہاں سے فارغ ہونے کے بعد پھر رکھ لی جو آخر وقت تک رہی۔ دوسری عجیب بات اس دور کی یہ ہے کہ وہ حسب عادت عموماً امتحان سے قبل رات گئے تک مطالعہ میں مصروف رہا کرتے تھے اور جب سونے کا ارادہ کرتے تب بھی ریاضی کے مسائل دماغ میں گھومتے رہتے اور نیند نہ آتی۔ جب دو ہفتے اسی طرح گزر گئے تو انہوں نے اپنے ٹیوٹر کے مشورہ سے ایک ماہر ڈاکٹر کی طرف رجوع کیا اس نے خوب معائنہ کرنے کے بعد رائے دی کہ فوراً ہندوستان واپس چلے جاؤ ورنہ دماغ خراب ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب یہ سن کر واپس چلے آئے اور اپنی قوت ارادی سے علاج شروع کیا اور یہ مشق بہم پہنچائی کہ جیسے ہی کتاب بند کرتے تمام مسائل دماغ سے خارج ہو جاتے اور خالی الذہن ہو کر سو جاتے اور جب کتاب کھولتے تو تمام مسائل پھر دماغ میں آ جاتے۔ جب کئی ہفتے اس کی مشق کر لی تو پھر اسی ڈاکٹر سے جا کر ملاقات کی اس نے پھر معائنہ کیا اور کہا اب حالت درست ہے ہندوستان جانے کی ضرورت نہیں جب اسے یہ معلوم ہوا کہ کس طرح ڈاکٹر صاحب نے خود علاج کیا تو اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ یہ قوت ارادی کا کرشمہ آخر وقت تک رہا۔ جب چاہتے اور جتنے وقت کے لئے چاہتے سو جایا کرتے تھے اور بروقت بیدار ہو جاتے تھے۔ ۱۹۰۴ء میں انہوں نے گوٹنجن یونیورسٹی

ہونے کی صورت میں پہلا ہے۔ ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی جہاں ان پیرس اسی کی یونیورسٹی میں پھر وہ مصری علوم کے ماہرین سے بھی ملے
گزشتہ صدی کا پیامبر ہوا۔ ان کا لکھا ہوا کلام ۱۹۱۳ء میں ہندوستان کے اخبارات میں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ سب اہل وطن ہندو قریب آ گیا تھا
سے اتفاق سے دوسرے کے کچھ کے نیوز ہندوستان میں لگا تار ہندو ریسرچ کے ڈائریکٹر مقرر ہو گئے تھے انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو ترغیب دی
کہ وہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر کا عہدہ قبول کر لیں لیکن ڈاکٹر صاحب نے انکار کیا۔ اس کے بعد ڈائرکٹر تعلیمات یو۔ پی نے انسپکٹر مدارس کا عہدہ
جس کا مشاہرہ ساڑھے سات سو سے شروع ہوتا تھا پیش کیا لیکن انہوں نے اسے بھی قبول کرنے سے انکار کیا اور نواب محسن الملک کو خط
میں لکھا کہ ۔

"مجھ اور آپ کو ہر قسم کی ملازمت کے لئے پہلا حرف عذاب جو جواب دیں گے وہی پہلا جواب ہوگا۔ ۔ ۔ آج مسٹر
ڈی لا فوس ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن کا خط ملا ہے۔ جس میں انہوں نے ہمارے لیے انسپکٹری قبول
کرنے پر زور دیا ہے۔ میں نے بھی دو ٹوک اس سے انکار کر دیا ہے۔"

۱۹۰۶ء کے اواخر میں ڈاکٹر صاحب یورپ سے واپس ہوتے راستے میں مصر میں قیام کیا۔ یہاں جامعہ ازہر میں طلبائے بیست سے
درس لیا اور وہاں کے اخباروں میں ہندوستان پر مضامین اور مصر کی تعمیر پر کئی مضمون انگریزی میں شائع کئے۔ ایک مضمون میں لکھا۔
بعد کو جب اکثر اسلامی ملک کے اہل قلم سے اور دیگر احباب سے ملاقات کے مواقع حاصل ہوئے ان سے جو گفتگو ہوئی اس سے
میں اس یقینی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس وقت مسلمانان ہند دیگر ممالک کے مسلمانوں سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں اور اگر
دنیا کے مسلمان کسی وقت ترقی کریں گے تو مسلمانان ہند ہی اس ترقی کا باعث ہوں گے اور علیگڑھ اس ترقی کا مرکز ہوگا۔

(۳)

اواخر ۱۹۰۶ء میں ڈاکٹر صاحب نے وطن کی طرف مراجعت کی اور ۱۰ دسمبر کو بصورت علی گڑھ پہنچے۔ نواب محسن الملک پرنسپل
اور اساتذہ وطلبا نے پرجوش استقبال کیا اور جس گاڑی میں وہ سوار ہوئے اس کے گھوڑے کھول دئے گئے وہ طلبانے گاڑی کو کھینچ کر نواب
محسن الملک کی کوٹھی تک پہنچایا۔ اب انہوں نے پروفیسر ریاضی کی حیثیت سے بڑے جوش و خروش اور سرگرمی سے کام شروع کیا۔ پھر حسب
الہ آباد یونیورسٹی کی پروفیسری انہیں پیش کی گئی جس کا مشاہرہ علیگڑھ کی نسبت تقریباً دوگنا تھا مگر انہوں نے اس پیشکش کو قبول کرنے سے انکار کیا
ڈاکٹر صاحب نے مصر میں متعدد پبلک لکچر تعلیم پر دئے تھے ۔ تقاریر کے دوران میں انہوں نے مصریوں کو مشورہ دیا تھا کہ ان کی پسماندگی
کا سبب برطانوی پالیسی ہے اور اس پالیسی پر انہوں نے سخت نکتہ چینی کی تھی مصریوں کو یہ بھی مشورہ دیا تھا کہ تعلیم کو عام کرنے کی کوشش کی
جائے اسی پر ملک کی ترقی کا دار و مدار ہے۔ ان کے یہ خیالات برٹش ہائی کمشنر مقیم مصر کو ناگوار گزرے اور انہوں نے دوران ملاقات میں ان کی
تقاریر پر اعتراض کیا ڈاکٹر صاحب نے صاف طور پر کہہ دیا کہ میں اپنی رائے کے اظہار میں آزاد ہوں۔ یہ سب معاملات وائسرائے ہند کو مطلع
کر دئے گئے اور برطانیہ سے ہدایات جاری ہوئیں کہ ضیاء الدین کی خاص طور پر نگرانی کی جائے۔ اس کے خیالات باغیانہ ہیں۔

چنانچہ جب وہ ہندوستان واپس آئے تو یہاں کے حالات کا معائنہ کرنے کے بعد انہیں اپنے خیالات میں ترمیم کرنی پڑی۔ تقسیم بنگال
سے مسلمانوں کو سیاسی ترقی کا موقع ملا تھا۔ شملہ ڈیپوٹیشن کے نتائج کا انتظار تھا۔ لہٰذا مسلمان حکومت سے کسی طرح بگاڑ پیدا کرنا نہیں چاہتے
تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے بھی نواب محسن الملک کے مشورہ سے مصلحت وقت کا تقاضا دیکھتے ہوئے اپنی زبان بند رکھی۔ لیکن باوجود
اس کے کئی سال تک خفیہ پولیس ان کی نگرانی کرتی رہی۔ ان کے مکان سے تمام وہ تعلیمی لٹریچر جو وہ یورپ اور مصر سے لائے ۔ چوری
کرا لیا گیا۔ خفیہ پولیس کے اس افسر نے جو ان کا نگراں تھا ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ڈاکٹر صاحب سے اس چوری کا اقرار کیا۔

ڈاکٹر صاحب ان پروفیسروں میں نہ تھے کہ جن کی سرگرمیاں صرف کلاس روم تک محدود رہتی ہیں۔ انہوں نے اپنے یورپ کے تجربے اور علم کی بنا پر ایجوکیشنل کانفرنس میں ابتدائی تعلیم کی اصلاحات سے متعلق ایک اسکیم پیش کی۔ انہوں نے تجویز کیا کہ مدرسے قائم کیے جائیں اور ان کے ذریعہ بچوں کو تعلیم دی جائے۔ علاوہ ازیں ایسے بڑی عمر کے لوگ جن کی تعلیم ادھوری رہ گئی ہے اور جو تعلیم کے شائق ہوں، ان کے [illegible] میں لیکچروں کا پروگرام مرتب کیا جائے۔ ابتدائی تعلیم مادری زبان ہی میں ہو اور عربی مدارس میں فارسی بھی اختیاری مضمون کے طور پر پڑھائی جائے۔ تاریخ اسلام بھی ایک الگ مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جائے۔ انہوں نے خود علیگڑھ میوزیم اور کنڈرگارٹن اسکول قائم کیا۔ انہوں نے ایک اسکیم ایسی بھی تیار کی جس میں ابتدائی تعلیم بچوں کو کنڈرگارٹن کے اصول پر دی جا سکتی تھی۔ کالج کے طلبا میں تعلیمی نقطۂ نگاہ سے ملک کی سیر و سیاحت کا جذبہ پیدا کیا اور اس طرح ایسے ایکسکرشن ہر سال ہونے لگے۔ انہوں نے یہ بھی تحریک کی کہ علی گڑھ میں ایک اولڈ بوائز کالونی قائم کی جائے تاکہ وہ لوگ مادر علمی کی خدمت کر سکیں چنانچہ اکثر نے علی گڑھ میں مکانات بنا کر سکونت اختیار کر لی۔

۱۹۱۱ء میں جنگ طرابلس اور پھر جنگ بلقان چھڑ گئی۔ ترکوں کی امداد کے لئے ایک کمیٹی کالج میں قائم ہوئی۔ اس کے صدر ڈاکٹر صاحب تھے۔ لڑکوں نے عمدہ کھانا اور عمدہ پہننا ترک کر دیا۔ اس سے جو بچت ہوتی وہ ترکی فنڈ میں دے دی گئی۔ ڈاکٹر انصاری کے طبی مشن کو بیش بہا امداد ملی اور کچھ طلبا نے اپنی خدمات پیش کیں۔ غرض ترکی امدادی فنڈ میں طلبا نے قریباً دو ہزار روپیہ جمع کر دیا۔

۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم چھڑ گئی۔ طلبائے علی گڑھ میں ترکوں سے ہمدردی اور سیاسی بیداری کا جذبہ زوروں پر تھا۔ حکومت ہند اس طرف سے خائف تھی لیکن نظم و ضبط قائم رہا۔ طلبا نے امپیریل ریلیف فنڈ کے لئے چندہ بھی جمع کیا اور ایمبولنس کور میں بھی خدمات انجام دیں۔

۱۹۱۷ء میں حکومت ہند نے کلکتہ یونیورسٹی کی تحقیقات کے لئے سیڈلر کمیشن مقرر کیا۔ اس کا ایک ممبر ڈاکٹر صاحب کو بھی مقرر کیا گیا۔ چنانچہ دو سال تک ڈاکٹر صاحب علی گڑھ سے الگ رہے اور کمیشن کے کام میں منہمک رہے۔ میٹرک میں مسلمان طلبا کی ناکامی کے پست ترین اعداد و شمار سے انہیں شبہ ہوا اور انہوں نے تحقیقات شروع کی۔ بنگال بھر کے مختلف مراکز امتحان کی کاپیاں منگوا کر خود جانچا تو انہیں یقین ہو گیا کہ مسلمان طلبا ہندو متعصب ممتحنوں کا شکار ہوتے ہیں اور انہیں قصداً فیل کیا جاتا ہے کیونکہ اس زمانے میں طلبا امتحانات کی کاپیوں پر نام لکھتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی سفارش پر نام کے بجائے رول نمبر لکھے جانے لگے۔

۱۹۱۸ء میں کالج کے اندرونی خلفشار کے باعث انگریز پرنسپل اور اس کے ساتھ انگریز اساتذہ نے ملازمت سے استعفا دے دئیے جو منظور کر لئے گئے۔ اور جنوری ۱۹۱۹ء سے ڈاکٹر صاحب کا تقرر پرنسپل کے عہدہ پر ہوا۔

(۴)

کچھ عرصہ سے کالج کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی تھی۔ بجٹ کی حالت متزلزل تھی۔ انگریز اساتذہ کے چلے جانے سے حکام ضلع اور محکمہ تعلیم ناراض تھا۔ ادھر کالج کے ٹرسٹیوں اور اولڈ بوائز میں معرکہ آرائیاں ہو رہی تھیں۔ ان حالات میں ڈاکٹر صاحب نے پرنسپلی کا جائزہ لیا۔ ان حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب مئی ۱۹۱۹ء میں کالج تعطیلات کے لئے بند ہوا تو تعداد طلبا صرف ۱۸۱ رہ گئی تھی۔ حالانکہ ایک وقت وہ بھی تھا کہ ۱۲ سو سے زاید طلبا تھے جن میں قریباً ایک ہزار بورڈر تھے۔

حالانکہ ڈاکٹر صاحب کا تقرر مشروط ہوا تھا کہ جب تک انگریز پرنسپل ملے کام کریں۔ لیکن انہوں نے نہایت سرگرمی سے کام شروع کر دیا۔ سب سے پہلے حکومت کے حکام کی خوشنودی ضروری تھی تاکہ الحاق فسخ کرنے کی دھمکیاں اور گرانٹ بند کرنے کا خوف دور ہو سکے۔ ڈاکٹر صاحب نے گورنر صوبہ کو دعوت دی اور انہوں نے کالج کا معائنہ کر کے نہایت عمدہ خیالات کا اظہار کیا اور ایک ہزار اپنی جیب خاص سے عنایت فرمایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کالج کی سالانہ آمدنی چوگنی ہو گئی۔ مرکزی حکومت کی گرانٹ کا روپیہ رکا ہوا تھا وہ اضافہ کے ساتھ وصول ہوا۔ کالج میں بیداری کا شعبہ

ختم ہوگیا - چنانچہ طلبہ کو بہت جلد کالج کا نظم بگڑ جانے کا خطرہ ہوا۔

سب سے پہلے یہ کہ اتحاد کا خطرہ کالج کا نظام پیچیدہ مشکلات زدہ حالت میں رہ جاتا تھا گزشتہ چند سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کالج کا تنزل کس درجے پہنچ چکا ہے۔ احساس تھا گورنمنٹ ... جو کہ نہ معقول ... سے نہیں دیکھتی تھی کہ زمانہ سابق میں دیکھتی تھی چنانچہ اس احساس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تعداد طلبا کی ہوتی تھی جب کہ سنہ ۱۹۱۹ء کالج کا بجٹ ہوا کہ تعداد طلبا (۷۸۰) تھی کیونکہ طلبا امتحان سے رہ جاتے تھے کالج ... مدرسہ کی اگست ... (۳۰۰) نئے داخلے ہوئے دوسری ۱۹۲۰ء میں (۹۰۰) تک تعداد پہنچی جن میں (۶۳۰) نوجوان تھے۔ یہ اضافہ بڑی حد تک ڈاکٹر ضیاء الدین کی ذاتی کوشش کا نتیجہ تھا۔ ساتھ ہی انجمن ... نے زیادہ تعداد میں قرضے دیے۔ ... (۱۰۰) طلبا اس طرح پیدا ہوئے۔

ترشیحل اور ... ایسوسی ایشن نے ڈاکٹر صاحب کی خدمات کے اعتراف میں قرارداد پیش کی۔

کالج کی حالت پوری طرح سنبھلنے کا موقع نہیں ملا تھا کہ مرحومت کا ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا ... یہ ایک سخت مصیبت کا وقت تھا ڈاکٹر صاحب پر کبھی زوال ... کے ہیں ... وہ بات ... تھے کبھی جیسے ہو رہے ہیں کبھی ... سے لڑتے رہے کبھی طلبائے سرپرستوں کو خطوط لکھے جو ہر ہے ... اپنے لڑکوں کو مختلف کاموں میں لگائے رکھتے تھے۔ انہوں نے اول تو مولانا شوکت علی سے اگست ہی میں وعدہ لے لیا کہ علیگڑھ کو نظر انداز کیا جائے گا پھر جب اکتوبر میں حضرت ... پہنچے تو گاندھی جی کو یہ وعدہ یاد دلایا آپ نے تو مارچ ہی میں وعدہ کر لیا تھا کہ طلبا کو ہدایت کریں گے کہ ... انہوں نے جواب دیا سیکرٹری کی بہت اور تنگ ظرفی سے میری رائے پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ مولانا محمد علی سے انہوں نے کہا قومی یونیورسٹی کی اسکیم اگر ... شروع جاری کرنے کو تیار ہیں کہ اگر قوائے ہندوستان کے ماہرین تعلیم ... کریں اور آپ علیگڑھ کالج کو چھوڑ دیں انہوں نے ... حکومت سے کسی قسم کا بھی تعلق نہیں رکھنا چاہتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کی رات دن کی مساعی ... کی بدولت ... طلبا ... میں سے ۳۰۰ باقاعدہ پرنسپل سے اجازت لے کر گھروں کو روانہ ہوگئے۔ قومی یونیورسٹی کے لئے صرف ... طلبا رہ گئے۔ ... ڈاکٹر صاحب ... اسٹرائک کی نوبت آنے دی اور نہ کوئی تصادم آپس میں ہوا۔ انہوں نے زیادہ تر بار اولڈ بوائز پر ڈال دیا۔ ... سے ... ہوگئی۔ اشتعال ... سے قطعی پرہیز کیا۔ غرض اسی طرح ۲۹ اکتوبر کو کالج بند کر دیا گیا۔ جب دسمبر میں کالج کھلا تو وہ ترقی کر کے مسلم یونیورسٹی ہوگیا تھا۔ غرض ڈاکٹر صاحب کی دلیری، ہمت اور حسن تدبیر نے میدان مار لیا۔ یونیورسٹی کا دستور اساسی ڈاکٹر صاحب ہی کا تیار کیا ہوا تھا۔

(۵)

یکم دسمبر ۱۹۲۰ء کو ایک ناقص ایکٹ کے ذریعہ مسلم یونیورسٹی معرض وجود میں آئی۔ وائس چانسلر راجہ صاحب محمود آباد نامزد کئے گئے۔ اور حکومت نے کورٹ کی تشکیل تک مکمل اختیارات راجہ صاحب کو سونپ دیئے۔ وہ ڈاکٹر صاحب کے سخت مخالف تھے انہوں نے ان کی پرنسپل کے تقرر پر بھی مخالفت کی تھی۔ اور اب پرو وائس چانسلر کے عہدہ کے لئے وہ کسی انگریز کے متلاشی تھے اس وقت نہ کوئی انگریز اس بار کو اٹھانے کے لئے تیار تھا اور نہ کوئی مسلمان بھروسے کا مل رہا جو تمام حالات پر قابو پاسکے۔ مجبوراً ڈاکٹر صاحب ہی پرو وائس چانسلر بنا دیئے گئے۔ لیکن ہر معاملہ اور ہر کام میں راجہ صاحب روڑے اٹکاتے تھے۔ اختیارات سب ان کے ہاتھ میں تھے اور وہ علیگڑھ سے اکثر غیر حاضر رہتے۔ ڈاکٹر صاحب کی ذمہ داریاں بے شمار لیکن اختیار کچھ بھی نہیں مگر ڈاکٹر صاحب جو علیگڑھ کی خدمت میں دھن کے پکے تھے ڈٹے رہے اور بقول میر ولایت حسین صاحب "ڈاکٹر صاحب یونیورسٹی کے کام میں اپنے تعلیمی تجربہ اور استقلال کی مدد سے راجہ صاحب کو

تک دیکھتے رہے۔

مہاراجہ صاحب محمود آباد چونکہ یو پی گورنمنٹ میں ہوم ممبر بھی تھے۔ انہیں مجبوراً وائس چانسلری سے استعفیٰ دینا پڑا۔ ان کے بعد نواب مزمل اللہ خان نے کام کیا لیکن دسمبر ۱۹۲۳ء میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں وائس چانسلر منتخب ہو گئے۔ اس انتخاب سے پہلے مہاراجہ صاحب نے صاحبزادہ صاحب کو ڈاکٹر صاحب کی طرف سے بدگمان کر دیا تھا چنانچہ انہوں نے بھی تعلیمی انتظام میں جس کی ذمہ داری ڈاکٹر صاحب پر تھی مداخلت شروع کر دی اور ایک ناگوار صورت پیدا ہو گئی۔ ان حالات سے مجبور ہو کر ڈاکٹر صاحب نے سوا ماہ تک صبر و سکون سے حالات کا مقابلہ کرنے کے بعد استعفیٰ دے دیا۔ ادھر یونیورسٹی کا جشن جوبلی ہونے والا تھا اور صاحبزادہ صاحب پر مزید جانتے تھے کہ بغیر ڈاکٹر صاحب کے کام چلنا ناممکن ہے انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے خط کے جواب میں ایک طویل خط لکھا اور آخر میں یہ تحریر کیا کہ:

"ہمارے ادارہ کی کامیابی ہر حالت میں اس امر کی متقاضی ہے کہ اس کو ان دیگر لیفٹننٹوں کے ماتحت چلایا جائے جو تیار ہو چکے ہیں ... اور اس معاملہ میں آپ کا اور صرف آپ کا تجربہ اور اثر نہایت ضروری ہوگا ...... جوبلی کی کامیابی کا اثر قوم کی سیاسی تنظیم پر بہت گہرا پڑے گا ... آپ کا علیٰحدہ کر ایسے موقع پر چھوڑ جانا میرے نزدیک مخالف اور قومی مفاد کے خلاف ہوگا ... میں آپ کا چھٹی تک پر جانا پسند نہیں کرتا لہٰذا آپ کا استعفیٰ جہاں تک کے متعلق ہے اس کو میں کبھی بھی خوش آمدید نہیں کہہ سکتا ——"

الغرض بڑی رد و قدح کے بعد ڈاکٹر صاحب نے استعفیٰ واپس لے لیا اور جوبلی کے انتظام میں مصروف ہو گئے۔ ۲۰ دسمبر سے ۳۱ دسمبر ۱۹۲۵ء تک یہ تقریب جاری رہی۔ مسلم لیگ اور دیگر مختلف مسلم اداروں کے اجلاس بھی ہوئے۔ ہر مکتبۂ خیال کے مختلف زعما ایک جگہ جمع ہو گئے اور سات ہزار مسلمانوں کا ایک مرکز پر جمع ہو جانا حیرت انگیز امر تھا۔ ان ہی دنوں ہندو مسلم مناقشات کو ختم کرنے کا واحد حل ایک پمفلٹ کے ذریعہ تقسیم ملک کو بتایا گیا تھا۔ یہ پمفلٹ اگرچہ گاندھی جی کے نام کھلا خط کے نام سے پہلے شائع ہو چکا تھا لیکن اسے اس موقع پر دوبارہ کتابی صورت میں شائع کیا گیا جس میں ملک کی مکمل تقسیم کی ایک اسکیم درج تھی۔ جوبلی کا یہ اہتمام و شان ڈاکٹر صاحب کی قوت تنظیم اور طلبا و اساتذہ کے اتحاد، ایثار اور جذبہ و جوش کا مظاہرہ تھا۔

مسلمانوں کا یہ اجتماع و جوش معاندین کو ایک آنکھ نہ بھایا اور اب یونیورسٹی کے خلاف معیار قابلیت اور تناسب نتائج کے متعلق پروپیگنڈا شروع ہوا اس میں سررشتۂ تعلیم کا انگریز ڈائرکٹر میکنزی اور یوپی کا مشہور ہندو اخبار لیڈر شریک تھے۔ اس سلسلے میں صاحبزادہ صاحب کی بعض تقاریر کو جو انہوں نے یونیورسٹی کی اندرونی بدنظمی کے متعلق مہاراجہ صاحب محمود آباد کو بدگمان کر دینے کی بنا پر کی تھیں بنیاد ٹھیرایا گیا۔ غرض صاحبزادہ صاحب اور ڈاکٹر صاحب کے نظریات میں اختلافات بڑھتے ہی گئے ان اختلافات کو ایک طرف تو ہوا دینے والے چند خود غرض علیگڑھ ہی میں موجود تھے۔ اس کے علاوہ حکومت کی سرپرستی بھی حاصل تھی۔ یہ اختلافات آخر یوں ختم ہوئے کہ صاحبزادہ صاحب میدان سے ہٹ گئے اور دسمبر ۱۹۲۶ء میں ان کی میعاد ختم ہونے پر سر ولیم میرس گورنر یوپی کے ایما سے نواب سر مزمل اللہ خان کا انتخاب ہو گیا۔

لیکن جشن جوبلی میں مسلم لیگ کا اجلاس منعقد ہونا قائد اعظم اور دیگر زعما کا وہاں آنا صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کا سوراج کی قرارداد کی تائید کرنا یہ سب امور ایسے تھے کہ صوبہ کے متعصب گورنر کو ایک آنکھ نہ بھاتے تھے وہ نہیں چاہتا تھا کہ مسلم طلبا میں سیاسی بیداری پیدا ہو وہ چاہتا تھا کہ تعداد طلبا محدود ہو اور اساتذہ میں انگریزوں کی اکثریت ہو چنانچہ اس نے ۱۹۲۶ء میں اپنی تقریر کے دوران جب کہ سپاس نامہ کا جواب دے رہا تھا صاف طور پر کہا کہ یونیورسٹی کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ آپ سرسید کے نصب العین کی طرف لوٹ جائیں

اور مقرر نے بھی ایک تقریر میں کہا کہ:

"جب تک مسائل حل ہوں گے اور ان کے حل کرنے کے لئے آپ سرسید کے قائم کردہ اصول پر چلیں گے ——"

یونیورسٹی کی تاسیس کے بعد یو پی گورنمنٹ کے وزیر تعلیم مسٹر چنتامنی تھے جو ایک متعصب ہندو تھے وہ ہمیشہ یونیورسٹی رہا ان کا اسسٹنٹ سیکرٹری تعلیم کا ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن تھا اسے نہ صرف یونیورسٹی سے بلکہ خاص طور پر ڈاکٹر صاحب سے پرخاش تھی کیونکہ اسی سال اپریل میں ڈاکٹر صاحب کی ایک رپورٹ تعلیم سے متعلق ... کی تعلیم پر شدید نکتہ چینی کی گئی تھی۔ اس نے مخالفت شروع کی اور چنتامنی کا اخبار لیڈر یونیورسٹی اور ڈاکٹر صاحب کے خلاف مضامین شائع کرتا تھا۔ صاحبزادہ صاحب نے یونیورسٹی سے الگ ہونے کے بعد یونیورسٹی کے انتظامات کے خلاف شائع کیا۔

ان حالات میں وائسرائے نے بیگم صاحبہ بھوپال جو یونیورسٹی کی چانسلر تھیں ان سے تحقیقاتی کمیشن قائم کرنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ رحمت اللہ کمیشن کا قیام عمل میں آیا۔ ... رحمت اللہ کمیشن سے ... کر دیا ... حضرات کی طرف سے ... حضرات نے شہادت کے دوران میں بہترین مشاغل کا اظہار کیا۔ اور وہ الزام ڈاکٹر صاحب کے خلاف تراشے گئے ان کے خیال سے نفرت کا جذبہ ابھرتا ہے۔ لیکن کمیشن کا کام خفیہ ہدایات کے مطابق ڈاکٹر صاحب کو ہٹانا مقصود تھا۔ ... رپورٹ میں کمیشن ... ایسی بحث بھی ہے جس سے اصلاح کا پہلو نکلتا ہو۔ ... رپورٹ میں درج کر دیا گیا۔ ... یونیورسٹی میں نہیں ہیں۔ اور ذمہ داری کسی کی ہو وہ سب ڈاکٹر صاحب کے سر منڈھ دی گئی اور مصداق ... کی بلا بندر کے سر ... سب کی پاداش میں ایک شخص ڈاکٹر کو ذمہ دار ٹھیرایا گیا ... حکومت کا منشا بھی یہی تھا۔ لیکن کمیشن کو ڈاکٹر صاحب کی قابلیت و خدمات کا اعتراف کئے بغیر چارہ نہ تھا چنانچہ کمیشن رپورٹ کے آخر میں لکھا کہ:

"ہم ڈاکٹر ضیاء الدین کی پختہ علمی قابلیت ان کی فکر اور بعد ازاں یونیورسٹی کی طویل خدمات اور ... سے ان کے گہرے جذبہ محبت کے معترف ہیں لیکن ہم کو یہ بیان کرتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ حالیہ مشکلات میں ان کے ... تعلقات کے پیش نظر ان کی خدمات کا یونیورسٹی میں جاری رہنا ... یونیورسٹی کی ترقی کے منافی ہوگا جو کہ ... کی آئندہ کامیابی کے لئے ضروری ہے۔ غالباً ڈاکٹر ضیاء الدین کے لئے بہترین راہ یہی ہوگی کہ وہ ... ہونے سے پہلے رخصت لے لیں۔"

ڈاکٹر صاحب نے رپورٹ دیکھنے کے بعد ۲۶ مارچ ۱۹۲۸ء کو وائس چانسلر کے سامنے اپنا استعفا پیش کر دیا۔ چونکہ اس خط سے جو ڈاکٹر صاحب نے لکھا تھا ان کی شخصیت اور کارناموں پر روشنی پڑتی ہے لہٰذا اسے ... درج کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ خط یہ تھا:

۲۶ مارچ ۱۹۲۸ء

بخدمت جناب وائس چانسلر صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مائی ڈیر نواب صاحب۔

۱۸۹۵ء میں بی اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد میں ڈپٹی کلکٹری کے لئے نامزد ہوا مگر تھیوڈور بک نے اس کے مقابلہ میں مجھ کو اسسٹنٹ پروفیسری کی حیثیت سے اسٹاف میں شریک ہونے کا مشورہ دیا۔ میرے تقرر کے وقت سرسید علیہ الرحمۃ سے جو حالات پہلی اس میں مجھ سے پانچ سال کی ملازمت کا اقرار نامہ لکھنے کا مطالبہ کیا گیا تھا مگر میں نے اس وقت عرض کیا کہ میرا ارادہ تو کالج میں تمام عمر خدمت کرنے کا ہے اس پر جو اقرار نامہ کا مسودہ انہوں نے میرے لئے خود لکھا تھا اسے پھاڑ ڈالا۔ ۱۹۰۱ء میں میں نے ڈی ایس سی کی ڈگری ...

ڈویژن میں حاصل کی جس کے بعد گورنمنٹ آف انڈیا نے مجھ کو انگلستان جانے کے لئے اسکالرشپ عطا فرمایا ۱۹۰۱ء میں کیمبرج سے رینگلر کی ڈگری لی۔ ۱۹۰۴ء میں سر اسحاق نیوٹن اسٹوڈنٹ شپ اور ۱۹۰۶ء میں میں نے گوٹنگن یونیورسٹی جرمنی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ میں یورپ میں ہی تھا کہ مجھ کو انسپکٹر مدارس کا عہدہ دیا جا رہا تھا۔ مگر میں نے اس سے انکار کردیا وہاں سے واپسی پر علیگڑھ میں ۱۹۰۷ء میں ریاضی کا پروفیسر مقرر ہوا ۱۹۱۰ء میں مسٹر سول کی ماتحتی میں سیکرٹری بنا دیا گیا ۱۹۱۱ء میں مسلم یونیورسٹی کے کانسٹی ٹیوشن کا پہلا مسودہ تیار کرنے کے لئے کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کا سکرٹری مقرر ہوا۔ ۱۹۱۳ء میں مسٹر سول کی عدم موجودگی میں میں پہلے اور کالج کا پہلا قائم مقام پرنسپل مقرر ہوا جنگ طرابلس جنگ بلقان اور مسجد کانپور کے واقعہ کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک ہیجان پیدا ہوگیا تھا جس کا اثر کالج کے طلبا پر بھی پڑا ان میں نہایت بے چینی ظاہر تھی۔ اور ہماری درسگاہ میں ڈسپلن کا نام بھی باقی نہ رہا تھا۔ اپنی قائم مقامی کے زمانے میں باوجود مخالف اثرات کے مجھے طلبا کے دلوں میں کالج کی عظمت قائم رکھنے میں کامیابی ہوئی۔

۱۹۱۷ء میں کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کا ممبر مقرر ہوا میری عدم موجودگی میں آنریری سیکرٹری بورڈ آف ٹرسٹیز اور یورپین اسٹاف میں کچھ غلط فہمیاں پیدا ہوگئیں آخرکار یورپین اسٹاف نے استعفا دیدیا۔ ۱۹۱۹ء میں جب کمیشن سے فارغ ہو کر آیا تو کالج میں طالبعلموں کی تعداد (۱۰۵) رہ گئی تھی کالج کی شہرت کم ہو رہی تھی اور اولڈ بوائز نے یہ خیال کرکے کہ کالج کی قدیم روایات کا خاتمہ ہوگیا ہے علیگڑھ میں دلچسپی لینی چھوڑ دی۔ نومبر ۱۹۱۹ء میں سر ہارکورٹ بٹلر کی تشریف آوری کے موقع سے فائدہ اٹھا کر میں نے قریب پانچ سو اولڈ بوائز کو مدعو کیا اور ہز اکسلنسی کی خاص توجہ کو دلا کر ان میں پھر بھی کالج کے معاملات سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ دوسرے سال تحریک ترک موالات کا حملہ ہوا اور ایمانداری سے میرا یہ یقین تھا کہ اگر اس وقت کالج بند ہوگیا تو مسلمانوں کی قوم کو سخت نقصان ہوگا اس انتشار کی حالت میں کالج کو بند کر دیا گیا اور اس تعلیم گاہ کو بچانے کے لئے مسلم یونیورسٹی ایکٹ کا نفاذ کیا گیا تارکان موالات نے اپنی نیشنل یونیورسٹی ہماری یونیورسٹی کے متصل قائم کر دی تھی میری راہ میں سخت دشواریاں حائل تھیں میں نے متواتر محنت اور جانفشانی سے والدین اور اولڈ بوائز کی ایک بڑی تعداد کو مدعو کرکے ان کی مدد سے یونیورسٹی کے اقتدار کو قائم کر دیا میں نے اسٹرائک کی صورت کو بدل کر لڑکوں پر ان کی درسگاہ کی ذمہ داری کا پورا بار ڈال دیا۔ جوبلی کے موقع پر جب کہ قریب سات ہزار مہمان ہندوستان کے ہر حصہ سے ایم اے او کالج کی پچاسویں سالگرہ کے منانے کو جمع ہوئے تھے یہ اقتدار اور بھی مستحکم ہو گیا۔ اس وقت لوگوں نے بانی کالج کے کام کو جاری رکھنے کے لئے بہت دلچسپی کا اظہار کیا۔

یونیورسٹی کے قیام کے پہلے کئی سال تک نہ کوئی قوانین تھے اور نہ کوئی ضوابط تھے میں نے اپنی سالانہ رپورٹ میں جو فروری ۱۹۲۴ء میں پڑھی گئی تھی مندرجہ ذیل فقرہ لکھا تھا۔

> "جون ۱۹۲۳ء تک مسلم یونیورسٹی کے آرڈیننس وصول نہیں ہوئے تھے اور اس کے قیام کے اول اٹھارہ ماہ تک حکومت ہند نے وائس چانسلر کو پورا اختیار دے دیا تھا کہ کسی قسم کے آرڈیننس یا ریگولیشن بنائیں حتیٰ کہ قوانین کی جس دفعہ کو چاہیں نظرانداز کر دیں یونیورسٹیوں کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ شخص واحد کو اور وہ بھی ایسے شخص کو جو موقع پر موجود نہ ہو اس قدر عرصہ کے لئے اس طرح سے مطلق العنانی کے ساتھ اختیارات دے دئے جائیں بڑا معجزہ ہے کہ یونیورسٹی کا اس دوران میں خاتمہ نہ ہوگیا۔"

بدقسمتی سے مجھ کو اپنے زمانہ میں تین مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑا (۱) آنریری سیکرٹری محمڈن کالج اور وائس چانسلر نے مجھ کو کافی امداد نہیں دی اور اکثر موقعوں پر انہوں نے کھلم کھلا اسٹاف میں میرے خلاف پارٹیاں قائم کیں (۲) میرے دفتر میں کوئی لائق آدمی نہیں تھے (۳) بعض ممبران اسٹاف نے میرے ساتھ مل کر کبھی کام نہیں کیا اور اکاڈمک کونسل میں میرے خلاف ایک منضبط پارٹی بنالئے

لیکن جناب نے اپنے عہدہ کا چارج لینے کے بعد نہایت نیک نیتی کے ساتھ اسٹاف میں اتحاد عمل پیدا کرنے کی کوشش کی مگر افسوس ہے کہ کس طرح آپ کی کوششیں ناکام کی گئیں۔

موجودہ کانسٹی ٹیوشن کے مطابق پرو وائس چانسلر یونیورسٹی کے ہر شعبہ کے متعلق پوری طرح ذمہ دار ہے لیکن اس کو کسی ملازم کے اعلیٰ ملازق اور عہدہ یا ملازمان کی تنخواہ کے معمولی اضافہ کرنے کا بھی اختیار نہیں ہے۔ تمام باتوں کا مدار وائس چانسلر کی مرضی پر ہے خواہ وہ پرو وائس چانسلر کی تجاویز کو اگزیکٹو کونسل میں پیش کریں یا نہ کریں۔ سابق وائس چانسلر راجہ صاحب محمود آباد نے صاف احکام جاری کر دئے تھے کہ پرو وائس چانسلر کو کوئی اختیار نہیں ہے وہ اپنی تجاویز اگزیکٹو کونسل میں براہ راست بھیجے اس پر اس وقت سے عمل ہو رہا ہے۔ پرو وائس چانسلر کی حیثیت ڈکٹیٹر کے بالکل برعکس ہے خدا کرے کہ میرے جانشین مجھ سے زیادہ خوش قسمت ہوں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یونیورسٹی کے چلانے میں سب سے بڑی جو مشکل ہے وہ یہ ہے کہ پرو وائس چانسلر پر تمام ذمہ داریاں ہیں مگر کوئی اختیار نہیں ہے اور وائس چانسلر کو تمام اختیارات حاصل ہیں۔ مگر کوئی ذمہ داری کچھ بھی نہیں ہے۔

ایم اے او کالج کے پرنسپل صحیح طور پر یا غلطی سے اپنے سابق طلبا کو ساتھ رکھنا ضروری خیال کرتے تھے تاکہ وہ مطمئن رہیں۔ نواب وقار الملک مرحوم کے مستعفی ہونے کے بعد سے میں نے اس فرض کو انجام دیا اور میں ہمیشہ اس روایت کو قائم رکھنا ضروری خیال کرتا تھا کہ جن کو سر سید علیہ الرحمۃ۔ نواب محسن الملک۔ مسٹر تھیوڈور بیک اور مسٹر تھیوڈور ماریسن نے قائم کیا تھا ان تمام صاحبان سے میرا گہرا تعلق رہا ہے اور ان کے ساتھ کام کرنے کا مجھے فخر حاصل ہے

میری رائے خواہ وہ غلط ہو یا صحیح ہمیشہ یہی رہی کہ گورنمنٹ سے خوشگوار تعلقات قائم رکھنا یونیورسٹی کے بنیادی مقاصد میں سے ایک مقصد ہے میں نے ہمیشہ نیک نیتی سے اس روایت کو برقرار رکھنے کی کوشش کی اگرچہ اس میں مجھ کو اکثر کامیابی نہیں ہوئی۔ بہرحال ممکن ہے کہ اکثر موقعوں پر غلطی ہوئی ہو اور ممکن ہے کہ اکثر میری رائے صحیح نہ ہوئی ہو لیکن میرے ذہن میں ہمیشہ ایک ہی خیال رہا ہے اور وہ یہ کہ جو کچھ میری سپردگی میں ہے اس کو بہترین مصرف میں لاؤں۔

۱۹۲۵ء سے میں پرو وائس چانسلری سے مستعفی ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ۲۰ اپریل ۱۹۲۵ء کو تیس سال ملازمت کرنے کے بعد میں نے سابق وائس چانسلر صاحب سے استدعا کی تھی کہ وہ اکتوبر ۱۹۲۵ء سے مجھ کو پرو وائس چانسلری کے فرائض سے سبکدوش کر دیں۔ لیکن انہوں نے ایک خط مورخہ یکم مئی ۱۹۲۵ء میں مجھ کو یونیورسٹی کے مفاد کے خیال سے استعفا دینے سے منع فرمایا۔ ایک سال بعد ۱۹۲۶ء میں انہوں نے میرے دوبارہ تقرر کی مندرجہ ذیل الفاظ میں سفارش کی:

"یونیورسٹی کو ایسے پرو وائس چانسلر کی ضرورت ہے جو قوم کی خاص ضرورتوں اور ملک کے مروجہ تعلیمی نظام سے واقف ہو اور پرو وائس چانسلر کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ملک کے مختلف حصوں کے طلبا کے والدین سے ذاتی تعلقات رکھتا ہو۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کی خاص لیاقت اور قابلیت میں یہ تمام اوصاف پائے جاتے ہیں"

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے ریٹائر ہونے کے بعد میں نے آپ سے مئی ۱۹۲۶ء میں عرض کیا تھا کہ مجھ کو میرے موجودہ فرائض سے سبکدوش کر دیا جائے آپ نے مجھ سے زبانی فرمایا تھا کہ تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ کے پیش ہونے تک میں توقف کروں۔

اس قدر عرض کر دینا بے جا نہ ہوگا کہ دوران قیام علیگڑھ میں مجھ کو مختلف محکموں کی ملازمت ملتی رہی ہے لیکن میں نے اپنی تقرری کے وقت جو وعدہ کیا تھا اس کا لحاظ کر کے میں نے ان کے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اب مجھ کو پورے طور پر یقین ہو گیا ہے کہ میں یونیورسٹی کی بہتر خدمت اس سے اپنے باضابطہ تعلقات ختم کرنے سے زیادہ کر سکتا ہوں لہٰذا بغیر کسی پس و پیش کے اپنے استعفے کو پیش کر کے استدعا

ادا کرتا ہوں اور آپ سے متمنی ہوں کہ جلد سے جلد جس طرح بھی ہو آپ اور آنریبل کونسل مناسب سمجھے اسے منظور کیا جائے۔

آپ کا صادق

ضیاء الدین احمد

استعفا بعد اعتراف خدمات منظور فرمایا گیا اور آنریبل کونسل نے طے کیا کہ اس استحقاق رخصت کی جائے جو کہ ان کو حاصل ہے اور اس کی تنخواہ ان کو دی جائے جو دو ہزار روپیہ ہوتی ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے بذریعہ ایک خط وائس چانسلر کو مطلع کیا کہ مجھے اس رقم کے لینے سے انکار ہے۔ انہوں نے لکھا کہ:۔

"میں نے آپ کو اپنے استعفے کے دوران میں لکھا ہے کہ اس ادارہ کی خدمت میں میرا مقصد کام ہے نہ کہ معاوضہ حاصل کرنا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے اپنی تیس سال کی ملازمت میں کبھی فرلو حاصل نہیں کی اور نہ کبھی تعطیلات کو کسی کام میں لایا اور ان تمام تعطیلوں میں یونیورسٹی کے مفاد کی خاطر اپنے خرچ سے دورہ کرتا رہا۔ اب میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں نے اپنا فرض پورا کیا ہے۔ یہی میرا معاوضہ ہے۔ میں آپ کا اور آنریبل کونسل کا اس مہربانی کے لئے مشکور ہوں۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں کوئی فرلو یا اس زمانے کے حق رخصت کی تنخواہ قبول نہیں کر سکتا اور نہ میں اس چیز کو منظور کر سکتا ہوں جس کو میں اپنے زمانہ ملازمت میں جائز نہیں سمجھتا تھا۔"

پارٹی میٹنگ کے قائم کرنے سے جو مقصد تھا یعنی مسلمانوں کی تعلیمی ترقی میں رکاوٹ ڈالی جائے اور ڈاکٹر ضیاء الدین کو الگ کر دیا جائے وہ حاصل ہو گیا۔ جس شان کے ساتھ ان کا استقبال یورپ سے واپسی پر کیا گیا تھا اس سے کہیں زیادہ دھوم دھام کے ساتھ انہیں رخصت کیا گیا۔ علیگڈھ سے رخصت ہونے کے بعد ایسے رہے کہ جیسے علیگڈھ سے کوئی واسطہ ہی نہیں دوست احباب سے خط و کتابت جاری رہتی تھی لیکن علیگڈھ کے نظم و نسق کے متعلق ایک حرف بھی نہیں ہوتا تھا۔ خدا نے انہیں غیر معمولی ضبط کا مادہ عطا کیا تھا یہ کام ہر ایک انسان کا نہیں ہے کہ اس طرح یک سو اور بے تعلق ہو جائے۔

ڈاکٹر صاحب مئی ۱۹۲۸ء میں یورپ چلے گئے اس سفر کا مقصد تعلیم پر اپنی کتاب کے لئے مواد جمع کرنا تھا دوران قیام انگلستان میں دو لطیفے ہوئے جو قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر صاحب سے لندن ٹائمز کے تعلیمی ایڈیٹر نے ملاقات کی۔ دوران ملاقات میں اس نے حیرت سے کہا کہ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ ۱۹۲۶ء میں تو مسلسل بہ صدائے اتفاق رائے ہندوستان میں علیگڈھ سے بہتر کوئی یونیورسٹی نہیں لیکن کچھ ماہ بعد ہی یہ کہا جانے لگا کہ اس سے بدتر کوئی ادارہ نہیں۔ عروج ترقی سے اترنے کے لئے کم سے کم پانچ سال کا عرصہ درکار ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فوراً جواب دیا کہ ۱۹۲۵ء کی جوبلی اس کا سبب ہے۔ جب تک یونیورسٹی ترک موالات کا مقابلہ کرتی رہی حکومت تعریفیں کرتی رہی اور جب جوبلی پر تمام مسلم زعما ایک جگہ جمع ہو گئے تو حکومت کو خوف ہوا کہ اب یہ علیگڈھ مرکزی حیثیت حاصل کرنے والا ہے اس لئے توڑنے کے لئے سب کچھ کیا گیا یونیورسٹی ویسی ہے جیسی تھی۔ دوسرا لطیفہ یہ ہے کہ ایک روز سر ولیم میرس سابق گورنر یوپی نے جو کہ اب انڈیا کونسل کے ممبر تھے ڈاکٹر صاحب کو لنچ پر مدعو کیا دوران گفتگو میں انہوں نے ایک سوال کیا کہ علیگڈھ میں اب کچھ Troubles تو نہیں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے برجستہ جواب دیا آپ خود Troubles تھے آپ کے آنے کے بعد کچھ بھی نہیں۔

۱۹۳۰ء میں ڈاکٹر صاحب مرکزی اسمبلی کے انتخاب میں کامیاب ہوئے اور اسمبلی میں پہنچ کر انہوں نے ملک و قوم کی بیش بہا خدمات کیں۔

(۶)

ڈاکٹر صاحب کی سبکدوشی کے بعد سر راس مسعود کا انتخاب ہوا اور عبوری دور کے لئے سر شاہ سلیمان کو کام سپرد کیا گیا علیگڈھ میں ایک

کا معاملہ چھیڑنے کے لئے کلکتہ میں ہی سٹہ سے اچھالنے والا گروپ تھا، اس جماعت نے سر شاہ سلیمان اور سر راس مسعود جیسے نیک نفس لوگوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ ان حضرات نے بڑے زور و شور سے یہ خیال پیدا کیا کہ یونیورسٹی کی ترقی کے لئے ڈاکٹر صاحب کا وجود مانع ہے۔ دوسری طرف گورنمنٹ نے ڈاکٹر صاحب کو وائس چانسلری کے لئے دوبارہ مقرر کیا لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ جب ان کا انکار ہو گیا تو ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب نے وقت کی ضرورت کو سمجھ کر ان حالات کا احساس کیا کہ وہ وائس چانسلری کے امیدوار ہوں۔ چنانچہ وہ مجبوراً خاموش ہو گئے لیکن بعد میں صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ نواب صاحب چھتاری چانسلری سے دستبردار ہو جائیں گے اور نہیں تو یہ انتخاب قبول نہ ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ نواب صاحب نے ایک روز قبل نواب صاحب چھتاری سے استعفیٰ دے دیا۔ اور ڈاکٹر صاحب دوسری بار وائس چانسلر منتخب ہو گئے۔ اب یہ حالات پیدا ہو چکے تھے کہ چانسلر نواب صاحب چھتاری کو خیال تھا کہ کوئی مناسب آدمی ان کے عہدے کا مستحق ہے لیکن ڈاکٹر صاحب اور ہائیڈر گلگتی کے ذاتی اثر سے نظام دکن نے چانسلر منظور کیا اور لسٹ میں باقاعدہ طور پر انتخاب ہو گیا۔ نواب محمد اسماعیل خاں کو شکست ہوئی۔ تین سال کے بعد ۱۹۳۸ء میں دوبارہ انتخاب ہونے والا تھا پھر اسماعیل خاں مقابلہ کے لئے کھڑے ہوئے لیکن اس مرتبہ بھی انکی کوشش کے باوجود پر ڈاکٹر صاحب کے مشورہ سے دونوں دست بردار ہو گئے اور سر شاہ محمد سلیمان کا انتخاب ہو گیا۔ لیکن ۱۹۴۱ء میں شاہ صاحب کا انتقال ہو گیا اور پھر یہ مسئلہ پیش ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کو پیش کیا گیا اس وقت سر سکندر حیات خاں اور سر جیمس نے بڑے انتظام و انتشار سے ڈاکٹر صاحب کی مخالفت کی اور سر شیخ عبدالقادر کو پیش کیا۔ وہ اس مرتبہ بھی ڈاکٹر صاحب کو کامیاب ہونے سے روکنے کی بھی کوشش کی گئی مگر زبردست کی منظوری حاصل نہ ہو سکی لیکن اس میں بھی ناکامیاب ہوئے۔ الیکشن کے نتیجہ میں جب ووٹ کے لئے ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سے دوست کی گئی تو انہوں نے سر شیخ عبدالقادر مرحوم سے فرمایا کہ آپ کام نہیں کر سکتے تو اچھا ہی ہے کیونکہ سیکشن میں ضیاء الدین سے زیادہ شیطان جیسا سخت ہے اور نہ کوئی۔

اپریل ۱۹۴۴ء میں نظام کی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا اب ڈاکٹر صاحب جن میں تعزیت کے لئے حیدرآباد گئے وہاں کے اخبارات میں ڈاکٹر صاحب کے خلاف سر اکبر حیدری کے زیر تربیت زہر اگلا جا رہا تھا۔ لیکن نظام نے نہایت خلوص و مہربانی سے خیر مقدم کیا اور قرب و شرف ملاقات بخشا اور بذریعہ فرمان علیگڑھ یونیورسٹی میں ایک شعبہ مسجد نظام کے نام سے قائم کئے جانے کا اعلان کیا۔

تیسری بار اپریل ۱۹۴۴ء میں ڈاکٹر صاحب کا انتخاب بلا مقابلہ عمل میں آیا۔

ڈاکٹر صاحب جانتے تھے کہ ان کی قوم تعلیم میں بہت پیچھے ہے اور اسی وجہ سے ملک میں مسلمانوں کا اقتدار ختم ہو چکا ہے ملک کے نظم و نسق میں بھی انہیں جیسا چاہئے حصہ نہیں ملتا لہٰذا اس مقصد کے حصول کے لئے تعلیم کو عام کیا جائے اور تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد بڑھائی جائے۔ اور خصوصاً ٹیکنیکل تعلیم کا مسلمانوں میں بالکل فقدان ہے لہٰذا اس طرف توجہ کرنی چاہئے۔ سب سے تمام سرکاری شعبوں پر حاوی ہیں اور وہ بوجہ تعصب مسلمانوں کو ان راستوں میں گھسنے نہیں دیتے اگر مسلمان سوچتے رہے کہ پہلے کافی تعداد میں تیار کیا جائے تو یہ ناممکن ہے جس طرح بھی سکے ہر قسم کی تعلیم جاری کر دینی چاہئے جب ایک کام جاری ہو جائے گا تو قوم اور حکومت دونوں اس طرف توجہ دیں گے اور امداد حاصل ہوگی اور ہمارے اداروں سے تربیت یافتہ افراد جیسے ہی نکلیں گے کام سنبھال لیں گے۔ انہی کاموں کی پختہ کاری کا اس تحریک کے تحت انہوں نے اپنی وائس چانسلری کے دور میں متعدد شعبے اضافہ کرنے شروع کر دئے چنانچہ انجینئرنگ کالج، ٹیکنیکل کالج، طبیہ کالج، ٹیچرز ٹریننگ کالج وغیرہ کی اسکیمیں تیار کرتے رہتے تھے اور حسب موقع ان اداروں کا اجرا بھی کیا گیا اگرچہ وہ چھوٹے پیمانے ہی پر ہوا۔ وہ مسلمانوں کو ہر شعبہ زندگی میں دوسروں کی مقابلے آگے دیکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے جنگ کے حالات سے فائدہ اٹھا کر عسکری تربیت کے لئے بھی ادارہ کھول دیا۔ طبیہ کالج اور انجینئرنگ کالج کے فارغ التحصیل طلبا نے مسلمانوں کی بیش بہا خدمات انجام دیں اور دے رہے ہیں۔ انجینئرنگ کالج کے ان ہی انجینئروں نے پاکستان

میں آ کر اس محکمہ کو سنبھالا۔

ڈاکٹر صاحب کو ہندوستان اور یورپ کے ممالک کے طرزِ تعلیم کے متعلق نہایت ہی وسیع معلومات تھیں اس ضمن میں شاید ہی اس ملک میں ان کے مقابلہ کا کوئی شخص نکلے۔ ان کا نظریہ تھا کہ تعلیمی اداروں کو زیادہ سے زیادہ اپنے کاروبار میں آزادی ملنی چاہئے اور حکومت کا کم دخل انداز ہونا چاہئے۔ اور جس قدر سہولتیں عوام کو پہنچ سکتی ہیں وہ پہنچائی جائیں تعلیم کسی خاص طبقہ کا اجارہ بن کر نہ رہ جائے۔

امتحان کے مروجہ طریقہ کو بہت برا سمجھتے تھے ان کا خیال تھا کہ یہ طریقہ غلط ہے اور ان کے نزدیک ایک خاص وقت میں پرچہ حل کرا کر اور نمبر دے کر طالب علم کی کئی سال کی محنت پر آخری فیصلہ کر دینا غیر منصفانہ ہے کیونکہ ایک ہی پرچہ کو مختلف ممتحن دیکھیں تو نتیجہ مختلف نکلتا ہے۔ ان کے خیال میں یہ بہتر تھا کہ اساتذہ کو طلباء کی روز بروز ترقی اور اہلیت و صلاحیت کا علم ہونا چاہئے۔ مروجہ طریقہ امتحان ان کے نزدیک حافظہ کا امتحان تھا وہ طالب علم کی ذہنی ارتقا کا پیمانہ نہیں تھا۔ طالب علم کو پاس ہونے کے لئے نمبر حاصل کرنے تک وہ نرم رہتے تھے لیکن جوں جوں آگے بڑھتے سخت ہوتے جاتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اصول و قوانین انسان کے لئے بنائے گئے ہیں اور انسان ہی نے بنائے ہیں اگر اصول و قوانین کی پابندی سے انسان کو نقصان کا اندیشہ ہو تو قوانین کو نظر انداز کر دینا چاہئے انسان کو گھٹانا نہ چاہئے انسان کے وضع کردہ قوانین خدائی قوانین نہیں ہیں۔ انہوں نے طریقہ امتحان پر ایک کتاب بھی لکھی تھی اور اس کے بعد سے ممتحن کا عہدہ چھوڑ دیا تھا۔

وہ چاہتے تھے کہ ایسے طلباء مسلمانوں میں پیدا ہوں کہ وہ خواہ کیسی ہی مصیبت میں گھر جائیں کبھی بددل نہ ہوں اور ہمت نہ ہاریں اور اپنے نصب العین اسی لئے وہ محض درس و تدریس سے زیادہ تربیت پر زور دیتے تھے ان کا خیال تھا کہ طلباء میں ضبط و نظم بغیر کسی تحریک کار روائی کے نہیں ہو سکتے اور اسی پر ان کا عمل تھا۔ ہر ایک طلباء کے ساتھ ہر قسم کی مراعات کرتے تھے۔ اپنے شاگردوں کو نہایت شفقت سے کام کرنے کو کہتے تھے۔ ان کا دروازہ ہر وقت طلباء کے لئے کھلا رہتا تھا اور ملاقات میں کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ ایم اے کے طلباء کو ہفتہ میں ایک بار گھر پر مدعو کرتے تھے اور اس وقت نہ صرف ان کے مضمون کے متعلق بات چیت ہوتی بلکہ قومی مسائل پر بھی گفتگو ہوا کرتی تھی انہیں اپنے شاگردوں کے متعلق جزئیات تک سے واقفیت رہتی تھی اور اگر برسوں بعد بھی کوئی مل جاتا تو اپنی غیر معمولی قوت یادداشت کی بنا پر اس کے پرانے واقعات دہرا دیتے اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ طلباء کو ان کے ساتھ فرزندانہ عقیدت ہو جاتی تھی۔ اس ضمن میں ایک نہایت دلچسپ واقعہ چودھری خلیق الزمان صاحب سے منسوب ہے۔ چودھری صاحب موصوف نے فرمایا کہ جنگِ بلقان کے زمانے میں طلباء مسجد میں جلسے کرتے اور حکومت برطانیہ کے خلاف تقاریر ہوتیں۔ ایک دن یہ معلوم ہوا کہ کوئی شخص ان تمام باتوں کو مسٹر ٹول پرنسپل تک پہنچا دیتا ہے۔ اس کی چھان بین کے لئے چودھری صاحب کے گرد پر مختلف ٹیموں کے کپتان اور یونین کے وائس پریزیڈنٹ جمع ہوئے اور قرآن شریف پر ہاتھ رکھ کر اپنی اپنی رائے دینے لگے کہ کون شخص مسٹر ٹول کو خبریں پہنچاتا ہے۔ ایک صاحب نے بتایا کہ رائڈنگ اسکول کے کپتان صاحب خبریں پہنچاتے ہیں۔ بعد ازاں یہ طے ہوا کہ چودھری صاحب رات ہی رات میں ایک اشتہار کا مسودہ تیار کر کے اور اسے اسکول کے بچوں سے اُلٹے ہاتھ سے لکھوا کر اس جگہ خبر کی قلعی کھولنے کے لئے مختلف مقامات پر چسپاں کرائیں چنانچہ چودھری صاحب نے ایسا ہی کیا صبح کو کپتان مذکور نے ان اشتہاروں کو نوچنا شروع کیا۔ شدہ شدہ یہ خبر ڈاکٹر صاحب کو بھی پہنچی اور چونکہ چودھری صاحب ہاؤس مانیٹر بھی تھے ان کے پاس آئے اور دریافت کیا کہ یہ اشتہار بازی کس کا کام ہے چودھری صاحب نے لاعلمی کا اظہار کیا اس کے بعد ڈاکٹر صاحب چلے گئے۔ چودھری صاحب فرماتے ہیں کہ ۱۹۲۶ء میں ایک دن ڈاکٹر صاحب نے اصرار سے انہیں دعوت پر بلایا ادھر ادھر کی باتوں میں انہوں نے ڈاکٹر صاحب سے دریافت کیا کہ آپ کو وہ اشتہار والا واقعہ یاد ہے فرمانے لگے ہاں خوب یاد ہے وہ کارگزاری تمہاری ہی تھی، لیکن میرے پاس کچھ ثبوت نہ تھا اس لئے میں کچھ نہ کر سکا۔ اس قسم کی باتیں درحقیقت ان کی کامیابی کا راز تھیں۔

انہیں اپنے طلبا پر بہت بھروسہ اور اعتماد تھا۔ جب سائمن کمیشن ہندوستان آنے والا تھا تو تمام ملک کے طلبا نے جلوس کی صورت میں اس کے خلاف مظاہرے کئے۔ مسلم یونیورسٹی کے طلبا کی خواہش تھی کہ وہ بھی ... آئیں ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ وہ ضرور آئیں گے لوگ یا سب لوگ پریشان تھے کہ دیکھئے کیا ہوتا ہے طلبا کچھ ناشائستہ حرکت نہ کر بیٹھیں لیکن ڈاکٹر صاحب نے کہا مجھے طلبا پر پورا بھروسہ ہے ... چنانچہ ... نہایت ضبط و نظم کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا۔ کمیشن کے صدر نے طلبا کی تعریف کی ڈاکٹر صاحب نے جواب میں یہ فرمایا کہ:

"میں آپ پر واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ طلبا کا زیادہ حصہ آپ کی آمد کے خلاف تھا لیکن جب کہ ... نے ... دی تو طلبا نے اپنی مخالفت پر آپ کے خیر مقدم کو ترجیح دی۔"

طلبا سے بعض اوقات ایسی حرکات سرزد ہو جاتی تھیں جن کی بنا پر وہ قانون کی زد میں آ گئے تھے ڈاکٹر صاحب اس وقت پریشان ہو جاتے تھے جو ایک باپ ... وہ سمجھتے تھے کوئی باپ اپنی اولاد کو پولیس کے حوالے کیسے کر دے۔ ان کا عقیدہ تھا قوم کی اصلاح اس قسم کی تعزیر و سزا سے نہیں ہوتی طلبا ... کی ترنگ میں اگر وہ ... سمجھتے ہیں تو جو ... سرزد ... اگر پولیس کے حوالے کر دیا جائے اور سزا کر دی جائے ... نوبت ... وہ ... طلبا کو ... بچا لیتے تھے ... متعدد مثالیں ... زندگی میں پیش آئیں اور وہ طلبا جنہیں انہوں نے اس طرح بچایا بعد میں سوسائٹی کے نہایت مفید ارکان ثابت ہوئے۔ ... تھی وہ قوم کے نوجوانوں کی ... زندگی برباد کرنے کے سخت مخالف تھے۔ کسی طالب علم ... ایسے طلبا کو وہ سزا ... بچے طلبا ... ہر طالب علم کو ... کا دروازہ کھلا تھا کسی کی سفارش کرنے سے انکار ... وہ ... کسی کی سفارش نہ کرتے ہوں انہوں نے بے شمار لوگوں کو برسر روزگار لگایا۔

وہ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۷ء تک مرکزی اسمبلی کے ممبر رہے۔ قائد اعظم محمد علی جناح کو ان سے ... پہلے ... پنڈت ... اور پھر مسلم لیگ پارٹی میں۔ انہوں نے بجٹ، مالیات، ٹیکس اور مزدوروں کے مسائل پر ... تقریریں کیں۔ ... میں سب سے پہلی تقریر بجٹ پر تھی اور اسمبلی پر ... فنانشل کمشنر کو شبہ ہوا کہ شاید کسی ... نے ... لکھی ہے ڈاکٹر صاحب کو جب اس کا علم ہوا تو انہوں نے دوران تقریر میں اس انگریز افسر کو مخاطب کر کے کہا کہ "آپ کا خیال غلط ہے یہ تقریر کسی نے مجھے لکھ کر نہیں دی ہے اور میں نے تیار کی ہے میں نے آپ سے زیادہ مشکل امتحان پاس کئے ہیں مجھے ضرورت نہیں کہ کوئی میرے لئے تقریر لکھے میں دوسروں کو تقریر لکھ کر دینے کی قابلیت رکھتا ہوں۔" معاشی مسائل پر بڑی وسیع نظر رکھتے تھے۔ حکومت کے مسلمان ملازمین کے معاملات میں بڑی دلچسپی اور انہماک سے بحث کرتے تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ مسلمانوں کی تنظیم ... کے مفاد محفوظ ... ہیں۔

ان کی علمیت اور ہمہ دانی کا یہ عالم تھا کہ ریاضی تو ان کا مضمون ہی تھا لیکن فلکیات، معاشیات، جغرافیہ، تعلیمات غرض جس موضوع پر ضرورت ہو اس کا سرسری مطالعہ کر کے اور اصول و نظریات کو سمجھ کر ایسی بحث کرتے تھے کہ ماہرین ان کے سامنے بیٹھے جاتے تھے۔ بظاہر وہ کھوئے کھوئے سے رہتے تھے۔ لیکن دماغ کی مشین برابر چلتی رہتی تھی۔ اکثر ایسا دیکھا گیا کہ بڑے بڑے تجربہ کار کسی گتھی کو سلجھانے میں سر پکڑ کر بیٹھ گئے اور ڈاکٹر صاحب نے آن واحد میں سلجھا دیا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ریاضی کو مسئلوں نے ہمیشہ کچھ رکھا ہے مجھے اس طلسم کو توڑنا ہے۔ لکچر کے وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ علم کا ایک دریا بہہ رہا ہے بعض ... عالموں کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے مخاطب کی قابلیت سے اپنے علم کا توازن پیدا نہیں کر سکتے۔ ڈاکٹر صاحب میں باوجود تبحر علمی یہ قابلیت تھی ... طلبا کی مشکلات کا اندازہ

خوب کر چکے تھے اور اکثر ہی بلند علمی سطح سے نیچے اتر آتے تھے۔ تاکہ مسئلہ طلبا کے ذہن نشین ہو جائے ان کے لکچروں میں جہاں تک ممکن ہو لطائف و ظرائف ہوتے تھے تاکہ مضمون کی خشکی اسے غیر دلچسپ نہ بنا دے۔ باوجود عالی دماغی اور تبحر علمی کے ان میں طلب علم کا جذبہ موجود تھا کوئی بات جو انہیں معلوم نہ ہو وہ ذرا سے ادنیٰ آدمی سے دریافت کرنے میں انہیں تامل نہ ہوتا تھا اور نہ اس حیثیت کا احساس تھا۔ وہ ایک معمولی کلرک یا اسکول ٹیچر کے ہاں دعوت میں اسی خوشی سے شریک ہوتے تھے جیسے وائسرائے کے محل میں۔ انہیں اپنی عظمت و اہمیت کو تسلیم کرانے کا احساس نہ تھا۔ بعض اوقات معلوم ہوتا تھا کہ انہیں پوزیشن کا پاس نہیں۔ مخاطب چھوٹا ہو یا بڑا سلام میں پیش قدمی کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ باوجود اس کے کہ وہ عرصہ تک یورپ میں رہے لیکن اپنے عادات و خصائل کے لحاظ سے وہ پورے و مکمل ہندوستانی مسلمان تھے۔ چنانچہ کپڑوں کے معاملے میں کوئی اہتمام نہ تھا۔ کام کی ضروریات کی وجہ سے سوٹ پہنتے تھے لیکن اس سوٹ کی بے بضاعتی سے پتہ چلتا تھا کہ انہیں اس سے کوئی خاص لگاؤ نہیں ہے۔ عید بقرعید پر اور اعزا کی تقاریب میں وہ شیروانی پہنتے تھے اور پاجامہ۔ غرض یہ کہ ڈاکٹر صاحب انتہا درجہ کے منکسر المزاج تھے۔ اپنے ماتحتوں کے دکھ سکھ میں برابر کے شریک رہتے تھے۔ اور ضرورتمندوں کی امداد کرتے۔ مالی امداد کا یہ طریقہ روپیے اور کبھی قرضہ کی صورت میں کر دیا کرتے تھے لیکن اس کی ادائیگی میں کبھی سختی نہ کی جاتی تھی۔

مہمان نوازی کا یہ عالم تھا کہ اکثر دعوتیں ہوا کرتی تھیں بڑی بڑی اور شاندار اور چھوٹی و معمولی لیکن ان کا اہتمام ایسا تھا کہ کم سے کم خرچ ہوتا تھا۔ ان کے پاس منیجر کا نام غلط ہو جاتا تھا۔ گاہ گاہ اپنے کنبہ کے افراد کو اور خصوصاً بچوں کو جمع کر لیتے تھے۔ اس روز ان کی کوٹھی میں بڑی چہل پہل ہوتی تھی۔ بچوں کے ساتھ ہنسنے بولنے میں انہیں بڑا لطف آتا تھا۔ چائے ان کے ہاں بڑی بامزہ اور جواب ہوتی تھی لیکن چونکہ اس قدر اعلیٰ درجہ کا پیتے تھے کہ اکثر احباب اس کی فرمائش کرتے تھے۔ اور خاندانی طعام تو خاص طور پر تھوڑے پسند کئے جاتے تھے۔ انہوں نے اپنی لڑکی کی شادی میں اپنے اعزا کو مدعو کیا تھا اسی اندازے سے انتظام تھا۔ بعض طلبا نے سازش کی اور قریب سو طلبا بن بلائے مہمان پہنچے ڈاکٹر صاحب قطعی نہ گھبرائے بلکہ خوش ہوئے اور انہیں الگ بٹھایا تاکہ دوسرے دور کا انتظار کریں اتنی دیر میں فوراً انتظام مکمل ہو گیا۔ انہیں طالب علمی کے زمانے سے علیگڑھ کے ڈائننگ ہال کا نسخہ یاد تھا یعنی ایسے غیر متوقع حالات میں سالن میں شوربے کا اضافہ کر دیا جاتا۔

ان میں ایک خصوصیت تھی کہ ابھی ایک مسئلہ درپیش ہے اس پر غور و فکر ہو رہا ہے کہ یکایک کوئی دوسری قسم کا مسئلہ آ گیا تو وہ فوراً اس کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو جاتے تھے نہ ان کا دماغ تھکتا تھا نہ ذہن میں الجھن پیدا ہوتی تھی جب کوئی بڑی سے بڑی اسکیم درپیش ہوتی تو ان کے سامنے اس کے تمام پہلو ہوتے اور معمولی سے معمولی جزئیات پر نظر رہتی ذہن ایسی تیزی سے کام کرتا تھا کہ جب کوئی ان کے ساتھ کام کرنے بیٹھتا تو مشکل ہی سے ان کا ساتھ دے سکتا تھا۔ یادداشت بڑے غضب کی تھی اور پھر یہی نہیں جس وقت جس چیز کو چاہتے یاد آ جاتی اور جب چاہتے اسے بھلا دیتے تھے۔

مخالفین کی ایک جماعت ہمیشہ ان کے درپے رہی لیکن وہ کبھی کسی سے انتقام لینا تو کجا اور اپنے مخالفین پر احسان کرتے تھے۔ جب ان کا انتخاب وائس چانسلری کے لئے ہوا تو نواب حمید اللہ خان والیٔ بھوپال نے چانسلری کے عہدہ سے استعفا دے دیا لیکن ڈاکٹر صاحب نے عسکری تربیت کا مرکز یونیورسٹی میں جاری کرتے وقت ان سے امداد کی استدعا کی اور تعلقات خوشگوار ہو گئے نواب صاحب علی گڈھ آئے مشورہ بھی دیا اور امداد بھی۔ مرکزی اسمبلی میں ملک کے غذائی مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے بھوپال کے غذائی نظم و نسق کی عمدگی کی مثال دی اور اس کی بہت تعریف کی۔ وہ کبھی کسی مخالف کی عزت کے درپے نہیں ہوتے تھے رحمت اللہ کمیشن کے صدر مرحوم [illegible] مرکزی [illegible] اسپیکر شپ کے امیدوار تھے اور ڈاکٹر صاحب سے مدد کے طالب تھے ڈاکٹر صاحب نے کھلے دل سے ان کی امداد [illegible] تھا جس نے ڈاکٹر صاحب کو علی گڈھ سے الگ کر دئے جانے کی سفارش کی تھی۔ بعض اوقات جب

جو کسی معاملہ میں مخالفت یا جدال کرنے پر تُل جاتے تو ان سے صرف جلنے کی کسی کو ہمت نہ ہوتی تھی مگر وہ اس وقت بھی بے محرک معاملے میں گھس جاتے اور بغیر تقریر کرنے کے مرکزی اسمبلی میں گردن جھکا دیتا اور وہ جو چاہتے ان سے منظور کرا لیتے تھے۔ ان کے ناقص اور ہم بلند جذبہ کا کام چلتے تھے۔ انتہائی مسائل پر سب ہی نے ان کی باتیں اور کوئی تجویز ان سے چھپی نہ رہی۔ ان کا اصل کام صرف یہ تھا کہ وہ کہیں کسی معاملہ کو ادا۔

ان کی کامیابی کا راز ان کی بات میں راسخ تھا کہ وہ دوسروں سے اچھے لگتے ان میں مستعدی تھی اور سب سے زیادہ یہ کہ خود کام کرتے اور مسلسل کام کرنے کی دھن تھی۔ ذہانت کے علاوہ ان میں کافی توانائی اور ہمت ہی غضب کی تھی۔ گھنٹوں کام کر سکتے تھے جتنی بلند عزائم پختہ تھے اتنا کام تیزی سے کام بھی کرتے تھے اور کام کرنے کی قوت بہت بڑھ جاتی تھی۔ وہ اکثر سفر کرتے رہتے تھے لیکن سفر سے واپس آتے ہی سیدھے دفتر کا رخ کرتے اور کام میں مصروف ہو جاتے تھے ان کے ساتھ کام کرنے والے تھک جاتے تھے۔ ایک دن ان کے ایک شاگرد رشید نے ان سے کہا کہ آپ کی تعلیم اور معمولی انسان کا کام نہیں ہے آپ نے کافی بھی سمجھ کر لکھے ہیں جب ان کا فیصلہ کیا جو قوت خدا نے عطا کی ہیں ان سے کام لینا چاہیے تب ہی محنت میں ان کو تابع رکھنے کے لئے خون اور محنت کی ضرورت ہے۔ ان کے سفر اور حساب کا یہ حال تھا کہ ایک تہائی سفر میں گزرا۔ یہ سب کچھ علی گڑھ کے لئے تھا اور یہ تکالیف برداشت کرتے تھے۔ سرسید مرحوم کے بعد اگر کوئی ہستی تھی تو ڈاکٹر صاحب کی تھی کہ وہ صرف علی گڑھ کا کام ہی اور اگر ڈاکٹر صاحب کا نام ذہن میں آتے ہی ڈاکٹر صاحب کا نام لے کر علی گڑھ آپ کے ذہن پر مسلط ہو جاتا اور یونیورسٹی اور ڈاکٹر صاحب کچھ لازم و ملزوم سے تھے۔ ان کے دل و دماغ سے زیادہ عزیز چیز تھی وہ علی گڑھ اور اس کی خدمت بعض مخالفین کا اعتراض تھا کہ اسمبلی کی نیت سے علی گڑھ کے کام میں ہاتھ ڈالا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہاں بھی وہ علی گڑھ ہی کی خدمت کے لئے گئے تھے یونیورسٹی کے بے شمار کام کرتے تھے۔ وہ جس قدر سفر یونیورسٹی کے لئے کرتے تھے ایک پیسہ بھی سفر خرچ کا یونیورسٹی سے نہ لیتے تھے۔ اور جو کچھ یونیورسٹی کو ان سے روپیہ حاصل ہوا وہ سب ان کے ذاتی اثر کا نتیجہ تھا۔ میڈیکل کالج فنڈ کے لئے دو سال میں پچاس لاکھ روپیہ جمع کر دینا ان ہی کے بس کا کام تھا۔ سرسید کے بعد اگر کسی کو چندہ جمع کرنے کا گر آتا تھا تو وہ ڈاکٹر صاحب ہی تھے۔ ہر جگہ ہر موقع پر ان کے مسلم یونیورسٹی کی فکر قوم کی تڑپ اور اپنے طلبا کے لئے بے چینی رہتی تھی۔

قائد اعظم نے جب لیگ کے پرچم کے نیچے قوم کو مجتمع کر لیا اور مرکزی اسمبلی میں بھی مسلم لیگ پارٹی بنا لی اس وقت ان کی دور رس نگاہ ڈاکٹر صاحب ہی پر پڑی انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے ذمہ پارٹی کی تنظیم کا کام کیا اور اس کا سیکرٹری انہیں کو بنایا۔ اسی زمانے میں یونیورسٹی کے لئے وائس چانسلر کا انتخاب ہونے والا تھا اور کورٹ کے ممبران کی اکثریت ڈاکٹر صاحب کو چاہتی تھی لیکن انہوں نے قائد اعظم کی خواہش کا احترام کیا اور اس قومی خدمت کو اس پر ترجیح دی اور سر شاہ سلیمان کو بلا مقابلہ منتخب کرا دیا۔ ڈاکٹر صاحب چونکہ خود دھن کے پکے تھے اور جس کام کے کرنے پر تل جاتے تو اسے بلا خوف مخالفت پورا کر کے چھوڑتے تھے اسی وجہ سے انہیں قائد اعظم کی یہ ادا پسند تھی کہ جب وہ کسی اصول یا پالیسی کو صحیح سمجھ کر اختیار کرتے تھے تو پھر کوئی چیز انہیں اپنی راہ سے نہیں ہٹا سکتی تھی اور جتنی مخالفت بڑھتی اتنا ہی ان کا عزم مضبوط ہوتا تھا۔ چنانچہ وہ قائد اعظم کی سیاست پختگی رائے بلند کردار دیانت اور عزم کے بڑے مداح تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا عقیدہ تھا کہ اسلامی جمہوریت یہ ہے کہ پہلے سوچ سمجھ کر اپنا قائد چن لو اور پھر بے چون و چرا اس کا ساتھ دو۔ اختلاف ہو تو نجی طور پر بحث کرو لیکن عوام میں لیڈر کی ہمیشہ حمایت کرو اسی جذبہ کے تحت وہ مسلم لیگ میں شریک ہوئے اور آخر تک قائد اعظم کے حامی و مددگار رہے۔

ڈاکٹر صاحب کا تعلق علیگڑھ سے کم و بیش ساٹھ برس رہا وہ علیگڑھ میں بحیثیت طالب علم آئے۔ حافظ ہوئے، ممبر ہوئے، پھر ہوئے۔ اسسٹنٹ ٹیوٹر ہوئے۔ پروفیسر ہوئے۔ پرنسپل ہوئے۔ پرو وائس چانسلر ہوئے۔ چانسلر ہوئے اور آخر میں ریکٹر ہوئے انہوں نے سرسید علیہ الرحمتہ سے تازیست علیگڑھ کی خدمت کا وعدہ کیا تھا اسے پورا کر دکھایا۔ علیگڑھ سے والہانہ محبت طلبا کی خیر سگالی اور مادر علمی سے وفاداری ایسی صفات ہیں جن کا دوست دشمن سب کو اعتراف ہے۔

علیگڑھ کی خدمات سے سبکدوش ہونے کے بعد ستر سال کی عمر میں وہ قوم کا جوان ہمت شیدائی ۱۹۴۷ء میں یورپ اور امریکہ تعلیمی ترتیبوں کے مطالعہ اور مشاہدہ کی غرض سے وطن سے روانہ ہوا۔ امریکہ اور دیگر ممالک یورپ کا دورہ کیا۔ نومبر ۱۹۴۸ء میں واپسی کا ارادہ تھا کہ سر آغا خاں سے ملاقات کرنے کے لئے پیرس گئے وہاں سے لندن آتے ہوئے راستے میں فالج کا حملہ ہوا۔ نرسنگ ہوم میں داخل ہو گئے۔ وہاں ایک روز مسلمان نوجوانوں کو چائے پر مدعو کیا اور باوجود تکلیف کے ان سے کہا کہ آپ لوگ یہاں سے ہندوستان ہی واپس جائیں اور وہیں رہیں اگرچہ وہاں ملازمت نہیں ملے گی لیکن یہ خوشی کی بات ہے اسی وجہ سے آپ لوگ زراعت صنعت و حرفت اور صحافت کی طرف متوجہ ہوں گے۔ وفات سے ایک روز قبل اپنے معالج ڈاکٹر غیاث الدین صاحب کو پاس بلا کر کہا کہ آپ اب ہندوستان جا کر کام کریں۔ اب آپ جیسے حضرات کی وہاں ضرورت ہے اب مسلمانوں کی تعلیم وہاں ایک اہم مسئلہ ہوگا۔

۲۳ر دسمبر ۱۹۴۸ء کو گیارہ بج کر ۴ منٹ پر اس جہان فانی سے رحلت کی انا للہ و انا الیہ راجعون۔ دوسری و تیسری فروری ۱۹۴۸ء کی درمیانی شب میں تابوت بذریعہ بحری جہاز علیگڑھ پہنچا۔ اور یہ فرزندی کو سرسید علیہ الرحمتہ کے پہلو میں مغربی جانب دفن کیا گیا۔

ملک بھر میں کہرام مچ گیا اخبار و رسائل نے تعزیتی مضامین لکھے ہم صرف دو رسائل کا مختصر اقتباس دیتے ہیں۔ معارف نے لکھا کہ:

مرحوم اس دور کی پیداوار تھے جب مسلمانوں پر مغربی تمدن مسلط تھا۔ اور اس کا سب سے بڑا مرکز علیگڑھ تھا لیکن انہوں نے اس کا بہت کم اثر قبول کیا۔ اب تو ضعیفی کی عمر تھی وہ ہر زمانے میں نہ صرف عقیدے بلکہ ظاہری وضع قطع میں بھی مسلمان رہے۔ ان کی زندگی بڑی سادہ اور بے تکلف تھی ان کی سادگی میں ایک صاحب کمال کی شان بے نیازی پائی جاتی تھی۔ شخصی طور پر بھی ان سے لوگوں کو بڑے فوائد حاصل ہوئے ان کی ذات سے سینکڑوں غریب طالب علموں نے تعلیم حاصل کی اور انہوں نے بہتوں کو جن کا کوئی سہارا نہ تھا۔ ملازمتیں اور بڑے بڑے عہدے دلوائے۔

صدق لکھنؤ کے مدیر نے لکھا کہ:

موتیں اچھے اچھے مخلص مسلمانوں کی بھی کہنا چاہیئے کہ روز ہی ہوتی رہتی ہیں اور بعض یقیناً بہت ہی دردناک و قلق انگیز بھی ہوتی ہیں لیکن کچھ موتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو فرد واحد کی نہیں پوری جماعت کی پورے ادارہ کی موت کہی جا سکتی ہے علیگڑھ کے مرحوم ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کی وفات اسی قسم میں آتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بڑے ذی مروت اور بڑے ہی فیض رساں تھے دروازہ ہر ملنے والے کے لئے ہر وقت کھلا رہتا تھا ہر اولڈ بوائے کے میزبان دوست اور دست گیر تھے۔ آمدنی کا بڑا حصہ طلباء ہی کے لئے وقف تھا۔ خدا معلوم کتنوں کو عہدے دلوائے کتنے بیروزگاروں کو روزگار سے لگایا کتنے بھوکوں کو کھلایا کتنوں کی سفارشیں کیں کتنوں کی خالی جیبیں اپنے پاس سے بھر بھر دیں ۔ ۔ ۔ ۔

بعض اہل صحافت نے جو مستقل پروپاگنڈا مرحوم کی مخالفت میں مہینوں بلکہ برسوں جاری رکھا اور جس نے ان کے ہر ہنر کو عیب ہی بنا رکھا وہ خود ہی ان کے حق میں کفارہ کا کام دے سکتا ہے۔ عجب نہیں اسی سے وہ بالکل

ڈھل گئے ہیں۔

اصنافِ سخن میں مدحت فرمائی۔ مرثیہ، سلام، دو قصیدے سب ہی کچھ ہے لیکن ڈاکٹر صاحب کے جنازہ کے استقبال کے سلسلے میں شائع ہوئی جنازہ کی استقبالیہ نظم ایک جدت ہے ہم اسی نظم پر اس مضمون کو ختم کرتے ہیں ۔

استقبالیہ نظم از پروفیسر محمد صادق صاحب ایم اے شعبہ فارسی مسلم یونیورسٹی

علیگڑھ تو نے کی ہے اہلِ ملت کی پذیرائی   ہوئی ہے تجھ سے اکثر اعلیٰ حضرت کی پذیرائی
ترے ایوان میں آمد ہوئی اکثر امیر الملک کی   بڑے دربار سے بھی تو نے مدارتیں ہزیلنس کی
رئیسانِ وطن کا تو نے استقبال دیکھا ہے   شہانِ ذی حشم کا مرتب استقبال دیکھا ہے
مگر یہ شان استقبال کی سب سے نرالی ہے   کہ آئی ہے ترے شیدائی کی میت تیرے دامن ہے
سلامی کو صفیں استادہ ہیں اعیانِ ملت کی   کہ دیکھی جیش کی زندہ دلانِ ملت کی
بیاں کیا ہو حقیقت قوم کے اندوہِ بے حد کی   کہ دوش آتی ہے یہ پیکر سید المتقین محمد کی
وہ جس نے اپنی ہستی کو مٹایا قوم کی غم میں   نبھایا بار وہ سر پہ اٹھایا قوم کی خاطر
شکایت جس کے لب سے شکر بن کر بہ کے نکلی   وہ جس کے منہ سے انگارے کلیاں بن کر نکلی
بڑھاپے میں بھی تھی جس کو ہمت نوجوانوں کی   وہ جس کی خاکساری میں تھی عزت مسلمانوں کی
وہ جس کی عمر گزری میڈیکل کالج کی خواہش میں   دیا نقد حیات آخر اسی سودے کی کاوش میں
وہ جس نے خاک چھانی ہائے مدت سے زمانے میں   ذرا دم لے لیے گھروں کی کالج کے خزانے میں
وہ ایسا ڈاکٹر جو ماہر امراضِ ملت تھا   جو کچھ بھی چہرہ سے زکوٰۃ قوم تھا ناصحِ ملت تھا
دیارِ غیر میں جس کے لئے پیکِ اجل آیا   زمانہ میں شہیدِ علم کا جس نے لقب پایا
مجھے سب سے زیادہ تھا قوم کا غم بعد سید کے   جو تھا محبوب احبابِ دو عہدِ سید کے
سن اے خاکِ لحد سن یہ امانت سونپی جاتی ہے   تجھے سارے مسلمانوں کی دولت سونپی جاتی ہے
قیامت تک اسے آغوش میں رکھ اس ودیعت سے   کہ یہ خاکی جسد محروم مالش عقیدت سے
دعا ہے یہ کہ پلہ نیکیوں کا اس کا بھاری ہو   دمِ حشر اس کے سر پر سایۂ افضالِ باری ہو

سدا از بس کہ ملت کی ہوا خواہی سے کام اس کو
ملے جنت میں قرب حضرت خیرالانام اس کو

نواب اعظم یار جنگ بہادر مولوی چراغ علی مرحوم

غلام پنجتن

[illegible] کشمیر سے بسلسلۂ ملازمت پنجاب میں آئے [illegible] ان کے بعد میرٹھ میں مقیم ہو گئے۔ یہ ان معدودے چند مسلمانوں میں سے تھے جنہوں نے انگریزی تعلیم کو بدعت نہیں سمجھا اور اپنے فرزند خدا بخش کو انگریزی پڑھائی۔ اپنے والد کی طرح یہ بھی جوان عمری میں کمپنی بہادر کے ملازم ہو کر سرحدی ضلعوں ڈیرہ غازی خاں، بنوں وغیرہ میں محکمۂ بندوبست میں خدمت انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد مولوی خدا بخش صاحب ضلع سہارنپور کی کلکٹری میں ہیڈ کلرک ہو گئے۔ چونکہ انہوں نے انگریزی وضع قطع اختیار کر لی تھی۔ لوگ انہیں کرانی کہنے لگے۔ مولوی خدا بخش صاحب ۲۵ برس کی عمر میں سہارنپور ہی میں ۱۸۴۶ء میں انتقال کر گئے۔ ان کی والدہ اپنی بیوہ بہو اور یتیم بچوں کو لے کر پھر میرٹھ آ گئیں۔ ان چار یتیموں میں مولوی چراغ علی سب میں بڑے اور [illegible] سال کے تھے جو آگے چل کر نواب اعظم یار جنگ بن کر آسمان ادب ہی پر نہیں چمکے بلکہ ریاست حیدرآباد کی تنظیم جدید میں جو سرسالار جنگ اول نے شروع کی تھی نمایاں مقام حاصل کیا اور آج تک ایک محلہ "چراغ علی لین" کے نام سے ان کا مسکن ہونے کی وجہ سے مشہور ہے۔

اس لاوارث کنبہ نے ابھی میرٹھ میں دوبارہ آ کر ہوئے ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ وہ ہنگامہ شروع ہو گیا جس کو "غدر" کے نام سے یاد کیا جاتا رہا ہے حالانکہ ملک کو تو کمپنی حکومت کی بدیسی ترت کے ہاتھوں سے چھین لینے کی مہم تھی جو مقررہ وقت سے پہلے شروع ہونے اور ڈسپلن قائم نہ رکھ سکنے کی وجہ سے ناکام رہی۔ ان سرداروں میں نہ تو مذہبی جوش تھا اور نہ نسلی تعریف جو قتل و غارت گری تو کیا ان لوگوں کو سبق دینا تک گوارا کرتی جو ملک میں انگریزی کا اقتدار بڑھانے میں اپنی فلاح سمجھے ہوئے تھے۔ چنانچہ شہر میرٹھ ہی میں جہاں اس انقلاب کا زور رہا کسی نے اس گھر کی طرف رخ بھی نہیں کیا۔ خون خرابا تو اس وقت عام ہوا جب لاہور سے سکھوں کی اور دکن سے نظام کی کمک شمالی ہند پہونچی اور کمپنی بہادر کا سکہ بٹھانے کی غرض سے ہندوستانیوں کو بزدل بنانا اور مسلمانوں کا تختہ الٹنے اور انہیں ذلیل کرنا شروع ہوا۔ عوام تو کیا خواص میں جو خوف بٹھایا گیا اس کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ سرسید ایسے جری شخص کی ہمت نہ ہوئی کہ اس شورش کے متعلق جو معرکتہ الآرا تصنیف کی اس کا نام "رسالہ اسباب بغاوت" دے سکتا۔

۱۸۵۷ء اور اس کے بعد کے کئی سال، ایسے گذرے کہ میرٹھ اور اس کے قرب و جوار میں کسی کو چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ ایسے میں

[illegible] تعلیم [illegible] اس زمانے میں [illegible] تعلیم کی [illegible] تعلیم حاصل کر سکتے تھے [illegible]
[illegible] شائع ہوتا تھا [illegible] مولانا الطاف حسین حالی
[illegible] مولوی صاحب [illegible]
[illegible] کی مکمل تعلیم کہیں نہ [illegible] چنانچہ [illegible] تعلیم [illegible]
حاصل کر لیا کرتے تھے۔ اپنے [illegible] چراغ علی [illegible] اگرچہ [illegible] مکمل تعلیم حاصل کرنے ہی [illegible]
[illegible] میں ایک [illegible] نیا قائم ہوا تھا چراغ علی [illegible] کے ذریعہ [illegible]
[illegible] میں ایک [illegible]
چراغ علی [illegible] اس [illegible] اس وقت خالی تھی [illegible]
بستی سے لکھنؤ پہنچے اس زمانے میں انہوں نے اپنی علمی استعداد حاصل کر لی تھی۔ [illegible] لکھنؤ سے [illegible] میں پہنچ گئے۔ لکھنؤ
میں آکر انہیں اہل علم و فضل کی صحبت میسر آئی جس سے انہوں نے [illegible] عماد الدین کی [illegible] چراغ علی [illegible]
قیام لکھنؤ میں [illegible] نے شائع کیا [illegible] سر سید احمد خاں نے [illegible]
دی۔ عام مسلمانوں نے اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور چراغ علی [illegible] چراغ علی [illegible] سر سید نے ان کی
علمی شخصیت کی [illegible] انہیں تہذیب الاخلاق میں مضمون لکھنے پر آمادہ کر لیا۔ اس طرح مولوی صاحب اسلام پر جو اعتراضات ہوتے
تھے ان کے جواب دینے اور عیسائیوں کو اسلام اور [illegible] پیغمبر [illegible] سے واقف کرانے [illegible] اسلامی فرقوں کی آپس
کی کج بحثی سے ہمیشہ دور رہے۔ چنانچہ [illegible] مشہور [illegible] لیکن اپنے
اپنے بچوں کے نام سے آگے نقد لگا دیا۔

لکھنؤ سے ان کا تبادلہ سیتاپور ہو گیا۔ وہاں انہیں سر سید احمد خاں کے علی گڑھ آنے کی خبر ملی [illegible] سر سید سے ملنے لکھنؤ سے
دونوں کا غائبانہ تعارف تو [illegible] اور تہذیب الاخلاق کے مضامین کے ذریعہ سے ہو چکا تھا۔ [illegible] ملاقات ہوتے ہی وہ
مہدی علی اور مشتاق حسین کی طرح سر سید کی طرف کھنچے ہوئے چلے گئے۔ سر سید کو جس جوہر کی تلاش تھی وہ انہیں مل گیا۔ انہوں نے مولوی صاحب
کو سینے سے لگایا سر پر بٹھایا اور خوب چمکایا۔ دوسرے ہی [illegible] مولوی صاحب رخصت لے کر علی گڑھ پہنچے اور سر سید نے انہیں انگریزی اور
عربی کی مستند کتابوں کے مطالعہ اور ان کے تراجم میں لگا دیا جن کی اس وقت مذہبی نکتہ نظر سے ضرورت تھی۔ اس دور میں عیسائی مشنریوں کے ہاتھ
میں تبلیغی کاموں کے لئے سرمایہ ہونے کے علاوہ حکومت کی پوری تائید حاصل تھی۔ عیسائی مذہب میں داخل ہونے سے روحانی برکت حاصل
ہو یا نہ ہو اخلاقی حالت سدھرے یا نہ سدھرے مگر دنیاوی بہتری کا دروازہ ضرور کھل جاتا تھا۔ برہمو سماج اور اس کے بعد سوامی دیانند سرسوتی
کا آریہ سماج مشن اسی روک تھام کے لئے انتھک کوشش میں لگا ہوا تھا۔ پڑھے لکھے مسلمان نئے فلسفے کے شیدا بن کر اور اپنے پرانے دقیانوسی
عقائد سے جو رفتہ رفتہ مذہب میں داخل ہو کر جزو مذہب بن چکے تھے بہت شبہ میں پڑے ہوئے تھے۔ مولوی صاحب نے اپنے محققانہ مضامین
میں وہ فلسفیانہ بحثیں اٹھائیں اور وہ مسئلے نئے رنگ میں حل کئے کہ سر سید کو ان کی ذات سے بڑی بڑی توقعات پیدا ہو گئیں۔ سب جانتے ہیں
کہ سر سید بعض معاملات میں بڑے ضدی تھے لیکن وہ ان لیڈروں میں نہ تھے جو شیخ سعدی کے

کس نیاموخت علم تیر از من
کہ مرا عاقبت نشانہ نکرد

کے خوف سے اپنے ساتھیوں کے مقتداء ہوتے ہیں۔ ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی تھی کہ ان کے ساتھ والے ان سے آگے نکلتے چلے جائیں اور ان کو

اپنی قابلیت اور اہلیت کے اظہار کے برابر موقعے ملتے رہیں۔ چند ہی دنوں میں چراغ علی صاحب کی جامع قابلیت اور وسعتِ نظری کا سرسید پر ایسا گہرا اثر پڑا کہ انہوں نے مہدی علی (محسن الملک) کے ذریعہ سر سالار جنگ کو اطلاع دی کہ جیسے شخص کی آپ کو تلاش تھی مجھے مل گیا ہے۔ حیدرآباد کی تاریخ میں یہ بڑی نازک کا زمانہ تھا۔ سر سالار جنگ کی ۱۸۵۷ء کی شورش کے زمانے کی خدمات بھلائی جا رہی تھیں اور وہ سلطنتِ برطانیہ کی بدلی ہوئی پالیسی کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنے آقا کے دیرینہ وقار کو قائم رکھنے اور ریاست کے نظم و نسق کو جدید دور کے مطابق بہتر بنانے کی فکر میں لگے ہوئے تھے۔ جنرل سر رچرڈ میڈ فوجی خدمات کے علاوہ مختلف ممالک کا ڈپلومیٹک سفر بھی کامیابی سے ختم کر چکے تھے۔ اس حیثیت سے اُن کا اثر گورنمنٹ آف انڈیا پر تھا۔ ان کو حیدرآباد کا ریذیڈنٹ بنا کر بھیجا گیا۔ وہ سر سالار جنگ کو نیچا دکھانے کے جوڑ توڑ میں لگے ہوئے تھے۔ اس کشمکش کے زمانے میں سر سالار جنگ نے مولوی صاحب کو فوراً حیدرآباد طلب کر لیا۔ اور سررشتہ مال میں محسن الملک کے مددگار کی حیثیت سے اُن کا تقرر چار سو ماہانہ پر کر دیا اور چند ماہ کے بعد ہی اُن کو سات سو ماہوار اس عہدے کی تنخواہ ملنے لگی۔

سرسید کے ان احسان کے علاوہ ان کے ساتھ جو عقیدت میری گھٹی میں پڑی ہے اس کو وقار حالی کر دار مصنف اور عہدے دار کے معاملے میں ایک اضافہ اور ہوا تھا کہ مولوی صاحب مرحوم کے فرزند محبوب علی جو ناظم ولاسیکی کے عہدے سے ریٹائر ہوئے علیگڑھ کالجیٹ اسکول میں ۱۹۰۱ء میں میرے ہم جماعت تھے۔ ہم دونوں کی عمریں اتنی نہ تھیں کہ اس سے زیادہ کچھ یاد رکھ سکیں کہ مرحوم بھاری بھرکم جسم، چوڑے سر، بڑی آنکھوں والے تھے۔ اتنا خیال بھی ہے کہ بچوں کو بہت پسند کرتے تھے۔ بچے اُن سے ڈرتے نہ تھے اور وہ بچوں کی ناسمجھی کی باتوں میں دل بہلاتے تھے۔ البتہ محسن الملک سے ان کے متعلق بہت سنا۔ محسن الملک کی یہ عادت تھی کہ کالج اور قوم کے کاموں سے جب وہ فارغ ہوتے تو اندر نہانے کے کمرے میں بیٹھ کر دادی صاحبہ مرحومہ سے جو عربی فارسی میں کافی دستگاہ رکھتی تھیں اپنے حیدرآباد کے پرانے ساتھیوں اور ہم عصروں کی اکثر باتیں کیا کرتے تھے اور اس طرح ہمیں مولوی چراغ علی صاحب نواب اعظم یار جنگ بہادر کی بہت سی خصوصیات معلوم ہوئیں۔ محسن الملک اعظم یار جنگ سے تقریباً سات سال بڑے تھے۔ اور بارہ سال بعد اس دنیا سے رخصت ہوئے آج پچاس پچپن برس کے بعد ہم ایسے خزاں رسیدہ کو سب سے زیادہ جو تکلیف ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس زمانے میں آپس کے اختلافات کے باوجود محبت و اخلاص تھا۔ جو آج مفقود ہے وہ بھلائیاں یاد رکھتے تھے اور ہم برائیاں۔ مثلاً علی گڑھ کے معاملات میں بعض امور میں نواب محسن الملک اور وقار الملک کا خصوصاً کالج میں انگریز اسٹاف کے معاملے میں اختلاف تھا لیکن جب میکڈانل نے جو اس وقت اس صوبے کے لفٹنٹ گورنر تھے سنہ ۱۹۰۰ء میں محسن الملک کے خلاف ہو گئے۔ تو نواب وقار الملک ہی سب سے زیادہ محسن الملک کے ساتھ اُردو کی حمایت میں پیش پیش تھے۔ اسی طرح ان کی وفات کے بعد ۱۹۰۷ء سے ہمیں یہ محسوس ہوتا رہا کہ وقار الملک سے زیادہ ہمارے اس غم میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔

محسن الملک جب معتمد مالگزاری تھے اور مولوی چراغ علی صاحب مرحوم اُن کے مددگار تھے جب وہ معتمد پولیٹیکل و فنانس ہوئے مولوی صاحب مرحوم کا تقرر ان کی جگہ معتمدی مال پر ۱۸۸۴ء میں ہوا۔ ان دونوں کی حیدرآباد میں یکجائی ہونے کے پہلے ہی سے محسن الملک مولوی صاحب مرحوم کی عربی و فارسی کی قابلیت اور طرزِ تحریر کے مداح ہی نہیں تھے بلکہ ان کو انگریزی زبان پر کافی عبور رکھنے والا اور اظہارِ خیال پر قادر سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس زمانے کے مسلمانوں میں ان کا نمبر نواب عماد الملک اور سر امیر علی سے کم نہ تھا۔ وہ مولوی صاحب کو ان دونوں ادیبوں سے زیادہ محنتی اور کھوجی خیال کرتے تھے۔ ان کی رائے میں مولوی صاحب تفریحی مشاغل اور ظاہری شان و شوکت کے اظہار سے بالکل بے نیاز تھے۔ انہیں نہ توصیف و تعریف کی پرواہ تھی نہ وہ مخالفت کی پروا کرتے تھے۔ نواب محسن الملک یہ بھی کہتے تھے کہ ان کے مددگاروں اور دوسرے عہدے داروں میں مولوی صاحب مرحوم ہی ایسے تھے جنہوں نے ان کے عروج کے زمانے میں کبھی ان کی ہاں میں

فیاضی میں حلال اور کبھی ضمیر پر ترجیح ہوئی کہ سرکاری یا فیصلوں اور معاملات میں وہ ذاتی تعلقات یا دوستی کی وجہ سے اپنی رائے بدل دیں گے۔
سرکاری معاملات میں جب تک وہ متعلقہ کاغذات اور حالات سے واقف نہ ہو جاتے کبھی کوئی فیصلہ نہیں کرتے تھے۔
وہ معاملے کی تہ کو اس حد تک پہنچ کر رائے تحریر کرتے تھے کہ کبھی [illegible] ان کی حق پسندی اور بے لوثی کی اس قدر شہرت
ہوئی تھی کہ ان تک نیچے سے بڑے [illegible] کو کسی قسم کی [illegible] جاگیردار و علاقہ داران ریاست
انہوں نے کبھی ان لوگوں سے ذاتی تعلقات بڑھانے کی [illegible] کبھی اور جو لوگ ان سے خلاف قانون کوئی
توقع رکھتے [illegible] وہ ان سے ناراض رہتے تھے [illegible]
کے [illegible] وزارت [illegible] سمجھا جاتا
سے نواب وقار الملک [illegible] کے جاتے تھے۔ جب
محسن الملک [illegible] دیا گیا۔

[illegible] نواب [illegible] علی شوق تصنیف و
تالیف کا [illegible] ان کی تاریخ ادبی
[illegible] کرنے لگے۔ [illegible] کے بعد [illegible] کیا کرتے اور
علمی مباحث میں حصہ لیا کرتے۔ [illegible] انہوں نے [illegible] کے لانے کے لیے [illegible] وقت گئے
تک آرام کرسی پر لیٹ کر کتاب پڑھا کرتے تھے اور اکثر [illegible] جب [illegible] پڑھتے پڑھتے [illegible] شروع
کر دیتے۔ وہ مشکل سے تین چار گھنٹے سوتے تھے۔ انگریزی ادب پر پوری قدرت حاصل کرنے کی خاطر سے انہوں نے لیٹن اور گریک بھی سیکھی
تھی۔ وہ انگریزی زبان میں ایسی شستہ عبارت لکھنے لگے تھے کہ [illegible] صاحب کا دماغ
ایسے ایسے مقامات پر پہنچ جاتا تھا جہاں عام محققین نہیں پہنچتے۔

فرائض منصبی کی ادائیگی کے علاوہ [illegible] صاحب ریاست حیدرآباد کی ایک بڑی خدمت جاگیر [illegible] پر ایک مفصل کتاب چھاپ رہے تھے۔
اس کے لیے انہوں نے ہزاروں مسلیں دیکھ ڈالیں اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ کون جاگیر کس [illegible] کے ساتھ ملی اور پھر اس میں نسلاً بعد
نسل کیا تبدیلی ہوئی۔ جاگیر کا رقبہ کیا ہے۔ جاگیردار کیا خدمت ریاست کی انجام دیتا ہے [illegible] باشندگان جاگیر کے حقوق
اور ذمہ داریاں کیا ہیں [illegible] وصولی کا طریقہ کیا ہے [illegible] سرکاری دفاتر میں [illegible] کی وجہ سے انہیں جاگیرداروں سے رجوع کرنا پڑا بعضوں
نے تو ان کے خطوط کا جواب تک نہیں دیا اور دل میں طرح طرح کے گمان کرنا شروع کر دیے۔ [illegible] صاحب مرحوم کو یہ کام ادھورا ہی چھوڑنا
پڑا۔ اگر ان کے ہاتھوں جاگیرداری کی تاریخ مکمل ہو جاتی تو صیغہ انعام و [illegible] کو بعضوں اور جاگیرداروں کو آئے دن کے مقدمات کی پیروی
سے نجات مل جاتی اور جاگیرداروں کے ورثاء کو جو صعوبتیں اٹھانا پڑیں ان سے چھٹکارا نصیب ہو جاتا۔

ان کو سرکاری خط و کتابت میں [illegible] سے سخت نفرت تھی اور نہ کبھی وہ ایسے الفاظ سے متاثر ہو کر ایسی لفافوں کو فوراً کھول کر
پڑھتے تھے۔ اس معاملے میں ان کی خفگی کا باعث یہ بھی تھا کہ وہ اپنے مفروضہ کام کو کبھی ٹال کر نہ رکھتے تھے۔ وہ دفتر میں زیادہ بیٹھنے کے عادی
نہ تھے۔

سرسالار جنگ کا انتقال یکایک ایک ہی دن کی بیماری میں ۳۰ ربیع الثانی [illegible] ہجری کو ہو گیا۔ اور مستقل انتظام ہونے تک [illegible]
کے سپرد وزارت کا کام کر دیا گیا اس وقت سے [illegible] کے آنے اور مرحوم نظام کے تخت نشین ہونے تک مختلف امراء وزارت کا خواب دیکھتے

سے چنانچہ گروہ واثق علی خاں کا حق ہوتا تھا وہ سر آسمان جاہ اور وقار الامرا کو اس منصب پر فائز دیکھنا چاہتا تھا ۔ ہر طرف سے ریشہ دوانیاں شروع ہو گئے ۔ سر خورشید جاہ کا تو ایک دو مگہ نام ہی آ کر رہ گیا ۔ مسٹر پلیر اور رحیم جی جاما جو کے لئے کوشش کرنے کو تیار ہوگئے ۔ محسن الملک عماد الملک نے واثق علی خاں کو اپنے باپ کا قائم مقام وزارت پر بھی حکومت ہند سے منوا لینے کی ترکیبیں کرنا شروع کیں ۔ ایک بات بھر میں صرف مولوی چراغ علی اور نواب اکرام اللہ خاں دو شخصوں کا نام لیا جاتا ہے کہ ان کو ان جھگڑوں سے قصوں سے ان کی مدد کا تعلق نہیں دیا ۔ نواب اکرام اللہ خاں تو سر سالار جنگ کے مرنے ہی استعفا دے کر چلے گئے ۔ اور چراغ علی خاں نے سالار جنگ کی زندگی ہی میں جو کتاب حیدر آباد دکن انڈر سر سالار جنگ لکھنا شروع کی تھی اپنے گھر بیٹھے خاموشی سے بغیر اس خیال کے کون وزارت کا مستحق قرار پاکر عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لیتا ہے ۔ اس کتاب کی تکمیل میں مشغول رہے ۔ سر سالار جنگ کو معلوم تھا کہ یہ کتاب لکھی جا رہی ہے اور اس کے کچھ جزو چھپ بھی چکے تھے لیکن اس کی اشاعت اور تکمیل ان کے مرنے کے بعد عمل میں آئی اور انہی کے نام سے منسوب کی گئی ۔ اس کتاب کی چار جلدوں میں تمام انتظامات اور ہر محکمے اور صیغوں میں جو اصلاحات ہوئیں ان کو مفصل بیان کیا گیا ہے ۔ یہ ایک مستند کتاب گزشتہ دور کی ہے ۔ سالار جنگ کے زمانے تک ختم کی جو تاریخی اور انتظامی معاملات پر ہے جو اس وقت بہت پسند کی گئی تھی اور انگریزی اخبارات نے تعریفیں کی تھیں ۔ مسٹر (؟) گوری ریذیڈنٹ نے مولوی صاحب موصوف کو ایک پرائیویٹ خط میں اس کی اشاعت پر مبارکباد دی تھی اور ان کی محنت اور لیاقت کی تعریف کی تھی Administration ۔ رپورٹ جس کی آج تک تعریف کی جاتی ہے بڑی تفصیل کے ساتھ سو سے زیادہ صفحات پر شروع سے آخر تک انہی کی لکھی ہوئی تھی ۔ یہ رپورٹ ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے اور سرکار انگریزی میں ریذیڈنسی سے مسٹر (؟) کے تعریفی نوٹ کے ساتھ بھیجی گئی تھی ۔ ان کی ملازمت کے سلسلہ کا ایک اور بڑا کارنامہ حیدر آباد کا پہلا باقاعدہ تفصیلی بجٹ ہے جس کی جامعیت کے ساتھ ساتھ اس کی اختصار اور صفائی بھی قابل تعریف قرار دی گئی ۔ اس بجٹ کی خصوصیتوں کا آگے چل کر مورخ (؟) کو اعتراف کرنا پڑا ۔ مسٹر (؟) کی وزارت کے زمانہ میں حیدر آباد پر کنٹرولر جنرل کی حیثیت سے مسلط کئے گئے تاکہ وہ نا گفتہ بہ حالات کی جو سکہ و چاندی کی فروخت اور بے جا مصارف سے پیدا ہو گئے ۔ اور جن کی وجہ سے آگے چل کر دو کروڑ قرضہ لینے کا سوال پیدا ہوا ، سد باب تمام ہو سکے ۔ انہوں نے رپورٹ تیار کی اس میں شاہی اخراجات کو بہت بڑھا چڑھا کر دکھایا اور اس پر بڑی کڑی تنقید کی اور نظم و نسق کے سر رشتوں میں تخفیف مصارف کی بھی تحریک کی ۔ مولوی صاحب اس وقت فنانشل سیکرٹری تھے ۔ ان کے کانوں میں جب یہ بھنک پڑی کہ ایک انگریز کو کنٹرولر جنرل بنا کر یہاں لانے کی ترکیبیں ہو رہی ہیں اس کی روک تھام تو ان کی طاقت سے باہر تھی انہوں نے فنانس پر جو مستند کتابیں مل سکتیں تھیں منگا کر دو ماہ میں ان سب کو پڑھ ڈالا جب مسٹر کراس آئے اور ان سے سرکاری ملاقاتیں ہوئیں تو انہیں پتہ چلا کہ یہ مولوی تو ان سے اور بڑی بڑی اتھارٹیوں مالا (؟) کسی آدمی علم جدید کے مالیہ کے اصولوں اور گورکھ دھندوں سے ان سے زیادہ واقف ہے ۔

مسٹر پلاؤڈن اس وقت ریذیڈنٹ تھے ۔ انہوں نے سر آسمان جاہ سے وزارت کی کرسی خالی کرائی تھی محسن الملک اور وقار الملک کو یکے بعد دیگرے ریاست سے باہر کرایا تھا ۔ فتح نواز جنگ بھی علیحدہ کئے جا چکے تھے ۔ نواب وقار الامرا بہادر کو وزارت پر لاکر ان کی بے جا تائید کر رہے تھے ۔ ایک طرف تو انہیں بڑھے ہوئے شاہی مصارف کا رونا تھا ۔ اور دوسری طرف حضور نظام کو مجبور کر کے فلک نما خرید دیا تاکہ اس طرح وقار الامرا کا قرضہ ادا ہو سکے اور یہ الزام اٹھ جائے کہ وزیر اس قدر قرض دار ہے ۔ اگر مولوی چراغ علی کا دم نہ ہوتا تو ریلوے شیئرز جو لندن Ballena sheet میں محفوظ تھے بک ہی جاتے اور نظام اسٹیٹ ریلوے ہاتھ سے نکل جاتی ۔ انہوں نے بجٹ وغیرہ کا ایسا صاف اور واضح تیار کیا کہ پلاؤڈن کو اس سے اتفاق کر کے تعریف کے ساتھ حکومت ہند کو بھیجنا ہی پڑا ۔ انہیں ایک عرصے سے ذیابیطس کی شکایت تھی لیکن وہ آرام لینا جانتے ہی نہ تھے ان پر اس مرض کا آخری دورہ جب شروع ہوا تو اس زمانے میں بھی وہ اپنے مشاغل میں مصروف رہے آرام لینا ترک کر آ

[illegible] ایک کاگی جیسا ہوتا ہے کہ مشہور ہے کہ [illegible] نے کچھ زیر نشانات دیا اور [illegible] لیکن [illegible] کی [illegible] کے [illegible] گئے اور بہت سے بہتر [illegible] کیا کہ جب انسان کا وقت آجاتا ہے [illegible] [illegible] کی تعبیر ہوتی ہے قسمت میں ہے بدلی ہے [illegible] ایک [illegible] ان کو
ایک [illegible] دل [illegible]

[illegible] سے ان کے احسان کم پیدا ہوتے ہیں وہ نہایت [illegible] تھے اور [illegible] اعلیٰ حضرت نواب [illegible] جنگ بہادر [illegible] نے جیسے ان سے کبھی [illegible] کی شان جو اس وقت [illegible] ہے [illegible] کی [illegible] جاتی تھی [illegible] نے جیسے مولوی چراغ علی کے نام سے منسوب ہوا ہے پسند کیا [illegible] ہے [illegible] زمانے میں ہی بہت سے وہ اپنے دوستوں اور عزیزوں [illegible] نہایت [illegible] چشانی [illegible] کرتے رہے ان طرح [illegible] حاصل کرنے اور [illegible] کا احساس نہ ہو [illegible] پیسہ کو [illegible] لکھتے تھے [illegible] نہیں جتاتے تھے [illegible] ان کے منہ سے نکلتا تھا [illegible] ہو چاہیے کتنا ہی وہ نقصان [illegible] اظہار کرتے تھے [illegible] کی وجہ سے چراغ پر جاگنے کی عادت کی بنا پر [illegible] پانی پینا پڑتا اور [illegible] نہیں دیتے [illegible] جو لوگ ان کی طبیعت سے واقف نہ تھے ان کی خاموش طبیعی کی وجہ سے کچھ کا کچھ سمجھتے۔ وہ چونکہ اپنے وقت کی بہت قدر کرتے تھے اس لئے جو لوگ ان سے ملنے آتے ان کو صرف مطلب کی بات ہی کہنے دیتے۔ جب سر سید کو ان کی وفات کی اطلاع ہوئی تو ان کو بہت قلق [illegible] اس مضمون سے ظاہر ہے۔ جو تہذیب الاخلاق کی [illegible] کی جلد میں موجود ہے۔ سید صاحب لکھتے ہیں۔

"افسوس۔ صد ہزار افسوس۔ صد ہزار افسوس کہ پندرھویں جون [illegible] کو نواب اعظم یار جنگ بہادر مولوی چراغ علی نے بعارضہ [illegible] جمبئی جا [illegible] کی دنیا میں انتقال کیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"افسوس کہ پندرھویں تاریخ کو جبکہ ہم بعض واقعات ان کے نام [illegible] کر رہے تھے۔ [illegible] جا رہے تھے اسی وقت انہوں نے بمبئی میں انتقال کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حیدرآباد میں سالار جنگ مرحوم نے انہیں بلایا تھا اس زمانے سے اس وقت تک متعدد انقلابات حیدرآباد میں ہوئے۔ [illegible] نیاں [illegible] قائم ہوئیں [illegible] اپنے کام سے کسی سے کچھ کام نہ تھا۔ ان کو بجز اپنے کام اور علمی مشغلے کے کسی [illegible] وقت [illegible] دنیا جو کیا ہو رہا ہے"

"انگریزی زبان میں بھی انہوں نے کتابیں تصنیف کی ہیں۔ مذہب اسلام کے ایک [illegible] حامی تھے ہمارے بڑے دوست تھے۔ ایسی خوبیوں کے شخص کا انتقال کرنا ایسے زمانے میں کہ ان کی عمر کچھ بھی زیادہ نہ تھی نہایت افسوس اور رنج کے لائق ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون، افسوس ہے کہ وہ مضمون اور اصل سوال کا جواب جو انہوں نے تہذیب الاخلاق میں لکھنا چاہا تھا ناتمام رہ گیا اور اب اُمید نہیں کہ کوئی شخص اس اصل سوال کو حل کرے گا"

[illegible] جس کا ذکر اقتباس بالا میں ہے وہ ماہ [illegible] تہذیب الاخلاق میں شائع ہو چکا تھا اور یہ اعلان بھی ہو چکا تھا کہ اس کا جواب مولوی صاحب مرحوم لکھ رہے ہیں جو انگریزی میں کتاب کی شکل میں "العلوم الجدیدۃ والاسلام" کے نام سے شائع ہو گا۔ سوال یہ تھا کہ اکثر لوگوں کی رائے میں یورپین علوم و فنون کی تعلیم عقائد اسلام سے برگشتگی پیدا کرتی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو یورپین علوم و فنون کے ان مسائل اور ان کے دلائل کو بیان کرنا چاہیئے جو اس برگشتگی کا باعث ہیں اور ان کتب دینیہ اور ان مقامات کا نشان ضروری ہے جن کو تسلیم میں داخل کرنے سے اس برگشتگی کی روک ہو سکے اور اگر یہ رائے صحیح نہیں ہے تو اس کی عدم صحت کا بیان جہاں تک ممکن ہو مفصل اور مدلل سے بیان کیا جائے۔

ان کی تصانیف میں ان کی پہلی کتاب "تعلیقات" کے نام سے ۱۸۷۲ء میں لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی اس میں انہوں نے پادری عماد الدین کی کتاب تاریخ محمدی کا جواب دیتے ہوئے یہ لکھا کہ اس کے ماخذ غلط ہیں حضرت عیسیٰ اور انجیل پر تفصیلی بحث کی تھی اس کے بعد انہوں نے ایک میں معرکۃ الآرا کتابیں "ریفارمز انڈر مسلم رول" "محمدی پوائنٹ ویو" لکھیں۔ تحقیق الجہاد میں انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے نہیں پھیلا۔ جہاد کی حقیقت بتلاتے ہوئے انہوں نے اثبات کر دکھایا ہے کہ پیغمبر اسلام کے زمانے میں جو لڑائیاں لڑی گئیں ان میں کفار کو قتل کرنا اور تلوار کے زور سے ان کو مسلمان کرنا مقصود نہیں تھا بلکہ وہ سب حالت مجبوری میں اپنے بچاؤ کے لئے لڑی گئیں۔ ایک رسالہ میں انہوں نے اسلام کی دنیوی برکتیں دکھلائی ہیں۔ ایام الناس جو اردو میں لکھا ہوا ایک چھوٹا سا رسالہ ہے اس میں اس اعتراض کو مٹایا ہے کہ قرآن میں کوئی بھی سن کی صحت تصریحاً نہیں۔ اس کتاب کے لکھنے میں انہیں بڑی محنت برداشت کرنا پڑی ہوگی اور کافی دقتیں ان کتابوں کے مہیا کرنے میں اٹھانا پڑی ہوں گی جس پر انہوں نے استدلال کیا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے قدیم یونانی اور عبرانی مؤرخوں کے حوالے سے ان قوموں کا وجود ثابت کیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے متعدد رسالے لکھے ہیں اور کئی کتابیں نا تمام حالت میں چھوڑ گئے۔ ان رسالوں میں "غلامی" اور "تعداد ازدواج" بہت مشہور ہیں۔ سر ولیم میور نے جو قرآن پر اعتراضات کئے تھے اس کے جواب میں انہوں نے "شہادت قرآنی بر کتب ربانی" لکھی تھی۔

مولوی امیر حسن صاحب مرحوم جو محسن الملک کے چھوٹے بھائی تھے انہوں نے اپنی نامور بھائی کی کتاب "آیات بینات" کا جواب "آیات محکمات" کی شکل میں بڑا کا بہت جید مرتب کیا۔ فرماتے ہیں کہ مذہب پر کتاب لکھنے والوں میں جو روش مولوی صاحب مرحوم کی تھی اس کی بڑی خوبی یہ تھی کہ ان کے اعتراضات و جوابات سے یہ پتہ چلانا دشوار تھا کہ وہ سنی ہیں یا شیعہ، مقلد ہیں یا غیر مقلد۔ وہ جہاں تک ہو سکتا قرآن ہی سے استدلال کرتے تھے۔ عام رائے یہ ہے کہ مولوی چراغ علی اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ محقق اور وسیع النظر تھے۔ ان کی تقریباً سب کتابیں اسلام کی حمایت میں ہیں جس میں نہ لفاظی اور نہ عبارت آرائی ہے اور نہ خواہ مخواہ فصاحت و بلاغت دکھائی گئی ہے وہ واقعات کی تنقید و تنقیح صحیح نتائج کے استخراج اور معلومات علمی سے لبریز ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی تحریر میں جوش اور گرمی دلبری اور رنگینی نہیں ہوں گی جن سے نہ جذبات بھڑکیں گے اور نہ دل پھڑکیں گے ان میں محض منطقی سرد مہری ہوگی۔ انہوں نے دنیا کو اپنی تصنیفات سے دکھلایا کہ مذہب اسلام ہی ایک مذہب ہے جس میں ترک دنیا و ترک لذات کے بغیر روحانی ترقی کے مدارج طے کرنے کے ذرائع موجود ہیں۔ وہ ان عالموں میں سے تھے جن کو صحیح معنوں عالم باعمل کہا جاتا ہے۔ جو وہ کہتے تھے اس پر خود عمل بھی کرتے تھے۔ ان کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ وہ ایک شفیق باپ اور مخلص دوست تھے۔ ادائے حقوق میں وہ کامل تھے اور اپنی بات کے پکے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا ایک لمحہ بیکار صرف نہیں کیا۔ وہ ایک ایسی مثال چھوڑ گئے جس کی پیروی کر کے دین اور دنیا دونوں سنبھل سکتے ہیں۔

۱۰ امرداد ۱۳۰۴ء فصلی کے جریدہ اعلامیہ میں ان کی وفات پر مندرجہ ذیل اعلان شائع ہوا۔

> "نواب مدار المہام سرکار عالی نے نہایت درجہ افسوس کے ساتھ سنا کہ مولوی چراغ علی صاحب اعظم یار جنگ بہادر معتمد مال و فنانس، سرکار عالی نے بتاریخ ہشتم امرداد ۱۳۰۴ء فصلی بروز شنبہ بمقام بمبئی جہاں وہ علیل ہو کر بغرض علاج و تبدیل آب و ہوا گئے تھے انتقال ہو گیا۔ مرحوم ایک نہایت لائق کارگزار واقف کار، ذی علم، مستقل مزاج اور سنجیدہ عہدہ دار تھے۔ نواب مدار المہام سرکار عالی کمر اظہار افسوس کرتے ہیں کہ طبقہ عہدہ داران میں سے مولوی چراغ علی صاحب مرحوم کے ایسے منتخب اور برگزیدہ شخص کے انتقال سے

[illegible]:

[illegible] سرسید کے [illegible] اخبارات میں [illegible] علی زبیری [illegible] خدمات [illegible]
[illegible] نواب اعظم یار جنگ سے ان کے وفات کی تاریخ [illegible] نکلتی ہے مولانا علی [illegible]
[illegible] سے مولوی [illegible] علی مرحوم کی اس شکست کا جو سرسید کے حواریں کے دل میں تھی پتہ چلتا ہے، وہ یہ ہے

مستفیدان ہم از کردہ دامن [illegible]	حیف از گنجینہ علم و گہر ناپدید ورفت
در رحلت [illegible] گلشن باشد سیلاب خلق	ساختہ برق بیانی از افق ناپدید رفت
کر [illegible] خلق السلطان [illegible]	[illegible] ناپدید رفت
یاوران قوم را تا زیست یار [illegible]	[illegible] ناپدید رفت

مولوی سید محمود نے ان کی انتقال کی خبر سنتے ہی کہا ۔

حیف چراغ علی از دنیا نہاں شد

اس سے ان کی وفات کی تاریخ سنہ عیسوی میں نکلتی ہے۔ سید محمد حامد علی صاحب اکبر آبادی نے بھی ان کے ساتھ یہی کام کر چکے تھے تاریخ کہی :-

گر ہمہ شب چراغ بود نماند

مختصر یہ کہ مولوی چراغ علی نواب اعظم یار جنگ بہادر ان ہستیوں میں سے تھے جو پیوند خاک ہو جانے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں [illegible] بزرگوں کی یاد آتے ہی مسلمانوں کو یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ گزشتہ دور کی [illegible] زبان نہیں ہے اور نہ ایسے انسانوں کی جانشینی ہوئی ہے۔ مگر اس کے پیچھے ہی سرسید، محسن الملک، وقار الملک، اعظم یار جنگ، حالی، شبلی، نذیر احمد، ذکاء اللہ ایسے بزرگوں کو صفحۂ ہستی [illegible] جائے گی، اور اگلی نسل میں کوئی ان کا نام بھی نہ سن سکے گا ۔

خدا وہ وقت نہ لائے !

نظام رامپوری

شاد عارفی

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ — دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ

اگر آپ حیران نہ ہوں اور آپ میری چندرہ سالہ تحقیق و تلاش پر بھروسہ کریں تو میں آپ کو یہ اطلاع فراہم کر سکتا ہوں کہ اوپر درج ہوئے حضرت نظام کے مطلع میں پہلا مصرع حضرت نظام رامپوری کا نہیں بلکہ نواب کلب علی خاں صاحب المتخلص بہ نواب کے فکر کا نتیجہ ہے جسے مرحوم نے کسی لطیفے کے کسی منظر سے متاثر ہو کر نظم کیا اور بار بار آکر شعرائے دربار سے اس پر گرہ کی فرمائش کی۔ اپنے اپنے رنگ میں سبھی نے زور مارا مگر مصرع کا ماتعاتی مزاج کسی کی گرہ برداشت نہ کر سکا۔ چونکہ یہ مصرع حضرت نظام صاحب کے نصیب کا تھا چنانچہ انہوں نے کہا، دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ ـــــ مصرع دست و گریبان ہو گیا تھا۔ اس لئے نواب صاحب نے اظہار خوشنودی کے طور پر اپنا مصرع یہ کہہ کر نظام رامپوری کو عطا کر دیا کہ یہ مصرع آپ ہی لے لو اور حضرت نظام نے بھی کمی نہیں کی کیونکہ رہ کوئی جاگیر نہیں تھی جسے اوڑھایا بچھایا جا سکتا ـــــ اور پھر اس مطلع پر پوری غزل کہی جو حضرت نظام صاحب کے دیوان کا حاصل ہے اور یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ ہر دیوان میں ایک غزل اور ہر غزل میں ایک شعر بے پناہ ہوتا ہے۔ حالانکہ نظام رامپوری کی ایک اور غزل بھی حاصل دیوان ہے جس کا یہ مطلب ہوا کہ حضرت نظام کے دیوان میں دو غزلیں وہی خصوصیت رکھتی ہیں۔ جو کسی اور شاعر کے ان پورے دیوان میں ہوتی اس غزل کا ایک مصرع یہاں سُنا دوں تفصیل بعد میں آئے گی۔ فرماتے ہیں ـــــ

اسے کیا بات تھی کیا بھول گیا

تو ہاں ـــ آپ میری اس اطلاع پر حیران ہوئے ہوں گے لیکن مجھے اپنی اس تحقیق پر کتنی پشیمانی ہوئی تھی بیان نہیں کر سکتا لیکن اس طرح حضرت نظام کے عقیدت مندوں کو ٹھیس لگی تھی لہٰذا اُن حضرت کو جن کے ذریعے یہ پتہ چلا تھا۔ جو فنا فی الوقت اور ضدی قسم کے آدمی تھے اُن سے اس لئے بدگمان ہو کر کہ یہ مبالغہ [illegible] فرماتے ہیں میں نے بے ساختہ کہا تھا ـــــ اور سے جی ...... اس مطلع کا پہلا مصرع معہ ردیف و قافیہ نواب صاحب کے تقدیر ہو گیا ہے [illegible] ملک الکلام والی بات ہے۔ وہ کس طرح؟ انہوں نے پوچھا ـــــ تم بھی کمال کرتے ہو ـــــ انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے ـــــ

مضمون ادا ہو گیا ۔۔۔ "آنکھ کے اندھے" ۔۔۔ پھول کا گرنا کیا تھا۔ بالکل یوں ہے کر لیجیے۔ میں نے نمک سے پھول سمجھا ۔۔۔
یا پھر - کوئی تیرا ہی پلکوں پر حضرت غالب نے یہ اعتراض کیا تھا۔

دل کی کانچ کی آں نازنیں سوار ہو دد ۔۔۔ کہ سبزہ ہا ہمہ انگشت زینہار بہ جنبد

پہلا مصرع میں صرف انقضا کا رنگ اور نادر ہے - سمجھ آیا ہے کہ مطلع بنا ہے - لیکن کچھ ہے - بہرحال - جب میں تیش کی طرح چلتا تھا
اور میری شاعری کا شہرہ ان کی مشق کی طرح حاوی تھا۔ خیر - جسے حضرت نے دو مصرعے مشتاق کیا میں اس وقت نواسے منظور سے واقف نہ تھا۔
اس لئے پورے مطلع پر چڑک گیا یہ تو میری شاعری کی بنیاد بھی اس وقت واقعات اور معاملوں پر قائم تھی - مثلاً

--- چھپالی تھی جس نے میری آنکھیں ہی انگلیاں سی جاتی ہیں --- وغیرہ

اس لئے حضرت نظام رامپوری کا دیوان دیکھنے کی فکر پڑی - بڑی کوشش کے بعد ایک معمولی نسخہ ملا - جہاں بھی کسی شخص کے پاس دیوان ہونے کی
خبر ملی پہونچا ۔۔۔ نہ مل سکا ۔۔۔ جو کچھ تھے اس سے پہلے زمانے کے لکھے گئے پھر میری نظروں پر کچھ پیسے اور جھٹکے اثر پہنچے سے سمجھ
سکے ہو مگر نہیں لے جا سکتے نہ ادھر کی نقل کر سکتے ہو - ایک شعر بھی نہیں جو نہیں - اور انہوں نے دیوان بغل میں دبا کر گھر چلے گئے - میں نے
پھر عاجزی سے کام لیا تو ٹھہر گئے ۔۔۔ قلمی دیوان تھا - لکھائی بہت بری - کاغذ بھی بوسیدہ اور گلا ہوا ۔۔۔ جو بس تھوڑا ایک گھنٹہ مطالعہ
کرکے بہت سے شعر یاد کر لئے اور ایک نوٹ بک پر گھر آکر نقل کر لئے - جب اس طرف سے مطمئن ہو گیا تو اشعار کا بغور مطالعہ کیا تو صاف
ظاہر ہوا کہ حضرت نظام اپنے ماحول سے تنگ آکر جو کچھ کہنا چاہتے تھے وہ شخصی ملامت کے خوف سے نہ کہہ سکے - اس لئے جگہ جگہ اشارے چھوڑ گئے
ہیں - مثلاً

--- ہم ایسے ہیں کہ جیسے کسی کا خزانہ ہو ---

یا پھر

--- جیسے ہم بن جائے بیٹھے ہیں ---

اب حال نظام کچھ نہ پوچھو ۔۔۔ غم بڑھا تمہیں اگر کہوں گا

کچھ آپ کو خبر بھی ہے سید نظام کی ۔۔۔ بیچارہ تنگ آ کے دہلی سے نکل گیا - وغیرہم

حالانکہ بے چارے نے کبھی ترک وطن نہیں کیا نہ کر سکتے تھے - مگر اس طرح وہ اپنی نظروں کے حسن میں آگے بڑھ گئے تھے وہ جیسا کہ تحقیق
ہوا اُن کی زندگی سخت مالی مشکلات کا شکار رہی - ان مشکلات کا پتہ مضمون میاں نظام شاہ رامپوری ہے جس میں نیاز فتحپوری نے کسی تجسس سے
کام نہیں لیا - ورنہ یہ کبھی نہ لکھتے کہ (جب میاں نظام شاہ کی شاعری کی خبر شہر میں عام ہوئی تو نواب نے انہیں بلایا اور منصب مقرر کر کے شعرائے
دربار کا سلسلہ سے وابستہ کر دیا) - حیرت ہے کہ نیاز فتحپوری نے کس بنیاد پر منصب مقرر کرنے کا دعوے کیا ہے جبکہ کوئی تحریری سند یا شجرۂ
گزٹ وغیرہ میں اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا - اس عبارت کے فوراً بعد انتقادیات میں ایک کھٹکتا ہوا جملہ یہ بھی ہے کہتے ہیں (کہا جاتا ہے کہ
میاں نظام شاہ نے اس کے بعد محمد نواب سے فن شعر حاصل کیا) اس جملہ معترضہ کے صاف وہی معنی ہیں - جس میں اقتدار پسندی لکھنے والے کو
دوسری جانب بہکائے جاتی ہے - سمجھ میں نہیں آیا کہ جس کا منصب ہو جو نواب کا شاگرد ہو اس کی زندگی اس قدر ناگفتہ بہ رہی کہ یا وہ شاید - مکان گر
پڑا تو بنا نہ سکے - مفلسی کی بناء پر بیوی ایک بچہ (لڑکا) لے کر اپنے گھر جا بیٹھی اور پھر زندگی بھر واپس نہ آئی - یہاں نیاز [illegible] کی کہ ایک اور شعر کر

کہہ لیجئے کہ وہ اپنے انتخابات میں لکھتے ہیں کہ سید نظام شاہ نے ساری عمر تجرد ہی میں بسر کی اور قلیل معاش پر قناعت [illegible]
گزار دی) تعجب ہے کہ اپنے انتخابات میں نیاز فتحپوری منصب مددی کا ذکر بھی کرتے ہیں اور تجرد کا بھی دعویٰ کرتے ہیں [illegible]
کرنے کے متعلق اقرار کرتے ہیں۔ نواب کلب علیخاں صاحب نواب کا شاگرد اور قلیل معاش، منصب مدد اور فاقے — ایسے متضاد [illegible]
مجھ سے شبہ گزرتا ہے کہ واقعہ یہ نہیں ہے جو احتیاطاً یا مصلحتاً درج انتخابات کیا گیا ہے۔ حقیقت جو میری تحقیق میں آئی جس کے [illegible]
معتبر تھے۔ کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ غلط۔ اُن کا منصب و نصب کچھ نہیں تھا۔ جوانی میں اپنے والد سید احمد شاہ صاحب کی جگہ [illegible]
تھے مگر اپنے لاابالی پن اور صوفیانہ روش، شاعرانہ مزاج کے بنا پر یہ نوکری چھوڑ دی تھی۔ تنگ دستی کی وجہ سے بیوی میکے [illegible]
ایک لڑکے کی ماں بھی بن چکی تھی۔ اس لئے فاقے کرتے کرتے تنگ آ کر گھر بیٹھ رہی اور سید نظام شاہ صوفی منش حضرات کی صحبت میں گزارتے [illegible]
بیوی کی جدائی اور اس کی یاد نے دو مقام جیسی یا معاملے شعر میں ڈھالنے شروع کئے جو ان پر گزر رہے تھے گویا یہ اشعار ہیں [illegible]
سب اُن کے گھر والی سے متعلق ہیں۔ یہ میں نے اس لئے کہا کہ وہ انتہائی پاکباز قسم کے صوفی تھے۔ میں اس قسم کے دعوے کیوں کر [illegible]
نہیں ہیں اُن کا معتبر راویوں کے ذریعہ ثبوت دوں گا۔ میں نے جس قدر وقت سید نظام شاہ کی زندگی پر لکھنے پر صرف کیا ہے اور جہاں [illegible]
نے خلاف توقع وہ اسباب فراہم کر دیئے۔ جو سید نظام شاہ پر لکھتے وقت کسی کو نصیب نہ ہوں اُن کے لئے میں مشیت ایزدی [illegible]
ہوں جنہوں نے میری بڑی رہنمائی کی ورنہ میں تھک کر بیٹھ رہتا۔ یہ تو آپ جانتے ہوں گے کہ سید نظام شاہ حضرت [illegible] شاگرد حضرت مومن کے شاگرد تھے
بعد میں صوفی محمد شاہ صاحب سے اصلاح لینے لگے ——— مگر ایک سوال ہے جو بار بار مجھے ستاتا رہا ہے وہ یہ کہ مولوی صوفی محمد شاہ صاحب ان
اشعار پر کیا اصلاح دیتے ہوں گے جن کا تعلق معاملہ بندی اور خلوت سرائے سے ہے اس لئے ماننا پڑے گا کہ یہ سید نظام شاہ صاحب کی [illegible]
ادا کا نتیجہ تھا۔ نیاز فتحپوری نے جو کہ سب سے الگ بات کہنے میں اپنی شان سمجھتے معلوم ہوتے ہیں سید نظام شاہ کو جرأت سے متاثر یا ان کے
رنگ میں کہنے والا بتایا ہے حالانکہ اُن کا رنگ یا تو میر سوز سے ملتا جلتا ہے یا پھر نواب آصف الدولہ سے۔ اب میں ان تینوں شعراء کا کلام [illegible]
کر کے آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں آپ خود اندازہ کریں گے کہ یہ ایک ہی شخص کا کلام ہے یا تین الگ الگ رجحانات طبع کا نتیجہ۔

جس کا تو آشنا ہوا ہوگا — اُس نے کیا کیا ستم سہا ہوگا
تیرا ملنا تو اک قیامت ہے — غیر کا حال کیا ہوا ہوگا
سوز دل اپنا میں اُس شوخ سے کہتا لیکن — جو چھپانے میں مزا ہے نہیں اظہار کے بیچ

گھر جانے کا قاتل نے نرالا ڈھب نکالا ہے — ہر اک سے پوچھتا ہے اس کو کس نے مار ڈالا ہے
غیر سے کہتے ہیں وہ میرے ستانے کے لئے — ڈھونڈھ لیں گے ہم بھی کوئی دل لگانے کے لئے
رات دن یہ سوچ رہتا ہے میرے دل کے تئیں — اے خدا وہ یاں سے جا کر کس کا ہم خانہ ہوا

اُس پاس پھر گیا دل گمراہ کیا کروں — دم مارنے کی بات نہیں آہ کیا کروں
بے وہاں جائے بھلا ہم سے رہا جائے کہاں — دل سے اور اس بزم میں جانے کا مزہ جائے کہاں
دیکھی جاے تماشا کے پاس سے اکدم سرکنے کر — سو اس کے در پہ اب رخصت نہیں ہے سر جھکا کر

[illegible] ہوا ہو گا ... ہیں۔ نظام شاہ صاحب آسف ... کے ... قریب قریب [illegible]
[illegible] ہے

چونکہ صاحب پرنسپل گورنمنٹ رضا ڈگری کالج رامپور نے نظام رامپوری کے ہم سے جو بار شائع کیا ہے اس کی بدولت [illegible] ہے کہ نظام رامپوری کا تخلص رامپوری یعنی نواب یوسف علی خاں کا شاگرد ہونا کمل تر ہے۔ اور کوئی بھی شاعر ایسا ہے جسے سے کوئی منفعت نہیں ہوئی۔ حتیٰ کہ انہوں نے نواب یوسف علی خاں صاحب ناظم اور نواب کلب علی خاں صاحب نواب کی تعریف میں قصیدے تک کہے (قصیدے میں ان کا رنگ بہت پھیکا ہے اور ان پر شکوہ الفاظ سے خالی ہے جو قصیدے کی جان ہوتے ہیں) اور [illegible] اور وہ تنگی معاش میں مبتلا رہے۔ چنانچہ انہوں نے یہاں تک کہہ دیا

— شب کو فرمائش سرکار نے سونے نہ دیا —

سید نظام شاہ [illegible] میں نواب احمد علی خاں صاحب بہادر کے عہد میں رامپور میں پیدا ہوئے۔ یہ سب ستیے ... بارہویں پشت میں حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے۔ نیم تہبند باندھے رہتے تھے اور کبھی کبھی سر ... ٹوپی ... اور متقی قسم کے صوفی تھے۔ تین صاحبزادگان وقت کا سودا سلف خریدنے پر بھی ملازم تھے۔ ان سے جو کچھ ل ... کے ساتھ ... کر لیتے تھے — یہ قناعت کا لفظ مجبوری کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ورنہ وہ کوئی باقاعدہ مشائخ اور مذہبی آدمی نہ تھے۔ صوفی مزاج تھے لیکن صوفی اور فاقہ لازم و ملزوم نہیں رہے ہیں۔ ایسے کہ اگر وہ اتنے ہی نفس کش تھے تو نواب یوسف علی خاں ناظم کے قصیدے کیوں لکھے۔ نواب کلب علی خاں صاحب نواب کی مدح اور فرمائش سرکار کے سلسلے میں اپنی راتیں کیوں کالی کرتے۔ ظاہر ہے کہ انہیں وہ فراغت نصیب نہ ہوئی جس کے وہ بجا طور پر متمنی تھے۔

سید قیم شاہ میاں جو نظام شاہ کے ساتویں لڑکے تھے۔ (ان سے پہلے چھ لڑکوں کا انتقال ان کے سامنے ہی ہو گیا تھا) اور اپنی والدہ کے ساتھ تھانہ پیلا تالاب پر رہتے تھے۔ جب میں ان سے ملا تو وہ بہت ضعیف اور عسرت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ وہ اپنے والد کی شاعری بابت قریب قریب کچھ نہیں جانتے تھے۔ خود پڑھے لکھے نہ تھے۔ اس لئے اپنے والد کی بے پروائی کے سخت خلاف تھے انہیں یہ قطعی معلوم نہیں تھا ان کے والد کو نا قدریٔ زمانہ نے اس بری طرح پیسا تھا کہ وہ پنپنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

— ہم ایسے ہیں کہ جیسے کسی کا خدا نہ ہو —

ہاں ایک مثنوی کے بابت کہتے تھے جو اُن کی والدہ کے پاس تھی جسے کوئی صاحب دیکھنے کو مانگ کر لے گئے اور پھر واپس نہ لائے — مسٹر امتیاز صاحب گمنام ... جو ڈرائنگ ماسٹر ہیں اور ایک اچھے آرٹسٹ بھی ایک روز میرے پاس میرا فوٹو لینے آئے، وہ اس پر بھی عمل کرنا چاہتے تھے۔ باتوں باتوں میں نظام صاحب کا ذکر آگیا تو موصوف نے اپنے دادا کے حوالے سے سید نظام شاہ صاحب کے بارے میں ایک روایت بیان کی انہوں نے کہا کہ میرے دادا جی کا اس عہد کی پسندیدہ ہستیوں میں شمار ہوتا تھا اپنا چشم دید حال بیان کرتے تھے کہ پہلے ہم لوگ بھی گھیر سنگی میں رہا کرتے تھے وہیں سید نظام شاہ صاحب کا آبائی مکان بھی تھا جس کو انہوں نے بیوی سے ناچاقی کے بعد قریب قریب ترک کر دیا تھا صرف رات کو سونے کے لئے یہاں چلے آتے تھے اور دن بھر علی نور صاحب کی خدمت میں رہا کرتے تھے علی نور صاحب اس عہد کے ایک اچھے بزرگ تھے۔ اُن کا ایک لطیفہ بھی سنتے چلئے۔ افغانستان سے ایک مولوی علی نور صاحب سے بیعت کے لئے آئے۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ جب یہ موصوف کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ خربوزہ کھا رہے تھے۔ اتفاق مولوی نے دیکھتے ہی کہا۔ لاحول ولا قوۃ میں کیا سمجھ کر

آیا تھا اور میاں تو کچھ اور ہی دیکھ رہا ہوں ۔ علی زر صاحب اس پر مسکرائے اور کہا ۔ مرشدنا ۔ اللہ میاں تو منہ نہیں رکھتا ۔ اتفاق سے وہاں کچھ آدمی تھے ۔ کہنے لگے ۔ اللہ میاں منہ تو نہیں رکھتا مگر وہ خربوزہ بھی نہیں کھاتا ہے —— آپ اس جواب پر بہت خوش ہوئے اور دعا بھی کر دیا اور کہتے ہیں کہ تھوڑے ہی عرصہ میں دولت فقر سے مالا مال کر دیا —— جب سید نظام شاہ کا انتقال ہوا تو کہتے ہیں کہا جاتا ہے وہ اس وقت علی زر صاحب کی خدمت میں تھے یا کسی اور مکان میں مگر یہ طے ہے کہ اُن کا انتقال مسکونہ مکان میں نہیں ہوا اور مشکل یہ ہے کہ کے مقبرے میں کہیں دفن ہوئے ۔ بہر حال فیصلہ کی نے یہ جو کہا ہے کہ انتقال کے بعد سید نظام شاہ بچے پر محمد شاہ صاحب کے تدفین کے لئے گئے قطعاً موضوعی حیثیت رکھتا ہے ۔ ان کے کے والد کا بیان ہے کہ جب میاں نظام کا انتقال ہوا تو امیر احمد صاحب مینائی نے آ کر نظام صاحب کے مسکونہ مکان پر حکومت کی طرف سے ایک اور قفل ڈلوا دیا سوئم کے بعد امیر مینائی نے ہی یہ مکان کھلوایا ۔ غزلیات کے مسودے اور کچھ اشعار جو دیوار پر کوئلہ سے لکھے ہوئے تھے نوٹ کئے اور ان کو مٹا کر چلے گئے ۔ چنگ ... ان کی بیوی کو بیگم ... نے یہاں ایک عجیب و غریب بات کہی ۔ مجھے چونکہ کسی حقیقت کو چھپانا مد نظر نہیں ہے اس لئے وہ سب کچھ بے کم و کاست بیان کرتا ہوں حالانکہ امیر صاحب مینائی میرے دادا استاد ہیں کیونکہ میں فصاحت جنگ حضرت جلیل کا شاگرد ہوں ۔ ... صاحب کے والد کا یہ خیال تھا کہ وہ اشعار جو امیر مینائی کے کلام میں نہیں چھپتے یہ وہی اشعار ہیں جو وہ نظام شاہ کے مکان سے اپنے ہمراہ لے گئے تھے ۔ میں نے جیسا سنا تھا آپ سے بیان کر دیا اب یہ آپ پر ہے کہ اُسے قبول یا رد کر دیں —— پھر بھی امیر مینائی سے اس قسم کی بدگمانی کی نسبت درست نہیں ۔ ... میں نظام شاہ صاحب سے متعلق کچھ لکھنے پر سوچ ہی رہا تھا کہ مردے از غیب بیروں آمد و کارے بکند ۔ کے طور پر ایک شخص میری غزل کا مطلع سن کر پوری غزل حاصل کرنے کو آ گئے ۔ یہ امیر مینائی خاندان کے قدیم خدمتگاروں میں ہیں ۔ ان سے جب سید نظام شاہ صاحب کا تذکرہ چھڑا تو وہ کھل پڑے ۔ کہنے لگے کہ آپ حافظ چھنو عرف پنڈت سے ملئے جو کٹ کویا محلہ میں رہتے ہیں اور جنہوں نے پنڈت کے متعلق سب کچھ بطور خود بھی بتایا ۔ پنڈت ان کے خاص دوستوں میں سے تھے ۔ یہ حافظ چھنو اور پنڈت کیا معاملہ ہے میں نے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ پیغمبر پور میں ایک بزرگ رہتے تھے ۔ حافظ چھنو نے ان کی کرامت کا امتحان لینے کے لئے پنڈت کا روپ دھارا اور حاضر ہوئے ۔ وہ بزرگ حقہ پی رہے تھے ۔ حقہ آگے بڑھا کر کہا ۔ پنڈت جی پیو —— انہوں نے پنڈت ہونے کا عذر کیا تو فرمایا یہ تو ٹھیک ہے مگر ہمارے یہاں پنڈت اور شیخ سب برابر ہیں ۔ بہت شرمندہ ہوا بس اب پی لو ۔ ... راز کھل گیا مگر یہ پنڈت کے نام سے ایسے مشہور ہوئے کہ لوگ اُن کا نام بھول گئے ۔ تو ان پنڈت کو سید نظام شاہ صاحب سے والہانہ محبت تھی ہر وقت اُن کی خدمت میں رہتے اور ہر شعر اور ہر غزل کے متعلقات انہیں یوں حفظ تھے جیسے وہ اُس کے حافظ ہوں ۔ ان پنڈت نے ہی لوگوں پر یہ راز فاش کیا تھا کہ انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ یہ مصرع نواب کلب علی خان کا مصرع تھا جس پر نظام رامپوری نے پہلے تو مصرع پہونچایا اور پھر پوری غزل کہی جو حاصل دیوان ہے ۔ پنڈت نے یہ بھی بتایا کہ آخر عمر میں ایک مہترانی جو گھر میں کمانے آتی تھی سید نظام شاہ صاحب اس سے محبت کرنے لگے تھے (مگر بے لوث اور پاک) پنڈت کا کہنا ہے کہ وہ مہترانی بھی بڑی مزاج شناس تھی ۔ جب نظام صاحب خاموش ہوتے یا کوئی شعر کہتے ہوتے تو وہ کوئی نہ کوئی چٹکی لے لیتی تھی اور نظام صاحب بھڑک جاتے تھے —— ایک مرتبہ وہ بیمار پڑ گئی اور کئی دن تک نہ آئی تو آپ آبدیدہ بھی ہوئے اور اُس کی مزاج پرسی کو اس کے گھر بھی تشریف لے گئے —— پنڈت کہا کرتے تھے کہ اُن کے کسی شعر میں محبوب کو ہاتھ لگانے کا ذکر نہیں ملتا ۔ یہی نظام صاحب کا کردار تھا ——

اور یہ بات قرین قیاس یوں بھی ہے کہ نظام صاحب کے ہاں چھوا چھاتی کا کوئی شعر نہیں ملتا ۔ وہی رکی تھمی کیفیت ۔ وہی احتیاط اور سلیقہ رکھ رکھاؤ جو ایک پاکباز شاعر کے ہاں ہوتا ہے نظام صاحب کا رنگ ہے ۔ سید نظام شاہ صاحب کے تین دیوان کتب خانہ سرکاری میں موجود ہیں ایک مطبوعہ اور دو قلمی ۔ قلمی اور مطبوعہ میں زمین آسمان کا فرق ہے کئی کا آمد اور اچھے اشعار مطبوعہ دیوان میں نہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ غلط دیوان کی اشاعت

کے بعد جب یہ بھید کھلے گا۔ مطلب یہ کہ نظام شاہ صاحب کا دیوان نسخہ میں ایک ہے جو کہ ان کی زندگی میں چھپا شعر جلد تیسرا شامل ہیں شعر لکھے [illegible] جس میں [illegible] نظام کو پہلے سے معلوم ہے کہ ترجمہ میں وہ بھی مشاعروں میں شریک [illegible] حقیقت حاصل نہ کر سکے جو ان کے سب حال ہوتی۔ انتقال کے بعد بھی یہ ہوا کہ ان کی کلیات شائع کی جاتی چنانچہ ہم [illegible] ترتیب سے کہ ایک جہاں سرکاری کتب خانہ میں داخل کر دیا ہے۔ دو ایک [illegible] ہے کہ اس کا خیال ہے اس نے بڑی [illegible] کے بعد ان کی کلیات اور وہ اشعار جو ان سے چھپے کر کے شائع کر سکے۔ چند شعر پیش کرتا ہوں یہ ممکن ہے کہ ان کا کچھ زیادہ تعلق ان کی زندگی سے نہ ہو مگر ان کے شعر سننے میں مزہ ہی کیا ہے

تم سے کیا کہنے کو تھا بھول گیا ۔۔۔ ہائے کیا بات تھی کیا بھول گیا
خوش ہوں اس وہ فراموشی سے ۔۔۔ کس سے ملنے کو تو وہ سنبھل گیا

انداز اپنا دیکھتے ہیں آئینے میں وہ ۔۔۔ اور یہ بھی دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو
کروٹ بدلنے میں جو دوپٹہ سرک گیا ۔۔۔ گھبرا کے دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو

بے ساختہ نگاہیں جو آپس میں مل گئیں ۔۔۔ کیا منہ پہ اس نے رکھ لیے آنکھیں چرا کے ہاتھ
بے اختیار ہو کے جو میں پاؤں پر گرا ۔۔۔ ٹھوڑی کے نیچے اس نے دھرا مسکرا کے ہاتھ
وہ زانوؤں میں سینہ چھپانا سمٹ کے ہائے ۔۔۔ اور پھر سنبھالنا وہ دوپٹہ چھڑا کے ہاتھ
دینا وہ اس کا ساغر مے یاد ہے نظام ۔۔۔ منہ پھیر کر ادھر کو ادھر کو بڑھا کے ہاتھ

سوتوں میں جان ڈال کے انگڑائیاں نہ لو ۔۔۔ یاں آنکھ آپ کی ہے مقدر کھو جملہ

کہتے ہیں سب یہ میری باتیں ہیں ۔۔۔ تجھ کو کروٹ ہو بنا دیا میں نے

اس دست نگاریں کو خدا میں نے چھڑا تھا ۔۔۔ کس ناز سے کہنے لگے اب چھوڑ دے گا ہاتھ

مرا کچھ حال وہ کہتا اور اس کا ۔۔۔ وہ کہتا چپکے سے منہ پھیر کر کچھ
یہاں کہتا ہوں کچھ میں اے قسمت ۔۔۔ وہاں کہہ دیتے ہیں بیٹھا ہر کچھ
نظام ایسے ابھی شاداں نہ تھے تم ۔۔۔ خوشی کی دی کسی نے کیا خبر کچھ

کس نے کوساتھا خدایا مجھ کو ۔۔۔ کہ تجھے عشق بتاں ہو جائے

پھر نہ کہنا کہ مجھے تم نے کہیں دیکھا ہے
سو رنگوں میں کئی بار وہیں دیکھا ہے
گر کوئی پوچھے مجھے، آپ اسے جانتے ہیں
ہم کہ انجان رہ سکتے ہیں کہیں دیکھا ہے

بعد رنجش وصل کے پوچھتے ہیں
ہم نہ ملتے تو آپ کیا کرتے

مری جانب سے تم کو دشمنوں نے خط یہ لکھے ہیں
بھلا ایسا میں لکھ سکتا ہوں یہ تحریر میری ہے

قاصد تری باتوں کا تو ہے اور ہی مطلب
ان باتوں کا خط میں کہیں مذکور نہیں ہے

ہمدم نہ کہہ وہ بات جو دل کو بری لگے
اس بیوفا سے گو مری رنجش بجا ہے

مجھ میں ان میں جو کچھ کدورت ہے
جائے گی یہ ابھی نہیں جاتی

چھپ چھپ کے دیکھنے کا مزہ دیکھئے نظام
یہ خبر گزری اس کی ادھر کو نظر نہ تھی

شاد عظیم آبادی

سید حسن امام

خان بہادر سید علی محمد شاد (۱۲۶۲ — ۱۳۴۵ھ)

مضمون نگار شہید قسمت کے بہاری کے جاننے والے مشاہیر میں شاد نہیں تھے جو گوشۂ خاک بہار میں پیوند کر دیے گئے بعض گل سرسبد کا تھا۔ میر و سودا کی اپنی اپنی خصوصیتوں کا دل کش پیغام دینے والا مجموعہ تیار کرنے کی فطری صلاحیت بھی ودیعت ہوئی تھی۔ بہاری شعرا کی محفلوں میں دگر ہزار بہ قدری سے یہی گوشۂ چراغ آنکھوں سے اوجھل ہو سکتا تھا۔ شاد پر زمانے کی نظریں پڑتی ہیں۔ دہلی اور لکھنؤ کا ترنم اپنی اپنی جگہوں پہ ٹھکنے کے بعد بھی شاد خود اپنی بہاری بولی پہ نازاں تھے۔ بدقسمتی سے ان کو نادان دوست تو ملے فرما دو شمس تک رفتہ رفتہ ترجمہ ہو کر ان کے اکثر 'بول' بزبان غیر ترجمہ ہو گئے۔

شاد کی شخصیت بہت ہی الجھی ہوئی سی ہے۔ کیا بااعتبار ذاتی توقعات اور اس کے حاصل کے' یا ماحول اور اس کی اقتضا کی نسبت سے۔ دونوں کے شواہد اور اثرات ان کے کردار اور کلام میں صاف نظر آتے ہیں۔ ان کے فرمودات پر جہاں تک خیال آرائی کی گئی ہے اس میں ان کی ذات کو معرضِ بحث میں لانے سے صرف نظر برتا گیا ہے۔ اگر ناگزیر طرح پر ان کو زیر بحث لایا بھی گیا ہے تو کچھ ایسی معترضین نے مثل قسم کی غیر واجب احتیاطیں برتی ہیں اور معترضین بری طرح اپنا بھانڈا پھوڑ بیٹھے ہیں۔ ع مرحوم زخدا خواہی مرحوم مرحوم۔ کہنے کا مستحق شاد سے بہتر کیا ہوگا۔ ماہنامہ ندیم گیا کا شاد نمبر بسرپرستی جناب حمید عظیم آبادی میری ادارت میں شائع ہوا تھا۔ متکلم اسلام، شعر کو ثابت کرنے کے لئے مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم کا نقد قلم ہاتھ آگیا تھا مگر شاد کی شخصیت کی تابانی یا تاریکی کو اجاگر کرنے کے لئے کوئی روشن ضمیر ہمت نہ کر سکا تھا۔ ایک کھلی وجہ اس کی یہ بھی ہو سکتی ہے کہ شاد کی ذات خود اپنے فرمودات کے حجابات سے باہر آنے کی کبھی عادی نہیں ہو سکی چونکہ نگاہ دید بھی اکثر تنگ ہی رہتی تھی۔ لہٰذا کہ ہم کے ویران میل وارد دل کش بیند مرا۔ قول کسی کا بھی ہو مگر زبانِ حال " شاد کی اس کی ہمنوا رہی۔ آج جب شاد شعرائے بہار کی صفوں سے پار اتر کر صرف اردو کے منفرد و سرآمد اساتذہ سخن میں شمار ہونے لگے تو ان کی شخصیت سے دل چسپی لی جا رہی ہے۔

شاد کے تالیف کردہ تذکرۃ الاسلاف کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے واداؤں میں بخطِ مستقیم کوئی ہستی غیر معمولی بہت

کا ہندستان میں نہیں تھی۔ صحافت کے ذریعہ نامہ نگاروں میں مقتدا سا رہتے ہیں مگر عجیب بات یہ ہے کہ مرثیہ اور وراثت کے نئے ... ایک سے نہیں ہیں۔ جن نسبتوں سے شاد اپنا امتیاز قائم کرتے ہیں وہ سیادت سے آگرا تر اک سے ملتی ہیں، یعنی علی وردی خاں صوبہ دار اڑیسہ و بنگال کے ذریعہ ظاہر ہے کہ شاد کا سا حساس طبع اس کو بالکل نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ پھر اکرودسے پر تیم' یہ جاکر ستارہ خاندان کا تبرک ہی تبرک شاد تک پہنچا۔ ان کے قریبی رشتہ داروں میں 'صرف فارغ البال ہی نہیں بلکہ کثیر الاملاک' افراد بھی تھے' جن سے تم شکل بقول کلکٹر شاد کے ایسے نازک طبع کے لئے "بن کہے ستمگر" سے کسی طرح کم نہ تھی۔ سادات بارہ کی قرابت داریوں سے بھی شاد بہت دور نہیں رہ سکتے تھے۔ ریشہ کے پیچھے ہی سے دائے مند بادشاہ گر بھائیوں کو مصعون کرنے لگی تھی۔ شاد کے ہوش سنبھالنے تک غیر جانبدار تھا۔ اور ان کے آگے کی نئی پود اس بارے میں بلند آور ہو چکی ہوگی۔ پھر انگریزی تسلط میں جو کارہائے نمایاں ان کے بڑوں نے کر دکھائے تھے مگر اس کے اجر "وہ وہ دنیا" میں سے پھوٹی کوڑی بھی شاد کی قسمت نہ ہوئی۔ ان سب باتوں کو زیر نظر رکھتے تو ان کے بیدردانہ بیان منش تمہ نہ (۱) نے کہا

تا نکہ مجنوں را خرابیہائے خرد ' دیدہ نبود۔

اس پس منظر پر صرف سرسری نظر ڈالنے والے کا نزد جب جید ا رہم ہے نہ خلاف توقع۔ تو پھر کون سی حیرت کی بات ہے کہ آنکھیں کھونے کے بعد سے ان کو موہ لینے کی جمعت پانے تک اس پس منظر میں گزر بسر کرنے والا بھی اثر لئے بغیر رہ سکا؟ آخر شاد بھی انسان ہی تو تھے۔ مگر تماچی کسی نے غور کیا اور نتیجے میں "الیپنچ" کی تم طرف کر میدان میں نہیں کودا۔ لکھنؤ والے مرزا پھو بیگ کی آخری منطق بھی اسی ذیل میں ہے۔ اگر شاد اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے صرف "شاگرد فریاد" ہوتے تو فغان و نالہ کرتے یونہی رہ جاتے اور کسی کو ان کی یاد بھی نہیں رہتی۔ مگر وہ تھے نبید فطرت سب طرح کے تھپیڑے سہار گئے۔ خزاں کے دورے گزر گئے مگر جب بھی بہار سازگار ہوئی تو کف گلفروش و دامن باغباں میں ترو تازہ نظر آئے۔

آباؤ اجداد میں مذہبی دور تک کوئی خاص بات نہیں ہوتی بشرطیکہ شاد بھی معمولی قسم کے آدمی ہوتے۔ لیکن ان کی صلاحیتیں خاص تھیں کہ اس عامۃ الورود صورت حال سے بھی استفادہ کئے بغیر نہ رہیں گی۔ چنانچہ منظر عام پر اب تک آئے ہوئے ان کے کلام میں "نوحہ" قسم کی کوئی چیز نہیں ملتی۔ ان کے مراثی بھی اپنے انداز میں منفرد اس لئے ہیں کہ وہ بین و بکا کے چنداں قائل نہیں ہیں۔ اس صنف سخن میں جو فلسفیانہ طرز انہوں نے اختیار کیا ہے وہ ایسا ہے کہ مراثی گو اساتذہ میں وہ سب سے ممیز ہیں۔ ان کے مراثی کا مقبول عام نہ ہونا ان کی خوبیوں کی دلیل ہے۔ جہاں مراثی بذیل رسمیات مذہبی مروج ہیں وہاں کے مطالبات شاد پورے نہیں کرتے۔ اور جہاں ان کی مقبولیت مصدق ہے وہاں مراثی کا مذاق نہیں۔ کہا جاتے تو بیجا نہ ہوگا کہ محنت برباد گئی۔ شاد اس سے بے خبر نہ تھے۔ مگر جو اصلاح ان کے پیش نظر تھی اس کو "دور کی کوڑی لانا" کہہ سکتے ہیں۔ آج زمانہ اعتناء نہ کرے مگر وہ دن دور نہیں جب ان کی اتباع بغیر چارہ نہ ہوگا۔ نثری خطبات شہادت تو اس ڈھرے پر آچکے ہیں۔ منظومات میں شرر عصری "رقت کے بند" سخت جانی کا ثبوت دے رہے ہیں لیکن فلسفیانہ استدلال آہستہ آہستہ قدم جما رہا ہے اور یہ سب شاد ہی کے مراثی کی آواز بازگشت ہے۔

شاد کی ایسی تحریریں نظر سے گزری ہیں جن کے سطحی مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بے اعتدالی کے ساتھ خودستائی کی جا رہی ہے' لیکن بین السطور غور کرنے سے پتہ چل جاتا ہے کہ اس بظاہر خودستائی کی تان جا کر ٹوٹتی ہے خود اپنے ہی مرثیہ پر۔ مکاتیب کے بارے میں ان کو کسی قسم کا خطرہ ہوتا ہی نہیں۔ اس لئے "دیوار ہم گوش دارد" کے ڈر سے جو بات وہ منہ سے نکالتے بھی نہیں تھے۔ وہ ان کا قلم "بزبان" لکھ سکتا تھا۔ بعض بعض خطوط کے کچھ مفاہیم ایسے نکلتے ہیں جن کو شاد کا مقصود واقعی باور کر لینا' خود اپنے ذوق سلیم کی توہین سمجھنی چاہئے۔ شاد کے ایسا متین و متواضع شخص کن مجبوریوں میں گھر گیا ہوگا جب اس کا قلم ایسا بے قابو ہو گیا۔ اس پر غور کرنے کی ضرورت تھی مگر اس دور میں یہ تاکرتا!

شاد کی ابتدائی تعلیم [illegible] پھر [illegible] جو ان کے [illegible] اور [illegible] بعد کی [illegible] پھیلا دیں [illegible] بہت ذہین تھے

دعوت آن [illegible] کہ [illegible] میں شاید [illegible] رسالہ [illegible]

دعوے کے پہلے [illegible] کے بعد بھی [illegible] کی [illegible] "شاد بچارے تو ہی [illegible] گئے۔ [illegible] کا سبب [illegible] کی شکایت [illegible] کو فرمائی!

رئیسوں کی اولاد ہونے کا بہت بڑا ثبوت انہوں نے یہ دیا کہ [illegible] کی باتوں میں [illegible] گئے [illegible] تیزی کا [illegible] لگے۔ جہاں انہوں نے [illegible] میں دریغ نہیں کیا [illegible] پر بھاپ لگانے میں عار بھی نہیں کی

شاد کی [illegible] پر [illegible] کے سبب [illegible] اس [illegible] کر لینے پر [illegible] نہیں ہے کہ حضرت [illegible] نے استاد زمن، استاد فن، استاد [illegible] لکھا تھا۔ بہرحال یہ [illegible] اس وقت اٹھایا گیا جب شاد دنیا سے اٹھ چکے تھے۔ [illegible] شاد [illegible] ہونے کی۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جا سکتا تھا مگر اس [illegible] کے باوجود [illegible] کر لیا گیا۔ خلاصہ یہ کہ [illegible]!

جہاں تک مجھے معلوم ہے شاد کی خانہ آبادی اور خانہ ویرانی [illegible] "نہ شادی [illegible] سامنے [illegible] آمد [illegible] قسم کی تھی حضرت ایک صاحبزادے سید حسین مرحوم کا مجھے علم ہے۔ باپ بیٹے کو یکجا دیکھ کر شاد کی [illegible] سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ عجیب عجیب قسم کے درد و اندوہ شاد کو قسمت ہوئے تھے۔ انہی کا ذوق تھا کہ صرف ہنس بول کر بسر کر لینے پر قادر نہ تھے [illegible] پہنچنے میں حیات فریاد کی تسوید ختم کر کے مانے [illegible] کتاب کی تاریخی حیثیت جو بھی سہی مگر [illegible] و معاشرے کے سمجھنے میں اس کا [illegible] آمد ہونا ناقابل انکار ہے۔

"دلی، لکھنؤ کے بعد پٹنہ" مرکز [illegible] کا حکم رکھتا ہے۔ مرشد آباد کو اس گنتی میں کبھی لیا ہی نہیں گیا [illegible] پٹنہ چاہے جو کچھ بھی ہو جائے مگر شاد کی جوانی کے دنوں پٹنہ ایسا باغ بہار تھا کہ [illegible] دروازہ سے [illegible] دروازہ تک گلستان سعدی کا باب [illegible] قرطاس سے سطح ارضی پر منتقل ہو کر جاندار ہوتا چلا گیا تھا۔ "[illegible] مستی" یا "[illegible] مستی" شاد کو کہیں سے [illegible] گئی ہو تو یا [illegible] طریقت ایک کی [illegible] لگائے بغیر [illegible] مانتے۔ ایسی [illegible] کر پاتے کہ باغ شاد کے افسانے کی حقیقت نہیں رہتی۔ مگر یوں بھی باز آنے والے تھوڑے ہی تھے، [illegible] ایک گل جہاں بہار کو شاخ پر [illegible]۔ [illegible] اس بارے میں شاد کے ماننے والوں کا سکوت [illegible] کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے" کی غلط فہمی کو [illegible]۔ حالانکہ [illegible] اسی قدر تھا کہ ذات برادری سے نکالی ہوئی [illegible] کے [illegible] ستم سے [illegible] پناہ ڈھونڈتی آگئی تھی۔ شاد نے [illegible] کا [illegible] پڑھا دیا [illegible] غلط کیا؟ مگر [illegible] جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے، باغ تو سارا جانے ہے! کے باوجود [illegible] الزام [illegible] کا [illegible] بلزم [illegible] گلستاں اگر [illegible] باشد!

خلاصہ یہ کہ ۱۲۶۵ ہجری مطابق ۱۸۴۶ء کا پیدا ۱۳۴۵ ہجری مطابق ۱۹۲۶ء کو دنیا سے اٹھ گیا اسی برس [illegible] سب نے اسی کو شاد پکارا — بر عکس تخلص ہے مگر شاد کریں کیا — مجبور [illegible] اسی نام سے ہم ہیں

ان کی غزلوں کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ان کو جا ہے [illegible] کہ ہم شاد کو کبھی مرنے ہی نہ دیں گے۔ اس میں شک کی گنجائش یوں نہیں کہ اپنے مرنے کا یقین ہو [illegible]!!

نصیر حسین خیال

شاہ ولی الرحمٰن ولی کاکوی

آنانکہ وصفِ حسنِ تو تقریر می کنند
خوابِ ندیدہ را ہمہ تعبیر می کنند

نقوش لاہور کے مدیر محترم کی فرمائش ہے کہ میں نواب سید نصیر حسین خیال عظیم آبادی کی شخصیت پر نقوش کے شخصیات نمبر کے لئے ایک مضمون لکھوں۔ ان کا رجسٹرڈ خط موصول ہوا تو میں نے محض اس وجہ سے تعمیلِ ارشاد سے پہلو تہی کرنا چاہی کہ میں نواب صاحب کی شخصیت سے ذاتی واقفیت نہیں رکھتا۔ لیکن دوسرے ہی دن مدیر محترم کا تار ملا کہ مضمون جلد بھیجئے تو کسی نہ کسی طرح تعمیلِ ارشاد کے لئے تیار ہو گیا۔

نواب صاحب صوبۂ بہار کے ایک ممتاز و متمول خاندان کے چشم و چراغ تھے اور ہندو پاک میں کون ایسا ہے جو ان سے واقف نہیں۔ لیکن اگرچہ مجھ کو شاعری میں شاد مرحوم سے تلمذ حاصل ہے اور کم از کم تین سال تک ان کی صحبت سے مستفیض ہونے کا موقع ملا ہے جس کو تیس سال کا عرصہ گزر چکا، یہ امر واقعہ ہے اور بدقسمتی بھی کہ نہ میں نے کبھی نواب صاحب کو دیکھا اور نہ ان کی گفتگو سنی، کیونکہ اس زمانے میں وہ کلکتہ میں قیام کرتے تھے اور میرے سامنے کبھی پٹنہ نہیں آئے۔

شخصیت نگاری ایک مستقل اور مشکل فن ہے اور اس کی تعمیر میں متعدد عناصر کارفرما ہیں۔ کسی کی شخصیت پر کوئی قلم نہیں اٹھا سکتا جب تک کہ اس نے اس شخص کو قریب سے نہ دیکھا ہو اور نہ اس کی صحبتوں سے لطف اندوز ہوا ہو اور اس کی شکل و صورت، خط و خال، رفتار و گفتار، عادات و اطوار، اخلاق و افعال اور سیرت و کردار سے کما حقہ واقف نہ ہو اور ان سب صفات کا تجزیہ و تفصیل نہ کر سکتا ہو۔ لہٰذا میرا یہ مقالہ گویا ایک ایسے خواب کی تعبیر ہے جس کو دیکھا بھی نہیں۔ تاہم کچھ نہ کچھ لکھنا بھی ضرور ہے کیونکہ مدیر محترم کو میں مایوس نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن میری اس تحریر سے نواب صاحب کی شخصیت اجاگر نہیں ہو سکتی۔ یہ تصویر نہیں بلکہ خاکہ ہے اور زیادہ صحیح یہ ہے کہ خاکہ بھی نہیں بلکہ چند لکیریں ہیں۔

نواب خیال صوبہ بہار ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے مشاہیر میں سے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت ہنوز جاذبِ توجہ ہے۔ متعدد اہلِ قلم نے مختلف اوقات میں نواب صاحب سے متعلق خامہ فرسائیاں کی ہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے سب سے پہلے پروفیسر محفوظ الحق مرحوم نے

کے ماضی میں ایک مقالہ پیش کیا تھا جو بعد میں [illegible] شائع ہوا۔ جناب سید رضا قاسم صاحب حال مقیم کراچی نے بھی ایک مقالہ شائع کیا ہے [illegible] ایک علمی رسالے میں بھی شائع ہوا ہے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ صاحبوں کا ایک مفید مقالہ شائع ہوا تھا جس میں نواب صاحب کے سوانح سے متعلق اہم باتیں درج تھیں۔ ان میں سے بیشتر مضامین میں نواب صاحب کی شاعری کی خصوصیات سے بحث کی گئی ہے۔ بعض مضامین میں ان کے حالات زندگی اور خاندانی تعلقات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان مضامین کی مدد سے یہ مقالہ ترتیب دے رہا ہوں اور اس میں کچھ مفید مباحث بھی شامل کر دیے گئے ہیں۔

نواب صاحب کا خاندان نہ صرف جاہ و ثروت بلکہ علم و فضل میں بھی ممتاز تھا۔ مخزن الحق مرحوم کا بیان ہے کہ آپ کے مورث اعلیٰ عرب سے ایران کو منتقل ہوئے جہاں اس خاندان کو اتنا عروج حاصل ہوا کہ سید حسین [illegible] شاہ ایران ہو گئے اور ان کے بیٹے [illegible] کچھ عرصے کے بعد اس خاندان نے ہندوستان کا رخ کیا اور اس کے اکثر ارکان صوبہ داری و وزارت کے عہدے تک پہنچے۔ عہد مغلیہ میں بھی اس خاندان نے اپنی عظمت و شان برقرار رکھی۔ چنانچہ قطب الملک نواب سید عبداللہ خاں اور امیر الامرا نواب سید حسین علی خاں ہندوستان کی تاریخ میں سید برادران اور بادشاہ گر کے القاب سے مشہور ہیں۔ ان دونوں بھائیوں نے کچھ ایسا اقتدار قائم کر لیا تھا کہ درحقیقت یہی حکمران تھے اور اس عہد کے شاہان مغلیہ محض کٹھ پتلی بادشاہ تھے۔ صوبۂ بہار سید حسین علی خاں کی جاگیر میں تھا اور وہ کچھ عرصے تک عظیم آباد میں مقیم بھی رہے۔ نواب علی وردی خاں صوبہ دار بنگال و بہار بھی اسی خاندان کے ایک رکن تھے۔ اس خاندان کی چند اور شخصیتوں کا ذکر بھی ضروری ہے۔ ان میں سے اکثر کا تذکرہ تذکرۂ محمد ابراہیم مولفہ علی ابراہیم خاں خلیل عظیم آبادی میں مذکور ہے۔ مثلاً نصیر الدولہ سید ہدایت علی خاں نصیر بخشی الملک اسد جنگ بہادر صوبہ دار عظیم آباد تھے۔ ان کے صاحبزادے نواب غلام حسین خاں سیر المتاخرین کے مصنف تھے جو فارسی زبان میں تاریخ کی ایک مشہور کتاب ہے۔

اس خاندان کی دوسری شاخ نے پانی پت میں برگ و بار پیدا کیے جس کے گل سرسبز خواجہ حالی مرحوم تھے اور وہ شاد مرحوم کے ماموں ہوتے تھے۔ خواجہ محمد قاسم کے صاحبزادے صمصام الدولہ خان دوراں امیر الامرا خواجہ محمد عاصم کا ذکر بھی اہم ہے۔ انہیں [illegible] ایک عہدہ پر مقرر کر دیا تھا جو انھیں تقریباً پانچ سال تک جاری رہا۔ ۶ ذی القعدہ ۱۱۵۱ھ نادر شاہی حملہ میں بمقام کرنال زخم کاری لگا اور وہیں انتقال کر گئے۔ ان کے صاحبزادے نواب اشرف خاں کے دو صاحبزادے تھے۔ احتشام الدولہ رستم علی خاں نواب بہادر رستم جنگ اور محمد حسن خاں۔ یہ دونوں بھائی انقلاب زمانہ سے مجبور ہو کر ترک وطن کر کے نواب سعادت علی خاں بہادر کے ہمراہ صوبۂ بہار و بنگال کو روانہ ہوئے اور بنارس میں رہنے لگے۔ یہ دونوں سید فضائل علی خاں اور سید محمد علی خاں کے بھائی تھے۔ یہ حضرات اسی خاندان کے افراد تھے۔

نواب خیال کی والدہ فاطمہ بیگم[1] کے والد نواب سید محمد مہدی خاں عیسیٰ اور آپ کی نانی عارفہ بیگم کے والد نواب سید مہدی علی خاں تھے اور بھائی نواب سید جلال الدین حسین خاں تاب بھی شاعر تھے۔ آخر الذکر شاد مرحوم کے حقیقی ماموں تھے۔ نواب خیال کے دادا نواب سید محمد حسن خاں محسن اور نانا نواب سید محمد عباس خاں محسن نواب سید تفضل علی خاں تفضل کے صاحبزادے تھے۔ محسن کے صاحبزادے نواب سید فیروز حسین خاں اور نواب سید جعفر علی خاں تھے۔ فیروز حسین خاں کے صاحبزادے نواب سید نصیر حسین خاں خیال اور جعفر علی خاں کے صاحبزادے نواب سید صادق حسین خاں نہال تھے۔ شاد مرحوم نواب خیال کے حقیقی ماموں تھے۔

غرضیکہ یہ امر مسلم ہے کہ نواب خیال ایک جلیل القدر خاندان کے فرد تھے جنھوں نے علم و ادب کی عظیم الشان خدمتیں کیں اور جاہ و اکرام بھی حاصل کیے۔ آپ کی ولادت بقول پروفیسر محفوظ الحق ۱۸۶۶ء میں اور بقول رضا قاسم صاحب[2] ۲۱ مارچ ۱۸۶۴ء کو عظیم آباد پٹنہ کے محلہ حاجی گنج میں ہوئی۔ آپ کی عمر صرف تین سال کی تھی کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور آپ کی تربیت فاطمہ بیگم نے اپنے ذمہ لی۔ چند برسوں کے بعد انھوں نے

۱؎ والدہ ماجدہ حضرت شاد مرحوم ۲؎ مضمون سید رضا قاسم صاحب

[illegible] آپ کی پرورش و پرداخت آپ کے چچا جعفر حسین خاں اور ماموں شاد مرحوم کے زیر سایہ ہوئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ [illegible] شاد مرحوم کے فیض صحبت کی مرہون منت ہے۔ آپ نے عربی و فارسی کے علاوہ انگریزی میں بھی کافی بصیرت پیدا کی اور سنسکرت [illegible] زبانوں سے بھی کچھ واقفیت حاصل کی۔ غرضیکہ نواب صاحب ہر لحاظ سے ذی علم آدمی تھے۔

نوجوانی میں نواب خیال شعر و سخن کے بھی دلدادہ تھے اور حضرت شاد مرحوم سے اصلاح لیتے تھے لیکن کچھ دنوں کے بعد شاعری کو چھوڑ کر نثر نگاری کی طرف مائل ہوئے اور اس میں کمال حاصل کیا۔ آپ کی عمر تقریباً اٹھارہ ہی سال کی تھی کہ ۱۸۹۵ء میں آپ نے ایک علمی ماہانہ رسالہ جاری کیا جس کا نام ادیب تھا۔ یہ رسالہ عظیم آباد (پٹنہ) سے نکلتا تھا ۱۹۰۵ء یا ۱۹۰۶ء میں آپ کی شادی نواب واجد علی شاہ کے وزیر نواب احمد علی مرزا احمد بیگ کی صاحبزادی سے ہوئی تو آپ نے پٹنہ کے قیام کو خیرباد کہہ کر مستقلاً کلکتہ میں سکونت اختیار فرمائی اور یہ ماہانہ رسالہ ادیب مرحوم ہوگیا۔ ملک کے معتدد رسالوں میں آپ کے اردو مضامین شائع ہوا کرتے تھے اور فارسی اخبار حبل المتین میں فارسی مضامین۔ علمی مشاغل کے علاوہ آپ کو سیاسی و تعلیمی تحریکوں سے بھی دلچسپی تھی۔ آپ ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کے ٹرسٹی اور رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے ممبر بھی تھے۔

آپ کا سب سے بڑا کارنامہ وہ خطبۂ صدارت ہے جس کا کچھ حصہ آپ نے دسمبر ۱۹۱۷ء کی آل انڈیا اردو کانفرنس کلکتہ میں پڑھا تھا۔ یہ خطبۂ صدارت سینکڑوں صفحات کو محیط ہے۔ افسوس ہے کہ پورا خطبہ کتابی شکل میں اب تک شائع نہ ہو سکا اور اب اس کی اشاعت کی امید بھی نہیں ہے۔ یہ عظیم الشان اور یادگار نمائندہ کانفرنس ۲۹ دسمبر کی صبح کو ۸ بجے قصر بلقیس کی خوشنما بارہ دری میں منعقد ہوئی تھی۔ ایک بلند وسیع پلاٹ فارم جس پر قالین اور گدے اور کرسیاں رکھی ہوئی تھیں، معتدد و ممتاز شرکاء جلسہ کے لئے بنایا گیا تھا اور اس کی پشت پر ایک مسقف چبوترہ مستورات کے لئے تیار ہوا تھا۔ حاضرین کی تعداد ہزاروں تھی اور ہر صوبہ کے سربرآوردہ اصحاب نے شرکت کی تھی جن میں سے چند افراد کے نام یہ ہیں:

راجہ صاحب محمود آباد، نواب ذوالقدر جنگ بہادر (صدر مجلس استقبالیہ)، مسٹر محمد علی جناح، مسٹر مظہر الحق، مسٹر مارگ لیتھ، میاں فضل حسین، مسٹر فضل الحق، مولانا آزاد سبحانی، مولانا شرر، حسنی لکھنوی، مولانا سلیمان ندوی، مولوی عبدالحق، مرزا رسوا، مسز سروجنی نائیڈو، پروفیسر کلم شالل، سید سجاد حیدر یلدرم، سید جالب ایڈیٹر ہمدم، ظفر الملک علوی ایڈیٹر الناظر، پنڈت کشن پرشاد کول ایڈیٹر ہندوستانی۔ دوسرے دن نشست ۶ بجے شام سے تھی۔ نواب صاحب کے آنے میں کچھ دیر ہوئی تو مولوی نظام الدین حسن کی صدارت میں کارروائی شروع ہوئی لیکن دس منٹ کے بعد نواب صاحب تشریف لے آئے تو بقیہ کارروائیاں آپ ہی کی صدارت میں ہوتی رہیں۔

نواب صاحب کے خطبۂ صدارت کا کچھ حصہ جس کا نام "داستان اردو" ہے العصر کے تین نمبروں میں شائع ہوا تھا[1] اور اس کا آخری باب "مغل اور اردو" کتابی شکل میں بھی شائع ہو گیا ہے۔ یہ پُر مغز خطبہ گراں قدر معلومات اور ادبی محاسن کا گنجینہ ہے۔ نواب صاحب کی ایک اور کتاب شائع ہوئی ہے جس کا نام "داستان عجم" ہے۔ یہ کتاب شاہنامہ پر کڑا تبصرہ ہے اور اس میں شاہنامہ کے اصطلاحات مثلاً درفش کاویانی، گرز گاو سر، ماران ضحاک، ہرمابہ، چاہ رستم، سیمرغ، سیاوش وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے۔ گو یہ چیز نئی نہیں کیونکہ سخندان پارس میں آزاد نے بھی مصطلحات کی تشریح کی ہے پھر بھی یہ کتاب دلچسپ اور لائق مطالعہ ہے۔

۱۹۱۷ء میں آل انڈیا تعلیمی کانفرنس کلکتہ میں منعقد ہوئی تو اس کی صدارت بھی آپ ہی نے فرمائی اور اپنے خطبہ میں اردو زبان کی اہمیت پر زور دیا۔ پھر ۱۹۱۸ء میں کلکتہ یونیورسٹی کمیشن میں آپ سے بھی شہادت لی گئی تو اس موقع پر بھی اردو زبان کی اہمیت کو زبردست بیان کیا۔

نواب صاحب سیر و سیاحت کے بھی دلدادہ تھے۔ چنانچہ ۱۹۲۱ء میں نظام حیدرآباد کی طرف سے آپ کو یورپ بھیجا گیا آپ نے

---

[1] رسالہ العصر ۱۹۱۷ء [2] مضمون سید رضا قاسم صاحب۔

[illegible] کی مشہور [illegible] عنوان [illegible] اور ایک مضمون لکھا جو [illegible] میں شائع ہوا [illegible] آپ نے [illegible] گفتگو میں [illegible] کا ذکر آیا تو آپ نے [illegible] نے جواب دیا [illegible] آپ [illegible] کے مشورے، تعلقات اور تعلیم [illegible]۔ اس کے بعد آپ [illegible] تشریف لے گئے جہاں [illegible] جہاں تا دم [illegible] حاصل رہا۔

اردو زبان کی ترقی و ترویج کے لئے آپ نے [illegible] مضامین لکھے [illegible] سکیمیں بنائیں اور عملی حصہ بھی لیا۔ اسی غرض سے [illegible] میں کابل میں بھی تشریف لے گئے۔ واپسی پر دو روز گیا میں جناب اکبر [illegible] کے یہاں قیام کیا۔ دسمبر [illegible] میں آپ [illegible] تشریف لے گئے [illegible] کو نواب احمد سعید خان سے ملنے کو چھتاری روانہ ہوئے۔ [illegible] کو [illegible] میں آپ کے قلب میں درد اٹھا [illegible] علاج کی بھی نوبت نہ آئی یہاں تک کہ چند ہی منٹ کے بعد روح پرواز کر گئی۔ آپ کی لاش کو نواب صاحب نے [illegible] روانہ کر دیا جو ۱۲ دسمبر کو حضرت [illegible] کے پہلو میں سپرد خاک کی گئی۔

میں کہہ چکا ہوں کہ نواب صاحب ابتدا میں غزلیں کہتے تھے اور شاد عظیم آبادی سے انہیں تلمذ بھی حاصل تھا لیکن اگرچہ شاعری آخر تک [illegible] تاہم ذوق [illegible] نہ رہا تھا چنانچہ ستمبر [illegible] میں بادشاہ نواب عشرتی کے دولت کدے پر ایک عظیم الشان مشاعرہ منعقد ہوا جس میں [illegible] گئی تھیں اور بیرون صوبہ کے حضرات نے بھی شرکت کی تھی تو نواب صاحب بھی اس مشاعرے میں شریک تھے لیکن غزل نہیں پڑھی تھی۔

نواب صاحب نے صرف ایک اولاد [illegible] چھوڑی آپ کے صاحبزادے سید امیر نواب صاحب ہیں جو آج کل غالباً حیدرآباد میں [illegible]۔

نواب صاحب نہایت ہی وجیہ و شکیل آدمی تھے۔ گندمی رنگ اور قد متوسط تھا۔ مونچھیں بڑی بڑی [illegible] داڑھی [illegible] طرز معاشرت مغربی اور اعلیٰ درجہ کا تھا۔ کبھی شیروانی استعمال کرتے تھے اور کبھی مغربی لباس لیکن ٹوپی ایک خاص قسم کی [illegible] کے سامنے [illegible] لگے ہوتے تھے۔ لباس کا خاص خیال اور شوق تھا اور جو لباس بھی پہنتے تھے اعلیٰ درجہ کا ہوتا تھا۔ نہایت ہی خلیق اور [illegible] لوگوں کو ایک ملاقات میں گرویدہ کر لیتے تھے۔ انداز گفتگو نہایت دلکش تھا اور گفتگو میں بھی صحت زبان کا خاص خیال رکھتے تھے۔ [illegible] خیالات [illegible] تھی بلکہ یہ کہنا نازیبا نہ ہوگا کہ ان کی زندگی [illegible] نہ تھے لیکن معلومات بہت وسیع تھیں اور ہر فن پر گفتگو کر سکتے تھے خواہ وہ علمی ہو یا مذہبی ہو یا سیاسی۔

داستان اردو ادبی حیثیت سے ضرور قابل قدر ہے لیکن تاریخی نقطۂ خیال سے مصنف کے اکثر نظریے محل نظر ہیں۔ اس کی چند مثالیں یہ ہیں۔

۱۔ نواب صاحب کا ارشاد ہے کہ "آپ کی (بابر کی) اردو کا یہ پہلا شعر جس وقت ظل اللہ کے منہ سے نکلا ہوگا تو نہ معلوم مغل [illegible] کا کیا رنگ تھا بابریوں کا کیا حال ہوا ہوگا، کتنی واہ واہ ہوئی ہوگی۔" بابر کا شعر یہ ہے ؎

مجکا نہ ہوا کچ ہوس مانک و موتی
فقرا اہلیغہ بس بولغوسدر پانی و روٹی

پھر یہ بھی فرماتے ہیں کہ "ہماری نظر جہاں تک ہے بابر سے قبل کسی نے اردو میں نظم کی ہمت و جرأت نہیں کی اس لئے جب تک اس کی تردید [illegible] ہم [illegible] مکان ہی اس کے موجد اور اس صنعت کے باوا آدم مانے جائیں گے۔" بابر [illegible] مطابق [illegible] میں ہندوستان آیا تھا مذکورہ بالا شعر

[1] روایت مولوی سید قدرت حسین عظیم آبادی۔

تو اس کے بعد کہا ہوگا۔ لیکن یہ تحقیق کے بعد حقیقت بے نقاب ہو چکی ہے کہ شاہ برہان الدین جانم (متوفی ۹۹۰ھ) اور ان کے صاحبزادے تھے اس کے بہت قبل اردو میں اپنی تصانیف کر چکے تھے ایک کا نام "خوش نامہ" اور دوسری نظم کا نام "خوش نغز" ہے۔ "مذہب کا ثبوت بھی ملتا ہے۔

۲ - نواب صاحب کا خیال ہے کہ فضلی کی "دہ مجلس" (۱۱۴۵ھ) اردو نثر کی پہلی مثال ہے۔ یہ آزاد کے خیال کی بازگشت ہے لیکن صحیح تحقیق یہ ہے کہ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (۸۲۵ھ - ۷۲۱ھ) نے اردو میں دو رسالے لکھے تھے "معراج العاشقین" اور "ہدایت نامہ" جو شائع ہو چکے ہیں۔ اس کا وجود ثابت کرتا ہے کہ دہ مجلس سے کہا قبل سینکڑوں رسالے اردو میں تصنیف ہو چکے تھے۔

۳ - نواب صاحب عمدۃ الملک نواب محمد امیر خاں انجام کی دو غزلیں پیش کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ عمدۃ الملک یہ دو غزلیں شاہد ہیں کہ وہ محترمہ زبان دانی سے او کس کا ..... آپ اسی کے شاگرد بعد زلہ خوار ہیں۔ اور انجام کے اس شعر کے متعلق ؎

نعش میری دیکھ کر مقتل میں یوں کہنے لگے

کچھ تو زیر صورت نظر آتی ہے چھائی ہوئی

فرماتے ہیں کہ ذرا زبان کو دیکھنا یہ دو سو برس کی اردو ہے۔ میاں ولی کیا کسی ولی نے بھی یہ زبان کی کرامت نہیں دکھائی۔

انجام کا انتقال ۱۱۶۰ھ میں ہوا ہے۔ ولی گجراتی (یا دکنی) نے انجام سے چالیس سال قبل ۱۱۱۹ھ میں وفات پائی۔ اس وقت انجام اگر پیدا ہو چکے ہوں گے تو بہت کمسن ہوں گے۔ اب ذرا ولی کی زبان کی کرامت ملاحظہ ہو ؎

صد حیف کہ وہ یار مرے پاس نہ آیا	یہ لطف عناں سے اسے پاس نہ آیا
پھر یہ دل خبر لینے وہ بیتاب نہ آیا	شاید کہ مرا حال اسے یاد نہ آیا
زندگی جام عیش ہے لیکن	فائدہ کیا اگر مدام نہیں
جسے عشق کا تیر کاری لگے	اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے
اے ولی رہنے کو دنیا میں مقام عاشق	کوچۂ زلف ہے یا گوشۂ تنہائی ہے

انجام کی دونوں غزلیں میرے سامنے ہیں ان میں زبان کی صفائی و روانی ہے مگر خیالات ہلکے پھلکے ہیں ولی کے بعض اشعار میں اعلیٰ خیالات کی جھلک بھی پائی جاتی ہے مثلاً ؎

دشمن دیں کا دین دشمن ہے	راہزن کا چراغ رہزن ہے
صدق ہے آب رنگ گلشن دیں	پاکبازی ہے شمع راہ یقیں

۴ - عمدۃ الملک انجام کو بیدل کا شاگرد لکھا ہے۔ اگر یہ شاگردی فارسی شاعری میں تھی تو ممکن ہے ورنہ انجام کا بیدل سے اردو شاعری میں اصلاح لینا محال نظر ہے، صرف دو اشعار بیدل کی طرف منسوب ہیں اس لئے وہ اردو کے شاعر ہرگز نہیں کہے جا سکتے۔ پھر دوسری جگہ نواب صاحب کا یہ ارشاد کہ انجام کسی کے مقلد نہیں شاگردی کی بنیاد کو منہدم کر دیتا ہے۔

۵ - نواب صاحب انشا پردازی کے شوق میں کہیں کہیں صنعت ایہام سے بھی کام لیتے تھے۔ ایک جگہ ولی کی زبان کے لئے یہ جملہ فرماتے ہیں: "ولی تاپتی ندی کے کنارے ناچتے رہے۔" یہ روش آزاد کی تھی، نواب صاحب بھی انہی کے مقلد تھے لیکن مورخانہ تحریر میں ایسے جملوں کا استعمال ثقاہت و متانت کے خلاف ہے۔

۶ - ایک جگہ فرماتے ہیں: "یہ وہی بھاکا تھی جس میں اس زمانہ بدھ نے ایک عالم وجد و سوز میں کاشی اور گیا جی کے جنگلوں کے درمیان اپنے ساتھیوں اور چیلوں کو پکارا اور کہا کہ دھرم کرو دھرم کرو دھرم کا سکہ جماؤ کر دھرم کی مند بچھاؤ۔" اگر اس مفہوم کا کوئی جملہ مہاتما بدھ نے کہا

زبان مبارک سے ادا کیا ہو تو وہاں زبان کا کوئی نقص نہ تھا کہ ایسی بات میں جس کا اردو سے مشابہت ہے اس منطق کے ساتھ کہ باہم تو وہاں تنہا کا کیا ذکر ہو سکتا ہے۔

۷۔ اردو کے ابتدائی دور میں جو لفظ گذرے ہیں پہلا آدمی جو البیلا ہو گزرا ہے وہ فیضی کا معاصر تھا اور ملا فقیر الحسن شاہ کے عہد میں گزرا ہے اور تانا شاہ کے دربار کے طبقے کا شاعر تھا۔ اس کو ان کا اسم شجاع الدین تھا لیکن نواب صاحب نے اس کو اکبر کے عہد سے وابستہ کر دیا ہے۔

۸۔ نواب صاحب نے بعض اچھے اچھے اشعار نورالعین جہاں بیگم و شہزادی زیب النساء سے منسوب کر دیے ہیں مثلاً اس شعر کے متعلق وہ فرماتے ہیں کہ نور جہاں بیگم کا نتیجہ فکر ہے۔

دیں جلوہ تو جفا کو دل سے جاں میں تم
دیکھو گر کچھ بھی وفا اس دل و جاں میں تم

اس پر تاریخ اور بھی نے بھی تفصیل کی ہے کہ اگر یہ شعر نور جہاں کا ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اردو ریختہ سے اصلاح لیتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ تنقید و تحقیق کی موجودہ روش خیال صاحب کی تحریروں میں مفقود نظر آتی ہے اور شاید وہ اس کی ضرورت کے بھی قائل نہ تھے۔

۹۔ نواب صاحب شاد عظیم آبادی سے عقیدت رکھتے تھے لیکن ان کی سید فرزند حسین معروف باعلی فرزند جو ان کے صاحبزادے ہیں معتقد جو شاگرد شاد تھے، ان سے یہ بات معلوم ہوئی کہ شاعری کا آغاز میں دونوں کے تعلقات خوشگوار نہ تھے اور کچھ کشیدگی باقی تھی۔ نواب صاحب نے شاد کی زبان کے متعلق صحیح رائے دی ہے کہ ان کی زبان نہ دہلی کی ہے نہ لکھنؤ کی بلکہ ایک خاص عمرانی نوع کی تھی۔ شاد کی شاعری کے متعلق کہنا یہ ہے کہ ان کا خیال ہے کہ اس پر حافظ کی شاعری کا اثر تھا لیکن نواب صاحب نے ایک مکتوب میں جو شاد عظیم آبادی کو لکھا ہے اس میں یہ بات کہی ہے اگر ہم اس کا مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے کہ خیال صاحب کے خیال کو انھوں نے پسند نہ کیا۔ حالانکہ شاد اس دور میں اردو میں صنف تخیل سے واقف تھے۔ بے شک انھوں نے مراثی، رباعیات اور قصائد بھی لکھے تھے۔ یہاں نواب صاحب کا خیال تھا کہ وہ غزل کے سوا کسی اور صنف تخیل سے واقف نہ تھے۔ اس خیال سے ہم بھی متفق ہیں۔

ممکن ہے کہ بعض لوگ یہ سمجھیں کہ نواب صاحب نے شاد کی زبان اور شاعری کے متعلق جو رائے دی ہے وہ کسی حسد و تعصب کی بنا پر تھی لیکن یہ خیال صحیح نہیں۔ آپ نے شاد کے متعلق جو خیالات ظاہر کیے وہ حسد پر نہیں بلکہ حسن ظن پر مبنی تھے اور یہ آزادی رائے ان کی تنقید اور حریت خیال کی مثال ہے۔

اس سلسلے میں ایک واقعہ بیان کرتا ہوں جس کو میں نے اپنے بھائی شاہ منظور الرحمن اختر کاکوی شاگرد رشید شاد عظیم آبادی سے سنا ہے۔ شاد کی غزلوں کا انتخاب ہو رہا تھا۔ نواب خیال بھی اس مجلس میں شریک تھے اور بعض اشعار کے متعلق فرماتے تھے کہ میں نے یوں نہیں سنا ہے۔ ایک روز سید صاحب وشاد کے صاحبزادے، نواب صاحب سے بگڑ گئے کہ آپ ابا جان کی غزلوں کو ترمیم و اصلاح سے خراب کر رہے ہیں۔ نواب صاحب بھلا کب چوکنے والے تھے، آپ نے بے ساختہ جواب دیا کہ تم کیا ہو تمہارے ابا جان کے سامنے بھی میں ٹوک دیا کرتا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اظہار خیال میں کسی کی شخصیت سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔

---

[1] مکتوب خیال مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۲۳ء بنام حمید عظیم آبادی مطبوعہ ندیم جولائی ۱۹۳۸ء

نواب صاحب کی شانِ ریاست [illegible] سے متعلق [illegible] ایک [illegible]
جناب انجم کے [illegible] ہوئے تو آپ کے لئے کوئی کام کا انتظام نہیں کیا گیا تھا۔ نواب صاحب کو انقباض ہوا اور آپ نے [illegible]
دوستانہ اس کی شکایت کی۔

نواب صاحب کی شخصیت یقیناً ممتاز و بلند تھی۔ آپ نے ساری زندگی علم و ادب کی خدمت میں صرف کر دی۔ آپ کو [illegible]
تھا۔ آپ کی انشا پردازی ایک خاص قسم کی تھی اگرچہ آپ آغا کے مقلد تھے لیکن پھر بھی آپ کی انفرادیت نمایاں تھی۔ جب تک اردو زبان زندہ ہے
نواب صاحب کا کارنامہ مشعلِ راہ اور آپ کا نام نامی روشن رہے گا ؎

بعد از وفات تربتِ ما در زمیں مجو
در سینہ ہائے مردمِ عارف مزارِ ماست

امداد امام اثر

سید حسن امام

نواب شمس العلما سید امداد امام اثر عظیم آبادی۔

سنہ ۱۹۰۰ء کو بیسویں صدی میں شمار نہیں کیا جا سکتا اور انیسویں صدی میں بھی اس کو گنتا [illegible]۔ اسی عجب و غریب سال میں مجھ کو اس خاندان کے مولوی امداد امام سے سابقہ پڑا تھا وہ بھی بذریعہ ملازمت۔ اس وقت کچھ پہلے [illegible] کوئی رشتہ نہ تھا۔ میری [illegible] کی [illegible] منسوب تھیں مگر یہ بھی کوئی [illegible] رشتہ تھا [illegible] شخصیتوں سے متاثر کرنے والی اس وقت بھی صاف محسوس ہوتی تھیں۔ [illegible] پیشہ ور حکیم یا [illegible] کسی [illegible] نہیں تھے۔ [illegible] ہے کہ باوجود [illegible] کے علاوہ [illegible] صاحب شکل [illegible] تھے۔ اس آخری صورت حال سے اندازہ ہو گیا تھا کہ کچھ [illegible] کی طبیعت واقع ہوئی ہے۔ بزرگوں سے سننے میں آیا کہ ایک وقت ایسا بھی گزر چکا ہے کہ جناب اثر نے اپنا [illegible] [illegible] ریش مبارک بڑھا لی تھی۔ [illegible] صورت [illegible] نواب صاحب کا جذباتی ہونا ظاہر ہو گیا تھا [illegible] کا بھی شبہ نہ دیکھا۔ [illegible] نہیں کیا جا سکتا [illegible] کی وجہ سے نکلا ہوا تھا انہیں [illegible]۔ شان متانت و بردباری پر حرف لائے بغیر [illegible] خاص [illegible] مگر قہقہے [illegible] نہ ہو پاتے تھے۔ مجھے یاد نہیں آتا کہ کسی محبت میں نواب صاحب کو دیکھا ہو اور انہوں نے کوئی ایسی بات نہ کی ہو جس پر خود بھی ہنسے ہوں اور سننے والوں کو بھی ہنسنے پر مجبور نہ کر دیا ہو۔ ہنستے وقت ان کی آنکھوں میں ایسی چمک اور چہرہ پر وہ کیفیت کھیل جاتی تھی جو شریر بچوں کا ستر ہو سکتی ہے جبکہ ان کی شرارتیں کامیاب ہو جاتی ہیں! آپ کے اخلاق کی وسعت بسا اوقات خوش گواری کی حدوں سے باہر ہو جاتی تھی۔ [illegible] کھا گئے جو مناسب ہی [illegible] سے چھپنے بھاگ کرتے تھے۔ اگر کچھ افراد صحبت میں ان سے نہ کبھی کبھار ہوتے تو وہ بھی نواب صاحب کا ادب ملحوظ خاطر رکھتے تھے۔ اب فرض کیجئے کہ نواب صاحب میرے یہاں محفل جانے بیٹھے [illegible] رہے ہیں کہ دفعتاً کوئی ایک کسی ضرورت سے آ نکلا۔ نواب صاحب اس کی پذیرائی کے لئے گفتگو بند کر کے منتظر بیٹھے ہیں۔ اس سکوت کا سبب ابھی دریافت نہیں کیا جا سکا ہے کہ نواب صاحب مرحوم [illegible]۔ ساری مجلس [illegible] ہو گئی۔ [illegible] خالی [illegible] چلا آیا۔ نواب صاحب نے [illegible] کو [illegible] تو حیران و پریشان

ہوگیا۔ اب سب لوگوں کی سمجھ میں بات آئی اور ایسے موقعوں پر یوں کرنا پڑتا تھا کہ سب دم بخود رہ جائیں کہ نواب صاحب کو غصہ نہ آ جائے ہنسنے ہنسانے کا ذوق تھا مگر زمانے میں متاثر ہوکر آنسوؤں سے منہ دھو لینا بھی ان کے لئے دشوار نہ تھا۔

نازک مزاجی اعلیٰ مشہور تھی مگر ہم نے کبھی نہیں دیکھا کہ بدمزاجی کا انہوں نے مظاہرہ کیا ہو" قہر درویش بر جان درویش" کو قول سے عمل میں لاتے ہوئے انہی کو دیکھا۔ شکار کا بے حد شوق ظاہر فرماتے تھے۔ مہاراج کشن پرشاد اور میر شجاعت حسین مرحوم اکثر اس مصیبت میں گرفتار ہوا کرتے تھے کہ نواب صاحب کو شکار کھلائیں۔ مصیبت کا لفظ میں نے دانستہ لکھا ہے۔ نازک مزاجی کا بڑا مظاہرہ شکار کے موقعوں پر ہوا کرتا تھا۔ پانی کا مخزن سمجھا ہوا رہتا تھا کہ دیکھئے کس غریب پر نزلہ گرتا ہے۔ پھر اس بات کا ڈر ہوتا تھا کہ نواب صاحب مار پیٹ پر نہ اتر آئیں گے یا بے نقط سنا کر کسی کی عزت اتار لیں گے۔ جی نہیں ایسی کسی حرکت کا گمان بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اگر تیتر وغیرہ درندوں میں سے کسی وحشی کے سینے پر گولیاں خود ہی چلائیں گے نہیں اور کسی نے شکار ہاتھ سے جاتے دیکھ کر سبقت کر دی تو بس قیامت آگئی۔ نواب صاحب اس سے کبھی خفا ہوتے کہ خود آپ سے خفا ہو کے بیٹھے ہیں۔ سارا لطف جاتا رہا۔ اسی طرح اگر پرندہ کا شکار ہے تو پھر سمجھئے کہ شامت آگئی اس شخص کی جس پر خاص توجہ صرف فرماتے نواب صاحب نے۔ اب اس غریب کو سوا اس کے چارہ نہیں کہ شکار کے نکات سیکھتا چلا جائے۔ نواب صاحب نشانہ سادھ کر پرندے آتا خوب نہ دو تین چھرے یا بتائے ہوئے اگر فضا میں پر افشانی کرنے لگے۔ بس پھر کیا تھا بندوق زمین پر رکھ دی اور نواب صاحب سے جا تھا خوش خستہ ملول صورت بنا کر بیٹھ جاتے تھے۔ ہمراہی پر سارا الزام دھرا جاتا کہ انہی کے اشارے سے شکار اڑ گیا۔ ہمراہی اگر ناآشنا ہو تو وہ خود اپنی نا کردہ غلطیوں کا اعتراف کرتا تھا۔ نواب صاحب سے آئندہ پوری معلومات حاصل کرنے کا وعدہ کرتا اس نے ظاہر کیا نہیں کہ موقع کا امکان ہی تھا اس کی طرف سے معذرت خواہی فرمانے لگے۔ بس یہ دو پیالے جائے اور خیر گزرتی۔ شکار میں کوئی ایسی شخصیت اگر آجاتی جو نواب صاحب کی افتادِ طبع سے واقف نہ ہوتی اور مرکز توجہ خاص بھی قرار پا جاتی تو اس خیال سے کہ زد میں وہ نہ آجائے گیا یہ جاتا کہ ساتھیوں میں سے کسی کو پہلے سے تیار کر لیا جاتا تھا کہ اشارہ پاتے ہی سب سے مرتب بندوق داغ دے یا کوئی ایسی حرکت کردے کہ شکار نہ ہو سکنے کا الزام اس کے سر جائے تاکہ اور نیا مہمان مامون و محفوظ رہے۔

موضع کیا ہے یہ سوا کہ بتانے ہیں کہ حضرت آثر عظیم آبادی کا مزار یہ تھا۔ ممکن ہے کبھی آنا جانا ہوا ہو اور یہاں رہتے ہوں گے مگر سنانے گیا کہ ان کو کہیں کا بھی ہم نے تو نہیں دیکھا شاید ۱۹۰۶ء کا ذکر ہے۔ شہر گیا کی کچہری روڈ پر زمیندار ان ہجوہ زادہ کی نسل سے ملحق کرنے پر جانب شمال ایک دو منزلہ مکان میں قیام فرماتے۔ چند بزرگوں کے ساتھ حاضری کا موقع ملا۔ اطلاع کرائی گئی۔ بڑوں کی باہمی کہہ سن سے پتہ چلا کہ بغیر کسی قسم کی سوئے مزاجی کے، زوجہ محترمہ سے بے نیاز ہو کر کسی بیگم کو متوجہ کر رکھا ہے۔ پردہ ہو جائے گا تو ہماری باریابی ہوگی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ خیال ایسا آتا ہے کہ گلابی جاڑوں کی رات تھی کیونکہ کمرے کے اندر ہم سب بیٹھے تھے۔ کمرہ ہوا دار رہتا تھا۔ گفتگو چلتے چلتے اس سوال پر آگئی تھی کہ زیر نظر کے مسلسل ہونے سے بڑا کامیاب تسلسل ممکن ہے کہ نہیں؟ بالتفصیل رہنے ہی لگی کہ ناممکن؟ نواب صاحب کے اشعار غزل کے تاثرات کے اعترافات حد مبالغہ تک کئے گئے تو آپ نے انکشاف فرمایا کہ ہنگامِ عنفوانِ شباب جب آپ کے حضرت قبلہ گاہی کی تعیناتی دربھنگہ میں تھی تو وہاں کسی تقریب میں محفل گرم ہوئی تھی جس موقع پر ایک شمع محفل اپنی محفل سے چل دی اور جناب آثر آج تک یہی کہنے پر مجبور ہیں کہ ع

سوختم یک مدانہ، چہ عزانہ سوختہ ا

مدہ یگر کا ذکر آ ہی گیا تو ایک طویل سی کہانی ادھوری رہ جائے۔ اسی شہر میں حضرت آثر اور حکیم یعقوب بیگ وارثی مرحوم و مغفور کی ملاقات ہوئی۔ مراسم بڑھے اور اس حد تک پہنچے کہ طرفین سے علیک سلیک کی جگہ معانقات سے تعزیز القلوب مرغوب ہوگئی۔ نواب صاحب نے معجزی طرح منظوم فرمائے جو یاد ہیں۔ یہ ایک نظم مسلسل تھی جس کے قوافی طرح دار و دلدار وغیرہ تھے اور ردیف حکیم والی تھی۔ ناظم کی قدرت تخلیق سخن کا قائل ہونا پڑتا ہے

حکیم صاحب کی خدمت کا کوئی پہلو [illegible] تھا کہ اس [illegible] کے [illegible]

کی غذا بھی نہیں دی جاتی کہ حکیم صاحب کا [illegible] "مجبوری ہے" [illegible] کیا تھی۔ پر [illegible] بھی اس کو [illegible] تھا کہ حکیم صاحب سے [illegible] اس بات کے اعتراف میں [illegible] کہ "مجبوری ہے" [illegible] ادھر حکیم صاحب کا یہ حال کہ "مجبوری ہے" کا نام [illegible] تک پہنچا نہیں کہ [illegible] قریب المرگ [illegible] کام میں لے آتے [illegible] کو جا سکے تو [illegible] تک نوبت پہنچے بغیر [illegible] حکیم صاحب [illegible] نماز پر تشریف رکھ سکے۔ جب تک [illegible] نے تجویز فرمایا تھا۔ [illegible] فرمایا کرتے تھے۔ [illegible] مل بھی جائے تو حکیم صاحب [illegible]۔

۱۹۰۹ء میں ہم حیدرآباد کے محلوں میں رہنے [illegible] تھے۔ [illegible] نواب صاحب [illegible] اردو [illegible] دنیا [illegible] ایشیا [illegible] ہندوستان [illegible] علاوہ [illegible] جہاں [illegible] نواب صاحب [illegible] فصیح [illegible] ساری [illegible] منتقل فرمائی [illegible] والد ماجد [illegible] نواب صاحب [illegible] فرماتے تھے [illegible] نواب صاحب [illegible] سفر کی [illegible] شروع کی۔ اس میں ایسے اپنے [illegible] بیان کرنے [illegible] حال ہو گیا [illegible] ادب [illegible]۔

نواب صاحب [illegible] ٹانگوں والے [illegible] فرمایا [illegible] شخص [illegible] کرتا تھا۔ [illegible] کی [illegible] آنکھ اٹھا [illegible] کی ضرورت ہی کیا؟

۱۹۱۲ء [illegible] جانا ہوا۔ نواب صاحب [illegible] الفاق [illegible] وقت پہنچا زیبائش خانہ گرل سانسان میں بیٹھے کچھ لکھ رہے [illegible] رسالہ لکھ رہا ہوں۔ تم لوگوں نے یہاں کیسی کیسی باتیں ہیں۔ [illegible] خوش [illegible] غالب [illegible] اللہ کی کرسی [illegible] کا صاحبزادہ بچپن سے لندن [illegible] تعطیلوں میں آیا ہوا [illegible] نواب صاحب کی کرسی کا پشتبان پکڑ کر کھڑا [illegible] لگے۔ اردو وہ خوب جانتا نہیں۔ اس کی سمجھ میں کیا خاک آتا تھا۔ تہذیب شائستگی اس کی [illegible] والی، وہ کیا جانے مشرقی ادب آداب۔ اس کی طبیعت [illegible] تک میرا حافظہ کام دیتا ہے یہی الفاظ بلکہ جملے تھے جو اس کے منہ سے نکلے:

WHAT NONSENSE YOU ARE TALKING, GRANDPA, LIKE AN OLD FOOL

"کیا اول فول بک رہے ہو دادا میاں، بڈھے بے وقوف کی طرح"

[illegible] صاحب کے پہلے [illegible] ایک [illegible] تھا [illegible] بعد سلام [illegible]

[illegible] میرا ایمان [illegible] اس کی کوشش کی۔ [illegible] یہ حال ہے کہ نواب صاحب کی اس وقت کی [illegible]

اس سے پہلے یا اس کے کچھ دنوں کے بعد کا واقعہ ہے کہ نواب صاحب اپنے چھوٹے بھائی نسیم اقبال جنگ [illegible]
بالکل [illegible] تازہ غزل سنا رہے ہیں۔ پٹنہ کے گھروں کے ساتھ شہر کے تقریباً جاہل طبقہ [illegible]
سے پہلے عرض کر دیا جائے کہ پٹنہ سٹی کے دو محلوں کی الگ الگ خصوصیت تھی۔ سانی پور کی کلاری نام کے حلقے میں جو کم سواد بستے تھے وہ [illegible]
تلفظ نہیں کر پاتے تھے "مورے کی گھر رہا" [illegible] کے ساتھ برتتے تھے۔ برخلاف چوک وغیرہ دیگر علاقہ والے "معاف" [illegible]
ہی سے تلفظ کرنے کے عادی تھے "سرکار" کو "سرکار" [illegible] شانداری تصور کرتے تھے۔ اس تمہید کے بعد اصل قصہ کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

نواب صاحب نے شعر سنایا جس میں "زلف پیچ" سے متعلق خیال آفرینی ہوئی تھی۔ ادھر شعر تمام ہوا اُدھر سنت خان چوک کے [illegible] تھے:

"واہ سرکار واہ۔ ایک تو جو زلف اس پر سے پیچ پیچ" اس وقت بھی یہی ہوا کہ نواب صاحب [illegible]

انہی دنوں کے بعد ہی سننے میں آیا کہ شمس العلماء نے نکاح ثانی بجائے [illegible] کر لیا ہے۔

۱۹۱۸ء میں نواب صاحب مختار سینل پرشاد آنجہانی کے مکان میں [illegible] ثانیہ کے قیام فرما تھے۔ موسم انتہائی گرم تھا، [illegible] تھیں، فضا صد درجہ تپ رہی تھی۔ ہر لوگ زمین دوز تہ خانے میں پناہ گیر تھے کہ ٹھیک دوپہر کے وقت نوکر نے اطلاع کی کہ نواب صاحب [illegible] لائے ہوئے ہیں اور مجھ کو طلب فرما رہے ہیں۔ گھبرا کر تہ خانہ سے برآمد ہوا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ پیادے اور شاگرد پیشہ مؤدب دست بستہ [illegible] مجلس رہے ہیں اس لئے کہ سب۔ حکم ملا کہ چوپٹ کھلا پڑا تھا۔ [illegible] نشست کی [illegible] پر نواب صاحب نزول اجلال فرما تھے۔ [illegible] میں غالباً یہی پہلی اور آخری مرتبہ تھا کہ اس [illegible] کی یہ عزت افزائی ہوئی۔ [illegible] مجھے بھی [illegible] یقین کیجئے کہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ نواب صاحب نے بڑی سکینیت اور معصومیت کے ساتھ باور کرایا کہ وہ قطعی بے یار و بے مددگار ہیں صرف راقم آثم کے سہارے اس شہر میں رہتے ہیں۔ اگر میں بھی ممدوح الشان کی مدد [illegible] نہ کروں گا تو پھر ان کی بے کسی کا کوئی چارہ نہ ہوگا۔ میں کہاں سے وہ الفاظ لاؤں جو میری اس وقت دماغی کیفیت کا صحیح اعادہ کر سکیں؟ مجھ پر کیا گزری اس وقت اس کو کوئی [illegible] سکتا ہو تو سوچے۔ میں خود بیان کرنے سے قاصر ہوں [illegible] یہ کیسی بلند پایہ ہستی تھی جس کی خوشنودی حاصل کرنے کے متمنی حاکم حکام، راجے مہاراجے، روساء و امراء ہی نہیں تھے بلکہ علماء و فضلاء بھی اور وہ اپنے ایک کمترین [illegible] سے پناہ طلب کر رہی تھی۔ کیا عالم ہوگا ناچیز کا؟ آج بھی جب میں بیان کر رہا ہوں [illegible] حقیقت کیا تھی؟ معلوم یہ ہوا کہ نواب صاحب کو یکایک دھیان آیا تھا کہ چند نفر [illegible] جو بروقت ملازمت میں تھے ان میں کسی کسی کی [illegible] سال [illegible] ماہ پوری ہو رہی تھی۔ خطرہ پیدا ہوا کہ ترک ملازمت کرنے پر اگر آمادہ ہو گئے تو کیا ہوگا۔ ساتھ ہی [illegible] اس خیال سے کہ اپنا ایک عزیز زمیندار ہے جس کے علاقوں میں [illegible] وغیرہ قسم کے اسامی ہوں گے لہٰذا صرف خبردار کر دینے کے لئے زحمت فرمائی گئی تھی کہ خطرہ [illegible] صورت عمل میں منتقل ہو تو میں خانہ پُری کا سامان رکھوں۔

اسی زمانہ میں آنریبل مسٹر سید شرف الدین گورنمنٹ بہار کے ہوم ممبر کی حیثیت سے رانچی میں مقیم تھے کہ فالج میں مبتلا ہو کر گیا لائے گئے۔ بیمار ماموں کو دیکھنے سر علی امام گیا آئے۔ ابھی انہوں نے [illegible] نہیں لی تھی، تھوڑی سی دیر میں سب کچھ کر لیا تھا لہٰذا سر علی فکر مند تھے کہ نواب صاحب سے ملے بغیر جانے کا خیال بھی نہیں کر سکتے پھر [illegible] تھا کہ وہاں سے بوقت رخصت دہلی تو کیا ہوگا۔ نواب صاحب کی شفقت جو مجھ پر تھی اس کے لحاظ سے میرا انتخاب ہوا کہ سر علی کے ساتھ جاؤں اور ان کی ٹرین چھوٹنے سے پہلے ان کے اسٹیشن پہنچ جانے کی راہ نکالوں۔ [illegible] سینل پرشاد مختار [illegible] کے مکان میں نواب صاحب مع متعلقین مقیم تھے جس وقت ہم لوگ پہنچے [illegible] نواب صاحب وظیفہ میں مشغول تھے، سلام [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ساتھ اور کرتی کو ان کی خبریت یاد کر لیا کرتے تھے ... [illegible] ... کی کتابیں ... [illegible] ... اس کے بعد کئے گئے ... [illegible] ... کے لئے خوشخالی کرتے تھے ... [illegible] ... تھے ... [illegible] ... کرستان ہو گئے۔ اس لئے ... [illegible] ... اس وقت بھی اس شکل ... [illegible] ... امام حسین امام کی ... [illegible] ... افسوس ... [illegible] ... انا للہ و انا الیہ ... [illegible] ... نواب صاحب کا ... [illegible]

ادھر کی سنئے کہ ... شرف الدین کا علاج یونانی ہو رہا تھا آگرہ سے حکیم محمد حیات خاں بھی بلائے گئے تھے۔ ... [illegible] ... مریض کو ... [illegible] ... کچھ پتہ نہیں چلتی تھی — نواب صاحب کا دل ... [illegible] ... سینے ہوئے ... [illegible] ... کے اندر ... [illegible] ... نواب صاحب ... [illegible] ... کو خبر لگی ... [illegible] ... حکیم صاحب ... [illegible] ... نواب صاحب غصہ میں بھرے گئے ... [illegible] ... نہیں رہی گے — حکیم صاحب کراچی جان ... [illegible] ... زیادہ ... [illegible] ... پرشاد کے گھر جا رہا ہے — نواب صاحب ... [illegible] ... آتے ہی ... [illegible] ... کی جان میں جان آئی۔ ... [illegible] ... مریض کا پلنگ اٹھوا کر ... [illegible] ... مریض صاحب اپنے ... [illegible] ... طبیعت سے واقف ... [illegible] ... باتوں سے خوش ہونے کے بجائے ... [illegible] ... جب ان سے سوال ہوا کہ کیا کھانے کو جی چاہتا ہے ... [illegible] ... یہ جانتے ہوئے کہ تاریخ میں اس کی ... [illegible] ... کی قاش ہی ... [illegible] ... کر کھانے کو دیا۔ ... [illegible] ... باقاعدہ علاج شروع ہوا ... [illegible] ... فائدہ ... [illegible] ... یہاں تک کہ اپنے پاؤں چل کر مولوی شرف الدین ... [illegible] ... کا علاج نواب صاحب کی ... [illegible] ... کا ایک کھلا ثبوت تھا۔

اسی سال ... [illegible] ... مولوی شرف الدین ہو گیا تھا۔ ... [illegible] ... کے عہدے پر بحالی کے لئے درخواست ... [illegible] ... میں میرے ایک محترم عزیز بھی تھے۔ مگر افواہ یہ تھی کہ ... [illegible] ... اپنے کسی خاص عزیز کو اس کے لئے ... [illegible] ... کسی کی ملال نہیں ... [illegible] ... قابل احترام عزیز میرے پاس تشریف لائے کہ ... [illegible] ... پرشاد سے اسناد حاصل کر دوں۔ نواب صاحب سے اس سلسلہ میں کچھ عرض ... [illegible] ... کرتا تھا۔ خود میرا اپنا دل نہیں ... [illegible] ... کی وادی سے گزرے ... [illegible] ...

ہوا تو ساڑھے دس بجے سے جلسے کا ترتیب دیا۔ نواب صاحب کی شفقت بزرگانہ زیرِ بحر و ساگری بیٹھے وہی سیتل پاٹھ کا تھا رہا۔ مکان پر نواب صاحب حسبِ معمول اسی انداز سے وظیفہ میں مشغول۔ نواب صاحب رام پور کا مکتوب کھلا پڑا تھا اور ممدوح الشان کو فرستادہ آموں کا ذکر ابھی ہو رہا تھا۔ اور بادہ و ظرائف سے فراغت کے بعد باتیں شروع ہوئیں جس کا شعر و سخن سے سلسلہ ملا بیٹھا دشوار نہ تھا۔ میں نے عرض کیا کہ ہمارا ممدوح استاد پہلے کہہ گئے غالب ایک شعر میں فرما چکے گئے۔ تعجب کے ساتھ دریافت فرمایا کہ کون سا شعر؟ عرض کیا ؎

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

یہ ظلم و نسق عالم مطلق تبارک و تعالیٰ پر الزام آتا ہے۔ فرشتوں کے خلاف احتجاج نہیں ہے۔ سن کر ہنسا بات ٹال دی اور کہا کہ انہی اسبابوں کو ٹالتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ خود حضور کا شعر اس سقم سے پاک ہے۔ بڑے تعجب اور شوق سے پوچھا کہ کون سا شعر؟ عرض کیا ؎

کیا جانے کیا لکھا کرتے تھے دیا کاتبِ اعمال
یاں میں تو بارہا لکھی نہ ہوا تھا

سنتے ہی جناب آدمی و تحریر ہی رو پڑے۔ بہت دیر تک [illegible] جو کچھ لکھا پڑھا سب عمل [illegible] برابر ہے۔ جب خود نہ سمجھ پاتے کہ جو کچھ لکھا ہے اس کو [illegible] فرمانے لگے [illegible] آئندہ والی تھی۔ اس [illegible] مطالعہ کر کے [illegible] ایک شعر کا مطلب سمجھاؤں۔ [illegible] کا مطلب [illegible] سمجھ میں آیا۔ [illegible] گیا۔ [illegible] آخر برس [illegible] گرامی قدر کو سرعلی سے ملا دینے کا وعدہ فرمایا۔ [illegible] نواب صاحب جب [illegible] سوار ہوئے اور روانہ منزلِ مقصود ہوئے۔ میں راہ [illegible] دریافت فرمایا کہ کلام اثر کچھ یاد ہے؟ حسنِ اتفاق کہ یہ اشعار ان کو یاد تھے ؎

ابھی ابھی بیٹھے دو کیوں سرپر آفت لاتے ہو	دل بیچ ہی میں [illegible] جب زلفوں کو الجھاتے ہو
چھپ چھپ کر تم رات صاحب غیروں کے گھر جاتے ہو	کیسی ہے یہ بات تم تو کیسے منہ دکھلاتے ہو
کیسا آنا کیسا جانا میرے گھر کیوں آؤ گے	غیروں کے گھر جانے سے فرصت کب کر پاتے ہو

اس سے بھی خوش ہوئے۔ سرعلی کے گھر پہنچ کر آپ باہر ہی [illegible] فرمانے لگے [illegible] سرکار [illegible] اندر تشریف لے چلنے پر اصرار کرنے لگے مگر آپ نے ایک نہ سنی۔ صرف اطلاع کر دینے کو کہا۔ خبر ہوتے ہی خود سرعلی دوڑے آئے تو آپ نے فرمایا کہ آج آپ کے پاس تشریف نہیں لائے ہیں بلکہ [illegible] ایک [illegible] ملنے آیا ہے۔ یہ صاحبزادے [illegible] ہیں اور انہی کی سفارش مجھے کرنی ہے۔ لائق و سعادتمند فرزند ارجمند نے سفارش کو [illegible] درجہ پر [illegible] لازم آتا ہے کہ الولد [illegible]۔

نواب صاحب زندہ نہ سرعلی امام مگر عمل خیر دلوں کے ہمیشہ بہار رہیں گے ؎

نیکی کن اے فلاں وغنیمت شمار عمر
زاں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نماند

اب جو واقعات لکھے جاتے ہیں ان کے سنین و ترتیب قبل و بعد کا صحیح تعین نہیں کر سکتا۔ رستاخیز ۱۹۴۷ء میں اردو کی متاعِ حیات و مال و منال پر زوال آیا۔ میرا ایک ہی سرمایہ تھا یعنی حافظہ افسوس کہ وہی ضائع گیا۔ پرانی باتوں کے نقوش سطحِ دماغ پر گہرے بیٹھے تھے وہ بھی قابلِ شناخت

[illegible] مع [illegible] کی تصدیق کا جست [illegible] ہے جس کا کوئی ذریعہ یہاں کا [illegible] نہیں۔

اب نواب صاحب [illegible] بھی [illegible] جو [illegible] ہو چکا مگر سال بھر کا بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک [illegible] وقت [illegible] پھر اسپتال سے [illegible] تشریف [illegible] ہیں تو [illegible] پہلے کی وجہ سے کہا [illegible] و [illegible] جناب [illegible] بھی [illegible] سنا کر [illegible] ہیں [illegible] ۔ انہوں نے [illegible] بتایا کہ آنکھ سے کوئی [illegible] گیا ہے [illegible] کا آپریشن کرانا [illegible] ہے [illegible] آ رہے ہیں۔ چونکہ [illegible] اسپتال سے قریب رہتے ہو اور [illegible] ہے لہذا [illegible] صاحب [illegible] سے [illegible] چاہتے ہیں۔ [illegible] میں [illegible] محسوسات [illegible] ہیں۔ [illegible] سمجھتے ہیں [illegible] نواب صاحب [illegible] اسپتال [illegible] ہوا۔ جو نواب صاحب کا [illegible] ہے جس [illegible] میں [illegible] گیا ہے۔ [illegible] نواب صاحب نے [illegible] بیٹے [illegible] تھا اسی [illegible] اسپتال [illegible] ۔ [illegible] سے متعلق [illegible] کی نازک مزاجی [illegible] آپریشن کامیاب ہوا۔ [illegible] وارڈ کے ایک [illegible] میں [illegible] امام صاحب کی [illegible] تصویر اور وہی [illegible] ۔ —— [illegible] آواز [illegible] تھی۔ چاند سے میں سوراخ کر کے اس قسم [illegible] دیا گیا تھا [illegible] ہے [illegible] نواب صاحب [illegible] اسپتال میں [illegible] سے سوراخ سے [illegible] جاتی تھی اور دودھ وغیرہ سیال قسم کی غذا [illegible] جاتی تھی۔ [illegible] نواب صاحب کے ساتھ کئی کئی گھنٹے [illegible] میں [illegible] دیکھا [illegible] ۔

آپ چاہے اس [illegible] مگر مجھے صاف [illegible] تھا [illegible] کچھ [illegible] میں نہ آیا۔ افسوس [illegible] چند مہینے ہی زندہ رہے۔ اس کی [illegible] نواب صاحب [illegible] دیا۔ [illegible]

اب وہ زمانہ ہے [illegible] امام [illegible] اور حیدرآباد [illegible] نواب صاحب بھی حیدرآباد [illegible] تھے۔ ابھی واپسی کی خبر بھی نہیں تھی کہ ایک دن [illegible] ریلوے اسٹیشن سے [illegible] ایک [illegible] بیٹھے نظر آئے۔ گاڑی کی [illegible] سامان [illegible] تھا۔ [illegible] گیا کہ [illegible] کی [illegible] اب تصور [illegible] گاڑی کے اندر اور [illegible] گاڑی [illegible] ۔ خود بھی [illegible] اللہ ہم سب [illegible] ان کی آل اطہار علیہم السلام کا [illegible] ہو گئے۔ باہم

آمین ——— !

ایک دن کا واقعہ سنئے۔ غریب خانہ حسینین منزل کے دروازہ پر ایک [illegible] گاڑی آ کر رکی۔ اس میں سے برآمد ہوئے نواب صاحب کی محل ثانیہ کے برادر [illegible] میاں [illegible] مرحوم۔ [illegible] کہ نہ سر پہ ٹوپی نہ پاؤں میں جوتے۔ "یا الٰہی خیر کیجیو" کہنے کے سوا اور کیا کرتا۔ خبر لائے کہ نواب صاحب سخت علیل ہیں اور فی الفور بلایا ہے۔ میں نے پوچھا کہ گاڑی پر لد کر آنے کی مہلت تھی مگر ٹوپی جوتی کی طرف دھیان دینے کی مہلت نہ تھی کیوں؟ غریب بلبلا اٹھا کہ نواب صاحب کی [illegible] پسندی نے ہی چل پڑنے پر مجبور کر دیا۔ پیادہ پا تمام راہ طے کی۔ پل پار کر کے گاڑی

[illegible] صاحب [illegible] خانہ روم میں کھانا ساتھ ہی جن کے آگے سنگترہ کی طرف [illegible] پلنگ بچھا تھا اور کرسیاں [illegible]
اس [illegible] کر دو آدمی دونوں بازوؤں کو سہارا دئے ہوئے نواب صاحب کو ہوشیاری کے ساتھ سنبھالتے زنان خانہ [illegible]
[illegible] صورت نواب صاحب واقعی بے حد علیل تھے [illegible] نقاہت بھی ایسی طاری تھی کہ جیسے ہم مہینوں کے فاقہ زدہ مریض [illegible]
نواب صاحب کی خو بو سے اتنی واقفیت کے باوجود بھی جی صاف دھڑکا کھا ہی گیا۔ پلنگ پہ دراز ہوتے ہی مخاطب فرمایا کہ بابو! [illegible] وقت [illegible]
بس چند گھنٹوں کا میں مہمان ہوں۔ جانبر ہونے کی کوئی امید نہیں ہے۔ تم کو وصیت کرنے کے لئے بلایا ہے۔ اگر میری وصیت پوری کرنے کی حامی
تم نے بھری تو میری جان آسانی سے نکلے گی اور روح آسودہ و مطمئن رہے گی۔ تم جانتے ہو کہ میرا اس شادی بیاہ کا نہ تھا مگر [illegible] میں کیا کرتا؟
کہ [illegible] اور [illegible] ہو گئیں۔ علی امام، حسن امام کرسٹان ہو گئے۔ کلمہ توحید پڑھنے والا میری نسل میں [illegible]
شادی کر کے دوبارہ نسل جاری کرنی چاہی اب آخری وقت ہے۔ ادھر میں مرا ادھر علی امام، حسن امام بال بچوں پر قبضہ جمائیں گے اور اپنے ساتھ کرسٹان
بنائے بغیر باز نہ آئیں گے۔ لہٰذا یہ میری وصیت ہے کہ میرے بعد میرے بال بچوں کے والی و کفیل آپ ہوں۔ علی امام، حسن امام سے ان کو کوئی
واسطہ نہ رہے۔ میں جانتا ہوں آپ سنی ہیں۔ آپ کی تربیت میں میرے بچے شیعہ نہ رہ سکیں گے۔ مجھے گوارا ہے۔ موحد مسلمان تو رہیں گے۔
کرسٹان تو نہ ہو جائیں گے لہٰذا آپ زبان دیجئے کہ میری وصیت پر آپ عمل کریں گے وغیرہ وغیرہ۔ اس وقت مجھ پر [illegible]
تھی مگر بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ میں نے نواب صاحب کا بکس دواؤں والا طلب کیا۔ خوش قسمتی [illegible] اس میں سے [illegible] چند گولیاں نکال کر
نواب صاحب کو دیں کہ پہلے ان کو نوش فرمائیے اس کے بعد جو وصیت کا معاملہ دیکھا جائے گا اس کی تعمیل اپنی سعادت سمجھوں گا۔ [illegible]
دوا کھا کر استفسار فرمایا کہ تم کو بھی اس طریقۂ علاج میں درک حاصل ہے؟ بفیض صحبت [illegible] میں نے جواب دیا۔ دوا کھاتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ خوب
کھنکھار کھنکھار کر تھوکا۔ لیٹے سے بیٹھے ہو گئے۔ فرمانے لگے بابو! [illegible] گئے۔ آپ نے [illegible] دیا ہے۔ لوگوں کی طرف مخاطب ہو کے
کہ دیکھی بابو کی حذاقت میرے معدہ میں بلغم شدید جمع ہو کر [illegible] پھیلا رہا تھا۔ اگر ذرا سی دیر اور اس کا نکالنا نہ ہوتا تو میرا کام تمام تھا۔ اب
نواب صاحب پوری طرح توانا و تندرست، خوش و خرم، چاق و چوبند تھے۔ پہلے سے اللہ کو [illegible] ہونے مجھے ہاتھوں سے پکڑ کر لے چلے
زنان خانہ کی طرف۔ ڈیوڑھی کے پردے کے پاس پہنچ کر شاید ان کو یاد آیا کہ ابھی وہ کس حال میں برآمد ہوئے تھے۔ لہٰذا تھوڑا سا اضمحلال [illegible]
پر طاری کر کے مجھے تھامے رہا ہے۔ مگر کہ چلتے ہوتے اندر پہنچ گئے۔ [illegible] بھی میرے سامنے نہ آتی تھیں۔ ان کے پاس پہنچ کر [illegible]
آواز میں فرما رہے کہتے کہ بابو نے میری جان بچائی ہے۔ بابو کے قدم لو۔ وہ غریب [illegible]
واسطے سے مجبور غیر محرم کو دیکھ کر ہٹ بھی نہیں سکتی تھیں۔ بہر حال [illegible] عمر سے بہت زیادہ سن و سال والے عزیزوں سے سامنا
ہوا کرے۔ مجھے بھی [illegible] کر کے دیکھا لیں۔ بعد کو معلوم ہوا کہ [illegible] تھیں اور نواب صاحب آواز کی نقاہت کا بیمار
مظاہرہ بھی تو فرما رہے تھے۔ ——— بیگم صاحبہ ہنوز زندہ و سلامت ہیں۔

مذہب کے متعلق یہی نہیں کہ وہ اپنے شیعہ ہونے پر متشدد تھے بلکہ ہر صحیح الخیال کے متعلق اصرار فرماتے تھے کہ وہ بھی شیعہ ہے۔ سنیوں سے
ملنے کے اظہار میں بیباک تھے اور بڑی عجیب باتیں سنیوں سے منسوب کرتے رہتے۔ بارہا ایسا ہوا کہ ایسی ہی کوئی بات انہوں نے سنیوں سے
منسوب کی تو میں بغیر کسی لحاظ کے احتجاج کر دیا کرتا تھا کہ آخر ہم لوگ بھی تو سنی ہیں۔ ان واہی تباہی باتوں سے ہم کو واسطہ کیوں نہیں ہے؟ بڑی
سادگی کے ساتھ اس پر کہتے کہ بابو خدا نہ کرے آپ کیسے سنی ہونے لگے۔ پلٹ کر میں بھی کہہ دیا کرتا تھا کہ جب ہم سنی نہیں ہیں تو آپ کہاں
کے شیعہ؟ کبھی ان باتوں سے نہ کبیدہ خاطر ہوا کرتے، نہ بحث مباحثہ کو راہ دیتے نہ ابرو پر بل ڈالتے نہ چہرے پر میل لاتے۔ یہاں تک کہ مسکراتے
بھی نہیں۔ کہتے تو بس یہی کہ باتوں کا رخ پلٹ دیتے۔

[illegible] ہے۔ اس زمانے کے [illegible] ایک [illegible]
احباب کو [illegible] ۔ [illegible] سارے [illegible] نہیں [illegible] جب تک [illegible]
چند اشعار [illegible] ہیں ۔

[illegible] / اس [illegible]
[illegible] / [illegible]
کرنا [illegible] کے ہے / اظہار [illegible] ہیں اور [illegible] ہیں

حاشیہ [illegible] کی طرف سے [illegible] بعض الفاظ کی ضروری تشریح یہ ہے :
(۱) اسفور : اسفر (۲) کاگری : [illegible] (۳) [illegible] (۴) [illegible] (۵) کرلا : [illegible] (۶) [illegible] کا
[illegible] (۷) بنے : [illegible]

ختم کرنے سے پہلے عرض کردوں کہ اتنی زیادہ تفصیل سے بات کرنے کی ضرورت [illegible] اور اس سے [illegible] کے
آگے [illegible] ابھی تیار نہیں ہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ [illegible] ضروری تفصیلیں [illegible]
[illegible] نہیں ہیں۔ [illegible] اس کے [illegible] قبول کرنا [illegible] ہوگا۔ [illegible]
بالسلامت ۔

نواب صدر یار جنگ بہادر

(مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی)

مالک رام

نواب صدر یار جنگ بہادر سے میری ملاقات محض حسنِ اتفاق کا نتیجہ تھی۔ وہ بالعموم علی گڑھ یا حبیب گنج میں رہا کرتے تھے۔ میں دہلی سے آگے کبھی گیا ہی نہیں تھا۔ ان کا مرتبہ بھی مجھ سے بہت بلند تھا اور عمر کا جو فرق تھا وہ ظاہر ہی ہے۔ بس ان حالات میں اس بات کا بہت کم امکان تھا کہ ہم کبھی ایک دوسرے سے مل سکتے۔ لیکن اس کے باوجود ہم ملے۔

ہوا یہ کہ ۱۹۳۸ء میں مجھے غالب کی کتاب سبدِ چین دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ یہ مختصر سا مجموعہ جس میں مشکل سے کچھ سات سو شعر ہوں گے غالب نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں (۱۸۶۷ء میں) شائع کیا تھا، لیکن چونکہ اس کے بعد نہ یہ الگ کہیں سے چھپا، نہ کلیات ہی کے کسی ایڈیشن میں اسے شامل کیا گیا، اس لئے مدت سے نایاب ہو چکا تھا۔ غالب کی بعض اپنی تحریروں اور یادگارِ غالب میں اس کا ذکر موجود ہے اور وہیں سے مجھے اس کا پتہ چلا تھا۔ میں نے ادھر ادھر بعض احباب کی خدمت میں لکھا کہ اگر آپ کے پاس یہ کتاب ہو تو چند دن کے لئے مستعار عنایت فرمائیے۔ ہر جگہ سے یہی جواب ملا کہ نہ ہمارے یہاں ہے نہ ہم نے اسے دیکھا ہے۔ البتہ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے اتنا اضافہ کیا کہ نواب صدر یار جنگ بہادر کی خدمت میں لکھ کر پوچھیے۔ ممکن ہے اُن کے کتب خانے میں اس کا کوئی نسخہ محفوظ ہو۔ چنانچہ میں نے ان کی خدمت میں لکھا۔ بارے ایک تیر نشانے پر بیٹھا۔ ان کا جواب یہ مژدہ لایا کہ سبدِ چین کا ایک نسخہ میرے یہاں موجود ہے۔ یہ تھی تقریبِ تعارف۔

یہ گرمیوں کا ذکر ہے۔ میں ان ایام میں اپنے کام کے سلسلے میں شملے میں مقیم تھا۔ میں نے اُن سے درخواست کی کہ اگر ممکن ہو تو کتاب مجھے مستعار بھیج دی جائے۔ میں اس کی نقل لے کر اسے بحفاظت واپس کر دوں گا۔ اس پر انھوں نے فرمایا کہ آپ کہاں اتنی زحمت کریں گے۔ میں یہیں سے اُسے نقل کروا کے چند دن میں بھجوا دوں گا۔ چنانچہ پندرہ بیس دن کے بعد انھوں نے یہ نقل مجھے بھیج دی۔ آپ میری خوشی کا اندازہ نہیں لگا سکتے، میں نے اس کی تلاش میں پانچ چھ مہینے صرف کئے تھے اور تقریباً مایوس ہو چلا تھا۔ اگرچہ یہ چیز میرے خیال سے بہت کم حجم کی نکلی، تاہم کچھ بھی ہو غالب کا کلام تھا اور اتنا نایاب کہ بڑے بڑے صاحبِ ذوق حضرات کے کتب خانے اس سے خالی تھے۔ اور وہ خود اس سے ناواقف تھے۔ اس لئے میں جتنا فخر بھی کرتا کم تھا۔

انھوں نے جو نقل مجھے بھیجی اس میں بہت غلطیاں تھیں۔ اب میں یہ فیصلہ نہ کر پایا کہ آیا اصلی کتاب ہی اتنی غلط چھپی ہے یا نواب صاحب

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ایک اور بات یاد آئی۔ غالب نے ایک غزل میں اپنے تمام مشہور فارسی گو معاصرین کا ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

[illegible]

یہاں دوسرے شعر میں علوی سے مراد مولوی عبداللہ خاں علوی ہیں۔ یہ علوی [illegible] صاحب کے حقیقی ماموں تھے۔ مولوی محمد اسمٰعیل شہید دہلوی کے شاگرد تھے اور سید احمد بریلوی سے بیعت تھے۔ طبابت میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا۔ [illegible] میں اپنے وطن [illegible] وفات پائی [illegible] ہو گئے۔ صہبائی انہی کے شاگرد تھے۔ تاریخ وفات ہے "[illegible]"

بات سے بات یاد آتی ہے۔ غالب کے نانا مرزا غلام حسین خاں آگرہ کے رئیسوں میں سے تھے۔ غالب نے اپنی والدہ [illegible] صاحبہ کا نام صرف

یہ خط ... ہے، جو انہوں نے اگست ... کو ایک صاحب خداداد خاں احسان کے ... صاحبزادے ... کے نام لکھا ہے ... خیال ہے کہ میرے ان کے تعلقات تھے اور اسی سلسلے میں غالب نے یہ خط لکھا ہے۔ اسی خط کا عکس ... حبیب گنج میں موجود ہے۔ ... ایک صاحبزادے کریم داد خاں بھی تھے۔ ان کریم داد خاں کی اولاد میں چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں۔ ... صاحب کے نام لکھا تو ... ایک صاحبزادی کا نام بسم اللہ بیگم تھا۔ یہ مولانا عبدالغنی خاں سے منسوب تھیں اور یہ جناب عبدالرحیم خاں صاحب انہی بسم اللہ بیگم کے صاحبزادے ہیں۔ گویا یہ غالب کے مکتوب الیہ جناب خداداد خاں ... کے بیٹے ہوتے۔ غالب کے جس خط کا اوپر ذکر ہوا وہ انہی سے نواب صاحب نے حاصل کیا تھا جو ان کے ... میں محفوظ تھا۔

یہ جملہ معترضہ بہر طور لمبا ہو گیا۔ بہرحال جناب خان صاحب نو بجے کے قریب مکان پر تشریف لائے۔ جونہی پہنچے انہیں میرے آنے کی اطلاع ہوئی اور اس کمرے میں آئے جہاں چند لوگ تھے۔ میں ایک طرف دیوار سے ٹیک لگائے دروازہ بیٹھا تھا۔ دروازہ کھلنے پر نظر اٹھا کے جو دیکھتا ہوں تو وہ سامنے کھڑے تھے۔ اگرچہ میں نے انہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن میں نے زینے سے فوراً پہچان لیا۔ جیسے حدیث ...

بہت لانبا قد کوئی چھ فٹ کے قریب۔ کسرتی جسم۔ سرخ و سپید رنگت۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں۔ لمبی ستواں ناک۔ خضاب لگی ہوئی بھروان داڑھی۔ خضاب لگے کچھ دن ہو چکے تھے کیونکہ جڑوں سے سپیدی جھلکنے لگی تھی۔ چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی جس سے سامنے کے دانت نمایاں ہو گئے تھے اور ان کے پان کے شوق کے غماز تھے۔ جسم پر بند گلے کا شیروانی نما گرم کوٹ اور ڈھیلا ڈھالا اسی کپڑے کا پاجامہ تھا۔ سر پر ٹوپی تھی اور اس کے اوپر مفلر ... سپید شال اوڑھے تھے۔ ایسے خوبصورت اور جامہ زیب آدمی میں نے بہت کم دیکھے تھے۔

بہت تپاک سے ملے اور ہاتھ پکڑ کے اپنے ساتھ دوسرے کمرے میں لے گئے۔ برآمدے میں سے گزرتے ہوئے فرمایا آپ نے خط کیوں نہ لکھا؟ اسٹیشن سے یہاں تک آنے میں تکلیف ہوئی ہوگی آپ کو۔ مکان تو آسانی سے مل گیا تھا؟ آپ نے لکھا ہوتا تو میں کسی کو اسٹیشن پر بھیج دیتا۔ غرض اسی طرح تابڑتوڑ انہوں نے تین چار سوال کر دئیے، لیکن لہجے میں کسی طرح کی عجلت اور گھبراہٹ نہیں تھی۔ بلکہ آواز بہت دھیمی تھی اور ایک ایک لفظ انہوں نے الگ الگ کہا۔ کمرے میں پہنچے تو مجھے دیکھتے ہی فرمایا میں تو آپ کو زیادہ عمر کا خیال کرتا تھا۔ آپ تو ماشاء اللہ بالکل جوان ہیں۔ میں نے عرض کیا قبلہ جوانی کی بھی ایک ہی کہی۔ ساری عمر جس حال میں بسر ہوئی ہے وہاں یہ معلوم ہی نہیں ہوا کہ جوانی کس چیز کا نام ہے۔ "غم عشق گر نبود غم روزگار بود" نے ہمیشہ پریشان رکھا، اس لئے عین جوانی میں بڑھاپا ... کہنے لگے ابھی تو آپ کے فارسی کے ذوق پر بہت حیران ہوا۔ ابھی تسبیح ... کی فرمائش سے جو تعجب ہوا تھا وہ ختم نہیں ہو پایا تھا کہ آپ نے مومن کے فارسی دیوان سے متعلق پوچھ بھیجا۔ پھر میری فارسی تعلیم کا حال پوچھا۔

فرمایا میں مولانا سید سلیمان اشرف صاحب کے پاس گیا تھا۔ ایک مدت سے یہ معمول ہے کہ جب یہاں علی گڑھ آتا ہوں تو اگر وہ یہاں موجود ہوں تو شام کا وقت ان کے ساتھ گزارتا ہوں اور واپسی بالعموم عشاء کی نماز کے بعد ہوتی ہے۔ آج معمول سے ذرا دیر ہو گئی۔ پھر ان کی تعریف اور علم و فضل سے متعلق چند کلمات کہے۔ اس کے بعد موضوع سخن بدل گیا، فارسی اور اردو علم و ادب پر گفتگو ہونے لگی۔ اسی طرح رات گئے تک ہم بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ میں دل میں شرمندہ ہو رہا تھا کہ خواہ مخواہ ان کے آرام میں مخل ہو رہا ہوں، لیکن وہ اتنی محبت اور دلچسپی سے گفتگو فرما رہے تھے کہ اگر وہ اس میری بے وقت کی ہرزہ سرائی سے بے آرام بھی ہوتے تو انہوں نے کسی طرح اسے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ آخر آدھی رات کے قریب میں نے باتوں باتوں میں اشارہ کیا تو نہایت لطف سے فرمایا۔ ارے آپ کی دلچسپ باتوں سے مجھے اس کا تو خیال ہی نہیں رہا کہ آپ سفر سے آئے ہیں۔ تھکے ماندے ہوں گے۔ اچھا اب آپ آرام کیجئے۔ کل صبح ان شاء اللہ حبیب گنج چلیں گے۔ میں نے عرض کیا، یہ دو تین گھنٹے کا گاڑی کا سفر ہی کونسا ایسا سفر تھا کہ میں تھک جاتا۔ آپ کی تکلیف کا خیال ہو رہا ہے۔ بہرحال ہم نے ایک دوسرے سے شب بخیر کہا اور میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔

اس دوران میں باہر بارش زیادہ شدت سے ہونے لگی تھی اور ساتھ ہی تیز ہوا بھی چل رہی تھی۔ بدقسمتی سے میرے کمرے کا ایک دروازہ ... کچھ خرابی تھی

[illegible] عمارت ہے [illegible] بات ہی [illegible] شکستہ [illegible]
[illegible] صاحب [illegible] ہوئے [illegible]
[illegible] ایک [illegible] صاحب [illegible] نواب صاحب [illegible]
[illegible] کے بعد [illegible] گئے۔ [illegible] بہت خراب تھی [illegible] ساتھ [illegible]
کہیں کہیں پانی بھر گیا تھا اور جہاں پانی نہیں تھا وہاں کیچڑ ہو رہی تھی۔

گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد ہم [illegible] پہنچے۔ [illegible] ناشتہ کر کے [illegible] بہت [illegible]
[illegible] وقت تھا۔ پہنچتے ہی نواب صاحب نے کتب خانہ کھلوا دیا۔ [illegible] گئے۔ [illegible]
[illegible] میں اپنے تاثرات کا حال کیا لکھوں۔ [illegible] قسمت [illegible]
کسی [illegible] شاعر کے [illegible] مضمون [illegible] ہے جو میرے [illegible]
[illegible] تو [illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

نواب صاحب کا عجیب [illegible] خصوصیت [illegible] شروع [illegible]
ہے۔ [illegible] بہت [illegible] جب [illegible]
[illegible] بہت [illegible]
یہ [illegible] کا ایک قدیم نسخہ ہے۔ [illegible] نسخہ [illegible]
[illegible] برس پہلے کا لکھا ہوا ہے۔ یہ میرا نسخہ [illegible] زیب [illegible] کے کتب خانہ [illegible]
زیب بادشاہ۔

یہ شیخ سعدی کی بوستاں ہے۔ اس پر [illegible] کی مہر [illegible]
چند دن پہلے ایک تازہ [illegible] آئی تھی۔ علامہ سعد الدین تفتازانی کی مطول [illegible] منگوایا۔ اس کے [illegible]
[illegible] اور [illegible] معلوم [illegible] نواب صاحب [illegible]
[illegible] عبارت [illegible] پڑھنے [illegible]
[illegible] کی تحریر تھی۔ اور اس [illegible] نے مجھے اس کے پڑھنے کے لئے کہا تھا۔ [illegible] کا دیوان [illegible]
اس کے ساتھ چند ایسے [illegible] کی تحریر [illegible] عبارت پڑھنے کے [illegible]
[illegible] بالکل [illegible] دیوان [illegible] بہت [illegible] دیوان دیکھا ہے۔ [illegible]
اسے دیکھ دیکھ کے خوش ہوتے رہے۔

غرض ہم دیر تک اس جنت نگاہ کے نظارے میں مشغول رہے۔ وہ کتاب نکالتے اور [illegible] خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے جاتے۔ اگر [illegible]
[illegible] تھے جیسے [illegible]

[illegible] صاحب علم دوست [illegible] مصروف [illegible] کتاب پر کتاب نکالا ہے [illegible]
[illegible] کی قدر [illegible] حضرت خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ کا شعر ہے

یاراں نہ مہربانی مانند، ہرچہ ماند
مانوب می غنا سینہ اے دیدہ تنہا ماندیم

اصل بات یہ ہے کہ وہ لطیفہ سب کچھ جھونے ہو گئے تھے، اساس وہ بنیادی طور پر علمی آدمی تھے اور ان کی طرح اور دوسری بات یہ ہے کہ جو عام طور پر
صاحب علم اصحاب کی سبت ہیں۔ جہاں کہیں انہیں یہ دونوں چیزیں میسر آ جاتیں ان کی ہر طرح پرواہ کرتے ہر حال عارضی چیز تھی۔ اس کے باوجود وہ اپنا اس طرح
میں نمایاں ہو جاتے۔ میرے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا۔ میں جب ان سے ملا تو وہ بے نقاب ہو گئے۔ صحیح یا غلط ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ میں بھی لکھنے
لکھنے کا شوق رکھتا ہوں اور کتابوں کا قدردان۔ اس صورت میں عمر، مرتبہ، علم کا تفاوت کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اہم چیز یہ تھی کہ میں بھی ان کے خیال میں ہم ذوق
شوقین اور کتابوں کا رسیا تھا۔ یہ چیز ہم دونوں میں گویا قدر مشترک تھی۔ اس کے بعد بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ ایک ہم مشرب و ہم خیال شخص کے سامنے اپنا ذخیرہ
نہ رکھ دیتے۔ اس میں کسی حد تک جذبۂ تفاخر بھی شامل تھا۔ آپ نے بار ہا دیکھا ہو گا کہ آپ کا بچہ جب تک اپنا نیا کھلونا اپنے ہم جولیوں کو نہ دکھا دے اسے چین
نہیں آتا۔ اس کی تہ میں بھی یہی بات ہے یعنی کسی ہم خیال کے ساتھ کھلونے سے لطف اندوز ہونا اور اپنی ملکیت کا غرور اور اس کی نمائش کی خواہش۔
نواب صدر یار جنگ نے عمر بھر کی محنت سے یہ کتب خانہ جمع کیا۔ بدقسمتی سے یہ ایسی جگہ تھا کہ وہاں تک پہنچنا آسان نہیں تھا اس لئے بسا اوقات واقعی
صاحب ذوق حضرات بھی وہاں جانے سے ہچکچاتے تھے۔ لیکن اگر کسی طرح نواب صاحب کو معلوم ہو جاتا، تو وہ خود ان سے درخواست کرتے، اپنا سمجھ کر
اور جب واقعی کوئی قدردان مل جاتا، تو پھولے نہ سماتے۔

عربی کے مشہور شاعر متنبی نے ایک شعر میں اپنی دو دل پسند چیزوں کا ذکر یوں کیا ہے ؎

وخیر مکان فی الدنیٰ سرج سابح
وخیر جلیس فی الزمان کتاب

یعنی دنیا میں بہترین نشست برق رفتار گھوڑے کی زین ہے اور زندگی میں بہترین ساتھی کتاب ہے
یہی دوسرا مصرع کتب خانے کا مونو ہے۔ ربڑ کی ایک گول مہر میں یہ کندہ تھا اور جو کتاب یہاں داخل ہوتی اس پر یہ مہر لگائی جاتی تھی۔
آخر ہم اندر سے نکل کر باہر کے برآمدے میں آ کے بیٹھ گئے۔ یہاں دیوار پر مختلف تصویریں، نقشے، مرقعے وغیرہ لٹک رہے تھے۔ چند دن ان کا ایک پلنگ
اور دل کش قلمی نسخہ تھا جس میں ساتھ ساتھ مختلف علاقوں کی زرعی پیداوار اور حیوانات بھی تصاویر میں دکھائے گئے ہیں۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد مرحوم کو کسی زمانے
میں مصوری کا بھی شوق ہوا تھا۔ یہاں ان کی دستکاری کے بھی چند نمونے دیکھے۔ تصویریں فنی پہلو سے زیادہ اچھی نہیں تھیں۔ البتہ تبرک ضرور تھیں۔ شروع میں غالب کی
جس تصویر کا ذکر کر آیا ہوں وہ بھی موجود تھا۔ اس تصویر پر تاریخ تحریر ۱۸۴۸ء لکھی ہے، جو بظاہر غلط ہے۔ دیر تک اس پر بحث ہوئی، کہ ٹھیک تاریخ کیا ہے۔
بہرحال کچھ فیصلہ نہ ہو سکا اور ہو بھی کیسے سکتا تھا محض قیاس آرائی ہی تو تھی۔ ثبوت کیسے مہیا کیا جا سکتا تھا؟ ذکر غالب کے ساتھ میں نے غالب کی جس تصویر کا
عکس دیا ہے وہ میں نے یہیں سے لی تھی۔
اتنے میں ظہر کا وقت ہو چلا تھا۔ فرمایا، اگر کھانے کے بعد مطالعے کیلئے کوئی کتاب لینی چاہیں تو نکلوا لیجئے۔ میں نے گزارش کی، کہ سہ چینی کا مطبوعہ نسخہ دلا دیجئے
تاکہ جو نقل آپ نے بھجوائی تھی اس سے مقابلہ کر سکوں۔ نیز مومن کا فارسی دیوان۔ کتابیں آئیں اور ہم باہر چلے آئے۔ میں اپنے کمرے کی طرف گیا اور وہ مسجد کی طرف۔
سہ چینی کی پہلی ۱۸۶۷ء والی اشاعت میں کتابت کی بہت غلطیاں رہ گئی تھیں، اور اس کے آخر میں غلط نامہ لگا دیا گیا تھا۔ سوئے اتفاق سے جیب کے
والے نسخے سے یہ غلط نامہ غائب تھا اس لئے میں پوری تصحیح نہ کر سکا۔ آخر میں نے یہ کام ہارڈنگ لائبریری دہلی کے نسخے کو دیکھ کر کیا تھا اس کے باوجود میرے

[illegible] مانوس ہے۔

[illegible] تھا۔ [illegible]

[illegible]

[illegible] تھے۔ [illegible]

[illegible] تھے۔

[illegible] نواب صاحب [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] نواب صاحب [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ملاقات [illegible]

[illegible]

اس پہلی ملاقات کے موقع پر آپ نے میری نوٹ بک میں مندرجہ ذیل عبارت رقم فرمائی۔

[illegible]

[illegible]

کمترین حبیب الرحمٰن

[illegible] حبیب گنج [illegible] ۲۱ [illegible] دسمبر ۱۹۲۶ء

اگلے دن میں واپس دہلی چلا آیا۔ چلتے وقت آپ نے اپنی تصنیفات کا مجموعہ میرے ساتھ گاڑی میں رکھوا دیا۔ یہاں آنے کے تھوڑے دن بعد میں نے پہلے [illegible] اور پھر [illegible] شائع کیں۔ دونوں کے نسخے میں نے ان کی خدمت میں بھیجے۔ حوصلہ افزائی فرمائی [illegible] تعریف کی۔

(۲)

اتفاق سے [illegible] میں [illegible] باہر چلا گیا۔ جنگ کا سارا زمانہ باہر ہی رہا۔ اور ۱۹۴۶ء کے آخر میں واپس دہلی آیا۔ اس تمام عرصے میں خط و کتابت کا سلسلہ ہمارے درمیان جاری رہا۔ [illegible] تو انہوں نے لکھا کہ جب واپس آؤ تو حبیب گنج ضرور آنا۔ چنانچہ [illegible] فروری ۱۹۴۷ء میں علی گڑھ گیا۔ [illegible] جانے سے ایک دن پہلے تار [illegible] پہنچنے کی اطلاع دی۔ [illegible] صبح کی گاڑی سے گیا تو [illegible] صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے مجھے پہچانا نہیں [illegible] کے بعد کچھ ایسا تغیر [illegible] بھی نہیں تھا۔ بہرحال ان سے معلوم ہوا کہ نواب صاحب [illegible]

حبیب گنج ہی میں نماز … جانے والی لاریوں کے اڈے پر پہنچا۔ اب سفر کا حال کیا بیان کروں … معلوم ہوتا تھا …
مسافت تک … سڑک کچی تھی … دونوں طرف کھیت تھے اور ان کے بیچ میں ایک …
جب ایک … گرد و غبار کا ایک طوفان … اور اگر قسمت سے کہیں سامنے سے کوئی لاری آ جائے …
تو بس پھر … تصور کر لیجئے کہ مسافروں پر کیا گزرتی ہوگی۔ سفر کا آخری ڈیڑھ دو میل کا ٹکڑا …
… طبیعت خراب ہونے لگی … دو تین فرلانگ کے بعد میں اتر کر …
باقی مسافت میں نے پیدل طے کی اور سامان تانگے پر آیا۔

میں قریب تین بجے کے قریب حبیب گنج پہنچا۔ نواب صاحب … باہر کے … عربی … فرش پر … حسب معمول … مشغول تھے۔ میر مختار احمد صاحب کو آداب عرض کر کے خاموش بیٹھ گیا۔ جب تلاوت سے فارغ ہو کر … نواب صاحب نے … محمد صاحب نے کہا کہ ذرا اونچا کہئے۔ چنانچہ میں نے ان کے کان کے قریب ہو کے … اونچی آواز … عرض کرتا ہوں … غور سے دیکھا ہم نے بھی نام نہیں بتایا اور چپ چاپ ان کے منہ کی طرف دیکھا … ہاتھ کی گرم جوشی سے … لذت … معلوم ہوا کہ میرا آنا … ایک شخص … لے کے آیا … تھا۔

جناب عبد الرحیم خاں صاحب نے آگے بستی روانہ کر دیا … پہنچے …
نواب صاحب نے ملازم کو حکم دیا وہ پانی لاؤ … ہاتھ منہ دھویا … میرے پاس … پہلے … سب نے … چند منٹ بیٹھنے کے بعد عصر کی نماز کے لئے مسجد میں چلے گئے … مغرب … آپ کو … سات برس کی … کہانی … کہاں کہاں رہے اور کیا کیا دیکھا۔ میں نے عرض کیا بسر و چشم … بڑے کمرے میں آ گئے۔ نواب صاحب … اگرچہ میں نے اس چھ سات برس میں مشرق وسطیٰ … اسلامی ممالک … لیکن زیادہ قیام مصر میں … کہنے لگے … اردو میں گفتگو نہیں ہوتی … آپ اتنے دن مصر میں رہے ہیں یقیناً عربی بہت اچھی بولتے ہوں گے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایک بات کی وضاحت کر دوں۔
یوں کہنے کو تمام عربی ممالک کی زبان عربی ہے لیکن جب باہر سے کوئی ایسا شخص یہاں آئے جس نے ساری عمر عربی پڑھی ہو اور اپنے آپ کو عربی کا عالم سمجھتا ہو تو اگر وہ یہاں عام لوگوں سے بات چیت کرے تو بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ وہ ان کی سمجھنے اور انہیں اپنی سمجھانے میں بہت دقت محسوس کرے گا۔ بات یہ ہے کہ عام بول چال کی بولی کتابی زبان سے بالکل مختلف ہے۔ اس عوامی زبان … کے اپنے اصول ہیں۔ اس کی گرامر الگ ہے۔ اس کی لغات الگ ہے۔ اس کا لب و لہجہ الگ ہے۔ غیر ملکی عالموں کو تو چھوڑ دیجئے کہ ان غریبوں نے سوائے کتابیں پڑھنے کے کسی کو کم بولتے سنا ہوگا۔ خود عربی ممالک کا یہ حال ہے کہ ایک مصری ایک عراقی کی بات سمجھنے میں مشکل محسوس کرتا ہے۔ حالانکہ دونوں عربی بولتے ہیں۔ ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ میرے ایک مصری دوست ہیں جو کسی زمانے میں … فرانس میں مصری قونصل تھے۔ مراکش کا علاقہ … فرانسیسی سلطنت کا حصہ ہے۔ ایک دن کچھ مراکشی باشندے کسی کام سے ان کے دفتر میں آئے۔ اب خیال ہے کہ مصر اور مراکش دونوں ملکوں کی زبان عربی ہے۔ فرمانے لگے قسم لے لو جو میں ان کی گفتگو کا ایک لفظ سمجھا ہوں۔ آخر ایک ترجمان بلانا پڑا۔ جو عربی کی باتوں کا ترجمہ کرتا رہا اور اس طرح معاملہ طے ہوا۔ پھر ہر ایک جگہ کی بولی میں دخیل الفاظ ہیں۔ یعنی دوسری زبانوں کے لفظ۔ عربی میں ایسے رس بس گئے ہیں کہ لوگ انہیں بے تکلف بولتے ہیں اور قطعاً کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ بلکہ انہیں یہ معلوم ہی نہیں کہ یہ عربی کا نہیں کسی غیر زبان کا لفظ ہے۔ مراکش اور تونس میں فرانسیسی اور ہسپانوی کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ مصر میں فرانسیسی اور اطالوی۔ اسی طرح عراق میں فارسی اور ترکی۔ اور یہی حال دوسری جگہوں کا ہے۔ اگر اس پر انگلش سے کچھ … ہے تو … زبانیں اگرچہ … بغیر نہیں رہ سکی۔ پھر یہ خرابی عوام ہی تک محدود نہیں بلکہ تعلیم یافتہ اور عالم لوگ بھی جب آپس میں بات چیت کریں گے تو …

[illegible] پاکستان نہیں [illegible] ہوگیا۔

[illegible] بات چیت [illegible] ادبی [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] شائع ہوا تھا [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] آپ کے متعلق ایک شعر [illegible] ہے

[illegible] ملک [illegible] زمانے [illegible]
دل [illegible]

[illegible]

میں نے [illegible] تصویر [illegible] کوشش کرتے ہیں [illegible] سب پہلی چیز [illegible] کو [illegible] تصویر [illegible] شام کو [illegible] آپ [illegible] علی گڑھ تک [illegible] تصویر اتروائیں گے۔ میں نے کہا کہ نہیں اتنی زحمت کی کیا ضرورت ہے۔ کہنے لگے زحمت کچھ بھی نہیں میں کل تو جانے ہی والا تھا، آج چلا جاؤں گا۔ یہاں علی گڑھ تک [illegible] بھی رہے گا۔ غالباً یہ بھی فرمایا تھا کہ مجھے

[illegible] معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب جب گئے سے ملتے جلتے رہتے ہوں گے۔ جلسے کے دن [illegible] معلوم ہوتا ہے [illegible]
[illegible] کا قصہ بیان کرنے کا وقت نہیں ہوتا۔ کہنے لگے کوئی بات نہیں، پھر کسی وقت [illegible]
[illegible]

راستے میں گلہ مند ہو کے عنوان کو دیکھ کر میں نے عرض کیا کہ اس وقت [illegible] کے فردوسی کے شعر کی حقیقت واضح ہوتی ہے

بس کہ گرد میداں زہر شد بہ دشت
بہ بیست حق تند [illegible] گشت ہشت

بہشت مسرور ہو ... [illegible] کہ اسی مقام کے آغاز میں شعر [illegible] ماشت [illegible] ہوگیا۔ اس وقت [illegible] کے پیچھے بھی تھا اور ظاہر ہے کہ کتب [illegible] نے ایک زمانے سے نہیں دیکھا ہوگا۔ کوئی ایک آدھ شعر کسی [illegible] سے سب مرتبہ پڑھ [illegible] کہاں نہیں [illegible] ہو سکتا ہے لیکن یوں اچانک ایک [illegible] کے شعر سنا دینا معمولی بات نہیں۔

مرحوم کی ایک عادت تھی کہ اگر کوئی بات ہو [illegible] نہیں دینا چاہتے تھے تو کچھ خاموش [illegible] کوئی اور بات چھیڑ دیتے۔ [illegible] ہوا۔

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے مولانا شبلی کی سوانح عمری حیات شبلی کے عنوان سے لکھی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی [illegible] مرحوم نے دیکھا تھا اور انھوں نے [illegible] کے ساتھ [illegible] عطیہ بیگم کے موضوع پر [illegible] مجھے سنا رہے تھے [illegible] شبلی اور عطیہ بیگم کا قصہ [illegible] لفظ نہیں لکھا، حالانکہ یہ ایسی بات نہیں جسے یوں نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ اگر [illegible] کی عظمت اور وقار میں کسی طرح کی کمی نہیں ہوتی اور اگر یہ غلط ہے تو پھر [illegible] وقت مولانا شبلی کے تلامذہ اور احباب [illegible] میں آنے والے تو بہر حال نہیں کے خوشہ چیں ہوں گے

انھی دعائیوں کے خیال سے میں نے اُن سے سوال کیا کہ کیا آپ نے حیات شبلی [illegible] نے کہا، میں عطیہ بیگم والے قصے پر بھی کچھ لکھنے کی ضرورت تھی۔ [illegible] خلفائے بزرگان کو [illegible] پر عمل کرنے کو تیار نہیں تھا۔ [illegible] مکاتیب شبلی [illegible] کے نام تو ضرور پڑھے ہوں گے۔ جواب [illegible] دیا۔ پھر پوچھا کہ کیا آپ نے مہدی افادی کے [illegible] کہا آپ نے کتاب خطوط شبلی بھی ضرور دیکھی ہوگی جس میں شبلی کے وہ خطوط ہیں جو انھوں نے عطیہ بیگم اور اُن کی بہن کے نام لکھے تھے [illegible] تھے۔ اب میں نے اتنی تمہید کے بعد سوال کیا کہ مہدی نے مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں صاف لکھا ہے کہ مولانا شبلی کا مجھ سے پردہ نہیں تھا۔ [illegible] پردہ داری تھی۔ کہنے لگے مجھے یہ کتاب دیکھے اتنا زمانہ ہو گیا ہے کہ اب ٹھیک طور پر کچھ یاد نہیں۔ میں نے کہا اچھا یوں سہی، لیکن آپ [illegible] پیدا کرنے والی ہے۔ آخر آپ لوگ کھل کے کیوں کوئی بات نہیں کرتے۔ کہنے لگے "فائدہ"۔ فائدہ یہ کہ اس سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ کل کے مورخ کے لیے روشنی مہیا ہو جائے گی، اور اس کے لیے فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی۔ انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ [illegible] کام لیتے ہوئے ایک [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] آخری ملاقات تھی [illegible]
آخری سال [illegible] جناب [illegible] صاحب [illegible]
[illegible] اگست [illegible] جمعہ [illegible] صبح [illegible] انا للہ وانا الیہ راجعون۔

۳

موت بھی آدمی کی میراث ہے۔ [illegible] وہ بھی ہرگز [illegible] وقت [illegible]
[illegible]
اپنی عمر [illegible]
[illegible] قابل فخر بات ہے۔ لیکن افسوس ہے [illegible]
ختم ہو گیا۔ اب ان کے [illegible] ایک [illegible]
[illegible]

زمانے نے اپنا ورق اُلٹ دیا ہے۔ [illegible] محبت اور خلوص [illegible] دوستی [illegible] ہر چیز کا مفہوم بھی بدل گیا [illegible]
اس زمانے میں پیدا ہوئے۔ پہلے پھُولے اور پروان چڑھے۔ جیسے ہم ایک نقطہ میں [illegible] ایک [illegible]
تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آپ [illegible] طرح کسی شخص سے آج ملے ہیں اسی طرح [illegible] زندگی کا [illegible] اب کوئی طاقت آپ
کو اس سے اِدھر اُدھر نہیں کر سکتی۔ آپ کی دوستی بھی کسی اصول پر مبنی ہوگی اور مخالفت بھی۔ [illegible] طرف ہو گئے۔ ایسے ہم [illegible]
تعبیر کرتے ہیں۔ مرحوم اسی اصول کی جیتی پھرتی تصویر تھے۔ اب یہ تصویر [illegible] اسی پر ختم کرتا ہوں ؎

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنیے گا
جب کہتے کسی کو سنیے گا تو دیر تلک سر دھنیے گا

علامہ عمادی

ابوالخیر مودودی

مستطیل سر اور کشادہ ابھری پیشانی کے عمادی صاحب بڑے جامع کمالات تھے۔ اسلامی علوم نقلی و عقلی کے حافظ، وسیع المطالعہ مؤرخ، عربی فارسی اردو کے انشا پرداز و ادیب، رنگین بیان و گرم لہجہ شاعر، کتاب میں دیدہ ور، باقی امور میں جنتی۔ ان کا حافظہ طرفہ تماشا تھا: جیسے مل مرتبہ کے چلے ہوئے رستے پر ان کو چھوڑ دیجیے، رستہ بھول جائیں گے اور بغیر رہنمائی کے اپنے گھر واپس نہیں پہنچ سکیں گے۔ حد یہ ہے کہ سالہا سال کے ربائی انتظامات میں رفیقۂ حیات نے ان کو زندگی کے رستے میں چھوڑا اور وہ یہ رستہ بھی بھول گئے۔ لیکن کتاب اگر کوئی بھی ہو — فسانۂ آزاد، کوچک باختر، نائیکا بھید یا کوک شاستر — ایک دفعہ نظر سے گزر جانی شرط ہے، ناممکن ہے کہ اس کے مضامین ان کی یاد سے اوجھل ہو جائیں، بلکہ بعض خاص خاص جملے اور فقرے لفظ بلفظ یاد رہتے۔ مہینہ بھر ایک ہی چیز کھلائیے، وہ شوق سے کھائیں گے، لیکن ایک ہی قسم کی کتابیں مسلسل پڑھے جائیں، یہ ناممکن تھا۔ تبدیلِ ذائقہ کے لئے — اور ذہنی ہضم کے لئے — تیرتھ رام فیروزپوری کے ترجمے بھی پڑھتے تھے۔

عمادی صاحب کے نام سے، میں سب سے پہلے، امرتسر کے اخبار "وکیل" کے ذریعے واقف ہوا — اور ابوالکلام صاحب کے نام سے بھی اولاً "وکیل" ہی کے ذریعے آنکھیں روشن ہوئی تھیں — یہ میرے بدوِ شعور کی بات ہے۔ بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں "وکیل" بڑا نامی گرامی اخبار تھا اور اس وقت کی صحافت میں اصابتِ رائے، متانت تحریر اور خوبی کے لحاظ سے بہت ممتاز تھا۔ عمادی صاحب اس کے اڈیٹر اور ابوالکلام صاحب کے جانشین تھے[1]۔ شعور بڑھتا گیا اور عمادی صاحب سے واقفیت بڑھتی گئی۔ "الندوہ" کے پہلے پرچوں میں ابوالکلام اور ابن خلدون وغیرہ پر ان کے مضامین اور سب اڈیٹری میں ان کا نام نظر آیا۔ یہاں بھی وہ سب اڈیٹری میں ابوالکلام صاحب کے جانشین تھے پھر "وکیل" کی ادارت کے ساتھ ان کی تراوش قلم سے "تہذیب الاخلاق" کے نام سے ایک ماہنامہ[2] نکلنے لگا۔ جس میں نقلی علوم کے پہلو بہ پہلو مسائل

---

[1] سنہ ۱۹۰۶ء — سنہ ۱۹۰۵ء

[2] یہ رسالہ بھی وکیل لمیٹڈ کے زیر اہتمام نکلتا تھا۔

[illegible] شائع ہوتے تھے۔ اس زمانے میں انہوں نے [illegible] کا اب معلوم ہوا تھا بند ہو گیا تھا [illegible] کرنے کے ایک عربی رسالہ "البیان" پر آ گئی نظر۔ یہ ماہنامہ عمادی صاحب کی ادارت میں لکھنؤ سے ۱۹۱۲ء میں نکلا تھا جو ۱۹۱۸ء تک کامیابی سے چلتا رہا۔ اس زمانے میں یہ ایک خاص بات ہے کہ وہ لکھنؤ کے علماء میں پہلے شخص تھے جنہوں نے ہندوستان کی صحافت سے نکل کر [illegible] اور مصر و بیروت کے رسائل و اخبارات میں مضامین لکھے۔[۲] "البیان" اسی زمانے کے عربی [illegible] تھا جب "الہلال" نکلا تو کچھ دنوں بعد "وکیل" کی طرح سے ان کا نام رخصت ہو گیا اور معلوم ہوا کہ ابوالکلام صاحب نے عمادی صاحب کو "الہلال" کی مجلس ادارت میں بٹھا لیا ہے۔ "الہلال" سے قبل ظفر علی خاں صاحب نے ان کو "زمیندار" میں کھینچا اور پھر وہ تین برس کے وقفے کے بعد ان کا نام ظفر علی خاں صاحب کے نیم رسالے "ستارۂ صبح" میں شریک مدیر کی حیثیت سے نمودار ہوا۔ صحافت میں غالباً یہ ان کی آخری نمود تھی۔

یہ معرفت بہت جاری ہو کر کم تھی، لیکن عمادی صاحب کی علمی فضیلت کا ایک بے نظیر واقعہ اس وقت میرے علم میں آیا جب میں دارالترجمہ سے متعلق ہو کے حیدرآباد جا رہا تھا۔ چنانچہ مشورے کی غرض سے حکیم اجمل خاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حکیم صاحب نے فرمایا: وہاں ایک بڑے فاضل شخص عمادی صاحب بھی ہیں۔ سفیر کابل ۱۹۱۹ء سے تاریخ ابن خلدون کے فارسی ترجمے کی فکر میں تھے۔ ایک دن سفیر صاحب نے مجھ سے کہا، حکیم صاحب! آپ کے ہندوستان میں ایک آدمی ایسا نہیں تھا جو ابن خلدون کی تاریخ کا ترجمہ کر دے۔ مجھے تین سال جستجو کرتے ہو گئے۔ مجھے یہ سن کر بڑی شرم آئی۔ سوچتا رہا۔ مولوی عمادی صاحب نے بڑے بھائی صاحب سے "قانون" پڑھا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ عربی فارسی میں بڑی دستگاہ رکھتے ہیں۔ سفیر کو ان کا پتا دیا اور انہوں نے یہ کام انجام دے دیا۔ قابل تعریف بات یہ ہے کہ بہترین ترجمہ کیا اور دو سال میں پوری کتاب کا ترجمہ کر دیا۔"

یہ قسمت کی نیرنگی تھی کہ عمادی صاحب جس شعبے کے رکن تھے اسی شعبے سے ایک دن میں بھی منسلک ہوا اور ان کی پائنتی میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا لیکن اس قربت کے باوجود میرے دل میں شوقِ ملاقات نہ تھا۔ خیال تھا کہ جب وہ ایسے ہی فضیلت پناہ ہیں تو اپنے عہد کے علما کی طرح اپنا سارا علم اپنی شرعی داڑھی پر لادے رہتے ہوں گے، آنکھوں میں نخوت تیرتی ہوگی، زمین پر اس طرح چلتے ہوں گے گویا لوگوں کے سروں پر چل رہے ہیں، اور باتیں آنکھیں بند کر کے اس طرح کرتے ہوں گے جیسے بہت دور کسی ستارے میں بیٹھے اپنے بندے پر وحی نازل فرما رہے ہیں۔

—— مگر جب ان کو دیکھا، تو پہلی نظر میں ذہن پر ان کی شخصیت کا پہلا عکس یہ پڑا کہ یہ شخص اپنے تئیں کوئی غیر معمولی وجود بہت اچھی نہیں سمجھتا؛ محض انسان، لاکھوں کروڑوں انسانوں کی طرح کا ایک انسان، اور اس سے زیادہ کچھ بننے یا نظر آنے کی کوشش بھی نہیں کرتے، گو اور میں حیران ہو گیا کہ وہ کوئی بڑے جغادری فضیلت پناہ ہیں؟ اور میں سطحِ دریا سے رہا سہا ساحل سے بہت دور کھڑا ایک نادان لڑکا ہوں۔ چہرے پر شرافت کی ملاحت، خد و خال میں علم کا رچاؤ، آنکھوں میں گہرے پانی کا وقار۔

۱؎ وکیل بک ڈپو سے عمادی صاحب کی مستقل تصانیف و مقالات میں "محکمات"، "علم الحدیث"، "فلسفۃ القرآن"، "فلسفۂ ابن عربی"، "صناعۃ العرب"، "تاریخ عرب قدیم" اور تراجم میں مفتی محمد عبدہ کی مشہور کتاب "الاسلام والنصرانیہ" [illegible] شیخ عبدالعزیز شاویش کی "الاسلام دین الفطرۃ" اور امام راغب کی "تفصیل النشاتین و تحصیل السعادتین" شائع ہوئیں۔

۲؎ "البیان" تین حصوں پر مشتمل تھا۔ ایک حصے میں عرب ممالک کے لیے ہندوستان کی تاریخ، رجال اور حالات حاضرہ پر عربی میں مضامین ہوتے تھے۔ دوسرے حصے میں عرب اہل قلم کے مضامین بازترجمہ درج کیے جاتے تھے اور تیسرے حصے میں عالم اسلام کے حالات اور خبریں اردو میں ہوتی تھیں۔ ہندوستان سے زیادہ مصر و شام، بیروت اور شمالی افریقہ، تونس و الجزائر و مراکش میں اس رسالے کی مانگ ہوئی۔

صحت حاصل کر چکے تھے ۔ علم سہالی سے مناسبت تھا، جاہ و منصب بھی رہا، ایک نامور نے جو بہار بنگال کا [illegible] ایک نسل سے دوسری نسل کو پہنچا ہے ۔ نسباً یہ لوگ صدیقی تھے، صدیقیت ان کے علمی شرف کے ساتھ ان کے [illegible] امتیازی نشان رہی ۔

شیخ عماد نام ایک صاحب فضل و کمال اس خاندان کے مورث تھے وہ آٹھویں صدی کے آخری برسوں میں ہندوستان آئے ۔ اس زمانے میں علم کے قافلوں کی آخری منزل پورب دیس تھا ۔ شیخ عماد بھی یہیں پہنچے اور جون پور میں خوردہ اور ان کے گھرانے کے لوگ افادۂ علوم میں مشغول ہو گئے ۔ ابراہیم شرقی کے زمانے میں اس گھرانے کے درس علوم کا شہرہ زبان زد عام تھا ۔ اس نے بارہ گاؤں میں حاصل جاگیر دیئے ۔ ان لوگوں نے انہی دیہات کو اپنی درس گاہ بنا لیا ۔

مسلمان بادشاہوں کی یہ جاگیر بخشیاں ایک مستقل فکر کی حامل تھیں ۔ جاگیروں کا مدعا تہذیبی اداروں کے لئے آزاد اور با اختیار سرمایہ مہیا کرنا تھا ۔ ہر مکتب گاہ قرب و جوار کے طلبہ کی اقامتی درس گاہ ہوتی تھی ۔ اکثر و بیشتر طلبہ تن کے کپڑوں سے گھر سے چلتے اور جس درسگاہ میں پہنچتے، فراغت حاصل کرنے تک ان کے تمام مصارف کی وہی درس گاہ کفیل ہوتی ۔ یہ دیہاتی مدرسے گاہیں صحت مند تعلیم و تربیت کے علاوہ تبلیغ کا بالواسطہ وسیلہ تھیں ۔

عمادی خاندان نے پورب کی بستیوں میں تقریباً ساڑھے چار سو برس تعلیم و تلقین کی شمعیں روشن رکھیں ۔ آخر زمانے میں سوگھر پورا میں شیخ عبد القادر عمادی کی درسگاہ مرجع عام تھی، جس میں بیک وقت دو دو سو طلبہ مقیم رہتے تھے ۔ بادشاہی وقتوں کی جاگیر اودھ کی نوابی کے انتقال دور میں ضبط ہو چکی تھی، لیکن چشمۂ نور جاگیروں نہیں خود ان کی ذات تھی ۔ بزرگوں کا زر خرید "امرتورہ" ایک گاؤں تھا، اس کی آمدنی سے طلبہ کی مدارات کرتے اور دونوں وقت کا کھانا ان کے ساتھ ایک دسترخوان پر کھاتے ۔ یہ عمادی صاحب کے پردادا تھے ۔

اس تعلیمی اور تہذیبی خدمت گزاری میں عورتیں بھی اپنے دائرہ عمل میں مردوں کے ساتھ شریک تھیں، اور یہ ہمارے معاشروں کا سیکڑوں برس پرانا دستور تھا، اسی سے خاندانی اوصاف جلا پاتے تھے، تہذیب و شائستگی بلند ہوتی تھی اور معاشرے کا شیرازہ بندھا رہتا تھا ۔

عمادی صاحب نے علمی شیفتگی کے اس ماحول میں آنکھ کھولی ۔ خاندان میں اب تک بول چال کی زبان عربی تھی، صرف و نحو دادی سے پڑھی اور گیارہ برس کی عمر میں اتنی استعداد حاصل کر لی کہ خود "الف لیلہ" پڑھ لیتے اور اس کے مشکل مقامات لغت کی مدد سے حل کر لیتے ۔ اسی کتاب نے عربی انشاء کا شوق پیدا کیا ۔ علوم متداولہ اپنے والد اور ماموں سے پڑھے، دونوں بزرگ صاحب فضل تھے ۔ ادب کی ڈھیروں اٹم قلم کتابیں چھوڑ کے قرآن اور حدیث کے درس میں بہترین ادب عالیہ بھی پڑھا دیا ۔ اس طریق تعلیم سے طالب علم میں یہ استعداد پیدا ہو گئی کہ جاحظ و ابن قتیبہ کی ادبی مناقتوں اور کلام عرب کے مجموعوں سے خود استفادہ کرے ۔ یہ زندگی سے ہنستے بولتے، اکھرے اور سادہ، لطیف اور منطقی؛ کانٹے کی تول تھے ادب کی تعلیم تھی متنبی اور حریری اس کے آگے پانی تھے ۔ نقلی اور عقلی علوم میں ملا نظام الدین کے اصول پر ہر فن کی ایک ایک دو دو جامع و مستند کتابیں پڑھائیں، فقہ میں عام نصاب کے خلاف امام محمد شیبانی کی جامع صغیر و جامع کبیر پر اکتفا کی، اور آخر میں امام رازی کی شرح اشارات پڑھائی ۔ یہ درس نظامی پر اضافہ تھا ۔ اس کے بعد خیر آبادی دبستان سے فکر و نظر کی وسعتیں حاصل کرنے کے لئے مولوی ہدایت اللہ خاں[1] رام پوری کے درس میں داخل کر دیا ۔

---

[1] مولوی ہدایت اللہ خاں رام پوری، مولوی فضل حق خیر آبادی کے یگانۂ روزگار شاگردوں میں تھے ۔ چند سال رام پور میں درس دیا، پھر [illegible] میں جون پور آگئے اور مدرسۂ امام بخش کو رونق بخشی ۔ مولوی حبیب الرحمان خاں شروانی ان کی کریم النفسی کا ایک واقعہ بڑے مزے لے لے کر بیان فرمایا کرتے تھے [illegible] امتحان کے سلسلے میں ہم پر تشریف لے گئے سخت گرمی کا موسم تھا، امتحان کے [illegible] (۴)

[illegible] چشتیہ ہوں یا ان بزرگوں پر جنہوں نے فقر میں سلطنت [illegible] کی ہو [illegible] ہے [illegible]
[illegible] مولوی صاحب قدس سرہ [illegible] اور [illegible] کی کمال مہارت کے تذکرے میں پڑھا ہے ، [illegible] ہوئے [illegible]
مولوی صاحب [illegible] جھوٹی [illegible] میں لکھے ''صحت معنی'' اور ''معنی صحت'' کے کانوں میں آ لگتے اور سوں کے [illegible]
[illegible] قرینے کی استعمال میں ہمسو ستائی ، [illegible] ایک عشق اور محبت بنا پڑتا ۔ [illegible] پہنچ [illegible]
[illegible] کے وجود کا [illegible] ہو سکتا ۔ شرح اشارات رازی کا سبق حقیقت میں [illegible] کا سبق تھا ۔ [illegible]
انہوں نے شاہنشاہوں کے ہاتھوں سے بڑے بڑے بتوں کو گرایا ہے اور بڑے مزے سے ان کا تماشا دیکھا ہے ۔ اور اس بت شکنی کے بعد بہت بڑا
احسان یہ فرمایا کہ خود اپنا بت کسی ہاتھ میں نہیں بٹھایا۔

[illegible] سے فراغت کے بعد حکیم عبدالمجید خاں صاحب سے ''دہلی'' جا کے طب کی مشہور کتاب ''القانون'' پڑھی ۔ پھر رامپور ''محمد عرب[1]
محمد طیب'' سے فنونِ ادب کا فیض حاصل کیا ۔ اور طیب صاحب نے مکتب سے مکتب زندگی کی مسند پر بٹھایا ۔

اس زمانے کی علمی دنیا میں مولوی عبدالحق ''آسی'' ایک مشہور و مقبول شخصیت تھے ۔ وہ مولوی عبدالحق خیر آبادی کے ممتاز شاگردوں میں تھے ۔
اور رامپور کے مدرسہ عالیہ میں مدرس رہ چکے تھے ۔ مدرسی چھوڑ کر لکھنؤ میں ''اصح المطابع'' کے نام سے مطبع قائم کیا جس میں حدیث و فقہ ،
خصوصاً عربی کی درسی کتابیں تصحیح و تہذیب کے ساتھ چھپتے تھے ۔ آسی صاحب کو اپنے اس کام کے لئے ایسے لوگوں کی جستجو رہتی تھی جو عربی
اور مختلف علوم میں دستگاہ رکھتے ہوں اور غلط نسخوں کی تصحیح میں ان کی مدد کریں ۔ وہ اپنے کسی کام سے رامپور آئے ، حبیب صاحب
نے ان کے مطلب کے موزوں ترین آدمی سے ان کو متعارف کیا ۔ اور عمادی صاحب مکتب سے مطبع کی زینت بن گئے ۔ یہاں تک وہ مطبوعہ نسخے
لے اور عمادی صاحب اوّل سے آخر تک لفظ بلفظ ایک ایک کتاب پڑھتے اور نقل و کتابت کی غلطیاں درست کرتے ۔ آسی صاحب کو کاپیاں
اور پروف دیکھنے میں بڑی مہارت تھی ۔ جیسے بچوں کو بچوں کے ساتھ قرآن پڑھایا جاتا ہے ۔ اسی طرح وہ کاپیاں اور پروف پڑھتے تھے ۔ یہ کام
انہوں نے اپنے ذمے رکھا ۔ کام کا دائرہ وسیع کر لیا اور حدیث و فقہ کے علاوہ معقولات کی بہت سی کتابیں اور درسیات کی تقریباً تمام کتابیں شائع

(بقیہ حاشیہ صفحہ) استاذ الاساتذہ کی عادت تھی کہ دوپہر کے وقت باہر نکلتے تو سر پہ چادر ڈال لیتے ۔ چادر ڈال کے مدرسے سے پیدل پا استاذ العلماء مولوی ہدایت اللہ خاں
رامپوری کے مکان پہنچے ، مولوی صاحب قیلولہ کرنے زنان خانے میں جا چکے تھے ۔ اطلاع ہوتے ہی باہر تشریف لائے اور اس شان سے جیسے مرید کی پیشوائی کی جو
انہی بزرگوں کا حصہ تھا ۔ اپنے بھتیجے کو بھیج کر کنوئیں سے تازہ پانی منگوایا اور خود اپنے ہاتھوں سے اپنے مہمان کے پاؤں دھوئے ۔ پاس لحاظ یہ تھی کہ ''استاذ حضرت
صاحب نے دھوپ میں کرم فرمایا'' ؟ اپنے ہم مرتبہ لوگوں کے ساتھ ان بزرگوں کے یہ آداب تھے ۔

[1] عرب محمد طیب نوادرِ عالم سے ایک نادرہ تھے ، علوم کا بہتا دریا ، وطن مکہ تھا ، نہ جانے ہندوستان کس طرح آ گئے ، مولوی فضل حق خیر آبادی المتوفی
سنہ ۱۲۷۸ھ سے معقولات میں کمال حاصل کیا ۔ نقلی علوم میں صاحبِ دستگاہ تھے ، کتاب سے بے نیاز ، ان کا علم ان کے سینے میں تھا ، ادب میں اپنا جواب
نہ رکھتے تھے ، کلامِ جاہلیت پر اس قدر عبور تھا کہ گھنٹوں تصیدے پر قصیدے مسلسل سنے جایئے ، پڑھنے کے انداز سے شعری تصویروں کی عکاسی کر دیتے
اور لہجے سے شعر کی خوبی نمایاں کر دیتے ، نکاتِ سخن بیان کرتے اور دلوں کو موہ لیتے ۔ حالی یا متنبی کا شعر سانے کی لہر آ جائے تو گھنٹوں ہر رنگ و ہم معنی شعر سنے
جایئے ۔ جس مجلس میں بیٹھ جاتے کسی کا چراغ نہ جلنے دیتے ۔ نواب کلب علی خاں کی مجلس کے میل ہزار داستان تھے ، چند ہزار میں خلق ، اغالب ان کی صحبت
ناز برداریاں کرتے ۔ مذہب میں پانی تھے ، جس رنگ کے گلاس میں چاہو ڈال دو ، مگر بنے تھے اسلام کے دائرے کے اندر ۔ مدتوں مدرسہ عالیہ کے صدر مہتمم
رہے اور طلبہ کے وظیفے بڑی فراخ حوصلگی سے ہضم کئے ۔ خدا کی رحمتیں ہوں اس مرد آزاد بے باک پر ۔

[illegible] نامی رسالہ " کا نام دیا تھا۔ عمادی صاحب کی سمت مباحث کی شکایت کہا جاتا تھا۔ عمادی صاحب کہتے تھے کہ اس کا سبب [illegible] کی تصحیح نے نکالی اور پھر کئی [illegible] پیدا کردی اور خود پڑھنے کی وجہ سے مباحث ذہن نشین ہو گئے اور پھر ان کتابوں [illegible] کے مباحث سامنے آ گئے۔

تصحیح کا بار جب ہلکا ہوا تو آسی صاحب نے پہلے " الریاض " نام ایک عربی ماہنامہ جاری کیا۔ پھر عبدالعالی صاحب کے اہتمام سے [illegible] جاری ہوا۔ یہ دونوں رسالے عمادی صاحب کی ادارت پر نکلے تھے۔ جب ناظم رہے تھے اس وقت سے عربی انشاء کا شوق پیدا ہوا تھا تصحیح کے کام سے جب فرصت پاتے عربی جرائد کو مضامین بھیجے رہتے تھے۔ آسی صاحب نے مناسب سمجھا کہ یہ ابر کرم جو باہر برستا ہے گھر میں کیوں نہ برسے۔

عمادی صاحب کے فضل و کمال سے سب سے آخر میں دارالترجمہ اور حیدرآباد کے دوسرے علمی اداروں کو استفادے کا شرف حاصل ہوا۔ اعلیٰ حضرت حضور نظام نے (خدا ان کو اپنی حفظ و امان میں رکھے) اس قدرشناسی کے ساتھ تقرر فرمایا تھا کہ ایسے علم و فضل والے علماء خال خال نظر آتے ہیں ... مشرقی شعبے میں اس پایہ کے فاضل شخص کا موجود ہونا مشرقی شعبے کا بڑا شرف ہوگا۔ دارالترجمہ کو یہ بڑا شرف " تقریباً " بائیس سال حاصل رہا۔ اس مدت میں وہ کبھی کچھ رہے: مترجم،[1] ناظر مذہبی، علمی مبصر، واضع اصطلاحات۔ عمادی صاحب کو عربی فارسی کی قدیم و جدید لغات و مصطلحات پر بڑا عبور تھا۔ اس لئے وہ اس شعبے کی مجلس مصطلحات کے مستقل رکن تھے اور ان کو ارکان مجلس میں بڑا اعتبار و احترام حاصل تھا۔ بااین ہمہ علمی رہنمائی سے ایک قدم آگے نہیں بڑھتے تھے۔ اصطلاح وضع کرنے میں مدد دیتے اور اس بات سے غرض نہ رکھتے کہ ان کی مدد و رہنمائی قبول کی گئی ہے یا نہیں۔ وہ اپنی شخصیت کا بوجھ لادنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔

دائرۃ المعارف اور کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد کے دو عظیم ترین بین الاقوامی شہرت کے ادارے ہیں۔ عمادی صاحب ان دونوں کے رکن رکین تھے۔ دائرۃ المعارف نے تاریخ اور فلسفے کے علاوہ ہیئت و ہندسہ وغیرہ علوم کی متعدد کتابیں پہلی بار شائع کر کے مشرق شناسوں کا شکریہ حاصل کیا ہے۔ اس قسم کی تمام کتابوں کی تصحیح و تہذیب کے نگران اعلیٰ عمادی صاحب مقرر کئے جاتے تھے۔[2] کتب خانہ آصفیہ کی مجلس مخطوطات میں وہ علمی

---

[1] مترجم کی حیثیت سے عمادی صاحب کے قلم سے حسب ذیل کتابیں نکلیں:۔
(۱) مؤرخ مسعودی کی تنبیہ و اشراف " اور " مروج الذہب " (۲) مؤرخ طبری کی تاریخ الرسل والملوک کی آخری دو جلدیں۔
(۳) طبقات ابن سعد کی بارہ جلدیں۔ (۴) ابن حزم کی الملل والنحل ـــــ یہ آخر الذکر کتاب تفسیر و حدیث علم کلام و فلسفہ اور مذاہب کی معلومات کا ایک عجیب مجموعہ ہے۔

[2] پانچویں صدی ہجری کے مشہور فلسفی طبیعی و ریاضیاتی مصنف ابن الہیثم کے حسب ذیل رسائل:۔
(۱) رسالۃ الضوء
(۲) رسالۃ المرایا المحرقہ بالقطوع
(۳) رسالۃ المرایا المحرقۃ بالدائرۃ
(۴) رسالۃ المکان
(۵) رسالۃ شکل بنی موسیٰ
(۶) رسالۃ المساحت
(۷) رسالۃ ضوء القمر۔
محدث ابن جوزی کی مشہور تاریخی اور سیرتی خاکوں کا نوشتہ المنتظم فی التاریخ وغیرہ۔

لوگوں نے سند سمجھے۔ کتاب کسی مصنف کی ہو، اس کی عبارت جانچنے پرکھنے کی صلاحیت تیز تھی۔ لیکن ... نسبت کیا ہو؟ اس میں مدد لینے سے، اور اس سے ہمارا ہی نہ سکتے تھے جب تک زندگی بھر زندہ رہے کہ اپنے فرائض پورے ہوں، صلاحیت جانچنے ہی پر تکیہ ہو جاتا۔ یک ور لوگ اور علم کے میدان کی شخصیت کی ایک بنیادی حیثیت تھی۔

حیدرآباد سے عمادی صاحب کے تعارف کا ذریعہ ظفر علی خاں صاحب[1] تھے —— یہاں حیدرآباد سے مراد موجودہ حیدرآباد کی سلطنت کا علاقہ جس سے حیدرآباد، حیدرآباد تھا —— اور اپنے دینی و دنیاوی ... کچھ اس شان سے تقریب کی کہ پہنچ گئے وہ سے کار کے ذریعہ علمی محفل اور درباری لباس برطرف کر دیا۔ پہنچتے ہی بار یاب کیا اور مشرقی شعبے اور ان کی ملکیت کا شرف بخشا۔ پہلی ملاقات میں بہ رغبات کا نقش تھا گہرا ہوا کہ عمادی صاحب خاص امتیازوں کے مورد ہو گئے، ایسے امتیاز جن میں وہ یکسر منفرد تھے۔ بندگان عالی جو مسلم ممالک میں علم و ادب کو فروغ سے پیش کی جاتیں، اور بڑے بڑے مصنف اپنی جو کتابیں نوازش و سرپرستی کی غرض سے پیش کرتے، ان کی قدر و قیمت جانچنے کے لیے ایک ہی مستند پیمانہ تھا: عمادی صاحب۔ یہی صلاحیت تھی، پروانہ رات "بلا رسے عمارس" و "بلا رسے حاضر" مخاطب کئے جاتے۔ شاہی خاندانی کتب خانہ اور آصف جاہی ریکارڈ آفس کے دروازے ان پر کھول دیئے اور اس کی تاریخ مراد ہے (جسے دیکھنے کا اتفاق عمادی صاحب کے سوا کسی کا نہیں ہوا)، خود اپنے لیے ہندوستان کی سیاسی تاریخ لکھوائی اور سب سے زیادہ یہ کہ اپنے اطمینان اور اپنی تلاوت میں استفادہ کے لیے قرآن کے اردو و انگریزی ترجموں کی نسبت توثیق چاہی کہ دیکھ کر بتاؤ ان میں کون سا ترجمہ مستند ہے، اور اگر اس میں غلطیاں ہوں تو حاشیہ پر اصلاح کر دو۔ کس قدر جزا کی بات ہے اور غالباً امتیاز کی یہ امتیاز اور منفرد امتیاز! لیکن عمادی صاحب کا جو ہر ذات اس قدر غالب اور ان کا ایقان کہ یہ سارے امتیازات چپکے ہی پر دہ بلندی کی لیے ہوئے تھے!

عمادی صاحب نے بطور "تحدیث نعمت" بھی ان باتوں کے ذکر سے اپنی زبان کبھی آلودہ نہیں کی۔ وہ جو شعر کی ایک کہاوت ہے: نیکی کر دریا میں ڈال، بالکل اسی طرح انہوں نے یہ سارے کام کئے اور ان کے ذکر اذکار خاموشی کے کنوئیں میں ڈال دیئے۔ اس حسنِ نیت کو کمال ہی سمجھا ہوگا کہ وہ بھی ان کاموں سے بے خبر رہے جو ان سے قریب تر تھے۔

یہ ان کے گہرے علم کا گمبھیرا پن تھا۔ انا احساس ذات ہے، یہ احساس جس قدر واضح اور مستقیم اور علم و نظر سے متوازن ہوتا ہے اسی قدر گمبھیر ہوتا ہے، اور جس قدر گمبھیر ہوتا ہے اسی قدر ہوش مند شخصیت تشکیل پاتی ہے —— لیکن ایغو جس نفسی کیفیت کا اظہار ہے وہ مستقیم اور متوازن احساس ذات نہیں، انا کی پرستی ہے —— عمادی صاحب کو احساس تھا کہ وہ علم و نظر سے بہرہ مند ہیں، اس میں ایک خاص کمال اور

---

[1] ظفر علی صاحب کو اعلیٰ حضرت آصف سابع اپنے زمانۂ شہزادگی سے جانتے تھے اور اسی جانے کی وجہ سے ملک بدر کئے گئے تھے۔ واقعہ یہ تھا کہ اعلیٰ حضرت آصف سادس (میر محبوب علی خاں) کے حکم سے تمام سیکرٹری شہزادہ ولی عہد کو مملکت کا کام سکھلانے جاتے تھے، ظفر علی خاں صاحب اس زمانے میں ہوم سیکرٹری عزیز مرزا صاحب کے اسسٹنٹ اور پیش کار تھے، کاغذات پیش کرنے ہمیشہ یہی ان کے ساتھ جاتے۔ عزیز مرزا صاحب تمام سیکرٹریوں میں سب سے زیادہ لائق فائق، اسباب اور کام میں زود رو برق تھے، ولی عہد کی نگاہ میں بہت عزیز ہو گئے۔ دوسرے سیکرٹریوں کو ان کی فوقیت گراں گزری، ان لوگوں نے یہ سازش گھڑی کہ عزیز مرزا ولی عہد کو برسر اقتدار لانے کی سازش کر رہے ہیں۔ اس پاداش میں عزیز مرزا صاحب اعمال کے سمیت ظفر علی خاں صاحب ملک بدر کر دیئے گئے۔ اعلیٰ حضرت آصف سابع نے یہ بات یاد رکھی اور جب ظفر علی خاں صاحب کرم آباد کی قید محض سے نکلے اور اسی کے لگ بھگ زمانے میں عثمانیہ یونیورسٹی کی نصابی کتابوں کے لئے سررشتۂ تالیف و ترجمہ قائم ہوا، تو ظفر علی خاں صاحب کو حیدرآباد بلوایا اور اپنے خاص فرمان سے مغربی شعبے کا رکن مقرر فرما دیا۔

حقیقت یہ ہے اس احساس اور قلندری[1] مشرب بزرگوں کے فیض تربیت سے ان کی پرکشش منفرد اور پہلو دار شخصیت کی تعمیر ہوئی۔

ان کی شخصیت میں اس قدر اعلیٰ انسانی خوبیاں تھیں جو کسی ایک شخص میں کہیں نظر نہیں آسکتیں، وہ خلق مجسم تھے [illegible] میں اور مسیحوں میں، بڑے بڑے سے بڑے اعلیٰ مرکز میں، شاید کا ذکر ہی کیا، نفرت اور تحقیر کا جو جذبہ ہم [illegible] کی بھی برداشت کرتے، اپنے چھوٹوں کے ساتھ اس طرح پیش آتے گویا وہ خود ہر حیثیت میں ان سے چھوٹے ہیں۔ [illegible] نہیں تھی کہ اس بات کا خفیف سا بھی احساس نہ ہونے دیتے کہ وہ اپنے آپ کو کچھ سمجھتے ہیں۔ نیکی اور دستگیری کا جو سلسلہ ایک مرتبہ شروع کیا مرتے دم تک قائم رکھا۔ ان کی تنخواہ میں دستگیری کی ایک مستقل رقم تھی۔ معمولی نہیں جو سرسری طور پر [illegible] کی مستقل مد۔ خود ان کا اپنا [illegible] اور ذاتی مصارف بمشکل پانچ فی صد تھا اور دستگیری کا بیس فی صد۔ دستگیری اس شان سے کرتے [illegible] مرید باخلاص اپنے پیر و مرشد کو اور سعادت مند شاگرد اپنے استاد کو نذر پیش کرتا ہے۔ عید ہی کے موقع پر دفتر کے چپراسیوں کا گروہ عید کے سلام کو آتا، تو اگرچہ وہاں کا عام دستور یہ تھا کہ چپراسیوں کا سلام دیکھ لیا اور انعام دلوا دیا۔ لیکن عادل صاحب ان سب سے مصافحہ کرتے، [illegible] داشت سے ان کو بٹھاتے، خود ہر ایک کو عطر پان پیش کرتے اور عید کا انعام بے شک اسی طرح پیش کرتے جس طرح اعلیٰ حضرت کو نذر پیش کی جاتی تھی۔ عید اور عید گاہ میرے لئے رسم سے خارج رہی ہے، لیکن عادل صاحب کی خدمت میں حاضر ہونا مقدم تھا۔ ان کی جھنیاں دیکھ کر میری پستیاں پانی پانی ہو جاتی تھیں۔ اور پھر پوچھئے تو اپنی پستی کا یہ احساس انہی کی بلند انسانیت کا ادنیٰ فیض تھا۔ شروع میں ایک دفعہ میں نے اس طریقے پر حیرت سے کچھ کہا، فرمانے لگے: جب عادل اعلیٰ حضرت کی جناب میں اس طرح عیدی نذر پیش کرتا ہے تو یہ لوگ جو بہ اعتبار [illegible] ہیں۔ عادل کی نگاہ میں سب اس سے اعلیٰ اور اس کے مخدوم ہیں اور وہ سب کا ادنیٰ ترین خادم ہے۔ ان کے لہجے میں جو پر انسانیت کا خلوص اور گداز تھا۔ اس وقت بھی جب میں یہ لکھ رہا ہوں، وہ دھیمی اور گہری آواز میرے دل میں پیوست ہوئی جا رہی ہے۔

نوکروں کے ساتھ برادرانہ برتاؤ تھا۔ نوکر صرف رہتے تھے، لیکن ان کا سارا گھر ان کے دسترخوان میں برابر کا حصہ دار تھا، بلکہ ان کے [illegible] جو خود کھاتے وہی ان کو کھلاتے۔ لذتِ کام و دہن سے زیادہ ان کو دسترخوان کی وسعت محبوب تھی۔ نوکر بیماری میں ان کا [illegible] علاج معالجہ کرتے اور ان کے بچوں کو اپنے بچوں کی طرح سمجھتے۔

عزیزوں کے ساتھ بہت الفت تھی۔ وطن جب جاتے عزیزوں دوستوں کے لئے سوغاتیں لے جاتے، بچوں کو نقدی دیتے۔ خاندان کے متعدد بچوں کو ان کے رجحان کے مطابق پڑھایا۔ ایک بھتیجے کو ادب کا اور ان کے صاحبزادے کو سائنس کا شوق تھا اور ان کو [illegible] ایک ساتھ ہی گھر میں پڑھایا۔

حیدرآباد کی جاہ نما معاشرت کا ان پر اتنا ہی اثر نہ تھا جتنی کانٹے پر اوس ہوتی ہے۔ نوجوانی کی طالب علمانہ سادگی جو ہمیشہ سے ان کا شعار تھی، حالات کے تغیر سے اس میں سرمو فرق نہ آیا۔ ان کے ایک بہت پرانے ہم وطن دوست کہتے تھے کہ میں نے وطن میں زندگی کی جو کش مکش دیکھی تھی

---

[1] قلندری طریق کا تعلق ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں شیخ خضر رومی ہندوستان آئے، پدینہ سال تھے، صاحب فضل اور اپنے کام میں صاحب کمال تھے، "بر کش ریک نگاہ ہے"۔ ان کا طریق کار تھا، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے ملے، متمتع کیا اور متمتع ہوئے۔ وہ خود تو وطن کی اس تازہ نظر سے ان حالات کو بہرہ مند کرنے واپس چلے گئے جہاں سے آئے تھے، لیکن یہاں بھی ان سے ایک مستقل طریق [illegible] شائع ہوا، [illegible] سرحلقہ تھے اور طریقہ چشتیہ میں بھی اس طرز تفکر کا پیوند لگا۔ چنانچہ [illegible] تمام اصحاب طریق متمتع ہوئے۔ عادل صاحب کے [illegible] کے حلقے سے متعلق [illegible] طبیعت نفس ہے۔ [illegible] شیخ محدث نے اخبار الاخیار میں خضر رومی کا مختصر ترجمہ لکھا ہے۔

رہتے تو اس کو مفید مشاغل میں لگے رہنے سے سرور حاصل ہوتا ہے، تنہائی اور بیکاری میں نہیں ـــــ اسلامی طلبا کی مدد و اعانت کا عمل
ہم کے واقعات ملتے ہیں۔

اکثر بہت کم باتیں کرتے، جو کچھ بھی کہتے اس کی تہ میں کوئی نہ کوئی تہذیبی ضابطہ اور انتہائی پاکیزگی مزاج نہیں کرتی تھی۔ ذہنی اور اصلاحی گفتگو میں صحبت بہت کچھ دیا اور بہت کچھ لیا۔ ذہنیت نے ان کے اچھے محققوں سے اونچے نہیں، اتنے ہی بیچ کا ہونا ہے سے رہے۔ پرہیزگاری اس قسم کے نیکی کی بہت گراں گزرتی تھی۔ سبا اور صحت سے کبھی کنارہ کش نہ ہوئے۔ جو لباس صرف پہنتے تھے کوئی مجلس ہو اسی لباس میں جاتے۔ جمعہ وغیرہ کا جدا لباس کبھی وا نہیں رکھا۔

لباس کی طرح تعلقات میں بھی بہت وضع دار تھے۔ جس سے جو تعلق تھا حاضر و غائب یکساں تھا۔ جو رشتہ پڑ گیا زندگی بھر قائم رہا۔ ترجیح چاہے کسی کی ہو کسی قسم کی ہو، اس سے انہیں سخت اذیت ہوتی تھی۔ بدگوئی، دل آزاری، طنز و استہزاء، اپنی ذات کے متعلق ذکر اذکار کے مذہب میں گناہ تھے۔ آپ بیتی گفتگو میں اسی حد تک آتی جتنی کہ مفید و سبق آموز ہوتی۔ حوصلہ افزائی ان کی خصوصیت تھی۔ جس میں ذرا بھی قابلیت پاتے اس کے لئے سراپا شفقت بن جاتے۔ کم استعداد والوں کے کام اپنے مقام سے نہیں، ان کے مقام سے دیکھتے اور حوصلہ بڑھاتے۔ بحث و تکرار سے پرہیز کرتے تھے۔ لیکن بعد تعلق کوئی ازکمی ہی بات چھیڑ کے ذہنی ورزش کا لطف لیتے اور لطف اندوز کرتے۔ شعر و ادب اور فقہ مسائل، ادبی لطائف و ظرائف، ان کے کشکول میں بہت تھے۔ انسان خواہ کسی درجے کا ہو، ان کی باتوں سے محظوظ ہوتا تھا۔ جس مسئلے پر گفتگو کرتے کمال خوبیاں نظر آتیں۔ عربی فارسی اور تینوں زبانوں کے ہزاروں شعر، چٹکلے و ہزل ہر قسم کے ان کے خزانۂ دماغ میں محفوظ تھے، سنانے سے محظوظ کرتے۔ مطالعے کے تنوع نے ان کی طبیعت کو گلزار بنا دیا تھا۔ ادبی، تاریخی اور فقہی لطیفوں کی پھلجھڑیاں چھوڑتے، خوش وقت کرتے اور خوش وقت ہوتے۔ منہ بند کرکے اس طرح ہنستے کہ سارا جسم ہل جاتا۔ شاید مقامی مصنف کی طرح ہنسنے کا عادی ہو، یہی ہنسنے کی اصل مرحوم مولوی ابوبکر شیث کی بھی تھی، دونوں "جمال پوری" تھے۔ ممکن ہے ہنسنے کا یہ سانچا جمال پور کی قدیم شائستگی نے ڈھالا ہو۔

تردید کے انداز میں تعبیر کرنا اور غلطی کی اصلاح "غلط ہے" کہہ کے نہ کرنا ان کی مستقل عادت تھی۔ اور یہی مستقل عادت تھی کہ جو لوگ بننے کے شوقین ہوتے بڑی نکتہ آفرینی سے ان کی تشکیک فرمایا کرتے۔ ایک صاحب کو علامہ بننے کا سودا ہوا، خوب علامات کی، وہ حضرت علامہ ہو گئے اور اس سند پر کہ عمادی صاحب نے علامہ لکھ دیا ہے، علامہ کو اپنا قانونی حق سمجھ لیا اور عمادی صاحب نے طرح طرح سے لکھ دیا کہ جامع العلوم کتاب کو مقدمہ کہتے ہیں اور جامع العلوم شخص کو علامہ، میرے دوست بلاشبہ علامہ ہیں اور ایسے علامہ کم ہوتے ہیں۔ تعریف کے لئے لطیف ضروری ہے اور یہ خفیف لطیف کا کرشمہ تھا۔ تھوڑے علم و لوگ جتائے۔ عمادی صاحب نے کہا: میرا آپ کا اس میں حرج کیا ہوا، وہ خوب علامہ بننے کی کوشش میں کچھ بن ہی جائے گا، مجھ سے کام نہیں۔ میرا تو یہ مسلک ہے ـ

ہمیں تو شیخ و برہمن سبھی کی سُستی لینی   یہ کیسی وکالت نہ تو لیں پکار ندائے

کسی بات کو وہ غلط جانتے ہوں، مگر اس کی علامات میں بھی دریغ نہ تھا۔ کیا خوب اس طرح کہتے کہ یہ اپنی جگہ سلطنت وہ اپنی جگہ خوش۔

اور یہی علامات تھی کہ قانون کے مترجم مسعود علی صاحب محوی نے عربی ادب پڑھنے کی خواہش کی اور استاد صاحب شاگرد کو اس کے گھر میں جاکے پڑھانے لگے۔ محوی صاحب علیگڑھ کے پرانے فارغ التحصیل اور علامہ شبلی کے شاگرد تھے، عربی میں نمایاں استعداد کا علامہ شبلی سے وثیقہ دیا تھا، سستی زیادہ ہو چکے تھے، جوش صاحب نے خیال کیا کہ شاید وہ سابقہ سستی کے غرور کی وجہ سے خود پڑھنے نہیں آتے، اور عمادی صاحب کو بھیج ڈالا۔ خوب بستے، خوب برسے، اچھے برسے، اتنے ہی وہ نہال ہوئے، اکھڑی تھی تو بڑے غیرت سے ہوئے، اچھے ہی بولے۔ اور کے آنے سے مجھے کچھ تنگ نہیں لگ جائے گا۔ یہ بات تو قابل قدر ہے کہ انہیں اس عمر میں بھی پڑھنے کا شوق ہے آپ پڑھئے عمادی آپ کی جگہ

پوچھا: ابن عربی صاحب کے اس شعر میں غزالی صاحب نے بیان کیا تھا، [illegible] ملاحظہ کیا ہے، [illegible]
ذکر کیا میں ابن عربی کا فلسفہ سمجھنا چاہتا ہوں، کوئی ایسا آدمی بتاؤ جو مجھے ابن عربی کی نحوی اور فتوحات کے مباحث اور فلسفہ سمجھا دے میں
اپنے مقصد کو پورا کیا اور یہ حضرت خود جا کے پڑھانے لگے" حمیدی صاحب نے زیر شناسی اور رسم پابندی امتحان جاری ہے

میں نے ایک مرتبہ تاریخ ابن خلدون کے فارسی ترجمے کا قصہ پوچھا، بہت سادگی سے اتنا کہا: "چونکہ یہ کام خوش اسلوبی سے انجام نہ پاسکے تھے وہ بیشتر ہو چکے تھے، مولوی شبلی سید صاحب کے زیر ہدایت وقت کے ضروری مباحث پر لکھنے اور تحقیق و مطالعہ میں مشغول تھے" اور قصہ گویا تمام کر دیا۔

مولوی سید سلیمان صاحب کو بہت ملال تھا کہ" ان کے مضامین ابوالکلام کے نام سے شائع ہو گئے" ایک دن دارالمصنفین کی کسی کتاب کے سلسلے میں عمادی صاحب کے پاس دفتر تشریف لائے، یہ قصہ لازم گفتگو سے تھا، فرمایا: یاد ہو گا مولانا آپ کو، وہ میرا 'کان پور' کی مسجد والا مضمون اور ابوالکلام صاحب کا برہمی کا خط! اسی مضمون سے شہرت ملی اور اسی مضمون پر لکھنے والے کو غیظ و غضب سے نوازا ——— اور میں نے دیکھا، آپ کے وہ مضامین بھی اپنی مملوکات ارثی میں شامل کر لئے جو آپ وہاں چھوڑ آئے تھے . . . . ." اور ان مضامین کی خوب ستائش فرمائی۔ عمادی صاحب نے کہا: چھوڑیئے جناب مولانا (یہ عمادی صاحب کا خاص انداز تخاطب تھا) ان باتوں کو، اب وہ مضامین نہ مولانا ابوالکلام ہی کے لئے کوئی حیثیت رکھتے ہیں نہ آپ ہی کے لئے۔ یاد کے قابل تو وہ صحبتیں ہیں جو مولانا ابوالکلام کے ساتھ گزر گئیں۔ پھر وہ لطف صحبت حاصل نہ ہوا۔" سید سلیمان صاحب کو یہ بات خوش نہ آئی۔ بڑی حد تک گرفتگی سے عمادی صاحب کی صورت تکنے لگے۔ میرے لئے یہ بہت دلچسپ مطالعہ تھا۔

ان کا ذہنی وجدان 'علیّۃ' عقل تھا، اور وجدان الفاظ کا زندانی نہیں ہوتا۔ وہ اپنے افکار و معتقدات میں بے حد راسخ تھے اور دوسرے کو اپنے معتقدات پر رسوخ کی پوری آزادی دیتے اور تصادم سے پرہیز کرتے تھے۔ ان کے ملنے والوں میں غالی شیعہ بھی تھے، راسخ اسماعیلی بھی، اور ایسے بے فکرے بھی جو انگریزوں کی زبان میں گفتگو کیا کرتے، اور یہ سب ان کی صحبت سے یکساں فرحت و انبساط حاصل کرتے۔ ایک غالی شیعہ دوست نے پوچھا: مولانا! اسلام نے موسیقی کی سرپرستی کیوں نہیں کی؟ بولے: آپ جس کو موسیقی سمجھتے ہیں اس کی سرپرستی اسلام نے اس وجہ سے نہیں کی کہ وہ طبلچی اور سارنگیئے پیدا کرنے نہیں چاہتا خیبر شکن حیدر کرار پیدا کرنا چاہتا ہے"۔ کم ان کے نزدیک لغت اور اصطلاح معانی الفاظ سے، عقل سے بغاوت ہے اور استدلال ایمان کی مستحکم بنیاد فراہم کرتا ہے۔ مولوی معنوی نے استدلال کو پائے چوبیں کہا ہے، وہ پلکے آہنیں کہتے ہیں۔ مولوی کے شعر کو انہوں نے یوں بدلا ہے:

پائے استدلالیاں چوبیں بود | پلئے روئیں باہمہ تمکیں بود
بلکہ استدلال کار دین ماست | فخر رازی راز دار دین ماست

اور یہ استدلالی طریق، دینی اور علمی امور میں، ان کا اصول کار تھا۔

وہ اپنی تسکین خاطر کے لئے جب کسی مسئلے کی تحقیق کے درپے ہو جاتے، تو دن رات اسی دھن میں لگے رہتے اور تحقیق کے پھل سے، خواہ ان کی خواہش کے مطابق ہو یا خلاف، شاد و شاد ہوتے۔ ان کا مدعا صرف تحقیق ہوتا تھا، وہ اپنی خواہش اور نقطۂ نظر کو محور نہیں بناتے تھے۔

تاریخی مطالعے میں ان کا طریقہ عام روش سے جدا تھا۔ وہ واقعاتی تاریخوں سے صرف ذہین کا کام لیتے تھے اور حرارت گری کے لئے تذکرہ و تراجم و رقعات و محاضرات (کشکول کتابوں) اور دوسرے مآخذ سے واقعات کو رونما کرنے والے ریشوں کا کھوج لگاتے۔ اس کے لئے وہ قصوں اور کہانیوں اور قصیدوں کا بھی مطالعہ کرتے تھے۔ ہندوستان کی تاریخ کے سلسلے میں انہوں نے شاہی فرمانوں، جاگیری وثیقوں اور

نے رقت بھری کا فیصلہ نہیں کیا مختلف انتخابات اور رسمی طور پر کاری مدد سے معاشی نظر سے عذر کی جا سکتی ہوئی مگر کتابوں اور نے
ورنیوں کے ساتھ وقت کی رعایت۔

جاہلی والی سے سوں کی بہت بہ سے حق گفتہ بحث کر دہ بہت نا معتبر ہے۔ اس نے تاریخ اور ان کو ایک نیا سلسلہ پیدا
کیا اس کے نو سے معاشرے کی کثرت ہنگامے میں بڑے دو قرنوں سے متصف ہوئی وہ مورخ کی بجائے ایک باقاعدہ نقاش ہے اور اس
نقاشی اس ماحول کا وہ آب ورنگ تیار کرتی ہے۔ یہ رو کے تاریخی مطالعے کا انداز نظر ہے۔

ابن خلدون کے دو نظریے: عربوں کی بدویت کے نظریے اور عوام و دواب کی ہر ایک کی پستی کے حوالے سے سخت اختلاف تھا کیونکہ
مستشرقین نے زیادہ تر ان دو نظریوں کی وجہ سے ابن خلدون کی ستائش کی ہے۔ ان کی تحقیق نے یہ ہے کہ ابن خلدون نے دونوں نظریے
ان کی تاریخ عرب قدیم اور مسالک عرب ابن خلدون کے نظریہ بدویت کی ترجمانی کی ہیں۔ انہوں نے متعدد مسائل کے ساتھ تمدن کے عروج پر پیش کیا۔

متعدد ہو یا ترجمہ ہر شے قلم سے لکھتے اور کسی پیراگراف سے ہی شاذ و نادر کوئی لفظ قلم زد ہوتا۔ مدت سے خود لکھا چھپتا تھا اور جب
ہوا ہے۔ ترجمہ لکھوانے کا ڈھنگ اکثر دلچسپ ہوتا تھا بیٹھتے سامنے کتاب ہوتی اور دیکھتے اور فقرے روانی سے بول دیتے۔ خوبی یہ ہوتی کہ
ترجمہ مستقل ہوتا۔ عربی عبارتوں کے لفظی ترجمے کی یہ شان تھی۔

والقمر الباهر والكواكب الزاهر والغمام
الماطر وما يلجئ من طائر وما اهتدى بعلمه
مسافر من منجد وغائر لقد سبق هاشم امية
الى المآثر اول منه وآخر ابو مهمة بذلك خابر
قضى لهاشم بعلية .

قسم ہے روشن چاند کی، چمکدار ستاروں کی، برسنے والی گھٹاؤں کی، اور
آسمان کی۔ قسم ہے اس پرندے کی جس سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں
نشیب و فراز میں چلنے والے مسافر، کہ ہاشم
امیہ سے بڑھ کے ہیں، آگے پیچھے ہر حال میں بڑھ چڑھ کے ہے
ابو مہمہ اس کا مخبر ہے اور یہی اس کا بیان ہے اس بات
کے ساتھ ہاشم کے غالب آنے کا فیصلہ کیا۔

لوگوں کی خدمت طرح طرح سے کرتے، ایک صاحب کے پاس قدیم قلمی کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا چاہتے تھے کہ آصفیہ کتب خانے میں بکے
دام مل جائے۔ ان سے کہا فہرست بنائیے ہر کتاب پر مختصر سا تعارف لکھیے کہ اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو۔ تعارف لکھنے کا کام ان کے
بس کا نہ تھا۔ یہ کام اپنے ذمے لے لیا اور بار احسان سے یہ کہہ کے ان کو سبکدوش کر دیا کہ مجھے پڑھنے کو اچھی کتابیں مل جائیں گی۔ وہ ہر ہفتے
دس پانچ کتابیں لاتے اور تعارفی نوشتوں کے ساتھ اپنی کتابیں لے جاتے۔ مہینوں یہ سلسلہ جاری رہا۔ اتنی محنت کون کسی کے لیے اٹھاتا ہے۔ چند
نمونوں سے تعارف کی فنی خصوصیتوں کا اور ادبی شان کا اندازہ ہوگا:

کیمیائے اسلام: اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تکوین کیوں کی، نبات و معدن و جماد میں تدریجی تنزل کیا ہے، نقص خلقت کی کتنی گنجائش ہے،
عالمات کتنے ہیں اور ناقصات کس قدر ہیں، جوہر و عرض کی کیا نسبت ہے، جن اجسام کو بظاہر مشتبہ اور مغشوش محسوس کیا جاتا ہے کیا حقیقت میں
ان کے اندر مخلخل نہیں ہے کہ اعمال تصعید و تنزیل و تحلیل و ترکیب سے وہی جنس سافل مرتبہ عالی میں پہنچ سکے اور صنعت گری کے طفیل سب کو سونے
کو بہیرے میں تبدیل کر لیا جائے؟

کیمیائے اسلام کا یہی موضوع ہے جو تمام تر حقائق اشیاء کے علم حق اور حل صدق پر مبنی ہے۔

اسلام سے پیشتر کلدانی و مصری و یونانی قومیں جس میں مبتلا تھیں، مسلمان بھی ابتداءً اسی علم میں گرفتار ہوئے، خلافت سے محرومی کے بعد
خالد بن یزید اور ان کے رفقا کلدانی جابر بن حیان اپنی تحریروں میں پڑے رہے جو طغرائی کی تحقیق میں فن سے تعلق نہیں رکھتے، ایک شخص زیرک کی تصنیف

میں سرگرم ہے، تحریر میں اچھال سکتا ہے، یا یہ کہ کشش بے نتیجہ رہتی ہے، اس لئے کائنات وحدت وجود کے [illegible]
آشنا نہیں۔

مسلمان سائنس پہ کر رہے ہیں مرکس کی، مبرّا تھی کے زینے پہ چڑھ کے کیمیا کے بام حکمت پہ چڑھ گئے۔

یہ کتاب انہی حقائق پر حاوی ہے۔

وطنزائی نے اپنے تمام پیش رووں سے الگ ہو کے ابو بکر رازی کو اپنا معیار علیہ مانا ہے کہ اس علمی خلافت کے ——— فی زمرہ ——— وہی
مالی فاضل تھے:

رسالہ عرشی: فلسفۂ اسلام کے سب سے بڑے پیشوا الشیخ بوعلی سینا کی یہ کتاب عربی زبان میں تھی جس کا یہ فارسی ترجمہ عہد سلاطین کی یاد ہے۔ اسی عہد کی زبان ہے اور وہی انداز بیان ہے۔ کائنات کس طرح وجود میں آئی۔ نیستی سے ہستی کیسے ہوئی، معدوم سے موجود کیا جیسے نکلی؟ کوئی شے اسی وقت وجود میں آسکتی ہے جب اس کے لئے کوئی علت و سبب موجود ہو۔ یہ علت اس شے پر مقدم ہوتی ہے، وجود علت سے نکلا تو کیوں کر نکلا۔ علتِ وجود کو وجود سے پہلے موجود ہونا چاہئے حالاں کہ وجود سے پہلے آپ عدم کے قائل ہیں۔ یہ مباحث نمونۂ کتاب ہیں۔ ان میں غور کرنے والے پر طبیعیین و دہریین کے مذہب کا فساد خود بخود واضح ہو جائے گا۔ اور ماننا پڑے گا کہ عدم اور وجود سے الگ ایک واجب الوجود بھی ہے، تعالیٰ شانہٗ کہ وہی اس کائنات کا سبب بھی ہے اور مسبب بھی۔

رسالۂ طیر: یہ بھی شیخ کی عربی تصنیف کا فارسی ترجمہ ہے جو سلجوقیوں کے عہد میں ہوا تھا۔ اس میں انسان کی تخلیق سے بحث کی ہے کہ ایک نوع کے ہوتے ہوئے ان میں گوناگوں اختلاف کیوں ہے؟ اختلاف کی نہایت نازک علمی تحلیل کر کے دکھایا ہے کہ ہر انسان میں ترقی کی استعداد موجود ہے۔ یہ استعداد بالقوہ ہے، ممارست سے اگر اس کو فعل میں لایا جائے تو کون سے مدارج ارتقا ہیں جن پر انسان فائز نہیں ہو سکتا۔

تحفۃ الحبیب: اصفہان کے خوش بیان سخنور و سخن سنج میرزا فخری کی یہ کتاب زبان آوری کی دنیا میں پرواز خیال کا ایک عجیب مرقع ہے مثلاً سعدی نے، کہ ملاحتِ کلام میں شور انگیزی پہلے پہل ان کے حصے میں آئی، ایک غزل لکھی۔ خسرو بھی اسی زمین کو شاداب کرتے ہیں اور مضامین بندی میں جیسے ان دونوں دو قدم گوئی کہتے تھے، ایک نئی شان دکھاتے ہیں۔ حسن اس کو روانی و سلاست کے قالب میں ڈھالتے ہیں۔ سلمان ساؤجی، خواجو کرمانی، عماد فقیہ کی شکر خائی اور حلاوت انگیز طبع آزمائی سے یہی زمین سخن شکرستان بن جاتی ہے۔ پھر حافظ آتے ہیں اور خداداد قبول خاطر سے اس زمین کو آسمان کے ہمدوش بنا دیتے ہیں۔ پھر وحشی، اہلی و کاتبی و نزاری و جامی اپنے اپنے طرز میں دلو کن دیتے ہیں۔

ایک ایک زمین میں مشاہیر شعرا کی طبع آزمائی کا یہ حیرت خیز نگار خانۂ معنی اہل نظر کے ذہنی شگفتگی کا انبار در انبار سامان رکھتا ہے۔ جس سے ادب فارسی میں عہد بعہد حسن تخیل و لطف ذوق و عروج فکر کی ایک ایسی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے کہ فارسی کی حد تک ایران و ہندوستان آج تک اس سے ناآشنا ہے!

اسی سلسلے میں دو مضمونوں کے اقتباس، ادب میں تاریخ اور تاریخ میں ادب کی شان دکھاتے ہیں۔

(۱) ساتویں صدی ہجری کے آخری ایام ہیں، 'بغداد' کا تمدن سیلاب تاتار کی نذر ہو چکا ہے، 'ہلاکو' کا جانشین 'اباقا' سریر آرائے سلطنت ہے۔ 'تبریز' جو 'زبیدہ خاتون' کی یادگار تھا، آج اس پر تاتاری لشکر کی چھاؤنی ہے۔ روم و عراق و ایران و توران و ماوراء النہر جتنے اسلامی ممالک تھے سب کے سب کفر کے نرغے میں آ چکے ہیں۔ مصر و شام کی ایک ہی بچائی اسلامی سلطنت رہ گئی ہے جہاں جا کر خلافت نے پناہ لی ہے، مگر اب اس پر بھی چڑھائی کے سامان ہو رہے ہیں۔ اسی ضرورت سے خود 'اباقا' 'تبریز' میں لشکر زن ہے، اور صاحب دیوان اعظم خواجہ شمس الدین محمد پر تاکید ہو رہی ہے کہ 'مغولستان' سے لے کر ایران تک کی تمام فوجیں یک جا کر لی جائیں [illegible]

[illegible]:

(۱) [illegible] کا پچاسواں سال ہے، [illegible] تسلیم [illegible] ہے [illegible] ایک [illegible] ہے، [illegible] ہے مرحوم [illegible] ہے، [illegible] کا آخر خاتمہ ہو چکا ہے [illegible] ہے۔ اس [illegible] کا ایک [illegible] اسباب کر بیٹھا دیتا ہے۔ اس کی نسبت ابو اسحاق ہے، [illegible] ہمیشہ [illegible] آل کو ب [illegible] اہل بیت میں اپنے تئیں شامل کرنا چاہتا ہے، [illegible] اس سے [illegible] ہیں اس کی کاٹ پھانس دیکھ چکے ہیں اب نہ جانے یہ کیا گل کھلائے یہ فتنہ کیا قیامت ڈھائے!!

اُسے دیں شعر کم کہتے تھے، عہدِ شباب کی ایک غزل ہے:

چشمِ پُر نم ہے [illegible] — گردشِ ساغرِ میکدہ سلام اے ساقی
صحبتِ جام کی جاں [illegible] عالم گیری — اب کہاں حلقۂ قربِ جم اے ساقی
شیشہ ہے منتظرِ جلوۂ خورشید زوال — کچھ ادھر کار نہیں ماہِ تمام اے ساقی
کعبۂ دل میں تجلّی کی [illegible] — لب تک آتا ہے پھر آشفتہ کلام اے ساقی
پردۂ صبح بنا گردشِ [illegible] — گیسوئے ہند جگر خوار کی شام اے ساقی
تیغ ابروئے [illegible] — دمِ شمشیر ہے [illegible] مقام اے ساقی

بے کلی رنگِ ثبات کا چلے بزم میں نہ
آج صاحبِ انتظارِ پیام اے ساقی

فارسی میں یوں طبع آزمائی کرتے ہیں:

جبین ز سجدۂ آستانگی [illegible] — ہزار سجدہ کند ور بر جبین زسد

جہانِ تو ز ہمتِ کوتاہ [illegible] — ہرگز در کرم بکام زہ بستہ اند

اہلِ بینش بر در آتشی [illegible] — ہر کہ در خود در آید در بزمش بجیم

عجب آن نیست کہ اعجازِ مسیحا داری — عجب این ست کہ بیمار تر بیمار زیست

فریبِ رنگ و نمودے گہر [illegible] — حباب وار خودی گہر بخشند
عجب مدار اگر مرغِ خانہ پرور را — نداد ہمتِ پرواز بال و پر بخشند
جہاں کشا کہ بہ جہلِ [illegible] — گلیمِ فقر بہ پابند و تاجِ زر بخشند

علم اور علامہ ہونا کوئی بڑی بات نہیں بڑی بات انسان ہونا ہے۔ علوی صاحب جتنے بڑے عالم اور مفکر تھے اس سے زیادہ اعلیٰ قسم کے انسان تھے۔ بلند حوصلہ، کریم النفس، دلکش صحبت اور دلنشین سیرت۔ ان کی زندگی شرافتِ علم اور شرافتِ نفس کے امتزاج کی نمود تھی۔

پنڈت برج نرائن چکبست

نجم الدین شکیب

چکبست کی وفات کو پورے تیس سال گزر چکے ہیں لیکن علمی و ادبی حلقوں میں وہ ابھی تک اس طرح یاد کئے جاتے ہیں جیسے ان کی موت کا حادثہ کل ہی کی بات ہو۔ وہ صرف یہی نہیں کہ جواں مرگ تھے بلکہ پنڈت اس دنیا سے گزر گئے جب ان کی قابلیت کی شہرت اپنے بھرپور شباب کو پہنچ چکی تھی۔ اگر موت کا بے درد ہاتھ اس جوہر گراں مایہ کو قوم کے ہاتھ سے چھین نہ لے جاتا تو ابھی ملک اور قوم کے نوجوانوں کو ان سے کسب فیض کا موقع حاصل ہوتا۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو اس سال ہم ان کی چوہترویں سالگرہ مناتے۔ اس عمر کے پختہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں لیکن پھر بھی چند سال اور ان سے استفادے کی آس باقی ہوتی۔ لیکن قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ ۱۲ فروری ۱۹۲۶ء کو جب شہرت اور شباب کے پھول ان پر نچھاور ہو رہے تھے وہ اچانک بیمار ہو کے پانچ چھ گھنٹے میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے ۔

لے چلی بزم سے کس وقت مجھے مرگِ شباب
اب تک آیا بھی نہیں ہاتھ میں پیمانہ ہے (چکبست)

چکبست کا آبائی وطن اودھ کی قدیم راجدھانی فیض آباد ہے لیکن وہ تعلیم و تربیت کے سلسلے میں لڑکپن ہی میں لکھنؤ چلے آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ ۱۹۰۵ء میں انہوں نے کیننگ کالج سے بی۔ اے پاس کیا اور ۱۹۰۸ء میں وکالت پاس کر کے قانون کے پیشے میں آ گئے تھوڑے ہی دنوں میں ان کا شمار لکھنؤ کے ممتاز وکیلوں میں ہونے لگا۔

وہ مشہور کشمیری برہمن خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ فارسی ادب سے لگاؤ ان کو ورثے میں ملا تھا۔ قدرت نے طبیعت موزوں عطا کی تھی گھر کا ماحول بھی شعر و ادب کی تخم ریزی اور آبیاری کے لئے موزوں تھا اس لئے نو برس کی عمر ہی سے مشقِ سخن کرنے لگے۔ ناسخ اور آتش غزل کی زمین کو آسماں بنا چکے تھے اس لئے شروع شروع میں چکبست نے بھی وقت کی اسی لے میں اپنے دل کی بات کہی۔ لیکن زمانہ بدل رہا تھا۔ اب دنیا کے غم اتنے بڑھ گئے تھے کہ صرف "حدیثِ ماتم دلبری" میں کوئی کشش نہیں محسوس ہوتی۔ ان کے خلوص نے جو ان کی سرشت میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا، ان کی فکر کے عمل کو زیادہ وسیع حلقے میں پھیلا دیا اور ان کے نغموں میں وہ غم بھی ڈھلنے لگے جو ابھی تک اردو شعر و ادب کے لئے تقریباً نئے تھے۔ کوئی شبہ نہیں

اقبال نے غنی ایک جہان تاں پیدا کی تھی کہ سب سے تحسین کی ہے، ہندوستان میں چکبست کی سب سے نمایاں خصوصیت ہی اک قوم پرستی تھی۔ چکبست خالص ہندوستانی قومیت کے جذبات کی عظمت سے متاثر تھے اور ان میں ایسے جذبے پیدا تھے جو ابھی تک کسی اور شاعر کے نصیب میں نہ تھے۔ نواب جعفر علی خان اثر کا یہ قول غلط نہیں کہ:

"صرف چکبست ہی وہ قومی شاعر ہے جس نے کل ہندوستان کے جذبات و ضروریات کی بلا امتیاز

تفریق مذہب ترجمانی کی ہے"

چکبست کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اردو فارسی کے علاوہ انہوں نے انگریزی ادب اور فلسفہ کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا۔ کل ہند بزرگ ان کے پسندیدہ قومی رہنما اور شاعر تھے۔ ان سے گو کہ بعض معاملات میں ان کے خیالات اور جذبات پر گہرا اثر تھا۔ وہ بڑے زبردست قوم پرست تھے لیکن ان کی قوم پرستی کا دامن تنگ نہیں تھا۔ وہ ہندوستانی تہذیب کے قدردان تھے لیکن قدیم کے پیچھے آنکھیں بند کر کے چلنا نہیں چاہتے تھے بلکہ تہذیب کی قدیم اور جدید قدروں کے امتزاج سے ایک نئی تہذیب و سماج کی بنیاد رکھنا چاہتے تھے۔ بقول پنڈت کشن پرشاد کول مرحوم چکبست کا عقیدہ تھا کہ:

"پرانی تہذیب میں جو کچھ بچ سکتا ہے پوری طرح سمیٹ لینا چاہئے لیکن نئی روشنی اور نئے تمدن

کے سامنے بھی آنکھیں بند نہیں کرنی چاہئیں۔ ہماری زندگی مشرق اور مغرب دونوں کی روشنی کا عکس ہونا چاہئے۔"

یہ صرف ان کا عقیدہ ہی نہیں تھا۔ انہوں نے زندگی بھر اس مقصد کے لئے جد و جہد بھی کی۔ انہوں نے اپنے ساتھ دوسروں سے بھی کام لیا اور تعلیمی اداروں میں شامل ہو کر بھی ابھرتی ہوئی نسل کو سنبھالنے اور راہ راست پر چلنے کی کوشش کی۔ جس سے ان کو بڑی دلچسپی تھی اور جس نے اب لکھنؤ یونیورسٹی کی شکل اختیار کر لی ہے، اس کے وہ طالب علم تھے۔ اس کے وہاں کے طلباء کا ان کے اوپر بہت اثر تھا۔ وہ طلبہ کے سچے رہنما اور مربی تھے۔ سب طرح طرح کے کالج جاتے، ملتے تھے، باتیں کرتے اور ان کا احترام کرتے اور اپنا سمجھتے۔

ملکی اور قومی معاملات میں ان کی تمام تر خالص ہندوستانی تھیں۔ وہ مذہباً ہندو تھے لیکن ان کا مسلک خالص ہندوستانی تھا۔ مذہب کی صداقت پر پوری طرح ایمان رکھنے کے باوجود وہ انسان تھے۔ ہر ہندوستانی ان کی آنکھ کا تارا تھا۔ ہندو مسلمان سب ان کے تھے۔ دیر و حرم سب ان کے عزیز تھے اور سب کے دکھ درد میں ایک سچے اور درد مند انسان کی طرح شریک ہوتے تھے۔ ان کا یہ شعر صرف شاعرانہ نہیں ہے بلکہ ان کے عمر بھر کے کردار کا آئینہ ہے جو وقت کے میدان میں اترتے وقت ان کی زبان پر آیا تھا۔

دردِ دل، پاسِ وفا، جذبۂ ایماں ہونا

آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا (چکبست)

ان کے سیاسی عقائد انتہا پسندانہ نہیں تھے۔ ہم ان کو اعتدال پسند کہہ سکتے ہیں۔ وہ ہندوستانیوں کی عظمت و برتری کا خواب دیکھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ

یہ آرزو ہے کہ مہر و وفا سے کام رہے

وطن کے باغ میں اپنا ہی انتظام رہے (چکبست)

لیکن بیرونی تسلط کے خلاف ان کا رویہ جارحانہ نہ تھا۔ انہوں نے پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء) میں انگریزی حکومت سے پوری طرح تعاون کیا۔ ان کی انتہائی تمنا بس یہی تھی کہ:

"ہم ہوں گے، عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا"

[illegible] ان کے مذہب نے کبھی تنگ نہیں پڑھے۔ زمانے کے حالات سنتے تھے پیکر پر چھٹے کانٹے الحمد للہ سے تو رہا [illegible]
خاموش ہے لیکن برت سنے تا وقت نہ دیا کہ ان کا خلوص ان کی بے چینیوں سے مل کر کسی واضح بغاوت کی شکل اختیار کر سکتا۔ لیکن پھر بھی [illegible]
منطقی جذبات کے اظہار نے میں جو حصہ لیا وہ بہت کم ادیبوں کے حصے میں آیا۔

چکبست تھے خوش وضع، منکسر، اور وضعدار دوست تھے۔ ان کا شباب کربائی وجاہت کی تصویر تھا۔ لکھنؤ کی تراش خراش اور نوک پلک نے
ان کی جامہ زیبی میں اور بھی چار چاند لگا دئے تھے۔ بہت سنجیدہ اور پرفکر آدمی تھے۔ باتیں کم کرتے تھے لیکن خشک مزاج نہ تھے۔ طبیعت میں مزاح
بہت تھا۔ کھلکھلا کر بہت کم ہنستے لیکن خندۂ زیر لب سے کبھی ان کا چہرہ عاری نہیں ہوا۔ دوستوں اور بے تکلفوں کی صحبت میں ان کی سنجیدگی کبھی بار نہیں
ہوئی بلکہ ان کی بذلہ سنجیوں نے روتوں کو ہنسایا اور مردہ دلوں کو زندگی کی رمق بخشی۔ پرانے زمانے کی تہذیب اور شائستگی سے ان کے [illegible]
نے جلا پائی تھی۔ ان سب پر مستزاد ان کا دل تھا جس کا گوشہ گوشہ انسانیت سے معمور تھا۔ وہ سراپا اخلاق تھے۔ لکھنوی تہذیب اور معاشرت کے
آب ورنگ نے اس میں اور بھی دلآویزی پیدا کر دی تھی۔ وہ اس وقت کے معاشرے کے تکلفات سے خالی نہ تھے لیکن ان تکلفات میں نقالی اور
ذہنی غلامی کا شائبہ نہ تھا بلکہ ان کے جمالیاتی ذوق نے صرف دل و نگاہ کی تسکین کے لئے رنگین نقاب ڈال رکھا تھا۔ وہ قدیم شرافت کا پتلا تھے اور جنہیں
غموں نے ان کے دل میں جو گداختگی پیدا کر دی تھی وہ اس روایتی شرافت میں روح بن کر ان کو سراپا انسان بنائے ہوئے تھی۔

چکبست ترقی پسند ادیب اور رفارمر تھے لیکن بے راہ روی سے کوسوں دور تھے۔ انہوں نے ترقی اور اصلاح کے میدان میں بھی میانہ روی کو
اپنا اصول بنایا۔ وہ تعلیم نسواں کے زبردست حامی تھے لیکن ان کی حمایت غیر مشروط نہ تھی۔ وہ زندگی کے ہر عمل کو اخلاق کی کسوٹی پر کستے تھے۔ تعلیم نسواں
بھی ان کے نزدیک ہندوستانی اخلاق کی روایات سے آزاد نہیں ہو سکتی تھی۔ ہندوستانی خاتون کا جذبۂ وفا، شرم، غیرت اور خاندان پروری یہ وہ جوہر
ہیں جن کو وہ زیورِ نسوانیت کے لئے ضروری جانتے تھے۔ وہ عورت کو صرف "چراغ خانہ" بنا کر نہیں رکھنا چاہتے تھے لیکن وہ اس کے "شمع انجمن"
بننے کے بھی حامی نہ تھے۔ ان کے نزدیک "عورت" اور اس کے فرائض کی بجا آوری عورت کا بڑا انسانی اور قومی فریضہ ہے جو تعلیم نسواں [illegible]
کی خاتون کر سکتی تھی۔ اپنی اولاد کی طرف سے مردوں کی بے اعتنائی دیکھ کر انہوں نے دخترانِ ہند کو متوجہ کیا تھا کہ

اپنے بچوں کی خبر قوم کے مردوں کو نہیں
یہ ہیں معصوم انہیں بھول نہ جانا ہرگز

مرحوم اودھ پنچ کا حلقہ چکبست کا خاص حلقہ تھا اور وہ تمام ادیب جو اس حلقے میں شامل تھے ان کے خاص دوست تھے لیکن اودھ پنچ کے لہجے
میں جو چھیڑ چھاڑ تھا اسے چکبست نے اپنی تحریروں میں اختیار نہیں کیا۔ ان کی فطرت جارحانہ نہیں تھی اس لئے وہ شدید اختلاف کے باوجود کسی
کا دل ہنسی مذاق میں بھی دکھا نہیں سکتے تھے۔

چکبست نے گلزار نسیم کو ایڈٹ کر کے ایک دیباچہ لکھا۔ عبدالحلیم شرر نے اس دیباچہ پر بڑی چوٹیں کیں۔ چکبست نے اس کا جواب لکھا اور
جواب الجواب بھی لیکن نفسِ استدلال کے باوجود کہیں تلخی نہیں آنے دی۔ ان کے اوپر بعض حلقوں سے کچھ غیر اصولی اور نامناسب حملے ہوئے لیکن انہوں
نے صبر اور ضبط کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ان کی تحریروں میں شروع سے آخر تک سچا تنقیدی وقار قائم رہا۔ جب گرما گرمی بہت بڑھی تو انہوں نے
بڑی شرافت سے لکھا:

"جناب شرر اطمینان رکھیں کہ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میرے قلم سے ایک فقرہ بھی ایسا نہ نکلے گا
جس سے کسی بندۂ خدا کی توہین مقصود ہو۔"

یہ بندۂ خدا ہی چکبست کا محبوب تھا۔ وہ اس کی خدمت کو خدا کی پرستش کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے۔ وہ ہندو تھے لیکن اس سے پہلے انسان تھے۔

اہل مذہب کے متعلق کہیں کہیں طنز ضرور کیا لیکن ایسی بات جو کسی کی دل آزاری کا سبب ہو ان کے نزدیک روا نہ تھی۔ مذہب کے نام پر جو فساد و فتنہ کھڑے ہوتے تھے۔ انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار کس خوبی سے کیا ہے ۔

بچا ہے اور نا بعد میں کے مذہب میں خون کا سبب تو آپس میں
کہیں گے ہم جس کو پاس انساں وہ اس کو عرفانِ خدا کہیں گے (چکبست)

چکبست نے بہت کمایا لیکن کبھی ایک پیسہ جمع نہیں کیا۔ وہ اپنے بڑے بھائی پنڈت مہاراج نرائن چکبست کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کے صرف ایک لڑکی تھی۔ پنڈت مہاراج نرائن کے کئی لڑکے تھے۔ یہ سب چچا بھتیجے ساتھ ساتھ رہتے اور چکبست کو بھائیوں اور بیٹوں کی طرح چاہتے تھے۔ چکبست کو اپنے بڑے بھائی پنڈت مہاراج نرائن سے بڑی محبت تھی۔ ایک خاص تعلق رکھنے کے باوجود بھی ان کے دل میں کبھی یہ خیال بھی نہ آیا کہ اپنی بیوی اور بچی کو لے کر الگ رہیں اور عیش سے زندگی بسر کریں۔ ان کے بعد وہ سارا مستحق ... بھائی کی موت پنڈت مہاراج نرائن کے لئے بڑا صدمہ تھی۔ چکبست کے انتقال کے وقت ان کی بچی بہت چھوٹی تھی۔ اس کی شادی کا انتظام پنڈت مہاراج نرائن نے اپنے ذمہ لیا۔ چکبست کا فوٹو ابھی تک ان کے خاندان میں آویزاں ہے۔ ان کے بھتیجے ابھی تک اپنے مرحوم چچا کو ویسے ہی یاد کرتے ہیں جیسے اپنے باپ پنڈت مہاراج نرائن کو یاد کرتے ہوں گے۔ ان دونوں بھائیوں نے ہمارے زمانے اور کشمیری برادری کی جو مثال قائم کی اس نے اس خاندان کو شہرت بخشی۔ چھوٹے اور تنگ گھرانے کا ... آج چکبست ہمارے درمیان نہیں لیکن ان کا فیضان ان کے خاندان میں جاری ہے اور کشمیری برہمنوں کی اس شاندار تہذیب کا نشان ہے۔

چکبست نے وکالت بھی کی اور روپیہ بھی خوب پیدا کیا۔ لیکن اس پیشے میں جتنے گہرے جاتے گئے ان کی شعر و ادب کی تشنگی اور بڑھتی گئی۔ ستے جیسے خاندان کی پرورش اور رشتے داروں کی ... روپے کی ضرورت تھی اس لئے ترک دنیا میں کوئی مصلحت نہیں دیکھی ... قلم جاری رہنے کے باوجود ان کی آخری منزل نہ بن سکی۔ ان کو پیشے کی مصروفیت میں برابر اس کا خیال رہتا کہ وہ اپنی اصل منزل سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے انتقال سے ایک یا دو روز پہلے بارہ بنکی کی عدالت ہی میں شیخ ممتاز حسین جونپوری سے جو اس وقت وہاں منصف تھے ایک کاغذ پر ... کہ آپ مجھے غالب کا ایک فارسی شعر لکھ دیجئے تاکہ میں ہر وقت اسے اپنی میز پر رکھوں اور ... ذوق ... غالب ... چکبست نے غالب کے اصل شعر میں اپنی ترمیم کرکے شیخ صاحب کے حوالے کیا۔ انہوں نے یہ شعر اس طرح لکھا تھا ۔

دل ز اسباب طرب گم کردہ با ہم غم ناں شدہ[1]
زراعت گاہ دہقاں کی شور چوں باغ ویراں شد

شیخ ممتاز حسین جونپوری اعلیٰ درجے کے خوشنویس ہیں۔ وہ اپنے عزیز دوست کی یہ فرمائش پوری نہ کر پائے تھے کہ چکبست کے انتقال کی خبر آئی۔ انہوں نے چکبست کے لکھے ہوئے شعر کو یادگار حبیب کے طور پر محفوظ رکھا تھا لیکن وہ کہیں تلف ہو گیا۔ اگر ہوتا تو اردو کے طالب علم کے لئے تبرک کے طور پر کام آتا۔

عدالت کی قانونی مصروفیت میں بھی چکبست کا ذوق سخن دلچسپی کی کوئی نہ کوئی راہ نکال لیتا تھا۔ وہ جب کام کرتے کرتے تھک جاتے تو بعض سخن فہم اور سخن گو اہلکاروں کے پاس جا بیٹھتے۔ مصرعے پر مصرعے دیئے جاتے۔ گرہیں لگائی جاتیں۔ کچھ کام کی باتیں ہوتیں۔ کچھ لطیفے ہوتے اور فضا میں ان کی بدولت ایک شگفتگی سی پیدا ہو جاتی۔ اس زمانے میں عدالت خفیفہ کے ایک منصرم تھے۔ ان کا نام پیارے لال تھا۔ وہ چکبست کے شاعرانہ کمال کے قائل تھے ...

---

[1] غالب کا اصل شعر غالباً یوں ہے ۔

دل ز اسباب طرب گم کردہ با ہم غم ناں شد زراعت گاہ دہقاں کی شور چوں باغ ویراں شد

چکبست کو ایک مصرعہ دیا اور فرمائش کی کہ اس پہ گرہ لگا دیں۔ مصرعہ تھا

"رنگ گل سے بلبل کے پر باندھتے ہیں"

چکبست نے مسکرا کر گرہ کا مصرعہ لگا کر شعر مکمل کر دیا

خفیفہ عدالت میں اکثر کے چھیٹے

رنگ گل سے جس کے پر باندھتے ہیں

پیارے لال عزت پر کوئی اثر ہوا ہو لیکن پیسہ دفتر اس برجستہ گرہ سے بہت محظوظ ہوا۔ ان کی یہی خوش مزاجی تھی جس نے ان کو مصاحبت کی ملکی چمکیں فضا میں بھی ہر دلعزیز بنا دیا تھا اور جب ان کی ناگہانی وفات کی خبر آئی تو رو پڑے۔ وہ سب جن کی آنکھیں برسوں سے مسلسل دیکھنے کی عادی تھیں اور بعض سب کچھ بھول چکی تھیں۔

شعر و ادب کا کارواں بہت آگے بڑھ چکا ہے لیکن راہ میں جس نے جو مراحل دیکھے ہیں وہ اسے ہمیشہ یاد آتے رہیں گے۔ چکبست کی ملکی تحریک پر نظم اور دیوان کیسی نہ ہو کسی حرفی محبتوں کی یہ غیر فانی یادگاریں ہماری رہنمائی کریں گی۔ آج چکبست ہم میں نہیں ہیں لیکن جو تصورات انہوں نے آنے والی نسلوں کے لئے چھوڑے ہیں وہ ہماری ادبی اور قومی زندگی کا گرانقدر سرمایہ ہیں۔

مولانا احسن مارہروی مرحوم

جمیل زبیری

شہروں کی ہماہمی سے دور یوپی کے ایک چھوٹے سے ضلع ایٹہ میں ایک چھوٹا سا قصبہ مارہرہ ہے جسے بہت سے لوگ مارہرہ شریف کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ مجیب مردم خیز علاقہ ہے۔ مولانا احسن مرحوم جن کا اصل نام سید شاہ علی احسن تھا اسی چھوٹے سے قصبہ کے چشم و چراغ تھے۔ میں نے انہیں پہلی بار اس وقت دیکھا جب میری عمر مشکل سے آٹھ دس سال ہوگی۔ مجھے خوب یاد ہے رمضان کا مہینہ تھا۔ ہم چار پانچ (صدیق حسن صدیقی جو خود بھی شاعر ہیں اور مولانا احسن کے شاگرد رہیں) کے ہمراہ مولانا کے گھر پہونچے۔ پرانے وضع کے ایک بڑے پھاٹک سے ہم لوگ مولانا کی بیرونی حویلی میں داخل ہوئے ہمارے سیدھے ہاتھ پر ایک دالان تھا جس میں چند کرسیاں پڑی تھیں۔ سامنے ایک چبوترہ تھا جس پر ایک لمبی نیچی سی چوکی بچھی تھی جس پر نہایت صاف دھلی ہوئی ایک چادر بچھی تھی۔ چوکی کے اطراف چھوٹے مونڈھے اور کرسیاں رکھی تھیں جن پر چند اشخاص موجود بیٹھے تھے چوکی کے سب سے بڑے پھاٹک کی طرف پشت کئے ایک نہایت وجیہ انسان ایک مونڈھے پر بیٹھا تھا۔ میرے ذہن نے سوال ہوتے ہی مجھے بتا دیا تھا کہ یہی مولانا احسن تھے۔ میں نے قریب پہونچ کر انہیں سلام کیا اور دیر تک ان کی طرف دیکھتا رہا۔ میں ان کی شخصیت سے کچھ ایسا مرعوب اور اس وقت کے ماحول سے کچھ ایسا متاثر ہوا کہ گو اس واقعہ کو آج تقریباً ۲۰ یا ۲۱ سال گذر چکے ہیں مگر ان کے جسم کا وہ نفیس کرتہ، وہ ہلکے سبز رنگ کا تہبند اور ان کے سیدھے ہاتھ پر سلگتا ہوا حقہ اور مولانا کا ہکلا ہکلا کر جلدی جلدی بولنا مجھے اس طرح یاد ہے جیسے آج کی بات۔ ہمیں دیکھ کر مسکرائے۔ نانا کو قریب ہی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ مجھے قریب بلا کر پیٹھ ٹھونکی۔ اور رحیم اللہ (مولانا کا دیرینہ خادم تھا) کو آواز دی "نعیم بنے، رحیم اللہ ہمارے بیٹھنے کے لئے ایک مونڈھا ہمارے قریب رکھدو" اور مجھے بالکل اپنے پاس بٹھالیا۔ اسی اثنا میں کچھ اور لوگ بھی آگئے معلوم ہوتا تھا کوئی بڑی پرتکلف دعوت ہے۔ افطار کا وقت قریب تھا۔ چوکی پر طرح طرح کی چیزیں جن میں پکوان، مٹھائیاں، پھل، کھجوریں اور دہی بڑے غرض کہ ہر ایک چیز شامل تھی موجود تھیں اور لوگ مؤذن کی صدا کے منتظر تھے۔ ہر آنے والے کو خوش آمدید کہتے اور مزاج پرسی کرنے کے بعد بیٹھنے کا اشارہ کرتے۔ میں خاموش بیٹھا کبھی ان کی طرف کبھی دہی بڑوں کی طرف اور کبھی دیگر افراد کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک دفعہ میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور ذرا سا جھک کر پوچھا "کیوں بیٹے تمہارا روزہ ہے؟" میں خاموش رہا۔ گو موجودہ اشخاص میں سے کچھ کی طرح میں بھی گھر سے منہ بالکل صاف کرکے اور چہرہ پر روزے کے آثار پیدا کرکے چلا تھا۔ مگر میری کم عمری سچائی کو نہ چھپا سکی۔ وہ خود ہی ہنس کر کہنے لگے "ایک ڈاڑھ کا ہوگا" پھر اور لوگوں سے محو گفتگو ہوگئے۔ روزہ کشائی کے بعد جماعت

کرکے دی۔ نماز خود انھوں نے ہی پڑھائی۔ نماز سے فارغ ہو کر تمام لوگ روانہ ہو گئے۔ شیخ صاحب نے کھانا وغیرہ کھلایا۔ وہ کھانا کھلا کر کر دیا اور پھر کھانا شروع ہو گیا ہے اس کا ... کوئی ایسی بات ہوئی کیونکہ اصل تو وہ بہت جلدی جلدی پڑھتے تھے ... پھر آنکھ بھی ... تھی۔ میں حیران و پریشان ادھر ادھر دیکھتا رہا اور جب نانا نے میری آنکھوں میں نیند کے آثار دیکھے تو مولانا سے رخصت لے کر چلے آئے۔ چلتے وقت مرحوم نے فرمایا۔ "صدیق کل ضرور آنا"

اور یہ سلسلہ پورے مہینے جاری رہا۔ میں نانا کے ہمراہ دو تین مرتبہ اور گیا اور اس محفل کو ہمیشہ اسی طرح پایا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا مرحوم علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لکچرر کی حیثیت سے کام کرتے تھے اور تقریباً ہر سال پورے ماہ رمضان کی چھٹی لیکر مارہرہ آجاتے تھے۔ جہاں ان کی تفریح طبع اور عبادت کا بہت کچھ سامان موجود تھا۔ گھر کے نزدیک ہی ایک بڑی مسجد تھی جس میں وہ تراویح پڑھتے تھے اور چونکہ خود بھی حافظ تھے اس لئے کبھی کبھی خود بھی کلام مجید سناتے تھے ستائیسویں روزے کو بڑی دھوم سے شبینہ کرتے تھے جس میں جلیبیاں بانٹی جاتی تھیں۔ شبینے کے سلسلے میں مجھے ایک اور واقعہ یاد آگیا جسے میں نے اپنے والد کی زبانی سنا تھا جس محلے میں ہمارا مکان تھا اس کی مسجد کے ایک امام تھے جن کا نام حافظ عبد المجید تھا مگر لوگ انھیں گاؤں کی بستی والے حافظ جی کہا کرتے تھے۔ وہ بڑے پُر مذاق اور زندہ دل انسان تھے۔ ایک رات اپنی مسجد میں تراویح ختم کر کے میرے والد سے کہا "چلو، بستی (بستی اس محلے کا نام ہے جہاں مولانا رہتے تھے) میں شبینے دیکھنے چلتے ہیں" بستی کی مسجد میں مولانا احسن جنھیں مارہرہ کے لوگ شاہ میاں کے نام سے یاد کرتے تھے تراویح میں موجود تھے اور کچھ صف میں سب سے پیچھے کھڑے تھے۔ حافظ جی جماعت کے دوران میں ہی ان کے قریب پہونچے اور کان سے برابر منہ لگا کر کہنے لگے۔ "اس کے بعد میں سناؤں گا" مولانا کو نماز ہی میں غصہ آگیا اور نیت توڑ کر کہنے لگے "لاحول ولا قوۃ۔ لاحول ولا قوۃ۔ نماز خراب کر دی" اور پھر نیت باندھ لی۔ حافظ جی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے اور اپنے گھر پہنچ کر دم لیا۔ مگر تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ احسن صاحب کا آدمی حافظ جی کو بلانے آیا ہے۔ انھوں نے کہلوایا تھا: "آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔ آکر قرآن ختم کرا دیجئے" اور حافظ صاحب کو جانا پڑا۔ یہ اخلاق تھا جو مرحوم کی زندگی کی سب سے نمایاں خصوصیت تھی یہ چیز انھیں اپنے آباؤ اجداد سے ورثے میں ملی تھی۔ مولانا مرحوم کا خاندانی تعلق سادات بلگرام سے تھا۔ سید شاہ برکت اللہ جو مولانا کے جد امجد تھے۔ سترھویں صدی کے آخر یا اٹھارہویں صدی کے شروع میں بلگرام سے مارہرہ تشریف لائے تھے۔ مارہرہ وہ جگہ ہے جہاں کا ہر فرد بقول غالب جو ہر قابل کہے جانے کا مستحق ہے۔ مولانا کے بزرگوں میں حضرت صاحب عالم اور حضرت شاہ عالم بڑے عالم بزرگ گذرے ہیں۔ مارہرہ کی مشہور درگاہ بھی ہیں جن کی وجہ سے مارہرہ "مارہرہ شریف" کہلاتا ہے۔ انہی تمام بزرگوں کے مزار ہیں۔

مولانا مرحوم سادات مارہرہ میں سے وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے انگریزی تعلیم کی ضرورت کو محسوس کیا اور جدید خیالات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گو وہ خود انگریزی تعلیم حاصل نہ کر سکے مگر قدیم اور جدید کی کشمکش میں انھوں نے ایک توازن قائم رکھنے کی کوشش کی اور ذاتی صلاحیت اور ذوق کی بدولت دونوں کے درمیان ایک معتدل راہ تلاش کرنے میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ ان کے لئے یہ خاصہ دشوار کام تھا کیونکہ بچپن سے ان کی تعلیم بالکل پرانی وضع پر ہوئی تھی۔ مولانا نے خود اپنی ایک نظم میں اپنے بچپن کا ایک واقعہ لکھا ہے جس سے اس زمانے کے علمی رواج کا اندازہ ہوتا ہے۔

علی گڑھ کالج قائم ہونے کے بعد جگہ جگہ انگریزی اسکول کھلنا شروع ہوئے اور اسی کے زیر اثر مارہرہ میں بھی مولانا کے گھر کے نزدیک ہی ایک اسکول کھلا حصول علم کا شوق تو تھا ہی۔ اس اسکول میں بیٹھنا شروع کر دیا۔ ایک ترکی ٹوپی اور ایک انگریزی پہاڑہ بھی خرید لی۔ شدہ شدہ جب ان کے والد بزرگوار کو اطلاع پہونچی کہ صاحبزادے نے انگریزی اسکول میں جانا شروع کر دیا ہے تو بہت ناراض ہوئے۔ اور نہ صرف انھیں مارا پیٹا ہی بلکہ کتاب اور ٹوپی چھین لی اور ہدایت کی کہ آئندہ ایسی جرأت نہ ہو۔ اس واقعہ کے چالیس سال بعد ۱۹۲۹ء میں مولانا نے اس واقعہ کو اس طرح نظم کیا۔

"سرسید کا فیض جاری"

سن تراسی عیسوی گذرے ہیں چالیس سال ✦ ✦ ✦ اس زمانے کے رواج علم کا لکھتا ہوں حال

یہ حال تو پہلے دوستوں سے کہتا ہوں — [illegible]
اس مسئلہ میں ایک اصل انگریزی کی شہ — [illegible]
میں کیمیا کی [illegible] — [illegible]
[illegible] — [illegible]
اُٹھ جائے دیکھنے والوں کی پڑتی ہے نظر — [illegible]
[illegible] — [illegible]
مجھکو انگریزی دیکھنے سے [illegible] — [illegible]
[illegible] — [illegible]
[illegible] — [illegible]

مجھکو ان احکام کی تعمیل کرنی ہی پڑی
زندہ رہ کر سب لڑائی جیتنی ہی پڑی

اس نظم کے آخری مصرعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں انگریزی تعلیم حاصل نہ کر سکنے کا بڑا احساس رہا اور نئے اور پرانے رجحانات کے بیچ ایک میانہ راہ قائم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ وہ اس کوشش میں یہاں تک کامیاب ہوئے اس کا اندازہ ان کے اس قسم کے اشعار سے لگایا جا سکتا ہے ؎

یہ شوقِ اضطراب خامہ سا دیکھا — اُنسے جواب خط کا منگایا ہے تار پر

اس میانہ روی کا ذکر انھوں نے ایک مرتبہ اپنے رسالے "فصیح الملک" میں اس طرح کیا ہے

"اس میں شک نہیں کہ ہر معاملے میں افراط و تفریط بری ہوتی ہے۔ اصل مذاق دونوں شاعری کی [illegible] جس میں کوئی خامی اور [illegible] لطف نہیں پایا جاتا۔ ان شاء اللہ ہر قسم کی شاعری کے نمونے شائع ہوں گے ...... فصیح الملک میں یہ کوشش کی جائے گی کہ ایشیائی پرانی طرز کے سوا نئے خیالوں کی ایسی نظمیں شائع ہوں جو پرانے اور نئے دونوں اہلِ مذاق کی دلچسپی کے لئے موزوں ہو سکیں اور اس کے واسطے معیار یہ ہے کہ خیال نیا اور عمدہ ہو مگر طرزِ بیان اور [illegible] قیود وہی ہوں جن کی ایشیائی طبیعتیں عادی ہیں"

انھوں نے اس میانہ روی قائم رکھنے کی برابر کوشش کی۔ انھیں اپنے خاندانی وقار اور پرانی روایات کا بڑا احساس تھا، وہ اس کے رکھ رکھاؤ میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے تھے۔ ہر ملنے والے سے بڑی محبت اور تواضع سے ملتے تھے اور بہت جلد ہی بے تکلف ہو جاتے تھے۔ مگر کسی قسم کی بیہودگی یا بدمذاقی نا پسند رکھتے تھے۔ پرانے اخلاق کا مکمل نمونہ تھے۔ اگر کوئی دوسرا ان کے سامنے کوئی بری بات کر بیٹھتا تو ان کے چہرے سے ناگواری کا احساس ہونے لگتا اور بسا اوقات صاف دلی سے اس کا اظہار کر دیتے تھے۔

[illegible] کے قسم کی دوائیں ہیں۔
مولانا کو اس نظم میں انگریزی کا یہ لفظ نہیں استعمال کرنا چاہیے تھا۔
مولانا کے قلم سے اس لفظ کا نکل جانا سخت حیرت کی بات ہے۔

رشید احمد صدیقی صاحب نے اپنے ایک مضمون میں مولانا کا ایک واقعہ اس طرح لکھا ہے۔

"مسیحی جھنڈے والی اسکوپ ہے کہ وہاں "فصل" میں کس کس قسم کے وحوش و طیور کہاں کہاں سے آکر اکٹھے ہیں اور صید و صیاد، دانہ و دام، تماشا و تماشائی کیسی کیسی نیرنگیوں سے سابقہ ہوتا ہے۔ یہاں ایک سالانہ مشاعرہ بھی ہوتا ہے۔ ایک مشاعرہ[1] میں مولانا بھی شریک تھے۔ سامنے کی صف اول میں وہ سب کچھ تھا جس کی ترجمانی ایک مصرع میں ہوتی ہے جو میرے بچپن یا لڑکپن میں بہت مقبول تھا۔ اس کا ایک مصرعہ مجھے اب تک یاد ہے

کہاں بچائیں دل و دین جان بچانی مشکل ہے

مولانا کی باری آئی۔ جیسے مانتوں کی طرح سیدھے سادے لب و لہجہ میں یہ رباعی پڑھی

ماندوں کے انداز کہاں سے لاؤں
بجتی ہوئی آواز کہاں سے لاؤں
فرمائش معاف نوجوانانِ سخن!
بوڑھا ہوں شباب ساز کہاں سے لاؤں

سننے والے اچھل پڑے اور مجمع میں ایک ہیجان سا پیدا ہو گیا۔ اس کے بعد طرح میں غزل پڑھنی شروع کی جس کے ایک شعر پر جو صف اول کو ذہن میں رکھ کر پڑھا گیا مجمع سے وہ نعرۂ تحسین و تہنیت بلند ہوا کہ دیر تک کان پڑی آواز سنائی نہ دی

ٹھنی ہے امیروں میں ترے حسن کی دولت
یہ مصرفِ خیرات سمجھ میں نہیں آتا۔"

مولانا کی کلاس میں اکثر طلبا شوخیوں پر بیٹھے رہتے اور مولانا برہم ہو جاتے تھے اور کلاس سے چلے جاتے تھے۔ ایک دفعہ رشید صاحب صدیقی سے جو شعبۂ اردو کے صدر تھے کہنے لگے[2] "رشید صاحب۔ طلبا پڑھنے نہیں آتے۔ وقت گزاری اور تفننِ طبع کے لئے آتے ہیں۔ یہ دنیا میں جو چاہے کریں علم تو ان کو آنے کا نہیں۔" مولانا کے پڑھانے کا طریقہ پرانا تھا۔ وہ بالکل معلم بن کر پڑھاتے تھے اور طالب علموں سے اس قسم کے آداب کی توقع رکھتے تھے جو خود مرحوم نے استادوں کے ساتھ اپنی طالب علمی کے زمانے میں رکھے تھے۔

مولانا احسن مرحوم جس طرح خوش پوشاک تھے اسی طرح خوش خوراک بھی تھے اور اچھے کھانوں کا بہت شوق تھا۔ اسی طرح انہیں چائے سے بھی عشق تھا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ صرف شکر کھانے کا بہانہ تھا اور اسی شوق نے انہیں ذیابیطس کے مرض میں مبتلا کر رکھا تھا۔ آموں سے بھی اسی طرح رغبت تھی۔ گو آم کھانے سے ان کے سارے جسم پر پھنسیاں نکل آتی تھیں مگر فصل بھر دونوں وقت کھانے کے بعد آموں کا ہونا لازمی تھا۔

ایک مرتبہ مین پوری میں مشاعرہ تھا۔ مارہرہ سے پوری ایک لاری بھر کر لوگ مشاعرے کی شرکت کے لئے روانہ ہوئے۔ مولانا بھی ہم سفر تھے۔ راستے میں شکوہ آباد پر لاری ٹھہری۔ کھانے کا وقت ہو چکا تھا مولانا نے کسی سے کہا "جاؤ کھانا لے آؤ" جو شخص کھانا لینے گیا وہ صرف اپنے اور مولانا کے واسطے کھانا لیکر واپس آگیا۔ مولانا نے پھر دوسرے آدمی کو بھیجا۔ وہ صرف اپنے واسطے کھانا لے کر واپس آگیا۔ مولانا کو غصہ آگیا۔ گھبرا کر لاحول پڑھی اور کہنے لگے "دیکھا یہ

---

[1] اس مشاعرے میں ساغر نظامی بھی موجود تھے۔

[2] یہ واقعہ بھی رشید احمد صدیقی صاحب نے اپنے اسی مضمون میں لکھا ہے جس کا اوپر تذکرہ آ چکا ہے۔

[illegible] ہو گئے تھے یہ دیوان پہلے اشاعت کے لئے کی اصلاح کے بعد تیار ہوا تھا
[illegible] سب مل جل کر سکر ارتب ہے گئے کلیات بہت بڑی چیز تھا جو خود تم ہو گیا تھا۔

مولانا کو شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ داسال کی عمر میں داغ کے شاگرد ہوئے۔ داغ نے ان پر بڑی عنایت کی۔ یہ بچے تھے ... [illegible]
کا پہلا مجموعہ ’’ریاض سخن‘‘ کے نام سے شائع کیا اور اس کو نواب صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ تحسین حاصل کی۔ نواب صاحب نے بعد میں
اس کا نام بدل کر ’’دیوان حسن‘‘ کی بجائے ’’دیوانِ خلیل‘‘ رکھ دیا۔

اس بات کو دنیا جانتی ہے کہ حسن مرحوم جو وقت اپنے استاد کے ساتھ حیدرآباد دکن میں گزارا وہ ان کی زندگی کا حصہ ہم بہت ہے۔
ان کی شاعری پر داغ کا کس قدر اثر ہے اس کا اندازہ حسب ذیل اشعار سے لگایا جا سکتا ہے ؎

کسی کو دیکھ کر خط دیتے لیے پر عتاب آیا
کو ہر اک پر چھپنے نامہ بر آیا جواب آیا

تغافلات پہ ہاں شکل یہی وفا کچھ بھی نہیں
بارہا تو نے کہا سب ہو گیا کچھ بھی نہیں

کوئی دیکھے یہ قیامت نہ تکلف کب تک
ہو چکا پردہ بس اب تو ادھر دیکھ لیے

لائے جو جنازہ تو مجھے دفن بھی کر دو
اٹھے بھی جہاں جا نہ سکیں ایک قدم اور

ڈوبی ہوئی نبضیں ہیں تو اکھڑی ہوئی سانسیں
کہ دیجئے بیمار سے باتیں کوئی دم اور

اس اثر کو مولانا نے خود ہی ایک شعر میں باندھا ہے ؎

طرزِ چھپتی ہی نہیں داغ کے شاگردوں کی
حسن اوروں سے الگ ان کی زباں ہوتی ہے

داغ کا اثر نہ صرف ان کے شاگردوں تک محدود رہا بلکہ مولانا احسن کے شاگردوں تک نظر آتا ہے۔ اپنے استاد کی طرح مولانا کے بھی شاگردوں
کا حلقہ کافی وسیع تھا اور سب میں تقریباً وہی رنگ پایا جاتا ہے۔

؎ گھر گھر مرا چرچا ہے در در مری رسوائی	بیٹھے ہوئے کوئی وحشی کرے مجھے سودائی	(صدیق)
؎ آتا نہیں یقین کہ جا ہو گئے تم ہیں	اچھا ذرا دکھاؤ تو چاہت نباہ کے	(اختر)
؎ سوچ کیا ہے قتل میں خوبی و شمشیر بھی	تم اگر ہوئے ہو مجھ سے بدظن تقصیر بھی	(منظر)
؎ الشتانہ مجھ سے ہجر میں الزامِ زندگی	اچھا ہی ہوا کہ میں اچھا نہ ہو سکا!	(ابر)

احسن کو داغ کی صحبت میں برسوں رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔ داغ کے انتقال کے بعد ان کی سوانح حیات کو ترتیب دینے کا کام انھوں نے اپنے ذمہ لیا
اور اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ استاد کے نام اور کلام کو چمکانے میں صرف کر دیا۔ داغ کی شاعری سے جس طرح وہ واقف تھے کسی اور شخص کا ہونا ممکن ہے۔ داغ
پر گو شاعر تھے ان کا پورا کلام چار ضخیم دیوانوں میں مرتب ہوا ہے۔ اس بات کی ضرورت تھی کہ اس کلام سے ایک اچھا انتخاب کیا جائے اور یہ کام بھی مولانا

احسن صاحب ہی کی سوانح کی زندگی میں احسن مرحوم میں ان کو ادا بتا نہ سکے۔ ایک زمانہ تو ایسا تھا کہ حضرت داغ کے ہی دیوان کی تصحیح ہی علما کا یہ ادب ہی آپ ہی دیا کرتے تھے۔ داغ کو خود بھی اس چیز کا اعتراف تھا اور انھوں نے احسن مرحوم کو اپنے ایک شعر میں یاد کیا ہے کہ ؎

سید احسن جو میرے دوست ہیں شاگرد بھی ہیں
جن کو اللہ نے دی فکر رسا، طبع رسا

مولانا زود گو شاعر تھے اور شاعری سے انھیں فطری لگاؤ تھا۔ لیکن ان کی طبیعت میں آمد کم اور آورد زیادہ تھی اور شاعری ... ہر وقت اور ہر عالم میں شعر کہہ سکتے تھے۔ وہ فکر کرتے تھے مگر ان کی فکر پریشان حال شاعروں کی طرح نہ تھی۔ وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں مصروف رہتے، علمی و ادبی مسائل پر گفتگو کرتے رہتے مگر فکر شعر سے کبھی خالی نہیں رہتے تھے۔ جس زمانے میں وہ شاہکار عثمانی مثنوی لکھ رہے تھے ان کا یہ عالم تھا کہ یونیورسٹی کی شعبۂ اردو میں بیٹھے ہوئے ہیں، ہر طرح کے طلباء اور دوستوں سے گفتگو بھی جاری ہے۔ علمی بحثوں میں بھی حصہ لے رہے ہیں۔ اور مثنوی بھی لکھی جا رہی ہے۔ اس مثنوی کے لکھنے میں مشکل سے تین یا چار دن صرف ہوئے ہوں گے۔

وہ اپنے اوقات کے بہت پابند تھے۔ دراصل اس پابندیٔ اوقات میں ان کے پرانے ملازم علیم اللہ کا بڑا ہاتھ تھا۔ جیسا معلوم ہوتا ہے، علیم اللہ خود گھڑی کی سوئی ہے۔ علیم اللہ سے مولانا کو بڑا لگاؤ تھا۔ اور آخر میں انھوں نے اس کی بہن سے نکاح بھی کر لیا تھا جس سے ان کے ایک صاحب زادے[2] بھی تولد ہوئے جو حیات ہیں مگر چونکہ انھوں نے اپنے خاندانی وقار کو قائم نہیں رکھا اس لئے احسن مرحوم ان سے ہمیشہ ناراض رہتے تھے۔

سنہ ۱۹۳۲ء میں رسالہ "ریاست" نے مختلف مشہور شاعروں سے درخواست کی تھی کہ وہ اپنے روزانہ مشاغل کے بارے میں کچھ تحریر کریں۔ اس درخواست پر بہت سے شاعروں نے اپنے مشاغل کو نظم کر کے بھیجا تھا۔ مولانا احسن نے بھی اسی درخواست پر حسب ذیل غزل لکھی تھی ؎

کیوں پوچھ رہا ہے کوئی احسن کے مشاغل — کیا حسن عمل دفتر عصیاں میں ملے گا
اوقات ہیں بے ضابطہ حالات ہیں بے ربط — ہر وقت وہ فکر و غم دوراں میں ملے گا
اس پر بھی ہو اصرار کسی کو تو وہ مسن سے — آوارہ دورنگی کے بیاباں میں ملے گا
یا صبح کو ہوگا وہ مصلے پہ نمایاں — یا خفتہ کسی گوشۂ پنہاں میں ملے گا
جب تک نہ ڈھلے دوپہر اس وقت تک اس کو — ڈھونڈو گے تو وہ اطفال دبستاں میں ملے گا
دیکھو گے اگر دو بجے سے چار بجے تک — سویا ہوا، جیتا ہوا، ایواں میں ملے گا
پھر چار بجے شام سے چھ سات بجے تک — مشغول ملاقات عزیزاں میں ملے گا
ہوگی پس مغرب جو تلاش اس کی تو اکثر — پڑھتا ہوا کچھ بزم شبستاں میں ملے گا

ل۔ دکن کے ایک اخبار میں چند مضامین شائع ہوئے تھے جو نواب حیدر آباد دکن کے چھوٹے بیٹے کی خمسہ متوفی وفات پر ... لکھے گئے تھے اور جن میں کچھ نسوانی ... نواب حیدر آباد کے بھی شامل تھے۔ مولانا نے انہی مضامین کو مثنوی کے پیرایہ میں قلمبند کیا ہے۔

۲۔ ان کا نام رفیق ہے۔

سرگرم مرغ شوق سپیدۂ سحر سے ہو
جب آہ گرم سے شب ایک نہ آسکی / بیٹھے سکون خواب پریشاں سے ہو

اللہ رے جوش آہ و بیاں جو تم!
لب بستہ وہ کلی غم تر و شاں میں ہے

ظاہر ہو گیا ہوگا کہ اسی ردیف قافیے میں حضرت جوش ملیح آبادی نے بھی غزل کہی تھی جو مقبول عام ہے۔

مولانا کو مشاعروں کا بڑا شوق تھا۔ بڑے اہتمام سے ان کا اہتمام کرتے تھے اور شعراء مجازی کی خاطر مدارات اس طرح کرتے تھے جیسے خود مولانا ہی کے ہاں کوئی تقریب ہو رہی ہے۔ مشاعروں میں اپنی غزلیں نہایت وضاحت سے ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے تھے۔ ایک دفعہ مارہرہ کے چھوٹے سے اسکول میں طرحی مشاعرہ منعقد ہوا۔ مولانا مرحوم اس کی صدارت فرما رہے تھے۔ حاضرین میں زیادہ تر اسکول کے طلبہ تھے۔ میں بھی اسی اسکول میں پڑھتا تھا اور مشاعرے میں موجود تھا۔ شاعر کی حیثیت سے شریک ہونے کے شوق میں میں نے بھی اپنے استاد سے غزل لکھا کر پڑھی تھی۔ جب لوگ اپنی اپنی غزلیں پڑھ چکے تو حضرت احسن نے اپنی غزل سنانی شروع کی۔ اسکول کے لڑکوں کے لئے کچھ تو نئی تھی۔ شرارتاً چیخ چیخ کر انہیں داد دے رہے تھے۔ مولانا جوش میں آکر مسند سے اٹھ کے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اس غزل کا ایک شعر مجھے اب تک یاد ہے

حاکم بلائیں تو اندھیرے ہی جائیں گے
اللہ چاہے تو سویرا نہیں ہوتا!

لڑکوں کی شوخی بہت بڑھ گئی اور وہ ناراض ہو کر مسند سے کھڑے ہو گئے اور مشاعرہ درہم برہم ہو گیا۔ وہ کہا کرتے تھے "اس طرح کے مشاعروں میں شرکت کرنے کے بعد میں عہد کر لیتا ہوں کہ اب آئندہ کبھی مشاعرے میں شرکت نہیں کروں گا مگر میرا یہ عہد بالکل اس حاملہ عورت کا سا ہوتا ہے جو درد زہ کی تکلیف میں مبتلا ہو کر ہمیشہ عہد کرتی ہے کہ آئندہ پھر بچہ نہیں جنے گی مگر تکلیف رفع ہونے کے بعد مہینے بھر کو بالکل بھول جاتی ہے"۔

احسن مرحوم کا ادبی مذاق ستھرا تھا اور وہ فن شعر گوئی سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ جس پر کثرت مطالعہ سے بار بار جلا ہوتی رہتی تھی۔ کتابوں سے انہیں عشق تھا اور اسی وجہ سے وہ اپنی کتابیں دوسروں کو عاریتاً دینے میں بھی تکلف کرتے تھے۔ کتابیں جمع کرنے اور مطالعہ کرنے میں انہیں خاص لذت حاصل ہوتی تھی۔ قدیم اور جدید مصنفین اور مولفین کی بیشتر تصانیف مولانا کے ذاتی کتب خانے میں موجود تھیں۔ مولانا کو اگر پتہ چلتا کہ شعر و ادب اور تاریخ زبان پر کہیں کوئی کتاب نئی لکھی گئی ہے تو انہیں اس وقت تک چین نہیں آتا تھا جب تک اس کا مطالعہ نہ کر لیں۔ ان کی وفات کے بعد ان کی وصیت کے مطابق ان کی تمام کتابیں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کتب خانے کو دے دی گئیں۔

مولانا نہ صرف شاعر ہی تھے بلکہ نثر میں بھی ان کی خدمات کسی طرح نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ اسکول اور کالج کے جیسیوں انتخاب مولانا کے قلم کے رہین منت ہیں۔ نثر میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ کلیات ولی کا دیباچہ (جس کی ضخامت ۱۰۴ صفحات ہے) تاریخ نثر اردو موسوم بہ منثورات اور منتخب داغ کا مقدمہ ہے۔

جناب بشیر علی صاحب صدیقی نے اپنے ایک مضمون میں کلیات کے بارے میں لکھا ہے کہ "تحقیق کا راستہ اتنا دشوار گزار ہے کہ یہاں چالاک سے چالاک رہرو ٹھوکر کھا جاتا ہے اور مولانا سے بھی کلیات مرتب کرنے میں کئی جگہ لغزشیں سرزد ہوئیں مگر ان کے کارنامے پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔"

سلہ اس اسکول کا نام مدرسہ اسلامیہ اسکول تھا۔

علاوہ ازیں احسن مرحوم نے ایک اور دلچسپ سلسلہ "رموزِ داغ" کے نام سے شروع کیا تھا مگر اس امر کی ابتدا بہت دیر سے ہوئی اور اسی وجہ سے یہ کام مکمل نہ ہو سکا۔ اسی طرح مولانا نے ایک لغت کی ترتیب بھی شروع کی تھی جس کا نام "فصیح اللغات" رکھا تھا [illegible] غالب کے مذہبی خیالات کو پہلی دفعہ کتابی صورت میں اپنی وفات سے تقریباً دو سال قبل شائع کیا تھا جس کا نام "افکارِ غالب" ہے اور اس [illegible] ادبی تحقیق ہوتی ہے۔ مولانا نے تھوڑے عرصے لاہور میں ماسٹری کی۔ ایم اے کے ساتھ مضامینِ جاوید کے دارالمطالعہ میں بھی کام کیا [illegible] جلد کی ترتیب و تدوین میں بھی شامل رہے۔

احسن مرحوم صاحبِ طرز نثر نگار تھے مگر ان کی تحریر بھی بہت سلیس اور شگفتہ ہوتی تھی۔ وہ عربی و فارسی کے ثقیل الفاظ استعمال کر کے پڑھنے والوں پر خوانخواہ اپنی قابلیت کا رعب ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔ ملاحظہ ہو:

"یہ مجمل شاعری کے وہ جو ہماری پرانی شاعری کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر چھری سے ذبح کر رہے ہیں ان کو خدا دادِ بہت دیں۔ اور جہاں کہیں اس قسم کی بحث چھڑ جائے تو وہ [illegible] اساتذہ کے [illegible] کے شاکی ہوتے ہیں یا مردہ دلی کی فرضی تشبیہوں پر منہ آتے ہیں۔"

"مولانا عبدالحق کی طرح احسن مرحوم نے بھی اپنی تحریرات میں ہندی کے میٹھے میٹھے الفاظ بڑی خوبی سے استعمال کئے ہیں۔" ان کی نثر میں اسی بات کا [illegible] مثال ہے۔ ان پر انھوں نے ہمیشہ دھیان [illegible] دی۔

مرحوم کی مالی حالت کچھ بہت زیادہ اچھی نہیں تھی اور بسا اوقات انھیں مجبوراً اپنی تصانیف کو فروخت کرنا پڑا۔

۱۹۴۰ء میں کل ہند اردو کانفرنس میں شرکت کے لئے تشریف لے گئے۔ وہاں سے واپسی پر ان کی صحت جو ایک عرصے سے خراب تھی اور بھی بگڑ گئی اور کچھ عرصہ بعد ان کی صحت بہت خراب ہو گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وہ علی گڑھ سے مارہرہ منتقل ہو چکے تھے۔ بغرضِ علاج اپنے بیٹے کے پاس علی گڑھ گئے۔ جب وہاں کچھ افاقہ نہ ہوا تو اپنے دوسرے بیٹے کے پاس جو پٹنہ میں ڈاکٹر تھے بغرضِ علاج پہنچے مگر ان کا مرض بہت بڑھ چکا تھا ایک عرصے تک [illegible] اچھا ہونا ناممکن تھا۔ وفات سے ایک [illegible] بے ہوشی کا عالم طاری ہو گیا تھا۔ آخر میں گردوں نے اپنا عمل بند کر دیا تھا۔ مرنے سے ذرا دیر پہلے آنکھیں کھولیں اور ادھر ادھر دیکھ کر [illegible] پر مضمون لکھا جا رہا ہے؟" اور جواب کا انتظار کئے بغیر ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ ان کی نعش مارہرہ لائی گئی اور وہیں ان کے بزرگوں کی درگاہ میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

کر دیا خاموش لیکن آج اس کو موت نے
آہ جو احسن جہاں میں یادگارِ داغ تھا

دیانرائن نگم

ثاقب کانپوری

جس طرح مسلمانوں کی تعلیم کا سرسید کے بغیر، اردو کے تحفظ کا کوئی تصور عبدالحق کو علیحدہ کر کے نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح اردو کی ادبی صحافت کا تصور منشی دیا نرائن کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ عہد حاضر میں حسرت موہانی مرحوم ہوں، منشی دیا نرائن نگم نے اس پرچے کی تو ... نصف صدی تک ... جگہ دیا تھا۔ دیا نرائن نگم کی شخصیت تو کتنے ہی ادیبوں کے لئے کعبۂ مقصود تھی، وہ یہاں طواف کرنے آتے یا پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ درگا سہائے سرور، پیارے لال شاکر، منشی پریم چند، نوبت رائے نظر، احسن سنبھلی، ان سب نے کانپور کو دیا نرائن نگم کی وجہ سے قربت دی۔

منشی دیا نرائن نگم سے میری پہلی ملاقات غالباً ۱۹۲۲ء میں ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میرے عزیز و محترم دوست جگر مرادآبادی کی شاعری اور خوش نوائی کا ادبی حلقوں میں نیا نیا چرچا ہوا تھا، ان کی رندی و سرمستی نے ادبی حلقوں کو گرما رکھا تھا، خانقاہوں، مدرسوں، ندوۃ العلماء اور سید سلیمان ندوی کے دل و دماغ میں بھی اپنا گھر بنا لیا تھا۔ جگر صاحب منشی دیا نرائن نگم کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ انہوں نے جناب کرشن سہائے صاحب وحشی کانپوری، استاذی مولانا احسن سنبھلی مرحوم، مولانا محمد حسین محوی اور ان کے وسیلے سے مجھے بھی بلایا کہ گھر پر شام کو ... جگر صاحب سے بھی ملنے کا مجھے اشتیاق تھا اور منشی صاحب کو بھی دیکھنے کی تمنا تھی۔ کیونکہ وہ زمانہ میری ادبی زندگی کا ابتدائی زمانہ تھا، یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ نیا ادیب بڑے، ممتاز اور مشہور ادیبوں سے تعلق پیدا کرنے کے لئے بیتاب رہتا ہے۔ میں وحشی صاحب کے گھر پہنچا، منشی خندہ پیشانی سے ملے۔ جگر صاحب سے تعارف ہوا اور پھر جگر صاحب نے ایک غزل پڑھنی شروع کی "دل میرا" اور "حاصل میرا"۔ ایک تو ان کے کلام کی گرمی اور دوسرے ان کے پڑھنے کا انداز، وحشی صاحب کرسی سے گر کر فرش پر لوٹنے لگے۔ یہ بڑے صاحب دل، رند اور مشّاق شعر کو بس ایک لمحے میں زیر و زبر ... جیسا دیکھتے ہیں، پھر یہ سب کچھ بڑی بے ساختگی سے ہوتا ہے، وہ مولانا عزمی، کشتگان عشق اور قتیل تیغ نظری میں سے ایک ہیں۔ جگر صاحب غزل پڑھ رہے ہیں اور وحشی صاحب آنکھیں بند کئے ہوئے فرش پر لوٹ رہے ہیں اور نعرے بلند کر رہے ہیں۔ عجیب منظر تھا وہ بھی، منشی صاحب پریشان ہو گئے، میری طرف دیکھا، میں نے کہا: "آپ پریشان نہ ہوں، وہ حال میں ہیں اور یہ کوئی مرض نہیں۔"

[illegible] مسکراتے ہوئے [illegible] ہوگئے ہوں۔ جب مجاز صاحب کی غزل ختم ہوئی تو [illegible] صاحب [illegible]
گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔

یوں منشی دیا نرائن نگم سے میری پہلی ملاقات ہوئی لیکن اس ملاقات میں ان سے زیادہ بات چیت نہ ہو سکی۔ مجاز صاحب کا [illegible] صاحب کا ساتھ ہمارے درمیان حائل ہو گیا لیکن میں نے ان کے متعلق رائے قائم کی اور مجھے زندگی بھر اس رائے پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ اردو زبان تو برصغیر کی بہترین روایات کا سنگم ہے ہی لیکن کچھ افراد بھی ایسے ملتے ہیں جو ہماری مشترک روایات کے بھی [illegible] بھی انہی میں سے ایک تھے، وہ قیامت کے وضع دار تھے۔ جب پہلی بار میں نے انہیں دیکھا تو وہ کرتا اور چوڑی دار پاجامہ پہنے ہوئے تھے۔ پھر میں نے ہمیشہ انہیں اسی لباس میں دیکھا۔ لباس کی یہ وضع داری ظاہر ہے کہ بہت سے حضرات کے نزدیک کوئی اہمیت نہ رکھتی ہو لیکن میرے خیال میں تو یہ کردار کی پختگی کی علامت ہے۔ ان کی شخصیت کا ایک اہم پہلو عینک کے پیچھے دیا نرائن نگم کی آنکھیں ہمیشہ مسکراتی رہتی تھیں۔ یہ مسکراہٹ اور ہونٹوں کا تبسم ہی ان کی گفتگو تھا۔ پہلی ملاقات میں انہوں نے اپنے ہاتھ سے ڈبیہ سے پان نکال کر مجھے دیا اور بس۔
جب بھی ہم ملے اس رسم میں کبھی فرق نہ آیا۔ بے تکلفی میں یہ تکلف ان کی وضع تھی۔

ابھی تو میں پہلی ملاقات کا ذکر کر رہا تھا۔ اس ملاقات کے بعد میں کئی بار ان سے ملنے گیا۔ ۱۹۲۲ء میں میرے استاد حضرت احسن [illegible] زمانہ میں ملازم ہوگئے اور پھر تو تقریباً روز ہی زمانہ کے دفتر میں میرا آنا جانا ہو گیا۔ نگم آنجہانی سے بھی روزانہ کی ملاقاتیں ہونے لگیں۔ زمانے کا معیار وہ ہمیشہ بلند تر کرنے کی کوشش کرتے رہتے۔ انہیں اپنے بارے میں زیادہ خوش فہمی نہ تھی۔ یہی ان کی بڑائی کی ایک سبب اسی لئے وہ شروع سے کسی ممتاز صاحب قلم کو ہمیشہ ادارۂ زمانہ سے متعلق رکھتے۔ کم لوگوں کو شاید یہ بات معلوم ہو کہ درگا سہائے سرور جہاں آبادی کے شاگرد اور نوبت رائے نظر وغیرہ زمانہ کی ترتیب میں نگم آنجہانی کے معاون تھے۔ ان کے بعد احسن مرحوم اور یعقوب کلام [illegible] زمانہ کو ان کے ساتھ ترتیب دیتے رہے۔

زمانہ کا دفتر نگم آنجہانی کے مکان ہی میں نیا چوک میں تھا۔ وہ اپنے رسالے کا کام بڑی پابندی سے کرتے تھے۔ احساس [illegible] میں بھی وہ میز کرسی پر بیٹھ کر دفتری انداز میں کام کیا کرتے تھے۔ احسن مرحوم مضامین وغیرہ دیکھتے تھے اور نگم صاحب ادیبوں کو خود ہی خط لکھتے اور خطوط کے جواب دیتے۔ مضمون لکھنے سے وہ کانپ جاتے تھے۔ لیکن خط بہت اچھے لکھتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا خلوص کسی ادبی صنف یا پیکر میں ڈھل ہی نہ سکتا تھا۔ ان کی شخصیت خطوط کے آئینے ہی میں منعکس ہو سکتی تھی۔ ان کے خطوط میں ان کی ساری ادائیں نظر آتی ہیں۔ انہیں اردو کے تمام ادیبوں سے ان کے بہترین تعلقات تھے۔ ان کے خط پڑھئے۔ وہ یہی سمجھتے جیسے نگم صاحب یہ سب باتیں آپ کے سامنے بیٹھے کر رہے ہیں۔ زمانہ کے لکھنے والے ان سے بڑی محبت کرتے تھے اور محض زمانہ سے زیادہ عرصے تک غیر حاضر رہنے کے متعلق سوچ بھی نہ سکتے تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب ایک بار میرے یہاں آئے ان سے ملنے کے لئے چند دوستوں اور بزرگوں کو میں نے بلایا۔ نگم صاحب کو نہ بلا سکا۔ انہیں معلوم ہوا تو انہوں نے مجھے خط لکھا۔

عزیزی ثاقب صاحب

آپ سید زادے ہیں اور میں آپ کا حلقہ بگوش۔ آپ کا نہیں آپ کے بزرگوں کا۔ کاشی کے ساتھ کعبہ بھی میرا ہے۔ میں اب لکھوں تو کیا لکھوں، ڈاکٹر ذاکر حسین آئے اور آپ نے مجھے ہی نہ بلایا۔ اچھا شکایت پھر کروں گا۔ پہلے آپ کو نظیری کا ایک شعر سناؤں:

دیدہ ام دفتر پیمانِ وفا حرف بحرف — نام خوباں ہمہ ثبت است ہمیں نام تو نیست

کہئے اب بھی شکایت کی کوئی ضرورت ہے۔

[illegible] کے مصرعے بھی فقروں پر بند نہیں ہوتے۔ شاید اب [illegible]۔

آپ بہت [illegible] مشکور ہوں گا۔

مجاز

دیا نرائن

ان چند سطروں میں تعلقات، اخلاص، اعتراف اور شکایت کی ایک دنیا آباد ہے۔ یہ بات عجیب ہے کہ نگم صاحب [illegible] اور دوسروں کے اشعار تو درست کر دیتے تھے اور بڑے صاحب مرتبوں پر [illegible] عام طور پر شعر ناموزوں پڑھتے تھے۔ [illegible] تو وہ کبھی معاً بہت غلط پڑھتے تھے جیسے نشاش بشاش کو نشاش بشاش پڑھتے تھے۔ اسی طرح ایک مرتبہ کرشن بہاری [illegible] کے علاوہ پنڈت چکبست آنجہانی، اصغر گونڈوی مرحوم، ماسٹر عبدالصمد بزمی اور احسن مرحوم وغیرہ سب موجود تھے۔ نگم صاحب [illegible] گئے، وہاں شعر غزالاں میں انھوں نے جبڑا جبڑا کو جدا جدا [illegible] سے اور ذرا [illegible] بدل دیا گیا۔ سب ہی [illegible] لیکن نگم صاحب سے کون کہتا۔

دیا نرائن نگم کو زمانہ سے بڑا گہرا لگاؤ تھا۔ یہ رسالہ ان کی زندگی کا مقصد بھی تھا اور حاصل بھی —— رسالے کا اجرا [illegible] تھا عام طور پر انھیں زمانہ کا بانی سمجھا جاتا ہے مگر صحیح یہی ہے کہ گورنمنٹ ہائی اسکول کے ایک ہیڈ ماسٹر صاحب نے [illegible] میں زمانہ کا اجرا کیا تھا۔ [illegible] وہ یہاں سے کلکتے جانے لگے تو یہ رسالہ نگم صاحب کے حوالے کر گئے۔ انھوں نے زمانہ کو زمانہ بنایا۔ دیا نرائن نگم آنجہانی کے والد کچہری میں پیشکار تھے۔ وہ اپنے بیٹے کو وکیل بنانا چاہتے تھے لیکن نگم صاحب نے کبھی وکالت کے پیشے کو [illegible] اور ادبی دنیا کے ہو کر رہ گئے۔

زمانہ کے علاوہ انھوں نے ہفت روزہ آزاد بھی نکالا جو تقسیم ہند کے بعد تک [illegible] جاری رہا۔ اس کے اجرا کی تحریک [illegible] بازار کی شہادت سے ہوئی۔ دیا نرائن مسلمانوں کو ان کا حق دلانا چاہتے تھے۔ [illegible] بے باکی سے [illegible] اسکیموں سے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ وہ سچے نیشنلسٹ تھے۔ گاندھی جی کے بڑے معتقد [illegible]۔ اسی زمانہ میں نیشنلزم، ہندوستانی زبان، سوراج، مہاتما گاندھی اور ہندوستانی تمدن وغیرہ وغیرہ مسائل پر [illegible] مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ ۱۹۲۵ء کی بات ہے میں نگم صاحب سے ملنے ان کے دفتر گیا۔ احسن صاحب اس زمانے میں زمانہ کے مرتب رہتے تھے۔ جس وقت میں پہنچا اس وقت احسن صاحب اور نگم صاحب میں بات ہو رہی تھی۔ نگم صاحب زمانہ کا [illegible] نمبر نکالنا چاہتے تھے اور احسن صاحب اس تجویز کے خلاف تھے۔ ان کی یہ رائے تھی کہ زمانہ کو خالص ادبی پرچہ رہنا چاہیے۔ نگم صاحب کہنے لگے موجودہ زمانہ کے انداز کو سمجھئے۔ حالی، چکبست اور اقبال کی شاعری کو آپ کیا کہیں گے۔ ان کے یہاں کیا نہیں ہے۔ نیشنلزم، مذہبی مسائل، مسلمانوں کا [illegible]، ہندوستان کی آزادی —— ادب زندگی سے الگ کس طرح ہو سکتا ہے۔ پریم چند کے افسانے تو آپ برابر پڑھتے ہیں انھیں ادب کہیں گے یا نہیں؟ میں تو زمانہ میں سیاست، آرٹ، موسیقی، رقص، مذہب، تاریخ اور سب ہی موضوعات پر مضمون چھاپنا چاہتا ہوں۔ آپ دیکھ لیجئے گا کہ آئندہ ادبی پرچے ایسے ہی ہوں گے اور پھر لوگ کہیں گے [illegible] اس جنگ کی ابتدا زمانہ سے ہوئی تھی۔ قومی نمبر ضرور نکلے گا۔ چلئے ہم فیصلہ ثاقب صاحب پر چھوڑ دیں۔ نگم صاحب تو یہ کہہ کر الگ ہو گئے اور مزا یہ کہ فیصلہ خود ہی کر دیا کہ "قومی نمبر ضرور نکلے گا" اور فیصلہ ثاقب صاحب [illegible] میرے لئے یہ بڑا دشوار مرحلہ تھا۔ نگم صاحب کے فیصلے پر میری بات کا کیا اثر ہوگا —— اور احسن صاحب میرے استاد ہیں —— کچھ دیر یوں ہی چپ رہا پھر میں نے کہا کہ احسن صاحب نے آپ کی مخالفت کب کی؟ ان کا مقصد یہ تھا کہ آپ آزاد بھی نکالتے ہیں اور زمانہ بھی۔ سیاست کے لئے آزاد کے صفحات موزوں ہیں اور اگر زمانہ قومی نمبر نکالے تو ادبی شان کا [illegible] سیاسی مسائل پر بھی [illegible] کے مضامین لکھوائے

جائیں، قومی تمدن اور زبان کے مسائل پر غور کیا جائے، وطنی نظمیں شامل ہوں ——— آپ نے احسن صاحب کی پوری بات تو سن ہی لی۔ یہی کہنے جا رہے تھے میں اُن کا شاگرد ہوں اس لئے بہت کچھ تمہید سے کہہ جاتا ہوں۔ یہاں میری جان پر بنی، احسن صاحب کہنے لگے، جی ہاں یہی میرا مطلب تھا ورنہ زندگی سے تو بیزار ہوں کہ ہمیں نجات نہیں ملتی، مگر جان کہاں چھوٹی ... تو حسن صاحب بولے ” ٹھیک ہے ٹھیک ہے تو چلئے ابھی کام شروع کر دیں، میں ہندوستانی زبان پر مضمون لکھنا شروع کرتا ہوں آپ وطنی نظمیں لکھیں۔ ابھی اسی وقت “ دوسرے لمحے ہم دونوں سادے کاغذ لئے بیٹھے تھے۔ نظم صاحب ... بول اُٹھے، ”لیکن آپ وطنی موضوع میں وزن اور ہیئت نہ روح ہیئت کا ہیئت سے کوئی تعلق نہیں، مجھے احسن صاحب: حسن صاحب کہاں چپ رہنے والے تھے، وہ بھی کہنے ” واہ صاحب تعلق کیسے نہیں، مسلمات جغرافیائی حدود کا قائل نہیں ہوتا؟“ آخر جب نظم صاحب مولانا احسن کو قائل کر کے تو کہنے لگے ” یہ میرے دوستوں کی بس و دوروں میں کوئی چیز ہے، میری ہی خاطر کچھ اشعار لکھ دو۔“ پھر نظم صاحب میری طرف متوجہ ہوئے ” دیکھئے آپ اپنی نظم میں حالیہ سیاسی بیداری کا ذکر ضرور کیجئے گا اور ہاں مرکزی خیال کیا ہوگا آپ کی نظم کا؟“ میں نے ذرا تیز لہجے میں کہا ”نظم صاحب پہلے آپ مجھے کوئی ہدایات نہ دیجئے، مجھے وطنی نظم لکھنی ہے سو لکھ دوں گا۔“ میں نے کاغذ پر یوں ہی لکیریں کھینچنی شروع کر دیں۔ نظم صاحب خاموش ہو گئے اور میں نے بھی دیر تک اُن کی طرف نہ دیکھا، کچھ دیر کے بعد میں نے اپنے کاندھے پر دباؤ سا محسوس کیا، نظر اٹھائی تو دیکھا کہ نظم صاحب کھڑے مسکرا رہے ہیں اور پان اُن کے ہاتھ میں ہے ———

” پان کھاؤ ——— میں شرمندہ ہوں۔ یہ بھی تو بھول گیا تھا کہ تم صرف میرے دوست اور عزیز ہی نہیں شاعر بھی ہو، شاعر بڑا حساس ہوتا ہے، ایک رسالے کے ایڈیٹر کو تو یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہئے۔“

کتنی نرمی کے ساتھ وہ کیا کچھ کہہ گئے، مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں جیتی ہوئی بازی ہار گیا۔ دوست، شاعر، ایڈیٹر، حساس یہ سب باتیں مجھ پر ہنسنے لگیں۔ وہ مسکرا رہے تھے اور میں اُنہیں بس دیکھ رہا تھا اور چپ تھا۔

پان کیوں نہیں کھاتے ——— اسے پان نہ کھاؤ مسکراہی دو ——— اور میں مسکرانے کی جگہ ہنس پڑا۔

” تم نے کتنے شعر کہے؟

میں نے پوری نظم لکھ لی ہے۔

سچ۔

” سچ “ ” اور آپ کا مضمون ہو گیا؟

——— ہاں سرخی لکھ لی ہے ——— ” اپنی نظم سناؤ “

” اس میں حالیہ سیاسی بیداری؟

” پھر وہی باتیں “

میں کہہ رہا تھا کہ اس میں حالیہ سیاسی بیداری کا بھی ذکر ہے ——— یہ دیکھئے

محو کر دے اپنی پیشانی سے داغِ عبدیت ۔۔۔ پھر دکھا دے بل دُنیا کو طریقِ حریت

پھر بلندی پہ ہو تیرا پرچم حسنِ عمل ۔۔۔ تیری آوازِ صداقت پھر ہو آوازہ بلند

” بہت اچھے “ بہت اچھے ۔ چلو تم نے نظم لکھ دی ——— اگر اب بھی ناراض ہو تو کوئی پروا نہیں۔

” آپ ادب میں بھی حساب کتاب اور مول تول کرتے ہیں ——— اور ہم دونوں ہنس پڑے۔

یہ مضمون شائع نہیں ہے، لیکن اس سلسلے میں اپنے پڑھنے والوں سے عرض نہیں ہوں — یہ گراں قدر نگار صاحب کی شخصیت کے کئی پہلو سامنے آتے ہیں — پہلی بات یہ کہ وہ اپنے زمانے کی نوجوان نسل کے رہنما سمجھے جاتے تھے۔ یا شاید آپ کہہ سکتے ہیں کہ اسی نسل کے شعور کا ترجمان تھا اور یہ واقعہ ترقی پسند تحریک کی ابتدا سے بہت پہلے کا ہے ——— دوسری بات یہ کہ اُن کا نثری اسلوب کس قدر صحت مند اور انقلاب آفریں تھا۔ تیسری بات یہ کہ وہ اپنے اردو کو عام پہنچانے کے سلسلے میں کس قدر فعال اور سرگرم تھے اور ساری تاثیر کے دروازے کھولتے تھے۔۔۔ ان سب باتوں سے بڑی بات ان کی وسعت، دلی و دوست نوازی ——— مستزاد یہ کہ وہ بات بھی بڑی دلچسپ تھی کہ وہ دوستوں پر نہیں بلکہ اعتماد ان کا تھا وہ جو چاہتے لکھ لیتے ——— اور ان کے اس عہد کے قابل بنایا، ایک ایسا اعتماد تھا ——— ہم سب کے لئے کہ کسی بات سے انکار نہ ہوتا تھا ——— یہ بات میں نے خود بھی دیکھی کہ نگار صاحب کا طرز لکھنا غیروں کا ہی نہ تھا ——— ہم نے ان کی تحریر کا ٹوٹا پھوٹا حصہ دیتے تھے۔ یہ خوبی اُن کی گفتگو اور تحریر دونوں میں ہے۔ شاید ہی دوسروں کو اس کا پتہ نہیں۔

اس واقعہ کے تین چار دن کے بعد جب میں گیا تو کہنے لگے کہ ریڈیو کی خبر کے لئے میں نے ایک چھوٹا سا مضمون لکھ دیا ہے ایک بیاتوں کے متعلق اردو میں ہر طرح کی زبان کے بارے میں۔ میں نے کہا دیہاتوں سے مجھے بڑی دلچسپی ہے۔ اُن کی زبان سے ہے۔ دیہاتوں والا مضمون سنا دیجئے گا۔ بولے دیہاتوں سے کیوں دلچسپی نہیں، ہندوستان کی تو بڑی آبادی تو دیہاتوں ہی میں رہتی ہے۔ میں نے جواب دیا کہ مجھے، علاوہ شاعروں کے ان سے بھی دلچسپی ہے، وہ دیہاتوں سے اس لئے ڈرتے ہیں کہ وہاں سانپ رہتے ہیں۔ نگار صاحب مسکرائے۔ "آپ کیسے شاعر ہیں۔ محبوب کی زلفوں کو سانپ سے تشبیہ دیتے ہیں اور سانپ کے ڈر سے نہیں جاتے۔" میں خوش ہو کر ہنسنے لگا اور اردو شاعری سے محبت ہے۔ میں نے کہا کہ "محبوب کی زلفوں کو سانپ سے تشبیہ دینے کا دور گزر گیا۔ وہ بھی خوش ہوئے اور ہنسے، شعر کہتے ہوئے بات کرتے رہے اور بھی تو ہم نظم کہنے والوں میں ہوں" وہ ہنس کر بہت ہی خوش ہوئے اور پھر انہوں نے ہندوستانی زبان کے مسئلے پر اپنا مضمون سنایا۔ یہ مضمون نگار کے اُس نمبر میں شائع ہوا تھا۔ اس میں اس مسئلے پر جس انداز سے غور کیا گیا تھا، اس کی بنا پر آج بھی یہ مضمون ہمارے غور و فکر کا مستحق ہے۔ پریس، رسم الخط، اصطلاحات، سلیس اسلوب، نظام تعلیم میں تو ہر بات کی اہمیت۔ ان سب پہلوؤں پر انہوں نے بڑے اچھے مشورے دیئے ہیں۔ لیکن مجھے ان سے بنیادی اختلافات تھے۔ انہوں نے اردو کی جگہ ہندوستانی لکھا اور اردو و ہندی کو ایک ہی زبان قرار دیا، ہندی رسم الخط کی برتری کا دعویٰ کیا اور اردو رسم الخط کو غیر ملکی قرار دیا۔ ہمارے درمیان ذرا تیز قسم کی گفتگو ہوگئی۔ میں نے یہاں تک کہہ دیا کہ پھر آپ کا رسالہ نکالنا اور اردو ادب کی خدمت کا دعویٰ کرنا بالکل ڈھونگ ہے۔ آپ اردو رسم الخط کو غیر ملکی قرار دیتے ہیں تو گویا اردو زبان اور ہندوستانی مسلمانوں کو بھی غیر ملکی سمجھتے ہیں اور یہ زبان و رسم الخط کا تعلق لباس و جسم کا نہیں بلکہ جسم و روح جیسا ہے۔ اسی سرگرمی کے عالم میں میں اٹھ کر چلا آیا۔ اور ہفتے بھر گزر گئے اور میں اُن کے یہاں نہ گیا۔ پھر ایک دن وہ خود چلے آئے اور ہم دونوں یوں باتیں کرنے لگے گویا کوئی بات ہی نہ ہوئی تھی۔ آج جب میں اُن کے بارے میں اپنے تاثرات لکھنے بیٹھا ہوں تو دل کہتا ہے کہ ضرور ہے کہ ہمارا اختلاف اصولی تھا ذاتی نہیں، اور میں آج بھی اپنے کو صحیح سمجھتا ہوں۔

نگار صاحب ایک مرتبہ اور مجھ سے ناراض ہو گئے تھے، سودا کے متعلق برادر محترم اثر لکھنوی کا ایک طویل مضمون کئی قسطوں میں زمانہ میں شائع ہوا تھا۔ جب میں نے جامعہ ملیہ کے لئے سودا کا انتخاب کیا تو غالباً اثر صاحب کی اجازت سے اس مضمون کے بعض حصوں کو زمانہ کے حوالے سے بغیر دیباچے کے طور پر شامل کر لیا تھا۔ انہیں یہ گراں گزرا کہ زمانہ کا حوالہ کیوں دے دیا۔ اور انہوں نے اس کا اظہار اپنے تبصرے میں بھی کر دیا۔ اُن کی یہ شکایت کچھ ایسی بیجا بھی نہ تھی، جب کہ زمانہ سے انہیں اتنی محبت* اور رقابت تھی، لیکن ایسی باتوں نے ہمارے تعلقات

کو کبھی متاثر نہ کیا۔

یہ ہمیشہ سے میری عادت رہی ہے کہ میں دوستوں سے ان کی گھریلو زندگی کے بارے میں کچھ نہیں پوچھتا، وہ خود بتا دیں تو الگ بات ہے ــــ منشی صاحب آنجہانی سے بھی اس قسم کی گفتگو بہت کم ہوئی۔ اس لئے میں آپ کو نہیں بتا سکتا کہ وہ شوہر کی حیثیت سے کیسے تھے، لیکن یہ یقین ہے کہ ان کی ازدواجی زندگی بہت ہی خوش گوار ہوگی۔ وہ وسیع القلب تھے اور انسانوں سے بے پایاں محبت کرتے تھے۔ ان کے پانچ بیٹے ہیں ــــ بڑے بیٹے مسٹر راج نرائن نگم وکیل ہیں اور والد کے انتقال کے بعد غالباً ۱۹۴۰ء تک "زمانہ" نکالتے رہے۔ نگم صاحب آنجہانی کو اپنے بیٹوں سے بڑا پیار تھا اور وہ اس باب میں خوش نصیب بھی تھے۔ آج ان کے سب بیٹے اچھے عہدوں پر فائز ہیں۔ ایک بیٹا آئی سی ایس ہے دوسرا بیٹا پی سی ایس اور تیسرا انڈین پولیس سروس میں۔ یہ چند بکھری ہوئی یادیں ہیں۔ ان میں کوئی منطقی ربط نہیں اور پھر محبت منطق کی حد سے آزاد ہے۔ آخر میں یقیناً آپ مجھے اس قسم کی باتیں لکھنے پر معذور کریں گے کہ منشی دیانرائن نگم بڑے آدمی تھے اور ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ نگم صاحب کے متعلق یہ سب کہنا مجھے بے معنی معلوم ہوتا ہے۔

سائل دہلوی

مالک رام

نواب سراج الدین احمد خاں سائل ۱۵ ستمبر ۱۹۴۵ء کو دنیا سے [illegible] رخصت ہوئے تھے۔ چونکہ سال ولادت ۱۸۶۴ء تھا، اس طرح عمر ۸۱ برس ہوئی۔ اللہ کریم انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے [illegible] میں مجھے [illegible] بہت [illegible] دنوں سے خیال کر رہا تھا کہ اپنے تاثرات قلم بند کر دوں، لیکن [illegible]

تجھ کو بھی دیکھیں، نہ مجنوں نے کیا [illegible] فرصت کہاں [illegible]

میں تعلیم ختم کرنے کے بعد [illegible] تو مجھے بد قسمتی [illegible] نہ سکے۔ ان ایام میں یہاں [illegible] میرے ایک مہربان تھے جنہیں [illegible] سے بہت [illegible] انہوں نے ۱۹۲۳ء کا گرمیوں میں مجھے لکھا کہ اگر تم یہاں آ جاؤ تو [illegible] چنانچہ میں [illegible] دلی پہنچ گیا۔ یہ وقت میری پہلی آمد تھی۔ میں اس سے پہلے یہاں کبھی نہیں آیا تھا۔ اپنے رجحانات کے باعث مجھے اس [illegible] سے جو دلچسپی رہ سکتی تھی، اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہاں پہنچ کے مجھے کتنی خوشی ہوئی ہوگی۔

ان دنوں یہاں میرے ایک ہم وطن عزیز دوست جگت سنگھ رہتے تھے۔ ساتھ کے کھیلے ہوئے، ساتھ کے پڑھے ہوئے۔ یہاں [illegible] کا [illegible] معاملہ تھا۔ وہ آج کی طرح جب بھی ایک اسکول میں مدرس تھے۔ [illegible] دو تین دن کے بعد وہ ایک صبح مجھ سے کہنے لگے۔ تمہیں اردو لکھنے پڑھنے کا شوق ہے، کسی دن فرصت ہو تو لال کنویں پر ایک بڑے نواب صاحب رہتے ہیں، سراج الدین خاں نام ہے۔ ان سے جا کر ضرور ملو۔ میں نے پوچھا کون نواب سراج الدین احمد خاں؟ وہی تو نہیں جو سائل تخلص کرتے ہیں۔ [illegible] ویرانہ راہ [illegible] اگلے دن اتوار تھا۔ میں نے ناشتہ کے بعد لال کنویں کی راہ لی۔

بوقت صبح چو مردم بکار و بار روند — بلاکشان محبت بکوئے یار روند

جگت سنگھ صاحب کو سائل صاحب کے مکان کا ٹھیک ٹھیک علم نہیں تھا۔ وہ بس اتنا ہی جانتے تھے کہ کہیں لال کنویں کے محلے میں رہتے ہیں۔ البتہ مجھے معلوم تھا کہ ان کا [illegible] خاندان سے تعلق ہے۔ اس لیے میرے دل میں اطمینان تھا کہ ایسی معروف ہستی کا مکان تلاش کرنے میں

کوئی وقت پیش نہیں آسکتی۔ چنانچہ میں پوچھتا پوچھتا گلی قاسم جان میں جا پہنچا جہاں اس خاندان کے مکانات ہیں۔ یہاں میں نے ایک شخص سے پوچھا کہ میں نواب سراج الدین احمد خاں کے ہاں جانا چاہتا ہوں۔ وہ اس وقت نواب ضیاء الدین احمد خاں عرف نیر رخشاں خلف نواب [illegible] احمد بخش خاں کے مکان کے سامنے تھا۔ اس شخص نے جواب دیا کہ یہاں سے دریافت فرمائیے۔ میں نے مڑ کر دیکھا، تو میرے سامنے جناب نیر رخشاں [illegible] تھا۔ میں نے اپنا سوال اس سے دہرایا۔ اس نے کہا، جناب وہ اس گلی میں نہیں رہتے۔ ان کا مکان لال دروازے میں ہے۔ مجھے شبہ ہوا کہ شاید نام سننے میں کچھ غلطی ہوئی ہے۔ اس لیے میں نے دوبارہ تاکید سے کہا کہ میں نواب سراج الدین احمد خاں صاحب کے ہاں جانا چاہتا ہوں۔ جی ہاں۔ میں سمجھ گیا۔ جو شاعر ہیں اور جن کے گھر میں شاعری ہوتی ہے۔ وہ لال دروازے میں رہتے ہیں۔ آپ چلیے میں آپ کو پہنچائے آتا ہوں۔ چنانچہ ہم دونوں گلی قاسم جان سے نکل کے لال کنویں میں آگئے۔ لال دروازہ کچھ دور نہ تھا۔ بس چند قدم کا فاصلہ ہے۔ اس کے اندر چند قدم چل کے وہ مجھے ایک اونچی کرسی کے مکان کے سامنے لے گیا۔ کہنے لگا حضور یہ ہے نواب صاحب کا مکان۔ اس کے بعد اس نے ملازم کو آواز دی اور میری طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے کہا کہ آپ نواب صاحب سے ملنا چاہتے ہیں اور مجھے اس کے سپرد کر کے خود واپس چلا گیا۔

میں ملازم کے پیچھے سیڑھیاں چڑھ کے ڈیوڑھی میں آیا۔ اندر داخل ہوتے ہی بائیں طرف ایک چھوٹی سی کوٹھڑی نظر آئی۔ ملازم کے کہنے پر اس طرف کے کمرے میں [illegible] دروازہ سامنے [illegible] جس پر پردہ پڑا تھا۔ یہ کمرے کے صحن میں [illegible] تھا۔ [illegible] گئی تھی، جس پر لکھا تھا "مکان [illegible]" سے دیکھ کر مجھے [illegible] والا لطیفہ یاد آگیا۔

[illegible] بغل میں بیٹھنے کا کمرہ تھا جس میں داخل ہونے کے لیے دو سیڑھیاں چڑھنی پڑتی تھیں۔ ملازم نے کمرے کا دروازہ کھولا اور مجھے یہاں بٹھا کے خود نواب صاحب کی خدمت میں اطلاع دینے چلا گیا۔

میں نے اپنے اردگرد نگاہ دوڑائی تو دیکھا کہ یہاں اچھا خاصا مشرقی اور مغربی تمدن کا امتزاج ہو رہا ہے۔ [illegible] تھا۔ اس کے اوپر نصف کمرے کے الگ [illegible] سپید براق چاندنی بچھی تھی۔ صدر میں ایک چھوٹا سا [illegible] اور دو بڑے بڑے گاؤ تکیے لگے رکھے تھے۔ نشست کے قریب چاندی کا پاندان، [illegible] اور تین اگالدان اور سگرٹ کی راکھ جھاڑنے کی پیالیاں دھری تھیں اور جہاں چاندنی نہیں تھی وہاں چند کرسیاں اور ایک چھوٹی سی تپائی رکھی تھی۔ میں بھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک نورانی صورت بزرگ کمرے میں داخل ہوئے۔

تقریباً ستر برس کا سن، کوئی چھ فٹ کا قد، نہ فربہ نہ خفیف، [illegible] رنگت، [illegible] کشادہ پیشانی، اونچی ناک کی لمبی عقابی قسم کی نوک دار ناک۔ گلے کی ہڈیاں نمایاں [illegible] جسم، مہندی لگی ہوئی [illegible] ڈاڑھی [illegible] تو یقیناً تھی دو انگشت کی خدا جانے۔ شرعی لبیں، آنکھیں نسبتاً چھوٹی، لمبے لمبے [illegible] ٹوپی جس کے نیچے سے لمبے لمبے کھچڑی بال نکلے پڑتے تھے۔ گلے میں کاج بٹی کے گریبان اور کھلی آستینوں کا ململ کا کرتہ [illegible] نیچے ٹخنے کا آدھا پاجامہ۔ پاؤں میں [illegible] کا جوتا۔ دائیں ہاتھ میں لکڑی اور بائیں میں سگرٹ کا بکس اور دیا سلائی کی ڈبیا۔

یہ تھے نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی بن نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب بن نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر نیر رخشاں بن فخر الدولہ نواب احمد بخش خاں بہادر رستم جنگ والی فیروز پور جھرکہ و لوہارو۔ [illegible] کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک جگہ کہا ہے

سائل کرنہ پیشہ سفارت سے دیکھنا نواب پانچ پشت سے اک [illegible] ہے

میں اٹھ کے آداب بجا لایا۔ بہت لطف سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ پہلے مجھے بٹھایا پھر خود دوسری کرسی پر تشریف فرما ہوئے۔ نام پوچھا، مقام پوچھا، تعلیم اور روزگار کا حال پوچھا۔ چونکہ خود شاعر تھے انھوں نے خیال کیا ہوگا کہ یہ جو ملنے کے لیے آیا ہے تو ضرور شعر بھی کہتا ہوگا۔ پوچھنے پر میں نے عرض کیا

[illegible] اتفاق [illegible] تو چپ ہو کر صبر کر لیا گیا۔ پھر فرمایا لیکن [illegible] کا شبہ نہیں [illegible] یاد رکھا۔
[illegible] کی سے نئی [illegible] ایک خط [illegible]
[illegible] ہوتا ہے [illegible] بہت پریشانی تھا۔ [illegible] ایک [illegible]
تھا۔ لیکن [illegible] بہت منقبض ہوئے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
اتفاق سے [illegible]
[illegible]
اگلے روز مجھے پھر [illegible] بہت [illegible] تھا لیکن [illegible]
کچھ ایسا مشکل نہیں تھا۔ حکومت [illegible] کے ساتھ [illegible] لوگ بھی [illegible] دلی جاتے رہتے تھے۔ چنانچہ جب ستمبر [illegible]
دلی آنے [illegible] کے بعد [illegible] ۱۹۴۳ء کے [illegible]
تھا تو ان کے ہاں [illegible] دراصل [illegible] ہے جب مجھے [illegible] بہت [illegible] دیکھنے کا اتفاق ہوا۔
اب تفصیل [illegible] کیا [illegible] کیسے [illegible] ہمارے تعلقات [illegible]
[illegible] جب تک [illegible]
[illegible]
[illegible] مجھے خوشی ہے [illegible]
[illegible] اور [illegible]
کھانے پینے میں مزاج بہت نفاست پسند تھا۔ [illegible] اس بات کی کوشش کرتے [illegible] برداشت
نہیں کر سکتے تھے [illegible] انگلیوں [illegible] استعمال کرتے تھے۔ [illegible]
پسند تھا [illegible] جب تمام پانی [illegible] ٹپک جاتا [illegible] دو چیزوں [illegible]
اور [illegible] کے درمیان [illegible] جیسے [illegible] کے کونے [illegible] کاٹ لیتے۔ ناشتے میں [illegible] ہوتا
تھا اور وہ اسے ہمیشہ کانٹے سے کھاتے تھے۔
کھانے میں مچھلی بہت پسند تھی، لیکن کانٹے سے ڈرتے تھے۔ آخری عمر میں [illegible] میں بھی فرق آ گیا تھا۔ [illegible] کھائی نہیں دیتا تھا۔ اس لئے
عام طور پر بیگم صاحبان کے لئے [illegible] کانٹا نکال [illegible] خوراک بہت کم تھی۔
ایک دن ناشتہ پر فرمایا [illegible] آج ہمیں سیر کے لئے باہر جانا ہے۔ اب [illegible] معمول ہو
گیا تھا کہ جب وہ مجھ سے کچھ کہنے کو کہتے [illegible] نہیں کرتا تھا۔ وہ میری عادتوں سے خوب واقف تھے اور انہیں معلوم تھا کہ [illegible]

پیدل چلا ہیں ۔ چونکہ اہل کن سی بات پر اس نے مجھے یقین تھا کہ وہ مجھ سے کوئی ایسا ایسا اور اپنے نہیں کہیں گے ۔ جو میرے خلاف طبع ہو ۔ اس لئے میں نے بھی میں نے نہیں پوچھا کہ کہاں جا رہا ہے ۔ صرف اتنا کہہ دیا بہت اچھا ۔ انہوں نے کسی دوست سے گاڑی [illegible] لی تھی ۔ وہ گاڑی سے آئے ہم بیٹھے اور سے اور [illegible] کے راستے حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مزار پر پہنچ گئے ۔

نواب سائل مرحوم کے خاندان کے بزرگوں سے بہت عقیدت رہی ہے ۔ [illegible] ۔ قبلہ ان کے دادا نواب احمد بخش خاں کے چھوٹے بھائی نواب الٰہی بخش خاں معروف [illegible] حضرت [illegible] کے متعلق ہیں اس سے کم مشہور نہیں ۔ وہ حضرت مولانا فخر الدین سے مرید اور خلیفہ تھے ۔ خود نواب [illegible] اپنے چھوٹے بھائی کے ذریعہ انہوں نے بھی مولانا فخر الدینؒ کی بیعت کی تھی ۔ [illegible] انہوں نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کا نام حضرت خواجہ ضیاء الدین اجمیری کے نام کی رعایت سے غلام ضیاء الدین رکھا ۔ [illegible] سائل صاحب بھی حضرت مولانا شاہ [illegible] صاحب کے ہاتھ پر بیعت تھے ۔ یہ بزرگوار نہ عربی تھے ۔ خاقانی تخلص [illegible] ذوق کے شاگرد تھے ۔ دیوان [illegible] موجود ہے

میاں سلطان جی [illegible] ۔ یہ پہلا چہرا تھا [illegible] حضرت محبوب [illegible] ۔ یہاں [illegible] کے بعد باہر صحن میں چٹائی ہوئی [illegible] آکے بیٹھ گئے ۔ چند کام میں ہمارے پاس آئی تھے وہ نواب صاحب کو اچھی طرح جانتے تھے ۔ یہ بھی ایک ایک شاعر کے گھر جا کر حال پوچھتے رہے ۔ ایک مجاور [illegible] آیا ۔ [illegible] نے ان سے کچھ [illegible] کیا ۔ [illegible] ۔ [illegible] سب [illegible] وہاں [illegible] ۔ [illegible] مسلمانوں کے [illegible] ۔ [illegible] مقامات پر [illegible] ۔ [illegible] ایسے لوگ بھی [illegible] کے دل صاحب [illegible] کے افراد سے [illegible] ۔ [illegible]

پہلے تو میرے جی میں آئی کہ ان سے کچھ بحث کروں لیکن [illegible] ۔ ہمارے [illegible] لوگ جمع ہو رہے تھے ۔ [illegible] نے [illegible] اور خوش [illegible] دیکھی ۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اسے پوری نہیں ۔ [illegible] ضرور سمجھے ہوں گے ۔

شاید اس سے کچھ غلط فہمی پیدا ہو جائے اس لئے میں ایک اور واقعہ بھی لکھ دیتا ہوں جس سے ان کے مذہب [illegible] صاحب مذہب [illegible] پر روشنی پڑتی ہے ۔

میں اس زمانے میں [illegible] باغ میں رہتا تھا ۔ ان دنوں جامعہ ملیہ کے [illegible] مسجد کے زیر سایہ خرابات [illegible] پیدا کرنے کی میں نے یہاں کے [illegible] میں [illegible] رکھا تھا ۔ [illegible] ایک [illegible] مکتبہ جامعہ کے مہتمم [illegible] حامد علی خاں صاحب سے ملنے گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں اچھا خاصا مجمع ہو رہا ہے ۔ [illegible] کے علاوہ باہر کے ایک بہت بڑے عالم اور مصنف بھی موجود تھے ۔ میں نے انہیں ذاتی طور پر کبھی نہیں دیکھا تھا ۔ البتہ ان کی [illegible] تصویریں دیکھی تھیں ۔ میں نے انہیں [illegible] پہچان لیا [illegible] ۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ [illegible] اور یہ لوگ ابھی ابھی [illegible] کھا کے بیٹھے ہیں ۔ میرے قریب جو صاحب تشریف فرما تھے ان سے معلوم ہوا کہ مشار الیہ بزرگ [illegible] کے سلسلے میں یہاں تشریف لائے ہیں [illegible] ۔

صورت یہ ایک [illegible] کے [illegible] اور بہت [illegible] کے علاوہ ایک مشہور [illegible] کے ایڈیٹر بھی تھے ۔ کچھ عرصہ پہلے ملی کے ایک [illegible] نوجوان نے ان کی ایک [illegible] کتاب پر [illegible] رسالے کی صورت میں شائع کی تھی ۔ اس میں [illegible] کی غلطیاں نکالی تھیں [illegible] ۔ [illegible] سے تجاوز کر گئے تھے لیکن [illegible]

مضمون لکھ کر اُلٹی باتیں شروع کر دیں کہ یہ مصنف جو حقیقت میں تصنیف کا بیان زبردستی کر رہے ہیں یہ صحیح نہیں
علم و عقل کی بات نہیں ہے جس طرح یہ لوگ ایک دوسرے کے خلاف باتیں نہیں کر سکتے۔ مولوی صاحب کو شبہ ہوا کہ
مصنف کی تصنیف میں ایک بات خلاف حقیقت ہے جو یہیں دہلی میں رہتے تھے۔ جنرل امام شمس الدین تھے۔ صاحبزادہ تحسین کے
ہم عصر بہت اچھا ہے۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ شناخت نہیں رکھتے تھے مگر ملاقات رہتی تھی ان کے باعث ان کی
بھی بات ہے اور ایک دوسرے کے خلاف ہو جاتے ہیں۔ یہاں بھی اسی طرح کا معاملہ پیش آیا۔ یہ دونوں صاحب ہمارے ہی ملک کے رہنے والے
ہیں جن کے نظریات اختلاف کی وجہ سے ایک دوسرے کے مخالف ہو گئے۔ مولوی صاحب نے اس تبصرے کی غرض سے
انہوں نے اپنے مضمون میں یہ لکھ دیا کہ یہ خوب جانتے ہیں کہ ... وہ مستحق ہے اور کس نے یہ کتاب لکھی ہے کہ
چھپائی ہے۔ یہ بھی مشہور ہو گیا کہ رسالے کے مصنف کا نام بھی ہے۔

جونہی یہ پرچہ ملک میں پہنچا، بھیجا یہ تنقید چھپی تھی اس نوجوان مصنف نے کورٹ میں دعویٰ دائر کیا کہ عدالت میں ہتک عزت کا دعویٰ کیا مقدمہ دائر
کر دیا کہ فلاں مجلہ کے ایڈیٹر نے میری حقیقی قابلیت پر حملہ کر کے میری ہتک کی ہے نیز یہ شبہ کر کے کہ میں نے یہ کتاب کسی اور سے لکھوا کے اپنے نام سے چھپوا
دی ہے میری شہرت اور عزت پر حملہ کیا ہے۔ ٹھیک طور پر یاد نہیں رہا۔ ہرجانہ غالباً دس ہزار روپیہ طلب کیا گیا تھا۔

جو حضرات قانون سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ معاملہ کس قدر سنگین تھا۔ قرائن ایسے تھے کہ جرم ثابت ہو جاتا اور مولوی صاحب کو سزا ہو جانے کا
ہر طرح امکان پایا جاتا تھا اس لئے قدرتی طور پر سب لوگ تشویش کا اظہار کر رہے تھے۔ اتفاق سے اسی مقدمے کی پیشی کی اور میں اسی سلسلے میں یہاں آئے تھے۔

اتفاق کی بات کہ میں اس نوجوان مصنف سے چند دن پہلے نواب سائل صاحب کے مکان پر مل چکا تھا اور ان کا یہ رسالہ بھی دیکھ چکا تھا۔ نواب صاحب
نے تعارف کراتے ہوئے ان کی تعریف کی اور ان کے والد مرحوم سے اپنے قدیم دوستانہ تعلقات کا ذکر کیا تھا۔ یہ نوجوان بھی مجھ سے اسی طرح خندہ پیشانی سے ملے
جیسے ایک نوجوان اپنے بزرگ سے ملتا ہے۔ میں نے جب اس مقدمے کی روداد سنی تو میرے ذہن میں یہ خیال گزرا کہ اگر نواب صاحب کوشش کریں
تو شاید ان کی وساطت سے کچھ سمجھوتہ ہو جائے۔ چونکہ مقدمے کی پیشی اگلے دن تھی اور وقت تنگ تھا اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ ابھی جا کر ان سے ملنا
چاہئے تاکہ کل صبح عدالت کے وقت سے پہلے اس نوجوان سے بات چیت کی جا سکے۔ میں نے جب اپنے اس خیال کا اظہار کیا تو وہاں موجود لوگوں نے اتفاق کیا
کیا تو انہوں نے بھی میری اس تجویز پر صاد کیا اور زور دیا کہ اگر تم کچھ کر سکتے ہو تو اس سے دریغ نہیں کرنا چاہئے۔ غرض کہ میں بازار سے بائیسکل پر سوار ہو کر ان
کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں جب سائل صاحب کے ہاں پہنچا تو ساڑھے دس سے زیادہ ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود بھی انہیں میرے آنے کی اطلاع ہوئی
فوراً نیچے اتر آئے اور چھوٹتے ہی پوچھا کہیں خیر تو ہے؟ میں نے کہا، نہیں تو کوئی ایسی بات نہیں۔ کہنے لگے اب میرے تو آنے سے رہا۔ اس سردی کے وقت
اتنی رات گئے دل باغ سے تمہارا آنا بے سبب نہیں ہو سکتا۔ الغرض میں نے بے آرامی کی معافی چاہتے ہوئے سارا قصہ بیان کیا تو انہوں نے جو کچھ جواب میں
کہا وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ فرمایا۔ "میاں تم بہت بھولے ہو۔ تم ان مولویوں کو نہیں جانتے۔ انہیں اپنے علم کا غرور ہے، انہیں اپنی نمازوں کا غرور
ہے، اپنے روزوں کا غرور ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کے علم اور عبادت کی وجہ سے لوگ ان کے آگے سجدے کریں اور ان کے ہاتھ چومیں۔ ان کی ہر بات پر
آمنّا اور صدقنا کہیں۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اب تو لڑکا اپنے سگے باپ کی الٹی سیدھی بات ماننے کو تیار نہیں ہوتا اور کہہ دیتا ہے 'ابا جان یہ بات تو کچھ سمجھ میں نہیں
آئی۔' بھلا یہ غیر کا کونسی خاطر رکھتے ہیں کہ دنیا ان کی ہر بات بے چون و چرا تسلیم کرے گی۔ تم اس نوجوان سے مل چکے ہو۔ وہ گھر کا اچھا کھاتا پیتا ہے اس
کے والد میرے اچھے دوست تھے۔ یہ ان کا اکلوتا لڑکا ہے اور وہ اس کے لئے اچھی خاصی پونجی چھوڑ کر مرے ہیں۔ اس کی عربی اور مشرقی علوم کی باقاعدہ
تعلیم ہوئی ہے اور وہ بُرا نہیں ہے۔ مجھے اس مقدمے کا علم نہیں تھا لیکن اگر انہوں نے اس کے خلاف کچھ لکھا ہے تو اسے بجا طور پر دکھ ہونا ہی چاہئے۔ علاوہ
اگر انہوں نے اس دوسرے عالم کی مخالفت کے جوش میں کوئی ایسی بات لکھ دی ہے جس پر قانونی گرفت ہو سکتی ہے تو انہیں اس کا خمیازہ بھگتنا ہی چاہئے۔

ہو الیکشن تھا۔ شاید یہ لوگ اولاد میں سے ہیں اس معاملے میں دخل دیتے ہیں لیکن اتنا میں بھی نہیں مانتا۔ لیکن ہماری خواہش ہے میں اپنی طرف سے لکھوں یہ ضروری سمجھتا ہوں۔ کل آپ حضرات یہ پڑھیں گے تو ان کی خدمت میں خود اس کے پاس چلا جاؤں گا۔

یہ مختصر سی داستان صرف اس لئے بیان کی ہے کہ اس سے سائل صاحب کے گھرانے دین سے متعلق خیالات پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ خود کوئی بہت بڑے عالم نہیں تھے۔ مگر جد بزرگوار کے جو نمونے نے شمس العلما ڈپٹی نذیر احمد مرحوم سے کچھ عربی پڑھی تھی۔ حدیث کی چند کتابیں مشہور عالم مولوی سید نذیر حسین محدث دہلوی سے پڑھیں لیکن اس کے باوجود ہم کسی طرح یہ نہیں کہہ سکتے کہ انہیں عربی علوم یا مذہب کچھ ایسی بڑی واقفیت تھی کہ انہیں علمی مولوی کا ہم مقابل خیال کیا جائے۔ بلکہ اپنی خاندانی روایات کے مطابق وہ بہت خوش عقیدہ تھے اور سب علماء اور اصحاب فضل کا نام احترام سے لیتے تھے لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ جہاں وہ حقیقی بزرگی اور علم کے قدرشناس اور پرستار تھے، وہیں بناوٹ اور ملمع کے سخت دشمن بھی تھے۔ کسی بڑے سے بڑے آدمی کی شوکت اور شہرت انہیں مرعوب نہیں کر سکتی تھی اور وہ اپنے خیالات کے اظہار میں کوئی لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے۔

دیکھئے، بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ میں ذکر کر رہا تھا کہ ہم حضرت محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مقدس کی زیارت سے مشرف ہو کر باہر نکلے اور پھرتے پھراتے جناب خواجہ حسن نظامی مرحوم کے دولت کدے پر پہنچ گئے۔ سائل صاحب اور خواجہ صاحب میں پرانی بے تکلفی تھی۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں لیکن غالباً یہ بھی فرمایا تھا کہ میری تحریک؟ از انسٹھ جناب خواجہ صاحب کی لکھی ہوئی ہے۔ خواجہ صاحب مرحوم مکان پر تشریف نہیں رکھتے تھے۔ ان کے بڑے صاحبزادے حسین نظامی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ یہاں تھوڑی دیر ان سے بات چیت ہوئی۔ پان اور چائے پانی سے کچھ تواضع بھی ہوئی۔ اس زمانے میں خواجہ صاحب موصوف فاسفورس کے تیل اور سوہا بین کا بہت اشتہار دے رہے تھے جانے جیسے ان چیزوں کا ذکر چل پڑا۔ حسین نظامی صاحب نے ان دونوں چیزوں کا ایک ایک نمونہ ہمیں پیش کیا اور ہم ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان سے رخصت ہوئے۔

باہر نکلے تو میں نے کہا کہ اب آئے ہیں تو چلئے، آپ کے دادا جان کے مزار پر بھی فاتحہ پڑھیں۔ چنانچہ ہم گھومتے گھامتے نولکھا کمبا کے پاس اس احاطہ میں پہنچ گئے، جہاں غالب ابدی نیند سو رہے ہیں۔ یہاں فاتحہ کے بعد مختلف قبروں کی نشاندہی کرتے رہے۔ چنانچہ بتایا تھا کہ غالب کے پاس والی قبر معروف کی ہے۔ اس گنبد معروف کی بیوی ہیں۔ ان کے بعد ان کے صاحبزادے علی بخش خاں کی قبر ہے۔ معروف کی پائنتی ان کے ایک مرید محمد حیات خاں ولد احمد یار خاں (رام پوری؟) ہیں اور ان کے برابر میں ان ہی کے صاحبزادے خان بہادر محمد نظام الدین خاں ہیں۔

دلی کی ایک ایک اینٹ کے نیچے ایک داستان اور ایک تاریخ دفن ہے۔ ہم یہ اینٹیں الٹتے پلٹتے، باتیں کرتے اور مختلف بزرگوں اور بادشاہوں کی بدانجام کا بھول سے درس عبرت لیتے ہوئے وہاں پہنچے، جہاں گاڑی ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ اب جو چلے، تو ڈیڑھ ایک بجے کے قریب قطب میں ہیرو لال جیلبر پر پہنچ کے دم لیا۔ یہاں کے انتظام دیکھ کر مجھے کچھ تعجب سا ہوا۔ شمالی برآمدے میں دریاں بچھ چکی تھیں۔ ایک طرف چولھا گرم ہو رہا تھا۔ ایک ملازم چائے کا سامان ایک چھوٹے سے تخت پر قرینے سے لگا رہا تھا۔ جب ہم داخل ہوئے، تو نواب صاحب نے ملازم سے پوچھا، کہ میاں بھائی کے آنے میں کتنی دیر ہے۔ حضور وہ اب آنے ہی والے ہیں۔ آپ تشریف رکھئے۔ حکم ہو تو چائے تیار کروں۔ نہیں میاں، ہم بھائی کے آنے سے پہلے کیسے پی لیں، یہ تو ٹھیک نہیں۔ حضرت، اتنے تکلف کی کیا ضرورت ہے۔ وہ آئیں گے تو دوسری دور ہو جائے گا۔ بس چٹکی میں تیار کئے دیتا ہوں۔ پانی تو آگ پر رکھا ہی تھا، اس نے ایک جھپکے میں چائے کی دو پیالیاں بنا کے ہمارے سامنے رکھ دیں۔ نواب صاحب کا حال تو مجھے معلوم نہیں، لیکن میں اس دو تین گھنٹے کی گھنڈر گردی سے خاصی تھکن سی محسوس کرنے لگا تھا۔ ہم ابھی چائے ختم بھی نہیں کر پائے تھے، کہ نیچے زمین پر ایک گاڑی آ کے رکی اور اس میں سے ایک بزرگ برآمد ہوئے۔ ۵۵۔۶۰ برس کا سن، سانولا رنگ، لانبا قد، اکہرا جسم، کھچڑی ڈاڑھی، ٹھوڑی پر زیادہ، گلوں پر کم، بدن پر بند گلے کا شیروانی نما لمبا گرم کوٹ اور نیچے گرم پاجامہ۔ سر پر بادامی رنگ کی ٹوپی۔ وہ آئے اور آداب عرض کر کے، نواب صاحب کے پہلو میں بیٹھ گئے۔ جب ایک دوسرے کا حال احوال پوچھ چکے، تو نواب صاحب نے کہا، بھائی، میں تم سے اس عزیز کا تعارف کرانا چاہتا ہوں۔ پھر میرے متعلق چند کلمے کہہ کر مجھ سے فرمایا: آپ خان بہادر

[illegible] صاحب بھی [illegible] نہیں [illegible]

[illegible] ذوق کا ذکر آیا ہے لیکن [illegible] دیوان کا نام [illegible] ہیں۔ دیوان ذوق کے [illegible]
[illegible] کسی استاد کے خلاف کچھ [illegible] نہیں [illegible]
ہے اگر کہیں ایک طرف کی [illegible] ہے تو اس کی [illegible] کر دیتی ہے۔ یہاں [illegible] لیکن [illegible]
[illegible] شعر [illegible] اعتراض کیا [illegible]

ذوق ۱۸۵۴ء میں فوت ہوئے۔ وفات سے پہلے وہ اپنا دیوان جمع نہیں کر سکے تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے [illegible] اور مولانا محمد حسین آزاد نے یہ کام اپنے ذمہ لیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ [illegible] حافظ محمد اسمٰعیل [illegible] گھر [illegible] کے ساتھ ہی ذوق کا کلام بھی ضائع ہو گیا۔ جو بچا کچھا تھا اسے [illegible] ذوق کے شاگرد [illegible] کر کوئی استاد کا نام [illegible] دونوں صاحبوں نے [illegible] اور حافظ ویران کے پاس [illegible] حاضر باش شاگرد تھے اور ان کا کلام بھی سب سے زیادہ ان ہی کو یاد تھا چنانچہ [illegible] ۱۸۶۲ء میں دیوان ذوق کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا۔ اس کے ایک مدت بعد مولانا آزاد نے بہت کچھ ترمیم کر کے [illegible] ایک اور دیوان شائع کیا جو اب متداول ہے۔

حافظ ویران استاد کی [illegible] رہے۔ ان کی وفات کے بعد [illegible] دہلی میں [illegible] ۱۸۸۵ء میں فوت ہوئے [illegible] تاریخ وفات ہے جو انہوں نے خود ہی اپنی وفات سے دو برس پہلے نکالی تھی۔ حضرت خواجہ باقی باللہ کی درگاہ میں دفن ہوئے [illegible] سے ملی ہوئی ان کی قبر ہے۔ لوح مزار پر یہ شعر کندہ ہے ؎

فاتحہ [illegible] ویراں پہ بھی پڑھتے جانا [illegible] گزرنے والے

[illegible] میں صرف ایک صاحبزادی چھوڑی۔ یہ حکیم امجد علی خاں صاحب اسی صاحبزادی کی یادگار تھے [illegible] حکیم صاحب [illegible] ویراں کے نواسے ہیں تو مجھے ایک پرانا مسئلہ یاد آ گیا۔

میرے دلی آنے سے کچھ دن پہلے لاہور کے ایک نوجوان ادیب نے [illegible] کے نام سے ذوق کی سوانح عمری لکھی تھی۔ اس میں انہوں نے اور اور غلط باتوں کے علاوہ یہ بھی لکھ دیا کہ ذوق مذہباً شیعہ تھے میرے نزدیک یہ بات درست نہیں تھی۔ اس پر میں نے اس کی تصدیق میں [illegible] کی تھی۔ میں نے استدلال خود ذوق کے کلام سے کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایسا قابل اطمینان ذریعہ تحقیق نہیں۔ اب [illegible] حکیم صاحب ایک ایسے شخص کے عزیز ہیں جو ذوق کا [illegible] مصاحب تھا میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے کبھی اپنے نانا جان سے ذوق کے معتقدات سے متعلق بھی کوئی بات چیت ہوئی تھی۔ فرمایا پہلے تو میں ان کی وفات کے وقت بہت چھوٹا تھا اس لئے مجھے ایسی باتوں سے کچھ دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی لیکن [illegible] ان سے کوئی بحث ذوق سے متعلق کرنا۔ اگر انہیں کہیں ہلکا سا شبہ بھی ہو جاتا کہ [illegible] استاد [illegible] تعصب یا اعتراض کا پہلو نکلتا ہے تو وہ [illegible] لیکن اس کا میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ ذوق شیعہ نہیں تھے بلکہ اہل سنت والجماعت میں سے تھے۔

معلوم ہوا کہ حکیم صاحب کا معمول ہے کہ اکثر [illegible] ہو پانی برسے آندھی ہو یا طوفان آئے ان کے اس معمول میں فرق نہیں [illegible] اگر آپ [illegible] یہاں موجود [illegible] نہیں یا اتنے بیمار ہیں کہ بستر سے ہلنے کی تاب نہیں۔ دلی میں ہوتے ہوئے [illegible]

کوئی گھنٹے بھر میں دوست احباب جمع ہونا شروع ہو گئے بیشتر شاعر حضرات تھے۔ ان میں دو نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں ایک [illegible] دوسرے

[illegible] سید اشتیاق حسین تھے۔ حکیم [illegible] مرزا [illegible] وقت [illegible] صاحب [illegible]
[illegible] بہت تھے۔ ایک صاحب [illegible] خاں کے چھوٹے [illegible] بھائی [illegible]
[illegible] حکیم مرزا انگریزی حکومت کے زمانے میں مختلف [illegible]
میں اپنے خاندانی [illegible] سارا وقت عبادت میں گزارتے تھے۔ اس وقت ان کی عمر ۸۰ برس سے زیادہ تھی۔ لیکن ان کے [illegible]
[illegible] اور بہت تیز تھا۔ انہوں نے ایسے ایسے لطیفے سنائے کہ ہنستے ہنستے حالت غیر ہو گئی۔ آپ یہ سن کر تعجب کریں گے کہ [illegible]
[illegible] انہیں [illegible] تک کہنے میں باک نہیں تھا ——— ان میں سے ایک لطیفہ نقل کرتا ہوں جو نسبتاً گوارا ہے:

ایک مولوی صاحب [illegible] نماز کا وقت آیا۔ مسجد میں تشریف لائے۔ پہلے سوال کی [illegible] سے جانے ضرور ہیں [illegible]
نہیں کر پاتے تھے کہ ان کی ہوا خارج ہو گئی اور وہ بھی آواز سے۔ اس پر جو صاحب ان کے قریب حوض پر بیٹھے وضو کر رہے تھے بولے کہ یہ تو: خدا حق کرے کہ آج
منہ میں تو سوال کی لیکن [illegible] اب بھی میں نے بعض لفظ حذف کر دیے ہیں اور بعض بدل دیے ہیں۔

معلوم ہوا کہ جوانی کے عالم میں شعر بھی کہتے اور خستہ تخلص کرتے تھے ان کا ایک شعر مجھے آج تک یاد ہے ؎

خضر بھی خدا کی قدرت ہے ‏ ‏ ‏ بُت بھی راستہ بتاتے ہیں

اس کے ساتھ انہوں نے مومن کا یہ شعر پڑھا تھا ؎

کل جو مسجد میں جا پھنسا مومن ‏ ‏ ‏ رات کاٹی خدا خدا کر کے

سید اشتیاق حسین کا نام میں نے یاد رکھا ہے۔ اس دن انہوں نے مختلف شاعروں کے پڑھنے کی ایسی ہو بہو نقل اتاری کہ [illegible] نقل بر اصل گمان ہوتا تھا۔ خوش قسمتی سے میں دور صاحب کے اکثر مشہور شاعروں کو ذاتی طور پر جانتا تھا اور میں نے ان کا کلام ان کی زبان سے سنا ہے۔ اس لئے میں نے ان سے فرمائش کی کہ بعض شاعروں کی نقل اتاریں [illegible] امتحان میں پورے اترے۔ سائل صاحب اپنا کلام بہت ترنم سے پڑھتے تھے۔ جیسا کہ مشہور ہے کہ داغ کے آخری زمانے میں جب وہ حیدرآباد میں تھے مشاعروں میں حضور نظام [illegible] استاد داغ کی غزلیں پڑھا کرتے تھے۔ [illegible] گلے بازی سے تو مرتے ہیں لوگ اسے سننے سے انکار کر دیتے ہیں لیکن سائل صاحب کے پڑھنے اور ہمارے موجودہ شاعروں کے پڑھنے میں بہت فرق تھا۔ وہ گاتے نہیں تھے بلکہ ترنم کا ذکر۔ اس کے باوجود ان کے پڑھنے میں ایک خاص لذت اور دلکشی تھی جو بس سننے سے تعلق رکھتی تھی۔ افسوس یہ انداز انہی پر ختم ہو گیا۔ جب شوق صاحب [illegible] شاعروں کی نقل اتار چکے تو میں نے ان سے کہا کہ اب سائل صاحب کی نقل فرمائیے۔ کہنے لگے یہاں بڑی مشکل کام ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے صرف ایک مصرع [illegible] کی نقل اتاری ہے اور اس پر بھی مجھے کچھ ایسا اطمینان نہیں۔ اس کے بعد انہوں نے وہ مصرع دہرایا۔ اگرچہ انہیں بس کا فرق تھا تاہم بالکل سائل صاحب کی آواز معلوم ہوتی تھی۔ سائل صاحب سن کے صرف اتنا کہا [illegible]۔

اس کے بعد کتنی مرتبہ مجھے ان ہفتہ واری جلسوں میں شریک ہونے کا موقع ملا اور ہر بار میں ان احباب کی مہربانی اور خلوص، محبت اور وضعداری سے بیاثر ہوا۔ ہماری آخری دور کی تہذیب میں وضعداری کو بہت دخل تھا۔ اس کی گرفت ملکی قانون اور مذہبی شریعت سے کسی طرح کم نہیں تھی۔ کیا مجال جو پہلے بزرگوں کو اس ڈگر سے ادھر ادھر ہٹا سکیں جو انہوں نے پہلے دن اپنے لئے پسند کر لی تھی۔ حکیم صاحب کی وضعداری کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

ان کے ہاں رمضان کے مہینے میں ہر جمعہ کو افطاری کی تقریب ہوتی تھی۔ اس میں وہ اپنے خاص احباب کو تو مدعو کرتے ہی تھے لیکن اس کے علاوہ بھی صلائے عام تھی۔ اس دن جس کا جی چاہے ان کے ہاں پہنچ جائے اور روزہ افطار کرے۔ ہر ایک کی مناسب آؤ بھگت ہوتی۔ کھانے کو مٹھائی اور پینے کو موسم کے مطابق چائے، شربت وغیرہ سے تواضع کی جاتی۔ میں نے صرف ایک جمعہ کو حاضری دی تھی۔ بلا مبالغہ سو سوا سو آدمی سے کم نہیں ہوگا۔ افطاری کے بعد بے تکلف احباب ٹھہر جاتے۔ کچھ دیر تفریح رہتی۔ شعر و شاعری ہوتی۔

[illegible] سائل صاحب کے ایک عزیز دوست کا یہ خط [illegible] تحریر کیا ہے:

ایں ہر دو نسل نظامی [illegible] — ساقی بیت الحرم و ناظر [illegible]

گہر دو خاندان جہان [illegible] سلسلہ — ارتقائے خاندان [illegible] داغی

سائل [illegible] ہم آگہ دہلی [illegible]

ذو جلال تعالیٰ [illegible] صاحب حاجی محمد علی

ان کے بعد وہ خطبہ صاحب کے [illegible]

وہ جیسے ہو چکے [illegible] بھی تک

کہاں ہے [illegible] بجا فرمائش ہو۔

سائل صاحب کی پہلی بیوی نواب ممتاز حسین خان والی [illegible] کی صاحبزادی تھیں جن سے [illegible] ایک بیٹا تھا جو صغر سنی ہی میں فوت ہو گیا۔ اس کا نام مظفر مرزا تھا [illegible] اس کے بعد [illegible] استاد داغ کی [illegible] جو ان کے چھوٹے بھائی میرزا امتیاز الدین احمد خان کی بیٹی تھیں۔ داغ کی اپنی [illegible] ایک بیٹا احمد تھا جو [illegible] داغ نے ایک شعر میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

احمد کے خون میں [illegible] کیوں نہ ہو — آنکھوں کا نور تھا مرے دل کا سرور تھا

اس کے بعد داغ نے لاڈلی بیگم کو لے پالا جو ان کی سالی اختری بیگم کی نواسی تھیں۔ [illegible] مجھ سے کہا تھا کہ دہلی میں نواب سراج الدین احمد خان [illegible] کے گھر میں [illegible] ڈیوڑھی کے اندر [illegible] کے اوپر ایک تختی پر لکھا تھا "مکان لاڈلی بیگم" تو اس کا یہ مطلب تھا۔

جناب بیگم صاحبہ [illegible] سائل صاحب سے کوئی بیس برس چھوٹی تھیں۔ یعنی جب سائل صاحب کا انتقال ہوا [illegible] ۹۴ برس کے۔ ایک آدھ [illegible] سائل صاحب جیسا [illegible] ہو گئے تو ان [illegible] ایک افسوسناک حادثہ پیش آیا [illegible] چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ بیشک اس عمر میں [illegible] مناسب علاج ہوتا [illegible] کہ وہ تھوڑا بہت چلنے پھرنے کے قابل ہو جاتے لیکن ان کے مزاج [illegible] معاملے میں وہ کسی اور کی بھی نہیں سنتے تھے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ بعض اوقات بیگم صاحبہ بہت [illegible] کہا کرتی تھیں [illegible] ہیں۔ بھلا جب تک اس کا مناسب علاج نہیں ہوگا یہ کیسے تندرست ہو جائیں گے۔

سائل صاحب اپنے استاد کا بہت ادب کرتے تھے۔ دن میں کئی کئی [illegible] سلسلے میں دسیوں مرتبہ ان کا ذکر آ جاتا۔ داغ صاحب کی [illegible] کی وہ بات [illegible] اپنے استاد بھائیوں کے ساتھ بھی ان کے تعلقات بہت خوشگوار رہے۔ جناب احسن مارہروی مرحوم، جناب نوح ناروی، جناب بیخود دہلوی [illegible] حضرات سے میں سائل صاحب ہی کے ہاں ملا ہوں۔

استاد داغ کے خاندان کی کتنی باتیں مجھے سائل صاحب سے معلوم ہوئی تھیں جن میں سے بعض گفتنی ہیں بعض ناگفتنی۔

ایک دن ان سے متعلق گفتگو ہو رہی تھی، میں نے کہا۔ آپ کے خاندان نے انہیں نواب شمس الدین احمد خان کا بیٹا تسلیم نہیں کیا — آپ کی

اس بات [illegible] آغا حشر [illegible] کے عشق [illegible]

[illegible] تعارف [illegible] آغا حشر [illegible]

[illegible]

امرت [illegible] شوق [illegible] انشاء [illegible]

[illegible] تھے۔

[illegible] سب [illegible]

[illegible] آدمی [illegible] نہیں [illegible]

[illegible] ایک [illegible] نہیں پہچان سکتا تھا۔

پہلا نیا [illegible] نواب [illegible] احمد [illegible] کی بیوی [illegible]

[illegible] شمس الدین احمد خاں کے [illegible]

[illegible] کامیاب ہو گئے [illegible] شمس الدین احمد خاں [illegible] بیٹھے

[illegible] کی حکومت میں لے آئی تھی۔

[illegible] ہو گا

داغ [illegible] شخص شراب [illegible] مولانا [illegible] داغ [illegible]

[illegible] شراب [illegible] انگور [illegible] حرام [illegible]

[illegible] شعر [illegible] تعلق [illegible]

[illegible] داغ صاحب نے [illegible] تھے۔

[illegible] جناب [illegible]

[illegible] سے [illegible] رعایت سے [illegible]

[illegible] نواب غلام محی الدین خاں [illegible] نواب [illegible]

[illegible] نواب [illegible]

[illegible]

[illegible] نواب مرزا خاں داغ [illegible]

[illegible] ہو گئے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] سے [illegible]

دستخط ہوا کرتی تھی۔ سائل صاحب بھی ان مشاعروں میں آتے تھے۔ ۱۹۳۰ء کے مشاعرے کے بعد جب وہ دلی سے چلے گئے تھے۔ تذکرہ نویس نے پوچھا کہ دلی میں آپ کا پتا کیا ہے، جس پر آپ کی خدمت میں خط لکھا جا سکے۔ یک دم کھڑے ہو گئے اور انتہائی انکساری کے لہجے میں کہنے لگے کہ پہلے میاں صاحبزادے! خط پر صرف "سائل دہلی" لکھ دینا مجھے مل جائے گا۔ اسی طرح کا جواب ایک مرتبہ غالب نے نواب علاء الدین احمد خان کو دیا تھا کہ بے شک صرف میرزا اسد دہلی لکھ دیا کرو، خط مجھ تک پہنچ جائے گا۔

لیکن اس کے باوجود طبیعت میں مذاق، ظرافت اور مروت کا مادہ تھا۔ کوئی ان کے پاس جا بیٹھے تو انہیں شعر اور اس کی فرمائش پر انکار نہیں ہوتا تھا۔ کوئی صاحب تشریف لے آتے اور کلام سنانے کی فرمائش کر دیتے۔ وہ اور بے ساختہ مسکراتے، اور شعر سنانے لگتے۔ اب جب تک وہ شخص خود یہ نہ کہہ دے شکریہ، بس کیجیے یا کوئی اور ذکر نہ چھیڑ دے، سائل صاحب بیاض ہاتھ سے نہ رکھتے۔ اگر کوئی صاحب ذوق آدمی ہوتا، تو خیر ایک بات بھی تھی، لیکن بعض اوقات ایسے ایسے گاؤدی سے واسطہ پڑتا، جو نظم اور نثر کا فرق بھی نہیں جانتے تھے۔ اب بھلا کے مانند نہ پڑے یقین۔ لیکن نواب صاحب بڑے اطمینان سے اسی طرح ان سے بھی پیش آتے۔ میں بہت جزبز ہوتا۔ ایک آدھ مرتبہ شکایت بھی کی کہ آخر آپ کیوں ایسے گدھوں کو ٹال نہیں دیتے۔ ہمیشہ یہی جواب ملا۔ بھیا! انکار کرنے کی جرأت نہیں پڑتی کہ اس سے اس کی دل شکنی ہوگی۔ تم نے سنا نہیں۔ دل بدست آور کہ حج اکبر است۔

ان کی زبان کی تعریف کرنا تحصیل حاصل ہے کہ ان کے خاندان کی زبان ہمیشہ مستند اور ٹکسالی سمجھی گئی ہے۔ اگر اردو کے معنی و لطف لینا ہو تو سائل کا کلام دیکھیے۔ باوجود داغ کا شاگرد ہونے کے انہوں نے استادی حیثیت سے شاعری کا تتبع نہیں کیا۔ یہ چیز داغ کے ساتھ مخصوص تھی اور انہی کے ساتھ ختم ہو گئی۔ امیر مینائی نے اس میدان میں مقابلے کے لیے کچھ کوشش نہیں کی، لیکن نتیجہ سب کے سامنے ہے۔ امیر کے شاگردوں میں سے ریاض خیرآبادی، حفیظ جونپوری اور جلیل مانکپوری نے اس رنگ کو نباہنے کی کوشش کی اور بہ فرق مراتب اس میں کامیاب بھی ہوئے، مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ خود داغ کے شاگردوں میں بعض بہت کامیاب ہوئے۔ احسن مارہروی، نوح ناروی، بیخود دہلوی استاد فن ہیں۔ مضطر خیرآبادی کی غزل میں استاد کا رنگ چھا گیا لیکن سچی بات یہ ہے کہ داغ اپنے رنگ کا واحد مالک ہے۔ سائل نے شروع سے بھانپ لیا تھا کہ اس کوشش میں وقت ضائع کرنا بیکار ہے۔ انہوں نے اپنے لیے نئی راہ نکالی۔ زبان تو وہی تھی جو ہونی چاہیے تھی۔ انہوں نے اس میں خالص عاشقانہ خیالات اور معاملات و محاکات کے علاوہ مضمون آفرینی کی طرف توجہ کی اور بہت حد تک اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ انہوں نے بعض اوقات بہت مشکل زمینوں میں طبع آزمائی کی ہے اور ان میں ایسے ایسے شگفتہ اور پر لطف شعر نکالے ہیں کہ بس انہی سے ممکن تھا۔

ان کی شاعری کی عمر ساٹھ برس کے قریب تھی اور بلا مبالغہ ایک لاکھ شعر سے کم ان کا سرمایہ نہیں ہوگا۔ لیکن ان کا بہت بڑا کارنامہ ان کی مثنوی نور محل ہے جس میں بنیادی طور پر اگرچہ نورالدین جہانگیر بادشاہ اور ملکہ نورجہاں بیگم کی حیات معاشقہ کا بیان ہے، لیکن اس میں اور بھی بیسیوں مسائل آ گئے ہیں۔ افسوس کہ یہ نامکمل رہ گئی، ورنہ خاصے کی چیز ہوتی۔ اب بھی اس میں سات آٹھ ہزار شعر سے کم نہیں ہوگا۔

زمانے کا مذاق بدل گیا۔ ان کے سارے دیوان تو کون چھپوائے گا اور کون پڑھے گا۔ لیکن اگر کوئی اللہ کا بندہ چار پانچ ہزار شعر کا انتخاب ایک مجلد میں شائع کر دے، تو یہ زبان کی واقعی خدمت ہوگی۔ اور مثنوی تو ضرور ہی چھپ جانا چاہیے، اگرچہ وہ نامکمل ہی ہے۔ بقول نظیری نیشاپوری

ہزار نقش دریں کارگاہ کار است
نگیں نخوردہ نظیری، ہمہ نکو بستند

چودھری افضل حق (مرحوم)

شورش کاشمیری

ہم ان لوگوں کو بہت جلد بھول گئے ہیں ان میں مرحوم افضل حق بھی ہیں۔ ہمارے زمانہ یا ہماری تنگ نظری جمہور بندی نے بہت سی قابل قدر شخصیتوں کو طاق نسیان کا گلدستہ بنا دیا ہے اور بہت سی ہستیوں کو شہرت کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔

پنجاب مرحوم کی قومی زندگی میں پہلی جنگ عظیم سے لے کر دوسری جنگ عظیم تک جن لوگوں نے عزت کا مقام پیدا کیا ان میں بعض شخصیتیں ادب و سیاست کے امتزاج کی مظہر تھیں۔ چودھری صاحب بھی انہی میں سے ایک تھے لیکن سیاسیات کے اختلافی گرد و غبار نے انہیں اوجھل کر دیا اور آج وہ محض اس لئے ایک فراموش شدہ شخصیت ہیں کہ ان کے گرد و پیش اعتراف محاسن کا کوئی حلقہ نہیں۔ وہ زندگی میں اپنی مفلسی کا چراغ تھے اور زندگی کے بعد بھی گمنام قبر میں جس پر کوئی کتبہ آویزاں نہیں ہے۔

——— چودھری صاحب کی زندگی ہمیشہ مختلف دھاروں کا سنگم رہی ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش کے خلاف بہت بڑا احتجاج تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا آغاز پولیس کے سب انسپکٹر کی حیثیت سے کیا تھا۔ جس زمانہ میں وہ پولیس کے سب انسپکٹر بھرتی ہوئے تب ہندوستانیوں میں سے بہت کم لوگ سب انسپکٹر ہوتے تھے۔ اس اعزاز کے مستحق چیدہ چیدہ خاندانوں کے چیدہ چیدہ لوگ ہی سمجھے جاتے تھے۔ مرحوم چودھری صاحب ہوشیار پور کے ممتاز راجپوتوں میں سے تھے۔ ان کے بڑے بھائی بھی پولیس میں تھے اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ چودھری صاحب پولیس میں رہتے تو عجب نہ تھا کہ اپنی ذہانت و فراست کے بل پر پولیس کا بڑے سے بڑا عہدہ حاصل کرتے اور عین ممکن تھا کہ پنجاب میں جو ہندوستانی پولیس افسروں کی آج تک دھوم ہے ان میں سے ایک ہوتے لیکن تحریک لاتعاون کے آغاز میں مستعفی ہو گئے ——— سید عطاء اللہ شاہ بخاری فرماتے ہیں کہ وہ ہوشیار پور کے ایک جلسۂ عام کو خطاب کر رہے تھے اور چودھری صاحب مرحوم اس جلسہ میں ان کی تقریر کے نوٹ لے رہے تھے۔ میں نے ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو مجھے ایک قبول صورت نوجوان کے چھریرے بدن پر پھبتی ہوئی خاکی وردی نے بہت متاثر کیا۔ میں نے اثنائے تقریر میں کنایۃً کہا:

"اے کاش مجھے اس طرح کے نوجوان مل جائیں تو میں چند دنوں میں ہندوستان کی کایا پلٹ دوں لیکن

کیا کسی بڑے زمیندار فرنگی بالادست میں مدد کر سکتے ہیں؟

پہلی عالمی جنگ میں مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں جمعیت العلماء کا اجلاس منعقد ہوا تو چودھری صاحب نے اس اجلاس میں [illegible]
دیا ـــــ انگریزوں کے خلاف کسی قسم کا تعاون نہ کرنا اتفاق سے تھا فیصلہ سے نہایت خوفناک تھا کہ ... کوشش کی اس زمانے میں جاننے والوں کے
کرتے تھے، انھوں نے چودھری صاحب کو سلطنت کے خلاف پیر جانے کی بھی نہ کوشش کی۔ مگر چودھری صاحب [illegible]
کو ملتوی تیار نہ تھے ـــــ انگریزوں نے دو سال کے لئے قید کر دیا۔ سب دعوی ثابت تھا چودھری صاحب کوئی جو [illegible]
اور وہ تو یا سرکار پرست تھے، جیل نے حالات بدل دیا، پرتشدد شروع کیں، قید تنہائی شب [illegible] [illegible]
ٹاٹ کے کپڑے پہنو دیے، غرض کر ان کی اذیتیں دی جاتی تھیں۔ [illegible] مگر چودھری صاحب نے مصیبت کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا ـــــ
پنڈت جی اور شاہ وید خانے میں آپ کے ساتھی تھے وہ رہا ہو کر آئے تو انھوں نے روزنامہ [illegible] میں مضامین کے خلاف احتجاج کیا
جس سے لوگوں کو پہلی دفعہ ان کی شخصیت اور ہمت کا علم ہوا۔

ـــــ دنیا میں دوزخ "" قید خانے کے کوائف، ایک بہترین تصنیف ہے جو آپ نے رہائی کے بعد قلمبند کی۔ ڈسٹرکٹ کانگرس [illegible]
نے اس کو شائع کیا اور رہائی کے بعد آپ کو ڈسٹرکٹ کانگرس کمیٹی کا صدر منتخب کر لیا گیا

تحریک خلافت ختم ہو چکی تو حالات بدل گئے۔ [illegible] چودھری صاحب رفتہ رفتہ [illegible]
صوبہ کے مسلمان لیڈروں کی صف اول میں شمار ہونے لگے۔ چنانچہ ہندوستان میں [illegible] اتحاد کانفرنس [illegible] پنجاب کے [illegible]
کی طرف سے آپ کو بھی مدعو کیا جاتا رہا اور ہمیشہ آپ کے مشوروں کی قدر کی گئی ـــــ اس دفعہ انھیں [illegible]
جب پنجاب کونسل کے انتخابات ہوئے تو ہوشیارپور کے مسلم حلقے سے لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے ـــــ پنجاب کونسل میں [illegible]
کے نقش اور اعمال ہوئے، خود انگریز ممبروں نے ان کی جرأت و قابلیت کا اعتراف کیا اور اس کی شہادت کونسل کے [illegible]
حاصل کی جا سکتی ہے۔

میاں فضل حسین مرحوم آپ کے بے حد گرویدہ تھے، ہمیشہ آپ کی استقلالی تقریر کو توجہ سے سنتے ـــــ وہ تمام زندگی کوشاں
رہے کہ چودھری صاحب اپنی موجودہ راہ سے ہٹ کر ان کے ہمقدم چلیں اور حکومت میں شریک ہوں لیکن چودھری صاحب ہمیشہ ان کے ہم خیال
کی مزاحمت کرتے اور اپنے طرز عمل کی سچائی پر اصرار کرتے تھے۔

چودھری صاحب مرحوم انتہائی عاجز طبیعت کے زندگ تھے۔ [illegible] لیڈروں کی طرح [illegible]، انکساری کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر
بھرا تھا۔ کبھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ کیا ہیں، بس ہر کچھ تھے انتہائی عاجزی کے ساتھ تھے ـــــ صرف ایک دفعہ انھوں نے
جیل خانوں میں اصلاحات کے مسئلہ پر بعض باتوں کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ جیل خانوں کے سدھارنے میں میں نے جو کوششیں کی ہیں مجھے
ان پر جائز فخر ہے۔

جب سردار بھگت سنگھ اور ان کے ساتھی جیل خانے میں اصلاحات کا مطالبہ کر رہے اور بھوک ہڑتال پر تھے چودھری صاحب غیر سرکاری وزیٹر
ہونے کے علاوہ اصلاحاتی کمیٹی کے ممبر تھے آپ نے اس معرکہ میں جس مستعدی کا ثبوت بہم پہنچایا اس سے اپنے پرائے سب عش عش کر اٹھے
گو آپ کو اس کمیٹی کی رکنیت سے محروم ہونا پڑا لیکن آپ نے "دنیا میں دوزخ" کے شعلوں کو ہلکا کرنے میں ایک قابل ستائش کارنامہ انجام
دیا۔ واقفان حال کو معلوم ہے کہ اصلاحات کی سب سے پہلی قسط کے مجوز آپ ہی تھے۔

ـــــ ۱۹۲۱ء میں کانگرس نے ڈانڈی مارچ کیا تو گاندھی جی کے بعد دوسری مجلس عاملہ کے ارکان میں سے ایک آپ بھی تھے ـــــ [illegible]

[illegible] سے تقسیم دار یعنی ملک پنجاب کی [illegible] میں جس کی پاداش میں گرفتار کر لیا گیا۔ آپ کو گجرات جیل میں رکھا گیا جہاں آپ نے شہرہ آفاق تصنیف "زندگی" سپرد قلم کی ——— اس کتاب کے شائع ہوتے ہی آپ کے قلم کی دھاک بیٹھ گئی۔ چراغ حسن حسرت نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ جو باتیں علامہ اقبال نے فلسفیانہ اداؤں کے ساتھ کہی ہیں وہ چوہدری صاحب نے سیدھے سادے الفاظ میں کہہ دی ہیں۔ مولانا ظفر علی خان نے "زندگی" کی تعریف میں نظم لکھی۔ تمام ملک کے جرائد و رسائل نے خراج ادا کیا۔ پنجاب یونیورسٹی نے پہلا انعام [illegible] روپیہ دیا۔ عرصہ تک یہ کتاب ادیب عالم کے نصاب میں رہی اور غالباً اب بھی شریک نصاب ہے۔

۱۹۲۱ء کے بعد آپ نے پنجابی رفقاء کے ساتھ مل کر اپنی الگ راہ قائم کی چنانچہ ۱۹۲۹ء میں مجلس احرار کی بنا ڈالی گئی تاکہ مسلمانوں کو ایک علیحدہ تنظیم کے طور پر زندہ کیا گیا' تحریک کشمیر کی ہنگامی نے انہیں مانع احرار کا درجہ دیا' سید عطاء اللہ شاہ بخاری انہیں بجا طور پر "مفکر احرار" کہا کرتے تھے' تحریک کشمیر سے لے کر دوسری جنگ عظیم کے مختلف ہنگاموں میں ان کی شخصیت کے دونوں پہلو ابھرتے گئے ———

ادبی زندگی میں انہوں نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ میرا افسانہ' ۲ جلد (خود نوشت سوانح)' جواہرات (افسانے)' شعور (ڈرامہ)' محبوب خدا (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح)' دین خدا (اسلامیات)' خطوط افضل حق (بیٹی کے نام خط)' تاریخ احرار اور انگریزی میں پاکستان و دیہات بچات۔ ——

افسوس ہے کہ ہمارے نقاد نگاروں نے ان کی ادبی زندگی سے انصاف نہیں کیا' حالانکہ وہ اسی سبب سے کہ منفرد حیثیت کے حامل تھے۔ ہمارے ہاں بعض افسانہ نگاروں نے صرف ایک مجموعہ یا ایک افسانہ کی بنا پر ادب اردو میں جگہ حاصل کی ہے احساس کی وجہ محض یہ ہے معاشرے میں [illegible] ادب کی کوئی ترازو ایسی نہیں جس میں چوہدری صاحب کے رشحات قلم تل نہ سکتے ہوں اور ان کا پلڑا غالباً جھکا ہوا ہو ——— اگر ادب کا مقصد تفسیر حیات' تنقید حیات اور تعمیر حیات ہے تو "زندگی" اس معیار پر پوری اترتی ہے' جتنا اثر ذہنوں پر "زندگی" نے ڈالا ہے اتنا شاید اس دور میں نثر کی کسی ایک کتاب نے نہیں ڈالا۔ لیکن کم روی کی حد ہے کہ ادب کے سیاسی نقادوں کی نگاہیں اس طرف اٹھتی ہی نہیں اور اٹھتی ہیں تو بیچ کر لوٹ جاتی ہیں۔

——— سیاسی زندگی میں چوہدری صاحب "مسلمان سوشلسٹ" تھے۔ ایک زمانے میں انہوں نے "اسلام میں امراء کا وجود نہیں" لکھ کر علماء کی صفوں میں ہیجان پیدا کر دیا تھا' حتیٰ کہ ان کے کئی احرار ساتھی بھی ان کے خلاف ہو گئے تھے۔ حالانکہ جو بات وہ کہنا چاہتے تھے اس کے مبادی کا شعور بھی ان حضرات کو نہ تھا۔

"تاریخ احرار" بظاہر احرار کی تاریخ ہے لیکن حقیقتاً مسلمانوں میں طبقاتی احساس کے نشوونما کی تاریخ ہے۔ مرحوم نے اس کتاب میں احرار کے [illegible] کا ذہن بکمال و تمام پیش کیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے ان کے خصوصاً احتجاج کا اندازہ ہوتا ہے جو ان کے دل میں امراء کے طبقہ کی بدولت کروٹ لیتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ قرآن مجید میں سرمایہ داری کے خلاف جو احکامات ہیں ان کو یکجا کریں اور پھر ان تفسیروں' تعبیروں اور تاویلوں کے بخیے ادھیڑیں جنہیں مختلف اوقات میں حکمرانوں کی منشا کے مطابق ڈھالا گیا لیکن اس کی راہ میں کئی دیواریں حائل تھیں مثلاً:

۱ - وہ اس مضمون کی صدیوں پہاڑی وسعتوں کو سمیٹنے کی ہمت نہ رکھتے تھے۔

اولاً وہ وسیع المطالعہ نہ تھے ثانیاً انہیں عربی کا بنیادی علم نہ تھا' ثالثاً عصری تحریکوں کے علمی رجحانات سے کاملاً آگاہ نہ تھے' رابعاً ان کا تجربہ صرف عملی سیاسیات کے بارے میں تھا۔

۲ - جس وقت انہوں نے اس انداز میں سوچنا شروع کیا وہ فکر و بحث کی اس تگ و تاز کے لئے موزوں وقت نہ تھا۔

۳ ۔ جن حالات میں وہ خود سب سے بڑھ کر [illegible] واقعہ تھے اور [illegible] نیاز تھے۔

ـــــــ تمام زندگی خود تکلیفیں برداشت کیں مگر ایک تنکے کے ظلم کو نہ سہہ سکے ـــــ چوہدری صاحب کی زندگی اس کے اخلاق و صداقت کی مثالیں اس دور کی پوری تاریخ میں بکھری ہیں ـــــ ہندوستان میں ایثار پیشہ لیڈروں کی کمی نہیں، مگر مسلمانوں میں اس کی قلت تھی" لیکن چوہدری صاحب محمود ہونے کے باوجود بے پایاں نے "احرار" پر شہر، اپنے گھر نے میں پرورش پا کر فقیری کی زندگی اختیار کی اور قوم کی بھلائی میں قدم رکھا تو پھر اس سے کبھی واپس نہ لوٹے ـــــ آخری سفر نے لئے ـــــ دل ان کا اتنے کے الیکشن میں ہر کے [illegible] والوں کو خبر نہ ہونے دی۔ مسکراتا چہرہ، متحرک آنکھیں، زرنگار لبوں سے پھسل گئے، بعض کتابوں کی راشلیٹی مل گئی یا پنجاب کونسل میں داخلے کا جھکڑا آ گیا تو اکثر و بیشتر احباب میں تقسیم ہو گیا۔

شادی کی نوبت ہے، مولانا حبیب الرحمن سوالی ہیں، ماسٹر جی کے پاس کرایہ نہیں، جانباز مانگتا ہے، سردار شیخ کرم علی بیٹے کی کہہ رہے ہیں، پھر مالی مدد کا سبب، فلاں رہنما کی شادی ہے، فلاں کارکن بیمار ہے اس کے پاس دوا کے لئے پیسے نہیں ـــــ اور چوہدری صاحب ہیں کہ اپنے آپ کو بیچ کر ان مطالبات کو پورا کر رہے ہیں۔

شہر میں عید ہے، گھر میں فاقہ، کوئی ساتھی سویاں لے کر آ گیا تو عید ہو گئی ورنہ سب اچھا!

دو دفعہ کونسل کے ممبر منتخب ہوئے، ایک دفعہ تعلیمی ستیہ گرہ کی تحریک کے آغاز میں مستعفی ہو گیا، تیسری دفعہ پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے انتخاب میں حصہ لیا لیکن ہار گئے ـــــ اور وہ اس طرح ہار گئے کہ صوبائی خود مختاری کے تحت پہلا انتخاب تھا، سب کے دلوں میں حکومت بھی تھیں، سردار سکندر حیات ہر قیمت پر شکست دلانا چاہتے تھے، لاہور کے بہت سے لوگ نے نہ چاہا کہ وہ ہر ہتھیار سے جو ہوشیار ہو سکے علاقہ انتخاب میں دراز کئے گئے جنہوں نے بازو پھیلا پھیلا کر اعلان کیا کہ شہید گنج میں ان پر جو کچھ بیتی اس کا ذمہ دار چوہدری ہے۔ مسلمان جذباتی قوم، ہوا کا رخ پلٹا، چوہدری صاحب ہار گئے۔ پھر اس کے بعد کبھی منتخب نہ ہو سکے، جب کبھی بھی ہونے لگے یونینسٹ پارٹی پوری طاقت سے مقابلہ کرتی، تھیلیاں کھل جاتیں، بے بس ہو کر شکست کھا جاتے۔ ایک دفعہ راقم نے عرض کیا:

"چوہدری صاحب! الیکشن لڑنے سے فائدہ؟ ہمیشہ ہزیمت اٹھانی پڑتی ہے۔"

ہنسنے لگے: "شورش! میں اس لئے الیکشن نہیں لڑتا کہ مجھے جیتنا ہی ہے، میں اس لئے بھی الیکشن لڑتا ہوں کہ مسلمان امراء کو یہ احساس ہو کہ غریب ان کا مقابلہ کر سکتا ہے اور غرباء میں یہ ذہن پیدا ہو کہ امراء کا مقابلہ کرنے سے جرأت عمل بڑھتی ہے۔"

ـــــــ چوہدری صاحب کی مجموعی قید کوئی آٹھ یا نو برس ہے۔ جن سپرنٹنڈنٹوں اور جیلروں کے پاس انہیں مختلف جیلوں میں رہنے کا اتفاق ہوا وہ ان کی سیرت کے شیدائی تھے، تقریباً سب متفق الرائے تھے کہ وہ سیاسی قیدیوں میں غیرت مندی، خودداری اور بہادری کے اعتبار سے گوہر یگانہ تھے، ہر سانحہ کو انہوں نے لبیک کہا، جو مصیبت آئی خندہ پیشانی سے جھیلی، کبھی کسی آفت پر اف نہ کی ـــــ دمہ کا عارضہ جیل ہی میں لگا، آغاز صاف تھی اس میں نام کو بھی خرخراہٹ نہ تھی لیکن جیل خانے میں ہمیشہ کے لئے گر رہ گیا۔ آخری بار ستمبر ۱۹۳۹ء میں قید ہوئے، ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی میں دمہ اٹھا، حکومت نے علالت کو جان لیوا دیکھا تو رہا کر دیا، بہتیرا علاج کیا لیکن ؎

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

آخر افق حریت کا یہ ستارہ ۲ رجنوری ۱۹۴۲ء کو ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔

ـــــــ انسانی سیرت کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ جو لوگ اس میں رہ گئے ہوں وہ بھی اس کے کردار کی گواہی دیں۔ چوہدری صاحب کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ انہوں نے زندگی کے ہر موڑ میں ساتھیوں سے خراج وصول کیا۔ ان کے سب سے بڑے دشمن کا نام حقہ تھا جو ان کا [illegible]

کے خلاف صف آرا تھے، اخوان۔ مذہبی کتابوں میں بھی اس کے خلاف بہت کچھ کیا اور علماؤں کی سیاسی تحریکوں کی ناکامی کے اسباب میں ان کا بڑا ہاتھ
رہا ہے۔ اس کا صحیح تجزیہ انہیں تحریک کشمیر میں ہوا جبکہ احرار کے فراہم شدہ رضاکاروں میں سے نصف سے زیادہ قیدی رضاکاروں کو شکست دینا کرنے
میں اٹھ گیا، کیونکہ بصورت دیگر ان کے معافی مانگ کر نکل آنے کا اندیشہ تھا اور اس صورت میں تحریک کی عزت و وقار ختم ہو جاتی۔ اس لئے
وہ حقوق کو کامل سمجھتے، اور تبا کرکی محنتوں کو امراء الامراض سے تعبیر کرتے تھے۔
ان کے سامنے کوئی سیاسی حق نہیں ٹک سکتا تھا۔ عام رضاکاروں کو ہمیشہ احتساب کی تلقین کرتے بلکہ ان سے وعدے لیتے، لطف کی بات
یہ ہے کہ احرار کے ممتاز رہنماؤں میں ایک آدھ راہنما کے سوا چوہدری کے سبھی لیڈر حقہ نوشی کے عادی تھے ......
افراد و جماعت کے بارے میں ان کا نقطۂ نگاہ اتنا صاف تھا کہ بسا اوقات پڑھ کر حیرت ہوتی، بعض سیاسی تحریکوں کے متعلق انہوں نے
عجیب و غریب تجزیے کئے ہیں۔ علامہ اقبال کو وہ اپنی صف میں سے سمجھتے تھے، مولانا ابوالکلام آزاد کو ملوکہ شہنشاہ ہند کے پانچ چار
الفاظ سے شکن آجاتی ہے۔ جواہر لال نہرو کو سیاست کا لاڈلا بچہ جو چاندی کا چمچہ لے کر پیدا ہوا ہے۔ گاندھی جی کو ساحر سیاستان جو جادو گر تھا
اور مدبر کا ایک دلآویز آمیزہ تھے۔ کانگرس کو وہ ہندو سرمایہ داری کا قلعہ اور مسلم لیگ کو خالص امراء کی آخری جائے پناہ سمجھتے تھے۔ غرض
خلاصۂ کلام یہ تھا کہ:

"امراء کبھی اس غریب کو ساتھ لے کر نہیں چلتے جو ان کی بات پر سوچتا ہو،
ان سے اختلاف کرے، ان کے مقابلہ میں زیادہ ہو اور ان سے علیحدہ بھی
اپنی شخصیت کو ابھار سکے۔"

چوہدری صاحب میں یہ چار بڑی خصوصیتیں بدرجۂ اتم تھیں نتیجہ معلوم کہ وہ بساط سیاست پر ایک چلتے ہوئے مہرے کی طرح ختم ہو گئے،
حتیٰ کہ زمانے کے ساتھ انہیں دوست بھی بھول گئے۔

سیماب اکبرآبادی

نثار نادری ایم اے

سنہ ۱۹۲۳ء کی بات ہے۔ میں بذریعہ مراسلت علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہو چکا تھا مگر ملنے کا اشتیاق باقی تھا۔ ایک دن اس جذبۂ شوق کی شدت سے مجبور ہو کر آگرہ پہنچا۔ غالباً اس جوش کا سبب یہ تھا کہ میری تربیت کچھ ایسے ماحول میں ہوئی تھی جہاں استاد کا احترام فرض عین سمجھا جاتا ہے، استاد کی خدمت میں نذر پیش کرنا اور خصوصاً اس وقت جب استاد سے پہلی مرتبہ شرف نیاز حاصل ہو، بہت ضروری تھا۔ مگر اس زمانہ میں میری مالی حالت نہایت سقیم تھی۔ ایک مقامی اسکول میں معلمی کے عوض مجھے آٹھ روپے ماہانہ ملتے تھے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے اس سفر کے لئے کہاں سے مصارف کا انتظام کیا۔ استاد کی خدمت کے علاوہ شیرینی لے جانا بھی ضروری معلوم ہوتا تھا چنانچہ شہر سے ایک ٹوکری خرید کر دو روپیہ کی مٹھائی خریدی مگر وہ ٹوکری کی تلی ہی میں رہ گئی۔ بڑی کشمکش و پیچ میں تھا کہ اتنی بڑی ٹوکری میں یہ ذرا سی مٹھائی لے کر کیسے جاؤں۔ آخرکار ایک تدبیر سمجھ میں آئی، ایک روپیہ کے پھل خرید لئے چند سنگترے، چند کیلے اور غالباً ایک یا دو چکوترے۔ ان سے ٹوکری کو پُر کر دیا۔ تانگہ میں ٹوکری رکھ کر قصر الادب کی طرف روانہ ہو گیا۔ قصر الادب عمارت کی بالائی منزل پر تھا۔ میں ٹوکری لے کر وہاں پہنچا، صحن کے بعد ایک کمرہ تھا۔ اس سے ملحق ایک کوٹھری تھی جس پر پھولدار رنگین پردہ لٹک رہا تھا۔ بیرونی کمرہ میں ایک صاحب لکھنے پڑھنے میں مصروف تھے، میں ان سے ناواقف تھا میں نے دریافت کیا مولانا کہاں ہیں؟ انہوں نے کوٹھری کی جانب اشارہ کر دیا۔ میں نے پردہ اٹھایا، دیکھا فرش پر سفید چادر اور قالین بچھا ہے، قالین پر حضرت علامہ گاؤ تکیہ کے سہارے فروکش ہیں۔ پیروں کی جانب ایک اور صاحب تشریف فرما ہیں (بعد کو معلوم ہوا کہ وہ جناب محمد صادق صاحب ضیا چنیوٹی تھے) میں نے سلام کیا اور اپنا تعارف کرایا، علامہ مرحوم کھڑے ہو گئے اور مصافحہ کیا۔ ضیا صاحب سے بھی ہاتھ ملایا۔ مولانا فرمانے لگے "نثار صاحب! آپ تو میرے تصور میں کوئی مسن شخص تھے" میں نے عرض کیا۔ جیسا ہوں حاضر ہوں۔ مولانا نے میرے قیام کے متعلق دریافت فرمایا، میں نے عرض کیا صرف آپ کے دیدار سے مشرف ہونے آیا ہوں، آپ سے نیاز حاصل کرنے کے بعد پہلی ٹرین سے واپس ہو جاؤں گا۔ مولانا نے بہت اصرار کیا کہ کم از کم ایک روز قصر الادب میں مہمان رہوں مگر یہ مجھے اس لئے گوارا نہ ہوا کہ جب مجھ میں اتنی استطاعت

[illegible] کا استفادہ کی [illegible] صاحب ہو سکتا ہے کہ اپنی [illegible] اور واپسی کی اجازت طلب کی۔ انہی دنوں علامہ کا پہلا مجموعۂ نظم "کارِ امروز" شائع ہوا تھا چنانچہ اس کے [illegible] کئے ہوئے تھا۔ "کارِ امروز" کی قیمت اس وقت ساڑھے تین یا چار روپیہ تھی۔ میرے پاس کرایہ کے علاوہ اب صرف پانچ روپیہ باقی تھے میں نے علامہ سے "کارِ امروز" کا ایک نسخہ عطا کرنے کی گزارش کی۔ مولانا نے بلند آواز سے کہا۔ "اعجاز میاں! نثار صاحب کو ایک نسخہ "کارِ امروز" کا دے دیجئے۔" وہی صاحب جو کمرہ میں بیٹھے تھے کتاب لے کر اندر آئے اور معلوم ہوا کہ وہ علامہ مرحوم کے صاحبزادے حضرت اعجاز صدیقی ایڈیٹر شاعر ہیں۔ میں نے شیرینی کی ٹوکری میں دس کا نوٹ رکھ کر مولانا کے سامنے پیش کیا اور گزارش کی کہ "کارِ امروز" میرے لئے جیسی باعث ہے میں اس کی کوئی قیمت نہیں چکا سکتا۔ آپ خود اسے نذر سمجھئے یا کتاب کی قیمت۔ مولانا خاموش ہو گئے۔ میں نے اجازت طلب کی اور اٹاوہ واپس آیا۔

یہ تھی میری علامہ مرحوم سے پہلی ملاقات ـــــــ

مولانا اس وقت باوجود عمر کی پچپن منزلیں طے کر چکنے کے کافی تنومند تھے۔ قد چھوٹا تھا مگر ان کی ترکی ٹوپی ان کے قد کو درازی عطا کر دیتی تھی سر کے بال سفید ہو چلے تھے اور انگریزی وضع پر ترشے رہتے تھے۔ مولانا کا چہرہ گول، آنکھیں بڑی اور چمکدار تھیں۔ ان کی آواز کافی رعب دار تھی۔ مونچھوں کے بال بہت ہلکے رنگے تھے، داڑھی صفاچٹ رہتی تھی۔ آخر عمر میں کمر میں تھوڑا خم آگیا تھا۔ مگر چھڑی کے سہارے نہایت تیز رفتاری کے ساتھ چل سکتے تھے۔ میں نے انہیں کبھی پُر تکلف لباس میں نہیں دیکھا۔ "کلیم عجم" میں ایام شباب کی تصویر دیکھ کر یہ ضرور معلوم ہوا کہ وہ کسی زمانے میں سوٹ بھی پہنتے ہوں گے مگر شاید جوانی کے ساتھ یہ شوق بھی رخصت ہو گیا۔ میں نے انہیں ہمیشہ شیروانی اور چوڑے پائنچے کے پائجامے ہی میں دیکھا۔ گھر پر قمیض اور تہبند یا پاجامے کے عادی تھے۔ اگر گرمی کی شدت ہوتی تھی تو صرف بنیان اور تہبند پر ہی اکتفا کرتے تھے مگر بغیر شیروانی اور ٹوپی کے مکان یا دفتر سے باہر جانا معیوب سمجھتے تھے۔ انہیں ترکی ٹوپی بہت عزیز تھی۔ کبھی کبھی جاڑے میں سمور کی ٹوپی بھی استعمال کرتے تھے۔ یہ سیہی کے کانٹوں جیسی گھنے، بھورے بالوں والی ٹوپی ان کے پُر رعب چہرہ کو اور بھی باوقار بنا دیتی تھی۔

اس ملاقات کے بعد مولانا سے میرے تعلقات روز بروز بڑھتے گئے۔ مولانا متعدد مرتبہ اٹاوہ تشریف لائے۔ میں بارہا آگرہ گیا اور ہفتہ دو ہفتہ مولانا کے یہاں قیام پذیر رہا۔ متعدد مقامی اور بیرونی مشاعروں میں ان کا ساتھ رہا۔ غرضیکہ ان کی ہجرت پاکستان کے وقت تک مجھے اس کے بے شمار مواقع ملے کہ میں ان کے نظریات، عادات و اطوار اور کردار کے ہر پہلو کا بہ نظر غائر مطالعہ کر سکوں۔

علامہ سیماب مرحوم صبح تڑکے بیدار ہونے کے عادی تھے۔ انہیں اکثر مشاعروں کی شرکت کے باعث رات کے پچھلے پہر تک جاگنا پڑتا تھا مگر یہ جگار۔ صبح خیزی کی راہ میں کبھی حائل نہ ہوتی تھی۔ وہ بہت جلد نماز فجر سے فراغت حاصل کر کے سیر گشت کے لئے نکل جاتے تھے۔ طلوع آفتاب سے پہلے کا سہانا وقت ان کی شگفتگی طبع کے لئے بہت معتدل ہوتا تھا۔ وہ خود فرماتے تھے کہ "کارِ امروز" کی بیشتر نظمیں میں نے سیر گشت کے دوران میں کہی ہیں۔ واپسی پر مکان تشریف لاتے، غسل فرماتے، ناشتہ کرتے، اخبارات کا مطالعہ فرماتے اور ٹھیک دس بجے قصر الادب تشریف لے جاتے وہاں ڈاک دیکھتے، ضروری خطوط پڑھتے ان کے جوابات لکھتے پھر دوپہر کے کھانے سے فراغت پا کر اپنے بیرونی شاگردوں کے کلام پر اصلاح فرماتے اسی دوران میں اگر موقع مل جاتا تو خود بھی شعر کہہ لیتے۔ شام کو مکان واپس آتے، مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر کبھی مکان پر اور کبھی دفتر میں آرام فرماتے اور فکر سخن میں مصروف ہو جاتے۔ اگر کسی مشاعرہ کی شرکت ضروری نہ ہوتی تو وہ رات کو جلد سو جانے کے عادی تھے۔

مولانا بڑے ہی صاحب علم و فضل بزرگ تھے۔ ان کی انگریزی تعلیم معمولی ہی تھی مگر ان کی انگریزی تحریر دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ صرف ایف۔ اے (سال اوّل) تک ہی پڑھے ہیں۔ عربی اور فارسی انہوں نے خوب پڑھی تھی۔ یہ تعلیم انہیں کچھ تو اپنے قابل قدر اساتذہ کے ذریعہ اور کچھ فطری ذوقِ مطالعہ سے حاصل ہوئی تھی۔ حضرت مولانا جمال الدین سرحدی مرحوم، مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا قمر الدین وغیرہ فاضل

ملک صاحب نے جو اسباب اصلاح و مشق کی تکمیل کی تھی۔ ان کا ذہن کافی اصلاح پسند تھا جس کا ثبوت ان کی ... نے اردو کی ... پر نظم ... مشکل مسائل اور معانی کے اظہار سے قاصر ہیں۔

اگرچہ خود ان کی تعلیم و تربیت قدامت پسند ماحول میں ہوئی مگر وہ بڑے روشن خیال اور مساوات پسند انسان تھے۔ معاشرے کے تمام طبقات ... تھے، اور ان کے ساتھ قدم بقدم چلنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کی وقت شناس نگاہیں ہمیشہ مستقبل پر رہتی تھیں۔ ادب کے معاملے میں ان کا یہی رویہ تھا۔ جب ان کے معاصرین کی اکثریت روایتی غزل کی پیچیدہ راہوں میں بھٹک رہی تھی انہوں نے اپنے تصورات ... کے ساتھ ہی ذہانت اور سنجیدہ اردو شاعری کی راہیں متعین کیں۔ کلیم مرحوم نے دیباچہ میں جو انہوں نے خود اپنی ... لکھا ہے اپنے نظریات شعری کی وضاحت فرمائی ہے۔ لکھتے ہیں:-

"اوائل مشق سخن تک مجھے قدیم تغزل سے دلچسپی تھی۔ لیکن وقت اور زمانے کے ساتھ موضوعات کا دائرہ جس قدر وسیع ہوتا گیا میرا قدیم سے لگاؤ کم ہوتا گیا۔ حالانکہ میرے رنگ قدیم میں بھی سوقیانہ، غیر مہذب اور بازاری عنصر کبھی نہ تھا۔ ۱۹۱۱ء سے میرا رنگ تغزل بدل گیا۔ میں اب شاعری میں بلند انسانی جذبات کی ترجمانی کا حامی ہوں یعنی شاعری میں فلسفہ، حقائق اور صداقت کے نکات پسند کرتا ہوں۔ میں اس شاعری کا منکر ہوں جس کا موضوع صرف عورت یا اس کے متعلقات ہوں یا جو مردہ پرستی کی نفسیات پر مشتمل ہو۔ میری شاعری کا موضوع حسن و عشق ہے اور تمام مظاہر کا مرجع وہ ذات ہے جو حامل حسن اور مرکز محبت ہے۔ جس طرح علم، شاعری کے لئے ضروری اور لازمی ہے اسی طرح محبت بھی شاعری کا لازم و ملزوم سمجھتا ہوں اور حقیقی واردات قلب کی ترجمانی میرا مسلک ہے۔ گو مجھے تمام اصناف سخن پر قدرت حاصل ہے مگر میں نظم، غزل اور رباعی کو اظہار خیال کا بہترین ذریعہ سمجھتا ہوں۔ شعر کی الہامی حیثیت پر میرا ایمان ہے۔ میں شعر میں جدت خیال کے ساتھ عام فہم الفاظ کا حامی ہوں۔ ایسے الفاظ جن میں غرابت نہ ہو اور جنہیں تعلیم یافتہ اصحاب بہ آسانی سمجھ سکیں۔

میں نظم کو غزل پر ترجیح دیتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ شعراء غزل سے زیادہ نظم گوئی کی طرف متوجہ ہوں۔ اس لئے کہ غزل جس چیز کا نام ہے وہ اپنی قدامت و کہنگی کی وجہ سے اب زیادہ کارآمد نہیں رہی۔ شعرائے متقدمین اس صنف کو تمام و کمال پامال اور ختم کر چکے ہیں۔ منتہی شعراء کے لئے بھی غزل میں اجتہاد و ایجاد کی گنجائش بہت کم باقی ہے۔ مگر نظم کا میدان بہت وسیع ہے اور یہ صنف سخن اردو شاعری کو کارآمد اور مفید بنا سکتی ہے۔ اس لئے زیادہ تر توجہ اسی کی طرف ہونا چاہیے۔

شعر و شاعری کے متعلق میرا ذاتی نظریہ یہ ہے کہ "زندگی شعر ہے اور شعر زندگی ہے" کائنات بغیر شاعر کے ایک ساز بے نغمہ ہے۔ شاعر دنیا کا ایک ایسا جزو لازم ہے جس کے بغیر دنیا کا قیام ناممکن ہے۔ الہام و القا کا وہ سلسلہ جو انبیاء و اولیاء کی ذات مقدس تک محدود ہے۔ شاعر کے دماغ اور سرکش کے ساتھ بھی باقی ہے اور ہمیشہ باقی رہے گا۔"

(کلیم مرحوم)

... مرحوم کے نزدیک شاعر کا مرتبہ بہت بلند تھا انہیں بڑا دکھ ہوتا تھا جب وہ اکثر شعراء کو مشاعروں اور ادبی محفلوں میں انسانیت سوز حرکات کا مرتکب ہوتے دیکھتے تھے، وہ شاعر کا وقار بہت بلند دیکھنے کے متمنی تھے۔ چنانچہ انہوں نے خود اپنی زندگی کو اسی رنگ میں ڈھال لیا تھا۔ وہ ایسے شعراء سے ملنا جلنا بلکہ بات کرنا تک پسند نہ کرتے تھے جو اخلاقی مراتب سے گرے ہوئے ہوں اور یہی وجہ تھی کہ بعض لوگ انہیں غلطی سے متکبر اور خود پسند سمجھتے تھے، مولانا فطرتاً نہایت منکسر المزاج تھے۔ میں نے انہیں خود اپنی آنکھوں سے اچھے سے اچھے اور کمتر درجے کے شعراء کی بھی مدارات کرتے دیکھا ہے۔ ... جب کبھی تشریف لاتے مولانا نہایت محبت سے بٹھاتے، گھنٹوں باتیں کرتے، ان کا کلام سنتے، اپنا سناتے، چائے پلاتے اور یہ امور تمام میزبانی کے فرائض انجام دیتے۔

علامہ سیماب جو خوددار انسان تھے ان کی خودداری ان کے پُروقار چہرے سے جھلکتی تھی۔ جب کبھی ان کے شاگرد یا عقیدت مند کسی بات پر
توان کا پیمانۂ صبر چھلک اٹھتا تھا وہ بپھر جاتے تھے ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو ان کا یہ انداز پسند نہ ہو۔ خودداری اور خودی کے درمیان کا
فرق سمجھنا اور ان حدوں کی حد شناسی کرنا ہر شخص کے بس کا کام نہیں ہے۔ ایک مرتبہ مولانا حیدرآباد کے ایک مشاعرہ میں تشریف لے گئے۔ وہاں
ان کی بڑی قدر ہوئی۔ وطن واپس آنے پر چند حیدرآبادی احباب کے توسل سے تحریک ہوئی کہ مولانا مستقلاً حیدرآباد چلے آئیں۔ وجہ یہ تھی کہ ان
سے اصلاح کلام کے طالب بھی تھے تنخواہ کے متعلق بھی معاملہ طے پاگیا مگر جب مولانا کو یہ معلوم ہوا کہ انہیں حیدرآباد کے رسوم کے مطابق دربار
میں پگڑی اور پیٹی باندھ کر حاضر ہونا پڑیگا تو ان کی خوددار طبیعت نے بغاوت کردی اور انہوں نے اس اعزاز کو قبول کرنے سے صاف انکار کردیا۔

اسی طرح ایک مرتبہ شکوہ آباد میں اسلامیہ اسکول کے قیام کے سلسلہ میں ایک جلسہ تھا پروگرام میں مشاعرہ بھی شامل تھا اسکول کا افتتاح کرنے کے لئے ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو مدعو کیا گیا تھا اور مشاعرہ کی صدارت علامہ سیماب کے ذمہ تھی۔ اتفاقاً دونوں حضرات ایک ہی ٹرین سے شام کے وقت تشریف لائے۔ منتظمین جلسہ میں چونکہ خاصی تعداد علیگڑھ کے تعلیم یافتہ طبقہ کی تھی لہٰذا وہ ڈاکٹر صاحب موصوف کو بڑے احترام سے کار پر بٹھا کر شہر لے گئے۔ مولانا کے لئے تانگہ کا انتظام کیا گیا۔ مولانا نے اسے اپنی توہین سمجھا اور اسٹیشن سے اس وقت تک قدم باہر نہ نکالا جب تک دوسری کار نہ منگوالی۔ بادی النظر میں یہ بات نہایت معمولی ہوسکتی ہے۔ کچھ لوگ اسے تنگ نظری اور عصبیت بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ معاملہ صرف سیماب کی ذات تک ہی نہ تھا بلکہ دیگر اکابرین شعر و ادب کے لئے بھی تامل کا مقام تھا۔ ہماری معاشی میں ہمارے بزرگانِ ادب کا مرتبہ سیاسی لیڈروں سے بھی کمتر سمجھا جاتا ہے (خواہ اس کے وجوہات کچھ بھی ہوں) اور وہ ان کی اہمیت کو محسوس نہیں کرتے اس لئے ہمارے ادیبوں اور شاعروں کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ عوام کو اپنی اہمیت کا احساس دلائیں اور ان کو اچھا ادب اور احترام کرنا سکھائیں۔

مولانا سیماب کو اپنی خودداری کی بڑی بڑی قیمتیں ادا کرنی پڑیں۔ تاریخ ادب میں شاید ہی کوئی ایسا شاعر یا ادیب ہوگا جس کے خلاف اس کی زندگی میں اس قدر کثرت سے لکھا گیا ہو جب مولانا سیماب پر پے در پے چاروں طرف سے حملے ہوتے تھے ان کے مخالفین اور معترضین ادبی تنازعات میں ذاتیات اور کردار کشی تک اتر آتے تھے مگر وہ جواں ہمت شمع ادب کی پہارو ہیاری میں بیٹھا ابھی ہنستا تھا کبھی جز بز ہوتا تھا اور کبھی زمانہ کی ناقدر شناسی کا شکوہ کرکے تاسف کرتا تھا، انہوں نے شاید کبھی خود اپنی قلم سے ان حضرات کا جواب لکھنا مناسب نہ سمجھا میں نے ایسے عزم اور ہمت کے انسان بہت کم دیکھے ہیں جو بیک وقت سیکڑوں طوفانوں سے ٹکر لیتے رہے ہوں اور ان سے صحیح و سلامت نکل کر ملک میں اس قدر مقبولیت اور شہرت حاصل کرسکے ہوں۔

ایک دن میں نے عرض کیا مولانا! ادبی دنیا میں آپ کے اس قدر مخالف موجود ہیں آپ زمانہ سازی سے کام کیوں نہیں لیتے شعرا اور نقاد آپ کو متکبر سمجھتے ہیں اور آپ کی خوددارانہ اسپرٹ کا غلط مطلب نکالتے ہیں آپ بھی دوسروں کی طرح ان کو فریب دیجئے۔ رفتہ رفتہ سب رام ہو جائیں گے۔ مولانا میرے اس سوال پر غور و فکر میں پڑ گئے۔ ان کے چہرہ سے کچھ بیکسی کے آثار جھلکنے لگے بولے۔ نظر صاحب! زمانہ سازی تو میرے بس کی بات نہیں، بچپن سے صاف گوئی کی عادت رہی ہے وہ کیسے بدل جائے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں متکبر نہیں ہوں۔ مجھے اپنے وقار کے تحفظ کا ضرور خیال رہتا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ اور ملک کے دوسرے شعرا بھی اس پر عمل کریں۔ جو کچھ جس کے جی میں آئے کہے میں کسی کو روک نہیں سکتا۔ لیکن یاد رکھئے کہ جب یہ دور گزر جائے گا۔ میں مرجاؤں گا۔ یہ نسل مرجائے گی تو سیماب کے کارناموں کی قدر ہوگی۔ میں نے اتنا کام کرلیا ہے کہ دنیا مجھے فراموش بھی کرنا چاہے تو نہیں کرسکتی میں نے اپنے ہاتھوں سے حیاتِ ابدی کا محل تعمیر کیا ہے اس عمارت کو میری مخالفت کے وقتی طوفان ڈھا نہیں سکتے ہیں۔

شہرتِ شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

[illegible] کے بعد اگر آپ کے ذہن میں کوئی ترمیم ہو تو بتا دیجیے میں اس پر عمل کرنے کو تیار ہوں [illegible] غزلوں میں دوسرے شعر سے مجھے شک ہے وہ لوگ اس کا مطلب الٹا سمجھے ہیں [illegible] پائیں گے۔ آپ کا خیال صحیح ہے مجھے بھی اس کا احساس ہے کہ دوسرے شعر میں [illegible] اس طرح سوچتے ہوں گے بعض وقت میں نے غلط [illegible] کو [illegible] مگر یہ میرا ملک کیا [illegible] شکل میں تبدیل ہو چکا ہے۔ آپ [illegible] مولانا کے صاحبزادے [illegible] نظم [illegible] کرتے ہیں [illegible] اور خون بہتا ہے [illegible] دوسرے شعر کے ساتھ مشوروں میں [illegible] انہیں کس قدر تکلیف پہنچی ہو گی۔ جہاں [illegible] ہیں لوگوں کی [illegible] تکلف ہے [illegible] جتنا پڑھے گا [illegible] وہاں [illegible] میں چاہتا ہوں کہ آپ [illegible] معاصرین کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت [illegible] آپ سے کہہ سکتا ہوں [illegible] ہی بتائیے اس میں [illegible] ہے۔ [illegible] اور میری [illegible] مقبولیت اور شہرت [illegible] نہیں [illegible] ایک دن خدا [illegible] خاک ہو جائیں گے۔

مجھے خدا نے حسد سے بچا لیا سیماب — بڑا مشکور محسود روزگار ہوں میں

علامہ مرحوم کی قادر الکلامی اور [illegible] کے سب ہی معترف تھے۔ شعر کہنا ان کے لئے بچوں کا کھیل تھا۔ [illegible] اشعار موزوں کرنے میں [illegible] دیر نہ لگتی تھی۔ وہ شعر کہنے کی مشین تھے۔ [illegible] ہو گیا ہے [illegible] شاگردوں کی غزلوں پر اصلاح دیتے جاتے ہیں۔ [illegible] تو وقت [illegible] عام طور پر پلنگ پر کروٹ کے بل لیٹے ہوتے تھے قلم اور کاغذ قریب رکھ لیتے تھے [illegible] بے تکلف لکھتے چلے جاتے تھے۔ [illegible] دیکھا ہے کہ وہ شعر کہتے وقت گنگناتے ہیں [illegible] سگرٹ پر سگرٹ پیتے ہیں [illegible] تب کہیں [illegible] شعر کی غزل کہہ پاتے ہیں۔ مولانا کے لئے یہ تمام لوازمات غیر ضروری تھے۔ ان کو کبھی بیٹھے بیٹھے [illegible] ہو جاتے تھے [illegible] جتنے اشعار چاہتے تھے موزوں کر لیتے تھے۔ مشاعروں میں کلام پڑھتے وقت بھی وہ [illegible] تمکنت سے [illegible] ہر شعر پر جھک جھک کے سلام کرنے اور [illegible] کرتے کبھی نہیں دیکھا۔ ان کی آواز بڑی [illegible] تھی۔ شعر [illegible] سے ادا کرتے تھے۔ ان کے پڑھنے کے طریقہ کو نہ تحت اللفظ کہا جا سکتا ہے اور نہ ترنم۔ وہ ان دونوں کے درمیان کی کوئی چیز تھی۔ ان کے پڑھتے وقت شعر اور شاعر دونوں کے وقار کا احساس ہوتا تھا۔ عوام کو تو ان کے اشعار پر داد دینے کی [illegible] ہی نہ ہوتی تھی۔ خواص کی داد پر وہ کبھی کبھی مسکرا دیتے تھے۔ جب ان کو کسی اچھے شعر پر مشاعرہ میں داد ملتی تھی تو ان کے چہرہ پر ایک خاص قسم کی بشاشت کی سرخی دوڑ جاتی تھی۔

ان کی قادر الکلامی کے بارے میں ابھی میں عرض کر چکا ہوں۔ اپنے بیرونی اور مقامی پچاسوں شاگردوں کی غزلوں اور نظموں پر اصلاح دینا ان کا روزانہ کا معمول تھا۔ چند گھنٹے دن کے اس کام کے لئے وقف تھے۔ اگر کسی دن ڈاک کم ہوتی تھی تو فاضل وقت میں اپنے لئے کوئی غزل یا نظم کہہ لیا کرتے تھے۔ ان کے شاگردوں میں ہر مذہب و ملت کے لوگ شریک تھے ان کے ادبی اور سیاسی رجحانات بھی جدا جدا ہوتے تھے۔ مولانا کو ان کے نظریات سے اختلاف ہونا فطری تھا مگر اصلاح کلام کے وقت وہ اپنے نظریات کو بالائے طاق رکھ کر شاگرد کے مسلک کے مطابق اصلاح دیتے تھے اور کسی کو اپنا نظریۂ حیات بدلنے پر مجبور نہ کرتے تھے۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ان کے ہزاروں شاگرد ملک کی مختلف تحریکات سے وابستہ ہیں۔ بعض روایتی غزل گو ہیں بعض ترقی پسند گروپ سے منسلک ہیں۔ کوئی کانگریسی ہے تو کوئی مسلم لیگ کا ہمنوا ہے اور کچھ لوگ کمیونسٹ

بے حد عقیدت و عشق رکھتے۔

مولانا علامہ کے متعلق ایک لطیفہ ہے۔ حضرت علامہ ایک مرتبہ ٹونک تشریف لے گئے۔ ٹونک کے شعراء کی یہ خواہش ہوئی کہ علامہ کا امتحان لیا جائے چنانچہ انہوں نے صبح حاضر ہو کر مولانا سے عرض کیا کہ آج شب کو آپ کو ایک مشاعرہ کی صدارت کرنا ہے جس کا مصرع طرح " آگ لگ جائے ... نہیں ہے " اور یہ کہ آپ کو اپنے اسکول کے دستور کے مطابق خطبۂ صدارت بھی پڑھنا ہوگا۔

اس زمین میں غالب کی ایک مشہور غزل ہے جس کی بحر نہ صرف اردو میں غیر مروجہ بلکہ نہایت مشکل ہے۔ مولانا کو بھی کسی نے آگاہ کر دیا کہ آپ کا امتحان مقصود ہے۔ علامہ مرحوم نے بخوشی یہ دعوتِ امتحان قبول کر لی اور رات کو مشاعرہ میں نہ صرف طویل طرحی غزل پڑھی بلکہ اسی زمین اور اسی ردیف قافیہ میں ساٹھ ستر اشعار کا خطبۂ صدارت بھی خلافِ معمول نثر کے بجائے نظم میں پیش کیا۔ مولانا کی اس قادر الکلامی پر شعرائے ٹونک دنگ رہ گئے۔ اور دوسرے دن کئی حضرات نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔

مولانا جس زمانے میں "وحئ منظوم" کی تکمیل فرما رہے تھے مجھے آگرہ میں ان کے ہمراہ چند دن قیام کا اتفاق ہوا۔ قرآن پاک کا ترجمہ آسان کام نہ تھا۔ مولانا صبح غسل فرماتے اور نماز سے فارغ ہو کر کمرہ میں آ بیٹھتے تھے۔ لوبان اور اگربتیاں جلائی جاتی تھیں۔ کلام پاک کے متعدد نسخے میزوں پر اردگرد کھول کر رکھ دیئے جاتے تھے اس کے بعد وہ ترجمہ شروع فرماتے تھے۔ ایک ایک آیت کی تلاوت کرتے تھے پھر مختلف تراجم کا مطالعہ کر کے اس آیت کا ترجمہ نظم کرتے تھے دوپہر کو تھوڑی دیر آرام فرمانے کے بعد سہ پہر سے پھر وہی شغل شروع ہو جاتا تھا۔ یہ بڑا کام تھا مگر مولانا کو چونکہ زبان اور بیان پر بے انتہا قدرت حاصل تھی لہذا انہوں نے صرف ساڑھے پانچ ماہ میں یہ عظیم الشان کام سر انجام دے لیا۔ وہ اپنے اس کارنامہ پر بے انتہا مسرور تھے اور فرماتے تھے کہ میری یہ خدمت نہ صرف میری نجات کا باعث ہوگی بلکہ میرے نام کو دنیا میں زندہ رکھنے کی ضامن ہوگی۔ افسوس کہ سرمایہ کی کمی کے باعث یہ ترجمہ ابھی تک شائع نہیں ہو سکا ہے۔ ان کے بڑے صاحبزادے منظر صدیقی نے کراچی سے صرف "نمونتاً" پارۂ عمّ کا ترجمہ چھپوا دیا ہے۔ حکومت پاکستان کو اس جانب توجہ کرنی چاہئے ایسا نہ ہو کہ دست برد زمانہ کے ہاتھوں یہ نایاب گوہر ضائع ہو جائے۔

مولانا مرحوم بڑے پکے مسلمان تھے۔ عقیدتاً وہ حنفی تھے، تصوّف سے بھی انہیں گہری دلچسپی تھی۔ حاجی وارث علی شاہ صاحب سے انہیں بیعت حاصل تھی وہ اپنے پیر سے بے انتہا عقیدت اور محبت رکھتے تھے۔ حاجی صاحب قبلہ کی ایک تصویر ان کے سرہانے آویزاں رہتی تھی۔ اور اس پر پھولوں کا ہار یا کبھی کبھی ایک سہرا پڑا رہتا تھا۔ وہ نماز بھی پڑھتے تھے اور روزے بھی رکھتے تھے اگرچہ اس ضمن میں زیادہ محتاط نہ تھے۔ بزرگانِ دین اور پیشوایانِ اسلام سے انہیں گہری محبت تھی۔ محرم کے ایام میں غزلیں کہنا ترک کر دیتے تھے اور اس مہینے میں صرف سلام یا شہدائے کربلا سے متعلق نظمیں یا مرثیے نظم کرتے تھے۔ ان کے سلاموں اور اس قسم کی نظموں کے دو مجموعے "سرود غم" اور "نفیر غم" شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ اس مذہبی شغف کے باوجود وہ دوسرے مذاہب کا بھی احترام کرتے تھے۔ دوسرے مذاہب کے بزرگوں سے بھی ان کو دلی لگاؤ تھا تعصب تو انہیں چھو تک نہ گیا تھا ان کے مجموعوں میں جہاں پیغمبر اسلام اور دیگر رہنمایانِ اسلام پر نظمیں ہیں وہیں ان کے مدّاحِ شری کرشن، گوتم بدھ وغیرہ کو بھی خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ سری کرشن جی سے تو انہیں خصوصی دلچسپی تھی۔ انہوں نے ہندو مذہب کے اس پیغمبر محبت کے متعلق بہت سی نظمیں مختلف عنوانات سے کہی ہیں جو کرشن گیتا کے نام سے شائع ہو چکی ہیں کرشن جی کو وہ کس نظر سے دیکھتے تھے اس کا اظہار ان ہی کی زبان سے سنئے۔ "کرشن گیتا" کے دیباچہ میں ایک جگہ تحریر فرمایا ہے۔

" مجھے ہندو مذہب کے قدیم اوتاروں میں صرف سری کرشن سے بڑی عقیدت و محبت ہے اس کا ایک سبب تو میرا شاعرانہ ذوق ہے کہ مجھے سری کرشن کی زندگی یکسر رومان اور مطلق محبت نظر آتی ہے۔ ہندوستان میں پریم اور پریت یعنی عشق و محبت

کے بعد بھی یاد ہو گئے ہیں۔ ان کا مرثیہ مولانا کی شہرت کی بنیاد بن گیا ہے۔ اس میں ایک بند کا حصہ صدی میں مولانا کی ناسری نے جو گیت لکھے ہیں ان کا اثر [illegible] تک محسوس ہوتا ہے جب کبھی وہ پڑھے جاتے ہوئے ہوں گے [illegible] ہو رہے ہیں کے جاتے ہیں اب تک مولانا کی ناسری یاد آتے ہوئے متاثر کرتے ہیں۔

مولانا کو صحت کے مناظر سے بھی بڑی دلچسپی تھی انہوں نے مختلف مناظر پر نظمیں لکھی ہیں۔ کلکتہ، پہاڑ، شفق، ہوا، صبح، شام، چاندنی، مقام سفر ان کے لئے دلکشی کا سامان فراہم کرتے تھے اور صورت کیف و نشاط بخشتے مگر ہمیں بوجہ دریا اور ساحل سے [illegible] ایک مرتبہ جب میں نے اس کا سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ سمندر دریا سے نفرت کا سبب ایک complex ہے۔ وہ ایک مشاعرہ کے سلسلہ میں ڈھاکہ گئے ہوئے تھے۔ وہاں انہیں [illegible] کشتی کے ذریعہ پار کرنی پڑی۔ دریا میں سیلاب آیا ہوا تھا۔ جب کشتی درمیان میں پہنچی تو آندھی آ گئی [illegible] فضل سے تمام مسافر بچا لئے گئے۔ مولانا مرحوم کو اسی دن سے دریا اور اس کی جولانیوں سے نفرت ہو گئی۔ جہاز پر جانے کے لئے ان کو کہا جاتا تھا۔ وحی منظوم کے ترجمہ کے زمانہ میں میں نے ان سے گزارش کی کہ آپ آگرہ کی اس [illegible] یا کسی اور جگہ تشریف لے جائیں تو بہتر ہو۔ فرمانے لگے جی تو میرا بھی یہی چاہتا ہے مگر کیا کروں۔ [illegible] چاہتا اگر یہاں کو یہاں چھوڑتا ہوں تو دل ان ہی میں لگا رہے گا [illegible]

انہیں اپنے اہل و عیال کا بڑا خیال تھا۔ خاندان میں [illegible] انتہا سے اکثر کہا کرتے تھے وہ اس کی پیاری پیاری باتیں سن کر بہت خوش ہوتے تھے [illegible] فسادات سے بہت ڈرتے تھے۔ ایک مرتبہ جب میں آگرہ میں مولانا کے یہاں مقیم تھا شہر میں ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ مولانا بہت پریشان اور مضطرب ہیں۔ ہر گھنٹہ بعد حالات معلوم کرنے کی فکر ہے گھبرائے ہوئے کمرے میں ٹہل رہے ہیں۔ میں نے جرأت کر کے عرض کیا مولانا مسلمان کے لئے موت برحق ہے آپ موت سے اتنا کیوں ڈرتے ہیں۔ کہنے لگے مجھے اپنی جان کی اتنی فکر نہیں۔ بلکہ بیوی اور بچوں کی فکر ہے۔

مولانا کو اپنے وطن آگرہ سے بے پناہ محبت تھی وہ اسے تمام دنیا میں سر سبز و معزز دیکھنا چاہتے تھے ان کو اس کی ادبی حرمت کا بھی بڑا احساس تھا۔ [illegible] تاج کے عنوان سے انہوں نے جو نظمیں لکھی ہیں وہ ان کی وطن دوستی کی شاہد ہیں ان نظموں میں آگرہ کی ایک ایک عمارت کا ذکر اس خلوص اور صداقت سے کیا گیا ہے کہ جواب نہیں، تاج کا حسن تو ان کی شاعری میں جذب ہی ہو چکا تھا۔ انہوں نے بھی تاج پر مختلف نقاط سے کتنی خوبصورت اور کچھ آخری نظمیں کہی ہیں جو شاید تاج کے فنا ہو جانے کے بعد بھی اس کا نام باقی رکھنے کے لئے باقی رہیں گی۔ وہ پاکستان میں تھے، مگر ان کی روح آگرہ کی گلیوں میں بھٹکتی پھرتی تھی اس جدائی سے انہیں کتنی روحانی تکلیف تھی اس کا احساس صرف وہی کر سکتا ہے جو ان کی طرح وطن دوست دل رکھتا ہو۔

علامہ مرحوم کی ذات مجسم عمل تھی میں نے انہیں کبھی بیکار نہیں دیکھا۔ احباب اور شاگردوں میں بیٹھ کر گپ شپ ہانکنا ان کا شیوہ نہ تھا۔ وہ زندگی بھر علم و ادب کی خدمت کرتے رہے تقریباً ۳۰ کتابیں تصنیف کیں۔ اقتصادی حالات سے مجبور ہو کر اکثر کتابوں کا حق اشاعت دوسروں کے نام فروخت کر دیا۔ آخر میں چند کتابیں اپنے ادارہ قصر الادب کی جانب سے شائع کرائیں۔ ضعیفی میں بھی وہ دن رات کام کرتے تھے۔ پاکستان منتقل ہو جانے کے بعد بھی تصنیف و تالیف کا یہ سلسلہ بدستور جاری رہا۔ پاکستان میں جب ان پر فالج کا حملہ ہوا تو تھوڑا سا افاقہ ہوتے ہی پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئے، فالج کے اثر سے جب خود لکھنے کے قابل نہ رہے تو اپنے چھوٹے صاحبزادے مظہر صدیقی سے منظوم خطوط کے جوابات اور غزلیں وغیرہ لکھواتے رہے۔ وہ دوسروں کو بیکار بیٹھے دیکھ کر تعجب کرتے تھے اور سوچتے تھے کہ لوگ بیکار رہ کر وقت کس طرح گزار لیتے ہیں۔ ایسے صاحب فکر و عمل شخص دنیا میں شاذ و نادر ہی پیدا ہوتے ہیں۔ افسوس کہ علم و عمل کا یہ چراغ دنیا کو پچاس سال تک روشنی دے کر ۳۱ جنوری ۱۹۵۱ء کو کراچی میں گل ہو گیا۔

مرزا یگانہ چنگیزی

سید اعظم حسین اعظم

۱۹۳۳ء سے چند دنوں قبل مرزا یگانہ چنگیزی کے ذاتی حالات سے میں کچھ زیادہ واقف نہیں تھا کیونکہ مجھے ان کو قریب سے دیکھنے اور ان سے ملنے جلنے کا بہت کم موقع ملا تھا۔ میں نے سب سے پہلے شاید ۱۹۲۲ء میں مرزا یگانہ کے چند اچھے شعر انہی کے لیے ہمارے پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی سے سنے تھے۔ پروفیسر صاحب موصوف نے اس حقیقت پر واضح فرمایا تھا کہ مرزا یگانہ صرف اچھے شعر کہتے ہی نہیں بلکہ پڑھتے بھی خوب ہیں۔ پروفیسر صاحب موصوف نے اس وقت مرزا یگانہ کے جو اشعار سنائے تھے ان میں سے دو ایک مجھے یاد ہیں اور دل سے پسند ہیں۔ وہ شعر یہ ہیں:

آہ پتا بھی کھل گئے کانوں کو روتے روتے ہوئے ‖ خوب جانا کہ پھر آنکھ سے کچھ یاد کو کر

وصال یار جب نظر آیا سر از منزل کو ‖ نگاہ شوق سے آگے تھا کارواں دل کا

اس کے بعد گاہے گاہے مرزا صاحب کا کلام ادبی رسالوں میں نظر سے گزرا ـــــ کئی سال بعد حکیم سید محمد قاسم صاحب کے مطب الادویہ میں مرزا صاحب سے ملاقات ہوئی۔ حیدر آباد دکن میں سب رجسٹرار تھے۔ وہاں سے چھٹی پر آئے ہوئے تھے۔ میں نے روزنامہ سرفراز کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ان کے کلام کی فرمائش کی اور انہوں نے کچھ شعر مجھے عنایت کئے۔

یہ مرزا یگانہ سے میری پہلی ملاقات تھی۔ سیاہ رنگ، داڑھی مونچھیں صاف، کمزور، سن رسیدہ آدمی نظر آئے۔ شخصیت کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا مگر ان کی شہرت سن چکا تھا اور دیکھا نہیں تھا۔ اس لئے ان سے ملکر ذوق تجسس کو یہ تسکین ہوئی کہ یہی مرزا یگانہ ہیں۔

اس کے بعد طویل مدت تک مرزا یگانہ سے ملنے کی نوبت نہیں آئی۔ رسائل میں یا خود ان کے مجموعہ رباعیات میں مرزا غالب دہلوی کے متعلق ان کے معاندانہ اشعار پڑھ کر ان سے ایک طرح کی بیزاری دل میں پرورش پاتی رہی۔ ان اشعار میں صرف اپنی تعلی اور غالب کی ہجو ہوتی تھی، کوئی ایسی قابل لحاظ تنقید نہیں ہوتی تھی جس سے ان کے سنجیدہ غور و فکر کا ثبوت ملتا۔

مرزا یگانہ حیدر آباد کی ملازمت سے ریٹائر ہو کر لکھنؤ آئے تو کبھی کبھار انہیں دیکھنے سننے کا اتفاق ہوا، پھر بھی کوئی مسلسل ملاقات اور تبادلہ خیالات کا موقع نہیں ملا۔ تقریباً دو سال ہوئے کہ ان کے خلاف مسلمان پبلک میں ایک ہیجان عظیم ہوا اور ایک دن ان کی بری گت بنائی گئی۔ جو تحریر یا ان سے

[illegible] کی کوئی بھی صورت قابلِ اعتراض نہیں سمجھی گئی ہے مرزا صاحب نے اس [illegible] ایک مصرع بھی نہیں سمجھا کہ انھوں نے کیسے جرأت کی [illegible] ۔ نہ [illegible] کر کے اس طرح اچھال دو کہ پبلک کا بھرم باقی رہ گیا۔ چنانچہ میں نے اخبار "روشنی" میں جو کہ اس وقت میری ادارت میں نکل رہا تھا اس مسئلہ پر دو ایک مضامین لکھے [illegible] کی اشتعال انگیزی میں حصہ لینے والے اخبارات جیسے [illegible] مرزا صاحب سے اختلاف کا اظہار کرتے رہے۔

اس دوران میں مجھے مرزا یگانہ کے حالات ان کے بعض احباب سے معلوم ہوتے رہے۔ میں نے [illegible] کو بہت زیادہ [illegible] کے دل و دماغ پر بہت زیادہ ہے۔ جس مکان میں رہتے تھے اس سے ایک [illegible] بیرونی شہر کے لئے [illegible] کہ اس میں ان کی تاریخ [illegible] دو سو سالہ بھی [illegible] ۔ پڑوسی نے [illegible] ۔ ان کی وفات تک وہ ایک دوسرے مکان میں [illegible] کسی عزیز نے ان کو جگہ دی اور ایک [illegible] وہاں رہے۔ [illegible] ان کے [illegible] رہ گیا تھا اور اس [illegible] ہو کر ایک اور مکان میں کرایہ کے مکان میں رہنے لگے۔ اس مکان میں [illegible] تھے کوئی دوسرا [illegible] نہیں تھا [illegible] تکلیف تھی [illegible] تھے تو [illegible] جا پڑے گئے۔ حالت نازک ہو گئی۔ ایک [illegible] ان کو [illegible] ان کی خدمت کے [illegible] ۔

میں ان سے ملنے گیا۔ مرزا یگانہ سے [illegible] بہت خوش ہوئے۔ ایک چھوٹا کمرہ ان کے ساتھ ہے جس میں ان کا پلنگ بچھا ہوا ہے۔ اس کو ٹھری کے پاس ایک بڑے ظرف میں [illegible] ہے جس میں [illegible] پلنگ کے سامنے ایک میز ہے جس پر کچھ کتابیں اور کاغذات اور کچھ چائے کے ظروف وغیرہ رکھے ہیں۔ وہیں [illegible] وغیرہ ہیں۔ ایک معمولی سی کرسی رکھی ہے۔ کمرے کے کونے میں کسی دوسرے شخص کا بستر بچھا ہوا ہے جس کے [illegible] لگا ہوا ہے مگر مرزا صاحب اس وقت کمرے میں بالکل تنہا تھے۔ کمرے کا دروازہ بند ہوتا ہے جسے کسی کی آمد کی صورت میں مرزا صاحب کھولتے ہیں اور پھر فوراً بند کر دیا جاتا ہے۔

مرزا صاحب بہت بیمار ہیں اور اپنی زندگی سے تقریباً مایوس ہیں۔ اس عالم میں انھیں اپنی تنہائی کا بہت [illegible] ہے [illegible] ان کی شریکِ زندگی بھی اس وقت ان کے پاس نہیں ہیں۔ وہ اپنے حال [illegible] کے متعلق پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی سے بعض امور باتیں کرتے رہے۔ پھر "نقوش" کے لئے مضمون کا تذکرہ ہوا۔ کافی دیر گفتگو رہی [illegible] ان کے حالات زندگی بیان کئے۔ کبھی لیٹ جاتے تھے کبھی [illegible] کی تکلیف سے بیٹھ جاتے تھے۔ [illegible] پر لیٹ جاتے تھے اور سگریٹ جلا کر پینے لگتے تھے۔ [illegible] سننے کا اتفاق ہوا اور ان سے بعض دوسرے سوالات کئے جن کے جوابات پا کر میں اس فن [illegible] کی بعض خوبیوں اور بعض کمزوریوں سے براہِ راست مطلع ہوا۔

مرزا یگانہ کا پورا نام مرزا واجد حسین ہے۔ ان کے والد مرزا پیارے صاحب تھے۔ یہ [illegible] عظیم آباد کے محلہ مغلپورہ میں پیدا ہوئے تھے۔ تاریخی ملازمت [illegible] ہے۔ ابتدائی تعلیم مولانا محمد سعید صاحب حسرت عظیم آبادی کے مدرسے میں ہوئی۔ پھر محمڈن اینگلو عربک اسکول پٹنہ میں داخل ہوئے۔ ۱۹۰۳ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے انٹرنس پاس کیا۔ شعر و ادب میں مذاق سخن کی اصلاح سب سے پہلے مرزا سید علی خاں بیتاب عظیم آبادی نے اور ان کے بعد شاد عظیم آبادی نے کی۔ [illegible] میں علاج کے سلسلے سے لکھنؤ آئے، پھر یہیں ایک معزز گھرانے میں شادی ہو گئی [illegible] سے لکھنؤ ہی کو اپنا وطن بنا لیا۔

اردو زبان پر بڑی قدرت رکھتے ہیں اور زبان دانی، محاورہ بندی، جدتِ بیان اور جوشِ ادا کے لئے خاص طور پر مشہور ہیں۔ وہ دنیائے ادب میں تقریباً پچاس سال تک بہ خیال خود اپنے ادبی فرائض انجام دینے کے باعث بدنام ہیں۔ عام طور پر [illegible] آج بھی [illegible] جھگڑنے میں گزاری بمصداق

[illegible] کے لیے انجام دیا مگر وہ صاحب کے نزدیک ان کی یہ زندگی بلاجواز اپنی زندگی تھی جسے تسلیم کرنے سے وہ بہت پہلے [illegible] سمجھتا ہے۔ بعد میں انہوں نے صاحب کی مکتوب کے خلاف اس لئے آواز بلند کی کہ ان کے نزدیک ان صاحب کو رد کرنے کا حق صاحب کو حاصل نہیں رہ سکتے۔ مرزا یگانہ نے اس سلسلے میں شعرائے لکھنؤ پر پُرجوش تنقید بھی کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام لکھنؤ اور سارا اودھ ایک طرف ہو گیا اور مرزا یگانہ ایک طرف — ایک خاصا محاذ قائم ہو گیا جس کا زور و شور تقریباً بیس سال تک رہا۔ لکھنؤ کے شعراء نے مرزا یگانہ کا اس حد تک بائیکاٹ کیا کہ جن مشاعروں میں وہ جاتے تھے ان میں وہ سب شعراء شرکت نہیں کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ مرزا یگانہ کو مشاعروں میں مدعو کرنے سے احتراز کرنے لگے۔

مرزا یگانہ نے تقریباً ۱۹۱۵ء سے مرزا غالب کے کلام کی تنقید یا تنقیص کی شروع کی۔ اس سلسلے کا مقصد غالب پرستوں کی روش کی مخالفت تھا لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ سارے ہندوستان کے شاعر و ادیب بگڑ بیٹھے کہ کل اہلِ ذوق مرزا یگانہ سے بیزار ہو گئے۔ مرزا یگانہ کی "غالب شکنی" بھی جاری رہی تا آنکہ انہوں نے غالباً ۱۹۳۴ء میں "غالب شکن" کے نام سے ایک رسالہ شائع کیا۔

"غالب شکن" کی شانِ نزول یہ ہے کہ ایک بار کانپور میں آل انڈیا شاعروں کی کانفرنس زیرِ صدارت سر راس مسعود مرحوم ہوئی جس میں مختلف لوگوں نے مقالے پڑھے۔ ایک مقالہ نگار نے اس وقت کے شعراء پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے مرزا یگانہ کے مجموعۂ رباعیات "ترانہ" کا حوالہ دیا جس میں مرزا یگانہ نے غالب کی بجو میں سخت الفاظ استعمال کئے تھے۔ مقالہ نگار نے ترانہ کا حوالہ دیتے ہوئے تعجب کا اظہار کیا کہ ایک ایسا بلند خیال شاعر ایسی پستی تک کیسے اتر سکتا ہے۔ پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی بھی اس کانفرنس میں شریک تھے۔ آپ نے کانفرنس سے واپس آکر لکھنؤ سے مرزا یگانہ کو جو خط لکھا، جس میں کانفرنس کے مقالہ نگار کے قول کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا کہ "آپ کے کمال کے قدردان آپ کی شاعری کے بارے میں اس سے بہتر رائے سننے کے خواہشمند ہیں۔"

پروفیسر مسعود حسین صاحب رضوی کے اس مختصر خط کے جواب میں مرزا یگانہ نے ایک نہایت ہی طویل مکتوب انہیں روانہ کیا جس میں اپنے رویہ کو حق بجانب ٹھہراتے ہوئے غالب پر بڑی طرح سے وار کئے تھے۔ اسی مکتوب کو مرزا یگانہ نے بعد میں کتابی شکل میں "غالب شکن" کے نام سے شائع کیا۔ "غالب شکن" کے پہلے ایڈیشن میں جو رباعیاں درج ہیں ان میں محض غالب کی ہجو کی گئی ہے، کوئی تنقید نہیں ہے مگر جب "غالب شکن" کا دوسرا ایڈیشن "غالب شکن دو آتشہ" کے نام سے شائع کیا تو اس میں بعض ایسی رباعیاں بھی اضافہ کیں جن میں غالب کے کردار کی بعض جہتیں کمزوریاں ایک حد تک دکھائی گئی ہیں۔

غالب پر مرزا یگانہ کے پے در پے حملوں سے ایک عرصے تک ہندوستان کے ادبی حلقوں میں مختلف لہریں اٹھتی رہیں۔ آخر کر فضا میں سکون ہوگیا اور خود بقول ان کے رفتہ رفتہ یہ مسئلہ بھی داخل دفتر ہو گیا۔ مرزا یگانہ کا عقیدہ ہے کہ یہ ایک فرض تھا جو فطرت کی طرف سے ان پر عائد کیا گیا تھا اور جسے انہوں نے بڑی کامیابی سے انجام دیا۔ مرزا یگانہ جس وقت اپنی اگلی معرکہ آرائیاں بیان کرنے لگتے ہیں تو اس پیرانہ سالی اور بیماری کے عالم میں بھی ان کے چہرے پر ایک تازگی و شگفتگی سی آجاتی ہے، ان کی آواز بلند ہو جاتی ہے، ان میں جوش و خروش پیدا ہو جاتا ہے اور وہ عجیب فاتحانہ شان سے مسکراتے ہیں۔ اس مسکراہٹ میں یہ اعتماد ہوتا ہے کہ وہ تو ضرور ہی فاتح رہے، اب یہ الگ بات ہے کہ دنیا اس کا اعتراف کرے یا نہ کرے۔

اس میں تو بہر حال شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ مرزا یگانہ اپنی دھن کے پکے ہیں۔ وہ ملک کے مذاقِ عام کو یا ملک کی موجودہ ادبی تحریک کا مطالبہ پورا کرنا کیسا، ان کو قابلِ اعتنا بھی نہیں سمجھتے۔ وہ ملک کو وہی چیز دے سکتے ہیں جو وہ خود دینا چاہتے ہیں۔ ساری زندگی ان کا یہی مسلک رہا، جس پر ان کی رفتار تیز ہوتی گئی۔ صلح و آشتی کی توقع ایسے اکھڑ اور اپنے اوپر بہت زیادہ بھروسا رکھنے والے شخص سے بالکل بے محل تھی۔

مرزا یگانہ کی یہ خودداری و خود اعتمادی جو اکثر حضرات کے نزدیک خود بینی و خود پرستی کی حدوں تک پہنچی ہوئی ہے، صرف شعر و ادب کی دنیا تک محدود نہیں ہے بلکہ دیگر معاشرتی معاملات میں حتیٰ کہ اپنے نجی امور میں بھی کارفرما رہی ہے جس سے انہوں نے نقصانات بھی اٹھائے ہیں۔ چنانچہ حیدرآباد دکن کی کسی وسیع و زرخیز ریاست میں بھی رہ کر جہاں بڑے بڑے مواقع ترقی کے تھے اور ان کے لئے ترقی کی راہیں بھی نکل سکتی تھیں انہوں نے کوئی ترقی نہیں کی۔

[illegible] ہو گئے۔ ہمارے [illegible] کے وہ اپنے [illegible]
کی [illegible] اسے ہی [illegible] تھی۔ وہ [illegible] ان کی [illegible]
[illegible] کا بھی اظہار کیا۔

ان ہی [illegible] میں جب کہ مرزا یگانہ کی ملازمت دو سال کی رہ گئی تھی [illegible] مرزا صاحب سے [illegible] کی بات ہوئی رخصت لے کر میرے پاس کیوں نہیں آ جاتے۔ [illegible] کی تجویز دیکھی کہ مرزا صاحب ملازمت [illegible] بہت گھبرائے [illegible] سمجھے جو جواب ایسے شخص سے کبھی [illegible] نہیں [illegible]۔ مرزا صاحب نے [illegible] کی تجویز کا کوئی جواب نہیں دیا اور خاموش رہے۔ [illegible] جنرل رجسٹریشن کو بھی اس امر کا خیال ہوا کہ مرزا صاحب وظیفے سے پہلے چھ مہینے کی رخصت لے کر جگہ خالی کر دیں تو وہ اپنا [illegible] اس جگہ [illegible]۔ مرزا صاحب نے رخصت نہیں لی گو انسپکٹر جنرل نے مرزا صاحب کا معاملہ [illegible] اسی جگہ کیا جہاں مرزا صاحب [illegible] کے آفس نہیں گئے اور رخصت لے کر ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ انہوں نے [illegible] کی [illegible] ماہانہ ضرور ہی ملتے۔

مرزا یگانہ جو کچھ جانتے اور سمجھتے ہیں وہی زبان سے کہتے ہیں، جھوٹ نہیں بولتے، [illegible] سے کام نہیں لیتے۔ وہ مصلحت بینی و مصلحت کوشی نہیں ہیں۔ وہ تہذیب سے گفتگو کو نفاق و ضمیر کشی سمجھتے ہیں۔ [illegible] جس سے دنیا ان سے بیزار و ناخوش ہو گئی مگر وہ اپنی اس [illegible] پر نادم و پشیمان نہیں ہیں بلکہ آج بھی اس کو صحیح سمجھتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں۔

مرزا یگانہ نہ صرف اردو کے عظیم المرتبت شاعر غالب دہلوی کو اپنے سے کمتر سمجھتے ہیں بلکہ فارسی کے بے نظیر غزل گو نظیری جیسے شاعر سے بھی اپنے کو بہتر و افضل تصور کرتے ہیں۔ آپ علامہ اقبال کو بھی خاطر میں نہیں لاتے اور ان کے خلاف بھی مضامین لکھے ہیں۔

مرزا یگانہ کی تصانیف حسب ذیل ہیں:

(۱) "شہرت کاذبہ المعروف بہ خرافات عزیز": یہ رسالہ اسی نام سے چھپا۔ اس میں لکھنؤ کے نامور شاعر عزیز لکھنوی پر شدید حملے ہیں، ان کے کلام پر اعتراضات ہیں۔

(۲) "آندھی گھری": ایک مضمون ہے جس میں ہم عصر شعرا پر رد کی گئی ہے۔

(۳) "چراغ سخن": یہ عروض پر رسالہ ہے جس میں تمام شعرا کی عروض دانی پر اعتراضات کی بارش کی گئی ہے۔

(۴) "ترانہ": مجموعۂ رباعیات

(۵) "غالب شکن": جس کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے۔

(۶) "ادب خبیث": یہ ایک مضمون ہے جو "ادب لطیف" کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ اس میں اردو کے ان مضامین کی جو رسائل و جرائد میں "ادب لطیف" کے نام سے لکھے جاتے تھے پُرزور مذمت کی گئی ہے۔

(۷) "آیات وجدانی": مرزا یگانہ کی غزلیات کا مجموعہ ہے اور شعری حیثیت سے یہی ان کا سب سے اہم ترکہ کہا جا سکتا ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ مرزا یگانہ کی غزل میں بہت اچھے اچھے شعر ملتے ہیں۔ غالب کی غزلوں پر بھی انہوں نے غزلیں کہی ہیں اور ان میں بعض بعض شعر بہت اچھے ہیں۔ مثلاً غالب کی زمین میں یگانہ کی غزل کا ایک شعر سنئے:

پیدا نہ ہو زمیں سے نیا آسماں کوئی
دل کانپتا ہے آپ کی رفتار دیکھ کر

ان کی بعض رباعیاں بھی بہت عمدہ ہیں۔ ایک رباعی سنئے ؎

کعبہ کی طرف دور سے سجدہ کر لوں یا دیر کا آخری نظارہ کر لوں
کچھ دیر کی مہمان ہے جاتی دنیا اک اور گنہ کر لوں کہ توبہ کر لوں

اہلِ مذہب کی نظروں میں یگانہ ملعون و مغضوب ہیں مگر خود یگانہ اپنے کو مسلمان سمجھتے اور مسلمان کہتے ہیں۔ البتہ وہ ایک آزاد خیال مسلمان ہیں اور بعض مذہبی نظریات کے متعلق کچھ اپنے مخصوص خیالات رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ انتہائی غور و خوض، تحقیق و تدقیق کے بعد انہی نتیجوں تک پہنچے ہیں۔ اس میں کوئی تصنع و ریاکاری نہیں ہے بلکہ ممکن ہے کہ وہ غلط نتیجے تک پہنچے ہوں مگر ان کا دماغ یہیں تک انہیں لے گیا ہے لہٰذا وہ اسے صحیح سمجھتے ہیں۔ خیر اس نازک و ناخوشگوار بحث کو چھوڑئیے اور مرزا یگانہ کی ایک رباعی سنئے جس میں ان کی مذہبیت اور غالب دشمنی دونوں ایک ساتھ ظاہر ہوتی ہیں جو کہ بہت سے لوگوں کے لئے اچنبھے کی بات ہے اور خود مجھے بھی مرزا یگانہ کی زبان سے یہ رباعی سن کر خوشگوار حیرت ہوئی تھی ؎

دونوں ویرانے ہیں علیؑ کے طالب جان ایک ہے گو جدا جدا ہیں قالب
مذہب میں، شاعری میں، آدمیت میں غالب ہیں یگانہ اور یگانہ غالب

یہ رباعی سن کر میں نے مرزا یگانہ سے کہا کہ اس میں تو آپ غالب کے قدردان نظر آتے ہیں۔ میرے جواب میں وہ بولے "مجھ سے زیادہ اور کون غالب کو سمجھ سکتا ہے؟"

یہ ہیں مرزا واجد حسین یاس عظیم آبادی ثم یگانہ چنگیزی لکھنوی ثم "تنہا شناسانِ ادب" ثم "امام الغزل" ثم "غالب کے چچا"!

اب آپ انہیں جو کچھ سمجھئے۔ یہ آپ کے فیصلہ پر چھوڑا جاتا ہے۔ البتہ آپ سے استدعا ضرور ہے کہ کسی رائے کے قائم کرتے وقت یگانہ پر کوئی الزام نہ عائد کیجئے گا۔ ان کی اصلی تصویر پیش ہو۔ کہئے گا کہ یہ ان کی خواہش ہے اور ایک ستر سال کے بوڑھے خادمِ شعر و ادب کی آخری خواہش کا احترام بہرحال ضروری ہے۔

رضا علی وحشت

احمد قادری

میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اپنے گھر میں مولانا رضا علی وحشت کا ذکر سنتا رہا ان کا کلام رسالوں میں پڑھتا آیا ہوں۔ غالباً ۱۹۳۶ء کا زمانہ تھا کہ مجھے پہلی بار مولانا وحشت کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اس زمانے میں میں اسکول کا طالب علم تھا۔ مولانا وحشت سے ملاقات ہوئی اور ان کی خوش خلقی اور ملاطفت سے میں بے حد متاثر ہوا۔ جہاں انکو دیکھ کر میرے اندر ایک روحانی مسرت پیدا ہوئی وہاں ان کی پروقار شخصیت کا رعب بھی مجھ پر طاری ہو گیا اور میں نے ایسا محسوس کیا کہ میں واقعی ایک بہت بڑی شخصیت کے سامنے کھڑا ہوں۔ انہوں نے مجھ سے دو چار سوال بھی کر ڈالے لیکن میں کچھ ایسا گھبرا رہا تھا کہ ان کے کسی سوال کا جواب بھی نہ دے پایا۔ وہ مسکرا دیے۔ ان کی مسکراہٹ میں کوئی طنز نہیں تھی بلکہ محبت اور بزرگانہ شفقت تھی۔ اس کے بعد سے مجھے مولانا وحشت کی خدمت میں برابر حاضری دینے اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کرنے کا موقع ملتا رہا ہے۔

ہمیں مولانا وحشت کی شخصیت کے تین پہلو بہت نمایاں نظر آتے ہیں۔ پروفیسر، انسان اور شاعر۔ پروفیسر حضرات میں عام طور پر اپنی علمیت کا غرور ضرورت سے زیادہ متانت، عالمانہ شان اور اپنے کو ہر وقت لئے دیئے رہنے کا انداز پیدا ہو جاتا ہے۔ مولانا وحشت میں ایسی کوئی بات نہیں۔ مولانا وحشت علم کا ایک بحر ذخار ہیں۔ چھوٹے سے چھوٹا طالب علم بھی ان کے سامنے اپنے کو طفل مکتب محسوس کرتا ہے۔ باوجود اس کے وہ زندگی بھر اپنے شاگردوں پر بڑے رعب اور جلال کی شان کبھی بھی اپنے اندر پیدا نہیں ہونے دی۔ وہ لوگ جنہیں وحشت کو قریب سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا ہے وحشت کو صرف اردو فارسی کا عالم سمجھتے ہیں یہ سچ ہے کہ وحشت نے اردو فارسی زبان و ادب کا بڑا گہرا اور باقاعدہ مطالعہ کیا ہے لیکن یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ان دونوں زبانوں کے علاوہ وحشت نے انگریزی زبان و ادب کا بھی مطالعہ کیا ہے اور اس سلسلے میں ان کی نظر بڑی گہری اور وسیع ہے۔ ان کی انگریزی تحریروں سے ان کی زبان دانی کا کافی ثبوت ملتا ہے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ جس زمانے میں مولانا وحشت اسلامیہ کالج کلکتہ میں اردو فارسی کے پروفیسر تھے حیدرآباد دکن سے [illegible] یار جنگ تشریف لائے تھے۔ ان کو انگریزی میں ایک سپاسنامہ پیش کرنا تھا۔ انگریزی ادب کے ایک پروفیسر طاہر جمیل مرحوم کے ذمہ یہ کام سپرد کیا گیا۔ طاہر جمیل مرحوم ایک انگریز پروفیسر مرحوم کے پاس گئے اور ان سے سپاسنامہ لکھنے کی درخواست کی۔ پروفیسر مرحوم (Holme) نے اپنی مجبوری ظاہر کی اور انہیں مشورہ دیا کہ یہ سپاسنامہ مولانا وحشت سے لکھوایا جائے تو بہتر ہے۔ طاہر جمیل مرحوم کو پہلے تو یقین نہیں آیا اور سوچا کہ مولانا وحشت کا انگریزی سے کیا واسطہ لیکن بالآخر جب مولانا وحشت نے سپاسنامہ انگریزی زبان میں لکھ کر طاہر جمیل مرحوم کے سپرد کیا تو جمیل مرحوم کو سخت تعجب ہوا

اساتذہ نے درست لکھا کہ: آج [illegible] کی آبرو داری کے بعد [illegible] [illegible] حضرت کا [illegible] ہو گئی ہے: [illegible] [illegible] ذات کی دلیل ہے۔ مولانا وحشت کی ان ہی خصوصیات اور حیثیت کی بنا پر ایک عزیز شاگرد [illegible] مرحوم کہا کرتے تھے کہ وحشت [illegible] ہیں:

انسانی حیثیت سے مولانا وحشت کا جواب اس زمانے میں مشکل ہی سے مل سکتا ہے۔ یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہیں کہ اس اعتبار سے وہ آپ اپنا جواب ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شرافت اور عجز و انکسار سے ان کا خمیر اٹھا ہے۔ یہ ان کی شرافت کی دلیل ہے کہ آج تک کسی کو ان سے شکایت کا موقع نہیں ملا۔ شکایت تو در کنار جس کو ان سے ایک مرتبہ ملنے کا اتفاق ہوا وہ ان کے خلوص اور حسن سلوک سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے آج تک انہیں کسی کا ذکر برائی سے کرتے نہیں دیکھا۔ معمولی سے معمولی انسان کو بھی وہ لفظ آپ سے مخاطب کرتے ہیں۔ کبھی کسی کی شکایت یا کسی کو برا بھلا کہنا ان کی طبیعت کے خلاف ہے۔ ہمارے یہاں کوئی دور ایسا نہیں جسے ہم شعرا کی معاصرانہ چشمک سے خالی کہہ سکیں۔ باوجود اس قدر نمایاں ترقی کے دور جدید بھی معاصرانہ چشمک سے خالی نہیں۔ ایک ادیب کا دوسرے ادیب کو اپنے سے کمتر سمجھنا ایک لازمی بات ہے۔ لیکن اس بارے میں وحشت کا کردار سب سے الگ اور منفرد ہے۔ ان کے اندر ہم ذرہ برابر بھی احساس برتری نہیں پاتے۔ وہ ہر کسی کو اپنے سے بلند و برتر سمجھتے ہیں۔ اور اپنے معاصرین کا ذکر نہایت احترام و عزت سے کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک صاحب وحشت صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے اپنے کلام پر اصلاح لینے کی خواہش ظاہر کی۔ مولانا نے اپنی مجبوری کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ "میں نہایت عدیم الفرصت انسان ہوں۔ میرے پاس وہ کہاں کہ آپ کچھ دیکھ سکیں گے۔ اور اسی سبب سے شاگرد بنانا ایک طرح سے ترک کر دیا ہے"۔ ان صاحب نے فوراً پوچھا کہ سیماب صاحب (اس وقت سیماب صاحب حیات تھے) کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ مولانا نے کہا کہ "سیماب صاحب کے متعلق میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ وہ مجھ سے بہت بہتر ہیں"۔ مشاعروں میں ہر شاعر یہاں تک کہ مبتدیوں کا کلام بھی نہایت غور سے سنتے ہیں اور تعریف کرتے ہیں۔ شعر میں جو فنی اور معنوی محاسن ہوتے ہیں ان کی طرف ہلکے ہلکے اشارے بھی کرتے جاتے ہیں اور اس طرح پڑھنے والوں کی ہر طرح حوصلہ افزائی فرماتے رہتے ہیں۔

مہمان نوازی مولانا وحشت کی طبیعت ثانیہ بن گئی ہے۔ جو لوگ ان کے یہاں جاتے ہیں وہ ان کی خاطر مدارات کئے بغیر نہیں آنے نہیں دیتے۔ خود ایک چھوٹی سی کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں اور اپنے مہمان کو صوفے پر بٹھاتے ہیں۔ عمر کی وجہ سے اب مولانا وحشت بہت نحیف و نزار ہو گئے ہیں۔ کمزوری کی بنا پر اٹھنے بیٹھنے میں انہیں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن اگر کوئی ان کے یہاں چلا جاتا ہے تو فوراً مردانے میں آتے ہیں اور نہایت تپاک سے ملتے ہیں۔ اور جب تک وہ بیٹھا رہتا ہے خود بھی بیٹھے رہتے ہیں۔ ہر چند کہ ایسا کرنے میں انہیں سخت جسمانی کوفت محسوس ہوتی ہے لیکن اپنے ملنے والے کے اندر اپنی تکلیف اور گھبراہٹ کا ذرا بھی احساس پیدا نہیں ہونے دیتے۔ یہاں میں نے اکثر لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ مولانا وحشت کی خدمت میں برابر حاضری دینے کو جی چاہتا ہے لیکن یہ سوچ کر کہ مردانے تک آنے میں انہیں بڑی دقت ہوتی ہے ان کے یہاں جانے کی ہمت نہیں پڑتی۔

وضع داری مولانا وحشت کے کردار کی ایک بڑی اہم خصوصیت ہے۔ اس زمانے میں انہوں نے جس طرح اپنی وضع داری نباہی ہے اور نباہ رہے ہیں یہ انہی کے دل گردے کا کام ہے۔ جب میں نے پہلی بار انہیں دیکھا اس زمانے سے لے کر اب تک ان کے لباس اور وضع قطع میں کوئی فرق نہیں پایا۔ لمبی شیروانی، چوڑے پائنچے کا پاجامہ، سر پر ٹوپی، عمدہ قسم کا موزہ اور جوتا۔ یہ ہے مولانا کا لباس۔ شیروانی کی جیب میں ایک گھڑی رہتی ہے جس کی نقرئی زنجیر شیروانی کے بٹن میں لگی ہوتی ہے۔ یہ گھڑی مولانا کی جیب میں ہمیشہ رہتی ہے۔ اس لئے کہ انہیں وقت کی پابندی بہت زیادہ عزیز ہے۔ ان کی زندگی میں ہمیں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ وہ کہیں وقت مقررہ پر نہ پہنچ سکے ہوں۔ مشاعروں میں عام طور پر لوگ دیر سے

[illegible] یہاں سے ان کا اصل اندازہ ہوتا ہے۔ یہی مولانا وحشت جیسے شاعروں میں وقت کا معاملہ ہے تقریباً ایک وقت پر پہنچ جانے کی عادت کے سلسلے میں مجھے ایک واقعہ یاد آگیا ہے جسے یہاں بیان کرنا غالباً بے محل نہ ہوگا۔ ایک دفعہ کلکتہ کے قریب ایک مشاعرہ تھا۔ وحشت صاحب بھی اس مشاعرے میں مدعو تھے۔ اتفاق سے کسی کا انتظار ہے کہ کس قدر دور ہے جہاں لوگ عام طور پر ٹرین سے جاتے ہیں۔ ٹرین شام کے سات بجے چھوٹنے والی تھی۔ جانے والے تمام شعرا اسٹیشن پہنچ گئے تھے۔ اور مولانا وحشت کا انتظار کرنے لگے۔ سات بجنے میں کچھ منٹ رہ گئے اور وحشت اس وقت تک اسٹیشن نہیں پہنچے تھے۔ لوگوں کے دلوں میں طرح طرح کے شبہات پیدا ہو رہے تھے۔ مولانا پابندیٔ وقت کے لیے مشہور تھے۔ سبھی لوگ سوچ رہے تھے کہ ضرور کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی ہے ورنہ وقت کی پابندی کا خیال مولانا سے زیادہ کس کو ہو سکتا ہے۔ سات بجنے میں ایک منٹ باقی تھا۔ تمام لوگ مایوس ہو چکے تھے کہ اتنے میں دور سے مولانا وحشت تیزی سے آتے ہوئے دکھائی دیے۔ جب وہ قریب پہنچے تو تمام لوگ ان کے ساتھ ایک ڈبے میں داخل ہو گئے اور چند منٹ بعد ٹرین چل پڑی۔ کچھ دیر کے بعد ایک صاحب نے مولانا وحشت سے کہا کہ حضور آج خلاف معمول ٹرین ایک دو منٹ دیر سے روانہ ہوئی۔ یہ اچھا ہوا ورنہ شاید ہم لوگ آپ سے محروم رہ جاتے: مولانا وحشت نے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے ہمیشہ وقت کا خیال کیا ہے۔ کیا آج وقت میرا خیال نہ کرتا؟ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وحشت صاحب نے وقت کا ہمیشہ خیال رکھا ہے۔

مشاعروں میں وحشت صاحب شروع سے اخیر تک ایک ہی انداز میں بیٹھے رہتے ہیں۔ چاہے مشاعرہ دو گھنٹے ہو یا رات بھر ہو۔ پہلو بدلنا بھی مشاعرہ کی وضع داری کے خلاف ہے۔ لوگوں کو حیرت ہوتی ہے کہ کوئی شخص رات بھر مسلسل ایک ہی پہلو کیسے بیٹھ سکتا ہے۔ رات بھر مشاعرے میں ایک ہی انداز میں بغیر پہلو بدلے بیٹھا رہنا مولانا وحشت کے لئے جس قدر تکلیف دہ ثابت ہوتا ہوگا اس کا اندازہ مشکل نہیں۔ لیکن اس کو کیا کیجئے یہ بات ان کی وضع داری کے تحت آتی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ آداب مجلس کا انہیں کتنا پاس ہے۔ کار گر میں جھلک مولانا کی اس وضع داری اور خصوصیت پر پڑتی ہے۔ یہاں مجھے وحشت صاحب کا ایک شعر یاد آگیا جو خود انہی پر صادق آتا ہے:

خیال تک نہ کیا اہل انجمن نے کبھی
تمام رات جلی شمع انجمن کے لئے

خطوط کا جواب لکھنا اور فوراً لکھنا مولانا کے لئے ایک فرض سے کسی طرح کم نہیں۔ آج بھی جبکہ کمزوری اور ضعیفی کی بنا پر ہاتھوں میں رعشہ پڑ گیا ہے لکھتے وقت انگلیاں کانپتی ہیں اور بینائی بھی کسی قدر کم ہو گئی ہے اگر کوئی انہیں خط لکھتا ہے تو وہ اس کا جواب فوراً لکھتے ہیں اس لئے کہ یہ بات ان کی وضع داری کے خلاف ہے کہ ان کی ذات سے کسی کی دل شکنی ہو یا کسی کو تکلیف پہنچے۔ وہ خود نقصان اٹھا کر دوسروں کو فائدہ پہنچانا چاہتے ہیں۔

میں نے اپنے ایک بزرگ سے سنا ہے کہ وحشت صاحب کے ایک ہم جماعت تھے جو زیادہ تعلیم حاصل نہ کر سکے اور تقسیم ملک کے پہلے ایک چھوٹا سا ہوٹل کھول لیا تھا۔ وہ ہوٹل ہرگز ایسا نہیں تھا جہاں کوئی شریف اور معقول قسم کا آدمی جا کر بیٹھتا۔ لیکن کہتے ہیں کہ وحشت صاحب جب کبھی اس راہ سے گزرتے تو بلا ضرورت بھی اس ہوٹل میں جا کر چائے ضرور پی لیتے۔ اور اس کی وجہ صرف یہ بتائی جاتی ہے کہ کہیں مولانا کے اس ہم جماعت کے دل میں یہ گمان نہ گزرے کہ وحشت صاحب بڑے اور مشہور آدمی ہو گئے ہیں اس لئے مجھ سے ملنے میں انہیں ہچکچاہٹ ہوتی ہے اور اسے کسر شان سمجھتے ہیں۔ مولانا جب کلکتہ میں تھے تو ان کے پاس ہمیشہ ٹرام کا پاس ہوتا تھا اور ٹرام والے پاس صرف فرسٹ کلاس کا دیتے ہیں۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا کہ مولانا پاس جیب میں رکھے سیکنڈ کلاس میں بیٹھ جاتے۔ ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وحشت صاحب کے اندر جھوٹی شان و شوکت کی نمائش ذرہ برابر بھی نہیں ہے۔

وحشت صاحب کے شاگردوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ برصغیر ہند و پاک کا شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو جہاں ان کے دو چار شاگرد موجود نہ ہوں۔ ہند و پاکستان سے باہر مثلاً رنگون وغیرہ میں بھی ان کے کچھ شاگرد ہیں۔ مولانا کے شاگردوں کی صحیح تعداد معلوم کرنا اور ان کے تفصیلی حالات جاننا

بہت مشہور ہے اس لئے کہ مولانا مرحوم اپنے شاگردوں کے متعلق بہت کم باتیں بتاتے ہیں۔ مولوی سید محمد مرحوم (سابق [illegible]) بھی مولانا کے شاگرد تھے اور ایک زمانے سے مولانا سے اصلاح لیتے تھے۔ لیکن مولانا نے اس کو اس طرح چھپا کے رکھا جیسے کوئی [illegible] مقربوں سے دور رہا۔ [illegible] تک اس راز کو چھپا نہ سکے ۔

مولانا اپنے شاگردوں کو اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتے ہیں۔ ان کے دکھ درد میں کام آنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اپنے شاگردوں سے کچھ قبول کرنا وہ معیوب سمجھتے ہیں۔ بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے شاگردوں کی امداد کرتے ہیں۔ اور کسی کو کانوں کان اس کی خبر نہیں ہونے دیتے۔ لیکن جن شاگردوں کی وہ مدد کرتے ہیں وہ خود اس کو ظاہر کر دیتے ہیں۔ اگر کسی شاگرد کی ملازمت جاتی رہی اور وہ مالی مشکلات میں مبتلا ہو گیا تو مولانا نے مسلسل ہر مہینے اس کو مالی مدد پہنچائی اور اسے حسب ضرورت دیتے رہے۔ ان باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا حسرت اپنے شاگردوں کو شاگرد نہیں بلکہ اپنی اولاد سمجھتے ہیں اور ان کے ساتھ اولاد کا سا سلوک کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسی حالت میں اگر مولانا کے شاگرد ان کے پاؤں دھو دھو کر پیتے اور خدا کی طرح پوجتے اور ان کے لئے ہر وقت اپنی جان تک قربان کر دینے کے لئے تیار رہتے ہیں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ۔

مولانا حسرت کو روپیہ پیسہ کا کبھی کوئی لالچ نہیں ہوا۔ روپیہ کو انہوں نے ہمیشہ ضروریات زندگی کو پورا کرنے کا ایک ذریعہ سمجھا اور کبھی انہوں نے آج تک اپنے کسی شاگرد سے کوئی فرمائش نہیں کی۔ ایک مرتبہ محمد عبدالعلی شوق سندیلوی کو ایک نئی بات سوجھی اور انہوں نے غزلیں کہیں اور ہر غزل پر مختلف شعراء سے اصلاح لی اور ہر ایک کو اس غلط فہمی میں رکھا کہ وہ اسی کے شاگرد ہیں۔ پھر ۱۹۲۶ء میں ان تمام شعراء کی اصلاحوں کو ترتیب دے کر کتابی شکل میں شائع کر دیا اور اس کا نام "اصلاح سخن" رکھا۔ اصلاح لینے کے زمانے میں مختلف شعراء سے ان کی خط و کتابت ہوتی تھی۔ "اصلاح سخن" کے آخر میں ان تمام خطوط کو بھی ضمیمہ "اصلاح سخن" کے نام سے شائع کر دیا۔ یہ خطوط بڑے پرلطف ہیں اور اس وقت کے اساتذہ کی افتاد طبع کی بخوبی ترجمانی کرتے ہیں۔ کسی صاحب نے ان سے مٹھائیاں طلب کیں کسی نے سندیلہ کے لڈو کی فرمائش کی کسی نے اپنی کتابیں خریدنے اور بعض نے مدیر بننے کو کہا۔ ایک صاحب فرماتے ہیں "میرا یہ بھی معمول ہے کہ جو صاحب مجھ سے اصلاح لیتے ہیں ان سے بغرض فاتحہ بزرگان و اساتذہ سلف ان کی توفیق اور ہمت کے مطابق کچھ نقد منگا کر مٹھائی تقسیم کر دی جاتی ہے۔ لہٰذا حسب توفیق بھیجئے۔ باقی رہی استاد کی خدمت یہ آپ جانیں اور آپ کی ہمت۔" دوسرے صاحب لکھتے ہیں "ہمیشہ اصلاح کے لئے باضابطہ شاگردی لازمی ہے۔ شاگردی کی مٹھائی عنایت فرمائیے۔" ایک صاحب لکھتے ہیں "آپ نے ...... ٹھیک فنڈ میں اعانت کا وعدہ فرمایا ہے۔ اس وقت دو کتابیں پریس جا چکی ہیں ...... ایک سو روپیہ کا خرچ ان دونوں کتابوں میں ہے۔ مجھے پچاس روپیہ بہت جلد بھیجنا چاہئے۔ اگر آپ اعانت فرما سکتے ہوں تو جلد توجہ کیجئے ...... امید ہے کہ آپ ذرا ہمت کر کے جہاں تک جلد ہو سکے اور جو کچھ مناسب رقم ہو سکے عنایت فرما کر شکریہ کا موقع دیجئے۔" ایک صاحب ٹکٹ کے دام تک وصول کرنا چاہتے ہیں اور فرماتے ہیں "جتنی غزلیں ایک دم آئیں اتنے ہی ٹکٹ بھی آ جانا چاہئیں۔" ایک صاحب لڈو کی فرمائش یوں کرتے ہیں اور حسن طلب کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جاتا "اب آپ سے ہم وطنی کی بنا پر ایک شکایت ہے۔ آپ نے جوابی لفافہ کیوں بھیجا کیا سندیلہ میں اب لڈو نہیں بنتے جو یہ ٹکٹ آیا ہے۔ شکایت سن کر کیمیا پارسل نہ بھیج دیجئے گا۔ اس کو بصیغہ امانت رکھنے میں تعطیل کرما میں آ کر خود لے لوں گا۔" ایک قبلہ نے تو اس معاملہ میں انتہا ہی کر دی۔ ان کے خطوط بڑے دلچسپ ہیں اور پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں یہاں ان کے مختلف خطوط سے صرف چند سطریں نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں "میرے دیوان ...... کی اشاعت کے متعلق میرے شاگردوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہم اپنے مصارف سے چھپائیں گے۔ چنانچہ لوگوں نے ایک فنڈ کھولا ہے آپ بھی چندہ بھیجیں ...... یہ پہلا بار ہے جو ڈالا جاتا ہے ...... اب تک تمہارے چندہ کا انتظار ہے ...... کی اشاعت میں تم بھی کچھ مدد دو۔" آگے تاکید کرتے ہوئے فرماتے ہیں "تمہاری امداد کا انتظار ہے۔" اپنے آخری خط میں یہ بزرگ کسی قدر خفگی کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں "مجھے سخت حیرت ہے کہ اب تک آپ نے ...... کی اشاعت میں کسی قسم کی امداد دی۔ محض معذرت تو کافی نہیں تو چکی

چاہئے تھی۔ شاید ان کی اسی [illegible] کے تقاضے سے کہ مجھ کو مولانا وحشت کا ایک خط بنام شوق صدیقی ملا۔ وحشت صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

"عزیز محترم! السلام علیکم۔ گرامی نامہ مع غزلوں کے موصول ہوا۔ نہایت شرمندہ ہوں کہ اس سے قبل جواب نہیں لکھ سکا۔ مریض و معذور رہتا ہوں۔ خدا خدا کرکے آج کچھ وقت ملا ہے [illegible] آج جواب لکھ رہا ہوں۔ آپ کا کلام ماشاءاللہ بہت خوب اور پُرجوش ہے۔ مجھ جیسے [illegible] اصلاح [illegible] کرنے کی ضرورت نہیں۔ [illegible] شکریہ کے ساتھ واپس کرتا ہوں۔ امید ہے آپ [illegible]۔ وحشت۔"

آج ہمارے شعراء حضرات کے لئے مشاعروں میں [illegible] اس سے میری غرض یہ نہیں کہ میں اس کو معیوب سمجھتا ہوں [illegible] وحشت کو ہرگز یہ گوارا نہیں کہ وہ باہر کسی مشاعرے میں شرکت [illegible] انہوں نے اس طرح کے کتنے ہی مشاعروں میں شرکت کی [illegible] مولانا وحشت کی یہی وہ [illegible] شرکت [illegible] بلکہ نہیں وہ اس معاملے میں مولانا وحشت [illegible]۔

مولانا وحشت سے [illegible] یہ بات [illegible] زندگی کے نشیب و فراز سے گزرے ہیں انہوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے [illegible] انہوں نے زندگی کے بہت سے [illegible] دوران ان کو حالات نے بڑے کٹھن دور سے گزرنے پر بھی مجبور کیا [illegible] جب [illegible] مولانا نے [illegible] کوئی بھی واقف نہ ہو سکا۔ البتہ اس کے لئے انہوں نے شاعری کا سہارا لیا اور شعر کے پردے میں سب کچھ کہہ گئے [illegible] شخص جس نے وحشت صاحب کو قریب سے دیکھا ہے ان کے حسب ذیل اشعار سے ان کی زندگی کے ایک پہلو کے متعلق بہت کچھ معلوم کر سکتا ہے:

ہم دیکھے ہیں زمانے نے ہمارے دل نے | اب کوئی اس میں تمنا کا گزر ہوتا ہے
ہم دیکھے ہیں زمانے کے مجھے کیا غم اگر | مٹ گیا دل سے مرے نام و نشان آرزو
شکل کچھ ایسی بدل دی یاس نے امید کی | آرزو پر بھی نہیں ہوتا گمان آرزو
کوئی کس طرح مصیبت سے بچے دنیا میں | مجھے اور کچھ ہی عشق کا سودا نہ سہی
جہاں میں چھوڑ جاتا میں الم کا ایک افسانہ | اگر مجھ سے مری روداد غم تحریر ہو جاتی
مجھے منظور ہے اپنی فلاح سے نہیں فائدہ [illegible] | ہے ضرر ہی سے مجھے [illegible] نفع جیسے فریب

یہ اور اس قسم کے اشعار وحشت صاحب کے ہاں بھرے پڑے ہیں جن کو ترتیب دے کر ہم اگر چاہیں تو ان کی زندگی کا خاکہ تیار کر سکتے ہیں لیکن اس کے لئے ہمیں ان کی پچھلی زندگی سے واقفیت کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں عمر کی وجہ سے مولانا اب نہایت نحیف و کمزور ہو گئے

ہے اور آنا جانا ان کے لئے ایک امر دشوار ہے۔ باوجود اس کے جب لوگ بہت مصر ہوتے ہیں اور کسی نہ کسی صحبت میں وہ غزل سنانے کی ...

غزل اپنی مجھے پڑھتے ہی بنے گی وحشت
پاس احباب سہی، دل کا تقاضا نہ سہی

اب وحشت صاحب شعر و سخن سے ایک طرح سے دست بردار ہو چکے ہیں:

نہ وہ وحشت کرے نہ وہ شعر میں تکلیف شرکت کی
کبھی کچھ کہہ لیا کرتا تھا اب اس میں رہا کیا ہے

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے کسی سے اپنا حال کہنا یا اپنی تکلیف و مصیبت بیان کرنا وحشت کی خودداری طبیعت کے خلاف ہے۔ وہ ہزار دل غم سہہ لیں گے لیکن یہ گوارا نہ کریں گے کہ اس کی خبر بات نہیں ہونے دیں گے۔

کیوں سکوت اپنا بتائے سبب خاموشی
کیوں نطق حال کہے دل کی پریشانی

ان دنوں وحشت صاحب بہت رنجیدہ رہتے ہیں۔ اس کا ایک سبب ترک وطن ہے۔ وطن کا جب ذکر آ جاتا ہے تو ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے ہیں۔ یہ غم ان کو اندر ہی اندر کھا رہا ہے۔

باعث اندوہ دل غربت کا ہر منظر مجھے
کاش جان وحشت یاد وطن میرے لئے

وطن کے چھوٹنے کے علاوہ اس وقت جو غم کھا رہا ہے وہ پچھلے زمانہ کی یاد ہے۔ پچھلے واقعات جب انہیں یاد آتے ہیں تو باوجود سعی بھی ان کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں۔ پچھلے ساتھیوں کو یاد کر کے وہ کڑھتے رہتے ہیں۔ اس وقت ان کے دل کی جو حالت ہوتی ہوگی وہ اہل نظر اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس وقت کا کلام صحیح معنوں میں ان کی زندگی کا آئینہ دار ہے۔ پوری پوری غزل ایک ہی رنگ میں ہوتی ہے وہ رنگ جس میں ان کی زندگی کا رنگ جھلکتا ہے۔

جو زندگی میں ہمیں کچھ امید ہی نہ رہی — تو زندگی بھی ہماری رہی رہی نہ رہی
دل فسردہ نے یوں مجھ کو بے نیاز کیا — کہ دہر میں کوئی شے وجہ دلکشی نہ رہی
مقام شکر ہے کہ اک وقت ایسا آ پہنچا — کہ دل کے حال سے خود دل کو آگہی نہ رہی
غلط ہے دوں جو گلستان دہر کو الزام — جب اپنے غنچۂ خاطر میں تازگی نہ رہی

اور آخری شعر تو بالکل ان کے حسب حال ہے:

یہ کیا ضرور ہے روؤں میں عیش رفتہ کو
برا ہی کیا ہے جو لب پر مرے ہنسی نہ رہے

وحشت صاحب شاعری میں صداقت کے قائل ہیں۔ ایسے خیالات جن میں صداقت کا فقدان ہوتا ہے ان کے نزدیک وقعت نہیں رکھتے وہ خود اپنے شعروں میں بھی اس کا بہت خیال رکھتے ہیں اور اپنے شاگردوں کو بھی ہدایت کرتے ہیں کہ صداقت کا دامن کسی حال میں ہاتھ سے نہ جانے پائے وہ حد سے زیادہ مبالغہ کو پسند نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے کہ مبالغہ جب اپنی حد سے تجاوز کر جاتا ہے تو پھر شعر شعر نہیں رہتا بلکہ معما بن جاتا ہے شعر میں صداقت اور بلند خیالی کے علاوہ وہ لطف زبان کا بھی بڑا خیال رکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ نہ صرف موضوع کوئی چیز ہے اور نہ صرف زبان

یہ مصرع وحشت کی دور رس نگاہ کا ایک بہترین نمونہ ہے جو اس شعر میں پایا جاتا ہے۔

پہنا نہیں سکتا ہے کوئی وحشت کو

مشہور ہی ہی کرو شیدہ کہ ثابت نہیں

وحشت صاحب نے شعر کہنے کے علاوہ کچھ تنقیدی مقالے بھی لکھے ہیں جو کئی سال پہلے مختلف جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ وحشت صاحب نے مولانا حالی مرحوم کی غزل گوئی پر ایک رنگین مقدمہ پر تنقید کی تھی جب مقدمہ حالی مرحوم کی نظر سے گزرا تو انہوں نے معذرت کر کے لکھا "مولانا آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے میری غزل گوئی کی طرف توجہ کی ہے ورنہ اب تک لوگ مجھے تو مرثیہ گو ہی سمجھتے رہے ہیں۔" اس واقعہ سے وحشت صاحب کی نظر کی گہرائی، وسعت اور شعر کی پرکھ کا کافی ثبوت ملتا ہے۔

سلطان حیدر جوش

وحید احمد

پیدائش بجنور۔ مرحوم سلطان حیدر صاحب باپ کی طرف سے شیخوپورہ (بدایوں) کے فریدی خاندان سے تھے اور ماں کی جانب سے ان کا سلسلہ حکیم احسن اللہ خاں صاحب دہلوی سے ملتا تھا۔ معلوم نہیں حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ شیخ فاروقی تھے یا سید تھے مگر سیادت فریدی کو تسلیم کرنے والے سلطان حیدر کے نام سے پہلے سید لکھا کرتے تھے۔ ان کے والد نے پہلے عیش میں پھر راہ خدا میں اپنی کثیر جائداد لٹا دی تھی سخاوت میں وہ مشہور تھے۔ چہرہ پر نور برستا تھا۔ بڑھاپے میں بچوں کی سی باتیں بہت وقار اور متانت سے کیا کرتے تھے۔ سلطان حیدر کا بچپن اپنی والدہ صاحبہ کے زیر سایہ دہلی میں گزرا اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ اینگلو عربک اسکول دہلی سے انٹرنس پاس کرنے کے بعد ۱۹۰۵ء میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ پہنچے۔ لیکن ۱۹۰۷ء میں بعہد نواب محسن الملک جب کالج میں اسٹرائک ہوا تو انہیں علی گڑھ کو خیرباد کہنا پڑا اور سلسلہ تعلیم ختم ہو گیا۔ اس کے بعد کچھ وقت بیکاری میں گزرا اور کچھ سعی ملازمت میں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۱۲ء میں ملازمت تحصیلداری سے شروع کی اور نیک نامی کے ساتھ ۱۹۴۶ء میں ڈپٹی کلکٹری سے پنشن پائی۔ علی گڑھ میں سکونت اختیار کی اور وہیں ۱۱ مئی ۱۹۵۳ء کو ہمیشہ کے لئے آرام کی نیند سو رہے۔

دہلی میں فٹ بال ٹیم کے اچھے کھلاڑیوں میں تھے۔ بچپن کے سلسلہ میں قلعہ کے انگریزی فوجیوں سے مراسم ہو گئے تھے۔ انگریزی تہذیب کے رسیا تھے علی گڑھ کالج کی فٹ بال ٹیم نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ صاحبیت کے مدارج طے کرنے کا یہاں خوب موقع ملا۔ اور جنٹلمین کے خطاب سے نوازے گئے۔ لباس عمدہ اور وجیہ زیب تن کرتے تھے۔ مجال نہ تھی کہ سوٹ میں کوئی سلوٹ در اندازی کر سکے۔ جسمانی ورزش کا ہر دم زندگی میں شوق رہا۔ ورزش اور ملازمت نے پابند اوقات بنا دیا تھا۔ اسی واسطے عادات اور اصولوں میں استقلال تھا۔ کم آمیز تھے لیکن جس سے ملتے خلوص سے ملتے۔ تصنع اور ظاہرداری کا ان کے یہاں گزر نہ تھا۔ ماشاءاللہ جسیم و وجیہ ہونے کے ساتھ زندہ دل تھے۔ ظرافت ان کی رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھی۔ شرارت و شوخی فطرت میں داخل تھی۔ ان کی صحبت میں وقت کا اندازہ مشکل سے ہوتا تھا۔ آخر میں ثقل سماعت نے [illegible] پیدا کر دیا تھا مگر اپنی ظرافت سے اسے نباہ لے جاتے تھے۔

تمام یاد رہیں مگر ایک مسلمان عالم و فاضل مذہب عیسوی قبول کر کے پادری کے عہدے تک پہنچ گئے تھے اور انہی مترجم پر ملتوے
کیا کرتے تھے۔ سلطان حیدر کو شاعری سے کا شوق تھا لیکن منطق سے ان کی دلچسپی بڑھی اور پھر منطق کی تحصیل ہوئی۔ اسی زمانہ میں ناولوں کا
بھی چسکا شروع ہوا تھا لیکن طالب علمی کے زمانہ میں ایک معمولی سا ناول شائع کر کے مصنف بن گئے تھے۔ انتہا درجہ کے مہر پرست تھے
شاعری سے شوق رہا ہو لیکن ان کی شاعری کا کوئی نمونہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ بجز اس کے کہ خوش فکر سمجھے جاتے تھے۔ بہر حال ان کا شوق ناول
رسالہ عزت سے شروع ہوتا ہے۔ ابتدائی مضامین اگر قابل اعتنا نہیں تو نہ سہی لیکن پھر ان کے مضامین میں پختگی و ضرورت جگہ
پانے لگی تھی۔ انگریزی رسالوں، مس کوریلی کے ناولوں، آسکر وائلڈ اور برنارڈ شا کے ڈراموں اور دیگر یوروپین تصانیف کے پڑھنے کے بعد
انہیں فسانہ نگاری کا شوق پیدا ہوا اور وہ اپنے مخصوص دلچسپ طرز کے مالک بن گئے۔ رسالہ تمدن میں ان کے جو مضامین و افسانے
چھپنے کے منتظر ہیں۔ تمدن میں پروفیسر مشتاق زاہدی صاحب سے پردہ کے متعلق بحث چھڑ گئی تھی۔ اس میں بہ آزادی نگار تمدن کی بجواب
اور اشاعت میں معتد بہ اضافہ ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ سلطان حیدر نے پردہ کی موافقت میں سب سے پہلا مضمون لکھا تھا اور غالباً یہ پہلا ہی تھا
جب مولانا شوکت علی صاحب نے علی گڑھ سے رسالہ "انڈو..." جاری کیا تو جوش صاحب اپنے مضامین کے ذریعہ اس رسالہ کی روح
رواں تھے۔ پھر مولانا محمد علی صاحب نے دہلی سے کامریڈ کے ساتھ روزانہ ہمدرد بھی نکالا تو اس کے اسٹاف میں سید ممتاز علی صاحب
صاحب اور قاضی عبدالغفار صاحب جیسے گراں قدر اہل قلم شامل تھے۔ ہمدرد نیا اندھر [illegible] کے مرحوم حاجی بغلول صاحب نے بیساختہ [illegible] کے ساتھ
ازسرِ نو جنم لیا تھا۔ اس موقع پر سلطان حیدر بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ انہوں نے سنجیدہ و مزاحیہ مضامین سے ہمدرد میں جان ڈال دی اور
خوب خوب داد حاصل کی۔

کہنہ مشقی نے اب انہیں مستقل تصانیف کے لئے مجبور کیا۔ چنانچہ یکے بعد دیگرے دو ناول لکھیں۔ [illegible] ایک ناول ہے جو اپنی خصوصیات کی وجہ سے [illegible]
کا نمونہ ہے۔ اس میں [illegible] نگاری کے وصف کو انتہا تک پہنچا دیا ہے۔ [illegible] پریس [illegible]
سے ۱۹۱۲ء میں شائع کیا اور اب تیسرا ایڈیشن لاہور سے چھپا ہے۔ اس کی اشاعت ۱۹۲۳ء میں سلطان حیدر کے انتقال سے چند ماہ پیشتر ہوئی
تھی۔ ان کی دوسری کتاب بائی شہزادہ محتشم خاں نواب [illegible] کی سوانح عمری ہے جو دورِ جہانگیری، شاہجہانی اور عالمگیری سے تعلق رکھتی ہے۔
اس میں تاریخ کی خشکی کو ادب کی رنگینی کا ہم پایہ بنا دیا ہے۔ ان تصانیف کے بعد ان کی تحقیق ادب کے مطالعہ میں منتہا مانا تھا۔ [illegible]
آنجلو اور دیگر ماسٹرز کی تصاویر [illegible] کی گیلریوں میں رسائی حاصل کی اور اس مطالعہ کے نتائج [illegible] نیرنگ خیال لاہور، نقیب بدایوں،
اور سرگزشت علی گڑھ وغیرہ میں نہایت آب و تاب سے جلوہ گر ہوئے۔ ان کے متعدد افسانے مثلاً "ہوائی" اور "نقش و نگار" ان کی بے مثال
اور بیش بہا یادگار ہیں۔ رسالہ [illegible] میں ان کی کسی ظریفانہ بات پر حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے قرآنی لغت [illegible] سلام
پیش کر کے اعتراض کیا تھا اور ان سے نوک جھونک شروع کی تھی جو ان کے جواب کے بعد ہی ختم ہو گئی۔ دوران ملازمت میں پہلی جنگ عظیم
کے موقع پر ریکروٹنگ آفیسر بنا دیئے گئے تھے۔ اس زمانہ میں انہوں نے فوجی زندگی اور جنگ کے اصولوں کے متعلق کافی واقفیت و معلومات
حاصل کی تھی۔ چنانچہ ان کی تصانیف میں اکثر میدان جنگ کے نقشوں کی بھی تفصیل مل جاتی ہے۔ سلطان حیدر صاحب [illegible] کر خود
[illegible] کے اصول کے قائل تھے۔ اپنی تصانیف کو زیورِ طبع سے آراستہ کرنے کا شوق تھا۔ لیکن اشاعت کے متعلق [illegible]
رہے اور تجارتی پہلو پر کبھی غور نہیں کیا۔ ان مسلم کے تیسرے ایڈیشن کی اشاعت اور افسانوں کی طباعت کی اجازت وہ اپنے چند احباب کو
بلا معاوضہ عطا کر گئے ہیں۔

ولایت سے میری واپسی ۱۹۱۶ء میں ہوئی تھی۔ یہ حضرت اس وقت ہردوئی میں تحصیلدار تھے۔ اتفاق سے وہاں پر بہتر صحبت و

مشکل چیا ہو گئی تھی ۔ سید عباس علی صاحب ۔ سید مسعود الحسن صاحب رضوی اور مرزا عبدالحسن صاحب عطارد وغیرہ علاوہ ازیں سب کے سب زندہ دل اور با مذاق تھے ۔ ان سب کی روح رواں عبدالحسن صاحب تھے اور سلطان حیدر اس سوسائٹی کے سیکرٹری تھے ۔ عبدالحسن صاحب قبلہ کی تعریف میں اس قدر کافی ہے کہ کشتی سلطان میں اور علی گڑھ کالج کی تو سوسائٹی کے منتظم تھے سب ہی دل کے دیگر مذاق سلیم رکھنے والے احباب کے علاوہ سلطان احمد صاحب بیرسٹر اور جان ظرافت چودھری محمد علی صاحب قبلہ اس سوسائٹی کے ممبر تھے چودھری صاحب کا شوق ان کو کشاں کشاں ردولی سے یہاں لے آیا کرتا تھا ۔ سوسائٹی کے صدر صاحب نے فرمان جاری کیا کہ ممبران آپس میں اسی انداز و طرز میں گفتگو کیا کریں اگر روزمرہ کی عادت کے طور پر گفتگو کسی نے کی تو ایسا جرم ممبری سے خارج کر دیا جائے گا ۔ شاعر ممبران کو حکم تھا کہ غزلیں بھی عامیانہ روش کو ترک کر کے سوسائٹی کے رنگ میں کہا کریں اور اعلان عام ہوا کہ شاعر ممبران میں سے کوئی ایک صاف ستھری غزل لکھے پھر اس غزل کو بیک وقت تمام استادان فن کے پاس اصلاح کی غرض سے بھیج دے ۔ اس سوسائٹی کی میٹنگ کے وقت اگر کوئی غیر ممبر آ پھنستا تو باوجود اپنی قابلیت و ہمہ دانی کے ہکا بکا ہو کر رہ جاتا اور اس کے پلے کوئی بات نہ پڑتی ۔ امیر حسن مرحوم انسپکٹر مدارس نے شاعری کے اس خاص طرز میں کمال حاصل کیا ۔ شوکت الفاظ سے مشاعروں میں داد حاصل کرتے اور داد دینے والے جب مفہوم شعر سمجھنا چاہتے تو سر کھجا کے رہ جاتے ۔ ان کی "ٹکڑے کر دیئے" والی مرصع غزل کا ایک شعر مجھے یاد ہے ۔ اس شعر کا ایکٹنگ اور تصور کس قدر دل خوش کن نظارہ پیش کرتا ہے ۔ ملاحظہ ہو ۔

اس نے پہلے مَس کیا ۔ پھر تق لیا پھر ہل کیا
اس طرح ظالم نے مستقبل کے ٹکڑے کر دیئے

نشتر سندیلوی کو جب جملہ شعرائے باکمال کی اصلاحیں موصول ہو گئیں تو صنف شاعری و ادب میں اضافہ کرنے کی غرض سے کتابی صورت میں شائع کی گئیں ۔ اور بڑے بڑے ماہران فن کی شخصیتوں کو جھکا کر دکھا دیا گیا ۔ غرض ہر دلعزیزی اس سوسائٹی پر سلطان حیدر کی پروان چڑھنے کا بہترین مرقع تھا ۔ رسالہ نقیب بدایوں کے اجراء کا تصور اسی سوسائٹی نے پیدا کیا تھا ۔ بدایوں پہنچ کر جب سید محفوظ علی صاحب مرحوم سے میں نے مشورہ کیا تو وہ دل و جان سے سرپرستی پر آمادہ ہو گئے ۔ نقیب نے ادب و ظرافت میں کس قدر اضافہ کیا مجھے نہیں معلوم لیکن یہ واقعہ ہے کہ سید محفوظ علی صاحب کو ایک مرتبہ محمد علی صاحب نے گوشہ سے نکال کر دنیائے ادب کو ممنون کیا تھا اور دوسری مرتبہ محفوظ علی صاحب کی تقلید کا فخر مجھے حاصل ہوا ۔

سلطان حیدر صاحب کے معمولات میں تھا کہ وہ ہر صبح کو ورزش و نماز سے فارغ ہو کر اور ناشتہ سے پہلے اپنے ملازمین سے ظرافت فرمایا کرتے تھے ۔ اور اس طرح طبع رسا کے سمند کو دن بھر کی الیلی رفتار پر چلانے کی مشق کیا کرتے تھے ۔ یہ ایک مستقل ڈرامہ تھا جو مستقل طور پر صبح کے وقت کھیلا جاتا تھا یعنی جا و بیجا وجہ تراش کر ملازم یا بچوں کو رسے بے گالیوں کی بوچھار کی جاتی تھی کہ کرسی صاف نہیں کی ۔ میز پر مٹی رکھ دی ۔ چلم سے چنگاری کیوں اڑتی ہے ۔ ملازمین اس انعام کو دعائیں سمجھتے تھے اور پھر مساوات ہو جانے پر جان بجان کر اس قسم کی حرکتیں کیا کرتے تھے کہ پارہ تیز ہو اور ہر اعتراض کا جواب ترکی بہ ترکی دیا کرتے تھے ۔ حتیٰ کہ ناشتہ کا وقت آ جاتا ۔ ناشتہ کھاتے وقت گھر والوں اور ساتھیوں کو سنا سنا کر لطیفے کو حق بجانب اور ملازم کو ملزم قرار دیا کرتے تھے اس کے بعد دن بھر ہنستے کھیلتے گزرتا تھا ۔ یہ واقعہ ہے کہ وہ روتوں کو ہنسایا کرتے تھے ہر مصیبت زدہ کو اس کی بہتری کیلئے صلاح مشورہ دیا کرتے تھے اور پوری ہمدردی کرنے میں انہیں باک نہ تھا لیکن بربناء وہم جب ذاتی پریشانی ہوتی تو اپنے انداز کو قائم رکھتے ہوئے زمین و آسمان کو زیر و زبر کر دینا بھی ان کی عادت میں داخل تھا اور بڑی مشکل سے ان کو تسکین حاصل ہوتی تھی ۔ ایک مرتبہ اپنی موجودہ زندگی پر نظر ڈالتے ہوئے مجھ سے کہا کہ تمدن میں پردہ کے متعلق ہم نے غلط بحث کی تھی ۔ پردہ تو جہالت کی بات ہے ۔ میں نے کہا کہ آپ اپنی جہالت کا پردہ فاش کر رہے ہیں ۔ میں تو پردہ ہی ڈالنا مناسب سمجھتا ہوں ۔ صحیح یاد نہیں ۔ غالباً ۱۹۳۱ء میں دہلی پہنچکر پہلے کرہ ...

[illegible] کی حیثیت سے ... صاحب ... [illegible] کے سامنے ... [illegible] ... وہ ہم ہیں ... حاصل ہے۔ ... تقریر ... ہیں۔ ... [illegible] ... مثال نہیں۔ مجھ سے ... شعر ... سلطان حیدر کے متعلق ... [illegible] ... سے انکار کرتا تھا۔ بڑی مشکل سے ... کا ایک دفتر پڑھا ... جب میں نے ... [illegible] ... کیا تو اقبال کی اور مولانا کی صفت و ثنا کرنے لگے۔

پنشن کے بعد مستقل قیام علی گڑھ میں تھا مگر شیر پور بھی آتے جاتے رہتے تھے۔ ... اسلامیہ ہائی اسکول کے انتخابات میں ... واقع ہوئی اور اس کے متعلق اس کے صدر صاحب کلکٹر ... رہے تھے ... انتخاب ... بحیثیت ... کے تشریف ... ڈاکٹر ... کے متعلق تصفیہ کردیں تو اس وقت میں اور سلطان حیدر صاحب ... پہنچے۔ کلکٹر صاحب نے سلطان حیدر سے کہا آپ ... بھی ہیں پنشن بھی حاصل کرچکے ہیں لہٰذا میری رائے ہے کہ آپ ... کے سیکرٹری بن جائیں ... یہاں کی صورتِ حال پر غور کئے بغیر حضرت راضی ہو گئے۔ ... نے صدر صاحب سے کہا اب ... کی ضرورت نہیں۔ صدر صاحب ... شہر کے نزاع کو ... منتخب کرکے ہمیشہ کے لئے دفن کردیں۔ صدر صاحب نے بڑے تپاک سے وعدہ کیا۔ معاملہ طے ہوگیا اور سلطان حیدر صاحب انتخابات کے منصوبے کا نقشہ بناتے ہوئے گھر پہنچے۔ دوسرے دن صدر صاحب نے میٹنگ میں یہ کہہ کر سلطان حیدر صاحب کی ... کلکٹر صاحب نے یہ حکم دیا ہے لہٰذا آپ غور کریں اور سلطان حیدر صاحب کو سیکرٹری بنائیں۔ یہ ... پہلے ہی ہو چکا تھا۔ ... نے ... عیب نکالے اور ان کو سیکرٹری منتخب نہیں کیا۔ جب واپس آئے تو ... منتخب نہیں کئے گئے بلکہ اس لئے کہ بیجا نکتہ چینی کے بعد مضحکہ اڑایا گیا۔

اب اس عرصہ میں ان کے کچھ احباب عالم بالا کو منتقل ہو گئے اور کچھ احباب پاکستان چلے گئے۔ ان ... کی جان پر بن آئی اور ان کی ظرافت شریفی نے بھی نیا دھیلو اختیار کرلیا۔ بھائی ... کی وفات پر انہیں سخت صدمہ تھا ان کے ذوق کی اصلاح کرنے میں ان کو بہت دخل تھا۔ ایک روز مجھ سے فرمایا کہ اب ہندوستان میں ... اور ... پاکستان میں ... ہیں مجھ سے میری ... ہی رہتی ہے۔ عطاء اللہ صاحب ان کے خالہ زاد بھائی ... کے ساتھی تھے۔ اس کے بعد جب بحیثیت پارلیمنٹری سیکرٹری کے مجھے علی گڑھ کے دورے پر جانا پڑا تو ان کو لکھ دیا تھا کہ میری مصروفیات مجھے ڈاک بنگلہ میں رہنے کے لئے مجبور کرتی ہیں اور فارغ ہو کر میرا وقت آپ کے یہاں گزرا کرے گا۔ دوسرے دن صبح کو جب ان سے ملنے گیا تو میری صورت دیکھتے ہی ... کو ... صلواتیں سنا دیں۔ اور میرا اسباب ڈاک بنگلہ سے اپنے یہاں منگوا لیا پھر تمام مصیبتیں ... برداشت کیں ... سے میں ان کو بچانا چاہتا تھا۔ دوران گفتگو میں مجھے یہ بتا دیا تھا کہ جواب عطاء اللہ کو میں نے لکھ دیا۔ کہ فکر نہ کرو اس لئے کہ اقلیت ہر جگہ اور ہمیشہ مظلوم ہی ہوتی ہے۔ میں نے اس نکتہ کی تائید کی۔ جب میں حاکم ضلع سے ملنے گیا تو انہوں نے مجھ سے جائے قیام کی تبدیلی کی وجہ دریافت کی۔ میں نے انہیں بتا دیا کہ سلطان حیدر میرے چچا زاد بھائی ہیں لہٰذا ان کے حکم کی مجھے تعمیل کرنا تھی۔ بڑی حیرت کے ساتھ صیغۂ راز میں کلکٹر صاحب نے بتایا کہ یہ تو پاکستانی جاسوس ہیں۔ میں نے ان کے خط پکڑے ہیں اور عنقریب ان پر مقدمہ چلانے والا ہوں۔ میں نے تعجب سے دریافت کیا کہ کس کو لکھے ہیں اور کیا لکھے ہیں۔ جواب ملا کہ عطاء اللہ کو لکھے ہیں اور یہ لکھا ہے کہ اقلیت مظلوم ہوتی ہے۔ میں ہنس پڑا۔ میں نے اصل واقعہ سمجھا کر انہیں یقین دلا دیا کہ سلطان حیدر کو سیاست سے کچھ واسطہ نہیں رہا۔ اور اب تو اپنے بعض مضامین میں کانگریس کو انہوں نے سراہا ہے

[illegible] ناکام ہو گا۔ تو تسلیم کرنے کے بعد اس شکایت کو باقی رکھا کہ باوجود پنشن یافتہ ہونے کے مجھ سے کبھی ملنے [illegible] نہیں آتے حالانکہ [illegible] کے دوسرے لوگ اب بھی ملنے آتے ہیں گے۔ گویا کہ پہلا لطیفہ شستا یا اور [illegible] آ گیا۔ اب تو ایسے تجربے کے بعد [illegible] نہیں جاؤں گا۔ اب وہ مجھ پر مقدمہ چلائیں۔ میں اور بھائی صاحب ہنسنے لگے۔ کو صاحبزادے اور صاحبزادی صاحبہ نے اس کی یہ طرح خبر لی کہ ہندوستان کو بھیس دشمن کو بھیس بنا دو، بیٹھ کر ہر کس و ناکس سے پیچ پیچ کر اخباری مضامین پر بحث کرتے ہیں۔ اب [illegible] C – I – D یا دشمن رپورٹ کر دے تو موجودہ فضا میں کوئی سننے والا نہیں اور برا دن دیکھنا پڑے گا۔ شنشے ہو کر تاثل ہو گئے اور دوسرے دن کلکٹر صاحب کے یہاں جانے پر راضی ہو گئے۔ اب یہ نہیں معلوم کہ کلکٹر صاحب کو انہوں نے رام کیا یا خود رام ہو گئے مگر بخیر گزشت۔

اس سلسلہ میں یہ بھی عرض کر دوں کہ سلطان حیدر بہ حیثیت انسان کے مرنجاں مرنج تھے۔ بہ حیثیت ادیب اور ظرافت نگار کے بلند پایہ رکھتے تھے لیکن بہ حیثیت ذہنی کلکٹر ان کی شوخی اور زندہ دلی نئے قسم کی تھی۔ جس کو عام مذاق کے لوگ نہیں سمجھ سکتے اور کیا عجب ہے کہ بیشتر ذہنی کلکٹر صاحبان کا یہی مذاق ہو۔ اس کو ایک مثال دے کر سمجھاؤں گا کیونکہ ان خواص کو سمجھنے کی قابلیت اپنے آپ میں نہیں پاتا۔ کانگریس گورنمنٹ نے بنایا تھا یا بنایا تھا۔ میں محض کونسل کا ممبر تھا اور سلطان حیدر کی لمبی چوڑی چھٹی ختم ہونے والی تھی۔ میرے سامنے کلکٹر اس سے گئے کہ چھٹی کے بعد ان کی تعیناتی علی گڑھ ہو جائے۔ میں نے قدوائی صاحب سے اس قسم کا وعدہ کر بھیں بنا دیا مگر یقین نہیں آیا تو انہیں سامنے جا کر ان کے سامنے چیف سیکرٹری موڈی صاحب کو نوٹ لکھوا دیا۔ شام کو جب کونسل کے اجلاس سے کمرے پر پہنچا تو فرمایا مجھے متحقق ہوا کہ قدوائی صاحب کی موڈی صاحب نہیں مانیں گے۔ اس لئے پنت جی سے کہلوا دو۔ دوسرے دن میں نے پنت جی صاحب سے عرض کیا اور انہوں نے بھی وعدہ کر لیا۔ اور میں سمجھا کہ اب ان کو اطمینان ہو جائے گا۔ مگر بولے تو یہ بولے کہ چیف سیکرٹری بھلا ان منتریوں کی کب ماننے والا ہے۔ لہٰذا کریں نے عرض کیا تو اب آپ موڈی صاحب سے خود مل لیجئے۔ اس پر انہوں نے پھر ٹال دی اور موڈی صاحب سے ملنے کو گئے۔ موڈی کے سامنے قدوائی صاحب کا نوٹ موجود تھا اس نے ذہنی صاحب سے کہا کہ آپ علی گڑھ چاہتے ہیں؟ جواب دیا کہ علی گڑھ ہو یا کوئی اور جو ایس کے قریب کا ضلع ہو۔ اور پھر خود ہی ایٹہ کا نام بھی تجویز کر دیا۔ اس لئے پھر دریافت کیا کہ آخر کس کو دینا چاہتے ہیں۔ فرمایا ایٹہ کو۔ ملاقات ختم ہو گئی۔ واپسی میں کونسل کے اجلاس سے مجھے باہر بلا کر ملاقات کا حال مفصلات مع سرمدات میں سنا دیا۔ لیکن مجھے اپنی غلطی کا اعتراف ہے کہ جلدی میں اصل حقیقت کو میں نہیں سمجھ پایا۔ وقتِ رخصت مجھے تاکید کی کہ علی گڑھ کی تعیناتی کا خیال رکھنا۔ کچھ دن بعد خط آیا کہ ایٹہ کو بھیجا گیا ہوں۔ مجھے حیرت ہوئی اور قدوائی صاحب سے شکایت کرنے پہنچ گیا۔ دیکھتے ہی فرمایا کہ کیوں حضرت یہ کیا بات ہے۔ مجھ سے علی گڑھ کے متعلق کہا اور چیف سیکرٹری سے ایٹہ کے متعلق طے کیا۔ عرض کیا یک نہ شد دو شد۔ آپ نے تو آتا میرا منہ بند کر دیا۔ میں تو طرداری کی شکایت کرنے آیا تھا۔ فرمایا کہ دفتر سے تحقیق کر لو۔ نتیجہ تحقیق وہی نکلا جو قدوائی صاحب نے بتایا تھا۔ اب میں نے ان حضرت کو لکھا کہ ایں ہمہ آوردہ تست۔ شکایت کس بات کی ہے۔ جواب ملا کہ یہ حرکت میں نے مصلحتاً کی تھی کہ چیف سیکرٹری یہ نہ سمجھے کہ میں منتریوں سے اس پر اثر ڈلواتا ہوں۔ مگر تمہاری کوشش پر مجھے اعتماد تھا جس میں مجھے مایوسی ہوئی۔ تمہاری کوتاہی کی شکایت ہے اور کچھ نہیں۔ یہ توجیہہ سن کر مجھے اپنی غلطی تسلیم کر لینے کے علاوہ اور صورت ہی کیا تھی۔ لب آخر میں بیوی کے انتقال کے بعد ان کی ظرافت نے اپنے اوپر خود مسکرانا شروع کر دیا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ ظرافت سے باز نہیں آ سکتے تھے۔

خدا جانے کیا قصہ ہے میرا اپنا تجربہ یہی ہے کہ جب میرا کوئی عزیز و قریب اس جہان سے رخصت ہونے کو ہوتا ہے تو میرے اور اس کے درمیان میں پردہ ڈال دیا جاتا ہے۔ شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ غم کھانے میں میرا دل ناکام ہے۔ سبب یہ قصہ مختصر ان کے ایک حکم کی تعمیل میں ان کے منشی نے ایک مغالطہ پیدا کر دیا تھا۔ ہر چند میں نے معذرت کرتے ہوئے منشی کی غلط بیانی کا یقین دلایا۔ لیکن انہوں نے میری نہیں مانی تو میں نے عمر بھر میں پہلی مرتبہ ایک سخت خط ان کو لکھا۔ جواب آیا کہ رسولؐ کے واسطے معاف کر دو۔ میں نے آگے ہی الفاظ دہرا انہیں معاف کر دیا لیکن ایک عرصہ تک خط و کتابت بند ہو گئی۔ اس عرصہ میں علامہ صاحب کا لاہور میں انتقال ہو چکا تھا۔ مجھے خبر نہیں کہ اس سانحہ کا ان کے اوپر کیا اثر ہوا۔ کچھ عرصہ کے بعد علیگڑھ سے دفعتہً خبر آئی کہ حرکت قلب بند ہو جانے سے علم [illegible]

اختر شیرانی

نیر واسطی

[ادب کے سلسلے میں میری زندگی کا دلچسپ مشغلہ شعر، تنقید اور تاریخ ہے۔ لیکن میرے دوست محمد طفیل صاحب نے مجھ سے فرمائش کی ہے کہ میں اختر کی شخصیت کے موضوع پر لکھوں۔ چنانچہ ان کے ارشاد کی تعمیل میں کوشش کرتا ہوں کہ اس فرض سے عہدہ برآ ہو سکوں۔]

۱۹۲۴ء سے اختر کا نام میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔ میں ان دنوں پہلے جوالا سنگھ کی دھرم شالہ میں مطب کرتا تھا۔ حافظ محمد عالم مدیر عالمگیر ہوا کرتے اپنے رسالے کے لئے نظمیں لکھوا کر لے جاتے اور اکثر اختر کے حالات بیان کیا کرتے تھے۔ پھر اسی عرصے میں نکات اور بعد ازاں ہمایوں نے جنہیں اختر نے ۱۹۲۸ء میں جاری کیا، مجھے ان سے اور زیادہ آشنا کر دیا۔ لیکن اس کے بعد عاشق شادی سے شاعری اور شعر میں ان کی محویت، مجذوبانہ وارفتگی اور والہانہ زندگی کے حالات کچھ ایسے لطیف اور پُرکیف انداز میں بیان کئے کہ میں اختر کا ان دیکھا عاشق ہو چکا تھا۔

مارچ ۱۹۳۰ء کا ذکر ہے کہ ایک دن شام کو مغرب کے بعد ایک حسین اور تنومند نوجوان ننگے سر اور ترکی ٹوپی لئے ہاتھ میں پہنے مطب میں آیا اور کہنے لگا کہ میرزا احمد صاحب اِن ایک مریض کو دیکھنے کے لئے چلئے۔ میں نے اس کا نام پوچھا۔ فرمایا اختر شیرانی ـــــ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ برسوں کے بچھڑے ہوئے کسی دوست کو پا لیا ہے۔ اختر سے میری یہ پہلی ملاقات تھی ـــ اس کے بعد تمام عمر جب تک وہ زندہ رہے یہ رشتۂ محبت روز بروز مستحکم سے مستحکم تر ہوتا چلا گیا۔

میں نے اختر کو زندگی کے ہر دور اور ہر حال میں دیکھا حتیٰ کہ روزِ ملاقات سے یومِ وفات تک جس کو ان کی شاعری کی عمر کا پورا دور سمجھنا چاہیے ان کی زندگی اور بالخصوص ادبی زندگی کے تمام مراحل میری آنکھوں کے سامنے گزرے ہیں۔ میں نے ان کو خلوت میں دیکھا، جلوت میں دیکھا، محفلوں میں دیکھا، دشمنوں میں دیکھا، امیروں میں دیکھا، فقیروں میں دیکھا اور فیشنیبل روڈ کے تانگے تک ایک گوشے کے علاوہ گجرات کی رات کی جلوہ باریوں، ایبٹ آباد کی شام و سحر کی نادرہ سامانیوں، مری کی سبز برستانی فضا کی بہار فروشیوں، اور خصوصاً باغ لارنس کی دلکش چاندنی راتوں میں دیکھا۔ اختر ہر جگہ اور ہر حال میں ایک عجیب و غریب انسان نظر آیا۔

میانہ قد، سڈول جسم، سرمگیں آنکھیں، کتابی چہرہ، ستواں ناک، کبھی کبھی اچکن ورنہ کھلے گلے کی قمیص اور سنہری طرز کا پاجامہ، چال میں لغزش اور نگاہوں میں مستی ـــ بس ـــ کمریا کمریا سالک جہانِ محرمش ـــــ یہ تھے اختر شیرانی جو ابتدا میں آگ تھے اور انتہا میں خاک ـــ

اختر ۴ مئی ۱۹۰۵ء کو اپنے آبائی وطن ٹونک میں پیدا ہوئے۔ پیدائش کے وقت آپ کے والد محترم [illegible]
رکھا۔ لیکن بعد میں انہوں نے تخلص اختر اختیار کیا۔ اور شیرانی اصل پٹھان ہونے کی وجہ سے شیرانی لکھا ہے۔

ان کے والد محترم حافظ محمود شیرانی فارسی کے عالم ادیب، محقق اور تاریخ کے جید عالم تھے اور علم عروض میں تمام ہندوستان میں [illegible] حافظ صاحب مرحوم جب ۱۹۱۳ء میں ولایت سے تعلیم سے فارغ ہو کر ٹونک تشریف لائے تو انہوں نے ٹونک میں اختر کی ابتدائی فارسی تعلیم کے لئے مولوی ساجد علی صاحب شاکر کو مقرر کیا۔ جنہوں نے پہلے پہل اختر میں شعر کے ذوق کو بیدار کیا۔ ایک پہلوان قیوم خاں ملازم رکھا گیا جو اختر کو ورزش کراتا اور کشتی کا فن سکھاتا تھا۔ اور ایک خوشنویس متعین کیا گیا جو اختر کو خوشنویسی کی مشق کراتا تھا۔ اختر کی حسین خط و خال اور جسمانی خوبصورتی [illegible] درحقیقت اسی دور کی یادگار تھی۔

حافظ محمود شیرانی ۱۹۲۰ء میں جب ٹونک سے جلاوطنی کے سلسلے میں اہل و عیال کو ساتھ لے کر لاہور آئے اور یہاں آکر اورینٹل کالج میں پروفیسر مقرر ہوئے تو اختر بھی ان کے ساتھ تھے۔ حافظ صاحب مرحوم نے اختر کو اورینٹل کالج میں داخل کرا دیا۔ اور غالباً ۱۹۲۲ء میں جبکہ اختر کی عمر ۱۶ سال کی تھی انہوں نے منشی فاضل کا امتحان پاس کر لیا۔

اس کے بعد خیال تھا کہ اس باقاعدہ تعلیم کے سلسلے کو اور آگے بڑھایا جائے۔ مگر اختر شعر و سخن کی دلچسپیوں کی جانب زیادہ متوجہ ہو گئے۔ اختر نے انگریزی باقاعدہ نہیں پڑھی تھی لیکن مطالعہ کی بدولت خاصی استعداد بہم پہنچائی تھی اور کچھ عربی سے بھی واقفیت حاصل کر لی تھی۔ اختر نے بہت کمسنی ہی میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا لیکن ۱۹۲۳ء سے ان کی نظمیں باقاعدہ رسالوں میں شائع ہونے لگیں۔ پہلی نظم "جگنو" تھی جس نے علمی اور ادبی حلقوں کو متوجہ کیا۔ اور پھر اس کے بعد سرزمین گجرات۔ انجام ہستی۔ تیتری۔ "ایک بار دیکھا ہے دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہے" اور اسی نوع کی بیشمار نظموں کا سلسلہ شروع ہو گیا جنہوں نے دنیائے شعر و ادب میں ہنگامہ برپا کر دیا۔

ابتدائی دنوں میں فلیمنگ روڈ پر آپ کے والد کے مکان میں زینے کے پاس ایک چھوٹا سا کمرہ اختر کے لئے مخصوص تھا۔ جس میں چند کرسیاں اور ایک چارپائی دیکھی جاتی تھی۔ دریچہ کی جانب ایک میز تھی جس پر چند کتابیں رکھی رہتی تھیں اور کبھی کبھی نپولین کی مراجعت روس کی تصویر نظر آتی تھی۔

درحقیقت یہ تھا اختر کا وہ مدرسۂ شعر و مکتب فکر جہاں ادب اردو کے ایک نئے دور کی تخلیق ہوئی اور شعر و ادب کے نئے اسالیب و اقدار وضع ہوئے۔

اختر کے دوستوں، شاگردوں اور ملاقاتیوں کا ہجوم اسی کمرے میں رہتا تھا اور اختر نے جو ادبی رسائل و مجلات جاری کئے ان کا دفتر بھی درحقیقت یہی کمرہ تھا۔ یہاں اختر ہمہ تن اپنے دوستوں کی خاطر و تواضع میں مصروف رہتے اور ان کا ملازم فضل بار بار بالاخانے کے زینے سے نیچے کی منزل میں جہاں یہ کمرہ تھا آتا اور آنے والوں کی خدمت میں سگریٹ۔ پان۔ شربت اور لیمونیڈ وغیرہ پیش کرتا۔

۱۹۲۵ء سے لے کر ۱۹۳۲ء تک اختر کی شاعری کے شباب کا دور تھا۔ اس دور کے ابتدائی ایام میں ان کی شاعری نے سب سے زیادہ جن لوگوں کو متاثر کیا وہ کالجوں کے طلباء۔ طالبات اور اس دور کے ہونہار نوجوان ادیب تھے۔ لاہور کے تقریباً ہر کالج کا ہر نوجوان جسے ادب سے ذرا بھی وابستگی تھی ان کے پاس پہنچتا تھا۔ اسی زمانے میں ن۔ م۔ راشد نے گورنمنٹ کالج لاہور کی مجلس اردو میں اختر کی شاعری پر ایک شاندار مقالہ پیش کیا۔ جو اب ان کی کتاب اخترستان میں شامل ہے اور اس کے بعد سید اختر احمد اختر اورینوی نے گورنمنٹ کالج پٹنہ میں ان کی شاعری پر ایک اور سیر حاصل مقالہ پڑھا۔

اس دور میں اختر کے گرد اس دور کے خوش ذوق نوجوان ادیبوں کا ایک شاندار حلقہ جمع ہو گیا تھا۔ ن۔ م۔ راشد۔ [illegible] احمد ندیم قاسمی

مجاادیب - وزیر حسین سحر - مرزا عشق - علی رضا - ضمیر قریشی - مصطفٰے حسین - سلیم رضا - عاشق بھاری - سردار کریم فواد - سید والحسینی - چراغ حسن حسرت ، جیسے جید ادیب اور صحافیوں میں جوہر ادیب اختر کے پاس چاند کے گرد تاروں کی طرح جمع ہو گئے تھے - چراغ حسن حسرت بھی جنہیں اختر چراغ حسن کہا کرتے تھے کبھی کبھی قیام کرا اس محفل کو جگمگاتے تھے - جگر و جوش جب لاہور آتے اس کلبہ اختر کی رونق بڑھتے -

پھر اختر کے ادبی رسائل نے رومانی ادب کے اس حلقہ کو اور وسیع بنا دیا تھا - مولانا حسرت موہانی مرحوم - جوش ملیح آبادی - اسعد مولانا عبدالحق - آغا حشر کاشمیری - چوہدری خوشی محمد ناظر - عبدالرحمن چغتائی - چوہدری فضل حق - شیخ عطا محمد - ڈاکٹر تصدق حسین خالد - ڈاکٹر سید صدیق حسین - سید شبیر حسین بخاری - مولانا مرتضٰی احمد - ساقی - شیخ محمد دل - شیخ عبد الطیف تپش - سید عابد علی عابد - عاشق لودھی - اسرار الحق مجاز - ان کے علاوہ اس دور کے تقریباً تمام مشاہیر علم و ادب اس حلقے میں شامل تھے

علاوہ ازیں اس محفل ادب میں ملک کی ممتاز اہل قلم خواتین بھی شریک تھیں ، ان میں کتنی ہی ایسی ہیں جن کے نام ذہن میں نہیں رہے - ان کے علاوہ محترمہ ادا جعفری - محترمہ عائشہ بیگم شمیم - محترمہ نسرین خانم - محترمہ آمنہ قمر - محترمہ رضیہ خاتون رضا - محترمہ شکیلہ اختر - محترمہ بیگم اور دیگر مشہور ادیب خواتین اختر کے رسائل میں مضامین نظم و نثر لکھتی تھیں -

اختر کی دوستی کے لئے علم و فضل کی کوئی قید نہ تھی - ایک چھوٹے سے چھوٹے ادیب اور صحافی ان کا دوست تھا - میں نے یہاں اختر کے دوستوں کی جو فہرست پیش کی ہے وہ بہت محدود ہے - خاص طور پر لاہور میں اختر کے دوستوں کی تعداد شمار سے زیادہ تھی - درحقیقت کشمیر سے لے کر راس کماری تک ملک کا کوئی گوشہ اور کوئی ادیب ، شاعر اور صحافی ایسا نہ تھا جو اختر سے واقف اور اس کا قدردان نہ ہو - دوستوں کے خطوط کا ایک انبار تھا جو ہر روز اختر کے پاس جمع ہو جاتا تھا -

رومان میں اختر کے مخصوص طرز نگارش کے حاملین کا ایک حلقہ بن گیا تھا - اختر انہیں رومان کے نام سے یاد کرتے تھے - رومان میں ان کے خطوط پر تبصرے ہوا کرتے تھے - رومان کے سرنامہ پر تحریر تھا " اردو کے نوجوان اہل قلم کا ترجمان -

انہیں مصوری سے گہرا لگاؤ تھا - موسیقی سے دلی وابستگی تھی - مشہور موسیقار مرحوم غلام حیدر ان کے خاص دوست تھے - اکثر موسیقی کی محافل میں شامل ہوتے - آپ کے نغمے ان کو بہت پسند تھے جس کا ذکر انہوں نے اپنے ایک سانیٹ میں بھی کیا ہے -

خطاطی اور فن خطابت سے اختر کو بڑی دلچسپی تھی - وہ خود بڑے اچھے خطاط تھے - حروف کے دائرے بڑے حسین بنتے تھے لیکن سطریں اکثر سیدھی نہیں رہتی تھیں - ہمیشہ ان کی یہ خواہش رہتی تھی کہ ان کا رسالہ بڑے اچھے خط میں چھپے اور اس مقصد کے لئے وہ لاہور کے مشہور کاتب کلیمی کو پسند کرتے تھے -

کلاسیکی ادب میں اختر کی نظر بے حد وسیع تھی فارسی کے شعراء میں طالب آملی سے لے کر آج تک کے جدید ایرانی شعراء کے کلام پر انہیں عبور حاصل تھا - شاعری میں حافظ کے پرستار تھے - اور اس کے دیوان کو شاعری کا قرآن کہا کرتے تھے - اردو شعراء میں میر اور غالب کے معتقد تھے - مومن کا نام جب آتا تو انہیں محمد رمضان کے صاحبزادے کہہ کر عجیب انداز میں یاد کرتے -

وہ مشاعروں کے شاعر نہ تھے لیکن متحدہ ہند کے ہر مشاعرے میں طلب فرمائے جاتے تھے - جہاں جگر و جوش موجود ہوتے ، اختر ضرور ہوتے - مشاعروں میں وہ اپنا کلام بغیر ترنم کے پڑھتے - سامعین چونکہ اختر اور ان کے کلام کے عاشق ہوتے اس لئے آپ کے کلام سے مشاعرہ گونج اٹھا کرتا تھا - اکثر ایسا بھی دیکھا گیا کہ عالم سکر میں بھی پڑھ دیتے - ان مشاعروں سے جو رقم وصول ہوتی وہ بالعموم بوتلوں کے بند پانی میں بہا دی جاتی تھی -

شعر کہتے وقت میں نے اختر کو کبھی گنگناتے نہیں دیکھا لیکن شعر پھولوں کی طرح بےساختہ ان کے منہ سے جھڑتے تھے عالم سکر میں انہوں نے

بیت کا شعر کہتے ہیں وہ کہتے تھے کہ میں شراب کی کیفیت کو شعر کی معنویت میں منتقل کرنا نہیں چاہتا۔ وہ عام طور سے [illegible]
بڑا پُر اثر مجلس میں اپنا کلام خود سنانے میں تامل کیا کرتے تھے اکثر دوستوں کو ارشاد فرماتے کہ وہ ان کا کلام پڑھیں۔ وہ بڑے شوق سے
ترنم سے پڑھتے اور وہ اسی کو سُن کر جھومنے لگتے تھے۔ اختر کا ہر شعر کسی نہ کسی داستان سے وابستہ ہے۔ آخری عمر میں اکثر بیٹھے بیٹھے
ان کے کسی دوست نے ان کا کوئی خاص شعر خوش الحانی سے پڑھا تو وہ بے چین ہو گئے۔ ایک مرتبہ اصغر نے ان کی ایک مشہور غزل کا یہ شعر ترنم سے پڑھا

کس کی آنکھوں کا نشہ دل پہ اتر جاتے ہیں
میکدے ہاتھ بڑھاتے ہیں جو ہم جاتے ہیں

تو انہیں ملتے کا سوز اور اس کا ایک حسین منظر یاد آگیا اور دیر تک زار و قطار روتے رہے۔

اختر اس عہد کے اہلِ قلم میں ابوالکلام اور آغا حشر سے متاثر تھے۔ وہ آغا حشر بھی اختر سے اس قدر متاثر تھے کہ ایک مرتبہ انہوں نے کہا کہ

پھر زاہد سے کیوں ہے ستم فردوس پامال
جو اس جنتیں آباد ہیں تمثیلِ اختر میں

مولانا ابوالکلام نے ۱۹۲۷ء میں جب دوبارہ البلاغ جاری کیا تو اس میں اختر کی نظمیں شائع ہوئیں۔ انگریزی ادب میں اختر پیکاک کا اثر تھا اور گہرا اثر تھا۔ بعض دوستوں کا خیال ہے کہ ان کی زندگی بعد میں اسی کے رویئے میں ڈھلتی گئی۔

رسائل و مجلات کی ادارت میں بھی ان کا خاص مقام تھا۔ ابتدا میں ہمایوں میں انہوں نے ادارت کے فرائض انجام دیئے۔ مقبول عام ماہنامہ سہیلی کی ادارت فرمائی اور آخر میں مولانا تاجور نے جب "شاہکار" نکالا تو اس کے ادارتی فرائض میں بھی آپ شریک تھے۔ اور مولانا تاجور کی حسرت سے شیرازہ کی ترتیب و تزئین میں بھی ان کا حصہ تھا۔

اختر نے سب سے پہلے ۱۹۲۵ء میں انتخاب کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا جس کا نام و معیار کچھ مدت کے بعد جل کر بدلت دیا۔ بہارستان جب بند ہوا تو ۱۹۲۸ء میں خیالستان جاری کیا لیکن خیالستان بھی زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکا ——— اور اب کاروباری زندگی سے بے تعلقی کی وجہ سے وہ ارادہ کر چکے تھے کہ آئندہ کوئی رسالہ جاری نہیں کریں گے لیکن احباب کا اصرار غالب آیا اور انہوں نے غالباً ۱۹۳۱ء میں رومان کے نام سے رسالہ جاری کر دیا۔ اس موقع پر کہا تھا کہ

میں کہاں اخترِ مشتاق عالمِ فانی کہاں
حاجتِ سود نہیں تھی کہ اٹھانے کے لئے

لیکن اہلِ دل کی بزم آرائیوں کو کیا کروں
چاہیے ہنگامۂ حسن کا دل بہلانے کے لئے

جیسا کہ اختر خود کہا کرتے تھے۔ یہ روایت قائم ہو گئی تھی کہ اختر کا کوئی رسالہ زیادہ دیر تک نہیں چل سکتا۔ لیکن اس کے باوجود شیدایانِ مشتاقانِ اختر کا یہ عالم تھا کہ جب بھی وہ کوئی نیا رسالہ جاری کرتے فوراً خریداروں کا حلقہ مہیا ہو جاتا تھا۔

اختر کے ان رسالوں سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ان کے ذریعہ بعد میں اختر کے مجموعہ ہائے کلام صبحِ بہار، اخترستان، لالۂ طور، طیور آوارہ، شہناز اور شہرود کے لئے ان کی نظموں اور غزلوں کا بہت سا سرمایہ مل گیا۔ ان مجموعوں کے علاوہ نظم میں اختر کی دو کتابیں اور شائع ہوئیں ایک نغمۂ حرم دوسری پھولوں کے گیت۔ نثر میں دھڑکتے دل کے عنوان سے آپ کے مضامین نثر کا ایک مجموعہ چھپا۔ اور اس سے قبل ضحاک اور آئینہ خانے میں نثر کی دو مختصر کتابیں شائع ہوئیں۔ ان چھوٹے رسالوں کے علاوہ آپ نے مجمع البحرین، مطلع السعدین اور جامع القصص کی ترتیب و تدوین میں بھی حصہ لیا اور عوفی کی جوامع الحکایات کا دو جلدوں میں ترجمہ اور خلاصہ لکھا۔

اختر کے ذاتی عادات و خصائل بڑے عجیب و غریب تھے۔ نہ ان کی رات رات تھی نہ ان کا دن دن تھا۔ تمام لیل و نہار مستی، بیخودی، سرشاری اور پرستشِ حسن کے لئے وقف تھے۔ ہر جام بادہ ان کا دوست تھا۔ ہر ایک سے بے تکلفی سے ملتے اور بعض مستقل

[illegible] کا کلام پڑھ لیتے اور جنہیں وہ منتخب کرتے۔ ان کی دکھتی رگ تھے۔ [illegible] بہت [illegible]
تھے ہر طرف کے [illegible] کے یہاں [illegible] بہت مقبول ہوا کرتی تھی۔

ابتدائی عمر میں نظم کی محفلوں میں بہت زیادہ بیٹھتے تھے۔ اور ان محفلوں میں اکثر شعر کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ لیکن اب بعد میں جو پڑھتے تھے صرف کلام جو ایک ہی طرح کا ہے دوسرے موضوع کی جانب منتقل ہو گیا تھا۔ اس سے [illegible] بہت کچھ پیچھے بہت زیادہ تھے۔ گوشت [illegible] اکثر پسند کرتے تھے لیکن [illegible] کے بعد [illegible] دستر خوان سامنے کھلا رکھا رہتا ہے اور وہ اسے دیکھتے رہتے ہیں۔

میں نے انہیں بہت کم پڑھتے دیکھا ہے لیکن حیرت ہے کہ جب وہ کسی موضوع پر گفتگو کرتے تو کورس بن جاتا۔ ایک بڑا [illegible] مطالعہ کرنے والا انسان معروف کلام ہے۔ فیملی روڈ کے مشہور ویرانی منزل والے مکان [illegible] ہی ان کی نشست ہوا کرتی تھی اس کے بعد [illegible] بنگلہ تھا جہاں وہ دوستوں میں بیٹھے محفل کو باغ و بہار بنائے رکھتے تھے۔

انہوں نے گھر بار کے معاملات سے کبھی تعلق نہیں رکھا۔ والد صاحب ناراض تھے اور اس لئے والدہ [illegible] والدہ سے چھپ کر ملتیں اور سمجھاتیں لیکن [illegible] سمجھانے بجھانے سے حل نہیں ہوتا تھا۔ انہوں نے خود بیوی کی ضروریات معیشت کی جانب کبھی توجہ نہیں کی۔ حافظ صاحب مرحوم ان کا اپنی بیٹی کی طرح خیال رکھتے تھے۔ اور اختر کے بچوں کو خوشنود اور بہبود کو بچوں سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ بیگم اختر کے مرنے سے پہلے جب لاہور میں میرے یہاں مقیم تھے اکثر بیوی بچوں کو یاد کرتے وہ کبھی کبھی یاد کرتے کرتے رو پڑتے۔ ایک دن بیوی کو یاد کیا اور ایک [illegible] کو اس قدر یاد کیا کہ روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ مرنے سے پہلے اپنی بیگم کے متعلق ایک سانیٹ لکھا جس کا عنوان بیان [illegible] تھا۔ اس میں ایک جگہ لکھا کہ ؎

ہر ایک ذرہ میں ڈھونڈے گی یہ جبیں تجھ کو　　برنگ کعبہ نہ پائے گی جب کہیں تجھ کو

عام لوگوں کے ساتھ ان کا سلوک نہایت مشفقانہ بلکہ عزیزانہ ہوتا تھا۔ نائی، پنواڑی اور تانگے والے لوگوں کے یار بنے رہتے تھے۔ بعض دفعہ ایک تانگہ چار چار دن تک ان کی اردلی میں رہتا تھا۔ اور چار دن کے بعد کہیں ان کو اکٹھے پیسے دیئے جاتے تھے۔ ایک دن دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر صبح کے وقت ایک دوست کو لینے گئے۔ شام تک تانگہ باہر کھڑا رہا۔ شام کو رخصت کرتے وقت دوست نے پوچھا کہ بھلا یہ دن بھر تانگے کو کیوں کھڑا رکھا۔ فرمانے لگے کہ بیچارہ غریب اور شریف آدمی ہے میں نے سوچا اس کا بھلا ہو جائے۔

محلہ کا پنواڑی ان کا دوست تھا جس کا بل مہینے مہینے بھر کے بعد ادا ہوا کرتا تھا۔ پان بہت کھاتے تھے خصوصاً ان دنوں میں جبکہ کچھ وقت کے لئے شراب ترک کر دی جاتی تھی۔ پان کے ساتھ چونا علیحدہ سے منگوایا کرتے تھے۔ سگریٹ کا دور بھی بڑے زور سے جاری رہتا تھا۔ خصوصاً ان دنوں میں جبکہ شراب چھوڑ دی جاتی تھی۔ عموماً سگریٹ سے سگریٹ سلگاتے تھے اور اکثر وقت دوست سگریٹ سلگا کر دیتے تھے۔ کثرت سیگار نوشی کی وجہ سے ان کی وہ انگلیاں زرد پڑ گئی تھیں جن سے سیگار اور سگریٹ پکڑتے تھے۔ ایک دن سگریٹ کی تعریف میں ایک جدید ایرانی شاعر کا یہ شعر سنایا۔ ؎

سیگار بے تکلف و ناز پری وشاں　　ایں ہر دو در کشش دم دل کشید نیست

دو تین مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ سگریٹ ہاتھوں میں لئے سو گئے یا نشہ میں غافل ہو گئے۔ فیملی روڈ والے گھر کے بستر سے دھواں اٹھنے لگا۔ فضل ملازم چلایا۔ والدہ محترمہ آئیں اور انہوں نے اختر کو بستر سے جدا کیا۔ ابتدائی دور میں اکثر عبادات پسند کرتے تھے۔

میں نے ان کو پان، سگریٹ اور شراب کے سوائے کوئی چیز بازار سے خریدتے نہیں دیکھا۔ لباس اور ضرورت کی تمام چیزیں ان

سکتے تھے ان کی عادت حد سے زیادہ طرحدار تھیں۔

آخر عمر میں سر کے آگے کے بال کچھ سفید ہو گئے تھے۔ کوشش کرتے تھے کہ اس سفیدی کو چھپائیں اسی مقصد سے وہ ماتھے پر ایک لٹ منتشر کر کے نکالا کرتے تھے۔

وہ بے حد منکسر اور خلیق تھے لیکن کبھی کبھی خدا خشک نظر آتے تھے مگر جب کھلتے اور خصوصاً بوقت مے پرستی کھلتے تو طبیعت بے حد شگفتہ ہو جاتی تھی۔ عالم کیف میں سب کچھ ہوتا تھا لیکن ہوش کی حالت میں میں نے انہیں بے حد متین دیکھا۔ چہرہ ہمیشہ متبسم رہتا تھا اور بھول کے عالم میں کبھی قہقہہ نہیں لگاتے تھے۔ جن لوگوں سے ملنا پسند نہ تھا ان سے ملاقات کے وقت بالعموم خاموش سے بیٹھے رہتے تھے۔

سینما سے انہیں کوئی خاص لگاؤ نہ تھا۔ پہلے پہل جب متکلم فلمیں لاہور میں آئیں تو میں تین چار بار انہیں لے گیا لیکن میں نے دیکھا کہ وہ تصویروں کی بجائے حسین صورتوں کی جانب زیادہ متوجہ رہے جو سینما ہال میں ادھر ادھر دکھائی دیتی تھیں۔ البتہ ہندوستان کے مشہور مصور شنکر کی فلم انہیں پسند آئی اور خصوصاً وہ منظر انہیں زیادہ پسند آیا جس میں جاپانی مندر کے باہر دیوانہ پرستش میں ناچ میں عقیدت سے رقاصانہ وارفتگی کا مظاہرہ کر رہی تھیں ــــ بایں ہمہ لطف یہ ہے کہ فلموں والے آتے اور ان سے اپنی فلموں کے لئے منظوم و منثور مکالمے لکھوا کر لے جاتے تھے۔ شیریں فرہاد میں ان کا لیلیٰ و مجنوں والا مکالمہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

اختر بہت کم بیمار ہوتے تھے اور ان کی بیماری بالعموم شراب کے بعد کی خماری کیفیت کا نتیجہ ہوتی تھی جس نے آخر میں ان کے جگر اور عصبی نظام کو درہم و برہم کر دیا تھا ــــ دو تین مرتبہ انہوں نے مجھے اپنے والد مرحوم کے علاج کے سلسلے میں یاد فرمایا جنہیں گاہے گاہے ضیق النفس کی شکایت رہتی تھی۔

ایک مرتبہ اختر نے ایک پردہ نشین ضعیفہ مہمان کے علاج کے لئے مجھے گھر بلوایا۔ گرمی کا موسم تھا۔ تنگ کمرہ اور مریضہ صاحب فراش لحاف اوڑھے پسینے میں شرابور پڑی تھیں ان کا یہ حال دیکھ کر میرے لئے مشکل ہو رہا تھا کہ مریضہ کو حال بیان کرنے کی زحمت دوں۔ معلوم ہوا کہ عجلت میں اختر نے انہیں پردے کے لئے معمولی چادر کی جگہ لحاف دے دیا تھا۔

اختر مال و زر کے معاملے میں قطعاً بے نیاز انسان تھے ان کے نزدیک سونے چاندی کی ٹھیکریوں اور خزف ریزوں کے درمیان کوئی امتیاز نہ تھا۔

وہ طبعاً نہایت بلند سیرت اور نیک طینت شخص تھے۔ اور بادہ کشی کی عادت سے قطع نظر اگر دیکھا جائے تو وہ اتنے بلند مرتبہ انسان تھے کہ انسانی محاسن و اخلاق کی تمام خوبیاں ان میں جمع ہو گئی تھیں وہ نہایت کریم النفس، نیک محضر، خلیق اور دوست نواز دوست تھے ــــ عطا پاش اور خطا پوش ــــ اور اس قدر غیور کہ انہوں نے اپنی زندگی میں حسن کی سرکار کے سوا کبھی کسی امیر و وزیر کی قصیدہ خوانی نہیں کی۔ وہ کہتے ہیں کہ

؎ کسی معبود کے آگے ہمارا سر نہیں جھکتا — فقیری میں بھی اختر غیرتِ شاہانہ رکھتے ہیں

یہ سچ ہے کہ بسا اوقات شراب کے لئے وہ عالم بیخودی میں ضرور مجبور ہو جاتے تھے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہوش کے عالم میں تو انہوں نے خدا کے سوا کبھی کسی سے کچھ طلب نہیں کیا۔

وہ ایک مرد قلندر اور فقیر خاک نشین تھے اور ان کے دل میں مہر و پیار کے سوا کسی کے لئے کینہ و حسد کی جگہ ہی نہ تھی۔

پھر سیر چشمی و مال و منال دنیا سے بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ کسی پبلشر نے لاہور سے ٹونک ان کی خدمت میں سات سو روپے بھیجے۔ وہ جب ان کو ڈاک خانہ سے لے کر گھر چلے تو راستے میں ضرورت مندوں اور دوستوں کو بانٹتے آئے تا آنکہ جب وہ گھر پہنچے تو صرف

پانچ روپے کا ایک نوٹ ان کے ہاتھ میں تھا

اسی ضمن میں ایک لطیفہ یہ بھی سنیے کہ ایک مرتبہ اختر ایک سرکاری ادارے سے اپنے ڈیڑھ سو روپے لینے تشریف لے گئے۔ میں ساتھ تھا۔ وقت یہ پیش آئی کہ ان کو کئی جگہ کلرکوں کے پاس جا کر کئی رجسٹروں میں دستخط کرنے پڑتے تھے۔ جب انہوں نے دو جگہ تو یہ تکلیف گوارا کر لی۔ لیکن جب یہ نوبت تیسری جگہ ایک کلرک کے پاس جا کر دستخط کرانے کے لئے کہا گیا تو یہ کہہ کر کہ جان اللہ واپس آ گئے کہ جعلی ہم سے یہ بار بار دستخط نہیں ہوتے۔

اختر بے حد ہمدرد قسم کے انسان تھے اور جہاں کسی کو تکلیف میں دیکھا تڑپ اٹھے اور اکثر رو دیتے تھے۔ اور عورت ذات کی مصیبت تو وہ کبھی دیکھ ہی نہ سکتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ تانگے میں جا رہے تھے کہ ایک عورت بھیک مانگتی نظر آئی۔ مجھ سے فرمانے لگے کہ جو کچھ ہے اسے فوراً دے دو۔ میں عورت کو یوں بے دست نہیں دیکھ سکتا۔

شرم و حیا کا یہ عالم تھا کہ چند ہم پیالہ و ہم نوالہ دوستوں کے سوا سب کسی کو سامنے دیکھتے شراب کی بوتل کو ادھر ادھر چھپانے کی کوشش کرتے اور ذہنی اضطراب اس قدر تھے کہ ایک مرتبہ راستے میں سڑک پر چند عورتیں جا رہی تھیں بڑی پیاری نظر آئیں وہیں بیٹھ کر دیکھتے نہیں دیکھے اور کہتے رہے

مجھے تو کچھ اپنی پیار کلیوں سے محبت ہے

پس حقیقت یہ ہے کہ اختر اپنے ادب اور آرٹ کی طرح خود انسانیت اور ذاتی و نسبی شرافت کے اعتبار سے بھی بہت بڑے انسان تھے ــــ ایک اتنے بڑے انسان جو کہیں صدیوں کے بعد کسی قوم کو نصیب ہوتے ہیں۔ بقول

گردوں بباید صد چو تو آخر بعید قراں

اختر نے اپنے مخالف معاصرین میں سے کبھی کسی سے انتقام لینے کی کوشش نہیں کی۔ جس نے آزار دیا اسے صبر سے سہہ لیا۔ میں نے انہیں دنیاوی امور میں کبھی کسی سے الجھتے نہیں دیکھا۔ وہ بہت کم ناراض ہوتے تھے اور اگر کسی سے ناراض ہوتے تو صرف سلام و کلام ترک کر دیتے تھے۔ بس ــــ دشمنوں کے معاملے میں ان کا رویہ یہ تھا کہ ایک مرتبہ ایک شخص نے ایک رسالے کے سلسلے میں انہیں شدید نقصان پہنچایا۔ خیال تھا کہ وہ اب اس سے کبھی نہیں ملیں گے۔ لیکن ایک دن جب وہ ان کے سامنے سے گزرا تو اسے لپٹ گئے اور الٹی اپنی طرف سے معافی مانگنے لگے۔

اختر اپنے دوستوں کے معاملے میں بے حد فیاض، سخی اور سیر چشم واقع ہوئے تھے۔ ایک مرتبہ جس سے تعلق ہو گیا اسے ساری عمر نبھایا۔ دوستوں کے ساتھ تمام عمر وہ بھائیوں کی طرح گھل مل کر رہے۔ مثال کے طور پر اس ضمن میں میرے ساتھ ان کا سلوک یہ تھا کہ اختر مجھے چھوٹا بھائی سمجھتے تھے اور اختر صاحب کہنے پر ناراض ہو جاتے تھے۔ کہتے تھے مجھے اختر کہا کیجئے۔ ساتھ ہی انہیں اس قدر پاس خاطر تھا کہ جب وہ شغل خاص میں مصروف ہوتے اور میری آمد کی آہٹ سن لیتے تو بوتل کو جسے وہ دختر رز کہا کرتے تھے ادھر ادھر چھپانے کی کوشش فرماتے تھے ــــ باایں ہمہ حالت یہ تھا کہ مجھ سے بلا تکلف اپنا ہر دکھ درد بیان کرتا تھا اور مجھے اپنے عشق و عاشقی کے دلچسپ فسانے سنائے جاتے تھے۔

۱۹۳۴ء تک میں چوک چونا منڈی میں تھا اس کے بعد میں اپنا مطب مستی دروازہ کے باہر اپنے مکان نیر منزل میں لے آیا۔ یہاں بھی اختر حسب معمول باقاعدہ تشریف لاتے اور بالعموم شام کو سورج چھپے تشریف لاتے۔ ابتدائی ایام میں ان کا معمول یہ تھا کہ شام کو مجھے ہی ساتھ لیا اور لارنس یا منٹو پارک کی طرف چل دیئے۔ یہاں آدھی رات تک بیٹھے باتیں کرتے رہتے تھے۔ باتوں کے لئے کوئی موضوع مخصوص نہ تھا۔ بالعموم شعر و ادب موضوع گفتگو ہوتا۔ بسا اوقات دوسرے احباب کو بھی ساتھ لے لیا جاتا تھا۔

جیسا کہ میں نے ابھی ذکر کیا اختر کا معمول یہ تھا کہ بالعموم شام کو تشریف لاتے اور کوشش کرتے کہ اسی رات گھر تشریف لے جائیں لیکن جب گھر سے ناراض ہوتے تو بالعموم یہاں ان کا بعض اوقات قیام رہتا تھا۔ اور اس امر کا خیال رکھا جاتا تھا کہ بلا اطلاع کبھی شب گزاری نہ ہو۔ ایک دن مجھے اطلاع دیئے بغیر بات کر سلیم کے یہاں مزنگ چلے گئے اور اس خیال سے کہ مجھے زحمت انتظار نہ ہو یہ منظوم خط لکھ کر مجھے ایک دوست کے

ذاتہ ارسال فرمایا۔

برادرِ معظم و محترم دامت معالیکم

سلیمہ نے مجھے گھیر لیا ہے آج کی رات　　کسی بہانے سے بہلا لیا ہے آج کی رات

پینہ جو بھی ہے بے حد حسین ہے لیکن　　نہ جانے مجھے بہکا لیا ہے آج کی رات

ہے واقعہ فقط اتنا کہ اتفاقاً آج　　نگاہِ حسن نے اپنا لیا ہے آج کی رات

کہ جس نے کھا ہے شعار دونوں کو　　کسی حسینہ نے بہکا لیا ہے آج کی رات

معاف کیجئے مری غیر حاضری پھر آج　　کہ ایک حور نے پھسلا لیا ہے آج کی رات

کچھ ابھی دل کی لگی ہم نے اٹھا رکھی ہے ـــــــ اختر

ایک دن رات کو ایک شو کے قریب کہیں سے تانگے میں تشریف لائے اور جب تانگے سے اترے تو کوچوان سے عالمِ مستی میں کچھ سخت کلامی ہو گئی۔ صبح خواب سے اُٹھے تو مجھ سے پوچھنے لگے کہ رات میں نے ایک تانگے والے کو کچھ سب وشتم کیا تھا میری آواز بھی تک تو نہیں پہنچ گئی تھی۔ یہ تھا ان کی شرم، مروت اور لحاظ کا عالم جو ان کی ذاتی و نسبی شرافت کا نتیجہ تھا۔

دوستوں کی تقریبات مسرت میں وہ جس انداز میں شرکت فرماتے تھے اس سلسلے میں یہ مثال کافی ہے کہ میرے گھر کے بچوں کے ساتھ انہیں گہرا لگاؤ تھا۔ اکثر جب گھر آتے تو بچوں کے ساتھ بچوں کی طرح کھیلتے تھے۔ اور ان کی تقریبات میں گھر کے ممبروں کی طرح شریک ہوتے تھے۔ میرے بچے سکندر صولت کی سالگرہ ہوئی تو جھومتے ہوئے آئے اور یہ نظم لکھ کر سب کو سنائی۔

سنا رہی ہے زیدِ پیار سالگرہ　　مسرتوں کی ہے پروردگار سالگرہ

زبسکہ سالگرہ ہے میاں سکندر کی　　بجا ہے کہئے سکندر وقار سالگرہ

سہا رہی ہے نگاہوں میں بن کے عالمِ کیف　　بسا رہی دلوں میں بہار سالگرہ

دیارِ قدس سے آئی ہے حور کی صورت　　مسرتیں لئے بے شمار سالگرہ

خوشی کے پھول برسنے لگے فضاؤں سے　　لٹا رہی ہے بہشت و بہار سالگرہ

خوشی سے پھولے سماتے نہیں ہیں خورد و کلاں　　بڑھا رہی ہے ہر اک دل میں پیار سالگرہ

اسی فروغ سے تا حشر بار بار آئے　　دعائیں کرتی ہے یہ بار بار سالگرہ

دعا ہے عمرِ سکندر کا رشتہ محکم　　اسی بہار سے دیکھے ہزار سالگرہ

خوشی سے رقص کریں مل کے ساقی و اختر

منا رہی ہے مئے خوشگوار سالگرہ

ایک مرتبہ میری اہلیہ گھر سے ناراض ہو کر کچھ مدت کے لئے بھوپال چلی گئیں۔ اختر ہمارے گھر کی ناراضگی کی اطلاعات سے بہت مغموم رہتے تھے ـــــ لیکن کچھ دنوں کے بعد جب میں اپنی بچی رخسانہ اور اس کی والدہ کو بھوپال جا کر گھر واپس لے آیا تو بہت خوش ہوئے اور اس وقت انہوں نے یہ اشعار کہے۔

دل کا سکون لئے ہوئے رخشانہ آگئی　　تیرہ کدہ میں رونق کاشانہ آگئی

بھوپال کی خبر ہے کہ بھابھی آگئیں　　بھائی کے گھر میں عشرتِ جانانہ آگئی

اچھے ہیں تم سے بھی بت خوش بجئے — جب ایک کو لگی ہے کہ سودا گیا
سلگ گئے یہ شعلۂ حسن کو وہ — اس میں یہ شکایت سے شانہ گئی
آنے کا اس کے سب کو گماں ہی چلا — وہ جان عشق ہے صنم خانہ آگئی
اختر کے دل کو آج سے ہوس ہے خوشی — دو رنگ سے دیوانہ گئی
ما ماضی میں ہوئی جو کچھ ہوئی گئی — بت سوس کی ایک پروانہ آگئی

ہر چند تھی خفا گر اعتبار عشق پہ
جادو سب روئی اختر دیوانہ آگئی

ان مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اختر کا اپنے دوستوں اور اُن کے گھروں کی خواتین کے ساتھ کس طرح کا اور کس قدر اچھا رہا کرتا تھا۔

اُن کے والد حافظ محمود شیرانی مرحوم اختر کو ہمیشہ اختر کی جگہ "داؤد" کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ اختر ان کے اکلوتے فرزند تھے اور ایسی صورت میں قدرتی طور پر حافظ صاحب مرحوم کو اختر کے ساتھ جو محبت ہو سکتی تھی ظاہر ہے۔ وہ اوّل اوّل اختر سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان کی علمی، ادبی اور شعری صلاحیتوں کو دیکھتے اور خوش ہوتے۔ وہ اختر کے ادبی رسائل میں اپنے مضامین شاعت کے لئے دیتے۔ لغت اور شعر کے بارے میں ان کو اختر کی صلاحیتوں کا اعتراف تھا۔ چنانچہ ان دنوں میں بھی جبکہ اختر سے ناراضگی تھی میں نے دیکھا کہ نعل ملازم باورچی خانے سے کوئی چٹ لاتا جس میں کسی لغت یا تاریخی مسئلے میں اختر کی رائے معلوم کی جاتی تھی۔

ادھر اختر کی حالت یہ تھی کہ ان کے بال بچوں کے کفیل صرف حافظ صاحب مرحوم تھے اور اختر دنیا و مافیہا سے بے نیاز لاابالی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اختر سماج کے باغی تھے اور انہوں نے کبھی اپنی زندگی اور ماحول سے سمجھوتہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ صرف شعر و نغمہ کی [illegible] تھے۔ انہوں نے کبھی کوئی کاروبار نہیں کھولا۔ کبھی کوئی مکتبہ قائم نہیں کیا۔ انہوں نے کئی ادبی ماہنامے جاری کئے لیکن وہ کبھی زیادہ دیر تک نہیں چل سکے کیونکہ آمد و خرچ پر کبھی کنٹرول نہیں ہوا۔ ایک مرتبہ "پھولوں کے گیت" مجموعۂ نظم سے جو آپ نے بچوں کے لئے لکھا تھا غالباً دو سو روپے ملے۔ یہ روپے لے کر وہ لکھنؤ جا رہے تھے کہ راستے میں امرت سر کے کچھ نوجوانوں کو پتہ چلا کہ اختر کے پاس روپے ہیں۔ انہوں نے ان کو سٹیشن پر گاڑی سے اتار لیا۔ انہوں نے یہ روپے قرض لئے اور دو چار دن میں عیش و عشرت میں اڑا دیئے۔ لیکن اب اختر کی سادگی ملاحظہ فرمائیے کہ وہ بیٹھے شیراز ہوٹل میں روپے کی واپسی کا انتظار کرتے رہے۔ مختصر یہ کہ روپے کی صورت میں کوئی چیز بھی ان کے پاس نہیں رہ سکتی تھی۔ آخر میں ان کے آخری مجموعہ ہائے کلام سے جو کچھ روپے وصول ہوئے بمشکل تمام ان کا عشر عشیر حصہ ان کے بچوں تک پہنچایا جا سکا۔ دستار اُن کے پاس نہ تھی ایک کوٹ کبھی کبھی رہن رکھا دیکھا جاتا تھا۔

ابتداء میں حافظ محمود شیرانی مرحوم نے کئی بار کوشش کی کہ اختر کو کسی کام میں لگائیں لیکن اختر ہمیشہ اس راہ سے دامن بچاتے رہے۔ حافظ صاحب مرحوم جب اسلامیہ کالج لاہور کی پروفیسری چھوڑ کر اورینٹل کالج میں تشریف لے گئے تو اختر سے کہا گیا کہ اسلامیہ کالج میں اپنے والد کی جگہ قبول کریں لیکن آپ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ لڑکوں کا پڑھانا میرے بس کا روگ نہیں۔ پھر ۱۹۳۵ء میں اختر کو دار الترجمہ حیدر آباد (دکن) میں ایک عہدہ پیش کیا گیا لیکن آپ نے وہاں جانے سے بھی انکار کر دیا۔ درحقیقت وہ کسی قسم کی پابندی اپنے ذمہ نہیں لینا چاہتے تھے۔

رفتہ رفتہ اختر کی دن رات کی خلوت گزینی بلکہ چپ گوئی، گھر اور گھر کی زندگی سے بیزاری۔ دنیا اور دنیا کی ہر قسم کی زندگی کی حدود سے بے حد بے نیازی۔ ہر وقت کی شعر نوازی اور ہمہ وقت مے کشی۔ رندی و مستی۔ الکحل اور الکوحل سے تعلق۔ ایک خاص قسم کا عہدہ

دلچسپی اور رسا سر بار لوگوں کی طرح کی زندگی اور ایک خاص طرز کے دوستوں سے سروکار ـــــ یہ سب چیزیں کچھ ایسی تھیں جنہوں نے اختر کے والد محترم کے دل میں ان کے خلاف سخت غم و غصہ اور رنج و نفرت کے احساسات پیدا کر دئے تھے۔

ساتھ ہی بعض مخصوص قسم کے احباب کا بھی کہنا ہے کہ حافظ صاحب مرحوم کو مخصوص انداز میں ان حالات سے آگاہ فرماتے رہتے تھے۔

جیسا کہ میں نے ذکر کیا اختر اپنے یگانۂ روزگار باپ پروفیسر محمود شیرانی مرحوم کے اکلوتے فرزند تھے اور قدرتی طور پر اُن کے والد محترم کی یہ دلی خواہش تھی کہ ان کا فرزند بھی سوسائٹی اور ملک میں عزت اور علم و ادب میں امتیازی شہرت حاصل کرے ـــــ لیکن اختر کی اس زندگی کی وجہ سے جو انہوں نے اختیار کر رکھی تھی اختر اور ان کے والد محترم کے درمیان رشتہ تھا فتراق و شقاق کی ایک زبردست خلیج حائل ہو گئی تھی اور اسی لئے اختر کی گھریلو زندگی بے حد تلخ ہو گئی تھی۔ اور صورت یہ ہو گئی تھی کہ گھر ان سے تنگ تھا اور وہ گھر سے بیزار ـــــ بارہا ایسا ہوا کہ وہ گھر بار چھوڑ کر دوستوں کے یہاں اقامت گزیں ہو گئے اور اس مقصد کے لئے اکثر میرے غریب کدہ کو شرف انتخاب بخشا۔ ـــــ لیکن پھر کسی نے گھر والوں سے صلح کرا دی اور وہ گھر واپس چلے گئے۔

اکثر ان کا معمول یہ تھا کہ رات گئے گھر لوٹتے تھے اور اس اثنا میں بارہا ایسا ہوا کہ ان کے والد محترم نے غصہ میں آ کر مکان کے اندر زینے کے دروازے کو قفل لگا دیا۔ اختر آتے اور اس دروازے کے باہر سیڑھیوں پر بیٹھے رہتے۔ ماں کی مامتا کے زیر اثر ان کی والدۂ محترمہ جب یہ منظر دیکھتیں تو کمرے کے اندر کواڑ کے پاس اپنے اکلوتے بیٹے کے قریب آ کر بیٹھ جاتیں۔ دونوں رات بھر بیٹھے باتیں کرتے رہتے اور اس طرح اکثر سردیوں کی ساری رات آنکھوں میں گزر جاتی تا آنکہ صبح ہوتی اور دروازہ کھلتا۔

اس سلسلہ میں ایک قابل ذکر لطیفہ یہ ہے کہ وہ اپنے گھر پر رہتے یا کہیں اور ـــــ ان کی یہ عادت تھی کہ جہاں بھی رہتے خواہ دن بھر کہیں ہوں لیکن کسی نہ کسی وقت اپنے ٹھکانے پر ضرور پہنچتے تھے۔ یعنی مست و لایعقل رہنے کے باوجود اس قدر باخبر اور محتاط ضرور تھے کہ رات کو اپنا ٹھکانا نہیں بھولتے تھے۔ چنانچہ بارہا ایسا ہوا کہ وہ میرے مکان پر قیام کے زمانے میں دن بھر غائب رہتے اور رات کو دو بجے تشریف لاتے تھے۔

ان تمام امور کے باوجود اختر اپنے والد محترم کا بے حد احترام کرتے تھے۔ وہ تمام تعزیرات سہتے اور کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لاتے۔ میں نے دیکھا کہ جب بھی وہ اپنے والد محترم کا نام لیتے بڑے احترام سے لیتے اور اکثر ان کی خوبیوں اور خصوصیتوں کا ذکر کرتے۔ عام لوگوں کو اس سلسلے میں اختر کی محبت کا اندازہ اُس وقت ہوا جب ٹونک میں اُن کا انتقال ہوا اور لوگ جنازے کو لے کر چلنے لگے تو اس رند خرابات نے راستے میں جنازہ کو روک کر پٹی پکڑ کر کچھ اس انداز میں صدائے نالہ و شیون بلند کی کہ شہر کا ہر چھوٹا بڑا اس منظر کو دیکھ کر زار و قطار رو رہا تھا۔

اختر کے ساتھ شراب کا قصہ لازم و ملزوم کی صورت میں سامنے آتا ہے میں نے ذکر کیا ہے کہ اختر سے میری ملاقات ۱۹۲۷ء میں ہوئی ہے اس وقت اختر شراب کے خوگر ہو چکے تھے اُن کی زبانی معلوم ہوا کہ لاہور پہنچنے کے بعد اُنہیں ان کے مخصوص قسم کے دوستوں نے شراب کے ذائقہ سے آشنا کرایا بعد میں جب علامہ تاجور مرحوم نے لاہور میں مرکز اُردو حلقۂ ارباب علم و ادب کے نام سے قائم کیا اور یہاں ہند کے دیگر مشاہیر شعر و ادب کے ساتھ ساتھ حضرت جگر مرادآبادی بھی کچھ مدت کے لئے قیام پذیر ہوئے تو حضرت اختر نے اس سلسلے میں اس پیر مغاں کی بیعت کی۔ اختر کا بیان ہے کہ میں شعر میں علامہ تاجور کا شاگرد ہوا اور شراب میں حضرت جگر کا ابتدائی دنوں میں اپنا کلام علامہ تاجور کو دکھلایا۔ اور اس کے بعد وہ اپنے مخصوص رنگ میں ڈھل گئے۔

شراب میں یہ جگر کی تقلید کا سلسلہ اس حد تک غیر متواتر کی صورت اختیار کر چکا تھا کہ ایک مرتبہ جب اختر طبی مشورہ کے لئے حکیم فقیر محمد

جگر مرحوم کے پاس گئے تو انہوں نے جس ایک کرپسیل تحفہ فرمایا کہ جگر کے کباب کھاؤ گے۔
رفتہ رفتہ اختر اس حد تک شراب میں بہہ گئے تھے کہ ان کے جسم میں پانی کی جگہ شراب بہنے لگی۔ شراب بہت مصیبت بن گئی
— آخر میں شراب کی بدولت ان کا گوشت ہڈیوں سے جدا ہو گیا۔ جگر جل کے کباب ہو گیا اور شراب نے ان کی زندگی کے تانے بانے ادھیڑ دیئے۔

اختر کی بادہ کشی عام شرابیوں کی طرح کی نہ تھی ان کی عادت یہ تھی کہ جب سے آغاز کرتے تو بے تحاشا پیتے۔ اکثر سو دو سو پیتے اور اگر یہ صورت ہوتی کہ پانی کا قطرہ نہ بجھتے تھے۔ جب وہ شروع ہوتا تو مسلسل دو دو ہفتے جاری رہتا۔ اس عرصہ میں غذا قطعاً ترک کر دی جاتی تھی۔ اس کے بعد خمار اور اس کے ساتھ قے اور اعضا میں بے چینی اور گھبراہٹ کا زمانہ آتا۔ اب وہ پہلوؤں کے بل گرتے اور پھر دورہ لازم آ جاتا۔

جہاں تک پند و نصیحت کا تعلق ہے بہت سے دوستوں نے جو خود تو شراب پیتے تھے لیکن ان کے سامنے ہمیشہ پرہیز کی تلقین کرتے انہیں شراب سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن بیکار — وہ بھرے نہ پیتے اور وعدہ کر کے جاتے لیکن اس کے باوجود پیتے رہتے اور جھومتے ہوئے تشریف لا رہے ہیں۔ پوچھا "حضرت یہ کیا ہوا" فرمانے لگے "اس دفعہ آخری دعوت ہے"۔ کئی بار سخت کوشش کی کہ انہیں مجبور کر کے شراب سے باز رکھا جائے لیکن جب کبھی دو چار دن کا وقفہ ہوا اس اثنا میں کہیں نہ کہیں سے کوئی ہم مشرب ٹپک پڑا۔ جو ان کی توبہ کے ٹکڑوں کو چند منٹ بھی سلامت نہیں رہنے دیتا تھا۔

شراب کے بارے میں وہ اپنے خاص دوستوں کی جیبوں کو اپنی جیب سمجھتے تھے اور حسن طلب کچھ ایسا لطیف اور شاعرانہ ہوتا تھا کہ بغیر فرمائش پوری کئے رہا نہیں رہا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ سردی کا مہینہ تھا اور میں باہر دھوپ میں بیٹھا مطالعہ کر رہا تھا۔ وہ مشہور ہم ذوق شاعر دوستوں کو ہمراہ لے کر آ گئے۔

ایک صاحب نے فرمایا ع "دھوپ میں اپنے مریضوں کو دوا دیتے ہیں۔"

دوسرے صاحب بولے ع "اور شاعر کوئی آئے تو جام دیتے ہیں۔"

اور آپ نے فرمایا ع "اہلِ دل ایسے مسیحا کو دعا دیتے ہیں۔"

اس کے بعد ان شاعروں کے سامنے فرمائش شروع کی اور بوتل کے پیسے لے کر چلتے ہوئے۔ شراب کے لئے رقم طلب کر کے اکثر یہ فرمایا جاتا تھا کہ بس آخری موقع ہے اس کے بعد اس کو منہ نہیں لگاؤں گا۔ لیکن یہ کافر ہمیشہ منہ سے لگی رہی۔

شراب پی کر شرابی دوستوں کو ساتھ تانگہ میں لے کر سیدھا باہر نکلتے اور دوستوں کے یہاں پہنچتے۔ ملک میں سودیشی کا چرچا تھا۔ شراب پینے کی عادت کی جانب اشارہ کر کے فرماتے کہ میں سودیشی کی تحریک کا زبردست حامی ہوں۔ شرابیوں اور شراب خانہ کے کاروبار سے جو آپ کو لگاؤ تھا اس سلسلے میں ایک لطیفہ یہ ہے کہ انارکلی کے چوک کے دائیں طرف باہر ٹھیکے کی دکان پر ایک مسلمان بادہ فروش ترکی ٹوپی اوڑھے شراب بیچ رہا تھا۔ جب اس کا سر ہلتا اور ٹوپی کا پھندنا جھولتا آپ قہقہے لگاتے اور جھومتے۔

احباب فرمِ مختلف کاموں کے سلسلے میں اختر کے پاس آتے تھے۔ کئی لوگ سفارشی خطوط لکھواتے۔ کئی انہیں اپنے کاموں میں سفارش کے لئے ساتھ لے جاتے۔ کئی ان سے اپنے اخبارات و رسائل کے لئے نظمیں لینے کے لئے آتے۔ اور کئی دوست ان کے پاس آ کر اپنی فلموں کے لئے ان سے مکالمات لکھواتے۔ اختر اس طرح کے اکثر کام بخندہ پیشانی مفت انجام دیتے تھے — اور گاہے ان کاموں کی قیمت دیسی شراب کی صرف ایک بوتل ہوا کرتی تھی۔ جو اس زمانے میں ڈھائی روپے میں آتی تھی۔

اختر کی شاعری بڑی حد تک سلمیٰ کے تصور کے گرد گھومتی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اختر کی شاعری سلمیٰ کے عشق کی رنگین داستان ہے

اس سے پہلے کہ آگے بڑھا جائے چند کلمات پہلے سلمیٰ کے متعلق بھی عرض کر دئے جائیں۔

جہاں تک سلمیٰ کا تعلق ہے یہ لفظ فارسی اور عربی ادب میں محبوبہ کے لئے استعمال ہوا ہے۔ حافظ کہتا ہے۔

تا کے حضرت سلمیٰ کہ سلامت باما ۔۔۔ چہ شود گر بسلامے دل ما شاد کند

منزل سلمیٰ کہ بادش ہر دم از ما صد سلام ۔۔۔ پر صدائے ساربان بینی و آہنگ جرس

ما بسلمیٰ و من بذی سلم ۔۔۔ این جیراننا وکیف الحال

امن تذکرتنی عن حب سلمیٰ ۔۔۔ غریق العشق فی بحر الودادی

اور جامی کہتا ہے کہ

عشق شویدا دل تنبیت جمال سلمیٰ ۔۔۔ کہ رسانند لاس وامی زید بطلعے بجانب ما

لیکن اختر کی شاعری میں سلمیٰ سے مراد ایک معین شخصیت تھی۔

سلمیٰ کا حقیقی وجود لوگوں کی نگاہوں سے اس لئے بھی مخفی رہا کہ اختر اس راز سے پردہ اٹھانا نہیں چاہتے تھے اور جو لوگ واقف تھے ان کو اس کی اجازت نہیں دی گئی۔ وہ تاعمر تک اس راز کو چھپاتے رہے اور جو لوگ پوچھتے انہیں بہ لطائف الحیل ٹال دیتے۔ اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں ان کا یہ طریق کار صحیح بھی تھا۔ آخر ایک شریف خاتون کو رسوا کرنے کا فائدہ۔

قدرتاً سلمیٰ کی بھی یہ خواہش تھی کہ کسی طرح اس کا نام منظر عام پر نہ آئے اور جب انہیں ایک دو مرتبہ یہ محسوس ہوا کہ شاعر بہک کر کچھ خاص قسم کے اشارات کرنے لگا ہے تو انہیں ایک خط میں اختر کو خاص طور سے تنبیہ کرنی پڑی جس کے جواب میں اختر نے ایک غزل میں کہا کہ

شعر میں ذکر کسی کا دل ناکام نہ کر ۔۔۔ اس نے لکھا ہے کہ تو یوں ہمیں بدنام نہ کر

غیرت حسن کو منظور نہیں رسوائی ۔۔۔ ضبط اے عشق اس افسانے کو یوں عام نہ کر

اور اس کے بعد اس حد تک اخفا کی کوشش کی گئی کہ اختر نے اپنے اور سلمیٰ کے خطوط کا اس وقت جو مجموعہ مرتب کیا اس میں اپنے لئے بھی اختر کی جگہ "کوکب" کا لفظ اختیار فرمایا۔

یہ مجموعہ مکاتیب ان دنوں بہت سے دوستوں کے یہاں چکر لگاتا رہا چند روز میرے پاس بھی رہا لیکن اس وقت مجھے اس کو نقل کرنے کا خیال نہ آیا۔ آہ اس وقت کسے خبر تھی کہ

ہے آج جو سرگزشت اپنی ۔۔۔ کل اس کی کہانیاں بنیں گی

مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس کی ایک ایک نقل آغا خادم حسین تاباں اور سلیم کے پاس موجود ہے۔

بہرکیف احباب کی اطلاع کے لئے اس قدر عرض کر دینا کافی ہے کہ سلمیٰ جن کا اصل نام اور ہے ایک معین شخصیت کا نام ہے اور وہ آج بھی بقید حیات ہیں۔

سلمیٰ سے اختر کے معاشقہ کی ابتداء ۱۹۲۶ء میں ہوئی جبکہ پہلے پہل سلمیٰ کا ایک مکتوب ان کے نام پہنچا اور اسے پڑھ کر انہوں نے وہ مشہور غزل کہی جس کا مطلع یہ ہے کہ

لے آئے انقلاب سپہر بریں کہاں ۔۔۔ اللہ ہیں کہاں وہ ثریا جبیں کہاں

اس کے بعد جب در جاناں پر طلبی ہوئی تو اختر یوں نغمہ سنج ہوا کہ

کتنی شاداب ہے دنیا کی فضا آج کی رات ۔۔۔ کتنی سرشار ہے گلشن کی ہوا آج کی رات

کتنی ہوش ربا ہے رُت کی گداز کیفیت — کس قدر دل رُبا ہے موسم فضا تجلیات
کر تو آنے کی وعدہ وفا آج کی رات

آ کہ لمحات جھومتے ہیں نشے سے بے خود ہیں — ہر اک پھول بہار سا شاداب ہے
ایک بے اختیاری سی مستی برسا رہی ہیں — بلکہ ہر خوشی ہر عشق سے
ہے خوشی چاروں طرف ہر سمت آج کی رات

آج کی رات کے عنوان سے یہ تمام نظم ہی نوجوان کے جذبات و احساسات سے معمور ہے۔ یہ نظم یوم ملاقات سے پہلے کی ہے لیکن
اس کے بعد جب ملاقات ہو چکی تو اختر بےبس تصورات باندھے ہیں تو انداز بدلا ہوا ہے

ــــہ
نہیں ستاروں نے بھی بار بار دیکھا ہے — شبِ چاند نے بے انتہا دیکھا ہے
کبھی چمن میں گئی ہو تو مست پھولوں نے — نگاہِ شوق سے آئینہ وار دیکھا ہے
سنہری دھوپ کی کرنوں نے بام پر جا کر — تیرے گیسوئے مشکیں بار دیکھا ہے
قریب شام تمہیں طائرانِ گلشن نے — ہزار بار بہ صد اعتبار دیکھا ہے
نسیم صبح نے زیبِ افسانہ کبھی — تمہیں بہ گلدۂ سنگار دیکھا ہے
غرض مظاہرِ فطرت نے ہر طرح تم کو — ہزار بار نہیں دل کے ساتھ دیکھا ہے
اگر مری نگہِ شوق کو شکایت ہے — کہ اس نے تم کو فقط ایک بار دیکھا ہے

وہ کیا ایک جھلک اور بس نگاہوں کو
دوبارہ دیکھنے کی ہے ہوس نگاہوں کو

اور پھر برس کے بعد کی ایک ملاقات کا نقشہ ملاحظہ کیجیے۔

ــــہ
کون آیا مرے پہلو میں یہ خواب آلودہ — زلف برہم زدہ و چشم حجاب آلودہ
کس نے پہلو میں بٹھایا یہ مجھے شرما کر — کس کے ہاتھوں میں ہے رخ شوخ گلاب آلودہ
کس کے ملبوس سے آتی ہے حنا کی خوشبو — کس کے ہر سانس کی جنبش ہے شباب آلودہ
کس کو شکوہ ہے مرے عشق سے رسوائی کا — کس کا لہجہ ہے ادائے لطف عتاب آلودہ

حسرت بوسہ پہ اختر یہ خیال آتا ہے
میرے ہونٹوں سے ہوا پھول ہر اک گلاب آلودہ

اختر سلمٰی کی نسبت سے دیار سلمٰی کا بھی جرمت سے آنذکرہ نیاز مندان شوق رہا ہے عاشق تھا اور اس سلسلے میں اس نے بربط عشق پر بے
دلگداز نغمے چھیڑے ہیں۔ ایک نظم کے چند بند ملاحظہ ہوں۔

ــــہ اے سرزمینِ گجرات اے خلد زارِ الفت
پھولوں میں تیرے رقصاں روحِ بہارِ الفت
تیرا ہر ایک ذرہ ہے رازدارِ الفت ——— اے یادگارِ الفت ——— اے سرزمینِ گجرات
[illegible]

آوارۂ عشق تیرے شاداب دامنوں میں
فطرت برہنہ تیرے پُر فضا میدانوں میں ——— رنگین مسکنوں میں ——— اے سرزمین گجرات
پھر آرزو کو رسوا کرنے کی آرزو ہے
مٹنے کی اور آہیں بھرنے کی آرزو ہے
سلمیٰ کے پاؤں پر سر دھرنے کی آرزو ہے ——— مرنے کی آرزو ہے ——— اے سرزمین گجرات

ایک مرتبہ سلمیٰ جب بیمار ہوئیں تو اختر نے انہیں ایک منظوم خط میں لکھا کہ

؎ تندرستی کا گلہ کیا ہے شکایت کیا ہے ——— میری بیمار بتا تو تری حالت کیا ہے
عشق بیماری ہے اور کتنی حسین بیماری ——— کیا خبر بے خبروں کو یہ لذت کیا ہے
ساری دنیا کے مریضوں کو شفا دے یارب! ——— آج احساس ہوا ہے کہ علالت کیا ہے
رو دیتے ہیں سب ہی سن کے دردبھری کوئی خبر ——— درد ہی درد ہے یارب کہ طبیعت کیا ہے
ان کی صحت کی خبر آئے گی جلد آئے گی ——— دلِ ناداں تجھے آخر یہ وحشت کیا ہے

سامنے ہوں تو فدا کردیں دل و جاں ان پر
ہم نہیں جانتے اختر کہ عیادت کیا ہے

تقریباً پانچ چھ سال تک یہ سلسلۂ معاشقہ جاری رہا لیکن آپ کو اس ضمن میں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ یہ تمام دور جنسی آلودگی سے قطعاً مبرا رہا۔ مجھے اختر نے ذاتی طور پر ان حالات سے خود آگاہ کیا اور خود اختر کی تحریروں سے بھی یہ چیز واضح ہے۔ اختر اپنے اس مجموعۂ مکاتیب میں جو آج بھی دوستوں کے پاس ہے ایک مکتوب میں سلمیٰ کو اپنی ملاقات کا وقت یاد دلاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "کیا آپ میری محبت کی معصومیت اور ملکوتی اور مقدس حیثیت کی داد نہ دیں گی"۔ اور اس کے جواب میں سلمیٰ لکھتی ہیں کہ "آپ انسان نہیں دیوتا ہیں اور آپ کی اسی شان نے مجھے خرید لیا ہے" (یہ مکتوب روزنامہ آفاق لاہور کی اشاعت مؤرخہ ۱۲ ستمبر ۱۹۵۲ء میں شائع ہو چکا ہے)

اختر اپنی ایک نظم میں بھی اس جانب اس طرح اشارہ کرتے ہیں۔

؎ قسم اس پاکبازی کی جو تھی باہم خیالوں میں ——— قسم اس بے نیازی کی جو تھی باہم سوالوں میں
قسم اس چاک دامانی کی جو مجبورِ وحشت تھی ——— قسم اس پاک دامانی کی جو معذورِ عفت تھی
محبت کی انہی معصوم راتوں کی قسم تم کو ——— حقیقت کی انہی موہوم راتوں کی قسم تم کو

فقط اتنا بتادو کیا وہ راتیں پھر نہ آئیں گی
وہ راتیں آہ وہ راتیں وہ راتیں پھر نہ آئیں گی

اختر و سلمیٰ کے مجموعۂ مکاتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دوران میں ایسے لمحات بھی آئے کہ اگر سنجیدگی سے کوشش کی جاتی تو ان کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کیا جاسکتا تھا لیکن بعض وجوہ سے ایسا نہیں کیا گیا ——— بالآخر غالباً ۱۹۳۲ء میں سلمیٰ ایک جگہ رشتۂ تزویج میں باندھ دی گئیں اور یہ سلسلۂ نامہ و پیام ہمیشہ کے لئے وعدۂ حشر پر ختم ہوگیا ——— اختر نے اس موقع پر اپنی محبوبہ کو مطلع کردیا کہ

؎ دل و دماغ کو رو لوں گا آہ کر لوں گا ——— تمہارے عشق میں سب کچھ تباہ کر لوں گا
تمہاری یاد میں میں کاٹ دوں گا حشر سے دن ——— تمہارے ہجر میں راتیں سیاہ کر لوں گا

اگر جدا ہیں ہم تم تبدیلے سال تم   میں اپنی مستی جوانی تباہ کر دوں گا
جو تم سے کر دیا محروم آسماں نے مجھے
میں اپنی زندگی صرف گناہ کر دوں گا

اور ہوا یہ کہ یہ کہتے ہوئے واقعی اختر نے اپنی جوانی تباہ کر لی۔

ہم نے ذکر کیا ہے کہ اختر جب آسمان شعر و ادب پر چھائے ہوئے تھے تو اس دور میں اُن کے عشق سے فضا میں شاعری میں لکھی تو اس سے سب سے زیادہ کالجوں کا دائرہ متاثر ہوا جن میں طلباء کی طرح طالبات و مستورات بھی شامل تھیں۔ ان کے علاوہ ملک کی بہت سی خواتین نے اختر کے کلام کو خوش آمدید کہا۔ جن میں سے اکثر بڑے ممتاز اور اعلیٰ گھرانوں کی چشم و چراغ تھیں۔

بعض خواتین اختر کو یوں ہی شوقیہ خطوط لکھتی تھیں۔ بعض ایسی تھیں جو کلام پر اصلاح کے لئے خطوط لکھتیں۔ اور کچھ ایسی بھی تھیں جن میں سے بعض کو اختر سے کچھ لگاؤ بھی تھا اور ایسی اکثر کی عادت یہ تھی کہ اختر کی نظموں میں حسن و رومانیت کے لئے کسی کے تصورات اور عادات و جذبات کو دیکھ کر اس کی تعریف اور اس کے جذبے کی دلدادہ تھیں۔ بعض کا معمول یہ تھا کہ اس کی نظموں میں کسی کو بیان پڑھ کر اس کو خطوط لکھتیں اور تعریف چھیڑتی تھیں۔ جو خواتین اس سے اپنے کلام پر اصلاح چاہتیں اکثر اس کے لئے ستائش کرتیں۔ اور یہ اختر کی سادگی تھی کہ وہ ان سب چیزوں کو عشق و محبت کی کارفرمائیوں کا نتیجہ سمجھتے تھے۔ درحقیقت یہ ہے کہ سلمیٰ کے بعد ان پرستاران اختر میں سے تقریباً سب کا تعلق اختر سے زیادہ اختر کے آرٹ سے رہا ہے۔

وہ خواتین جن سے اختر کی مراسلت رہی ہے زہرہ۔ پروین۔ ثریا۔ نسرین۔ ناہید۔ وغیرہ۔ شمسہ اور جمیلہ تھیں۔ علاوہ بریں لاہور کی عذرا۔ سندھ کی زلیخائے حزیں۔ امرت سر کی نوبہار ناز اور لکھنؤ کی ممتاز ادیبہ سے بہت زیادہ سلسلہ مکاتبت رہا۔ ان سے متعلق اختر نے کئی نظمیں لکھیں جن میں سے

کوئی مہ جبیں جلوہ دکھلا گئی   مرے گھر بہت مہ بہار آ گئی

شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔

سندھ کی زلیخائے حزیں جب اکثر دہلی سے سندھ یا سندھ سے دہلی جاتے ہوئے لاہور سے گزرتیں ان کے خیر مقدم کے سلسلے میں جو نظمیں لکھی گئیں وہ ادب اُردو کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔

راہ دہلی سے صبا عطر فشاں آتی ہے   خبر آئی ہے کہ وہ جانِ جہاں آتی ہے

اور پھر

سامانِ رشکِ انجم و مہتاب کر کے جا   لاہور کی فضاؤں کو شاداب کر کے جا
مانا کہ سندھ ہے مضطر ترے لئے   کچھ تو علاج بے کسِ پنجاب کر کے جا

جیسی نظمیں اسی عذرا کی یادگار ہیں۔
ماہ لقا لکھنؤ کی شان میں لکھا۔

کب تک رونقِ شامِ اودھ اے ماہ لقا   شامِ لاہور کو بھی صبح بنا دے آ کر

اور امرت سر کی نوبہار ناز کی شان میں تحریر فرمایا۔

ہر ذرہ اُس کے حسن سے گلشن بنا ہے آج کل   امرت سر ایک وادیٔ ایمن ہے آج کل

عمر کے آخری حصے میں اختر کو نسرین سے کچھ رابطہ رہا ہے اور اس کا علم مجھے اس طرح ہوا کہ ایک دن مرنے سے کچھ مدت پہلے میرے

[illegible] کے سامنے سڑک پر نکل پڑتے تھے۔ ہر سو چھایا ہوا ہے۔ [illegible] شیریں کی موت [illegible]
آپ نے جو اشعار کہے وہ شہناز پر خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

مری روحِ شیریں مری جانِ شیریں — تمنائے دل ہیں وہ ارمانِ شیریں
ترا رخ ہے برقِ سحابِ بہاریں — ترے لعل لب ہیں گلستانِ شیریں

دیکھنے والی نظر آیا وہ دیارِ شیریں — ذرہ ذرہ سے جھلکتی ہے بہارِ شیریں
خاکِ لاہور ہے گہوارۂ شان و عظمت — اختر اس خاک میں روشن ہے مزارِ شیریں

یہاں میں ضمناً یہ عرض کر دوں کہ اختر عورت ذات کے بارے میں سخت ذکی الحس واقع ہوئے تھے اور سلمیٰ کی جدائی کے بعد وہ خاص طور سے بہت زیادہ جذباتی ہو گئے تھے جب بھی کوئی حسین صورت دیکھتے تو سراپا تصویر بن جاتے۔ کسی حسین صورت کا سامنا ہو جانا ان کے لئے مصیبت تھا۔ جس کا اظہار ان کے چہرے سے ہونے لگتا تھا۔ ایک دن میں مزنگ میں ان سے ملنے گیا۔ پتہ چلا کہ ایک حسین لڑکی کی خاطر سڑکوں پر ادھر ادھر پھر رہے ہیں۔ میں نے ان کا پیچھا کیا اور جب مل گئے تو پوچھا کہ آخر اس آوارہ گردی سے مقصد ہے۔ فرمانے لگے زندگی کا اس سے بہتر مقصد اور کیا ہو سکتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ یوں ہی کوئی صورت دیکھ کر اپنا تانگہ کسی تانگہ کے پیچھے دوڑانا شروع کر دیتے تھے۔ ایک بار لاہور سے گزرتے ہوئے سندھ کی شوخ کمسن نے کچھ یوں کہا کہ جب جھٹکے پلیٹ فارم پر پہنچے تو وہ پچھلے پلیٹ کے سٹیشن سے گھر سامان ہی باندھ لائے۔

خطوں کے معاملے میں یہ عالم تھا کہ جب بھی کوئی حسین خط آتا بار بار پڑھتے رہتے اور کئی کئی دن تک خاص خاص دوستوں کو دکھاتے اور سناتے تھے مرنے سے کچھ دن پہلے ان مہکتے ہوئے خطوط کی نسبت ارشاد فرمایا۔

مٹ چلے میری امیدوں کی طرح حرف مگر — آج تک تیرے خطوں سے تری خوشبو نہ گئی

اختر کی زندگی کے تین دور ہیں پہلا دور سلمیٰ سے معاشقت سے پہلے کا ہے اس زمانے میں اختر نے جوگی۔ تیتری اور نغمۂ سحر وغیرہ عنوان سے دلکش نظمیں لکھیں۔ دوسرا دور سلمیٰ سے معاشقہ کے زمانے کا ہے۔ اس دور کا تقریباً تمام تر ذخیرۂ شعر اور سلمیٰ کے عشق کی حکایت لذیذ و دراز پر مشتمل ہے۔ اختر کی مشہور نظمیں آج کی رات۔ گجرات کی رات۔ اے سرزمینِ گجرات۔ اے عشق کہیں لے چل۔ انگوٹھی۔ آہ وہ راتیں۔ اعترافِ محبت۔ بستی کی لڑکیوں میں۔ بعض وصال لمحات کی یاد۔ ایک تصویر دیکھ کر۔ سلمیٰ نور جہاں کے مزار پر۔ اور "مری سلمیٰ مجھے لے چل قرآن بکف بہاروں میں" اسی دورِ بہار سے متعلق ہیں۔

تیسرا دور سلمیٰ سے مہجوری کا زمانہ ہے۔ اس میں اختر نے ابتداً دنیا سے تنگ آ کر میکدے کے دروازے پر دستک دی ہے اور ڈھلکتے آنچل کو چھیڑا ہے۔ عذرا۔ ناہید۔ سندھ کی شوخ کمسن شیریں اور دوسرے حسین عنوان اسی دور سے متعلق ہیں اور اختر کی نظم "میری داستانِ حیات" جو لالۂ طور میں درج ہے اس دور کی زندہ تصویر ہے۔ اس دور کا آخری حصہ تمام تر نالہ و شیون اور آہ و بکا پر مشتمل ہے جس میں اختر نے "بہار چھیننے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ" اور "رخصتِ دائمی" جیسی المیہ شاعری یادگار چھوڑی۔

اختر کا ہر شعر کسی نہ کسی سانحہ سے وابستہ ہے اور ان کی زندگی جن حالات و سوانح سے گزرتی گئی ان ہی کے سانچے میں ان کی شاعری بھی ڈھلتی گئی آخری دور ارمانوں کی پامالی پر مشتمل ہے اس عہد کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

شاداب ہو سکا نہ گلستانِ آرزو — کتنے ہی ابر بام پہ چھا کر چلے گئے

جنت بنائے گی دل کو ہماری داستاں برسوں — کرے گا یاد رو رو کر ہمیں سارا جہاں برسوں

بہت مشکل ہے [illegible] | [illegible]

قرار چھین لیا بے قرار چھوڑ گئے | بہار لے گئے یادِ بہار چھوڑ گئے
ہماری چشمِ حزیں کا خیال کچھ نہ کیا | وہ عمر بھر کے لیے اشکبار چھوڑ گئے
[illegible] سدا کی حسرت حزیں [illegible] | ہمیں وہ غمزدہ و دلفگار چھوڑ گئے
امید و شوق سے آباد تھا ہمارا دل | امید و شوق کی بستی اجاڑ چھوڑ گئے

اختر کو اپنی زندگی میں پانچ عظیم حادثات سے سابقہ پڑا۔ اپنے چھوٹے بھائی کی موت۔ بشیر کی خودکشی۔ والد کی وفات۔ اور سب سے آخر میں ان کے عزیز داماد نظیر الدین کی ٹونک میں موت۔ یاس کی [illegible] جس پر انہوں نے حسب ذیل قطعہ کہا۔

ہے غرقِ ظلمتِ یاس آسماں آج | سرِ عرش ہے نوحۂ بے کساں آج
صدائی بحرِ غم میں کیوں ڈوبتا ہے | [illegible] جواں آج

ان تمام حوادث پر گھر والوں کا عتاب۔ دوستوں کی [illegible] اور لاہور کی جدائی مستزاد تھی۔ یہ تھے اختر کے مصائب اور ان سب کا علاج آپ نے شراب تجویز کر رکھا تھا۔

تقسیم سے کچھ مدت پہلے اختر کے والد محترم حافظ محمود شیرانی یونیورسٹی کی ملازمت ختم کرکے اپنے وطن ٹونک مراجعت فرما ہوئے تو اختر بھی ان کے ساتھ تھے۔ لیکن وہاں پہنچ کر وہ لاہور کی یاد میں ہمیشہ بیقرار رہے۔ ہر خط جو ٹونک سے آتا اس میں لاہور کی جدائی کا مرثیہ ہوتا۔ وہ لاہور آنے کے لیے بے چین رہتے تھے اور اس اثناء میں جو خطوط انہوں نے دوستوں کو لکھے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لاہور ہی کی خاک میں دفن ہونا چاہتے تھے۔ لاہور آنے سے پہلے کئی بار ان کے مرنے کی خبر مشہور ہوئی۔ اس زمانے میں انہوں نے نگار کے غزل نمبر میں لکھا کہ

"ریاست ٹونک میں پیدا ہوا۔ لاہور میں پرورش پائی اور شاید یہیں کے اخبارات کو سب سے پہلے میرے انتقال کی خبر شائع کرنے کا موقع ملے گا۔"

مرنے سے چھ ماہ پیشتر ایک دن اچانک لاہور آگئے اور فرمانے لگے کہ بس اب میں لاہور ہی میں رہوں گا۔ میں نے نیر منزل کے نیچے کا کمرہ ان کے لئے کھلوا دیا۔ اور اس کے بعد وہ اسی میں باقاعدہ مقیم ہو گئے۔

اس بار بھی ان کے بسر اوقات کا عالم وہی تھا یعنی رات دن پینا۔ دن کو بالعموم غائب۔ آدھی رات کو آنا۔ خود جاگنا [illegible] جگانا کہ ع خاقانی زار گر شب آمد۔

اس اثناء میں کبھی ایسا بھی ہوتا کہ عالمِ نشہ و کیف میں باہر نکلتے اور بستی کے محلہ کی گلیوں کی خاک چھان کر واپس آجاتے۔ اس مرتبہ اختر مصائبِ حیات سے کچھ بہت زیادہ تھکے ہوئے معلوم ہوتے تھے اور اس قدر رقیق القلب ہو چکے تھے کہ اکثر بات بات پر رو دیتے۔ اور جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا اکثر بیوی بچوں کو یاد کرتے اور اپنی بے عنایتوں کا گلہ کرتے۔

پھر اس اثناء میں ایک خاص بات یہ دیکھنے میں آئی کہ اپنی تصویریں بہت زیادہ کھنچواتے اور سب میں تقسیم کرتے تھے۔ ایک دن کہنے لگے معلوم نہیں کیا ہونے والا ہے میں اس بار اپنی تصویریں بہت کھنچوا رہا ہوں۔

ان چیزوں کے علاوہ اس دور میں ایک خاص چیز یہ دیکھی گئی کہ آپ پر عشقِ رسول کا غلبہ معلوم ہوتا تھا چنانچہ اس زمانے میں آپ نے بہت سی نعتیں لکھیں جو آپ کے آخری مجموعۂ کلام شہرود میں درج ہیں۔

لگ بھگ اسی دوران سب سے بڑا ایک دن آپ پر دل کی کیفیت زیادہ طاری ہو گئی جس کے تیسرے ہی [illegible]

کر قبض شدید ہو گیا۔ جگر نے جواب دے دیا اور آنکھوں پر زردی چھا گئی۔ مجبوراً میں نے انہیں میو ہسپتال میں داخل کرایا۔ حالت چند

تو چند روز ٹھیک رہے۔ لیکن اچانک ایک دن طبیعت زیادہ بگڑ گئی ——— اور ۲۳ سال کی عمر میں ۹ ستمبر [illegible] کو موت

کہ آپ نے وقت سے پہلے زندگی کی دشوار گزار راہوں کا سفر ختم کر دیا ——— آہ

میں میکدے کی راہ سے ہو کر گزر گیا ورنہ سفر حیات کا بے حد طویل تھا

مرنے سے پہلے اختر کے ہونٹوں پر یہ مصرعہ تھا۔ ع ہو گئی بزم میکدہ خاموش ۔ شاعر نے یہ کہا اور بزم میکدہ خاموش ہو گئی

۱۰ ستمبر کی صبح کو آپ کا تابوت ہسپتال سے نیر منزل لایا گیا اور یہاں سے وہ تدفین کے لئے گورستان لے جایا جا رہا تھا کہ اقبال بخشنے

والی کو اختر یاد آ گیا۔ راستے میں ایک برقع پوش خاتون نے تابوت رکوا کر اس کا آخری دیدار کیا ——— اور اس کے بعد شبستان علم

و ادب کی یہ عظیم دولت گورستان میانی میں ہمیشہ کے لئے سپرد خاک کر دی گئی۔

ابو سعید بزمی

ادیبہ بزمی

طفیل صاحب آپ نے مجھ سے بزمی کی شخصیت کے متعلق لکھنے کی فرمائش کی ہے۔ بزمی کا نام میری زندگی کا سب سے اہم باب ہے لیکن حالات کی ستم ظریفی نے اس کتاب کو ہی بند کر دینے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس لیے میں نے بھی کبھی زندگی کے متعلق سب کچھ بھول جانے کی کوشش کی ہے۔ آج پانچ سال گزر جانے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی باتیں تو مجھے بھول بھی چکی ہیں۔ پھر بھی سوچتی ہوں کہ بہت سی باتیں ایسی ضرور ہیں جن کی یاد ابھی تازہ ہے اور اگر اپنے جذبات سے قطع نظر انہیں کہہ دوں تو شاید مفید بھی ہوں۔ اس سلسلے میں میری کوشش یہی ہے کہ بزمی کو بحیثیت انسان کے آپ کے سامنے پیش کر دوں لیکن میرے ذہن میں ان کی گھریلو زندگی کا کوئی پہلو اس طرح سے نہیں آتا کہ گھر سے باہر کی زندگی یا اس خاص قسم کی "ذہنی دنیا" سے ان کو الگ کر دوں جہاں کے وہ سب کچھ تھے اور جس کے لئے انہوں نے اپنے آپ کو بڑی ریاضت اور کوشش سے تیار کیا تھا۔

ان کی موت پر مجھے عربی کی یہ ضرب المثل یاد آتی ہے "ایک شخص تمام رات دعا مانگتا رہا کہ خدایا صبح کر دے اور جب صبح ہوئی تو اس کی بینائی زائل ہو گئی"۔

جب ارادے تکمیل کو نہ پہنچیں تو خواب پریشان ہو کر رہ جاتے ہیں۔ بزمی کے بے شمار پریشان خوابوں کے دھندلے نقوش میرے ذہن میں باقی ہیں جنہیں اندھیروں سے کھینچ کر لانے کی کوشش کی ہے۔ مگر ان کی ترتیب کچھ میں نہیں آتی اس لئے میں نے ان کی چند تصویروں کا سہارا لیا ہے کہ شاید یہ ذہن کی رہنمائی کر سکیں۔

لیجئے یہ تصویر بزمی کی وہ واحد تصویر ہے جو نہ جانے کس اتفاق سے میرے پاس موجود ہے۔ بندۂ خدا نے اس مختصر سی زندگی پر ایک ستم یہ بھی کیا کہ کبھی تصویر ہی نہ اتروائی۔ ایک دن ان کی میز کے کاغذوں کے انبار میں سے پاسپورٹ سائز کی تصویر کے یہ دو پرنٹ برآمد ہو گئے۔ میں بہت حیران ہوئی۔ مگر وہ بولے۔ "دیکھئے کتنا پریشان کر رکھا تھا تصویروں کے حساب کبھی مت کہئے گا کہ تصویر

نہیں کھنچواتے:

اور میں مزید حیران ہو کر رہ گئی کہ کس قدر بے تکلفی سے بھوپال کے دوستوں کی نہ کسی کا احسان [illegible] رکھ سکے ہیں۔ [illegible]
بھوپال سٹیٹ پیپلز کانفرنس Bhopal State Peoples Conference کے ممبروں کے مرکز کا تیرہ [illegible]
تھی کہ اس کانفرنس کے بانی اور وہاں کے عوام کے منظور نظر راہنما کی کم از کم تصویر ہی دفتر میں آویزاں ہو جائے۔ اور [illegible]
یہ اعتراض تھا کہ اب ان تصویریں اترواتا پھرے۔

پھر آخری سفر پر روانہ ہونے سے پیشتر کہنے لگے۔ جی چاہتا ہے کہ آپ کے ساتھ ایک تصویر کھنچواؤں کہ خدا جانے کیا ہو۔
مجھے عجیب سا رنج ہوا اور وہ تصویریں نہیں آئیں۔ اب جب میرا وہم حقیقت بن کر سامنے آ گیا تو میرے ہاتھ میں صرف یہی تصویر
رہ گئی۔ اس میں بڑی بڑی گہری آنکھیں اور دونوں ابروؤں کے درمیان دو چھوٹی چھوٹی لکیریں جو سوچتے وقت اور ملال میں ابھر آتی تھیں
دکھائی دے رہی ہیں۔ جبڑے کی ساخت اور دہانے سے قوت ارادی کی مضبوطی ظاہر ہے۔ چوڑی پیشانی اور چہرے پر وہی [illegible]
مزے دار لطیفے بیان کرتے اور زندگی سے بھرپور قہقہے لگاتے وقت پیدا ہو جایا کرتی تھی اور یہ بیچ حسب دستور داڑھی بڑھی ہوئی ہے
— شیو بنانے اور بال کٹوانے کا کام ان کے لئے بے حد مشکل تھا۔ ہمیشہ دفتر سے اٹھتے ہوئے دس بجے رات کو اگر کسی حجام
کی دکان اس وقت بھی کھلی رہ جاتی تو اس میں داخل ہو جاتے تھے اور وہ بھی دوستوں کی سرزنش سے تنگ آ کر۔ شاید کہ اسی خصوصیت کی
وجہ سے مولانا عبدالمجید سالک انہیں سرحدی کہہ کر پکارا کرتے تھے۔

نائی کی دوکان سے چھٹکارا پا کر وہ یوں گھر آتے جیسے ساری دنیا کے جھگڑے چکا کر آئے ہوں۔ ایک دن بہت زوردار قہقہوں کے
درمیان مجھے بتایا کہ کل جو میں بال بنوانے گیا تو شخص مذکور کہنے لگا کہ بال پرانے فیشن کے بنا دوں یا اس فیشن کے رہنے دوں۔ شاید یہ
کہ بڑے بال رکھنے کا فیشن ان دنوں نیا نیا شروع ہوا تھا جو نوعمر لڑکوں میں بہت مقبول تھا۔

شیو کی مصیبت سے نجات حاصل کرنے کا ایک نسخہ انہوں نے داڑھی نکلتے ہی معلوم کر لیا تھا وہ کہ شروع سے ہی داڑھی چھوڑ
دی جائے۔ مگر دوستوں کی دستبرد سے وہ بیچاری نہ بچ سکی۔ اس وقت سے مجبوراً شیو کرنے کی روایت شروع ہوئی۔

یہی حال لباس کے معاملے میں بھی تھا۔ عجیب بے نیازی کا عالم تمام عمر چھایا رہا۔ ان کی کھدر پوشی بھی کھدر کی سرپرستی کے ساتھ، لباس
کے مسئلہ کو بھی ایک ہی بار حل کر دیتا تھا۔ ایک دم کئی تھان کھدر کے اٹھا لائے اور کرتے، پاجامے، شیروانیاں اور ٹوپی سب تیار ہو گئی۔ بعد
میں درزی کو یہ اختیار مل گیا کہ جیسی تو اپنی مرضی سے کپڑے بنا دیا کرے۔ وہ ظالم ان کی ڈھیل سے دن بدن بے پروا ہوتا گیا اور سینے پرونے
کے فن کے تمام تجربات کی رو وہ جولانیاں دکھائیں کہ کیا کہیے۔ ایک دن جو گھٹنوں تک لمبی قمیص سی کر لایا تو میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو
گیا۔ اور میں نے کھدر کے وہ سب کپڑے اٹھا کر پھینک دئے۔

"بس آج سے کھدر ودر سب بند۔ آئندہ سے انسانوں کے لئے کپڑے بنیں گے"۔

"ارے بھئی جیسا اُسے آتا ہے اس بیچارے نے سی دیئے ہیں۔ آپ کا جی چاہے تو آپ ٹھیک کر دیجئے"۔ لیجئے یہی جواب مسئلہ
آ گیا۔ گویا جی نہ چاہے تو مت ٹھیک کرو یہاں ایسا ہی پہننے میں کیسے انکار ہے۔

پھر میں نے بڑے شوق سے عام رواج کے کپڑے تیار کروائے تو انہیں بھی انہوں نے اسی بے نیازی سے پہن لیا جیسے پچھلے
درزی کے سلے ہوئے ڈھیلے کرتوں کو۔ البتہ جدید وضع کے لباس میں اتنی ترمیم کر دی کہ کوٹ کے بجائے شیروانیاں سلوائیں۔
گنگا جمنا کے دوآبہ میں شیروانی وضع داری اور شرافت کی علامت سمجھی جاتی ہے اور جو لوگ یوپی کے قدیم خاندانوں کی [illegible]

سے ماتھی ہوشیں یا حیات کی تبدیلیاں اس شاں کے پاس ہوں یا نہیں مگر چال ڈھال، اُٹھنے بیٹھنے سے دروکی زندگی کے دور فرحت دیں سے ایک تکھ ٹیک دیتا ہو ایک صبر و سکون کی کیفیت موجود ہوتی ہے۔ وہ صبر و سکون جسے اکثر خصوصیات سے مال ہونا ہے۔ مگر سے پہلے تک ان بزرگوں کی خصوصیات تھیں جو ان کی زندگی میں اہم صفات، انجام دے گئے اور ہم ہی دوروں کے نقش سے ہو گئے۔ بزرگ کا خاندان بھی ایسے ہی بزرگوں کا خاندان ہے جن کے ان آبائی آداب سے پتا لگتا ہے، خاندانی تجربے سے جینا ہے۔ زمیں پر نقد سے قدم رکھنا ہوتا ہے۔ غرض یوں جینا کہ

سے مانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام   آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

بزرگی کا پنے اس ماحول سے بہت سی باتیں ورثے میں ملیں اور کچھ انہوں نے اپنا لیں، ان کی طبیعت میں ایک دلآویز قسم کی کیسانیت تھی ایک ٹھہراؤ تھا، شائستہ ہے کہ اس ٹھہراؤ اور تحمل کو بھوپال کے گھروں کی بیرونی سیاستیں اور ریاستی چپقلیں بھی متزلزل نہ کر سکیں۔

شدید سے شدید جذباتی موقع پر بھی وہ ایسے ہی پرسکون رہتے اور انتہائی غصے میں بھی آہستہ سے ایک آدھ جملہ کہہ دیتا چہرے کے آثار چڑھاؤ یا آنکھوں کی چمک کے سوا اور کسی طرح یہ پتہ چلانا مشکل ہوتا کہ یہ شستہ اور مہذب جملے کس جذبے کے تحت کہے گئے ہیں۔ بیشتر ان کے غصے کی حالت کچھ یوں ہوتی:-

"کیا گڑبڑ ہے یہ؟ کیوں اتنا شور مچا رکھا ہے؟" — وہ بغیر کاغذ پر سے نظریں اٹھائے لکھتے لکھتے اور کے جملے... بہرحال کسی نہ کسی وقت تو کوئی ہنگامہ ہوتا ہی ہے۔ اور مجھے اکثر کسی وجہ سے ان کے لکھنے میں مخل ہونا پڑتا۔

ان کا اعتراض سن کر میں بھی جھلا جاتی۔ "جی ہاں ٹھیک ہے بے خبری میں ہر بات ہی ہنگامہ معلوم ہوتی ہے۔"

اس کا جواب عموماً یہ ہوتا کہ اپنا کاغذوں کا پشتارہ اٹھایا اور کسی دوسرے کمرے میں گھس کے کھٹ سے دروازہ بند —

ابھی ان کی بے نیازی پر میری طبیعت کا تکدر باقی ہوتا کہ وہ بچوں کی سی معصومیت کے ساتھ اپنا تازہ شاہکار سنانے آموجود ہوتے۔ ایک مضمون نگار اپنے مضمون کی تکمیل پر جس طرح خوشی کا مجسمہ بن جاتا ہے اور مسرت کی جو دکشی اس میں نظر آتی ہے اس کا ساتھ نہ دینا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس لئے مجھے اپنی ناراضگی جلدی ختم کر دینی پڑتی۔

تاہم ایسی لڑائی کے موقع بھی ہمارے اس ساتھ سالہ زندگی میں بہت کم آئے کیونکہ بزرگی کو ان باتوں سے کوئی دلچسپی ہی نہ تھی جن پر عام طور سے گھروں میں فساد برپا ہوتا ہے۔ گھر میں کیا ہو رہا ہے؟ کھانا کیا پکتا ہے؟ خرچ کس طرح ہوتا ہے؟ کون نیا ملازم رکھا جاتا ہے؟ انہیں کچھ غرض نہ تھی۔

انہیں تو یہ مسرت ہی کافی تھی کہ گھر کی بدولت انہیں زندگی کا سکون و اطمینان تو میسر ہے —— کیا یہ خوشی ان کے لئے کافی نہیں تھی کہ وہ جس وقت چاہیں کتابیں پڑھ سکتے ہیں۔ اور انہیں مطالعہ کے لئے بھوپال کے قدیم کھنڈرات اور ویران سڑکوں پر تو پناہ نہیں لینی پڑتی کہ وہ والد کی سخت گیری کی زد میں نہ آسکیں۔ ان کو اپنے بچپن کے بے شمار دکھ یاد تھے اس وقت کے جب زبان کو اظہار پر قدرت نہ تھی مگر دل دکھی احساسات کا خزانہ ہو گیا تھا۔ بچپن میں انہیں پرندوں سے بہت محبت تھی مگر وہاں گھر میں پرندے کہاں جہاں سوتیلی ماں کے نخروں کا راج ہو۔

ایک کتاب کہیں سے ہاتھ لگ گئی تھی جس میں پرندوں کی تصویریں تھیں تو ندے اور سہمے ہوئے ابو سعید نے جو اس وقت بزرگی نہ بنا تھا گھر کے کونوں کھدروں میں الماریوں کے پیچھے اور جہازی چھپرکھٹ کے نیچے اندھیروں میں چھپ چھپ کر ویسے ہی تصویریں بنانے کی مشق شروع کر دی اور ایک ایک تصویر نقل کر کے چھپا دی۔ لیکن پھر والد صاحب کو پتہ چل گیا کہ گھر میں شرع کی رو سے کوئی تصویر رکھنا حرام تھا

اس نے اس احساس کی شکل دونوں کو تنہا آنگن کر دیا گیا - بزمی کو یہ ساغر بڑی جذباتی تفصیلوں کے ساتھ یاد تھا۔ اس نے ... خوشی کا باعث تھا کہ اب کے اپنے بنائے ہوئے گھر میں بچے اپنی مرضی سے کتابیں پڑھ سکیں گے۔ کھیل کھیل سکیں گے اور ... سکیں گے اور یہاں وہ اپنے سارے تشنہ ارمان پورے کر سکیں گے۔

اپنی عدیم الفرصت زندگی میں بھی وہ جب اپنے چار پانچ سالہ بیٹے کو سلیٹ پر کیل کانٹے بناتے دیکھتے تو اس کے پاس ... کہتے چڑیا بنائیں! کیا بناتے ہیں؟ کبوتر بنائیں! کبوتر!"

پھر بڑے انہماک سے کبوتر بنایا جاتا اور دونوں باپ بیٹے بے انتہا خوش ہوتے۔ شاید اپنی کامیاب تصویر سے زیادہ اپنے بچپن کی تمنا کو پورا کرنے پر خوشی ہوتی تھی۔

پھر یہیں تک بس نہ تھا۔ ایک دن دس پندرہ شیرازی کبوتر اٹھائے چلے آ رہے ہیں۔

"ارے یہ کیا تماشہ ہے؟"

"ہوں تماشہ کہہ دیا بڑی مشکل سے خرید کر لایا ہوں۔"

"بلی جو کھا جائے گی؟"

"نہیں کھائے گی ہم خود دانہ پانی ڈالا کریں گے۔ ہم تو بچوں کے لئے لائے ہیں۔"

آخر بڑے اہتمام سے کونڈی منگوائی گئی اور چنبل کا دانہ بچے سارا دن ڈالا کرتے رہتے اور کبوتروں میں گھسے رہتے۔ ادھر میں سے گذرتے ہوئے وہ اس خوبصورت منظر کو ایسی محبت سے دیکھتے جیسے کبوتروں کے سڈول اور پاکیزہ وجود میں ان کے آئیڈیل کا کوئی اہم راز چھپا ہوا ہو۔

بزمی کو مطالعہ کا بچپن سے شوق تھا - پانچ سال کی عمر میں والدہ کے انتقال کے بعد سے چودہ پندرہ سال تک کا عرصہ جو انہوں نے اپنے نانا کی حویلی میں گزارا تھا۔ مطالعہ کے یادگار دن تھے۔ ان کے نانا مولوی سراج الحق صاحب بھوپال میں قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز تھے اور ایک وسیع کتب خانہ کے مالک تھے۔ انہوں نے بڑے شوق سے بزمی کو فارسی اور عربی پڑھائی کیونکہ ان کے کھینچے ہوئے زائچے کے مطابق یہ لڑکا بڑی علمی صلاحیتوں کا مالک بننے والا تھا۔ اس پر اسرار قدیم حویلی کے حجروں میں جہاں زندگی بہت احتیاط اور سنجیدگی کے ساتھ چلتی تھی دونوں نانا نواسے ان خزانوں کو پیدا کرنے میں کے جواہرات جن کی مٹی کے مول ہو رہے تھے۔

پھر جب نانا کے انتقال کے بعد اس حویلی کا سکون بھی منتشر ہو گیا اور اس کی بنیادیں لرز لرز کر بجھنے لگیں تو بزمی نے عام گردش کی ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی کو اپنا لیا کیونکہ نانا کے وارثوں کے لئے ان علمی خزانوں اور تاریک حجروں سے زیادہ اہم چیزیں موجود تھیں۔

انہوں نے ایک بار مجھے بتایا "میں حجرے کے دروازے میں لیٹ کر کتابیں پڑھا کرتا تھا کیونکہ اس کے آگے ایک اور حجرہ تھا اور اس میں سے ہو کر ذرا سی روشنی میرے حجرے کے دروازے تک آیا کرتی تھی۔"

آخر وہ حویلی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اور وہ کتابیں بک کر رہیں تو بھوپال کے کھنڈرات نے اپنی آغوش کھول دی جن سے رفاقت کی مدت غالباً نو دس سال رہی - یہیں سے بزمی نے بھوپال کے مقامی اخبارات کے لئے مضمون لکھنے شروع کئے جس کی اشاعت والد کی سخت ناراضی کا باعث بنی اور یہیں سے منشی فاضل کے امتحان کی تیاری ہوئی جس کے لئے اس بنا پر جھڑکیاں دی گئیں کہ اتنی چھوٹی عمر میں چلا ہے امتحان دینے۔

بے چارے والد چند ہی سال بعد اس لڑکے کو جسے وہ منشی فاضل کے امتحان کے نا قابل سمجھتے تھے - دو بھائیوں اور ایک ماں کا سہارا

بلا جھجکے سے بھی کی طرح ان کی ملازمت کا تجربہ شروع ہوگیا۔ میٹرک کی سند سے لے کر پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری تک کے سب مرحلے اسی طرح طے ہوئے۔

اخبار نویسی سے تعلق کے دوران، چوبیس سال کی عمر سے تیس سال کی عمر تک، جب میرا ان سے واسطہ ہوا وہ اگرچہ صحافتی لحاظ سے آسودہ حال تھے لیکن ایک مفلس ہی تھا، کیونکہ آمدنی سے بیشتر حصہ ہر ماہ کتابیں خریدنے یا انسائیکلوپیڈیا کی قسطوں کے چندے دینے میں چلے جاتے تھے۔ ان کے بالائی حصے گھر میں ہر طرف کتابیں ہی کتابیں نظر آتی تھیں۔ غالب و اقبال کے کلام سے لے کر فرائیڈ کی ضخیم جلدوں تک، فرانس کے مشہور افسانوں سے لے کر معاشیات کی مشکل ترین کتابوں تک، قرآن و بائیبل کے مقدس نسخوں سے لے کر کارل مارکس کی کیپٹل Capital تک کے مجموعے ان کے پاس موجود تھے۔

انہی کتابوں میں وہ کمپیکٹ آکسفورڈ ڈکشنری بھی تھی جسے وہ اپنی دوائی عمر کی طرح ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ بلکہ خالی اوقات میں پرانی پرانی فائلیں پڑھنے میں مدد دو۔ اور یہ میرے خیال میں ان کی شگفتگی تھی۔ کیونکہ جس وقت بھی ان کے لئے ڈکشنری طلب ہوا کرتا تھا۔ اور ان کے انتقال کے بعد جب امریکہ سے ان کا سامان آیا تو دوسری اشیاء تو ہمیشہ کی طرح سے غائب ہو چکی تھیں البتہ ان کی پسندیدہ کتابیں ضرور مل گئیں جن میں نہ تصویریں تھیں اور نہ حسینوں کے خطوط تھے اسی لئے محفوظ رہ گئیں تھیں شاید!

ان کا کتابیں رکھنے کا طریقہ بھی کچھ نیا ہی تھا۔ کچھ کھُلی، کچھ ادھ کھُلی، کچھ کے بیچ میں کاغذ ٹھُنسے ہوئے اور بعض ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوتی ہوئی۔ ایک میدانِ حشر تھا جس کے لئے عام طور پر کسی چیز کو منتشر سمجھ کر ایک بہت بڑی میز لگی تھی، انہیں سب سے بڑا فائدہ یہ نظر آتا تھا کہ ہر چیز ڈھونڈنے سے ہی مل جاتی تھی۔ اور ڈھونڈنے میں وقت ضائع نہیں ہوتا تھا۔ ان کا قول تھا "جو لوگ کتابیں سجا سجا کر رکھتے ہیں وہ اسے پڑھتے نہیں۔" بعد میں جب تمام کتابیں الماریوں میں سجا دی گئیں تو ہمیں شک پیدا ہوگیا کہ ان کی تمام چیزیں ہم نے کھو دی ہیں۔ اس لئے ان کی ضرورت کی کتابیں مجھے بھی ہمیشہ ڈھونڈنا ہی پڑتی تھیں۔

لیکن اخبار کے سلسلے میں معاملہ برعکس تھا۔ اگر کوئی ان سے پہلے اخبار دیکھ کر اس کے صفحات آگے پیچھے کر دیتا تو ان کا یہ جملہ ضرور سنائی دیتا: "تمام اخبار باسی کر دیا ہے کسی نے۔ ساری ترتیب خراب ہو گئی!" پتہ چلتا کہ اس بات پر بہت ناراض ہیں۔

خوشبودار لطیف قسم کی چائے پی کر دھیمے دھیمے انداز میں باتیں کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس وقت سیاست سے لے کر پنجابی زندگی کے آئندہ پروگراموں پر غور ہوتا۔ ابوالکلام کی شخصیت ان کو بہت محبوب تھی اس لئے وہ اکثر ان کے بارے میں گفتگو کرتے رہتے۔ اس کے علاوہ غدر کے دور میں انگریزی استبداد سے ٹکر لینے والے مجاہدوں کی داستانیں اور ان تمام بہادروں کے کارنامے جو غدر کے بعد سے آزادی کے وقت تک انگریز کے مظالم سے ٹکرا کر اپنی جان پر کھیل گئے تھے ایسے انفرادیت سے محب وطن لوگوں کی داستانیں انہیں ازبر تھیں۔

انہیں غدر کی سو سالہ برسی منانے کی بڑی تمنا تھی۔

"مجھے ۱۹۵۷ء کا بڑا انتظار ہے" ـــ وہ بڑی دلسوزی سے کہتے۔

"ہم غدر کی سو سالہ برسی بڑے دھوم سے منائیں گے!"

اب جیسے جیسے ۱۹۵۷ء قریب آتا جاتا ہے مجھے ان کے جملے بار بار یاد آتے ہیں۔

کیونکہ انیس سو ستاون میں تو خود ان کی چپ چاپ گزرنے والی برسی کو بھی سال بیت چکے ہوں گے۔

"وہ کوئی انسان تھا؟ بلیّات، تھا پورا بلیّات!"

"بلیّات" کا لفظ ان کی لغت میں بہت وسیع مفہوم رکھتا تھا۔ غصّہ ہو تو "بلیّات"۔ پسند ہو تو "بلیّات" کوئی زیب

بن جائے تو کیفیات۔ اگر احترام و عقیدت منفرد ہو تو گویا بیعت ہی "کیفیات"۔ ان بہت سی کیفیات "فلسفے کے ... کے ذہن کا بہت بڑا حصہ گھیر رکھا تھا۔ جو لوگ کچھ بھی نہ ہوتے ان میں بھی عظمت کے پہلو ڈھونڈ لیتے تھے۔ وہ مگر ان کی ... تھا سے یہ نہیں سا آدمی بہت عام تھا مگر وہ تو "کیفیات" کا قائل ہو گیا۔

ایک دن ایک فادری کا تذکرہ سنا رہے تھے جو کہیں اتفاق سے کانگریس کی سیاسی تحریک کے سلسلے میں دس پندرہ دن جیل میں کاٹ آئے تھے اور اسے اپنی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھتے تھے۔ کہ میں نے ان کی بات کا رُخ بدل دیا۔

مجھے معلوم تھا کہ سرپال جیل کی جن کوٹھڑیوں میں بزمی نے ڈھائی سال رہ کر اپنی صحت برباد کی وہ کلکتہ کے بلیک ہول سے بدتر تھیں وہاں سانپ، بچھو اور حشرات الارض قیدیوں کی ہم نشینی کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ریاستی جیلوں میں کسی وجہ کا ذکر سال بھر پیدا نہ ہوتا تھا۔ وہی عام قیدیوں کی بارکیں جہاں نہ روشنی تھی نہ کھلی ہوا اور گرمیوں کی رات کو جب تپتی ہوئی پتھر کی کوٹھڑیوں میں ان قیدیوں کو بند کر دیا جاتا تھا۔ یہ وہی لوگ تھے جو عوام کے لئے روٹی، کپڑا، اسکول اور اسپتال مانگتے تھے۔

میں نے کہا بزمی "یہ ٹھیک ہے کہ دنیا میں بہت سے عظیم انسان ہیں، بہت سے جو ذلیل ہیں مگر آپ بھی . . .

"ہم نے کیا ہی کیا ہے۔" بزمی نے تاسف کے انداز میں جواب دیا۔

رشید جہاں

صدیقہ بیگم سیوہاروی

رشید آپا!

یہ بات ہوگی اب سے کوئی تیرہ سال پہلے کی۔ میں علی گڑھ میں امیر نشاں میں رہتی تھی۔ وہ مجھ سے ملنے آئی ہوئیں مشکل سے چند منٹ ہوئے ہوں گے کہ دیکھتی کیا ہوں کہ بوٹے سے قد کی ایک خاتون چلی آ رہی ہیں۔ جان نہ پہچان بڑی خالہ سلام ——— موصوف کی یہ بات مجھے پسند ہے کہ گھر میں مردانے میں بھی داخل ہوں گے تو دستک ضرور دیں گے۔ لیکن یہ خاتون چلی آئیں بغیر پوچھے ——— برسات کی جھڑی لگی ہوئی تھی میں دوپٹہ تہ کیے اطمینان سے پھر رہی تھی۔ میں کیا جانتی تھی کہ اس بھری دوپہری کوئی آ جائے گا اور پھر آنے والا بھی ایسا کہ قمیص کے گلے میں سے ہاتھ ڈال کر کھا جائے جا رہا ہو۔ گھبر گھبر ——— مجھے اپنے بدن میں کھجلی سی محسوس ہونے لگی۔ انگلی بیلا کہیں سے یہاں کھجانے لگی۔ میں وہیں بیٹھی کھجلاتی تھی، یہ رنگ ڈھنگ دیکھ آئے حواس جاتے رہے۔ کبھی تو کیا کہتی اور بیٹھا ہی کہ میرے سلام کا جواب دیئے بغیر کرے میں گھس چلی آ رہی ہیں۔ بڑی بیزاری اپنے گھر میں مہمان بنی جا رہی تھی۔ بس میں سوچتی رہی کہ یہ اللہ ماری کون آ گئی۔ اس وقت اس کی اچھی بھلی صورت بھی تو مجھے زہر لگ رہی تھی۔ بھلا گریبان بھی کوئی چیز ایسی گھسی ہے اور پھر ایسے چھپاتے مرتے ہیں۔

لیکن چند سیکنڈ کے اندر جیسے زمین میرے پاؤں کے نیچے سے کھسک گئی۔ مجھے اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہا۔

"تم صدیقہ ہو؟ مجھے رشید جہاں کہتے ہیں۔"

"ڈاکٹر رشید جہاں !!!" میرے منہ سے بلا سوچے سمجھے نکل گیا۔

"کیوں کیا رشید جہاں کافی نہیں ہے" ——— انہوں نے بڑے پیار سے کہا جیسے کسی بچے کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہی ہوں۔ پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تو مجھے اپنے دوپٹے کا خیال آیا۔ نفسیات کی ماہر بھی تو تھیں سمجھ گئیں۔ "اوہ! اپنے گھر میں سب ایسے ہی رہتے ہیں۔" لیکن مجھے اطمینان نہیں ہو رہا تھا۔ میں تڑپ کر اٹھی اور دوپٹہ ڈال کر آ گئی۔ اب کہیں میرے ہوش و حواس ٹھکانے لگے۔

تھوڑی دیر میں بے تکلفی سے باتیں شروع ہو گئیں۔ ساری دنیا جہان کی باتیں۔ وہ بڑی کامیاب ڈاکٹر تھیں۔ کیا ہی مریض ہوتے کے سامنے گرماوی باتیں آگی ہے۔

اس روز دو تین گھنٹے میں مجھے محسوس ہوا جیسے میں انہیں بچپن سے جانتی ہوں اور سچ پوچھئے تو اس ملاقات کے بعد کئی اور ملاقاتیں ہوئیں مگر بھی ہوتی تو یہ دو تین گھنٹے ان کو سمجھنے کے لئے کافی تھے۔

ہمارا ملازم باہر گیا ہوا تھا اور وہ چائے بنانے کے لئے مجھے اٹھنے نہیں دے رہی تھیں۔ آخر معاملہ اس پر طے ہوا کہ میں کچن میں ساتھ آؤں اور وہیں چائے بنے۔ اور وہ چائے بنانے میں میرا ہاتھ بٹائیں۔ مگر چائے کے برتن ملتے الٹے وہ بھی تو ڈھونڈتے ہوئے نہ ملتے میں ادھر ادھر ہو گئی۔ آگئیں چائے بنانے۔ میں نے بھی سوچا جہاں کھو بیٹھیں واں سوا ہی۔ اس لئے وہ ماننے والی کہاں تھیں۔ ضد کر جو بیٹھیں۔ جس بات پر اڑ جاتی تھیں بس اڑیل ٹٹو کی طرح اڑی ہی تو رہتیں (کم از کم میرا تجربہ تو یہی ہے۔ جب بھی ملی ہوں۔ میں نے انہیں کسی کے سامنے قائل ہوتے نہیں دیکھا)۔

اب اسی ملاقات میں سنیے۔ ایک ناول نگار خاتون ہیں۔ بھلا سا نام ہے ان کا۔ ہاں اے۔ آر۔ خاتون۔ اے۔ آر۔ خاتون کے ناول "شمع" کا علی گڑھ میں بڑا زور تھا۔ لڑکیاں برقعوں میں چھپ چھپ کر پڑھتی تھیں۔ جیسے دیکھئے اسی پر دیکھا جا رہا ہے۔ اس سے پہلے سنا ہے کہ نیاز فتح پوری کے ناول "انور" اور "شمیمہ" بھی اسی طرح مقبول تھے اور پھر علی گڑھ کی لڑکیاں ــــ وہ بھلا کہیں ایک دو بار کسی چیز کو پڑھ کر اپنی تسلی کر لیتی ہیں۔ وہ تو بس پڑھتے ہی چلی جاتی ہیں۔ گویا حفظ کرنے کا ارادہ ہو۔ ہاں تو علی گڑھ میں ان دنوں "شمع" کا زور تھا اور میرے تو اس پسندیدہ ہیں روز کے اندر ہی اندر سنتے سنتے کان پک گئے تھے۔ کیونکہ میں نے بھی اسے پڑھا تھا اور مجھے تو بڑی مایوسی ہوئی تھی۔ جیسے کھودا پہاڑ اور اس میں سے نکلی مری ہوئی چوہیا اور اس ناول کے بعد سے مجھے علی گڑھ کی لڑکیوں کے ناول پڑھنے کے ذوق اور ان کی پسند پر سے اعتماد اٹھ گیا۔

ہاں تو مجھے یہ ناول ذرا بھی پسند نہ آیا۔ لیکن دنیا میں کیا نہیں ہوتا۔ اب کیا سنتی ہوں کہ ڈاکٹر رشید جہاں جو ترقی پسند تحریک کی بانیوں میں ہیں اس ناول کی شان میں "قصیدہ" پڑھ رہی ہیں۔ میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور آج تک میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ وہ رشید جہاں جنہوں نے نہ جانے انگریزی، فرانسیسی، روسی اور دوسری زبانوں کے کتنے اچھے اچھے ناول پڑھے تھے وہ اس ناول سے اتنا متاثر کیوں تھیں۔ میں تو بس ششدر تھی۔ انگلی دانت کے تلے دبائے بیٹھی میں نے بحث کرنی چاہی مگر اللہ کا نام لو۔ "وہ بھلا کسی کی بات مانتی ہیں"۔ اس لئے کہ وہ تو شاید ملنے جا کر مصنفہ کو اس عظیم کارنامے پر مبارکباد بھی دے آئی تھیں۔ اب انہوں نے اس عظیم ناول کی عظمت پر لیکچر دینا شروع کر دیا اور یہ ڈاکٹر رشید جہاں کی شخصیت کا اعجاز تھا کہ میں نے اس ناول کو دوبارہ پڑھا۔ مگر پھر بھی مجھے اس میں اچھے ناول کی کوئی بات نظر نہ آئی۔ لیکن وہ جب بھی ملیں نہ ان کی محبت اور خلوص میں کوئی فرق آیا اور نہ اے۔ آر۔ خاتون کے ناول کی قصیدہ خوانی میں۔

میں ابھی تک ان کا پورا نام لے رہی ہوں۔ یہ نام پڑھنے والوں کو نامانوس لگے گا۔ اس لئے کہ وہ تو جگت کی رشید آپا تھیں۔ لیکن ابھی تک میری سمجھ میں نہ آیا تھا کہ انہیں کیا کہوں۔ شوکت تھانوی کی "شیش محل" اس وقت تک نہیں آئی تھی اور اگر چھپ گئی تھی تو میں نے نہیں پڑھی تھی ورنہ یہ مسئلہ آپ ہی آپ حل ہو جاتا۔ کیونکہ بقول شوکت انہیں سب ہی رشید آپا کہتے تھے سوائے ان کے جو کسی مجبوری کی بنا پر نہ کہہ سکتے ہوں لیکن رشید آپا سے دوستی کے بعد مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ تو ان بھی جا بتا ہو گا۔ اتنے پیارے انسان کا نام لیکر کون پکارے گا۔ اگر صاحبزادہ محمود الظفر بھی جانتے تو میں ضرور پوچھ لیتی۔

ہاں تو دوسرے روز بعد میں رشید آپا کی کوٹھی پر گئی۔ رشید آپا باہر ٹہل رہی تھیں مردانہ وار۔ (میں اس زمانے میں پردہ کرتی تھی) مجھے دیکھ کر خوش ہو گئیں جیسے میرا انتظار ہی تو کر رہی تھیں۔

"اچھا لائیے آئیں:

میں نے کہا: آپ سے جلد ہو جاتا:

رشیدہ آپا شکر ہے۔ "اچھا آؤ تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔ میں بھی تیار بیٹھی ہوں" اور پھر رشیدہ آپا نے اپنی باتیں شروع کر دیں۔ اس عرصہ میں مجھے حیرت ہوتی رہی وہ یہ کہ انہیں کیا کہوں یہ میری کمزوری ہے کہ خدا کی شان حسن کو صاحب ہی کہتی ہوں چاہے میں نے شکل کیوں نہ دیکھی ہو لیکن مشتاق صاحب کی اولاد کو بہلانے والا نہیں۔ رشیدہ آپا کہہ رہی تھیں۔ بس مرتی نہ تو کیا کرتی۔ تب سے ہی جتنیاں نکال دیئے۔ معاملہ میں اگر انہیں بھائی کہتی تو شاید پہلی اور آخری "بھائی" کہنے والی ہوتی۔

ان کے اس بعد پھر حسب دستور رشیدہ آپا نے لمبی چوڑی باتیں شروع کر دیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ میں نے نماز کی پابندی کے ہی یہ نہ سمجھا کہ رشیدہ آپا اتنی پڑھی لکھی ہیں۔ علی گڑھ کے گرلز کالج سے بی۔ اے کیا ہے۔ ہندو بزرگوں جیسی اصطلاحیں بھی ہیں۔ سب لکھے تو وہ اپنے جیسی نظر آتیں۔

رشیدہ آپا ابھی نہ جانے کتنی دیر باتیں کرتیں وہ تو بھلا ہو کسی نے دستک دے دی۔ رشیدہ آپا نے نہیں مڑ کر دیکھا ہی مسکرا کر کہنے لگیں کہ "رہنے دو یہ طالب علم نہیں ہے۔ اس سے پردہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

میں بھی تن کر بیٹھ گئی۔ جیسے واقعی طالب علم ہی سے پردہ کرنے کی ضرورت ہو۔ میں آدمی ہی جب نماز کے بعد لوگوں سے ملتی ہوں تو مجھے ہر منٹ ہنسی آتی ہے۔ لیکن بات سنجیدہ تھی۔ کوئی کام پڑ گیا تھا۔ رشیدہ آپا دروازے پر دیکھنے گئیں تھیں۔ رشیدہ آپا نے مجھ سے کہا "چلو چلو ابھی ہے چلے چلیں تمہیں بھی کراتے ہیں۔ ابھی بات کی بات میں آ کے جاتے ہیں۔ تمہیں ہمارے ساتھ ہو لینا چاہیے۔"

ہم لوگ چلتے چلے جا رہے تھے اور راستہ تھا کہ کھینچتا چلا جا رہا تھا — عجیب و غریب راستے تھے، رستے تنگ گلی کوچے۔ میں نے اس سے پہلے ایسی گلیاں کاہے کو دیکھی تھیں اور رشیدہ آپا جیسے ان رستوں پر مدت سے چلتی آئی ہیں۔ رشیدہ آپا تو ساری مشکل کا احساس ہو گیا۔ اس لئے کہ انہوں نے باتیں شروع کر دیں۔ میں سمجھ گئی کہ مجھے کھونے دے کر بہلا رہی ہیں۔ میں بھی خاموشی سے ان کی سنتی رہی۔ پھر انہوں نے جاگیرداری نظام پر باتیں شروع کر دیں تو میں پھر ہوش سے مس نہ ہوئی۔ وہ سمجھ گئیں کہ ضرورت ہے موضوع بدل کر کہیں "تمہیں رسالہ کیسا لگا ہے۔" (اس زمانے میں میں ایک زنانہ رسالہ "دنیا" کی ادارت کر رہی تھی۔)

میں نے کہا: "بس یونہی سا۔"

اس وقت اگر میں چاہتی تو بڑے مزے میں رشیدہ آپا سے ایک کہانی کا وعدہ لے لیتی لیکن میں چپ رہی تھی۔

رشیدہ آپا بولیں "لیجئے! ہم آ گئے۔" اب ہم ایک تنگ و تاریک راستے سے گزر رہے تھے۔ بڑے گندے کچے مکان نظر آ رہے تھے پھر رشیدہ آپا نے اطمینان سے کہا "بس ان ہی میں سے کوئی مکان ہوگا۔ بھلا یہاں کوئی تندرست رہ سکتا ہے۔ یہاں تو بیماریوں کے جراثیم پلتے ہیں اور ہم ان بیماریوں کا علاج کرتے ہیں۔ کیوں صدیقہ غالی سنت ہے یا نہیں؟"

اور میں اس وقت ان کے تیور دیکھ کر بے حد سنجیدہ ہو گئی تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کہا "جی ہاں" اور میں نے جھک کر کہا لیکن پھر مڑ کر دیکھا کہ کہیں کسی کامریڈ نے تو نہیں سنا اور پھر اطمینان کا سانس لیا۔ کیا ہی اگر کوئی اس وقت سن لیتا تو ہنس پڑتا لیکن میں کہتی ہوں کہ اگر اس وقت فراق گورکھپوری یا مجاز مرحوم بھی ہوتے تو ان کی زبان سے بھی یہی نکلتا کہ "جی ہاں" ———

رشیدہ آپا بڑبڑاتی چلی جا رہی تھیں۔ اب ہم مکان در مکان گھستے چلے گئے آخر ایک اندھیری سی کوٹھری میں پہنچے جہاں ایک بیمار کے کراہنے کی آواز آ رہی تھی۔ رشیدہ آپا نے سرہانے جا کر اس کا ٹمپریچر لیا۔ "افوہ ۱۰۳ ڈگری بخار ہے۔ کیوں جی اس کو کب سے بخار آ رہا ہے؟"

"ابھی کئی روز سے۔" اس کامریڈ نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"اور تم کہاں ٹھہری ہو۔ وہ جانتے اور شہر جانتے۔ کس کا انتظار کر رہے تھے؟"

رشیدہ آپا کو غصہ آ رہا تھا اور وہ خاموش تھا۔ پھر انہوں نے مریض کا باقاعدہ معائنہ کیا اور معائنے کے سلسلے میں وہ بہت جانفشانی سے پھر رشیدہ آپا نے ایک نسخہ لکھ کر اس کے حوالے کیا اور بولیں۔

"دیکھو! دودھ کے سوا اور کچھ مت دینا اور ان سنگتروں کا عرق ضرور پلاؤ۔"

کامریڈ نے نسخہ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پھر رشیدہ آپا کو ذرا ایک طرف لے جا کر ڈرتے ڈرتے بولا "آپ نے نسخہ تو لکھ دیا مگر دوا کہاں سے آئے گی؟ یہاں تو پھوٹی کوڑی پاس نہیں۔ پیسے ہوتے تو کسی ڈاکٹر کو ——" وہ کہتے کہتے رک گیا۔

میں سہم گئی۔ رشیدہ آپا کے تیور پہلے ہی سے کیا کم بگڑے ہوئے تھے اور رشیدہ آپا کیا کرتیں اور ڈاکٹر بھی ہوتی تو کسی کو اس کے نسخے کا پتا نہ جانے کتنا اور چڑھ جاتا —— لیکن رشیدہ آپا —— جیسے کسی نے آگ پر پانی چھڑک دیا ہو اور ان کے چہرے سے جیسے کسی نے سارا غصہ سوت لیا ہو۔ انہوں نے آہستہ سے کہا "چلو میرے ساتھ چلو —— اب ہم تینوں چل پڑے۔ بہت دور تک خاموش چلتی رہیں پھر بولیں "بہت حقیر ہو گئیں۔ "کیوں صدیقہ! یہ حالات اپنے آپ بدل جائیں گے یا ان کو بدلنا پڑے گا۔"

آپ بتائیے اس کا کیا جواب ہوگا۔ اور میں جانتی ہوں کہ راجہ صاحب محمود آباد بھی ہوتے تو وہ بھی وہی جواب دیتے۔ جو رشیدہ آپا کے دل میں تھا اور میری زبان پر۔"

ترقی پسندی کا یہ پہلا سبق تھا جو رشیدہ آپا نے مجھے پڑھایا۔ میرس روڈ کی سڑک پر چلتے ہوئے۔

"صحت اور اس مریض میں زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ شاید اتنا بھی نہیں جتنا کہ مجھ میں اور تم میں ہے۔" رشیدہ آپا نہ جانے کیا کیا کہہ گئیں۔ میں اور میں یہی سوچتی رہی کہ واقعی ان حالات کو بدلنا ہوگا۔ یہ اپنے آپ نہیں بدلیں گے۔

میں ابھی وہیں تھی اور رشیدہ آپا آگے بڑھ گئی تھیں۔ "بیچارہ اندھیرے میں پڑا کراہ رہا ہے۔ اندھیرے میں ہے لیکن اس اندھیرے کو اندھیرا کہنا بھی تو جرم ہے۔"

میں ان کی باتیں سنتی رہی۔ پھر اُن کی کوٹھی آگئی۔ رشیدہ آپا اندر جا کر دس روپے کا ایک نوٹ لائیں اور اس آدمی کو دے کر بولیں "دوا فوراً دوا لا کر پلاؤ۔ سنگترے بھی لیتے آنا۔ کل مجھے حال بتانا یا میں خود آکر دیکھ لوں گی تمہارے آنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

اب رشیدہ آپا سے میری خوب دوستی ہو گئی لیکن اگر دوستی نہ بھی ہوتی تو اس میں فرق ہی کیا پڑتا اس لئے کہ پہلے ہی روز وہ مجھ سے اس طرح ملیں کہ غیریت کے سارے پردے اٹھ گئے تھے میں اپنے آپ پر کئی روز ناز کرتی رہی۔ رشیدہ آپا مجھ سے بے تکلفی سے باتیں کرتی ہیں۔ مجھے اپنی بہن کی طرح سمجھتی ہیں۔ مجھے کتنی اچھی اچھی باتیں بتاتی ہیں —— لیکن یہ ایک فریب تھا جو بہت دن نہ چل سکا۔ اور میں اس خود فریبی میں زیادہ مبتلا نہ رہ سکی۔ اس لئے کہ وہ تو ہر ایک سے اسی بے تکلفی سے ملتی تھیں۔ میرے ساتھ کوئی خصوصیت تھوڑا ہی تھی۔ وہ ہر ایک سے ہی تو اسی محبت اور خلوص سے ملتی تھیں۔

"واہ بھی تم ابھی تک بی اے میں ہو۔ میں تو جب تم سے بھی چھوٹی تھی یہی اب کوئی پندرہ سولہ سال پہلے تب کیننگ کالج لکھنؤ میں پڑھتی تھی —— تم ابھی تک بی اے میں ہو۔"

اور لڑکی نے تپاخ سے جواب دیا "جی ابھی تک کیوں اسی سال تو آئی ہوں بی اے میں۔"

اور رشیدہ آپا ہنس پڑیں۔ "بڑی ذہین ہو میں اتنی ذہین نہ تھی"۔ وہ لڑکی خوش ہو گئی اور پھر رشیدہ آپا نے اسے پاس بلا کر بٹھا لیا اور

میں رشیدہ آپا کی شخصیت کے کئی پہلو تھے۔ وہ یوں تو بڑے میاں کی باتیں سنتی تھیں لیکن وہ ہمیں اور کے بڑے ہوئے دیتی تھیں۔ بالکل جیسے انا سکتے ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے کہنے میں داستانی ترغیب بھی شامل ہوتی۔ نہ ہو اگر بات ٹھہالی ہو جاتی ہے۔ اس نے زمانے سے ... بھی صدا ان کے ایک آدھ کوستے کا ذکر تک تم تک آ ہی گیا تھا۔ نہ جانے تنگ ہو کر کیا کیا کہہ ملیں گی ——— بس یوں سمجھئے کہ وہ جملہ اکثر تکرار سے ہی نہ ہو چکی تھیں مگر وہ بھلی ہی کب تھیں۔

میری اور رشیدہ آپا کی ملاقات کا سلسلہ کافی دنوں تک رہا۔ پھر وہ لکھنؤ چلی گئیں اپنے سسرال۔ اور میں چند مہینوں کے لئے دلی چلی گئی۔
——— اس زمانے میں کبھی کبھی خط و کتابت کا سلسلہ بھی رہا لیکن ٹھہرا ٹھہرا سا۔
اگر کہیں نثر میں استاد اور شاگرد کا سلسلہ چلتا ہو تو میں رشتے کی حیثیت سے کہتی ہوں کہ میں یک ساتھ تنقید پسندی کے باوجود جو چند صفحے چڑھا، حق فرض ادا کرنے کی بات ہے تو وہ شاگرد بہک ہی تو گئی لیکن شاگرد تو اس کے باوجود بھی تھی ——— رسم رواج ادا کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ انہوں نے مجھے جو کچھ بھی سکھایا وہ آج بھی میرے لئے مشعل راہ ہے۔

ستمبر ۴۸ء میں شادی کے بعد میں الٰہ آباد چلی گئی لیکن نہ جانے کیوں مجھے رشیدہ آپا سے شرم آتی تھی۔ میں نے انہیں اپنی شادی کی اطلاع دی۔ دعوت تو خیر کیا دے سکتی کیونکہ شادی ہی ایسی کون سی شاندار ہوئی تھی بس دو بول پڑھے گئے تھے نہ ڈھول تاشے نہ بجے شہنائی۔ لیکن رشیدہ آپا ٹوہ لگائے تھیں، جیسے بس موقع کی تاک میں ہوں۔
عوامی تھیٹر کی کانفرنس الٰہ آباد میں تھی۔ اس میں جہاں ہندوستان کے کونے کونے سے لوگ آئے رشیدہ آپا بھی لکھنؤ سے شرکت کے لئے چلی آئیں۔ رات کو ایک ڈرامہ ہونے والا تھا۔ میں اسے دیکھنے کے لئے گئی۔ وہیں رشیدہ آپا سے ملاقات ہو گئی۔ مسلسل بیماری کی وجہ سے ان کی تندرستی خراب ہو گئی تھی۔ چہرے پر بس گھنگھریالے بال نظر آتے تھے ——— زرد زرد سی ہو رہی تھیں، جیسے کسی نے خون چوس لیا ہو۔ لیکن آنکھوں میں وہی چمک، وہی ذہانت اور وہی تیزی تھی۔ وہ آنکھوں کا کیا زمانے کا حال ہی وہی تھا، جیتے اُسے کہیں کچھ کہوں وہ تو میں بھی پریشان ہیں۔
"شادی کرکے بیٹھ گئیں اور مجھے پرچہ تک نہیں کہیں بھیجا؟" انہوں نے سب کے سامنے کچھ اس طرح کہا کہ میں دلہنوں کی طرح شرما گئی۔ "چل ابھی دفعہ ——— تم کو پرچہ نہیں اور وہ ساتھ بیٹھ گئیں۔" رشیدہ آپا کھل پڑتی تھیں اور میں کٹ جاتی تھی۔ مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ ڈرامہ شروع ہونے میں دیر تھی وہاں کچھ اور خواتین بھی آ گئیں۔

اُردو کے مشہور شاعر مسعود اختر جمال صاحب کے گھر کی کچھ خواتین۔ رشیدہ آپا نے پھر وہی گفتگو شروع کر دی۔ اسی انداز میں جیسے اب سے چند سال پہلے علی گڑھ میں کیا کرتی تھیں، جیسے وہ اتنے گزرے ہوئے ماہ و سال کا فرق نہ رہا ہو۔ اُن کی طبیعت میں رتی بھر جو تبدیلی آئی ہو۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ کسی طرح ڈرامہ شروع نہ ہو اور میں باتیں کرتی رہوں۔ لیکن ڈرامہ شروع ہو گیا۔ یہ ایک مختصر سیاسی ڈرامہ تھا۔ جس میں طالب علم سپاہی اور جیب تراش وغیرہ کام کر رہے تھے۔ دلچسپ اتنا کہ سارے دیکھنے والے محو۔ میں نے ایک مرتبہ جو مڑ کر دیکھا تو رشیدہ آپا غائب۔ معلوم ہوا کہ پیچھے مزدوروں کے جھنڈ میں بیٹھی ہوئی دیکھ رہی ہیں۔ پھر ذرا سی دیر بعد جب ایک اسٹیج پر روشنی بڑھی تو دیکھتی کیا ہوں کہ رشیدہ آپا بالکل آگے والی صف میں بیٹھی ہیں۔ رشیدہ آپا پارہ صفت ہی تھیں۔ لیکن یہ محض اتفاق نہ تھا۔ مجھے اس روز معلوم ہوا کہ عام لوگوں کی طرح رشیدہ آپا کسی ایک طبقے کی فرد نہیں۔ اگر آپ نے انہیں دیکھا ہے تو جانتے ہوں گے کہ نچلے طبقے میں وہ مزدور تھیں اور اونچے طبقے کے آداب سے بخوبی واقف تھیں کیونکہ انہوں نے

ایسے ماحول میں پرورش ہی پائی تھی - اور معاشی حیثیت اُن کے لئے اجنبی نہ تھا - وہ ڈاکٹر تھیں اور ان گھروں میں ان کا روز کا آنا جانا تھا جہاں سے انہیں خاص واسطے کی محبت تھی -

غرض ہر جگہ وہ ایک جیسی تھیں - کسی محفل میں اجنبی نہ تھیں - جہاں پہنچ جاتیں ایسا معلوم ہوتا کہ گویا بس اسی ماحول میں پلی بڑھی ہیں - بس معاً اسی میں گھل مل جاتیں - کہتے ہیں کہ اُن کا دل جو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ الگ کر دے ——— ہاں تو بات چلی تھی اس ڈرامے کے بارے میں - یہ ڈراما بہت پسند کیا گیا اور الٰہ آباد جیسے شہر میں بار بار اسٹیج ہوا - ہر ایک واہ واہ کر رہا تھا - یہاں تک کہ مخالفین بھی عش عش کر کے اُٹھے تھے - لیکن رشید آپا نے منہ چھوٹے کہہ دیا - "قطعی بکواس"۔

میں چونک پڑی - "رشید آپا! کیا کہہ رہی ہیں آپ - اس ڈرامے کے بارے میں تو دو رائے ہو ہی نہیں سکتیں" - میں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا - (در اصل بحث کرنے میں میں یوں بھی کمزور ہوں)

"اجی ڈرامے کی کچھ مت کہو - ڈرامے تو اشتراکیت پر بھی ہیں - انسانی مساوات اور برابری پر - سرمایہ داری کے خلاف پر - مزدوروں کی چال پر ——— " رشید آپا نے تڑسے جواب دیا اور مجھے ایسا لگا کہ جیسے میرا منہ دھرا ہو گیا ہو - اور پھر رشید آپا نے نہ جانے کیا کیا کہہ ڈالا - میں نے تو کچھ سنا نہیں - رشید آپا اپنی بات پر اڑی رہیں - یہ ڈراما عام طور پر پسند کیا گیا - پھر مجھے رشید آپا کی رائے کا پس منظر معلوم ہوا -

ڈرامے کے مکالموں کے طنز مزدوروں کے سمجھ میں نہیں آئے تھے، جو پیچھے بیٹھے ہوئے تھے - اتفاق سے ڈرامے کا موضوع ہی طنز پر مبنی تھا - نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ڈراما ہی سمجھنے سے قاصر رہے اور رشید آپا مزدوروں کے خیالات کی ترجمانی کر رہی تھیں - اور یہی نہیں بلکہ میں نے سنا کہ بعد میں ان سے اور عوامی ساتھی سے اس پر خوب بحث بھی ہوئی - انہوں نے عوامی تھیٹر کے تمام ساتھیوں سے شدت سے اختلاف کیا - کچھ لوگوں کو اُن کی تنقید بُری بھی لگی لیکن رشید آپا بلا وجہ کبھی کسی کو خوش نہ کرتی تھیں -

اگلے دن میری بچی کی طبیعت خراب تھی - لیکن شام کو میں رشید آپا سے ملنے چلی آئی اور جب رشید آپا کو معلوم ہوا تو مجھ پر برس پڑیں - تم نے اپنی ماں اور ساس کی بھی اتنی باتیں کاہے کو سنی تھیں - سچ مچ رشید آپا مردانہ وار زندگی گزارنے کے باوجود عورتوں کا سا دل رکھتی تھیں - وہ عورتوں کی طرح بگڑ رہی تھیں ——— "تم بیمار بچی کو چھوڑ کر نکل پڑیں - واہ لڑکی واہ ——— ننھی سی جان کا اتنا بھی خیال نہیں - جلی ہو گئی میری محبت ——— " اور مجھے اُلٹے پاؤں لوٹنا پڑا - مرتی نہ تو کیا کرتی - ذرا سی دیر بعد دیکھتی کیا ہوں کہ رشید آپا میرے گھر پر موجود ——— اس وقت وہ اپنا آلہ لئے ہوئے تھیں اور خوب سنجیدہ تھیں - سو فی صدی ڈاکٹر ———

بچی ایسی کوئی خاص بیمار بھی نہ تھی کہ جس کا علاج کرنا اتنا ضروری ہو - یونہی بس نزلے زکام کی شدت سے بخار ہو گیا تھا لیکن رشید آپا نے علاج شروع کر دیا اور جب تک بچی اچھی نہ ہو گئی وہ برابر اسے خود آ کر دیکھتی رہیں اور انہوں نے میرا تو گھر سے نکلنا تقریباً نا ممکن کر دیا -

---

رشید آپا پر مجھے غصہ بھی بہت آیا ہے - وہ سامنے ہوتیں تو ایسی جلی کٹی سناتی کہ چھٹی کا دودھ یاد آتا -

یہ بھی اسی زمانے کی بات ہے جب الٰہ آباد میں تھی - اس زمانے میں یوں تو پردہ چھوٹ چکا تھا - لیکن گھر والوں کے سامنے بس یونہی سا کرتی تھی محض دکھاوے کا - حالانکہ انہیں بھی اس کا علم تھا لیکن محض بڑے بوڑھوں کے جذبات کا پاس جو رکھنا تھا - اب میں کسی اور سے کیا کہتی - اسی زمانے کی بات ہے - مہینے میں چار پانچ آدمی ایسے ملنے چلے آتے تھے جنہیں رشید آپا نے میرے پاس بھیجا ہوتا - ان لوگوں کو محض افسانہ نگار خواتین سے ملنے کا شوق ہوتا - اس کا اندازہ تو کچھ وہی لڑکیاں کر سکتی ہیں جنہیں ایسے "اڑکھی آفت" کا مقابلہ کرنا پڑا ہے یہ بات لکھنے کی نہیں -

بات یہ تھی جو لوگ رشید آپا سے بحیثیت افسانہ نگار ملنے جاتے اُنہیں وہ میرے پاس "ریفرڈ" کر دیتیں - اب میں نمٹوں ان سے - اور

گئی جو دو گولیاں ، اسد بیگ اسپغول کی ترکھتی ہی تھیں اب مرمنے کو بیٹھنے آنے لگے ۔ لیکن رشید آپا سے کیا کہیں ۔ کچھ کہو تو ٹال کر ایک ہفتہ سے بخار ہو رہا تھا کہ مرض بگڑ گیا ۔ بیچ میں نکل جاتیں ۔۔۔۔ البتہ اس کا نقش یہ ضرور ہوا کہ میں نے بہت جلد اس مرض کو چھوڑ دیا ۔ تمہارا رشید آپا نے علاج کر کے کیا ہو ۔ کیا تکلیف کوئی نہیں آتا ۔ لیکن رشید آپا ابھی تو زندہ نہیں ہیں ۔

رشید آپا کا گھرانہ بڑا عجیب و غریب تھا ۔ ایک بہن گرلز کالج کی پرنسپل تھیں ، ایک بہن پولیٹیکل سائنس کی پروفیسر ہیں ۔ اور رشید آپا ۔۔۔۔ انہیں کون نہیں جانتا ۔ رشید آپا اپنے گھر میں سب سے الگ تھیں ۔ وہ چاہتیں تو عیش کی زندگی گزار سکتی تھیں لیکن انہوں نے ہر قسم کے عیش و آرام کو ٹھکرا کر ایک عام انسان کی زندگی کو ترجیح دی ۔

اس گرمی میں میں نے ان کی ایک بہن کو دیکھا جو اپنی ہونے والی بہو کی بری کے لئے پریشان تھیں ۔ پاس پڑوس کی فضا سے بے نیاز ۔۔۔۔ ہم چار پانچ لڑکیاں رشید آپا کے پاس بیٹھی تھیں لیکن ان کی بہن آئیں اور ہمارے سلام کا جواب دیئے بغیر گزر گئیں ۔۔۔۔ رشید آپا شرمندہ تھیں گویا یہ بد اخلاقی ان سے ہی ہوئی تھی ۔ دوسروں کی کمزوری کو اس طرح اپنا لینا بھی تو بڑی بات ہے ۔

میں نے شاید یہ کہیں نہیں لکھا کہ رشید آپا کمیونسٹ تھیں ۔ اس کی ضرورت بھی نہیں اس لئے کہ ایسے لوگ اگر کمیونسٹ نہ بھی ہوں تو ان کی بڑائی میں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا ۔

آج رشید آپا ہمارے درمیان نہیں ۔ وہ یہاں سے ہزاروں میل دور روس کی سرزمین پر آرام کر رہی ہیں ۔ میں یقین سے جانتی ہوں کہ رشید آپا کی روح بے چین ہو گی خاک وطن کے لئے ۔ وہ اپنی بیماری کا علاج کرانے گئی تھیں ۔ روس کی مٹی نے انہیں اپنی طرف کھینچ لیا اور آج روس میں ان کی ایک حسین سی قبر ہے ۔ شاید ہم رشید آپا کے لئے اتنی حسین قبر نہ بنا سکتے ۔ اس لئے کہ ہمیں ابھی ان کی عظمت کا صحیح معنوں میں احساس ہی نہیں ۔ لیکن کون جانے ایک وقت ایسا بھی آئے جب ایک قبر ماسکو سے منتقل کی جائے ۔ جس میں روس کی مٹی خاک ہند سے ملے ۔ ہماری امانت ہمیں واپس مل جائے ۔

رشید آپا ترقی پسند تحریک کی بانیوں میں سے ایک تھیں ۔ وہ ایک بڑی افسانہ نگار تھیں ۔ کم لکھتی تھیں لیکن بہت اچھا لکھتی تھیں ۔ وہ بہت اچھی معالج تھیں ۔۔۔۔ وہ کمیونسٹ تھیں اور وقت آنے پر سر گردن سے تار کر رکھ دینے والی تھیں لیکن ان کی بڑائی ان کے افسانوں میں نہیں ۔۔۔۔ ان کے علاج معالجے میں نہیں ، ان کے کمیونسٹ ہونے میں نہیں ۔۔۔۔ ابھی کتنے افسانہ نگار اور پیدا ہوں گے جو شاید ان سے زیادہ اچھے افسانے لکھیں گے ۔ ان سے اچھے اچھے ڈاکٹر بھی پیدا ہوں گے ۔ ان سے اچھے اچھے کمیونسٹ بھی پیدا ہوں گے جو قوم کے لئے ان سے بڑی قربانیاں بھی دیں گے ۔۔۔۔ لیکن ان میں کوئی رشید آپا نہ ہوگا ۔ وہ سراپا خلوص کہاں ملے گا ۔ وہ محبت کس میں ملے گی ۔

وہ بے باک تھیں اور شاید اسی لئے کہ ان کے دل و دماغ میں گانٹھیں نہ تھیں ۔ وہ کبھی کسی چیز کو فرض کر کے آگے نہ بڑھتی تھیں ۔ جو دیکھتی تھیں بس وہی کہتی تھیں ۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں ان کے ڈاکٹر ہونے کو دخل ہو ، جو مفروضات پر علاج نہیں کرتا ۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے حقیقت پسند فنکار ہونے کو دخل ہو ۔ لیکن یہ سچ ہے کہ وہ بے باک تھیں اور نڈر تھیں ۔

لوگ کہتے ہیں کہ پچھلے دنوں جب انہیں پولیس نے خطرناک سمجھ کر گرفتار کر لیا تھا تو ان کے مریضوں نے انہیں چھڑوا لیا ۔ میں اس واقعہ کی سچائی کے بارے میں تصدیق سے کچھ نہیں کہہ سکتی تاہم یہ بات رشید آپا کے لئے غیر ممکن نہیں ۔

میں نے رشید آپا کی شخصیت کا یہ ہلکا سا جائزہ لیا ہے ہو سکتا ہے کہ بعض لوگوں کو یہ شکایت ہو کہ میں دودھ کا دودھ پانی کا پانی نہ کر سکی ۔ ان کی شخصیت کی کمزوریاں سامنے نہ لا سکی ۔ لیکن میں نے انہیں کیمرے کی آنکھ سے نہیں اپنے دل و دماغ سے دیکھا تھا اس لئے ہو سکتا ہے کہ چہرے کے داغ نظر سے اوجھل ہو گئے ہوں لیکن اگر آپ انہیں جانتے ہیں تو ذرا مجھ سے نظریں ملا کر سچ سچ بتایئے ان میں خامیاں تھیں بھی کب ۔۔۔۔

مجازؔ [۱]

ابواللیث صدیقی

۱۹۳۲ء میں علی گڑھ کا انٹرمیڈیٹ ٹوٹا تو اسکولوں کی جماعتیں اسکول کے ساتھ اور کالج کی جماعتیں یونیورسٹی کے ساتھ ملحق کر دی گئیں۔ جانچ میں بھی یونیورسٹی پہنچا۔ ایک زمانے تک علی گڑھ کی شہرت اور فضا کا مجھ پر بڑا رعب تھا۔ پھر علی گڑھ میں بعض ایسی روایات تھیں جو سے اکثر وہ بدیسی سمجھتے تھے۔ یہاں سینئر اور جونیر میں کچھ ایسا حفظ مراتب تھا کہ بیچارے جونیر عرصہ تک اپنے آپ کو محض "بدھو" اور سینئروں کے رحم و کرم پر سمجھتے تھے۔ اخلاقی تسلط سینئروں کو خاص مراعات حاصل تھیں۔ ڈائننگ ہال میں 'بالائی' اور مرغ کا 'ڈونگا' اور 'پیٹیز' تو سینئروں کا حصہ تھا ہفتے میں پہلے دن بریانی اور جمعہ کے دن شاہی ٹکڑے بھی پہلے ان کی خدمت میں پیش ہوتے، پھر ان سینئروں کا حصہ ہوتا جو جونیروں کو بتا دیتے کہ میاں یہ 'ویانگی' [۲] صرف سینئر طالب علموں کے لئے ہوتی ہے۔ پھر یہ سینئر طالب علم واقعی تھے بھی سینئر۔ مثلاً ان میں سے ایک صاحب ممتاز حسین کے ایک ہی کمرے میں بارہ سال سے مقیم تھے اور بی۔ اے پاس نہ کر سکے تھے۔ ہر سال وہ ایک دو مضمون میں پاس ہو جاتے اور دو ایک میں فیل۔ وہ حساب لگاتے تو ہر مضمون میں الگ الگ کئی مرتبہ پاس ہو چکے تھے۔ اب یہ مضامین کی ستم ظریفی تھی کہ انھوں نے طے کر رکھا تھا کہ ان کا میل ملاپ یا سنجوگ کبھی نہ ہو۔ ایسے سینئر طالب علموں سے جونیر تو درکنار بڑے بڑے جغادری عہدہ دار بھی ڈرتے تھے اور ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔

یونیورسٹی پہنچتے ہی مجھے بھی اس فضا کو محسوس کرنا پڑا۔ خیریت یہ تھی کہ اس وقت کے چند نہایت ہی "سینئر" میرے عزیز اور ہم وطن تھے اور ان کے کرم سے میں ان آزمائشوں سے کسی قدر محفوظ رہا جن سے عموماً جونیر طالب علموں کو گزرنا پڑتا تھا، پھر بھی میں بڑی اجنبیت محسوس کرتا۔ میری حالت اس وحشی ہرن کی سی تھی جو جال میں نیا نیا پھنسا ہو۔ ایک دقت یہ تھی کہ میں نہ جونیر تھا نہ سینئر۔ جونیروں کے ملنے سے تو میں یوں خارج سمجھا جاتا تھا کہ بعض اساتذہ اور سینئر طالب علم مجھ پر غیر معمولی شفقت فرماتے، اور مجھے ایسی مراعات حاصل تھیں جو جونیروں کو نصیب نہ ہوتیں۔ سینئروں سے میں خود گھبراتا اس لئے میری وحشت کا علاج سمجھ میں نہ آتا تھا۔

۱؎ یہ مضمون مرحوم کی زندگی میں لکھا گیا تھا۔

۲؎ علی گڑھ کی خاص اصطلاح میں مرغ کا قورمہ اور پلاؤ وغیرہ۔ اصل اس اصطلاح کی یہ ہے کہ ڈاکٹر کی تجویز پر بیماروں کے لئے ڈائننگ ہال میں خاص کھانا پکوایا جاتا تھا۔ اکثر سینئر طلباء ڈاکٹر سے اچھے مرغ کا شوربہ اور پلاؤ بطور پرہیزی غذا تجویز کرا لیتے تھے۔

[illegible] اس زمانے میں [illegible] (۱۹۳۵ء) کہ ہم ایک جلسہ میں سالانہ مشاعرہ کی ایک
[illegible] مجاز شرکت کیا اور یہ پہلا موقعہ تھا کہ اکبر علی خان، ڈاکٹر ذاکر حسین وغیرہ جیسے [illegible]
شعر پڑھا کرتے تھے اس پر بہت سی تحسین و ستائش کا شور تھا۔ یہ حال تھا کہ جب اس دن نظم پڑھی اس پر کتنی داد ملی
تھی ۔ یہ کتاب حال کے گرد قریب ہی موجود تھا۔ اس وقت ایک تیز طرار، خوش پوش اور خوش رو طالب علم تشریف لائے، تعارف
ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ اسرار الحق صاحب ہیں۔ دونوں ساتھ ہی تھے۔ جب تک تعارف نہ تھا، یہ میرے پاس آئے اور مجھ سے
تعارف کیا۔ یہ مجھے ہمارے یہاں کے طالب علموں کا ایک نقشہ، جو کہ اس وقت تک بہت کچھ اس تقریر کی یاد دلاتا ہے۔؎

یہ انصار سے میری پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد انصار کے بڑے بھائی اسرار سے پھر میں علیگڑھ میں ملاقات ہوئی۔ اسرار اس وقت
اسرار الحق تھے، مجاز کی شہرت صرف ایک اسم، کلام تک ہی محدود تھی۔ بعد میں جب اس سلسلے میں یہ سب کیا تو میں شاگرد
بھی رہے۔ پھر وہ جوانی کی بے فکریوں کے ساتھ علیگڑھ میں مشغول رہا۔ مجاز یہ منظر دیکھ کر ان سے ملاقات ہوتی رہی۔ جب تک علیگڑھ میں
رہا اکثر ملاقات رہی۔ پاکستان بنا تو میں وہیں رہ گیا۔ اس کے بعد تو کئی برس ایک مرتبہ ان سے ملاقات ہوئی۔ بھائی انصار اس وقت بھی
کے اسی طرح سیدھے سادے تھے۔ جب وہ بھی یہیں آ گئے، ان دنوں اکثر ملاقات ہوتی۔ انصار، محمد عباس اور حافظ عثمان انصاری
مقرر کر دیے گئے۔ ان کے ساتھ کام کرتے تھے لیکن ان کے بچے ان کے ساتھ نہیں رہتے، ان کو تمام معاملات میں شامل کیا گیا تھا۔
وہ کے بچے وہاں پہلے ہوتے اور رہنے لگے۔ ایک ہوش اور حرکت سب کچھ میری نظر میں ہے۔ علیگڑھ کی ان سب کی صلاحیتوں
شہرت اور کارناموں پر غور کرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ ذہانت، شرافت اور لیاقت تینوں سے وہ بہرہ یاب تھے۔

مجاز کی نشوونما علیگڑھ کے خاص ماحول میں ہوئی۔ یونیورسٹی سے باہر علیگڑھ بڑی عجیب و غریب اور بہت پرانی جگہ تھی۔ شہر میں تالوں
کی تجارت ہوتی اور ریلوے اسٹیشن پر علیگڑھ کی مشہور نمائش کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ سارا شہر ایک شور سے بھرا ہوتا لیکن صرف دو دنوں میں
بہاروں سے آشنا ہوتی۔ لیکن اس فیروزہ رنگ ماحول میں یونیورسٹی کی دنیا الگ تھی۔ اس کے در و دیواروں میں زندگی کے جلوے تھے۔ وہاں آپ نے
رنگ و بو کے ساتھ جلوہ گری۔ اس میں مختلف شاعر، ادیب، علما اور مولوی، نوجوان پڑھنے والے اور سب کے سب ہی چمکتے تھے۔ کہیں کرکٹ
میں طبلے کھنکتے اور ستار کے تار جھنجھناتے سنائی دیتے۔ کہیں شعر و شاعری کے چرچے ہوتے، کہیں انکی گفتگو ہوتی، کہیں کرکٹ، فٹ بال اور ہاکی
کا ذکر ہوتا۔ لیکن دو چیزیں سب میں مشترک تھیں: خوش باشی اور خوش ذوقی۔ تیسرے درجے کے گھٹیا پن کا تو ذکر کیا کوئی دوسرے درجے کی بات
بھی اس ماحول میں مستحسن خیال نہیں کی جاتی تھی۔ شاید علیگڑھ کی اقامتی زندگی کی شہرت اور کامیابی کا راز اسی میں مضمر تھا۔ اور اسی وجہ سے جو لوگ
علیگڑھ میں رہتے اور بستے تھے وہ بھی اپنے بچوں کو بورڈنگ میں کچھ وقت گزارنے بھیج دیتے۔ چنانچہ مجاز نے بھی ایک عرصہ اسی سرکل میں گزارا۔ علیگڑھ کا مذاق
کیری روڈ پر رہتا تھا۔

علیگڑھ کے مجاز کے معاصرین میں حیات اللہ انصاری، سبط حسن، اختر حسین رائے پوری، علی سردار جعفری اور بعد میں جاں نثار حسین اختر، جذبی اور
اختر الایمان قابل ذکر ہیں۔ ان میں اختر الایمان بہت کم عرصہ رہے اور علیگڑھ کی روایات اور ان میں سرایت نہ کر سکیں۔ باقی سب ایک ہی حلقہ اور زمانے کے ایک
دسترخوان پر دانہ کھاتے رہے جو سب کے سب کھیل بہت سی چیزوں میں مشترک ہیں۔ یہ سب شاعر، ادیب اور شاید دانشور ہیں۔ اور سب کے سب ترقی پسند ہیں۔ اختر حسین ملسانی پوری کی دوسری

؎ یہ پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے سے بہت پہلے کا واقعہ ہے۔ یہ اسٹوڈنٹ ہی تھا کہ مرحوم پروفیسر محمد حبیب نے مجھے ڈاکٹر کہنا شروع کیا اور پھر یہ دوست
سب کبھی مزاحاً کبھی طنزاً اسی لقب سے یاد کرنے لگے۔

مصیبتوں نے ان کی راہ تنگ کر دی۔ باقی ابھی تک یکسانی رہ پہ گامزن ہیں۔ سب نے آزادی کے لیے کوششیں کی ہیں اور آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیا ہے۔ سب کے یہاں حب الوطنی ہے اور وطن کو سربلند کرنے کی آرزو سب کے یہاں موجود ہے۔ ان سب کی زندگی بھرا یا ہے۔ مجاز نے کبھی کسی کی خوشامد نہیں کی، نہ کبھی اپنا ہاتھ کسی کے آگے پھیلایا۔ ان میں سے کوئی ابن الوقت نہیں، یہ سب "وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے" کے قائل ہیں۔

علی گڑھ میں مجاز کے خاندان کا قیام میرس روڈ پر تھا جسے علی گڑھ کی سول لائن کہتے ہیں۔ لیکن یہاں بھی سرکاری عہدہ داروں کی کوٹھیوں کے علاوہ [illegible] کا پرچم لہرا رہا تھا۔ یونیورسٹی کے اساتذہ کی کوٹھیاں، گرلز کالج اور گرلز کالج کا ہوسٹل، یونیورسٹی کے طلبا جو بیرونِ جات سے آکر علی گڑھ میں مقیم ہوا کرتے تھے ان کے مکانات اور وہ لوگ جو سرکاری ملازمتوں پر فائز ہو کر علی گڑھ تبادلہ کر دیا کرتے تھے یہاں رہتے تھے۔ اس پورے بیلٹ کو میرس روڈ "رومان پرور" علاقہ تھا، بہار رت سے سنگم ندی [illegible] رومان کرنے والے رہتے تھے۔ سڑک پر دو رویہ درختوں کی قطار [illegible] ہرے آم کے درخت اندھیرا ہوتے ہی جگنوؤں کی چمک دمک، پپیہوں اور کوئلوں کی کوک نے اسے واقعی ایک رومانی علاقہ بنا دیا تھا۔ آبادی کے باوجود یہاں موروں کی بھی کثرت تھی اور میرس روڈ سے کوئی دو فرلانگ کے فاصلے پر یونیورسٹی کا زرعی فارم تھا جہاں ہم نے اکثر مور اور تیتر کا شکار کیا ہے۔ گرلز کالج کی وجہ سے اس علاقے کی رونق اور بڑھ گئی تھی۔ لیکن "غنڈہ گردی" کا کوئی امکان نہ تھا کہ یہ بات علی گڑھ کی روایات کے منافی تھی۔ یہاں رومان کرنے والے اکثر یہاں گھومتے نظر آتے تھے اور مجاز تو رہتے ہی یہاں تھے۔ علی گڑھ والی نظم میں مجاز نے اسی فضا کے لیے لکھا ہے کہ یہاں کلیوں سے حسن ٹپکتا ہے، پھولوں سے جوانی ابلتی ہے، یہاں برقِ حسن چمکتی ہے اور نور کی بارش ہوتی ہے، یہاں کی ہر شام، شامِ مصر اور ہر شب، شبِ شیراز ہے۔ ان سڑکوں پر اکثر لوگوں نے مجاز کو گھومتے دیکھا ہے لیکن ان کا کوئی رومان بدنام نہ ہوا اور شاید قریب کے جاننے والے بھی مجاز کی محبوبہ کا نام مشکل سے بتا سکتے ہیں۔

میرس روڈ اور ہوسٹل کے علاوہ علی گڑھ کی زندگی میں بعض اور چیزیں طلبا پر اثر انداز ہوتی تھیں۔ ان میں سے ایک یونین تھی۔ یونین جمہوریت کے نمائندوں کی تربیت کے لیے ایک پلیٹ فارم ہی نہ تھی بلکہ علی گڑھ کی اجتماعی زندگی کا سب سے بڑا آئینہ تھی۔ یہاں طالب علموں کو، بڑوں سے ملنے اور تبادلۂ خیال کرنے کا موقع ملتا تھا۔ جہاں وہ کھل کر اپنے افکار اور خیالات کا اظہار کر سکتے تھے، سیاسی مسائل پر بے خوف و خطر مباحثے کر سکتے تھے، سیاسی لیڈروں سے صاف صاف باتیں کر سکتے تھے۔ پھر یہاں مشاعرے اور ادبی [illegible] بھی ہوا کرتی تھیں۔ ایسے مشاعرے جو علی گڑھ کے علاوہ کہیں اور نظر نہیں آتے تھے۔ ان میں اساتذہ اور نوجوان شاعر اپنا کلام سناتے اور داد پاتے تھے اور داد کا نعرہ یہاں سے بلند ہو کر اس کی گونج ملک کے دور دراز گوشوں میں پھیل جاتی۔ اسی علی گڑھ سے حسرت، فانی اٹھے اور یہیں سے جگر اور اصغر کی شہرت کا آوازہ بلند ہوا۔ چنانچہ اسی یونین کے پلیٹ فارم سے مجاز کی جو نظمیں پہلی مرتبہ پڑھی گئیں ان میں "نذرِ خالدہ"، "ذہب خانم"، "نذرِ علی گڑھ"، "نمائش"، "نرس"، "نورا"، "رات اور ریل"، "انقلاب" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۹۳۲ء کے قریب مجاز کی شاعری شروع ہوئی اور تین چار سال میں ان نظموں کی شہرت یونین کی چہار دیواری سے نکل کر سارے ملک میں پھیل گئی۔ اس وقت علی گڑھ کے نوجوان شاعروں میں مجاز سے زیادہ کوئی مقبول نہ تھا۔ مشاعروں میں بار بار ان سے پڑھنے کی فرمائش کی جاتی، اور اس فرمائش میں طلبا سے زیادہ ان طالبات کی آوازیں بلند ہوتیں جو یونین میں اوپر کی گیلری میں الگ بیٹھی یونین کی کارروائی دیکھتی تھیں۔

جنوری کے آخر اور فروری کے آغاز میں علی گڑھ میں نمائش ہوتی۔ یہ نمائش علی گڑھ کی معاشرتی زندگی کا جزو بن گئی تھی۔ سال بھر لوگ اس کا انتظار کرتے، خرید و فروخت کے پروگرام مہینوں پہلے بنائے جاتے، طالب علم مختلف بہانوں سے گھروں سے روپیہ منگا کر جمع کرتے۔ نمائش آتی تو عید سے زیادہ خوشی ہوتی، صبح سے تیسرے پہر تک تو علی گڑھ کے شہر والے اور مضافات کے دیہاتی نمائش دیکھنے آتے۔ نمائش کے دوکاندار کچھ اونگھتے، کچھ جاگتے، کچھ اپنی دوکانیں کھولے، کچھ دوکانوں پر پردے ڈالے جمائیاں لیتے رہتے۔ شام ہونے سے ذرا پہلے بیٹھ

[illegible] اور شعر و شاعری کا ذوق کرتے۔ اس وقت صحبت کے نتیجے کے
[illegible] بہت کچھ تبدیلی ہو چلی تھی۔ مجاز اس ماحول میں [illegible]
[illegible] ان کی شاعری کی تربیت ہوئی۔

[illegible] مجاز کی تعلیم [illegible] معلوم نہیں ہیں۔ رشید احمد صدیقی سے بھی انھوں نے کس صحبت سے اس کیا ہو گا جب انہوں نے ایم اے میں [illegible] کی بات دیکھنے کو ملی تھی۔ وہ اپنے اساتذہ کا بڑا احترام کرتے۔ رشید صاحب اور مولانا احسن کے ساتھ ان کی عقیدت کا [illegible] بھی قدیم ادب، لسانیات اور اس طرح کے موضوعات سے وہ بھاگتے تھے۔ مجھ سے اب تک اکثر کرتے تھے۔ ایک بار ان سے اس موضوع پر مکمل کر گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ شاعری میں رس اور بہاؤ پیدا کرنے کے لئے کلاسیکی ادب کا مطالعہ، تجزیہ اور تنقید کی بھی ضرورت ہے۔ اس ضرورت کو مجاز نے بھی تسلیم کیا۔ پھر لکھنے پڑھنے کا پروگرام بنایا۔ میں نے ترکیب بتا دی۔ مجاز صرف یاروں کا نے شعر کہنے اور شعر سنانے کی نذر ہو گئے۔ شراب انہوں نے شاید اس وقت تک شروع نہیں کی تھی یا کم از کم ہم لوگوں کو اس کا علم نہ تھا لیکن شاعرانہ لاابالی پن ان میں اس وقت بھی پوری طرح پیدا ہو چکا تھا۔ وہ ہر وقت اپنا یا کسی اور کا کوئی شعر گنگناتے رہتے، پھر ان کا کھانے لگتے، سگریٹ اور گفتگو سے بھی کچھ شوق تھا۔ غرض نتیجہ یہ نکلا کہ مجاز بیاگی لکھے اور ایم اے کی تکمیل نہ کر سکے اور نہ باقاعدہ مطالعہ یا محنت کی طرف مائل ہو سکے۔ ان کی شاعری میں جو رس اور رنگ ہے وہ محض ان کی طباعی اور شاعرانہ فطرت کا مرہون منت ہے۔ اکتساب اور ریاض کا ان کے یہاں سوال پیدا نہیں ہوتا۔

علی گڑھ میں اس وقت طالب علموں کی ایک جماعت کانگریس کے خیالات کی ترجمان تھی، ان میں سے بعض کو سوشلسٹ لوگ سمجھا جاتا تھا۔ حیات اللہ انصاری، سبط حسن، اختر حسین رائے پوری، علی سردار جعفری سب اسی حلقے سے وابستہ تھے۔ مجاز بھی ان کے ساتھ تھے چنانچہ ان کے یہاں بھی رومانی طبیعت پر کبھی کبھی انقلاب کا سایہ پڑنے لگا۔ 'انقلاب' والی نظم اسی دور کی یادگار ہے۔ اس نظم کو مجاز نے جب پہلی مرتبہ [illegible] میں [illegible] آواز میں ایسا جوش اور اتار چڑھاؤ تھا جیسے وہ لوگ سے باہر نکلتے ہی جام چھوڑ کر شمشیر اٹھا لیں گے لیکن یہاں بھی ان کا طبعی لاابالی پن سامنے آیا۔ یوں ان کے اشعار میں اس طرح کے خیالات بار بار ملتے ہیں لیکن عملی طور پر وہ اپنی شاعری کی رومانی فضا ہی میں بستے رہے اور آج تک ہیں۔ انصاری بڑے عملی قسم کے آدمی تھے اس لئے انہوں نے کانگریس کی عملی جدوجہد میں بڑا حصہ لیا اور اب تک وہ ایک سرگرم سیاسی کارکن ہیں۔

علی گڑھ کے مشاعروں میں اس وقت ترنم سے پڑھنے کا رواج عام ہو چلا تھا۔ حالانکہ علی گڑھ کی بزم سخن کے صدر مجلس مولانا احسن مارہروی مرحوم ترنم کے سخت مخالف تھے اور انہوں نے ساغر نظامی کے ترنم پر ایک لطیف طنز بھی ایک مشاعرہ میں سنا دیا تھا لیکن جگر کے زمانہ آنے نے علی گڑھ میں ترنم کا شوق پیدا کیا۔ سردار جعفری تو بے شک نثر میں نظم سناتے لیکن مجاز، جذبی اور جاں نثار اختر نے شروع سے ہی ترنم اختیار کیا۔ جاں نثار کی آواز ترنم کے لئے موزوں نہ تھی، اس لئے ان میں کبھی کبھی ان کے ترنم کے ساتھ اس کی نقل بھی شروع ہو جاتی۔ لیکن جذبی اور مجاز دونوں کا ترنم بے حد پسند کیا جاتا تھا۔ جذبی کے یہاں ترنم میں ایک سوز تھا اور مجاز کے یہاں نغمگی۔ پھر جذبی پڑھتے تو مجسم سوز بن جاتے اور مجاز مجسم نغمہ، ان کے پتلے پتلے ہونٹوں پر تبسم کھیلتا رہتا، وہ جھوم جھوم کر اپنا کلام سناتے اور بار بار والہانہ انداز میں اپنے بڑے بڑے بالوں کو جو ماتھے پر آ جاتے، ہاتھوں سے سنوارتے جاتے۔ ان کی آواز باریک تھی لیکن بڑے سے بڑے مجمع میں مائیکروفون کے بغیر وہ بلا تکلف اسے آخری گوشے تک پہنچا سکتے تھے۔ ابھی تک ان کے ترنم کے انداز میں فرق نہیں آیا لیکن صحت خراب ہونے کے بعد سے اس میں کچھ اضمحلال کے آثار پیدا ہو گئے ہیں۔

مجاز کی صحت اس وقت بھی بہت اچھی نہ تھی —— وہ دبلے پتلے اور کمزور سے آدمی تھے، اکثر بیمار رہتے تھے اور اسپتالوں کی سیر کرتے لیکن

[illegible] کی بیماری مگر [illegible] ہسپتال (دار الصحت؟) کی یادگار ہے [illegible] بیس [illegible]

[illegible] ہوتا تھا [illegible] کے [illegible] بہت ہی [illegible] کے ڈاکٹر صرف [illegible] PRINCE TIME DOCTOR [illegible]

جاتے ہیں [illegible] بالعموم [illegible] کی سفارش کے لئے ان کی خدمت میں حاضری ہوتی تھی۔ سگریٹ بہت پیتے تھے، شاید اس [illegible] وحشت

پیدا ہونے لگا تھا، پھر بھی شدت کا دورہ آیا۔ اس کا پورا حال مجھے معلوم نہیں لیکن مجھے محسوس ایسا ہوتا ہے کہ جوش کے ساتھ رہ کر مجاز نے [illegible]

کا مشغلہ اختیار کیا جس نے ان کی صحت کو اور تباہ کر دیا۔ بعض لوگ اس تباہی کی ذمہ داری جوش پر عائد کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک لطیفہ بھی

مشہور ہے۔ مجاز ایک مرتبہ جوش کے یہاں پہنچے اور آواز دی۔ جوش صاحب موجود نہ تھے۔ [illegible] سے پوچھا گیا کہ آپ کون ہیں؟ انہوں

نے کہا: مجاز ہوں۔ وہاں سے جواب ملا: "اچھا آپ ہی مجاز صاحب ہیں جنہوں نے جوش کو خراب کیا ہے؟" [illegible] کون جانتا ہے کہ کس نے

کس کو خراب کیا۔ لیکن مجاز کے [illegible] میں اس رندی کی شدت سے اور اضافہ ہوا اور [illegible] کی شاعری کو اس سے نقصان پہنچا اور اس نے

ایک کام کے آدمی کو دفعی [illegible] کر دیا۔

مجاز کا ہمیشہ ہونٹوں پر ڈھلکا تبسم ان کی شگفتہ مزاجی کا نشان ہے۔ دوستوں کی محفل میں وہ خوب فقرے لگاتے [illegible]۔ ایسے فقرے چست کرتے

کہ سامعین لوٹ لوٹ جاتے۔ اس سلسلہ میں سب سے مشہور لطیفہ جوش صاحب کے متعلق ہے۔ کسی محفل میں جوش صاحب موجود تھے تو "شاعر اعظم"

کی بات چھڑی۔ مجاز پہلے تو مسکرائے پھر کہنے لگے "حضرت شاعر اعظم" تو بعد کی بات ہے پہلے "قد آدم" تو ہو جائیے! جن لوگوں نے جوش صاحب

کو دیکھا ہے وہی اس لطیفے سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ مجاز کی طبیعت کا یہی انداز ان کے کلام کی شگفتگی اور رنگینی کی بنیاد ہے۔

مجاز دوستوں کے دوست اور یاروں کے یار تھے۔ اس معاملہ میں ان کی دوست نوازی میں بھی لاابالی پن تھا۔ [illegible] کمرے [illegible]

ہوتے جب ہوتے گھر پر ہر وقت دوستوں کی محفل بھی رہتی یا پھر وہ خود اس کمرے سے بھاگ کر دوستوں کے ساتھ رہتے اور اکثر ایسا ہوتا کہ کئی کئی

دن وہ اس کمرے کا رخ نہ کرتے۔ کمرے میں چیزیں بے ترتیبی سے منتشر پڑی رہتیں، کتابیں البتہ کہیں نظر نہ آتیں اور نہ ملازم ہی [illegible]

لانے کی زحمت کرتے۔ ان محفلوں میں شعر و شاعری ہوتی۔ [illegible] کھیلے جاتے، قہقہے لگائے جاتے اور ساری فضا ان سے گونج جاتی۔ شاید ہی کبھی

کسی نے مجاز کو تنہا دیکھا ہو اور کسی مجلس میں شاید ہی کبھی وہ خاموش اور افسردہ نظر آئے ہوں۔ ان کے اس انداز میں جو رندانہ شان پائی جاتی تھی

وہ ان کے اور ساتھیوں میں سے کم کے حصہ میں آئی ہے۔ اسی لئے ان کے یہاں غم جاناں اور غم دوراں دونوں غرق [illegible] ہیں اور جہاں یہ غم

ہے بھی وہاں ان کی مسکراہٹوں نے اس کی تلخی کم کر دی ہے۔ ایک عشاق شاعر کے لئے یہ بہت بڑی نعمت ہے، خصوصاً جس دور میں مجاز

تھے اس میں زندگی کی تلخیاں اتنی بڑھی ہوئی ہیں کہ ایک تبسم یا ایک مسکراہٹ بھی کسی کو نصیب ہو سکے تو غنیمت ہے۔

مجاز کی طبیعت کا لاابالی پن ان کی وضع قطع اور لباس سے بھی ظاہر ہوتا تھا۔ وہ ایک خاصے خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور

علی گڑھ میں یوں بھی عام طور پر طالب علم بہت خوش پوش رہتے تھے لیکن مجاز اس معاملے میں بھی بے نیاز تھے، ویسے ان کا لباس علی گڑھ کٹ

پاجامہ اور شیروانی تھا لیکن دونوں سے لاابالی پن ظاہر ہوتا تھا۔ ٹوپی اس زمانہ میں سر کی کھلی زیادہ تر ہا تھ میں رہتی تھی۔ ترکی ٹوپی علی گڑھ سے

رخصت ہو چکی تھی۔ البتہ کھدر کی شیروانی اور کھدر کی گاندھی ٹوپی پہنتے تھے لیکن مجاز بالعموم سیاہ رنگ کی سمور کی ٹوپی استعمال کرتے تھے۔ سوٹ

انہوں نے کبھی نہ پہنا اور لاابالی پن کے باوجود کبھی بڑھے بالوں یا میلے کچیلے کپڑوں سے "ہونق" کی صورت بنائی۔ لباس میں بے اعتنائی کے باوجود

ایک نفاست اور ستھرا پن موجود تھا، اس زمانے میں علی گڑھ میں کابوری چپل کا رواج بھی عام تھا لیکن مجاز نے کبھی اسے پسند نہ کیا۔

غرض میں نے آج سے بیس بائیس سال پہلے مجاز کو جیسا دیکھا تھا آپ کے سامنے پیش کر دیا۔ باہر والوں نے مجاز کو ان کی شاعری

میں دیکھا ہے اور اسی سے ان کی صورت اور سیرت کا اندازہ لگایا ہے ——— فیض نے "آہنگ" کے دیباچہ میں مجاز کے بارے

[illegible]

دیکھ شعلے بھڑکا، ساز ہے جام ہے
تو ہر نشتر اٹھالے تو بڑا کام ہے

کہا ہے کہ مجاز کی شاعری اتنی تیزی سے ابھری ہے مگر ہے لیکن مجاز زیادہ مرہونِ فنائی شاعر ہے اور بیک وقت تغزل ... کر ... کی ... گیت گاتا رہا ہے جو ہر ... کہ ... سادہ ... دہ ہے ... مجاز کی شاعری پتہ دیکھ ... اس سے صرف اتنا کہنا ... کہ ان کے اشعار میں جزوی نازک ... غزل کی ... سے بعض جو ... جذبات اور خیالات نے مجاز کو ... سے دور ... جاتا ہے انقلاب کا نعرہ مجاز کی شاعری میں ایک عنوان بن کر آیا ۔ لیکن اس عنوان کو انجام تک پہنچانے کے لئے جس ... استقلال اور جس ریاض کی ضرورت ہوتی ہے وہ مجاز کے بس کی بات نہیں ... نئے انقلاب والی ... اس نمونے میں ایک تو ... ہے ... تکنیک میں سے تجربات کا ہے ... یہاں بھی ان کے یہاں فیض ... وغیرہ کی ... پیدا نہ ہوئی ۔ ... مجاز کی شاعری میں اضمحلال پیدا ہو چلا ہے ... انقلاب ... میں شاعر کر چکا ہوں ... کوئی عیب ... انقلاب کا مطرب بن جانا اور ... کی صحبت سے ... بعض ضرور ... ایسی صورت میں ... فیض کے بقول برسات کے دن کی سی سکون بخش خنکی اور بہار کی رات کی سی گرم جوشی ... لیکن ... سے ... مجاز کی آخری نظم ہے جو ۱۹۳۷ء میں لکھی گئی ۔

مولوی محمد داؤد عباسی

محمود احمد عباسی

روہیل کھنڈ (یو۔پی) کے مشہور و مردم خیز قصبہ امروہہ[1] کے ایک علمی خاندان میں ۳۰ رمضان ۱۲۸۰ھ مطابق ۲۹ فروری ۱۸۶۴ء کو داؤد مرحوم نے آنکھیں کھولیں۔ اس علمی خاندان کے مورث اعلیٰ مولانا رکن الدین عباسی[2] اوائل عہد مغلیہ کے مشاہیر علماء میں سے تھے۔ ان کے اخلاف میں نسلاً بعد نسل علماء و فضلاء ہوتے رہے۔ داؤد مرحوم کے والد مولوی علی محمد عباسی نے علوم دینیہ کی تحصیل و تکمیل کے بعد درس و تدریس کے بجائے وکالت کا امتحان پاس کیا اور اس پیشہ میں کامیاب و نیک نام رہے۔ انہوں نے اپنے سب بیٹوں[3] کو اس زمانہ میں انگریزی پڑھوائی جب انگریزی کا پڑھنا حرام بتایا جاتا تھا چنانچہ ۱۲ ستمبر ۱۸۷۸ء کو داؤد مرحوم ۱۵ سال کی عمر میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں داخل ہوئے اور ۱۴ ہی سال تک اکتساب علم کرتے رہے ۱۸۸۸ء میں ایف۔ اے، ۱۸۹۰ء میں بی۔ اے کی سند حاصل کی۔ خاص مضامین فلسفہ اور ادبیات فارسی تھے۔ تکمیل تعلیم کے بعد دو سال تک

---

1. روہیل کھنڈ کی بہت قدیم بستی ہے، ابن بطوطہ دوران سیاحت میں یہاں بھی آیا تھا، اپنے سفرنامہ میں امروہہ کے شیخ زاویہ اور قاضی شہر سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ "یہ ایک چھوٹا سا حسین شہر ہے"۔ اسی حسین شہر کی خاک سے جو ہر چہار طرف آموں کے سرسبز و شاداب باغوں سے گھرا ہوا ہے۔ بڑے بڑے صاحب کمال اور خاص کر ریختہ اور اردو کے نامور شعراء اٹھے مثلاً میر سعادت علی سعادت جن کو میر تقی میر نے تذکرہ میں اپنا استاد بتایا ہے۔ استاذ الاساتذہ شیخ غلام علی ہمدانی مصحفی اور دکنی طرز کی قدیم اردو کے قدیم شاعر اسمٰعیل امروہوی۔
2. یکے از اجلۂ علمائے عہد بابر و ہمایوں و اکبر شہنشاہان ہند و مورث خاندان عباسیہ متوطنہ امروہہ

   "سر برآوردۂ علم و فضل رکن الدین عباسی   بدنیائے معارف شد ز فیض او محیا" (تذکرۃ الکرام)
3. یہ سب آٹھ بھائی تھے۔ ان میں سے ایک نے جب اسکول میں داخل ہو کر انگریزی پرائمری میں dog اور cat وغیرہ لفظ پڑھے ان سے ایسی کراہت محسوس کی کہ گھبرا کر صاف کہہ دیا کہ میں ایسی کتاب نہیں پڑھوں گا۔ ان کو دینی مدارس میں بھیجا گیا۔ دیوبند اور امروہہ کے مدارس عربیہ میں تکمیل درس کے بعد دلی میں فن طب حاصل کیا اور اس فن میں اب وہ یکتائے روزگار ہیں اور یہ ہیں مولانا حکیم فرید احمد صاحب عباسی بابائے طب نزیل لاہور۔

[illegible] تحصیلدار [illegible]
[illegible] اس کام کو ایسی خوبی اور دیانت سے انجام دیا کہ [illegible] کام
سے اپنے [illegible] دوست مولوی سید طفیل احمد [illegible] مرحوم کو ۳ اکتوبر ۱۹۱۸ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"میں خدا کے فضل سے ہر گز [illegible] سے خوش ہوں، [illegible] کام سے نیک نامی کے ساتھ فارغ ہوا۔ یہ کام [illegible] سرداری اور [illegible] کا تھا، [illegible] جو کسی [illegible] دے دیا تھا کہ مناسب [illegible] صرف کرو۔ اس میں لوگوں نے سیکڑوں روپیہ [illegible] غبن کیا اور کسی نے پوچھا بھی نہیں یہ واقعات تفصیل کے ساتھ انشاء اللہ بوقت ملاقات عرض کروں گا۔ ہاں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں اس کام میں نیک نام رہا۔"

باندہ کے بعد چند اور اضلاع ایٹہ اور آگرہ وغیرہ میں تعینات رہے۔ طالب علمی کے زمانہ میں ایک مرتبہ ٹائیفائیڈ کے شدید مرض میں مبتلا ہو گئے تھے تندرست ہونے کے بعد بھی اس کا کچھ نہ کچھ اثر باقی رہا۔ ۱۹۱۸ء میں [illegible] سے متاثر ہوئے، بیماری کی رخصت بھی لی۔ [illegible] اپنے ان ہی دوست کو ۳ اگست ۱۹۱۹ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"میں بفضلہ اب بالکل تندرست ہوں، ضعف مطلق نہیں، صبح کو [illegible] دودھ، شہد کھانے کے [illegible] تیسرے پہر کو میاں فرید کی رائے سے شیرہ بادام خشخاش، الائچی [illegible] اور [illegible] کھانے کے ساتھ پھر کاڈلیور آئل۔ اتنی چیزیں استعمال کر رہا ہوں۔ ان مقویات کے سامنے تو پاس پھٹکنے والوں کا بھی ضعف جاتا رہے۔"

مگر مرض برابر بڑھتا رہا، حسن کارگزاری [illegible] تحصیلداری پر تقرر ہوا لیکن اس کے ایک سال کے اندر ہی یعنی ۴ جون ۱۹۲۰ء میں عمر تقریباً ۲۹ سال داعی اجل کو لبیک کہا اور فتح آباد ضلع آگرہ کے احاطہ عیدگاہ میں دفن ہوئے۔

نہایت سلیم الطبع، نیک نہاد، ہر دل عزیز شخص تھے۔ متانت و سنجیدگی کے ساتھ طبیعت نہایت شگفتہ تھی۔ سخن سرائی کا ذوق موہبت الٰہی تھا نہ کبھی کسی سے تلمذ حاصل تھا اور نہ کبھی مشق سخن کی، شعر فی البدیہہ کہتے۔ مولانا ظفر علی خاں صاحب نے جو کالج میں داؤد مرحوم سے کئی سال جونیئر تھے ایک موقع پر لکھا تھا:

"محمد داؤد مرحوم کو جو راقم الحروف کے زمانۂ طالب علمی میں مدرسۃ العلوم علی گڈھ کے ایک تلمیذ رشید تھے مبدأ فیاض سے سخن سرائی کا ایک خاص ذوق مرحمت ہوا تھا۔ شعر فی البدیہہ کہتے تھے اور ظرافت تو مرحوم کا خاص حصہ تھی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ کاندھلہ[1] سے جتنے لوگ علی گڈھ آئے سب کے سب امارت شعرانی کی [illegible] ہو گئے اور قدرت نے ان کے جسم کو تو [illegible] لیکن سروں کو ضرور [illegible] سے خارج البال کر رکھا تھا اس پر مرحوم کی ذیل کی اچھوتی پھبتی شہرہ ہو گئی جو اسی وقت کالج کے ہر ایک لڑکے کی زبان پر تھی

آتا ہے کاندھلے سے جو لانا ہے سر پہ گنج
قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا"

---

[1] کاندھلہ ضلع مظفر نگر یو۔ پی میں پرانا قصبہ ہے۔

[illegible] علی گڑھ کے طلباء میں خاص طور پر ... کے عادی تھے ... مرحوم کی شخصیت تنہا ایسی تھی کہ طویل زمانہ تک ... [illegible]
... [illegible] مرحوم نے اس کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی ہے :

سنہ ۱۹۰۸ء کی گرمیوں میں جبکہ میری عمر ساڑھے گیارہ برس کی تھی میں اپنے بھائی مولانا شوکت علی کے ساتھ ... بریلی کے اسکول سے علی گڑھ کے مدرسۃ العلوم میں پڑھنے کے لئے گیا ...... اس "نیچر گڑھ" میں قریباً سبھی طلباء کی ایک ہی سی وضع قطع تھی۔ شیروانی، اچکن، ترکی ٹوپی، سیدھا ڈھیلا ڈھالا پاجامہ، قمیص بوا بگڑ پہ جوتا، یہ سب کا لباس تھا۔ کوئی شیروانی کی جگہ ترکی کوٹ پہن کر آتا تھا، ترکی ٹوپی کی جگہ کوئی سیاہ ایرانی ٹوپی اوڑھا کرتا تھا۔ کوئی کبھی کبھی کرتہ بھی پہن لیا کرتا تھا مگر داڑھیاں سوائے ایک آدھ کے سب کی منڈی ہوئی ہوتی تھیں مگر مونچھوں کے بھی صفایا کرانے کا فیشن اس وقت تک رائج نہیں ہوا تھا۔ بال سب کے آگے سے بڑھے ہوئے پیچھے سے بتدریج زیادہ کترے ہوئے ہوتے تھے جو آج سارے ہندوستان میں رائج ہیں اور جنہیں ولایت تک کی عورتوں نے اسی طرح کتروانا قبول کرلیا ہے اور جو "ایٹن کراپ" کے نام سے موسوم ہیں لیکن جس کچی بارک میں ہم دونوں بھائی رہتے تھے اس کی پاس والی کچی بارک میں اور اس بیچ والے کمرے میں جہاں ایک عرصہ سے "ڈول ہاؤس" بن گیا ہے، ایک دراز قامت مگر خاصے دبلے پتلے صاحب رہتے تھے جو خالص ہندوستان کی پرانی وضع کی اچکن پہنا کرتے تھے جن کی ٹوپی ان کے وطن امروہہ کی ساخت کی کشتی نما ہوتی تھی (جس کو اب "گاندھی کیپ"[1] کہا جاتا ہے)۔ جس کا جوتا دہلی کا سلیم شاہی وضع کا گرگابی ہوتا تھا اور جن کے بال رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح لانبے تھے اور اگرچہ "بر دوش" نہ سہی لیکن تابہ گوش ضرور آتے تھے تاکہ ان لمبے بالوں کے باعث اچکن پر تیل وغیرہ کا دھبہ نہ پڑ جائے۔ وہ گردن پر ایک بیٹھا ہوا خاصے کا رومال اسی طرح ضرور باندھا کرتے تھے جس طرح سر سید رحمۃ اللہ علیہ اپنے گلے کی رسولی چھپانے کے لئے استعمال فرمایا کرتے تھے۔ یہ وضع قطع اس زمانہ کے بزرگوں کی اس وقت تک باقی تھی۔ لیکن علی گڑھ جیسے "نیچر گڑھ" کے کسی طالب علم کا اس وضع قطع کو برقرار رکھنا اس زمانہ میں اس سے بھی زیادہ نمایاں تھا جتنا کسی یورپین لیڈی کا آج بڑے بال رکھنا، نیچا سایہ پہننا اور سینہ اور گردن، بازوؤں اور بانہوں سب کو کپڑے سے ڈھانپنا آج نمایاں ہوگا اس لئے میری نظر بھی آتے ہی ان بزرگ پر پڑی اور اگر انہیں کسی اور طرح کا امتیاز نہ بھی حاصل ہوتا تب بھی میں ضرور اپنے بھائیوں سے پوچھتا کہ یہ اس عجیب و غریب وضع قطع کے بزرگ کون ہیں۔ لیکن محمد داؤد صاحب کو کون نہیں جانتا تھا۔ علی گڑھ کالج میں اس وقت سب سے زیادہ ممتاز اور ہر دلعزیز جو جماعت تھی اور جس میں محمد حبیب اللہ خان صاحب[2]،

---

[1] گاندھی کیپ اور امروہہ ساخت کی ٹوپی میں نمایاں فرق تھا۔ امروہہ ساخت کی ٹوپی ساٹن پر کلابتوں اور ریشم سے کڑھی ہوئی ہوتی تھی اور گاندھی ٹوپی کھدر کی۔

[2] یعنی خان بہادر الحاج مولوی محمد حبیب اللہ خان صاحب بی۔ اے (علیگ)، سابق کلکٹر یو۔ پی جنہوں نے اپنے مادر علمی کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اور اب بھی پیرانہ سالی میں انجام دے رہے ہیں۔

احمد حسین مرحوم[1] [illegible] بیگ[2] بھی شامل تھے ان کے بعد بیچارے داؤد [illegible] کمبخت [illegible]
کہ انھوں نے [illegible] کی تضمین کی تھی:

داؤد مرحوم کو اس کالج میں یہ [illegible] ان کی شاعری شگفتہ [illegible] سے بحث کرنے کی وجہ سے [illegible] طبیعت کچھ ایسی تھی کہ اس سنجیدگی و متانت کے باوجود کبھی خود قہقہہ مار کر ہنستے [illegible] اور ساتھیوں میں ان کے لطیفے [illegible] مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے کالج کے زمانے کے دو ایک لطیفے لکھے ہیں۔ مولانا حالی مرحوم کی مشہور غزل ہے

ان کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

مقطع ہے

ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

اس مقطع کی جو تضمین داؤد مرحوم نے کی تھی مولانا محمد علی مرحوم اس کے متعلق لکھتے ہیں:-

"باوجود پوری سنجیدگی کے داؤد مرحوم کی طبیعت نہایت شگفتہ تھی اور مولانا حالی کی مشہور غزل کے مقطع پر جو تضمین انھوں نے لکھی تھی اس نے تو مولانا حالی تک کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا تھا کہ داؤد میری ساری غزل لے لیں صرف میرا تخلص مقطع سے نکال ڈالیں تو میں خوش اور میرا خدا خوش۔ مگر تضمین کیا تھی گویا ایک ہی مصرعے نے مولانا مرحوم کے شعر کا ستیاناس کر دیا۔ سنئے

گر کرے قصد کسی کام کا دل میں انساں | پہلے یہ دیکھ لے اس کام کے سب ساماں
سن کے [illegible] | ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر میں مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت"

اس کے بعد مولانا مرحوم ایک اور لطیفہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"بزرگوں کی شان میں داؤد صاحب نے صرف یہی ایک گستاخی نہیں کی تھی۔ کالج میں ایک مرتبہ ہز [illegible]

---

1. احمد حسین بی۔ اے (علیگ) مرحوم ۱۸۸۲ء میں کالج میں داخل ہوئے۔ ۱۸۹۰ء میں بی۔ اے پاس کر کے ریاست رامپور کے اسٹیٹ ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر رہے۔ عرصہ ہوا انتقال کر گئے۔

2. مرزا قسیم بیگ چغتائی بی۔ اے (علیگ)، آگرہ کے رہنے والے ۱۸۸۳ء میں فرسٹ ایر میں کالج میں داخل ہوئے ۱۸۸۸ء میں بی۔ اے پاس کر کے اول علی گڑھ کے ایک کلکٹر کے جس کی آنکھیں خراب تھیں پرسنل اسسٹنٹ ہوئے پھر کچہری میں مترجم ہو گئے اس کے بعد آگرہ کالج میں وارڈن رہے اور پھر اتفاق سے ڈپٹی کلکٹر ہوئے۔ خان بہادری کے خطاب یافتہ تھے۔ آخر میں جودھ پور میں بھی رہے۔ بڑے لطیفہ گو تھے ان کے کئی بیٹے تھے جن میں مرزا عظیم بیگ چغتائی افسانہ نویسی میں مشہور ہوئے۔

3. تضمین کے اس واقعہ کو مولانا ابوالکلام آزاد صاحب نے بھی یادگار حالی مؤلفہ صالحہ عابد حسین کے مقدمے میں بیان کیا ہے لیکن تضمین کے مصرعے بھی غلط لکھے ہیں اور داؤد مرحوم کا حال بھی صحیح نہیں لکھا اور بھی متعدد اصحاب نے جنہوں نے یہ لطیفہ بیان کیا ہے ایسی ہی غلطیاں کی ہیں۔

[illegible] مرحوم [illegible] کالج میں [illegible] مولانا شبلی [illegible]
[illegible] مرحوم [illegible] مولانا شبلی [illegible]
[illegible] صاحب نے اسی وقت کہہ دیا ؎

آج کالج میں ہے یہی چرچا عام ۔۔۔ غل کا ہے ہر طرف سے ہجوم
یہاں اٹھی رحم ستی مرحوم ۔۔۔ "کس نہ آید بزیر سایۂ بوم"
الّا مولانا شبلی مخدوم"

مولانا شوکت علی مرحوم کو داؤد مرحوم کے بہت سے لطیفے کالج کے زمانے کے یاد تھے۔ مولانا شبلیؒ نے ایک مسدس اردو میں لکھا تھا جس کا ایک بند یہ تھا ؎

بانیٔ مدرسۃ "سید" والا گوہر ۔۔۔ وہ جیمنگ کمیٹی کے معزز ممبر
شبلیٔ غمزدہ وہ شاعر اعجاز اثر ۔۔۔ اور یہ زبادۂ اقبال کے سب بگڑے فر
نہ تکلف کے کچھ انداز نہ کچھ جاہ کی شان
بزم میں آتے ہیں اس حال سے [illegible] کی شان

اسی طرح جب مولانا موصوف قسطنطنیہ کے سفر سے واپس آئے ایک ڈنر کے موقع پر فارسی نظم پڑھی جس کے چند شعر یہ تھے ؎

کالج امروز بہ آں فرحشاں است کہ بود ۔۔۔ بزم ما گرمیٔ ہنگامہ رجاں است کہ بود
ہر یکے بکٹ[2] و مارسین[3] و آرنلڈ[4] و ہوارسٹ[5] ۔۔۔ ہم چناں مدرسۂ مادر دوراں است کہ بود
واں وگر دیدہ وراں کز بہ اسکول بوداند ۔۔۔ ہم چناں می طلب از تہ جاں است کہ بود
شبلیٔ غمزدہ آں بوقلموں طرف بساط
ہم بہ آں طرز نوی زمزمہ خواں است کہ بود

"ہماں است کہ بود" ردیف وقافیہ تھا اور حسب معمول اپنے نام کے ساتھ "غمزدہ" باندھ گئے تھے اس سے اس زمانہ میں وہ کالج کے طلبہ میں

---

[1] مولانا شوکت علی مرحوم نے "علی گڑھ کالج کی ایک عجیب و غریب شخصیت" کے عنوان سے جو مضمون لکھا تھا اس میں بھی "یوم" والا لطیفہ بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ "مولانا شبلیؒ نے جب یہ قطعہ سنا فوراً تاڑ گئے کہ یہ پھبتی داؤد مرحوم کے سوا اور کس کو سوجھ سکتی ہے چنانچہ انہوں نے خود بھی اس کی بہت داد دی۔" "یوم اول" کے بارے میں کہتے ہیں کہ "بدایوں یا بریلی کے رہنے والے گوری رنگت بڑے بڑے دانت والے خوش وضع تھے مگر شے لطیف کی غذا کی تھی جس کسی ہم جماعت سے رنجش ہو جاتی اپنے کمرے میں پنسل سے دیا سلائی سے اس کی تصویر بناتے اور جوتے سے کھونے کے چمچے سے تصویر پر نشانہ بازی کرتے۔ ان کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ حوائج ضروری سے فارغ ہونے کے لئے جب پاخانہ میں بیٹھتے "اونہہ" "اونہہ" کی زحمت سے بچنے کے لئے مولانا حالی کے "شکوۂ ہند" کے اشعار بلند آواز سے پڑھتے۔ مولانا شبلی سے بھی عقیدت تھی اور بلا کی طرح ان کے پیچھے رہتے تھے۔

[2] مسٹر بک پرنسپل کالج [3] پہلے پروفیسر تھے مسٹر بک کے بعد پرنسپل ہوئے [4] مسٹر آرنلڈ عربی کے پروفیسر اور مشہور کتاب پریچنگ آف اسلام کے مؤلف [5] مسٹر ہوارسٹ اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔

[illegible]

[illegible] ہے۔

شیخ خود در صف [illegible]

رنگ او [illegible]

مولانا محمد علی جوہر لکھتے ہیں:

"چودھری خوشی محمد خاں صاحب[3] کالج کے پرانے طالب علم ہیں۔ اپنے شعر کے لحاظ سے وہ گمنام شاعر تھے اور آرنلڈ صاحب اور مولانا شبلی خاص طور سے ان کے قدردان تھے مگر چودھری صاحب کی زبان پر پابندی نہ تھی اس لئے کبھی نظم میں ماذر صاحب اور کبھی نثر میں عبدالحق صاحب جو آج کل اورنگ آباد میں اردو کی خدمت کر رہے ہیں[2]، اس زمانہ میں کالج میں "بنٹ پال" کے عرف سے معروف تھے، چودھری صاحب کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ چودھری صاحب نے ناصر کی نظر "سیر فلس" پر لکھی، پڑھ کر جو ان کے کورس میں داخل تھی ایک نظم لکھی تھی جس پر مولانا شبلی کے مشورہ سے آرنلڈ صاحب نے انہیں ایک انعام دلوایا تھا اس میں ایک موقع پر چودھری صاحب لکھ گئے تھے کہ "ناظر! اب سیر سبزہ کر ڈالو"۔ ناظر آپ کا تخلص تھا اور قد میں ناظر صاحب کے متعلق کہا جا سکتا تھا کہ "نظر ایں ماہ با کیفیت خلقت" اس لئے ناممکن ہو گیا کہ اس مصرع کی داد نہ دی جائے جو اس پر ماذر صاحب نے لگایا تھا۔

ناظر صاحب فرماتے ہیں ——— ناظر! اب سیر سبزہ کر ڈالو

ماذر صاحب اس پر لکھتے ہیں ——— اپنے آگے کی گھاس چر ڈالو

نواب محسن الملک مرحوم جب حیدرآباد چھوڑ کر علی گڑھ چلے آئے اور صرف جو سر سید کے رشتے سے ملتے تھے۔ اب نواب صاحب کے پاس جانے لگے اور علی گڑھ کے سدا بہار کالج کی حسب دستور شکایت کرنے لگے تو نواب صاحب نے بھی "حسب دستور" اصلاح کے بہت سے وعدے کئے ان وعدوں

---

[1] قرۃ العین حیدر صاحبہ نے "بلدم" کے حالات میں دو حاشیہ ص ۱۳۳ "شخصیات نمبر — نقوش — طبع ثانی" ۱۹۵۷ء یہ شعر بہ تغیر بعض الفاظ نقل کیا ہے لیکن مولانا شوکت علی مرحوم کے سامنے کہتے رہے اور وہ اس شعر کو اسی طرح پڑھا کرتے تھے اس کے علاوہ "خر سیہ چوں بر ...... " ...... جنہوں خر پا شد" کے متعدد شعر بھی سنایا کرتے تھے جو ماذر صاحب مرحوم کے کہے ہوئے تھے۔

[2] یعنی ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب بابائے اردو — مولانا محمد علی مرحوم نے جس زمانہ میں (یعنی ۱۹۲۳ء میں) یہ تحریر لکھی تھی ڈاکٹر صاحب اورنگ آباد میں بسلسلہ ملازمت مقیم تھے اور وہیں انجمن ترقی اردو کا دفتر اور پریس بھی قائم کیا پھر چند سال بعد ملازمت سے ریٹائر ہو کر دہلی آ گئے۔ فسادات دہلی میں کتب خانہ انجمن برباد ہو گیا اس کے بعد کراچی آ کر از سر نو انجمن کا کتب خانہ، مطبع وغیرہ قائم کیا اور اردو کالج کی بنیاد ڈالی جو اب اعلیٰ درس گاہ ہے۔

[3] چودھری خوشی محمد خاں بی۔ اے علیگ نے ۱۹۰۳ء میں فرسٹ ڈویژن میں بی اے کیا۔ انگریزی سرکار میں آنے کے ساتھ ہی ریاست کشمیر میں اعلیٰ منصب پر فائز رہے۔ قومی نظمیں بہت کہی ہیں انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسوں میں خاص طور سے پڑھی جاتی تھیں۔

جواب لکھو، صوفی صاحب نے فارسی میں ایک نظم کہی جس کا قافیہ ... استاد مرحوم شبلی کے شاگرد رشید اور محبوب خاص سے اسے سنانے کے انداز سے یونین میں پڑھا۔ ان کے بعد ... تخلص لقب ان کا ملتے ہوں گے اسی بحر اور قافیہ میں راؤ صاحب نے بھی فوراً ایک شعر کہہ دیا اور اسی ... سے اپنے خاص حلقہ میں پڑھ کر سنا بھی دیا۔ وہ یہ تھا ؎

خوب تر صحرا نوردی می کند
اشتر پنجاب در ہندوستان

اب قارئین کرام راؤ صاحب کے لگائے ہوئے مصرعہ کا لطف پوری طرح اٹھائیں گے ؎

ناظرا اب سیر سبزہ کر ڈالو
اپنے آگے کی گھانس چر ڈالو"

حامد علی خاں[1] کے کمرے سے جو کالج میں "منشی ستائیس" کہلاتے تھے، ان کی ٹائم پیس گھڑی چوری ہو گئی تھی۔ میز پر گھڑی کا خانہ خالی پڑا تھا۔ واقعہ حسرت مرحوم، مصرع آنکھے چوری کا واقعہ سنا اور فی البدیہہ چند مصرعے موزوں کر کے گھڑی کے خانہ میں لکھ دیئے۔ آخری مصرعہ تھا ؎

چور گھڑی لے گیا کیوں نہ ہو خانہ خراب

علی گڑھ میں تعزیہ داری کے جلوس کے سلسلہ میں سخت ہندو مسلمان فساد ہو گیا تھا، اس فساد کی وجہ سے کالج بھی کچھ دن کے لئے بند کیا گیا تھا۔ ہندوؤں کا لیڈر لالہ بدری پرشاد وکیل تھا اور وہی مقدمہ کی پیروی میں پیش پیش تھا۔ مقدمہ کی پیشی کے دن ایک پرجوش مسلمان [illegible] نامی نے کچہری کے احاطہ میں لالہ بدری پرشاد کی ناک کاٹ لی۔ لالہ بڑے بزدل تھے غش کھا کر گر گئے اور پیشاب پاخانہ خطا ہو گیا۔ حالی مرحوم نے اس واقعہ پر نظم لکھ ڈالی جس کے دو شعر یہ تھے ؎

واہ رے [illegible] خاں قربان تیرے جائیے	ناک کاٹی ہے عدالت میں تجھے [illegible] کی
کیا زبوں حالت تھی لالہ بدری پرشاد کی	منہ سے گریہ کی صدا تھی اور [illegible] کی

مولانا شوکت علی مرحوم اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

" بہادر علی جن کا بیٹا اختر علی تحریک خلافت کے زمانہ میں میرا اسیکرٹری رہا تھا، وہ غریب اسکول میں تعلیم دینے لگے۔ نیک طینت شخص تھے، لانبی داڑھی رکھتے تھے جس کی وجہ سے ہر شخص ان کا مذاق اڑاتا تھا۔ انہوں نے بی۔ اے میں ریاضی لی تھی۔ چونکہ عام خیال یہ تھا کہ مسلمان ریاضی میں کمزور ہوتا ہے اس لئے ہماری پارٹی کے مسٹر کمال الدین نے جو عبدالرحمٰن صدیقی کے بہنوئی سورت کے رہنے والے اور فٹ بال کے کپتان تھے، ان کا نام "بابو لٹھوش" بروزن "بابو گھوش" رکھ دیا تھا۔ جب ریاضی کا مضمون انہوں نے چھوڑ دیا تو "بابو گھسیٹے" بروزن "بابو گھوسلے" کی پھبتی ہوئی۔ غرضیکہ جب بہادر علی اسکول میں درس دینے لگے تو

---

[1] حامد علی خاں ساکن فتح گڑھ ۱۸۸۹ء میں فرسٹ ایئر میں داخل ہوئے ۱۸۹۳ء میں بی۔اے کیا اولاً نائب تحصیلدار پھر تحصیلدار ہوئے۔ امروہہ میں تعینات تھے، شکار کھیلتے میں بندوق کا نشانہ اتفاقاً لگا اور جاں بحق ہوئے۔ کسی موقع پر وہ کالج میں انیس بیس کے فرق کو یہ کہہ بیٹھے تھے کہ یا تو فرق چار کا ہوگا یا ستائیس کا۔

... صاحب مرحوم نے ... صاحب کی ہجو میں ایک مثنوی تصنیف کی جس کے پہلے شعر یہ
ہیں ... کے چند شعر حسب ذیل ہیں —

کہاں ہیں ... کدھر ہے تمہارا ... کیسا ... ہے
بس اب ... یہ ... بس اب ... یہ زمانہ ... ہے

مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے اپنے ذوقِ شعر کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ:

"شعر نے جس شخص کے لئے اتنی قدر و قیمت حاصل کی تھی اس کی ... ہو گئی ہو" وہ بھلا شعر کا عاشق کس طرح نہ ہوتا جبکہ اسے اس کا زمانہ معلوم ہو گیا ہو کہ داؤد صاحب کا بھی یہی حال تھا۔ میں نے سنا تھا کہ چودھری ممتاز حسین صاحب[1] کو آپ کے کلاس فیلو زین الدین صاحب[2] کے ساتھ خاص الفت تھی مگر زین الدین صاحب جس طرح ۱۹۲۱ء میں ان کو اپنی ترک موالات[3] پر عمل کرنے میں مشہور تھے اسی طرح اس زمانہ میں چودھری صاحب پر یہاں تک ظلم فرمایا کرتے تھے کہ بیچارے چودھری صاحب نے خودکشی کی ٹھان لی تھی۔ اس قصہ کو داؤد صاحب نے ایک مثنوی کی شکل میں منظوم کیا تھا اور ۱۹۰۱ء سے مجھے اس کا ایک شعر یاد تھا جس میں زین الدین صاحب کا اپنی کوٹھی سے یہ سنتے ہی گھبرا کر باہر نکل آنا بیان کیا گیا ہے —

نہ ہوا سر پہ تھی نہ سر پہ چھاؤں
اس پہ طرہ یہ تھا کہ ننگے پاؤں

اس مثنوی کو میں بھلا کر دکھاتا لیکن کسی نہ کسی کی زبانی میں نے یہ شعر سن لیا تھا اور گو زیادہ عصیان کے باعث حافظہ اب بالکل برباد ہو گیا ہے لیکن الحمدللہ بچپن کے سنے سنائے اشعار اب تک یاد ہیں۔ جب میرے عزیز دوست محمود احمد صاحب عباسی نے یہ ارادہ ظاہر کیا کہ اپنے مرحوم بزرگ عباسی کی اس مثنوی کو وہ پھر شائع کرائیں گے اور تقریظ لکھنے کی مجھ سے فرمائش کر کے مجھے وہ مثنوی دکھائی تو میں نے سب سے پہلے اس شعر کی تلاش کی اور عجیب مسرت ہوئی جب اس کو اسی طرح مثنوی میں اسی موقع پر جس کا میں نے اپنے حافظہ سے اوپر ذکر کیا ہے پایا۔"

مثنوی کا نام "شکوۂ یار" رکھا، پانچ سو سے زیادہ شعر ہیں ۱۹۲۱ء میں طبع ہوئی۔ دیباچہ میں خود لکھتے ہیں:

---

[1] چودھری ممتاز حسین مرحوم ولد علی بخش ساکن پانی پت۔ ۱۰ رجون ۱۸۹۱ء میں علی گڑھ کے مدرسۃ العلوم میں داخل ہوئے اور ۱۹۰۱ء میں انٹرمیڈیٹ پاس کر کے کالج چھوڑ دیا، اولاً نائب تحصیلدار رہے پھر تحصیلداری پر ترقی ہوئی کچھ عرصہ ریاست دوجانہ میں منیجر رہے —— عرصہ ہوا انتقال ہو گیا۔

[2] سید زین الدین مرحوم ایم۔اے سید زین العابدین مرحوم کے فرزند تھے جو سر سیدؒ کے احباب خاص میں سے تھے اور علی گڑھ میں سب جج تھے۔ سید زین الدین مرحوم کا تقرر براہ راست ڈپٹی کلکٹری پر ہوا، پھر کلکٹر ہوئے۔ ابتدا آپ بڑے فیشن ایبل تھے، آخر میں مذہب کا رنگ غالب آیا۔ کچھ عرصہ ریاست رامپور میں ریونیو منسٹر رہے۔ جب کبھی ملنا ہوتا اکثر داؤد مرحوم کا ذکر کرتے اور ان کے لطیفے سنایا کرتے تھے۔ مجھے اجازت دی تھی کہ مثنوی اور ان کے نام کے قطعہ کو بااظہار نام چھپوا دوں۔

[3] یعنی کانگریس کی تحریک عدم موالات پر عامل "Non-Cooperation"

"یہ بات ہے کہ مستکلا رت بھی حاصل نہیں۔ مشہور ہے کہ بابا طاؤس کی ... ہر ... [illegible] ... سے ... [illegible] ... اپنی [illegible] ... سے [illegible] ... زیں کو طبع کرنے سے منع کرتا ہوں۔ پہلے ہی مجھ کو [illegible] ... کر میں اس کو طبع کرا دوں مگر مجھے یقین نہ تھا کہ طبع ہونے کے بعد مطبوعہ ہوگی لہٰذا احباب ذکر سکا اور [illegible] چھپانے کے چھپانے کی کوشش کی لیکن ان کے سخت اصرار اور متواتر تقاضوں نے اب مجھ کو اس بات پر مجبور کیا کہ اس کو طبع کرا کے پبلک کے سامنے اپنی یاوہ گوئی اور ژولیدہ بیانی کے ثبوت دوں۔"

تمہید کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

قلم رو جہاں دکھا جوہر — خامۂ دُرفشاں دکھا جوہر
وقت آیا ہے خوش بیانی کا — امتحاں آج ہے روانی کا
گل مضموں رنگ دکھلائیں — آج کاغذ پہ پھول کھل جائیں
لب پہ تحسین بار بار آئے — گلشنِ نظم میں بہار آئے
ہر ورق رشکِ سنبلستاں ہو — مثنوی غیرتِ گلستاں ہو
بحرِ مضموں میں ہو تلاطم آج — جوش میں آئے قلزمِ مواج
کس طرح سے میں سخن کے زمزمہ ساز — کھولتا ہوں در خزینۂ راز
عرصۂ نظم گھیرتا ہوں میں — آج موتی بکھیرتا ہوں میں
گوہرِ دُر کی کان ہے سینہ — جوہری کی دوکان ہے سینہ
تھے جو مضمون ازل سے سربستہ — ہیں مرے سامنے کمربستہ
توسنِ فکر ہو جو گرم عناں — پردۂ غیب کے ہوں راز عیاں
پھر کے اک پل میں چار سو آئے — جب اُٹھائے آسماں کو چھو آئے

اسی طرز کے چند اور شعر ہیں پھر "کیفیت ابتدائے الفت" کے عنوان سے یوں شروع کیا ہے ؎

اب سنیں صاحبانِ سوز و گداز — قصۂ درد و غم کا ہے آغاز
اک مرے دوست اور کرم گستر — ذی خرد، ذی شعور، دانشور
نکتہ رس، نکتہ سنج، خوش اطوار — ساری باتوں میں الغرض ہشیار
مگر آگاہ بے مزا الفت سے — نابلد محض ہے محبت سے
دور دل سے یہ لطف تھے سارے — جانتے ہی نہ تھے یہ بیچارے

لہ محمد ضمیر گمری ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے ۶ مئی ۱۸۸۱ء میں کالج میں داخل ہوئے ۱۸۸۸ء میں سیکنڈ ایر سے تعلیم چھوڑ کر چلے گئے پہلے سب انسپکٹر ہوئے پھر اکسائز انسپکٹر پھر تحصیلدار۔ داؤد مرحوم کے گرے ہیں وہ ادماں کے بڑے بھائی محمد عبید ... کلکٹر ہوتے رہتے تھے محمد ضمیر بڑے ... تھا اور سید زین الدین سے ان کی دوستی تھی۔

[illegible]   [illegible]

جس کے [illegible]   اس سے [illegible] طبیعت ہو

اس کے [illegible] ہو مرغان   اس سے ہو کر کوئی [illegible] خالی

اس کو الفت [illegible] زندگی [illegible]   گھر [illegible] کے آدمی کا [illegible]

اس کی تلخی میں بھی حلاوت ہے   اس کی تلخیت میں بھی راحت ہے

اس سے دل میں سوز آتا ہے   اس سے آنکھوں میں نور آتا ہے

اس کی بنائی نامہ کا باعث   اس کی [illegible] کا باعث

یہ خزاں ہے بہار سے بہتر   ہجر [illegible] سے بہتر

حق ہے باعث خوشی اس میں   موت ہے عین زندگی اس میں

اس کے ہیجان سے ہوش آتا ہے   خود بخود دل میں جوش آتا ہے

اس کے غم میں بھی اک مزا ہے   اس کی ہر بات سے نرالی ہے

اس نے پائی ہے کچھ عجب تاثیر   خاک اس کی نظر سے ہو اکسیر

قدمیں بجوں سے سنا ہے مس ہو   جس کو یہ مس کرے وہ پارس ہو

جس پہ یہ مہرباں ہوتا ہے   وہ [illegible] ہوتا ہے

شہرہ عام قیس نے پایا   کس قدر نام قیس نے پایا

تخم الفت کا ایک فرہاد   سرخرو اس سے ہو گیا فرہاد

اس کے غم سے نہ تھا جو دل خالی   رتبہ عشاق میں ہوا عالی

دقتیں ہیں مگر ہزار اس میں   ہر کسی کو نہیں ہے بار اس میں

اس جنوں کے لئے ہے سر درکار   اس تحمل کو ہے جگر درکار

اس میں زور آزمانے مشکل ہیں   اس کے صدمے اٹھانے مشکل ہیں

جو کوئی یہ مصیبتیں جھیلے   پہلے وہ اپنی جان پر کھیلے

جان ہر ایک کھو نہیں سکتا   ایسے ویسوں سے ہو نہیں سکتا

اس میں لازم ہے مستقل رہنا   اس کے صدمے بجان و دل سہنا

چوٹ پر چوٹ کھائے اف نہ کرے   لاکھ صدمے اٹھائے اف نہ کرے

یہ مثنوی جب چھپ گئی اس کی بڑی شہرت ہوئی۔ کالج کے ہر بے فکرے کی زبان پر اس کے اشعار رہتے تھے۔ شدہ شدہ سید [illegible] مرحوم کے پدر بزرگوار سید زین العابدین صاحب کو خبر ہو گئی وہ ایسے برہم ہوئے کہ سر سید سے شکایت کی۔ انہوں نے مسٹر بک پرنسپل سے کہا مگر مولوی صاحب مرحوم طلبہ اور اسٹاف دونوں میں بڑے ہر دلعزیز تھے اور مسٹر ہورسٹ ہیڈ ماسٹر خاص طور سے ان کے مداح تھے۔ سید محمود مرحوم کو بھی ان کے بعض لطیفے خاص کر مولوی شبلی کے متعلق پسند آئے تھے ان حالات میں کوئی اقدام ان کے خلاف نہیں کیا جا سکتا تھا بالآخر مسٹر بک نے

[illegible] کے ملازمت کی سفارش [illegible] نہ ملنے [illegible]
بھی بیٹی کی ولادت پر [illegible] ایک نظم میں شکوہ بھی کیا تھا کہ دوستوں نے نہیں بلایا ہے ناؤد مرحوم نے جو قطعہ [illegible]
دیا تھا وہ یہاں درج کرتا ہوں ۔

کیسا یکایک بھلا دیا ہے کا سبب — اور حقیقت میں واقعی بات بھی تھی یہ حال
یعنی ہر ہفتے کی آخر میں ہوتی تھی حالت — اور جس قسم کی تھی اس سے کیا پریشان حالی
کم زیادہ وہ ہی حال تمہارا ہے کہ تم — جس طرف دیکھئے ہو پاتے ہو میدان خالی
لاکھ کوشش کرو اب کوئی نہیں بیٹھنے کا — محض بے سود ہے گو کیسی ہی دیکھا بھالی
جو دھری بگڑ گیا یک ہے جو کچھ کرنا تھا — اس کی ہمت بھی تو تھی جو نکلے ایسے عالی
اب وہ دم ہے کسی میں نہ وہ جوش و خروش — اور ادھر قہر ہے یہ بھی ہے چھائی ہوئی کنگالی
یعنی خود غم کر کے افسوس اب تم میں کچھ — نہ رہی بات وہ لوگوں کو رہنے والی
اب نہیں وہ کہ جسے چاہے پھونک دیا — گویا آگ آتش تھی جس نے میں ہوا دے ڈالی
حل کیا جب کوئی بیچارہ تو دل اینٹھ لیا — صبر و ہمت کی جو کچھ جمع تھی سب کھو دی
ہو گئے علم میں جب طاق [illegible] میں استاد — خوب ان تاروں میں جب مشق بہم پہنچالی
تو یکایک صف عشاق سے نکل آگے — [illegible]
[illegible] کر دی قیامت برپا — [illegible] وہ مسل ڈالی
[illegible] سے دیکھے [illegible] — پاتی تھی اس نے صیبت بھی عجب [illegible]
اس کی الفت [illegible] میں کیا کیا — [illegible] اک ٹکڑا ڈالی
قوم بھی شاد [illegible] اس کے باعث — اور اس نے بھی [illegible] شہرت پالی
اس زمانہ کے اندر جانے کا اب کچھ فضول — شہرتِ عشق [illegible] برگزیدہ والی
اب کوئی اور اسی قسم کی سوچو تدبیر — شغل کچھ چاہئے اچھا نہیں بیٹھا خالی
ہم بتا دیں تمہیں اب اس پہ عمل کرنے لگو
"قحبہ چوں پیر شود پیشہ کند دلالی"

ناؤد مرحوم کے عزیزوں میں علی حسین عباسی ایک معتبر بزرگ دمہ کے مریض تھے ۔ کھانسی کھنکار بلغم تھوک سے بر دم واسطہ۔ اپنی قبر کے لئے انہوں نے پہلے ہی سے جگہ تجویز کر لی تھی اور خاندانی قبرستان سے ذرا دور ہٹ کر ایک چبوترہ بھی بنا دیا تھا لیکن جب ۱۸۹۷ء میں مراد آباد خانی آبادی [illegible]

ا اس زمانہ میں "روز و فرزی نند" شائع ہوا تھا جس کا نام تھا ، زین الدین اور ناؤد مرحوم انگریزی تحریر کی قابلیت بڑھانے کے لئے انگریزی خطوط لکھا کرتے تھے۔ ایک روز کی طرف سے اور دوسرا فرزی نند کی جانب سے ۔
۲ یعنی چودھری ممتاز حسین مرحوم ساکن پانی پت ضلع کرنال ۔
۳ اس زمانہ میں ناؤد مرحوم کالجیٹ اسکول میں ٹیچر تھے ۔

[illegible] ... فرزند

[illegible] ... مرحوم

گئے ... [illegible] ... مرحوم کو خود ...

[illegible] ... لکھتے ہیں

مر گئے ہیں بشیر میاں جب سے — دل میں اٹھتی ہے ان کی اک ہوک

تھے بڑے نیک بخت اور دیندار — کر لیے جیتے جی [illegible]

جنتی ہونے میں نہیں ان کے — دوست دشمن کسی کے دل میں شکوک

سب نے لکھی ہیں ان کی تاریخیں — بس گئی اک خدا مجھ ہی سے چوک

اس لئے آج میں نے بھی اپنی — تاریخ کی فکر یا کردی ہے کوک

سب سے یہ مصرع ہوئی ہے عجب — کس کو لکھنے ہیں [illegible]

بڑھا یا غم کر ہو گئے بے گھر

تاریخ لکھا [illegible]

۱۸۹۹ء

داؤد صاحب مرحوم کی بیاض میں جو راقم الحروف کے پاس اب تک موجود ہے میر انیس، مرزا دبیر، میر مونس کے متعدد مرثیے خاص کر وہ مرثیے جو حسن بیان، صنائع لفظی و بلاغت کے عمدہ نمونے ہیں نقل ہیں۔ ۱۰۰ سال پہلے زمانہ طالب علمی میں ان مجالس کی شرکت سے جو پٹنہ اور حاجی پور میں ہوا کرتی تھیں راجہ باقر علی خاں کے یہاں محرم کی مجلسیں ہوا کرتی تھیں اور لکھنؤ سے ذاکر و مرثیہ گو آتے تھے۔ معلومات سے اپنے ولی عہد مرزا سعد علی کو جو کہ زیر تعلیم تھے انگریز پولیٹکل ایجنٹ کی ہدایت سے تعلیم و تربیت کے لئے علی گڑھ بھیج دیا تھا۔ ابھی چند ہی سال ہوئے تھے کہ اس نوجوان کو [illegible] کے لئے دہلی واپس جانا پڑا جہاں پہنچتے ہی پایا تھا کہ مخالف پارٹی نے راستے ہی میں بڑی بے دردی سے قتل کرا دیا۔ [illegible] کے طلبا پر اس قتل کا اثر پڑا اور انھوں نے انگریزی میں اس کا مرثیہ لکھا۔ وہ خود بھی شاعر تھے اور داؤد مرحوم کی خوش فہمی کی قدر داں۔ انھوں نے فرمائش کی کہ داؤد اردو میں مرثیہ لکھیں۔ داؤد مرحوم نے فرمائش کی تعمیل میں جو مرثیہ لکھا صاحب تحفہ جاوید کی رائے میں مرثیہ یوسف خاں سے ان کی غیر معمولی عقیدت، معاملہ بندی اور مضمون پسند فکر کا رنگ مترشح ہوتا ہے۔ حق یہ ہے کہ یہ مرثیہ اپنے رنگ میں فرد ہے۔ اب یہ مرثیہ سنئے

خشک اور ویران صحرا میں بلوچستان کے — اک کھلا تھا پھول ناز کہ نہایت خوشنما

باغباں دہر نے دیکھا نہ ہوگا کوئی پھول — اس سے بہتر تر و تازہ اور دلفریبی کے سوا

گلشن عالم میں ہاں کر گل کھلے ہونگے مگر — کہہ سکا کوئی اس سے زیادہ دلربا

لیکن اس کے واسطے موزوں نہ تھی وہ سرزمین — وہ گل تر ایسے ریگستان کے قابل نہ تھا

ل برعایت روزہ ماہِ رمضان

ل داؤد مرحوم کے رفیق اور ساتھی قطب الدین صاحب (رشو) کے جو بعد میں حیدرآباد کے مشہور افسر مال رہے۔ عالیجناب راجہ باقر علی خاں کے [illegible] کے مصاحب تھے اس لئے داؤد صاحب مرحوم کو مجالس کی شرکت کے لئے وہاں قیام کرنے کی سہولتیں تھیں۔

[illegible] کے لئے
[illegible]

کھلا [illegible] نے
[illegible]

سوچ [illegible] ایک باغ دیکھا بہار
قسمت [illegible] کے پھول [illegible] تھا

[illegible] کر
اس گل [illegible] کر اس باغ میں [illegible] سکا

اس چمن میں کس [illegible] سا رنگ
جو [illegible] سے تھا [illegible]

ہر طرف تھا خیاباں [illegible] اور رنگیں زمیں
موسم گل [illegible] تھا [illegible] ہوا

چونکہ اس سامان [illegible] تھے ہم
بات [illegible] کی شاخ [illegible] سا

حسن خوبی میں ترقی دم بدم ہونے لگی
تازگی بڑھتی گئی [illegible]

حیف [illegible] نے [illegible]
کر دیا گلشن سے [illegible] پہلے

نکہت [illegible] اس کی [illegible] تھے جو ہر ابھی
تجھ نے پائی تھی نہ کامل طور سے نشو و نما

رہ گئی قسمت [illegible]
جو کسی پہلو سے اس کے [illegible] نہ تھا

پھر وہی برق بلا انگیز تھی چاروں طرف
پھر اسی طوفان آفت خیز کا تھا سامنا

لیکن اس گل کو کہاں [illegible] تاب تھی
[illegible] میں آخر کار وہ مرجھا گیا

جس چمن میں وہ گل رعنا رہا تھا چند روز
آج تک اس کی جدائی [illegible] ماتم بپا

گل گریباں چاک [illegible] غم فرقت میں سب
[illegible] پھرتی ہے [illegible] صبا

ہے یہ بلبل [illegible] کافی سمجھنے کے لئے
اس [illegible] کیا کہ وہ گل کون تھا

جس کے گل مسند نشینی کی سنی تھی خوش خبر
[illegible] قسمت آج [illegible] اس [illegible] تھا

[illegible] جینے کا اٹھایا تھا نہ [illegible] ابھی
اس کا [illegible] بے وقت [illegible] تھا

جس قدر ارمان [illegible] دل ہی میں رہ گئے
زیست کا [illegible] حاصل ہوا

رحم آیا [illegible] نہ اس کے حال پر
تو نے کس [illegible] خاک و خوں میں [illegible] کیا

کس کو دنیا سے اٹھایا [illegible]
دل بھرا آتا ہے کس سے جہاں خالی ہوا

[illegible] میں چھپا ہے چاند وہ
[illegible] اندھیرا چھا گیا

اے گل [illegible] کیوں آ گئی تجھ پر خزاں
[illegible] اس پھول کو پامال کیوں تو نے کیا

تیرے مرنے کا نہ تھا [illegible] ابھی
کھا گئی [illegible] دنیا کی ہوا

باغ عالم میں نہ دیکھی تھی ابھی تیری بہار
[illegible] کھلنے بھی نہ پایا تھا کہ مرجھا گیا

داستاں تیری [illegible]
منہ کو آتا ہے کلیجہ واقعہ سن کر ترا

وہ ترا [illegible] زخموں سے ہو کر چور چور
بے کفن [illegible] خاک و خوں میں [illegible] پڑا

جاں [illegible] ہوگی نہیں معلوم کس تکلیف سے
کیا اذیت ہوگی جب [illegible]

تیرے قاتل نے [illegible] پر بھی تیر [illegible]
جس نے تیرا خون بہایا [illegible] تھا

[illegible] / [illegible]
دم ہے [illegible] / دل [illegible] نہیں [illegible] جلتا
[illegible] / [illegible]
پھندے میں [illegible] / سب [illegible]
کہہ کے اس کو [illegible] / بندھا تھا [illegible]
اب بیابان [illegible] / تھا [illegible]
[illegible] / [illegible] ذکر [illegible]
جس طرح [illegible] / [illegible] شوق تھا
[illegible] آنکھوں میں [illegible] / [illegible] تھا

اب نہ تو ہے [illegible] میں تھا کوئی نشاں
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

داؤد مرحوم کا مجموعۂ کلام بیشتر اخلاقی نظموں، مثنوی، قطعات، تضمین اور چند غزلیات پر مشتمل ہے۔ اشعار کی تعداد پونے دو ہزار ہے۔ ان کی ایک نظم "سچی دوستی کا امتحان" کو ان کے رفیق خان بہادر مولوی الحاج محمد حبیب اللہ خان صاحب سابق کلکٹر یو۔پی نے ۱۸۹۶ء میں طبع کرا دیا تھا [illegible] مرقومہ ۱۴ فروری ۱۸۹۶ء میں اس بات کا ذکر کرتے ہوئے کہ مولانا حالی مرحوم کی نظموں سے اردو شاعری میں طرزِ جدید کی بنیاد پڑی، یہ تحریر فرماتے ہیں:

"پچھلے پانچ چھ سال سے مدرسۃ العلوم کے طالب علموں نے اس طرزِ جدید میں طبع آزمائی کی اور چند عمدہ نظمیں پبلک کے سامنے پیش ہوئیں، لیکن یہ نظم جس کا نام "سچی دوستی کا امتحان" ہے اور جو اب نذرِ ناظرین کی جاتی ہے ایسے اعلیٰ درجہ کی نفیس اور دلکش نظم ہے کہ مدرسۃ العلوم کے طالب علموں کی نظمیں تو درکنار ان کل نظموں میں جو اس طرزِ جدید میں مولانا حالی کی نظموں کی تقلید کر کے لکھی گئی ہیں بے مثل اور لاثانی ہے۔ اس نظم کے مصنف ہمارے دوست محمد داؤد صاحب بی۔اے ہیں جنہوں نے محمڈن کالج میں تعلیم پائی ہے اور جو علاوہ کامل استعداد زبانِ عربی کے فنِ شاعری میں اعلیٰ دستگاہ رکھتے ہیں۔ ان کی طبیعت کو قدرتی طور سے شعر سے خاص مناسبت اور لگاؤ ہے اور یہ رائے ہماری مدتِ دراز کے ذاتی تجربہ اور واقفیت کے بعد قائم ہوئی ہے۔ ہم پبلک پر اس کا فیصلہ چھوڑتے ہیں وہ اس نظم پر اپنی قطعی رائے قائم کرے لیکن ہم اپنی سمجھ کے مطابق اس امر کے کہنے سے باز نہیں رہ سکتے کہ یہ بلحاظ خوبیِ مضمون، سلاستِ بیان، بے ساختگی، طرزِ ادا اور بندشِ الفاظ وغیرہ کے یہ نظم نہایت اعلیٰ درجہ کی ہے۔ جس قصہ کو ہمارے دوست نے نظم کیا ہے وہ اخلاقی لحاظ سے نہایت پُر اثر ہے اور اس لحاظ سے اور نیز سادگی اور سلاستِ زبان کے لحاظ سے یہ نظم اس قابل ہے کہ سرکاری دیسی مدارس کے کورس میں شامل کی جائے۔ ہمیں امید ہے کہ قوم اس دلکش نظم کی پوری قدر کرے گی اور ہمارے دوست مصنف جو اپنے قدرتی انکسارِ طبیعت کی وجہ سے پبلک اسٹیج پر آنے میں تامل کیا کرتے ہیں وقتاً فوقتاً ایسی عمدہ نظموں سے قوم کو فائدہ پہنچاتے رہیں گے اور اس ذریعہ سے اردو زبان کی روز افزوں ترقی میں مدد دے کر اس کو اپنا ممنونِ احسان کریں گے۔ — ۱۴ فروری ۱۸۹۶ء"

اس نظم میں سب سے زیادہ شعر [illegible]

ہی شعر نقل کرتا ہوں ؎

کر رہا تھا فخر سے اک شخص یوں بیٹھا ہوا — [illegible]
آج جیسے ہیں مرے دوست اور ہمدرد ہیں — ویسے ہی احباب صادق ہر کسی کو [illegible]
ان میں اک ایک [illegible] وقت پہ — مل [illegible] تک [illegible]
ایک قطرہ گر پسینہ کا [illegible] میرے گرے — تو بہے اس جگہ دیں گے وہ اپنا خوں بہا
بیوفائی کس کو کہتے ہیں نہیں ان کو خبر — نام سے آشنا کے ان میں نا آشنا
یار و ہمدرد و جانباز و رفیق و غمگسار — باہر وقت و بے تکلف یار و باصفا
نازبرداں پر مجھے جتنا زیادہ ہے درست — جتنا ہو فخر مجھ کو ان کے لئے بے جا
دوستوں کے بننے میں شاکی اگر ہوں گے تو کیا — کیا شکایت ہوتی [illegible] دیکھیا [illegible]
کہتے ہیں [illegible] ہوتی ہے بہت — غالباً یہ جھوٹ ہے ایسا تو کیا ہوگا بھلا
دوست اور [illegible] ممکن نہیں — یوں ہی اپنے دل سے گڑ [illegible] شاید گھڑ لیا
جھگڑے اور [illegible] بنا لیتے ہیں قصے [illegible] کر — بعض لوگوں کو انہی باتوں میں آتا ہے مزا
جیسے خود ہیں ویسا ہی [illegible] کرتے ہیں قیاس — وہ سمجھتے ہیں کہ ہے سارا زمانہ ایک سا
دوستوں کو دیکھ کر مشکل ہے [illegible] — خلق میں ہو جائے گا اندھیر ایسا بھی کہیں!

اسی نظم میں ایسے بھی شعر ہیں کہ صنعت ایہام کا لاثانی نمونہ کہے جاسکتے ہیں مثلاً ؎

خود غرض احباب سے رکھتے نہیں ہم خود غرض
جو ہیں اپنے کام کے ان سے ہمارا کام کیا

"تذکرہ خندہ گل" سے ترتیب دے: مولوی عبدالباری نے داؤد جوہر کے تذکرہ میں ان کے کلام کا انتخاب شائع کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ نہایت قابل ذکی اور ذہین تھے ...... قدیم اور جدید دونوں رنگوں میں شعر کہتے تھے طبیعت میں چونکہ شوخی کا مادہ زیادہ تھا اس لئے کہیں کہیں وہ ایک ہلکی ظرافت کا رنگ اختیار کرلیتا تھا (خندہ گل) - اسی طرح لالہ سری رام ایم۔ اے صاحب "خمخانہ جاوید" ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "مولانا حالی کے اکثر اشعار کو تضمین کیا ہے۔ بلا کے ذکی اور ذہین تھے۔ ان کے کلام سے ان کی شوخی اور طبیعت داری اور ذکاوت ٹپکتی ہے اگر زندگی وفا کرتی تو کیا عجب کہ اس فن میں بھی نام و نمود حاصل کرتے" مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے فرمایا ہے کہ "خمخانہ جاوید میں جو چند غزلیں اور متفرق اشعار اور یوسف خان کا مرثیہ شائع ہوا ہے ان کو پڑھ کر داؤد صاحب مرحوم کی بے تکلف شاعری اور ان کے سہل ممتنع کا لطف اٹھایا۔ ان اشعار میں سے بھی بچپن کے حافظہ نے ایک شعر کا اندوختہ مجھے عطا کیا تھا چنانچہ اس کو بھی اسی مسرت سے پڑھا ؎

یہ جھوٹ اور ہم سے بس اب رہنے دیجئے
ہم بھی تو ساتھ کھاتے رہے تھے رات سے

الغرض اب جبکہ میری عمر غالباً داؤد صاحب کی عمر سے بھی زیادہ ہوگئی ہے اس شعر کے "معاملہ" پر نظر پڑی تو تعجب ہوا کہ ان جیسا سنجیدہ اور متقی بزرگ بھی کم از کم شعر میں [illegible] جانا کب سکتا تھا؟ خدا نہ کرے یہ شعر بھی مثنوی کی طرح صوبجات متحدہ کے نان کو آپریٹروں پہ [illegible] مسلمانوں کا [illegible]

[illegible]

[illegible] — قریب [illegible]
[illegible] — جنہاں [illegible]
[illegible] — یارب [illegible]
قرباں عشق کے کہ ہم آشنا ہو گئے — قید حیات [illegible]
میری [illegible] — تصویر سی کیا ہوئی اس خاکسار سے
[illegible] مرا نام یوں کہا — [illegible] ضعیف و نزار سے
[illegible] داستاں میں جناب — [illegible]
[illegible] بیاں کروں — [illegible]

اب دو ایک تضمینیں بھی ملاحظہ ہوں۔ مولانا حالی کا شعر ہے ؎

آؤ ہمیں جا کر ہمیں اس کو منا — اس کی بے پروائیوں پر جائیے کیا

داؤد مرحوم نے اس کو یوں تضمین کیا ؎

اس سے کچھ بیٹھی اور وہ ہم سے خفا — گو حقیقت میں اسی کی ہے خطا
خیر اب جلنے بھی دو کیا فائدہ — آؤ ہمیں جا کر ہمیں اس کو منا
اس کی بے پروائیوں پر جائیے کیا

شعر حالی ؎

آ رہی ہے چاہِ یوسف سے صدا — دوست یاں تھوڑے ہیں پر بھائی بہت

تضمین داؤد ؎

ہو رہا ہے رنگ [illegible] — دیکھ [illegible]
کاروانِ مصر میں یوں برملا — آ رہی ہے چاہِ یوسف سے صدا
دوست یاں تھوڑے ہیں پر بھائی بہت

شعر حالی ؎

ہم خوش کبھی ہوئے ہیں نہ غم ناگوار ہو — ملتا نہیں محل [illegible] کا

تضمین داؤد ؎

کیوں نشترِ ملال سے سینہ فگار ہو — کیوں رنج کے خیال سے چشم اشکبار ہو
صدمہ کچھ نیا ہو تو دل بے قرار ہو — ہم خوش کبھی ہوئے ہیں نہ غم ناگوار ہو
ملتا نہیں محل [illegible] کا

شعر حالی ؎

اک خوشی ہو گئی ہے تحمل کی در رکاب — وہ حوصلہ رہا نہیں صبر و قرار کا

نمونہ اردو ؎

وقت تربیۃ الطفل ہے یہی بے شک | تا نفیس بنے گا یہ طفل محبوب

نہ بنا یہ جو آپ کے پڑتا ہے عجب | کہ شوہر کو یہ لگتا ہے عقل کی منقلب

وہ ہوسد رہا نہیں جس کا استادکا

اردو کے علاوہ فارسی میں بھی ایسی بے تکلفی اور سلاست بیانی سے طویل نظمیں کہہ دیتے۔ فتح نواز جنگ کو ریاست حیدرآباد کی ہوم عہدہ ہوم سیکرٹری کا تھا۔ انگلستان کے زمانۂ قیام میں انہوں نے گرٹروڈ نام کی ایک انگریز عورت سے شادی کر لی تھی۔ حیدرآباد کے قیام میں اس عورت کی بدچلنی کی شہرت ہوئی، سالار جنگ وغیرہ سے اس کا ناجائز تعلق بتایا گیا، اخبارات میں مضامین شائع ہوئے۔ فتح نواز جنگ نے سکندرآباد میں ایک اخبار نویس مسٹر پر ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کر دیا، یہ مقدمہ بڑا ہنگامہ خیز ہوا۔ اس زمانہ میں ماؤ مرحوم کے ایک رفیق اور دوست مولوی مسعود علی بی۔ اے۔ علیگ، فتح نواز جنگ کے پیش دست تھے۔ ایک پمفلٹ لکھا گیا، ماؤ مرحوم نے اس کو فارسی میں نظم کر دیا تھا۔ جو طویل نظم تھی ایک دو شعر اس کے لکھتا ہوں ؎

محرم ماز این پمفلٹ بنوشت | گفت این تیم مینیست شغل است

چوں رسید این بگوش فتح نواز | استغاثہ کناں زجا برجست

متعدد کتابوں پر منظوم تقریظیں فرمائش سے لکھی ہیں۔ اردو انگریزی میں بھی مضامین لکھتے۔ اردو مضامین بعض اخبارات میں شائع ہوتے مگر اپنے نام کا کبھی اظہار نہ کرتے۔ پھبتی کہنے میں بھی نہ چوکتے۔ "نیچری بجلنڈ" اور "نیچری سانڈ" کی پھبتی جن پر کسی تھی وہ مدت العمر [illegible]۔

مجذوب صاحب

محمد رضا انصاری

شخصیت نگاری اور سوانح نگاری کے فرق کی بدولت مجذوب صاحب کے شخصیت نگار پر یہ ذمہ داری عائد نہیں ہوتی کہ وہ ان کے سنِ پیدائش، عمر اور سالِ وفات وغیرہ کی تفصیل بھی بیان کرے، جن میں سے ایک چیز بھی بدقسمتی سے میرے علم میں نہیں ہے۔ سنِ پیدائش اور عمر کے سلسلے میں تو بعض بڑی بڑی شخصیتیں گمنامی کا شکار پائی جاتی ہیں لیکن کسی نمایاں شخصیت کا سالِ وفات نہ معلوم ہونا یقیناً جہالت ہے، اس جہالت کا مجذوب صاحب کے بارے میں مجھے اعتراف ہے

عجیب اتفاق ہے جولائی ۱۹۵۳ء میں حیدرآباد کی ایک نجی صحبت میں جہاں کل ہند اردو کانگریس کے سلسلے میں حضرت جگر مرادآبادی کے ساتھ گیا ہوا تھا مجذوب صاحب کا ذکر آگیا جن کے بیشتر اشعار مجھے یاد ہیں۔ جگر صاحب نے تقاضا کیا: "آپ کوئی دو شعر ان کے سنا دیجیے، دیکھیے آپ کے ذوق کا بھی امتحان ہے اس میں!"

ذوق کا ذکر جگر صاحب نے محض چھیڑنے کے لیے کیا تھا اس لیے کہ ادارۂ ادب لکھنؤ سے میری وابستگی اور ماہنامہ نرمل (لکھنؤ) کی ادارت نے جگر صاحب کو "ترقی پسندوں کے ادبی ذوق" سے بدگمان سے ہوتے ہوئے میرے ذوق کا امتحان لینے کی دعوت دے دی۔ بہرحال دو شعر جو بروقت یاد آگئے میں نے سنا دیے ؎

گھٹا اٹھی ہے تو بھی کھول زلفِ عنبریں ساقی
ترے ہوتے فلک سے کیوں ہو شرمندہ زمیں ساقی

یہ مطلع جس غزل کا ہے اس کا مقطع بھی ؎

الٰہی خیر ہو مجذوب مے خانے میں آیا ہے
قدح کش، لاابالی، جامِ نازک، نازنیں ساقی

دیر تک مجذوب صاحب کا ذکر ہوتا رہا۔ دونوں میں سے کسی کو ان کے بارے میں صحیح علم نہ تھا کہ وہ اب کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔

خود لکھا تھا مجذوب صاحب نے گویا یکسانی جس سے سال معلوم ہو گیا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کے بعد ایک دفعہ مجذوب صاحب کا ذکر آیا تو معلوم ہوا کہ ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ [illegible] ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ تاریخ انتقال بھی جولائی ۱۹۴۴ء کی کوئی تاریخ ہے، اس وقت [illegible] حساب [illegible] یا ایک آدھ دن آگے پیچھے کی تاریخ تھی جب حیدرآباد میں مجذوب صاحب کی یاد ہم لوگوں کو آئی تھی۔ تاریخ انتقال [illegible] نہ معلوم ہو سکنے کی وجہ کھلی ہوئی ہے کہ آخر زمانے میں مجذوب صاحب ایسی جگہ قیام پذیر ہو گئے تھے جو خبروں کی رہگزر سے دور [illegible] اس کی وجہ بتانا مشکل ضرور ہے کہ مجذوب صاحب کا ایسا شاعر جو شعراء کی درجۂ اول میں ہے، جگر اور اصغر وغیرہ [illegible] تھا، عام طور پر نقادوں اور تذکرہ نویسوں کی نگاہوں سے کیوں پوشیدہ رہا۔

صفِ شعراء میں جب کبھی مجذوب صاحب کو دیکھا اساتذہ کے پہلو بہ پہلو دیکھا اور جب "مثنوی یکتائی" میں انہیں پایا تو اکثر کو منفی پایا۔ جب وہ "نالہ ساں" ہوتے تو اچھے سے اچھے شاعر خاموش سامع بن کر رہ جاتے۔ اس فضا میں جو مجذوب صاحب کی ترنم تھا: اور بے چین جذبات سے ہمیشہ پیدا ہو جایا کرتی۔ بڑے بڑے سخن شناس وارفتہ ہو جاتے یا گم ہو اور سب اس دعوے کے ثبوت نظر آتے۔

یہ معانی، یہ حقائق، یہ روانی، یہ اثر
شاعری تیری ہے اے مجذوب یا الہام ہے؟

شاعر سب ہی "پیدائشی" ہوتے ہیں اس لئے میں یہ نہیں کہتا کہ مجذوب صاحب "پیدائشی" شاعر تھے لیکن یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ مجذوب صاحب سراپا شاعر تھے۔

یہ دعویٰ مجذوب صاحب کے بہت سے جاننے والوں کو محض دعویٰ نظر آئے گا جس کا بظاہر واقعیت سے کوئی تعلق نہیں۔ بیشک مجذوب صاحب ایک زمانے میں ڈپٹی کلکٹر رہے ہیں پھر اس سے منتقل ہو کر محکمۂ تعلیم ... یو پی میں اسسٹنٹ انسپکٹر ہوئے، آخر میں انسپکٹر آف اسکولس کے عہدے پر پہنچ کر سبکدوش ہوئے۔

مجذوب صاحب سخت قسم کے متشرع بھی تھے اور صوفی بھی، صوفی صرف شاعرانہ حد تک نہیں بلکہ واقعتاً اپنے وقت کے ایک بڑے شیخ طریقت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مرید خاص اور خلیفہ بھی۔ شیخ کے انتقال کے بعد خانقاہ امدادیہ اشرفیہ میں متوسلین کے معاملات و کوائف کے نگراں اور مشیر بھی۔

تو وہ ملا بھی تھے صوفی بھی، سرکاری افسر بھی تھے اور سرکاری فہرستوں میں "خان صاحب" اور "خان بہادر" بھی۔ پھر بھی میں انہیں سراپا شاعر کہنے کی جرأت کر رہا ہوں ـــــ شاعری اگر صرف قافیہ پیمائی کا نام نہیں بلکہ اس کیفیت، اس شعور اور اس احساس کا نام ہے جو ہر شاعر میں کم و بیش پایا جاتا اور اس سے شعر کہلاتا ہے تو مجذوب صاحب پر یہ کیفیت اور یہ جذبہ ہمہ وقت طاری رہتا تھا۔ اگر ان کے دوسرے فرائض اس کیفیت کے اظہار میں رکاوٹ بنتے تو ایک سخت قسم کی بے چینی ان کے ہر بن مو سے ٹپکتی دکھائی دیتی تھی۔ اس بے چینی کو محسوس کرنے والا پوری طرح جان لیتا تھا کہ اس میں نہ بناوٹ ہے اور نہ دکھاوا۔

ہم دونوں "صاحبزادگان" فرنگی محل (یہ لحاظ عمر نہ بغرض احترام) مجذوب صاحب کی تلاش میں ان کے مکان واقع بنارسی باغ مغرب کے بعد پہنچے۔ ۱۹۳۲ء کے آس پاس کی بات ہوگی، اس وقت مجذوب صاحب انسپکٹر آف اسکولز ہو چکے تھے اور خان صاحب خواجہ عزیز الحسن غوری انسپکٹر آف اسکولز (یو پی) کہلاتے تھے۔ مکان یعنی سرکاری بنگلے میں وہ نہ ملے تو ہمیں معلوم ہوا کہ نماز پڑھنے گئے ہیں۔ دیر تک ہم نے ٹہل ٹہل کر انتظار کیا آخر اس مسجد تک [illegible] جہاں وہ نماز پڑھنے گئے ہوئے تھے۔ وہ مسجد کے صحن میں مصلے پر بیٹھے ایک طرف گردن ڈھلکائے ہوئے اور داہنے شانے پر جھکائے تسبیح پڑھ رہے تھے۔ تسبیح ان کے ہاتھ میں تھی اور پڑھنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ بالکل قریب جا کر دیکھا تو وہ گنگنا رہے تھے ...

پہلا ہے بھل کا —— [illegible] ہے
جان بانسے مجذوب کی [illegible] ہے

کیا مکتب عشق میں ماجرا کی [illegible] آنکھوں سے جب ہو کیا لکھنے کی ہم سب مجذوب
کی صفات کو نہ [illegible] عالم الستر والشہادۃ سے مسوب [illegible] تھے [illegible] لیلۃ سرگذ دو نگاہ کی حاجت پہ نہیں ہوتی۔
عربی زبان میں ایک لفظ حنین ہے جس کے معنی کسی کے شوق میں بیقرار ہو [illegible] مجذوب [illegible] شوق [illegible]
میں ہوں، مرکز ہوں [illegible] حال بیٹھے ہوں یا الجھے ہوں [illegible] مجذوب تھے [illegible]
فرقت [illegible] میں [illegible] ہے

اسطوانہ حنانہ: مسجد نبوی میں ایک درخت کا تنا تھا جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ٹیک لگا کر خطبہ [illegible] وقت [illegible] کرتے تھے۔
پھر مسجد نبوی میں منبر بن گیا اور آپ اس پر کھڑے ہو کر خطبہ دینے لگے۔ کہتے ہیں کہ آنحضرت کی جدائی [illegible] اس ستون کو بہت شاق گزرا اور
نے اس لکڑی سے حنین [illegible] اس لئے اسطوانہ حنانہ [illegible] کہا جاتا ہے۔

مجذوب صاحب [illegible] کی طرح [illegible] اسطوانہ حنانہ کی تشبیہ ان کے ظاہر و باطن دونوں کے عین مطابق تھی۔

مجذوب صاحب جب اسسٹنٹ انسپکٹر آف اسکولز ہو کر لکھنؤ میں متعین ہوئے تو [illegible] دو محلوں کے
گھروں کے درمیان صرف ایک سڑک حائل تھی [illegible] معلوم کرنے کی کوشش [illegible]
میں پہلے پہل [illegible] ان کی شاعری [illegible] زندگی کا ذکر [illegible] ایک دوسرے [illegible] اپنے
تحریر یا خصوصاً اکبری کا سبق پڑھنے بیٹھا ہوتا۔

انہوں نے کہا سڑک پر ایک بچہ دیکھ کر [illegible] مجذوب صاحب کھڑے [illegible] رقص [illegible]
رہے ہیں مجھے دیکھ کر چونکے اور بولے آئیے آئیے آپ [illegible] غزل [illegible]
اس غزل کے اشعار بلا لحاظ ترتیب سنانے لگے۔

عجیب و غریب "تعارف" تھا یہ: سڑک پر ایک آدمی [illegible] کسی سے
بات نہ کرو، شیروانی کے بغیر گھر سے قدم نہ نکالو، سودا خود نہ خریدو وغیرہ وغیرہ [illegible] اور اس شاعر کے طور طریقے
ایک [illegible] ایسے آدمی سے ملنے کا، اس کی شاعری کے شوق میں [illegible] برس کی عمر اور [illegible] شاعری کی سوجھ بوجھ
ہے؛ اس عجیب و غریب شخصیت کو دیکھنے کی گدگدی ضرور ہوتی۔ جب یہ معلوم ہوا کہ آج رات [illegible] نشست ہو گی تو [illegible]
گھری کا ہم تھا، مجذوب صاحب آٹھ ساڑھے آٹھ بجے رات کو آ گئے، ہم کو سبق یاد کرنے اور مطالعہ [illegible] کے بعد [illegible]
ہو کر مجذوب صاحب کو دیکھنے پہنچ گئے۔

دیکھا کیا [illegible] سفید داڑھی والا آدمی [illegible] کالا [illegible] جس میں داہنے سینے سے متصل
گھڑی اور قلم وغیرہ رکھنے والی جیب [illegible] لکھنؤ کے خوش پوشاکوں کے [illegible] اور [illegible] تخت پر بیٹھے دونوں ہاتھ
اٹھائے اپنے بائیں جھوم جھوم کر ایسے انداز میں شعر پڑھ رہا ہے کہ شاعر کے ساتھ سامعین بھی جھوم رہے ہیں یا کبھی کبھی چیخ پڑتے ہیں۔ [illegible] سب
ملا کر [illegible] سننے والے جن میں زیادہ تعداد طلبائے فرنگی محل کی تھی، چھوٹی پور سب سے پیچھے ایک پلنگ [illegible] کرگیا تھا، اشعار
نوٹ کرنے [illegible] کر جس شعر کی زیادہ تعریف [illegible] اس کو لکھ لو —— مگر ایک شعر بھی ایسا نہیں تھا جس پر [illegible] تعریف

[illegible] کی صورت صداقتی تحریت کا فرق ہیں، اس وقت بیان کیا جا سکتا تھا۔
مجذوب صاحب پڑھ رہے تھے ۔

ہر تمنا دل سے رخصت ہوگئی اب تو آ جا اب تو خلوت ہوگئی
دل میں داغوں کی یہ کثرت ہوگئی رونا اک شانِ وحدت ہوگئی
یاس ہی اب دل کی فطرت ہوگئی آرزو ہو کی وہ حسرت ہوگئی!
سوگ ہے یہ کس کی شرکت ہوگئی بزم ماتم، بزم عشرت ہوگئی
پڑ گئی تھی ان پہ بھولے سے نظر بات اتنی سی، قیامت ہوگئی
ایسی ضد کا کیا ٹھکانا سب بھلا بات جو کہہ دی وہ قسمت ہوگئی
جی رہا ہوں موت کی امید میں مر ہی جاؤں گا جو صحت ہوگئی
رنج دینے سے وہ باز آئے تو کب جب کہ غم کھانے کی عادت ہوگئی
خاک میں کس نے ملایا یہ تو دیکھ شکر کر مٹی سعادت ہوگئی

کر چکے رندی بس اے مجذوب تم
ایک مدت میں یہ حالت ہوگئی

یہ تو ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا سب ہی اشعار ایک درجے کے نہیں یا سب بلند پایہ اشعار نہیں کہے جا سکتے لیکن حقیقت ہے کہ جب مجذوب صاحب غزل سنا رہے ہوں تو بڑے سے بڑے نکتہ رس کے لئے بھی ممکن نہیں کہ وہ اس کیفیت میں جذب ہو کر جو خود مجذوب صاحب پر طاری رہتی تھی، ایک ایک شعر پر سر نہ دھننے لگے ۔

خدا اے ناصحِ فرزانہ اچھا کر سکن تو دو باتیں
نہ ہوگا پھر بھی تو مجذوب کا دیوانہ دیکھیں گا

مجذوب صاحب کے پڑھنے کا بالکل نرالا انداز تھا۔ ٹھیک وہی جس کی طرف میر سوز کے تذکرے میں شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد نے "آب حیات" میں اشارہ کیا ہے، لکھتے ہیں:

"انہوں نے (میر سوز نے) علاوہ شاعری کے شعر خوانی کا ایسا طریقہ ایجاد کیا تھا کہ جس سے کلام کا لطف دو چند ہو جاتا تھا، شعر کو اس طرح ادا کرتے تھے کہ خود مضمون کی صورت بن جاتے تھے اور لوگ بھی نقل اتارتے تھے مگر وہ بات کہاں؟ آواز درد ناک تھی، شعر نہایت نرمی اور سوز و گداز سے پڑھتے تھے اور اس میں اعضا سے بھی مدد لیتے تھے مثلاً شمع کا مضمون باندھتے تو پڑھتے وقت ایک ہاتھ سے شمع اور دوسرے سے اوٹ وہیں فانوس تیار کر کے بتاتے۔ بے دماغی یا ناراضی کا مضمون ہوتا تو خود بھی تیوری چڑھا کر وہیں بگڑ جاتے۔"

آگے چل کر میر سوز کے بارے میں آزاد نے جو بات لکھی ہے وہ وہ ہے جو مجذوب صاحب کے بارے میں میرے دل میں لیتی مگر مجھے اس مفہوم کے اظہار کے لئے موزوں الفاظ نہیں ملتے تھے آزاد لکھتے ہیں:

"تم خود خیال کر کے دیکھو ان کے اشعار اپنے پڑھنے کے لئے ضرور حرکات و انداز کے طالب ہیں۔"

[illegible]

[illegible] کی بات ہے۔

ایک مرتبہ [illegible] مجذوب صاحب [illegible] ایک بار [illegible] بات [illegible]

کو [illegible] کر دیا [illegible] اس کی بات یہ ہے کہ [illegible] کے اشعار [illegible]

[illegible] کو جب تک شامل نہ کیا جائے [illegible] سے لطف [illegible] سمجھا جا سکتا۔

اشعار سنانے میں مجذوب صاحب کو یہ [illegible] ہوتے یا غش کھا جاتے تو نہیں [illegible]

موقع پر عجیب انداز سے حسب ذیل قطعہ پڑھا —

چلے گھر سے جو ہم اپنے سر ہوسے — [illegible] سب کر گئے

وہاں دیکھے کئی طفل پری رو — اور [illegible]

یہ قطعہ پڑھتے پڑھتے وہیں [illegible] گر پڑے گویا [illegible] دیکھتے ہی دل بے قرار ہو گیا ہے [illegible] ایسے [illegible] غش کھا کر بے ہوش ہو گئے۔

لیکن مجذوب صاحب کے حرکات و سکنات سے کچھ ایسی [illegible] کہ غزل سنا رہے تھے۔ کہیں ہنسی [illegible]

جتانے کو نشیں ہر چند کہ چشم گریاں پر
کبھی یہ آستیں ہوتی کبھی یہ آستیں ہوتی

تب پہلے داہنی آستین چشم گریاں پر رکھ لی، پھر گویا نشیں نے [illegible] تو بائیں آستین اس کی جگہ رکھ لی

ایک دفعہ یہ شعر پڑھا —

ہنسی ہی ہو، ہنسی بھی ہو، ہاں ہاں چلو بس ہو چکے
اب ہنسئے اب ہنسے دیکھو وہ ہنسی آئی ہے

سو دیکھو وہ ہنسی آئی ہے" جب بھی کہا اس طرح کہا کہ جس کی طرف انہوں نے اشارہ کیا اس کو ہنسی آگئی ہو۔

انہوں نے جب سنایا —

کسی کی یاد میں بیٹھے جو سب سے بے غرض ہو کر
تو اپنا بوریا بھی پھر ہمیں تخت سلیماں تھا

تو اپنی نشست پر اس طرح اکڑ کر بیٹھ گئے جیسے واقعی تخت سلیماں پر بیٹھے ہیں۔

یا جب یہ شعر پڑھا —

اٹھاؤں گا نہ زانو سے میں ہرگز اپنا سر ہمدم
ارے میں اپنی آنکھوں سے انہیں جاتا نہ دیکھوں گا

تو اس قدر جھک گئے کہ واقعی سر بہ زانو نظر آنے لگے۔

مجذوب صاحب کی یہ پہلی نشست تھی ہمارے یہاں۔ میں سامع سے زیادہ منشی، بن کر اس میں شریک ہوا تھا۔ وہ خود ہر شعر دو تین بار پڑھتے تھے اور بیشتر اشعار ان سے بار بار پڑھوائے جاتے۔ مجھے نقل کرنے میں کوئی زحمت نہیں ہوئی، ۸ بجے رات سے مجذوب صاحب نے سنانا شروع

گیا تھا، نہ وہ سنانے سے تھکتے نہ سننے والے سننے سے۔ فجر کی نماز کے وقت بادلِ ناخواستہ محفل برخاست ہوتی اور سننے والے [illegible]
محفل برخاست ہونے کا مطلب یہ نہ سمجھ لیجیے کہ واقعی یہ ختم ہو گئی بلکہ مجذوب صاحب کی محفل نرالی شان سے برخاست ہوتی [illegible]
ہوتی۔ سب لوگ اٹھ کھڑے ہوتے کہ نماز کی تیاری کریں، مجذوب صاحب بھی اٹھ کھڑے ہوتے مگر گنگناتے ہوئے شعر سناتے، جا رہے ہیں
شعر سنا رہے ہیں، گھر سے نکل رہے ہیں اور گھوم گھوم کر شعر سنا رہے ہیں، کچھ لوگ جا رہے ہیں اور باقی شوق کی شابیت کو ضروری سمجھتے [illegible]
شعر سناتے چلے جا رہے ہیں اور اگر سننے والے پر ہیں تو سنتے ہیں کھڑے ہو جائیں گے اور سناتے رہیں گے، مشابعت کرنے والوں کو کشاں
کشاں ان کے گھر تک پہنچا دیں گے، جب تک گھر کا دروازہ کھلے مجذوب صاحب سناتے جائیں گے۔ یہاں تک کہ وہ گھڑی دیکھ کر
ایک دفعہ زور سے "استغفراللہ" کہیں گے گویا نماز کا وقت تنگ ہوتا جا رہا ہے اور جلدی جلدی اپنے مکان کے زینے چڑھ جائیں گے۔ یوں
محفل برخاست ہوتی تھی، ایک دو بار کی بات نہیں ہے ہمیشہ۔ یہ بھی ہوا ہے کہ مجذوب صاحب کو سننے کی ہوس ہوا ہے، بے چینی اور اضطراب کا عالم
طاری ہے، دیکھا نمازِ فجر کے بعد گنگناتے چلے آ رہے ہیں اور پیروں کی مسابقت یا اطلاع پر ہر طرف سے لوگ لپک لپک کر آ رہے ہیں۔ بقول
مجذوب صاحب کے؎

آ رہے ہیں ہر طرف سے طالبانِ دردِ دل !
ہو رہی آہ و فغاں سے یا اذانِ دردِ دل ؟

یہ تو آٹھ دس گھنٹے کی نشست بھی ایک دفعہ لگاتار ۲۸ گھنٹوں کی نشست ہوئی جس میں نماز اور کھانے پینے کے علاوہ کوئی وقفہ نہیں ہوا۔
اس کے بعد بھی یہی محسوس ہوا کہ نہ سننے والا تھکا اور نہ سنانے والا اور نہ سنانا تو مکمل ہوئی۔
۲۸ گھنٹے کی نشست فرنگی محل کے ایک قدیم متوسل قاضی وحید الدین صاحب کے یہاں سترہ ضلع بارہ بنکی میں ہوئی تھی اور سب لوگ لکھنؤ
سے لد پھند کر وہاں پہنچے تھے۔

قاضی صاحب کے ایک قدیم ملازم نے گھر والوں اور مہمانوں کا جو حال دیکھا کہ نہ کھانے کا ہوش ہے نہ سونے کی فکر بس ایک ہنگامہ مچا ہوا
ہے اور سب میاں لوگ جھوم رہے ہیں تو اسے عجیب معلوم ہوا اس نے بڑی حیرت سے کہا "ایک رات تو خیر سے رہنا ہی، اس کے سارے سب
میاں لوگ کا ہے کیوں، شرفی ہو گئے ہیں؟"
مجذوب صاحب چاہے ایک گھنٹہ سنائیں یا ۲۸ گھنٹے سب کچھ زبانی سنایا کرتے تھے، ان کو سارا کلام حفظ تھا، نہ بیاض کا جھگڑا نہ
نوٹ بک کی قید، یہ بات پہلے پہل میں نے مجذوب صاحب ہی میں دیکھی اس کے بعد جگر صاحب کو دیکھا کہ وہ جو کچھ سناتے ہیں زبانی سناتے
ہیں خواہ کتنی ہی لمبی غزل ہو۔
مجذوب صاحب کبھی ایک دفعہ میں کوئی غزل پوری نہ سنا سکے، ایک غزل سنانے سناتے کوئی اور شعر کسی وجہ سے یاد آ گیا وہ سنایا اور
اسی غزل پر چل نکلے، بیچ میں یاد آ گیا یا کسی نے یاد دلایا کہ فلاں غزل ہو رہی تھی فوراً چونکے اور سابقہ غزل کی طرف پلٹ گئے۔ یہ سب ان سے اضطراراً
ہوتا تھا۔
غزل ہو رہی تھی؎

یہ نالہ کہاں کون؟ یہ آواز حزیں ہے
دیکھو کہیں مجذوب غزل خواں تو نہیں ہے

اس اثنا میں چلتے آ گئی جھونکے چھوٹے حسین فنجانوں میں، مجذوب صاحب بے قرار ہو گئے، غزل چھوڑی چائے گنگنانے لگے، اب جو شعر ہو رہے

[illegible] ہے

آنکھیں یارو آنکھیں [illegible] ہے

[illegible] کے [illegible] ہے

پھر اس غزل کا مطلع ہے

[illegible] | [illegible]
[illegible] | [illegible]
[illegible] | [illegible]

[illegible]

[illegible] کے [illegible] ہے

اس گفتگو سے مجذوب کے دیوانے پن کی کارفرمائیوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ مجذوب صاحب پہلی فرصت میں ایک نیا مطلع سنایا ۔

اک عمر سے انجمن میں مری جانِ حزیں ہے
یہ بھی ہے کوئی بات کہ تو [illegible] نہیں ہے

اسی غزل میں انہوں نے کہا تھا ۔

اف جلوہ گہِ حسن میں کیسی مری آنکھیں
کب جاتا ہے نظروں میں خدا بھی جو حسیں ہے

درحقیقت مجذوب صاحب حسن کے دیوانے تھے انسانوں سے لے کر حیوانوں تک جہاں بھی انہیں حسن کا جلوہ نظر آتا وہ آپے سے باہر ہو جاتے ۔

ایسی ہی ایک محفل میں مجذوب صاحب کی سحری کے لئے آم لائے گئے عشاء کے بعد سے دوسرے دن تک وہ مولانا قطب میاں صاحب مرحوم کے یہاں سناتے رہے تھے دوسرے دن مجذوب صاحب کو روزہ رکھنا تھا گھر جا کر سحری کرتے۔ قطب میاں صاحب مرحوم نے اپنے یہاں انتظام کیا کہ تھوڑی دیر اور مجذوب صاحب کا سنانا جاری رہے پھر سحری لائی جائے تو مجذوب صاحب رضامند ہو گئے تھوڑے سے آم بھی تھے، تر و تازہ، خوش رنگ اور رسیلے۔ بس مجذوب صاحب بے چین ہو گئے اور جب آم رکھا گیا تو انہوں نے منہ پھیر لیا۔

اسی وقت انہوں نے برملا حسن پرستی کے جذبے کا اقرار کیا۔ کہنے لگے "میری چار پانچ مہینے کی ایک بچی ہے گول گول خوبصورت نرم نرم ہاتھ پاؤں، اس کو گود میں لے کر ایک دفعہ عجیب خواہش ہوئی یعنی اس کے پلپلے بدن کو منہ میں لے کر دانتوں سے خوب چبا ڈالوں"

انسانی بدن کو دانتوں سے چبانے کا تصور بہت کریہہ ہے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ وفورِ رغبت کے اظہار میں "لب و دنداں" کی سرگرمیوں کا کتنا دخل ہوا کرتا ہے ۔

مجذوب صاحب نے نفسیات، جنسیات، اشارات کنایات کسی کا بھی سہارا لئے بغیر جذبات محسوس کی کہہ دی مگر اس طرح انہوں نے اپنی پوری شخصیت کو بے نقاب کر دیا ۔ ایسی شخصیت کے لئے ایک ہی جامع لفظ ہے یعنی "حسن پرست" وہ بلا کے حسن پرست تھے مگر غضب کے [illegible] سکتے ہیں ۔

دیدِ جمال کے سوا کچھ مدعا نہیں | حسن پسند پاک ہیں فاسق نہیں [illegible]

[illegible]

[illegible]

بُت سے کہتے ہیں بیعانت گر حیا دل بھر کر | نہ رکیں گے نہ کہیں گے کہیں [illegible]

جہاں گلگشت آتی تھی آیا نظر کوئی حسین بھر کر | بس اب ہو دم [illegible] رکتا ہے [illegible]

یہ بُت کہتے کرمیں اب لے خدا [illegible] بھر کر | اٹھا لے آسماں بھر کر نگل جا لے زمیں بھر کر

یا ؎

بچے اُف نہ کر مِن حسینوں سے پالا | وہ معصوم نظریں وہ منہ بھولا بھالا

ملائی ہے درد محبت ! دہائی! | ارے مار ڈالا ! ارے مار ڈالا

ایک دوسری غزل میں کہتے ہیں ؎

آنہ ہے نظر حسن ہی جانتے ہیں جدھر ہم | کیا پھوڑ لیں اب آنکھیں ہی اپنے جگر ہم

اف بچ ہی گئی ہم اک بت کافر پہ نگہ آج | رکھتے تھے اسی دستِ ہمیں ہی نظر ہم

ایک صاحب نے پوچھا "یہ کون بت کافر" ہے۔ فوراً ہی مجذوب صاحب نے دوسرا شعر پڑھا ؎

اتنی تو خبر ہے کہ کوئی ہوش ربا تھا | رکھتے نہیں کچھ اس کے سوا اور خبر ہم

اسی غزل میں ایک شعر ہے ؎

در پردہ کوئی پردہ نشیں دیکھ رہا ہے | اب حور بھی آجائے تو ڈالیں نہ نظر ہم

محترم مولانا عبدالماجد دریابادی تشریف فرما تھے۔ ۱۹۶۲ء یا ۱۹۶۳ء کی بات ہے۔ مولانا کی غیرت دینی معمولی بھول چوک پر بھی گرفت کے بغیر نہیں رہ پاتی تھی۔ وہ جن مرحلوں سے گزر کر آئے تھے غالباً اس کا فطری نتیجہ تھا کہ سخت قسم کا تقشف ان کا نگہبان بن جائے' ہم فرنگی محلیوں کا مسلک یہ کہ سماع، عرس اور زیارت قبور کے لیے شدِ رحال وغیرہ بھی ممنوع نہیں۔ غرض مولانا عنایت اللہ صاحب فرنگی محلی اور مولانا دریابادی میں کچھ شعر و شاعری کے مضامین پر نوک جھونک ہو رہی تھی۔ مجذوب صاحب نے جب کہا: "اب حور بھی آجائے تو ڈالیں نہ نظر ہم" مولانا عنایت اللہ صاحب نے تعریف کرتے ہوئے مولانا دریابادی سے کچھ کہا، مولانا عبدالماجد صاحب نے جواب میں فرمایا "بے شک اس میں اللہ کی ایک بڑی نعمت کا استغنا تو پایا ہی جاتا ہے"۔ استغنا کے لفظ نے جو میرے کانوں کے لیے نیا نیا تھا مولانا کا پورا جملہ ذہن نشین کر دیا۔

مجذوب صاحب خود راوی تھے کہ وہ اپنی موٹر پر جا رہے تھے حسبِ عادت متوسط رفتار سے خود ہی ڈرائیو کرتے ہوئے، پیچھے سے زور زور سے "ہارن" ہوا اور ایک موٹر تیز رفتاری کے ساتھ ان کے داہنے سے نکل گئی' تیز رفتار موٹر کی چلانے والی ایک فیشن ایبل خاتون تھیں اور شاید انہوں نے دقیانوسی صورت والے مجذوب کو ڈرائیور سمجھ کر، دیر میں سائڈ دینے پر چلتے چلتے آنکھیں بھی نکالیں، بس مجذوب صاحب اس ادا میں گم ہو گئے اور فرمایا ؎

اس ناز سے اس شان سے اس تیز روی سے
گزرو گے تو دنیا ہی سے جائیں گے گزر ہم

وکٹوریہ اسٹریٹ جس پر مجذوب صاحب کا ۱۹۴۲ء-۱۹۴۳ء میں قیام تھا وہی سڑک ہے جو مزار حضرت مخدوم شاہ مینا[؟] کو علاقہ چوک سے ملاتی ہے' مزار شریف پر ہر مہینہ رسوم دعا کی نوچندی اس وقت بھی ہوتی تھی اور آج بھی ہوتی ہے' نوچندی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ایک

[illegible] دوسروں کی جنسیات شریک ہو سکتی ہیں۔ ہر صورت کو عام فہم بنا کر واضح جذبات کو ادا کرنا ہی ہر شاعر کا فرض ہے [illegible] مجذوب صاحب کے ساتھ اس سلوک سے عزیز و شریف کی سمت مائل ہوتا ہے۔ مجذوب صاحب نے [illegible] ایک غزل کا ایک مطلع بھی کہا تھا —

ہم بھی ہیں سرِ راہ کھڑے آج حسینو
دل کھو کے نہ ٹھوکر لگا دیں گے نظر پر

ایسے شوخ اشعار مجذوب صاحب کی طبیعت نے بہت سے کہے ہیں اسی غزل کا ایک شعر ہے —

جانے کو قفس دیں گے سب آپ بھی جڑ کر | شب ہائے فراق کی آہیں سکھلا کر
پہلو میں حسینوں کے جگہ دی تو نظر کیا | دنیا ہے مگر اس پہ بیٹھے ہیں نظر پر

یہ شوخی ان کی رگ رگ میں رچی بسی تھی جس کی شدت ہر شب صاحب خود بھی کرتے تھے اور جب یہ زیادہ زیادہ کرنے لگی تو قدم اپنے مرشد (مولانا تھانویؒ) کو اس کیفیت کی اطلاع کرتے تھے وہاں سے جو ہدایتیں آ جاتی تھیں ان پر مجذوب صاحب عمل پیرا ہو جاتے تھے۔ وہ زمانہ ان کے لیے سخت مصیبت اور کشاکش کا ہوتا تھا۔ مرشد کی ایک ہدایت کا عموماً دوسروں کو بھی ہو جاتا تھا، یعنی ان کو شعر خوانی کی ممانعت کر دی جاتی تھی۔ دوسروں کے لیے بھی یہ ممانعت مصیبت سے کم نہ ہوتی، لوگ طرح طرح سے اصرار کرتے تھے اور مجذوب صاحب خاموش رہتے۔ لیکن یہ کہتے جاتے تھے کہ "آپ لوگوں کو کیا خبر، یہاں دل پر چھریاں سی چل رہی ہیں۔"

ایک دفعہ یہی "توبہ" کا زمانہ چل رہا تھا سب لوگ سنانے کا تقاضا کر رہے تھے ایک صاحب نے جگر کا شعر پڑھا —

بات ساقی کی نہ ٹالی جائے گی
کر کے توبہ توڑ ڈالی جائے گی

مجذوب صاحب بے قابو ہو گئے۔ توبہ ٹوٹنے لگی مگر انہوں نے ضبط کیا اور اٹھ کر چل دیے۔ یہ صبح کی بات تھی شام کو جو آئے تو وجد و رقص کرتے نئی غزل کے ساتھ —

زاہدوں پر یہ اچھالی جائے گی | جان ان مردوں میں ڈالی جائے گی
شیخ پینے کا ارادہ تو کرے | توبہ کوثر سے منا لی جائے گی
اور تو نکلیں گے کیوں کر تیرے کام | اس میں ہر کل بھی چھپا لی جائے گی

۴۰، ۵۰ اشعار اس غزل کے شام تک ہو گئے تھے اور اس انداز سے انہوں نے سنائے جیسے کہیں سے رسّی تڑا کر بھاگے ہوں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مجذوب صاحب عام شاعروں کی طرح شعر گوئی میں ریاض کرنے کی زحمت میں کبھی نہیں پڑے۔ ایک ابال کی طرح ان کے جذبات ابلتے اور موزوں قالب اختیار کرتے چلے جاتے تھے۔ کبھی کبھی جذبات کا دھارا اتنا تیز ہوتا کہ ایک زمین میں ڈیڑھ سو دو سو شعر تک کہہ ڈالتے تھے اور بلا انتخاب سناتے چلے جاتے تھے۔ کم از کم تین غزلیں تو مجھے یاد ہیں جو ڈیڑھ سو دو سو اشعار کی ہیں۔ ایک میں ۳۵ مطلع ہیں اور دو غزلوں میں بھی بیس سے اوپر مطلعے کہے ہیں۔

۳۵ مطلعوں والی غزل کا پہلا مطلع —

اب بھی مجذوب بر محوِ سر و دم پذیرائی ہے
کیا جنوں میں ابھی آمیزشِ دانائی ہے؟

[illegible]

بیان کرتا تھا، اپنا مزاحیہ کلام بہت پسند نہیں کرتے تھے کہتے تھے

ہم خاک نشینوں کو نہ مسند پہ بٹھاؤ
یہ عشق کی توہین ہے اعزاز نہیں ہے

سرکاری اعزاز کا یہ خان صاحب کے خطاب کی شکل میں ملا تھا خود انہوں نے مذاق اڑایا ہے

پہلے خواجہ صاحب تھے اب خان صاحب ۔۔۔ جن کی خاک ہو تو گھٹی شان صاحب

ایک خان بہادر دوست کو خطاب ملنے پر لکھا

کیا شان دکھاتے ہو ارے خان بہادر ۔۔۔ گر خان بہادر ہو بہ ایمان بسلامت
شاباش ہے شاباش ہے اے خان بہادر ۔۔۔ دنیا پہ کیا دین کو قربان بہادر

محفلوں سے گریز کی ایک وجہ تو ان کی بے قید و بند طبیعت تھی دوسری وجہ ایک واقعہ کے بعد ظاہر ہوئی یعنی دعوتوں کے لئے ان کا کھانا کھانا اس احتیاط کے پیش نظر ہو کہ حلال کی پابندیوں کے لئے ضروری ہو سکتی ہے مجذوب صاحب پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ مجذوب صاحب اور ان کے ایک ملنے والے تعلقدار کے یہاں زبردستی پہنچائے گئے جہاں انہوں نے مجبوراً کھانا بھی کھایا۔ رات بھر کی شعر خوانی کے بعد جب وہ واپس ہوئے تو ایک صاحب سے انہوں نے پوچھ لیا کہ تعلقدار صاحب کی آمدنی میں کوئی ناجائز ذریعہ تو شامل نہیں ہے؟ اطمینان دلا دیا گیا کہ وہ سود وغیرہ نہیں لیتے ہیں، جزئیات تک مجذوب صاحب نے پوچھ ڈالے اور جب یہ معلوم ہوا کہ لگان وغیرہ کی وصولی میں ان تعلقدار صاحب کے یہاں بھی عام زمینداروں اور تعلقداروں کی طرح کاشتکاروں پر ظلم کیا جاتا ہے تو مجذوب صاحب نے سب کی نظروں سے بچ کر گرم پانی کرا کے غسل خانے میں استفراغ کیا اور جب اطمینان ہو گیا کہ رات کی غذا کا کوئی ذرہ معدے میں باقی نہیں رہا ہے تو مطمئن ہو کر بستر پر پہنچ گئے۔ اس تکان کا عالم دو دن گرمی رہا اور تیسرے دن تکان کا ازالہ کر دیا۔

یہ تو مجذوب صاحب کے لئے معمولی واقعہ تھا، کمال تو یہ کیا انہوں نے کہ بی۔اے پاس کرنے کے بعد ڈپٹی کلکٹری کی کچھ دنوں [illegible] جو ہے کہ [illegible] سے پہلے [illegible] بادشاہ بننے [illegible] تھا انہوں نے گوارا کیا اس کے بعد محکمۂ تعلیم میں داخل کر دیا گیا، کیوں؟ اس لئے کہ اس ملازمت میں قانونِ شریعت کے خلاف [illegible] قوانین کے تحت انہیں فیصلے کرنا پڑتے تھے۔

ان کی خدمات حکومت یو۔پی نے محکمۂ تعلیم کو منتقل کر دیں جہاں ان کی ابتدائی تنخواہ ڈپٹی کلکٹری کی تنخواہ سے آدھی تھی مگر وہ راضی اور مطمئن تھے۔

آخر میں . . . وہ ایک ریجن کے انسپکٹر آف اسکولز ہو گئے اور ایک ہزار کے قریب ان کو تنخواہ ملنے لگی تو اکثر سنایا کرتے تھے ۔

عیش ہے عشرت ہے موٹر کار ہے ۔۔۔ اور اس دنیا میں کیا درکار ہے
اس جہاں کی نعمتیں بھی ہوں عطا ۔۔۔ اے خدا تیری بڑی سرکار ہے

---

(۲)

جادہ چوں نبضِ تپاں در تنِ صحرا بینند

غالب

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ

اثر لکھنوی

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ ایم اے۔ ڈی لٹ۔ آئی ای ایس چشم بد دور بلا کے ذہین ہیں۔ وہ یونیورسٹی کے امتحانوں میں ہمیشہ اوّل آیا کئے۔ بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ انہیں اردو کا مسیحا اور اس کے ساتھ اردو کا عاشق شیدا کہنا بے جا نہ ہوگا۔ انہوں نے انگریزی میں تاریخ ادب اردو لکھ کر اردو کو صرف ہندوستان بھر ہی نہیں بلکہ غیر ممالک سے روشناس کرایا۔ اردو جو محض بول چال کی بولی سمجھی جاتی تھی اس کو زبان، بھرپور زبان، انواع و اقسام کے جواہر سے مالا مال زبان تسلیم کرایا۔ مطالعہ کا شوق اس حد پر ہے کہ ان کے گھر میں ہر طرف اردو زبان کی کتابوں کے ڈھیر لگے رہتے ہیں حتیٰ کہ غسل خانہ میں بھی کتابوں کی ایک الماری ہوتی ہے شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اردو ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔

شوق کا یہ حال ہے کہ ایک مرتبہ جب ہم دونوں کا تقرر کانپور میں تھا (سنہ [illegible] یا [illegible] کا ذکر ہے) مجھے لکھنؤ کے ایک مشاعرے میں شریک ہونا تھا۔ انہوں نے بھی چلنے کا وعدہ کیا مگر عین وقت پر کسی ضروری منصبی کام نے روک لیا۔ ایک یا دو بجے رات کو دیکھتا کیا ہوں کہ رام بابو صاحب مسکراتے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ مال گاڑی میں سفر کیا۔ پوس کا جاڑا، رات بھر کا جاگنا (اس زمانے کے مشاعرے صبح ہوتے ہوتے ختم ہوتے تھے اور واپسی کے وقت یہ اندازہ دشوار ہو جاتا تھا کہ ہم چل رہے ہیں یا زمین چل رہی ہے) یہ تمام زحمتیں گوارا کرکے مشاعرے میں بحیثیت سامع شریک ہونا —— کیا بجز اردو سے عشق نہ ہو اتنی زحمت برداشت کرنا گوارا کر سکتا ہے؟

ان کی اردو دوستی کا مزید ثبوت وہ پیغام ہے جو انہوں نے حال ہی میں راجستھان اردو کانفرنس کے انعقاد کے موقع پر بھیجا تھا اس کا خلاصہ درج ذیل کیا جاتا ہے:-

"اردو کی راہ میں جو دشواریاں اور خطرے ہیں ان سے اردو کے بہی خواہوں کو بددل نہ ہونا چاہئے بلکہ ان سے مہمیز کا کام لینا چاہئے اور اپنے مساعی میں زیادہ مستعدی و انہماک دکھانا چاہئے۔

اردو کو ہندی سے دشمنی یا رقابت نہیں ہے۔ یہ مانتے ہوئے کہ ہندی ہندوستان کی زیادہ آبادی کی زبان ہے اگر اسے عالمگیر ہونا ہے

تو ہر حالت میں ہمیں ہمارا شعور اس کی مدد کرے اور شریک کار ہو۔

اُردو کو پاکستان سے منسوب کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ کسی ملک کی پیداوار نہیں بلکہ ہندو مسلم اتحاد کی نشانی ہے۔ عام لوگوں نے اسے [illegible] عوامی استعمال کرنے سے یہ پھولی پھلی ہے۔ اُردو اسی ملک کی پیداوار ہے باہر سے اس کی کھیپ نہیں آئی۔

لیکن بدلتے ہوئے حالات میں اسے اپنی بقا کے لئے نئے نئے تجربات کرنے میں جھجکنا نہیں چاہیے اور ان کا ساتھ دینا چاہیے۔ خود اپنے بچاؤ کی وقت پر پورا کرنا چاہیے۔ اس کے پس منظر میں ہندوستانی روایات ہیں۔ اسے عام لوگوں سے علاحدگی اختیار کرنا چاہیے بلکہ ان سے قریب تر ہونا چاہیے۔ ایسی میٹھی، شریں، لچکیلی اور کس بل رکھنے والی زبان کو متروک یا تہس نہس نہ ہونے دیجئے۔

اُردو کا ادب موتی ہے جس سے دل کا کنول کھل جاتا ہے۔ اس کا خزانہ بھرا پڑا ہے جس میں موتی، یاقوت، ہیرا، زمرد اور دوسرے رنگ رنگ کے جواہر ہیں۔ اس کو یقیناً تلف ہونے سے بچایا جائے گا۔

ہندوستان ایک برصغیر ہے اور کافی وسیع ہے جس میں نصف درجن یا اس سے بھی زیادہ زبانوں کے لئے گنجائش ہے۔ ایک زبان کی ترقی کا یہ مقصد نہیں کہ دوسری زبانوں کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ میل ملاپ میں یکسانگی ہونا چاہیے۔ اسی طرح مسلم اور ہندو میں جو کچھ یکجہتی ہوئی ہے اُنھوں نے ایک ضخیم کتاب میں پوربی اور اینگلو انڈین شاعروں کا کلام مع حالات جمع کردیا ہے جہاں جہاں سے بڑے پیمانے پر مشاعرے کئے چنانچہ بلند شہر کے ایک مشاعرے میں میں بھی شریک ہوا تھا۔

قدما کے قلمی نسخوں اور تصاویر کا ایک نایاب ذخیرہ جمع کیا ہے۔ وہ ہمیشہ اُردو کے متعلق کچھ سوچا یا لکھا کرتے ہیں۔ شعر کے حسن و قبح پر اُن کی نظر ایسی پڑتی ہے کہ بایدوشاید۔ اُردو نہایت صحیح وفصیح بولتے ہیں مگر تحریر میں بجائے اُردو کے انگریزی استعمال کرتے ہیں وہ اس لئے کہ افادیت کا دائرہ زیادہ وسیع ہو جائے۔

تقریباً پچاس سال سے ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور اکثر ملتے رہے ہیں۔ کبھی وہ میرے یہاں آئے کبھی میں اُن کے پاس گیا۔ انسان کی حیثیت سے بھی اُن کا مثل نہیں۔ شرافت کا پتلا، اخلاق مجسم۔ اس قابلیت اور ہر طرح کے دنیوی عروج کے باوصف رام بابو کو غرور چھو بھی نہیں گیا۔ ہر شخص کے ساتھ خلق سے پیش آنا اور ملنے والے کی بھلائی کی فکر میں لگے رہنا۔ میں نے انہیں آج تک کسی کی برائی کرتے نہیں سُنا۔ اگر کسی نے اُن کے ساتھ برائی بھی کی تو خاموش ہو رہے کبھی انتقام لینے کا خیال بھی نہ گذرا۔ کبھی حرفِ شکایت زبان پر آیا۔ اُن پر کئی کٹھن وقت پڑے مگر ہمیشہ مردانہ وار مقابلہ کیا اور کیا مجال جو تیوری پر میل بھی آئے ہوں۔ یہ ایک دلچسپ مطالعہ ہو کہ اُن کا کیرکٹر بنانے میں اُردو کو کتنا دخل ہے۔

مجھے ناز ہے کہ رام بابو ایسا شخص مجھے دوست نہیں بلکہ اپنا بھائی سمجھتا ہے۔ میں بھی اُن سے اپنے چھوٹے بھائی کی طرح محبت کرتا ہوں۔ ہم علاحدہ دل ہی دل میں اس محبت کے مزے لوٹا کرتے ہیں اور جب مل جاتے ہیں تو دونوں کی عید ہو جاتی ہے۔

اُن کی کتابیں جو ابھی زیر تصنیف یا پریس میں ہیں اُن کی اشاعت سے اُردو کے ذخیرے میں بیش بہا اضافہ ہو گا۔ منتخب فہرست درج ذیل ہے:۔

(الف) اُردو ادب جدید (دو جلدیں) (ب) اشارات وروایات (ج) اُردو شعرا کا مرقع مع پیش لفظ (د) مثنویات میر و غلط تمیز۔ (س) اُردو اور فارسی کے شاعروں کا کلام بزبان ہندی (ص) اُردو ادب پر وہ مضامین جو پی ای ان میں شائع ہو چکے ہیں (ط) [illegible]

یہ کچھ بھی نہ ہوتا تو اُن کی تاریخ ادب اُردو انگریزی جس کا ترجمہ اُردو اور دوسری زبانوں میں ہو چکا ہے اُن کو زندگی جاوید بخشنے کیلئے کافی ہے۔

میں بیمار ہوں اور زیادہ محنت نہیں کرسکتا۔ جیسا کچھ اور جتنا کچھ لکھنا چاہتا تھا نہ لکھ سکا جس کا افسوس ہے۔

جگ جگ جیو رام بابو۔ تمہارا بول بالا رہے۔

جوش ملسیانی

پنڈت ہری چند اختر

۱۹۳۲ء کا ذکر ہے۔ کپورتھلے کا سالانہ مشاعرہ تھا۔ لاہور اور دیگر مقامات سے کئی نامور شاعر آئے تھے۔ صدارت کے لیے شیخ سر عبدالقادر مرحوم سے درخواست کی گئی تھی۔ انہوں نے آتے ہی پوچھا "جوش صاحب آ گئے؟" مشاعرے کے مہتمم مولوی مظفر حسین صاحب شمس نے بتایا کہ جوش صاحب نے کسی اور مصروفیت کے باعث معذوری کا اظہار کیا ہے۔ شیخ صاحب نے فرمایا "حیرت ہے کہ یہاں جوش ملسیانی کے بغیر بھی کوئی مشاعرہ ہو سکتا ہے۔ اتنا بڑا استاد اس علاقے میں موجود ہے اور آپ اس کو نہیں بلا سکے"۔ بے شک ایسا مردم شناس بھلا اس صورت حال سے کیوں نہ فائدہ اٹھاتا۔ فوراً تجویز پیش کر دی کہ اجازت ہو تو آپ کی طرف سے پیغام بھیج دیا جائے۔ چنانچہ ایک خاص آدمی موٹر کار میں روانہ ہو گیا۔

اس وقت جو شعرا شریکِ محفل تھے ان میں سے کئی ایک کو اپنے علم و کمال اور مقبولیت و شہرت کی بنا پر استادی کا درجہ حاصل تھا اور دو چار حضرات ایسے بھی تھے جن کی "حفظِ عزت" کی فکر نازک مزاجی کی مناسب حدود سے تجاوز کر چکی تھی لیکن میں نے دیکھا کہ سر عبدالقادر کی طرف سے جوش صاحب کی اتنی "شدید تعریف" اور خلوص بھرے اشتیاق پر کسی ایک پیشانی پر بھی بل نہیں آیا۔ اور پھر جب مشاعرہ کے اختتام کے قریب جناب جوش تشریف لائے تو ان سب کے چہروں سے حقیقی مسرت کا اظہار ہوتا تھا۔

جن لوگوں نے اس سے پہلے جوش کو نہیں دیکھا تھا انہیں کچھ دیر کے لیے مزید حیرت ہوئی ہو گی۔ درمیانے قد کا ایک سیدھا سادہ ادھیڑ آدمی۔ معمولی کپڑے کی پگڑی، قمیص اور دھوتی اوڑھے ہوتا، لباس کی وضع قطع خالص دیہاتی، شاعرانہ بناؤ نہ استادانہ تمکنت، کوئی تصنع نہ حاشیہ بردار، سراپا خلوص و انکسار انداز میں دیہاتیوں کی سی اخلاص بھری سادگی اور بے تکلفی۔ ہونٹوں پر ہلکا سا متانت آمیز تبسم، صورت شکل اور لباس کو دیکھو تو زیادہ سے زیادہ ایک سفید پوش عامی کہہ سکیں۔ ہر شخص یوں ملتا ہے جیسے خدا سے بھی اپنے مرتبے کا علم یا احساس نہیں۔ بھلا اس وضع قطع اور انداز میں ناواقف لوگوں کو اس اشتیاق اور تعریف و توصیف کا جواز کہاں نظر آ سکتا تھا جس کا اظہار سر عبدالقادر

سے نوازا تھا۔

لیکن ابھی کچھ زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ مشاعرہ قریب الاختتام تھا۔ دو چار شاعر باقی رہ گئے تھے وہ پڑھ چکے تو جوش صاحب سے درخواست کی گئی۔ یہ مشاعرہ مسلم الثبوت اساتذہ اور مشہور و مقبول شعرا کی تعداد کے علاوہ کلام کی بلندی اور عمدگی کے اعتبار سے بھی ایک معیاری اجتماع تھا۔ ایک ہی محفل میں اس پایہ کا اتنا کلام آج کل تو کجا ان دنوں بھی بہت کم سننے میں آتا تھا۔ پس اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ جب جوش صاحب شعر پڑھنے کے لئے اٹھے تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ سامعین نہ صرف داد و توصیف کے الفاظ کا ذخیرہ ختم کر چکے ہیں بلکہ واہ واہ اور سبحان اللہ کے نعرے لگاتے لگاتے خود بھی شل ہو گئے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ آنے والے شاعر کی وضع قطع بھی کچھ زیادہ موزوں نہ تھی لیکن آپ نے ایک رباعی ہی پڑھی تھی کہ سب دوبارہ سنبھل کر بیٹھ گئے اور غزل شروع ہونے تک تو مشاعرے میں گویا ایک نئی روح ایک نیا جوش اور اس کے ساتھ ایک نئی قوت پیدا ہو گئی۔ اب وہ سیدھا سادہ مسکین صورت اور منکسر المزاج شاہ مملکت سخن کا پرجلال و صاحب سطوت بادشاہ نظر آ رہا تھا۔ دیہاتی سادگی کا معنی سا مجسمہ نیستان شعر میں بپھرے ہوئے شیر کی طرح گرج رہا تھا۔ ایک قصباتی اسکول کا مدرس پرواز تخیل اور کمال فن کے وہ کرشمے دکھا رہا تھا کہ بڑے بڑے استاد بے خودی کے عالم میں جھوم رہے تھے۔ پنجاب کا ایک دیہاتی کوثر میں دھلی ہوئی ٹکسالی زبان میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہا رہا تھا۔ جس پر دہلی اور لکھنؤ والے بھی رشک کریں۔

جن لوگوں کو پہلے حیرت ہوئی تھی وہ اب بھی حیرت زدہ تھے۔ فرق یہ تھا کہ پہلے ان کی حیرت شک و شبہ پر مبنی تھی اب اس میں عقیدت اور احترام کا اظہار ہوتا تھا لیکن خود شاعر اس صورت حال سے قطعاً متاثر معلوم نہ ہوتا تھا۔ اس کے لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ عام سامعین کے علاوہ باکمال شاعروں اور عالی مرتبت استادوں نے بھی بڑی فراخ دلی سے خراج تحسین ادا کیا تھا۔ صاحب فن اہل نظر کی تعریف و توصیف سے فن کار کو قدرتی طور پر خوشی ہوتی ہے۔ چنانچہ جوش صاحب بھی مسرور و مطمئن تھے۔ لیکن اس سے زیادہ یہ کچھ نہیں۔ کسی حرکت کسی انداز میں کامیابی کے نشے، فتح مندی کے غرور یا مقابلے کی خواہش کا شائبہ تک نہیں۔ تحسین و آفرین کے غلغلوں میں غزل ختم کر کے پہلے کی طرح مسکراتے ہوئے اپنی جگہ پر آ بیٹھے۔ جیسے ایک فرض تھا وہ ادا ہو گیا اور بس۔ اقلیم سخن کا جلالت مآب پھر وہی مسکین صورت سادہ مزاج دیہاتی تھا گویا عجز و انکسار کا مجسمہ نظر آ رہا تھا۔ فصاحت و بلاغت کے دریا بہانے والا قادر الکلام پھر ایک عامی کی طرح سیدھے سادے چھوٹے چھوٹے بے تکلف جملوں میں باتیں کر رہا تھا۔

یہ مغالطہ اور تعجب تو خیر ناواقف ظاہر بینوں تک محدود تھا۔ لیکن حق بات یہ ہے کہ جس ماحول میں جوش صاحب کی تربیت و پرورش ہوئی اور جن حالات میں ان کی زندگی گزری ان کا پورا علم ہونے پر جوش صاحب کے شاعرانہ کمالات ان لوگوں کو بھی ایک معجزہ معلوم ہوں گے جو انہیں ایک مدت سے جانتے اور ان کے کلام اور مرتبے کو پہچانتے ہیں۔

پنڈت لبھو رام صاحب جوش یکم فروری ۱۸۸۴ء کو ضلع جالندھر (پنجاب) کے قصبہ ملسیان میں پیدا ہوئے۔ ۱۴ سال کی عمر میں والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ انہوں نے بیٹے کی تعلیم اور کنبے کی گزر اوقات کے لئے کوئی اثاثہ نہ چھوڑا تھا۔ اس لئے نہایت غریبی اور تنگدستی سے بسر ہونے لگی۔ ۱۴ برس کے بے یار و مددگار یتیم کے کمزور کندھوں پر جن مختلف اور کثیر التعداد ذمہ داریوں کا بوجھ آ پڑا تھا ان کے تصور ہی سے جی چھوٹنے لگتا ہے۔

اس بے کسی اور اقتصادی مشکلات و مصائب کے علاوہ جوش صاحب کو ماحول بھی سخت غیر شاعرانہ نصیب ہوا۔ تیس سال عمر تک ملسیان میں رہے۔ جسے صرف پنڈت جی کے لحاظ سے قصبہ کہہ دیا گیا ہے۔ پھر ۱۹۱۲ء سے نکودر میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہ ملسیان سے ۸ میل کے فاصلے پر تحصیل کا صدر مقام ہے۔ نکودر کو اگرچہ بعد میں ہائی اسکول نصیب ہو گیا۔ جس میں پنڈت جی فارسی کے اول مدرس تھے لیکن جوش صاحب

کے والد صاحب علی گڑھ میں آپ کے ہم درس و ہم سبق رہ چکے ہیں۔ [illegible] تعلیم و تعلم کا کچھ قابل ذکر حصہ جامعہ [illegible] میں گزرا ہے [illegible] کوئی فائدہ حاصل تھی۔ اور [illegible] ان کے ہاں صحبت اور ہم جماعت طلبہ میں [illegible] شعر و سخن کا ذوق تھا۔ [illegible] کافی ذخیرہ سمجھا جاتا ہے۔ اور موجودہ [illegible] علم و ادب اور شعر و شاعری کے [illegible] جوش صاحب سے پہلے [illegible] صاحب [illegible] اور [illegible] صحبت میں [illegible] علی گڑھی [illegible] زندگی کے شعبوں میں [illegible] کہ [illegible] کسی شعر و ادب کی [illegible] نہیں ہوئی [illegible] جوش صاحب کو سابقہ پڑا [illegible] صحبت میں ان کا وقت گزرتا تھا [illegible] حبیب [illegible] ایسی شامل ہو جایا کرتا تھا ان کی سرگرمیوں میں [illegible] علم و ادب اور وسعت مطالعہ کے اسباب اور [illegible] بھی مہیا تھیں [illegible] ہے [illegible] پختہ عالم [illegible] کے ہوئے [illegible] صاحب [illegible] کے حوالے ہو جائے گا۔

اب جوش صاحب کی سوانح [illegible] ان کی ذات زیر بحث آ گئی ہے تو چند اور باتیں بھی بیان کر دی جائیں۔ [illegible] صاحب [illegible] سے جتنا معروف [illegible] تعلیمی ترقی کے لحاظ سے اتنا ہی جوش [illegible] حافظے کی قوت بھی [illegible] ہے۔ [illegible] اچھا مطالعہ کرنا درسی کتابوں سے [illegible] کی ضرورت پیش [illegible] مشکل سے مشکل سبق [illegible] یاد ہو جاتا تھا۔ چنانچہ آپ محنت شاقہ سے کام نہ لیتے تھے اور اس طرح دوسری [illegible] پر توجہ کے لئے وقت [illegible] تھا۔ مگر اس کے باوجود جماعت میں اوّل نمبر پر رہتے تھے۔ ایک بار کا ذکر ہے امتحان کے دن تھے۔ شام کو کھانا کھانے کے بعد سائیکل پر [illegible] کے پاس گئے [illegible] دس بجے لوٹ آئے۔ صبح اٹھ کر ایک ہم سبق سے کہا کہ ذرا فلاں حصہ کتاب سے میرا امتحان لو۔ وہ سوال پوچھتا گیا [illegible] اور معقول جواب دیتے گئے جو کتاب میں درج تھے۔ اس طرح آپ ادب [illegible] اور منشی فاضل بن گئے۔ [illegible] کے پڑھنے والے جوش صاحب سے برسوں استفادہ کر سکتے ہیں۔ لیکن اس وقت روز افزوں [illegible] کے بنے ہوئے [illegible] کے لئے یہ بہت بڑی بات تھی۔ بالخصوص اس وجہ سے کہ اس سے آپ کے [illegible] کی سبیل بن گئی اور آپ [illegible] کے معتمد اور پھر اوّل مدرس ہو گئے۔

مزاج کی سادگی اور بے تکلفی کی طرف پہلے بھی اشارہ کر چکا ہوں۔ یہ سادگی زندگی کے کسی ایک پہلو تک محدود نہیں بلکہ ساری زندگی پر چھائی ہے۔ لباس کی یہ حالت ہے کہ معمولی کپڑے کی سفید پگڑی سفید دھوتی اور سفید قمیص کو کافی سمجھتے ہیں [illegible] سردیوں میں البتہ کمبل اوڑھ لیتے ہیں۔ گلوبند کا تکلف اور پتلون کا تو ذکر ہی کیا کوٹ پاجامہ [illegible] کبھی کبھار موسم کے اعزاز میں معمولی سیدھا سادہ کوٹ پاجامہ بھی پہن لیتے ہیں۔ جرابوں کے زیادہ سے زیادہ دو جوڑے جاڑے کے لئے کافی ہیں۔ وہ بھی سفر میں استعمال ہوتے ہیں۔ بوٹ آج تک نہیں پہنا۔ سر عبد القادر نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ اتنی سادگی اس رنگینی کلام سے کچھ بھی مناسبت نہیں رکھتی۔ لیکن جوش صاحب کی رائے یہ ہے کہ :

کیف آور تو ہے شراب فقط
ساغر زرنگار ہیں معنی

کھانے پینے میں بھی تکلف کو قطعاً دخل نہیں۔ جو کچھ ملا خدا کا شکر کر کے کھا لیا۔ بعض لوگوں کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ شعر و سخن کی محفل میں کیف و مستی سے بھری ہوئی شراب کے خم کے خم لنڈھانے والے جوش نے عمر بھر کبھی شراب نہیں پی بلکہ گوشت سے بھی ہمیشہ پرہیز کیا۔ اس کے باوجود احباب کی محفلوں میں نہایت بے تکلفی سے شامل ہوتے اور بلبل کی طرح چہکتے ہیں۔ خود فرماتے ہیں :

آتا ہے جذب دل کو وہ انداز مے کشی
رندوں میں رند بھی رہیں دامن بھی تر نہ ہو

لیکن اس انداز مے کشی کو ہر شخص کے لئے ضروری نہیں سمجھتے۔ حالات و طبائع کے مطابق نسخے میں تغیر و تبدل بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً جناب شیخ کی جوانی

حالت میں غزل مشہور کہی تو مقطع میں یہ کہہ گئے کہ —

پی لو گے تو اے شیخ ذرا گرم رہو گے — ٹھنڈا ہی نہ کر دیں کہیں جنت کی ہوائیں

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جوش صاحب کسی خانقاہ کے درویش یا مندر کے مہنت بن کے رہ گئے ہیں۔ اس پریشانیوں اور کلفتوں کی دنیا میں ہر شخص کو کسی نہ کسی وقت "چو خورد بادہ و فرزندم" کے چکر سے فرار اور کسی ذہنی پناہ گاہ کی تلاش ہوتی ہے۔ چنانچہ جوش صاحب نے بھی ایسی مصروفیتوں کے علاوہ ایک شغل بے شغل منتخب کر لیا ہے۔ شطرنج کھیلنے کا شوق خدا جانے نہیں کب اور کن حالات میں پیدا ہوا لیکن رفتہ رفتہ فنی کاوش انہماک کی صورت اختیار کر کے علاج کی جگہ خود ایک مرض بن گیا۔ بارہا یہ دیکھا گیا کہ ایک صبح سے دوسری صبح تک کھیلتے رہے اور اٹھے بھی تو صرف اس امید سے کہ دنیا اس انہماک کو دیکھ کر کیا کہے گی۔ آپ کا شمار پنجاب کے مشہور و معروف شاطروں میں ہوتا ہے۔ شطرنج سے متعلق ایک بیاض بھی مرتب کی ہے۔ جس میں بہت سے مشکل نقشے حل کئے ہیں۔ شاعری پر بھی اس شوق کا اثر ہونا لازم تھا۔ اکثر اشعار میں شطرنج کی اصطلاحیں اور تشبیہات بڑی خوبی سے استعمال ہوتی ہیں۔ مثلاً

سمجھتے خوب تھے ہم شاطروں کی چالوں کو — مگر نقشہ پڑا ایسا کہ بازی ہار بیٹھے ہیں
شکست چار قیس و کوہ کن ہی کو نہیں دیکھا — بساط عشق و الفت پہ تو ہر شاطر کو ماتیں ہیں

ایک جگہ آتش کی زبان سے فرماتے ہیں۔

مجھ سے جانباز کو غربت ہے بساط شطرنج — جو نہ پلٹے کبھی واپس وہ پیادہ میں ہوں

شطرنج کا پیادہ آگے ہی بڑھتا ہے۔ اور مہروں کی طرح پیچھے نہیں ہٹتا۔ پہلے مصرع کے متعلق کچھ عرض کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ جانباز غربت اور بساط شطرنج خود ہی مذاق سلیم سے داد و تحسین کا خراج حاصل کریں گے۔

عادات و خصائل کے اعتبار سے جوش صاحب قدیم وضع کے دیہاتی بزرگ ہیں۔ مزاج میں تکلف نام کو نہیں خود بے حد مخلص اور خلوص پسند ہیں۔ اور ایسے اشخاص سے مل کر خوش ہوتے ہیں۔ ظاہر داری اور ریاکاری کی مزدوری اور کاریگر صفات سے قطعاً محروم ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ بے حد فراخ دل اور مرنجان مرنج ہونے کے باوجود ان صفات کے لوگوں کو سخت ناپسند فرماتے ہیں اور ان کے متعلق اپنے خیالات و جذبات کو چھپانے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ طبیعت میں بغض و شر کے فقدان کے باعث دوستی کا نباہ تو عمر بھر کر سکتے ہیں لیکن دشمنی کی راہ پر تھوڑی دور بھی نہیں چل سکتے۔ کسی میں کوئی خوبی ہو تو اس کی تعریف دل کھول کر کریں گے مگر فضول خوشامد اور لابہ گری سے سخت نفرت ہے۔ میں نے اصول پرستی اور خودداری کے بڑے بڑے دعویداروں کو ذرا ذرا سی بات کے لئے ذلت کی انتہائی گہرائیوں میں گرتے اور اپنی خودداری بلکہ انسانیت کا خون کرتے دیکھا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جتنے زور و شور سے اصول پرستی اور آزادی ضمیر کے دعوے کئے جاتے ہیں۔ اتنی ہی ڈھٹائی اور بے حیائی سے ان دعووں کے اصولوں کی مٹی پلید کی جاتی ہے۔ مگر پنڈت جی کے متعلق پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے کسی حالت میں بھی یہ ذلت گوارا نہیں کی۔ اس سے بچنے کے لئے انہوں نے اپنی ضروریات میں انتہائی تخفیف کر لی اور قناعت کو اپنا مذہب بنا لیا۔ اسی لئے فرماتے ہیں —

وہ گدا ہوں تاج شاہی کی ہوس تو درکنار — سر چھپانے کو جگہ ڈھونڈوں ہما کو دیکھ کر

حقہ آپ کا محبوب ساتھی ہے۔ سگرٹ سے نفرت ہے۔ بالعموم سفر میں بھی ایک سفری حقہ ساتھ رہتا ہے۔ مجلس مشاعرہ یا اس قسم کی دوسری تقریبوں کے موقعے پر جبراً قہراً سگرٹ پیتے ہیں۔ اور وہ بھی "ریڈ لیمپ"۔ اچھے اور قیمتی سگرٹ اس لئے پسند نہیں کہ ان میں حقے کا سا لطف بھی نہیں۔ نکودر کی تحصیل میں تقسیم ملک سے پہلے تمباکو کی بہت کاشت ہوتی تھی اور یہاں کا تمباکو دور دور تک مشہور تھا۔ آپ کا معمول تھا کہ فصل کے موقعے پر بیسیوں نمونے تمباکو کے لاتے اور جو سب سے اچھا نکلتا اس کا اسٹاک سال بھر کے لئے خرید لیتے۔

... زندگی میں قیامت ایک مدت سے برپا ہے۔ آپ خود یہ واضح کرتے ہیں کہ گویا کہ یہ واقعہ ہونے کے بعد وقت رکھے
... ملامت و ضربات میں اضافہ ہی کی سازش۔ ... سے بچا سکیں ... بیمار ہو کر بھولی باتوں میں ...
... آپ کی مخصوص صفات ہیں۔ کہہ دے ہمسایاں ... کا اسم ہے۔ ... ہونے کے بعد ہی معلوم ہوا کہ
... ہی۔ استعجاب سے کہ ایک میل کا فاصلہ ہوگا۔ لیکن ... تو کبھی تھکے ہی نہیں تھے۔

ہم نشینوں میں صاحب علم کوئی نہیں۔ یہ وہ بات ہے کہ آپ کی صحبت کے فیضان سے ہم نشینوں میں خود سخن بھی پیدا ہو گئی ہے
... بہت سے ایسے ہم نشینوں میں ہیں کہ آپ ہی کے ہم نام ایک عالم صاحب ہی ... آپ کی ... کے پاس ...
علمی اور ادبی ہر قسم کی گفتگو حقے کے دھوئیں کے ساتھ وہاں ہوتی ہے۔

انگریزی نہیں جانتے۔ جوانی کے زمانے میں انگریزی پڑھنے کی کوشش کی اور ... ایک ... کتاب ... پہلی دفعہ تو
(JUDGE) اور سولجر (SOLDIER) کے ہجوں سے کچھ بیزار ہو گیا ... ڈی ... سے ... کس مصلحت سے ہے
دوسری مرتبہ پھر شوق ہوا مگر نائٹ (NIGHT) اور ہاف (HALF) اور نو (KNOW) وغیرہ وغیرہ کے لفظ ... سے
... پریشان ہو کر رہ گئے۔ پھر تیسری بار ... کی ترغیب ... ایک ... کتاب ... جہاں آپ کا مستقل قیام
... طاعون پھیل گیا۔ چوتھی دفعہ کوشش کی تو شہر میں ... نے حشر ڈھا دیا۔ یہ ... دیکھ کر کتاب پھینک دی اور پھر اس وہم کی
... ہے کہ اگر پڑھنا شروع کیا تو خدا جانے کیا قیامت نازل ہو۔

فصیح الملک مرزا داغ کے شاگرد ہیں۔ ان کے شاگردوں کی تعداد بہت ... جوش صاحب سے فیض اصلاح پانے والوں کی تعداد
بہت ہے۔ حالانکہ آپ اکثر ... کہہ کر ٹال دیتے ہیں کہ ... آپ کے ... ہے۔ ...
... مشق آپ سے مشورہ سخن کرتے رہے ہیں ... آپ ... زبان کے پابند ... سائل ...
... نوح، یگانہ، حسرت موہانی، جگر، جوش ... سب آپ کے اچھے ... ہیں ... آپ نے ...
... اس طرح گزارا کہ ایک مشاعرے میں ... آپ کا کلام سن کر انگشت بدنداں رہ گئے تھے ... آپ نے ... کی مشہور زمین میں یہ شعر پڑھا

جناب شیخ کی میراث اس میں چل نہیں سکتی ابھی ز گلشن جنت سے ہم حقدار بیٹھے ہیں

آغا شاعر قزلباش اسٹیج پر آ کر آپ سے بغل گیر ہو گئے۔

یہ بات کہ بے شمار شاگردوں کو فیض پہنچانے کے باوجود آپ نے اپنے قابل فخر صاحبزادے حضرت ... کو اصلاح کے فیض سے
فیض یاب نہیں کیا۔ عجیب ضرور ہے لیکن جوش صاحب کی وضع داری اور مزاج کی نفاست کو دیکھتے ہوئے یہ بات بھی قابل تسلیم ہے
آپ جوش صاحب کی شخصیت میں ایک شفیق باپ، ایک باوقار استاد، ایک معزز شہری، ایک نہایت شریف انسان اور شہرت سے ...
تلاش نہ کرنے والا شاعر پائیں گے۔ انہیں شاعر کی عظمت کا احساس ہے۔ اس کے ساتھ خود اپنی عظمت کا احساس بھی ضرور ہے۔

انکار کیجئے نہ کمالات جوش سے
کم گو سہی مگر وہ سخن ور ضرور تھا

تلوک چند محروم

جگن ناتھ آزاد

مسلسل چھتیس برس تک سرکاری اور نیم سرکاری ملازمت کرنے کے بعد والد جب کنٹونمنٹ بورڈ اسکول راولپنڈی کی ملازمت سے ریٹائر ہوئے تو انھوں نے اپنے اس عرصۂ ملازمت کا جائزہ ان اشعار میں لیا ہے

سی و پنج سال عمرم بہ ملازمت بسر شد   کہ شباب خود را بہ تیرہ شام کردم
شرفی بہ عہد پیری چہ بود کہ در جوانی   بہ سگاں ادب نمودم بہ خراں سلام کردم

یہ ہیں ایک شاعر کی مسلسل چھتیس برس کی ملازمت کے تاثرات ۔

چھتیس برس ——— زندگی کا ایک حصہ ——— بہ سگاں ادب نمودم بہ خراں سلام کردم ——— اور اس کے باوجود مسلسل تخلیق فن کا سلسلہ جو آج تک جاری ہے۔ چھتیس برس کی اس مسلسل کشمکش کا اندازہ ان تنقیدی یا تعریفی مقالات سے نہیں ہو سکتا جو مختلف رسائل اور کتابوں میں والد احسان کی شاعری کے بارے میں لکھے گئے۔ والد کی زندگی کے وہ گوشے جو ان کے تخلص کے ساتھ گہرا معنوی ربط رکھتے ہیں اور اس لحاظ سے بھی جاوید ہیں ابھی تک منظر عام پر نہیں آئے۔ میں اس مقالے میں بعض ایسے ہی گوشوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کروں گا۔

والد سے میں نے ذکر کیا کہ طفیل صاحب کا خط آیا ہے اور انھوں نے مجھ سے آپ کے بارے میں مقالہ لکھنے کے لئے کہا ہے کچھ مشورہ دیجئے کیا لکھوں تو کہنے لگے کہ میری زندگی میں ایسے واقعات پیدا ہی نہیں ہوئے جنھیں رسالے کے لئے لکھا جائے اور جو واقعات ہیں وہ ماحول کے ہمارے سماج کی کوئی عمدہ تصویر پیش نہیں کرتے۔ پنجاب کی تلخیوں اور تعصبات کا زمانہ۔ اسے دہرانا کوئی مستحسن بات نہیں ہے۔ میانوالی اور راولپنڈی کے واقعات تو تمھیں یاد ہی ہوں گے۔ اگر مفتی احمد سعید اور بیرسٹر محمد جان میری امداد نہ کرتے تو متعصب لوگ میری زندگی بھی دشوار بنا دیتے۔ اب بھی انھوں نے کچھ کم پریشان نہیں کیا اس سے پہلے بھی جب تم بہت چھوٹے تھے مجھے مخالفوں نے مسلسل کئی برس تک پریشان کیا۔ یہ باتیں لکھنے کی تھوڑا ہی ہیں۔

انھوں نے مقالہ نہ لکھنے کی جو وجہ بیان کی وہی میرے لئے یہ چند سطور لکھنے کی وجہ جواز بن گئی۔ پریشان کرنے والے لوگوں میں بعض مسلمان

بچانے کا منصب [illegible] مسلمانوں [illegible] اب [illegible] شاعری [illegible] کے ساتھ [illegible] کے
[illegible] ایک شاعر کی داستان حیات لکھنے کی [illegible] ہو سکتی ہے [illegible] کیا ان میں [illegible] نہیں
تھے [illegible] تاریخ ادب کا ایک [illegible] ہے جو آج سے بہت پہلے [illegible] میں آ جانا چاہیے تھا۔

[illegible] والد کا [illegible] دریائے سندھ [illegible] ضلع [illegible] تحصیل میں [illegible] ایک گاؤں [illegible] بھی ہے
یہ گاؤں اس زمانے میں [illegible] تھا۔ [illegible] بہت [illegible] کو [illegible] آباد ہو گیا۔
[illegible] اس وقت [illegible] کی تھی۔ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ [illegible] مسلمان [illegible] تحصیل [illegible]
کے پاس سے [illegible] دریائے [illegible] میں [illegible] جب [illegible] گاؤں [illegible]
ہو جاتا تھا [illegible] مکان [illegible] اور پھر اتر جاتے تھے [illegible]
[illegible] بیٹھتے تھے [illegible] اس طرح [illegible] بہتے [illegible] ہوتے ہوئے [illegible] کے
کے تختے [illegible] کشتیاں بنا لیں [illegible] مرتبے [illegible] ان [illegible] میں [illegible] غالب کا یہ شعر [illegible]
کے سامنے آ جاتا ہے۔

عذر سیلاب سے مل کر نہ ٹھہا تشنہ — خانہ عاشق گر ساز صدائے آب تھا

والد کا دریائے سندھ سے دلی ربط جو آج بھی ان کی گفتار و اشعار میں موجود ہے، اسی زمانے کی یادگار ہے۔ ایک تازہ ترین نظم میں کہتے ہیں —

بھولا نہیں حادثہ [illegible] اوائل [illegible] کا — وہ [illegible] بھی [illegible] کا
[illegible] مرے [illegible] زماں کا — افسوس کہاں [illegible] حصہ [illegible]

گر رشتہ کناروں سے مرے توڑ کے آیا
طغیانی بھی حجازی بھی جب چھوڑ کے آیا

تقدیر بھی [illegible] سے مجھے انکار نہیں ہے — گو پاٹ [illegible] نہیں ہے
کیا کیجیے وہ آر نہیں پار نہیں ہے — آسودہ کسی [illegible] نہیں ہے

وہ بھیرو وہ جوش وہ خروش اس میں کہاں ہے
افسردہ سی بے جان سی اک نہر رواں ہے

گو جور و جفا کی بھی عادت بھی رہی ہے — ظرف [illegible] کچھ مائل وحشت بھی رہی ہے
مضمر ترے طوفان میں آفت بھی رہی ہے — ساتھ اس کے نمایاں یہ جمعیت بھی رہی ہے

دیہات اجاڑے ہیں بسائے بھی ہیں تو نے
نقشے جو بگاڑے تو بنائے بھی ہیں تو نے

ہاں یاد ہے [illegible] آباد جو قریہ — آتا ہے ابھی [illegible] یاد جو قریہ
تھا جلوہ گہ حسن خداداد جو قریہ — ہر قید تکلف سے تھا آزاد جو قریہ

بستا ہے کنارے پہ ترے اب بھی کہیں اور
مضمون نہ ہو گا وہی ہو گرچہ زمیں اور

کرا پھر سات برس کی عمر میں انہیں مڈل کے امتحان کے لئے شمالی ہائی سکول میں باقاعدہ داخل کرا دیا گیا۔ [illegible] سے۔ پانچویں جماعت کے امتحان میں وظیفہ حاصل کیا۔ اس زمانے میں ضلع بھر میں کوئی ہائی سکول نہ تھا اس لئے [illegible] جا کر [illegible] ہائی سکول میں داخل ہوئے۔ [illegible] میں میٹرک کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا۔ ایف اے سے [illegible] بعد میں بہ درجہ [illegible] پاس کئے۔

میٹرک [illegible] کے بعد سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں داخل ہونے کے لئے بزرگوں سے لاہور آئے۔ رستے میں پہلی بار مقبرہ نور جہاں کا مقبرہ دیکھا۔ [illegible] کی مشہور نظم "نور جہاں کا مزار" اسی زمانے کی یادگار ہے۔ والد بتلاتے ہیں کہ اب تو مقبرے کے چاروں طرف [illegible] ہوگئی ہیں اور میدان کا عالم [illegible] ہے لیکن اس زمانے میں جب میں نے اسے پہلے پہل دیکھا تھا۔ اس مقبرے کی کیفیت واقعی ہی تھی کہ۔

چمگادڑیں جو گھبراتی ہیں گرمی سے تو اکثر　　آرام کیا کرتے ہیں اس روضے میں آکر
اور شام کو بالائی سیہ خانوں میں شپّر　　اڑ اڑ کے لگاتے ہیں در و بام کے چکر

معمورہ ہے یوں گور یہ غم خانہ کسی کی
آباد رہے محفل جانانہ کسی کی

اسی سال میرے دادا کا انتقال ہوا۔ وہ ایک خوش طبع انسان تھے۔ آتے جاتے مسافر کی خدمت خوشی سے کرتے اور جب کوئی سادھو مل جاتا اس کے ساتھ ہو لیتے اور کئی کئی دن تک گھر سے غائب رہتے تھے۔ میرے دادا اردو اور فارسی سے اچھی طرح واقفیت رکھتے تھے ہو [illegible] میں انہوں نے شعر کہنے کی بھی کوشش کی لیکن اسے جاری نہ رکھ سکے۔

والد کی پہلی شادی [illegible] میں ہوئی۔ پانچ برس بعد بیوی کا انتقال ہوگیا۔ ایک سال کی بچی رہ گئی — ودیا — میری بہن جس کی خودکشی نے والد کی زندگی سے ہمیشہ کے لئے مسرت چھین لی۔

اگلے برس دوسری شادی ہوئی۔ یہ میں اپنی والدہ کا ذکر کر رہا ہوں۔ دو برس بعد ۱۹۱۳ء میں میں پیدا ہوا۔ تین چار برس کی عمر کے واقعات [illegible] کے دھندلکے میں ابھی تک موجود ہیں گویا آئندہ سطور صرف شنیدہ ہی کی نہیں بلکہ شنیدہ اور دیدہ دونوں چیزوں کی حامل ہوں گی۔

آج سے چونتیس برس پہلے کا زمانہ میری نظر کے سامنے ہے۔ جیسے تخیل میں ایک چھوٹا سا مکان ہے۔ والد، والدہ، ودیا اور میں ہم چار افراد اس میں رہتے ہیں۔ سردیوں کے دن ہیں۔ والد کوٹھے کی چھت پر دھوپ میں ایک چارپائی پر بیٹھے ہیں۔ کوئی کتاب ان کے سامنے ہے گنگنا رہے ہیں۔ والدہ مجھے اور ودیا کو اوپر بھیجتی ہیں کہ جا کر کہو بازار سے ترکاری لے آئیں۔ ہم دونوں اوپر جاتے ہیں۔ دو ایک بار انہیں پکارتے ہیں لیکن وہ ہماری طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ ہم اس خوف سے کہ کہیں جھڑک ہی نہ دیں فوراً واپس آجاتے ہیں۔ اخبار یا کتاب کی جانب ان کی محویت کا آج بھی یہی عالم ہے۔ وہ محوِ مطالعہ ہوں تو انہیں اپنی جانب متوجہ کرنے کے لئے دو چار بار پکارنا بالکل بے کار ثابت ہوتا ہے۔ ان کی محویت سے قطع نظر ان کا خوف اسی تصویر کا ایک اور پہلو ہے جو ایک زمانے تک قائم رہا اور جس کے کچھ نقوش آج بھی باقی ہیں۔

میرے اور ودیا کے دل میں ایک مدت تک والد کی محبت کے مقابلے میں شاید ان کا خوف زیادہ غالب رہا۔ یہ ان کے کردار کا ایک نمایاں پہلو ہے۔ آج بھی وہ اپنی رائے کے خلاف دنیا بھر کی رائے سن سکتے ہیں لیکن میری رائے ان کی رائے کے خلاف ہو یہ انہیں گوارا نہیں اور میں نے بھی حتی الامکان محتاط رہنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کی یہ افتادِ مزاج شفقت پدری کے رستے میں حائل رہی بلکہ جہاں تک میرا اور ودیا کا تعلق ہے ہمیں اس شفقت کا حصہ وافر ملا ہے۔ ہاں میری چھوٹی بہنیں ساوتری اور کرشنا اس محبت سے پوری طرح شادکام نہیں ہوسکیں کیونکہ انہوں نے اس وقت ہوش سنبھالا جب ودیا کی خودکشی کے باعث والد کا دل بجھ چکا تھا۔ ودیا نے جو بائیس برس کی عمر میں تین بچوں کی ماں ہو چکی تھی سسرال میں

ایک مقالے کی بابت [illegible] چھپا [illegible] تھی۔ [illegible] مدت تک اس مقالے کے چھپنے [illegible] دیکھی [illegible] سے قبل [illegible] شعر [illegible] اس [illegible] نہیں کیا اس [illegible] اشعار [illegible] کہیں شائع نہیں ہوئے:-

شمشان کا نظارہ دکھاتی ہے یہ دنیا — افسوس کہ شمشان میں کیا کیا گئے چھپ
تو دیکھ مجبور ہوئی گی جب بھر — تپتے ہوئے [illegible]

بجھ نہیں سکتی جو دل میں ہے جلی آگ — [illegible]
کیا تو نے [illegible] جگر — [illegible]

پہلے بھی ہوا خانہ تھی وہ مہرباں [illegible] — افسوس [illegible]
اے بخت جگر [illegible] — [illegible] آتش [illegible]

تا اب ان کے کی ہو سکتی نہیں جان جگر — ایک چنگاری سے ہو جاتا ہے شعلہ بلند
اے [illegible] ہیں تو نے سے لخت جگر — [illegible] افسوس [illegible]

دل بیتاب جتا دیتا ہے گا اس کی حسرت سے — [illegible]
جگر شگفتہ ہے میرا آگ لگی ہے سینے میں — [illegible]

کیسی غلط سے [illegible] داغ جگر [illegible] — فریاد [illegible] داغ جگر [illegible]
ایں داغ جگر یا خون جگر سوخت — [illegible]

"آں داغ جگر" اشارہ ہے [illegible] بہن کی موت کی جانب۔ یہ بچی دو برس کی عمر تک [illegible] بیمار رہ کر ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئی تھی۔ اس بچی کو موت کے بعد ہندوؤں کے طریقے کے مطابق جلایا نہیں گیا تھا بلکہ دفنا دیا گیا تھا۔ والد [illegible] مسلسل تین دن اس کی قبر پر جاتے رہے۔ وہاں سے واپسی پر والد بزرگوار ایک نظم کہتے تھے۔ تیس دن کے بعد یہ سلسلہ بند کر دیا۔ یہ نظمیں بھی [illegible] خیال ہے کہیں شائع نہیں ہوئیں۔ چند اشعار مجھے زبانی یاد ہیں، یہاں درج کر رہا ہوں:-

پہلی صبح

کیوں ماں سے روٹھ کر نکل آئی ہے تو یہاں — اٹھ میرے ساتھ چل مری پیاری شگفتہ
وحشت فزا مقام ہے جنگل ہے ہولناک — یاں رات تو نے کیسے گزاری شگفتہ
خواب گراں میں تو ہے ابھی زیر خاک سرد — بیدار کائنات ہے ساری شگفتہ

خوش ہو کہ پھر بہار گزرنے پہ ہے صبا — آنکھوں سے اس کی شکل پھری تھی گئی تھا
گلشن میں بلبلوں کا ہے چاک گریباں — پتھر پہ تجھ کو دیکھ کے سارے شگفتہ
ویرانہ ہوگیا ہے گھر تیرے بغیر — کہتے ہیں سب کہاں ہے ہماری شگفتہ

دوسری صبح

مایوس ہو کے نکل گئے پھر آج آ گئے — اے کاش زیرِ خاک سے تو آشکار ہو
تو دور رہ کے آ نہ سکی گھر سے بے خبر — روؤں کی بھی کیا پیاس بجھا کے تیری یاد تو
گھر میں لوٹ کے آئی تھی تو نے تڑپ تڑپ — آسودہ ہوگئی ہے خاک کے اندر تو
افسوس عمر بھر بھی نہ پائے گی وہ بات — سب ہو رہی تھی ہر سفر نے قرار لو
روتا ہے ہر شب تیری یاد میں تیرا گھر — وہ جلتی شب کی کہانی ہے سب تیرا پیار تو
بھولا نہ غم جہاں تجھے جب گود میں لیا — آئی تھی بن کے راحتِ جانِ نثار تو
جتنی تیرے بغیر رہے گی یہ مرے نصیب — اتنا ہی رکتی ہے جیب دلِ فگار تو

تیرے لئے دعا ہے دلِ غم نصیب کی
ہو بہرہ یاب رحمتِ پروردگار تو

تیسری صبح

ملتا نہیں ہے کچھ مری فریاد کا جواب — کس نے شگفتہ تجھے یوں کر دیا خموش
مطلب یہ تھا کہ ہوگی نالوں سے جاگ اٹھے — فطرت میں ورنہ ہے ملی ہر شی خموش
مجھ بدنصیب کے لئے تیری خموشیاں — دیا ہے خاموشی میں تو ہو جاؤں گا خموش
طاری ہے آہ شہرِ خموشاں پہ کیا سکوت — خاموش سرزمیں کی ہے ساری فضا خموش
سرمنزلِ دیارِ عدم سے یہی مقام — ڈیرے لگے ہوئے ہیں مگر سب ہیں خموش
وادی یہ وہ ہے جس میں مسافر اترتے ہیں — سینے میں سانس روک کے ہر نقشِ پا خموش
دم مارنے کی تاب کسی کو یہاں نہیں — پیر و جواں خموش ہیں شاہ و گدا خموش
نغمے خوشی کے ہیں نہ کہیں نالہ ہائے غم — یکسر ہیں ساکنانِ دیارِ فنا خموش

صدمہ نہ کیوں ہو تیری معصوم روح کو
ہوتا ہے سامنا جب مری فریاد کا خموش

شگفتہ کے ذکر سے پہلے میں عذرا کی خودکشی کا ذکر کر رہا تھا۔ یہ ۱۹۳۶ء کی بات ہے جب ہم راولپنڈی میں تھے جس روز دوپہر کو اس حادثے کی اطلاع تار کے ذریعے سے ملی اسی روز جب صبح کو ——— حادثے کی اطلاع سے پانچ سات گھنٹے قبل ——— عذرا بیدار ہوئے تو میں نے انھیں خلافِ معمول بہت افسردہ پایا۔ میں نے ان سے دو ایک بار پوچھا کہ طبیعت تو آپ کی اچھی ہے؟ رات کو نیند تو ٹھیک سے آئی؟ انھوں نے کہا۔

پہلی بار ہوا کہ اتنی بات نہیں ہے بلکہ حیثیت پریشانی کی ہے جب سکول بیکار ہو چکا [illegible]
[illegible] تھا۔ میں نے اس خیال سے کہ اسکول کا [illegible] کراچی [illegible] پیش کیا [illegible]
[illegible] پریشان تھا [illegible] انگریزی [illegible] اسکول جانے تک [illegible]
پریشانی کو چھپانا ان کے بس میں نہ تھا [illegible] ——— (VIETNAMED THE MORNING
وہی صبح کا وقت جب والد صاحب [illegible] خاموشی کے عالم میں بیٹھا [illegible] کلاس [illegible]
کھانا بھی نہیں کھائی گئی۔

یہ میری جنوں کی زندگی اور [illegible]
[illegible] پنجاب میں ایک چھوٹا سا شہر ہے [illegible]
[illegible] ضرورت پانی یہاں کیا [illegible] پتہ چلانے کیا کیفیت ہے [illegible] شہر [illegible] چھوٹا سا
شہر کی عورتیں ہر صبح [illegible] پانی [illegible] گرمی [illegible]
عورت گھر میں مقید تھی۔ پانی لانے کے سوا [illegible] پانی [illegible]
جائے لیکن سارا شہر یہی پانی پیتا تھا۔ والد پندرہ برس کی [illegible] شہر سے [illegible] لاہور [illegible]
برس گزارنے کے بعد جب [illegible] خیال ہی آتے [illegible] شہر کے پانی سے بیزار ہو گئے [illegible] پانی ہم لوگوں کو بیمار کر رہا ہے
چنانچہ وہ اکثر پانی کے گھڑوں اور صراحیوں [illegible] پیدا کرنے سے اور [illegible] خاص [illegible]
تہ کے قریب نہ پانی میں حرکت پیدا نہ ہو۔ اس [illegible] پانی سے [illegible]
پتھری کی صورت اختیار کر لی تھی۔ شدت درد کے [illegible] ایک مدت تک
زیر علاج رہے ڈاکٹر [illegible] ایک مشہور انگریز ڈاکٹر [illegible] انہوں نے آپریشن کر کے پتھری [illegible] نقاہت کے عالم میں واپس گھر آئے۔
اب ہر لمحے یہی خیال کہ پھر پتھری بننے کی [illegible] پیش نظر نہیں [illegible] اس کی کیا صورت کی جائے۔

مفتی احمد سعید [illegible] ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز تھے۔ گجرات ان کا وطن تھا نیک [illegible] اور تعصب سے بالا انسان تھے۔ ذوق سخن رکھتے تھے، والد کے مداح تھے اور قدر دان۔ ان سے والد نے اپنی مشکل بیان کی کہ اس شہر سے مجھے نکالئے ورنہ پھر بیمار پڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ انہوں نے ان کا تبادلہ کلور کوٹ کے مڈل سکول میں ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے کر دیا۔

کلور کوٹ دریائے سندھ کے کنارے ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ گاؤں کے اردگرد میلوں تک ریگستان پھیلا ہوا ہے۔ آندھیاں یہاں اکثر آتی ہیں۔ بارش کی صورت کو لوگ ترستے رہ جاتے ہیں۔ بادل اٹھتے ہیں اور ایک جھلک دکھا کر غائب ہو جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود نعمت غیر مترقبہ ——— صاف ستھرا پانی ——— جس کی تلاش میں والد نے اپنا شہر چھوڑا تھا یہاں بافراط موجود تھا۔ اب والد کو یقین ہو گیا کہ یہاں پانی کی خرابی کی بنا پر بیمار پڑنے کا اندیشہ نہیں۔

لیکن اس اسکول کی ہیڈ ماسٹری کانٹوں کا بستر نکلی۔ ٹیچر صاحبان میں شاید دس جماعتوں سے زیادہ پڑھا لکھا کوئی نہ تھا۔ ان کی ذہنیت وہی تھی جو اکثر دیہاتی مدرسوں کی ہوتی ہے۔ ایک ٹیچر صاحب نے ایک دن اپنے طلبہ سے کہا کہ کل سب لڑکے اپنے اپنے گھر سے ایک ایک اکنی لے کر آئیں۔ [illegible] رقم سے کلاس روم کے لئے [illegible] خریدا جائے گا۔ والد کو یہ بات معلوم ہوئی تو انہیں ضابطے اور اخلاق کے نقطہ نظر سے بہت ناگوار گزری۔ انہوں نے اس ٹیچر کو بلایا اور اس سے کہا کہ یہ حرکت تمہارے لئے اور سارے اسکول کے لئے بدنامی کا باعث ہے۔ جب سرکاری طور پر کلاس روم کے [illegible] مہیا کئے جاتے ہیں

[illegible] طلبہ سے بھی کہہ دیا تھا ۔ وہ صاحب اس وقت آگرہ ... لیکن انھوں نے ... [illegible]
متعصب ہے اور مسلمانوں کو تنگ کرتا ہے ۔ کلورکرٹ میں زیادہ تر ہندوؤں کی تھی ۔ مسلمان شہر سے دور مختلف دیہات میں ... [illegible]
... لوگ بھی تھے ۔ خوشحال اور کھاتے پیتے بھی اور ایسے بھی جنھیں مفلس کہا جا سکے ۔ ان دیہات میں کوئی اسکول نہیں تھا ۔ میرا خیال ہے ... [illegible]
اسکول بھی کوئی نہ تھا ، انگریزی مڈل کا تو کیا سوال ! لہٰذا مسلمان طلبہ کے لئے کلورکرٹ میں آکر تعلیم حاصل کرنا ایک بڑا مسئلہ تھا ۔ جہاں تک ... [illegible]
جب ہم کلورکرٹ میں آئے تو اسکول میں مسلمان طلبہ کی تعداد دو چار فی صد سے زیادہ نہ تھی ۔ علاوہ ازیں ان دیہاتی طلبہ کی سہولت کے ... [illegible]
کا انتظام کیا ... جس میں سب شامل ... ۔ تمام طلبہ دیہات سے آکر داخل ہو گئے اور اسکول میں ان کی خاصی تعداد ہو گئی ۔ اس بات سے دیہات کے تمام مسلمان
... یا زیلدار ، امیر یا کاشتکار ، غریب ہوں یا امیر ، بہت خوش ہوئے کیونکہ ان کے بچوں کی مستقل تعلیم کی ایک صورت پیدا ہو گئی تھی لیکن
کچھ ٹیچروں کی ذہنیت جوں کی توں رہی ۔ ایک ٹیچر نے بورڈنگ ہاؤس سے دو چار پائیاں چرا لیں اور جب اس سے حساب طلب کیا گیا تو اس نے طلبہ
... ہندو کہنا شروع کر دیا ۔ بدقسمتی سے یہ ٹیچر ایسے لوگ تھے جو کسی طرح سے سچی کے منصب کا مرکز ہوں نہیں تھے ۔ یہ لوگ سرتا پا ... [illegible]
اردو کا صحیح تلفظ بولنا ان کے لئے بہت مشکل تھا ۔ ... وہ لوگ سچی کے کام پر مامور تھے ۔ ان میں سے ایک صاحب ہر روز ... طلبہ
کو اپنے گھر بھیج دیا کرتے تھے اور وہ طلبہ وہاں ان کے طرح طرح کے ذاتی کاموں میں مصروف رہتے تھے ۔ زیادہ تر وہ کام یہ ہوتے تھے کہ ... [illegible]
کھلی اور چارے کا انتظام ، چارپائی وغیرہ کی بنائی ، گھر کی صفائی اور بچوں کو ادھر ادھر لئے پھرنا وغیرہ ۔ ایک اور صاحب نے طلبہ کی باریاں مقرر کر رکھی تھیں
اور اپنی اپنی باری کے مطابق ہر طالب علم ان کے لئے گھر سے لسی لایا کرتا تھا ۔ ٹیچر صاحب لسی میں مکھن کی موجودگی پر بھی اصرار کیا کرتے تھے ۔ ایک ٹیچر صاحب
جیب میں تاش ڈال کر اسکول آیا کرتے تھے ، اور جب موقع ملا وہ بعض ساتھیوں کے ساتھ تاش کھیلنے بیٹھ جایا کرتے تھے ۔ والد ان بدعنوانیوں کو گوارا
نہ کر سکے ۔ مشورہ ، نصیحت اور ڈانٹ ڈپٹ کے ذریعے سے انھیں روکنا چاہا ۔ انھوں نے والد کے خلاف ایک محاذ قائم کیا ۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز
اور ڈپٹی کمشنر کو گمنام خطوط لکھے ۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز مفتی احمد سعید ایک شریف اور غیر متعصب مسلمان تھے ۔ ان پر ان شکایات کا مطلقاً کوئی اثر
نہ ہوا اور سازشیوں کو ہر بار منہ کی کھانا پڑی لیکن ان کا تبادلہ ہوتے ہی صورتِ حال بدل گئی ۔ نئے ڈسٹرکٹ انسپکٹر مختلف مزاج کے افسر تھے ۔ انھوں نے
ان شکایات کا اثر لیا اور والد کے خلاف انکوائری جاری کر دی ۔ یہ ایک عجیب صورتِ حال تھی ۔ مسلمان بچوں کی تعلیم کے لئے والد نے اتنا کچھ کیا اور ان کو اسی
اہتمام کی تحسین کے لئے یہ سزا ملی کہ یہ متعصب ہیں اور مسلمان طلبہ اور ٹیچروں کو پریشان کرتے ہیں ؎

بجرمِ عشق توام می کشند و غوغا ایست
تو نیز بر سرِ بام آ کہ خوش تماشا ایست

انھوں نے مفتی احمد سعید کو ایک خط لکھا ؎

" فردا و دوسرے کا تعزیت بار ہٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی "

لیکن وہ اب دوسرے ضلع میں افسر تھے اور یہاں کے معاملات میں بے بس تھے ۔

ڈسٹرکٹ انسپکٹر خود انکوائری کے لئے تشریف لائے ۔ ڈاک بنگلے میں عدالت قائم ہوئی ۔ شہر کے ہندوؤں کو تو گواہی کے لئے بلایا گیا
تمام دیہات کے مسلمان اور اسکول کے ٹیچر اور طلبہ موجود تھے ۔ ہر شخص کی عزت و آبرو خدا کے ہاتھ میں ہے ۔ ٹیچروں نے دو چار معصوم طلبہ کو ورغلایا لیکن
دیہات سے آئے ہوئے تمام مسلمانوں اور سارے مسلمان طلبہ نے سازشی ٹیچروں کے خلاف گواہی دی اور ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز کو اس بات پر
مجبور کیا کہ موجودہ ہیڈ ماسٹر کا کلورکرٹ سے بالکل تبادلہ نہ کیا جائے کیونکہ اندیشہ ہے کہ ان کے جانے کے بعد مسلمان بچوں کی تعلیم کا یہ انتظام شاید ... [illegible]

[illegible] اس ماحول سے الگ ہو جائیں گے۔

[illegible] ہے کہ شاید تعلیم کہیں بھی [illegible] کے

مختلف شعبوں میں [illegible] ایک خط لکھا [illegible] نظر [illegible]

[illegible] سے چھپ ہی جاتے۔ [illegible] کی [illegible] بات [illegible] کے [illegible] کی [illegible] ہو سکتی [illegible] یہ کہ ایک

پرچہ ملک [illegible] والد کے خطوط کی نقل [illegible] کی [illegible] پریس کر [illegible] ان کا اس میں [illegible] تیار کیا تھا

[illegible] رات کے [illegible] ایک [illegible] کی [illegible] تھا کہ [illegible] میں شائع کی تھی۔ والد کا اس میں [illegible]

موجود تھا۔ اس نظم نے [illegible] کو مکمل [illegible] کر دیا اور [illegible] ایک [illegible] کی [illegible] میں [illegible]۔ اب کے [illegible] کے [illegible] میں

تھا۔ جہاں تک [illegible] ہے ان کا [illegible] رادھا کرشن تھا۔ حکومت کی جانب سے [illegible] کا [illegible] بھی نہیں ہوا تھا۔ اس [illegible]

والد کے خلاف کسی قسم کے ثبوت کی ضرورت نہ تھی۔ ان کے اپنے خطوط کی نقل [illegible] بعض حالات میں اصل خطوط اور اپنے [illegible] کی [illegible] نظمیں موجود

تھیں۔ حکومت وقت کے خلاف بغاوت کا جرم ثابت تھا۔ اس کی کم از کم سزا ملازمت سے برطرفی تھی۔ حکومت چاہتی تو گرفتاری کا حکم بھی دے سکتی

تھی۔ رادھا کرشن ضلع کے دورے پر کلورکوٹ آئے۔ والد کو انہوں نے [illegible] ڈاک بنگلے میں طلب کیا اور انہیں صورت حال سے آگاہ کیا۔ والد اپنے

خلاف اتنے سنگین معاملہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے۔ ان کے اپنے ہاتھ کی تحریریں موجود تھیں۔ رادھا کرشن نے صاف الفاظ میں کہا کہ اگر میری جگہ کوئی

مسلمان یا انگریز ڈپٹی کمشنر ہوتا تو آپ اس وقت جیل میں ہوتے۔ میں نے محض مذہبی تعلق سے سخت رویہ اختیار نہیں کیا۔ اب آپ ایک طرف ہو جائیے

یا کانگرس کی تحریک میں شامل ہو جائیے یا سرکاری ملازم رہیے۔ وہ تو حکم دے کر چلے گئے۔ والد کے خلاف کوئی کارروائی بھی نہ ہوئی لیکن اس

سارے واقعے سے انہوں نے کوئی اچھا اثر نہیں لیا۔ رادھا کرشن نے اگرچہ ان پر احسان کیا تھا لیکن انہوں نے اس واقعہ کا جب بھی ذکر کیا بڑے

افسوس کے ساتھ کہ وہ بھی کیا لوگ جو تعصب کی بنا پر کی جائے۔ شاعر ہونے کی حیثیت سے فدائی کرنے کو کوئی بات بھی تھی۔ تعصب کی بنا پر [illegible]

کی تو کس کام کی۔ اب بھی جب آپ کبھی اس زمانے کا ذکر کرتے ہیں تو اس واقعے کا ذکر افسوس اور اندوہ سے کرتے ہیں۔ میں نے خیل کے مرحوم نواب

سیف اللہ خان کا تذکرہ اس موقع پر وہ ضرور کرتے ہیں۔ سیف اللہ خان مرحوم ان کی بڑی قدر کیا کرتے تھے۔ جب کبھی ملاقات ہوتی تھی تو بغلگیر ہو کر ملتے

تھے اور بڑی عزت سے پیش آتے تھے۔ لاہور میں کسی ملاقات کے دوران میں نواب سیف اللہ خان سے نواب احمد یار خان دولتانہ نے یہ کہہ دیا تھا

کہ عیسیٰ خیل وہی شہر ہے نا جہاں محروم صاحب رہتے ہیں؟ انہوں نے والد سے اس واقعہ کا ذکر کیا اور کہا کہ آپ تو ہمارے لیے [illegible] ہیں

ہیں۔ یہاں ضلع بھر میں زمینوں اور جائدادوں کے مالک ہم ہیں۔ آپ کی حیثیت ایک ہیڈ ماسٹر سے زیادہ نہیں لیکن ہمارے شہر کا نام آپ کی وجہ

سے مشہور ہے۔ آپ کی ذات ہمارے لئے فخر کا باعث ہے۔

کلورکوٹ سے آب و دانہ انہیں راولپنڈی لے آیا۔ بات یہ تھی کہ میں نے میٹرکولیشن کا امتحان پاس کر کے راولپنڈی کالج میں داخلہ لے

لیا تھا۔ والد کلورکوٹ کے ماحول سے بیزار تو تھے ہی، کوشش کر کے انہوں نے اپنا تبادلہ راولپنڈی کرا لیا۔ یہاں وہ کنٹونمنٹ بورڈ اسکول کے

ہیڈ ماسٹر مقرر ہو گئے۔ راولپنڈی میں ادبی سرگرمیاں زوروں پر تھیں۔ عبدالحمید عدم کا قیام ان دنوں یہیں راولپنڈی میں تھا۔ علامہ اللہ کریم، عبدالعزیز فطرت،

ضمیر، آغا [illegible] سب حضرات یہیں تھے۔ والد راولپنڈی آئے تو شہر کے ادبی حلقوں کی طرف سے ان کا خیر مقدم ایک [illegible] دعوت کی

صورت میں کیا گیا۔ ان کے آنے سے راولپنڈی کی ادبی سرگرمیوں میں نئی جان آگئی۔ ان کی اپنی ادبی زندگی بھی زیادہ خوشگوار ہو گئی لیکن اسکول کے حالات

یہاں بھی ان کے سر ہو گئے۔ کلورکوٹ میں تو ایک افسر تھا ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز۔ یہاں کنٹونمنٹ بورڈ کا ہر ممبر افسر تھا۔ ایک ممبر محمد رفیق کو تو ان سے پہلے

دن ہی سے بغض [illegible] ہو گیا۔ اس نے انہیں اسکول سے نکلوانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن ایک اور ممبر محمد جان بیرسٹر ایٹ لا اور سابق منسٹر پاکستان

[illegible] ایک [illegible] چلتی رہا [illegible] ورکشاپ کا کام ہوتا رہا۔ یہاں وہ ایک لیکچرر صاحب سے مل گئے جن [illegible]
[illegible] ہو گیا۔ انگلش اسکول [illegible] کے بعد [illegible] وقت [illegible] لیے بیانات لکھنے میں مشغول رہا تھا۔ [illegible]
[illegible] ہو گیا اور سند حاصل [illegible] ہو گئی۔ یہاں سے آپ [illegible] میں ریٹائر ہوئے اور آپ نے " [illegible] ...... [illegible]
[illegible] کا ساتھی [illegible]

فوراً ہی آپ گارڈن کالج راولپنڈی میں اردو فارسی کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ مولانا تاجور کو اس تقرر کا علم ہوا تو انہوں نے لکھا کہ [illegible] حالانکہ جہاں شروع میں پہنچنا چاہئے تھا وہاں وہ آخر میں پہنچے ہیں۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اسکولوں میں ان کا وقت قریباً ضائع ہی ہوا ہے [illegible] کالج میں اردو فارسی کا لیکچرار مقرر ہونا چاہئے تھا۔

یہ تین برس بڑے اطمینان اور سکون میں بسر ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہو گیا اور ہنگامہ کشت و خون میں کپتان عبدالحمید اللہ الامین ہمیشہ [illegible] کے ہمراہ رہے (ان) نامی ایک فرشتہ خصلت انسان کی امداد سے بخیر و عافیت لاہور پہنچے۔ لاہور سے بہ ہزار دقت امرتسر اور پھر جالندھر گئے میں ان دنوں دہلی میں تھا۔ انہوں نے مجھے خط لکھا کہ جالندھر تک تو آ گیا ہوں۔ دہلی پہنچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی ہے۔ ہر طرف ایک [illegible] اور کس مپرسی کا عالم ہے۔ یہاں بھی کسی مسلمان ہی سے کام نکلے گا۔ لیکن کون مسلمان اس وقت جالندھر میں اس قابل تھا کہ ان کی خدمت کر سکتا۔ بڑی مشکل سے دہلی پہنچے۔ یہاں ورکشاپ بند ہو گئی تھی آنجہانی نے "تیج" اخبار میں ان کی ملازمت کا انتظام پہلے ہی سے کر دیا تھا۔ کچھ مدت وہاں کام کیا۔ پھر پنجاب یونیورسٹی کیمپ کالج نئی دہلی میں لیکچرار مقرر ہوئے اور ابھی تک وہیں کام کر رہے ہیں۔

میں نے ابھی تک اس مقالے میں والد کی شاعری کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ اصل میں اس موضوع کو چھیڑنے کی ضرورت بھی نہیں لیکن اتنا لکھنا مضمون کے احاطے سے باہر بھی نہیں ہوگا کہ والد ابھی اسکول کے تیسرے درجے ہی میں تھے کہ ایک منظوم کتاب مجموعہ قصص ان کے ہاتھ لگ گئی۔ اس میں چند قصے آسان نظم میں تھے۔ انہیں پڑھ کر خود بخود ذہنی لہریں موزوں ہونے لگے۔ بعد میں درسی کتابوں کی نظمیں پڑھ کر واقفیت ہونے لگی اور آٹھویں درجے تک پہنچتے پہنچتے ایسی نظمیں کہنے لگے جو ہم درس طلباء اور ماسٹر صاحبان کے لئے دلچسپی اور حیرت کا باعث ہوتی تھیں (ملاحظہ رسالۂ ہم جماعت) میں آنجہانی ملکہ وکٹوریہ کا نوحہ لکھا جس میں ایک شعر یہ بھی تھا ؎

فرطِ غم سے غنچے چپ ہیں گل گریباں چاک ہیں
نوجوانانِ چمن بھی سر پہ ڈالے خاک ہیں

اس شعر پر ڈویژنل انسپکٹر آف اسکولز نے جو ایک دہلوی بزرگ تھے بہت داد دی۔ اس سے پہلے ایک مثنوی بارش پر کہی تھی جس کا ایک شعر میرے علم میں ہے ؎

الٰہی ان دنوں سیلابی ہوئی کہ ساری زمیں پانی پانی ہوئی

اگرچہ اس دور کی شاعری کچی تھی اور اردو مادری زبان نہ ہونے کے باعث زبان کے نقائص سے خالی نہ تھی لیکن وزن کی صحت ہر نظم میں برابر قائم رہتی تھی۔

ہائی اسکول میں پہنچ کر شعر گوئی میں زیادہ انہماک ہو گیا اور دسویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے ایسی نظمیں بھی ہو گئیں جو "زمانہ" کانپور اور "مخزن" لاہور ایسے رسالوں میں شائع ہونے لگیں۔ چنانچہ "پپیہا کی زاری" اور "سندھ کو پیغام" مطبوعہ "مخزن" اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ منشی دیا نرائن نگم ایڈیٹر "زمانہ" کانپور سے اسی زمانے میں خط و کتابت شروع ہو گئی تھی اور انہوں نے تعریفی جملوں سے ہر نظم پر ان کا دل بڑھایا۔ شاعری میں آپ نے کسی سے اصلاح نہیں لی اور نہ ہی عروض کا باقاعدہ مطالعہ کیا ہے۔ فن عروض کے متعلق شروع ہی سے آپ کے دل میں یہ خیال بیٹھ گیا کہ جب تک کوئی قابل استاد نہ ملے

[illegible] کے [illegible] ہیں۔

[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]

اس نظم کے بارے میں سوال یہ ہے کہ یہ پہلی نظم تھی [illegible] حقیقت کی اہمیت سے کہہ سکتا ہوں۔
[illegible] ایک بار [illegible] اقبال سے [illegible] اس سلسلے میں [illegible] ہے۔
[illegible] شاعری کے لئے [illegible] استادی شاگردی کے سلسلے [illegible] جانا ضروری ہے۔

والد استادی شاگردی کے سلسلے سے [illegible] شہر میں ان کا کوئی استاد [illegible] نہ کسی کو اپنا شاگرد بنایا ہے [illegible] انہیں [illegible] پاکستان [illegible] کے بعد [illegible] کا شاگرد [illegible] اصلاح لینے سے کچھ [illegible] اس قسم کے [illegible] لکھنے والوں کو [illegible] کتابوں کے نام مطالعے کے لئے تجویز کرتے [illegible] کلیات امیر مینائی [illegible] شامل ہیں۔ ان کی رائے ہے کہ اوّل الذکر دونوں [illegible] خیالات میں تنوع اور بلندی پیدا کرنے کے لئے [illegible] زبان کے لئے بہت مفید [illegible] شاعری کے بارے میں اکثر انہوں نے مجھ سے یہ کہا ہے کہ میں نے شاعری کا [illegible] حاصل کیا اور [illegible] نظر سے [illegible] ایک [illegible] یوں کہتے ہیں ـــ

شاعر ہوں شاعری میں استاد نہیں — گرچہ [illegible] پاس [illegible] نہیں
ہے شعر و سخن کا اب سے سودا مجھ کو — [illegible] آتی ہوئی [illegible] کچھ یاد نہیں

میں نے والد کو شعر کہتے اکثر دیکھا ہے۔ جب طبیعت مجبور کرتی ہے یا کوئی [illegible] ہوتی ہے تو آپ کاغذ [illegible] لکھتے [illegible] ایک بار [illegible] لکھ لیتے ہیں وہ اس کی قطعی صورت ہوتی ہے۔ میں نے انہیں [illegible] نظر ثانی [illegible] کا شعر [illegible] رہنے میں کبھی حائل نہیں ہوا۔ ان کی فرمائشی نظم کہنا ہو تو اس [illegible] کچھ [illegible] ہو جاتا ہے۔ [illegible] شہر کے باہر چلے جاتے ہیں اور وہیں [illegible] فرمائشی نظم ختم کر کے لاتے ہیں۔ اب تو فرمائشی [illegible] نہیں [illegible] نہیں رہی لیکن [illegible] اور راولپنڈی میں [illegible] ڈسٹرکٹ انسپکٹر [illegible] اور ڈپٹی کمشنروں [illegible] اکثر اس قسم کی [illegible] بعض دفعہ تو آپ [illegible] لکھ دیتے تھے۔ اس کی نقل [illegible] کو بھیج [illegible] نظموں کی [illegible] کبھی [illegible] کا [illegible] کی جانب رجوع کرنا مناسب نہیں [illegible] یادداشت کے سہارے لکھا جا رہا ہے اور [illegible] سے اشعار [illegible] سے اس کی ترتیب بدل جائے گی۔ [illegible] کے زمانے کی بات ہے۔ ایک دفعہ دریائے سندھ کے سیلاب نے ضلع میانوالی کے [illegible] دیہات کو برباد کر دیا۔ ملک [illegible] خان ضلع کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ ایس۔ ڈی۔ او [illegible] صاحب [illegible] کی امداد کا کام ان افسروں کے ہاتھ میں تھا۔ ملک [illegible] خان [illegible] تھے۔ وہ امداد کے انتظام کا معائنہ کرنے اور تباہ شدہ لوگوں کی ڈھارس [illegible] آئے۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز نے والد کو نظم کہنے کی فرمائش کی۔ آپ نے فی البدیہہ نظم کہی۔ چند اشعار سنئے ـــ

[illegible] جاناں [illegible] آید ہمی — [illegible] نہاں آید ہمی
مژدہ بادا [illegible] بہار — [illegible] خستاں آید ہمی

مدعا شش پریشاں گشتیم بار   بار جسم آشیاں آید ہمی
از سرِ ما شورشِ ہجراں گرفت   کو سکوں در سوزِ جاں آید ہمی
حاملِ امیدِ ما نیک شد   زلف ازوئے نشاں آید ہمی
از پئے امدادِ طوفاں دیدگاں   کشتیِ امید و اماں آید ہمی
کار ہمے چوں خاں ہمی کند   از حوادث کے زیاں آید ہمی
ما نمی ترسیم از دشتِ بلا   رستمِ ما از کیساں آید ہمی

از ستم ہائے فلک ما را چہ غم
چوں ملک فیروز خاں آید ہمی

ملک فیروز خان نون کے نام کا ایک سجع بھی لکھا تھا ۔

مئے فیروزیش در جام کردند
ازاں فیروز خانش نام کردند

شاعرانہ صلاحیتوں کا بہ امر مجبوری کتنا افسوسناک استعمال ہوتا رہا ۔

فی البدیہہ شاعری کا ذکر آ گیا ہے تو دو ایک واقعات اور بھی سن لیجئے ۔ اس فن میں آپ کو واقعی ایک کمال حاصل ہے ۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری سے آپ کے دوستانہ مراسم ایک زمانے سے تھے ۔ آپ جب کبھی لاہور آتے حفیظ صاحب سے ضرور ملتے تھے ۔ حفیظ صاحب بھی جب کبھی راولپنڈی گئے اپنی مشاعرانہ مصروفیات کے باوجود والد سے ملنے ہمارے گھر ضرور آتے ۔ ایک دفعہ والد لاہور آئے تو انہیں معلوم ہوا کہ حفیظ صاحب نے انارکلی میں بالائی منزل پہ دفتر لے لیا ہے ۔ آپ وہاں پہنچے تو حفیظ صاحب دفتر میں موجود نہیں تھے ۔ آپ نے ایک کاغذ کے پرزے پہ یہ شعر لکھے اور ان کی میز پر چھوڑ کر آ گئے ؎

دفتر جو بالاخانے پہ دیکھا حفیظ کا   محروم اک تو یہ ہے کہ دل شاد ہو گیا
رونق ہوئی انارکلی کی چہار چند   بازار نغمہ ساز سے آباد ہو گیا
جن منزلوں پہ حسن کبھی جلوہ ریز تھا   اب عشق ان میں مائلِ فریاد ہو گیا

سنہ ۱۹۳۵ء کا ذکر ہے ۔ راولپنڈی میں انجمنِ اسلامیہ کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا ۔ والد بھی شریکِ بزم تھے ۔ حفیظ اپنی نظم پڑھ چکے تو والد نے کہا

حفیظِ خوش نوا ! بزمِ سخن میں   قیامت تک رہے گی یاد تیری
نشاط انگیز ہیں تیرے نغمات رنگیں   غم افزا ہے جہاں فریاد تیری

کیا پابندِ نے نالے کو تو نے
یہ طرزِ خاص ہے ایجاد تیری

اسی جلسے میں حفیظ صاحب نے منتظمین کی فرمائش پر چندے کی اپیل کی اور اپنی نظم "مسدسِ حالی" پڑھی جس کے اس وقت کہیں کہیں سے مصرعے مجھے یاد ہیں ؎

مرے شیخ ہیں شیخ سر عبدالقادر   ہما ان کی جانب سے فرماں بہ صادر
نہیں چاہتے ہم سخن کے نوادر   . . . .

سب مطلب بر کر نہ کہہ نہ سکے

سنا کر اپنی سب حسن عقیدت

مشاعرہ بہت ہی کامیاب رہا [illegible] بہت ہوا۔ جب [illegible] صاحب [illegible] کا [illegible]
کا [illegible] تو ہم [illegible] صاحب نے [illegible] بہت [illegible] تھے [illegible] کر گئے۔

حقیقت کہتے ہیں اے حسن [illegible] نواز

یا رب کر دے [illegible] سب [illegible] نواز

شیخ صاحب بہت محظوظ ہوئے اور یہ شعر مجید صاحب نے سنایا۔ حقیقتاً آپ کے [illegible] سے [illegible] شیخ صاحب اس [illegible]
کے موضوع پر اکبر الہ آبادی کے متعدد اشعار سنائے۔

ایک مرتبہ شیخ [illegible] کے ساتھ نشست ہوا۔ [illegible] کے بعد مجید صاحب نے اعلان کیا کہ حضرت [illegible] نشست میں
اپنا کلام سنائیں گے۔ والد کے پاس [illegible] نشست کے لئے کوئی [illegible]۔ وقت بہت [illegible] چونکہ [illegible] تھا انہوں نے فی الفور
نظم کہنا شروع کر دی اور جب چند لمحوں کے بعد ان سے کلام سنانے کے لئے کہا گیا تو یہ اشعار ان کی زبان پر تھے ؎

اے حسنِ اسلام [illegible] — [illegible] مستی کا ہے گلزار

[illegible] — انجام سے پیدا ہے ترے عالمِ اسرار

مستانہ کسی کنج میں عاشق ہیں [illegible] — عاشق ہیں کہیں [illegible] دلِ بیمار

ہیں عشق کی اک سمت حسینانِ [illegible] — دامانِ نظر میں لئے [illegible]

جھلک نظر آتی ہے یہاں حسنِ ازل کی — کتنا مجھے [illegible]

احسان سے [illegible] نہیں [illegible] کا جادو — بے پردہ ہے [illegible]

تیر [illegible] کی نگاہوں سے ہے پیہم — وہ حسن کی [illegible] ہے جان [illegible]

ہے [illegible] میں ازل سے — جس حسن کے [illegible]

نغموں سے [illegible] ہے چمن کی

کیسی ہے دل آویز فضا تیرے چمن کی

علامہ اقبال کا مرثیہ بھی انہوں نے اقبال کی موت کی خبر سنتے ہی فی البدیہہ کہا تھا۔ علامہ کے انتقال کی خبر ریڈیو پر [illegible] تو انہوں نے اسی وقت [illegible]
کے اعزاز میں اسکول بند کر دیا اور سیدھے گھر آئے۔ مجھے بتایا کہ اقبال اس دنیا میں نہیں ہیں۔ پھر کہنے لگے ایک مرثیہ لکھوانا ہے تم نوٹ کرو۔
میں نے کاغذ پنسل ہاتھ میں لی۔ آپ حقے کے ہر کش پر ایک شعر لکھوا دیتے تھے۔ مرثیے کا پہلا شعر یہ ہے ؎

ظاہر کی آنکھ سے جو نہاں ہو گیا تو کیا

احساس میں سما گیا دل میں اتر گیا

جب آپ یہ اشعار لکھوا چکے ؎

کچھ مزار میں تن خاک کو چھوڑ کر — قدسی نژاد اوجِ سماوات پر گیا

کاشانۂ بقا میں مسافر پہنچ گیا — ویرانۂ فنا سے سلامت گزر گیا!

اس جہاں میں مست تھا گمنام تھا
اپنے جہاں میں مثل مسیحا ہو گیا

خاک چمن میں گرچہ شبنم نہاں نہیں
خورشید جلوہ بار سے پاکیزہ ہو گیا

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
روشن تر اس حقیقت کا شعور ہو گیا

والد صاحب نے کہا اس نظم میں "ہو گیا" کا قافیہ تو استعمال نہیں کریں گے۔ کہنے لگے کیوں؟ میں نا مراد ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ سو گیا شعر کو بے جان کر دے گا۔ انہوں نے آخری سطر لکھوا لیا اور وہ شعر یہ ہے ؎

تو وہ اکیلا نہ تھے وہ تو جوان نصیب کو
یہ وہم ہو گیا ہے کہ اقبال مر گیا

مجھے فوراً احساس ہوا کہ میں نے رائے دینے میں بے حد غلطی کی تھی۔

دوسرے دن اقبال کے انتقال پر ماتمی جلسے کا پروگرام طے ہوا۔ گارڈن کالج کے ہال میں جلسہ کرنے کا فیصلہ ہوا لیکن عین وقت پر کالج کو کوئی ایسی ضرورت پیش آ گئی کہ وہ ہال ہم لوگوں کو نہ مل سکا۔ سارا انتظام مکمل تھا اسے ملتوی کرنا اب ہمارے بس میں نہ تھا چنانچہ طے پایا کہ کالج کے قریب ہی پسپل باغ میں جلسہ منعقد کیا جائے۔ تمام مدعوئین کالج ہال سے ہو کر باغ میں پہنچ رہے تھے۔ والد بھی کالج سے ہو کر باغ میں آئے اور اپنی نظم سے پہلے تمام جلسہ کی تبدیلی پر یہ شعر پڑھا ؎

بلبل گفتہ از مستی بود آں یکسر سخن
ماتم اقبال باید کرد در صحن چمن

وقار انبالوی کے ساتھ بھی ان کے مراسم بے تکلفی کی حد تک دوستانہ تھے۔ وقار صاحب پہلے روزنامہ "پرتاب" میں کام کرتے تھے، وہاں سے "احسان" میں آ گئے۔ والد کی ان سے لاہور میں ملاقات ہوئی تو کہنے لگے ؎

جس دن سے اُدھر سے تو اِدھر آیا ہے
چشم بینا کو کم نظر آیا ہے

"احسان" پہ بھی احسان تھا منظور لیکن
"پرتاب" کو بے وقار کر آیا ہے

یہ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ وقار صاحب نے یونہی باتوں میں ان سے کہا اس جنگ کا انجام کیا نظر آ رہا ہے۔ والد ایک لمحہ تک خاموش رہے پھر بولے ؎

ہٹلر کہ مئے خودی سے ہے سرمست
ہو جائیں گے اس کے حوصلے اور پست

جب گھر میں خوراک ختم ہو جائے گی
کیا کھائے گا وہ اگر نہ کھائے گا شکست

ایک اخبار کا ایڈیٹر اور پھر شاعر ایڈیٹر ایسی چیزیں کہاں چھوڑتا ہے۔ وقار نے فوراً یہ رباعی لکھ لی اور اگلے دن اپنے ایک تمہیدی نوٹ کے ساتھ اخبار میں شائع کر دی۔

اسی سفر لاہور کا ذکر ہے۔ وقار اور والد اکٹھے جا رہے تھے۔ دیوار دیوار پر جا بجا سینما کے پوسٹر نظر آئے۔ ان پر وہی عام تصویریں تھیں، نیم عریاں۔ وقار نے تصویروں کی جانب اشارہ کیا اور کہا ملاحظہ فرمایا آپ نے؟ والد نے جواب میں کہا ؎

لب عشرت پہ تبسم نظر آتا ہے مگر
آنکھ اخلاق کی روتی ہے بڑے شہروں میں

عورت تھا مری جس بانکپن آتی ہے حیا
منظر عام پہ ہوتی ہے بڑے شہروں میں

سینما دیکھنے سے آپ نے ہمیشہ احتراز کیا ہے۔ میرا خیال ہے زندگی بھر میں آپ نے دو چار تصویریں ہی دیکھی ہوں گی۔ اس کے علاوہ

[illegible] … [illegible]
[illegible] … [illegible]
[illegible] … [illegible]
علاوہ تخلیق پیدا ہونے کا سوال ہی نہیں [illegible] … [illegible]
نہیں [illegible] کم از کم پنجاب کی [illegible] بالکل [illegible] … [illegible]
[illegible] ہے اور [illegible] کے بارے میں [illegible] … [illegible]
[illegible] … [illegible]
اگر اس امر کی کوشش بھی کی گئی [illegible] … [illegible]

صحت کے پیش نظر وہ نماز بھی اکثر [illegible] ادا کرتے ہیں اور [illegible] … [illegible] کیا باقی رہ جاتا ہوگا۔ شاید انہی [illegible] … [illegible] جب [illegible] کا شوق تھا تو ریلوے اسٹیشن میں ایک بار کھڑی چھلانگ لگا دی۔ [illegible] مستقل طور پر [illegible] … [illegible] عرق النسا اور دل کبھی کبھی [illegible] تکلیف اور پریشانی کا باعث ہو جاتے ہیں۔ غالباً [illegible] … [illegible] پر جاتے ہیں تو دس بارہ دوائیں اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ [illegible] وغیرہ [illegible] … [illegible] کہتے ہیں [illegible] میں کہیں جاتے ہیں تو [illegible] شعراء کے لئے ان کی دواؤں کی [illegible] کا باعث ہوتی ہے۔ دوائیں ساتھ لے کر [illegible] عادت شعراء میں بھی مشہور ہو چلی ہے۔ ایک دفعہ [illegible] میں مشاعرہ تھا۔ قتیل شفائی والد سے ملنے آئے [illegible] … [illegible] ایک کمرے میں میز پر مختلف دواؤں کی دس بارہ شیشیاں رکھی تھیں [illegible] … [illegible]

اتفاق کی بات ہے اسی مشاعرے میں ایک شاعر صاحب سامعین کا ہجوم دیکھ کر بے ہوش ہو گئے [illegible] … [illegible] ان کو بڑی مشکل سے قیام گاہ تک لے گئے۔ والد کے پاس [illegible] موجود تھی [illegible] … [illegible] اور شاعر صاحب [illegible] ہو کر رات کے مشاعرے پر تبصرہ فرما رہے تھے۔

چونکہ والد نے بہت کم عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا اور ایک نسل ان کا کلام پڑھتی چلی آ رہی ہے اس لئے ان کی عمر کے بارے میں اکثر غلط [illegible] ہو جاتی ہیں۔ ایک بار جوش ملیح آبادی لاہور تشریف لائے۔ والد ان سے ملنے گئے۔ انہوں نے والد کو دیکھ کر بڑی حیرت کا اظہار کیا اور کہنے لگے میں بچپن سے آپ کا کلام پڑھ رہا ہوں اور میرا خیال تھا کہ اب آپ بمشکل لاٹھی [illegible] چلتے ہوں گے۔ آپ کی عمر کے بارے میں میرا اندازہ قطعی طور پر غلط تھا۔ اس واقعہ کو اٹھارہ برس ہو چکے ہیں اور آج بھی جب کہ والد کی عمر تقریباً ستر برس کی ہے آپ عصائے پیری کا سہارا لئے بغیر [illegible] جاتے ہیں اور احباب اس چھڑی کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے جو چند برس پہلے ان کے ہاتھ میں ہر وقت موجود رہتی تھی۔

عبدالرزاق ملیح آبادی

شاہد خاں

خاندان: پٹھان۔ وطن: ملیح آباد۔ تاریخِ پیدائش معلوم نہیں۔ خود کو مولانا آزاد سے زیادہ پرانا کہتے ہیں! عمر کبھی چھیاسٹھ برس کی کبھی ستاون سے [illegible] کی بتلاتے ہیں۔ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ جوش ملیح آبادی سے، جو ان کی والدہ کے سگے پھوپھیرے بھائی ہیں، کہیں چھوٹے ہیں۔

[illegible] چھوٹا ہے۔ بدن گٹھا ہوا ہے۔ کینڈا کچھ اس وضع کا ہے کہ بُرا کوئی نہیں کہہ سکتا۔ رنگ صاف ہے۔ سر بڑا ہے۔ کلا بھی چھا چہوڑا [illegible] صورت نہیں کہتے۔

[illegible] کس قسم کا ہے؟ خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ کچھ معمہ سا ہے۔ شاید چھل بل کا مرکب ہے۔ بالکل ٹھنڈے، جیسے برف کی سِل؛ بالکل گرم، جیسے آتش فشاں کی چٹان۔ بہت ہی ہنس مکھ، نہایت ہی خشک۔ ہنسنے پائیں، تو خود بھی کھلکھلائیں اور دوسروں کو بھی ہنسا دیں۔ منہ بنالیں، تو خود بھی تیوریاں چڑھالیں اور ہنستوں کو بھی روانسا بنادیں۔

لیکن اکھڑ مزاج ہیں۔ سنہ ۱۹۲۹ء کا واقعہ ہے کہ چوہے مارنے کے لیے سنکھیا آئے تھے اور وہ میز پر سامنے رکھی تھی۔ دوستوں سے بحث چل پڑی کہ قوتِ ارادی مضبوط ہو تو آدمی سب کچھ کر سکتا ہے۔ ایک دوست نے کہا: "یہ فضول بات ہے، کوئی صاحب فرمائیں کہ میری قوتِ ارادی بڑی ہے اور سنکھیا کا یہ ڈلا کھالیں، تو نتیجہ کیا ہوگا؟ اینٹھ کر رہ جائیں گے اور قوتِ ارادہ کھڑی فاتحہ پڑھتی ہوگی!" اس پر انہوں نے وہ ڈلا ملا چبا کر اوپر سے پانی پی لیا۔ اور کہنے لگے، "ابھی ثبوت ملا جاتا ہے۔ مجھے کچھ بھی نہ ہوگا!" یقیناً یہ پٹھانی جہالت تھی۔ مرنے میں کسر ہی کیا رہ گئی تھی؟ مگر ایسے اُجڈ لوگوں کا ساتھ شاید مسخری قدرت بھی دے دیا کرتی ہے۔ حضرت کا سر تو پندرہ دن گھوما، مگر پہلے سے کہیں زیادہ تندرست ہو گئے۔ سر کے بال کھچڑی سے تھے اور چہرے کا رنگ پیلا۔ سنکھیا کے طفیل بال کالے بھونرا ہو گئے اور رنگ گہرا سرخ! خود کہا کرتے ہیں سنکھیا کھانے کے بعد ایسی توانائی پائی ہے کہ پہلے تصور میں بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ بس جی چاہتا ہے اڑتے پھرو!

اکھڑ پن کے سلسلے میں یہ واقعہ بھی لکھ دینا مناسب ہے کہ یا تو بیمار ہی نہیں ہوتے، اور ہوتے ہیں تو جان لیوا بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں۔

... ہوتے۔ اور صرف ناچنے پر بند مصروں بیگ کہاں ہیں کھانے میں بیگ چاول تھا

... میں بیٹھے بیٹھے ایک دن کتابیں کا مطالعہ کر رہے تھے کہ انہوں نے دیکھا کہ امیر ہیں کے منہ میں پانی ہے۔ اس وقت ... جیسے ہی سب ... مولانا آزاد کے ساتھ ... تھا ... بیٹھے ہوئے اور جب اچھے ہوئے تو خود اپنے ہاتھوں سے آزاد کے ... کھانا ہو گئے۔ اور آٹھ بیٹے بیمار ہی ہے گشت کرتے رہے۔ ابھی ابھی ہمارے آنکھوں کے سامنے ... کے کمرے میں تھے۔ خوشی ... حاضر کرانے گئے۔ اور ہنستے کھیلتے لوٹ آئے ؛

ایسے ایسی مہلک بیماریوں میں پھنسے مگر کبھی پرہیز کیا نہ ڈاکٹری نسخوں پر عمل۔ کبھی کبھی کہا کرتے ہیں "اپنی فکر ایک حماقت ہے۔ صحت ... ہوگی تو جہاں دنیا میں رکھے گا۔ اور فرض ہوگی تو اٹھا لے گا۔ ہم کب اپنی مرضی سے یہاں آئے تھے کہ اپنی ارادوں سے واپس پہنچے ہیں ! پھر ہنس کر کہتے ہیں "اشد میاں ! ان جلدی مارتے ہیں جو موت سے ڈرتا ہے۔ موت سے نہ ڈرو گے تو ملک الموت تم سے شرمندہ ہوگا !

ہمیشہ دیکھا گیا ہے کہ ... پہنتے ہیں۔ مزادار کھانا چاہتے ہیں ... کھانے نہیں پاتے۔ سستی چیزوں کا استعمال پسند کرتے ہیں مگر ساتھیوں کے لئے سستی چیزیں گوارا نہیں کرتے۔ نفیس سے نفیس اور ... سے نازک چیزیں ان کے استعمال میں دیکھنا چاہتے ہیں۔

نہایت چست، چالاک اور جو بند ہیں۔ چلتے ہیں تو بہت تیز چلتے ہیں۔ لیکن بڑے ہی سست بھی ہیں۔ بیٹھے ہیں تو گھنٹوں بیٹھے ہیں۔ بیٹھ گئے تو اٹھنے کا نام ہی نہیں۔

صناع ہونے کا بھی کچھ ... ہے۔ ... سے مولانا آزاد کی بہن ساجدہ کا جوتا ایک ... تو حضرت نے بغیر فرمے کے ایک جوتا جوتا بنانا شروع کر دیا۔ مولانا دیکھتے اور ہنستے۔ فرماتے "مولوی صاحب آپ بھی وقت کو قتل کرنا خوب جانتے ہیں"۔ اور یہ حضرت مسکرا کر جواب دیتے "بن جائے گا ، تو آپ ہی داد دیں گے"۔ اور جوتا بن جانے کے بعد واقعی مولانا نے داد دی تھی۔

... کا بھی دعویٰ ہے۔ ایک دفعہ اپنی دو شیروانیاں خود ہی کاٹیں اور خود ہی سیئیں۔ اتفاق سے ایسی فٹ ہوئیں کہ ملیح آباد کا ... جو تعلقہ داروں کی شیروانیاں سیا کرتا تھا، دیکھ کر کہنے لگا "ہم سے ایسی شیروانی نہیں سلے گی۔ یہ تو حیدرآباد کی سلی ہوئی ہے"۔ اور جب ... سلائی دکھائی گئی تو حیرت زدہ ہو کر کہنے لگا۔ "واقعی شیروانی تو آپ ہی نے سی ہے، کیونکہ ... کی یہ سلائی ... نہیں ہے ...

بال کاٹنے میں بھی خود کو استاد سمجھتے ہیں۔ مردوں ہی کے نہیں، لیڈیوں کے بھی۔ مردوں، عورتوں کے بال ... پر نگاہ رہتی ہے۔ جیل میں مولانا آزاد صاحب کو تبدیلی نائی کے سامنے بیٹھنا گوارا نہ تھا۔ یہ صاحب بول اٹھے "میں آپ کی حجامت بنا ... " پہلے تو مولانا حجامت کے محاورے پر ہنسے، پھر فرمایا "مولوی صاحب ! آپ مجھے کیسے بیوقوف بنانا چاہتے ہیں ؟ ——— کیا آپ نائی ہیں ؟"

——— بڑی منتوں، خوشامدوں کے بعد مولانا کی حجامت بنادی گئی اور مولانا حیرت میں پڑ گئے ؛

کہا کرتے ہیں "بچپن میں بڑا تیز اور ذہین تھا، لیکن نو دس برس کا ہوا تو اول درجے کا گاؤدی سمجھا جانے لگا۔ حالانکہ ایسا تھا نہیں لوگوں کو بیوقوف بنانے کے لئے خود بیوقوف بن گیا تھا" ؛

۱۹۱۳ء میں مصر کا سفر اختیار کیا۔ خاندان میں اب تک پہلے آدمی ہیں، جس نے حج کے علاوہ ہندوستان سے باہر ... سفر ... مصر کے وقت انگریزی سامراج کے کٹر دشمن بن چکے تھے، اور اسی لئے سفر کیا تھا کہ لوٹ آئیں تو ملک میں انقلاب برپا کریں گے۔

مصر میں چار سال رہے۔ عربی پڑھی۔ مصر کیوں گئے ؟ عربی کیوں پڑھی ؟ خود بتایا کرتے ہیں "مسلمانوں کے اٹھنے سے پہلے ہندوستان میں انقلاب ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔ اور مسلمانوں کو وہی اٹھا سکتا تھا، جو اسلام سے کما حقہٗ واقف ہو، اور دنیادار طاقتوں کی، جو مسلمانوں سے ہو کر کی ... چھیڑ ہوتے ہیں، پوری طرح تلعی کھول سکے۔

مصر کی زندگی ہر طرح کی ... سے بھرپور رہی۔ اسی زمانے میں قسطنطنیہ ہو گئے۔ ترکی حکومت ... جنگ ... ہندوستان کی جنگ ... حضرت پہنچتے ہی انور ... کے بیڈ پر ہو گئے۔ ... پاشا سے ... قسطنطنیہ میں ... ایک حلیم ... انہوں نے انور پاشا سے خفیہ ملاقاتیں کیں۔ مگر ... ترکی ... فرمانے لگے کہ ... تسلیم حاصل کرو۔ حکومت ہند سے مصالحت کی ... ہے کہ ... مشکل ... جنگ کی حالت میں ... باقی نہیں ... جنگ میں شریک نہیں ہو سکتے۔

پھر مصر سے ... مصر واپس آئے اور پہنچتے ہی انگریزی ... کے چنگل میں پھنس گئے۔ لمبی داستان ہے اور ... داستان کا ... تھیں قسطنطنیہ میں ... عبد العزیز شاویش، عبد الحمید ... السید صالح تونسی، ابو سعید ... مرزا عبد الحفیظ ... عبد الجبار خیری اور عبد الستار خیری، لالہ ہردیال جیسے انقلابیوں سے ملاقاتیں رہیں۔

پہلی عالمگیر جنگ شباب پر تھی ... صاحب ... کاروائیوں میں مصروف تھے۔ ترکوں سے ... ہندوستانی ... کو، انگریز پہلے مصر ... کرتے تھے۔ قاہرہ کے مضافات میں ایک مقام ... ہے ... حضرت ... بدل کے ... جاتے اور انقلابی پروپیگنڈا کیا کرتے۔ اتفاق سے ایک روز ... ایک ... میں بیٹھے اپنا "انقلاب" ... دوسیاہی ... کی بھیڑ ... گرفتار ... زار رونے لگے۔ اب جو حضرت دیکھتے ہیں تو ... کے اور اپنے خاندان کے ... کے ... اگر ... کرتے تو کیا کرتے!

اس ... انقلابی ... کا نتیجہ یہ نکلا کہ ... ہزار ہندوستانی فوجی ... مسلمان، ہندو، سکھ سبھی تھے "باغی" ہو گئے اور ... ہنگامہ برپا کرنے کی اسکیم بھی انہوں نے پیش کی، مگر اس مہم کے لئے بڑے ساز و سامان کی ضرورت تھی اور ساز و سامان یہاں مفقود تھا۔ ... مگر ... یہ سچے انقلابی مجاہد اپنی قسم کے ... نکلے۔ انگریز انہیں ترکوں کے مقابلے پر ... لے گئے اور انہوں نے لڑنے سے انکار کر ... نے سب کو ... دیا۔ ... صاحب ... آنسو ... پھیلا ... ہے!

... طبیعت تو ہے ہی، ندوۃ العلماء لکھنؤ میں عربی پڑھنے ہی کے لئے داخل ہوئے تھے۔ مگر وہاں فٹ بال کھیلنے کے سوا کچھ نہ کیا۔ یہاں تک کہ دن ... فٹ بال کھیلا کرتے، زبردستی امتحان پاس کرتے چلے گئے۔ لیکن درجہ چہارم میں سب کتابیں صرف عربی میں تھیں۔ اور یہ حضرت عربی کی پہلی ... کے بھی حافظ نہ تھے۔ مجبوراً مصر بھاگ گئے۔ اور وہاں ذہن ایسا کھلا کہ نو مہینے کے اندر ہی درسگاہ میں سب سے بازی لے گئے۔ ان کے دو ہم سبق بہت مشہور ہوئے: مفتی امین الحسینی (فلسطین) اور شیخ یوسف یاسین، جو اس وقت سعودی حکومت کے ایک بڑے رکن ہیں۔

یا تو چار برس ایک عربی لفظ نہ پڑھا تھا اور یا پھر نو مہینے میں عربی کے عالم، ادیب، انشاء پرداز اور مقرر بن گئے۔ علامہ رشید رضا مرحوم نے جو استاد تھے، اپنے اس شاگرد سے ایسا رشتہ جوڑا جو باپ بیٹے کے رشتے سے بھی سوا تھا۔ استاد کا آخری خط شاگرد کو استاد کی وفات کے دسویں دن ملا۔

مصر میں چار سال پڑھنے اور ہنگامہ آرائی کرنے کے بعد حجاز گئے۔ شریف مکہ حسین بن علی نے ترکوں سے بغاوت کی تھی، اور مصر کے حاجی اب ... جا سکتے تھے۔ یہ حضرت بھی حج کے لئے تیار ہو گئے۔ سفر کی اصل غرض یہ تھی کہ شریف حسین کی بغاوت کے راز معلوم کریں اور حجاز سے بچ کے ہندوستان بھاگ آئیں۔ مگر جدہ میں شریف کی پولیس نے گرفتار کر لیا۔ لمبی کہانی ہے، بڑی مشکل سے جان بچی اور ہندوستان

سب صحت کے بعد بھی [illegible] سے علیحدہ ہو کر [illegible] کرنے کی قسم کھائے بیٹھے تھے۔ اس پہ [illegible] بھی
[illegible]۔ چونکہ میں مولانا عبدالباری مرحوم فرنگی محلی نے متعدد ایک خفیہ انجمن بنائی ہوئی تھی۔ [illegible] شروع کر دیئے۔ مولانا حسرت موہانی
مرحوم بھی اس انجمن کے ایک رکن تھے۔ اسپیشل [illegible] ہو جائیں گے [illegible] انگریزی اخبار [illegible]
شروع شروع اس انجمن کے سرگرم رکن تھے۔ بعد میں [illegible] سے الگ ہو گئے۔ مگر مولانا مرحوم کو [illegible] آخری وقت تک انجمن کا راز
فاش نہیں کیا اور نہ بہت سی [illegible] کے متعلق پشیمانی تھی۔

پھر مولانا ابوالکلام صاحب آزاد کے ساتھ ہو گئے [illegible] ان کے اخبارات پیغام، پیام، [illegible]
[illegible] اور الہلال [illegible] کرتے رہے۔ کلکتہ ہی میں [illegible] آباد کیا [illegible] مولانا [illegible]
اور [illegible] چند برس ہی تھے۔

مولانا آزاد نے [illegible] مگر [illegible]
[illegible] شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور [illegible] کی کتابیں ترجمہ کر [illegible]
بال بچوں کا پیٹ پالتے رہے۔

جب مولانا نے [illegible] مگر [illegible] کبھی [illegible]
[illegible] کر دیا کہ مصری اخباروں کی نامہ نگاری کریں گے۔ [illegible] کے سب سے بڑے [illegible] المقطم، الاہرام [illegible] کے
نامہ نگار بن گئے۔ [illegible] تینوں اخبارات کے [illegible] جس سے کئی سو روپیہ ماہانہ
کی آمدنی ہونے لگی۔

پھر خود اپنا اخبار [illegible] کے نام سے کلکتہ ہی سے نکالا۔ [illegible]
اور [illegible] میں چراغ حسن حسرت مرحوم کام کرتے تھے۔ یہ دونوں اخبار [illegible] کے ہوتے، خبریں انگریزی اخبارات
سے ترجمہ کر لی جاتیں۔ [illegible] اپ ٹو ڈیٹ نکلا۔ [illegible] سے تازہ ترین خبریں [illegible] سب کچھ کسی [illegible]
میں ہونا چاہئے مگر [illegible] بغیر کسی سرمایہ کے نکالا۔ خوش قسمتی سے وہ تب بھی [illegible] بنگال [illegible]
مستقل تھا۔ کسی کارکن کی کوئی تنخواہ نہیں تھی۔ رات کو چنے بھگو دیئے جاتے اور دن بھر [illegible] اپنے [illegible]
کرتا۔ اور خود "سہم سالاری" فرماتے تھے۔ مزے مزے کے چنے چباتے [illegible] اور چنے کے فضائل و محاسن پر آسمان زمین کے
قلابے ملایا کرتے!

غرضیکہ اخبار چلا، خوب چلا۔ کاتب تک اپنے کچے گھروں کو پکا کر کے مطمئن ہو گئے۔ ان کی اور ان کے ساتھیوں کی شادیاں بھی اخبار
ہی کی آمدنی سے ہو گئیں۔ مگر خود جیسے بے سر و سامان تھے [illegible] خود ہی بتایا کہ "جو کچا جھونپڑا سر چھپانے کو تھا وہ بھی
پچھلے سال کی برسات میں سربسجود ہو گیا! اور اس پر بہت خوش ہیں کہ اب ساری دنیا ہمارا گھر بن چکی ہے!

خیر سے "دوستوں" کے رسیا بھی ہیں۔ ایک دوست مل گئے بیس بائیس برس دوستی کے حقوق ادا فرماتے رہے۔ حضرت کو اعتماد
بھروسہ ہو گیا۔ اخبار کو کمپنی بنا چکے تھے اور "دوست" کو کمپنی کا ڈائرکٹر۔ پھر لندن تشریف لے گئے، اور "دوست" کی عنایت سے اخبار
[illegible]!

اب بھی ہندوستان کے کئی اخبارات [illegible] ہیں ۔ لیکن شکست اٹھانے والے ہی دیکھے [illegible] [illegible]
کا ذریعہ اشاعت [illegible] کسی نہ کسی طرح پر [illegible] قائم کر لیا اور آزاد ہند کے نام سے روزانہ بھی جاری کر دیا ۔ یہ [illegible]
اخبار [illegible] بھی ان کے ہونہار لڑکے اختر اور سید انہیں سنبھالے ہوئے ہیں ۔

پھر [illegible] کے بعد مولانا ابوالکلام صاحب آزاد کے ایما پر دہلی چلے آئے ۔ اب ہندوستان کی ثقافتی کونسل کے سہ ماہی رسالے "ثقافت الہند" کو ایڈٹ کر رہے ہیں اور آل انڈیا ریڈیو کے عربی شعبہ کے ایڈوائزر بھی ہیں ۔

علمی مشاغل پر میں نے کچھ نہیں لکھا ۔ ملک ان مشاغل سے واقف ہے ۔ بہت سی تالیفیں اور ترجمے شائع ہو چکے ہیں ۔ بہت سے [illegible] طباعت کا انتظار کر رہے ہیں ۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ مولانا آزاد کے ساتھ انتہائی عقیدت کے باوجود مولانا کا اسلوبِ نگارش قبول نہ کیا ۔ خود کہا کرتے ہیں "مولانا کا اسلوب مولانا ہی کے ساتھ خاص ہے ۔ اس کی نقل اتارنا اپنی تضحیک کرنا ہے ۔"

خود اپنا ایک اسلوب پیدا کر لیا ہے ۔ یہ اسلوب عجیب و غریب ہے ۔ نہایت آسان ، عام فہم ، اور دلنشین ہونے کے ساتھ ساتھ ادبی محاسن سے بھرا پڑا ہے ۔ مضمون پر مضمون ان کی کتابیں کی کتابیں پڑھ جائیے ، نہ الجھے ہوئے جملے ملیں گے ، نہ بوجھل عربی فارسی لفظ سیدھی سادی ہموار تحریر ملے گی ۔ کہیں آپ کو رکنا نہ پڑے گا ۔ مطالب بے تکلف ذہن میں بیٹھتے چلے جائیں گے ۔ خود کہا کرتے ہیں "میری اخبار نویسی کے کامیاب رہنے کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ اتنا آسان لکھتا ہوں کہ عورتیں اور بچے تک سمجھ جاتے ہیں ۔" تحریر میں بلا کی ظرافت اور چبھتی ہوئی چٹکیاں ہوتی ہیں ۔ یہی سبب ہے کہ پڑھنے والا اکتاتا نہیں بلکہ چٹخارے لیتا ہوا پڑھتا چلا جاتا ہے ۔

ڈاکٹر سید عابد حسین

ضیاء الحسن فاروقی

حکایت از قدِ آں یار دلنواز کنیم — بہ ایں فسانہ مگر عمرِ خود دراز کنیم

سنہ ۱۹۳۲ء میں جب میٹرک کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا تو میرے زیرِ مطالعہ ایک کتاب تھی "پردۂ غفلت"۔ بیداریٔ شعور کی اس منزل میں مجھے کتاب کے مصنف سے کوئی سروکار نہ تھا۔ بس "پردۂ غفلت" کے پلاٹ اور کرداروں سے الجھا ہوا تھا۔ مصنف کون ہے یہ جماعت کا کوئی طالب علم نہیں جانتا تھا اور شاید ہمارے استاد جو ہم لوگوں کو اردو پڑھاتے تھے انہیں بھی اس کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں معلوم تھا کہ وہ ایک بڑا ادیب اور انشا پرداز ہے۔

میٹرک کے بعد جب میں علی گڑھ پہنچا تو وہاں ایک دلچسپ بات یہ معلوم ہوئی کہ انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع کی ہوئی اسٹینڈرڈ انگلش۔ اردو ڈکشنری کی تالیف و ترتیب میں مولوی عبدالحق کے علاوہ جس شخص کی ذہنی و علمی کاوشوں کی آمیزش ہے اس کا نام ڈاکٹر سید عابد حسین ہے اور وہ جامعہ ملیہ۔ دہلی میں پروفیسر ہیں۔ اس کے بعد مجھے اس پروفیسر کے بارے میں اور جاننے کا اشتیاق ہوا۔ مجھے کامرتبہ تو بہت عرصے تک نہیں معلوم البتہ علی گڑھ کے قیام کے زمانے میں میں نے عابد صاحب کے دو ترجمے پڑھے جن کا اس وقت وہاں چرچا تھا۔ خاص طور سے میرے ایک دوست جو سائیکالوجی کے طالب علم تھے۔ نفسیات بعنوانِ شباب کا اکثر ذکر کیا کرتے تھے۔ یہ ترجمہ ہے جرمنی کے مشہور عالم ایڈورڈ اشپرانگر کی کتاب سائیکالوجی آف یوتھ (Psychology of youth) کا۔ ترجمے کے خوش نما پیرایہ سے اس سے مترجم کی عالمانہ ژرف بینی کا کسی قدر اندازہ ہوا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مترجم پروفیسر اشپرانگر کا شاگرد ہے اور برلن یونیورسٹی کا پی۔ایچ۔ڈی ہے ــــ جگ بیتی جو پنڈت نہرو کی شہرۂ عالم Glimpses into World History کا ترجمہ ہے اور ترکی میں مغرب و مشرق کی کشمکش جو خالدہ ادیب خانم کی تقریروں کے مجموعے Struggle between the East and the West in Turkey ــــ کا ترجمہ ہے ــــ یہ دونوں ترجمے بھی میں نے علی گڑھ ہی میں پڑھے۔ یہ دونوں کتابیں میں نے مولانا [illegible]

[illegible] مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کچھ ... ڈگری بھی پڑھیں (مولانا عابد نے ... فارسی پڑھائی ... [illegible]
[illegible] سے ...) اس وقت ترجمہ کے ... مولانا نے اردو یا فارسی کی کسی کتاب کے ... [illegible]
[illegible] ... مولی ... کے بعد جب میں نے انہیں بتایا کہ یہ دونوں کتابیں میں نے پڑھ لی ہیں تو فرمایا کہ آپ نے ...
[illegible] جنگ بھی اور ترکی میں مغرب و مشرق کی کشمکش کا ذکر کیا تھا اب آپ ، بتایئے کہ ڈاکٹر عابد حسین کے بارے میں بحیثیت مترجم کے آپ کی کیا رائے ہے؟ میں نے عرض کیا کہ "میں اس نقطۂ نظر سے تو ان کتابوں کا مطالعہ کیا نہیں، اور پھر ایسے مسائل کے بارے میں ، میں [illegible] سکتا۔ البتہ مجموعی طور پر میرا تاثر یہ ہے کہ باوجود یہ جاننے کے کہ جنگ بھی ترجمہ ہے دوران مطالعہ میں کسی مرحلہ پر یہ نہیں محسوس ہوا کہ یہ ترجمہ ہے"۔ کہنے لگے "یہی ترجمہ کا کمال ہے۔ ایک زبان سے دوسری زبان میں کسی مضمون یا کتاب کا منتقل کرنا آسان کام نہیں ہے۔ ترجمہ کرنے والے کو دونوں زبانوں پر عبور ہونا چاہئے اور پھر سب سے اہم کام الفاظ کے صحیح انتخاب کا ہے، اس پر بڑی قدرت ہونی چاہئے —— ڈاکٹر عابد حسین میں یہ دونوں کمال بدرجہ اتم موجود ہیں"۔

۱۹۴۸ء میں میں نے گورنمنٹ بی۔ اے کیا اور ایم۔ اے کرنے کے لئے میں نے الٰہ آباد یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ وہاں مجھے عابد صاحب کی ادارت میں نکلنے والے ہفت روزہ اخبار "نئی روشنی" کی خبر ملی۔ عابد صاحب سے جو ذہنی تعلق قائم ہو گیا تھا اس نے ایک دن "نئی روشنی" کو ڈھونڈ ہی لیا۔ پھر جب تک "نئی روشنی" نکلتا رہا اس کی آمد کا برابر مجھے انتظار رہتا۔ اس میں میں نے چھوٹے چھوٹے مضامین لکھنے شروع کئے اور اس طرح ایک طرح کا قلمی تعلق بھی قائم ہو گیا۔ ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کے بعد جو واقعات رونما ہوئے، اور ملک کو، خاص طور سے مسلمانوں کو، آگ اور خون کے جس سمندر سے گزرنا پڑا اس سے ایک طرح کی انفعالی کیفیت سبھی پر طاری تھی۔ چاروں طرف اندھیرا تھی، راہ اور نشانِ منزل سب گم ہوتا نظر آ رہا تھا۔ مسلمانوں پر افسردگی اور شکست خوردگی کی ایک ایسی کیفیت طاری تھی جو صحیح طور پر سوچنے، حالات اور ان کے تقاضوں کو سمجھنے اور اپنے لئے کوئی لائحہ عمل متعین کرنے کی ساری صلاحیتیں مفلوج کئے دے رہی تھی۔ حالات کی ان تاریکیوں میں نئی روشنی نے بہت پریشان ذہنوں کو سیدھی راہ کا پتہ دیا اور جمود و تعطّل کے سیاہ بادل میں اُمید کی کرن بن کر منزل کی نشان دہی کی۔ میرا خیال ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ عابد صاحب کا یہی ایک کام بہت بڑا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے دماغوں میں وسعت اور دلوں میں گرمی ہے اور جو ملک و ملت کا درد رکھتے ہیں۔ "نئی روشنی" میں "بزم بے تکلف" کے نام سے ایک کالم ہوتا تھا۔ اس کالم کے ذریعے عابد صاحب نے طنز و مزاح کے پردہ میں بڑے بڑے سیاسی، سماجی اور اخلاقی مسائل چھیڑے اور اُن کی طرف لطیف اشارے کر کے ذہنوں میں ایک بے چینی پیدا کی۔ ایسی بے چینی کہ اگر صحت مند بنیادوں پر اس کی پرورش کی جائے اور اُسے زندہ رکھا جائے تو وہ کسی قوم کا بھی سرمایہ ہو سکتی ہے۔ ذہنوں کا اضطراب دراصل زندگی کی علامت ہے۔

۱۹۵۰ء میں ایم۔ اے کرنے کے بعد مدینہ (بجنور) کے ایڈیٹوریل بورڈ میں شامل ہو گیا۔ غالباً ۵۰ء کے آخر یا ۵۱ء کے شروع میں مجھے جامعہ آنے کا اتفاق ہوا اور جامعہ پہنچ کر سب سے پہلا کام جو میں نے کیا وہ یہ کہ عابد صاحب کے دروازہ پر صدا لگائی۔ عابد صاحب اتفاق سے تشریف رکھتے تھے۔ فوراً شرف باریابی حاصل ہوا۔ بڑی شفقت سے بٹھایا، پہلے میرے بارے میں پوچھا پھر مدینہ اور نئی روشنی کے بارے میں گفتگو ہوئی، پھر عام مسائل چھڑ گئے۔ ایک ایسے شخص سے جو عمر میں بہت چھوٹا ہو، علم میں بالکل تہی مایہ ہو، عابد صاحب نے دو ڈھائی گھنٹے گفتگو کی، بڑے اطمینان، سکون اور تفصیل کے ساتھ۔ جب میں رخصت ہوا تو آپ یقین مانئے میری آنکھیں نم تھیں۔ معلوم نہیں کیوں؟ شاید فرطِ مسرت میں کہ اتنے بڑے آدمی سے ملاقات ہوئی! شاید اس لئے کہ اپنی ہیچ مدانی کے باوجود پہلی بار اپنی شخصیت کا احساس ہوا تھا اس لئے کہ میں اتنی طویل اور مفصل ملاقات کی توقع لے کر نہیں آیا تھا، ایسی محبت اور شفقت کی امید نہ تھی۔ جیتے

علمی مشغلہ جاری رکھا اور وہ بہت ہی بلند پایہ کی علمی کاوش دے سکے جو ان سے وابستہ ہو گئی۔

اس وقت کے بعد عابد صاحب کی کئی ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ عابد صاحب نے جواب دیا تھا اور اکثر ملاقات میں جب علمی گفتگو ہوتی مجھے اطمینان ہو جاتا۔ ۱۹۳۸ء میں جب میں واپس آیا تو عابد صاحب جرمنی میں تھے۔ ۱۹۴۰ء میں جب وہ جرمنی سے واپس تشریف لائے تو مجھ سے بڑی محبت سے معانقہ فرمایا اور کہا کہ تمہاری کتاب کا اصل لکھ لیا ہے؟ اس دن سے آج تک ان کو بہت کچھ میں نے انہیں بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ظلم کرتے ہوئے، سبق پڑھاتے ہوئے، علمی و عملی مجلس کی صدارت کرتے ہوئے۔ علمی مباحث پر کنٹرول کرتے ہوئے، چائے پیتے ہوئے، کھانا کھاتے ہوئے، کبھی کبھی حقے کی کش لگاتے ہوئے اور سگار پیتے ہوئے (ڈاکٹر صاحب نے تمباکو نوشی ترک کر دی ہے۔ لیکن جب محب صاحب ساتھ ہوتے ہیں تو پی لیتے ہیں)۔ میں سمجھتا ہوں کہ عابد صاحب کی شخصیت میں بڑی جاذبیت اور دلکشی ہے۔ بڑی سادگی اور بے تکلفی ہے۔ ذہن صاف اور دل بڑا ہے۔

عابد صاحب ۲۱ صفر ۱۳۱۴ھ (۲۵ جولائی ۱۸۹۶ء) کو بھوپال میں پیدا ہوئے جہاں ان کے نانا مرحوم سید حامد حسین صاحب وزیر تھے۔ انہیں اردو، فارسی اور عربی اچھی آتی تھی، شاعر تھے اور تاریخ گوئی میں بڑی دستگاہ رکھتے تھے۔ خاندان کی روایت کے مطابق عابد صاحب کی تعلیم بھی پہلے گھر پر شروع ہوئی۔ قرآن پڑھا اور پھر عربی اور فارسی کا سلسلہ شروع ہوا۔ خاندان کے بعض بزرگ انہیں عربی تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ پروگرام یہ تھا کہ ابتدائی کتابیں ختم کر لینے کے بعد انہیں لکھنؤ بھیجا جائے۔ اور وہاں سے وہ مجتہد بن کر آئیں اور اس کی کشمکش میں تین سال گذر گئے۔ آخر کار 'قدیم' پر 'جدید' غالب آیا اور عابد صاحب ۱۹۰۶ء میں بھوپال کے جہانگیریہ ہائی سکول میں پانچویں جماعت میں داخل ہو گئے۔ اس عرصہ میں انہوں نے تھوڑی سی انگریزی اور حساب اردو سیکھ لی تھی۔ ۱۹۱۲ء میں اول درجہ میں میٹرک پاس کیا اور اسکالرشپ ملا۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے وہ میور سنٹرل کالج الٰہ آباد میں داخل ہوئے۔ انٹرمیڈیٹ میں انہوں نے ریاضی اور سائنس لی مگر ان مضامین سے کوئی طبعی مناسبت نہ تھی اس لئے ایف۔ اے میں سیکنڈ کلاس ملی۔ بی۔ اے میں جب آئے تو ریاضی اور سائنس کی دردسری کو چھوڑ کر فلسفے کی بھول بھلیاں میں اُلجھے۔ فلسفے کی خشکی کے ساتھ فارسی اور انگریزی ادبیات کی رنگینی سے ایک خوشگوار امتزاج قائم کیا اور بی اے میں فرسٹ کلاس لی۔ الٰہ آباد میں وہ مسلم بورڈنگ ہاؤس میں جو ایم۔ بی۔ ہاؤس کے نام سے مشہور تھا رہتے تھے۔ ڈھائی سال تک وہ یہاں مسلم بورڈنگ میگزین کے ایڈیٹر رہے اسی زمانہ میں ان کی ملاقات اکبر الٰہ آبادی مرحوم سے ہوئی تھی۔ بی۔ اے کرنے کے بعد وہ علی گڑھ چلے آئے اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں ایم اے (انگریزی) میں داخلہ لیا۔ علی گڑھ میں اس وقت ایک بے چینی تھی، ایک کشمکش تھی۔ عدم تعاون کی تحریک نے طلبہ اور اساتذہ کو ایک ہیجان میں مبتلا کر رکھا تھا۔ عابد صاحب اگرچہ اس تحریک سے الگ تھلگ رہے لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیمی لحاظ سے یہ سال ان کا بیکار گیا۔ ۱۹۲۰ء میں ولایت جانے کے لئے انہیں ریاست بھوپال سے وظیفہ ملا۔ تھوڑی بہت امداد ان کے چچا نے بھی کی اور وہ انگلستان چلے گئے۔ یہاں انہوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں بی اے (آنرز) کے لئے فرسٹ پارٹ کا امتحان بھی پاس کر لیا تھا۔ لیکن چونکہ وظیفہ کی رقم اتنی نہیں تھی کہ آکسفورڈ میں رہ کر وہ یکسوئی سے تعلیم حاصل کر سکتے اس لئے وہ مارچ ۱۹۲۲ء میں وہیں سے جرمنی چلے گئے۔ جرمنی میں انہوں نے پی۔ ایچ۔ ڈی میں داخلہ لیا۔ فلسفہ خصوصاً فلسفۂ تعلیم خاص مضمون تھا اور اس کے ساتھ عربی اور تاریخ یورپ دوسرے مضامین تھے۔ دسمبر ۱۹۲۵ء میں انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی۔ جرمنی میں پروفیسر ایڈورڈ اشپرانگر کی رہنمائی میں علمی سرگرمیاں ہی ان کی توجہ کا مرکز رہیں۔ اس وقت اتفاق سے ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر محمد مجیب، خواجہ عبدالحمید اور ڈاکٹر سلیم الزماں وہیں موجود تھے۔ ہندوستانی ایسوسی ایشن ان سب کا علمی و تہذیبی پلیٹ فارم تھا۔ ذاکر صاحب سے وہیں ملاقات ہوئی تھی۔ ذاکر صاحب کی کوششوں سے برلن کے کاویانی پریس نے دیوانِ غالب شائع کیا تھا۔ اس

[illegible] میں عابد صاحب کا بھی اثر تھا۔ عابد صاحب نے ایک مرتبہ مولانا محمد [illegible] لکھا [illegible]
[illegible] پڑھ چکے ہیں۔

جرمنی کے دوران قیام میں یہ ہوا کہ ایک مشہور شہر میں ان ہندوستانی نوجوانوں کی ملاقات حکیم اجمل خاں مرحوم سے ہوئی۔ مضامین عابد میں ایک مضمون ہے جس کا عنوان ہے "سچا افسانہ"۔ اس مضمون میں اس ملاقات کی طرف اشارہ ہے۔ ان نوجوانوں کے جوشیلے ارادے اور بلند خیالات کا تصادم ہوتا ہے ایک پیرفرزانہ کی مستقل اور سبک رو انداز طبع سے۔ اس کا ایک پیراگراف واقعہ یہ کہ حکمت سے بھرا ہوا ہے۔ کتنی پرسوز حقیقت ہے جو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے!

"یہ ہمتیں اور یہ ارادے ہیں ان نوجوانوں کے، مگر دنیا میں بڑے کام کرنے والے کے لئے محض ہمت اور ارادہ کافی نہیں، جب تک تجربہ اور معلومات، دانائی اور تدبیر، احتیاط اور استقلال شریک کار نہ ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ صفات نوجوانوں کو نصیب نہیں۔ یہ اس پیرِدانش کے حصے میں آتی ہیں جس کی رگوں میں خون کی گردش معتدل ہو چکی ہو اور جس کی سیرت میں وہ توازن اعتدال پا چکی ہوں۔ ان نوجوان سپاہیوں کو تلاش ہے ایک پیر معرکہ جہاں کا سالار بنے۔ یہ ایسا سالار چاہتے ہیں جس نے مشرق و مغرب کے درمیان کی دشوار گزار گھاٹیوں کو طے کیا ہے اور دونوں میدانوں میں داد شجاعت دی ہے جس نے بیسیوں معرکے جیتے ہیں۔ جس نے سختیاں جھیلی ہیں اور مشکلوں پر فتح پائی ہے۔ یہ رگ جسم تصور سے ہندوستان کے تمام سربرآوردہ مسلمانوں کو دیکھتے ہیں۔ مگر کوئی ان کے کام کا نظر نہیں آتا۔"

جرمنی میں ڈاکٹر عابد حسین صاحب نے اپنا اسلامی فلسفہ پر وہ غفلت لکھا اور ڈچ مصنف ڈی بوئیر (De Boer) کی کتاب ہسٹری آف فلاسفی اِن اسلام کو جرمن زبان سے اردو میں منتقل کیا۔ یہ کتاب اسلامی فلسفے پر نہیں ہے جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے۔ بلکہ حقیقت میں یہ کتاب مسلمان فلسفیوں کے بارے میں ہے اور جامع ہے۔

فروری ۱۹۲۶ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب ـــــ جامعہ کی تین اہم شخصیتیں ـــــ جرمنی سے ہندوستان واپس آئے اور تینوں نے جامعہ کو اپنی خدمات پیش کر دیں۔ اس لحاظ سے بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سال جامعہ کی تاریخ کا بڑا اہم سال ہے۔ تین شخصیتیں جو ایک دوسرے کے قلب کی حرارت، اور نگاہوں کی بلندی کو اچھی طرح سمجھتی تھیں، ایک ٹیم کی حیثیت سے اس ادارے کے لئے اپنی جان کھپانے کو تیار ہو جاتی ہیں جو ضعف و مشکلات کی سخت ترین منزلوں سے گزر رہا تھا۔ جس کا نہ تو کوئی شاندار ماضی تھا نہ حال امید افزا اور نہ مستقبل کا پتہ ـــــ اپنے مستقبل کو کسی ایسے ادارے سے وابستہ کر دینا بڑے دل و جگر کا کام ہے۔ لیکن بڑی شخصیتیں اسی طرح "نقد" کو نظر انداز کر کے "ادھار" سے معاملہ کرتی ہیں۔

ایک مرتبہ میں نے عابد صاحب سے پوچھا کہ کیا وہ طالب علمی ہی کے زمانے سے نیشنلسٹ تھے۔ فرمایا کہ پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں میں انگریزوں کا طرفدار تھا، پائنیر پڑھتا تھا اور میرے سیاسی خیالات وہی تھے جن کی تبلیغ پائنیر کرتا تھا۔ لیکن جب جلیانوالہ باغ کا حادثہ پیش آیا تو میرے دل و دماغ کی دنیا ہل گئی۔ جلیانوالہ باغ کا مجھ پر بہت اثر تھا۔ اسی زمانہ میں مجھ پر گاندھی جی کی ایک تحریر کا جو معاشیات سے متعلق تھی اور جس میں پیداوار اور تقسیم پیداوار سے بحث کی گئی تھی، بہت اثر ہوا۔ سامراجی نظام کی چیرہ دستیاں مجھ پر واضح ہونے لگیں۔ جب میں آکسفورڈ گیا تو وہاں میرے خیالات بلکہ میرا طرز خیال ہی بدل گیا۔ ۱۹۲۱ء کا ذکر ہے آکسفورڈ میں چھپا

[illegible] تحریک کے [illegible] ڈاکٹر [illegible]
[illegible] ایک [illegible] تھا ... ان کے [illegible]
[illegible] کی [illegible] ان کے مضمون میں [illegible] کی تحریک پر [illegible]
[illegible] نے یہ جواب دیا تھا اس میں ان کی حقیقت پسندی تھی [illegible] شاعرانہ [illegible]
[illegible] دیکھے گا —— [illegible] عابد صاحب [illegible]
[illegible] اب جامعہ میں انہیں پورے تیس سال ہوچکے ہیں۔ ان تیس سال کے عرصہ میں جامعہ نے بڑے نشیب و فراز دیکھے —— [illegible]
[illegible] زندگی کے [illegible] —— ڈاکٹر صاحب بھی ان نشیب و فراز سے گزرے [illegible] شخصیت [illegible]
کے بہت سے غم، آلام و مصائب کا مقابلہ [illegible] عابد صاحب کے ان نشیب و فراز بھی بہت دیکھے

بہت کم لوگوں کو شاید یہ معلوم ہوگا عابد صاحب نے شاعری بھی کی ہے اور ان کے اشعار اکبر الٰہ آبادی مرحوم سے خراجِ تحسین وصول کرچکے ہیں۔ الٰہ آباد میں اکبر مرحوم سے ان کی ملاقات بحیثیت شاعر کے ہوئی تھی۔ پھر جب وہ علی گڑھ آگئے تو انہوں نے علی گڑھ میگزین میں اکبر الٰہ آبادی پر ایک مضمون لکھا اور غالباً اسی اشاعت میں ان کی ایک نظم شائع ہوئی "اشتیاق" کے عنوان سے شائع ہوئی۔ اکبر مرحوم نے یہ مضمون اور نظم دیکھی تو رشید صاحب کو لکھا کہ یہ ڈاکٹر سید عابد حسین کون ہیں (الٰہ آباد کی ملاقات کی یاد شاید ان کے ذہن سے نکل چکی تھی) نظم کا آخری بند یہ تھا ؎

باعثِ تسکیں نہیں ہے یہ خیال — عارضی ہے زیست کا رنج و ملال
انتہائے دورِ ظلمت تا بکے — چند لمحے، چند ساعت، چند سال
پھر رہا تھا بلبلِ بے خانماں — پھر بھی محروم ہے حسنِ ازل
قیدِ صورت سے ملے گی جب نجات — شاہدِ معنی سے پھر ہم کنار

"مرغِ جاں را آشیانے دیگر است
ایں مکاں را ہم مکانے دیگر است"

اکبر مرحوم نے عابد صاحب کو بھی لکھا "آپ کی نظم میں نے پڑھی۔ خوب ہے۔ خصوصاً آخر کا بند اسے پڑھ کر میری زبان پر بے اختیار یہ شعر آگیا ؎

آپ کی ہستی تو ذوقِ راہِ عرفاں میں کھلی — کاش چھوٹے آپ کے دامن کو یہ پندارِ ہستی

عابد صاحب کی نثر بڑی چوکھی اور رچی بسی ہوئی ہوتی ہے۔ عبارت کا ہر لفظ اپنی جگہ پر نقطہ ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جن لوگوں نے "مضامینِ عابد" کا مطالعہ کیا ہے وہ میری رائے سے متفق ہوں گے یا پھر جن طلبہ نے جامعہ کالج میں ان سے اردو پڑھی ہے ان سے ذرا عابد صاحب کا حال بحیثیت استادِ اردو کے پوچھئے۔ آج جبکہ وہ درس و تدریس کے کام سے الگ ہوکر تصنیف و تالیف کا کام کررہے ہیں، طلبہ انہیں یاد کرتے ہیں اور ہم سب ان کی کمی بری طرح محسوس کرتے ہیں۔ طلبہ کے ساتھ ان کا تعلق مربیانہ ہوتا ہے۔ مستطیع اور غیر مستطیع ہر قسم کے طلبہ کو مختلف طریقوں سے ان سے فیض پہنچتا رہتا ہے۔ حاجتمند طلبہ کی وہ ہر طرح سے اعلاوہ ادرمے، قدمے، سخنے مدد کرتے ہیں۔ عابد صاحب جب جامعہ میں رہتے ہیں تو کالج کے طالب علموں کو بڑا اطمینان رہتا ہے۔

مقالے میں ایک طرح سے بیتی ہوئی زندگی کا خاکہ ہے۔ یہ مضمون ایک طرح سے تمہید ہے عابد صاحب کی ... میں جو تصویر ابھرتی ہے وہ بڑی حد تک ان کی اپنی شخصیت ہے۔ اس میں ایک جگہ عابد صاحب نے لکھا ہے: "ایک مصنف ... لکھتا ہے تو ... اپنی تحریر کے اسلوب اور مضمون میں اپنی شخصیت کی ایک جھلک ... جیسے ... مصور کی سیرت پر قلم اٹھاتا ہے اس کے خلوت کدۂ ذات کا حجاب اٹھ جاتا ہے، اسعد کے جوہر چمکتے ہیں ... ہیں نہ ـــــ کیا میں اس موقع پر یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ یہاں صیاد خود اپنے دام میں آگیا ہے۔ اس مضمون میں کئی ... اور جگہیں ہیں جہاں عابد صاحب خود اپنے آپ سے نہیں بچ سکے ہیں۔ مرزا حیرت کے سلسلے میں انہوں نے لکھا ہے "... کی وہ منزلت ہے کہ جاہ و دولت کی سطح میں اس سے اوپر جانا حقیقت میں نیچے اترنے کے برابر ہے۔" ایک مرتبہ مجھے یاد ہے کہ انہوں نے ایسے پرزور الفاظ میں ... کے چند مدارج کا مجھ سے ذکر کیا اور کہا کہ ... کے سامنے منصب کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

عابد صاحب کے یہاں کنبے کا تصور بہت وسیع ہے۔ خاندان اور خاندان والوں کا ... ان کا عزیز ہے اس سے انہیں محبت ہے اور جب کبھی کوئی موقع آتا ہے تو عابد صاحب کی مروت ان کے دل کو تقویت دیتی ہے۔ جب وہ صاحب ملتے تھے اور وظیفہ پاتے تھے تو وظیفے کی بڑی رقم ان کے علاج معالجے میں صرف کرتے تھے اور انہیں یہ محسوس نہیں ہونے دیتے تھے کہ ان کی خبرگیری کرنے والا کوئی نہیں۔ صالحہ باجی کا (تعلیم ...) کہنا ہے کہ عابد صاحب کی شرافت نفس کا اندازہ گھر میں ہوتا ہے۔ ملازموں سے انہیں بڑی محبت ہے اور جب کبھی کسی بات پر ملازموں سے بازپرس کرتی ہوں اور عابد صاحب کو اس کی اطلاع ہو جاتی ہے تو وہ ہمیشہ ملازموں کی طرفداری کرتے ہیں۔ عابد صاحب کے دوست بہت کم ہیں۔ لیکن جو ہیں ان پر وہ جان چھڑکتے ہیں۔ ذکی احسن اور متعدد ... دوستوں سے وہ دو سرے درجے کی بات بھی نہیں سکتے۔ دوستوں کو بھی عابد صاحب کی رائے پر بہت بھروسہ ہوتا ہے، جب کوئی مشکل مسئلہ پیش آتا ہے تو وہ انہیں سے حل کراتے ہیں اور سب مطمئن ہو جاتے ہیں۔

عابد صاحب کے مزاج میں بڑی سادگی ہے۔ لباس بہت سادہ، کھانا بہت کم، بس کل دو چپاتی کھاتے ہیں۔ میٹھا ان کی کمزوری ہے۔ طبیعت میں بھی بہت سادگی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ اس سادگی میں اپنی بذلہ سنجی کے ذریعہ بڑی چاشنی پیدا کر دیتے ہیں۔ مزاح ان کی طبیعت کا ایک جزو لاینفک ہے۔

صبح و شام ایک دو میل تک ٹہلنا عابد صاحب کے معمولات میں سے ہے۔ رشید صاحب نے ایک جگہ اپنے بارے میں لکھا ہے کہ "میں بیٹھ کر سوچ ہی نہیں سکتا، میرے پاؤں کی 'حرکت' میرے دماغ کی 'حرکت' کا سبب بنتی ہے۔" میرا خیال ہے کہ عابد صاحب کے ساتھ بھی کم و بیش یہی معاملہ ہے۔ شام کے وقت کبھی کبھی میں ان کے ساتھ ہو جاتا ہوں۔ مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی ہے۔ میں کوئی بات چھیڑ دیتا ہوں پھر 'گل افشانی گفتار' کا تماشہ دیکھتا ہوں۔ غالب کو اس کام کے لئے 'پیمانہ و صہبا' کی ضرورت پڑی تھی، عابد صاحب کو کھلی ہوئی فضا چاہئے۔ عابد صاحب کی حاضر جوابی مسلّم ہے۔ سنا ہے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب بھی ان سے گھبراتے ہیں۔ بے شمار لطیفے ایسے ہیں جو جامعہ والوں کی زبان پر ہیں۔ کچھ فطری طور پر وہ حاضر جواب ہیں، علم و شعور، مطالعہ اور مشاہدہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس میں بھی ترقی ہوتی گئی۔ بچپن کا ایک واقعہ ہے۔ ان کے والد مرحوم کے ایک دوست تھے جو اکثر انہیں چھیڑا کرتے تھے۔ ایک دن وہ آئے اور ان کی طرف اشارہ کر کے ان کے والد سے کہا۔ آپ نے عابد حسین کو کیا مخمل میں مڑھ لیا تھا۔ ابھی وہ کوئی جواب بھی نہیں دے پائے تھے کہ عابد صاحب نے کہا "جی ہاں، انسانوں کا قحط تھا۔" اس وقت ان کی عمر دس سال کی تھی۔

صالحہ باجی چوہوں سے بہت ڈرتی ہیں، ان کے یہاں کئی چوہے پال رکھے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ان پر چوہوں کی طرف سے دہشت ہونی چاہئے، عابد صاحب اس معاملہ میں بہت بے نیاز ہیں، ان کا کہنا ہے کہ چند گھر کی چیزیں ہی توڑے جائیں گے ایسے جانے دو۔ ایک مرتبہ عابد صاحب ہنستے ہوئے

کے لئے بھیجے جا رہے تھے۔ صالحہ باجی کا مشورہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب نہ جائیں تو اچھا ہو۔ عابد صاحب کہہ رہے تھے۔ ایسی کیا جلدی ہے اسعد ایکسکیوز سے ہو چلی وہ بارہ بجے تھی اس میں پچھتر آدمی ذاکر تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ اگر آدمی چھٹی نہ لے اور بیمار ہو جائے تو زیر بار کون ہو گا۔ خود کو خوشی ہو سکتی۔ عابد صاحب نے پوچھا کیا؟ اور اگر یہی ہوا اور وہ بیمار ہو گئے۔ بیگ نے آپ کا کہا مانا؟ اسے مرحومہ عفیرہ آپ جیسے لوگ بیمار!
جامعہ میں ایک تعلیمی کانفرنس تھی۔ جامعہ کی طرف سے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب، پروفیسر محمد مجیب اور عابد صاحب اس میں شرکت کے لئے گئے۔ مجیب صاحب اور عابد صاحب کا قیام ایک ہی کمرے میں تھا۔ رات کو سب لوگ بیٹھے تو مجیب صاحب کمبل جیسی چیز لپیٹ کر برآمدہ کو بیٹھ جاتے تھے۔ عابد صاحب نے کہا "مجیب صاحب! کیا بات ہے" مجیب صاحب نے بڑے تکلف سے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ چارپائی میں کھٹمل ہیں" عابد صاحب نے بے ساختہ فرمایا "تو پھر مجیب صاحب بیٹھے" مجیب صاحب کشمیری، عابد صاحب کشمیری نہیں بلکہ مجیب بقرعید کی قدر جاسوسی ہمیشہ سنبھل کے ساتھ بیٹھتے ہیں اور وارکعو مع الراکعین کی زندہ مثال ہیں۔

عابد صاحب دھن کے آدمی ہیں۔ کوئی کام ان کے ذمہ ہو تو جب تک وہ پورا نہیں کر لیں گے دوسرا کام نہیں شروع کریں گے۔ اسی لئے وہ ہمیشہ ایڈمنسٹریشن کی ذمہ داریوں سے بچتے رہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کی طبیعت کی افتاد ہی کچھ ایسی ہے۔ وہ سست سوچتے ہیں، فرماتے ہیں کہ زبان کی طرح دماغ میں بھی لکنت ہے۔ لیکن اس سے ایک فائدہ یہ ہے کہ جو کچھ سوچتے ہیں ٹھیک سوچتے ہیں۔ ہر پہلو کی تفصیل پر نظر رکھتے ہیں اس لئے ان کا ہر فیصلہ دو اور دو چار کی طرح واضح، صاف اور مطمئن کرنے والا ہوتا ہے۔

صالحہ باجی کہتی ہیں کہ گھر میں لوگ چھوٹے موٹے مرض کی اطلاع بھی عابد صاحب کو نہیں کرنے دیتے اس لئے کہ اگر انہیں خبر ہو جائے تو لکھنے پڑھنے کا سارا کام ترک کر کے اس طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ بڑے سے بڑے ڈاکٹر سے رجوع کریں گے یہاں تک کہ بے چارہ مریض پچھتائے گا کہ ناحق انہیں اس کی اطلاع ہو گئی۔

عابد صاحب کی شخصیت کی سب سے بڑی خوبی ان کی انسان دوستی ہے۔ ان کا جذبہ ہمدردی عام اور دلنواز ہے۔ فرد کی ان کے نزدیک بڑی اہمیت ہے اور فرد کی صلاحیتوں کو ابھارنے میں ان سے جو کچھ ہو سکتا ہے وہ سب کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے اب وہ ملک کی ان چند شخصیتوں میں سے ہیں جن پر بجا طور پر ناز کیا جا سکتا ہے۔

عرشی رامپوری

عشرت رحمانی

یادش بخیر۔ ریاست رام پور (یو۔پی) میں "بزم ادب" کے نام سے ایک ممتاز علمی ادبی جماعت قائم تھی۔ اس کے روح رواں مولانا عزیز خاں مرحوم، مدیر رسالہ نیرنگ و مالک مطبع سعیدی تھے۔ عزیز مرحوم نہایت اعلیٰ خوبیوں کے انسان تھے۔ "نیرنگ" اپنے زمانہ کا ایک ممتاز علمی ادبی ماہنامہ شمار کیا جاتا۔ اور عزیز مرحوم نے اپنی زندگی علم و ادب کی خدمت کے لئے وقف کر دی تھی۔ اور اپنے کسب کمال سے عزیز جہاں بنے ہوئے اپنے گرد شیدائیانِ ادب کا ہجوم لئے خاموشی اور تندہی سے مصروف کار تھے۔ اس بزم کا مرکز نیرنگ کا دفتر عزیز مرحوم کا مکان واقع گھیر کلیاں تھا۔ جو دفتر کم اور یارانِ میکدہ کا تکیہ زیادہ تھا۔

بزم ادب کے زیر اہتمام یوں تو کبھی کبھار مختصر شاعرانہ محفلیں منعقد ہوتی رہتیں۔ اور سال میں ایک دو عالیشان قسم کے مشاعرے ہو جاتے۔ لیکن اس کی خاص سرگرمیوں میں روزانہ کی وہ محفل تھی جو چند مخصوص اہل علم و ادب پر مشتمل دوستوں کی نشست کہی جاتی۔ مگر اس میں علم و فن کا کوئی موضوع ایسا نہ تھا جو آئے دن زیر بحث نہ آتا ہو۔ اس بزم کے اراکین میں رام پور کے معدودے چند حضرات شریک تھے۔ جن میں بزرگ بھی تھے، ہم عمر اور جوان سال بھی۔ عزیز مرحوم کے خلوص نے ان سب کو اپنی بزم ادب کی شمع کا ہم ذوق پروانہ بنا لیا تھا۔ ۱۹۲۷ء کا زمانہ تھا میں نے اپنی ابتدائی تعلیم سے فراغت حاصل کر کے کلکتہ اور لاہور کے قیام کے بعد رام پور آیا تھا اور اپنے ذوق ادب کی تسکین کی خاطر بلکہ زانوئے ادب تہ کرنے اس بزم میں شریک ہو گیا۔ میری حیثیت ان چند بڑوں میں سب سے چھوٹے کی تھی۔ لیکن یہ یارانِ نکتہ داں کی محفل تھی جہاں چھوٹے بڑے کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ یہاں تو "زندگی برائے ادب" کا نعرہ سب کی زبان پر تھا اور ہر شام کے چند گھنٹے نہایت خلوص و یگانگت کے ساتھ ادبی گفتگو میں گزارے جاتے۔ علم و ادب کی گتھیاں سلجھانے کے لئے آپس میں بے حد دلچسپ و پُرکیف بحث مباحثے بپا ہوتے۔ اور ان سب مباحث اور مذاکروں کے نتیجہ میں بیش بہا علمی مواد مجلہ نیرنگ کے صفحات کی زینت بن جاتا۔ ان مجالس میں شعر و ادب ہر دو کی کوئی قید نہ تھی۔ کبھی نشست میں ایک مصرع پڑھا جاتا اور تمام احباب فی البدیہہ فکرِ سخن میں مصروف ہو جاتے۔ اور تھوڑی دیر میں سب حضرات اپنی اپنی تازہ غزلیں سنا کر بزم

[illegible] ۔ عرشی صاحب کی ممتاز [illegible] عرشی کی صحبت ہر صنف [illegible] نظر آتی تھی۔ [illegible]
[illegible] ادبی ذوق میں ان کا یہ عالم تھا کہ جہاں سال حضرت ہی [illegible] تھا۔ [illegible] مباحث میں [illegible] صاحب [illegible] اختلاف
[illegible] تھی۔ [illegible] چند [illegible] ایسے [illegible] جو [illegible] حاضرین کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتے [illegible]
[illegible] آواز کو بلند کرنے پر [illegible]۔ اور جب [illegible] تبسم [illegible] دیکھتے۔ یا [illegible] کرنے [illegible]
[illegible] کے درمیان ایک [illegible] سے [illegible] نظر آتا۔ [illegible]
[illegible] سے تقریباً تیس سال پہلے [illegible] عرشی سے خطاب کیا جاتا [illegible] کے بعد [illegible] کیفیت [illegible]۔ اور وہ [illegible]
[illegible] سے مخاطب کرکے [illegible] اور [illegible] آ جاتے ان کے [illegible] تو [illegible] گفتگو کی [illegible] پیدا کر دیتے۔ اور ذرا دیر میں [illegible]
[illegible] کو آسانی سے سلجھانے میں کامیاب ہو جاتے۔ پھر [illegible] گفتگو کے [illegible] پر [illegible] ہو جاتی۔
[illegible] کی [illegible] آواز [illegible] سنائی دیتی کہ "چلئے بات ختم ہوئی"۔ پھر کسی ملازم کو چائے کے لئے پکارنے لگتے اور تمام احباب [illegible]
[illegible] گفتگو کی تلخیوں کو چائے کی چسکیوں پر اڑا دیتے۔

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ عرشی صاحب کئی سال قبل علوم مشرقی کی تحصیل سے فراغت کرکے علوم مغربی کی تحصیل میں مصروف تھے۔ [illegible] کے شب و روز علمی مشاغل میں گزرتے۔ کئی اداروں سے ان کو ملازمت کی پیش کش ہو چکی تھی مگر وہ اپنی علمی و ادبی سرگرمیوں پر کوئی پابندی عائد کرنا پسند کرتے نہ ان کی عزلت گزینی شہرت کو گوارا کرتی۔ ان کے اکثر احباب جو پنجاب اور یوپی سے علمی و ادبی رسائل شائع کرتے تھے ان سے مضامین کی فرمائشیں کرتے لیکن وہ ان کو کسی نہ کسی طرح بہ لطائف الحیل ٹال دیتے۔ البتہ مولانا عزیز مرحوم کا خلوص ان پر غالب آتا اور نیرنگ کی کوئی اشاعت ان کے علمی یا ادبی مقالہ یا غزل سے خالی نہ ہوتی۔ کیونکہ عرشی صاحب خوش فکر شاعر ہونے کے باوجود عام طور پر حجاب میں رہتے تھے۔ اور ان کا کلام کسی مجلہ ادب کی زینت نہیں بننے پاتا۔ نہ کسی عام مشاعرہ کی محفل میں ان کا نام پکارا گیا۔

بزم ادب کی شاعرانہ مجالس میں وہ کارکن و منتظم کی حیثیت سے پیش پیش نظر آتے۔ مگر مشاعرہ کے وقت وہ ایک خوش ذوق سامع کی حیثیت اختیار کر لیتے۔ اور پیشتر ہی تمام احباب سے یہ وعدہ لے لیتے کہ ان کے سامنے شمع نہیں لائی جائے گی۔ نہ اصرار و تقاضہ سے ان کو مجبور کیا جائے گا۔ بہت کم ایسا ہوتا کہ مخصوص شاعرانہ صحبت میں ہم لوگ ان کو مجبور کر دیتے اور وہ عجیب شانِ تکلف سے شعر خوانی پر آمادہ ہو جاتے۔ بزم ادب کی شبانہ مجلسوں میں ایسے مواقع اکثر پیش آتے۔ دراصل عرشی صاحب کی طبیعت رسا میں شاعری کا قدرتی مادہ ودیعت کئے جانے کے باوجود وہ کئی وجوہ کی بناء پر اپنی شاعرانہ حیثیت کو منظر عام پر لانے سے محترز رہے۔ ایک تو ان کی گہری ناقدانہ نظر ان پر کڑی پابندی لگائے رہی۔ پھر سب سے زیادہ یہ کہ علمی ادبی تحقیق و تدقیق کو دوسرے تمام مشاغل پر ترجیح دیتے اور انہی کو اولیت حاصل تھی اور آخرکار ان کے تخلص نے ان کے نام اور علمی مقام کی حیثیت اختیار کر لی۔ حالانکہ افغانی النسل ہونے کے باوجود ان کا پیشۂ آبا سپہ گری نہیں تھا مگر ان کے لئے شاعری ذریعہ عزت نہیں۔

عرشی صاحب کا خاندان افغانستان کے یوسف زئی سلسلہ میں کرزئی شاخ حاجی خیل سے تعلق رکھتا ہے۔ اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ کو ہندوستان آئے سوا سو سال ہوئے اور اسی عہد سے ان کے آباؤ اجداد رامپور کے محلہ بیجواری میں سکونت پذیر ہوئے۔ اور اسی آبائی مکان میں وہ آج تک رہتے ہیں۔ ان کے دادا صاحب مرحوم مولوی اکبر علی خاں صاحب اپنے عہد کے جید عالم اور مشہور محدث تھے۔ لیکن عرشی صاحب کے والد ممتاز علی خاں صاحب کو ورثہ میں ان علوم کا کوئی حصہ نہ ملا۔
ان کو علوم مذہبی سے ذوق ضرور تھا مگر فضیلت کے درجہ تک نہیں پہنچے اور وہ رامپور کے مویشی خانہ سرکاری کے ہسپتال کے افسر اعلیٰ

تھے۔ مگر انہوں نے ہونہار فرزند کی تعلیم میں اپنے حق کی کوتاہی کی اس زمانی اور جسمانی وضع سے آپ کو چند ہی تمام ہند کے مسائل سے
صاحب کی نگرانی میں رہ کر ساتھ فضیلت حاصل کئے۔ انہوں نے رامپور کی مشہور زمانہ درسگاہ مدرسہ عالیہ علوم مشرقیہ میں عربی و
فارسی کے مروجہ درسی نصاب کی تکمیل کی۔ اور پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کی سند حاصل کی۔ بعد ازاں انگریزی ادب کے مطالعے سے بھی
استفادہ کیا۔ اس طرح اپنے ذوق اور ضرورتِ وقت کے لحاظ سے علوم جدید میں وافر استعداد بہم پہنچائی۔

جیسا کہ ابتداء میں بیان کیا جا چکا ہے نہالی عرشی نے تحصیل علم کرا چکا سب کچھ کر کے عرصہ دراز تک اعلیٰ سے اعلیٰ ملازمت سے اپنا دامن بچائے رکھا۔ اور اپنی ضروریات کو محدود کر کے دولت کی آستاں بوسی گوارا نہ کی۔ موروثی جائداد اور والد صاحب کی ذاتی آمدنی خاندان اور ان کی ضروریاتِ حیات کے لئے کافی تھیں۔ ڈاکٹر مختار علی خانصاحب بھی اپنے سعادت مند و رفاضل فرزند کے مشاغل علمی سے مسرور رہتے تھے انہوں نے کبھی کسی حالت میں عرشی صاحب کا وطن سے باہر نکل کر کسی اعلیٰ ملازمت سے وابستہ ہونا گوارا نہ کیا۔

ابتدا سے عرشی صاحب کا زیادہ وقت مشرقی علوم کے مطالعہ اور چھان بین ہی میں صرف ہوتا۔ ان کا حلقۂ احباب محدود و مخصوص تھا۔ ان کے خاص علمی احباب میں ابتداء سے مولوی عزیز اللہ خاں عزیز مرحوم — مرزا ہادی علی بیگ واحق شادانی (حال استاد السنۂ شرقیہ گورنمنٹ سنٹرل ماڈل ہائی اسکول لاہور) اور ڈاکٹر وجاہت حسین عندلیب شادانی (صدر السنۂ شرقیہ ڈھاکہ یونیورسٹی) شامل ہیں۔ باقی ... کے اکثر علماء و فضلاء اور اہل ادب حضرات سے رشتۂ یگانگت قائم تھا اور ہے۔ عرشی صاحب نیک سیرت، نیک نفس اور سادہ مزاج انسان ہیں ان کا رہن سہن، لباس تمام تر خالص مشرقی ہے۔ ہر موسم ہر موقعہ پر ان کا لباس کرتہ پاجامہ اور اچکن اور رامپوری ساخت کی مخملی ٹوپی رہا۔ اور آج تک وہی وضع قائم ہے۔ وہ اکہرے جسم کے خوش وضع خوش شکل پیکر مردانہ حسن کا مجسمہ ہیں اس لئے ان کو اپنی طرز کا لباس زیب دیتا ہے۔ انہوں نے ابتدا سے خاندانی وضع کے مطابق داڑھی رکھی۔ جو ان کے حسین چہرے پر نہایت خوش نما معلوم ہوتی ہے۔ پابندیٔ مذہب نے ان کی طبع سلیم میں خاص صلاحیت پیدا کی۔ اوائل عمر سے پابند صوم و صلوٰۃ ہیں۔ لیکن کٹر ملائیت کے سخت مخالف۔ انہوں نے مذہبی علوم کو برتا ہے۔ احکام قرآنی کو سمجھا اور ان کی روشنی میں شرعِ دین کی تعلیم کو عملی جامہ پہنا کر اپنے عقائد و اعمال میں حقیقی اسلامی صلاحیتیں پیدا کی ہیں اور دوسروں کو اس سے متمتع کیا ہے۔ دوستوں، عزیزوں اور بیگانوں سے تعلقات میں تکلف و مدارات کے امتیاز اور حفظ مراتب کو برقرار رکھتے ہوئے تعلقات و مراسم کو نباہنا ان کی طبع سلیم و وضع حلیم میں خاص ملکہ ہے۔

عرشی مجھ سے عمر میں چند سال بڑے ہیں۔ میرے ان کے تعلقاتِ یگانگت کی ابتدا تقریباً ۱۹۲۳ء سے ہے۔ اور بزم ادب رامپور کے فروغ میں اس قربت میں اضافہ ہوتا رہا۔ اور علمی فضیلت میں تو وہ مجھ سے بزرگ تر ہیں۔ مگر ابتداء سے آج تک حاضر و غائب ہمیشہ سے میرے ان کے درمیان پُر خلوص مساوی تعلقات برادرانہ قائم ہیں۔ میرے اور عرشی کے درمیان برادرانہ و مخلصانہ مراسم استوار ہیں لیکن میں نے اکثر ان کو دوسرے اصحاب سے بحث و تمحیص کے دوران میں بھی کبھی ایسی حالت میں نہ دیکھا کہ جس سے یہ گمان ہو سکے کہ وہ خواہ مخواہ کسی پر اپنی فوقیت جتائیں یا فریقِ مخالف سے اپنی اصابتِ رائے منوانے کے لئے ملائیت کی درشتی اختیار کر کے کج بحثی پر آمادہ ہوئے ہوں۔ عرشی کی مرنجاں مرنج طبیعت کسی دشمن کے خلاف بھی قدمے سخنے قلمے کی حیثیت سے آمادۂ انتقام نہیں ہوتی۔ اور یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ شاید عرشی وہ فرشتہ خصلت انسان ہے جس کا کوئی دشمن نہیں اور اگر کوئی بلاوجہ دشمنی پر آمادہ بھی ہو تو عرشی میں بذاتِ خود دشمن آزاری کا مادہ نہیں۔ وہ دشمن کو اپنی حلیم الطبعی سے دوست تو بنا سکتے ہیں مگر اس کی تلخ کلامی یا ترشروئی کے جواب میں اپنے تیور اور زبان کو نہیں بگاڑ سکتے۔ اور یہ وہ خوبیاں ہیں جو اس دور کے بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہیں۔ بالفاظ دیگر وہ ان معدودے چند انسانوں میں سے ایک منفرد انسان ہیں جن کی نسبت کہا گیا ہے کہ ع

سخت دشوار ہے انسان کا انساں ہونا

عرشی کا ظاہر و باطن یکساں ہے۔ منافقت چھو کر بھی نہیں گئی۔ ہر کسی کو بھائی نہیں بلکہ قریبی رشتہ سے مخاطب کرتے ہیں اور صدق دل سے کہتے بھی ہیں۔ وہ عقائد کے لحاظ سے اہلِ سنت والجماعت ہیں۔ اور علمی و مذہبی مسائل و معتقدات میں حضرت امام ابو حنیفہؒ کے پیرو اسی لحاظ سے ان کے نام کے ساتھ 'حنفی' کی نسبت پائی جاتی ہے۔

عرشی کی پیدائش ۸ دسمبر ۱۹۰۴ء مطابق ۲۹ رمضان المبارک ۱۳۲۲ھ یوم پنجشنبہ کو اپنے آبائی مکان محلہ پیپل دار (رام پور) میں ہوئی اور شاید اس ماہِ مبارک کی تمام برکات و فیوض ان کے حمیدہ عادات و خصائل میں بدرجۂ اتم ودیعت ہوئیں لیکن اپنی تمام محمودہ صلاحیتوں کے ساتھ وہ ایک عملی انسان اور دلکش خیال شاہراہِ حیات ہیں۔ ان کی پیدائش کے ماہ و سال نے انہیں 'رمضانی' یا 'معجزاتی' نہیں بنایا۔ وہ اس نوع کی کرامات سے متنفر اور اس قدر منکسر المزاج ہیں کہ صحیح معنوں میں ملا نا کرتے ہوئے اس لقب سے شرماتے اور دوسروں پر اپنی فضیلت جتاتے گھبراتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کی ناموس جبیعت نے شہرتِ عام سے ہمیشہ نفرت کی۔ اور کتاب خانہ کے گوشہ میں مقید ہو کر علم کے دریا بہانے کے باوجود اپنی ذات و صفت کو منظرِ عام پر لانا گوارا نہیں کیا۔ حالانکہ عرشی کی علمی عملی زندگی تمام تر مشغلہ جات ہے۔ مگر وہ کبھی سربراہ نظر نہیں آتے ۔۔۔۔ ان کے علمی ادبی کارناموں کے دفاتر ہیں، تحقیق و تنقید کے ذخائر ہیں لیکن ان میں سے بہت کم اشاعت پذیر ہوئے ہیں۔ اس کا بڑا سبب ان کا فطری حجاب اور قناعت اور پھر مقامی حالات کی وہ تنگ حدود جو انہوں نے خاص محدود دائرہ میں اپنے اوپر عائد کر لیں

عرشی کی شخصیت کا علمی پیکر جو ہمارے سامنے آتا ہے اس سے ان کے ظاہر و باطن دونوں کا پورا پورا اندازہ اس طرح ہوتا ہے:

تخلص کے عرشی۔ مزاج میں فرشی۔ فرشتہ صفت، خجستہ خصلت، انسل اخلاق، اصل انسان۔ طبیعت میں وہ نرمی کہ اختلافی گرمی کا شائبہ تک نہیں۔ سادگی کا مجسمہ۔ اخلاص و مروت کا پیکر، مخلص و متواضع، خوش خلق، خوش اطوار، یاروں کے یار، دشمن کے لئے بیکار۔ علم و فضل میں راسخ ملا۔ مگر شگفتہ مزاجی و خندہ دلی میں ہمارا بھی رہنما! کشادہ پیشانی، وسیع القلب، نیک مشرب، نیک دل، تہذیب و علومِ مشرقی کے دلدادہ، زمانہ کے انداز پر ہر معقول جدت قبول کرنے پر آمادہ۔ صورت و سیرت میں حسین، ظاہر و باطن سنجیدہ و رشیں۔ کم سخن مگر خوش گفتار، کم آمیز، نرم و بے ستیز، مگر علم و عمل میں تیز، اس لئے شخصیت کو اسمِ با مسمّٰی کا لقب زیب دیتا ہے۔ جس کی ذات میں وہ امتیازی جواہرِ علم و فن پوشیدہ ہیں جو ہر کسی بحرِ علوم میں نہیں پائے جاتے۔ مگر وہ ایک ذخّار سمندر کی طرح خاموش ہے جس میں جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے ۔۔۔ کے مصداق اپنے علمی فضائل و ادبی کمالات سے موج در موج تشنگانِ علم و ادب کو عجز آنہ سکوت کے ساتھ فیضیاب کئے جا رہا ہے۔"

پیشتر کہا جا چکا ہے کہ عرشی صاحب نے ابتدا سے اپنے آبائی وطن رام پور کو اپنا ملجا و مسکن بنانے پر قناعت کرکے اس کو اپنی تمام و کمال سرگرمیوں کا مرکز قرار دیا۔

شروع میں چند دیگر علمی مصروفیتوں کے علاوہ کتاب خانہ عالیہ رام پور (جو اب رضا لائبریری کے نام سے موسوم ہے) کے نایاب و نادر کتب ہائے گرانمایہ سے استفادہ کرکے ۲ سال تک خلیفۂ دوئم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے خطبات و خطوط اور حکیمانہ اقوال کی تحقیقات کی اور ان کو مرتب کیا۔ اسی زمانہ میں مسٹر چیمپین (Mr. Champan) کتاب خانہ سرکاری کے ناظم اعلیٰ تھے۔ انہوں نے عرشی صاحب کے ذوقِ علمی اور تجسس و تدقیق کی صلاحیتوں کا اندازہ لگا کر بڑے اصرار سے ان کو اپنی نیابت کے لئے رضامند کر لیا۔ عرشی نے اس عہدہ کو محض اس خیال سے قبول کیا کہ ان کا زیادہ وقت اس کتاب خانہ میں صرف ہوتا ہے۔ اگر وہ باضابطہ اس سے منسلک ہو جائیں تو ان کے مطالعہ میں

وہ یہ عنوانات میں اسکیمیں لگے ہیں جن سے ان کی رسائی ابھی ایک عام شہری کی حیثیت سے نہ ہو سکی تھی۔ چنانچہ اس موضوع [illegible] کام کرنے کے بعد [illegible] ان کی زبانی نواب صاحب کو بھی بخوبی ہو گیا۔ یہ دیدہ ناصل اگرچہ مسٹر [illegible] ریاست کا کافی [illegible] رفتہ رفتہ نواب صاحب بھی ان کے فضل و کمال اور اہلیت سے کما حقہ واقف ہو گئے۔ عرشی صاحب نے [illegible] کی رہنمائی میں اس کو اپنا مرکز و مشق اُستاد تصور کر کے بڑی تندہی اور دل سوزی سے کام لیا۔ پھر ان کے ذوق [illegible] نے ان کے کام کی اہمیت کو اور بھی واضح کر دیا۔ یہ کتاب خانہ دنیا بھر کے ان چند گنے چنے عالیشان کتاب خانوں میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے جس کے گرانمایہ نوادر کی زیارت کے لئے شیدایانِ علم و ادب دور دراز کے سفر اختیار کر کے وہاں آتے اور اپنی تشنگیٔ ذوق کی تسکین کی خاطر مشقت و محنت گوارا کرتے ہیں۔

ریاست رام پور روہیل کھنڈ (یو۔پی) کے علاقہ میں اپنے علم و کمال کے لحاظ سے ایک خطۂ مردم خیز تسلیم کیا جاتا ہے، جو سالہا سال سے فضل و کمال کا منبع رہا ہے۔ یہاں اسلامی تعلیمات اور علوم شرقیہ کی درسیات کے لئے مدرسۂ عالیہ، مدرسۂ قادریہ اور مطلع العلوم وہ ادارے ہیں جو عرصۂ دراز سے مرجعِ خلائق بنے ہوئے ہیں۔ اور جہاں دور دراز مقامات حتیٰ کہ بیرونی اسلامی ممالک سے طالبانِ علم آکر دینی و دنیوی علوم کی تحصیل کرتے ہیں۔ اس سرزمین نے متعدد اکابرینِ دین و ملت اور کاملینِ علم و فن کو جنم دیا اور ملک کے اکثر علماء و فضلاء اور مشاہیر ادباء و شعراء کا مسکن رہا ہے۔ ہندوستان کے بیشتر شعرائے متقدمین و متاخرین ہر دور میں دربارِ رام پور کی زینت بنے ہوئے تھے۔ اسی لئے سرکاری کتاب خانہ میں مطبوعہ و غیر مطبوعہ نادر کتب اور گرانمایہ نسخہ جات قدیم تصاویر اور خطاطی کے بے بہا نقوش محفوظ ہیں جن میں سے بیشتر کمیاب و نایاب نوادر کا درجہ رکھتے ہیں۔

جب عرشی صاحب نے مسٹر چیمبین کی نیابت میں اس کتاب خانہ کا جائزہ لیا اور اس کے ترتیب و نظام کا بہ غائر مطالعہ کیا تو ان کو اندازہ لگا کہ ان نادرات کے ذخائر بے ترتیب بد حالی میں پڑے سڑ رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے کئی سال کی شبانہ روز جانفشانی کے بعد ان کو درست و منظم کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ناظم اعلیٰ مسٹر چیمبین اپنے عہدہ سے سبکدوش ہو کر انگلستان روانہ ہوئے تو کتاب خانہ کی نظامت عرشی صاحب کے سپرد ہوئی۔ اور نواب صاحب کا کلی اعتماد ہونے کے بعد انہوں نے کتاب خانہ کی مکمل و مفصل فہرست مرتب کی۔ اور اس کی ایسی اصلاح و تنظیم کی کہ ملک کے اکثر مشاہیر علم و ادب نے اس کو ہندوستان کا بے نظیر ادارہ تسلیم کیا اور عرشی صاحب کی گرامی خدمات و اعلیٰ لیاقت کی قرار واقعی داد دی۔ اس مخزنِ علم و فن کی محافظت عرشی صاحب کا ایک ایسا عظیم کارنامہ ہے جس پر ہمیشہ فخر کیا جا سکتا ہے۔

اس تنظیم نے کتاب خانہ کے نادر جواہرات کو محفوظ کر دیا اور اس سلسلہ میں انہوں جو کاوش و محنت کی اور متعدد علمی ادبی کتابوں کا مسلسل مطالعہ کیا اس سے ان کے ذوق کی جلا بھی ہوئی۔ اس دوران میں ملک کے بیشتر شیدایانِ علم و ادب اور مشاہیر اس ادارہ سے استفادہ کرنے وہاں آئے عرشی صاحب کو ان سے ملنے، علمی مباحث میں حصہ لینے اور ان کے ساتھ ان کے ریسرچ کے کاموں میں شرکت و نگرانی کا بھی موقعہ ملا۔

بھائی عرشی کو خاص طور پر مذہب، تاریخ و تنقید ادب سے دلچسپی ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے اپنی دقتِ نظر اور تحقیق و تفحص سے جو تخلیقات پیش کی ہیں ان کا مرتبہ دنیائے ادب میں نہایت بلند ہے۔ مولانا عرشی کا تبحرِ علمی، ذوقِ تنقید اور نکتہ رسی و ژرف نگاہی مسلم ہے وہ ایک جید عالم اور اُردو فارسی اور عربی کے بلند پایہ نقاد ہیں۔ ان کی یہ مسلم الثبوت حیثیت کسی تبصرہ کی محتاج نہیں۔ ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ علم و ادب کے لئے وقف، اور کسی نہ کسی شعبہ کی تحقیق و جستجو میں گزرتا ہے۔

عرشی صاحب ذہنی اور جسمانی طور پر نہایت درجہ صحت مند اور عملی انسان ہیں۔ وہ اپنے فرائض و معاملات میں نہایت متین و سنجیدہ

ہیں۔ اور وہ احباب کے ساتھ بے تکلف بھی ہیں۔ وہ بے تکلف اصول کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے ہیں۔ یہ سلسلہ اور تعلق ہی کمال خلوص و محبت پر مبنی ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مشاغل کی اہم دلچسپیوں میں پھنس کر بھی اپنے مقررہ اصول پر سختی سے کاربند رہتے ہیں۔ اسی لئے پابندی وقت ان کی فطرت ثانیہ ہے۔ مادی ترغیب یا کوئی قوت ان کے عزائم و اصول میں تغیر یا اضمحلال نہیں پیدا کر سکتی۔

عرشی صاحب کی تحریر اور تقریر کا انداز تقریباً یکساں ہے۔ ان کا طرز بیان شستہ، سلیس اور شگفتہ ہے۔ رنگینی کا مظہر ہے۔ زبان و بیان میں بلا کی سلاست اور صفائی ہے۔ اور ایسی شگفتگی کہ سنجیدہ سے سنجیدہ موضوع بھی بہارستان نظر آتا ہے۔

وہ ایک خوش بیان مقرر بھی ہیں۔ اور طرز بیان کے مالک بلند پایہ انشا پرداز اور خوش فکر شاعر بھی۔ مگر حقیقتاً ان کی ذات میں تمام صفات میں نمایاں ہیں۔ پھر گفتار و کردار کی یکسانیت نے ان کو ایک ایسی امتیازی شان کا مالک بنا دیا ہے کہ جو بھی ان کے کلام پر ہر شخص ان کی شیریں و دلچسپ شخصیت کے تمام اوصاف سے بآسانی روشناس ہو جاتا ہے۔ اور ان کے دلکش کلام کی حلاوتوں سے بہرہ مند ہو کر طبیعت میں فرحت و انبساط محسوس کرنے لگتا ہے۔ اگر گفتگو علمی موضوع پر ہو تو معلوم ہوتا ہے کہ بحرِ علم سے سیراب ہو رہے ہیں۔ ہر شعبۂ شعر و ادب پر تو بارش و بہار کا احساس لے کر اٹھے۔ اور پھر اس ہمہ صفت موصوف انسان میں ان تمام کمالات کے باوجود عجب و تعلی کا قطعاً نام تک نہیں۔

ان کے حسین و متین چہرے پر ہر وقت بشاشت نظر آتی ہے۔ اور ان کو رنج و فکر میں بھی مسکراتے ہی دیکھا گیا ہے۔ علماء و فضلاء کی محفل میں عرشی ایک فاضل اجل ہوتے ہیں۔ سیاسی مذاکرات میں ایک باخبر مدبر۔ اور بزم احباب میں ان کی شگفتہ مزاجی و بذلہ سنجی کچھ اور ہی بہار دکھاتی ہے۔ خصوصاً بے تکلف دوستوں میں وہ گل رعنا بن جاتے ہیں۔ ان کی متانت و سنجیدگی میں بھی ایک کیف ہے۔ تاہم خشکی کا شائبہ تک نہیں۔ ان کی خشک رندی پر ہزار پارسائی قربان ہیں۔ مزاح میں متین شوخی اور سنجیدہ مزاح کی چاشنی ہے۔ بعض اوقات وہ مطائبات کے ایسے لطیف پہلو نکالتے ہیں کہ اعلیٰ سے اعلیٰ ظرافت سنجیدگی رہ جاتی ہے۔ بے ساختگی و بے تکلفی کا یہ عالم ہے کہ تحریر و تقریر میں کہیں بھی تکلف، تصنع یا آورد کا نام تک نہیں ہوتا۔ احباب کے رنج و خوشی میں اس طرح شریک نظر آتے ہیں جیسے اپنے گھر میں ہیں۔ دوستوں سے کہیں کسی حالت میں بھی ملاقات ہو بغلگیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور ہر موقع پر خوش طبعی سے نہیں چوکتے۔

ایک بار ۱۹۵۸ء میں عرشی صاحب میرے قیام لکھنؤ کے دوران میں وہاں علمی مصروفیت کے سلسلے میں تشریف لائے ہوئے تھے اور میرے پاس قیام پذیر رہے تھے۔ اسی عرصہ میں میرے ایک عزیز جنہوں نے پنجاب میں شادی کی تھی اور اپنی نئی دلہن کے ساتھ آئے تھے وہ بھی غریب خانہ پر مقیم تھے۔ میرے یہ عزیز عرشی صاحب کے بے تکلف دوست تھے۔ لیکن کسی وجہ سے عرشی صاحب کو ان کی شادی کی قبل سے اطلاع نہ تھی۔ جب عرشی صاحب کی ان سے ملاقات ہوئی اور شادی کا حال معلوم ہوا تو انہوں نے کہا ہم رسمِ مبارک باد کے قائل نہیں۔ اور شادی کی اس ازراہ کرم نے کے لئے نہیں تیار۔ یہ شادی پھر ہوگی اور ہمیں ہوگی۔ بجا دعا کو سلام عرض کہہ دو مزاج تو ظاہر ہے۔ آپ سے شادی کرنے کے بعد اس کا کیا پوچھنا!"

آخر ایک پُر تکلف دعوت کے ذریعہ میں نے شادی منانے کا انتظام کیا اور دعوت پھر منائی گئی۔ اور اس واقعہ سے پانچ سال قبل جبکہ میں دہلی میں مقیم تھا۔ میری شادی کے موقعہ پر دوسرے مخصوص احباب کو جو عرشی صاحب تھے دعوتی رقعے روانہ ہوئے ان میں جب عرشی صاحب کو یہ رقعہ پہنچا تو انہوں نے مجھ کو لکھا:

"بھائی! آپ کی شادی کی اطلاع ملی۔ آپ کی معقولیت کا خیال کرتا ہوں تو یقین نہیں آتا۔ لیکن مجبوری اپنے ابا آدم کی سنت کسی پر عمل کرکے آپ کو انسانیت کا جامہ اختیار کرنا ہی ہوگا۔ بہرحال سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود ہونا مبارک"! سوچتا ہوں آپ

بیچارے یہ انسان جب شادی کرے تو احباب کیا کریں گے؟

شادیوں کے اسی پُر لطف سلسلہ میں بھائی عرشی کی اپنی شادی بھی یاد آگئی - میری شادی سے کچھ عرصہ کے بعد ان کی شادی ہوئی - میں دہلی میں ہی تھا - میرے نام بجائے رقعہ کی بجائے ان کے قلم کی ایک تحریر موصول ہوئی - لکھا تھا

مبارک باد مرکب ز ہے عرشی

بھائی ــــ یہ سنگ ملانے آئیے - بھا میری کو بیگم عرشی کا سلام کہہ کر مژدہ دیجئے کہ آخر ایک دن وہ آئیں گی اور وہ سلام آپ کے سامنے ادا ہوگی - پھر کیوں یہ فریضہ پیشگی کیوں نہ ادا کروں - ہمیں بھی مرزا نوشہ کے "خار دو سو دو تہہ شدہ ملو دہ گا۔

اور تیغ بیتر اند رو رکھے"۔

عرشی کے ادبی لطائف اور علمی سطائبات بے شمار ہیں - لیکن اس مضمون میں ان کی ذات و صفات کا تذکرہ ہے - فضل و کمال پر تفصیلی تبصرہ نہیں - اس لئے میں دانستہ چند ذاتی لطائف کے ذکر پر اکتفا کروں گا - بزم احباب کے لطیفوں کا بھی اگر تفصیلی بیان کرنے لگوں تو اس مختصر مضمون میں گنجائش نہیں - ۱۹۳۳ء میں عرشی صاحب لاہور آئے ہوئے تھے - ان کے مخصوص احباب میں مولانا غلام نامر خاں نگار مرحوم سابق ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ سنٹرل ماڈل ہائی اسکول کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی - حسن اتفاق سے ولادت کے وقت عرشی صاحب غلام ناصر خاں صاحب کے مکان پر موجود تھے - لڑکی کی ولادت کی خبر سنتے ہی عرشی صاحب نے ان کو مبارک باد دی اور فرمایا -

"مٹھائی منگوائیے"

اسی دوران میں کسی عزیز نے کہا کہ "کسی مولوی کو بلایا جائے لڑکی کے کان میں اذان دی جائے گی"۔

عرشی نے مسکرا کر کہا "بھئی - ہم سے بڑا مولوی کون ہوگا" ہم خود اذان دیں گے" اور جھٹ اصرار سے بنتے ہوئے زنانہ میں پہنچے - اذان دی - اور باہر آکر مٹھائی کی مکرر فرمائش کی - اور بولے -

"اب تو میرے دو حصے ہو گئے - ایک بہ حیثیت مولوی اور ایک بچی کے چچا ہونے کا!

پھر لڑکی کا نام رکھنے کے ذکر پر فرمانے لگے -

"اس کی فیس علیحدہ لوں گا - آخر داڑھی کی لاج بھی تو رکھنا ہے"۔

عرشی صاحب کے عزیز ترین احباب میں مرزا ہادی علی بیگ واثق (جن کا نام پہلے آچکا ہے) کا نام خاص ہے - مولانا واثق تقریباً عرشی صاحب سے عمر میں بڑے ہیں - اور فضل و کمال میں خاص درجہ رکھتے ہیں - شاد انی برادری میں ہم سب احباب ان کو "ہادی بھائی" کہتے اور ان کا بہت احترام کرتے ہیں - اور یہ محترم بھائی ہم میں سے ہر ایک کو کبھی "میاں" کبھی "بھتیا" کہہ کر بڑی شفقت سے مخاطب کرتے ہیں -

"ہادی بھائی" بڑے پختہ عقائد کے شیر دل عالم فاضل بزرگ ہیں - کسی موضوع پر بحث ہو ان کے سامنے کسی کی مشکل ہی سے پیش چلتی ہے - اُردو زباندانی میں ان کو زندہ لغات کا درجہ حاصل ہے - عربی فارسی کے مستند فاضل ہیں - ساری عمر تحقیق علمی میں بسر کی - اور عروسِ علم کو گلے لگا کر تجرد کی زندگی گزار رہے ہیں - دوستوں کے جاں نثار ہمدرد اور دشمنوں کے جانی دشمن ان کے پُر خلوص کردار کی خاصیت ہے - عرشی صاحب مولانا کا بیحد احترام کرتے ہیں اور دونوں میں انتہائی خلوص و مودت کے تعلقات ہیں - وہ عرشی صاحب کو "عرشی" "شیاد" اور کبھی امتیاز علی خاں کہہ کر مخاطب کرتے ہیں - ان دونوں احباب کے درمیان جب کسی موضوع پر گفتگو چھڑ جائے تو کئی کئی گھنٹے

مسلسل بحث نا ممکن ہو جاتی ہے اور مزاج میں بیحد برہمی اور تلخی پیدا ہو جاتی ہے۔

اس بھائی ادا جعفری، فرزند حجابت اور عرشی صاحب کی دونوں میں بہت شگفتہ بحثیں ہوئیں۔ بحث میں کئی ایسے موڑ آتے تھے جہاں اس بھائی عرشی صاحب سے رد و قدح اور بحث میں لگے رہتے، اور عرشی صاحب کو اصل موضوع کی اہمیت برقرار رکھتے ہوئے اس کو ختم کرنا پڑتا ہے۔ کبھی بحث شکست پر، دونوں میں سے کوئی بھی آمادہ نہیں ہوتا۔ عرشی صاحب کے نئے محترم بھائی کے بگڑنے کا موقعہ خدا نخواستہ کبھی ہوتا ہے۔ لیکن اکثر نوبت یہ انجام بخیر ہوا کرتا ہے۔ کبھی ادیب بھائی عرشی صاحب کی ذہنی اور علمی نکات سے متاثر ہو کر ان کو بے اختیار گلے لگا لیتے ہیں۔ اس وقت ادیب بھائی اپنے شکست پر شرمندہ ہو کر بحث دوسرے دن نہیں چھیڑتے بلکہ عرشی صاحب کے تبحر علمی کو تسلیم کر کے علم پرور تشنگی میں مصروف ہو گئے ہیں۔ عالمانہ فتح و شکست اور مصالحانہ بعد از بحث تعلق نہایت پُر کیف اور دیدنی ہوتا ہے۔

غرضیکہ عرشی صاحب کا مخلص ترین دوست اور شدید ترین مخالف۔ بڑے سے بڑا عالم اور بڑے سے بڑا ادیب ان کی علمی فضیلت اور دقیق و عمیق فکر کا قائل نظر آتا ہے۔ دوستوں کو ان کی ذات و صفات پر ناز ہے اور مخالف ان کا لوہا ماننے پر مجبور ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بے لوث اور بے غرض ایثار و خلوص کا مجسمہ احباب کا مونس و غمخوار اور دل آزردوں کے حق میں بے آزار ہستی کا حکم رکھتا ہے۔

ایک محترم عزیز دوست کی حیثیت سے مجھے ان کے اخلاص و محبت پر فخر و مسرت ہے اور یہ امر میرے لئے باعث ناز ہے کہ میں نے جب کبھی ان سے اپنے رسالہ نیرنگستان (دہلی) اور بعض احباب کے لئے مضمون کی فرمائش کی تو انہوں نے محروم نہ رکھا۔ اور ان کا ارشاد ہے کہ "تمہارا اصرار میری کم قلمی پر سدا غالب آتا ہے"۔

لیکن جس زمانہ میں (۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک) میں آل انڈیا ریڈیو میں پروگرام ڈائرکٹر تھا اور لکھنؤ اسٹیشن پر متعین رہا۔ عرشی صاحب سے بارہا تقاضہ و اصرار کرتا رہا کہ ریڈیو اسٹیشن سے کسی علمی ادبی موضوع پر تقریر نشر کریں مگر انہوں نے ہمیشہ کتب خانہ کی مصروفیت کا عذر پیش کر کے مجھے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔ آخر میرا اصرار حد سے متجاوز دیکھ کر انہوں نے دوران ملاقات میں مجھے اس ٹال مٹول کی وجہ صاف طور پر بتا دی۔ انہوں نے فرمایا۔

"بھائی۔ بات یہ ہے کہ آپ اس محکمہ کے با اختیار رکن ہیں۔ اور میرے عزیز دوست۔ اس کا علم اکثر احباب کو ہوگا۔ میں آپ کے اصرار سے مجبور ہو کر چند بار تقریر نشر کروں گا۔ لوگوں میں یہ چرچا ہونے لگے گا کہ میں آپ کی دوستی سے فائدہ اٹھا کر ریڈیو کو اپنی شہرت کا آلۂ کار بنا رہا ہوں، میرے انکار اور آپ کے اصرار سے کون خبردار ہے۔ آپ پر خواہ مخواہ دوست نوازی کا الزام آئے گا اور میرا ضمیر مطمئن نہ ہوگا"۔

اس سے عرشی صاحب کے عقائد کی پختگی اور قناعت پر بڑی روشنی پڑتی ہے۔ اس سلسلہ میں جب میری کوئی بحث و تکرار کارگر نہ ہو سکی مجھے بیحد مایوسی ہوئی۔ اکثر ارباب ذوق جو عرشی صاحب کے مداحوں و معتقدوں میں سے تھے ان کے سامنے بھی مجھ کو خفت محسوس ہوتی۔ وہ طعنے دے دے کر مجھ کو زندہ رہتے کہ مولانا عرشی سے آپ کے ایسے یگانگت کے مراسم ہیں اور آپ کا ریڈیو اسٹیشن ان کی تقریروں سے محروم ہے۔

مجھے اپنی ناکامی کے احساس نے ستانا شروع کیا۔ آخر میں نے ان کی بلا اطلاع "یوم غالب" پر ان کی تقریر پروگرام میں شامل کر دی۔ اور مقررہ تاریخ سے چند روز قبل خود رامپور گیا۔ اور محض تفریح کی خاطر ان سے لکھنؤ اپنے ساتھ چلنے کے لئے اصرار کیا۔ وہ میری اس فرمائش کو نہ ٹال سکے اور لکھنؤ پہنچ کر میں نے مطبوعہ پروگرام ان کے سامنے پیش کر کے کنٹریکٹ پر دستخط کرنے اور تقریر لکھنے کی درخواست پیش کر دی۔

عرشی صاحب یہاں تھے اور جب میں نے ان سے کہا کہ اگر آپ میری اس درخواست پر اظہار کریں گے [illegible] ریڈیو اسٹیشن کی پابندی تمام (جو پیسے پہ ہے) معروض خوش ہوگی۔ آخر عرشی صاحب نے مسکرا کر قلم اٹھایا [illegible] پر دستخط کئے اور تقریر لکھنے کی فکر کرنے لگے۔ چنانچہ انہوں نے مختصر مدت میں معرکہ کی تقریر لکھی اور نشر کی۔ جو بہت مقبول ہوئی اور بہت بے شمار تعریفی خطوط موصول ہوئے۔ میں نے اس کامیابی پر بصد شکریہ ان کی خدمت میں عرض کیا ؎

اے عرشی کرا اتجار کے کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

ہنس کر فرمایا "خدا خدا کرو بھائی۔ میں اس لائق کہاں!"۔ اس کے بعد چند بار اور بھی انہوں نے میرے تقاضے پر بہ بہ ہر کر ریڈیو اسٹیشن پر لطف فرمایا۔ اور میں ہمیشہ اُن کو اس حیلے سے منا لایا کہ "بر سبیل تقریر چند روز کے لئے آپ لکھنؤ تشریف لے آتے ہیں اور ملاقات کا لطف نصیب ہو جاتا ہے"۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے عرشی صاحب عاجزی کش طبع قانع اور کم آمیز بندگی ہیں۔ لیکن ارباب علم و ادب سے ان کے مراسم ایک حد تک قربت و یگانگت کے ہیں۔ اور گو وہ طبعاً شہرت پسندی سے محترز رہتے ہیں لیکن ہندوستان و پاکستان کے علاوہ تقریباً تمام بیرونی اسلامی ممالک میں ان کی علمی و ادبی تحقیقات اور مستند فاضل شخصیت کو بڑے احترام و وقعت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔

آخر میں یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مولانا عرشی کی ہمہ گیر شخصیت پر یہ ماحصل مقالہ کچھ بہت بس کی بات نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عرشی کی شخصیت میں ایسا تنوع اور خلوص و صداقت ہے کہ ان کے علمی ادبی کارناموں کے مطالعہ ہی سے ارباب علم و ادب ان کی محبت سے غائبانہ طور پر روشناس ہو جاتے ہیں۔ اور اس پیارے انسان کی پیاری علمیت و شخصیت سے والہانہ پیار کرنے لگتے ہیں۔ یہ مختصر مقالہ بھائی عرشی کے عالمانہ خلوص و محبت کی قدر کر کے میں وہی مسرت محسوس کر رہا ہوں جو ان سے گلے مل کر ہوتی ہے۔

سید امتیاز علی تاج

شوکت تھانوی

"بچا چھکن نے تصویر ٹانگی" تھا وہ مضمون جسے پڑھ کر سید امتیاز علی تاج ذہن میں کچھ اس طرح جم سے گئے جیسے کوئی کسی کو ہنسا ہنسا کر بے دم کر جائے جس سے وہ بچپن میں کھیلا کرتا تھا۔ اور کچھ ایسا محسوس ہوا کہ گویا کہیں کا کوئی بچھڑا ہوا عزیز مل گیا ہو۔ ملاقات تو سید امتیاز علی تاج سے نہ ہوئی تھی مگر ان کے اخبار "پھول" ہی سے وہ اصل میں نے اردو سیکھی تھی۔ یہی پہلا اخبار تھا جو باقاعدہ میرے نام آتا تھا اور یہی اخبار تھا جس میں میرے بڑے بھائی ارشد تھانوی صاحب میرے نام سے کہانیاں لکھ لکھ کر چھپوایا کرتے تھے حالانکہ میں اس وقت شوکت تھانوی نہیں صرف محمد عمر تھا۔

بچا چھکن کے سلسلۂ مضامین کو بڑی یگانگت کے ساتھ پڑھتا رہا۔ پھر سید امتیاز علی تاج کا ڈرامہ "انارکلی" کی صورت میں نظر سے گزرا اور دل میں ایک بے ساختہ ارمان پیدا کر گیا کہ کاش میں ان سے کبھی مل سکتا۔

۱۹۲۵ء میں پہلی مرتبہ لاہور آنا ہوا۔ لاہور میں میرے لئے جو کشش تھی وہ علامہ اقبال، مرحوم سالک اور امتیاز علی تاج کی تھی یعنی جہانگیر کے مقبرے اور شالامار باغ سے بھی زیادہ کشش جس کا ثبوت یہ ہے کہ اس سفر میں نہ جہانگیر کا مقبرہ دیکھنے گیا نہ شالامار کی سیر کی البتہ علامہ اقبال، مرحوم سالک اور امتیاز علی تاج سے نہایت بے تابی کے ساتھ ملنے کے لئے پہنچ گیا۔

ریلوے روڈ پر دارالاشاعت میں سید امتیاز علی تاج کو ایک بانکے سجیلے جوان رعنا کی صورت میں میں نے دیکھا۔ خوبصورت پنڈلیوں پر چپکا ہوا چوڑی دار پاجامہ، پیروں میں سلیم شاہی جوتا، کلاؤ کے کام کا کرتا پہنے، سنہری کمانی کی عینک لگائے آپ اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ مولانا حسرت مرحوم بھی اس وقت آپ کے پاس ہی موجود تھے۔ یہ ملاقات اس قدر رسمی اور واجبی سی ثابت ہوئی کہ آج تک مجھے اس بے پروائی پر شرم آتی ہے کہ ان سے مل گئے مگر اپنا تعارف ان سے نہ کرا سکے اور تعارف کراتے بھی کیا۔ تھے ہی کس کھیت کی مولی۔

تفصیلی ملاقات پھر ۱۹۳۴ء میں ہوئی جب سیٹھ دلسکھ پنچولی کے بلاوے پر لاہور آنا پڑا۔ تاج صاحب اس زمانے میں بہاولپور روڈ پر رہتے تھے۔ کوٹھی کے برآمدے میں پہنچتے ہی ایک نہایت اشرف المخلوقات قسم کے طوطے کا عظیم الشان پنجرہ نظر آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے انواع واقسام

کہ فضا میں ہماری سیری کلبلی کرتی ہوئی نظر آئیں مگر اس سے قبل کہ اس کرشمے کو ذرہ بھر کرید کرتا خود تاج صاحب باد صبا سے اُڑنے کی غیبگ موسم میں سے گئے تو بھی بی جماعتوں کی حالت کا طلوع فضل ہوں کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور پیل کے جنگلوں اور مدارس کی وہ کثرت تھی کہ کوئی اگر ایک سے نیچے تو دوسرا سر پر حشر تک مزید مارے گا۔ نارنجی رنگ کا یہ ٹھنڈا موسم جس کی ہر چیز نارنجی تھی کچھ عجیب رومانی فضا پیدا کر رہا تھا۔ وہ بھی میرے لئے یہ پہلا گھر تھا جس میں مجھ کو صحیح قسم کے پان کھانے کو ملے اور یہ دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا کہ خود تاج صاحب بڑے سلیقے سے پان کھاتے ہیں۔ بڑی تفصیلی باتیں ہوئیں۔ ملاقاتوں کا بھی ایک سلسلہ قائم ہو گیا کبھی جنرل کے اسٹینڈ میں ملاقات ہوتی تو کبھی ریڈیو اسٹیشن پر مگر پھر بھی تک ایک خاص فاصلہ درمیان تھا اور ۱۹۴۷ء تک یہ فاصلہ اسی طرح قائم رہا۔

قیامِ پاکستان کے بعد تاج صاحب کی تجویز پر ریڈیو پاکستان نے ایک تعمیری پروگرام "پاکستان ہمارا ہے" کے نام سے شروع کیا۔ میں تو ریڈیو میں تھا ہی اب تاج صاحب بھی آ گئے اور شروع کر دیا یہ پروگرام۔ یوں تو خیر اس وقت "جوشِ عمل" ہر شعبہ اور ہر گوشے سے بے پناہ مظاہرہ ہو رہا تھا مگر ہم لوگوں نے تو واقعی یہ سمجھ رکھا تھا کہ پاکستان گویا ہم ہی دونوں کو بنانا ہے صبح سے شام تک وہ جنون انگیز مصروفیت کر دکھانے کا ہوش نہ پینے کا بس عالم یہ تھا کہ ؎

منبر پہ چل رہی ہے پن چکی — اس کی پوسٹ ہے کام کی چکی

منبر کی ایک طرف میں ہوں دوسری طرف تاج صاحب وہ بھی لکھ رہے ہیں اور میں بھی پروگرام ایک ہی ہے مگر دونوں مل کر اس طرح لکھتے ہیں کہ نہ وہ تھکتے ہیں نہ میں تھکتا ہوں کہ یکایک تاج صاحب نے لکھتے لکھتے کہا "یار علامہ اب یہاں ہونا چاہیئے ایک نظم لحافوں کے متعلق"

جی ہاں اس قرب نے اب یہ تعلقات پیدا کر دیئے تھے کہ تاج صاحب نے مجھ کو علامہ کہنا شروع کر دیا تھا۔ خیر علامہ تک بھی غنیمت تھا مگر خدا اس "یار علامہ" کی ترکیب ملاحظہ فرمائیے ـــ ہاں تو کہنے لگے "یار علامہ اب یہاں ہونا چاہیئے ایک نظم لحافوں کے متعلق"

اب بتائیے لحاف کے متعلق نظم کہاں سے لائی جائے۔ نہ اقبال نے لحاف کو کبھی موضوعِ سخن بنایا نہ مولانا ظفر علی خاں نے مگر تاج صاحب ہیں کہ لحاف پر نظم ضرور چاہتے ہیں۔ آخر عاجز آ کر عرض کیا:

"تاج صاحب لحاف پر تو مشکل ہی سے اساتذہ میں سے کسی نے نظم کہی ہوگی"

بڑے اطمینان سے بولے "تو کہہ ڈالو نہ علامہ آٹھ دس شعر لحاف نہ سہی کمبل سہی"

پھر مصیبت یہ کہ نظم بھی وہ ایسی نہ چاہتے تھے کہ ؎

رب کا شکر ادا کر صاف — جس نے بنایا تیرا لحاف

بلکہ مقصد یہ تھا کہ سردی میں اکڑنے والے مہاجرین کا وہ دلدوز مرقع اس نظم میں پیش کیا جائے کہ سننے والوں کے بستر ہی کانٹے بچھ جائیں اور وہ اپنے گدے گدے بستر چھوڑ کر کھلے آسمان کے نیچے سرد راتیں گزارنے والے مہاجرین کے لئے اوڑھنا بچھونا لے کر دوڑ پڑیں۔ چنانچہ شروع کی یہ نظم کچھ اس طرح کہ ؎

کانپتے تارے لرزتی چاندنی سکڑی فضا — برف کی پیغامبر تھی رات ہر موجِ ہوا
آتشِ سیال کر تھا بے کسی کا اعتراف — آگ خود ہی سو رہی تھی راکھ کا اوڑھے لحاف

اور ختم یہ نظم اس طرح ہوئی کہ جب میں کمبل تقسیم کرنے ایک مہاجر خاتون کے پاس پہنچا پہلے جو گود میں بچہ لئے بت بنی بیٹھی تھی تو اس کا عالم یہ تھا ؎

گود میں بچہ تھا اس کے پھر بھی وہ بے آس تھی — اس کو تو معلوم ہونا تھا کہ دولت پاس تھی
لیکن اس کو دیکھ کر کمبل جو کھینچی آہِ سرد — اس میں مایوسی تھی اس میں بیکسی تھی اس میں درد

مفت کی کمائی نے جب بھی کہا   آپ اب منہ پر کہیں عیب پڑ گیا
جانے یہ کیسی تو اب بیکار ہے   یہ اکیلی کی جگہ میں کیسی مدد ہے

احباب مجھات کرتے ہیں کہ وہ پروگرام چلتا تھا جب تو پروگرام ختم ہونے کے بعد اس کی ہم لوگ ریڈیو اسٹیشن سے معلوم کرتے رہتے تھے اللہ اور کبھی سے جواب ایک ڈاک ریڈیو اسٹیشن پہنچ گیا۔ جس کو ہم لوگوں نے کہ آپ کی طرف سے کیا سمجھیں یہ معلومات کا اندازہ تھا یہ جو ش کی خاطر اس پروگرام کے متعلق باتیں کرتے تھے جس نے اپنی پروگرام تاج صاحب کا اسی کام سے کہ نیاز ی پاکستان سے جو شہر پہلا چلا کہ جیسے وہ صرف پاکستان کی خدمت نہیں کرتا ہے بلکہ تمام انسانیت کی خدمت کر رہا ہے۔

اس ذکر کی تفصیل میں جانے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ تاج صاحب کی محنت کوشی کے سبب خدا اس کا معاملہ بھی محفوظ فرمائے جس کے بعد جاری ہے جیک کیا کرتے ہیں۔ تاج صاحب اس کا جواب سے زیادہ لکھنا ہے اور اسی سے ہر لکھنے کا دستور ہے جو مقررہ تاریخ سے ایک ہفتہ قبل سے میں بعد ان کو ٹیلیفون کر دیا کرتا ہوں اور جواب میں ہمیشہ جواب ملتا ہے "ارے وہ تو میں کب کا کسی منزل پر ہے اور کیا ہوگا" یہاں تک کہ آخری کال دو تین ہونے والی ہے اور مسودہ آنے کا موسم ہی جوں کا توں ان کا رکھی کی طرف ہے اور پھر پاکستان کا صاحب کو جگہ جیسے پیسہ خواب بھی ڈر اشتاق پڑا۔ جمائیاں اور انگڑائیاں لیتے آتے اور ہی آگئے۔ ہوئے ہیں کے ذہن میں تحفظ دیں گے ساتھ چہرے سے یہ دولت پیسہ کا مطالبہ منشاؤں کے ترس والے تقاضے کی طرح شروع کر دیا" تاج صاحب اب اس کا بیان نہیں کریں گے۔ اب بہرحال ہوگا کب وہ پیش ہوگا۔

میرا اضطراب دیکھئے اور آپ کا یہ اطمینان کہ عینک آنکھوں سے اتار رکھتے پر سکون آنکھوں کو ملا اور بہ نہایت سنجیدگی سے فرمایا "یار علامہ میں نے کئی مرتبہ لکھنے کا ارادہ کیا۔ کچھ نوٹس بھی تیار کئے۔ مگر کچھ موڈ پیدا نہ ہو سکا۔ کوئی ڈھب پیدا نہ ہوا۔ ادھر جو اوپر خیالات آئے اور وہ بھی اوپر غائب ہو گئے۔ یار چھوڑو بھی اس ذکر کو۔ بات کرو۔"

اور جب انہوں نے دیکھا کہ یہاں بات کے بجائے ہر لکھنے کا ارادہ بہر حال ہے اور آئندہ کی اس سطح پہنچ چکی ہے کہ رو دینے کو جی چاہ رہا ہے تو ایک دم یہ جمائیاں بھی ختم اور انگڑائیاں بھی غائب اور ایک دم کمر باندھ کر تیار بھی ہو گئے۔

"تو یار علامہ مر اکیوں جاتا ہے لکھے دیتے ہیں نا۔ چار بجے مسودہ منگا لینا۔"

اور پھر ٹھیک چار بجے ٹیلیفون آگیا کہ مسودہ منگا لو۔

تاج صاحب کی یہ کیفیت اور کیفیات کا یہ تضاد ان کی زندگی کا ایک عام خاصہ کہنے لگے: "یار علامہ یہ علمی مشاغل واہیات اس تضیع اوقات کے بجائے اگر اپنا ہی کام دیکھیں تو بیڑہ پار ہو جائے۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ بس یہ دھندا ختم۔"

میں یہ سن کر آگیا اور اتنی ہی دیر میں نہ جانے کس کس سے کہہ بھی دیا کہ تاج صاحب علمی مشاغل سے کنارہ کش ہو گئے ہیں کہ اتنی ہی دیر میں ٹیلیفون چلا آتا ہے: "یار علامہ یہ کیا واہیات ہے کہ ہر وقت دفتر میں بیٹھے رہتے ہو۔ فوراً نہیں جاتے:"

پوچھا: "خیریت؟"

معلوم ہوا کہ کسی پروڈیوسر نے کچھ ایسے اخلاق دباؤ ڈالے کہ پھر کہانی دینے کو تیار ہو گئے اور یہ بھی نہیں معاوضے کی معقولیت نے ارادہ بدلنے پر مجبور کیا ہو۔ جی نہیں صرف چند جذباتی باتیں کچھ ملکی اور قومی قسم کی اپیل کہ پاکستان کی تمام انڈسٹری منجدھار میں ہے اور اس ظلم سے یہ ڈوبتی ناؤ پار ہو جائے گی وغیرہ وغیرہ بس تاج صاحب پھر پگھل گئے۔ حالانکہ اگر یہی بات ان سے کہہ دی جائے تو صاف مگر جائیں گے کہ "یار علامہ عجیب نسخہ ہے تو بھی میں اب ایسا بھی موم کی ناک نہیں ہوں۔" حالانکہ موم کی ناک ہی کیا سرتا بقدم موم کے ہیں۔

میں نے اپریل ۱۹۴۳ء میں اپنی کتاب شیش محل میں تاج صاحب کے متعلق جس قدر خطبات لکھی ہے کہ "خاص تجارتی آدمی ہیں گو صورت

ہے بالکل معاملہ کار نظر نہیں آتے تھے ممکن صاحب بھی اس سے بڑا اہتمام ہو سکتا نہیں ہو سکتا کہ سار قبلہ آدمی بہت ...
اب خود تاج صاحب اس بات کا اظہار کرتے ہیں وہ کہا جاتے ہیں مگر میں یہ ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ وہ تجارتی آدمی کسی ...
کے معاملات میں ان کی طرح شرمانے والا کیونکر تجارتی آدمی ہو سکتا ہے۔ یہ معاملات ان کی طرف سے اکثر بہر طور ...
آدمی تو نہیں ہوا۔

تاج صاحب میں ممکن ہے کچھ خامیاں بھی ہوں مگر ان کی ایک خوبی نے کم علم بے اعتنائی کو چھپا دیا ہے کہ وہ آدمی ...
ہیں۔ ڈرامہ ان کا فن ہے۔ مکالمہ نویسی میں ان کی عظمت کا اعتراف کرنا ضروری ہے مگر آج بھی وہ کسی مبتدی سے کسی آنے گئے سے مطلب یا کسی
سے بھی اپنے اسی فن کے سلسلے میں کوئی مشورہ لیتے کبھی نہیں جھجکتے اور اگر کسی نے ایسا مشورہ دے دیا جو ان کے دل نے قبول کر لیا تو داد
دینے میں بھی دیر نہیں کرتے "ہاں اب بات بن گئی یار آدمی ہو نا خیر سے"

اسی کے ساتھ وہ خطرناک حد تک اس شخص کے لئے گرد گھپٹ بھی بن جاتے ہیں جو غیر ضروری طور پر ان کے سامنے بننے کی کوشش کرے جیسے
بڑے بت وہ گرا چکے ہیں اور چھپتے ہوئے ایک آدھ فقرے سے رخود غلط قسم کے لوگوں کی ایسی قلعی کھول دی ہے کہ وہ ان کی چشم مروت ڈھونڈتے ہیں۔

گھر میں ان کی حیثیت ایک دوست باپ۔ ایک مہذب شوہر اور ایک فراخ دل آقا کی ہونے کے علاوہ ایک معصوم بچے کی سی ہے جو اس
بھاگ دوڑ پر پرہیزی بھی کر سکتا ہے۔ اور پھر نہایت بھولپن سے اس کا اعتراف بھی کر لیتا ہے۔ مثلاً چوٹ لگ گئی ہے اور ڈاکٹر نے ... بلڈ پریشر کا شاخسانہ
ہے چنانچہ تمباکو قطعاً بند نہ پان میں کھا سکتے ہیں نہ سگریٹ کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں اور کل ہی کی بات ہے تاج صاحب نے واقعی وہ پان بھی چھوڑ دیا جو ان
زندگی کی واحد عیاشی تھا میں اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ تمباکو چھوڑنے کے بعد پانوں کے سلسلے میں تقدیر پھوٹ جانے والی بات
نہیں کر سکتا۔ خیر میں تو یوں بھی پرہیز ہوں اور بڑی گھٹیا قسم کی بیڑیاں گزرتا ہوں مثلاً گلے میں درد تھا ڈاکٹر نے بولنے کی قطعی ممانعت کر دی
اور کاغذ پنسل سرہانے رکھ دیا کہ لکھ کر بات کیا کرو۔ چنانچہ میں باتیں تو لکھ لکھ کر کرتا رہا مگر جب تنہائی ملتی تھی تو تھوڑا بہت گا لیا کرتا تھا۔

تاج صاحب نے شروع شروع میں تو بڑی پابندی سے پرہیز کیا پان واقعی نہیں کھایا مگر جب ان کو حقہ پینے کی اجازت مل گئی تو چپکے چپکے سگریٹ
بھی پینے لگے اور بیگم حجاب امتیاز نے مورد الزام ان کو نہیں بلکہ اُن کو قرار دیا جو اُن کو سگریٹ پلا دیتے ہیں۔ میں نے اب تک سنجیدگی سے پان یا پان
کے خشک مسالے کی دعوت نہیں دی ہے ورنہ شاید میں ان کو اپنے اعتماد میں لے کر اور راز داری کا وعدہ لے کے تمباکو بھی کھلا دیتا اور وہ میری دوستی
کے بے انتہا قائل بھی ہو جاتے۔

تاج صاحب مدت سے لکھ رہے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے اُن کا قلم ابھی بوڑھا نہیں ہوا ہے مگر علمی سرگرمیوں نے انارکلی کے خالق سے
کوئی ایسی ہی تخلیق اب تک ممکن نہ ہونے دی۔ وہ کہتے ہیں کہ یار علامہ یہ علمی مشاغل واہیات ہیں مگر مصیبت یہ ہے کہ اب یہ کمبل نہیں چھوڑتا۔
حال ہی میں آپ ایک نئے عزم کے ساتھ اپنے دار الاشاعت کی طرف متوجہ ہوئے ہیں اور اس توجہ کے کئی شاندار ثبوت بھی پیش کر چکے
ہیں۔ سلیقہ۔ محنت اور انہماک کی اب بھی کمی نہیں مگر خدا کرے کوئی فلم پروڈیوسر پھر نہ آ جائے۔

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

محمود نظامی

تبسّم پروفیسر صوفی غلام مصطفیٰ کا نام اور تخلص ہی نہیں، ضمیر بھی ہے فطرت بھی ہے اور عادت بھی۔ لیکن اگر پروفیسر تبسّم صوفی بھی کہلاتے ہیں تو یہ فقرہ ایک ذی روح طنز ہے کیونکہ جو لوگ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کو پوری طرح نہیں جانتے انہیں ان پوشیدہ دنوں پر بعض حکایات گھڑنے کا بھی گمان ہو سکتا ہے۔

میرے ان شفیق اُستادوں میں، جنہوں نے پچھلے تیس برس کے عرصے میں مجھے سلیقے سے پڑھانے کی ایک مسلسل کوشش جاری رکھی ہے صوفی غلام مصطفیٰ تبسّم ایک ایسے بزرگ ہیں جن کی شخصیت کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ جو کچھ نظر آتے ہیں وہ دراصل بھی ہیں یا نہیں اور وہ جو کچھ دراصل ہیں وہ نظر بھی آتے ہیں یا نہیں۔ میں نے جب انہیں پہلے پہل دیکھا تھا تو میں خود کسی قسم کے ابہام میں گرفتار ہو گیا تھا۔ یہ انیس سال ایک کی بات ہے میں اسلامیہ کالج لاہور میں فرسٹ ایئر میں پڑھتا تھا۔ ایک شام میں اور میرے چند ہم جماعت اپنے اُستاد ڈاکٹر تاثیر کے ہاں بھوڑے سعد والی حویلی میں بیٹھے کسی درسی مسئلے پر ان کے خیالات سن رہے تھے کہ اچانک ایک چھوٹے قد کے گٹھے گٹھے بدن گول مٹول اپنے حلیے کے اعتبار سے اچھے کھلاڑیوں کے نمائندے معلوم ہوتے تھے کمرے میں وارد ہوئے ان کے آتے ہی تاثیر کا چہرہ یوں کھل گیا گویا انہیں کوئی نعمت ہاتھ آگئی ہے۔ "اوہو! آئیے صوفی صاحب" کا فقرہ ادا کرتے ہی درس و تدریس کے مسئلے کو بھول کر زوردار و پرمغز فقرہ بازیوں، پھبتیوں اور طرح طرح کے مزاحیہ کلمات کے ساتھ پل پڑے۔ ان میں سے اکثر فقروں میں بڑے خوفناک قسم کے ذم کا پہلو نکلتا تھا جس سے صوفی صاحب کی ذات کے بارے میں کوئی شریفانہ یا معقول رائے قائم کرنا حد سے مشکل تھا۔ لیکن مجھے یاد ہے صوفی صاحب نہایت متانت اور سکونِ قلب سے تاثیر کے ان فقروں کے چپ چاپ لطف لیتے رہے۔ کبھی کبھی وہ کنکھیوں سے تاثیر کے شاگردوں کو ایک نظر دیکھ لیتے غالباً اس خیال سے کہ ان برخورداروں کی موجودگی میں اب کوئی جواب دیں یا نہ۔ لیکن جب تاثیر کی "خوش کلامی" بہت ہی طوالت اختیار کر گئی تو صوفی صاحب نے میز پر رکھی ہوئی پلیٹ میں سے پان اٹھایا اور اسے چباتے ہوئے ایک ہی مرتبہ جو تاثیر پر ایک فقرہ چست کیا۔ تو طلبہ کی ساری مجلس اپنے اُستاد کے ادب کے باوجود ہنستے ہنستے بے حال ہو گئی۔

[illegible] اور پہلی مرتبہ تبسم کی طبیعت کے کئی ایسے پہلو کھلے جو آج بھی ان کی شخصیت اور ان کی [illegible] کا سکون اور ٹھہراؤ، سوچ کی پختگی، ان کا خلوص اور ان کی شفقت، ہم عصروں کا لحاظ، بزرگوں کا احترام [illegible] دیکھی تھیں آج تیس برس گزر جانے پر بھی میں انہیں جوں کا توں دیکھتا ہوں۔ اس پہلی ملاقات میں بھی خاص بات [illegible] کہ اپنی تمام قابلیت کے باوجود تبسم نے کسی پر اپنے تبحر علمی کا رعب ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ آج بھی ان کی یہی صفت ہے اور [illegible] کے بعد جب بھی مجھ جیسے کسی نااہل شاگرد سے ملتے ہیں تو ان کی سعی یہ ہوتی ہے کہ نہ صرف اسے ان کی ذاتی قابلیت کا احساس نہ ہونے پا جائے بلکہ اس پر اپنی قابلیت اور علم کا رعب بھی کسی حد پر نہ آنے پائے۔

لیکن اس پہلی ملاقات میں مجھے صوفی صاحب کی ادبی شخصیت کا کوئی زیادہ علم نہ ہو سکا تھا کیونکہ یہ مجلس زیادہ تر پُرخلوص قہقہوں اور [illegible] کی معمور رہی البتہ اتنا ضرور پتہ چلا کہ صوفی صاحب ٹریننگ کالج سے تبادلے پر گورنمنٹ کالج میں آ گئے ہیں، اور پھر آہستہ آہستہ صوفی صاحب کی ادبی عظمت کا حال ہم متعلمین پر کھلنے لگا۔ چند ہفتے بعد ایک دن تاثیر نے کہا آج صوفی کے ہاں قرہ بونے کا دن ہے۔ شب دیگ اور [illegible] ہے۔ کون کون آئے گا میرے ساتھ۔ صلائے عام دیکھ کر ہم میں سے کئی لوگ ہاتھ مارنے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ اور فوراً ایک مختصر سا قافلہ باوروں سے تانگوں میں سوار ہو کر حضرت داتا گنج بخش کے عقب میں ذیلدار روڈ کی ایک گلی کے دہانے پر جا پہنچا۔

کھانے کے بعد شکیو چائے کا دور چل رہا تھا کہ حضرت ابوالاثر حفیظ جالندھری اپنی ایک غزل کا ایک مصرع گنگنانے لگے اور پھر احباب کی فرمائش یا اصرار کا انتظار کئے بغیر انہوں نے اپنی غزل سنانا شروع کر دی۔ جملہ حاضرین ہمہ تن گوش ہو گئے۔ اور ان کے کلام کا لطف لینے کے لئے آگے کو ان کی طرف سرک گئے لیکن اس دوران میں یہ بات ہم طلبہ کے لئے اچنبھے کا موجب بنی رہی کہ اپنا کلام سنانے کے دوران میں حفیظ کا سلسلہ سخن بیشتر صوفی تبسم ہی کی طرف رہا اور وہ [illegible] کو مخاطب کر کے شعر پڑھتے رہے اور پھر خود تبسم کی باری آ گئی۔ انہوں نے اپنا کلام سنایا جس پر تاثیر اور حفیظ نے خوب دل کھول کر داد دی۔ لیکن انہوں نے جو کچھ بھی سنایا وہ صرف فارسی ہی میں تھا اور پھر مدت تک ہم نے صوفی صاحب کا جو بھی کلام سنا یا پڑھا فارسی ہی میں تھا۔ یہ بات کئی برس بعد معلوم ہوئی کہ صوفی صاحب کی طبیعت فارسی سے اکتا کر اب اِدھر اُدھر ہر طرف میدان ڈھونڈ رہی ہے۔

چنانچہ اگر آج آپ صوفی صاحب کے بارے میں یہ بات وثوق سے کہہ دیں کہ وہ ایک ہمہ گیر شاعر ہیں تو وہ صاف مکر جائیں گے کہ میں ہمہ گیر تو نہیں ہوں مگر اسپھد ضرور ہوں۔ آپ بحیثیت ایک پنجابی شاعر کے ان کے فن کو سراہنا شروع کریں تو وہ اپنا فارسی کلام سنا کر آپ کو سوالیہ نشان بنا دیں گے۔ آپ اب ان کی فارسی شاعری پر روشنی ڈالنے لگیں گے تو وہ اُردو کی غزل سنا کر آپ کو ایک مرتبہ پھر چکرا دیں گے آپ گھبرا کر جب یہ فیصلہ کریں کہ وہ اُردو پنجابی اور فارسی تینوں زبانوں کے نہایت بالغ نظر شاعر ہیں تو وہ اپنے کلام کا مجموعہ سامنے رکھ کر اپنا عکس اپنے چہرے پر بہلاتے نظر آئیں گے اور بڑی معصومیت سے آپ کو سنانا شروع کر دیں گے کہ

" ایک تھا لڑکا ٹوٹ بٹوٹ "

نتیجہ یہ کہ خود آپ کو اپنے اوپر ٹوٹ بٹوٹ ہونے کا شبہ ہونے لگے گا اور آپ اب مجبور ہو جائیں گے کہ تبسم کی شخصیت نگاری میں وہی طریقہ اختیار کریں۔ جو شعرائے کرام غزل کہتے ہوئے اختیار کرتے ہیں کہ پہلے دو سرا مصرعہ کہا جائے۔ یعنی بجائے یہ لکھنے کے کہ تبسم کیا ہیں اصل اس میں رہے گی کہ یہ لکھا جائے کہ وہ کیا نہیں ہیں تاکہ اس کے بعد آسانی سے یہ بات سمجھ میں آ جائے کہ وہ جو کچھ نہیں ہیں اس کے علاوہ جو کچھ ہیں وہ ہیں۔

مگر تجربے کے بعد یہ اندازہ بھی فوراً غلط ہو جائے گا کہ یہ صورت بھی اتنی ہی مشکل ہے جتنی آسان نظر آتی ہے اس لئے کہ تحقیقات کرنے کے

[illegible] صاحب ان کی بھی نہیں ہیں بنا اس ہونے نہ ہونے کا جھگڑا ختم لیکن اس پر گرفت ہے کہ متعلق مرزا صاحب [illegible] تبسم نے کسی مضمون کو اس کے لئے کچھ کہہ سے بیت نہیں لی تھی ان کا شعر کی وفات میں قصہ [illegible] اصل جو پہلو بیٹھا ہو گیا ہے کہ ان کے جاننے والے ان سے وہی عقیدت رکھتے ہیں جو صوفیائے کرام [illegible] کے معتقدین اور مریدوں کو ہوتی ہے۔

تبسم زندگی بھر جیل کو روزمان بنانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ شاگرد کو پڑھا دینا ایک ہے جس کا ہمیشہ یہ حق سمجھا گیا کہ پہلے سلسلہ بیٹھتے ہیں اور شام کا کام شروع کر دیتے ہیں۔ تبسم نے بھی خاص طور نے شاگردوں کی ایک تعداد کثیر سے زیادہ ہے۔ اس مجلس میں ایسے بہت کم لوگ ہوں گے جنہوں نے کسی نہ کسی رنگ میں ان سے کچھ نہ کچھ سیکھا نہ ہو۔ طالب علموں کو پڑھانے میں ہمارے ہاں طالب علم سے خود کچھ حاصل نہ کر سکے خوش دلی کے ساتھ کبھی ہوتا ہے ضرور، انسان وہی پر اپنا وقت ضائع کرتے بیٹھا ہے جس دن کے بعد ناراض ہوں اور چاہئے تو شاید وہ بھی طرح کا یہ استاد اپنے شاگردوں کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ زمانے سے کس قدر پیچھے ہے۔ تبسم کو بھی کتابوں سے دوستی کا الزام سمجھتے ہیں حالانکہ جانتے ہیں کہ شہر کے لوگوں میں اس آئینہ زورشی پر دنیا ہنستی ہے۔ یہ آج کل دوستوں کے لئے وقف ہیں۔ جہاں کا بھی دوستی پر دشمنی کا شبہ نہیں ہوتا۔ یہ آج بھی دوستوں کو گھیر گھیر کر لاتے ہیں۔ دیدہ و دل فرش راہ کرتے ہیں۔ معاملات میں خود اپنے کو بیچ نکلنا چاہتے ہیں۔ ان کے پاس دوستوں سے جو کچھ بچا ہے وہ آج بھی دوستوں ہی کے لئے ہے۔ ان کے گھر کا سامان، ان کے جسم کے کپڑے حتیٰ کہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز وہ کتابیں جن کو الماریوں میں بند کر کے کنجیاں دانستہ کسی کنوئیں میں پھینک دی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی شخص اپنی ذاتی شرافت کی وجہ سے ان سے کچھ طلب نہ کر سکے۔ یہ واقعہ ہے کہ اگر کوئی کچھ مانگ بیٹھے تو تبسم میں انکار کرنے کی تاب نہیں۔ البتہ مانگنے والا ذرا سلیقے کا آدمی ہو۔ سوال کرنے کا ڈھب جانتا ہو۔ موقعہ اور محل کا اس کو احساس ہو جس وقت صوفی صاحب محفلوں میں سگریٹ اور بیروں میں حقے کی نے دبائے۔ اپنا بنایا ہوا قوام چاٹ رہے ہوں۔ اگر کوئی شخص ان کے قوام کی مہک کی داد دے دے اور ذرا سا قوام چکھ کر چاٹ کر اس کی تعریف کر دے تو صوفی صاحب کی آنکھوں میں ایک خاص چمک پیدا ہو جائے گی۔ ان کی ناک کچھ اور سرخ ہو کر خوشبو سے بھر جائے گی یہ وقت ہوتا ہے کہ جس کا جو جی چاہے مانگ لے۔ ویسے بھی ان کے گھر میں دوست نام کے ہر شخص کے لئے روٹی بھی ہر وقت موجود رہتی ہے۔ اور کپڑے بھی ہمیشہ موجود ہوتے ہیں۔ پیسہ درکار ہو تو ناکسٹل کی گولیاں حاضر ہیں۔ لیجئے چند ہزار روپے جائیے اپنی قسمت کا پیسہ۔ وہ جو کچھ کما چکے ہیں اس میں دوستوں کا حصہ ان کے ساتھ دیانت برت کر اور اہل و عیال کے ساتھ بددیانتی کر کے ہمیشہ نکالتے رہے ہیں جو کچھ کمانا چاہتے ہیں اس میں بھی دوستوں کی پتی ہے۔ ورنہ خود ان کی ذات کے لئے سب ہی کچھ موجود ہے خود ان کے پاس نہ سہی ان کے ان قدردانوں کے پاس جو صوفی کو سر آنکھوں پر جگہ دینا چاہتے ہیں مگر ہمت اس لئے نہیں کرتے کہ صوفی اپنے پتوں کی وجہ سے عادی ہے۔

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی ساری زندگی کا ایک محبوب مشغلہ دوست بنانا تو رہا ہی ہے مگر باقی تمام دنیا کی دوستیوں کو اپنی کوششوں سے قائم رکھنا بھی ان کا ایک بے ساختہ شغل ہے اگر ان کو معلوم ہو گیا ہے کہ دو دوستوں میں کھٹ پٹ ہو گئی ہے تو وہ دونوں کے علیحدہ علیحدہ دوست بھی نہیں رہ سکتے۔ دونوں میں سے کسی ایک کے دوست اور دوسرے کے حریف بھی نہیں بن سکتے۔ اور نہ دونوں پر فاتحہ پڑھ کر خود الگ تھلگ رہ سکتے ہیں۔ اس اختلاف کی خبر سننے کے بعد ان کا ہر سرور بے کیف ہو جائے گا۔ اور ہر نشہ ہرن۔ وہ بیقراری سے نظر آنے لگیں گے اور ان کی تمام کوششیں سمٹ کر اس ایک مرکز پر آ جائیں گی کہ یہ بچھڑے ہوئے دوست کسی طرح آپس میں مل جائیں۔ اکثر ان کی حیثیت اس اختلاف میں اس دیوار کی سی ہو جاتی ہے جو چکی کے دو پاٹوں کے درمیان آ جائے مگر ان کی یہ مقدس کوشش جاری رہتی ہے۔ اور انجیل مقدس کی یہ آیت اپنی تفسیر ان کی صورت میں پیش کرتی ہے کہ۔

مبارک ہیں وہ جو صبح کو اٹھتے ہی کہہ گئے کہ وہ خدا کو دیکھیں گے!

خدا گواہ ہے شک دیکھ ہیں مگر قدرتی ہے کہ خدا نے انسان کو دیکھ لیا نہ کیا ہو گا۔ خدا کی طرف سے ان کو بھٹکنے کا ایک سوال [illegible] کہ اے بندے ہم نے تجھ کو دنیا میں جس عظیم مقصد کی تکمیل کے لیے بھیجا تھا۔ اس سے تو کس حد تک عہدہ برآ ہوا۔ ظاہر ہے کہ [illegible] یہ نہیں ہو سکتا کہ دوستیاں کیں اور نباہ کی حد تک کیں، اور نہ صوفی صاحب یارا و غمازوں میں یہ کہہ سکیں گے کہ رب العزت میں نے [illegible] چندوں کو شب دیگ کھلائی ہے جیسے دسترخوان پر تیرے خدا جانے کتنے بندے سیراب ہوتے رہے ہیں۔ اور یہ کہتے رہے ہیں کہ سلطانی جو کھا رہے ہیں صرف خدا کی دیا ہے۔ نہ صوفی صاحب یہ کہہ کر چھٹکارا حاصل کر سکیں گے کہ میں نے جو علم حاصل کیا تھا وہ بے شمار طالب علموں پر تقسیم کیا۔ سوال کی اصل نوعیت تو یہ ہوگی کہ اپنے بعد اپنی کیا یادگار چھوڑی۔ سر سید کو اگر یہ اطمینان تھا کہ اگر خدا نے مجھ سے پوچھا کہ کیا لایا ہے

تو میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا کر لایا ہوں، ظاہر ہے کہ اسی قسم کے سوال پر خود حالی نے یہ کہا ہوگا کہ میں مسدس پہلے ہی آپ کے ہاتھوں بھجوا چکا ہوں۔ مگر تبسم جن صلاحیتوں کے مالک ہیں اور دنیائے شعر و ادب کو ان سے جو توقعات ہیں اس معیار کی یہ کیا چیز پیش کریں گے۔ اپنے علم و فضل اور اپنی اہلیت و صلاحیت کو بروئے کار نہ لانے کا شکوہ ڈاکٹر تاثیر اور چراغ حسن حسرت کی طرح ان کی جا سے دور ان سے بھی ہے۔ تاثیر اور حسرت سے جو شکایت ہے وہ بعد از وقت ہے مگر تبسم سے یہ شکایت برمحل ہے۔ تاثیر اور حسرت نے خود ساتھ خود انصاف نہیں کیا۔ تو شعر و ادب کے مؤرخ ان کے ساتھ کب تک انصاف کریں گے۔ کام نہ ہو تو نام کب تک زندہ رہ سکتا ہے صوفی غلام مصطفےٰ تبسم خدا ان کو ہزاروں سال عمر عطا کرے اگر اب ان کے پاس وقت ہے کہ اپنے شایان شان کوئی بلند پایہ تخلیقی کام ایسا کر جائیں جو رہتی دنیا تک ان کو زندہ رکھے۔ اور وہ صلاحیتیں جن کے یہ امین ہیں ان میں خیانت کا الزام ان پر نہ لگے۔

مسعود حسن رضوی

علی عباس حسینی

میری شخصیت [illegible]

مسعود حسن رضوی [illegible] مسعود صاحب [illegible]

[illegible] مسعود صاحب [illegible]

کے زمانے میں [illegible] مسعود صاحب [illegible]

[illegible]

[illegible] مسعود صاحب [illegible]

سوانح } [illegible]

آپ [illegible]

عربی و فارسی کا [illegible] میرے والد [illegible]

کہ ان کی مفارقت و وفات نے میری تعلیم کا [illegible]

[illegible] میرے [illegible] ذہنی [illegible]

[illegible] امتحان پاس کیا [illegible] انگریزی [illegible] تعلیم میں ایک

[illegible] ضروری تفصیلوں کے ساتھ مرتب کرکے

[illegible] سرکاری اخبار میں شائع کی جائے۔ ——— [illegible] تقریباً

دس ہزار کتابیں میری نظر سے گزریں۔ مطالعے کی اس کثرت اور تنوع نے میری نظر میں وسعت [illegible] تصنیف و تالیف کا شوق پیدا کیا [illegible]

سمجھا ہیں۔ ۱۹۲۳ء میں ایل۔ ٹی کی سند حاصل کی۔ اسی سال گورنمنٹ ہائی اسکول [illegible] تقرر ہوگیا۔ اس [illegible] سرکاری خدمت

سے استعفا دے کر یونیورسٹی کی ملازمت بخوشی قبول کرلی۔ ۱۹۲۶ء میں کوئی ڈیڑھ برس فارسی کے سینئر لکچرار کی قائم مقامی کی اور اسی زمانے میں فارسی میں ایم۔ اے کا امتحان

قبل مدرسے میں امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ یونیورسٹی نے طلائی تمغہ عطا کیا۔ ۱۹۱۲ء میں ... کالج ... میں ... مقرر ہو گئے ... ریڈر شعبہ ... ۱۹۲۸ء ... ۱۹۲۹ء میں سیاحت ... اور ایران کی عتبات عالیات کی زیارت کرکے بحری راستے سے ہندوستان واپس آگئے۔ اب تک جن کتابوں کی تصنیف و تالیف ترتیب ترجمہ یا تحشیہ ... انجام دیا ہے ان کے نام یہ ہیں: انتخاب ... فرہنگ امثال، ہماری شاعری، فیض میر، مجالس رنگین، دبستان اردو، روح انیس، نغمۂ اردو، جواہر سخن، شاہکار انیس، دیوان فائز، متفرقات غالب، اردو زبان اور اس کا رسم خط، آب حیات کا تنقیدی مطالعہ۔ ان کتابوں کے علاوہ بہت سے تحقیقی اور تنقیدی مضامین مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں اور ... مکمل کاموں کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے ...... شعر کا ذوق میری فطرت میں ... کا اظہار شعر گوئی سے زیادہ شعر فہمی کی صورت میں ہوا۔ تاہم کبھی کبھی دل کے جذبات قلم کی زبان سے موزوں اور مترنم شکل میں بے ساختہ ادا ہو گئے۔ ان ... کا ایک مختصر سا گلدستہ بن گیا ہے ——— (ہماری شاعری۔ پانچواں ایڈیشن)

ان سوانح میں اتنے اضافے کی اجازت دیجئے کہ مسعود صاحب اپنے حسن خدمات کے صلے میں ۱۹۵۰ء میں ریڈر کی جگہ شعبہ اردو و فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے اور جون ۱۹۵۴ء میں اسی عہدہ جلیلہ سے ریٹائر ہوئے۔

حلیہ اور خصوصیات

(۱) متوسط قد، ... گیہواں رنگ ... چہرے پر خود اعتمادی کی جھلک۔ خوش وضع، شریف طبیعت، خوش مزاج، متین اور سنجیدہ۔ باتیں سنئے تو ایسی مزے دار اور پر از معلومات کہ اگر آپ کو فرصت ہو تو گھنٹوں سنا کیجئے اور آپ کا دل نہ بھرے۔ زبان ایسی صاف، شستہ اور دھلی ہوئی کہ گویا منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ ان کے منہ سے ہر لفظ ... ہے۔ باوجودیکہ خالص لکھنوی ہیں ... لکھنؤ میں رہتے رہتے زبان اتنی منجھ گئی ہے کہ ... لکھنؤ والے غلطی کر جائیں تو کر جائیں لیکن ان کے منہ سے کوئی لفظ غلط یا محاورہ ٹکسال سے باہر نہ ... آپ ... تقریر نہایت مدلل، منظم اور مفصل کرتے ہیں ایسی کہ بحث طلب مسئلے کا کوئی گوشہ حتی الوسع تشنہ نہیں رہتا۔ یہ تقریریں اردو میں ہوں یا انگریزی میں، ہندی میں ہوں یا فارسی میں، نہایت روانی، فصاحت اور شستہ زبان میں ... لکھنے کا انداز آپ نے آپ کی مشہور کتاب "ہماری شاعری" میں دیکھا ہوگا، ہر بحث ... ہے ہر حکم دلیل اور شواہد سے واضح بلکہ واضح ترین کر دی ہے۔ (فروغ اردو۔ جون ۱۹۵۴ء۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی)

(۲) سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم۔ اے کا وطن ... ضلع ... ہے ——— ... کہنا چاہئے۔ سید مسعود حسن صاحب صرف لکھنے ہی میں ادیب نہیں بلکہ ان کی بات چیت اور انداز گفتگو میں بھی ایک خاص ادبیت پائی جاتی ہے۔ اور جب تقریر کرتے ہیں تب بھی ادبیت کے رنگ میں ڈوبی ہوتی ہے ——— اپنے علمی و ادبی شوق کے سلسلے میں سید مسعود حسن صاحب نے اردو اور فارسی کی نایاب قلمی اور مطبوعہ کتابیں جن کی تعداد کئی ہزار ہے بہت کچھ صرف کرکے جمع کی ہیں جن میں بہت سے ادبی نوادر شامل ہیں ——— موصوف اردو زبان کے فاضل اور بہترین ادیب ہونے کے ساتھ ہی اردو کے عاشق بھی ہیں جس کی بقا و ترقی کے لئے انہوں نے اپنی زندگی وقف کر دی ہے ——— مسعود الحسن صاحب طبیعتاً بہت سنجیدہ، بہت نیک اور خوش اخلاق انسان ہیں۔ آپ مذہبی آدمی نہیں ہیں مگر آپ کا شمار تعلیم یافتہ شخصوں کے اس گروہ میں کیا جا سکتا ہے جو آج کل کی اصطلاح میں "ترقی پسند" کہا جا سکتا ہے، ایک علمی و ادبی شخص میں سنجیدگی تو بہرحال ہونا ہی چاہئے مگر مسعود صاحب کی گفتگو میں خشکی نہیں ہوتی بلکہ ان باتوں میں ایک خاص ادبی لطافت اور شگفتگی ہوتی ہے ——— (حقیقت مئی ۱۹۵۳ء۔ ... ۔ انیس احمد عباسی)

(۳) مرکزی اور ٹھوس باتوں پر ایسے بے لاگ اور مطمئن انداز میں گفتگو کرتے ہیں کہ ان کے نقطۂ نظر سے مخالفت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ آپ چاہیں تو ان کے خیال میں اضافہ کر سکتے ہیں لیکن ان کے ... سے اثر نہ لینا آسان نہیں۔ (مختصر تاریخ اردو۔ ۱۹۴۶ء ڈاکٹر اعجاز حسین)

(۴) آپ تمدن کے عناصر ثلثہ یعنی خوراک، پوشاک اور مکان کے بہترین برتنے والے ہیں۔ کھانا بہت اچھا کھاتے ہیں۔ کپڑا اچھے سے اچھا اور نہایت عمدہ سلا ہوا پہنتے ہیں ——— اور مکان آپ کا در و دیوار ... فرش سے ... تک یعنی چھت سے زمین تک آپ کی جودت طبع اور خوش مذاقی کا بہترین ثبوت ہے ...

[illegible] کے خلاف [illegible] اخلاق کے حد درجہ [illegible] خاصے [illegible]
[illegible] ان کی [illegible] ہے ———— [illegible]
[illegible] سکتا

میں مسعود صاحب کا [illegible] سب سے پہلے [illegible] جب میں ایف [illegible] کے لئے [illegible] تھا [illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible] خود بھی شعر [illegible]
[illegible]

بورڈنگ ہاؤس [illegible] مرزا [illegible] مسعود صاحب
[illegible] مسعود صاحب [illegible] اسی طرح مرزا [illegible]
[illegible] مرزا نے تحریک پیش کی [illegible] ایک [illegible]
[illegible] مسعود صاحب کی [illegible]
[illegible] ایک دن [illegible] مگر فطری ظرافت [illegible]
[illegible] بغیر کچھ کھائے [illegible] کبھی [illegible]
یا امرود کے [illegible] کبھی [illegible]
[illegible] مسعود صاحب [illegible]
بھی [illegible] ابراہیم [illegible]

بی۔ اے پاس کرنے کے بعد جب میں اور مرزا ٹریننگ کالج لاہور میں داخل ہوئے تو مسعود صاحب اس شہر میں پہلے سے موجود تھے۔ وہ اس وقت محکمہ تعلیم کے [illegible] ڈپارٹمنٹ میں ملازم تھے اور [illegible] منڈی میں رہتے تھے۔ میں اور مرزا اتوار اور چھٹی کے دن صبح سویرے مسعود صاحب کے ہاں پہنچ جاتے [illegible] طرح طرح کے کھانے پکائے جاتے [illegible] مختلف ادبی موضوعات پر بحث ہوتی رہتی۔ ہم سب غالب [illegible] تھے لیکن ایک دوسرے کو [illegible] اور تپانے کے لئے کبھی کبھی ان [illegible] پر بھی [illegible] کر دیتے۔ اسی ضمن میں ایک دن مرزا نے کہا بحیثیت [illegible] ذوق غالب سے بڑے شاعر تھے۔ میں نے کہا وہ سرے سے شاعر ہی نہ تھے [illegible] مرزا [illegible] شعر کہنا [illegible] بحث رہی۔ آخر [illegible] مسعود صاحب [illegible] بنائے گئے۔ انہوں نے کہا کلام ہے سند قبول [illegible] نہیں۔ مرزا صاحب [illegible] ذوق کے دیوان سے [illegible] مرزا جی۔ حامد نے [illegible] دیوان ذوق پر صرف کیا۔ تین بجے انہوں نے صرف ساڑھے نو شعر منتخب کئے۔ دن بھر بحث ہوئی اور بالآخر ساڑھے تین شعر ایسے مانے گئے جن میں سے ہر ایک پورے پورے دیوانوں پر بھاری تھا۔ میں نے مان لیا کہ خاقانی ہند یقینی شاعر تھے اور [illegible] تینوں نے مل کر [illegible] کی۔

اس طرح کی صحبتوں میں بھی مسعود صاحب کی شخصیت کی انفرادیت نہ جاتی تھی۔ وہ کبھی [illegible] زور سے نہ ہنستے کہ ہماری طرح پیٹ پکڑ کر [illegible] لگیں [illegible] کبھی خفا ہوتے [illegible] نہ جھنجھلاتے [illegible] بزرگ [illegible] کا خیال ان کے ذہن سے محو ہوتا۔ بورڈنگ کے رہنے والے اکثر بے تکلف [illegible] اخلاص میں ایک [illegible] صاحب [illegible] بھی [illegible] یہاں تک کہ مذاق کا سلسلہ بعض اصحاب کے درمیان [illegible] اور گالی گلوچ تک بھی پہنچ جاتا مگر مسعود صاحب کا نام کسی کی

دلیپ کمار صاحب کا نام لے کر کسی طالب علم کی انہیں اپنی محفل میں مخاطب کرنے کی جرأت کرتا۔

... سے بھی فیض حاصل کر دکھایا۔ انہوں نے کبھی ہی کسی سے اپنا گلہ شکوہ نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ نہایت صبر و ضبط سے کام لیتے تھے۔ یہ بات بھی مشہور ہے کہ حصول علم کے لئے جب لکھنؤ آئے تو برسوں یہ حالت رہی کہ جہاں دو چار لڑکوں کو ایک جگہ کھڑا دیکھتے تھے راستہ کترا کر نکل جاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ پابندی و جہات کا اہم سبب یہ نظریہ ہے کہ ماتحت مسعود صاحب یقینی طور پر یہ احساس رکھتے تھے کہ انہوں نے لکھنؤ کے سب سے بڑے تعلیمی ادارے میں تعلیم کی۔ قیصر باغ کے ہاؤس میں قیام کیا جہاں کے گیارہ طلبہ قاعدہ و ضابطہ کے خلاف بغاوت کرنے پر چھ ہی سال نکال دئے گئے اور ان سے ایک مقامی معلم ہونے کی حیثیت سے ہمیشہ بڑے بڑے رہبروں کو قابو میں رکھنے میں کامیاب ہوئے اور بڑے بڑے مجمعوں میں عالمانہ اور بیانہ اور مدلل تقریریں کیں۔

اسی حالت میں چھپے ہوئے غدر نے انہیں ہر طرح کے احتساب کا اور اپنے جذبات کو چھپانے کا عادی بنا دیا۔ اور اسی سے خودداری کا احساس کر فرصت سے پیدا ہوا۔ ملاقاتیوں کے رہن سہن سے کبھی یہ ظاہر نہ ہوا کہ انہیں کوئی مالی دشواری بھی پیش آ سکتی ہے۔ طالب علمی میں بھی سب ساتھیوں سے کوئی سہولت تھی اور لباس صاف ستھرا رہتا تھا۔ اور ان کے چہرے مہرے سے کبھی یہ ظاہر نہ ہوا کہ بعض وقت ان کے پاس فیس کے روپے بھی نہیں ہوتے۔

ایف۔ اے کا امتحان سر پر تھا۔ امتحان اور کالج کی فیس ملا کر پچاس روپے دینے تھے۔ تین مہینے سے وظیفہ نہ ملا تھا۔ سخت پریشانی تھی کہ کیا کریں۔ ایک عزیز سے جو صاحب ثروت بھی تھے اور ان کے والد مرحوم کے مرہون منت بھی رہ چکے تھے روپیہ قرض مانگے۔ انہوں نے سرجا میری طرح صاحب دستار و سوال بھی نہ کریں اس لئے حیلہ شرعی کر کے ٹال دیا۔ مسعود صاحب کو ناگوار ضرور ہوا مگر خاموش رہے۔ اتفاق یہ کہ احسان فراموش کے ایک ہمدرد کو اس واقعہ کی خبر لگ گئی۔ انہوں نے پچیلا زمانہ یاد دلایا، غیرت بھی دلائی اور خود ضمانت بھی کر لی۔ ان حضرت نے مجبور ہو کر ایک عزیز کے ذریعے مطالبہ دریافت کیا تو مسعود صاحب سے کہا کہ میں ان دس سے تنگ ہوں، اور دوسرے تنگ اب آئیں کے روپے نہ لوں گا۔ انہوں نے مجھے بے اعتبار سمجھا، دوسرے کی ضمانت ضروری سمجھی۔ بزرگ ... رد و کد میں بڑا اصرار کیا گیا مگر مجروح خودداری بات پر اڑ گئی۔ شاید یہی انداز استغنا خدا کو پسند آگیا کہ بغیر کوشش و فکر کے دوسری جگہ قرض حسن مل گیا۔ امتحان میں بھی شریک ہوئے اور ممتاز حیثیت سے اسے پاس بھی کیا۔

اسی خودداری نے انہیں شاعری کے بازار میں بکنے سے بار بار روک لیا۔ میٹرک پاس کرتے ہی ایک نواب صاحب کی طرف سے فرزندی میں لینے کی خواہش کی گئی۔ مکان و اثاثہ گھوڑا گاڑی سب ہی کچھ مل رہا تھا۔ مگر انہوں نے کہا الفقر فخری۔ اسسٹنٹ ماسٹری کے زمانے میں ایک مشہور متمول تعلقہ دار کے ان سے اسی طرح کی خواہش کی گئی اور بہت سے سبز باغ دکھائے گئے مگر انہوں نے کہا شادی کے معاملے میں اس کا قائل ہوں کہ لوگ یہ کہیں کہ فلاں صاحب مسعود صاحب کے خسر ہیں نہ یہ کہ مسعود صاحب فلاں صاحب کے داماد ہیں۔ یعنی دامادی ذریعہ عزت و ترقی و امتیاز نہ بنے بلکہ اپنی ذاتی صلاحیت و قابلیت۔

مسعود صاحب کا حافظہ بلا کا ہے۔ جس چیز کو دھیان دے کر دو تین بار پڑھ لیتے ہیں وہ حرف حرف یاد ہو جاتی ہے۔ شعراء تو بہت سے ایسے دکھائی دئے جنہیں اپنے کلام کے سینکڑوں شعر زبانی سنانے میں کوئی تامل نہیں ہوتا مگر سوائے مسعود صاحب کے کوئی صاحب طرز نثر نگار میری نظر سے نہیں گزرا جو اپنے مضامین کے صفحے کے صفحے زبانی سنا تا چلا جائے۔ مسعود صاحب کے اس حافظے نے جہاں ان کا اپنا علم تازہ رکھنے کا کام بہا موقع دیا، وہاں انہیں ایک فاضل اور ایک ادیب بے مثل کی خود اعتمادی بخشی وہیں انہیں مشاعروں کی شرکت سے معذور بنا دیا۔ جہاں کسی شعر کی زیادہ تعریفیں ہوئیں اور انہیں اساتذہ قدیم میں سے کسی کا اس سے بہتر شعر یاد آگیا ہے اب اگر صاحب شعر کی تعریف کرتے ہیں تو سرزنش کرتا ضمیر ستاتے ہیں اور اگر خاموش رہتے ہیں تو سکوت سخن شناس کا الزام لگایا جاتا ہے۔ اس لئے کنارہ کشی ہی میں سلامتی دکھائی دی۔

عمر بھر سرکاری و غیر سرکاری علمی و ادبی انجمنوں کے ممبر رہے۔ مگر سوائے مسلم اکاڈمی اور انجمن اردو لکھنؤ کے کبھی کسی ادارے میں کوئی عہدہ نہ قبول کیا۔ ان ادارہ جماعتوں کی عہدہ داری سے انہیں تجربہ ہو گیا کہ خاموش ادبی کام کرنے والوں کے لئے انجمن بازی تضییع اوقات ہے۔ چنانچہ انجمن ترقی اردو لکھنؤ اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی اکیڈمک کونسل کی ممبری اب بھی ان کے لئے پریشان کن ہے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کہاں [illegible]

شاہوں کے انقلاب سے [illegible]

[illegible]

[illegible] ہندوستان و پاکستان میں بھی [illegible] نہیں۔

[illegible] مسعود صاحب [illegible] ان کی تعداد ہزاروں [illegible]

پھر ایک یہی نفاست پسندی اور سلیقہ مندی ان کی فطرت و طبیعت [illegible] محقق کی خوردبینی [illegible] وہ مکمل تحقیق کر کے اپنے کو مطمئن [illegible] شک ہی ہے میں نے بارہا عرض کیا کہ آپ نے جو کچھ لکھا ہے [illegible] ہے۔ خدا کرے وہ اپنے ارادوں میں کامیاب ہوں!

اب تک جتنا کام مسعود صاحب انجام دے چکے ہیں وہ اردو ادب میں زندہ رہنے کے لئے کافی ہے اگر دو چیزیں اور طبع ہو گئیں [illegible] مسعود [illegible] کی صورت [illegible] تو پھر کسی طرح آپ کو بھی ماننا پڑے گا کہ مسعود صاحب ان لوگوں میں ہیں جن کو "ادبی دیو" کہا جاتا ہے!

علی عباس حسینی

کشور نہاد زیدی

اگر چہ یہ سلیقہ ہوتا تو میں بڑے ڈرامائی انداز میں لکھتی

یہ وہ زمانہ ہی ہے نہ لوگ ـــــ!

یاد رکھنا افسانہ ہیں نہ لوگ ـــــ!

لیکن وہ دور گزر چکا۔ اب مضمون شروع کرنے کے لئے تعریفی الفاظ سوچنے پڑتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ شخصیات خود کو پیش کریں گی۔ دیکھ کر میرے دل نے کہا کہ علی عباس حسینی کی شخصیت سے مجھ سے زیادہ کون واقف ہوگا گو میرے الفاظ ان کو اچھی طرح روشن اور واضح نہ کر سکیں بلا سے خاندان ہی ہیں جا بیٹھے تکلف و تمہید برطرف۔ ایک شفیق باپ۔ ذرا سی نے شرارت پر ڈانٹا اور وہ بیچھے ذرا دیر۔ آنسو پونچھے گئے۔ تھوڑی سی نصیحت بھی ہوئی۔ ساتھ ہی والدہ بھی لپیٹ میں آگئیں۔ .. آپ ہی نے بگاڑ رکھا ہے بچوں کو ...... وہ بگڑیں ...... وہ پھر مسکرائے وہی شفیق پیاری سی مسکراہٹ جو انسان کے چہرے کو فرشتوں سے جیسا بہتر بنا دیتی ہے۔ کسی کو پیسے سے کسی کو گڑیا لانے کا وعدہ ہوا۔ اور کوئی گیند کی خوشی میں اچھلنے لگا ـــــ

اپنے ہی بچے نہیں، دوسروں کی فریاد بھی اسی دلسوزی سے سنتے ہیں۔ کسی کی فیس نہیں داخل ہوئی، کسی کے پاس کتابیں نہیں ہیں، کسی کے پاس گرم کوٹ نہیں ہے، کسی کے بری کے جوڑوں میں کمی پڑ رہی ہے .... غرضیکہ دنیا کے ہر مرض کا واحد علاج "امرت دھارا" یعنی حسینی صاحب ..... گو کہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کا اظہار کرنا بچپنا اور کم ظرفی ہے۔ لیکن مجھے تو غصہ صرف اس بات پر آتا ہے کہ جو لوگ ہمیشہ ساتھ رہے۔ پڑھایا لکھایا سرپرستی کی۔ وہی آج کہتے ہیں کہ حسینی صاحب نے بیوقوفی کی فضول خرچی کی ہمدردی یا ممنون احسان ہونا تو دور کی بات ہے میرے خیال میں حسینی صاحب کے خود ان ہی لوگوں کا ممنون کرم ہونا چاہئے۔

ہزاروں روپے کمائے لیکن وہی ڈھاک کے تین پات۔ گو کہ کمائی خالص حلال کی تھی لیکن روپے ایسے اڑنچھو ہو جاتے کہ بس آدمی دیکھتا رہے۔ اس لئے کہ اگر کوئی رشتہ دار شہر میں آیا ہے تو جائے قیام سوائے حسینی صاحب کے اور کہاں؟ اگر کسی کو تعلیم حاصل کرنی ہے تو بہترین علم کا گھر موجود ہے، اگر مہینے میں کم از کم آٹھ دس ضیافتیں نہ ہوتیں تو پھر مہینے کا لطف ہی کیا ....

والد کے ساتھیوں نے اپنی عمارتیں بنوا لیں۔ لاکھوں کا کیش بینک میں جمع کر لیا لیکن یہ جیسے کے تیسے رہے، خدا نے صبر اور مستقل مزاجی کی سادی

[illegible]

[illegible]

... ہے ۔ جو پڑھ سکے خود اٹھ کے ہاتھ میں ... [illegible]

حد یہ ہے کہ خود اپنی تصنیفات میں سے بھی ایک کی نذر بھی گھر میں نہیں ہے۔ والد کی خاص ... [illegible] ... کہ جو کاپی نذر ہوئی تھی وہ بھی کسی کی بھینٹ چڑھ گئی۔

یوں تو آپ انہیں کافی آزاد خیال سمجھیں گے لیکن حقیقتاً والد کافی قدامت پرست ہیں۔ نسل۔ ذات پات کے قائل۔ اور اپنے سید ہونے پر فخر.....

لڑکیوں کو ڈاکٹری پڑھانے کے قائل نہیں۔ نہایت ہی بے شرمی کی پڑھائی ہوتی ہے اور جانے کیا کیا۔ لڑکیاں پڑھ لیں لیکن اگر نوکری نہ کریں تو بہتر ہے۔

کھانے پر بیٹھیں گے تو گھر کا ہر فرد ساتھ ہو خواہ جگہ کتنی ہی کم ہو ہر ایک سمٹ سمٹا کر اسی میں بیٹھ جائے۔ اکیلے کھانا نہیں کھا سکتے اکیلے کوئی تفریح نہیں کر سکتے اکیلے بس وہ ایک ہی کام کرتے ہیں — مطالعہ —!

لباس کے معاملے میں حد سے زیادہ بے فکر۔ بس صاف اور اُجلا ہونا چاہئے قمیص کا کالر اگر ترچھا ہے تو کیا ہوا —! شیروانی زیادہ چوڑی لی ہے تو کیا خرابی —! چنانچہ پہلے پہل میں نے والد ہی کی قمیصوں کو تختۂ مشق بنایا اور وہ جنت نشیں ہو کر میرے بنائے ہوئے جھولوں کو پہنتے رہے

[illegible] سے [illegible] ہو رہی ہے [illegible] بارش نے [illegible] نہیں [illegible]

[illegible] لیکن [illegible] ضرور [illegible] ہوا۔ مگر یہی صرف تمہارا بیان پر قناعت کرتے ہیں [illegible]

انہیں اس [illegible] نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ [illegible] کہ وہ ڈرائنگ روم میں نہیں جاتے اور [illegible]

اپنی صحت کے معاملے میں بھی مستغنی ہیں۔ کھانا بہت کم کھاتے ہیں۔ کسی حرارت یا پیٹ کی گرانی کسی وقت کے کھانے ناشتے میں اب نہیں ہوتی۔ [illegible] زیادہ تر ہیں۔ ..... کسی کام سے عار نہیں ہے۔ بہ ضرورت شوق آپ انہیں کتابوں کی [illegible] دیکھ سکتے ہیں [illegible] کے پھندے پر [illegible] لگانے کے لئے آدھی رات کو نیم کی [illegible] بھی گئے ——— شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ خالص دیہاتی ماحول کی [illegible] ہیں۔ زمیندار کے بیٹے لیکن تعلیم حاصل کرنے دو شہر سات میل پیدل آتے اور جاتے تھے۔ یہ بات دوسری ہے کہ آج ان کے بیٹے چند قدم پیدل بھی نہیں جا سکتے۔

لکھتے پڑھتے ایک عمر آئی لیکن نہ تو اب تک کوئی خاص لکھنے کا کمرہ ہے نہ میز نہ کرسی۔ حتیٰ کہ کسی وقت کاغذ کی کمی بھی ہو جاتی ہے۔ ہاں کے پلنگ یا زیادہ سے زیادہ بستر پر گاؤ سے ٹیک لگائے تہمد بنیان میں ملبوس، ایک پنسل اور چند کاغذات اپنے سامنے بکھیرے آپ اپنے اس فنکار کو کسی تخلیق میں مشغول دیکھ سکتے ہیں۔ اسی دوران میں بچے آ آ کر اپنی شکایتیں اور فرمائشیں بھی سامنے رکھ دیتے ہیں۔ کبھی ذرا مسکرا کر تسلی دیتے ہیں کبھی ہلکی سی ڈانٹ۔ اور زیادہ تنگ آئے تو کاغذ سمیٹے اور [illegible] اپنے گھر کی [illegible] یعنی اوپر چلے گئے۔

ادھر انھوں نے ایک ناول پندرہ دن کے اندر لکھ کر ختم کیا ہے۔ جس کے بہترین ہونے کے متعلق ان کا دعویٰ ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ انہوں نے یہ ناول مسلسل سترہ اٹھارہ گھنٹے تک یک نشست بیٹھ کر لکھا ہے اور اس قدر اپنے چہیتے نواسے عسکری میاں کی ساری فریادیں بھی سنتے رہے اور ان کو تسلی بھی دیتے رہے اور ان کی چوٹوں کی مرہم پٹی بھی کرتے رہے ..... جب سے وہ ریٹائر ہوئے ہیں میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ جیسے وہ اب اپنے آپ کو کافی اکیلا [illegible] کرتے ہیں اور زیادہ جوش اور لگن کے ساتھ لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے ہیں۔ خداوند تعالیٰ ان کو ہمیشہ ہمارے سروں پر قائم رکھے اور وہ ہمیشہ اسی طرح اردو ادب کو زندہ جاوید کرنے والے ادب پارے پیش کرتے رہیں ۰

حامد علی خاں

محمد عبداللہ قریشی

حامد علی خاں منشی سراج الدین احمد خاں بانئے اخبار "زمیندار" لاہور کے فرزند تھے۔ ۱۹۰۷ء میں موضع کرم آباد ضلع گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے [illegible] تعلیمی [illegible] آفتاب بنا ہوا تھا۔ منشی سراج الدین احمد خود بڑے انشا پرداز اور شاعر تھے۔ ان کے فرزند اکبر مولانا ظفر علی خاں تو اس باب میں کسی کے حریف ہی نہیں۔ غلام حیدر خاں صاحب جو مولانا ظفر علی خاں سے چھوٹے [illegible] ہیں۔ روزانہ صحافت میں کافی شہرت اور نام پیدا کر چکے ہیں۔ ان کے ایک بھائی محمود [illegible] علی گڑھ کالج کے ایک کامیاب گریجویٹ تھے اور [illegible] میں مضامین اور نظمیں لکھا کرتے تھے۔ وہ [illegible] زندہ رہتے تو اپنے عہد کے نامور شاعروں [illegible] میں شمار ہوتے۔ ایک بھائی پروفیسر [illegible] احمد خاں کئی سال تک عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن میں پروفیسر کیمسٹری رہے [illegible] کے بعد [illegible] یونیورسٹی کی [illegible] اصطلاحات علمی کے رکن رہے ہیں۔ اب مجلس زبان دفتری حکومت پنجاب کے زیر [illegible] دفتری اصطلاحات کا ترجمہ ہو رہا ہے۔ حامد علی خاں نے [illegible] اعلیٰ [illegible] میں پرورش پائی۔ پروفیسر حمید احمد خاں اسلامیہ کالج لاہور [illegible] انگریزی اور اردو دونوں زبانوں کے نہایت بلند پایہ ادیب اور نقاد ہیں اور انھوں نے غالب کے متعلق بہت محققانہ کام کیا ہے۔

حامد علی خاں نے ابتدائی درسی تعلیم اسلامیہ ہائی سکول لاہور، چرچ آف سکاٹ لینڈ مشن ہائی سکول وزیر آباد میں حاصل کی۔ اسکاچ مشن کالج کے انچارج ڈاکٹر [illegible] اس زمانے میں ان کے انگریزی کے معلم تھے ——— وہ بعد میں لندن یونیورسٹی میں [illegible] ادبیات کے شعبہ کے صدر ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر [illegible] ہونے کے باوجود اردو اور پنجابی ایسی بے تکلفی سے بولتے تھے کہ سن کر حیرت ہوتی تھی۔ پنجابی [illegible] کا لہجہ ایسا تھا کہ کوئی شخص ان کے ٹھیٹھ پنجابی ہونے میں شبہ نہ کر سکتا تھا۔ ان کے ذہن میں پنجابی اتنی رچی ہوئی تھی کہ وہ خاص خاص اشیاء کے نام بھی جان گئے تھے۔ وہ اپنے شاگرد حامد علی خاں کو ایسے کھاتے پیتے امیر گھرانے کا لڑکا سمجھتے تھے جس کا طرز ماند و بود انگریزی ہو۔ ایک دن پنجابی میں کہنے لگے "تسی تاں ڈبل روٹی کھاندے ہوو گے۔ پر پنڈاں دے لوک [illegible] دی روٹی پکاندے [illegible] اوہ بڑا ثقیل ہندا اے۔" یعنی تم تو ڈبل روٹی کھاتے ہو گے۔ مگر دیہاتی لوگ [illegible] ایک قسم کی روٹی پکاتے ہیں جسے [illegible] کہتے ہیں۔ وہ بڑا ثقیل ہوتا ہے۔

ڈاکٹر [illegible] اپنے شاگردوں کو بے تکلفی سے خالص پنجابی انداز میں بلایا کرتے تھے۔ کسی کا نام شاہ محمد ہوا تو اسے [illegible] "او شاہنیا محمدیا"

ہوا اور علیگڑھ میں ایک صاحب نے سعادت علی خاں کو بھی شروع کرنے سے پہلے منتخب کیا۔ ... صاحب نے ... چنانچہ ایک دوست کا ... رپورٹ تیار کیا۔ گر دہ نہیں ڈاکٹر ... کے سامنے ... پاس ... ڈاکٹر ... کہنے سے روک سکیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ یہ تیر نشانہ پر بیٹھا۔ ڈاکٹر ... نے ... کو بلاتے ... اور سعادت علی خاں سے کہا "لیکن صاحب! حامد علی خاں کیا بلا ہے۔ مجھے تو اس میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ ... بے تکلفی کی نشانی ہے۔ میں نے ... میں ... دیکھا ہے کہ وہ میاں محمد شفیع کو شفیع شفیع کہتے ہیں اور وہ برا نہیں مانتے۔" مگر جب ڈاکٹر ... کے ... شفیع ... میں خرابی واقع ہونے کا فرق معلوم ہو گیا۔ تو انہوں نے حامد علی خاں کو پورا نام لے کر پکارنا شروع کر دیا۔ ... یا کبھی مذاق کی سوجھتی تو کہہ دیتے "ہنس لو حامد چہرتاں دی طاری لے۔"

تحریک عدم تعاون کے زمانے میں حامد علی خاں نے نیشنل یونیورسٹی لاہور سے فرسٹ ڈویژن میں بی۔ اے پاس کیا اور اپنے مضامین اقتصادیات تاریخ، سیاست، اردو وغیرہ میں یونیورسٹی میں اول آئے۔ اس یونیورسٹی کا نظام تعلیم امریکی یونیورسٹیوں کی طرز کا تھا۔ گاندھی جی نے حامد علی خاں اور دوسرے کامیاب طلبہ کو اپنے ہاتھ سے سندیں عطا کیں اور جلسۂ تقسیم اسناد کے بعد الگ لے جا کر باتیں بھی کیں۔

۱۹۲۲ء میں حامد علی خاں اسی یونیورسٹی میں اکنامکس (اقتصادیات) اور اردو کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ یہ یونیورسٹی بریڈلا ہال لاہور کے متصل واقع تھی۔ اور بریڈلا ہال کا بڑا ہال تھا۔ جو اس وقت کانگریسیوں کا جہت بڑا مرکز تھا۔ ملک کے تمام بڑے بڑے قومی رہنما وقتاً فوقتاً یہاں آتے تھے اور حامد علی خاں کو ان کے خیالات سننے کا اکثر موقع ملتا رہتا تھا۔ طبیعت میں انگریز دشمنی اور آزادی کی تڑپ شروع ہی سے موجود تھی۔ گویا ابتدائے عشق ہی میں آگ سے تھے۔ مسٹر گاندھی، سی۔ آر۔ داس۔ لالہ لاجپت رائے۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ پنڈت مدن موہن مالویہ۔ مسز سروجنی نیڈو اور دیگر محب وطن اور آزادی پسند حضرات کی تقریروں نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اور آپ شعلۂ جوالہ بلکہ آتش کا پرکالہ بن گئے۔ اگرچہ آپ عام شعلہ سر نوجوانوں کی طرح اپنے جوش و خروش کا اندھا دھند اظہار نہ کرتے تھے۔ بلکہ اسے پوری قوت سے اپنے سینے میں چھپائے ہوئے رکھتے تھے۔ پھر بھی کبھی کبھی یہ لاوا پھوٹ بہتا اور طوفان برپا کر دیتا تھا۔ چنانچہ دو تین موقعوں پر ضبط کی کوئی کوشش بھی کامیاب نہ ہو سکی۔

طالب علمی کے زمانہ کا ایک واقعہ ہے۔ کہ مولانا ظفر علی خاں کسی سفر سے واپس کرم آباد پہنچے۔ "ستارۂ صبح" ان دنوں کرم آباد سے شائع ہوتا تھا۔ اور علامہ عبداللہ عمادی اس کی ادارت کے فرائض انجام دینے کے لئے وہیں رہتے تھے۔ مولانا نے علامہ عمادی سے اپنے سفر کے حالات بیان کرتے ہوئے کہا "کہ بعض انگریز بڑے مہذب اور شریف النفس ہوتے ہیں۔ ان کا برتاؤ دیسی شرفا کے ساتھ ایسا اچھا ہوتا ہے کہ خواہ مخواہ اس کی تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے"۔ بات یہ تھی کہ ریل گاڑی میں مولانا کے ہم سفر انگریز ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ تھے۔ رات کے وقت گاڑی وزیر آباد اسٹیشن پر پہنچی۔ دونوں نے کچھ دیر آرام کرنے کے لئے ویٹنگ روم کا رخ کیا۔ دروازہ کھولا تو دیکھا کہ وہاں صرف ایک ہی کوچ ہے۔ اس پر اس انگریز نے مولانا سے نہایت نرم لہجے میں کہا "افسوس یہاں صرف ایک ہی آدمی کی گنجائش ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر یہاں دوسرا کوچ بھی ہوتا"۔

مولانا کو اس کا یہ انداز جو حقیقت میں نہایت مہذب متنازع تھا اتنا پسند آیا کہ آپ نے اس کا ذکر اپنے اخبار ستارۂ صبح میں کرنا چاہا۔ حامد علی خاں اس وقت وہاں موجود تھے ان سے رہا نہ گیا۔ فوراً بول اٹھے کہ یہ معمولی بات ہے۔ ہم کیوں اپنے وطن کے دشمنوں کی قصیدہ خوانی کریں۔ مولانا ظفر علی خاں مسکرائے اور کہنے لگے "یہ حامد صاحب تو بڑے انتہا پسند ہیں"۔ اس کے بعد انہوں نے اخبار میں اس واقعہ کا ذکر نہ کیا۔

نیشنل کالج میں حامد علی خاں نے اردو انجمن قائم کی اور وقتاً فوقتاً اس کے اہتمام میں مشاعرے بھی کرائے۔ ہندو نوجوانوں میں اردو کا شوق پیدا کرنے کے لئے کئی دفعہ ان کو خود غزلیں لکھ کر دیں اور پھر مشاعروں میں ان کی زبانی سن کر ان کی حوصلہ افزائی کی۔ ایک مشاعرے کے صدر مولانا

[illegible]

[illegible] ابتدائی تعلیم [illegible]

[illegible] حامد علی خاں [illegible] آزادی کے جوش [illegible]

[illegible] ان کی آنکھیں [illegible] نے خفیہ خفیہ [illegible] شروع کر دی۔

حامد علی خاں اپنے ہندو دوستوں کو باہم [illegible] دیکھتے [illegible] تو چپ ہو جاتے [illegible] ان کی یہ بات ذرا کھٹکتی [illegible] ہے۔ کرشن گوپال [illegible] نہایت [illegible] دوست تھے۔ انھوں نے [illegible] اس کی وجہ پوچھی۔ انھوں نے پہلے تو بتانے سے انکار کیا۔ پھر کہا ان لوگوں کا کہنا ہے کہ ہندوستان ہندوؤں کا ملک ہے۔ مسلمان [illegible] تو ہندو ہو کر رہیں۔ ورنہ [illegible] چلے جائیں۔ اس واقعے نے حامد علی خاں کی آنکھیں کھول دیں۔ [illegible] سنگھ کی [illegible] ہندوؤں کی [illegible] تنگ نظری اور تعصب نے [illegible] مسلمانوں کو دو قوموں کا نظریہ اور پاکستان کا مطالبہ پیش کرنے پر مجبور کیا۔

رسالہ ہمایوں سے [illegible] کے بعد دسمبر [illegible] میں حامد علی خاں اس کے جوائنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے اور وہ ایک [illegible] بارہ سال اس سے وابستہ رہے۔ آپ نے مضامین کے انتخاب اور زبان [illegible] پر بہت کاوش اور محنت کی کہ ہمایوں پہلے ہندوستان کے دو چار بہترین پرچوں میں تھا۔ [illegible] یہ ہے کہ ہمایوں آپ کی توجہ اور محنت سے [illegible] تک پہنچا۔ ہمایوں کا کوئی دوسرا [illegible] وہاں تک نہ لے جا سکا

ہمایوں کی ادارت کا [illegible] آپ نے نہایت محنت [illegible] سے گزارا۔ [illegible] کتب وغیرہ تبصرے کے لیے آتی [illegible] رسالے آپ اس دوران میں انتخابات و اقتباسات کی خاطر [illegible] اپنے گھر لے جاتے۔ [illegible] کے بعد ان کو نہایت احتیاط سے واپس [illegible] رکھ دیتے [illegible] اس ڈھیر میں سے آپ نے کبھی کاغذ کا ایک پرزہ بھی اپنے پاس نہیں رکھا۔

حامد علی خاں نے اپنے زمانۂ ادارت میں نہایت سختی اور استقلال کے ساتھ اس کا لحاظ رکھا کہ ہمایوں ہر ماہ کی مقررہ تاریخ پر باقاعدہ شائع ہوا کرے۔ یہ پابندی [illegible] ایک امتیازی وصف بن گئی اور اس کا انحصار [illegible] مگر آپ کے بعد آنے والوں نے ہمایوں کا یہ امتیاز ختم کر دیا۔

[illegible] میں ہمایوں کی ادارت چھوڑ کر حامد علی خاں نے پنجاب یونیورسٹی سے [illegible] میں [illegible] کی سند لی۔ اور پھر [illegible] میں [illegible] کالج [illegible] میں داخلے [illegible] کی تیاری شروع کی۔ [illegible] چھوڑ دی۔

[illegible] کالج کی طالب علمی کے دنوں میں بھگت سنگھ اور [illegible] جیسے پرجوش نوجوانوں کو پھانسی کے تختے پر لٹکایا گیا [illegible] کی لاشیں [illegible] فیروز پور کے قریب [illegible] میں بہا دی گئی۔ لاہور میں ان کے ماتمی جلوس نکلے۔ جب ایک ایسا ہی جلوس [illegible] کالج کے سامنے سے گزرا۔ تو آپ نے دیکھا کہ نوجوانوں کی آنکھیں پرنم ہیں۔ وہ بے حال [illegible] غم کی مجسم تصویر بنے۔ سر جھکائے ایک ماتمی جلوس کی صورت میں جا رہے ہیں۔ اور پوری فضا پر سوگ طاری ہے۔ بھگت سنگھ نیشنل کالج میں ان کا شاگرد رہ چکا تھا۔ بس پھر کیا تھا۔ دبی ہوئی بارود کو آگ لگ گئی۔ ایک شعلہ دل میں بھڑکا اور آپ نے آگے بڑھ کر بے اختیار بھگت سنگھ زندہ باد کے تین نعرے لگائے۔ جن سے جلوس میں جوش اور حرارت کی لہر دوڑ گئی۔ چنانچہ جلوس ان کی آواز پر زندہ باد کے نعرے بلند کرتا ہوا آگے نکل گیا۔ اس کے بعد آپ نے پلٹ کر دیکھا تو پیچھے دوسرے طلبا اور اساتذہ کے ساتھ [illegible] کالج کے

پنجاب لٹریری لیگ اور ادبی حلقوں کی اس جماعت پر مشکل رہے تھے۔

۱۹۳۸ء میں حامد علی خاں نے مولانا تاجور نجیب آبادی کی خواہش اور مشورے کے مطابق انجمن اردو سبھا قائم کی جس کے مستقل سرپرست پشت پناہ ... اور نائب صدر ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر۔ پروفیسر نیازی۔ ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ آزاد ... جیسے ڈاکٹر بھٹناگر کے زیر اہتمام پنجاب یونیورسٹی کی کیمیکل لیبارٹری میں ہوا کرتے تھے۔ وہ اُردو کے دلدادہ شیدا تھے۔ اس لئے سبھا کی کارروائی میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ علامہ کیفی نے اس سبھا میں بہت سے دلچسپ اور مفید مقالے پڑھے جن میں سے "نئی شاعری کا پہلا شاعر" "ذکیہ ..." وغیرہ کی بڑی مقبولیت ہوئی بعد میں رسالہ اردو اور ہمایوں میں بھی چھپے اور کیفی صاحب کی کتاب منشورات کی زینت بھی بنے۔ شاید ۱۹۴۰ء میں یہ سبھا بشیر احمد کی "انجمن اردو" میں مدغم کر دی گئی۔

کچھ مدت بعد حامد علی خاں ایم۔ اے عربی کی تحصیل کے لئے اورینٹل کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ مگر دوسرے سال کے آخر میں آپ کے دوست ن م راشد نے آپ کو بطور مشیر ادبی آل انڈیا ریڈیو دہلی میں کام کرنے کی دعوت دی۔ اور آپ قیام دہلی کے شوق میں کالج چھوڑ کر دہلی چلے گئے۔

ان دنوں آپ اورینٹل کالج لاہور کے دارالاقامہ میں مقیم تھے تو انڈین نیشنل کانگرس کی طرف سے یوم آزادی منایا جانے لگا۔ ہندو طالب علموں نے اس موقع پر کانگرس کا جھنڈا لہرانے کی تیاری کی۔ انہوں نے حامد علی خاں کو اس تقریب میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ مگر آپ نے کہا کہ چونکہ کانگرس مسلمانوں کی قومی حیثیت کو تسلیم نہیں کرتی اس لئے میں اس میں شریک نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ادھر ہندو نوجوانوں نے کانگرس کا جھنڈا نصب کیا۔ ادھر مسلمان طلبہ نے مسلم لیگ کا جھنڈا گاڑ دیا۔ چونکہ کانگرس اور مسلم لیگ دونوں جماعتیں حکومت کے خلاف تھیں۔ اس لئے کالج کے ارباب حل و عقد نے اسی میں اپنی عافیت سمجھی کہ یونین جیک بھی کھڑا کر دیا جائے۔ یونین جیک دیکھ کر ہندو طلبہ سخت ناراض ہوئے اور انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اسے کس طرح اکھاڑ دیا جائے۔ حامد علی خاں کو جب انگریزی جھنڈا نصب کئے جانے کا حال معلوم ہوا۔ تو ان کی قومی غیرت ایکدم جوش میں آگئی۔ اور آپ نے کانگرس پارٹی کے نوجوانوں سے کہا کہ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ اس کے بعد آپ نے ان کی قیادت ہاتھ میں لے کر بورڈنگ ہاؤس کے سپرنٹنڈنٹ کے سامنے نہایت تیکھے الفاظ میں اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ نوجوانوں کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا کہ بورڈنگ میں ہندو طالب علم رہتے ہیں۔ اس لئے کانگرس کا جھنڈا لہرانا سمجھ میں آتا ہے۔ یہاں مسلمان طالب علم بھی مقیم ہیں۔ اس لئے مسلم لیگ کا جھنڈا بھی لہرایا جائے تو مقام تعجب نہیں۔ میرا سوال یہ ہے کہ اس بورڈنگ ہاؤس میں انگریز کون ہے جس کی خاطر یونین جیک لہرا رہا ہے؟ اس احتجاج کے کچھ دیر بعد بورڈنگ ہاؤس اور کالج کے منتظمین کو یونین جیک اتارنا پڑا۔

اسی روز پچھلے پہر میاں بشیر احمد مدیر ہمایوں نے بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے اعزاز میں دعوت چائے دی۔ جس میں اورینٹل کالج کے پرنسپل مولوی محمد شفیع اور حامد علی خاں دونوں شریک تھے۔ مولوی عبدالحق نے ازراہ تفنن پرنسپل محمد شفیع سے پوچھا۔ آپ کے کالج میں تو قومی جھنڈا لہرانے پر کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی؟ آپ کو چاہئے تھا کہ آپ بڑے پیڑ کا جھنڈا کھڑا کر دیتے۔ حامد علی خاں فوراً بول اٹھے کہ جی ہاں بڑے پیڑ کا جھنڈا کھڑا کر دیا گیا تھا۔ مولوی صاحب نے پوچھا کیا؟ کہا۔ یونین جیک۔ اس پر بہت قہقہہ پڑا۔

جب حامد علی خاں آل انڈیا ریڈیو دہلی میں تھے۔ تو ان سے وہاں کے افسروں نے ریڈیو پر نشر کرنے کے لئے اُردو کے قدیم و جدید ممتاز شعراء کے کلام کا انتخاب کرایا۔ اور تمام دواوین اور یہ منتخب کلام جو بڑی کاوش سے جمع کیا گیا تھا ایک الماری میں بند کر کے ان کی تحویل میں دے دیا۔ حامد علی خاں نے منتخب کلام کی دو نقلیں کرائیں۔ ایک نقل دفتر میں ان کے پاس محفوظ رہی۔ اور دوسری بوقت ضرورت استعمال ہوتی رہی۔

جب برعظیم پاکستان و ہند میں ۱۹۴۷ء کی قیامت برپا ہوئی اور دہلی میں بھی فتنہ و فساد اور قتل و خونریزی کی آندھی تیزی سے چلنے لگی تو حامد علی خاں نے فیصلہ کیا کہ جس طرح بھی ہو آگ کی اس دہکتی ہوئی بھٹی سے نکل کر لاہور پہنچنا چاہئے۔ مگر شہر میں قتل و غارت کا بازار گرم تھا سڑکوں پر اور گلیوں میں خون مسلم سے جل

[illegible]

[illegible] ... یہ بات آپ کے مہیا کی ہوں۔

[illegible] ایک خوبصورت ... [illegible] ... حقیقت

[illegible] ... جیسے کیسے ... [illegible] ... معرفت ... [illegible]

ایک ... پہلی چیز ... سے خالی نہیں۔

حامد علی خاں ... [illegible] ... ایک ہندو ... [illegible] ... قریب ... [illegible] ... ہو گئے۔ اس نے کچھ ... [illegible] ... حامد علی خاں نے ... [illegible] ... اپنے قریب ... [illegible] ... خواب ... [illegible] ... حامد علی خاں ... [illegible] ... پاس ... [illegible] ... کر دو۔

اس قسم کی ... [illegible] ... ہندو ... [illegible] ... کسی طرح ... آگئے اور ۹ ستمبر ۱۹۴۷ء کی ... [illegible] ... پہنچ گئے۔

دہلی سے لاہور آنے کے بعد ۱۹۴۸ء میں ... [illegible] ... اردو ... [illegible] ... حامد علی ... [illegible] ... میں گزرا۔ البتہ صحافتی سیاست کا خوب تجربہ حاصل ہوا۔

اس کے بعد ... [illegible] ... کی ادارت سنبھالی ... [illegible] ... ادارہ ... [illegible] ... وقت ... [illegible] ... کے بند ہو جانے کے بعد اب تک اپنا ذاتی ... [illegible] ... ہیں ... [illegible] ... خود ہے۔

حامد علی خاں ایک نرم ... [illegible] ... انسان ہیں۔ [illegible] ... بہت متواضع ... [illegible] ... عزت پسند اور گوشہ گیر ہیں۔ خلوت ہی کو ... سمجھتے ہیں۔ بالکل الگ تھلگ زندگی گزارنے کے عادی ہیں۔ تنہا نشینی ... [illegible] ... محسوس کرتے ہیں۔ ادبی مجالس میں بھی شاذ و نادر ہی شریک ہوتے ہیں۔ ... [illegible] ... تعصب سے ... ہیں۔ ذات پات کی تمیز کو اچھا خیال نہیں کرتے۔ ... پنجابی ہونے کے باوجود پنجابی کھانے کی بجائے پاکستانی کھانا ... [illegible] ... مولانا مودودی اور اس قسم کے شخصی ... [illegible] ... سے سخت نفرت ہے۔ نام و نمود بھی پسند نہیں کرتے۔ اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی انھوں نے کبھی کوشش نہیں کی۔ یہاں تک کہ دیباچہ نگاری کو بھی ... شہرت کا ایک ذریعہ سمجھ کر اس سے کتراتے ہیں۔ مثلاً ایک دفعہ ڈاکٹر ... [illegible] ... کا یہ ... [illegible] ...

بات یہ ... [illegible] ... ایک کتاب کا دیباچہ ان سے لکھوانا چاہتے تھے مگر آپ کسی طرح راضی نہ ہوتے تھے۔ یہ ان کے اصول کے خلاف تھا۔ کتاب کا نام ... [illegible] ... دوسرے افسانے" تھا۔ ... [illegible] ... اس وقت ... [illegible] ... مسودہ زبردستی چھوڑ کر چلے گئے ... [illegible] ... مگر اس کے کچھ عرصہ بعد ... [illegible] ... کرنے کے لئے ولایت روانہ ہو گئے۔ ادھر حامد علی خاں ... [illegible] ... مقدمہ لکھنے کی ... [illegible] ...

بات آئی گئی ہو گئی۔ لیکن اس کے کچھ عرصہ بعد ... [illegible] ... کے ... [illegible] ... افسانے" دیکھ کر حیرت ہوئی

[illegible] کے نام سے مقدمہ ہو چکا تھا۔ جس کی [illegible] ترقی پسند [illegible] حامد علی خاں [illegible]
[illegible] نہ ہو۔ اس خیال سے کہ وہ

نالہ کرتا ہوں تو اندیشۂ رسوائی ہے

[illegible] صاحب ولایت سے واپس آ گئے۔ تو ان سے شکایت کی۔ انھوں نے کہا میں نے تو کہیں [illegible] کے حق میں بیان دیا تھا۔ [illegible] نے موقع پر اپنا آدمی حامد صاحب کے پاس مقدمہ لڑنے کے لئے بھیجا۔ مگر وہ نہ جیتے۔ اس پر [illegible] اس کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ اس جواب سے حامد گلہ بے جا ثابت ہو گیا تھا۔ آپ کو تسلی تو ہو گئی۔ مگر آپ مروت کی وجہ سے خاموش ہی رہ گئے۔

آپ خودداری سے بھی زیادہ ایمانداری کے قائل ہیں۔ صداقت۔ راست بازی اور جرأت کا یہ عالم ہے کہ جو بات منہ پر کہہ دینے سے کسی نہیں [illegible] احساس کا حق پیدا نہیں کرتے کہ اس سے کوئی خوش ہوتا ہے یا ناراض۔ امروز کی ادارت کے زمانے میں سعادت حسن منٹو کا ایک افسانہ اشاعت کے لئے آیا۔ آپ نے دیکھ کر واپس کر دیا کہ یہ شائع نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ یہ مملکت پاکستان کے خلاف ہے۔ اس میں پاکستان کی توہین کا پہلو نکلتا ہے [illegible] اس مضمون کے مختلف حصوں میں مختلف بیہودگیوں کی طرف اشارہ کر کے بار بار پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگایا گیا ہے۔ منٹو کی درخواست پر مولانا چراغ حسن حسرت کی رائے پر فیصلہ ٹھہرا۔ انھوں نے فرمایا کہ مضمون تو اچھا ہے۔ مگر فی الحال اسے شائع نہ کیا جائے۔

اس کے چند سال بعد جب حسرت۔ منٹو اور پطرس بخاری کسی مجلس میں جمع ہوئے تو حسرت نے منٹو کی دلجوئی کے لئے مذاق کے طور پر کہا کہ آپ کا افسانہ تو بہت اچھا تھا۔ مگر حامد علی خاں نے اسے شائع نہیں ہونے دیا۔ بخاری نے کہا۔ یہ عجیب بات ہے کہ چیف ایڈیٹر آپ ہوں۔ آپ کوئی مضمون شائع کرنا چاہیں اور وہ شائع نہ ہو سکے۔ حسرت نے کہا ان صاحب! محمود بھی تو آخر زندہ آدمی ہیں۔ انھوں نے میرے ہاتھ باندھ رکھے ہیں۔ منٹو نے خود یہ واقعہ حامد علی خاں کو سنایا۔ حامد علی خاں نے حقیقت حال بیان کی۔ چاہی تو منٹو نے کہا کہ آپ جو کچھ کہتے ہیں وہی درست ہے۔ حسرت صاحب کی بات درست نہیں۔ البتہ ان کے حق میں ایک بات جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس وقت وہ نشے میں تھے۔

اس کے بعد ایک وقت ایسا بھی آیا جب حامد علی خاں نے اصرار کر کے خود منٹو سے مضمون مانگا۔ اس نے مضمون لکھنے سے تو انکار نہ کیا۔ مگر کہا: حامد صاحب! آپ تو انتہا پسند ہیں میرا مضمون برداشت نہیں کر سکیں گے۔ اس واقعہ سے حامد علی خاں کی سیرت کے کئی پہلو روشنی میں آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جو کام آپ کے سپرد کیا جاتا ہے۔ اسے پوری ذمہ داری۔ فرض شناسی اور محنت سے نباہتے ہیں۔ دوسرے پاکستان کی نظریاتی مملکت کے خلاف کوئی ایسی بات سننا گوارا نہیں کرتے جس سے اس کا مذاق اڑانا مقصود ہو یا جس سے اس کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ آپ کی سلامت روی اور اصابت رائے کا دوست دشمن سب کو اعتراف ہے۔

آپ اس قدر ترقی پسند بھی ہیں کہ روس۔ جرمن۔ اٹلی۔ چین۔ امریکہ۔ فرانس اور دوسرے ملکوں کے بڑے بڑے آدمیوں اور تحریکوں کا ذکر اپنے پرچوں میں ہمیشہ چھیڑتے رہتے ہیں۔ تاکہ معلومات عامہ ترقی کرے اور لوگوں کو اچھی باتیں اختیار کرنے کا موقع ملے۔ مگر اس خیال سے انہیں سخت وحشت ہوتی ہے کہ غلامانہ ذہنیت کے ساتھ اندھا دھند دوسرے ملکوں کے اصول اور نظریئے اپنے ملک پر مسلط کر لئے جائیں۔

حامد علی خاں نثر بھی خوب لکھتے ہیں اور نظم بھی۔ غزل بھی نہایت عمدہ کہتے ہیں۔ اور نظم بھی۔ ان کا کلام پاکیزہ خیالات۔ رنگینی و بلند تخیل اور دلپذیر انداز بیان کا حامل ہوتا ہے۔ دل میں سوز و گداز کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ آپ نے جب سے ہوش سنبھالا ہے۔ اردو کی بے لوث خدمت اور ادب و شعر کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ طمع اور لالچ ان میں نام کو بھی نہیں۔ اپنی حالت پر قانع اور مطمئن ہیں۔ سازش۔ جوڑ توڑ۔ دھڑے بندی۔ ہنگامہ آرائی اور پارٹی بازی کی لعنت میں کبھی گرفتار نہیں ہوئے۔ فرقہ وارانہ تعصب سے بھی ان کا دامن پاک ہے۔ مختلف فرقوں کے آپس کے جھگڑوں میں دلچسپی نہیں لیتے ہیں دلچسپی کے متعلق جو یہ الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ محبت یا نفرت کرنا نہیں جانتے۔ وہ محبت کا جواب محبت سے دیتے

[illegible] ہی [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کیا ہے۔

افسانۂ عشق [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ہے

غزل کے [illegible] ملاحظہ ہوں

[illegible] محبت کی
[illegible] محبت کی
[illegible] محبت کی
[illegible] محبت کی
[illegible] تیری محبت کی

پھر یہ شعر دیکھیے

[illegible] حسرت [illegible]
[illegible] دو جہاں سے [illegible]

بقول منصور احمد ساحر کی شاعری کی ایک دلکش خصوصیت وہ ابہام انگیز الفاظ ہیں [illegible] کوئی تصویر کھینچتا ہے تو اپنے قلم سے ایک [illegible] سے گزر کر اس میں [illegible] ہو جاتی ہے۔ [illegible] یہ شعر دیکھیے

گلزار کے سایوں میں وہی حشر بپا ہے
پھولوں سے ابھی تک تری خوشبو نہیں جاتی

"وہی" اور "ابھی تک" دو الفاظ ہیں جو اس شعر میں کئی افسانے کہہ رہے ہیں۔ وہ کیا حشر تھا جو گلزار کے سایوں میں بپا ہوا۔ اور کیوں پھولوں سے ابھی تک اس کی خوشبو نہیں جاتی؟ صرف وجدان ہی ان سوالات کی پہنائی کو پا سکتا ہے۔

ایک اور شعر دیکھیے

آنکھیں تری آنکھوں سے ملائی نہیں جاتیں
سر اب ترے قدموں سے اٹھایا نہیں جاتا

"اب" نے ایک پورا افسانہ پیدا کر دیا ہے۔ کیوں اب آنکھوں سے آنکھیں نہیں ملائی جاتیں۔ کیوں اب سر قدموں سے نہیں اٹھتا۔ سوچیے تو دل میں تصورات کی ایک دنیا بس جاتی ہے۔

اقبال کا [illegible]

[illegible] ان کی وحشت [illegible]

کرنے کی [illegible] ہے ۔

خوار وحشت ہملی دیتی سلطی کا بیچی ذرق
ممن سرپا طاق تا بچی کاتی جب ما کا ن
وصلتی و لکواتی کمر کواتی بیتیاں جب یکیں
سیاہ گل قطار اندر قطار از قطب مہ آئی

[illegible] سے

سب جو ٹمار زندگی چپ چاپ ساحل پہ ان کمی
اٹھی موج اٹھے سدہ جب کی کشت مہ کر گیا

پہلے مصرعے میں ساحل دریا کی خاموشی کو تکمیل تک پہنچا دیا ہے اور پھر دوسرے مصرعے میں اس خلیج انسانی سکوت کو ایک نہایت ہی مختصر لمحے سے توڑ کر اس تقابل کو نمایاں کیا ہے۔ جس کا اندازہ کسی دریا ہی کے کنارے پہ کھڑے ہو کر ہی ہو سکتا ہے۔

رئیس احمد جعفری

ارشد تھانوی

مولانا حالی بھی عنفوان شباب میں اپنی نئی نویلی دلھن کو اس کے خوشحال میکے میں بیچارا پانی پت سے دلی بھاگ نکلے تھے تاکہ اپنی تعلیم کی تکمیل کر سکیں اور میں ایک ایسے ہی طالب علم کو جانتا ہوں جو اتنی سی عمر میں اسی علمی تشنگی کے تقاضے سے گھر چھوڑ کر چل دیا۔

یوپی کے ضلع سیتاپور میں ایک مردم خیز قصبہ خیرآباد ہے، وہاں کے مکتب میں ایک تیرہ سالہ بچہ پڑھا کرتا تھا۔ معمولی نوشت و خواند اور ابتدائی کتابیں پڑھنے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ اس قصباتی مکتب میں بقدر ذوق اس کی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ کسی بڑی درسگاہ کا طالب علم بننا چاہیے۔ ماں اور بڑے بھائی اس کمسنی میں اپنے سے علیحدہ کرنا اور کہیں دور بھیجنا نہ چاہتے تھے۔ دل کے اندر خواہش زور پکڑتی رہی۔ ایک روز ماں نے کسی بات پر خفا ہونا، بیٹا تو خفا ہونے کا بہانہ ہی ڈھونڈھتا تھا۔ موقع پاکر گھر سے نکلا اور لکھنؤ پہنچ کر دم لیا۔ یہ بات رہنے دیجیے کہ یہ سفر جائز طریقہ پر طے کیا تھا۔ یا ریل کی مفت سواری پر ہاتھ مارا تھا، اگر آخری حل کیا تو بھی یہ گناہ کسی طرح ثواب سے کم نہیں۔ بہرحال لکھنؤ پہنچ کر اپنی ذاتی کوشش سے دارالعلوم ندوہ میں داخلہ لیا۔ اور پڑھنے کا جو حق ہوتا ہے، وہ پورا پورا ادا کیا۔ جتنی جتنی علمی مدارج میں ترقی کی، اتنی ہی تحریر و تقریر میں بھی صلاحیت پیدا کی مگر درجہ تکمیل تک پہنچتے پہنچتے کارکنان ندوہ کے خلاف سرکشی کی۔ "انجمن اصلاح" کے نام سے طالب علموں کی ایک انجمن بنائی تھی۔ اس کے سکریٹری کی حیثیت سے ہڑتال کرا دی۔ اور جب معاملات رفع دفع ہو گئے تب بھی بغاوت کا جوش ٹھنڈا نہ پڑا۔ اور اس دارالعلوم میں رہنا گوارا نہ کیا۔ معتمد ندوہ اس زمانہ میں سید سلیمان تھے۔ وہ اس ہونہار طالب علم پر بہت شفقت کرتے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ بقیہ تعلیم نامکمل رہے۔ اپنے خط کے ساتھ ڈاکٹر ذاکر حسین کے پاس دہلی بھیج دیا۔ بقیہ علمی مراحل جامعہ ملیہ میں طے ہو گئے۔ اس کے بعد ندوہ میں پہنچ کر بھی سند فضیلت حاصل کر لی۔ دینی و دنیوی تعلیم کا یہ پیکر اب مولوی رئیس احمد جعفری تھا۔ میری ان کی پہلی ملاقات ۱۹۳۲ء میں ہوئی جب یہ روزنامہ خلافت بمبئی کے چیف اڈیٹر تھے۔ اور خلافت ویکلی کے نام سے ایک علمی و ادبی ایڈیشن بھی جداگانہ شائع کرتے تھے۔ ایک روز میں علمائے اسلام کا کوئی تذکرہ دیکھ رہا تھا۔ متعدد بزرگانِ کرام کی نسبت معلوم ہوا کہ وہ صرف پڑھنا جانتے تھے، لکھنا انہیں نہ آتا تھا۔ ان کی تصانیف دوسروں کے قلم کی رہین منت ہیں۔ جو حیرانی

کے شاگرد ہوتے تھے۔ اسی وقت ڈاک آئی۔ ایک لفافہ جو کرنا سہل تر شاندار ہیڈ پر پاشا خلوص مرقوم تھا۔ الفاظ بہت خوب ، جماعت بہت اچھی ، مگر حروف بڑے ادھورے بیٹھے ۔ میں عرصہ دراز تک کرتے انسپکٹر ، ماہرین سینکڑوں نہیں ہزاروں بد خط لکھی ہوئی تحریریں پڑھ چکا تھا۔ نعمانی جعفری صاحب کا خط با تکلف پڑھ لیا اور سوچنے لگا کہ حضرت علوم مشرق کے مستند عالم ہیں ، بقسمتی سے فیل ہو چکی ہے۔ ورنہ شاید با مل لکھنا سیکھتے۔ اور قدیم علماء کی طرح علم کے ساتھ فن پر توجہ کرنا غیر ضروری سمجھتے ۔ یہ اب سے ۴۰ برس پہلے کا ذکر ہے ۔ اب تو یہ انداز نگارش اور بھی پختہ ہو گیا ہوگا ۔ معلوم نہیں ان کی تصانیف کی کتابت کیونکر ہوتی ہے ۔ کاتب رُک رُک کر ان کی لکھی پر کھی ہی تو نہیں بدلتے پھر بھی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خط خوشنما نہ ہے ۔ اور لگے دستوں کے انداز تحریر کا دلکش نمونہ دور حاضر کے ادیب و انشاء پرداز اور صحافی اتنے بڑے بڑے دائرے نہیں کھینچتے ۔

میں بالالتزام خلافت دہلی کے لئے نظم و نثر لکھا کرتا تھا ۔ اس لئے ہمارے غائبانہ ربط قائم ہو گیا ۔ کچھ دنوں بعد بھوپال کے ایک صاحب جامعہ ، ذریں ، اپنی تعلیم کی تکمیل کر کے واپس آئے وہ جعفری صاحب کے دوست تھے انہیں بھی اپنے ساتھ گھسیٹ لائے ۔ میں انہیں پہلی دفعہ دیکھ کر کچھ بھونچکا سا ہو گیا ۔ دبیز جسم کے داڑھی لگائے نوجوان مولانا ۔ اس پر طرہ یہ کہ بہت کم سن اور سنجیدہ بھی ۔ خلافت دہلی میں ایک بہت ہی دلچسپ افسانہ قسط وار ان کا شائع ہوا کرتا تھا ۔ جس میں موجودہ معاشرت کے بعض نازک پہلو بڑی خوبی سے اجاگر کئے جاتے تھے میں سوچنے لگا کہ یہ ٹھوس نہیں محض قسم کا آدمی ایسی اہلک بینی اور نکتہ سنجی کا اہل کیسے ہو سکتا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ خود نہیں لکھتے کسی سے لکھوا کر اپنے نام سے شائع کر دیتا ہے ۔ لیکن مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ بدوران طالب علمی جبکہ ۱۵ سال کی عمر تھی یہ ماہنامہ حجاز کی ادارت رکھتے تھے ۔ جو ان کے بڑے صاف مولوی عتیق احمد نے دہلی سے نکالا تھا اور جب جامعہ ملیہ میں تھے تو مولانا محمد علی جوہر کی سوانحمری لکھی تھی جو مکتبہ جامعہ نے چھاپی اور شائع کی ۔ ان کے نانا مولوی سید نیاز احمد ڈپٹی پولیس سے پنشن لے کر بھوپال میں سپرنٹنڈنٹ پولیس ہو گئے تھے ۔ میں ان کی نظر میں بھی رہ چکا تھا ۔ اور چونکہ وہ میرے والد اور چچا کے دیرینہ دوست تھے ۔ ان کا مجھ پر شفقت بھتیجا بھی رہا تھا ۔ اس نے خود دیکھے ان کے اس عزیز ترین نواسے کے حالات سن چکا تھا ۔ پس دل کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیا کہ ؎

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ

اس لئے دیئے ہیں کہ زمی و اخلاق ملاقات کے دس سال بعد

حالات نے ملایا مجھے میں بیٹھ بیٹھا

اپنی سادگی کی اطلاع جعفری صاحب کو بھی رسمی طور پر دے دی تھی ۔ خیال تھا کہ جب ملیں گے تو اپنے بڑے نانا حضرت ریاض کے مصرعہ کی ہو بہو تصویر ہوں گے ۔ یعنی

اک عبا پہنے عصا تھامے عمامہ باندھے

مگر یعنی ۔ ہر دم بہ لباس دگر آں یار برآمد ۔ ایک نوجوان ملنے آیا ۔ دبلا پتلا ۔ اکہرے جسم کا عینک شیروانی نے چھپایا نہیں ۔ بڑے خلوص سے علیک سلیک کی ۔ بمشکل پتہ چلا تو یقین کرنا مشکل ہو گیا کہ یہ وہی جعفری ہیں ، جو ایک بھاری بھر کم مولانا کے پیکر میں بھوپال تشریف لے گئے تھے ، گفتگو کی تو منہ سے پھول جھڑنے لگے ۔ خوب کھل کے باتیں ہوئیں ۔ معلوم ہوا کہ اپنا ذاتی پریس قائم کر لیا ہے ، اور ایک روزنامہ بھی کامیابی سے نکال رہے ہیں ۔ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری ہے ۔ قائداعظم کی سوانحمری لکھ رہے تھے یا لکھ چکے تھے ۔ ان دنوں کٹر کانگریسی اور بھوپال اسٹیٹ پیپلز کانفرنس کی مجلس عاملہ کا سرگرم ممبر تھا ۔ اس لئے سیاسی موضوع پر بحث چھڑ گئی ۔ یہ حقیقت ہے کہ اس سے پہلے متعدد کوشش کے باوجود میں کانگریس سے بدظن نہ ہوا تھا ۔ لیکن جعفری صاحب سے ایک گھنٹہ ردوکد کرنے کے بعد میں تہ دل سے مسلم لیگ کا حامی ہو گیا

یاد ہے کہ جب جب آپ پاسبان سے اسٹیشن مسلم لیگ سول لائنز [illegible] اسٹیشن [illegible] سے تشریف لاتے تھے
اسٹیشن مسلم لیگ کی [illegible] بنا دیا گیا تھا۔ [illegible] اجازت چاہتے تھے [illegible]۔ [illegible]
تم کو بھی لگتی ہے

بندہ دز جنت سے [illegible]   [illegible]

[illegible]   [illegible]

وقت گزرتا رہا۔ [illegible] ہندوستان [illegible] پاکستان [illegible]
[illegible]
کی [illegible] مختلف موضوعات پر تحریر [illegible] اسلامی [illegible] موضوعات میں کوئی
ایسا موضوع نہ تھا جس پر انہوں نے تصنیف و تالیف [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
کچھ [illegible] بقول ان کے [illegible] تو سب کچھ [illegible]
[illegible] نہیں پڑھتا ہے

بھولی ریاں جوانی کی بہار آخر [illegible]   [illegible] عشق کی [illegible]

جعفری صاحب از راہِ محبت مجھے اپنی دو کتب تحفتاً دیتے ہیں جو میرے [illegible] ایک ناول بھی [illegible] دیا۔ جو تازہ شاہکار نہیں بلکہ ۱۹۴۹ء کا چھپا ہوا تھا۔ میں نے دل میں سوچا۔

[illegible]

میں نے [illegible] گھر میں [illegible] پڑھنے [illegible]۔ [illegible] میز پر رکھ دیا۔ [illegible] سگریٹ [illegible]۔ [illegible]
سامنے تو تھا ہی غیر ارادی طور پر اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگا۔ [illegible] ورق [illegible]
پہلے عبارت تھی۔ ― جنت ، جہنم ، اور قیامت کی داستان ―― دونوں عبارتوں کے درمیان فلمی دنیا بھی لکھ دیا تھا۔ شبہ ہوا کہ
شاید دوزخ ، بہشت اور حشر نشر کو فلمایا گیا ہے ، اور ایسی فلم [illegible] جس طرح اپنی مذہبی روایات کو پردہ [illegible] پیش کیا کرتی ہیں ایسی ہی
کوئی عبارت کہیں جعفری صاحب تو نہیں کر بیٹھے۔ مگر اس مرد مسلمان سے ایسی توقع نہیں۔ ورق الٹا۔ جعفری صاحب نے تحریر فرمایا تھا۔

کاردار پروڈکشن سے وابستہ رہ کر ڈیڑھ برس تک میں نے فلمی دنیا کا کاروبار دیکھا۔ جنت کا لطف ، جہنم کا عذاب ، قیامت
کی نفسا نفسی سب کچھ اسی جہانِ خراب آباد میں ہے۔ یہ ناول اسی دنیا کی ایک جھلک ہے۔

جی چاہا کہ اس نئی دنیا کی میں بھی سیر کروں ، اور یہ بھی اندازہ کروں کہ رئیس احمد جعفری نے اس دنیوی منظر کو کتنی گہری نظر سے دیکھا ہے۔ چنانچہ پڑھا اور خوب پڑھا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ ایک نوجوان کے جس معروف اسٹوری رائٹر کی زبانی یہ فسانہ دہرایا گیا ہے۔ یقیناً وہ خود جعفری صاحب ہی ہیں۔ بڑی حیرت ہوئی۔ ع

مارا ازیں گیاہِ ضعیف ایں گماں نبود*

ناممکن ہے کہ کسی سوسائٹی کو بہت سے مصائب سے بچانے بغیر اس کی اصلاح کی جا سکے کہ کوئی بلیک سے وائٹ ہو جائے یا حاصل نہ ہو سکے
تجربہ پایاں میں مگر خود لگائے بغیر نہ کے ترقی اور عزت ریزے نکلے جا سکیں۔ انجان صاحب ڈوب کر اپنا بغیر اس ...

شناور بحر الفت میں کہیں ڈوب کے ہیں نکلے

جعفری صاحب کا اس گنگا سے واپس ہو کر نکل آنا معجزہ ہی ہو سکتا ہے۔ مگر یہ معجزوں کا زمانہ نہیں۔ اچھا ہوا کہ جعفری صاحب کو اپنا سے سمجھ بیٹھے گئے۔ ورنہ ممکن تھا کہ وہ بھی یہ ستائش نہ درمنہ کر بیٹھتا، اور وہ اس طرح ایثار کر اپنی ذات پر ایک بیہودہ الزام لے کر تھیسے قتول میں کارزدہ ہو جاتے۔ میں اس کو واقعی معنوں میں داد دیتا ہوں کہ انہوں نے اپنے کردار کی ایسی ہی اونچی قربانی دی ہے جیسی بعض مغربی ڈاکٹر بعض خطرناک امراض کی تحقیق و علاج کے لئے اپنے جسم اور بعض اوقات جان کی دیا کرتے ہیں۔ اور شاید مرض کی ماہیت کا اندازہ لگانے کو اس مرض کے جراثیم اپنے خون میں داخل کر لیتے ہیں۔ اور ذاتی تجربہ کے بعد اس کی مدافعت کر کے مخلوق خدا کی تکالیف دور کرنے پر قادر ہو جاتے ہیں۔ جعفری صاحب نے بھی ایک شدید ترین معاشرتی مرض کا تجربہ کر کے چاندنی کے نام سے نسخہ شفا پیش کیا ہے۔ اور خود بھی اس مرض سے پاک صاف ہو کر ادبی و صحافتی فضا میں آگئے ہیں۔ جعفری صاحب میں ایک بڑی اچھی بات یہ ہے کہ وہ کبھی کسی سے خفا نہیں ہوتے اور دوستوں کو دشمن بنانا انہیں بالکل نہیں آتا۔ حالانکہ یہ بہت آسان بات ہے۔ اور عیب یہ ہے کہ حاسدوں کو جو دشمنوں ہی کی ایک بدترین قسم ہے دولت جلانے کی ناکام سعی سے باز نہیں آتے۔ اور نا دشمناں علما کے اصول پر نقصان مایہ میں اکثر مبتلا ہو جاتے ہیں۔

شبلی بی کام

قمر تسکین

میکسم گورکی نے اپنے "روزنامچے کے پریشان اوراق" میں ذکر کیا ہے کہ ایک روز وہ کسی پارک کے قریب سے گزر رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر ادھیڑ عمر کے ایک شخص پر پڑی جو ایک بنچ پر بیٹھا کبھی پیٹ اندر کر لیتا اور کبھی اسے ابھار کر سورج کے سامنے کر دیتا تھا۔ گورکی نے قریب پہنچ کر دیکھا۔ وہ چیخوف تھا۔ گورکی نے سوال کیا۔

"کیوں میاں چیخوف، یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟"

چیخوف نے منہ اٹھا کر بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

"یار یہ دھوپ قابو میں نہیں آتی۔ میں پیٹ میں شعاعیں جمع کر کے جلدی سے روکنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن وہ نکل بھاگتی ہیں۔"

چیخوف کو سمجھانا بے سود تھا۔ گورکی اُسے اپنے حال پر چھوڑ کر اپنی راہ لگ گیا۔

شبلی بی کام دھوپ پکڑنے کی کوشش تو نہیں کر رہا۔ لیکن میں اُسے ۱۹۴۲ء سے جانتا ہوں۔ اور اگر میں اپنے علم میں ان لوگوں کی معلومات بھی شامل کروں جو اُسے مجھ سے بھی پہلے سے جانتے ہیں تو وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ گزشتہ بیس برس سے مکان میں مچھلیاں پکڑنے کی کوشش میں مصروف رہا ہے۔

مجھے ایک قریبی دوست ہونے کی حیثیت سے اُس کی زندگی کا گہرا مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ جن دنوں وہ "عالمگیر" اور "خیام" کا ایڈیٹر تھا۔ اندرون شہر کے ایک تنگ و تاریک بازار میں رہتا تھا۔ وہ اُس وقت مجرد تھا اور اس وقت بھی مجرد ہے۔ اُس نے سات روپے ماہوار پر ایک چھوٹا سا چوبارہ کرایہ پر لے رکھا تھا جو صرف ایک کمرہ پر مشتمل تھا۔ اس کی سامنے کی دیوار لکڑی کی بنی ہوئی تھی۔ جس میں تین دریچے تھے جو بازار کی جانب کھلتے تھے۔ روشندانوں میں اور بازار سے گزرنے والی بجلی کے تاروں پر جنگلی کبوتروں کی ایک فوج غٹرغوں غٹرغوں کرتی رہتی۔ کمرے کے اندر تین الماریاں تھیں۔ ایک میں آئینہ، کنگھی، کریم اور سنگھار کا دوسرا سامان پڑا رہتا تھا۔ دوسری میں کتابیں اور رسالے بُری طرح ٹھنسے رہتے

کے بکسے میں مشق کی تختیاں پڑی رہتی تھیں۔ کچھ میں چوہوں نے بل بنا رکھے تھے۔ اس تیسری الماری کے اوپر ایک طاقچہ تھا جس میں بے شمار خطوط بے ترتیبی سے پڑے رہتے تھے۔ یہ خطوط راس کماری سے ہمالیہ تک کے ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور مداحوں کے لکھے ہوئے تھے۔ ان میں قدردانوں کے خطوط بھی ہوتے اور کئی مشہور شخصیتوں کے بھی۔ بعض خطوط کے ہمراہ جواب کے لئے ٹکٹ بھی ہوتے اور جوابی لفافے بھی ـــ لیکن شبلی بی کام نے کبھی کسی خط کا جواب دیا ہو ایسا ہی ہے جیسے بقول منٹو مرحوم کے ماں بہن کی گالی دے دینا۔ وہ اپنے نام آئے ہوئے تمام خطوط پڑھ لیتا اور خط کا اپنے دوستوں سے بھی تذکرہ کرتے ہوئے اس مصمم ارادے کا اظہار کرتا کہ وہ اس خط کا جواب ضرور لکھے گا۔ اس نے اکثر ضروری خطوط لکھنے کے لئے ان کو بکسوں کی جیبوں میں اڑستے ہوئے جب جیبیں جواب دے جاتیں تو وہ ان کو نکال کر مشق کی تختیوں والی الماری کے نچلے خانے میں ڈال دیتا۔ جب وہاں بھی انبار لگ جاتا اور چوہے ان خطوط کو اپنا تختۂ مشق بنا چکتے تو وہ ان سب کو اٹھا کر اوپر طاقچہ میں ڈال دیتا۔ میں تقسیم سے قبل چھ برس تک خطوط کے اس ڈھیر کو رفتہ رفتہ بڑھتے دیکھتا رہا لیکن اُسے ان کے جواب دینے کی فرصت نہ مل سکی۔ اُسے جواب دینے کی فرصت ہی کہاں ملتی تھی؟

وہ دن چڑھے چارپائی سے اٹھتا اور وہ بھی اس لئے کہ بستر اور بہشتی کو آنا ہوتا۔ وہ ہمیشہ اس کا خیال رکھتا کہ سامنے سونے نہیں دیتے۔ پھر یہ عذاب ناگزیر تھا کیونکہ اگر وہ بہشتی کو رکوا دے تو کمرہ تو پانی کہاں سے آتا؟ صفائی کون کرتا؟

وہ بیدار ہو کر سب سے پہلے لوٹا ہاتھ میں پکڑ کر چھت پر چڑھ جاتا۔ شاید دن بھر میں یہی ایک موقع ایسا ہوتا جب وہ اردگرد کی منڈیروں اور چھتوں پر جھانک سکتا۔ لیکن اس کے شریک بہن کا یہ عالم تھا کہ اکثر لوگ مالک مکان سے یہ کمرہ کرایہ پر مانگنے چلے آتے۔ کیونکہ ان کے خیال میں یہاں کوئی بھی نہ رہتا تھا۔ پھر وہ شیو بناتا، غسل کرتا اور کپڑے پہن کر سیڑھیوں سے اتر کر ساتھ کے پان فروش سے سگریٹ کی ایک ڈبیا اور ایک پان خریدتا اور ہیرا منڈی کے ایک ہوٹل "بسم اللہ ہوٹل" کا رخ کرتا۔ رستے میں اس کے ایک ہندو حلوائی کی دوکان تھی۔ وہ اس ہندو حلوائی سے اکثر پیڑے کی مکھن کی ٹکیہ خریدتا اور بسم اللہ ہوٹل میں پہنچ کر ایک بینک چائے کا آرڈر دیتا۔ یہ چائے دودھ، چائے کے رس اور چینی کو ملا کر ایک ہی ساتھ ابالی گئی ہوتی۔

لڑائی آئی اور گئی، موسلا دھار بارش ہوئی، دام لگ گئی، خاکساروں پر گولی چلی، فسادات ہوئے لیکن شبلی بی کام کے اس معمول میں کبھی فرق نہ آیا۔ وہ اپنے اس روز مرہ پر ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۷ء تک عمل پیرا رہا۔

"بسم اللہ ہوٹل" سے نکل کر وہ تحصیل بازار کی راہ لیتا۔ یہاں "عالمگیر" اور "خیام" کا دفتر تھا۔ بشرطیکہ اسے دفتر کہا جا سکے کیونکہ میرے خیال میں اُسے دفتر کی بجائے کباڑ خانہ کہنا زیادہ موزوں تھا۔ جگہ انتہائی تنگ اور بے ڈھب سے اور سب سے زیادہ مصیبت عالمگیر پریس کی گڑگڑاہٹ۔ "سید مٹھا بازار" سے "تحصیل بازار" کی طرف چلیں تو اس بازار کے بائیں ہاتھ ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ اسی مسجد کے ساتھ ایک بڑا سا پھاٹک ہے اس پھاٹک سے داخل ہوں تو دو بڑی سی مشینیں نظر آتی تھیں۔ یہ مشینیں پہلی جنگ عظیم کا ماڈل تھیں۔ اس لئے پوری قوت سے چیختی چلاتی رہتی تھیں ان کے پہلو میں ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ جہاں حافظ محمد عالم مرحوم ایک لمبے بازوؤں والی گہری آرام کرسی پر بیٹھے رہتے تھے۔ ایک میز کرسی شبلی بی کام کے لئے مخصوص تھی۔ دوسری میز ایجنسی کلرک کے سپرد تھی۔ تیسری میز اشتہارات کے زیر استعمال تھی۔ چوتھی میز پر ایک کلرک بیٹھتا تھا اور پانچویں میز ایک ٹائپسٹ کو دے دی گئی تھی۔ میں آج بھی اس چھوٹے سے کمرے کا تصور کرتا ہوں تو "بلیک ہول" کے واقعہ پر یقین کر لینے کو جی چاہتا ہے۔ حیرت ہے کہ اس قدر تنگ و تاریک کمرے میں اتنے لوگ، اتنی میزیں اور اتنی کرسیاں کس طرح سما جاتی تھیں۔ پھر ملاقاتی بھی تو ہوتے تھے اور حافظ صاحب سے کاروبار کرنے والے لوگ اس پر مستزاد!

اس کمرے کی ایک چھوٹی سی واحد کھڑکی سڑک کی جانب کھلتی تھی۔ جہاں پانچ سات منٹ کے بعد ایک آدھ پھیری والا صدا لگا کر گزرتا تھا۔ [illegible] ـــ کھیلوں گلگ ـــ نان کباب ـــ آلو چھولے ـــ کتابوں رسالوں کی ردی ـــ پرانی بوتلیں ـــ منجی پیڑی ٹھکوا لو۔

— بیداری کی کیفیت میں — ویرانہ کی طرح — متقدمین کے متاثرۃ الذہن ضمیر — "عشق کیا ہے؟" —
جیمز جوائس — ادب برائے ادب — نہایت اعلیٰ، نہایت تحسین، نہایت عمدہ، نہایت اچھے ہیں؛ لیکن ان سب باتوں کا غالب
تعلق ہم پہلی بار دیکھتے ہیں۔ [illegible] اسی وجہ سے ہم [illegible] اس عمدگی کے لیے اردو میں مسلسل دس برس تک شبلی نے پہلے [illegible]
کئے اور کسی ایک ادبی سکول کے گرد نئے حلقے کا کام دیا۔ ایک دفعہ اس نے شاعری [illegible] "پیرس کی شاموں" کے متعلق کہا تھا کہ بہت سے
کے پہلے بنگلے ہیں گلیاں گھومتی ہیں۔ سڑکیں پھیلتی ہیں اور پھر چپ۔ اس شاعری کا اندازہ سطح پر رہ جانا ملتا ہے لیکن یہ بھی مشتبہ ہے کہ
اس کا شعور گم ہو جاتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم نے [illegible] پھر کھل کر شرمندہ ہے۔ جیسے گنبد اوپر کی گردش تک گھومتے
اس کے ذہن پر بحری سی چھا گئی ہے اور اب وہ [illegible] ذہنی سطح سے نیچے [illegible] سکتا۔ اپنے خیالات کی بنا نہیں سنوار سکتا۔

شبلی کا یہ مسلسل دس برس تک مباحثوں کی صورت یا اداکاری کے [illegible] جنت [illegible] ماہنامہ عالمگیر
جیت لیتا تھا۔ اس زمانے میں جو معیار کا شمار اس وقت کے معیاری ادبی رسائل و صحافت میں ہوتا تھا۔ [illegible] سے ہمیشہ کئی کئی
ضخیم خاص نمبر شائع ہوا کرتے تھے۔ [illegible] بیش قیمت [illegible] ایڈیٹر [illegible] علامہ کی جان کے [illegible]
خوش اسلوبی سے نبھاتا وہ [illegible] ادب و صحافت میں ضرب المثل ہو چکی ہے [illegible] "ادبی اور صحافتی" [illegible] کرتے تھے۔ غالباً اسی [illegible] سے
متاثر ہو کر [illegible] نے ایک دفعہ اسے لکھا تھا۔

• اگر تمہاری طرح کا محنتی آدمی مجھے مل جائے تو میں "نگار" اس کے سپرد کر کے خود گوشہ نشینی پر جاؤں۔ اسی زمانہ میں جوش ملیح آبادی نے
اس کے کسی مقالہ کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا میں یہ رائے کا ہر گز

• محنت و جانفشانی اور عرق ریزی اس کا کام ہے۔

اسی دور میں اس نے عالمگیر کے سالنامہ پر بیس بائیس صفحات کا ایک مقالہ "لاشعور، اور اس کی زندگی اور ادب پر اثر" لکھا تو ڈاکٹر [illegible]
نے لکھا۔

• آپ کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ میں نے اتنی کتابیں نہیں پڑھیں۔

اس مقالہ پر مولانا عبدالماجد دریابادی۔ مولانا عبدالستار صدیقی، حبیب شادانی، برج موہن دتاتریہ کیفی، محی الدین قادری زور اور بے شمار دوسرے
علماء و فضلاء نے جو خراج تحسین ادا کیا وہ خطوط میں نے بھی دیکھے ہیں اور "عالمگیر" میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔

وہ اسی پریس میں بیٹھ کر حروف و حکایت کے [illegible] موتی بکھیرتا تھا۔ حتیٰ کہ اس کے کئی کئی سو صفحات کے ناول بھی اسی پریس
کی نمناک اور صندلی فضاؤں میں بیٹھ کر لکھے گئے ہیں۔

سورج ڈھلے شبلی پریس سے نکلتا اور اخبار و رسالوں کا پلندہ بغل میں داب کر سیدھا [illegible] کی طرف ہو لیتا۔ وہاں [illegible] کیفے میں
میں بیٹھ جاتا۔ سامنے کے ہوٹل سے چائے کا ہاف سیٹ آتا اور وہ چائے کی پہلی پیالی کے ساتھ ہی تازہ دم ہو جاتا۔ اس کے دوست احباب بھی وہیں
آجاتے اور یا تو رات گئے تک یہیں گپ شپ گرم رہتی یا وہ دو تین دوستوں کے ہمراہ انارکلی سے مال روڈ کا چکر کاٹتا اور بھاٹی دروازے کے رستے
واپس عالمگیر پریس میں پہنچ جاتا۔

اسی زمانہ میں احمد ندیم قاسمی نے اس کی سیروں کا حال سن کر اسے لکھا تھا کہ سنا ہے آپ پہرے کے پہرے بازار انارکلی بازار میں گھومتے ہیں
عالمگیر پریس میں "میس" کا انتظام تھا۔ ایک کاتب کھانا تیار کر دیتا اور وہ پریس کی چھت پر بیٹھ کر کھانا کھاتا۔ چائے پیتا۔ [illegible] پیٹ
کر ایک آدھ سگریٹ کے کش لگاتا اور پھر رات کے نو بجے اسی قہوہ خانہ میں آجاتا۔ سیڑھیاں چڑھ کر داخل ہوتا تو سب سے پہلے [illegible]۔

پھر شہر بھر کے تمام کتب فروشوں کو چھان مارتا۔ حاصل یہ وقت اُس کے مطالعہ کا ہوتا۔ اس وقت کسی کتاب کی جلد بندی، رنگ، چھپائی کے ساتھ اُس کے کاغذ پر بھی توجہ دیتا۔ اس کی ضرورت محسوس ہوتی وہ اُس کے کمرے پر جاتا کہ آمدنی سے جو بچتا وہ سب کتابوں ہی پر صرف ہوتا۔ جب کہ اُس کا دوست پاس ہو کر رخصت ہو جاتا۔ اس وقت وہ "حرف و حکایت" ایسی کتابوں کا مطالعہ کرتا یا کسی رسالے کے لئے مضمون لکھتا۔ اس نے اپنے افسانوں کی بیشتر کتابیں بھی اسی وقت میں لکھی ہیں۔

میرے علاوہ احسان بی اے اور میرزا ادیب کا بھی اُس کے ہاں آنا جانا تھا۔ اس لئے ہمیں ایسے وقت میں بھی کسی سے ملنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ میرزا ادیب نے اپنے ایک افسانے "عبدالرحمٰن" کا مواد شکیل کے اس کمرے سے لیا تھا اور عبدالرحمٰن دراصل عبدالرحیم شکیل کا نفسیاتی تجزیہ ہے۔ اس افسانے کے آخری حصہ میں میرزا ادیب ٹھوکر کھا گئے ہیں۔ لیکن ماحول نگاری میں ان کا یہ افسانہ بڑا کامیاب ہے۔ میرزا صاحب نے لکھا ہے۔

"گرمیوں کے دنوں میں مچھروں کے حملے سے بچنے کے لئے وہ پاؤں تک کسی چادر میں چھپا لیتا اور اگر موسم سرما ہوتا تو وہ کوٹ میں لپٹا لپٹایا دیوار سے سہارا لگائے کسی کتاب کا مطالعہ کرتا، لکھتا اور ساتھ ہی ساتھ سگریٹ کے کش بھی لگاتا رہتا۔"

اس وقت دیوار سے سہارا لگا کر سرہانے ایک چارپائی پر رکھی رہتی۔ سیاہی کی بوتل اکثر چارپائی پر الٹ جاتی۔ چادر سیاہی سے تربتر ہو جاتی لیکن وہ افسوس ذرا کم کرتا بلکہ ہنس پڑتا کیونکہ اس کے بجٹ میں ہر ماہ ایسی آٹھ دس چادروں کی رقم مخصوص رکھی جاتی تھی۔

ایک بجے رات تک وہ فکر و مطالعہ میں لگا رہتا۔ پورے ایک بجے جب بازار میں ہنگامہ ختم ہو جاتا۔ پان فروش ہوٹل سے متصل اپنا تختہ اٹھانے لگ جاتا۔ وہ دودھ دہی والا کونڈے صاف کر کے ایک طرف رکھ دیتا اور کوئی رکھوالا گھر روانہ کرتا اور بازار کے تمام ریڈیو اپنے ریکارڈنگ ختم کر دیتے تو شکیل کام چپ چاپ نیند کی آغوش میں جا پہنچتا۔

برابر دس برس تک اُس کا یہی پروگرام رہا۔ اُسے دنیا کا کوئی ہوش نہ تھا۔ اس کی تمام زندگی اسی ڈگر پر بسر ہوتی رہی۔ اُس کے پھول بچے تھے ہی نہیں کہ گھریلو الجھنوں کے حل کی فکر ہوتی۔ شادی کے متعلق اُس کے خیالات عجیب تھے میرزا ادیب نے لکھا ہے کہ

"اس کی ذہنی تخلیقات کے ملک کے گوشے گوشے میں پھیل چکے تھے۔ وہ اسے بہت بڑا آدمی سمجھتے تھے۔ مگر جو دوست اس کے بہت قریب تھے اور اس کے معمولات حیات سے پوری طرح واقف تھے۔ وہ اکثر حیران ہو کر یہ سوچتے تھے کہ اپنی بے پناہ قابلیت کے باوجود یہ شخص اپنی زندگی کے معیار کو بلند کیوں نہیں کرتا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس کی نگاہوں میں دولت کی کوئی وقعت نہیں تھی اور عورت کے تصور نے اس کی زندگی کی سرد فضا کو ابھی چھوا تک بھی نہیں تھا۔ شادی کے بارے میں اس کا نظریہ عجیب و غریب تھا۔ جب کبھی گفتگو میں شادی کا ذکر چھڑ جاتا تو وہ مسکرا کر کہتا۔ میں شادی صرف اس لئے کروں گا کہ میرے گھر میں ایک عورت ہر صبح میرے لئے چائے کی گرم گرم پیالیاں بنا دیا کرے اور جب میں کام سے فارغ ہو کر گھر آؤں تو میرے لئے کھانا بالکل تیار موجود ہو۔"

اس کے موڈ کی ایک بات یاد آگئی۔ قیام پاکستان سے قبل میں لاہور سے ایک رسالہ شائع کرنا چاہتا تھا۔ شکیل سے ذکر ہوا تو اُس نے ایک ریستوران میں یہ خاکہ بنا کر بھیج دیا تھا۔ وہ یہ تھا۔

ماہنامہ ندیم لاہور —— ایڈیٹر قمر شکیل

ایڈیٹر —— پڑھنے والے بھائیو! میں نہ تو ادیب ہوں، نہ شاعر، ایک معمولی ایڈیٹر ہوں جس کا کام نوآموز لڑکوں سے تحریریں چھینا [illegible] کر کے شائع کر دینا ہے۔

[illegible] ندیم کا پہلا شمارہ ایک معمولی پرچہ کے طور پر پیش کر رہا ہوں۔ اگر آپ اس کی سرپرستی قبول فرمائیں تو آپ جیسے اچھے قارئین بہت ہیں گے

شبلی بی کام کی محبت بھرے کام ـــــ ادب میں ۔ شبلی

شمیم	شبانہ	والدہ
یہ صبح کا وقت اور یہ سہانا سماں تھا اب کیا ہے بنانے کے سامان کا تھا	جی ہاں ۔ جی ہاں ۔ معاف کیجئے ۔ میرے خیال سے ہو گیا	وہ ایک دن ہمیشہ اپنی بیوی کی طرح کب وہ کسب دبک گی ۔

پیچ	نفسیات	مزاحیہ گیت
وحشیات ۔ اس دور کی یہ کہ تصنیف ہے ۔ یہ محبت ہے کہ اس میں خزانہ کر رہی ہیں ۔ بس چلتے ہو چکا ہے	ادیب اس لئے تحفت ہے کہ اس کی جس سے اس کا سب سے بڑا آرام زبانی سے ستم تھا !	ہم سے ذرا ضیاں ہیں ہم ہے ناپسند ہے

جب وہ موڈ میں ہو تو سینکڑوں لطیفوں چٹکلوں اور حکایتوں سے پوری محفل کو کشت ۔ زعفران بنا کر کھ دیتا ہے ۔ خوب ہنستا ہے خوب ہنساتا ہے ۔ اس کے احباب اس کے قریب بیٹھ کر اپنی ہر پریشانی کو بھول جاتے ہیں ـــ لیکن اگر وہ کام میں مصروف ہو تو اس سے بڑھ کر خشک مزاج انسان کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا ۔ ۱۹۶۲ء کا ذکر ہے ۔ پروفیسر اختر اورینوی پٹنہ سے آئے ہوئے تھے ہم ایک روز ان کے ساتھ شہر گئے ہیں اور میرزا ادیب انہیں شبلی بی کام سے ملانے عالمگیر پریس لے گئے ۔ شبلی وہاں کسی مسئلے کا ضمون پڑھ رہا تھا ۔ شاید ماہنامہ عالمگیر کے کام میں مصروف تھا ۔ ہم تینوں اس کے عقب میں جا کھڑے ہو گئے اور میرزا نے شبلی کو متوجہ کرتے ہوئے تعارف کرایا ـــ " آپ ہیں اختر اورینوی صاحب " ـــ شبلی نے منہ پھیرے بغیر اپنا ہاتھ عقب کی طرف بڑھایا ۔ اختر اورینوی صاحب کا ہاتھ مل گئے ۔ ایک منٹ اور نہیں دو چار منٹ گزر گئے ۔ شبلی بدستور پڑھنے میں مصروف رہا اور منہ پھیر کر بھی نہ دیکھا ۔ چنانچہ ہم تینوں " السلام علیکم " کہہ کر پریس کی گڑگڑاہٹ سے نجات پا گئے ۔ تمام راہ میں اور میرزا ادیب انتہائی شرمندگی کے عالم میں قدم اٹھاتے رہے ۔ بچارے اختر اورینوی خاموش رہے اور اپنی منزل پر ہم سے جدا ہو گئے ۔ اور پھر ہمارے مابین شبلی کے بارے میں کوئی گفتگو نہ ہوئی ۔

شبلی بی کام کی زندگی کے اس عجیب و غریب اسلوب نے اسے ایک افسانوی کردار بنا کر رکھ دیا ہے ۔ چنانچہ اختر اورینوی نے پٹنہ پہنچ کر " اندر کلی اور بھول بھلیاں " کے عنوان سے ایک افسانہ لکھا ۔ یہ افسانہ شبلی کے گرد گھومتا ہے ۔ اس افسانے کی اٹھان بہترین ہے لیکن کلائمکس خوف ماتحت ہے ۔ میرزا ادیب نے بھی اپنے افسانے " عبدالرحمٰن " میں کھوج لگانے کی کوشش کی کہ شبلی بی کام کا مزاج کا انحصار کس چیز پر ہے ؟ اختر اورینوی کا خیال ہے کہ شام کے وقت اس نے انار کلی سے کھلونا خریدا اور اسی میں قوت محسوس کرکے مطمئن ہو گیا ـــ میرزا ادیب اپنے افسانے میں اچانک ایک روز اس کے کمرے میں تبدیلی دیکھتا ہے ۔ نئے پردے ، کرسی ، میز وغیرہ دیکھ کر کچھ اندازے لگاتا ہے ۔

لیکن میری رائے میں یہ دونوں حضرات تہ تک نہیں پہنچ سکے ۔ شبلی کی تفریح کے اسرار کی گتھی ان سے نہیں کھل سکی اور سچی بات تو یہ ہے کہ میں بھی اس معمّا کو نہیں سمجھ سکا ۔ اس زمانہ میں شبلی کے گھر پر کس مپرسی کا عالم تھا ۔ اس لئے وہ کسی کو اپنے گھر کا پتہ نہ بتاتا تھا ۔ اس کے کمرے کا نقشہ میرزا ادیب نے ان الفاظ میں کھینچا ہے ۔

" کمرے کی ہر چیز فرسودہ ، بے جان اور بے روح تھی ۔ یوں محسوس ہوتا تھا گویا زندگی کی حرارت نے اس تنگ و تاریک اور سرد دنیا میں کبھی سانس لیا ہی نہیں ہے ۔ جس وقت وہ کمرے میں موجود ہوتا تو کبھی کبھی پُرسکوت فضا میں چلنے پھرنے یا برتن اٹھانے سے ہلکی سی ہلچل پیدا ہو جاتی ۔ مگر چند لمحوں کے بعد ہی یہ لرزش اس طرح غائب ہو جاتی جیسے کسی جھیل کی کائی جم کر سطح پر جو تیر گئے سے

[illegible] پیدا ہو کر آتا تا تا ایک اُبھرتے ہوئے دائرے میں غائب ہو جاتی ہیں۔ اس کی زندگی کے بڑاروں دن اور ہزاروں راتیں [illegible] تھیں۔ مگر اس کی حالت آج بھی ویسی ہی تھی جیسی آج سے سات برس پیشتر تھی۔ سات سال کی لمبی مدت اس نے اس کمرے میں اس طرح [illegible] ایک ساعت میں قیام کر رہا ہو۔ چائے پینے کام کرنے اور سونے کے علاوہ اسے دنیا کی کسی چیز سے دلچسپی نہیں تھی۔

تقسیم سے کچھ عرصہ قبل حافظ محمد عالم کی بیماری کے دوران میں شبلی میں کچھ بیزاری سی پیدا ہوئی۔ شاید وہ مسلسل دس سال تک ایک ہی جگہ کام کرتا کرتا تھک گیا تھا۔ اُس نے لیپلی جوبلی اور ہفتہ وار اور ماہوار رسالوں کو چھوڑ کر روزناموں کی دنیا میں چلا گیا۔

قیام پاکستان کے بعد بھی شبلی بی کام کے معمول میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بسیدہ مشابلاد مالاچ بارہ تو فسادات کی نذر ہو گیا اور تقسیم کے بعد جالندھر کو اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ آیا تھا۔ اُس نے نئی انارکلی میں دو تین کمرے الاٹ کرا لئے ہیں لیکن یہاں بھی اُس کے حصہ میں صرف ایک ہی کمرہ آسکا ہے۔ اُس کے گھر میں اگرچہ اب بھی بیوی نہیں ہے تاہم ماں باپ موجود ہیں۔ اس کے باوجود وہ صبح سویرے اُٹھتا ہے۔ شیو بناتا بناتا ہے اور ناشتہ سے فارغ ہو کر تانگے کے ذریعے سیدھا دفتر پہنچتا ہے۔ پہلے وہ اپنے دفتر کا کام ختم کر کے دو بجے کے بعد رسالہ مطبوعات کے دفتر میں محفل احباب جماتا تھا اب رسالہ ڈائرکٹر کے دفتر میں بیٹھتا ہے۔ اُسے ظلموں سے دلچسپی نہیں ہے۔ کیونکہ وہ ایک فیصد بھی فلمی آدمی نہیں۔ اُسے تو محض ان فلمی دفتروں کے اُن گدوں سے دلچسپی ہے جو اُس کے تھکے ہارے جسم کو چند گھنٹوں کے لئے سہولت دیتے ہیں۔ مطبوعات کے دفتر کا صوفہ اس کی بے پرواہی کے باعث جل گیا تو وہ رسالہ ڈائرکٹر کے دفتر میں اُٹھ آیا۔ یہاں سے اُکتا جائے گا تو کسی اور ایسی جگہ جہاں اُس کے قیام، پیشاب کرنے کی جگہ ہو، پنکھا ہو، ایک صوفہ سیٹ ہو اور چائے منگوائی جا سکے چلا جائے گا اور اسی دفتر میں ہر وقت اپنی جیب سے دس کا ایک نوٹ نکال کر چائے منگوائے گا۔ آس پاس بیٹھے ہوئے سب لوگوں، سب ملاقاتیوں اور سب دوستوں کو چائے پلائے گا۔ کوئی کھانا کھاتا چاہے تو اُسے کھانا کھلانے سے بھی دریغ نہ کرے گا۔

وہ کہا کرتا ہے — "میں چاہتا ہوں کہ نیوزی لینڈ چلا جاؤں۔ سمندر کے کنارے کسی سرسبز و شاداب تختہ پر لیٹا رہوں۔ لیٹا رہوں۔ حتیٰ کہ کئی صبحیں طلوع ہوں اور شامیں غروب ہو جائیں" —— دراصل اس کا جسم تھک چکا ہے لیکن تعجب ہے کہ اُس کا ذہن ابھی تک نہیں تھکا۔ اس میں ایک لاوا سا سلگ رہا ہے۔ جس کی چنگاریاں اُس کی تحریروں میں اُڑتی رہتی ہیں۔ تقسیم کے بعد سے وہ روزنامہ شہبازوں میں چیف ایڈیٹری کے فرائض سرانجام دے رہا ہے۔ وہ اداریے لکھتا ہے کئی ملک گیر تحریکیں چلا چکا ہے۔ کئی وزارتوں کو الٹ چکا ہے۔ عوام کے ان گنت مسائل کو حل کرنے کی جدوجہد میں کئی زمروں کے بخیے ادھیڑ چکا ہے۔ لیکن وہ ایک عجیب کردار ہے جسے سچی بات ہے میں اب تک نہیں سمجھ سکا۔

اُس کی بہترین تفریح ہوٹل میں ایک آدھ گھنٹہ بیٹھنا ہے۔ جہاں اُسے اک دفعہ چھیڑ دیا جائے تو پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ اُس کا تجربہ اور مطالعہ بہت وسیع ہے۔ وہ گزشتہ پچیس برس سے بے شمار سیاسی، ادبی اور مذہبی تحریکوں کا عروج و زوال دیکھ چکا ہے اس لئے معاشرے کا ایک مزاج بن کر رہ گیا ہے۔ اُسے ادب اور صحافت سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

وہ باتیں بڑے پتے کی کہتا ہے اور اس حد تک بے باک ہے کہ کسی کی پروا نہیں کرتا۔ وہ ناشروں کے بھی خلاف ہے اور مصنفوں کے بھی سیاستدانوں کے بھی اور —— سب کے۔ بلکہ کبھی کبھی تو خدا اور انبیاء اولیا بھی اُس کی زد میں آئے بغیر نہیں رہتے۔ بایں ہمہ اُس کی گفتگو بے معنی اور بے ربط نہیں ہوتی۔ انداز خواہ کچھ ہو۔ اُس میں علمیت کا رنگ ضرور ہوتا ہے۔ مثلاً وہ حسرت، سالک، اور سلیمان ندوی کو کوسنے بیٹھے گا تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ دے گا کہ حسرت صاحب نے فلاں تاریخ کا مادہ غلط نکالا ہے اور فلاں کتاب کا نام غلط لیا ہے۔ سالک صاحب نے قصہ چہار درویش کا کردار فلاں کے سر منڈھ دیا ہے۔ سلیمان ندوی نے مستشرقین کی کتابیں ترجمہ کرا کے اپنے نام سے چھاپ دی ہیں۔ لیکن وہ عمر خیام کی تاریخ پیدائش متعین نہیں کر [illegible] کی بالکل [illegible] نے نجوم کی رُو سے منٹ اور سیکنڈ بھی بتا دیئے ہیں۔ اس کا مطالعہ وسیع ہوتا ہے اور وہ پتے کی باتیں کہتا ہے اب اُسکا [illegible]

[illegible]

وہ [illegible] (اقتباسات) [illegible] اپنے [illegible] ہے۔ [illegible] صبح سے رات کے [illegible] [illegible] میں [illegible] زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیکن درحقیقت وہ [illegible] [illegible] ہوگا

[illegible] کوشش کرتے۔

وہ [illegible] ہے لیکن [illegible] وہ ایک حقیقت ہے [illegible] حیثیت [illegible]

ہے ـــــ [illegible] قبول کر رہے ـــــ

[illegible]

بی کام اس کے نام کا جزو بن چکا ہے۔ جسے کہ شبلی نے [illegible] وقت ہی [illegible] [illegible] بی کام ـــــ [illegible] شبلی بی کام کے بجائے عبدالرحیم شبلی لکھ دیا ہے [illegible] جب اس نے [illegible] تو انہوں نے پڑھا کہ ـــــ " اچھا تو آپ ہیں "۔ ہم نے سمجھا۔ وہ کوئی اور شبلی ہوگا۔ اس نے اپنے نام کے ساتھ بی کام لکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ لیکن بدقسمتی سے [illegible] ایڈیٹروں نے [illegible] کر کے [illegible] دیے۔ شروع شروع میں ایڈیٹروں نے غالباً مولانا شبلی مرحوم سے عبدالرحیم شبلی کو علیحدہ شخصیت ظاہر کرنے کے لیے بی کام اس کے نام سے منسلک کیا تھا اور بعد میں یہ ایک ایسا جزو بن گیا جسے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے خاندان میں یہ رواج ہے کہ ہر شخص کا ایک تخلص رکھ دیا جاتا ہے۔ عام اس کے کہ وہ شاعر ہو یا نہ ہو۔ شبلی کا تخلص بھی اس کی والدہ محترمہ نے اس کے پیدا ہوتے ہی تجویز کیا تھا۔ غالباً اس وقت مولانا شبلی نعمانی نئے نئے فوت ہوئے تھے اور ان کے ادبیانہ کارناموں کی گونج ابھی تک فضا میں باقی تھی۔ ایسی صورت میں ممکن ہے اس کی والدہ نے یہ خیال کیا ہو کہ شاید یہ لڑکا بھی اپنے باپ کے نقش قدم پر چلے اور عجب نہیں کہ ان کی طرح شاعر ہی نکلے۔ اس لیے یہ تخلص (شبلی) اس پر ٹھونس دیا گیا۔ تاہم اس میں شعر و شاعری کا فطری ذوق موجود ہے جو کبھی کبھی معاشیات کی خشک تعلیم کے باوجود ابھر آتا ہے اور ایک زمانہ ایسا بھی آیا ہے جب یہ کلام موزوں کی صورت میں ڈھل گیا تاہم اس کے نام سے حتیٰ کہ غزلیں یا نظمیں شائع ہوئی ہیں۔ وہ ان کو اپنے ادب میں شامل کرنے کو تیار نہیں ہے۔

سانولی رنگت، الجھے بال، ستواں ناک اور موٹی موٹی آنکھوں والا انتالیس [39] سالہ سید عبدالرحیم ہاشمی (شبلی بی کام) دوستوں کی محفل میں بے باکی کے ساتھ قہقہے لگاتا، ہنستا اور سگریٹ پھونکتا ہوا جب معصومانہ انداز اختیار کر لیتا ہے تو بڑا عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ اس کا [illegible] چھوٹے بڑے تمام ادیبوں کے ساتھ ہے۔ وہ اپنے کسی دوست اور کسی طالب علم کو نہیں چھوڑتا، کسی کو معاف نہیں کرتا۔ وہ ادیبوں کے دکھ درد

بڑی واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کا مستقبل کس طرح ان سے وابستہ ہے۔ صرف اس کا نہیں بلکہ اُردو کا [illegible]
[illegible] وہ ایک ادیب کی حیثیت سے مستقبل کا احساس کرتا ہے۔ اس کے دل میں خلوص ہے اور جب وہ تعلیمی [illegible] ادیب کی حیثیت سے مسائل سے سروکار رکھتا ہے اور تعلیمی مسائل کے بارے میں کچھ کہتا ہے تو اس کا یہ انداز بالکل مخلصانہ معلوم ہوتا ہے۔

میں نے اپنے اس مضمون میں شبلی بی کام کی کمزوریاں نہیں گنوائیں۔ اس لئے کہ میں اس کا دیرینہ دوست ہوں اور مجھے اس میں خوبیاں ہی نظر آتی ہیں۔ اس کی شخصیت بڑی پہلو دار، بڑی حسین اور بڑی عجیب و غریب ہے۔ میرا خیال ہے کہ "عجیب و غریب" کا لفظ قدرے وضاحت طلب ہے ——!

شبلی بی کام جب بولنے پر آتا ہے تو اپنے مخصوص انداز میں اپنی عینک کے دائروں سے اپنی شعلہ بار آنکھیں نکالنے لگتا ہے۔ اس وقت اُسے آپ کسی ناراضی، ندامت، آزردگی، معصومیت غرضیکہ کسی شے کی پرواہ نہ ہوگی اور اس کے دلائل کا سلسلہ اس وقت رکے گا جب آپ اپنی مکمل شکست کا اعلان کر دیں گے۔

آپ اپنے کسی ذاتی مسئلہ پر اُس سے انتہائی سنجیدگی سے مشورہ کر رہے ہوں گے تو وہ اچانک اپنے بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے فضا میں کچھ لکھنے لگے گا اور آپ کے مسئلہ پر قطعی توجہ نہ دے گا۔ اس وقت بھی اُسے آپ کی ناراضی، آپ کے جذبات و احساسات غرضیکہ آپ کا بالکل خیال نہ ہوگا!

اگر وہ موڈ میں ہوگا تو آپ کو ہلکے سے اشارے پر دو چار سو روپے تک ادھار دینے سے دریغ نہ کرے گا اور اس کے ذہن میں ان روپوں کو واپس لینے کا خیال تک نہ ہوگا۔ لیکن اگر آپ کی جان پر بن آئے اور آپ اُس کے سامنے ایک آدھ روپے کے لئے دست سوال دراز کریں۔ وہ موڈ میں نہ ہو تو آپ کی کسی بات سے متاثر نہ ہوگا اور ایک پھوٹی کوڑی بھی جیب سے نہ نکالے گا۔

وہ مال، لارنس، میکلوڈ اور انارکلی میں اس قلندرانہ شان سے چلتا پھرتا نظر آتا ہے کہ کسی روزنامہ اخبار کے چیف ایڈیٹر کے بجائے کسی دفتر کا معمولی سا کلرک نظر آتا ہے۔

آج کی مادی دُنیا میں وہ ہر بڑے آدمی، ہر ظالم، ہر وزیر، امیر سے نفرت کرتا ہے حتی کہ ان کے سلام کا جواب دینا بھی پسند نہیں کرتا۔ لیکن ہر بے حیثیت آدمی، ہر مظلوم، ہر نتھو خیرے اور ہر غریب کے گلے میں باہیں ڈال کر گھومتا پھرتا دکھائی دیتا ہے۔

جس کام میں مالی فائدہ ہو۔ اُسے ٹالتا رہتا ہے حتی کہ یہ موقعہ ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ دوسروں کے ان گنت کام نکالتا ہے اور اس سلسلہ میں اپنی جیب سے دشمنی کرنے سے بھی نہیں چوکتا۔

ہر روز ایک نئی اسکیم بناتا ہے۔ اُس کے ذہن میں ہزاروں، لاکھوں اسکیمیں تہ در تہ جمی ہوئی ہیں۔ لیکن وہ آج تک کسی اسکیم کو بھی پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکا۔ وہ خود ہی کہا کرتا تھا کہ علم النجوم کی رو سے میں "کیتو" ہوں جو آگے بڑھتا بڑھتا عین منزل کے قریب پہنچ کر کچھ اس طرح پلٹ کر غائب ہو جاتا ہے کہ اُس کے ساتھی منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

یہ ہے شبلی بی کام، وہ عجیب و غریب کردار۔ جسے میں اب تک نہیں سمجھ سکا اور جو میرے خیال میں آج بھی طوفان میں مچھلیاں پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

عبدالسلام خورشید

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی میرے بہت پرانے دوست ہیں۔ اُن سے میری پہلی ملاقات آج سے تقریباً تیس سال پیشتر ملی مسلم ہائی اسکول پانی پت کے کتب خانے میں ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ کتب خانے کی بڑی میز کے پاس ایک نہایت سنجیدہ جوان گہرے مطالعے میں مصروف ہے۔ اور اپنی نوٹ بک پر کچھ یادداشت لے رہا ہے۔ چھریرا جسم، کتابی چہرہ، سیاہ داڑھی، سر کے بال بالکل کٹے ہوئے۔ بدن پر ایک صاف مگر سادہ کرتا اور شرعی پاجامہ۔ یہ تھے شیخ محمد اسماعیل۔ اُن کی شخصیت کی جو چیز میرے نزدیک سب سے زیادہ جاذبِ توجہ تھی وہ اُن کا خلوص تھا، اُن کی حق گوئی، راستبازی اور نیک نیتی تھی۔

شیخ صاحب کی شخصیت کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس میں تنوع اور رنگا رنگی نہیں ہے۔ نہ کرکٹ، نہ تاش، نہ اقسام کے دیگر مشاغل کا شوق ہے۔ نہ ان کو بہت عمدہ قسم کے لباس سے شغف ہے۔ اور نہ کھیل تماشوں، میلوں اور دوسری تفریحات کی طرف میلان۔ انہوں نے تا عمر سینما نہیں دیکھا۔ اور کسی قسم کا کھیل بھی نہیں کھیلا۔ عملی سیاست سے بھی وہ ہمیشہ علیحدہ رہے۔ ان سب چیزوں کو چھوڑ کر ان کو ایک اور صرف ایک چیز سے عشق ہے۔ وہ ہے کتاب، مطالعہ، علمی تحقیق اور تصنیف و تالیف۔ ہم نے مطالعے کے شوقین بہت دیکھے ہیں مگر اس معاملے میں شیخ صاحب کی مثال نرالی ہے۔ اپنے لڑکپن کا ذکر شیخ صاحب نے بارہا کیا ہے۔ خود ان کے قول کے مطابق وہ اس زمانے میں رات کو ڈھائی ڈھائی بجے تک کتاب پڑھتے رہتے تھے۔ والدین کی تاکید تھی کہ رات کو جلد سو جائیں۔ ان کے ڈر سے منہ لحاف میں ڈھک لیتے اور لحاف کے اندر سرسوں کے تیل کا چراغ جلا کر شیخ صاحب کتاب پڑھتے رہتے۔ گھر والے سمجھتے کہ سو رہے ہیں۔

شیخ صاحب نے ہمیشہ اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ کتابیں خریدنے پر صرف کیا اور ہمیشہ اچھی کتاب کی تلاش میں رہتے تھے۔ اس طرح انہوں نے ایک بے نظیر ذاتی کتب خانہ جمع کر لیا تھا۔ جو بیش بہا قلمی نسخوں اور نایاب مطبوعہ کتابوں پر مشتمل تھا۔ جس خوش اسلوبی سے شیخ صاحب اس کو استعمال کرتے تھے بہت کم لوگ ذاتی کتب خانوں سے ایسا استفادہ کر سکتے ہیں۔ اکثر شائقینِ علم ان کے کتب خانے کو دیکھنے کے لئے دور دور سے آتے تھے۔

کتب خانہ شیخ صاحب کی زندگی بھر کا عزیز ترین اور نہایت قیمتی سرمایہ تھا۔ افسوس ہے کہ یہ ۱۹۴۷ء کے انقلابات میں [illegible] صحت پر اس کے ضائع ہو جانے کا بہت برا اثر پڑا ہے۔

بالعموم دیکھا گیا ہے کہ ذاتی کتب خانوں کے مالک اپنی کتابوں کی ہوا بھی کسی کو نہیں لگنے دیتے۔ مگر شیخ صاحب اس معاملہ میں بہت فیاض رہے ہیں۔ ان کے کتب خانے سے ہر شخص فائدہ اٹھا سکتا تھا۔

شیخ صاحب کی یادداشت نہایت عمدہ ہے۔ بعض اوقات ان کی اس خوبی سے عجیب لطیفے رونما ہوئے۔ ۱۹۳۵ء میں سید علی نقی صاحب پرنسپل شاہیہ انٹرمیڈیٹ کالج ..نگ آباد نے اپنے کالج میں حالی سنٹنری (صد سالہ جشن ولادت) منائی تھی۔ شیخ صاحب اور میں حالی مسلم ہائی اسکول پانی پت کے نمائندوں کی حیثیت سے وہاں مدعو تھے۔ مسٹر اکبر حیدری جلسہ کی صدارت کر رہے تھے۔ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب مولانا حالی پر تقریر کر رہے تھے۔ تقریر کے دوران میں دفعتاً مولوی صاحب نے شیخ صاحب سے سوال کیا کہ مجالس النساء مولانا حالی نے کس سنہ میں لکھی تھی۔ شیخ صاحب اس وقت کچھ لکھ رہے تھے۔ مگر بلا تامل انہوں نے سوال کا جواب دیا۔ اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ تمام حاضرین کی نظریں شیخ صاحب پر پڑیں اور لوگ حیرت زدہ ہو کر ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ یہ کون بزرگ ہیں جو حالی کے متعلق ایسا یقینی علم رکھتے ہیں کہ مولوی عبدالحق صاحب بھی استفسار فرماتے ہیں۔ اور بھروسہ کرتے ہیں اور جن کو حالی کی واقعات کے جزئیات گویا ازبر ہیں۔

حقیقت بھی یہی ہے کہ حالی کی تحقیق پر شیخ صاحب نے سالہا سال جس قدر کاوش و کوشش کی ہے کسی دوسرے کو میسر نہیں۔ انہوں نے اس قدر مواد اس موضوع پر جمع کیا ہے کہ اگر وہ لکھیں تو بہت آسانی سے ہزار صفحہ کی سوانح عمری لکھی جا سکتی ہے۔ وقت لکھنے کی آرزو تو اب تک پوری نہ ہو سکی مگر شیخ صاحب نے مولانا حالی کے غیر مطبوعہ کلام اور کلیات نثر کے مجموعے مرتب اور شائع کئے ہیں۔ ان کے علاوہ دو جلدیں مقالات حالی مرتب کئے۔ جن کو انجمن ترقی اردو نے شائع کیا تھا۔ ایک مختصر سوانح حیات تذکرہ حالی کے نام سے لکھی۔ اور کثرت سے مضامین مختلف رسائل کے لئے لکھے۔

شیخ صاحب نے ملک کے موقر رسائل و جرائد میں مضامین لکھنے کا سلسلہ پندرہ سال کی عمر سے شروع کیا اور اب تک جاری ہے۔ ان کی تعداد بتانا مشکل ہے۔ بلکہ بعض تحقیقی مقالے واقعی قابل صد تحسین و آفرین ہیں۔ اس لحاظ سے شیخ صاحب کی ایک قابل ذکر خوبی یہ بھی ہے کہ ان مضامین پر تحقیق کا کام آپ نے دس پندرہ سال تک کیا۔ یہ استقلال حیرت انگیز ہے۔ ایسا ہی ایک مقالہ سنسکرت عربی و فارسی تراجم ہے۔ جس کو شیخ صاحب نے سالہا سال کی محنت شاقہ کے بعد مرتب کیا۔ مولانا وحید الدین سلیم پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی فرمایا کرتے تھے۔ کہ اس مضمون کو دیکھ کر میں فخر کرتا ہوں کہ میرے اہل وطن میں ایک ایسا فاضل محقق موجود ہے۔ میں نے بھی اس مقالے کا اس وقت انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔

شیخ صاحب کو میں نے کبھی کسی بڑی سے بڑی شخصیت سے مرعوب ہوتے نہیں دیکھا۔ ذاتی منفعت کے خاطر وہ کبھی کسی کی خوشامد نہیں کرتے۔ جن بڑے لوگوں سے ان کا ملنا رہا وہ برابر کے درجے میں رہا۔ اپنی رائے کے اظہار میں ان کو ہمیشہ بے باک پایا۔ مگر اس کے ساتھ وہ دوسروں کی رائے کی قدر کرنا بھی جانتے ہیں۔ وہ بے حد خلیق متواضع اور منکسر انسان ہیں۔ شیخی۔ ریاکاری۔ تصنع سے ان کو دور کا واسطہ نہیں۔ دوستوں کے مخلص اور ہمدرد دوست ہیں۔ اعزہ و اقارب کے ساتھ ان کا سلوک ایسا ہے کہ ان کی شکایت کسی سے سننے میں نہیں آئی یہ بڑی بات ہے۔

ان کی صحبت کا رنگ خالص علمی رہتا ہے۔ اس کے باوجود ان کی گفتگو بہت دلچسپ ہوتی ہے مجھے پانی پت میں سالہا سال تک ان کی گفتگو سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا۔ ایک عرصے تک یہ معمول رہا کہ ہم دونوں علی الصباح سیر کے لئے جاتے اور دو گھنٹے تک علمی باتوں پر گفتگو کرتے رہتے یہ لطف میں عمر بھر نہیں بھول سکتا اور اب بھی یہ تمنا دل میں موجود ہے کہ کاش وہ زمانہ پھر لوٹ آئے۔

شیخ صاحب غالباً ۱۸۹۳ء میں دہلی کے قریب ایک گاؤں [illegible] میں پیدا ہوئے تھے۔ زندگی کا بیشتر حصہ اپنے آبائی مکان واقع پانی پت میں بسر کیا۔ یہ مکان محلہ انصاریاں اس مکان کی پشت پر تھا۔ جس میں مولانا حالی پیدا ہوئے تھے۔ نیچے کے مکان میں وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ رہتے تھے۔ اوپر کی منزل

شیخ صاحب [illegible] عمر بھر اسی طرح تصنیف و تالیف و تحقیق کے دل پسند مشاغل میں لگے رہتے تھے
کچھ عرصہ تک [illegible] ہوئے وہ بحیثیت [illegible] رہ چکے تھے۔ متعلقہ شعبہ میں پھر لوٹ آئے۔ پھر وہ ایک عرصہ تک
اہل اسلام کے کتب خانہ میں ملازم ہو رہے۔ اسی زمانے میں، جہاں وہ [illegible] آ گئے۔ [illegible] میں وہ [illegible] کے منتخب
[illegible] کے ڈپٹی کی حیثیت سے بھی۔ یہ ملیح [illegible] کا ادارہ تھا۔ کچھ عرصہ بعد [illegible] کا [illegible] ہو گئے
سے کراچی چلے واپس آگئے۔ دو سال تک پنجاب حیات کے نام سے [illegible] اخبار نکالتے رہے، جس [illegible] اس کے بعد
ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وہ مسلسل وابستہ ہیں۔ اور ان کا سب مشغلہ تالیف، تصنیف، ترجمہ ہی ہے۔ ان کی تصانیف کی
تعداد اس قدر ہے کہ ان سب کا ذکر طوالت سے خالی نہیں۔

شیخ صاحب اگرچہ بہت سنجیدہ آدمی ہیں لیکن ان کی حس ظرافت بھی بہت عمدہ ہے۔

ایک بار ان کے ایک بے تکلف دوست اپنے مہمان بیٹے کی شکایت کرنے لگے۔ ان کے دوست کا لہجہ غمزدہ تھا۔ شیخ صاحب نے ہمدردی کرتے ہوئے فرمایا: "لیکن بھئی آخر بیٹا تو ہے۔"

بعض لوگوں کو عادت ہوتی ہے کہ کسی دوسرے سے ملنے جاتے ہیں تو میز کے قریب بیٹھ کر میز کی چیزوں مثلاً پنسل، پیپر ویٹ وغیرہ سے کھیلتے رہتے ہیں یا میز پر رکھے ہوئے خطوط ہی پڑھنے لگتے ہیں جو ایک قسم کی بدتمیزی ہے۔ ایک دفعہ شیخ صاحب بھی ایک ایسے ہی شخص کے ہاتھوں تنگ آ گئے۔ اخلاق مانع تھا کہ ان کو سختی سے روک دیں۔ اس موقع پر شیخ صاحب نے جو طریقہ اختیار کیا وہ بہت خوب تھا۔ وہ حضرت حسب عادت پھر آئے اور اپنا کام شروع ہی کیا تھا کہ شیخ صاحب نے میز کی دراز سے ایک خوبصورت گڑیا نکال کر ان کے آگے رکھ دی: "لیجئے اس سے شوق فرمائیے۔" دوسرے لوگ بے حد محظوظ ہوئے اور وہ خود ایسے کھسیانے ہوئے کہ دیکھنے ہی رہ گئے۔

میں نے شروع میں لکھا ہے کہ شیخ صاحب کی حیثیت میں رنگا رنگی نہیں ہے اس کے باوجود وہ اچھے افسانے لکھنے میں کامیاب ہیں اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ان کے افسانوں کے کردار بالعموم تاریخی ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر غلام جیلانی برق

محمد عثمان

انسان فرشتہ ہے نہ شیطان۔ اس قول کی صداقت کسی اور بزرگ سے زیادہ ڈاکٹر غلام جیلانی برق کی شخصیت سے کھل کر سامنے آتی ہے اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر برق گو برسوں کالج میں دینیات پڑھاتے رہے ہیں اور دو قرآن، دو اسلام اور تاریخ اسلام جیسی مذہبی کتابوں کے مشہور مصنف ہیں مگر ایک اعتبار سے دیکھا جائے تو انہوں نے اس شہرت اور اس تصنیف و تالیف کا اثر نہ اپنے ظاہر پہ چڑھنے دیا ہے اور نہ باطن پر۔ ظاہری طور پر وہ ویسے ہی ہنس مکھ ملنسار ہیں، بے تکلفی اور ایک گونہ خوش مذاقی ان کی سرشت تھی کالج کے نام سے بعض اوقات بھی غصہ آتا ہے اور باطن یوں نہیں کہ ایک عام انسان میں اخلاق و کردار کی جو کمزوریاں پائی جاتی ہیں ڈاکٹر برق میں اپنی ڈاکٹری، پروفیسری اور مصنفی کے باوصف ان کا ایک معقول حصہ بتمام و کمال موجود ہے۔

ڈاکٹر برق کی ابتدائی زندگی اور تعلیم دونوں بے قاعدہ اور ناہموار تھیں۔ ابھی تیسری جماعت میں تھے کہ والد کے پیر و مرشد نے سرکاری اسکول کی بجائے مسجد میں بھیجنے کا حکم سنایا۔ اس کے بعد جیلانی برسوں ایک مسجد سے دوسری مسجد اور ایک ملا سے دوسرے ملا تک پڑھنے اور سیکھنے کی غرض سے جاتا رہا۔ اور ساتھ ساتھ اس کا قیام و طعام بھی بدلتا رہا۔ آج والد کے پاس ہے تو کل بھائی کے پاس اور پرسوں ان دونوں سے تنگ آ کر یا دونوں کو تنگ کر کے کسی دور دراز ویران مسجد کو جا بسا ہے اور غریب کے گاؤں سے دونوں وقت کی روٹیاں مانگ کھانے پر مطمئن ہے۔ اس کشمکش میں نہ جانے زندگی کی اور کتنی منزلیں گزر جاتیں مگر مسجد نیلا گنبد لاہور میں ایک شام ایک خیال نے اس کو ایک نئی راہ پر ڈال دیا۔ عربی اور فارسی کی بہت سی کتابیں پڑھ ڈالی ہیں۔ نماز مغرب کی اذان پر اپنے حجرے سے نکلتے اور وضو کے لئے آستینیں چڑھاتے ہوئے جیلانی نے دل میں سوچا۔ اب کوئی باقاعدہ امتحان کیوں پاس نہ کیا جائے۔ وضو کرنے اور نماز پڑھتے اس کا ذہن زندگی میں پہلی مرتبہ ایک باقاعدہ کام کر گزرنے کا منصوبہ بناتا رہا۔ امام نے قرأت شروع کی تو جیلانی امتحان کے کمرے میں بیٹھا منشی فاضل کا کوئی پرچہ تیزی سے حل کر رہا تھا۔ جب امام سجدے میں جھکا تو دوسرے مقتدیوں کے ساتھ اس نے بھی اپنا سر فرشِ مسجد پر رکھا تھا مگر وہ ابھی تک پرچے کے جوابات لکھ رہا تھا۔ امام رکوع و سجود کی منزلیں طے کرتا گیا اور جیلانی منشی فاضل کے مختلف پرچے، پہلا، دوسرا، تیسرا، چوتھا..... لیکن ابھی تک اسے اس پرچے کا خیال نہ آیا تھا جو پہلے پرچے سے بھی پہلے ہوتا ہے

[illegible] کا احساس ہوا [illegible] جب [illegible] نے سلام پھیرا
[illegible] باقی تھا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کی [illegible] انھوں نے انارکلی بازار کے ایک [illegible] محمد [illegible] سے [illegible] بارہ روپوں کا انتظام کر دیا۔

اس کے چند سال بعد جیلانی نے ایک اور منصوبہ تیار کیا۔ یہ منصوبہ پہلے منصوبے سے [illegible] مختلف تھا [illegible] حالات بھی مختلف تھے [illegible] یہ منصوبہ تیار ہوا [illegible] جیلانی [illegible] فاضل تھا اور [illegible] ہائی اسکول میں پچاس روپے ماہوار پر فارسی کی تدریس پر مامور تھا۔ وہ [illegible] روپے ماہوار [illegible] ایک چھوٹے مکان میں رہتا تھا جس کے تین کمرے اور ایک کھلا سا صحن تھا۔ [illegible] کے طور پر ڈیڑھ روپے میں [illegible] ایک آرام کرسی اور [illegible] میں ایک [illegible] اسٹول خریدا تھا اور جب وہ [illegible] سب سے [illegible] کمرے میں اپنی چارپائی کے پاس آرام کرسی بچھا کر اور سامنے تازہ خریدا ہوا اسٹول رکھ کر کرسی پر دراز ہوا تو اس نے دل میں اطمینان اور خوشی کی ایک عجیب کیفیت محسوس کی ایک ایسی کیفیت جس سے وہ پہلے کبھی آشنا نہ ہوا تھا اور پھر اس کے ذہن میں [illegible] اس نے سوچا عربی، فارسی اور اردو کے کئی مرحلے طے ہو چکے ہیں۔ اب انگریزی کی طرف توجہ کرنی چاہئے۔ وہ [illegible] اسکول [illegible] اور دو ایک اور مقامات پڑھ چکا [illegible]

لہ شاہی مسجد لاہور کے موجودہ خطیب

کا کام کوئی اڑھائی تین سال کے قریب کر چکا تھا اور یونیورسٹی کے متذکرہ بالا امتحانات پاس کرنے سے اس کا حوصلہ زیادہ [illegible]
علم میں آگے بڑھنے کا شوق تیز تر ہو چکا تھا۔ کئی سال پہلے جب وہ مدرسہ حمیدیہ لاہور میں زیر تعلیم تھا اس نے علامہ اقبال مرحوم کو انجمن حمایت اسلام
کے جلسوں میں اپنی نظموں سے حاضرین پر جادو کا سا اثر کرتے دیکھا تھا۔ پھر وہ نظمیں اسی زمانے میں بعض اخبارات، اور رسائل میں شائع ہوئیں اور
شاعر کے نام کے ساتھ اسی سلسلہ۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ لکھا پایا تو ان لفظوں کی حقیقت اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ دریافت کرنے پر جب معلوم ہوا کہ ایم اے
کے بعد گویا علمی دنیا کا سب سے بڑا اعزاز ہے تو مسعود جیلانی نے جس کی یہ تک خبر نہ تھی کہ منشی فاضل پاس ہی دوسرے امتحان میں شریک ہونے
کے لئے یونیورسٹی کو کچھ فیس بھی دینی پڑتی ہے، دل میں ٹھان لی کہ وہ بھی اس ہمیشہ کو پانے کی کوشش کرے گا چنانچہ اب حالات کو سازگار
پا کر اس نے ایک جامع منصوبہ مرتب کیا جس کی تکمیل کا تعلق پی۔ ایچ۔ ڈی سے اور آغاز کا اسی سال میٹرک کے امتحان میں شریک ہونے سے تھا

۱۹۲۹ء میں ۲۷ برس کی عمر میں ماسٹر غلام جیلانی برق نے بی۔ اے پاس کیا تو وہ فکر و خیال کی نئی وادی میں قدم رکھ چکا تھا۔ ۱۹۲۴ء کے
قریب اسے محمود حسن میاں کی ضخیم کتاب "تہذیب اسلام" پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ اس میں اسلامی فتوحات اور مذہبی نظام کی برائی کی گئی تھی اور کچھ ایسے
وزنی دلائل دئے گئے تھے جن کا جواب اوسط درجے کے پڑھے لکھے مسلمان کی قابلیت اور قدرت سے باہر تھا۔ کچھ دنوں بعد سوامی دیانند کی
"ستیارتھ پرکاش" ہاتھ لگ گئی۔ اس کے بعد پنڈت نتھو رام اور مخالف اسلام مستشرق مصنفین کی باری آئی اور ماسٹر جی بھٹک گئے ـــ پہلے
تلاوت قرآن موقوف ہوئی۔ پھر نماز چھوٹی پھر روزے ترک ہونے اور آخر میں ہستی باری تعالیٰ سے انکار کا مرحلہ آیا۔ یہ دور کوئی پانچ سال جاری
رہا اس میں سوائے چہرے پر ایک داڑھی کے جو نہ جانے اس کی برق نگاہی سے کیسے بچ رہی ظاہر و باطن سے مسلمانی کا ہر نشان رخصت ہو
گیا اور آہ! وہ تنہا داڑھی اس داڑھی والی بزم میں ایمان کے اجڑ جانے پر درحقیقت مرزا غالب کی شمع خاموش تھی ؎

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

۱۹۳۴ء میں ایم۔ اے کرنے کے تھوڑے عرصہ بعد ماسٹر برق پروفیسر برق بن کر گورنمنٹ کالج ہوشیار پور میں تعینات ہوئے تو ان کی زندگی
میں نئی دلچسپیوں نے قدم رکھا۔ تاش اور شطرنج مدتوں سے ان کے مرغوب کھیل تھے مگر اب تک وہ محض ترب کا عامیانہ کھیل کھیلتے تھے اور پتوں
کے ساتھ پیسوں کے "خرام ناز" کی دلفریبیوں سے ناواقف تھے۔ یہاں آ کر برج سیکھی تو دو ہی چار دن میں طبیعت داد دینے لگی اور حوصلہ اتنا بڑھا
اور شوق اتنا مچلا کر سروسز کلب کے علاوہ پبلک کلب کے بھی رکن بن گئے تاکہ کھیل کا تار گھنٹوں ٹوٹنے نہ پائے ٹینس بھی انہوں نے اسی زمانے میں
سیکھا۔ انگریزی لباس تو وہ مدت سے پہنتے تھے مگر اس کی نازک مزاجیوں سے آگاہ نہ تھے۔ یہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ داڑھی کی سرحد اس کے
حق میں مضر ہے۔ چنانچہ شیو بنانے کے آداب سے آراستہ ہوئے اور یہیں آ کر ان کا یہ گمان یقین میں بدلا کہ ان کی پہلی بیوی ان کی رفاقت کا حق ادا
کرنے کی بالکل اہل نہیں۔

مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ اپنے منصوبے کی طرف سے غافل ہو کر بس انہی دلچسپیوں میں کھو گئے تھے۔ ہوشیار پور کے زمانہ قیام میں ان
کے وقت کا خاصا حصہ ڈاکٹریٹ کے مقالے کی تیاری میں صرف ہوا۔ وہ دس بجے کے قریب کلب سے اٹھ کر گھر جاتے اور کھانا کھانے کے بعد مطالعہ
و تحقیق میں لگ جاتے۔ یہ مشغلہ کھیل سے کچھ کم دلچسپ نہ تھا۔ اس لئے رات گئے تک، اکثر دو بجے تک، جاری رہتا۔ چارپائی اور اس کے سامنے پڑی ہوئی
میز کے اوپر نیچے، دائیں، بائیں، انگریزی، عربی اور فارسی کی کتابیں اور رسالے بکھرے پڑے ہوتے۔ پروفیسر برق بڑی دماغ سوزی اور عرق ریزی کے
ساتھ ان سے ضرورت کا مواد اور معلومات اخذ کرتے، تنقیح و تہذیب کے بعد ان کو ایک خاص انداز سے مرتب کرتے اور ان سے اپنی کتاب کے لئے
مستند نتائج نکالتے تھے۔ یہ علمی مشقت کوئی چھ سال تک جاری رہی۔

۱۹۴۲ء میں [illegible] منصوبہ [illegible] ہے [illegible] سلسلے [illegible]
[illegible] اس منصوبہ
[illegible] آپ [illegible]
منصوبہ کیا تھا۔

۲۔ ۱۹۴۹ء [illegible] مطالعہ [illegible] کی حقانیت [illegible]
[illegible] بزرگی [illegible] مطالعہ [illegible] ہیں۔
اسلام [illegible] سائنس [illegible] قرآن [illegible]
اور سائنس کے جدید انکشافات اور نظریات [illegible] اسلام کی صداقت اور قرآن [illegible]
ہونے کا زبردست ثبوت ہے۔

۳۔ اسلام وہ نہیں جو اکثر علماء کی زبان و قلم سے پیش کیا جاتا ہے بلکہ وہ ہے جس کی تعبیر و تصدیق قرآن [illegible] سے ہوتی ہے اور ان دونوں اسلاموں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ [illegible] اسلام مذہبی تعصب، کج بحثی، تنگ نظری [illegible] کا نام ہے مگر حقیقی اسلام علم و اخلاق کی بلندی، نظر کی وسعت اور قلب کی فراخی ہے۔

۴۔ مذاہب عالم کی اصل ایک ہے اور ان کا باہمی تضاد اور موجودہ منافرت [illegible] مذہبی پیشواؤں اور [illegible] کی پیدا کردہ ہے۔

جب متذکرہ بالا خیالات ڈاکٹر برقؔ کے دل و دماغ میں راسخ ہو گئے اور جب ان کے اظہار کے تقاضے میں بڑھے تو انہوں نے اس کو سلسلہ وار شائع کرنے کا منصوبہ تیار کیا۔ جن میں کا پہلا منصوبہ "دو قرآن" ۱۹۴۸ء، "دو اسلام" ۱۹۵۰ء اور "ایک اسلام" ۱۹۵۱ء کی صورت میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

ان حالات کا بیان اور ان منصوبوں کا ذکر اس لئے ضروری تھا کہ ان کے بغیر ڈاکٹر برقؔ کی شخصیت کا وہ پس منظر اجاگر نہ ہو سکتا جس میں اس نے اپنی تعمیر کی اور ان واقعات کا اندازہ نہ ہو پاتا جن سے وہ دوچار ہوئے، جن سے انہوں نے اثر لیا اور جن کی مدد سے ان کی شخصیت کو اپنا مخصوص آب و رنگ حاصل ہوا۔ اس پس منظر کو سمجھنے کے لئے پس منظر کا دیکھنا بہرحال ایک ناگزیر سی چیز ہے۔

جو لوگ اپنی محنت اور قابلیت سے ابھرتے ہیں بعض اوقات ان میں خود دماغی اور اپنی ذات کا ضرورت سے بڑھا ہوا احساس بھی ابھر آتا ہے۔ ڈاکٹر برقؔ کو یہ جذبہ چھو تک نہیں گیا۔ نخوت و پندار سے بڑھ کر کوئی چیز ان کی ذات سے دور نہیں۔ آپ ان سے ملئے، ان سے الجھئے، اگر جی چاہے تو ان کے منہ پر ہی ان کے سارے کارنامے کی نفی کر دیجئے، وہ اس کے جواب میں کوئی ایسا کلمہ منہ سے نہ نکالیں گے، اٹھنے بیٹھنے، پہلو بدلنے یا مخاطب کرنے کا کوئی ایسا انداز اختیار نہ کریں گے جس سے یہ پایا جائے کہ وہ اپنے کو آپ کی ذات یا بات سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ اس لحاظ سے نہ صرف ان کو اپنے علم اور مصنفانہ صلاحیت پر کوئی ناز نہیں بلکہ ان میں ایک نوع کی "نفیِ ذات" بھی بڑی نمایاں ہے۔ یہ "نفیِ ذات" نہ تو صوفیانہ عجز و انکسار سے کوئی تعلق رکھتی ہے اور نہ "اخلاقِ جلالی" کے تحمل و بردباری سے۔ ایسا نہیں کہ وہ بھڑک نہیں اٹھتے یا برس نہیں پڑتے۔ کبھی کبھار یہ بھی ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے لیکن روزمرہ کی زندگی میں، گھر میں ہوتے ہوئے، کالج کے اوقات میں، احباب کی صحبتوں میں، کلب میں، سینما میں، سیر و شکار کے موقعوں پر، غرض ہر جگہ جہاں وہ علم و کتاب کے بغیر چلتے پھرتے اور ملتے ملاتے موجود ہوتے ہیں ان کو اپنی مصنفانہ شہرت یا عالمانہ حیثیت بالکل اور قطعاً یاد نہیں ہوتی اور کوئی بھی ان کی گفتگو، غیر علمی مشاغل میں ان کے انہماک اور

دوستوں سے ان کی بے تکلفی کی نوعیت سے ہرگز نہیں پاسکتا کہ وہ قرآن یا ایک اسلامی ادارے ڈاکٹر ہیں

خوش دلی ڈاکٹر صاحب کی طبیعت کا جوہر ہے۔ ان کی عمر اس وقت باون ترپن برس کی ہے اور اتفاق دیکھیے کہ اس عمر میں وہ پوتوں کے باپ اور جہاں تک نانا کا تعلق ہے ایک سے زیادہ بیٹیوں کے شوہر ہیں۔ اس کے باوجود ہنسنے ہنسانے میں وہ اپنا حریف نہیں رکھتے وہ تبسم زیرلب کے نہیں بلکہ بے تکلف قہقہوں کے قائل ہیں۔ یہ لطیفے ان کے دیوان خانہ میں، کلب میں ... بزم پرور کالج شادی بیاہ کی، غیر رسمی اجتماعوں میں بھی چند لمحے اور دن گزرتے ہیں کہ ان کی بہار دیکھی ہو تو کوئی اس وقت دیکھے جب کالج سے اوقات ختم ہونے پر وہ اپنے ساتھیوں کی محفل میں ... رونق بنے بیٹھے ہوتے ہیں۔ عالمانہ اور شاعرانہ نکات کے علاوہ ان کے حافظہ میں سعدی و رومی کی حکایات سے لے کر سکھوں، پٹھانوں ... تک ... کے لطیفوں کا ایک بڑا ذخیرہ محفوظ ہے اور ان کا طرز بیان اس قدر دلکش، انداز ترجمانی اور ... کہ محفل پر ... چھا جائے تو گھنٹوں کسی کو اٹھنے کا نام نہ لے گا۔ آغاز مجلس عام طور پر علمی مسائل ... ڈاکٹر صاحب یا کوئی اور رفیق کسی مضمون یا کتاب کی تیاری میں مصروف ہیں اور انہوں نے ... نظریہ کا انکشاف کر دیا ہے یا خصوصیت سے کوئی مسئلہ درپیش ہے، مسائل کا دائرہ حدیث کی حجیت سے لے کر ... اور ... تک وسیع ہے، اور دو چار احباب درمیان ہوں تو بحث چھڑ جائے گی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ڈاکٹر صاحب خود اس وقت ... موجود ہیں ... ضرور ہوگا۔ چنانچہ دفعتاً ... سے فارغ ہوتے آئیں گے ... کی بعد ... جانے گی ... ڈاکٹر صاحب ... احمد ... لیڈر ڈیم لیڈ تشریف لے آتے ہیں۔ اب باقاعدہ کارروائی شروع ہوتی ہے۔ آیات قرآنی پڑھی جا رہی ہیں، اتفاق سے دو رفقاء حافظ قرآن بھی ہیں ... بیان ہو رہی ہیں۔ ... حوالے سنائے جا رہے ہیں، تفسیر کے نکتے حل ہو رہے ہیں، منطق و استدلال سے دریے جلتے ہیں اور وہ سب کچھ ہو رہا ہے جو نظریات کے تصادم ... ایوانوں سے ... کیا کرتے ہیں مگر اب بحث نے طول کھینچا ہے اور طبیعتوں میں کچھ تیزی آنے لگی ہے۔ اس موقع پر ... مخالف ... میں سے کسی باذوق نے منہ کا مزا یا محفل کا رنگ بدلنے کے لیے کسی فاضل دوست پر کوئی فقرہ چست کر دیا ہے یا لطیفہ کہہ دیا ہے تو سمجھیے کہ اب محفل کا پہلا دور ختم ہوا اور کارروائی جب دوسرے دور میں داخل ہوتی ہے تو فضا قہقہوں سے گونج رہی ہوتی ہے۔ وہ چہرے جو تھوڑی دیر پہلے ... اور علم کی سنجیدگی سے بوجھل بوجھل نظر آتے تھے اب پھولوں کی طرح شگفتہ ہیں اور بقول ... کھلی ہوئی باچھیں پھر گھنٹوں تک اپنی اصلی جگہ پر واپس نہیں آتیں۔ ڈاکٹر صاحب پہلے بھی صدر نشین تھے، اب بھی میر مجلس ہیں۔ لطائف و ظرائف کا دفتر کھل گیا ہے مگر اصل کشش ان کی قدرت بیان میں ہے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے بعد یہ کمال میں نے ڈاکٹر برق میں دیکھا ہے کہ عربی، فارسی، اردو، پنجابی، ملتانی، سندھی، پشتو، کشمیری ... ڈاکٹر صاحب کی حد تک انگریزی بھی اس فہرست میں شامل ہے۔ غرض لطیفہ جس زبان اور طبقے کا ہوگا اس کو اسی زبان اور اسی طبقے کے لب ولہجہ میں ادا کر سکیں گے۔ ڈاکٹر صاحب جب ... صاحب لوگوں کے واقعات جن کا ذاتی تجربہ بھی ان کو کچھ کم نہیں، کا ذکر کرتے ہیں اور ان کے مخصوص تلفظ سے کام لیتے ہیں تو سماں بندھ جاتا ہے۔ اسی طرح جب وہ ان بے شمار ہیڈ ماسٹروں، اسکول انسپکٹروں، پرنسپلوں اور ڈائرکٹروں کا ذکر خیر کرتے ہیں جن سے انہوں نے نفع یا نقصان اٹھایا تو ہر ایک کی انفرادیت اس کی مخصوص آواز، طرز گفتگو اور انداز فکر کے ساتھ آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے اور حاضرین کو بے حد محظوظ کرتی ہے۔ لیکن اس تمام لطیفہ گوئی اور واقعہ نگاری پر غالب اور سب سے بڑھ کر دلچسپ ان کی 'آپ بیتی' ہے جسے موقع و محل کی رعایت سے وہ انتہائی بے باکی اور صدق گوئی کے ساتھ 'منظر عام' پر لاتے ہیں۔ ماضی میں ان سے جو کچھ سرزد ہوا، اندھیرے اجالے انہوں نے جو کچھ کیا، بیان واقعہ سے خواہ ان کی اہانت و سبکی کا پہلو نکلتا ہو خواہ ان کی کسی نفسی یا اخلاقی کمزوری کا پتہ چلتا ہو وہ لگی لپٹی رکھے بغیر اس کا ذکر کر دیں گے۔ مرزا غالب نے اپنے کسی خط میں لکھا ہے کہ "آپ اپنا تماشائی بن گیا ہوں" یہ ڈاکٹر صاحب کا سلوک بھی اپنی ذات کے ساتھ

[illegible]

[illegible]

[illegible] ڈاکٹر صاحب [illegible]

[illegible] جس کے کان تک جب یہ بات پہنچی [illegible] اسلوب کی بنا پر وہ خط نقل کیا تھا اور کہیں رکھ کر بھول گیا تھا۔ [illegible] اپنی صفائی میں ناکام اور اپنی نیک نامی سے مایوس ہو چکے تھے۔

میں نے یہ واقعہ بہت سوچ بچار کے بعد یہاں درج کیا ہے اور محض اس لئے درج کیا ہے کہ اس کے بغیر ڈاکٹر صاحب کی طبیعت کا یہ سنگین رخ تشنۂ اظہار رہ جاتا۔ فیصلے میں عجلت اور طبیعت کی تیزی ان دو حملوں کا باعث ہوئی جو انہوں نے 'دو قرآن' کے ایک تبصرہ پر مولانا عبدالماجد دریابادی کو پارسال یا دو سال پہلے لکھے تھے۔ علاوہ اور باتوں کے اس میں ڈاکٹر صاحب کا مولانا کو یہ مشفقانہ مشورہ بھی شامل تھا: "لہٰذا آپ علمی و اسلامی مسائل پر لکھنا چھوڑ دیں، اس لئے کہ یہ کام آپ کے بس کا نہیں۔" اپنے اسی خط میں ایک جگہ مولانا کو یقین دلاتے ہیں: "آپ کی اسلام سوز جہالتوں پر ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے لیکن کوئی صاحب فکر و نظر آپ جیسی متعفن لاش پر وقت کیوں ضائع کرے۔"

مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو متذکرہ بالا دونوں واقعات کا بعد میں بے حد افسوس ہوا۔ انہوں نے اپنے رفیق سے بھی معذرت چاہی اور مولانا کے لئے بھی ان کے دل میں معذرت خواہی کے سینکڑوں ارمان پوشیدہ ہیں مگر مجھے یہ بھی یقین ہے کہ جب تک دم میں دم ہے ہر ایسی صورت پیدا ہونے پر وہ فیصلے پر تحقیق سے پہلے ہی پہنچیں گے۔

ان کی طبیعت کا یہ رخ لطیف پہلو بھی رکھتا ہے اور کثرت الوقوع کے اعتبار سے لطیف پہلو سنگین پہلو پر بلاشبہ غالب ہے۔ اب تو خیر

بعد الٹھ آتے ہیں۔ چند سال پہلے تک وہ گرمی ہو یا سردی کلب سے آدھی رات کو لوٹتے اور [illegible] جاگتے رہ کر دروازہ کھولنے کا فرض ادا ایثار صرف اہلیہ ہی کا حصہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب جب دروازہ کھٹکھٹاتے تو [illegible] عادتاً پوچھ لیتیں: "کون ہے؟" ڈاکٹر صاحب شاید دیر سے آنے کے احساس کو دور کرنے یا بیگم کے اس ایثار کی قدر [illegible] کرنے کے جواب میں اکثر کہتے: "کوئی خوش دل کا ہو گا" کبھی کہتے: "آپ کا سرتاج!" کبھی بولتے: "آپ کا تابعدار شوہر" کبھی [illegible] درجن بھر بچوں کا باپ" وغیرہ وغیرہ۔ ایک دفعہ گھر میں ساس آئی ہوئی تھیں۔ اہلیہ نے ماں کی شفقت اور مامتا سے [illegible] کا کام ان کے سپرد کر کے خود سو رہیں (بقول ڈاکٹر صاحب کے ماں بیٹی کی آواز میں مماثلت بہت ہے)۔ حسب معمول بارہ بجے کے قریب جب ڈاکٹر صاحب نے دروازہ کھٹکھٹایا تو تھوڑی دیر کے بعد ایک نسوانی آواز نے پوچھا "کون ہے؟" ڈاکٹر صاحب نے کمال بے تکلفی کے ساتھ پنجابی میں خاوند کا ایک بھرپور مترادف لڑھکا دیا ... اور پھر کئی روز تک وہ جس احساس سے مغلوب رہے اس کی تفصیل نہ پوچھئے۔

کلب کا ذکر آ گیا ہے تو اس کو بھی نمٹاتے چلیں۔ ہوشیار پور سے ڈاکٹر صاحب کو زندگی کے دو نہایت مخلص اور وضعدار ساتھی میسر آئے۔ دوسری بیگم اور برج۔ گرمی ہو یا سردی، بادل برسیں، طوفان ہو یا آندھی اٹھ رہی ہو، لکھنے پڑھنے کا کوئی ضروری کام ہو یا طبیعت ناساز ہو، ہر حال میں عین اس وقت جب مؤذن نماز مغرب کے لئے پکار رہا ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب اپنی سائیکل پر کلب پہنچتے ہیں اور پھر تین ساڑھے تین گھنٹے تک برج میں لگے رہتے ہیں۔ اتوار کے روز البتہ خاص کھیل بھی ہوتا ہے اور دوپہر کے کھانے کے بعد سے نصف رات تک مسلسل اور لگاتار جاری رہتا ہے۔ اس طرح آج کل اوسط کوئی چار ساڑھے چار گھنٹے یومیہ سے زیادہ کی نہیں مگر ایک زمانے میں وہ چھ چھ سات سات گھنٹے یہ کھیل کھیلتے تھے اور برسوں ان کے سگریٹ پان کا خرچ اس سے پورا ہوتا رہا۔ سگریٹ پان کا خرچ کیوں ہی (محاورۃً) کہہ دیا وہ جنگ سے پہلے کے ساٹھ ستر روپے ماہوار بڑی چیز ہوتے تھے اور کیا عجب علامہ طنطاوی مصری کی تفسیر (جس سے متاثر ہو کر انہوں نے دو قرآن لکھے) اور علامہ یوسف علی کا انگریزی ترجمۂ قرآن جس کے وہ بے حد معترف ہیں، اسی مد سے خریدے گئے ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ وہ اس کھیل میں ہارے بہت کم ہیں۔ ان کی جیت کا ریکارڈ ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کا ہے مگر ہار اٹھارہ روپے سے آگے نہ جا سکی اور پیار بھی انہیں کسی معمولی آدمی کے ہاتھوں نہیں ہوئی۔ غالباً ۴۸ء کے شروع کا ذکر ہے، راجہ غضنفر علی خاں مرکز میں وزیر تھے اور ان دنوں پنجاب کے دورے پر تھے کہ ایک روز کیمبل پور آ نکلے۔ دن بھر تو آس پاس کے مہاجر کیمپوں میں کمبل اور لحاف بانٹتے رہے اور رات کے ابتدائی حصے میں مقامی کلب کے مقامی اور مہاجر کھلاڑیوں سے پیسے بٹورے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے حصے کے طور پر مبلغ اٹھارہ روپے شاہی نذر کئے۔

برج کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کو شطرنج، شکار اور شمع معمے سے بھی شغف رہا ہے۔ شطرنج پر اب بھی توجہ فرماتے ہیں۔ سال میں دو تین دن شکار پر بھی نکلتے ہیں البتہ 'شمع' والوں کی بے اصولی سے تنگ آ کر انہوں نے معمے حل کرنے ترک کر دئے ہیں۔ بیچ میں کچھ دنوں 'بیسویں صدی' اور 'آستانہ' سے بھی شغل فرمایا مگر وہ بھی بالآخر بے اصول ثابت ہوئے۔

انگریزی میں یہ خیال ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے کہ ماتحت اپنے افسر کو نظرانداز نہیں کر سکتا۔ وہ اس کو پسند کرے گا یا ناپسند، اس سے محبت کرے گا یا نفرت، ڈاکٹر صاحب اس خیال کی زندہ اور نہایت زوردار تائید ہیں۔ وہ پرنسپل کی شخصیت کو بالکل اور ہرگز نظرانداز نہیں کر سکتے۔ اگر پرنسپل ان کے ڈھب کا ہے یا اس سے ان کے مخلصانہ تعلقات استوار ہو چکے ہیں تو وہ ہر جگہ اور ہر موقع پر اس کی نیک دلی اور انسان دوستی کی تعریف کریں گے۔ اگر ایسا نہیں تو ان کی قوت بیان کا ایک خاص حصہ اس کی 'مردم آزاری' کی تشہیر کے لئے وقف رہے گا۔ البتہ اس میں وہ ایک خاص وضع کے پابند ہیں۔ 'مردم آزار' پرنسپل جب تک کیمبل پور میں ہے ڈاکٹر صاحب اس کی قدح میں محتاط رہیں گے۔

[illegible] حقیقت [illegible] کے مطابق [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] پریشان ہو جاتے ہیں [illegible]
[illegible]
[illegible] روایت ہے [illegible] دو سال پیشتر [illegible]
[illegible] کسی ذاتی [illegible]
کے پاس یہاں ایک [illegible]
خوش [illegible] ہیں۔ اس کے علاوہ [illegible] کلب [illegible] یہ سب [illegible] ہیں۔

ڈاکٹر صاحب [illegible] مخلص خاوند اور [illegible] شفیق اور ہمدرد باپ ہیں۔ [illegible] بچوں سے
[illegible] ایک جو سب سے بڑا ہے [illegible] ڈاکٹر صاحب کے گھر [illegible]
اور ڈاکٹر صاحب کے حقیقی ماموں کے گھر [illegible]
آٹھ [illegible] دوسری جگہ [illegible] ہیں۔ سب سے بڑا لڑکا پشاور یونیورسٹی میں بی۔ اے [illegible] اور سب سے چھوٹی بچی نے ابھی پانچ سال اسکول
جانا شروع کیا ہے۔ باقی سات [illegible] مختلف درجوں میں ہیں۔ ان سب کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کا سلوک نہایت [illegible]
اور [illegible] ہے۔ میں نے [illegible] اپنے بچوں کا دوست [illegible] پایا تھا۔ ڈاکٹر صاحب بھی اپنے رنگ میں بچوں کے ساتھ
ملنسار [illegible] واقع ہوئے ہیں۔ میں نے ابھی انہیں [illegible] اور مخلص خاوند کہا ہے۔ مخلص اس لئے کہ میاں بیوی کے درمیان
خلوص اور اخلاص کا جو تصور عام طور پر پایا جاتا ہے ڈاکٹر صاحب [illegible] مطلب دوسری جگہ کی نسبت سے ہے) اس پر پورا اترتے ہیں
اور [illegible] اس بنا پر کہ [illegible] ذرا شرح میں اس کی وضاحت ایک مثال سے کرتا ہوں۔ چند سال ادھر کا واقعہ ہے ایک دوست نے
جو کلب میں برج کھیلنے کے عادی تھے شادی کی لیکن اس کے باوجود کلب سے اپنا تعلق قائم رکھا۔ بیگم صاحبہ ذرا جدید وضع کی
واقع ہوئی تھیں، ہفتہ عشرہ تو صبر کر گئیں پھر ایک روز بولیں: "میرا خیال ہے آپ کی شادی مجھ سے ہوئی ہے کلب سے نہیں۔" تاہم میاں
بھی عورتوں کی 'مساوات' کے جدید تقاضوں سے ناواقف نہ تھے۔ جذبات کی نزاکت کو فوراً سمجھ گئے۔ لیکن میرا اندازہ ہے ڈاکٹر صاحب
کے لئے 'جذبات کی نزاکت' کا کبھی سوال ہی پیدا نہیں ہوا اور یوں بھی وہ 'نزاکتوں' کے قائل نہیں اور جو شخص زندگی اور جذبات کی
نزاکتوں سے چنداں سروکار نہ رکھتا ہو اور یوں معقول آدمی ہو میرا یقین ہے وہ بطور خاوند کے ضرور لاپروا ہوگا۔

البتہ ایک لحاظ سے وہ بڑے 'بیوی پرست' واقع ہوئے ہیں۔ انہیں عورتوں کے سیاسی، معاشرتی یا معاشی حقوق سے تو چنداں
دلچسپی نہیں اور نہ وہ تحریک نسواں کے مساواتی نظریہ سے کوئی ہمدردی رکھتے ہیں مگر وہ 'بیوی' کو 'ماں' کے یا زیادہ واضح لفظوں میں یوں
کہ اس کی 'ساس' کے 'جارحانہ عزائم' سے محفوظ رکھنے کے بہت بڑے حامی اور مؤید ہیں۔ رفقاء میں سے کوئی شادی کرے تو مبارکباد
کہنے کے بعد اکثر پہلا سوال یہی کرتے ہیں: "والدہ ماجدہ زندہ ہیں؟" اگر جواب نفی میں ہو اور مخاطب سے بے تکلفی بھی ہو تو اس کو
ایک بار اور مبارکباد کہنے میں کچھ مضائقہ نہ سمجھیں گے اور شادی کی کامیابی کی فی البدیہہ پیشگوئی کر دیں گے اور جواب مثبت میں ہو تو
ذرا سوچ میں پڑ جائیں گے اور بڑے پُر شفقت لہجے میں مشورہ دیں گے کہ "جہاں تک ممکن ہو بیگم صاحبہ کو والدہ ماجدہ کے سایۂ عاطفت سے

دو بھی رکھیں گا۔ بس شادی کی کامیابی کا یہی گر ہے" اور اگر مرد ہیں جوں تو پھر اس بات کا قدرے تفصیل سے ذکر کریں گے کہ ان کی اپنی والدہ محترمہ اپنی تین عدد پیاری بہوؤں کی طلاق کا سامان کر چکی ہیں۔ بحیثیت مجموعی ڈاکٹر صاحب عورت کے متعلق کوئی اونچی رائے نہیں رکھتے۔ اب یہ فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے کہ اس سے خود ڈاکٹر صاحب کے بارے میں اونچی رائے قائم کرنے میں کتنی مدد ملتی ہے۔

طوالت کے خوف سے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے بعض اور پہلوؤں پر مختصر طور سے لکھتا ہوں۔ اگرچہ میرا ارادہ ان پر قدرے تفصیل سے لکھنے کا تھا۔ وہ شعر و سخن کا بہت عمدہ اور پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں۔ بڑے زوردار قسم کے عوامی مقرر ہیں۔ سپاس نامہ لکھنے میں وہ یدِ طولیٰ حاصل ہے کہ چاہیں تو ملا شور بازار جیسے افغان کی چیخیں نکل جائیں[1]۔ پرنسپل کے پاس جب کوئی ایسی تجویز یا سفارش آتی ہیں جس کی منظوری خود ان کی نظر میں مشتبہ ہو، جناب "منظور" کا لفظ معمول سے زیادہ فراخ دلی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ ضرورت پڑنے پر ایسے طریقِ کار کو بھی آزما دیکھتے ہیں جس کو اخلاقی مضمون لکھتے یا تقریر کرتے وقت وہ جائز نہیں ٹھہراتے۔ بڑے منکسر المزاج، ہمدرد اور دوست نواز ہیں مگر کبھی کبھی اس وصف میں وہ حد سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ایک زمانے میں پڑھنے اور لکھنے والوں میں ممتاز اور شوق کی کارفرمائی تھی۔ اب کفایت سے پڑھتے اور محبت سے لکھتے ہیں۔ دیر سے سونے اور دیر سے اٹھنے کے عادی ہیں۔ بمشکل سے انھوں نے طلوعِ صبح ہوتے دیکھا ہو، سوائے ایسے موقعوں کے جب وہ دوسروں کے اصرار یا اپنے شوق سے سیر و شکار کی کسی مہم میں شریک ہوں اور اس کے لیے صبح سویرے کی کسی گاڑی، بس یا موٹر سے روانہ ہونا ہو۔ دیر سے اٹھ کر پہلے اخبار دیکھتے اور پھر شیو بناتے ہیں۔ اس کے بعد وضو کر کے دو رکعت نمازِ فجر خاصی پابندی کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ سردیوں میں بس یہی دو رکعت ان کا ناشتہ ہے۔ البتہ گرمیوں میں رات کو جب کلب سے لوٹتے ہیں تو کھانا کھانے سے پہلے اور غسل کرنے کے بعد اکثر دو رکعت نمازِ عشا کے ادا کرتے ہیں۔ نمازِ جمعہ کے وہ قطعی تارک ہیں۔ گذشتہ چودہ برس سے انھوں نے مسجد میں قدم نہیں رکھا۔ روزے کی بجائے وہ فی روزہ دو روپیہ فدیہ ادا کرتے ہیں۔

آخر میں میرا جی چاہتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کے مذہبی عقائد و خیالات پر بھی کچھ کہوں مگر اس مضمون کے اصولی اور تکنیکی تقاضے اس امر کے مانع ہیں۔ البتہ یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ میرے نزدیک وہ بعض سچے دعووں کے قدرے کمزور وکیل ہیں۔ اس کی دو وجوہ ہیں۔ اوّل یہ کہ دعویٰ یا خیال جس قدر اونچا اور بلند ہوگا اسی قدر اپنے حق میں دیرپا اور بے داغ استدلال کا تقاضا کرے گا۔ ڈاکٹر صاحب بڑے سے بڑے اور اونچے سے اونچے خیال کی حمایت میں ایک آدھ محکم دلیل دینے کے بعد تھک سے جاتے ہیں اور پھر اس شاعر کی طرح جو غزل میں دو ایک اچھے شعر کہہ چکنے کے بعد بھرتی کے اشعار پر اتر آتا ہے، وہ ایسے دلائل دینے لگتے ہیں جو اپنے اندر کچھ زیادہ وزن اور وقعت نہیں رکھتے۔ غور سے دیکھا جائے تو غزل اور سنجیدہ مضمون نگاری میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ غزل میں ایک آدھ کام کا شعر بھی نکل آئے تو بقول مولانا حالی ساری غزل چمک اٹھتی ہے اور بالفرض وہ نہ بھی چمک اٹھے تو بھی اس کے بُرے شعروں کا اس کے اچھے شعروں پر چنداں برا اثر نہیں پڑتا۔ لیکن سنجیدہ مضمون میں خواہ اس کا تعلق مذہب و فلسفہ سے ہو یا کسی اور علم سے صرف ایک بودی دلیل کے ہونے سے سارے مضمون کے وقار اور قدر و قیمت کو دھکا لگتا ہے۔ دوسرے اگرچہ ڈاکٹر صاحب کا اندازِ بیان اپنے اندر ایک خاص طرح کی شگفتگی اور ادبیت رکھتا ہے مگر بحیثیت مجموعی اس میں گرج زیادہ ہے اور نرمی اور دل سوزی کم ہے۔ گو گرج کی بھی زندگی اور ادب میں ایک مقام رکھتی ہے مگر اس کے علاوہ بھی

---

[1] چند سال پہلے اپنے دورۂ پاکستان کے وقت جب ملا صاحب یہاں تشریف لائے تو حکامِ ضلع کی سفارش و درخواست پر ڈاکٹر صاحب نے ان کی خدمت میں بزبانِ فارسی ایک سپاس نامہ پیش کیا۔ اس میں مشرقی پنجاب کے مظالم کا ذکر کچھ اس انداز سے تھا کہ ملا صاحب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

[illegible] مقالات میں ایک حد تک [illegible] ایک ایسے شعر [illegible] اقبال کی [illegible] [illegible] کے [illegible]
ان مقالات سے [illegible] خاص [illegible] [illegible] [illegible] اشاعت [illegible]
[illegible] ہے کہ [illegible] دست [illegible] اقبال [illegible] ہے۔

گو [illegible] کے سینے [illegible] بیدار ہے

گلستاں [illegible] [illegible] ہے

[illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] ہے۔

اے آر خاتون

زبیدہ خاتون

ایک بیٹی کا اپنی ماں کے صحیح نقش و نگار اور جیتی جاگتی تصویر کو لفظوں میں پیش کرنا، ان کی خوبیوں اور کمزوریوں کو ظاہر کرنا کچھ عجیب سی بات ہے بلکہ ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ اور پھر اے آر خاتون کی شخصیت تو بالکل بحر اوقیانوس کی طرح گہری ہے۔ بلکہ ایک معمہ ہے۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کی کون کون عادات کو خوبیوں کے دفتر میں داخل کیا جائے اور کس بات کو کمزوری سمجھا جائے۔ یہ دونوں آپس میں اس قدر گتھی ہوئی ہوتی ہیں کہ ان کو سلجھا کر الگ الگ کرنا ذرا دقت اور دیر طلب کام ہے، کیوں کہ کوئی بھی انسان خوبیوں اور برائیوں سے پاک نہیں ہوتا۔ بہرحال یہ فیصلہ تو پڑھنے والے ہی خوب کر سکیں گے۔ مگر سچی سچی بات کہہ دینے میں کوئی ہرج بھی نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ ایک باعمل انسان ہیں اور انہیں ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کا ایک مرض سا ہے۔ وہ ہر ایک سے یہی کہتی ہیں کہ کوئی نہ کوئی کام کرتے رہو اور کچھ نہ ملے تو کھیل ہی کھیلو۔ اگر کھیلنے والے کوئی توجہ نہیں دیتے تو وہ خود کوئی کتاب یا کھیل شروع کر دیتی ہیں، کوئی ان کا ساتھ نہ دے۔ تو بچوں کو اپنے ساتھ شامل کر لیتی ہیں، نہ بچے تو اس کے منتظر ہی رہتے ہیں کہ گھر کا کوئی خاص فرد ان کے کھیل میں دلچسپی لے۔

وہ چپکے ہی چپکے اپنے کام میں ایسے مصروف رہتی ہیں کہ کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ اور دیکھنے والوں کو ان کا کیا ہوا کام ایسا لگتا ہے جیسے کوئی جن آ کر کر گیا ہو۔ بعض وقت تو ان کے مسلسل کام ہی کام سے دیکھنے والوں کی طبیعت اکتا جاتی ہے، مگر ان کی کوشش اور مستقل مزاجی میں ذرہ برابر فرق نہیں آنے پاتا۔ چاہے کتنا ہی کوئی انہیں اس کام سے بیزار کرانے کی کوشش کرے طرح طرح سے اس کام کے عیب ان کے سامنے ظاہر کرے، مگر توبہ کیجئے وہ بغیر کسی کی بات کا جواب دیئے اپنے کام میں مصروف رہتی ہیں اور اس کو مکمل کر کے ہی چھوڑتی ہیں۔

مشغول و مصروف رہنا ان کی عادت ہے ان کا کہنا ہے کہ بیکاری سے انہیں الجھن ہوتی ہے صحت پر خراب اثر پڑتا ہے اپنی [illegible]

اور آنکھوں سے چھوٹے ہے انھوں نے کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کی عادت ڈال لی ہے۔

انھوں نے ہمیشہ زندگی کو مطمئن اور آسان بنانے کی کوشش کی ہے اور اب تک اسی جدوجہد میں کوشاں رہتی ہیں۔ اس راہ میں انھیں بڑی بڑی رکاوٹیں بھی پیش آتی ہیں، مگر وہ بڑے صبر واستقلال سے اپنی دھن میں لگی رہتی ہیں۔ نہ جانے ان میں یہ قوت کہاں سے آگئی ہے۔

وہ بہت جلد آنکھوں ہی آنکھوں میں کسی ہے مشکل کام سیکھ لیتی ہیں۔ اگر کسی کو بہت عمدہ نرالی قسم کا سویٹر یا کپڑا پہنے دیکھیں گی اور وہ انہیں پسند آجائے گا (کیونکہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر عمدہ طرز کا فیشن انہیں پسند آجائے) تو یقین مانئے کہ بالکل ویسا ہی بلکہ اس سے بہتر جب تک وہ اپنے ہاتھ سے تیار نہیں کر لیں گی انہیں چین نہیں آئے گا۔ ان میں سیکھنے کا شوق اور تجسس کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ ہر کسی کی وہ بات یا کام جو انہیں پسند آجائے اور وہ سیکھ کر دم لیں گی۔ "جستجو" بھی ان کی ایک فطرت ہے۔ وہ دنیا کی ہر قسم کی معلومات و حالات اپنے میں جذب کر لیتی ہیں۔ خبروں یا کسی میچ کی کمنٹری کے وقت اگر انہیں تلاش کیا جائے تو وہ ریڈیو کے پاس بیٹھی ہوئی بڑی دلچسپی سے خبریں یا کمنٹری سنتی ہوئی ملیں گی۔

گھر کے دوسرے لوگوں کی زیادہ تر یہی خواہش ہوتی ہے کہ گھر میں رسالے یا کتابیں کم آیا کریں کیونکہ وہ "کتب کا کیڑا" بھی ہیں کوئی کتاب ہاتھ لگ جانی شرط ہے۔ وہ اس کو ختم کئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ اگر کبھی کوئی بے حد موٹی تازی کتاب مل جائے تو چاہے وہ [illegible] ہی کیوں نہ ہو) ایسا معلوم ہوگا جیسے امی گھر میں موجود نہیں ہیں۔ کبھی کبھی کوئی کہہ اٹھتا ہے "اسے یہ موٹی موٹی کتابیں کہاں سے آجاتی ہیں۔ خدا کے لئے انہیں نہ لایا کرو۔" مگر امی تو چشمہ لگائے کتاب میں اس قدر غرق ہوتی ہیں کہ انہیں معلوم بھی نہیں ہوتا کہ کوئی کیا کہہ رہا ہے یا ان کے ارد گرد کیا ہو رہا ہے۔ کتاب ختم ہونے کے بعد وہ ان کے ذہن میں اس قدر سما جاتی ہے کہ اکثر کئی کئی دن وہ اسی کا ذکر کرتی رہتی ہیں۔ کتابوں کی وجہ سے وہ اپنا آرام تک بھول جاتی ہیں (جس کی انہیں اشد ضرورت ہے)، انہیں یہ تک خبر نہیں ہوتی کہ وہ کہاں ہیں۔ کیا کرنا ہے، ضروری سے ضروری کام کتاب ہاتھ میں آکر کچھ دیر کے لئے ان کے ذہن سے نکل جاتا ہے۔ وہ اپنا اچھا خاصا وقت باورچی خانہ میں بھی صرف کرتی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ دوسرے کاموں میں بھی لگی رہتی ہیں جیسے لکھنا پڑھنا، خطوط کے جواب دینا، یا کسی آئے گئے سے بات چیت کرنا، اور کوئی نہ کوئی کھانا بھی پکتا رہتا ہے یا کسی کھانے میں جدت ہوتی رہتی ہے ورنہ کسی غیر ضروری اور بچے ہوئے کھانے کی شکل اور ذائقہ تبدیل کرتی رہتی ہیں۔ مثلاً رات کا بچا ہوا قورمہ صبح کے کھانے پر بہترین پلاؤ کی صورت میں ملے گا۔ یا دن کی بچی ہوئی دال رات کو کریلوں میں تبدیل ہو جائے گی۔ سالن کے بچے ہوئے آلو یا اروی شام کی چاء پر پکوڑوں اور چاٹ کا کام دیں گے۔ اور روٹیاں کبابوں کی شکل اختیار کریں گی۔ صبح کے دودھ پر سے اتری ہوئی بالائی اگر کسی نے نہیں کھائی ہے تو دوپہر کے کھانے پر پراٹھوں میں نظر آجائے گی۔ کوئی کسی قدر بھی کوشش کرے مگر ان کھانوں کی اصلیت ہرگز نہیں پہچان سکے گا۔ ان کے یہ سب کام ایک ہی وقت میں چلتے رہتے ہیں۔

ایک مرتبہ محرم کے مہینہ میں شاید دس تاریخ کو دوپہر کے کھانے سے گھنٹہ دو گھنٹہ قبل نیاز کے سلسلہ میں کہیں سے کوئی چیز آئی اس کو دیکھ کر ہم میں سے کسی کی زبان سے نکلا "کاش یہ کھچڑا ہوتا" اور اس کو صرف کھیر پا کر ہم لوگ اچھے خاصے مایوس ہو گئے۔ مگر جس وقت سب کھانا کھانے بیٹھے تو دیکھا کہ دو ڈونگے بھرے بہترین قسم کے خوشبودار کھچڑے کے میز پر موجود ہیں۔ ہم سب نے حیرت سے امی کی طرف دیکھا، انہوں نے مسکرا کر صرف اس قدر کہا "تم سب کا کھچڑا کھانے کو جی چاہ رہا تھا، مجھ سے جس طرح بھی ہو سکا کھچڑا تمہارے واسطے تیار کر دیا۔ کیونکہ میں جانتی ہوں تم لوگوں سے خود کوئی کام نہیں ہو سکتا بس زبانی جی چاہ کر رہ جاتا ہے۔"

چنانچہ خوب جی بھر کر وہ مزیدار کھچڑا کھایا گیا اور ایک حضرت کے تو پیٹ میں قدرے [illegible] کی نوبت آگئی مگر انہوں نے کھچڑے سے ہاتھ نہیں روکا۔ مگر ہم میں سے کسی کو آج تک یہ پتہ نہیں چلا کہ اس دن وہ لذیذ کھچڑا جس کے تیار ہونے میں سُنا ہے ایک مدت درکار ہوتی ہے کون سے

بچے ہوئے اور بے مصرف گھنٹے گی دروح تھا۔

ان سب کاموں اور باتوں کے باوجود ان کا دماغ کسی اور ہی فکر میں رہتا ہے اس کی کسی کو خبر نہیں ہوتی ممکن ہے کسی ناول یا افسانے کا پلاٹ اندر ہی گھومتا ہو یہ وہ کسی کو نہیں بتاتیں۔ اُن میں قوتِ برداشت کافی سے زیادہ ہے وہ اکثر لوگوں کی کمزوری کسیلی بات بھی پی کر خاموش ہو جاتی ہیں، بلکہ شربت کے گھونٹ کی طرح پی جاتی ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ زندگی میں کسی سے مخالفت اور دشمنی نہیں پیدا کرنی چاہئے بلکہ ایسی بات ہی نہیں کرنی چاہئے جس سے شر و فساد کی بو آئے اور اگر اس کوشش کے باوجود مجبوراً کسی سے بدمزگی ہو جائے تو تمام عمر کے لئے اس سے تعلقات ختم کر لینے چاہئیں۔ اُن کی اِسی بات سے ایک قسم کی غیرت و خودداری پائی جاتی ہے۔ اگرچہ وہ خود اسے اپنی ایک بڑی کمزوری کہتی ہیں۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ خاندان کے تمام افراد ان کا بے حد احترام کرتے ہیں۔ کبھی کسی کے منہ سے اُن کے بارے میں شکایت کے الفاظ نہیں سُنے گئے بلکہ اکثر لوگ ان کی حد سے بڑھی ہوئی تعریف کرنا اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔ عام طور سے وہ خاموش کم گو ہیں وہ کبھی کسی سے فضول بات منہ سے نہیں نکالتیں۔ کسی محفل یا جلسہ وغیرہ میں انجان لوگوں کے سامنے وہ گھنٹوں خاموش بیٹھی رہتی ہیں۔

بعض وقت ان کی خاموشی کچھ ناجائز سی معلوم ہوتی ہے بلکہ وہ کچھ کھچی ہوئی اور بیزار سی نظر آتی ہیں جس کو سب ہی محسوس کرتے ہیں، وہ اپنی اس عادت سے کبھی کبھی اچھا خاصا نقصان اٹھا لیتی ہیں کیونکہ وہ مزید تاب بھی نہیں رہتیں مگر وہ مجبور ہیں، اپنی فطرت کو کس طرح بدل سکتی ہیں۔ انہیں خود اس بات کا احساس ہے اس کو بھی اپنی بڑی کمزوری سمجھتی ہیں۔

دیکھنے والے پہلی نظر میں انہیں کچھ مغرور اور متکبر ضرور سمجھتے ہوں گے مگر جتنا زیادہ وقت وہ اُن کے ساتھ گزارتے ہوں گے ان کی رائے قطعی طور پر بدل جاتی ہوگی کیونکہ طبعاً وہ منکسر المزاج ہیں۔

اکثر لوگ ان سے ملنے یا آٹو گراف وغیرہ کی قسم کی چیزوں کے لئے ان کے پاس آتے رہتے ہیں جن میں زیادہ تر طلباء کے ریڈیو کا حصہ ہوتا ہے۔ ایسے موقعوں پر گھر والوں کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ کچھ تکلف کرکے آنے والوں سے ملیں مگر ان کا جواب ہوتا ہے "نہیں میں جس حالت میں ہوں اسی طرح سب سے ملوں گی میرا یہی دستور ہے میں لوگوں پر بناوٹی رعب جمانا نہیں چاہتی"۔ اور وہ اسی حالت میں سب سے ملتی ہیں چاہے اس وقت وہ باورچی خانہ میں بیٹھی پسینہ میں شرابور ہی کیوں نہ بیٹھی ہوں یا ہاتھ میں کھرپی لئے کسی کیاری وغیرہ میں پانی لگا رہی ہوں، گھر والے ان کی اس عادت سے چڑ کر رہ جاتے ہیں مگر ان کو ایسی باتوں کی کوئی پروا نہیں ہوتی، وہ اپنے لئے کسی قسم کا اہتمام نہیں کرتیں بہت ہی سادہ قسم کا لباس پہنتی ہیں مگر دوسروں کے لئے بناؤ سنگار اور تکلفات کو ایک قسم کا ہنر اور سلیقہ خیال کرتی ہیں۔

وہ وقت اور موقعہ پر ہر قسم کی عادت ڈال لیتی ہیں اور زمانہ کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے کی کوشش کرتی ہیں مگر حد سے تجاوز نہیں کرتیں۔ بلکہ وقت کی بہتر اور آسان روش اختیار کرتی ہیں اسی وجہ سے انہوں نے اپنے کوئی سخت اصول نہیں بنائے جو بدلے نہ جا سکتے ہوں وہ کہتی ہیں کہ بعض سخت اصول بعض وقت انسان کو بڑی ذہنی اُلجھن میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

اُن کے پاس آنے والے لڑکے لڑکیاں انہیں جدید قسم کی لٹریچر والی سمجھ کر خاص تیاری کرکے ملنے آتے ہیں اور اُن کی سادگی اور گھریلو پن دیکھ کر حیرت میں رہ جاتے ہیں، مگر جیسے جیسے وہ اُن سے بات کرتے ہیں، اُن کی شخصیت سب پر چھانے لگتی ہے اور اُن سے مل کر کوئی مایوس نہیں ہوتا بلکہ ورگ گرویدہ ہو جاتے ہیں، وہ عمر اور شخصیت کو ملحوظ رکھ کر سب سے بات کرتی ہیں لڑکے لڑکیاں اُن کی صحبت میں اپنائیت پاتے ہیں اور بڑی عمر والے انہیں خود سے زیادہ تجربہ کار اور ہوش مند سمجھتے ہیں۔ اُن کی گفتگو سطح سے اُبھری ہوئی، مکمل اور صاف ہوتی ہے۔

وہ اپنے آپ کو کسی سے بے حد بے تکلف نہیں ہونے دیتیں، ان کا خیال ہے کہ حد سے بڑھی ہوئی بے تکلفی اکثر بدمزگی کا پیش خیمہ ہوتی ہے وہ کسی کی بات میں قطعی مداخلت نہیں کرتیں اگر اُن کے سامنے دو شخص آپس میں لڑتے ہوں تو انہیں بالکل اعتراض نہیں ہوگا۔ ان کا

شوخی جھلکتی ہے وہ چھوٹی کرتی ہیں مگر شرافت کے ساتھ، ان کا ہر افسانہ ہی بڑی سادگی سے ملتا ہے اور کہانی کچھ اس طرح کہ وہ چپ چاپ کرتی کام کرنا مشکل ہے۔ وہ ایک ہی نظر میں سب کچھ تاڑ جاتی ہیں۔ وہ مختلف ممالک کی کسی زمانہ کی باتوں کی ہنسی مشغلہ ابھی تک انہیں اچھی لگتی ہیں اور واقعات تو ایسے یاد رہتے ہیں جیسے معلوم ہو کچھ صحت خراب ہو جانے کی وجہ سے وہ اب بعض وقت زیادہ پریشان ہو جاتی ہیں اور اسی وجہ سے وہ مجمع عام میں جانے سے پرہیز کرتی رہتی ہیں اور ابھی ابھی ادبی محفلوں سے گریز کرتی ہیں۔ ہمارا ریڈیو کے پروگرام ہوتے انہیں اکثر پیش ہوتے رہتے ہیں مسترد کر دیتی ہیں۔ قوت تقریر بہت کم ہے وہ اپنے آپ کو برسر عام پیش نہیں کر سکتیں۔ وہ بجائے مجبوری کسی بڑے جلسہ یا پارٹی وغیرہ میں شرکت کر لیتی ہیں۔ ان کی طبیعت میں نوک جھوک، اور جھجک کافی سے زیادہ ہے وہ بھی بے ضرورت افسانوں سے الگ کام یا بات چیت نہیں کر سکتیں۔ ماحول بیچارگی کی عادی ہیں۔

یہ تو تھیں اُن کی عادتیں اور خصلتیں مگر اب آئیے ہم اُن کے چند خاندانی حالات بھی لکھنے ضروری ہیں تاکہ تاریخی طور پر ان کو بھی پڑھتے ان کا نام امۃ الرحمٰن ہے وہ سنہ ۱۹۱۸ء میں دہلی کے محلہ کوچہ چیلان میں خواجہ میر درد کی بارہ دری کے قریب اپنے دادا صاحب کے مکان میں پیدا ہوئیں۔ ان کے دادا مولوی محمد یوسف صاحب، شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کے نواسے شاہ اسحٰق صاحب کی اولاد میں تھے۔ اور ان کی دادی صاحبہ خواجہ میر درد صاحب کی اولاد میں تھیں۔ امی صاحبہ کی عمر مشکل سے سات سال ہوگی کہ ان کے والد مولوی محمد سلیمان صاحب کا انتقال ہو گیا اور جب وہ چودہ سال کی ہوئیں تو والدہ کی شفقت سے بھی محروم ہو گئیں۔ ان کی ابتدائی تعلیم اور پرورش ریاست بھوپال میں ہوئی کیونکہ ان کے دادا صاحب بھوپال میں مجلس علماء کے رکن اور مددگار رہے تھے۔ پندرہ سال کی عمر میں وہ اپنی دادی صاحبہ کے ساتھ مکہ معظمہ چلی گئیں اور تین سال تک وہاں رہیں۔

اُنیس کی عمر میں اُن کی شادی اپنے ماموں خان بہادر ڈپٹی سید بہاء الدین کے لڑکے سید ظہیر الدین سے ہو گئی۔

یہ ہیں اُن کے مختصر سے خاندانی حالات۔ شادی کے بعد وہ زیادہ تر دہلی سے باہر رہیں۔ کیونکہ ہمارے پاپا یو پی میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ امی کو بچپن ہی سے تعلیم حاصل کرنے کا بے حد شوق تھا۔ مگر خاندانی روایت کے مطابق اس زمانہ میں لڑکیوں کو اسکولوں کی تعلیم دلانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے انہوں نے جس قدر بھی سیکھا اور لکھا پڑھا سب اپنے شوق اور محنت کا نتیجہ ہے۔ ان کے مضامین وقتاً فوقتاً رسالہ عصمت میں شائع ہوتے رہے۔ جن میں "... کا پرچم" اور "شیخی کی شورش" خاص طور پر مقبول ہوئے۔ ان کا پہلا ناول "شمع" سنہ ۱۹۳۹ء ہی میں مکمل ہو گیا تھا مگر دوسری جنگ عظیم کا آغاز تھا اور اسی جنگ کے ساتھ ساتھ اُن کی زندگی میں بھی کشمکش اور انقلاب پیدا ہونے لگا۔ سنہ ۱۹۴۱ء میں ہمارے پاپا جو آئی ایم ایس میں کیپٹن بھی تھے لڑائی کے سلسلے میں ملایا بھیج دیئے گئے۔ امی اور ہم پانچوں بھائی بہن دہلی میں اپنے دادا خان بہادر سید بہاء الدین صاحب کے پاس رہے اور ایک سال تک کوئی خاص واقعہ نہیں ہوا اور پھر امی نے اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے علی گڑھ میں کوٹھی بنا کر وہاں کی سکونت اختیار کر لی۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں سنگاپور انگریزوں کے قبضہ سے نکل کر جاپانیوں کے ہاتھ میں چلا گیا یعنی انگریزی فوجوں نے شکست کھائی۔ تقریباً تین سال تک ہم لوگ اپنے پاپا کی طرف سے ایک امید و بیم کی حالت میں وقت گزارتے رہے۔ اس عرصہ میں "شمع" اور اس کے بعد "تصویر" شائع ہو چکی تھیں۔ تین سال بعد انگریزی حکومت نے پاپا کے لڑائی میں کام آنے کا اعلان کر دیا۔ اور اُمید کی ہلکی سی آخری کرن بھی ہمیشہ کے لئے ڈوب گئی۔

اب امی کی زندگی میں ہر طرف انقلاب اور مشکلات کا طوفان تھا۔ جو ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے لئے بھی ایک انقلاب کا پیش خیمہ بن گیا یعنی اسی زمانہ میں پاکستان وجود میں آ گیا۔ وہ بھی اپنے دوسرے مسلمان بھائی بہنوں کی طرح وطن چھوڑنے پر مجبور ہو گئیں اور لاہور میں

سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ پہلے بھی انہیں جن مشکلات اور پریشانیوں اور جدوجہد کا سامنا کرنا پڑا ہے وہ [illegible] کر کے کیا ہو گا اور انہیں اب تک کسی قسم کا ذہنی سکون میسر نہیں ہوا ہے انہی مشکلات اور الجھنوں کی وجہ سے اب [illegible] ہو گئی جس کا ان کے اعصاب پر بہت خراب اثر پڑا ہے۔ اگرچہ وہ اپنی تکالیف کو چھپانے کی بہت کوشش کرتی ہیں۔ [illegible] نہیں کیا جا سکتا کہ باوجود ہر قسم کے تفکرات اور پریشانیوں کے جو انہیں گھیرے رہتی ہیں انہوں نے کبھی اس کا عکس دوسروں پر نہیں پڑنے دیا۔ بلکہ اپنی اولاد تک کو اس کے اثرات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتی ہیں اور خود ہر مشکل بہت ہنس کھیل کر جھیل لیتی ہیں۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ ان جیسی بلند حوصلہ، باہمت اور وسیع النظر خاتون مشکل سے ملے گی۔

اس پہچاننے سے خاکہ میں اگرچہ ابھی بہت کچھ تشنگی باقی ہے پھر بھی اے۔آر۔ خاتون کی دھندلی سی جھلک مل سکے گی۔ مگر اس کو پڑھ کر یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ لکھنے [illegible] کی طرف جھکے ہیں۔

---

(۳)

زشرر ستارہ جویم، ز ستارہ آفتابے

اقبال

ڈاکٹر سید اعجاز حسین

(سید احتشام حسین)

اکبر الٰہ آبادی اپنے عہد کے الٰہ آباد میں اپنے اور امرودوں کے سوا بہبود کے دوسرے سامان بالکل غائب پاتے تھے۔ مجھے معلوم نہیں اکبر سے پہلے الٰہ آباد میں کسے ایسی شہرت اور اہمیت حاصل تھی جسے وہاں کے امرودوں کے ساتھ یاد کیا جاتا رہا ہو اور یہ بات بھی تحقیق طلب ہے کہ الٰہ آباد کے امرودوں کو کسی زمانے میں وہ انفرادیت نصیب ہوئی جب ان کا ذکر دوسری جگہ کے امرودوں سے الگ کیا جانے لگا لیکن اپنے عہد کے الٰہ آباد کے متعلق یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہاں کے جن لوگوں کو جانے بغیر الٰہ آباد کی معرفت دھندلی رہ جاتی ہے ان میں ایک ذات پروفیسر ڈاکٹر سید اعجاز حسین ایم اے ڈی لٹ، صدر شعبۂ اردو الٰہ آباد یونیورسٹی کی بھی ہے۔ امرود اب بھی اپنی جگہ پر ہیں لیکن اس کے ایک دوسرے کے لیے جگہ خالی کرتے رہے ہیں۔ اعجاز صاحب اس سارے مضمون میں انہیں کے نام سے یاد کیا جائے گا۔ شاید وہ اس کے ساتھ بڑی اہمیت کے قائل نہ ہوں لیکن وہاں کے امرودوں کی برائی نہیں سن سکتے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ پہلے اکبر کی بڑی تشہیر کرتے تھے اس الٰہ آبادیت کے سبب کی وجہ سے یہی کہا نہیں جاسکتا تو وہ کہتے ہیں اعجاز صاحب کا اور ان کی انفرادیت کے پیش نظر میں انہیں اکبر یا امرود کے ساتھ گڈمڈ نہیں کرنا چاہتا اگرچہ ان کا تعلق دونوں سے ہے اکبر پر انہوں نے ہندی میں ایک کتاب لکھی ہے اور امرودوں کی تعریف میں رطب اللسان رہتے ہیں، اکبر کو پڑھتے اور پڑھاتے ہیں، امرود کھاتے اور کھلاتے ہیں۔

اعجاز صاحب کو میں نے پہلی مرتبہ ۱۹۳۲ء میں دیکھا اور پہلی ہی ملاقات میں مجھے ان کی ان خصوصیات کا اندازہ ہوگیا جنہیں میں اب بھی ان کی ذات اور شخصیت کا جزو سمجھتا ہوں۔ یہ خصوصیات شعر و ادب سے متعلق نہیں، انسان کی روزمرہ کی اخلاقی، سماجی اور عملی زندگی سے وابستہ ہیں یہاں اپنے متعلق کچھ کہنا ناگزیر ہوگا اور اس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔

اعظم گڑھ سے ۱۹۳۰ء میں ہائی اسکول کرنے کے بعد میں نے مزید تعلیم کے لیے الٰہ آباد کا رُخ کیا، وہاں کچھ آسانیاں تھیں اور میری محدود زندگی کے لیے اس اہم علمی اور سیاسی مرکز میں ایک کشش، چنانچہ وہاں دو برس گورنمنٹ انٹر کالج میں پڑھتا رہا۔ اس دوران میں اعجاز صاحب کا نام تو میں نے کبھی کبھی سنا لیکن ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ چوک میں کتابوں کی ایک چھوٹی سی دوکان تھی۔ آتے جاتے میں اس پر بھی ٹھہر جاتا تھا۔ کتابیں خریدنا تو مشکل سے ہوسکتا تھا لیکن نگاہوں کی ضیافت ہو جاتی تھی۔ ایک دن ایک نئی کتاب نے اپنی طرف متوجہ کیا۔ دیکھا تو ایک تازہ تصنیف

تھی، "اہمیتِ معرفت" مصنف کا نام سید اعجاز حسین۔ وہاں پر وہ بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے ... کتاب کی تعریف میں کچھ اور مصنف کے بارے میں اپنی معلومات کا اظہار کیا۔ میں نے ان کی آنکھیں بچا کر ... جب ... کتاب ... بھی نہ تھے، چلا آیا اور اس کتاب کے پڑھنے کے لئے بہتر وقت کا انتظار کرنے لگا۔

انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرنے کے بعد یونیورسٹی میں داخلہ کا سوال تھا۔ وہ سہارا ختم ہو چکا تھا جس کے بھروسے پر الٰہ آباد میں تعلیم کا سلسلہ کروں یا پڑھوں۔ اسی کشمکش میں تھا کہ میرے دو بھائی اور دوست سید محمد شفیع مرحوم اور سبط حسن آگئے اور انہوں نے مشورہ کیا کہ چلو تمہارا کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔ یہ وہی سبط حسن ہیں جو پاکستان کی جیلوں میں کئی سال کی قید و بند جھیل کے اب لاہور میں ایک زندگی گزار رہے ہیں۔ شفیع بھائی مرحوم نے اسی سال بی اے پاس کیا تھا، سبط حسن بی اے میں پڑھ رہے تھے۔ جب یہ لوگ الٰہ آباد جانے لگے تو میں بھی ساتھ ہو لیا۔ یونیورسٹی پہنچ کر نام لکھا لیا۔ بورڈنگ ہاؤس کے اخراجات میرے امکان میں نہ تھے۔ چاہتا تھا کہ دوسرے طلباء کے ساتھ کہیں قیام کروں اور تعلیم کا سلسلہ جاری رکھوں۔ شام کے وقت شفیع بھائی مرحوم مجھے ساتھ لے کر نکلے اور اپنے بعض جاننے والوں سے ... کہ میرے قیام کی کوئی صورت نکل سکے۔ جب کئی دوستوں سے مل ملا کر واپس آنے لگے تو شفیع بھائی مرحوم نے کہا چلو تمہیں اعجاز صاحب سے ملا دیں، بہت اچھے آدمی ہیں۔ اعجاز صاحب ان دنوں محلہ دارا گنج میں گنگا کے کنارے اپنے ننہالی مکان میں رہتے تھے۔ اندر مکان تھا لیکن باہر ایک کمرہ تھا جس میں کچھ زیادہ سامان نہ تھا، ایک میز اور چند کرسیاں بے ترتیبی سے پڑی ہوئی تھیں، لکھنے پڑھنے کا سامان، کتابیں، سامنے صحن تھا جہاں سے دریائے گنگا اور اس کے گرد و پیش کا سہانا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ اطلاع کراتے ہی اعجاز صاحب تشریف لائے، اخلاق اور گرمجوشی سے ملے، ایسا اخلاق جو تصنع سے سراسر منزہ ہوتا ہے، صاف شفاف شیشے کی طرح جس کے پار جا سکتا ہے۔ کمرے کے بجائے ہم لوگ صحن ہی میں بیٹھے۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ اس دن کیا کیا باتیں ہوئیں لیکن یہ یاد ہے کہ جب میرے قیام کے لئے کسی جگہ کی تلاش کا سوال آیا تو کہا کہ جب تک کہیں انتظام نہیں ہو جاتا یہیں رہیں، یہ کمرہ خالی ہی تو رہتا ہے۔ کچھ تکلفات اور عذر کے بعد یہی بات طے ہو گئی، اعجاز صاحب کا اصرار دوسرے خیالات اور تاملات پر غالب آیا۔ میں چند دنوں میں وہیں اٹھ آیا اور چند دن قیام کم و بیش چھ سال کے قیام میں تبدیل ہو گیا۔

انہی دنوں ایک اور لطیفہ پیش آیا۔ گرمیوں کی تعطیل کے زمانے میں جب وطن میں قیام تھا اور کچھ عزیز اور دوست اکٹھا تھے کسی بات پر یہ طے پا گیا کہ چند مہینے تک بال نہ ترشوائے جائیں۔ بالوں پر تقریباً دو مہینے گزر چکے تھے جب میں اعجاز صاحب کے یہاں گیا۔ یہ کوئی بات نہ تھی جو چھپی رہتی۔ چند دن تو اعجاز صاحب نے میرے بالوں کی بے ترتیب بڑھوتری کو غور سے دیکھا اور سوچا کہ شاید کوئی زبردست ادبی شغف یا سر اشتراکی ہے لیکن جب ان باتوں کی کوئی خاص علامت مجھ میں نظر نہ آئی تو انہوں نے بڑی نرمی اور آہستگی سے کہا، "احتشام آپ بال کیوں نہیں کٹواتے؟" میں جانتا تھا کہ کسی نہ کسی دن یہ سوال ضرور اٹھے گا، میں نے کہا فرصت نہیں ملی۔ ... اور بھی گزر گیا۔ اب کچھ ایسا تھا کہ اعجاز صاحب سے دیر دیر تک باتیں ہوتی تھیں۔ گھر، خاندان، تعلیم، ادبی دلچسپی اور تفریحی مشاغل ... آتا تھا تو انہوں نے ایک دن کسی قدر سختی سے کہا، "آخر بات کیا ہے کہ آپ بال نہیں ترشواتے، کیا پیسے نہیں ہیں؟" میں نے سوچا اب بیٹھ کر کسی شرط کی پابندی اس طرح کرنا کہ دیکھنے والوں کو ناگوار گزرے، حماقت ہے۔ میں نے کہا، کل ضرور بنوا لوں گا۔ اتفاقاً دوسرے دن دوستوں کے دستخط سے خط آ گیا کہ بال کٹوا ڈالو کیونکہ ایک صاحب کو ٹائیفائڈ ہو گیا اور ڈاکٹر نے "رسم مو تراشی" ادا کرا دی، اب کسی ... نہیں۔ میں نے اعجاز صاحب کو وہ خط دکھایا اور بال ترشوانے چلا گیا۔ انہوں نے اس عجیب و غریب عہد و پیمان سے جو لطف لیا وہ مجھے اب تک یاد ہے۔

[illegible] سے
[illegible]
کی [illegible] خصوصیت ہے جو ان کے دوستوں اور شاگردوں کو [illegible] جاتی ہے۔ اعجاز صاحب اپنی محبت لطف
مسلسل توجہ سے ہر شخص کی اپنی زندگی میں داخل ہو جاتے ہیں اور بہت جلد تکلف، محض رسمی [illegible] ہو جاتی ہیں [illegible] حقیقت
میں [illegible] ہو جاتی ہیں۔ ان کے بہت سے دوستوں اور شاگردوں نے [illegible] کا تماشا دیکھا ہے۔

بی اے میں میں نے جو مضامین لئے ان میں اردو ادب بھی تھا۔ مجھے اردو سے دلچسپی تھی کیونکہ اسی زمانے سے [illegible] شعر بھی کہہ لیا تھا جو [illegible] یہ بھی دیا تھا۔ لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ [illegible] یونیورسٹی کے باہر میں نے اعجاز صاحب کو اردو زبان و ادب ہی کے عشق میں سرشار پایا۔ مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ اردو [illegible] مضمون کی حیثیت سے پڑھنا اور بات ہے اور اس کے عشق میں مبتلا ہو جانا اور بات ہے۔ اعجاز صاحب نے کبھی ان الفاظ میں مجھے اس کی تلقین نہیں کی۔ مجھے خاص طور سے اردو [illegible] کی طرف متوجہ نہیں کیا لیکن وہ جس طرح اپنی زبان سے دلچسپی لیتے تھے، اٹھتے بیٹھتے اس کا ذکر کرتے تھے، شعر سے لطف لیتے تھے وہ خود ایک محبت کی سی کیفیت تھی۔ ان سے ہر کام اردو [illegible] مجھے ادب کے متعلق کچھ نئے تجربے ہونے لگے۔

ان دنوں اعجاز صاحب مختصر تاریخ ادب اردو لکھ رہے تھے۔ یہ کتاب اس طرح لکھی جا رہی تھی کہ چند صفحے لکھ کر کاتب کو دے دیے جاتے تھے کتابت کی تصحیح ہو کر کاپیاں پریس کو بھیج دی جاتی تھیں۔ پروف پڑھے جاتے تھے اور کتاب چھپتی جاتی تھی۔ میں اکثر دیکھتا تھا کہ اعجاز صاحب نے بعض ایم اے کے طلباء ان کے پاس آ جاتے ہیں۔ کتاب کے بعض مباحث پر بحث ہوتی ہے۔ یہ سلسلے پڑھے جاتے ہیں۔ [illegible] ہیں۔ ہنسی مذاق کی باتیں ہوتی ہیں لیکن نام نہیں، کہ ان شاگردوں میں ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی، رفعت عظیم، غالب [illegible]، جلیل قدوائی ہوتے اور میں دخل در معقولات کا مرتکب ہوتے بغیر ان دلچسپیوں میں شریک ہوتا۔ دو چار ہفتے بھی گذرے ہوں گے کہ کاپیاں اور پروف میرے قبضے ہو گئے۔ چھوٹے موٹے مشوروں میں بھی شریک کیا جانے لگا اور کبھی لائبریری سے بعض کتابوں کے حوالے تلاش کرنے کا کام بھی میرے سپرد کر دیا گیا۔ مجھ سے کم تر ادبی ذوق رکھنے والا اور مطالعہ کرنے والا بھی ہوتا تو ان باتوں سے فائدہ اٹھاتا۔ میں نے جو کچھ ان سے سیکھا۔ اعجاز صاحب کا یہ عمل آج تک جاری ہے۔ وہ کتاب چھپا کر نہیں لکھتے۔ اس کا ڈھنڈورا بھی نہیں پیٹتے۔ بہت زیادہ اہتمام نہیں کرتے خاکہ بنانے سے لے کر آخر منزل تک۔ دوستوں اور شاگردوں سے اس کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ مشورہ سے گریز نہیں کرتے۔ آسانی سے اپنی رائے نہیں بدلتے لیکن اپنی بات پر اڑتے بھی نہیں۔ جب وہ مشورہ کرتے ہیں تو ایسا نہیں معلوم ہوتا کہ واقعی وہ کوئی کتاب یا مضمون لکھنے والے ہیں بلکہ یہی خیال ہوتا ہے کہ شاید کوئی خیال آگیا ہے اور اس پر گفتگو کر رہے ہیں لیکن سارا مواد ان کے ذہن میں محفوظ ہوتا رہتا ہے۔ اب کتابیں اور مضمون لکھنے کا ذکر آگیا تو اس بات کو مکمل ہی کر دوں۔

اعجاز صاحب جو کچھ لکھتے ہیں اس کا خاکہ زیادہ تر صبح کی سیر میں مرتب ہوتا ہے اور کئی دن تک ذہن ہی میں اس کی ترتیب ہوتی رہتی ہے۔ اس کا زیادہ حصہ سورج نکلنے سے پہلے ہی لکھا بھی جاتا ہے۔ دن کی شورش میں وہ عموماً سنجیدہ اور غور و فکر سے لکھے جانے والے مضامین کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ رات کے وقت بھی شاذ و نادر ہی لکھنے کا کام کرتے ہیں۔ چونکہ اپنے موضوع کے متعلق برابر سوچتے رہتے ہیں اس لئے جب لکھنے بیٹھتے ہیں تو تیز لکھتے ہیں اور عام طور سے زیادہ کاٹ چھانٹ نہیں کرتے۔ مضامین کو دہراتے بھی کم ہیں اور میرا خیال ہے کہ اس کی وجہ سے انہیں نقصان بھی پہنچتا ہے۔ اس بات کا تعلق کسی حد تک اعجاز صاحب کے مزاج سے بھی ہے جس میں ایک

خوش نشست رہی ہے ساتھ ساتھ کلام کو خاتمہ تک پہنچانے کی دھن کا امتزاج ایک خاص انداز سے جو اعجاز صاحب [illegible]
تقریر اور زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

جہاں تک تصنیف کا تعلق ہے اعجاز صاحب نے اس خاموشی سے اس کام کو انجام دیا ہے کہ شاید ان کے بہت سے شاگردوں کو بھی خبر نہ ہوگی کہ اس وقت تک ان کی ہندی اُردو ملا کر کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور دو ایک کتابیں زیر تصنیف ہیں جن میں سے ایک جلد ہی طباعت کی منزلوں سے گزرنے والی ہے۔ "آئینہ معرفت" "مختصر تاریخ ادب اُردو" (جس کے پانچ ایڈیشن نکل چکے ہیں اور ہر ایڈیشن میں اضافہ ہوتا رہا ہے) "نئے ادبی رجحانات" "نئی ادبیت" "مذہب اور شاعری" "صنف ادب کے شہزادے" "انتخاب آتش" "مبادی ہندی" (الکبیرہ تاریخ ہندی) یہ کتابیں تو کیسے تنقید و مطالعہ کی دعوت دیتی ہیں لیکن مصنف کی شخصیت ان کے سرسری جاننے اور تعارف سے بھی رکھتی ہے تاہم اشاعت ضروری ہے اُردو ادب کے طالب علموں کو اعجاز صاحب سے اس سے زیادہ واقف ہونا چاہئے جتنا وہ اس وقت واقف ہیں۔ یہ تو تھا تصنیف کا ذکر جن میں ادبی مضامین شامل نہیں ہیں جن کی تعداد کافی ہے۔ یہ بات بھی بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ اعجاز صاحب ایک مدت سے شاعری کی دیوی کے قدموں میں بھی اپنے قیمتی نذرانے چڑھاتے رہتے ہیں۔ یہ کام بھی اسی احتیاط سے اور اسی چھپاؤ سے ہوتا ہے کہ شاید ہی کسی کو پتہ چلتا ہو۔ نئی تال اور مسوری کی فضا بھی شاعرانہ ہے اور ساقی ہے اور کئی نظمیں اس فضا کی یادگار ہیں۔ زیادہ تر غزلیں کہتے ہیں لیکن انہیں چھپا کر رکھتے ہیں۔ کبھی کبھی تو صرف دوستوں ہی کو انہیں ان کے اشعار سننے کی سعادت حاصل ہوتی ہے۔ ایک آدھ بار ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی خاص مشاعرے کے لئے کسی دوست یا بزرگ کے اصرار پر کوئی غزل کہی ہے۔ ورنہ یہ وہ شوق ہے جو طبیعت کے تقاضے کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اعجاز صاحب کو شاعری کا یہ ذوق اپنے نانا سید حسین صاحب فوق مرحوم سے ملا جن کا سلسلہ تلمذ آتش سے ملتا تھا۔ اپنی شاعری کے متعلق ایک دفعہ اعجاز صاحب سے میرے ایک استفسار کے جواب میں مجھے لکھا: "غضب روحیہ سے شعر کہنا شروع کیا تھا لیکن نانا مرحوم کلام پر اصلاح دینے کے لئے راضی نہیں ہوتے تھے، کہتے تھے کہ ابھی کہتے رہو ایک اسی طرح کئی سال رہا تب میں ایسا ہے میں چھپ چھپا کر میری ماں کی بڑی بہن یعنی میری خالہ کے اصرار پر کبھی کبھی میری غزلیں دیکھ لیتے تھے۔ اس زمانے میں سید مہدی حسن ناصری مرحوم کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ کالج کے علاوہ ان سے گھر پر بھی ملاقات ان کی صحبت ایک درس گاہ تھی۔ تفریحی گفتگو میں بھی مسائل ادبی، تذکرے، بزرگان ادب کے تذکرے برابر آتے رہتے۔ میں کلاس میں ان سے عربی پڑھتا تھا۔ گھر پر اُردو کی باتیں ہوتیں۔ نانا کی آنکھیں جاتی رہیں تو انہوں نے میرے کلام کی اصلاح کا کام بھی باقاعدہ ناصری صاحب کے سپرد کر دیا چنانچہ میں نے دو سال تک اصلاح سخن میں بھی ناصری مرحوم ہی سے فیض اٹھایا۔"

یہ تو اعجاز صاحب کا بیان ہے میں نے خود انہیں ہمیشہ اپنے نانا مرحوم اور ناصری صاحب مرحوم کا ذکر بڑے ادب اور جذبے کے ساتھ کرتے ہوئے سنا ہے۔ ناصری صاحب کے انتقال پر انہوں نے ایک پُر درد مرثیہ حالی کے مرثیہ غالب کے تتبع میں لکھا تھا۔ یہ سب کچھ ہے لیکن شاعری سے اعجاز صاحب کی دلچسپی عملاً بہت گہری نہیں ہے۔ بہت کم اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جو کچھ کہا ہے اس کا بہت تھوڑا سا حصہ اُن کے پاس محفوظ ہے۔

اعجاز صاحب کی شخصیت اور کردار کا مطالعہ کئی پہلوؤں سے کیا جا سکتا ہے۔ اور اُن کی تصویر کئی آئینوں میں دکھائی جا سکتی ہے جیسے ادب اور زبان کی خدمت اور ایک معلم کی زندگی کے مختلف پہلو ہی وہ کسوٹیاں ہیں جن پر انہیں پرکھا جا سکتا ہے جو شخص انہیں ایک انسان کی حیثیت سے نظر انداز کرے گا۔ اُن کے طرزِ زندگی اور تقاضے ذہن کا نفسیاتی مطالعہ نہیں کرے گا وہ انہیں سمجھ نہیں سکے گا۔ اس کے لئے مختصراً اُن کے حالاتِ زندگی سے واقفیت بھی ضروری ہے۔

اعجاز صاحب اگست ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے۔ ننہال محلہ ماہ پور شہر الہ آباد میں تھا اس کو اپنا گھر جانا۔ والد بزرگوار نے ماحول سے عزیب اور کم پڑھے

[illegible] تعلیم و تربیت کی طرف [illegible] ہے [illegible]
[illegible] سال کے [illegible] کا انتقال ہو [illegible]
ابتدا میں فارسی عربی پڑھی، پھر انگریزی اسکول میں [illegible] ۔ [illegible]
[illegible] کیا۔ [illegible] سے [illegible] ہوتی [illegible]
مشکلیں آسان کر دیں۔ [illegible] اعجاز صاحب کی
[illegible] اس بات پر [illegible]
[illegible] لیکن جب [illegible]
[illegible] شوق [illegible]
[illegible]
کی خدمت کی جائے لیکن [illegible] انتقال ہو گیا۔ [illegible]
تھے۔ [illegible] مکان میں رہتے تھے [illegible] مکان کا
ذکر کیا ہے وہ اسی کا ایک حصہ تھا۔ [illegible] تھی۔
اس لئے ایک مکان بنانے کا خیال ہوا [illegible] مکان سے کوئی ڈھائی تین سو گز کے فاصلہ پر [illegible] ۱۹۳۲ء
میں مکان [illegible] ۱۹۳۲ء میں نشیمن کی عمارت
پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

اس مکان کا ذکر کئی حیثیتوں سے اعجاز صاحب کی زندگی اور [illegible] اہمیت رکھتا ہے [illegible] یہ بات بڑی خصوصیت کی ہے
کہ وہ نا اُمیدی [illegible] اور بے سروسامانی میں [illegible] کے ساتھ اس کام کو چستی کے
ساتھ شروع کرتے ہیں کہ اس کا ہونا [illegible] ہے۔ میں نے یہ کبھی نہیں دیکھا کہ وہ بہت سی کتابیں، کاغذ، قلم دوات [illegible] کر رکھتے ہوں اور پھر کوئی کتاب
کے لکھنے کا سلسلہ شروع کرتے ہوں۔ کتاب شروع ہو جاتی ہے اور سامان اکٹھا ہوتا رہتا ہے۔ [illegible] نشیمن کے بننے [illegible] تین سال کی ملازمت
اور تقریباً دو سو روپیہ [illegible] تنخواہ میں روپیہ پیسے کا کوئی سوال نہ تھا۔ دوسرے ذرائع بھی محدود تھے۔ مکان بنانے کا کوئی خاص تجربہ نہ تھا۔ لیکن
دیکھتے دیکھتے جنگل کی آبادی بڑھی اور تھوڑے دنوں میں ایک خوبصورت عمارت کھڑی ہو گئی۔ گرچہ وہ بہت سی الجھنیں اپنے ساتھ لائی۔ میرا اندازہ
یہ ہے کہ اعجاز صاحب کے مزاج میں جو اُمید پرستی ہے وہ کبھی [illegible] طرف متوجہ بھی نہیں ہونے دیتی جو پیچیدگی پیدا کر سکتے ہیں مگر کوئی
انہیں ان باتوں کی طرف متوجہ کرے تو وہ ان کی تاویل [illegible] ایسی خوبصورتی سے کرتے ہیں کہ آپ اُن کے خیالات کو [illegible] کے بجائے
اُن کے ہم خیال بن جائیں گے۔ چھ سال کے ساتھ میں مجھے ایسی دشواریاں برابر پیش آئیں، اُس وقت [illegible]
وجہ سے کچھ زیادہ کہنا سننا آسان بھی نہ تھا لیکن اس مشکل کا اندازہ اب بھی ہوتا ہے۔ [illegible] اعجاز صاحب
کے ایک بہت ہی عزیز دوست سید ماجد علی صاحب وکیل ایک دن بڑے سویرے آ گئے اور اعجاز صاحب کو اپنے ساتھ موٹر میں بٹھا کر لے
گئے۔ انہوں نے تقریباً چالیس ہزار روپے قرض لئے تھے۔ مہاجنوں کو ضمانت کی ضرورت تھی، [illegible] نے اعجاز صاحب کی قیمت بڑھا دی تھی۔ اعجاز
صاحب گئے اور ضمانت کے کاغذ پر دستخط کر کے چلے آئے۔ بعد میں لوگوں نے ہمدردانہ کہا کہ یہ بڑی غلطی ہے لیکن اعجاز صاحب اس طرح سوچنے کے
عادی نہیں ہیں اور نہ انہیں کبھی اس کا خیال آیا کہ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ۱۹۳۶ء میں اچانک سید ماجد علی صاحب مرحوم کا انتقال ہو گیا اور سب [illegible]

صاحب ایک بہت بڑی مصیبت کا شکار ہو گئے۔ یہ وہ دن تھے جب اعجاز صاحب سے [illegible]
تکلیفیں اٹھا کر اپنا پسندیدہ مکان بنا رکھا تھا۔ پھر اٹھا کر برسوں میں اس قرض کو ایک بڑا حصہ ادا کیا۔ سارا سامان [illegible]
سے گھیل اپنی گرہ [illegible] اور ضرورتوں کی وجہ سے بوجھ جتنا ہلکا ہوتا تھا اتنا ہی بڑھتا جاتا تھا۔ ان حالات نے ان کی صحت اور [illegible]
پر بہت برا اثر ڈالا ہے۔ وہ اب تک جھیلتے رہے ہیں لیکن وہ نہ زمانے کے شاکی ہیں اور نہ ماضی کے مرثیہ خواں، وہ [illegible]
سے [illegible] ہمدردی سے خوش ہو لیتے ہیں، قسمت سے گلہ مند۔ انہیں مستقبل پر بھروسہ ہے۔ اور ہمیشہ آگے کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔
یہی مستقبل پرستی اُن کے سیاسی تصورات میں بھی جھلکتی ہے۔ وہ عملاً اور عقیدتاً اشتراکی نظام کے حامی ہیں۔ سیاسی کاموں میں حصہ نہیں لیتے لیکن ذہنی اور اخلاقی اعتبار سے ہر اس سیاسی اقدام کو قبول کرتے اور لبیک کہتے ہیں جو ترقی پسندانہ ہو اور جس میں جذباتیت کا بھی اچھا خاصا دخل ہوتا ہے۔

اعجاز صاحب کی نفسی بہت سے قانون اور قاعدوں کی پابندی برداشت نہیں کر سکتی، سرکاری اور غیر سرکاری ہر کام ایک غیر رسمی شکل اختیار کر لیتا ہے یعنی وہ جس کام کو بھی ہاتھ میں لیتے ہیں یا اُن کے ہاتھ میں پہنچ جاتا ہے اُسے اس کے سارے غیر رسمی لوازم کے ساتھ انجام دینے کے بجائے اپنے ڈھنگ سے پورا کر دیتے ہیں اور اسی بات کی توقع دوسروں سے بھی رکھتے ہیں۔ اُن کے شاگرد بڑی خوشی سے اُن کے ہر کام کے لئے تیار رہتے ہیں کیونکہ وہ بھی انہیں حتی الوسع مایوس نہیں کرتے۔ یونیورسٹی میں طلبا کی دشواریاں کیا ہیں؟ داخلہ کے شرائط میں کوئی نقص، فیس کی معافی، وظیفہ کے لئے سفارش، حاضری کی کمی اور امتحان میں شرکت کی اجازت، سعی سفارش، نوکری کی تلاش میں مشورہ اور کوشش وغیرہ اعجاز صاحب ان میں سے ہر کام کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں، اُن کی طبیعت خراب ہو، کسی اور کام کا وقت ہو، کڑی دھوپ اور گرمی ہو، شدید بارش ہو رہی ہو، کڑاکے کے جاڑے ہوں وہ دوسروں کے کام کے لئے نکل کھڑے ہوں گے، اپنی سی کوشش ضرور کریں گے چاہے سو فیصدی کامیابی نہ ہو، اپنے کام کے لئے وہ یہی اُمید دوسروں سے رکھتے ہیں۔ حالانکہ اس کا مقصد اپنی محنت کا معاوضہ نہیں ہوتا۔

ان تمام خصوصیات میں جس خصوصیت کی سب سے زیادہ جلوہ گری ہوتی ہے وہ ان کے مزاج کی سادگی ہے۔ اس کی جھلک ان کی نشست گفتار میں، طرز تحریر میں، لوگوں سے ملنے جلنے میں، طرز معاشرت میں ہر جگہ اپنی جھلک دکھاتی ہے۔ یہ سادگی ہر ایک پر یکساں اپنا پرتو ڈالتی ہے۔ میں نے انہیں "بڑے لوگوں" شاگردوں، وزیروں سے بھی ملتے دیکھا ہے۔ اور راجہ پور کے ناخواندہ یا معمولی لوگوں سے بھی۔ اُن کا بنیادی انداز مشکل ہی سے بدلتا ہے۔ بڑے بڑے لوگوں سے خود اُن کی ضرورتیں وابستہ ہوں یا انہیں کوئی کام اعجاز صاحب سے ہو، چھوٹے چھوٹے لوگ اپنی ضرورت سے ان کا گھر یا نام یا محلہ کا رشتہ ظاہر کر کے اُن کے پاس آئیں، وہ یکساں انہماک سے گفتگو کرتے ہوئے ملیں گے۔ اعجاز صاحب کی گفتگو کا انداز بھی مخصوص ہے۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر آہستہ آہستہ گفتگو کرتے ہیں اور نکتہ سنجی، خوش طبعی اور بے تکلفی کا انداز پیدا کر لیتے ہیں۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ طبیعت پر مزاح غالب ہے لیکن اگر بات چیت کو خوشگوار اور غیر سنجیدہ بنانے کی ضرورت پیش آ جائے تو وہ اس کام کو بڑی خوبی سے انجام دیتے ہیں، یہ موقع نہیں ہے کہ ایسے لطیفے اور چٹکلے پیش کئے جائیں لیکن ایک واقعہ بے اختیار یاد آ گیا۔ الٰہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ ہندی میں ایک استاد ہیں۔ ڈاکٹر رام کمار ورما، ہندی کے بڑے اچھے ادیب، شاعر اور ڈرامہ نگار۔ اعجاز صاحب کے خاص دوستوں میں سے ہیں، دونوں ایک مدت سے آشنا شناس ہیں۔ میں ان کا شاگرد تو نہیں لیکن کبھی کبھی ان کی صحبتوں میں بیٹھنے کا موقع ملتا تھا۔ ایک دن میں اعجاز صاحب کے ساتھ تھا، راستے میں ڈاکٹر رام کمار ورما کی کوٹھی پڑتی تھی، اُن کے یہاں پہنچ گئے۔ ایک صاحب پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ کوئی سرکاری افسر یا رئیس معلوم ہوتے تھے۔ ورما صاحب نے بے تکلف انداز میں اعجاز صاحب کا خیر مقدم کیا اور کہا بھئی کئی دن سے ملاقات نہیں ہوئی کیا کرتے رہتے ہو، اعجاز صاحب نے بڑی سنجیدگی سے کہا، اب تمہیں کیا بتاؤں، وہ جو تمہارے گورنر صاحب بہادر ہیں نا، وہ آ گئے اور مجھے پکڑ کر شکار میں لے گئے، کتنا جھوٹ بولا جائے

[illegible] صاحب [illegible]
[illegible] صاحب کی [illegible]
[illegible] جو صاحب بیٹھے تھے،
انہوں نے [illegible] اعجاز صاحب کے یہاں
آ [illegible] پہنچے [illegible] صاحب سے [illegible] انھیں [illegible]
[illegible] اعجاز صاحب نے ان سے مجھ [illegible] پھر مجھے یاد نہیں کیا کہا — یہ دلچسپ قصے [illegible]
ہیں اور ان کو کبھی [illegible] اور خشک نہیں بننے دیتے۔ ان کا [illegible] جہاں [illegible] اگر کسی کی [illegible]
کے خلاف ہے۔ انھوں نے ایک زمانے میں تصوف کا مطالعہ کیا [illegible] صاحب کے [illegible]
کے مزاج میں ایک خاص قسم کی [illegible] پائی جاتی ہے۔ مذہب [illegible]
انسان کی اخلاقی زندگی [illegible] صلاحیتوں پر [illegible] کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے [illegible]
نکلے [illegible] دلنشین ہو تو وہ صبح کی نماز پڑھ لیتے ہیں۔ تصوف نے ان کے [illegible] خیالات پر گہرا اثر چھوڑا ہے [illegible] کے اچھے
اخلاقی پہلو ان کی زندگی میں نمایاں ہوتے رہتے ہیں۔

جیسا کہا گیا اعجاز صاحب بہت سی پابندیوں سے گھبراتے ہیں اور [illegible] کی زبان میں "[illegible]" کے قائل نہیں ہیں اسی وجہ سے بڑی بڑی کانفرنسوں میں، شادی بیاہ میں، مجالس و محافل میں، جہاں دیر تک بے کار بیٹھنا پڑے اور دوسروں کے ہاتھ میں وقت کی لگام ہو شرکت سے گھبراتے ہیں۔ اگر [illegible] ہونا ہی پڑے تو کبھی وقت سے پہلے نکل جانے [illegible] ہوتے ہیں اور وقت کی لگام خود اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔ صحت کی خرابی کی وجہ سے مسلسل کسی کام میں لگے رہنا ان کے لئے بہت مشکل ہوگیا ہے اس وجہ سے [illegible] سمجھتے ہیں کہ انھیں [illegible] سے دلچسپی نہیں ہے۔ لیکن جنہیں ان سے ملتے رہنے کا اتفاق ہوتا ہے وہ ان کی اکتاہٹ کا سبب آسانی سے معلوم کر لیتے ہیں۔

اعجاز صاحب ایک استاد کی حیثیت سے غیر معمولی جذب و کشش کے مالک ہیں۔ انہیں اپنے شاگردوں پر بھروسہ رہتا ہے اور شاگردوں کو ان پر۔ ان کا بے تکلف، بے ریا اور تصنع سے خالی انداز ان کے طالب علموں کو ان کے قریب لاتا ہے اور یہ قرب محض درس کی ملاقات سے گذر کر عزیزدارانہ شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ان کے شاگردوں کے ذہن میں ان کی ادبی اور انسانی حیثیت اس طرح گڈمڈ ہو جاتی ہے کہ وہ انھیں جدا نہیں کر سکتا۔ ان کی ایک کمزوری کا تکملہ دوسری خوبی سے ہوتا ہے۔ نتیجہ میں ان کی شفیق اور ہمدرد شخصیت ذہن پر چھا جاتی ہے۔ انسانی ہمدردی کا ایک بڑا حصہ ان کو ودیعت ہوا ہے، وہی غلطیوں کا ارتکاب بھی کراتا ہے، کمزوریوں کے روپ میں بھی ظاہر ہوتا ہے لیکن ان سے قریب رہنے والوں کو معلوم ہے کہ اس کے پیچھے کوئی اخلاقی نقص نہیں ہے۔ میں پھر عرض کروں گا کہ کوئی شخص الہ آباد جائے اور اعجاز صاحب سے نہ ملے تو اس کی بدذوقی اور لاعلمی پر مجھے افسوس ہوگا۔

احتشام صاحب

ڈاکٹر محمد حسن

کہا جاتا ہے حسن کی ازلی چٹان مجسمے کی شکل تیار کرنے سے پہلے ہی بنا موجود ہے۔ وہ پتھر میں ایک صرف سنگ تراش کے پیچھے انگڑائی لیتی ہے اور تصور کی دنیا میں بستی ہے۔ جمادات کے خاموش وجود میں بھی کسی محبوب کی طرح ناز سے انگڑائیاں لیتی ہے۔ یہ چھپی ہوئی انگڑائیاں نہ جانے حسن کے کتنے ان گنت روپ سنگ کی شکل میں نکھرتی رہتی ہیں۔ دروں کا تخلیقی عمل اسی حسن کا تصور ہے، یہ مائیکل اینجلو کا "مرمر" ہے اور یہ غالب کی غزل کا شعر ہے جس کی لذت کسی سرمستی نغمے کی طرح پاکیزہ اور مدہوش کن ہے۔ احتشام صاحب کی شخصیت بھی شاید اسی قسم کے حسین مجسمہ کا نقاب ہے۔

احتشام صاحب کی شخصیت کے بارے میں کیا کہے — اس شخصیت کے نہ جانے کتنے پرت اور پہلو ہیں۔ اگر کسی ملاقات کرنے والے نے دیکھا تو ان ایک مشہور، منکسر، متانت ہے، ایک متانت اور آہنگ ہے جیسے کوئی بہت نرمی کو برتتا ہے، وہ مماثلت رکھتی ہوئی مسکراہٹ ہیں، دیکھیے چاہے تو ان کی باتوں کی شیرینی اور شخصیت میں رچے ہوئے خلوص سے پہچان لے لیکن پچھلے بارہ سال کے عرصے میں جب میں ان سے واقف ہوا، مجھے بار بار ان کی صحبت میں اس بات کا احساس ہوا کہ افلاطون حقیقت کی طرح احتشام صاحب کی شخصیت دراصل کسی حقیقی شخصیت کا محض ایک روپ ہے وہ الفاظ، جو میرے کانوں میں آ رہے ہیں وہ شائستہ طرزِ عمل، وہ مزاج اور باقاعدہ زندگی —— دراصل کسی عظیم تر حقیقت کا عکس ہے۔

وہ عظیم تر حقیقت، وہ اصلی احتشام حسین کہاں ہے؟ میں سوچتا ہوں کہ ان معنوں میں شاید اس حقیقت کا وجود ہی نہیں ہے، ان معنوں میں احتشام صاحب کا وجود ہے وہ تو ہر لمحہ بدلتا رہتا ہے۔ لمحاتی آویزش کی نشاندہی کرتا رہتا ہے جو مختلف شخصیتوں کے درمیان ایک وسیع القلب انسان کے سینے میں جاری ہے۔ کبھی ایک بھڑکنے کی کسی لے کا بہاؤ شروع ہوتا ہے اور ساحل تک کو چھوتی چلی جاتی ہے کبھی دوسرا آہنگ رونما ہوتا ہے اور اس لہر کو کسی مقابل میں گم کرتا ہوا گزر جاتا ہے پھر کوئی اور احتشام حسین آتا ہے جو گزرے ہوئے بکھرے ہوئے خزانوں کی باقیات چنتا ہے اور نئے رنگ محلوں کی تعمیر کے خواب دیکھتا ہے۔

شاید احتشام صاحب کا یہ بڑا "مابعد الطبیعاتی" تصور ہوا لیکن اصل یہ ہے کہ جس نے احتشام صاحب کی شخصیت میں چھپے ہوئے اس فنکار کا کرب اور تخلیقی اضطراب نہیں دیکھا وہ انہیں صحیح طور پر نہیں جانتا۔ وہ انسان جس کے بارے میں صرف اس کی تنقید ہی سب کچھ کہتی ہے دراصل

[illegible] ہے۔ جذبات و احساس کے کتنے گوشے ہیں جو آپ نے اپنے تجربات سے ان کی شخصیت کا [illegible] ہے۔
آپ نے یہ شعر سنائے:

کل تو غیروں کی یاد آتی تھی [illegible]

جب وہ پہلو میں [illegible]
[illegible]

شعور جب ہی آئے [illegible] کہ امت کی [illegible]

[illegible] کی یادیں ہیں جو احساس کی سطح پر گزرتے [illegible] جو [illegible] کے [illegible] ملاقات ہوئی ہے نہیں بھولی بچھڑی آرزوؤں کی حکمت سے ہی جس کی تصویر [illegible] ہوتی ہے [illegible] جس کی شخصیت [illegible] نہیں کرتی۔

[illegible] سال پہلے کی بات ہے جب میں نے [illegible] بحث اپنے شباب پر تھی۔ اشتراکی [illegible] رسالوں میں منتقل تھے [illegible] اور کلاس کے باہر [illegible] پڑھی جاتی تھیں۔ احتشام صاحب کے [illegible] اپنے وطن [illegible] مضامین [illegible] مضامین بھی تھے جو [illegible] سید [illegible] امامت اور خلافت کی بحث کے سلسلے میں [illegible] علما حضرات [illegible] گروہوں کا [illegible] نظر آتا تھا۔

بہرحال کلاس میں احتشام صاحب کو دور سے دیکھا۔ [illegible] شیروانی [illegible] دیکھ کر پہلا احساس ان کے شائستہ اور کافی خوش رو ہونے کا ہوا تھا [illegible] ایک ایسا محسوس ہونے لگا کہ ہم سب [illegible] محفل میں سامعین کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ احتشام صاحب ہم میں سے ہر ایک سے [illegible] کے انداز میں بڑی گرمجوشی تھی جیسے ادب کی تعلیم اس شخص کے لیے صرف [illegible] کا ذریعہ نہ ہو بلکہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہو۔

ان کے پڑھانے کی تعریف کن [illegible] کی منظر کشی کرنا ممکن ہے [illegible] لیکن [illegible] بھی بار بار اس کا احساس ہوتا تھا کہ طلباء اور استاد [illegible] ایک سفر پر ایک ساتھ روانہ ہوئے [illegible] ایک قدم آگے ہے کوئی پیچھے اور احتشام صاحب ایک [illegible] کی طرح [illegible] کی ٹولی میں گھل مل گیا ہے اور اپنے بیان سے خود بھی [illegible] کو [illegible] اور جلوہ بار گلستانوں کو متعارف کرتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔

ان کا پڑھایا ہوا شعر ایک جمالیاتی تجربہ ہوتا ہے صرف مشکل الفاظ کی تشریح [illegible] جاتے تھے۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ ایک بار پورا گھنٹہ اس مباحثے کی نذر ہو گیا تھا کہ پہلی نظر میں محبت ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اگر ہو سکتی ہے تو اس کے نفسیاتی، حیاتیاتی یا جمالیاتی اسباب کیا [illegible] پھر غالب کے اس شعر کے ساتھ ــــ

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی　　وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

حسرت کے اس شعر کا تعارف ہوا ــــ

ایک ہی بار ہوئی وجہ گرفتاریٔ دل　　التفات ان کی نگاہوں نے دوبارہ نہ کیا

[illegible] —

[illegible]

آہستہ آہستہ ہم لوگوں کو غالب کے کلام کے نئے امکانات کا احساس ہونے لگا۔ [illegible] میں [illegible] کی "CONVENTION & REVOLT IN POETRY." [illegible] کی A NOTE ON LITERARY CRITICISM [illegible] کی LOVE IN THE MACHINE AGE کے نام پہلی بار سنے گئے اور یہی وہ زمانہ ہے جب ہم لوگ کم از کم نفسیات، جنسیات اور مارکسیت کے ناموں سے روشناس ہونے لگے۔

پھر ان کی ذاتی واقفیت کا یہ حال تھا کہ سال میں چار چار مرتبہ صرف یادداشت سے حاضری لیا کرتے تھے۔ قبل تقسیم کے لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو طلباء کی تعداد کافی ہوتی تھی لیکن ہر طالب علم کے بارے میں احتشام صاحب کو نہ صرف پوری معلومات ہوتی تھیں بلکہ ہم میں سے ہر ایک کو ذاتی طور پر جانتے بھی تھے۔

"نقوش" میں میرا ایک چھوٹا سا افسانہ چھپا تھا۔ احتشام صاحب پہلے شخص تھے جنہوں نے وہ افسانہ پڑھا اور کلاس ہی میں مجھ سے اس کے بارے میں پوچھا۔ احتشام صاحب ان دنوں ہم سب سے [illegible] میں لیکن آزادی فکر کے حامیوں میں تھے اور جب سرور صاحب یا مولانا [illegible] سے ان کے مباحثے ہوتے تھے تو ہم لوگوں میں بھی مختلف پارٹیاں بنتی تھیں اور گرما گرم بحثیں ہوتی تھیں۔

انہی دنوں ہم نے "حلقۂ احباب" کے نام سے ایک چھوٹی سی انجمن کی بنیاد ڈالی تھی۔ چند ہم جماعت طلبا اس کے ممبر ہوتے تھے، اس میں سے بعض افسانے لکھا کرتے تھے اور ان پر بحثیں ہوتی تھیں۔ جوش کا یہ عالم کہ ہم نے اسی حلقے ہی میں چندہ جمع کر کے "ماہتاب" کے نام سے رسالہ نکالا جو چند شماروں کے بعد بند ہو گیا۔ ان دنوں ہمارے حلقے کا سب سے کامیاب افسانہ نگار احمد حسن تھا اور مجھے آج بھی اس بات کا یقین ہے کہ وہ افسانے لکھتا رہتا اور [illegible] "پاکستان اسٹینڈرڈ" کی سب ایڈیٹری میں اسیر نہ ہوتا تو یقیناً آج صف اول کے افسانہ نگاروں میں ہوتا۔

اس بے بضاعت حلقے کی صدارت کے لئے بزرگوں سے بہت ہی ڈرتے ڈرتے احتشام صاحب سے درخواست کی اور اس کے بعد چار چھ سال تک برابر احتشام صاحب ان جلسوں کی صدارت کرتے رہے۔

"حلقۂ احباب" کی سیکرٹری شپ نے مجھے احتشام صاحب سے بہت قریب کر دیا۔ [illegible] احتشام صاحب اور میں نے [illegible] کا جو سہ سالہ پروگرام تیار کیا تھا اس میں نہ صرف اردو ادب کی تمام تر اصناف کا جائزہ لینے کا ارادہ تھا بلکہ مختلف علوم و فنون کے ماہرین سے عام فہم زبان میں مقالات لکھوانا بھی شامل تھا۔ مختلف ہندوستانی زبانوں کے ادب کا اجمالی خاکہ پیش کرنا اور فنون لطیفہ کی اصناف میں سے ہر ایک کا تفصیلی جائزہ بھی ہماری فہرستِ مقالات میں شامل تھا۔ اس سہ سالہ پروگرام کا افتتاح کرنا ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے منظور کر لیا تھا۔

اب یہاں احتشام صاحب کی شخصیت کا ایک اور پہلو سامنے آتا ہے۔ نہ جانے کتنی بار مجھے احساس ہوا ہے کہ احتشام صاحب جس طرح اپنے ہم نشینوں اور ملنے والوں کے دل میں جگہ کر لیتے تھے اس کا عشر عشیر بھی خود ان میں بہت کم پایا جاتا ہے۔ خود اپنی بات کرتا ہوں اپنے رفیقوں کے عمل میں عمل کا ذوق پیدا کرنا اور جوش پیدا کرنا بہت آسان کام تھا۔ یہی نہیں اکثر مولوی عبدالحق اور خواجہ غلام السیدین جیسے بزرگوں کو دہلی اور بمبئی سے کھینچ بلانا اور "حلقہ" کے لئے جوش پیدا کر دینا بھی دشوار نہ تھا۔ لیکن خود احتشام صاحب کو اس کے لئے آمادہ کرنا جوئے شیر لانا تھا۔

ہم سب لوگ دن رات پروگرام بناتے، مقالے لکھتے، جلسوں کی نوعیت کے بارے میں سوچتے لیکن جب ہم یہ ساری تجاویز اور [illegible] لے کر احتشام صاحب کے پاس پہنچتے تو وہ اس کے بارے میں کبھی کبھی ایسے عیوب نکال دیتے کہ ہمارے سارے ولولے پر پانی پھر جاتا۔

ایک دلچسپ واقعہ ۱۹۴۷ء کی ایشیائی کانفرنس میں آئے ہوئے ایرانی مندوبین کو مدعو کرنے کی دعوت سے [illegible]۔ خیال یہ تھا کہ بزرگ

[illegible]

[illegible]

[illegible] علم ہو جائے کہ اب یہ [illegible] دے گا؟

[illegible] ایک جلسہ کرنے کا اہتمام کرلیا۔

ہم سب لوگ بیٹھے یہ سوچ رہے تھے کہ کیسے اب احتشام صاحب کا [illegible]: احتشام صاحب کے [illegible] ساری [illegible] احتشام صاحب نے [illegible] کہا:

"یہ تو سب ٹھیک ہے مگر جلسے کے لئے حاضرین کہاں سے آئیں گے؟"

بات غلط نہ تھی کیونکہ [illegible] سندھی [illegible] یہاں تک آجائیں [illegible] کے بعد آمادہ کر لائیں [illegible] اس کے بعد ایمانی وفد کے استقبال کے لئے حاضرین کی کمی پڑے — — احتشام صاحب کی [illegible] طبیعت [illegible] تھی۔

افسردگی پرست کہلانے ہی جاتا ہے [illegible] مستقل [illegible] ایک ایسے نقاد کے بارے میں لکھ رہا ہوں جس نے [illegible] اگر میں نے احتشام صاحب کی تحریریں نہ پڑھی ہوتیں تو ان کی [illegible] تیر کے دوبارہ جنم [illegible] میر کتنا یا پھر انھیں صوفی، وجودیاتی، یا قنوطی تسلیم کر لیتا۔

غالب کا شعر ہے: —

بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

بے دلی کا اتنا رچا ہوا احساس میں نے کم لوگوں میں دیکھا ہے [illegible] اسے کیا کہئے، مجھے تو بار بار ایسا لگتا ہے کہ احتشام صاحب کے اندر ایک بہت ہی اچھا آدمی چھپا ہوا ہے جو وضعدار ہے، جس نے قصبہ [illegible] کے ایک قدیم گھرانے میں پرورش پائی ہے اور اس کی قدیم روایات کو اپنے میں جذب کیا ہے [illegible] وضعدار اور [illegible] اچھا آدمی اتنا طاقت ور ہے کہ وہ باغی نوجوان [illegible] شکست کا [illegible] کہا جاتا ہے اس نوجوان باغی کو وہ کھونے نہ دے [illegible] ایک افسردگی کی شکل میں [illegible] گئی ہے، یہ وہ [illegible] ہے جس کا ذکر کرشن چندر نے ناول شکست کے آخری صفحات میں کیا ہے۔

اب ذرا اس بات کا [illegible] آدمی کی [illegible] دیکھئے:

میں نے ایسے آدمیوں کو [illegible] دیکھا ہے جو [illegible]

اور کوئی خاص حل نہیں کر سکتے۔ کمشن کر تو دیا گر وہ دونوں تک ہی بحث میں مزا نہیں آتا کہتے ہیں کہ احتشام صاحب [illegible] سے آنے والے سامنے تماشوں کو [illegible] دیں گے۔ اس وقت ایک یونیورسٹی کا وقت ہو گا تو [illegible] ہو سکیں گے کہ آپ کسی اور وقت تشریف لائیے گا۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں [illegible]۔

ان سے ملنے آنے والوں کا ایک سلسلہ [illegible] سب سے زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے جو اپنی کتابوں پر مقدمہ لکھوانے آتے ہیں۔ خود ایک سے زیادہ مرتبہ [illegible] سے اس مقدمہ بازی کی شکایت کی ہے [illegible] پہلے بھی [illegible] کسی نے [illegible] مجھ سے کہا کہ [illegible] میں نے آکر ان سے فریاد کی۔

کہنے لگے کہ لوگ یہ تو پوچھتے ہیں کہ احتشام [illegible] لوگ [illegible] سفارشیں کراتے ہیں تو میں [illegible] دیتا ہوں؟

اور اس کی گواہی خود میں دے سکتا ہوں کہ میں نے ایک [illegible] کتاب کے دیباچے کے لیے ایک وقت [illegible] آباد سے [illegible] ایک [illegible] کے [illegible] ہوتے دیکھا ہے۔

امریکہ جانے سے پہلے ہر شام وہ امین آباد میں [illegible] کتابوں کی دوکان نشر محل میں آ بیٹھتے۔ یہاں ان کے دوست اور [illegible] جمع ہوتے ہیں اور موضوعات کے دائرے میں کتابوں سے لے کر [illegible] تک سب کچھ شامل ہے۔ وہ گفتگو میں مقامی سیاست اور الیکشن [illegible] پر بحث کرتے ہیں۔ یہ بزم [illegible] بے تکلف تو نہیں کہی جا سکتی کیونکہ احتشام صاحب کی شخصیت [illegible] کی عادی نہیں۔ ہاں [illegible] ہے جہاں روزگار کے لیے دو چار خوشگوار لمحے گزر جاتے ہیں۔ اور آپ یقین کیجیے کہ وہاں بیٹھنے والوں کے گروہ میں سے ہر ایک کے لیے احتشام صاحب کے دل میں گرمجوشی اور خلوص کے وہی سوتے ہیں جو شاید کسی پسندیدہ دوست کے لیے ہوں گے۔

ایک اور رخ دیکھیے۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں ریڈر شپ کا مسئلہ درپیش تھا۔ امیدوار یوں تو بہت سے تھے لیکن خاص مقابلہ احتشام صاحب اور آل احمد سرور صاحب کے درمیان تھا۔ سرور صاحب کا تقرر ہو گیا۔ [illegible] سے آج تک اگر لکھنؤ یونیورسٹی میں سرور صاحب کسی کو اپنا سرپرست [illegible] کر سکتے ہیں تو وہ احتشام صاحب ہیں۔ یہ میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا ہوں۔ نہ جانے کتنی بار میں نے سرور صاحب کی زبان سے یہ الفاظ سنے ہیں اور اس خلوص کا اندازہ کیا ہے جو احتشام صاحب کی رگ رگ میں پیوست ہے۔

یوں تو یہ معمولی سی بات ہے لیکن ایسے موقعوں پر جب انسان خود اپنی حسرتوں کی شکست کا منظر دیکھتا ہے اور اس کے سامنے اپنے مستقبل پر چھائے ہوئے [illegible] اچھے اچھے تصور پرستوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں۔ معاصرانہ چشمک ہمارے ادب میں [illegible] نہیں رہی لیکن اس وسعت قلب کی مثالیں کم ہی ملیں گی جب چند لمحوں کے حریف زندگی بھر کے رفیق ہو گئے ہوں۔

یہ چشم مروت احتشام صاحب کے کردار کی خوبی بھی ہے اور خامی بھی۔ وہ شاعر کا شعر بھی بڑے استغراق سے سن لیتے ہیں اور تنقید نگاروں کی صف اول میں ہونے کے باوجود ان کا قلم [illegible] اور ہنگامی شہرتوں کے بلبلے توڑنے میں مزا نہیں لیتا۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ ان کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے دائرے [illegible] ہوں۔ وہ [illegible] کے ساتھ پکاسو کے آرٹ پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں لیکن اگر خدانخواستہ پکاسو ان کا ہم وطن ہوتا تب وہ کھلے بندوں اس کی کڑی نکتہ چینی کر پاتے — یہ البتہ بحث طلب ہے۔

چاہے ان کے قلم کے نشتر [illegible] نہ ہونے پر نکتہ چینی کر لیجیے لیکن ان کے ہمدردانہ لہجے پر کوئی شبہ نہیں کر سکتا۔ مروت میں وہ کہیں کہیں اس طرح بہ جاتے ہیں کہ شاید بہت سے لوگ اسے ہضم نہ کر پائیں اسی لیے انہوں نے ہم عصر ادیبوں پر بہت کم لکھا ہے۔ ان کا کام اردو کی تنقید کو ایک نئی نظریاتی بنیاد بخشنا تھا اور ہر چند کہ جو کچھ انہوں نے اب تک کیا ہے وہ اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہے جو وہ کر سکتے ہیں اور غالباً صرف وہی کر سکتے ہیں۔

[illegible]

[illegible] ہوتا ہے۔ [illegible] احتشام صاحب [illegible] وفات [illegible]

[illegible] بے حد [illegible] ظاہر ہو [illegible] جاتا ہے۔ [illegible] احتشام صاحب [illegible] شخصیت کا ایک [illegible]

[illegible] گفتگو [illegible]

[illegible]

[illegible] ظاہر ہے۔

اس طرح [illegible] ہیں [illegible] جاتے ہیں [illegible]

[illegible]

اس سے بات کریں گے۔ [illegible] گے

گھریلو زندگی میں بھی احتشام صاحب [illegible]

ان کے چھوٹے بھائی اقتدار ان کی [illegible] دیکھ [illegible]

بہت کم باہر نکلتے ہیں۔ [illegible] وقت [illegible]

کے جلسے میں [illegible]

احتشام صاحب یوں بہت گھریلو آدمی ہیں۔ ان کا گھر بھی [illegible] رہتا ہے۔ کوئی [illegible] ان کی گود میں

بیٹھنے کے لئے [illegible] رہا ہے، کوئی کتاب چھپنے کے لئے جا رہی ہے [illegible] احتشام صاحب [illegible] خاطر سے [illegible]

کو [illegible] رہے ہیں اور کبھی آپ سے [illegible] فلسفۂ جمالیات پر بحث کر رہے ہیں۔ [illegible] تو ان کے سامنے [illegible]

مسخ ہو جائیں گے۔ حالانکہ خود اپنی بیماری کو ہمیشہ ٹالتے ہی رہتے ہیں۔

یہ بیماری جسمانی ہے نہ صرف بقول رشید احمد صاحب صدیقی [illegible]

ان کا مرض ہے لیکن اس کے علاوہ طبیعت کی گرانی، الجھن اور پریشانی کچھ کو کچھ بنا رہی ہیں۔ ایک شام [illegible] احتشام صاحب [illegible] دہلی جانے والے تھے

وہاں جامعہ کی طرف سے "یوم نظیر" منایا جا رہا ہے۔ حضرت گنج میں مجھے اطلاع ملی [illegible] بجے [illegible] پر جانا تھا [illegible]

کام تھا۔ بھاگم بھاگ دولت خانہ پہنچا۔

گھر کے سامنے رکشا کھڑی تھی۔ تھوڑی دیر میں اقتدار میاں بستر سے آئے، رکشا میں رکھ دیا گیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ ٹھیک سے وقت پر ہی پہنچے گی۔

بہرحال اطلاع کرائی تو قمیص اور پاجامے ہی میں [illegible] باہر چلے آئے۔ میں نے حیرانی سے پوچھا:

"آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئے؟"

بولے "طبیعت میں عجب طرح کا خلجان سا ہے۔ کچھ گرانی محسوس ہو رہی ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ جاؤں یا نہ جاؤں۔"

اتنے میں اقتدار میاں اور رکشا والے دونوں نے جلدی مچانا شروع کی۔ کہنے لگے:

"میاں اقتدار، کیا ۲۰-۹ کے بعد کوئی اور گاڑی نہیں جاتی؟"

اقتدار میاں نے کہا "غالباً ۱۲ بجے جاتی ہے۔" پھر بھی کوئی ۱۵-۲۰ منٹ سامان اسی طرح رکھا رہا۔ فیصلہ ہوا کہ اس گاڑی سے جانا ملتوی کیا جائے

[illegible] وہ اسے دیکھ جاتے تھے۔ میترا دار ہو گئی، رکشا رخصت ہوا اور ہم دونوں اس مشاعرے کی باتیں کرتے رہے [illegible]
وہاں نہیں گئے۔

اب یہی اگر روشنی میں شبہ ہوا کہ جان لیا جائے کہ احتشام صاحب جو امریکہ، لندن اور پیرس کے ناول نگاروں، مصاحب گھروں اور آرٹ گیلریوں کو دیکھ چکے تھے، آج بھی آیا کہ اسٹ وڈ اور شاہ نجف کے امام باڑے اور شاہان اودھ کی آرٹ گیلری دیکھنے کبھی نہیں گئے۔ آٹھوں محرم کو دریائی گھوڑے کا جلوس دیکھنے والے بھی دیکھنے کے لئے آتے ہیں لیکن اس وضع دار شخص نے تیرہ کے انداز میں ہمیشہ اپنے ہی باغ و بہار سے مطلب رکھا ہے۔ اس جلوس کے نظاروں سے کوئی سروکار نہیں رکھا۔

لکھنؤ کا کافی ہاؤس اور حضرت گنج یونیورسٹی اور شہر کے سارے صاحب ذوق رکھنے والوں کا مرکز ہو گیا ہے۔ شام کو ایک کمرے میں آل احمد سرور، ڈاکٹر عبدالعلیم، پروفیسر مجنوں گورکھپوری، پنڈت جواہر لال نہرو کے اخبار نیشنل ہیرالڈ کے ایڈیٹر چلپتی راؤ، کبھی کبھی ڈاکٹر رام منوہر لوہیا اور ان کا سیاسی گروپ اکٹھا ہوتا تھا مگر احتشام صاحب برس دو برس میں صرف ایک آدھ بار اس محفل میں دکھائی دے جاتے تھے۔

شہر کے سب سے خوبصورت سینما ہال میں روز رنگ برنگی روشنیاں جگمگاتی رہتی ہیں۔ لیکن وہ ادیب جس نے نہ جانے کتنے طلبہ کے ذہن میں آرٹ کا ایک مربوط اور بہت بہت تصور پیدا کیا ہے، خود یہاں یا کسی اور سینما ہال میں کوئی فلم دیکھنے نہیں جاتا۔ یہ وہی احتشام صاحب تو ہیں جنہوں نے امریکہ اور یورپ میں صرف انگریزی ہی نہیں فرانسیسی، روسی، اطالوی فلموں کی تعداد میں دیکھے ہیں۔ یہ وہی احتشام صاحب ہیں جن سے اگر رقص کی تکنیک اور ساز و ساز کی باتیں یا موسیقی کا ذکر چھیڑئیے تو گھنٹوں اس طرح بات کرتے رہیں گے کہ آدمی بیٹھا سنتا رہے۔

امریکہ جانے کا واقعہ سنئے۔ انہی دنوں میں لکھنؤ یونیورسٹی میں ایک عارضی جگہ پر شعبۂ اردو میں لیکچرار کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ تقرر ہونے تک اتفاق سے جب اس جگہ کے مستقل ہونے کا سوال آیا تو صدر شعبہ اور فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین کی حمایت کے باوجود ایک دوسرے صاحب اس جگہ پر مقرر ہو گئے۔ جس روز اس نتیجے کا اعلان ہوا ہے احتشام صاحب اپنے وطن ماہل ضلع اعظم گڑھ گئے ہوئے تھے۔

تیسرے چوتھے دن واپس آئے۔ میری ملازمت کے آخری دن تھے اور میں کمرۂ امتحان میں نگرانی کر رہا تھا۔ دیکھا کہ احتشام صاحب چلے آ رہے ہیں اداس، خاموش اور رنجیدہ۔ مجھے دو منٹ دیکھتے رہے۔ میں نے اس لمحے محسوس کیا کہ ان کے دل میں میری ناکامی کا کتنا گہرا عکس ہے۔ پھر کہنے لگے:

"شاید مجھے امریکہ جانے کے لئے سال بھر کی چھٹی لینا پڑے، اس صورت میں ایک عارضی جگہ اور نکلے گی۔"

مجھے اس شاید کی داستان معلوم تھی لیکن اس لمحے میں اس درد مندی سے اس درجہ مبہوت ہو گیا تھا کہ اس کے بارے میں کچھ اور پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ البتہ یہ جانتا تھا کہ امریکہ والے ان کو بلانے کے بارے میں لکھ چکے ہیں۔ ہاں ان کو جانے کے بارے میں طے کرنا ہے۔ یہ داستان طویل ہے کہ کس کس طرح احتشام صاحب نے امریکہ کو ٹالنے کی کوشش کی۔ اپنے کو بار بار یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ بلا وجہ تو ہاں لیں گے درخواست بھیجنے میں کیا حرج ہے۔

اور جب ایک نہ چلی تو بھی ان کو اچھی خاصی ذہنی اذیت سے گزرنا پڑا ہوگا۔ انہوں نے امریکہ جانے کا فیصلہ محض ایک عارضی جگہ خالی کرنے کے طور پر کیا۔ جب کوئی ایسا نہ ملا جو اس اقدام کی مخالفت کرتا اور "گھر سے میں تقصی کے لئے آرام بہت ہے" دہراتا۔ جب یونیورسٹی نے چھٹی اور قرض دونوں دے دئے، جب راک فیلر والوں نے خاندان کو الاؤنس دینا بھی منظور کر لیا تب کوئی بہانہ ایسا نہ رہ گیا جو ان کے عارضی تقرر کو ملتوی کر سکتا۔ لیکن ان کی منزل کی ایک کیفیت ان کا چہرہ مانوس نہیں ہوا۔ وہ مسکرا ضرور رہے تھے اور اسٹیشن پر جب ان کو پہنچانے کے لئے ایک ہجوم غفیر اکٹھا ہو گیا، ان کی گردن ہار [illegible] اتار اتار کر اپنے بچوں کے گلوں میں ڈالتے جاتے تھے اور ایک مسکراہٹ کے ساتھ ان کے گال تھپتھپاتے جاتے تھے لیکن ان کا کرب

[illegible]۔

[illegible]

[illegible] ... جنہیں پہلی بار میں نے کلکتہ ... بستی میں دیکھا تھا۔

امریکہ سے آنے کے بعد ... میں کوئی ظاہری تبدیلی نہیں ہوئی ... تفصیل سے ... تھا کہ وہ امریکہ کی ... یونیورسٹی کا دورہ کر کے آئے تھے وہاں کی لائبریری ... ہے، وہاں سنسکرت اور خاص طور پر ... اردو کے قلمی مسودات ... کی تعداد کافی ... وہاں آئی۔ اے۔ رچرڈس، جیکس ... سے ملے ہیں۔ لندن میں برٹش میوزیم ... ڈاکٹر ... کے ساتھ شیکسپیئر کے وطن ... نہیں کی بلکہ جیسے مستشرقین سے ملاقات کی ہے ... کے اردو کی زیارت کی ہے ... لکھنے والوں سے ملے ہیں ... فنکاروں کی نشستوں میں شریک ہوئے ہیں۔

ان سب ملاقاتوں اور زیارت گاہوں نے احتشام صاحب کو متاثر ضرور کیا ہے ان کے ذہنی افق میں بڑی وسعت اور گہرائی پیدا ہوئی ہے۔ ان کا حال بھی صحبت میں ان کی زبانی سنئے تو ایسا لگتا ہے کہ آپ خود ان دانشوروں سے باتیں کر رہے ہیں ... اور ... کی تمام گاہوں کی سیر کر رہے ہیں۔ چار ... روز ہوئے ان کا سفرنامہ یا ڈائری چھپ کر آئی ہے اس کے کچھ حصے میں نے غیر مطبوعہ شکل میں سنے تھے۔ میں نے ابھی اس تازہ کتاب ... کو ختم کیا ہے۔

اس میں باتوں کی وہ رنگینی کہیں کھو گئی ہے صاف سیدھی سپاٹ باتیں ہیں۔ جی چاہتا ہے یوں کہہ دیجئے کہ احتشام صاحب جب لکھنے بیٹھتے ہیں تو اپنے اس وجود سے رخصت لے لیتے ہیں جو باتیں کرتے وقت رنگینی لیے شگفتگی اور قہقہے شناسا لہجہ رکھتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کی تقریروں، کلاس لیکچر اور ریڈیو کے لئے بےساختہ لکھے ہوئے مضامین میں اکثر وہ رنگینی، تازگی اور شناسا لہجہ مل گیا ہے جو ان کی تنقید میں جھلک دکھا کر چھپ جاتا ہے۔ کنہیا لال کپور نے شاید اسی لئے کہا ہے کہ تحریر میں اگر وہ کوئی شگفتہ اور رنگین جملہ لکھ جاتے ہیں تو نظر ثانی میں اسے کاٹ دیتے ہیں۔

قلم شخصیت کے اظہار میں بڑے پردے قائم کر دیتا ہے اور پردہ بھی جب احتشام صاحب کا فلسفیانہ قلم ہو اور احتشام صاحب کی شخصیت جو خود کو چھپانے میں ماہر ہے تو پھر ڈائری کتمان ذات کا ذریعہ ہو جاتی ہے یہ داخلی سفر ضرور رہے جو امریکہ سے زیادہ مصنف نے کبھی کتابوں کی مدد سے اور کبھی سیاسی خبروں کی مدد سے کیا ہے۔ یہاں خارجی تحریروں کی دلکشی کم ہے امریکہ کے ساحل ... نظارے کم ہیں برطانیہ کی ... کا کیف و رنگ نہیں ہے ... کوئی نوجوان ... بھٹکے ... ہو جائے گا۔ ... [illegible]

یہاں ساحل بھی ساحل ہی ہے، سمندر اور اس کے طوفان نہیں کیونکہ ان مرحلوں پر احتشام صاحب اس نکتے سے بندھ جاتے ہیں کہ انھیں پار جانے کا ادراک نہیں۔

احتشام صاحب ہمارے ان تنقید نگاروں کے پیش کاروں میں ہیں جنھوں نے نقطۂ نظر پر اصرار کیا ہے کہ ان کے نزدیک تنقید محض نظریاتی نقد و نظر ہی نہیں بلکہ اس کا اطلاقی عمل بھی ہے اور اسی بنا پر نقاد کا زاویۂ نظر ہونا بھی ضروری ٹھہرا اور ادب کا حکیمانہ مطالعہ بھی۔ شاید اسی سبب سے حکیمانہ مطالعہ کی جانب تجربے کی طرف سے گئی ہے "ساحل اور سمندر" اس سفر کے ساتھ ختم ہوتی ہے:

"غیر ارادی طور پر اور بہ سفر میں میں نے اگر کچھ اور بھی سیکھا تو شاید یہی کہ میں نے احتشام حسین کو سمجھنے کی کوشش کی ... عجیب اتفاق ہے، متضاد کیفیتوں کا حامل، حقیقتوں سے جدوجہد کرنے کا شائق، خوابوں کے پیچھے دوڑنے والا، چھوٹے سے سمندر سے بھی محبت، ساحل بھی عزیز ہے۔ وہ مرغزاروں کی خواہش بھی کرتا ہے، دریا کی موجوں کا عاشق بھی ہے۔ بیان کرتا ہے اس سے زندگی کے ساتھ پوری وابستگی۔ اس کی داستانوں میں سے صرف مطالعہ کو چن لیا، مطالعہ تنہا ہی نہیں ہوتا، مشاہدے اور زندگی کی جدوجہد میں شریک ہو کر تجربے حاصل کرنے کا بدل نہیں ہو سکتا۔ ساحل پر جا کر بیٹھنے کے لیے کبھی کبھی مجبور یا محض بیٹھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس نے اس راز کو نہیں سمجھا وہ ڈرتا ہے کہ کوئی اس سے پوچھے، زندگی کی کرنیں یہ ایک سمٹی ہوئی محدود شخصیت کی نشانی ہے۔ تفریح، وقت گزاری کے بہت سے در کھلے ہوئے دیکھ کر اس نے کچھ کہا بھی تو اس طرح جیسے اپنے گرد و پیش سے خوفزدہ ہو جائیں۔ جب لوگ دلچسپیوں میں مصروف ہوتے اور وہ پڑھتا، سمندر کی موجیں گنتا رہتا تو میرا جی چاہتا کہ اس کی کتاب اس کے ہاتھ سے چھین لوں اور کہوں کہ یہ کھیل کود، یہ تماشے، یہ رقص کے ہنگامے، یہ قہقہے بازی، یہ محض ہنسی کے لیے ہنسی، یہ صرف بات کرنے کے لیے بات، محض حماقت تو نہیں، کچھ لذت تو حاصل ہوتی ہی ہوگی ورنہ لوگ کوشش کیوں کرتے ہیں۔ میں نے اس سے کبھی کہا کہ یہ سنجیدگی بے محل ہے۔ اس کا خیال ہے کہ خول کے اندر رہنا بے معنی ہے۔ رقص، کھیل کود، بات چیت کے بہانے دل ملتے ہیں، جسم ملتے ہیں، گو یہ حاصل تو ہے یہی باتیں تو ناکرت کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ اس کی اداسی، اس کے فلسفیانہ غم اور اس کے احساس تنہائی کو دور کرنا تو میرے بس کی بات نہیں لیکن میں نے وہ چاہا کیا ہے۔ نا، بات خود میں اس کا محرم نہیں ہے۔ شاید اس میں کچھ گہرائی ہو، کچھ پیچیدگی ہے جس کو وہ بتا نہیں سکتا۔ ایک دن جب میں نے اسے بہت مجبور کیا تو اس نے مسکرا کے میرے شیکسپیئر کے ڈرامے "ایز یو لائک اٹ" (As you like it) کا چوتھا ایکٹ میرے سامنے کر دیا۔"

ساحل اور سمندر، صفحہ ۲۶۶

آپ نے اس کے بارے میں جیکس اور روزالنڈ کا یہ مکالمہ پڑھا ہے۔ مجھے احتشام صاحب کے بارے میں دو چار باتیں کرنے کی اور اجازت دیجئے۔

یہ آخری بات ان کی سیاست کے بارے میں ہے۔ یہ میں مانتا ہوں کہ احتشام صاحب ذہن کے دریچے بند کر کے نہ کبھی کانگریسی ہوئے ہیں نہ کمیونسٹ، ایسے موقع پر بھی جب کمیونسٹ پارٹی غلط قسم کی پالیسی پر کاربند تھی احتشام صاحب نے اپنے توازن اور اعتدال کو نہیں چھوڑا۔ شاید اس لیے کہ وہ ان کی فطرت کا دوسرا نام ہے۔ اس غلط پالیسی کے زمانے میں وہ "علم و دانش" کے ادارے میں رہے۔ مارکسی مصنفین کی کانفرنس میں شرکت کرتے رہے۔ لیکن ایمان کی بات یہ ہے کہ مجھے ان کی سیاست سے الجھن ہوتی ہے۔ ادب بھی ایک محبوبہ ہے جو سوکن کو برداشت نہیں کر سکتی۔ میرا بے اختیار جی چاہتا ہے کہ احتشام صاحب کی شخصیت جو سیاست اور امریکہ اور روس کے مناقشوں، ہائیڈروجن بم اور امن کے دھندوں میں گم ہو جاتی ہے اپنے جمالیاتی شعور کے ساتھ نکھر کر سامنے آئے۔ اب "ساحل اور سمندر" کو لیجئے۔ یہاں بھی یہ سفر ایک حسن پرست ادیب سے زیادہ واضح اشتراکی رجحان رکھنے والے سیاست دان کا سفر معلوم ہوتا ہے۔ [illegible] Goods that failed جیسی غیر ادبی کتاب کا تذکرہ کرنے کی فکر میں ہے۔ کبھی ایسا لگتا ہے جیسے وہ ادب کے

[illegible] کو بجلی کی انسانیت کے طلسم سے گرفتار [illegible] ہیں۔

[illegible] صاحب سے [illegible] [illegible]

[illegible] شعر کا [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اختر حسین رائے پوری

دیوندر ستیارتھی

"حسن و عشق کے گیت تو بہت ہو لئے۔ بغاوت کے گیت ہوں تو نکالئے اپنے جھولے سے!"

"تو آپ نے مجھے کوئی مداری سمجھ لیا، جب چاہوں اپنے جھولے سے بے موسم کا پھل نکال کر پیش کر دوں۔"

"بہت خوب۔ لیکن بغاوت کے گیتوں سے میرا کیا مفہوم ہے، یہ شاید آپ نہیں سمجھے۔"

"ارشاد"

"میرا اشارہ کسانوں کے ان گیتوں کی طرف ہے جن میں انھوں نے قسمت کا رونا رونے کی بجائے اپنے قدموں پہ کھڑا ہونے کا ارادہ ظاہر کیا ہو۔ جن میں ہمیں ان کے وہ تیور نظر آسکیں جو اپنے اقتصادی حالات پر غور کرنے والے کسی شخص کے چہرے پر اکثر دیکھے گئے ہیں۔"

"لوک گیتوں میں ایسے گیتوں کی بھی کمی نہیں۔"

"تو فوراً ایسے گیتوں کو منظر عام پر لائیے۔ ان کی ہمیں زیادہ ضرورت ہے۔ خالص شاعری کے نقطۂ نظر سے تو دوسرے گیتوں کی اہمیت بھی کچھ کم نہیں۔ لیکن جہاں تک ادب کی افادیت کا تعلق ہے، ہمیں کسانوں کے ایسے گیتوں کو ترجیح دینا ہوگی جن میں وہ اپنے کھیتوں کے بارے میں کچھ کہتے ہیں، اپنے قرض چکانے کی بات سوچتے ہیں، زمیندار کی غلامی سے آزاد ہونے کے لئے آواز بلند کرتے ہیں۔"

گفتگو کے یہ نقوش آج تک دھندلے نہیں ہوئے۔ اگرچہ یہ گفتگو بیس برس پیشتر ہوئی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب اختر حسین رائے پوری کلکتے کے ہندی ماہنامہ "وشوامتر" کے مدیراعلیٰ تھے اور میں اس خیال سے دفتر وشوامتر پہنچا تھا کہ کسی طرح ایک مضمون کی پیشگی مزدوری مل جائے اور اس سے دارجلنگ تک، نہیں تو کم از کم سلی گڑی تک کا ٹکٹ لیا جا سکے۔

میری زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی ادیب نے مجھے ادب کے اقتصادی پہلو سے اتنی شدت سے روشناس کرایا۔ اختر حسین نے وعدہ کیا کہ وہ وشوامتر کے مالک مول چند جی سے کہہ کر میرے لئے دارجلنگ کے کرائے کا انتظام کر دیں گے۔ میرا مضمون انھوں نے وشوامتر میں چھاپنا منظور کر لیا۔ لیکن بڑے رکھ رکھاؤ کے ساتھ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ لوک گیتوں کے پس منظر کو سمجھنے کے لئے ادب کے گہرے مطالعے کی ضرورت ہے۔ احساس کے لئے مجھے گورکی کے افسانوں کا بھی طرح جائزہ لینا چاہئے۔

۔ آپ پہلے [illegible] ساتھ والے [illegible]
[illegible]:

۔ ۱۹۴۲ء میں [illegible]
سکتا ہے۔ [illegible]

۔ یہ تو آپ نے [illegible] رکھنے [illegible]

۔ ۱۹۴۲ء میں [illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
اپنے دور سے مکان [illegible]
[illegible]
[illegible]
اسی بو آتی تھی۔ جیسے مُردے کے منہ سے آتی ہے۔

۔ گئے ہاتھوں تیسرے اور چوتھے مکان کا حال بھی بتا دیجئے۔

تیسرے مکان کے بہت بڑے صحن میں دوسرا [illegible] منظر دیکھنے کو نصیب ہوتا تھا۔ مالک مکان نے یہ قاعدہ بنا رکھا تھا کہ وہ جمعرات کی صبح کو اپنے ہاں آنے والے بھکاریوں کو ایک ایک ادھیلا دے گا۔ میں اپنے برآمدے میں کھڑا ہو کر ان لنگڑے لولے اور اندھے بھکاریوں کے جمگھٹ کا جائزہ لیا کرتا تھا۔ [illegible] منظر دیکھنے کے بعد کئی روز تک میری طبیعت پریشان رہتی تھی۔ مجھے ان سرمایہ داروں سے نفرت ہو گئی۔ جو ان ریزہ چننے کا ڈھونگ رچانے میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ اب سنئے چوتھے مکان کا حال۔ اس کے سامنے ایک پرولتاری ہوٹل تھا جہاں صبح سے لیکر آدھی رات تک تندور پر روٹیاں پکا کرتی تھیں۔ ہوٹل [illegible] تندور کے سامنے آلتی پالتی مارے بیٹھ اپنے ہاتھوں سے تندور میں روٹیاں لگایا کرتا تھا۔ اُس کا اپنا حساب تھا۔ کٹھرتی سے گندھے ہوئے آٹے کی ایک خاص مقدار نوچ کر پیڑے پر رکھتا اور بیلن کی [illegible] گول شکل دیتے ہوئے اسے اٹھا لیتا اور دونوں ہاتھوں میں [illegible] کے بعد تیزی سے تندور کے اندر [illegible] تھاپ دیتا۔ دھماکے کے ساتھ تندور میں روٹی تھاپنے کے بعد ہر بار وہ [illegible] پسینہ پونچھتا اور پاس رکھی گڑگڑی اٹھا کر ایک کش لگا لیتا۔ اس پرولتاری تندور والے کی ڈیوٹی دن بھر بجتی ہی رہتی تھی۔ [illegible] یہاں میرا یہ حال ہے کہ اس کی ہر تھاپ کے ساتھ گویا میرے دماغ پر چوٹ پڑتی ہے۔ اُس کے آٹے کے گولے کی تھاپ میرے سر کے اندر طبلے کے تال کی مانند گونج جاتی ہے۔ ہنسنے کا نہیں [illegible] بات سن کر۔ ابھی بس یہی کہنے کو جی چاہتا ہے کہ روٹی پر مکوں کی [illegible] طرح گونج اٹھتی ہے جیسے کلاس روم کی [illegible] دماغ کے سُننے

آسمان میں کوئی کمی رہتی ہے ۔

اس پر ہم نے زور کا قہقہہ پڑا اور اختر حسین نے بات کا رخ کسی قدر بدل کر میرے اس مضمون کی تعریف شروع کر دی جو میں نے اپنی جب ہدایت و شہرت کیلئے لکھا ہو کر دیا تھا۔ وہ یہ تک مجھے سمجھاتے رہے کہ لوک گیتوں کے آئینے میں ہی ہندوستان اور بنگال کے نغمے کو دیکھا جا سکتا ہے اور اپنے عوامی ادب میں عوام کی وہ آواز سننی چاہئے جو ان کی اقتصادی کشمکش کی یاد دلاتی ہے۔ میرے مضمون میں وہ گیت انھیں خاص طور پر پسند تھا جس میں بنگال کا کسان اپنے اللہ سے شکایت کرتا ہے کہ ندی میں سیلاب آگیا اور زمینداروں سے اس کی فصل واپس لے گیا اور اب وہ اپنی بیوی کیلئے زیور بنا کر دینے کا وعدہ پورا نہ کر سکے گا۔ اگرچہ اختر حسین ایک ہی سانس میں کہہ گئے تھے کہ محض اللہ سے شکایت کرنا کافی نہیں ہے کسان کو چاہئے کہ اپنے ہاتھوں اپنی قسمت بنانے کا کوئی نہ کوئی طریقہ پیدا کرے ۔

باتوں باتوں میں اختر حسین نے اس واقعہ کا ذکر کیا جب وہ ایک بار اپنی بیٹی کی گڑیا بیچنے جاتے اپنے گھر کے سامنے والے موڑ پر ہو رہے تھے کہ راستے میں ایک بھکاری نے ان کا بازو پکڑ لیا۔

[illegible] میری چٹھی پر شاداں ذہنیت فوراً بیدار ہو گئی تھی۔ انھوں نے کسی قدر سنجیدہ ہو کر لکھنا شروع کیا: "میں اسے فوراً دھکا دے کر پرے کر دینا چاہتا تھا کہ اچانک دیکھے رہ گئے۔ اس کے ہاتھوں کو لقوہ مار گیا تھا اور وہ ٹھنڈ کی مار سے تھر تھرا رہے تھے۔ اس کے ہاتھ میں روٹی کے ٹکڑے دبے ہوئے تھے۔ اس میں اتنی بھی طاقت نہ تھی کہ خود روٹی کھا سکے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ صرف یہی چاہتا ہے کہ میں اس کی روٹی اسے کھلا دوں۔ کلکتہ جیسے شہر میں جہاں بھکاریوں کی کوئی کمی نہ تھی، میرے لئے یہ پہلا موقع تھا جب اپنے ہاتھ سے اس بھکاری کو اس کی روٹی کھلا سکوں۔ میں اس کے منہ میں لقمہ دیتا جاتا تھا اور وہ بھوکا اسے بنا چبائے نگل رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میرے لئے واقعی یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ اور شاید یہی سبب ہے کہ اس واقعہ کا مجھ پر گہرا اثر ہوا اور میں جی جان سے اس نظام سے نفرت کرنے لگا جس کی بدولت سیکڑوں ہزاروں لوگ بھکاری بننے پر مجبور رہتے ہیں۔"

اس سے قبل مجھے اختر حسین کا ایک مضمون پڑھنے کا موقع ملا جو کچھ دن پہلے دشمن میں شائع ہوا تھا۔ اس ڈائری نما مضمون میں ایک جگہ انھوں نے لکھا تھا:

"چار اگست ۔ پھر ریل کا سفر۔ میری زندگی ڈرامنگ ماسٹر کی پرکار یا پلاری کی جیب کی مانند ہو گئی ہے۔ میں تو گویا سندباد جہازی ہو گیا ہوں۔ لیکن نہ مجھے سونے چاندی کی تلاش ہوتی ہے ورنہ میں ان کی تلاش میں اپنی بری حالت کو بدستور بدتر بناتا جاتا ہوں۔"

اس مضمون میں آگے چل کر اختر حسین نے ملک کی سماجی حالت کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا تھا:

"میرا جسم ہی بیمار نہیں، میری روح بھی بیمار ہے۔ یہ کچرے کا ڈھیر ہے جس میں تعلیم کی روشنی سے کیڑوں کی طرح اتنے انسان کلبلا رہے ہیں۔ ان کے بیچ میں میری روح مچھر کی طرح کبھی جلتی ہے کبھی بجھ جاتی ہے۔ میں یہاں سے بھاگ جانا چاہتا ہوں۔ لیکن دنیا میرے لئے یا تو بہت تنگ ہے یا اتنی بڑی کہ اس کی کشمکش میں گھن کی طرح میں پسا جا رہا ہوں۔ کچھ دنوں سے پھر دل کی دھڑکن شروع ہو گئی ہے۔ کل پڑھتے پڑھتے یک دم میرے ہاتھ تھرانے لگے، دل پنکھے کی طرح گھومنے لگا۔ کان بھائیں بھائیں کرنے لگے، چہرہ خون کے دباؤ کی تیزی سے سرخ ہو گیا۔ میں نے سانس روک لیا کہ کہیں اس دھڑکن میں رک ہی نہ جائے۔ ایسا دورہ کبھی نہ پڑا تھا۔ پھر رد عمل سے ہاتھ پاؤں نڈھال ہو گئے۔ اندھیرا اور سناٹا۔"

اختر حسین ایک ضروری کام سے باہر چلے گئے تھے۔ میرے ہاتھ میں ان کا مضمون تھا۔ انھوں نے لکھا تھا:

"کیا انسان روٹی کمانے اور کھانے والے حیوان کے سوا کچھ نہیں؟ کیا یہی زندگی کا مفہوم اور اختتام ہے، کیا یہی اس لفظ کا آخری مفہوم ہے؟ اگر کام کرنے اور چلنے میں کوئی فرق نہیں تو میں ہرگز کام نہ کروں [illegible] بندوں کے پیچھے اور ہوا کی چیخ پکار کو سنتے ہوئے بنا لے مجھے

جا رہی ہیں [illegible] زندگی کی ضرورت نہیں تو ہم [illegible] ہے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

خوب پہچانتے ہیں۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کیوں ہوتی ہے اور [illegible]

[illegible] نے کہا۔ آپ کا مطلب یہ ہے [illegible] کسانوں اور مزدوروں کے لئے [illegible] بے معنی ہے؟

آپ نے میرا [illegible] کسانوں اور مزدوروں کو تو ہمیں یہ بتلانا ہے کہ [illegible] ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد بات کا رُخ بدل کر [illegible] اپنی زندگی بسر کرنے کا سبب بنانا چاہتے ہیں۔ میں نے ہنس کر کہا۔ پھر مجھے بھی بتائیے نا!

آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ انھوں نے ہنس کر کہا۔ آپ کو ہی [illegible] ضرور عرض کروں گا کہ لوک گیتوں [illegible] کی آواز سننے تک ہی اپنی پوری طاقت نہ لگا دیجئے۔ میرا مطلب ہے [illegible] قدم [illegible] رکھئے۔ اور میرا تو خیال ہے کہ آپ کا کام اسی صورت میں مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

نہیں آپ یہ تو نہیں سمجھتے کہ میں خواہ مخواہ مارا مارا پھرتا ہوں ان گیتوں کی تلاش میں۔

ان لوک گیتوں کے سامنے تو میرا سر جھک جاتا ہے۔ اور جو شخص مختلف زبانوں کے لوک گیتوں کو ایک ساتھ ہمارے سامنے لاتا ہے اور ہمیں اپنے ملک کے تمدن کی رنگا رنگی کے باوجود اپنے تمدن کی ہم آہنگی سے روشناس کراتا ہے اس کا ہمیں ممنون ہونا ہوگا۔

اس ذرہ نوازی کے لیے شکریہ ادا کر کے میں چلا آیا۔

اس کے بعد کلکتے میں اختر حسین سے ملاقات نہ ہو سکی۔ مجھے یہ پتہ چلتے دیر نہ لگی کہ اختر صاحب نے وشو بھارتی کی نوکری چھوڑ دی اور مزید تعلیم کے سلسلے میں علی گڑھ یونیورسٹی میں چلے گئے۔

میں بھی کلکتے سے کشمیر جا پہنچا۔ اور کشمیر میں تین مہینے گزارنے کے بعد میں نے پشتو لوک گیتوں کے سلسلے میں پشاور کا رخ کیا۔ اس بیچ میں اختر حسین کی کوئی خبر نہ ملی۔ جب بھی کبھی کوئی "کلاس اسٹرگل" کے موضوع والا گیت ملتا، اختر صاحب کی یاد ہو آتی۔ آخر میں نے "وشال بھارت" کے اسسٹنٹ ایڈیٹر برج موہن ورما کو خط لکھ کر اختر صاحب کے بارے میں پوچھ تاچھ کی تو ورما جی نے مجھے اس خط کی کچھ سطریں لکھ بھیجیں جو اختر صاحب نے علی گڑھ سے ۱۵ فروری ۱۹۳۳ء کو لکھا تھا: "پچھلے چار مہینے کیسے بیتے، اس کا حال سنئے۔ اکتوبر میں علی گڑھ یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر نے کہا کہ آپ خوشی سے بوریا بستر اٹھا لیجئے گا۔ تو نکالے جائیے گا۔ اچھا یہی سمجھا گیا کہ ابھی اخباروں کی بیہودہ پبلسٹی سے بچا جائے۔ کانگریس کا میلہ لگنے والا تھا۔ ہم بھی خود اپنے گشتی نامہ نگار بنے وہاں جا پہنچے۔ اگر حضرت دل ...... ہائے ورما جی! اس دل نے کہیں کا نہ رکھا! مصیبت کسی پہ آتی نہیں یعنی بلایا کرتا ہے۔ بس صاحب ہم ان دنوں قریب قریب ایسے ہو چلے تھے کہ ڈاکٹر انصاری تک پہنچ ہوئی۔ نسخہ تو مگر اس نے ایک [illegible] مہینے جب یہ پڑے رہے۔ ہمہ وقت بستر۔ ایکسرے ہوا۔ انجکشن دئیے گئے ہیں۔ رگ سے شاید بہت دنوں کے لئے چھٹی ہو۔"

ورما جی کے خط سے مجھے یہ بھی پتہ چل گیا کہ علی گڑھ یونیورسٹی سے نکالے جانے کے بعد اختر حسین کچھ دن دلی میں فاقہ مستی میں گزارنے پڑے، اور پھر اسی پریشانی میں وہ لاہور جا پہنچے۔ لاہور سے انہوں نے ورما جی کو خط لکھا:

پیارے ورما جی!

آپ لوگوں کو یاد ہو گا کہ شانتی نکیتن میں اختر نامی ایک آوارہ کبھی رہتا تھا۔ اب وہ پٹواری کی جریب کی مانند زمین ناپتا لاہور چلا آیا ہے۔ علی گڑھ، بمبئی، دلّی ...... کہیں بھی اُسے آرام نہ ملا۔ اس بیچ میں برابر بیمار رہا۔ رہا تنگ آکر ہندی سے ناطہ توڑ لیا ہے۔ ان دنوں "اردو" اور انگا باد کا کچھ کام کرنے لگا ہے۔ شاید روٹیوں کا کچھ سامان ہو جائے۔ کہیں مول چند جی ہیں یا بنارسی داس جی پوچھیں تو میری طرف سے کرپیا شعر سنا دیجئے حالانکہ دونوں مہانو بھاووں کو حسن یا عشق سے کوئی واسطہ نہیں۔

کیا کہوں نے سمجھ ہے کیا عشق نے جانا ہے
ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے

اگر آپ اب بھی میرا دل اتنا سمجھتے ہیں کہ وشال بھارت مفت بھیج دیا کریں تو امیر منزل علی گڑھ کا پتہ بدل کر لاہور کا پتہ کر دیجئے۔ بہت دنوں تک یہیں رہنے کا ارادہ ہے۔

اُمید ہے آپ سب لوگ خیریت سے ہوں گے۔ جو یاد کرتے ہوں انکو دھنیہ باد، جو بھول گئے ہوں انکا بھی شکریہ۔

آپ کا

اختر حسین رائے پوری

اس کے بعد ایک عرصے تک کسی دوست کے خط سے بھی اختر حسین کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ وہ مستقل طور سے انجمن ترقی اردو کے بلاوے پر حیدرآباد چلے گئے ہیں۔ ادھر میری لمبی مسافرت قائم رہی۔ مئی ۱۹۳۶ء میں جب میں کلکتے میں تھا اور جنوبی ہند اور لنکا کی جاترا میرے پیش نظر تھی میں چاہتا تھا کہ حیدرآباد جا کر اختر حسین سے بھی ملاقات کروں گا۔ لیکن جب مجھے پتہ چلا کہ اختر حسین تو نظام سرکار کا وظیفہ لے کر پیرس چلے گئے ہیں۔ اور اب وہاں سے ڈی لٹ لیکر ہی واپس آئیں گے تو جہاں مجھے ایک گونہ خوشی ہوئی وہاں یہ سوچ کر افسوس بھی ہوا کہ اب نہ جانے کب اپنے اس دوست سے ملاقات ہوگی جس نے مجھے [illegible] "کلاس اسٹرگل" کے نقطہ نظر سے لوک گیتوں کے پس منظر کو سمجھنے

[illegible] صاحب کے [illegible] تھا۔
[illegible]
[illegible] مجھے یہ سوچ کر بڑی خوشی ہوئی [illegible] دوست [illegible]
[illegible] اختر حسین [illegible]

[illegible] اختر [illegible] افسانہ [illegible] مجھے [illegible]
[illegible] مجھے [illegible]
[illegible] خوش ہوتے تھے [illegible] سمجھتے تھے [illegible] موجود
[illegible]

[illegible] مجھے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible] اس کالج کا [illegible]
[illegible]
[illegible] کلاس کی [illegible] سنتا تھا [illegible]
[illegible] اس کی [illegible]

[illegible] مختلف حالات [illegible]
[illegible] درخواست کرتا۔ بیگم اختر حسین تو حیران نہیں [illegible] کیسی بھی [illegible] باتیں کرنے لگتے ہیں۔ [illegible]
[illegible] ایک [illegible] ڈرائینگ روم میں بیٹھا ہوا ایک [illegible] اپنے [illegible] سے [illegible]
[illegible] بیگم اختر حسین [illegible] اختر صاحب نے بیگم اختر کو مرعوب کرنے کیلئے بتایا کہ جو شخص آج ان کے [illegible] مہمان کے طور پر موجود ہے اس نے
اپنے پیروں سے ہندوستان کی دھرتی ناپ رکھی ہے اور بھی بہت سے [illegible] وہ ایک [illegible] پر چھوڑ دیا۔ اپنی تعریف سن کر مجھے [illegible] خوشی
نہ ہوئی۔ اگرچہ میں بہت پھٹے حال تو نہ تھا۔ لیکن اپنے آسودہ حال دوست کے سجے سجائے ڈرائینگ روم میں مجھے اپنا لباس واقعی بہت بدزیب اور
میلا نظر آنے لگا۔ کبھی میں اپنے دوست کی طرف دیکھتا اور کبھی اپنی طرف۔ کلاس [illegible] شدت سے میرے سامنے آ جاتا اگر چہ کبھی
تھی۔ بار بار میرے ذہن میں یہ سوال اٹھ رہا تھا کہ کیا اختر صاحب اور میں ایک ہی کلاس سے تعلق رکھتے ہیں۔ اپنے دوست سے یہ سوال پوچھنے کی ترغیب
نہ ہوئی کیونکہ وہ تو بہت دیر سے گورکی کی آپ بیتی کی تعریف کئے جا رہا تھا۔ جس کا ترجمہ اس نے بڑی خوبی سے اردو ادب کی نذر کیا تھا۔ میرے
دوست کی بات میں ایک طرح کا رئیسانہ تپاک موجود تھا۔ لیکن جب بھی میری نظر اپنے لباس کی طرف جاتی جب بھی مجھے اپنی بے آسودگی کا خیال آتا مجھے
یہ محسوس ہونے لگتا کہ اختر صاحب تو وضعداری میں آج بہت کمال کر رہے ہیں۔ اس وضعداری میں اگر کسی چیز کی کمی کھٹک رہی تھی تو وہ تھی اپنائیت کی

کی معلوم ہوتا تھا کہ ان سوالوں کا تعلق یہیں کا گھر ہے۔ وہاں اگر ایسے ہی کسی گھر میں اپنی دنیا آباد کرنے کو ترسی ہیں تو ان کی چھپی دیکھ سکتے۔

"یہ حضرت نوکری سے کر رسولی [illegible] گئے ہیں۔" شام کی چائے پر اختر صاحب نے بیگم اختر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ بار ہا مجھے ملنے کا موقع ملا مجھ سے تو کسی کسی کی نوکری نہیں ہوتی۔ [illegible] تصورات۔ [illegible] بھی حیات کا واضح مقصد ہے ان کے سامنے۔ یہ واضح مقصد سامنے نہ ہوتا تو کوئی یہ شخص تھا کہ رسول سے ملک [illegible] میں ایک جیسی [illegible] پھر تا۔ گزرنے کی طرح ہی ان کی زندگی بھی سرگرداں [illegible] ہے۔ ان کے حشا ہدے اور تجربے کی بھی ہم داد دے سکتے ہیں [illegible] دوست کو جو لکھتے مجھے ان کے مضامین میں نظر آتے ہیں ان سے [illegible] کو سرگرداں ہیں۔ [illegible] دل [illegible]

[illegible] دیکھئے [illegible] ایک دوست کی۔ ان سے کوئی بھی ایسی تعریف ملو کیسے برداشت کی جا سکتی ہے۔ اس شام میں نے اپنا ایک غیر مطبوعہ افسانہ [illegible] تو انہیں پڑھ کر سنایا جس سے انہیں تنہائی کے [illegible] ایک [illegible] میں سے چار پیسے تھا [illegible] افسانہ لکھنے [illegible] ایک افسانہ "[illegible]" جو میری اپنی زندگی سے متعلق تھا [illegible] پسند تھا [illegible] میں نے دونوں افسانے ایک ساتھ پڑھ کر سنا ڈالے تھے۔ میری حیرت کی حد نہ رہی جب انھوں نے مجھے [illegible] سے افسانے سے کہا۔ بڑھیا افسانہ ہے لیکن اس سے بھی زیادہ حیرت مجھے اس وقت ہوئی جب انھوں نے مجھے [illegible] میں [illegible] سید صاحب کی [illegible] کا ذکر کر رہے تھے۔ ہوں۔ میں نے عرض کیا شاید آپ نے [illegible] کا مطلب [illegible] کے ساتھ [illegible]

"یہ تو خیر اپنی اپنی پسند کی بات ہے۔ وہ [illegible] لیکن میں تو محض اتنی عرض کرنا چاہتا تھا کہ کہیں آپ لوگ کہیں کے کام بالکل [illegible] نہ رہ جائیں۔"

میں نے عرض کیا [illegible] آپ عجیب فرما رہے ہیں۔ مجھے اپنے [illegible] سے زیادہ [illegible] جو بات [illegible] کی [illegible] دوں ایک اور دوست نے [illegible] دنیا سے کوچ کر جاؤں گا اور خدا کے دربار میں مجھے آواز [illegible] کی افسانوں والا [illegible] مجھے آواز دی جائے گی۔

خیر اس وقت تو [illegible] آئی گئی ہو گئی اور میں [illegible] یہ کچھ عجیب بات ہوئی [illegible] میرا جی [illegible] ہو گیا۔ [illegible] کہ مجھے [illegible] پہلا افسانہ شائع ہو جائے اور پھر دوسرا افسانہ لکھا جائے [illegible] نیز [illegible] افسانوں کے نیچے دبا [illegible]

ایک دن دلی سے اختر صاحب کا خط آیا کہ وہ جہاں [illegible] کے نام سے ایک ماہنامہ شائع کر رہے ہیں۔ انہیں فوراً اور [illegible] بھیج دوں۔ چنانچہ وہ [illegible] میں نے انہیں بھیج دیا لیکن بدقسمتی سے نہ وہ یہ ماہنامہ شروع کر سکے اور نہ یہ افسانہ ہی واپس کر سکے۔ میں نے کئی بار لکھا بھی انھوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے سمجھ لیا کہ ہمارے ڈاکٹر اختر حسین صاحب بھی اور بہت سے دوستوں کی طرح بڑے آدمی بن گئے ہیں وہ کلاس [illegible] والی تھیوری بھول گئے ہیں۔ خیریت ہوئی کہ میرے پاس میرے اس افسانہ کی ایک نقل موجود تھی۔ ایک مدت کے بعد وہ افسانہ کہیں جا کر ادب لطیف میں شائع ہوا۔ میرا دوسرا افسانہ بھی لکھے جانے کے اتنی دیر بعد شائع نہیں ہوا تھا۔ جب یہ افسانہ شائع ہوا تو میں نے ادب لطیف کے اس شمارے کی ایک کاپی خط کے ساتھ اختر حسین صاحب کو بھی بھجوائی۔ انھوں نے اب کے بھی کچھ جواب نہ دیا۔ میں نے سوچا میں نے ایک دوست کھو دیا لیکن میں نے بھی ناراض نہ ہونے کا قصد کر لیا تھا۔

چار پانچ سال کے بعد [illegible] جب میں لاہور سے دلی چلا آیا تو میں نے دیکھا کہ اختر صاحب ہند سرکار کی ایجوکیشن منسٹری میں ڈپٹی سیکرٹری

[illegible] پاکستان [illegible] ہے۔

[illegible]

[illegible] آپ [illegible]

آپ تو افسانہ لکھتے جا رہے ہیں!

[illegible]

[illegible] آپ کو یاد ہے؟

[illegible] شخصیت [illegible]

[illegible] شخصیت [illegible]

[illegible]

جب ملک کی تقسیم کا معاملہ [illegible] لیکن میری [illegible] صدمہ ہی جب مجھے معلوم ہوا کہ انہوں نے پاکستان میں جا کر رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ خیر اس میں تو ہم بول ہی کیا سکتے تھے۔ یہ ان کا اپنا انتخاب تھا، ان کا اپنا فیصلہ تھا۔

ملک کی تقسیم عمل میں آئی تو اختر حسین بھی ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے۔ میں نے سمجھ لیا کہ اب شاید ان سے ملاقات کبھی نصیب نہیں ہوگی۔ اختر حسین کے پاکستان چلے جانے پر مجھے حیرت نہ ہوئی کیونکہ وہ اس پار رہ کر بھی لکھنے کی رفتار تیز کر سکتے تھے۔ لیکن اس کا تمام تر دکھ اس بات کا ہے۔ پاکستان میں شائع ہونے والے رسائل میں اختر حسین کا بھولے سے کہیں نام آ جائے اس کے لئے میں ہمیشہ ترس گیا۔ بار بار نقوش کے ہر شمارے میں اپنے دوست کا چہرہ اور اس کی تازہ ترین تحریر کا کوئی نہ کوئی ٹکڑا ڈھونڈنے کا جتن کیا۔ لیکن جب کہیں اختر حسین کا ذکر تک نہ ملا تو شدید مایوسی ہوئی کہ اب اختر حسین نے لکھنے کی طرف سے بددل ہو کر ہاتھ اٹھا لیا ہے یا سوچ بیٹھا ہے کہ وہ پھر سے کبھی اشعار لکھنے لگیں گے۔ کئی بار دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ انہوں نے لکھنا کیوں چھوڑ دیا۔ لیکن لاکھ سوچنے پر بھی اس کا جواب نہ مل سکا۔

کئی سال کا عرصہ بیت گیا۔ اتنا ضرور پتہ چلتا رہا کہ اختر صاحب پاکستان کی پبلیکیشنز منسٹری میں کام کر رہے ہیں لیکن نہ کبھی میں انہیں خط لکھ سکا۔ نہ کبھی ان کا خط آیا۔ میں انہیں یہ بھی نہ بتا سکا کہ میں بھی ادھر کئی برسوں سے ہندوستان کی پبلیکیشنز ڈویژن میں ہندی "آج کل" کی ادارت کے فرائض سرانجام دے رہا ہوں اور میں قریب قریب قلم سے کام لے رہا ہوں۔

۲۲ ستمبر ۱۹۵۵ء کی بات ہے۔ میں اپنے دفتر کے کمرے میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ اچانک میری نگاہیں اٹھیں تو دیکھا کہ زینے سے ایک شخص میرے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ شخص میری طرف بڑھا آ رہا تھا۔ جانی پہچانی صورت دیکھ کر میں کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس شخص کی طرف بڑھا۔ ہم بغلگیر ہو گئے۔ یہ اختر حسین ہی تو تھے۔

"کب تشریف لائے اختر صاحب!" میں نے جھٹ سے پوچھ لیا۔

"صبح پہنچا ہوں۔ آپ سے زیادہ دیر نہیں رک سکتا۔ شام کو انڈیا کافی ہاؤس میں آ جائیے گا۔"

"ابھی بھی کیا جلدی ہے؟" میں نے کہا۔

"بس ذرا اختر صاحب سے ملنے آیا تھا۔" انہوں نے کھڑے کھڑے جواب دیا۔ "سوچا آپ کو اپنے آنے کی اطلاع کرتا چلوں۔ شام کو کافی ہاؤس میں زیدی بھی آئے گا۔ آپ بھی آ جائیے گا۔"

وہ جس طرح آئے تھے اسی طرح جلدی جلدی چلے گئے۔ مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہی اختر حسین تھے۔

شام کو نئی دہلی کے انڈیا کافی ہاؤس کی بالکنی میں پہنچا تو اختر حسین اور شمشیر سنگھ نرولا پہلے سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ نئی پرانی بہت سی باتیں ہوئیں۔ اختر صاحب کے چہرے پر بار بار وہی رنگ جھلک اٹھتا تھا جو ہم ان کے چہرے پر آج سے برسوں پہلے دیکھا کرتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے اپنے اندر شباب کا رنگ ابھی تک بچا رکھا ہے۔ آواز میں وہی نکھار۔ آنکھوں میں وہی تبسم۔ چہرے پر وہی دلہن کی سی لاج کا احساس۔ لیکن ان کی باتوں میں بڑی گہرائی آ گئی تھی۔

اتفاق سے بالکونی کے ایک کونے میں مجھے اپنا ایک دوست نظر آ گیا۔ میں نے اسے پاس بلا کر اختر صاحب سے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "یہ بھی آپ کے مداحوں میں سے ہیں۔"

"بہت خوب!" اختر صاحب نے قہقہہ لگایا۔

"میرے دوست نے اپنی بغل سے ایک کتاب نکال کر اختر صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اس پر اپنا آٹوگراف ہی دے دیجئے۔"

یہ "پیام شباب" کی جلد تھی جسے اتفاق سے میرا دوست اسی روز بازار سے خرید کر لایا تھا۔ اختر حسین نے "پیام شباب" پر چند الفاظ لکھ دئیے۔ کافی آئی تو اختر صاحب دیر تک گرم کافی کی تعریف کرتے رہے۔ جیسے ان میں بھی قاضی نذر الاسلام کی کسی بنگالی نظم کا والہانہ پن کھلا ہوا ہو۔ "پیام شباب" میں نذر الاسلام کی شاعری آپ کو کیسی لگی؟" انہوں نے میرے دوست سے جھٹ سے پوچھ لیا۔ اس کے جواب میں میرا دوست صرف مسکرا کر رہ گیا۔

[illegible]

[illegible] ملا۔

آخر [illegible] آپ [illegible]

بہت خوب [illegible] آپ [illegible]

[illegible]

[illegible]

لیکن [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اختر [illegible] واپس چلے گئے [illegible]

دیکھئے کر [illegible]

یاد ہے ایک [illegible] نقوش کا افسانہ نمبر [illegible] ۱۹۵۲ [illegible] ایک [illegible]

[illegible] ——— [illegible]

[illegible] روایت اور [illegible] سعادت حسن منٹو [illegible]

[illegible]

[illegible] ایک [illegible]

حمید [illegible] پر [illegible] ؟

وقار عظیم: [illegible] دوسرے [illegible] تعلق رکھتے ہیں۔

عبادت بریلوی: [illegible] ان کے [illegible] مغربی افسانوں سے [illegible] ———

[illegible] سے زیادہ [illegible] انہوں نے اپنے [illegible] ایک [illegible] لیکن یہ کوئی [illegible] بات نہیں [illegible]

[illegible] انہوں نے [illegible]

پچھلے دنوں سہیل عظیم آبادی سے ملاقات ہوئی تو پتہ چلا کہ [illegible]

[illegible] پاکستان واپس چلے گئے۔ حالانکہ [illegible] دوستوں سے [illegible] لیکن ان کے [illegible]

وقت کم تھا۔ اور انہیں ڈھونڈنا ناممکن تھا

اگر ان سے ملاقات ہو جاتی تو میں ان سے یہی عرض کرتا کہ [illegible] نقوش میں آپ کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اس سے میں [illegible]

نہیں ہوں۔ میں ان سے کہتا کہ آپ نے ہمارے ادب کی بہت خدمت کی ہے۔ لیکن پھر سے اپنا [illegible]

ساتھ [illegible] حالات [illegible] مت کیجئے۔ اپنے جوہر قابل کو عوامی ادب کی تعمیر میں لگائیے۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر کہیں مجھے [illegible]

[illegible] بات کو کاٹنا چاہا تو میں صاف صاف کہہ دوں گا [illegible] ادیب [illegible] صاحب [illegible]

اختر اورینوی

شکیلہ اختر

[illegible]

[illegible] ایک سا [illegible] سے خوبصورت [illegible] ایک دو ماں کو
بات [illegible] پھر تو میری شامت ہی آگئی۔ خود تو ان میں صحت بھی نہیں [illegible] شاہ [illegible] کا [illegible] الاس کے
[illegible] ایک [illegible] بہت پسند ہے۔ [illegible]
[illegible] میں بیٹھے [illegible] تصویر کھنچوا کے [illegible] نہیں تھی [illegible] پہنچا [illegible] بہت [illegible]
[illegible] ہوگئی تھی [illegible] نہیں [illegible]
آخر [illegible] حرکت سے بہت [illegible] نکا [illegible] دیکھا [illegible]
[illegible] تھی اور [illegible] سے خاموش [illegible]
[illegible] صحت
[illegible] ان [illegible]
[illegible] میرے [illegible]
[illegible] والی
چھت [illegible] لوگوں نے [illegible] بیٹھے [illegible]
[illegible] محروم [illegible] تھی [illegible] نہیں [illegible] قسمت
[illegible] کے بعد [illegible] بیگم [illegible]
[illegible] تھے [illegible] سارے لوگ
[illegible] کمرے کے فرش پر [illegible] بیٹھے تھے [illegible]
[illegible] پہلا موقع تھا [illegible] کو معافی
[illegible] کے خلاف [illegible] مقصد [illegible]

ان دنوں [illegible] سب سے بڑی [illegible] کا احساس [illegible]
[illegible] ایسی حساس [illegible] سے [illegible] جیسے [illegible]
[illegible] آپ [illegible] شکیل جیسے [illegible]
[illegible] بھائی [illegible] سے [illegible] ان کی طرف [illegible] ان کے پیچھے ہو [illegible]
[illegible] خاندان میں ہونے لگے تھے [illegible] حیرت سے تکتی ہوئی رہ گئی [illegible]
جلتے ہوئے لیمپ کی روشنی سیدھی ان کے چہرے پر پڑ رہی تھی اور عینک سے ڈھکی ہوئی ان کی بڑی بڑی [illegible] آنکھوں میں [illegible]
میں ایک شعر سناؤں [illegible] کے معنی بتاؤ۔ دائیں طرف کو ذرا سے جھکتے ہوئے ان کے گداز لبوں پر ایک تھرتھراہٹ سی آئی

[illegible] کے لئے ہے یہی معراج کمال
تیری غیبت میں بھی جانا تجھے دیکھا کرنا

اور اچانک ایک عجیب سی لطیف حقیقت بجلی کی طرح میرے دل و دماغ پر لہرائی اور اچانک میری نگاہیں آپ ہی آپ جھک گئیں شکیل جیسا دنیا بھر کی فکر
کرتے رہے اور میں رات بھر یہی سوچتی رہ گئی تھی کہ میری تین سال کی خاموش نگاہوں میں اتنی تاثیر کہاں سے بھر گئی تھی۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ ڈیرہ دون میں ان کی

طبیعت نہیں لگ رہی تھی بار بار [illegible] پر شٹل کاک کھیلنے کی وجہ سے وہ جلد ہی پٹنہ واپس آ گئے تھے میڈیکل کالج میں ان کا تعلیمی سلسلہ شروع ہو چکا تھا اچھے اسٹوڈنٹ کی حیثیت [illegible] کی تعلیم کو کسی طرح سے بھی مکمل کر لینا چاہ رہے تھے علاوہ اس طرف اچانک پھر ان کے منہ سے تھوڑا سا خون آگیا۔ اور پٹنے کے سب سے بڑے پروفیسر اور ڈاکٹر ڈی۔ این۔ نہرو جی نے مکمل طور پر آرام کرنے کے لئے انگوسرن کے کنارے جنگل تکیہ کوئی تھی [illegible] ایک بیمار کی حیثیت سے تبدیلی آب و ہوا کی خاطر ہمارے یہاں دریائے سترون کے کنارے کچھ مہینے گزارنے کو آ گئے تھے ان کے برتن علیحدہ کر دئے گئے پانی پینے کا گلاس تک الگ تھا اور ان کے گھر والوں نے بڑی تاکید سے اس بات پر زور دیا تھا کہ ان کو آؤٹ ہاؤس کے ایک کمرے میں الگ تھلگ رکھا جائے۔ مہمان کے کھانے پینے کی چیزیں دوسروں سے بالکل علیحدہ رکھی جائیں۔ ٹی۔ بی کا کیڑا ابھی تک نکلا تو نہیں تھا مگر پھر بھی احتیاط رکھنا ضروری ہے مولی خدا بچائے سب نے غلیل۔ ان کے اپنے بچے کو اتنا عزیز لڑکا جو مدتوں کے انتظار کے بعد اتنے لاڈ و پیار پر دنیا میں آیا تھا۔ اور آج جو ان کی خوش قسمتی سے ان کے گھر کا مہمان ہوا تھا تو وہ "پام ولا" کی اتنی بڑی شاندار کوٹھی کو چھوڑ کر ان کو آؤٹ ہاؤس میں جگہ دیں گی؟ امی جان کا چہرہ بھی بڑا افسردہ تھا انہوں نے بچپن میں کتنے پیار سے ان کو اپنی گود میں کھلایا تھا اور آج جب موت کا سایہ ان کے سر پر منڈلا رہا تھا ہم سب محسوس ہو رہا تھا کہ لوگ کس طرح سے ان بیچارے کو ان کو تنہا چھوڑنا چاہتے تھے "نہیں جی نہیں ہوگا۔ اب جو بھی ہو ہم تو ایک ہی ساتھ رہ کر گزاریں گے۔" اماں ابا جان سب اس فیصلے پر بے حد خوش تھیں۔ یہ سنہ کی شروعات جنوری کی تھی۔ آموں کے باغ شیشم، نیم اور تاڑوں کے جھنڈ اپنی ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں میں ان کے نئے زندگی کا پیغام دیتے رہے۔ ہر لمحہ کے رنگ بدلتے پھولوں سے بھرے ہوئے۔ پیڑوں کے اونچے اونچے سنہرے ٹیلوں میں اب ان کے نغموں کی گنگناہٹ کا پتہ نہ تھی اور سترون کے ساحل پر گھنٹوں اکیلے بیٹھے ہوئے تصویریں رنگ بھرتے رہتے یا بڑی اچھی اچھی نظمیں لکھتے رہا کرتے تھے۔ اور چاندنی راتوں میں "پام ولا" کے سامنے نہر کے کنارے چپ چاپ بیٹھے ہوئے شیشم کے پیڑوں سے چھن چھن کر چھلکتی ہوئی بے قرار چاندنی کو دیکھتے ہوئے اپنی تازہ کہی ہوئی نظموں کو گنگنایا کرتے تھے انہی دنوں کی کہی ہوئی نظم کا ایک ٹکڑا یہ بھی تھا۔

دامن ابھی کھلی بھی نہ تھی جو بادِ خزاں نے آ لیا

نغمے نکل رہے تھے کہ سازِ مرا بگڑ گیا

خندہ ابھی تھا زیرِ لب آنسو کا ابر چھا گیا

اپنی خوشی کا آفتاب وقتِ سحر غروب تھا

اندول کی شاداب فضاؤں، ہرے بھرے باغوں اور لہلہاتے ہوئے دھان کے کھیتوں میں جہاں وہ حیات نو پا رہے تھے۔ تو اسی جگہ میں وہ ایک بڑے ادیب شاعر اور نقاد بھی بن رہے تھے۔ ان دنوں نیاز فتحپوری کا بڑا گہرا اثر ان پر چھایا ہوا تھا، بڑے بڑے الفاظ اور رنگین استعاروں کے ساتھ انہوں نے پہلی بار اندول ہی میں افسانے لکھنے شروع کئے تھے۔ جن میں سے کچھ تو "بہارستان" پٹنہ میں چھپتے رہے تھے، اور انہی دنوں ان کا ایک افسانہ "نیا شوالہ" "نگار" میں پہلی بار چھپ کر بہت مقبول بھی ہوا تھا۔ ان دنوں ان کی عمر بیس سال کی تھی۔ وہ اندول آ کر اپنی بیماری کو اس حد تک بھول چکے تھے کہ گھنٹوں سترون میں تیرتے رہتے اور اونچے ریت کے ٹیلوں پر لمبے لمبے قدموں کے ساتھ گھومتے رہتے اور نہر میں دیر دیر تک کشتی رانی کرتے رہتے تھے۔ اور جب اتنے کاموں کے بعد بھی وقت بچ جاتا تو "پام ولا" کے ہرے بھرے لان پر اوندھے منہ لیٹ کر وہ فطری مناظر کی تصویریں بناتے رہتے اور اس کے بعد پھر کچھ کو ہاکی بھی پڑھایا کرتے تھے۔ صحیح معنوں میں انکو اتنا بڑا ادیب اور شاعر اندول ہی نے بنایا ہے، وہ اپنے دل و دماغ میں ادب کا بیج لے کر تو ضرور آئے تھے مگر سترون کے ساحل پر ہی ان بیجوں میں سے کونپلیں پھوٹی تھیں اور ہرے بھرے پتے لگنے لگے تھے۔ چھ فٹ کا اونچا قد، دبلا جسم، لمبی گردن اور سیاہ بیک برش کئے ہوئے سیدھے سیدھے بال، وہ سارے لوگوں میں نمایاں طور پر نظر آ جاتے اور لمبے لمبے قدموں والی چال سے وہ دوری سے پہچان لئے جاتے تھے۔ نوجوانی کی چمک، روشنی اور زندہ دلی کے بعد بھی جب تک ان کے چہرے پر مسکراہٹ ہوتی دل کھول کر باتیں کرنے کو جی چاہتا اور جہاں

[illegible] کی آمد" میں ان سے زیادہ ملنے جلنے کا موقع ملا۔ میں نے ہمیشہ [illegible] ایک ترغیب دی [illegible]
[illegible] کو ہمیشہ لکھنے [illegible] ادب اور اردو زبان کا [illegible] نصف صدی کا [illegible]
[illegible] خیالات کا [illegible] دونوں اپنے اپنے وقت پر بیٹھے ہوتے تھے [illegible] کے [illegible] ہمیشہ [illegible]
اور صحت [illegible] خواتین نے زیادہ تر ادب [illegible] ـــــ دوسرے سال [illegible] کا انتقال ہو گیا تھا۔ ہم
سارے لوگ ایک ہی ساتھ [illegible] آ گئے تھے وہی گھر [illegible] ان کا [illegible] عام [illegible] کی جستجو بھی
[illegible] بیماری اور کاشتکاری [illegible] سب کی سب ایک ساتھ تھی [illegible] دونوں اختر صاحب کھل [illegible] پائے
[illegible] گئے تھے ان [illegible] کھیت کی [illegible] دیکھے [illegible] صفحات [illegible] سے [illegible] پر
وہ سلسلہ [illegible] آرام سے بیٹھے ہوئے [illegible] لکھنے [illegible] ان کا پتہ نہیں چلتا تھا [illegible] نے [illegible]
مجھے انھوں نے دوسرا کمرہ بھی لیا تھا اور [illegible] کی شام [illegible] جب [illegible] سامنے [illegible] پہلے [illegible] سے نکلتے اور ٹہلتے ہوئے
میں گزرتے ہوئے [illegible] کی گھنٹیاں بجنے لگیں تب ٹھیک اسی وقت [illegible] بھاری بھاری [illegible] سامنے سے [illegible]
گرتے ہوئے [illegible] تھے [illegible] دھان کی سنہری [illegible] ادھر ادھر بکھری ہوتی [illegible] ان نگاہوں سے دیکھتی ہوئی سوچتی رہ جاتی
کہ وہ [illegible] شعر و ادب کی تفسیر بیان کرنے والا انسان کہاں چلا گیا!

اب ان کی صحت ہر طرح سے اطمینان بخش تھی۔ چند مہینوں کی کاشتکاری کے بعد جولائی سے کالج کھلنے والا تھا [illegible] کالج میں جانے کے لیے
انھوں نے بڑی کوشش کی مگر [illegible] صاحب نے بڑی سختی سے روک دیا [illegible] کے بعد انھوں نے [illegible] کالج میں [illegible]
[illegible] تھی۔ اختر صاحب پٹنہ جا چکے تھے مگر جیسے ہی چھٹیاں [illegible] جب [illegible] آتے [illegible] زندگی کی [illegible]
اتنے ہی دنوں میں [illegible] انھوں نے [illegible] کی تیز [illegible] ادب [illegible] زندگی کا مقصد بنا لیا تھا۔ کبھی کبھی وہ بڑی حسرت
سے کہا کرتے کہ میں نے صرف غریبوں کی خدمت کے لیے ڈاکٹری پڑھنا چاہا تھا مگر اب مجھے [illegible] ہوتا ہے کہ میں ادب [illegible] ہی کے لیے پیدا
کیا گیا تھا۔ [illegible] کیٹس [illegible] کی نظمیں [illegible] سمجھتے [illegible] غالب [illegible] اقبال سے ان کا موازنہ کرتے ہوئے
مجھ کو ان کی خصوصیات بتاتے اس وقت ان کے الفاظ اور خیالات کی روانی کو دیکھتے ہوئے مجھے ہمیشہ [illegible] سمندر [illegible] بہت [illegible]
ساحل سے ٹکرانے کو بے چین ہے [illegible] سمندر کے [illegible] ایک ایسی [illegible]
کسی سمندر کی [illegible] ایک دائرہ سا بنا کر تھوڑی دیر کے لیے اس میں ایک حسن پیدا کر دیتی ہیں [illegible] کیٹس سے محبت تھی۔ اس کی شاعری [illegible]
اپنے درد اور غم کی جھلک نظر آتی تھی اور [illegible] صاحب کو اس بات کا پورا یقین تھا کہ کیٹس ہی کی طرح ٹھیک [illegible] سال کی عمر تک وہ بھی اس دنیا [illegible] جائیں
گے کیٹس کا نام اور اس کی [illegible] شاعری ہی ان کے دل میں اپنے مرض کا [illegible] کرتی تھی ویسے اپنی بیماری کا احساس [illegible]
کرنے دیا کرتا تھا۔ انھیں دنوں میں میں نے بھی اپنے بچپن سے لکھنے پڑھنے کے شوق کو پورا کرنے کی کوشش شروع کر دی تھی اور اختر صاحب جس تیزی سے
[illegible] صحت یاب ہو رہے تھے اسی رفتار سے میں بھی چھوٹے چھوٹے انشائیہ لکھنے کی مشق کر رہی تھی۔ [illegible] ادب نواز [illegible] اور اس پر سے
ایک ادیب [illegible] کچھ روشنی [illegible] پڑ ہی جاتی ہے۔ میری اماں اور ابا جان کو اختر صاحب سے بے حد محبت تھی گھر کے اندر چھوٹے
چھوٹے بچے بڑے بوڑھے سب تھے مگر ایک دن بھی اس گھر میں یہ محسوس نہیں کیا گیا تھا کہ کوئی [illegible] مریض یہاں آیا ہے۔ ڈاکٹروں کا بھی خیال بہت کچھ بدل
گیا تھا اسی لیے [illegible] میں ۲۴ مئی کی لہکتی ہوئی تاریخ کو وہ میری زندگی میں آ گئے تھے۔ پٹنہ کالج گرمی کی چھٹیوں میں بند تھا اور ریتوں کے اونچے اونچے
ٹیلوں کی وجہ سے "پام ولا" کی [illegible] عمارت ایک لہکتا ہوا تنور بن کر رہ گئی تھی، سارا دن گرمی سے تڑپتے ہوئے گزرتا مگر سورج کے [illegible]

بات کا تکلیف دہ ہی لمحہ تنہا [illegible] ہوتا تھا۔

اختر صاحب نے انگلش [illegible] کے پڑھنے کی شان بڑی نرالی تھی انھوں نے جب سب کتابیں دیکھیں تو ایسی بھی تھیں جو انھیں صاف ازبر تھیں آر مائکنڈ شری بم کرکی جو پڑھتے تھے ان کو اپنے کالج میں انگلش لانگویج پروفیسر ان بہت پسند تھا۔ اکثر وہاں کے کچھوں کا نوٹ بھی کو سنایا کرتے تھے اس کی [illegible] سادگی کے سبب سے مداح تھے۔

اکثر ہم کو چھٹیوں سے پہلے تو بہرے مجھے بچا کا سا خاندہ "پام والا" میں آ گیا تھا۔ مجھے بار بار شہر کر کے "پام والا" کے قریب ہی اپنی کوٹھی خالی کر گئے تھے اچانک طور پر آ جانے والے دن بے حد حسین بڑے رنگین اور بہت ہی دلچسپ تھے ایک تو ہم بہنوں کی ہی خاصی تعداد تھی اس پر سے ایک ہی ساتھ مجھے ابا کی پانچ لڑکیاں آ گئی تھیں۔ دونوں سے طبیعت ملتی ہماری اور دوسری جن صفیہ کی ہم عمر دوسرا سے کچھ چھوٹی بس پھر تو "پام والا" میں جیسے پر لگ گئے تھے چہکتی چہکتی شرارتیں کی سوجھی اور اختر صاحب کی کوئی نظم سن جاتے اور ان کی تین تین شعر ان بیویں نعرہ ادرحسن ورسا اگا یا تھا ان کے ہر شعر پر عقیدت کے پھول چڑھائے جاتے تھے اور ہوش نہ ان جیسی مرحوم "تھے" وہی گریہ ان کی طرح ہم اختر صاحب کے ان مصرعوں پر لپک لپک اٹھتے تھے۔

مینہ وشاد ہے شباب کا عالم ہر ایک گام ہے ۔ ۔ ۔ سرو آزادی میں رقصاں ہے عزم بحر کا بحوم

شاعرہ شعر کے رنگین خیالوں کا ہجوم

اور اختر صاحب القصہ سی ٹینیوں میں ارادل ہو آئے نزیک دوست رجحان مند ہو گئے۔ دو ان بڑے یادگار دور پر گزر سے تیرہ ہم سب کی سب اختر صاحب کے گرد ایک گھیرا لگائے بیٹھی رہتیں کسی کے ہاتھ میں جگر مراد آبادی اور کسی کے ہاتھ میں دیوان غالب ہر طرف بس دیوان ہی دیوان نظر آتے تھے مومن کی تو عرق جھڑتی، غالب کا انداز بیان سمجھ میں آتا اور اقبال کے تاثر میں ماضی پر تبصرے ہوتے رہتے۔ اختر صاحب نے ایک خاص شاعرانہ ماحول پیدا کر کے ہمارے اندر کی امنگوں سے بھر دیا تھا، شاعری اور احساس شعریت سے ہم اتنے ہم آہنگ ہو گئے تھے کہ اچانک طور پر مسماۃ جمیلہ نے ایک ہی ساتھ شعر کہنا شروع کر دیا۔ اختر صاحب حیران رہ گئے۔ یہ سون کے میٹھے پانی ہی کے کرامات تھے جو ایک ساتھ ایسی لڑکیاں جذباتی شعر کہنے لگ گئی تھیں جو تعلیمی لحاظ سے بے حد کم وہ تھیں۔ "پام والا" پورے طور پر شعر و ادب کا گہوارہ بن کر رہ گیا تھا۔ آدھی آدھی رات تک بیت بازی ہوتی رہتی، مصرعہ طرح دیا جاتا شعر لکھے جاتے اور پھر مجلس مشاعرہ منعقد ہوتی۔ صدارت کی کرسی اختر صاحب کے لئے مخصوص تھی اور باری باری عائشہ شمیم، شکیلہ اختر، عزیزہ نگار، زہرہ، رؤف، نفیسہ، ماذرہ، نسیمہ، سونا اپنا اپنا کلام سنا کر داد و تحسین وصول کرتیں۔ اندر سبھا کی مجلس ہی رہتی اور اجرا اندر اپنی جگہ پر استقامت رہتے مکان میں ہر ہی رنگینیوں کے ساتھ ہی ساتھ [illegible] پابندی بھی تھی۔ اسلامی خصوصیات بیدہ شبے کی عالمانہ بحث میں روشنی ڈالا کرتے اور جمعہ کی نماز پڑھانے ہوئے بہت ہی شاندار خطبے دیا کرتے [illegible] لیکر میڈیکل کالج تک میں ان کی پڑھائی کا ایک اعلیٰ ریکارڈ تھا اور کوئی نہ کوئی وظیفہ ان کو ملتا ہی رہا تھا۔ میڈیکل کالج میں اسکالرشپ کے جتنے بھی [illegible] وہ علیحدہ سلسلے میں چندہ دے دیا کرتے تھے۔ پٹنہ یونیورسٹی میں میڈیکل کالج میں پڑھتے تھے اور رضیتیں کا کام سمجھا جاتا رہا ہے مگر اسی کالج کے ہوسٹل میں [illegible] اختر صاحب کے بستر پر بچھونے اس لئے چادر نہ بچھا تھی کہ انھوں نے اپنے ناشتے کے پیسوں کے ساتھ چادر کی قیمت بھی غریب لڑکوں کی فیس میں دے ڈالا تھی اور ان کی غیرت نے صبح کے ناشتے میں چنا چھلا چھلا کر کھانا زیادہ پسند کیا تھا مگر گھر والوں کو اس کی خبر تک نہ پہنچنے دی تھی۔ اسی طرح سے جب وہ اسول پہنچے تھے تو ہم لوگ ان کے بستر میں کسی نیچے کا توشک دیکھ کر حیران رہ گئے تھے بعد میں معلوم ہوا گھر میں ایک بزرگ ضعیفہ کے پاس توشک نہیں تھا اختر صاحب نے خود قینچی لے کر اپنے توشک کے دو ٹکڑے کر دئے اور وہ توشک اب ایسی صورت اختیار کر چکا تھا۔ ایک دن "پام والا" میں وہ سارا دن اپنے کوٹ کا گلا بند کئے ہوئے پھرتے رہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ باہر ایک چپراسی کے پاس کرتا نہیں تھا اختر صاحب نے اپنی قمیض اتار کر اس کو دے دی ہے اور اب اپنا کوٹ اس لئے پہنے پھر رہے ہیں کہ اس وقت کوئی دھلی ہوئی قمیض ان کے پاس نہیں تھی۔

اپنی طبیعت، مزاج اور آؤٹ لک کے لحاظ سے وہ بڑے عجیب و غریب انسان ہیں، ساری دنیا کا علم سمیٹ لینے کی تڑپ نے ان کو اچھا خاصا

… پابند ہو گیا ہے۔ جب بی۔ اے کرنے کے لئے پٹنہ کالج کے مسلم ہوسٹل میں بھیجے گئے تو … بھی گزر گئی تھی۔
… یہاں ان دنوں ایک گروپ اکٹھا ہو گیا تھا۔ شہلا کی ساری سہیلیاں انہی کے کمرے میں … سپرنٹنڈنٹ کی بے جا
… سخت پابندی تھی اسی لئے سٹیڈی … لڑکیاں … کالج کے … جیسے کالج
… سپرنٹنڈنٹ … ہو جاتی تو … کے … سے … ان کی حفاظت کے ساتھ
… جاتے … ان کے نام پر فاتحہ پڑھ کے ان کے … سے آخری … ہوتی تھی۔ …
… سے اطمینان سے گزر جاتے تھے جیسے ان کو کبھی … ستمبر …
تھا … سال کا امتحان … کے سامنے … تھے
… ایک … تھا کہ … ان کے منہ سے خون آنا شروع ہو گیا۔ … خون … عجیب … سے … تھا
… امتحان … ہوسٹل کے … سے … ہوئے … تھا … اگر خون آنے کی بات …
تو پھر امتحان … ہوسٹل کو بھی چھوڑ دینا پڑتا۔ مگر جیسے قدرت … شکیل … تھے …
… سے نکلتے … ڈاکٹر … صاحب نے … ہوسٹل …
نے … ڈاکٹر صاحب نے ان کی ہمت افزائی کی …
… اختر صاحب نے … ان کے …
… ان کے … ہوئے زرد چہرے پر مسکراہٹ …
بیٹھے ہوئے وہ امتحان کا پرچہ لکھتے رہے … کے ساتھ … جیب میں
… شکیل … اور … کے بعد …
خدا کا شکر ہے کہ امتحان کے کمرے … کسی نے نہیں دیکھی …
… امتحان کے بعد ایسا … کہ وہ اسی حالت میں ۲۲ میل … پر چل کر … پہنچ گئے۔ … جیسے …
… لوگوں کی ہمدرد نگاہیں … سے زیادہ مجھ پر تھیں … دل کے سارے … ایک افسردگی سی چھا کر رہ گئی تھی …
میرے سارے ارمان … کر دئے گئے تھے … جب کسی طرح سے خون آنا بند نہ ہوا تو …
… ساتھ … پٹنہ کے ڈاکٹروں نے ڈھیروں ڈھیر دواؤں کی فہرست لکھی افسردہ چہروں کے ساتھ تسکین دیتے رہے۔ مگر اختر صاحب …
… پٹنہ سے گھبرا کر … پہنچ گئے تھے۔ اب … شکیل بھیا نے بڑی … کی تھی … کے والدین کو … ایک ڈاکٹر کے …
نظر آتی تھی … انجکشن دیتے ہی گزرا۔ مگر … اختر صاحب کو بات … کرنے کی سخت ممانعت تھی …
… سے … کو … رہتے تھے میرا دل ڈوبتا جا رہا تھا لیکن کسی طرح سے … اور تسکین دینے کی کوشش کرتی۔ اور گزری ہوئی باتوں کو …
… وقت کاٹنا چاہتی تھی۔ میری شادی کو پورا ایک سال ہو رہا تھا اور اپنی ناتجربہ کاری کے ساتھ میں نہیں جانتی تھی کہ اب میں کیا کروں! میرے جہیز کا
… اور ان کے مرجھائے ہوئے زرد اور نحیف چہرے کے نیچے میرا … تکیہ کا غلاف … جس کو میں نے … سے بنایا تھا۔
ان کا … اور پیلا سا ہاتھ آہستہ سے اٹھتا اور وہ میرے شانے کو بڑے پیار سے تھپتھپانے لگتے۔ وہ کیا کہنا چاہتے تھے میں نہیں جانتی لیکن … خاموش
… اشارہ دل میں نشتر … آنکھیں … بے اختیار ہو جاتیں لیکن میں بڑی مشکلوں سے ان امڈتے ہوئے آنسوؤں کو پی جاتی اور کسی پاگل کی طرح
… کے خواب … ہمارا اپنا ایک اچھا سا گھر ہے … جہاں ہم پھول کھلائیں گے۔ ہمارا گھر کیسا اچھا سجا ہوگا اور ہماری میزوں پر …

... کا ایک امر رہا ہے گا: میری سوچا تھا کہ شمع کے نیچے ایک مختصر قرارداد سی تیار [illegible] ... کے چند ... سے
... [illegible] ... میں جیران رہ جاتی کہ آخر میں کیسے اپنی راہ پر جا رہی ہوں؟ ... بے حد پریشان تھیں ... بہت ...
... [illegible] ... تھے انھوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: ہم تو ... بھی خون ... ہو جائے گا ... سے
آخری گلشن کو جاسانپ کے زہر ... گیا ہے:

مگر جب رات کے گیارہ بجے ... اور ... دوستی ہونے کی توقع ... شکیل جیا قریب ہی کرسی پر بیٹھے ہوئے ہوں دیکھا کہ ... ان کے منہ اور ناک سے
خون کی ... بہہ رہی تھی۔ ... سرخ خون سے ... پھیل ... ہوئے غلاف قمیص اور سارا بستر خون سے تر بتر ہو رہا تھا ... پاس ... بھی خون ... ہی
... اختر صاحب ... بے بس ... کھڑے ... اور اختر صاحب ایک ... کے بت بنے ... سامنے کی دیوار کو دیکھ
رہے ہیں ... کیا ہو جائے گا؟ ہم سب ... یہ طور پر ... ایک ... گلشن اندر ... گئے۔ ... پھر ... اور ... کے
منہ میں ڈالتے جاتے رہے۔ اس وقت ... نے اپنے ... ہاتھوں سے ... بڑی مضبوطی کے ساتھ میرا ہاتھ تھام رکھا تھا جیسے موت کے منہ ... میں ڈوبتے
ہوئے بھی ایک بے بس ہاتھ کے سہارے ... شاید ... زندگی کے ساحل کو ... واپس ... گے۔ میری زبان پر ... تھا، لیکن میری ... خدائے تعالیٰ کے ... بستی
ہستی کی ... ہی تھی۔ ... دعاؤں کے لئے بار بار امام جماعت احمدیہ حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد ایدہ اللہ کی خدمت میں قادیان تار ... جاتے
رہے اور یہ دعاؤں کی قبولیت کا معجزہ اور خدائے تعالیٰ کا خاص فضل ہی تھا کہ وہ اندھیری رات سچ مچ میں آخر کٹ ہی گئی۔ اور ... کو کسی طرح سے ... لاکر ...
... میں داخل کیا گیا۔ اختر صاحب ... اور ... کبھی تھی ہی نہیں مگر کمزوری بے حد بڑھ چکی تھی۔ ... اور ... کرنے سے ... کے ساتھ
... گیا تھا ... ڈاکٹروں نے میڈیکل کالج میں ان کو ایک اچھے اسٹوڈنٹ کی حیثیت سے کافی توجہ دے کر پڑھایا تھا ... کے سب بڑی محبت سے دیکھنے اور
علاج کرنے مفت آتے رہتے۔ میڈیکل کالج ہوسٹل کے ایک ... عزیز ڈاکٹر ... نے ان کے بیگ ... ہوئے بالوں کو اپنے سامنے حجام سے کٹوا
کر دیا ... شیو ... اور کپڑے تبدیل کرانے واپس جاتے جاتے مڑ کے پھر بیٹھے اور قریب آکر ہنستے ہوئے بولے: "بالوں کی زیادہ فکر مت کرو ... پھر ...
آئیں گے۔ بس جلدی سے اچھے ہو جاؤ ... پروفیسر بنا ... گے۔" ایک مردہ سی ہنسی ان کے لبوں پر آئی جیسے ان کا دل کہہ رہا تھا: "پروفیسر! پروفیسر کون
بن سکے گا!" ... سارے بڑے ڈاکٹروں کی یہی کوشش تھی کہ جہاں تک جلد ہو سکے ... کے پاس ... میں ان کو داخل کر دیا جائے۔ مگر ... سے
... کا جواب ... تھا کہ کوئی سیٹ خالی نہیں ہے ... زیادہ خون آجانے کی وجہ سے اختر صاحب کمزور بھی بہت ہو گئے تھے ... جانا ... مشکل
ہی نظر آرہا تھا۔ ایک مہینے کے بعد آخر اس صورت میں ... آجانے کی اجازت مل سکی تھی کہ اپنا ایک بڑا ... مریض کے استعمال کی ساری چیزیں خرید کر بھیجو ... اتنی
ساری چیزیں خرید کر بھیجنے پر بھی برآمدے میں صرف لوہے کی ایک پلنگ بچھنے کی جگہ مل سکی تھی۔ میں یہاں بھی ساتھ ہی آئی تھی۔ میرے ہی سامنے ایمبولینس پر
... کو ... لایا جا رہا تھا تو ... کے مدراسی سپرنٹنڈنٹ نے ... کو مریض کو لینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ ان کے پیلے
سے ... چہرے پر غصے کی ایک لہر دوڑ گئی "یہ ہمارا اپنا ہے اور آپ یہاں رہنے کی ہمیں اجازت دے چکے ہیں"۔ ... کے ... صاحب
بھی ... بلند آواز ... نکل سکتی تھی۔ ... کا ان کے لئے یہ پہلا موقع تھا۔ یہاں آتے ہی ان کے چہرے سے پژمردگی دور ہو گئی تھی۔ اس دنیا کے
سارے ہی لوگ ایک دوسرے کے ہمدرد اور غم گسار ... ہی میں ان کا ... ہو چکا تھا اور یہی ... ان کے لئے بڑی ... تھی۔ اب تک وہ
یہی سمجھتے رہے تھے کہ کسی رگ کے پھٹ جانے سے خون آجاتا ہے۔ ... ایک ہی ہفتے میں ... دل کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ ... آنکھوں سے
خوف ... تھے اور ... وارڈ کے اندر مریضوں اور نرسوں کے ... میں ... بھی دلچسپیاں لینے لگے تھے۔ ایک دن جب
میں ... لاجی سے ... ہوئی ریل پر ... اسٹیشن سے پیدل چلتی ہوئی ان کے پاس پہنچی تو شاید وہ پہلے سے کسی بات پر ہنس رہے تھے
اور اسی طرح سے ہنستے ہوئے انھوں نے ایک ساتھ تین نرسوں کو پکڑے ہوئے مجھ سے ملایا ... یہ ... ہے ... سی ... ہوئی ... اور یہ ...

کمزوریاں تو [illegible] اختر صاحب [illegible] ایک ہی مہینے کے بعد [illegible]

[illegible] صحت کے ساتھ ان کی ذہنی [illegible] صلاحیت بھی [illegible] جب [illegible] سے [illegible]

[illegible] صاحب کے پاس [illegible] سے [illegible] اپنے بچانے سے [illegible] اور

اس کے ایک [illegible] کامیاب [illegible] کوشش [illegible] ہوتی [illegible] کی [illegible]

[illegible] کا [illegible] کے [illegible] کی [illegible] کے [illegible] کے بعد سے [illegible] تفصیل کے

ساتھ [illegible] ایک [illegible] کی [illegible] ہوتی [illegible] صحت [illegible] کی

[illegible] باتیں [illegible] اختر صاحب کی [illegible] بات [illegible] سے [illegible] شخصیت

[illegible] احساس ہے کہ [illegible] سے [illegible] کے

[illegible] کہتے جاتے [illegible] کہ [illegible] اختر صاحب کے چہرے [illegible]

[illegible] ایک [illegible] کے بعد [illegible] اختر صاحب [illegible] ڈاکٹر [illegible]

[illegible] تھا اس میں [illegible] مریضوں [illegible] کے [illegible] کے سامنے [illegible]

کے [illegible] کی طرف تیزی سے بڑھتے چلے آ رہے تھے اور [illegible] ایک [illegible] سے نکل جاتے تھے [illegible]

[illegible] موت کا مقابلہ [illegible] گھنٹے گزرنے لگے تھے اور [illegible] ایک [illegible]

سے [illegible] چند ہی مہینوں کے بعد اختر صاحب [illegible] انگلش [illegible]

میں ان کا [illegible] اختر صاحب بڑی خاموشی سے سینی ٹوریم کے [illegible] پر [illegible] کی طرف سے [illegible]

[illegible] انگلش [illegible] کیفیت [illegible] سینی ٹوریم [illegible] طرف سے چھا گئے تھے جیسے [illegible]

کرتے ہوئے [illegible] پر [illegible] گئے تھے۔ انھوں نے یہاں بھی کئی افسانے لکھے۔ سینی ٹوریم کا [illegible] پسند کیا گیا تھا۔ [illegible]

پہنچنا ہی مہینوں میں [illegible] صحت [illegible] ہو گئے تھے [illegible] چہرے کے سفید جلد کے اندر سے [illegible] سرخی جھلکنے لگی تھی وہ ایک

میل سے زیادہ [illegible] لگے تھے [illegible] اور [illegible] میں بیٹھے ہوئے [illegible] اسلام کی [illegible] پیار سے [illegible] رہتے۔ میں ان سے

دو میل دور [illegible] ایک مکان میں رہتی تھی وہاں سے پیدل چل کر ان سے ملنے [illegible] کی مزاج پرسی [illegible] گئے ہوتے [illegible] کی

تیاریوں میں لگے رہتے [illegible] کو یہاں بھی [illegible] گیا تھا اور [illegible] جگہ [illegible] سینی ٹوریم میں [illegible] چکے تھے اور [illegible] اختر صاحب نے

گرمی گزار کر ان کو واپس جانے کو کہہ دیا تھا اس وقت اچانک ان کے منہ سے پھر خون آگیا تھا [illegible] میں [illegible] سیدھی ان کے پاس پہنچی [illegible]

[illegible] وہ لیٹے پلنگ پر خاموش پڑے تھے دونوں بازوں پر [illegible] سے [illegible] کی [illegible] ہی [illegible]

[illegible] میں [illegible] پہلے طریقے پر پھر انھوں نے میرا ہاتھ تھام لیا تھا ان کے چہرے پر بے حد گھبراہٹ تھی [illegible] اپنے دل سے

[illegible] اس کی آنکھوں میں بھی آنسو [illegible] ہوئے تھے وہ مجھ سے [illegible] اب [illegible] بھابھی [illegible] اس نے [illegible]

[illegible] تھا۔ ہائے بھابھی [illegible] تو تیرے لیے [illegible] کر رہی تھی۔ [illegible] بوجھ [illegible] آئی یہاں ــــ [illegible] چلی

[illegible] ــــ [illegible] کے [illegible] کہیں کی ــــ اختر صاحب نے اس سے پہلے جس ہمت سے اپنی بیماریوں کا مقابلہ کیا تھا اب ان کی طرف [illegible]

ہوتے یہ لگتا تھا جیسے وہ اپنی [illegible] چکے ہیں۔ [illegible] خاموش رہنے کا [illegible] تھا اور [illegible] ایک طرح سے [illegible] سامنے سینی ٹوریم کا اس

آفس کو دیکھتے رہتے جہاں اپنی بلند آواز میں وہ کئی تقریریں کر چکے تھے جہاں [illegible] ہوئے [illegible] میں ان کے کئی اصلاحی نقشے موجود تھے اور جس جگہ اختر صاحب

بہت دیر ڈاکٹر کے بچپن کی باتیں اور شعر و شاعری کی باتیں سناتے رہے تھے۔ ایک دن ان کے سر میں کچھ زیادہ درد اٹھا تھا ایک بار ڈاکٹر صاحب جب بیمار تھے اور ... کو دیکھ رہی تھیں اور ان کا ہاتھ پکڑ کر چومنے لگے، وہ آہستہ آہستہ سسک رہے تھے اور ایک عجیب سا غم تھا ایک دیسی ملکی دوا کا ذائقہ۔ انگلیاں ان کے کانپتے اور کانپتے ہوئے لبوں پر دھری تھیں۔ ان کے مرجھائے ہونٹوں میں اتنی حسین آنکھیں کر دیکھ کر مجھے ایسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ غلطی سے اس بات پر الگ گئی ہیں اور اب ہی شمع کی کانپتی ہوئی لو شاید بجھنے والی تھی۔ ڈاکٹر بڑے خلوص سے ان کی خدمت کر رہے تھے جب وہ کچھ اچھے ہونے لگے تب، وہ ایک دن مجھ کو سمجھاتی ہوئی کہنے لگیں بھابی بھیا کو سمجھا دے کہ وہ اتنے زور زور سے گر گر کر کسی کو ڈانٹا کریں۔ میں نے کبھی بھی بھائی جان نے اپنی زندگی میں اتنی کڑوی جھوٹی ڈانٹ کبھی بڑے صاحب کی بھی نہ سنی تھی۔ ان کبھی بس چلانے سے منع کیا رہا۔ اختر صاحب جب لمبے ہو گئے تب یہ راز کھلا کہ ڈاکٹر نے کبھی وارڈ سرونٹ کو کچھ زیادتی سے ڈانٹ دیا تھا جس سے اختر صاحب کو غصہ آیا اور وہ انسانیت کی اس تضحیک کو برداشت نہ کر سکے۔ پہلے تو انہوں نے ڈاکٹر کو سمجھایا۔ وہ ... ان سے معافی مانگ لے مگر ڈاکٹر نے صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ "ایسے ایسے نوکر اس کی جوتی کی نوک پر رہتے ہیں" تو اتنی بات سن کر اختر صاحب اپنی بیماری میں بستر پر جو گرجنے لگے تو پھر سارا وارڈ اکٹھا ہو کر رہ گیا۔ اور اسی بات کو سہتے سہتے ہی ان کے منہ سے خون آنا شروع ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر اپنے کا رونا رو کر خوب روتی رہی تھی مگر جیسے ہی اس کو ان کی بیماری کی خبر ملی تو رت ہو گئی پیر دبانے لگی ہوئی جو کالج آ

سو سال گئی ہیں۔ ڈاکٹر اختر صاحب واپس ہوئے آئے تھے اختر صاحب نے ایک بڑی اچھی سرٹیفکیٹ دے کر ان کو ... سوسائٹی کے سٹیج پہ منہ پر کہہ دیا تھا۔ اس وقت ان کا دل بڑھ گیا تھا۔ ان مسلم بہترین کھانے اور آرام کرنے کی سخت تاکید کر دی گئی تھی۔ وہ اتوار کی چھٹی آئے تھے۔ وہ زندہ دلی اور ترش مزاجی کے ساتھ شرارتوں میں کوئی کمی نہ آئی تھی اور ان کو دیکھ کر پہلے سے بھی یہ خیال نہ ہوتا تھا کہ کبھی ان کو دکھوں سے بھی واسطہ پڑا تھا۔ ان کی نگاہوں میں روئی بہت خلوص اور بہت سا پیار سب ہی کچھ تھا مگر اس کے ساتھ ہی ایک چڑچڑاہٹ اور بیزاری کی جھلک بھی صاف نظر آنے لگی تھی معمولی سی معمولی باتوں پر وہ جھنجھلا اٹھتے اور باتوں ہی باتوں میں خفا ہو جانے اور ایسا لگتا جیسے اپنے راستے میں ایک بھربھری سی کنکری کو بھی روک دینا ان کو گوارا نہ تھا۔ اتنی لمبی بیماری نے بھی ایک داغ ان پر چھوڑ دیا تھا۔ دوسرے ہی سال اختر صاحب نے پرائیویٹ طور پر اردو میں ایم۔ اے کا امتحان دے دیا اور پھر فرسٹ کلاس فرسٹ آ کر ایک اور سرنے کا میڈل اور دوسری اردو کتابوں کا انعام پا لیا تھا۔ اب تک وہ صرف اپنی زندگی کو تازہ رکھنے کی جدوجہد کرتے رہے تھے مگر اب ان کو زندگی گزارنے کا راستہ تلاش کرنا تھا اور جس میں زندگی گزارنے کا معیار ان کی سمجھ میں ... تھا ان کو انسانیت سے بے حد محبت تھی اور انھوں نے لکھنے اور پڑھنے کے فرق کو کبھی بھی محسوس نہ کیا۔ خود بیمار رہتے رہتے ان کے دل میں انسانی زندگی کی قیمت بہت بڑھ گئی تھی۔ اور اختر صاحب شروع ہی سے ہر ممکن حد تک مددگاروں کی ... کو اپنا ایمان سمجھتے تھے۔ شادی کے فوراً ہی بعد میں نے اپنا ایک جوڑا کپڑا ان کو پہنے جاتے وقت دے دیا تھا کہ میری بچی کو زنانہ ہسپتال جن کر سے دیکھنے کو وہ اس کو پہن کر اچھے فوٹو کھنچوا دیں گے۔ جب یہ واپس پہنچے تو میں نے بڑے اشتیاق سے ان کی اٹیچی کھولی کپڑے کے جیسے میں نے نکالے تو پھر ہمت تھے کہ اٹیچی کھولی تو اس میں کپڑے کا نام و نشان تک نہ تھا۔ وہ یہ تماشہ دیکھتے ہوئے بڑے سکون سے بولے "تمہارے کپڑے؟ وہ تو بڑے قیمتی کپڑے تھے" جنرل ہسپتال میں بارہ بجے رات کو ایک لڑکی زبیدہ مر گئی تھی اس کا بھائی روتا ہوا ہوسٹل میں میرے پاس آیا ہسپتال والے مردے کو آکسیجن روم میں بھگا چاہ رہے تھے مگر وہ بے چارہ شریف لڑکا اس خیال سے ہی کانپ رہا تھا کہ جو لڑکی غربت میں عزت آبرو سے رہی مر گئی تھی اس کے بے جان جسم کو اب مردہ خانے تک لیجانے کے لئے ڈوموں کے ہاتھ لگیں گے۔ ان لوگوں کے پاس ایک پیسہ نہ تھا۔ میں نے ڈاکٹروں سے کہہ کر لاش کو صبح تک اسپتال میں رکوا لیے رکھا اور سویرے ہی تمہارے کپڑے بیچ کر اس بچاری کو سپرد خاک کر دیا۔"

اختر صاحب ایم۔ اے کے بعد تلاش روزگار میں پریشان ہی تھے کہ ان پر ریومیٹزم کا بڑا ہی سخت حملہ ہو گیا۔ جوڑ جوڑ میں درد کے ساتھ سارا جسم سوج کر کپّا بن گیا تھا اور درد کے ٹیس کے ساتھ تیز بخار نے ان کو توڑ کر رکھ دیا کسی طرح سے پھر وہ پٹنہ ہوسٹل کے وارڈ میں داخل کئے گئے۔ ہزمی صاحب نے دیکھا دل پر حملے کا اثر ہو چکا تھا، چھ مہینے تک ایک طرح سے بغیر ہلے جلے ہوئے چپت لیٹے رہنے کی سخت تاکید کر دی گئی تھی۔ اس وقت جب ہم ان سے

[illegible] ہوتے تھے دونوں کی گھریلو فضا بہت مختلف ہوا کرتا تھا اور کئی گھنٹوں تک بحث ہو جاتی مگر کسی سے یہ بات نہیں کہا کرتے تھے۔ علاوہ نصاب میں جو کچھ درج ہوتا تھا وہ اس کا اصل سے بالاتر بات تھی اسے اتنی اہمیت سے وہ ما کر چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ پڑھے ہوئے اشاعت کی ان کی ہمیشہ تاڑ پڑھتے۔ جب تک ملازمت دونوں وہ اپنے متعلق کوئی فیصلہ دے سکتے تھے کہ ان کا حشر کیا ہوگا اور ان کا مستقبل تاریکیوں کی طرح گا یا ایک ایسا حصہ کا انتخاب کے پہلو کی نگاہ میں پہنچے۔ ہو سکتی تھیں۔ ڈاکٹر شبال نے امیدواروں کی کراسیں عملاً کمان کے سر کر دیں کہ دیا تھا۔ اس وقت میں جب کمان کے سارے حصے کے جوڑوں پر کل تھے۔ ان پر ہے۔ تو صفیہ کی بندی تھیں ڈاکٹر کو شبال ہوئے پیار بھرے لہجوں میں کہتے اختر تم جلدی سے اچھے ہو جاؤ پھر تم کو پروفیسر بنا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر شبال کی باتیں تھیں جنہوں نے اختر پر بیماری [illegible] کے دسمبر میں ہوئے انٹرویو میں اختر صاحب کو تھرڈ کلاس [illegible] بن گئی تھی۔ پبلک سروس کمیشن نے جن کا وہ [illegible] ان کے دوستوں کی [illegible] پیش ہوئے [illegible] تو کمیشن نے یونیورسٹی کے چند ہی [illegible] کے سیدھے سادے طور پر فرسٹ کر دیا تھا [illegible] صلاحیت [illegible] ممبران ڈاکٹر سید محمود صاحب تھے اختر صاحب کے دوست علی اطہر صاحب کی [illegible] سید محمود صاحب کو اختر نے اس بات پر [illegible] کر دیا تھا کہ پٹنہ کالج میں [illegible] اردو کے کلاس میں تینوں فرسٹ کلاس تو آنے ہوئے امیدواروں سے [illegible] تب وزیر تعلیم خود سے یہ فیصلہ کیا کہ اس جگہ کا اصل حق دار کون ہو سکتا ہے! یونیورسٹی اور کالج میں یہ ایک نیا تاثر تھا وزیر تعلیم کے ساتھ [illegible] پرنسپل [illegible] بہت سے پروفیسر بھی سیکڑوں لڑکوں کے ساتھ اردو کے کلاس میں پہنچ چکے تھے۔ اختر صاحب کے ہم جماعتوں نے یہ خبر مشہور کر رکھی تھی کہ پروفیسر [illegible] صاحب نے اختر کو پہلے سے سوالات بتا دیے ہیں اور پروفیسر صاحب [illegible] ڈاکٹر صاحب کو اختر سے پوچھنے کو کہہ گئے۔ [illegible] کے مقابلے کے [illegible] امیدوار [illegible] نے عین مقابلہ کے کمرہ میں ڈاکٹر صاحب سے جا کر یہ شکایت کر دی۔ ڈاکٹر صاحب کو بات بہت بری لگی اور انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ ممتحن لینے میں آیا ہوں [illegible] پروفیسر کلیم الدین صاحب۔ اس کے بعد وزیر تعلیم نے پہلے امیدوار کے سامنے اسی وقت ایک مضمون پیش کیا اور اس پر کلاس کے سامنے تقریر کرنے کو کہا۔ جب وہ تقریر کر چکے تو ڈاکٹر صاحب نے بال جبریل سے چند اشعار دیئے کہ ان کی تشریح کریں جب وہ تشریح بھی کر چکے تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ اب آپ بال جبریل ہی سے چند اشعار [illegible] اختر صاحب کو تشریح کے لئے دے دیں پہلے صاحب نے کتاب لے کر بڑے غور سے ورق شروع کر دی کہ کوئی ایسا شعر ایسا منتخب کریں جو اختر صاحب کے بس کا نہ ہو جب کئی منٹ صرف ہو گئے تو [illegible] ڈاکٹر صاحب کو بڑی [illegible] جلدی کرنے کی تاکید کی آخر انہوں نے اشعار منتخب کر کے دے دئے اب اختر صاحب کی باری تھی اختر صاحب نے ان شعروں کی تشریح کر دی۔ پھر ڈاکٹر صاحب نے غالب اور ذوق کے متعلق خود ہی اختر صاحب سے سوالات کئے اور اسی موضوع پر [illegible] دینے کو بھی کہا جب [illegible] تو تیسرے کے لئے بال جبریل سے اشعار منتخب کرائے اتفاق سے وہ اشعار مسجد قرطبہ کے تھے جس کو تیسرے صاحب غلط [illegible] پڑھ رہے تھے۔ کلاس کے لڑکوں نے اب [illegible] شروع کر دیا تھا اور ہمارے خلیل احمد خان سلام بورس اور مظفر نقوی نے چن چن کر سوالات کرنے بھی شروع کر دئے تھے۔

تینوں امیدواروں کی تقریریں اپنے اپنے نمبر حاصل کر چکی تھیں [illegible] کی پہلی منسٹری کا دور تھا اختر صاحب کے سوا دونوں امیدوار کانگریسی تھے محمود صاحب ابھی پٹنہ کالج کے احاطہ ہی میں تھے کہ کالج کے لڑکوں نے اپنی کامیابی میں ایک بڑا ہی پرجوش نعرہ لگایا اور مسلم لیگ زندہ باد کی گونج سن کر محمود صاحب نے متحیر ہو کر پوچھا یہ نعرہ کیسا تھا؟ علی اطہر صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو بتایا کہ لڑکے اختر زندہ باد کے نعرے لگا رہے ہیں اور یہ کہتے ہوئے انہوں نے ڈرائیور کو موٹر تیز چلانے کا اشارہ کر دیا۔ اختر صاحب کے دوستوں میں علی اطہر صاحب، شرف الدین احمد شرف عظیم آبادی، قتیل، کلیم نقوی اور رضا نقوی نے اختر صاحب کو ایک دولہا کی طرح سجا کر پہلے پھول کے ہار کی صورت میں پٹنہ کالج بھیجنا چاہا۔ بکس کو کھولا گیا اس کے اندر کوئی سوٹ یا شیروانی نہیں تھی بس وہی ایک پاجامہ کرتا کا اوور کوٹ تھا جس کو جھاڑ پونچھ کر دوستوں نے ایک ساتھ مل کر پہنایا۔ اب جوتے کا سوال رہ گیا تھا مگر جوتے ایسے تھے کہ مرمل کئے

کا طرح اچھے نظر آ رہے تھے بعد میں معلوم ہوا کہ ساڑھے دس کٹ کا دو اور کرٹ تو خیر کسی طرح سے لگتے اور پہلے تو یہ خاکسار صاحب خاندان کی [illegible]
نظر آتے تھے کہ بڑی مصیبت سے [illegible] کا جا۔ اب سب نے اپنے اپنے پرس اور بٹوے الٹ دیئے تو ایک کمرہ ہوا [illegible] کی فہرست تھی [illegible]
پر پاس رکھ گیا اور بہت سات ملا تھا [illegible] ایک نظم پر پڑھ کر سارے دوست [illegible] کے شعلہ ہوا کے [illegible] جا کر پہنچ گئے۔ وہ مرحوم اختر صاحب [illegible] کی زندگی۔
[illegible] تھا۔ [illegible] کے میڈیکل کالج کے بعد ان کو [illegible] ۲ [illegible] اور بعض [illegible] فلیسوں کے نام
[illegible] سے پہلا کہ انہوں نے اپنی دہشتناک بیماری کی حالت میں بی۔ اے کا امتحان دیا تھا۔ اور
اس امتحان کو کرنے کرنے سے بے پناہ محبت تھی۔ اختر صاحب کے دوستوں کی مختلف پارٹیاں ہیں جو ہیں ان سے خلوص سے ہی [illegible] زندگی [illegible] کبھی فرق نہ
ہو سکا کہ [illegible] کے دوستوں میں شریک ہیں تو وہ [illegible] اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں اور اختر صاحب کو اس بات کی بے حد خوشی ہے کہ گذشتہ
دو ستر سال سے صرف اپنے کلاس ہی کے نہیں بلکہ اکثر دوسرے کالجوں کے لڑکوں کے لئے بھی تابندہ مستقبل کی تعمیر کی جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ ان کا تعلق اپنے
شاگردوں سے جہاں اپنے عزیزوں کی طرح ہے وہاں ایک دوست کا اور پرخلوص دوست کی طرح بھی۔ ہمارے کے پرانے شاعر اور ادیبوں کے لئے اختر صاحب کی
نگاہوں میں بڑی عزت بڑا احترام ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ نئی پود میں اور [illegible] شاعری کی ذرا سی بھی صلاحیت دیکھ کر اپنی خوشیوں کا خیال رکھتے ہوئے اس کو آگے
بڑھانے میں کوشاں رہتے ہیں۔ [illegible] وسیع اخلاق کے باوجود بھی اختر صاحب کے مخصوص دوستوں کا ایک بے تکلف گروپ بھی تھا جو اب پاکستان چلے جانے
سے ٹوٹ کر رہ گیا ہے۔ دوستوں نے ان کے ساتھ جہاں محبت اور وفاداری کا بہت سا ثبوت دیا ہے وہاں اختر صاحب کو بھی اپنے دوستوں سے بے حد محبت
رہی ہے۔ انہوں نے اپنے دوستوں کی ضرورت کو ہمیشہ اپنی ضرورت سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ ان کے ایک دوست کو اپنے والد کے [illegible] مقدمے کی پیروی
کرنے کو روپے کی ضرورت تھی۔ اختر صاحب نے جب اپنی جیب خالی دیکھی تو پھر انہوں نے بڑے اطمینان سے اپنے بی اے اور ایم اے کے امتحانوں میں ملی ہوئی
سونے کی میڈلوں کے ساتھ اپنے اور بھی جیتے ہوئے سونے اور چاندی کے میڈلوں اور کپوں [illegible] بیچ کر روپے اپنے دوست کے حوالے کر دیئے اور
جب اس فرض کو ادا کر کے وہ گھر خوشخبری سنانے آئے تو بیوی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ یادگار چیزیں گھر میں رہنے کی بجائے دوکانوں پر بک چکی تھیں۔ اور اس
ڈر سے میں نے انگریزی اور اردو کی ان ساری کتابوں کو جو انہیں انعام میں ملی تھیں [illegible] اپنے کمرے کی الماری میں بند کر کے مضبوط تالا لگا دیا تھا۔

ایک تمناؤں کے بعد پیدا ہونے والی اولاد کو [illegible] بابو بنا کر [illegible] سے اس [illegible] بچپن میں [illegible] اور [illegible] جیسی لمبی بیماریوں نے ان کی طبیعت میں
[illegible] ضد اور حکومت پیدا کر کے ان کو آرام طلب بنا دیا تھا۔ [illegible] خداداد ذہانت ہی تھی جو ہمیشہ کام آتی رہی۔ ان کا سارا بچپن بیماریوں میں کٹ گیا تھا اور دوائیں
[illegible] شفیق ماں کے اٹھتے ہوئے ہاتھ اختر صاحب کے میٹرک پاس ہونے سے کچھ دن پہلے ہی خاموشی کے ساتھ قبر میں چھپ گئے تھے۔ نوجوانی
کے عالم میں تمناؤں کی رنگینیوں سے بھی پہلے منہ سے خون کے تھکے آنے لگے تھے اور جب [illegible] ہو کر واپس آئے تو [illegible] کے سخت حملے کا
دل پر بھی [illegible] اثر چھوڑ گیا تھا۔ [illegible] پھونک پھونک کر قدم ڈالتے ہوئے وہ اپنی ملازمت کو نبھاتے آ رہے ہیں عمدہ غذا، ہوادار مکان اور آرام ان کی زندگی کا
ایک ضروری جزو بن کر رہ گئے ہیں۔ کالج کے فرائض کے ساتھ دنیا بھر کے کاموں کا ایک جھنجھٹ ان کے ساتھ لگا رہتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ جلسوں
میں گھنٹوں تقریریں کرتے رہنے کا ثواب جیسے پیشہ ہی بن کر رہ گیا ہے۔ اور اختر صاحب کے ساتھ سارے لوگ یہ جانتے ہیں کہ حضرت امام جماعت احمدیہ مرزا
بشیر الدین محمود احمد ایدہ اللہ کی مخلصانہ دعاؤں کی قبولیت سے اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طور پر ان کو باعزت طرح پر زندہ رکھ کر انسانیت اور قوم کی خدمت کا موقع
عطا کیا ہے۔ ۱۹۴۲ء کے ہنگاموں سے لے کر جنگ اور فتنہ و فساد تک کی ہولناکیوں میں روزانہ کی زندگی کتنی دشوار گذار بن کر رہ گئی تھی اختر صاحب آج تک ان
سے [illegible] رہے ہیں آنے والے مہمانوں اور عزیزوں کی کثرت سے مجبور ہو کر میں کسی وقت ان سے پوچھ کر [illegible] یا چینی کی پرمٹ کے لئے درخواست لکھانے جاتی
تو وہ صاف طور پر میٹھی چیزوں اور پکے ہوئے کھانا کھانے سے ہی انکار کرتے ہوئے اعلانیہ طور پر کہہ دیتے کہ وہ ایک ساتھ دو کام نہیں کر سکتے ہیں۔ یا تو وہ [illegible]
[illegible] اور چینی کی فکر کریں گے یا پھر [illegible]۔ اور میں قلم اور سادہ کاغذ لئے [illegible] ان کے کمرے سے نکل آتی۔ اختر صاحب کا گھرانا [illegible]

کہ ستقبل کبھی اتنا روشن تھا۔ ان کے اور بڑے بھائیوں سے جیسے ان کے معاملے میں ایک [illegible] رہی تھی [illegible] سب کے سب [illegible] اپنے لئے [illegible]
تھے تو اختر صاحب سے قدرتی۔ جب مختلف حالات میں گذارا [illegible] میں [illegible] کے [illegible] تو وہ [illegible] ہندوستان سے [illegible]
کہ ہم ایک ساتھ [illegible] نہیں رہ سکتے ہیں یا تو ہم سب ہی کچھ رہیں گے [illegible] [illegible] بیٹے تھے [illegible]
اور لڑکوں کے ساتھ [illegible] اور بہنیں [illegible] سب [illegible] شعر [illegible] سب نے [illegible]
بہت [illegible] پر وفیسر ڈاکٹر [illegible] اور سپرنٹنڈنٹ پولیس [illegible] ہیں [illegible] ہیں [illegible]
ہو گیا ہے زمانے میں کیا کچھ [illegible] اختر صاحب بھی [illegible] ہو گئی تھی [illegible] ماڈرن [illegible]
ہنگاموں سے [illegible] طرح گھبراتے ہیں [illegible] چیزوں [illegible] ہیں [illegible]
دہی ہو تو بہ۔ ایک دفعہ مجھ سے [illegible] کراچی [illegible] سے واپس آتے [illegible] میرے لئے خاص طور پر انھوں نے
تحفہ خرید۔ ان کے تحفے میں [illegible] بڑی محبت سے کہا [illegible] اور جب ان کے تحفہ پر میری نظر پڑی تو میں
حیران رہ گئی۔ [illegible] سا تحفہ [illegible] ہی [illegible] بہت سادی تھی۔ تب سے میں نے
کہہ دیا کہ بھئی میں قربان ہو آپ کے تحفے سے [illegible] جھگڑا کرتے۔ [illegible] خود بہت بڑے ادیب تنقید نگار
اردو کے محسن [illegible] میں اردو کے [illegible] ہر طرح سے [illegible] ————— [illegible] ہمیشہ [illegible]
گھر کے اندر جہاں میرے ساتھ ان کو بھی صفائی کا شوق [illegible] بات پر مجبور [illegible] کی [illegible]
اور [illegible] فضول اور بیکار چیزیں [illegible] کپڑے [illegible] لیکن جب [illegible] روپے [illegible] تب بڑے
اطمینان سے فرمائیں گے کہ تمہارا [illegible] بڑا عجیب [illegible] [illegible] کا [illegible]
بڑا عجیب ہے وہ بڑے سے بڑے [illegible] مشاعروں کے [illegible] پسند نہیں کرتے اگر
[illegible] کو بے حد شوق ہے۔ جب کبھی ان کو کسی کتاب [illegible] میرے پاس آئیں گے: کچھ لوگوں کی دعوت
کرنی ہے [illegible] سب کو [illegible] خرچ آئے گا [illegible] مہمانوں کی تعداد [illegible] تیس چالیس روپے
کہیں گے۔ تب وہ گھبرا جاتے ہیں اور [illegible] مہمانوں کو [illegible] کھانا [illegible] روپے [illegible] کی کوشش کریں گے۔ ان سے زیادہ مجھ کو غصہ
آتا ہے جہاں پانچ روپے سیر گھی ہو اور ایک ایک مرغی دو دو روپے [illegible] روپے [illegible] آپ [illegible]
بتوا لیجئے: اور [illegible] میرے سر سے [illegible] ہے۔ اور کبھی ان کو اپنے حساب سے [illegible] ہے۔ ایک دفعہ [illegible] کھانے پر بلانے کا
سوچ رہے تھے [illegible] فہرست تیار کر لی گئی کھانے کے [illegible] تھا [illegible] برتنوں [illegible] وہ بڑے اطمینان سے بولے کہ
میں جو بھی برتن ہیں اسی سے کام چلایا جائے گا۔ میں نے صاف طور پر [illegible] برتنوں میں کھانا کھلانے سے انکار کر دیا۔ [illegible] انھوں نے اس بات پر [illegible]
بچارے لوگ تو پتوں پر بھی کھانا کھا لیا کرتے ہیں۔ لیکن میں [illegible] [illegible] کا عزم تھا کہ اپنے [illegible] وہ
اپنی خوشی سے کچھ کر بھی نہیں سکتے ہیں اور اسی لئے [illegible] پر میری ان سے کافی لڑائی ہوتی رہی ہے۔ اور ایسے ہی سب [illegible] لڑائیاں ہم اکثر لڑتے رہتے
ہیں۔ اختر صاحب میں جو سب سے بڑا عیب ہے وہ یہی کہ معمولی سی معمولی بات کو بھی غصے میں اتنے زور سے [illegible] کہ [illegible] دیکھنے والا یہی
سمجھے گا کہ بڑی بھاری جنگ ہو رہی ہے اور وہ جہاں زور سے بولے بس [illegible] کا پارہ انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ تو یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ آہستہ سے
بول ہی نہیں سکتے: پھر وہ جیسے خود انتہائی سادگی سے رہتے ہیں اسی طرح سے اپنے [illegible] مہمانوں کو بھی رکھنا چاہتے ہیں [illegible] چیز کھلا دیتی ہے
شام کی چائے ختم ہوتے ہی وہ میرے پاس آئے [illegible] کرا گئے ہیں میں اسٹیشن پر جگر مراد آبادی کو لینے جا رہا ہوں [illegible] نے کوشش کی تھی

کہاں کہ کسی اچھے ہوٹل میں ٹھہرایئے گا لیکن انکار سے یہ جی نہیں ہو سکتا ہے اب میں جمیل صاحب کو اپنے ہاں پاس رکھا ان کا [illegible] عقیدت میرے دل [illegible]
پڑھتے تھے بتا دیتے تھے گھر کی صفائی ستھرائی [illegible] دیکھا کہیں گے کہ کچھ بد تمیز لوگ ہیں جہاں گئے اور وہ چڑھ کر بیٹھ گئے۔ بڑے بوڑھوں کی نگاہیں [illegible]
پر [illegible] کہیں گے کیا اس کوئی نواب کا ناتی [illegible] ان کی ہم جیسی شان [illegible] جیسے بیٹھے ہیں [illegible] اور جب اختر صاحب کے ملنے
گھروں میں کھانا، ساغر، حفیظ، سلام، عبادت بریلوی، سرور، احتشام، فراق، [illegible] اشک، [illegible] جعفر علی خاں [illegible]
جگر مراد آبادی جیسے معزز مہمان آتے رہے تو اگر ان دنوں میں پٹنہ میں رہتی تو بس یہی جی چاہتا ہے کہ مہمانوں کے بیٹھنے کے لئے اس گھر سے [illegible]
تاکہ اختر صاحب کے چھوٹے گھر کا الزام مجھ پر [illegible] بڑے سے بڑے محترم مہمانوں کو وہ بڑی فراخ دلی سے اپنے گھر میں ٹھہرا کر خوشی محسوس کرتے رہتے۔
اور میں اتنے عرصے تک ان کی [illegible] خدمت نہ کر سکنے کے احساس اور غم سے تڑپتی رہتی ہوں [illegible] عزیز ہیں [illegible]
بھر میں مشہور ہے کہ اختر صاحب کا اصول یہ ہے کہ وہ زمین پر چٹائی بچھا کر مٹی کے برتنوں میں بھی اپنے مہمانوں کو کھلا کر خوشی محسوس کریں گے اور میں اپنے
مہمانوں کو سر آنکھوں پر بٹھانے کی قائل ہوں۔

گھر کے اندر جب ہم [illegible] کی حیثیت سے گفتگو کرنے لگتے ہیں تو گھر میں آئے ہوئے عزیزوں کو ہمارا یہ کھیل بڑا اچھا لگتا ہے۔ ادب شاعری اور فلسفہ
پر باتیں کرتے کرتے ہم مذہب اور قرآن شریف کی تفسیر پر پہنچ جاتے ہیں۔ جب تک ہم دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ تب تک تو گفتگو میں اپنائیت
رہتی ہے مگر ایسا تھوڑی دیر رہتا ہے پھر ہم الگ راستوں پر مڑ کر بحثیں شروع کر دیتے ہیں اور اس کا نتیجہ کبھی یہ بھی نکلتا ہے کہ ہم آٹھ آٹھ دنوں تک آپس میں
بول چال بند کر دیتے ہیں۔ اختر صاحب کا گھر بھی مہمانوں سے خالی نہ رہا ان کے رشتہ داروں سے زیادہ میرے عزیزوں کو ٹھہرنے کی فرصت [illegible] لیکن
میرے عزیزوں [illegible] کے بچے ہیں۔ جب کبھی ان کو کہیں سے روپیہ ملتا ہے وہ تاش کے پتوں کی طرح پھینکتے ہیں۔ روپے کو [illegible] دیتے ہیں اور
روپے دینے کا عجیب عجیب [illegible] اگر [illegible] کی ترجمانی کرو تو [illegible] روپیہ ملے گا۔ شمیم نے اگر [illegible] ایک شعر کا بھی معنی بتا دیا تو
پندرہ روپے [illegible] اور شہلا [illegible] اگر ایک ہفتے کے اندر [illegible] آگیا اور اس نے بنایا [illegible] تو پچاس روپے شہلا کے ہوں گے۔ کسی
افسانے کا فن سمجھنے پر انعام دیا جاتا ہے تو کسی کو زیادہ شعر یاد رکھنے پر۔ لیکن ابھی تک مجھ کو یاد ہے کہ شادی سے پہلے پانچ سو روپے کا لالچ دے کر انہوں نے
مجھ سے پورا شکوہ یاد کرا لیا تھا اور آج تک میرے وہ پانچ سو روپے باقی ہی رہ گئے ہیں۔ اختر صاحب سمجھتے ہیں آنے والی چیز نہیں ہیں۔ جتنے [illegible]
کی سخت ضرورت ہے [illegible] کبھی کبھی کالج جاتے وقت کپڑوں کی تنگی کا رونا سنایا جاتا ہے مگر پیسے جب [illegible] فاضل ہو گئے
گئے۔ اختر صاحب کے گھر میں ان کا اپنا کوئی بچہ نہیں ہے مگر جو ایک نسل پہلے پڑھ کر نکل چکی ہے اب ان کی نسل پڑھنے لگی ہے اور اس طرح سے خدا نے ایک
ہی ساتھ [illegible] آٹھ آٹھ بچے دے دیے ہیں۔ میں اور بھی اختر صاحب کے بھائی فضل احمد آئی۔ پی۔ ایس اور میری اپنی تیسری بہن صوفیہ شہناز کے بچے ہیں
اور چار چار سالوں کی عمر سے میرے پاس رہ کر کونونٹ میں تعلیم پا رہے ہیں۔ میری منجھلی بہن رضیہ [illegible] کا بچہ بھی سینٹ زیویرس میں ہے چوتھی بہن [illegible] کی بچی سیمیں
اور میرے بھائی ظہیر [illegible] احمد کی بچی نسرین کونونٹ کے [illegible] کلاس میں ہیں۔ اور [illegible] کی بہن [illegible] اور میری سب سے چھوٹی بہن [illegible] ہائی اسکول میں ہیں۔
اور اختر صاحب کے چچا زاد بھائی کا بچہ تاج مسلم اسکول میں۔ گھر اب گھر نہیں ہے وہ ایک بورڈنگ ہاؤس بن کر رہ گیا ہے جہاں قدم قدم پر ماسٹر، جگہ جگہ
پر پنسل، سلیٹ اور [illegible] کی کتابیں بکھری پڑی رہتی ہیں۔ صبح کو آٹھ بجے جب سارے بچے کونونٹ اور اسکول چلے جاتے ہیں تو دماغ ہلکا ہلکا سا لگتا ہے
اور جب چار بجے رکشا موٹریں اور گاڑیاں ان سب کو لا لا کر پہنچانے لگتی ہیں تو پھر گھر سے کہیں بھاگ جانے کو جی چاہتا رہتا ہے۔ اور آئے ہوئے مہمان بچوں
کی اس فوج سے بری طرح گھبرا گھبرا کر بھی آنے سے باز نہیں رہتے۔ اختر صاحب کا دسترخوان ہمیشہ سے بڑا لمبا چوڑا بچھتا رہا ہے گھر کے سارے لوگ ایک ہی
ساتھ کھانا کھایا کرتے ہیں اور کھانے کے درمیان ایسی ایسی مزیدار باتوں کا سلسلہ چلتا ہے کہ گیارہ بارہ بجے رات تک جمائے محفل جمی رہتی ہے جو بھی
ہاتھ منہ [illegible] کر اٹھ جاتے ہیں پھر بھی کسی کا بھی پلنگ پر جانے کو جی نہیں چاہتا ——

اختر صاحب [illegible] ہیں [illegible] سلسلہ [illegible] بہت سی [illegible] جب [illegible] اختر صاحب [illegible] کی قسمت [illegible] ایک [illegible] سے [illegible] اپنے [illegible] جب [illegible] خود [illegible] [illegible] بات [illegible] تفصیلی [illegible] صاحب کی [illegible] ملک [illegible] ہیں [illegible] اختر صاحب [illegible] کے اسی وقت [illegible] اختر صاحب [illegible] پہلے [illegible] سے پہلے [illegible] ہیں۔

اختر صاحب کی ایک خاص چیز ان کا [illegible] ہے۔ [illegible] قرآن [illegible] اسلام کے لئے چندہ [illegible] حساب [illegible] سگریٹ [illegible] ایک عادت [illegible] کرتے رہنے کی ہے جو سب سے بڑھ چڑھ کر ہے۔!

اختر صاحب کی اب تک [illegible] کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں افسانے، ڈرامے، ناولٹ اور تنقیدی مضامین سبھی ہیں۔ انھوں نے ایک ناول "تعمیر" بھی لکھا ہے جو [illegible] سے لکھا ہوا [illegible] ہندوستان میں غریب [illegible] پیشہ [illegible] ڈرتا ہے اور پاکستان جو [illegible] نئے دور [illegible] ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ اور ایک نظموں کا مجموعہ بھی مسودوں کی صورت میں [illegible] آنے والے اچھے دن کی راہ تک رہا ہے۔

اختر صاحب کو بہار کے آم اور [illegible] بہت پسند ہیں۔ [illegible] کام کرتے کرتے تھک جاتے ہیں تو سوچتے ہیں کہ ادریں[1] کی پہاڑی پر حضرت بدھ کی طرح بیٹھ کر سکون اور نروان حاصل کریں گے۔

اختر صاحب موجیبی زیدی سیدوں کے گھرانے سے ہیں۔ ادریں میں ان کے بزرگ سید احمد [illegible] فیروز تغلق کے زمانے میں آکر بسے تھے اور فوجی کارناموں میں انھوں نے جاگیر پائی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اپنی [illegible] کے باوجود اپنی پرمذاق طبیعت، سادگی، علمی صلاحیت اور نرمی کے ساتھ وہ ہمیشہ ہی آئیڈیل آدمی ہوتے اگر چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی سے وہ الجھتے نہ رہتے۔

---

[1] نوٹ: ادریں کی بستی میں ایک پہاڑی ہے جس پر پالی زبان میں کتبے لکھے ہوئے ہیں اور بدھ کی مورتیاں بنی ہوئی ہیں کہا جاتا ہے کہ مہاتما بدھ نے اس پہاڑی پر آکر وعظ کیا تھا۔!

حیات اللہ انصاری

مسیح الحسن رضوی

جب کسی شخص کی زندگی ہنگاموں سے خالی ہو، اس میں گھن گرج کی کیفیت نہ ہو بلکہ اس کے برعکس نرم رو دریا کی سی کیفیت ہو تو اس کے بارے میں کیا اور کیونکر کہا جائے؟ حیات اللہ انصاری افسانہ نگار ہیں، صحافی ہیں اور اب لیڈر بھی بنتے جا رہے ہیں۔ ان میں سے اگر کسی بھی حیات اللہ کو الگ نکالا جائے گا تو دوسرے حیات اللہ کا ذکر ناگزیر ہو جائے گا۔ اس سے بچنے کا آسان نسخہ یہ ہے کہ آپ کے سامنے اس حیات اللہ کو پیش کیا جائے جو ان تینوں چیزوں کا مرکب ہے —— حیات اللہ جو انسان ہے اور سب کچھ بعد میں۔

اس حیات اللہ نے زمانہ کے بڑے سرد و گرم چکھے ہیں۔ عزیزوں کی خفگی، دوستوں کی بے زاری اور تمسخر۔ عزیزوں کی خفگی کے سبب ایک زمانہ میں فرنگی محل سے "بن باس" ملا اور دوستوں کی بے زاری کے سبب انجمن ترقی پسند مصنفین سے علیحدگی اختیار کرنا پڑی۔ اب جب کہ حیات اللہ انصاری اپنی راہ الگ ہی کامیاب ہو گئے ہیں تو دوست تو دوست عزیز بھی انہیں اپنا رہے ہیں۔ فرنگی محلیوں سے ملئے تو وہ آپ کو بتلائیں گے کہ حیات اللہ کا تعلق فرنگی محل سے ہے۔ دوست کہیں گے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے بنانے میں حیات اللہ انصاری کا ہم سے کم ہاتھ نہیں ہے۔ بلکہ سرہ کانفرنس میں تو ڈاکٹر علیم نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ایک زمانہ میں حیات اللہ ہم سے زیادہ گرم کمیونسٹ تھے اور ہمیں انہیں لگام دینے کے لئے کہنا پڑتا تھا کہ "ذرا سنبھل کے، آگے خندق ہے"۔ بہرکیف حیات اللہ انصاری خندق میں گرنے سے بچ گئے۔ اس میں ڈاکٹر علیم کا مشورہ شامل تھا یا خود حیات اللہ کی کوششوں اور سمجھ کا ہاتھ، یہ کہنا مشکل ہے۔ لیکن ان کی اس تبدیلی کا ان کے دوستوں پر بڑا ناگوار ردعمل ہوا جو بقول ان کے بزرگوں کے حیات اللہ انصاری کی صحبت میں پڑ کر خراب ہو چکے تھے۔ کمیونسٹ حیات اللہ گاندھیائی بن گئے تھے اور ہندوستان (ہفتہ وار لکھنؤ) کی اڈیٹری کر کے بڑے زور شور سے گاندھیائی فلسفہ حیات کی تبلیغ کر رہے تھے۔ دوست ان کی اس تبدیلی کا مذاق اڑاتے پھر رہے تھے۔ اس مذاق اڑانے کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ چنانچہ جب انہوں نے چند سال ادھر اُردو کو علاقائی زبان بنانے کے لئے دستخطی مہم چلائی تب بھی ان کا مذاق اڑایا گیا۔ جب انہوں نے صدر جمہوریہ ہند کی خدمت میں بیس لاکھ دستخط پیش کر دیئے تب بھی ان کا مذاق اُڑایا

کہا جب جمعیۃ گل ہند مسلم کونسل کے حلقوں کی اور ہندی کے خلاف تحریک چلائی اور ہندوستانی کے خلاف اپنے اخبار میں احتجاج کیا اور بھی پھر اس سلسلہ میں وقت بھی فنی کا اتفاق نہ پایا اور ایک بھرے جلسہ میں مسٹر ... آنند نے حیات اللہ صاحب سے اعتذار بھی کا مطالبہ کیا۔ اور شاید یہ سن کر آپ کو تعجب ہو کہ جب لکھنؤ کے ایک انگریزی روزنامہ میں کسی نیپالی نے پیغمبر اسلام کے بارے میں لکھا تھا کہ ... کا احتجاج بیسیوں حیات اللہ انصاری نے اپنے اخبار قومی آواز کے صفحہ پر اس کے خلاف احتجاج کیا تب بھی بعض حلقوں کی طرف سے ... انہیں رجعت پسند کہا گیا۔ جب اردو کی ... کے سلسلہ میں ایک ... جلسہ ہوتا تو ... کو "... تحریک" کا ... ٹھہرایا گیا۔ دیکھنا یہ ہے کہ حیات اللہ انصاری کی زندگی میں ... اپنے ... کے ... کے پاس کا ... رہا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں کے بھی دوست ہیں۔ ... اس شخص کی زندگی میں ... اپنے ... کے ... سے وہ اس شعر سے اپنے تعلقات کی حالت استوار کرتے ہیں ... کامیاب رہا ہے کہ اب ان کے مخالفین بھی ان کا احترام کرنے کے لئے ... پاتے ہیں۔

اس سفر کی آگے بڑھانے سے قبل میں آپ کے سامنے ۱۹۲۱ء کے حیات اللہ کا کچھ ذکر کروں گا۔

غالباً اس وقت حیات اللہ کی عمر تیرہ چودہ سال کی رہی ہوگی۔ فرنگی محل کے ایک حصہ میں وہ اپنے والد مولانا وحید اللہ مرحوم کے ساتھ رہتے تھے۔ ایک بے حد چھوٹا کمرہ جس کا اپنا کمرہ "حیات منزل" ایک عجیب شاپ و نمائش والا تھا۔ جس میں ہر طرح کی چیزیں تھیں۔ ٹرنک سے خود ... چلنے والا پنکھا، توپ، تھیٹر کے پردے، بائسکوپ کی مشین، عجیب و غریب میزیں اور کرسیاں، طلسم ہوشربا ... اور ... ہوئے کئی ... یہ سب چیزیں خود حیات اللہ کی بنائی ہوئی تھیں۔ ان کے بچپن کی ہمت تھی وہ ... کہ اگر حیات کو تعمیری کی تعلیم دی جاتی تو وہ آج ملک کا ایک ماہر انجینئر ہوتا۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ وہ زمانہ تھا جب تحریک خلافت دم توڑ چکی تھی، مسلمان اور خصوصاً ان کے علما کا طبقہ میدان میں آنے کے بعد پیچھے ہٹ گیا تھا۔ حیات اللہ کا تعلق چونکہ علما کے خاندان سے تھا ... یہ وہ زمانہ تھا جب سیاسی ... اور علما کی باہمی پھوٹ کی وجہ سے فرنگی محل کی قیادت کا آفتاب بھی غروب ہو چکا تھا۔ ان حالات اور ماحول میں حیات اللہ فرنگی محل میں تعلیم و تربیت حاصل کر رہے تھے۔ ان کی جدت پسندی، ذہانت اور روشن خیالی کا احساس اس وقت عام طور پر فرنگی محل میں کیا جانے لگا تھا۔ چنانچہ ان کے ہم عمر ساتھی ان کی صحبت میں بیٹھنے اور اپنا وقت برباد کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن فرنگی محل کے بچے اس وقت اپنے بزرگوں کے بچپن کے مقابلہ میں کم سعادت مند واقع ہوئے تھے اس لئے وہ چھپا چھپی حیات منزل میں جمع ہوتے اور اس لڑکے کے کارنامے اور تخلیقیں دیکھ کر اپنے جذبۂ تحیر کو تسکین دیتے۔ اس زمانہ کے دو واقعات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک مولانا کو فرنگی محل کے ایک مکان کے کمرہ میں "جلوۂ طور" نظر آنا، اور حیات اللہ انصاری کا مسجد ٹمنی کے متصل ہی واقع ایک دوسری چھوٹی مسجد کے مینار سے چھلانگ لگانا۔

پہلا واقعہ اس طرح ہے کہ حیات اللہ کہیں سے ایک تیز روشنی والا دھماکا لے آئے۔ اور جب مولانا تہجد ادا کرنے کے بعد سو گئے تو انہوں نے اس دھماکے کو داغ دیا۔ چاروں طرف روشنی ہو گئی اور مولانا چلائے کہ ——" نور الٰہی، نور الٰہی ——" کہتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد مولانا ہمیشہ کے لئے مجذوب ہو گئے۔

دوسرا واقعہ راوی نے اس طرح بیان کیا ہے کہ ایک دن حیات منزل میں لڑکے جمع تھے۔ حیات اللہ نے ان سب سے اپنے مینار سے چھلانگ لگانے اور بانسوں کے درختوں کے ایک جھنڈ کے بانس کی مدد سے، جو مینار کی اونچائی تک پہنچا تھا اپنے نیچے تک بخیر و خوبی پہنچنے کی حیرت انگیز داستان بیان کی۔ لڑکوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس واقعہ کے بعد حیات اللہ اس ٹولی کے مسلم لیڈر بن گئے۔ اب ان کی قیادت میں لڑکوں کی ٹولی گھر تی، ایل گارد اکثر شہر کے دوسرے حصوں کو جاتی۔ اگر کبھی دیر ہو جاتی اور لڑکے اپنے والدین کے ڈر سے گھبراتے تو حیات اللہ ان کا اطمینان کرا

میتے۔ پھر فرنگی محل کی گلی میں جب یہ ٹولی داخل ہوتی تو حیات اللہ حلوائی کی دکان سے جلیبیاں لے کر ان میں تقسیم کرتے اور کہتے کہ اگر [illegible] میلاد شریف سے آ رہے ہیں۔ میلاد کے لئے جلیبیاں خریدنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حیات اللہ اپنی کم عمری میں اپنے ماحول اور [illegible] کی [illegible] سے اچھی طرح واقف تھے۔ لیکن یہ لڑکا جس کا نام حیات اللہ تھا محض جدت پسند اور شریر ہی نہیں تھا وہ اس کم عمری میں [illegible] منزل میں ایک بار اس نے بھاپ سے چلنے والا پہیہ بنایا۔ جس ڈبے میں بھاپ بند تھی وہ اتفاقاً پھٹ گیا۔ حیات اللہ کا آدھا منہ بھاپ سے جھلس [illegible] لیکن انہوں نے اس وقت شور نہیں مچایا۔ منہ پہ پانی بھی نہیں ڈالا۔ وہ خاموشی سے اس جگہ سے ہٹے اور فرسٹ ایڈ بکس سے انہوں نے کوئی [illegible] منہ پر مل لی۔ یہ فرسٹ ایڈ بکس ان کی عمر عیاری کی زنبیل میں دوسری چیزوں کے ساتھ موجود رہتا تھا۔

لوگ کہتے ہیں کہ اگر حیات اللہ اس وقت حاضر دماغی سے کام نہ لیتے تو ان کا منہ ہمیشہ کیلئے آدھا سیاہ اور آدھا سفید ہو گیا ہوتا۔ ان کی یہ زندگی [illegible] طرح ختم ہو گئی کہ مولانا [illegible] کا انتقال ہو گیا۔ ماں پہلے ہی مر چکی تھیں اب ان کے سر پر کوئی دست نہیں تھا۔ اس عمر میں انہوں نے فرنگی محل کے عربی مدرسے سے سند حاصل کر لی تھی [illegible] اس تعلیم سے وہ بالکل مطمئن نہیں تھے انہیں کوئی آگے کی راہ سوجھانے والا بھی نہیں تھا۔ ایک محبت کرنے والا ماموں زاد بھائی ضرور تھا۔ لیکن وہ خود بھی [illegible] مشورہ دے سکتا تھا۔ ان مشوروں کے طفیل انہوں نے دو تین سال میں انٹرنس پاس کر لیا۔ لیکن ان کے حوصلوں نے یہیں بس نہیں کی وہ [illegible] علی گڑھ پہنچ گئے جہاں وہ اس زمانہ کے سب سے غریب پرور ہوسٹل آفتاب ہال میں رہنے لگے۔ یہاں کے قیام کے دوران میں ان کی [illegible] کا اہم واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے اُردو میں تقریر کرنے کی مہم چلائی اور ساری یونیورسٹی میں ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ اس سے قبل وہ لکھنؤ میں کیمونسٹ [illegible] بچکے تھے۔ یہاں انہوں نے وجود باری کے مسئلہ پر مولانا عبدالباری مرحوم کی خفگی مول لی تھی۔ یہاں شاید یہ بتلانا دلچسپی سے خالی نہ ہو کہ مولانا عبدالماجد دریابادی کی دہریت سے متعلق تحریروں نے حیات اللہ کی زندگی میں بچپن ہی میں زہر گھول دیا تھا۔ چنانچہ اس زمانہ میں انہوں نے اپنے استاد اور بزرگ مولانا عبدالباری مرحوم سے وجود باری کے مسئلہ پر تلخ باتیں کہیں تو مرحوم نے انہیں اپنی صحبت سے اٹھ جانے کا حکم دیا۔ حیات اللہ خاموشی سے اس صحبت سے، جس میں سید جالب دہلوی مرحوم وغیرہ شریک تھے اٹھ کر چلے آئے۔ لیکن ابھی وہ اپنی 'حیات منزل' تک کے راستہ ہی میں تھے کہ مولانا عبدالباری نے انہیں واپس بلایا۔ شفقت سے اپنے پاس بٹھایا اور ان کو مخاطب کر کے کہا کہ "میں عالمانہ سطح پر عقیدہ کے اس خلوص کا احترام کرتا ہوں"۔ اس واقعہ کے بعد مولانا مرحوم حیات اللہ کا آخر وقت تک احترام کرتے رہے۔ عام مذہبی لوگوں کی کٹر پنیت کے خلاف مولانا کا یہ رویہ حیات اللہ کے لئے ایک نیا تجربہ تھا۔ نہیں کہا جا سکتا کہ آئندہ زندگی میں انہوں نے اس سے کس طرح فائدہ اٹھایا۔

علی گڑھ سے بی اے کی ڈگری لینے کے بعد اب جو حیات اللہ لکھنؤ واپس آتے ہیں تو کایا ہی پلٹ گئی تھی۔ کمیونسٹ حیات اللہ بقول مولانا [illegible] مرحوم کھدر [illegible] پہ رہنے لگے تھے۔ یہاں سے دوستوں سے چھیڑ چھاڑ اور طعن و تشنیع کا دور شروع ہوا۔

ان کی زندگی کے اس دور (۱۹۳۹ء) میں میں ان سے متعارف ہوا۔ اس وقت ان کے افسانوں کا مجموعہ '[illegible] معصیت' شائع ہو چکا تھا۔ "آخری کوشش" جیسا غیر فانی شاہکار انہوں نے ابھی تخلیق نہیں کیا تھا۔ کمیونزم کو وہ خیرباد کہہ چکے تھے۔ لیکن گاندھیائی ہوتے ہوئے بھی وہ غیر طبقہ واری سماج کے علمبردار تھے۔ میری طرح ان کی نظریاتی زندگی کا یہ معمہ بہتوں کی سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ آخر گاندھی ازم کو مارکزم کے غیر طبقہ واری سماج سے کیا نسبت ہے۔ لیکن اب بہت دنوں ساتھ رہنے کے بعد کم از کم میں نے اس معمہ کو حل کر لیا ہے۔ حیات اللہ ناک کو سر کے پیچھے ہاتھ گھما کر پکڑتے ہیں دوسرے اسے سامنے سے پکڑ لیتے ہیں۔ یہ طریق کار کا فرق ہے۔ اس کی وضاحت اس طرح کی جا سکتی ہے کہ حیات اللہ سرمایہ داری کے اس لئے مخالف ہیں کہ اس میں فرد کو معاشی مساوات اور ترقی کے مواقع حاصل نہیں ہیں۔ اس کے ساتھ وہ کمیونزم کے اس لئے مخالف ہیں کہ اس میں ریاست کی جبریت کو بڑا دخل ہے۔ پھر ان کے سامنے سماج کی نابرابری کو ختم کرنے کے لئے کون سا فلسفہ حیات ہے؟ یہ فلسفہ حیات

ان کی نظر میں آزادی وطن کے بعد کوئی ایسا نظام نہیں چل سکتا۔ جس کی بنیاد معاشی مساوات کے اصول پر ہے اور جہاں سیاست کی بنیاد کا اعمال ہیں ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کے خیال میں گاندھی جی کی تعلیمات میں بھرپور Human touch ہے۔

یہ ایک لمبی بات ہے جس کی یہاں پر بحث کی گنجائش نہیں۔ تاہم اس سے صاف ظاہر ہے کہ نظر حیات اللہ کو اپنے طور پر اتنی کامیابی ضرور ہوئی ہے کہ ان کے دوست اور مخالف بھی انہیں رجعت پسند نہیں سمجھتے ہیں۔ بلکہ ان کی صلاحیت کا اعتراف کرتے ہیں۔ کسی زندگی اس سے بڑھ کر بھلا اور کیا ہو سکتی ہے۔

آج حیات اللہ جس مقام پر کھڑے ہوئے ہیں وہاں تک پہنچنے کے لئے انہوں نے جس طرح کی مشکلات کا سامنا صبر و شکر کے جذبہ کے ساتھ کیا ہے۔ دنیا میں شاید سب سے بڑی ذلت فاقہ کشی کی ہے۔ اس فاقہ کا مزہ صرف اس صورت میں لیا جا سکتا ہے جب کوئی بچے اصول اور نظریات کے لئے بھوکوں مرنا گوارا کرے لیکن کبھی حق کے سامنے سر نہ جھکائے۔ حیات اللہ ان دشوار گزار راہوں سے بھی بڑی خاموشی اور پامردی کے ساتھ گزرے ہیں۔ ۱۹۴۵ء میں جب سامراجی جنگ ہٹلر کے روس پر حملہ کے بعد عوامی جنگ بن گئی تھی اور حیات اللہ کے بیشتر ساتھی لیڈر، شاعروں اور ادیبوں کے دو مسرے نقادوں سے مدد لے رہے تھے تو اس وقت حیات اللہ لکھنؤ کی دسمبری سردیوں میں ٹھٹھری ہوئی شیروانی پہنے اسی شان استغنا سے رہتے تھے اور چھنے کے کوروں سے روٹی حاصل کرتے تھے۔ وہ سرسبز رہتے شہرت کم ہی حاصل کر پاتے تھے اور حیات اللہ اپنے گھر پر سانپ پالتے تھے۔ ان سانپوں کے پالنے کا قصہ یہ ہے کہ پنڈت نہرو کے ایک عزیز مسٹر ... جو مشہور سائنٹسٹ ہیں اس زمانہ میں لکھنؤ یونیورسٹی میں تھے۔ ان کی کسی طرح سے حیات اللہ سے دوستی ہو گئی۔ پھر کیا تھا دونوں نے مل کر سانپ پالنے شروع کئے۔ میں ... صاحب کے بارے میں تو نہیں جانتا ہوں لیکن حیات اللہ کے بارے میں وثوق سے بتا سکتا ہوں کہ انہوں نے اس فن شریف کو سیکھنے میں اپنا قیمتی وقت برباد کیا۔ اس زمانہ میں سانپوں سے متعلق تھے کہ خیال بھی آ گئے ہیں اور مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس موضوع پر جب ریڈیو پر ان کی تقریر ہوئی تو ان کے اس اصرار پر ریڈیو کے سننے والوں میں کافی کھلبلی مچ گئی کہ تقریر سے پہلے مائک پر بین بجائی جائے۔ بہرکیف ان سانپوں کا قصہ یوں ختم ہوا کہ ... صاحب انگلینڈ چلے گئے اور حیات اللہ کی زندگی کے تلاش کے لئے دوسری راہیں نکل آئیں۔ انہوں نے پرانے لکھنؤ میں زور شور کے ساتھ تعلیم بالغان کا کام شروع کر دیا۔ جو ایک عرصہ تک جاری رہا۔ اس کے ٹھیک پندرہ برس بعد انہوں نے بالغوں کی تعلیم کے لئے اور انہیں دس روز میں اردو لکھنا پڑھنا سکھانے کے لئے "حیات اللہ قاعدہ" تیار کیا۔ ۱۹۴۶ء میں ہندوستان ہفتہ وار لکھنؤ بند ہو گیا جس کی تیس چالیس روپے ماہوار کی نوکری چھوٹ گئی اور وہ اس وسیع دنیا میں جہاں ان سے ہمدردی کرنے والوں کا شدید فقدان تھا وہ بالکل تنہا رہ گئے تنہا اس معنی میں کہ حیات اللہ نے ہندوستان کے ذریعے ادب اور صحافت کی بڑی خدمت کی تھی۔ آج کے بعد ممتاز ادیبوں اور شاعروں میں کم لوگ ایسے ہوں گے جنہوں نے ان کے اخبار میں نہ لکھا ہو۔ اس وقت اس ہفتہ وار اخبار کو جاننے والوں کی تعداد بہت کم ہو گی (کیونکہ ترقی پسند تحریک کے سلسلہ میں نقادوں نے کہیں بھی اس کا ذکر نہیں کیا ہے) لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حیات اللہ نے اس پرچہ کے ذریعہ اپنے ان متوازن خیالات کا ریہرسل کیا تھا جن کو بعد میں انہوں نے قومی آواز کے ذریعہ پیش کیا ——

قومی آواز کا ذکر کئے بغیر حیات اللہ کی زندگی بڑی ادھوری رہ جائے گی۔ لیکن ان کی زندگی کے اس پہلو پر لکھنے سے قبل ان کی رضاکارانہ بے کاری کے زمانہ کا ایک قصہ اور تجربہ ان کے کردار پر روشنی ڈالنے کے لئے یہاں لکھنا ضروری ہے۔ جب ہندوستان کے تمام ممتاز ادیبوں نے ایک ایک کر کے فلمی لائن کو اختیار کیا تو حیات اللہ نے بھی قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ انہوں نے چیتن آنند کے ہاتھ اپنی ایک فلمی کہانی "نیچا نگر" فروخت کی۔ اس سلسلہ میں وہ کئی ماہ بمبئی رہے۔ جب اس کہانی کا فلم تیار ہوا تو اس نے فرانس میں اکاڈمی انعام جیتا۔ لیکن اس عرصہ میں بمبئی کی فلمی دنیا نے حیات اللہ کو بدحواس کر دیا۔ چنانچہ وہ اپنی فلمی کہانی کے پیسے جیب میں ڈال کر بمبئی سے بھاگ نکلے اور لکھنؤ آ کر دم

تھا۔ یہاں رفیع احمد قدوائی مرحوم سے انہوں نے ملاقات کی اور انہیں ایک اردو روزنامہ نکالنے کا مشورہ دیا۔ قدوائی صاحب اس وقت یوپی کانگریس کا الیکشن لڑنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ وہ اخبار نکالنے پر آمادہ ہو گئے۔ حیات اللہ نے کام سنبھال لیا۔ اس وقت حسن عسکری ایڈیٹر تھے۔ جب پہلا پرچہ نکلا تو انہوں نے حیات اللہ کو جلا کر ایک مختصر سا کسیلا خط لکھا۔ حیات اللہ حسن عسکری کا خط پی گئے۔ پھر برسوں شاید مدتوں میں بھی خط و کتابت نہیں ہوئی۔ اس سلسلہ میں ان کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ایک الیکشن کے پرچہ کو اپنی کوششوں سے ایک باوقار روزنامہ بنا دیا اور آج یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی مذہبی اور ثقافتی خدمت جس صحت مندانہ طریقہ سے قومی آواز انجام دے رہا ہے۔ اس کی مثال آزاد ہندوستان میں مشکل سے ملے گی۔ قومی آواز کی بقا کے لئے انہوں نے اپنے معدودے ساتھیوں سے بھی اسی طرح جنگ کی جس طرح وہ باہر اپنے ترقی پسند ساتھیوں اور فرقہ پرست جماعتوں سے کرتے رہے تھے۔ انہوں نے خود پیٹ پر پتھر باندھ کر اور اپنے ساتھیوں کے پیٹ پر پتھر باندھ کر قومی آواز کو زندہ رکھا ہے۔ اس کی وجہ سے ادارہ کے اراکین میں تلخیاں پیدا ہوئیں۔ شکوے پیدا ہوئے۔ انانیت کا سوال درمیان میں لایا گیا۔ دوستی اور تعلقات میں فرق آیا لیکن وہ اپنی بات پر جمے رہے۔ بات پر جمے رہنا حیات اللہ کا بہت بڑا وصف اور کمزوری ہے۔ وہ جب سوچ سمجھ کر ایک بات کا فیصلہ کر لیتے ہیں تو پھر بڑی مشکل سے اسے بدلنے پر تیار ہوتے ہیں جلد بدلتے ہی نہیں ہیں۔ اس میں بعض اوقات کٹ حجتی کو دخل ہوتا ہے۔ لیکن ایسا بہت کم ہوا ہے کہ انہوں نے کسی مسئلہ کے بارے میں غرض نیت سے اپنی رائے قائم کی ہو۔

لیکن خود ان کی بھی ایک کمزوری ہے۔ یہ کمزوری ان کے تخیل کی اڑان ہے۔ جس کو اگر آپ حیات اللہ کے ساتھ رعایت برتیں تو ان کی امید پرستی کا نام دے سکتے ہیں۔ وہ کبھی مایوس نہیں ہوتے۔ لیکن ان کے اس مایوس نہ ہونے کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر آپ خدانخواستہ ان کی تدبیر میں شامل ہو گئے تو یہ ممکن ہے کہ آپ امید کا دامن ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیں۔ مثلاً مجھے یاد ہے کہ ایک زمانہ میں انہوں نے اپنے ایک کمیونسٹ دوست لوکل چند رستوگی کے ساتھ مل کر کوہ پیمائی کا بڑا عظیم الشان پروگرام بنایا تھا۔ اس کے لئے لکھنؤ کے نخاس سے سامان جمع کرنے کی ایک طول و طویل فہرست بھی بنائی گئی تھی۔ دن بھر یہ دونوں دوست کوہ پیمائی کے اصولوں پر دلچسپ گفتگو کیا کرتے۔ غریب رستوگی اس گپ میں اتنا منہمک ہو جاتا کہ اس کی نوجوان آنکھوں میں ایورسٹ کی برفیلی چوٹیاں چمکنے لگتیں۔ لیکن کچھ دن کے بعد یہ ہوا کہ حیات اللہ کو اپنے تخیل کی اڑان کے لئے دوسرا شغل ہاتھ آ گیا۔ رستوگی غریب آج کل فارمنگ کے چکر میں پڑ گیا ہے۔ شاید اسے اس بات کا علم نہیں ہے کہ تن سنگھ کے ایورسٹ کے سر کرنے سے قبل حیات اللہ انصاری اپنے تخیل میں اسے کبھی کا سر کر چکے ہیں۔ تو یہ تخیل پرستی یا امید پرستی حیات اللہ کی فطرت کا خاصہ ہے۔ جس کے سہارے انہوں نے اپنی زندگی کے کتنے ہی معرکے سر کر ڈالے ہیں۔ لیکن حیات اللہ کے اس اسکیچ کو پڑھنے والوں کو میرا یہ مشورہ ہے کہ وہ رستوگی کی مثال کو سامنے رکھیں اور زیادہ اڑان بھرنے کی کوشش نہ کریں کیونکہ بسا اوقات حیات اللہ کو اس اڑان کا خمیازہ بھگتنا پڑا ہے۔ اس کا قصہ یوں ہے کہ ایک بار یوپی اسمبلی میں کبھی وزیر مالیات حافظ محمد ابراہیم نے اپنی بدقسمتی سے بجٹ تقریر میں انڈوں کا ذکر خیر فرما دیا۔ دوسرے دن جب یہ تقریر اخبارات میں چھپی تو حیات اللہ نے اپنی امید پرستی کے ہاتھوں اس کی بڑی مٹی پلید کی ——— انڈوں کی جیت اور ان کے تخیل نے سینکڑوں ہوائی قلعے بنا ڈالے۔ پھر یہ ہوائی قلعے اڑا اڑا دھم گرے اور بیچارے حیات اللہ دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ اب یہ نوبت پہنچ گئی ہے کہ وہ انڈوں کے مقدمہ سے مایوس ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن اس پر بھی انہوں نے صبر اور تخیل کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے اور اب وہ "سرد جنگ" کی تیاری کر رہے ہیں۔ وہ جمہوریت کی فتح پر بھرپور اعتماد رکھتے ہیں۔

ان کے تخیل کی اڑان کی ایک دوسری مثال بھی سنتے چلئے۔

۱۹۴۲ء میں غیر منقسم ہندوستان کی جو سیاسی صورت حال تھی اس سے کم و بیش سب ہی واقف ہیں۔ یہاں ان افسوسناک واقعات کا اعادہ

کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن وہ [illegible] حیات اللہ پارس نہیں تھے۔ ان کے تخیل کی اڑان کا وہی حال تھا۔ چنانچہ ۔ ۔ جو وہ [illegible] کر بیٹھے
یہ خواب لکھ بیٹھے۔

"...... جو تحریک چھ ماہ پہلے اس پر بحث ہو رہی تھی۔ یہ ہے۔ اب ہندوستان کو آزاد ہوئے دو سال کو ختم ہوئے آخری مہینوں کی وہ بات ہے۔ یہاں قربانیوں کی ضرورت ہے"

مجھے اس کا اقرار ہے کہ دستور کی طرح اس بارے میں ان کے ساتھ بدرشت کی حد پر جا پہنچا۔ لیکن یہ کوئی واقعات پیش آئے ان سے مجھے محسوس کیا۔ اگر میں دستور کی جگہ کرشانہ میں ہی مادمنک کے چکر میں پڑ گیا ہوتا۔ لیکن یہ نہ مجھے کہ حیات اللہ انصاری کی اس تخیل پرستی پر حقیقت سے بالکل ناطہ توڑ لیا جاتا ہے۔ میں نے ان کے لئے انہیں پڑھتے وقت ایسے ہی مشکل سے دو چار ہوتے دیکھا ہے۔ یہ اسی معاملے میں یہ ہوا کہ وہ مجھے یہ خط تحریر کر اپنے دوست اور انگریزی کا ول "کنٹسٹ پوائنٹ" مصنف راجا راؤ کے ہمراہ اس کوشش میں کل فرصے ہوئے کہ روحانی سامراج کے مظالم کی داستان کو غیر ملکی اخباروں میں شائع کرایا جائے۔ یہ راجا راؤ بھی عجیب خوابی انسان ہیں۔ اپنے تخیل کی اڑان میں حیات اللہ سے ہزاروں ہزار ہاتھ آگے۔ حیات اللہ دلتقسیم اسٹریٹ کے ایک کمرے میں بیٹھ کر بدرشت کو سرسری سی تحت ... تھے۔ یہ راجا راؤ تو ہوائی جہاز پر سفر کرتے تھے۔ یہ لئے ... پر پچھے ان نے عقل کی اڑان۔ اس پر نے پر ... ہماری گاڑی والے کی ذات تھی جو اپنی حیثیت حقیقت پسندی سے دونوں کو بریک دیتے تھے۔

اس وقت (۱۹۵۶ء) حیات اللہ انصاری قومی آواز، دستخطی مہم اور فرقہ پرستوں کے خلاف جہاد کرنے کا دوسرا نام ہے۔ دستخطی مہم کے سلسلے میں اوپر کہیں ذکر آ چکا ہے۔ جب انہوں نے اس مہم کو شروع کیا تھا تو بہت کم لوگوں کو اس بات کا یقین تھا کہ وہ بیس لاکھ دستخط جمع کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس زمانہ میں ہندوستان کا جو سیاسی مزاج تھا اس پر یہ بات ناممکن ہی نظر آتی تھی۔ لیکن انہوں نے دیکھتے دیکھتے ایک عظیم الشان تنظیم کھڑی کر دی۔ جس نے پوری لگن کے ساتھ بیس لاکھ دستخط جمع کر کے صدر جمہوریہ ہند کی خدمت میں پیش کر دیئے۔ آج اگر یہ ان کی کوششیں بار آور نہیں ہوئی ہیں تو اس میں ان کا قصور نہیں ہے۔ ہندوستان کے جمہوری مزاج کا قصور ہے اور جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے حیات اللہ کو ہندوستان کی جمہوریت پر اٹل بھروسہ ہے۔ اس لئے وہ اس سلسلہ میں اپنے بس بھر کام کئے جا رہے ہیں۔ اس مہم کے سلسلہ میں حیات اللہ نے ان دیکھے میدانوں کو سر کیا۔ بڑے بڑے پنڈوں سے ٹکرلی۔ یہاں تک کہ انجمن ترقی اردو کے معتمد قاضی عبد الغفار مرحوم تک کی مخالفت مول لی۔ اس سلسلہ میں انسانی فطرت کی کمزوری کے پیش نظر ممکن ہے کہ دونوں میں قیادت کے لئے بھی رسہ کشی ہوئی ہو۔ لیکن قاضی عبد الغفار کے انتقال کے بعد انہوں نے قومی آواز میں جو اداریہ لکھا اس میں اردو کی جدوجہد کا سہرا قاضی صاحب مرحوم کے سر باندھ دیا۔ جو لوگ حیات اللہ کے مزاج سے ناواقف تھے انہوں نے منہ میں انگلیاں دبا لیں۔ جب حیات اللہ کو اس حیرت کا علم ہوا تو انہوں نے اپنی مخصوص دلکش مسکراہٹ پر اکتفا کی۔

اسی طرح کا ایک ہنگامہ مجاز مرحوم کے انتقال کے موقع پر اس وقت پیش آیا جب انہوں نے "مجاز رخصت ہو گیا" کے عنوان سے ایک اداریہ سپرد قلم کیا۔ اس اداریہ میں حیات اللہ نے دل کھول کر مجاز کے فن کی تعریف کی۔ صحیح معنوں میں اس اداریہ میں انہوں نے خون کے آنسو بہائے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ انہوں نے اپنی عادت کے مطابق کمیونسٹ پارٹی کی بھی خبر لے ڈالی اور اس بات پر اظہار افسوس کیا کہ "مجاز اس لئے چاند بن کر نہ چمک سکے کہ وہ ایک ایسی جماعت سے وابستہ تھے جو ادب کو اپنے مفاد کے مسائل اور ایک خاص سیاسی نظریے سے منسلک رکھنا چاہتی ہے ...... "

علی سردار جعفری جو ان دنوں ایک مشاعرہ کے سلسلہ میں لکھنؤ آئے ہوئے تھے انہوں نے اداریہ کو پڑھا۔ اپنے مخصوص انداز میں بالوں

کہ دونوں ہاتھوں سے سر کے پیچھے پسینا اور کہا کہ "حیات نے سب ٹھیک لکھا ہے مگر ...... [illegible] سے
پیراگراف کو ترقی پسند کے ہمدردوں کو کہلایا کہ یہ غلط ہے اس موقع پر یہ نہ کہنا چاہئے تھا۔"
واقعی اگر حیات اللہ اس موقع پر اپنے ذہنوں کو نہ کریدتے تو اچھا تھا۔ یہ ان کا بنیادی حق بھی تھا لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ نہ جانے کتنے لوگوں میں سے جو ہیں جو مجاز سے متاثر ہوئے بغیر بے باکی سے اپنے خیالات کو ڈنکے کی چوٹ پر کہہ سکیں۔ اس کے دوسرے دن جہانگیر پارک میں ایک جلسہ ہوا جس نے سبھی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس جلسہ میں حیات اللہ بھی بولے۔ بلکہ انہوں نے یہاں بھی اپنا صاف صاف مسلک ظاہر کیا اور مجاز کی شاعری پر ایک نئے انداز سے روشنی ڈالی۔

حیات اللہ بڑے پیارے دوست ہیں۔ ان کی سنجیدگی کے پیچھے ایک بڑی زندہ دل، ہنسوڑ اور چلبلی شخصیت چھپی ہوئی ہے۔ وہ اپنے دوستوں کی کمزوریوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ انہیں تنگ کرتے ہیں۔ خود ہی ان دوستی پر زندہ رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن انہیں عمدہ پراٹھے، قورمہ، کباب اور پلاؤ کھلاتے ہیں۔ دوستوں کی بیویوں کو شوہروں کے خلاف بغاوت کرنے پر اکساتے ہیں۔ چنانچہ جذبی کے ساتھ علی گڑھ میں ایک دلچسپ لطیفہ پیش آ چکا ہے۔ حیات اللہ کسی کام سے علی گڑھ گئے ہوئے تھے۔ جذبی ان کے پرانے رفیق اور دوست ہیں۔ ان کی بیوی نے شکایت کی کہ بیوی کے ساتھ باہر نکلتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ کبھی سینما تک ساتھ نہیں جاتے۔ حیات اللہ نے انہیں تسلی دی اور یقین دلایا کہ اس مرتبہ ایسا انتظام کر کے جائیں گا کہ جذبی ہمیشہ آپ کے ساتھ سینما جائے گا۔ وہ تھیرا بڑا شاعر اور یونیورسٹی کا لیکچرار شاید اسے یہ ڈر لگتا ہوگا کہ اس کے طالب علموں کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ وہ جذبی بیوی کے ساتھ نکلتے ہیں۔ جب اس دن جذبی گھر واپس آئے تو حیات اللہ نے انہیں دوسرے شو میں بیوی کے ساتھ سینما جانے کا الٹی میٹم دے دیا۔ جذبی گھبرا گئے۔ مگر مجبور تھے وہ خود اتنے شریف واقع ہوئے ہیں کہ اس خرافات کی مدافعت کرنا ان کے بس سے باہر ہے۔ اس واقعہ کے بعد حیات اللہ لکھنؤ واپس آ گئے۔ معلوم نہیں جذبی کے طالب علموں کو اس بات کا علم ہوا یا نہیں کہ جذبی اپنی بیوی کے ساتھ سینما دیکھتے ہیں۔ طالب علموں کو چاہئے معلوم ہو یا نہ ہو لیکن ہماری دعا ہے کہ اس کی خبر مولانا عبدالماجد دریابادی کو نہ ہونا چاہئے کہ حیات اللہ عورتوں کی صورتوں کو سینما دکھاتا پھرتا ہے۔ کیونکہ اگر انہیں اس بات کا علم ہو گیا تو حیات اللہ کی خیریت نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں یاد آیا کہ قومی آواز جب شروع شروع میں نکلا ہے تو حیات اللہ نے مولانا عبدالماجد دریابادی سے بھی مضمون لئے تھے۔ لیکن حیات اللہ تھیرے شگفتہ مزاج کے انسان انہوں نے طرزِ سنگ کے بجائے اس بھاری پتھر کو چوم کر چھوڑ دیا۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ ذکر حیات اللہ کے اچھے اور دلچسپ دوست ہونے کا تھا۔ ہر شخص کی طرح حیات اللہ کا بھی ایک مخصوص حلقہ احباب ہے۔ ان کی روح کی گہرائیوں میں جھانکنے کے لئے اس حلقہ احباب میں شامل ہونا ضروری ہے۔ یہاں حیات اللہ ایک بالکل مختلف انسان ہیں۔ جو آپ کو سستے پھلوں کے خریدنے کے گُر سے کر کباڑی اور نخاس کے سستے مال کے ذریعہ گھر کو سجانے کی ترکیبیں بتلاتے نظر آئیں گے۔ حیات اللہ بچپن سے پیٹ کے مریض ہیں۔ شاید بچپن میں ماں کے قبل از وقت انتقال کی وجہ سے باپ نے بہت زیادہ دلار کیا ہوگا جس کی وجہ سے ان کا معدہ کمزور ہو گیا۔ بہرکیف وجہ کچھ بھی رہی ہو اس پیٹ کی بیماری کا سلسلہ آج تک قائم ہے۔ اور اب وہ اس کا علاج غذاؤں اور دواؤں کے ذریعہ خود کر لیتے ہیں۔ یہاں تک تو ٹھیک ہے لیکن آگے چل کر یہ معاملہ نازک صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ صورت اس وقت پیش آتی ہے جب ان کا کوئی دوست دردِ سر، بے خوابی یا اسی قسم کی کسی دوسری شکایت کا ذکر کرتا ہے۔ حیات اللہ فوراً سنبھل کر بیٹھ جاتے ہیں۔ "اچھا تو آپ کو یہ شکایت ہے؟" پھر اس شکایت کا شجرہ بدہضمی سے ملا کر کہیں گے: "سب پیٹ کی خرابی ہے، کبھی آپ کو بدہضمی تو نہیں ہوئی؟" اب وہ بیچارہ دوست ذہن کو کھنگال کر کہتا ہے کہ "جی نہیں بدہضمی کبھی نہیں ہوئی۔ مجھے کیا میری سات پشتوں کو یہ موذی مرض کبھی نہیں ہوا۔" لیکن حیات اللہ اس کی بات کا اعتبار نہیں کریں گے۔ فوراً کھانے اور نہ کھانے کی ایک لمبی چوڑی فہرست گنا

[illegible] شیعہ بھی ہے [illegible] آ جاتا [illegible] دوست ہے تو ان سے ملنے [illegible]
گے۔ پھر حیات بھائی [illegible] دوست [illegible] تک [illegible] ضرورت نہیں آتی۔ چنانچہ تکیہ کی جگہ کی تنگی
دیکھ کر [illegible] سوال [illegible] حیات اللہ [illegible] آپ [illegible] سجدہ کر لیا [illegible]
[illegible] مسلمان [illegible] ہو جائے گا۔

اس سلسلہ میں مجھے یاد آتا ہے کہ [illegible] میں انہیں [illegible] قرآن [illegible] سے [illegible] تشویش پیدا ہو گئی۔ [illegible]
[illegible] سب [illegible] کی صحت [illegible] جب [illegible] سب کی صحت [illegible]
[illegible] کی ایک فہرست [illegible] ایک [illegible] سب [illegible]
[illegible] کے ذریعہ [illegible] حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ [illegible] تجربات [illegible]
[illegible] اس سلسلہ میں [illegible] کوشش کرنے کے قابل ہے کہ فضل [illegible] وقت [illegible] جب [illegible] لوگوں [illegible]
جواب [illegible] بار [illegible] ملازمت [illegible] نہیں [illegible] حاصل [illegible]

پھر اسی صحبت میں حیات اللہ [illegible] شروع [illegible] ایک [illegible] پوچھا [illegible] گے۔ [illegible]
ایک زمانہ میں حیات اللہ خدا کے قائل نہیں تھے۔ [illegible] ہے [illegible] بڑی [illegible]
ایک [illegible] کی طرح [illegible] دیکھتے ہیں۔ [illegible] پوچھا گیا کہ آپ [illegible]
[illegible] کتاب [illegible] یا نہیں — حیات اللہ [illegible] ہو گئے۔ [illegible] کی آنکھوں میں [illegible]
[illegible] کس طرح؟ [illegible] اور پھر [illegible] ہو سکتی ہے [illegible]
[illegible] اصرار کیا گیا۔ کہنے لگے میں ایک [illegible] ادیب ہوں [illegible] ذکر کیجئے [illegible] شخص میں [illegible]
[illegible] کسی کی خودی مٹ جائے [illegible] ہو سکے گا [illegible] ایک [illegible] اب آپ [illegible] نام
[illegible] لیجئے۔"

ان کے اس استدلال کو ہم جیسے انسان تخیل کی [illegible] ہیں گے۔ لیکن [illegible] زبان کو سمجھنے والوں کے لئے [illegible] حالت پوشیدہ
حیات اللہ کا بچپن اور زندگی کا بڑا حصہ لکھنؤ میں گزرا ہے۔ ان کا لکھنؤ کے علماء کے فرنگی محل کے [illegible] خاندان سے تعلق ہے۔ [illegible] حاصل کئے
[illegible] کی خاندانی روایات کا اثر ہے یا ان کے گاندھیائی ہونے [illegible] بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ لیکن [illegible] سوال کا جواب دینے کے لئے حیات
کہا جائے تو یقین ہے کہ وہ گاندھی جی کی تعلیمات کو اپنے خدا تک پہنچنے کا وسیلہ قرار دیں گے۔

نفاست کے اعتبار سے حیات اللہ پورے لکھنوی ہیں۔ وہی لب و لہجہ (لیکن تصنع سے پاک) وہی بول چال کا [illegible] وہی تہذیب کا رکھ
[illegible] لکھنؤ میں ان کا قیام شہر کی نئی آبادی والے حصہ میں ہے۔ عید بقرعید کے موقع پر وہ صرف اپنے بزرگوں سے ملنے فرنگی محل جاتے ہیں اور اس
[illegible] شدت سے اصرار کرتے ہیں کہ ان کے چھوٹے ان سے ملنے کے لئے نہ [illegible] آئیں۔ چنانچہ فرنگی محل جانے کا انہوں نے کچھ ایسا طریقہ اختیار کیا ہے
[illegible] خاندان کے چھوٹوں کو ان سے عید ملنے کے لئے ان کے گھر جانا پڑتا ہے۔

لکھنؤ میں جہاں بہت سی خوبیاں ہیں وہاں ایک تہذیبی برائی یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے دو فرقے شیعہ اور سنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ
بنائے بیٹھے ہیں۔ لیکن حیات اللہ نے بہت شعوری طور پر اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ شیعہ سنی علماء اور علمائے شہر کا یکساں احترام
کرتے ہیں۔ وہ دونوں فرقوں میں یکساں مقبول ہیں۔ شیعہ علماء اور شرفا کے گھرانے کی کوئی ایسی تقریب نہیں ہوتی ہے جس میں حیات اللہ کو مدعو

دکیا جاتا ہو۔ مدعی ہے کہ جب لکھنؤ میں مدح صحابہ اور تبرّا کے سلسلے میں باہمی تعلقات بہت خراب ہوگئے تھے تو ان ہی دنوں میں حیات اللہ نے شیعوں کی شیعہ درس گاہ سلطان المدارس کے طلباء کے حقوق کے لئے ایک تحریک کی رہنمائی کی تھی۔ جس میں طلباء نے ایک لمبی ہڑتال بھی کی تھی لیکن کسی مرحلے پر بھی حیات اللہ کو اس لئے مورد الزام نہیں ٹھہرایا گیا کہ وہ شیعوں کی درس گاہ کی تخریب کر رہے ہیں۔ وہ ملّت اسلامیہ کی شان کے کچھ ایسے ستون نہیں ہیں جیسے انہیں کار دانتے ہیں۔

اس مضمون کے شروع میں آنحضرت کی ذات کے متعلق ایک دل آزار اشتہار کا ذکر آ چکا ہے۔ اس سلسلے میں حیات اللہ نے شہر میں جو مجلس عمل بنائی تھی اس میں دونوں فرقوں کے نمائندوں کو شریک کیا تھا۔ پھر جب مجلس عمل کے ایک عالم نے جو ان کے عزیز ہوتے ہیں مجلس عمل کے فیصلے سے انحراف کیا تو حیات اللہ نے بغیر کسی قسم کی رو رعایت کے اخبار کے ذریعہ ان کا پول کھولا۔ اس واقعہ کے سلسلے میں ان کی وہ غیر فرقہ پرست شخصیت بھی کافی مجروح ہوئی۔ لیکن اس کی انہوں نے فکر پروا نہیں کی۔ جب ان سے کہا گیا کہ آپ اس تحریک کے ساتھ بہت دور تک چلے گئے ہیں تو انہوں نے نہایت ٹھنڈے لہجے میں جواب دیا کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حیات اللہ اگر اپنے اخبار میں اس تحریک کے خلاف کچھ لکھ دیں گے تو معاملہ ختم ہو جائے گا وہ معاملہ کی نزاکت اور مسلمانوں کے جذبات سے واقف ہی نہیں ہیں۔ لوگوں کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ لیکن اس دھن کے پکے شخص نے اس معاملہ سے نپٹنے کے بعد دوسرا مورچہ سنبھالا اور بالآخر مخالفین کو یہ سمجھانے میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کی کہ انہوں نے اس معاملہ میں جو رویہ اختیار کیا تھا وہ بالکل صحیح تھا۔

حالات نے اس وقت حیات اللہ کو سیاست میں حصہ لینے پر مجبور کر دیا ہے جس کے لئے وہ بالکل نادم اور شرمندہ نہیں ہیں۔ لیکن یہ ایک بہت افسوسناک بات ہے۔ دراصل وہ بنیادی طور پر ایک فن کار اور مفکر ہیں اور یہیں ان کی جگہ ہے۔ چند سال ادھر وہ ایک صحافتی وفد کے ساتھ مصر گئے تھے۔ وہاں سے واپسی پر وہ اپنے ساتھ فراعنہ مصر کی داستانیں، بادشاہوں اور شہزادیوں کے قصے اور وادیٔ نیل کے رومان کی کہانیاں لے کر آئے۔ مصر کی سماجی زندگی کے اور بہت سے پہلوؤں کا بھی جمالیاتی نقطۂ نظر سے مطالعہ کر کے لوٹے۔ لیکن انہیں وہاں شاہ فاروق کے خلاف ہونے والی سازش اور اس انقلاب کی کوئی بو باس نہیں ملی جو ان کی واپسی کے چند ماہ یا شاید چند ہفتوں کے بعد رونما ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مخصوص حالات کی وجہ سے وہ ایک سیاسی آدمی ہو گئے ہیں ورنہ اس سے انہیں فطری لگاؤ نہیں ہے۔

بعض لوگوں کا اب سے چند سال قبل یہ خیال تھا کہ اگر سی حیات اللہ بس چند دنوں کی بات ہے کہ وزیر نہیں تو نائب وزیر اور وہ بھی نہیں تو پارلیمنٹری سکریٹری ضرور ہو جائیں گے۔ لیکن حیات اللہ کی ذات سے ایسا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ انہوں نے اُردو کی تحریک اور اقلیت کے حقوق کے لئے جس جان جوکھم کی منزل میں قدم رکھا ہے وہاں سے سرکاری کرسیاں بہت دور ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ بعض دوسرے لوگوں کی طرح حیات اللہ منزل سے پلٹ پڑنے کے لئے کوئی چور دروازہ کھلا ہوا نہیں رکھتے ہیں۔ جب وہ اپنی منزل پر روانہ ہونے لگتے ہیں تو چور دروازہ تو چور دروازہ وہ معمولی دروازے اور جھروکوں کو بھی بند کر دیتے ہیں۔ آج اپنی اس سچائی اور خلوص کی وجہ سے وہ پہچانے جاتے ہیں۔ اگر ہندستان میں اقلیت کی تاریخ ختم نہیں ہو گئی ہے تو آگے چل کر حیات اللہ کا نام یقیناً ان چند گنے چنے لوگوں میں ہوگا۔ جنہوں نے ہندستان کے جمہوری نظام میں اسے معزز جگہ دلوانے کے لئے کام کیا اور دوسروں کو ان کا کھویا ہوا اعتماد واپس دلوایا۔

حیات اللہ کو کسی نے غصہ آتے نہیں دیکھا۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو ان کے سب جاننے والوں کو معلوم ہے۔ لیکن ان سے اسکے بارے میں استفسار کیا گیا تو وہ مسکرائے "سلطانہ نے یہ غصہ دیکھا ہے" ——— اس غائبانہ سچائی نے استفسار کرنے والے کو غرق حیرت کر دیا۔ بعد کی تحقیقات سے معلوم ہوا کہ حیات اللہ کو بھی غصہ آتا ہے جلد ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ بھی جلتے ہیں اور وہ سب کچھ کرتے ہیں جو ایک عام شوہر کرتا ہے۔ لیکن اس داستان کی تفصیل بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔ پھر کچھ باتیں سلطانہ حیات کو بھی تو کہنا چاہئیں جو حیات اللہ کے ساتھ دس بارہ برس سے بڑی خوشگوار زندگی گزار رہی ہیں۔

اوپندر ناتھ اشک

کوشلیا اشک

اشک جی نے اپنی ایک ہندی نظم میں کہا ہے:

اور میں دریا
چر کا چلا
تھکا اور ہارا
لتھ گتی سے میدانوں میں بہنے والا
مون، گمبھیر، شانت، وشرانت
پرجن کی سب یاد بھلا کر
روٹھ روٹھ کر
بہتا ہوں اوپرانت[1]

---

[1] اور میں دریا
بہت دیر کا چلا ہوا
تھکا اور ہارا
آہستہ آہستہ میدانوں میں بہنے والا
خاموش، گمبھیر، شانت
بھائی کی سب یاد بھلا کر
روٹھ اور لٹا کر
بہتا ہوں کھویا کھویا سا

لیکن سکون کی ایک گہری سی بیاد کے ساتھ آہستہ آہستہ چپ چاپ اگر سے کمرے سے چھا رہا کی شان سے ایک پرانی چھت کی اندرونی مرہم سا اس کی شان نحیف و نزار لہجہ اور بے حس سا بھدا سا برسات کے موسم میں کنارہ کر ترو تازہ — قہقہے کا بہاؤ اندر بھٹکتا ہے اسے کڑک گرک سے نکل جھک کر بھی قریب المرگ زخمی سانپ سا آہستہ آہستہ بل کھاتا ہوگا۔

صبا کی روانی کی ہی وہ صورت اشک جی کے مزاج کی مرہون ہیں۔ ان کے مزاج کی ایک انتہا کو دیکھ کر اس کے بارے میں کسی طرح کا یقینی اندازہ لگانے والا شخص جب اس کی دوسری انتہا کو دیکھے گا تو صرف اسے حیرت ہوگی بلکہ اس کے اس یقین کو بھی صدمہ پہنچے گا۔

اشک جی نے اپنے تعارف اور اپنی شادی کے اولیں دنوں پر بڑی وضاحت سے روشنی ڈالی ہے جس نے دریا کی روانی کا محض سوائی سدھپ ہی دیکھا ہے ——— چھوٹی عمر ہی میں اشک جی کی شادی ہوگئی تھی۔ ایک بھری پری ناخواندہ دیہاتی لڑکی کے ساتھ۔ وہ کسی قابل ہوئے تو وہ تپ دق جیسے موذی مرض کے بعد اسے موت کی گود میں سلا دیا۔ اس کی وفات سے اشک جی کو بڑا صدمہ پہنچا۔ ان کے ساتھ پہلی بیوی کے بچے کے رشتے بھی ٹوٹ گئے ہیں۔ اشک جی کو پہلی بیوی پسند تو نہ تھی لیکن جب اس کی وفات کے بعد اسے چاہنے لگے تھے۔ انہوں نے جلد ہی دوسری شادی کی۔ سب جج کرنے کے لئے تو وہ پاس کیا تھا لیکن مقابلے کے امتحان سے محض دو مہینے پہلے بیوی کے رحلت کر جانے کی وجہ سے افسردہ دل ہو کر انہوں نے سب جج بننے کا خیال چھوڑ دیا اور اپنے فطری رجحان کے مطابق ادب کی خدمت میں محو ہو گئے۔

لاہور کی زندگی ان دنوں کافی بھیانک رسوا تھی۔ کہیں نہ کوئی سکینڈل اٹھ کر ان پر لپکا۔ وہاں سے سکون کی تلاش میں نکلے تو وسط پنجاب کے ایک گاؤں پریت گڑھ میں جا پہنچے۔ وہاں بھی رسوائی نے پیچھا نہ چھوڑا۔ ایک لڑکی کے سلسلے میں خاصہ سکینڈل پھیل گیا۔ اشک جی اتنے تنگ آ گئے کہ انہوں نے اپنے بھائی کو لکھ دیا ——— "میری شادی کہیں کر دو۔" بھائی صاحب نے دیکھے بھالے بغیر ایک جگہ سگائی طے کر دی۔ کچھ دنوں بعد انہوں نے محسوس کیا کہ خاصی جلد بازی ہو گئی ہے۔ پہلے بھی شادی کچھ ایسے ہی ہوئی تھی۔ تجربات کافی تلخ تھے۔ انہوں نے بھائی صاحب سے کہا۔ "یہ سگائی چھوڑ دیجئے۔" بھائی صاحب نے انہیں دور کے رشتے کی ہم سگائی طے کر دی تھی وہ نہیں۔ وہ سخت مذبذب اور ذہنی پیچ کی ایسی ہی حالت میں ٹھکرائے اداس اور برگشتہ خاطر تھے۔ جب ان سے میرا تعارف ہوا اور میں نے ان کے مزاج کا وہی روپ دیکھا جس کا ذکر انہوں نے اپنی مسند جرہا نظم میں کیا ہے۔

میرے نانا ضلع منٹگمری میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ وہ ہر آتی لوئر بیدن روڈ پر اپنے ماما جی کے ہاں ٹھہرتی۔ اشک جی وہیں مجھ سے ملنے آیا کرتے۔ آتے تو ڈرائنگ روم میں جیسے چپ چاپ بیٹھ جاتے گویا منہ میں زبان ہی نہ ہو۔ کوئی بات پوچھتی تو نپی تلی اور دھیمی آواز میں جواب دیتے کہ قریب بیٹھا شخص ہی سن سکے۔ ان دنوں میں سوچا کرتی تھی کہ ان کی اس خاموشی اور سنجیدگی کو کیسے اپنا سکوں گی ——— آپ میری حیرت کا اندازہ کر سکتے ہیں جب اپنی شادی کے ایک ماہ بعد ہی میں نے انہیں فلک شگاف قہقہے لگاتے دیکھا اور مجھے سننا پڑا کہ میں بے حد سنجیدہ مزاج ہوں اور شاید ان جیسے ہنس مکھ ہلکے مزاج آدمی کے ساتھ نہ چل سکوں۔

کبھی اس حد پر اور کبھی اس کے عین برعکس دوسری حد پر چلنے والے اشک جی کے مزاج کا محض ایک پہلو دیکھنے والا جب اچانک اس کا دوسرا پہلو دیکھتا ہے تو وہ کچھ لمحے کے لئے حیران و مبہوت رہ جاتا ہے ——— اپنی ازدواجی زندگی کے گذشتہ سات برسوں میں (ہماری شادی کو صرف سات برس ہوئے ہیں) حیرت کے ساتھ دھچکا سا لگانے والے ایسے کئی لمحے آئے۔

شادی کے اولیں دنوں کا ذکر ہے۔ ایک بار ہم نے کچھ احباب کو مدعو کیا۔ ان دوستوں میں کچھ اشک جی سے عقیدت بھی رکھتے تھے جو سب

ہمارا ... [illegible] ... مگر ہم نے سب سے دسترخوان پہ بیٹھنے کے لئے کہا۔ جب سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تو میں نے اپنے دائیں طرف اور بائیں طرف بیٹھے ہوئے مہمان سے کھانا شروع کرنے کو کہا۔ انہوں نے پورا اتفاق اور ... [illegible] ... کی وجہ سے ساتھ بیٹھے ہوئے اشک جی سے کہا: جی آپ ہی شروع کیجئے ... [illegible] ... سے ... [illegible] ... کی طرف بڑھا دیا۔

اشک جی اپنی عادت کے مطابق ... [illegible] ... باتیں کر رہے تھے ... [illegible] ... اسی طرح ... [illegible] ... کے ... [illegible] ... اپنی پلیٹ میں سالن ڈالا ... [illegible] ... اور ... [illegible] ... یہ سالن ... [illegible] ... وغیرہ اپنی پلیٹ میں ڈال لئے ... [illegible] ... سب سے ... [illegible] ... نکلے ... [illegible] ... پر ... [illegible] ... کرسی ... [illegible] ... لیا ... [illegible] ... آپ نے کھانا شروع کر دیا۔

میں نے ... [illegible] ... سے کہا: آپ نے کھانا شروع کر دیا ... [illegible] ... رہے ہیں؟

اشک جی نے فوراً سوال کیا: میں ... [illegible] ... بیٹھے ... [illegible] ... کھانا ... [illegible] ... تکلف ... [illegible] ... رہیے۔

اور یہ ... [illegible] ... ہے۔

سب کچھ ... [illegible] ... ساری ... [illegible] ... آگے بڑھا دیئے۔

اسی طرح ایک بار ... [illegible] ... ضرورت سے زیادہ ... [illegible] ... مہمان زیادہ آ گئے ... [illegible] ... سب ... [illegible] ... ہیں ... [illegible] ... کچھ کم پڑے ... [illegible] ... کوئی ... [illegible] ... نہ ... [illegible] ... آپ ... [illegible] ... سے ... [illegible] ...

بولے: ... [illegible] ... سب ٹھیک ہے اور کچھ ... [illegible] ... ہرگز کوئی ضرورت نہیں ... [illegible] ... سب ... [illegible] ...

میں نے کہا: ... [illegible] ... تھوڑا تھوڑا ... [illegible] ... سب کی پلیٹوں میں ڈال دیجئے گا۔

بولے: تم ذرا بھی فکر نہ کرو، میں سب دیکھ لوں گا۔

اور ... [illegible] ... دوستوں سے باتوں میں ... [illegible] ... میں بھی ... [illegible] ...

جب وقت پر سب کھانے کے لئے بیٹھے تو میں نے ... [illegible] ... کی طرف ... [illegible] ... انہوں نے ... [illegible] ... اور کافی مقدار میں اپنی پلیٹ میں ڈال کر بولے: "دیکھو بھئی ... [illegible] ... بس اتنی ہی ہے۔ لیتے وقت ذرا دوسروں کا خیال رکھئے گا۔"

شرم کے مارے ... [illegible] ... لال ہو گیا۔ میں نے کہا: "آپ تو دوسروں کا خیال رکھئے۔"

"ارے ... [illegible] ..." کہتے ہوئے انہوں نے ... [illegible] ... لگایا۔ "اب تو ... [illegible] ... ہو گیا نہیں ... [illegible] ... دیا ..." اور پھر مجھ سے معافی مانگتے ہوئے بولے: "غصے کیوں ہوتی ہو، یہ سب اپنے آدمی ہیں۔ یہاں کھانا کھانے تھوڑی آتے ہیں۔ اس بہانے کچھ دلچسپ گھڑیاں بن جاتی ہیں۔" اور دوستوں سے بولے: "لو یار تھوڑا تھوڑا۔ یہ تو ... [illegible] ... لگی تھیں میں نے روک دیا کہ تم سب اپنے آدمی ہو، تکلف کی کیا ضرورت ہے۔"

اشک جی کے لئے سبھی اپنے آدمی ہیں۔ جامعہ ملیہ دہلی کے پروفیسر ... [illegible] ... نے ان کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے:

"اشک کی طبیعت میں اجنبی پن نام کو نہیں۔ پہلی ہی ملاقات میں آپ سب کچھ دیں گے
سب سے بے تکلف اور سب کے دوست۔"

اور مجھے ان کے ساتھ اپنی پہلی ملاقات کی یاد آ جاتی ہے۔

مجھے بیمار سے ملنے میں دیر ہو گئی تھی لیکن پھر سب سے پہلے پریت نگر سے لاہور پہنچ گئے تھے۔ میں ابھی غسل وغیرہ سے فارغ ہوئی تھی
کہ آپ کا چھوٹا بھائی پہنچا۔ معلوم ہوا کہ اشک جی کو آئے چار پانچ گھنٹے ہو چکے ہیں، ان کی طبیعت خراب ہے اور ان کی کمزوری سے ان کی کمر
پر گہری چوٹ آئی ہے اور اگر مجھے خاص تکلیف نہ ہو تو میں بھی اُدھر ہی چلوں۔

اشک جی کے چھوٹے بھائی لاہور میں دانتوں کے ڈاکٹر تھے۔ ماڈل ہاؤس سوسائٹی کے سامنے ان کی سرجری تھی۔ ان کے بھائی نے مجھے ان کا پتہ بتایا۔
میں نے کہا: "آپ چلیں میں کچھ کر کے آدھ گھنٹے میں خود ہی وہاں پہنچ جاؤں گی۔"

میں نے اشک جی کو پہلے بھی دو ایک بار دیکھا تھا۔ سلک کا بنگالی کرتا اور باریک کورے کی دھوتی پہنے۔ حلقہ اربابِ ذوق لاہور کے جلسوں میں
ان کی نظمیں بھی سنی تھیں لیکن وہ مجھ سے واقف نہ تھے، چند خطوں ہی کا تعارف تھا۔ دوکان کی چق اٹھا کر میں اندر داخل ہوئی تو میں نے دیکھا کہ اشک جی
اور کھلے گلے کی قمیص پہنے بیٹھے ہیں۔ ایک آنکھ پر پٹی بندھی ہے جو نصف سر کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہے۔ قمیص کے کھلے گریبان میں سے تھی اور
پتلون کی بجائے تہبند بھی نہیں تھی۔ بڑی حیرت کو چھپا کر میں نے نمسکار کیا۔ میرے نمسکار کا جواب دئے بغیر بولے: "آؤ!" میں بیٹھنے ہی والی تھی کہ وہ یک
اٹھ کھڑے ہوئے۔ بولے: "یہاں مریضوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ گھر میں پتا جی آئے ہوئے ہیں اور بچے ہوتے ہیں۔ چلو بیدی کے ہاں چلتے ہیں۔"
اس سے پہلے کہ میں کچھ جواب دیتی آپ نے باہر نکل کر تانگے والے کو آواز دی اور اگلی سیٹ پر جا بیٹھے۔

بیدی کا نام سن کر نہ جانے کیوں میں نے سمجھا کہ ہم کسی ڈاکٹر کے یہاں جا رہے ہیں —— ڈاکٹر بیدی —— اور میرے تخیل میں جیسے طرح طرح کا
ایک ماڈرن مطب روم گھوم گیا لیکن جب گھوڑا ہسپتال کے پیچھے سے ہو کر ڈنگر کے باہر کی سڑک پر چلتے ہوئے تانگا ایک کچی گلی کے سامنے رکا
اور مکانوں کے آگے بنے ہوئے چوبچوں کی عفونت کے مارے دماغ پھٹا گیا (اس وقت تک شہر میں نالیاں نہ بنی تھیں اور مکانوں کا گندا پانی
ان کے آگے بنے ہوئے چوبچوں میں اکٹھا ہو جاتا تھا) تو میرا ماتھا ٹھنکا لیکن تانگے سے اتر کر میں چپ چاپ ان کے پیچھے پیچھے چلتی گئی۔

جس کمرے میں ہم داخل ہوئے وہ نہ جدید تھا، نہ میرے تصور کے مطابق سجا ہوا تھا اور نہ بیدی ہی ڈاکٹر تھے۔ کمرہ چھوٹا سا تھا اس میں ایک
پلنگ بھی بچھا تھا، ایک میز اور دو تین کرسیاں بھی تھیں اور "آؤ بیدی" کہہ کر اشک جی نے جس شخص سے ہاتھ ملایا وہ منجھلے قد کا ایک سیدھا سادا
سکھ نوجوان تھا۔ ننگے سر اور کچھا پہنے ہوئے۔

کمرے میں ایک نفیس سوٹ میں ملبوس ایک دوسرا سکھ نوجوان بھی بیٹھا تھا۔ اشک جی اسے جانتے تھے یا نہیں، یہ تو میں نہیں کہہ سکتی لیکن اس پر ایک
اڑتی سی نگاہ ڈال کر یہ اپنے دوست کو دھکیلتے ہوئے سا اندر صحن میں لے گئے اور اس سے بولے: "بھائی اپنے اس دوست کو جلدی چلتا کرو خواہ تمہیں
کتنا بھی عزیز نہ ہو۔" میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے: "ان کو زنانے جا کر بٹھاؤ اور مجھے کوئی پاجامہ لا دو تاکہ اس دھوتی کی قید سے نجات حاصل کروں۔"
اور اپنے دوست کو جواب دینے کا موقع دئے بغیر رسی پر دھو کر سوکھنے کی غرض سے پھیلا ہوا اور سوکھا ہوا ایک پاجامہ کھینچ کر "میں ابھی آتا ہوں"
کہہ کر اندر کمرے میں چلے گئے۔

میں حیرت زدہ سی بیدی صاحب کے ساتھ (کیونکہ یہ بیدی اردو کے مشہور افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی کے علاوہ کوئی دوسرے نہ تھے) پچھواڑے
اندر اس کمرے میں گئی اور جس کرسی کی طرف انہوں نے اشارہ کیا اس پر چپ چاپ بیٹھ گئی۔

کچھ عقیدت کے مارے اور کچھ اس لئے کہ میں اتنی دور سے اشک جی سے ملاقات کرنے آئی تھی میں ان سب باتوں کے باوجود جو میرے نزدیک
نہایت غیر مہذبانہ تھیں، چپ چاپ بیٹھی رہی۔ یہ جان کر کہ الفاظ سے کھیلنے والے بھی کوئی علاج نہیں، میں نے اس وقت تک اشک جی کی کوئی تحریر ہی پڑھی تھی
اور نظمیں سنی تھیں، ان کے افسانوں سے میں روشناس نہ تھی، دل ہی دل اس انہماک سے کھیل سکتے ہیں کہ آنکھیں نظر انداز ہیں، مجھے حیرت ہوئی تھی اور اگر جان
کی اس ترتیب قریب المرگ مصنف بے تکلفی کو دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گئی تھی لیکن اس عجیب پن کے باعث انہیں کچھ اور جاننے کا تجسس بھی

[illegible] پیدا ہو گئی تھی۔

[illegible] صاحب کو وہ بے تکلفی حاصل رہے گی جو میں نے بعد میں نہیں نہایت مخلص سطحیں جوش ہی دیکھا ہے [illegible] صاحب
[illegible] کے بنگلے میں ہی لیکن اپنے لطف ان کے معاملے میں نے انہیں اتنا ہی مہذب اور بااخلاق پایا ہے۔ اشک جی کو کبھی بہت دکھ پہنچا
[illegible] صاحب کو میں نے کبھی خواہ مخواہ یا ناروا طور سے رکھا سلوک کرتے نہیں دیکھا۔

مجھے پتا ہے کہ میاں صاحب اپنے ملاقاتی کو چلتا کرنے کو جاتے ہیں۔ مٹھائی کی طشتری اور سوڈے کا گلاس [illegible] لائے اور [illegible] کے سامنے رکھتے ہوئے بولے "لیجئے ڈاکٹر صاحب! آپ [illegible] آپ بیٹھے ہی کہاں ہیں؟"

ڈاکٹر صاحب (جو بعد میں معلوم ہوا کہ ڈاکٹر کہلانے والی ہستی سے بہت نیچی کرسی سے بڑے تھے) غالباً اپنے [illegible]
تھے۔ اگرچہ میاں صاحب نے "آتی دیر" کہتے ہوئے ان الفاظ پر [illegible] دیا تھا لیکن اس لطیف اشارے کو وہ کیا سمجھتے۔ انہوں نے بڑے اطمینان سے
تپائی کو اپنی طرف کھینچ کر اس کے نیچے گھٹنے ٹکا دیے اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مٹھائی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر منہ میں ڈال لیا۔

بیدی صاحب کے چہرے پر ایک رنگ آنے اور ایک جانے لگا۔ اپنی کرسی پر بیٹھے وہ پہلو بدلنے لگے۔ مجھے یہ یقین ہے کہ وہ اپنے
دوست کو کبھی نہ ٹال سکتے لیکن اشک جی نے کچھ سنبھل کر آنکھوں ہی آنکھوں میں اب اپنی کانفرنس ختم کر دیا اور کچھ وقت ہمارے لئے بھی دے دو۔
کوئی احمق ہی ہوگا جو اتنا سیدھا اشارہ نہ سمجھے۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب اچانک اٹھ کر اور بیدی صاحب سے ملاقات کا
وعدہ کر کے چلے گئے۔ اشک جی نے اگر مختصراً بیدی صاحب سے میرا تعارف کرایا۔ بیدی صاحب میری مٹھائی اور سوڈے کی ترکیب [illegible]
ہو اشک جی جا کر پلنگ پر تکیے ہو کر لیٹ گئے۔

وہیں لیٹے لیٹے انہوں نے آنکھ کی چوٹ سے جو بات شروع کی تو اپنی چوٹ اور حرارت کے باوجود اپنی زندگی کی کتنی ہی اور کتنی باتیں
کہہ گئے۔

لیکن سب سے بے تکلف اور سب کے دوست کی دوسری انتہا بھی ہے۔ یوں تو اشک جی دوسروں ہی سے نہیں بارہا پہلی بار ملنے والوں
سے بھی اپنی کمی کمی اور کمی باتیں کہہ دیتے ہیں لیکن جنہیں وہ اپنا دشمن سمجھ لیں اور ان کی توہین کر دے، انہیں وہ کر رہے رہتے ہیں۔ دس دس برس بعد
ملنے پر بھی کبھی اس پر اپنا جذبہ ظاہر نہیں ہونے دیتے اور دس برس بعد بھی اپنی ہتک کا بدلہ لینے سے نہیں چوکتے۔ یہ بات نہیں کہ وہ اپنے کردار کی اس خامی
سے بے بہرہ ہیں۔ بات چل پڑے تو اشک جی اس کا اعتراف کر لیتے ہیں۔ اسے وہ جہالت کا نشان بتاتے ہیں وہ ہمیشہ اپنی اس عادت سے نجات
پانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن انہوں نے ایسے خاندان میں جنم لیا ہے جہاں وہ اپنی توہین کا بدلہ لیتے چلے آتے رہے ہیں اور جب بھی کبھی ایسا واسطہ
کوئی ان کی ہتک کر دیتا ہے تو یہ پیدائشی جذبہ سے مجبور ہو کر دیا ہو کا سارا فلسفہ بالائے طاق رکھ کر اپنی اس توہین کا انتقام لینے کے لئے تل
جاتے ہیں۔ نہ اس توہین کو بھولتے ہیں اور نہ اس وقت تک سکون پاتے ہیں جب تک اس کا بدلہ نہ لے لیں یا دوسرا معافی نہ مانگ لے۔

ان کی معافی کا قصہ بھی دلچسپ ہے۔ کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ کسی سے دھوکا کھانے یا ہتک کی وجہ سے ناراض ہوتے پر دل میں کڑھتے اور
"بہانہ کیا ہے" اس ہتک کا بدلہ لینے کی سکیمیں سوچتے رہتے ہیں کہ وہ اپنی اس حرکت پر اظہار افسوس کر دیتا ہے۔ بس یہ سب کچھ بھول کر اس کے گن
گانے لگتے ہیں۔

ابھی تین چار برس پہلے ان کے ایک دوست نے دھوکے کے ساتھ ہم سے نہ صرف ملی والا مکان (جہاں اشک جی کے بمبئی آنے پر پیدا ہوا
رہتا تھا) سے کرکسی کو دے دیا بلکہ وہاں میرے بھائی کا جو سامان تھا وہ بھی ٹھکانے لگا دیا۔ اشک جی نے ساتھ تڑپتے تلملاتے لیکن جس کو اس نے

مکان ہوا بھی اور یہ دوست تھے انھوں نے ایک بات جانتے ہی فکر کر افسوس ظاہر کیا۔ تب نہ صرف انشا جی نے مکان حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ مالک مکان کو فکر کر حتی الامکان انہیں وہاں جانے کی سعی کی۔ لیکن جس دوست نے ذکر کیا تھا اس سے تمام ... کے سبب پچھلے دنوں جب ڈاکٹروں سے صلاح مشورہ کرنے بمبئی گئے تو کہیں وہ بھی بمبئی ہی میں تھا۔ اسے ان کے وہاں ہونے کا پتہ چلا تو ملنے چلا آیا۔ نہ جانے کیا کیا باتیں ہوئیں پھر بھی وہ معافی مانگ گیا۔ واپس آئے تو بولے "شاید ... پہنچ گئی ہے"

میں حیرت زدہ سی ان کا منہ تکنے لگی۔

تب بتانے لگے کہ کیسے وہ ملا۔ کیسے مسز بیدی کے ساتھ ملاقات سے ملنے آیا، کیسے بحث ہوئی اور کیسے انھوں نے اسے لاجواب کر دیا۔ کیسے پاکستان میں اس کا بڑا نقصان ہوا ہے اور کیسے اس نے اپنے کردار پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔

جب اس صفائی پر بھی میرے چہرے سے حیرت اور غصے کے آثار نہ مٹے تو بولے "جب اس نے معافی مانگ لی تو گویا میں نے پھانسی پر لٹکا دیا۔ بمبئی میں گرمی ہے، حال اس کا آج کل پتلا ہے۔ لاکھ برا سہی مگر آدمی دلچسپ ہے۔ میں نے اسے پہنچ گئی آنے کے لئے کہہ دیا۔ اب ہٹاؤ اس قصے کو۔"

اور یہ کہہ کر بے پروائی سے سر جھٹکا دے کر اپنے کام میں محو ہو گئے۔

انشا جی اپنے کپڑوں کے سلسلے میں بڑے بے پروا ہیں۔ لوگوں نے انہیں ہر طرح کا لباس پہنے دیکھا ہوگا لیکن سوٹ بوٹ، اچکن، نیلی قمیص شلوار، دھوتی کرتہ وغیرہ ہر فیشن کے کپڑے پہننے کے باوجود انہیں تہ بند پہنے ننگے بدن رہنا بہت پسند ہے۔ پہلے پہل یہ سوٹ وغیرہ بھی پہنتے تھے جب انہیں سرکاری دفتر میں کسی سے ملنے جانا ہوتا ورنہ سارا دن گھر میں ننگے بدن، تہ بند اور کبھی کبھی محض کچھا پہنے بیٹھے رہتے (قمیص یا کرتا قریب ہی رکھتے، کوئی آتا تو جھٹ پہن لیتے) پھر جب خود سرکاری دفتر میں نوکر ہوئے تو اگرچہ ہمیشہ پینٹ وغیرہ کسے رہنا پڑا لیکن تہ بند سے ان کا موہ نہیں گیا۔ جب بھی گھر میں ہوتے تہ بند پہنتے۔

دلی میں یہ آل انڈیا ریڈیو میں نئے نئے ملازم ہوئے تھے۔ گرمی کا موسم تھا لیکن شامیں نسبتاً ٹھنڈی ہو گئی تھیں۔ ایک شام کھانا کھانے کے بعد بولے "چلو ذرا سیر کی جائے۔"

اپنی عادت کے مطابق صرف تہ بند پہنے ہوئے تھے۔ مجھے تو بڑی بدتمیزی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن نئی نئی شادی تھی زیادہ زور نہ دیتی تھی۔ آہستہ سے میں نے کہا "کپڑے تو بدل لیجئے!"

کہنے لگے "پھر سیر کا مزا کیا خاک آئے گا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں ننگے بدن گھومنے کا جو لطف ہے وہ کپڑے ٹھونس کر جانے میں کہاں؟"

"میں تو نہیں جا سکتی۔"

بولے "اس وقت سڑک پر کون ہوگا۔"

"تو بھی" میں نے کہا "میں تو نہ جاؤں گی۔"

"تو میں ہو آتا ہوں، مہندر کو لے لوں گا۔"

مہندر اردو کے مشہور افسانہ نگار کرشن چندر کے چھوٹے بھائی ہیں اور خود بھی خوب لکھتے ہیں۔ ہمارے ان کے گھر ساتھ ساتھ تھے۔ مہندر بھائی کو ساتھ لے کر یہ ننگے بدن صرف تہ بند پہنے، اس کی دائیں کور کو جالندھریوں کے خاص انداز میں اٹھائے چلے جا رہے تھے کہ نظامی صاحب جو آل انڈیا ریڈیو میں شعبہ موسیقی کے انچارج تھے اور خود بھی بہت اچھے موسیقار تھے، آتے دکھائی دئیے۔ ہارڈنگ روڈ پر بجلی کی روشنی تو ہے، لیکن

وہاں درخت گھنے پیڑوں کے باعث وہاں اندھیرا سا رہتا ہے۔ ہر شام وہاں سے گزر جایا جاتا ہے۔ اس وقت تو آسمان سے ذرا وقت تھا مگر سوزاتی اور نظامی صاحب آسمان کی طرف منہ کیے کوئی دھن بنانے اور گنگناتے چلے آ رہے تھے۔

چونک کر اشک جی نے ان کے کندھے پر ہاتھ مارا "کیوں بھئی ادھر!"

نظامی صاحب کا خیال اپنی دھن میں تھا۔ سڑک پر ماسٹر تارا کی مجی جو دن بھی اس مقام کے نزدیک ہی ایک ریڈیو انجینئر ہوتا تھا کھلا جاتا تھا۔ شب جی کو اس حال میں دیکھ کر وہ فوراً پہچان نہ سکے۔ ان کا مشغلہ ہوگا، وہ نظامی صاحب سے وہ دور کر ٹھٹکتے رہے۔ پھر جب اشک جی نے اپنا ہاتھ نکال کر ٹکایا اور حضرت نظامی نے بیٹھ کر انہیں دیکھا کہ آپ ادھر کیا بات کی حیرت سے۔ انہوں نے پوچھا "کیا بات ہے ایسے کیوں گھوم رہے ہو؟"

اشک جی کو اس میں حیرت کی کوئی بات نظر نہیں آئی تھی۔ وہ شمس جی سے نکل کر کھلے سر چپل یا شش کئے جالندھر کے بہت بڑا میں بھاگتا پھرتا رہا ہوں۔ مجھے لوگ پہچانتے نہیں ہیں ہر اوپر اس بات کا ڈر ہے کہ ہم وہاں کسی کو نہیں دیکھتے۔ دلی کی سڑکوں پر سگریٹ نہیں پیتے بند گلے کے گھر سے میں کیا برائی نظر آ سکتی ہے۔ تیزی سے مہرو کی ہوسٹ ہو گئے ہوئے اشک جی نے ہاتھ ملایا اور آگے بڑھ گئے۔

ادھر کچھ برسوں سے اشک جی نے تہبند پہننا ترک کر رکھا ہے۔ اپنے قول کے مطابق زیادہ وقت کپڑوں کے قید خانے میں بند رہتے ہیں لیکن نظامی تہبند کا وہ بھوت اب بھی کبھی کبھی سر اٹھاتا ہے۔ بمبئی میں جب جب گھر پر کام کرتے رہے ہیں، پنڈت جی کے مطابق ہمیشہ ہوتی یا تہبند اندر پیرہن یا دھوتی میں کام کرتے رہے ہیں۔ یوں بھی کپڑوں کے معاملے میں کچھ عجیب طرح کی بے نیازی ان کے مزاج میں ہے۔ اکیلے تھے تو جو بھی کپڑا ہاتھ لگا پہن لیا۔ اشک کے اوپر ہماری بھی لینے تھے۔ جیتنے تو جو بھی ہیں نکال دیں وہی پہن لیتے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ جب کبھی جی سے پہنتے ہیں تو تب نفاست پسندی کی حد کر دیتے ہیں۔ پہلے پہل مجھے یہ بے نیازی اور نیز نفاست عجیب سا لگتا تھا لیکن اب میں ان کے مزاج کی اس انتہا پسندی کی عادی ہو گئی ہوں۔

دلی ہی کی بات ہے۔ یہ دیکھ کر کہ پاس میں پیسے ہونے کے باوجود یہ پرانے پھٹے کپڑے پہنتے ہیں۔ سب کچھ ہی ہو، جب میں کالج کی لیکچرر شپ کی نوکری کے باوجود گرمیوں کے لئے ان کے پاس صرف نیلی پتلون اور تین قمیص تھیں ——— دھو کر ڈال کر کلف کرا دی اور پہن کر چلے جاتے تھے اور سردیوں کے لئے محض ایک ذلیل سا سوٹ تھا۔ میں نے آتے ہی ان کے نہ نہ کرنے پر بھی دو بڑھیا گرم سوٹ سلوائے۔ ایک دن جب میں نے نیا سوٹ پہننے کو نکالا تو کالی ٹائی حسب پسند نہ ہونے کے باعث چھوڑ دیا۔ میں اسی شام کچھ بہت اچھی ٹائیاں لے آئی۔ کسرت کرتے، حجامت بناتے اور غسل لیتے ہوئے انہیں کچھ دیر ہو گئی تو جلانے لگے۔ جلدی میں کبھی یہ قمیص پہنتے کبھی وہ۔ آخر جب سوٹ پہن کر کوئی قمیص پہنی تو ٹائی پر کافی دیر لگ گئے۔ بوٹ پر پالش کیا گیا۔ آخر جب پوری طرح اطمینان ہو گیا تو ناشتے کا وقت نہ رہا۔ کسی نہ کسی طرح زور دینے پر ناشتہ کر کے بھاگے۔ ان کے جانے پر میں حیرت زدہ سی کھڑی سوچنے لگی کہ کہاں تو اتنی بے پرواہی کہ کیا پہنتے ہیں کیا نہیں پہنتے اس کا ہوش نہیں اور کہاں اتنی نفاست پسندی کہ کالج کے چپڑاسی بھی مات کھا جائیں۔ کام کرتے ہوئے میں متواتر یہی سوچتی رہی۔

ان کو گئے پانچ چھ منٹ گذر گئے تھے اور میں منا رہی تھی کہ میٹنگ کے وقت پر پہنچ جائیں تاکہ اس دیر کا غصہ مجھ پر نہ اترے۔ کبھی برآمدے میں پھر ان کے جوتوں کی آواز سنائی دی۔ میں میز کی طرف بھاگی کہ کوئی فائل رہ گئی ہو تو دیکھ کر جلدی سے دے دوں۔ دوسرے لمحہ آپ داخل ہوئے اور سیدھے اندر کے کمرے میں چلے گئے۔ میں نے پوچھا "کیا ہوا؟ کیا رہ گیا ہے؟"

بولے "کچھ نہیں۔"

بلکہ کہتی ہیں، آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر دیکھ لو کیسے لگ رہے ہو۔

ان کی ماتا جی سے ایک بار بات چلی تو کہنے لگیں: "دیکھو بیٹا یہ اس کی ایسی عادت ہے، جبھی پہنتا تو نہیں پہنتا، پہنتا ہے تو بہت ٹھاٹھ باٹھ سے کو مات کرتا ہے۔ ایک بار سرہند رہنے بھائی کی شادی پر بڑھیا سلک کا ایک کرتہ سلوایا۔ درزی نے اوپر کی جیب کہیں نیچے لگا دی تھی تو اس میں کوئی نقص نہ لگتا تھا مگر اس نے وہ ایک بار پہن کر دیکھا اور پھر نہیں پہنا۔"

دونوں اشک جی آٹھویں یا نویں جماعت میں پڑھتے تھے۔

ان کے اس رومانی مزاج کا ایک اور ثبوت مجھے انہی دنوں پھر ملا۔ دلّی کی بات ہے۔ میں نے اندرپرستھ گرلز ہائی سکول میں نوکری کی تھی۔ لڑکیوں کے امتحان ہو چکے تھے اور پیپروں کا ڈھیر کا ڈھیر آیا پڑا تھا۔ انہی دنوں نوکر بھاگ گیا۔ کسی طرح رات کا کھانا پکا کر، برتن اور کپڑے وغیرہ اسی طرح چھوڑ کر میں پیپر دیکھنے لگی اور رات کے دو بجے تک دیکھتی رہی۔ یوں بھی میں صبح دیر سے اٹھنے کی عادی ہوں۔ اس دن کچھ اور دیر ہو گئی۔ اٹھتے ہی باہر آئی تو صحن میں بنی پڑی ہوئی رسی پر سوکھنے کے لیے ڈالے ہوئے دھلے دھلائے کپڑے تھے۔ حیرت ہوئی کہ کس نے دھوئے۔ سوچا شاید ملازم کوئی نوکر مل گیا ہے۔ خوشی خوشی سے بھاگی اندر گئی تو دیکھا باورچی خانے میں باپ بیٹا (اشک جی کی پہلی بیوی سے ایک لڑکا ہے) بیٹھے برتن مل رہے ہیں اور اشک جی اپنے لڑکے کو برتن ملنے کے فن میں مشاق بنا رہے ہیں۔

میں بھونچکی سی ہو کر دیکھتی کھڑی رہ گئی۔ پھر بڑھ کر میں نے کہا، "ہٹیے یہ کیا کر رہے ہیں، کیا میں مر گئی ہوں جو برتن ملنے آ بیٹھے ہیں؟"
کہنے لگے "مرنے کا نام نہ لو۔ چوتھی بیوی اب مجھے کہاں سے ملے گی؟"

میں نے کہا، "ہٹائیے، یہ مذاق مجھے پسند نہیں۔"

لیکن انہوں نے مجھے برتنوں کو ہاتھ نہیں لگانے دیا۔ کہنے لگے "میرے ہاتھ تو سنے ہوئے ہیں، تم کیوں فضول ہی انہیں خراب کرتی ہو۔ تم سے برے نہیں ملوں گا، اس بات کا یقین رکھو۔ سکول کے دنوں میں برسوں برتن ملے ہیں۔ جاؤ جلد تیار ہو جاؤ، سکول پہنچنے میں تمہیں دیر ہو جائے گی۔"

مجبور ہو کر مجھے ہٹنا پڑا۔ خوش قسمتی سے اسی دن نوکر مل گیا، نہیں تو جانے وہ کتنی دیر تک گھاٹی بنے رہتے۔

لیکن اس واقعہ کے چند دن بعد کا ذکر ہے، اتوار تھا۔ میں باہر صحن میں بیٹھی پیپر دیکھنے میں مصروف تھی اور اشک جی اندر کچھ لکھ رہے تھے کہ مجھے آواز پڑی۔ مجھے اٹھنے میں کچھ دیر ہوئی کہ پھر آواز پڑی۔ پیپر چھوڑ کر میں بھاگی۔ بولے "ذرا وہ ڈکشنری دینا۔"

ڈکشنری دو قدم کے فاصلے پر ڈیسک پر پڑی تھی۔ میرے سامنے دو دن پہلے کپڑے دھونے اور برتن ملنے کا واقعہ گھوم گیا۔ ڈکشنری دیتے ہوئے سوچنے لگی کہ جو آدمی ایسی شاہانہ آرام طلبی کا مالک ہو سکتا ہے کہ دو قدم اٹھ کر چیز اٹھانے کی بجائے دوسرے کو بلائے، وہ کپڑے دھونے اور برتن ملنے جیسا مشکل کام کیسے کر سکتا ہے۔

لیکن یہی اتار چڑھاؤ اور انتہا پسندی اشک جی کے مزاج کا اہم جزو ہے۔ ان کا سبھاؤ ایسے سکون پسند آدمی کا سا نہیں جو پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر وہیں ڈیرا ڈال لے، بلکہ ایسا چنچل راہی کا ہے جس کو کبھی پہاڑوں کی چوٹیاں پسند ہیں کبھی گہری گھاٹیاں، جو کبھی گنجان شہروں کو پسند کرتا ہے کبھی سنسان ویرانوں کو، جسے کبھی یہ انتہا مرغوب ہے کبھی وہ۔ کوئی ایک حد یا میانہ روی جسے پسند نہیں۔ بچپن ہی سے اشک جی کی زندگی حوادث سے پُر رہی ہے۔ انھوں نے نہایت کڑوے جام بھی پیئے ہیں اور بے حد میٹھے بھی، فراوانی بھی دیکھی ہے اور نقصان بھی۔ بے انتہا محبت بھی پائی ہے اور بے پناہ نفرت بھی اور نہ جانے کن پیدائشی سنسکاروں، ماں باپ کی کن خوبیوں اور خامیوں اور کن دوسری جسمانی، ذہنی، معاشرتی اور اقتصادی پیچیدگیوں کے باعث ان کا سبھاؤ

ایسے موقع کے برعکس معمولی باتوں پر کچھ نہ کچھ گفتگو رہتا ہے۔ لکھنے کے وقت آپ بہت پہنچی ہوئی رکھائی دیتے ہیں۔ وہ کبھی بھی کسی کی
طرف سے تیس پینتیس برس کی ترکیبوں میں تائید نہیں لیتے بلکہ ایک طرح استغنا اور کسی ساختہ رکھا جاتا ہے۔ دوسرے
موقع پر نہ صرف کسی بات سے بھی گفتگو کرتے ہوئے باتیں پچکانا ہے کہ یہ پتے ہیں۔ ان کو دھیان نہیں کہ کتے ہیں اس کی پروا نہیں لیکن وہ حس
پرانے نفاست پسند کہ اس کو کسی ایسی تفصیل کا خیال لکھنے والے ہو تے ہیں کہ منہ سے ہر لفظ جانچ تول کر نکالنا ہے۔ کبھی اتنے
فراخ دل کہ ذرا سی بات کو خاطر میں نہ لائیں اور کبھی اتنے تنگ دل کہ معمولی سی بات پر راتوں کی نیند حرام کر لیں اور جب تک اس کا اختتام نہ
ہو چین نہ پائیں۔ کبھی ایسے کنجوس کہ تکلیف سہہ لیں پیسہ خرچ نہ کریں اور کبھی ایسے فضول خرچ کہ کسی مصیبت سے جمع کی ہوئی رقم لمحوں میں خرچ کر دیں
کبھی مستقل مزاج کہ ایسے شکار کرا بیٹھیں اور کبھی فیصلہ کرنے سے پہلے ایسے تذبذب میں پڑیں کہ فیصلہ کر کے بھی اس سے پھر جائیں
کبھی بے حد سنگدل کبھی موم کی طرح پگھل جانے والے۔ کبھی اتنے شاطر کہ بڑے سے بڑے چالاک سے دھوکا نہ کھائیں اور کبھی ایسے سادہ لوح کہ
عام آدمی بھی ٹھگ کر چلا جائے۔ انہی انتہاؤں کو لے کر اشک جی کے اس تفاوت طبع و مزاج کے سلسلے میں ایسے دلچسپ واقعات ہیں کہ چھوٹے
سے مضمون میں ان پر پوری روشنی نہیں ڈالی جا سکتی۔

لیکن جس طرح کوئی عام اصول استثنیٰ سے خالی نہیں ہوتا اسی طرح اشک جی کی مختلف انتہاؤں پر چلنے والا مزاج بھی مستثنیات سے خالی نہیں
میں نے پچھلے برس میں ان کی طبیعت کے ایسے پہلو بھی دیکھے ہیں جن کی بعض ایک ہی انتہا ہے۔ اس سے دوسری حد نہیں۔

ان کے لکھنے ہی کو لیجیے۔ لکھنا ان کو شوق ہی نہیں ان کا روزانہ کام ہے۔ جو ادیب اس کام کے سر پر زندگی بسر کرتے ہیں بعض اوقات ان کے
ہاں کبھی ایسا وقت آتا ہے جب ان کی تخیل بالکل پڑی ہوئی ندی کی طرح ایک سے بڑھ کر ایک شاہکار وجود میں لاتی چلی جاتی ہے۔ پھر ایسا وقت بھی
آتا ہے جب تخیل کی بارش رک جاتی ہے اور ان کا دماغ اترے ہوئے سمندر کے پیچھے بے کیف ساحل سا ہو جاتا ہے۔ وہ مہینوں، ہفتوں
اور بار ہا برسوں کچھ نہیں لکھ پاتے۔ اشک جی کو میں نے دیکھا ہے کہ وہ ہمیشہ لکھتے ہیں۔ ہر روز کبھی برسات برسنے میں ہمارے ہند والی دعائی بدلی
کی طرح ان کی تخیل ہمیشہ بھری رہتی ہے۔ یہ دکھی ہوں یا سکھی، تندرست ہوں یا بیمار، کہیں نہ کہیں لکھنے کے لیے وقت نکال لیتے ہیں۔ ان کے
دوست ان کی اس عادت کو شک کا نام دیتے ہیں۔ بہت ممکن ہے یہ شک ہی ہو لیکن ان کی یہ شک ایک ہی انتہا پر قائم رہتی ہے۔ اس کی دوسری انتہا یعنی
سستی اور بے حسی میں نے ان کے ہاں کبھی طاری ہوتی نہیں دیکھی۔ لکھے بغیر یہ رہ ہی نہیں پاتے۔ ابھی ایک برس ہوئے، جب ڈاکٹروں نے دق کا فتویٰ دیتے ہوئے
ہدایت کی کہ انہیں پورا آرام ملنا چاہیے تو میں سمجھتی تھی کہ اب یہ کچھ دن چین لیں گے۔ میں نے انہیں الگ کمرے میں لٹا دیا اور دروازہ لگا دیا کہ شاید
کوئی ہرگز بات نہ کر سکے۔ انہوں نے نہ لکھا نہ پڑھا نہ باتیں کیں لیکن بیٹھے لیٹے یادداشت کے بل پر "دیپ جلے گا" کے نام سے ایک طویل نظم
لکھ ڈالی۔ ایک مہینے بعد میں انہیں پنج گنی لے آئی اور چار مہینے تک انہیں کام کرنے کی اجازت نہ ملی۔ ان دنوں یہ لیٹے لیٹے ایک دوسری طویل
نظم لکھتے رہے۔

عام طور پر اشک جی اپنے ناطے رشتے داروں سے اسی حد تک محبت کرتے ہیں جس حد تک یہ ان سے پاتے ہیں۔ لیکن بڑے بھائی،
ماں اور سب سے چھوٹا بھائی اس سے مستثنیٰ ہیں۔ ماں اور بڑے بھائی خواہ ان سے کیسا ہی روکھا سلوک کیوں نہ کریں، خواہ کتنی ہی ٹھیس کیوں نہ پہنچا
دیں یہ ان کی رکھائی اور بے اعتنائی کا جواب ہمیشہ ادب اور محبت ہی سے دیتے ہیں۔ ان کے برے سلوک سے رنجیدہ خاطر نہ ہوتے ہوں یہ بات نہیں
کبھی کبھی کوئی چھوٹا سا نقصان کی باتوں کی نیند حرام کر دیتا ہے یہ ان کی بدسلوکی پر جلتے بھنتے رہتے ہیں، لیکن جب ان سے ملتے ہیں تو سب کچھ بھول جاتے
ہیں اور ان کے دکھ سے دکھی اور ان کے تفکرات سے فکرمند ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح دوستوں کے سلسلے میں بھی ان کی محبت ایک ہی انتہا پر رہتی ہے۔ اشک جی کا قول ہے کہ جسے ہم پسند کرتے ہیں، پیار کرتے ہیں،

جس کی دوستی کے خواہشمند ہیں اس کی خامیوں کو دیکھنا بے معنی ہے۔ اس کی دوستی میں جو مسرت ہمیں حاصل ہوتی ہے اسے کبھی ہاتھ سے نہ [illegible] دوستی ٹیلیفون سی چیز ہے۔ جسے ہم چاہتے ہیں اسے دوست بنائے رکھنے کے لئے اس کی چھوٹی موٹی خامیوں پر توجہ دینے کے بجائے محبت سے [illegible] انتقام کی تو بات ہی وہاں نہیں اٹھتی اور میں نے دیکھا ہے کہ اپنے عزیزترین دوستوں کے سلسلے میں (اگرچہ ان کی تعداد بہت کم ہے) اشک ہمیشہ اپنے اس قول پر عمل کرتے ہیں۔

اشک جی کی ایک اور سنک تھی جس کی دوستی مخالفت انتہا کے لحاظ نہیں آئی۔ وہ تھی باقاعدہ صبح اٹھ کر ورزش کرنا۔ شادی کے بعد جب نئی نئی دلی آئی تو میں نے دیکھا کہ صبح اٹھ کر لنگوٹ لگائے تیل کی مالش کر کے ڈنٹر مگدر نکالتے اور فری ہینڈ کسرت کرتے۔ بیدی صاحب ان دنوں دلی آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے کبھی اشک جی کو فری ہینڈ کسرت کرتے نہ دیکھا تھا۔ اس اچھل کود کو دیکھ کر انہوں نے اشک جی کو "بندر" کے خطاب سے سرفراز کر دیا اور جتنے دن وہ رہے صبح صبح اشک جی کی کسرت ایک فلک شگاف قہقہے سے شروع ہوتی رہی۔ لیکن وہ دھن کے ایسے پکے ہیں کہ کسی مذاق یا پھبتی کو سن کر اپنی دھن نہیں چھوڑتے۔ اس لئے "بندر" کہلائے جانے کے باوجود بلا ناغہ ورزش کرتے رہے۔ مجھے بچپن کی پرانی شکایت ہے۔ دورہ پڑتا ہے تو نڈھال ہو جاتی ہوں۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے۔ "تم ورزش نہیں کرتیں اسی لئے تمہاری کمر دوہری ہو گئی ہیں۔ پرانے خیالات کی ہندوستانی عورتیں گھر کے کام کاج کی صورت میں اور مغربی عورتیں ناچ گانے کی صورت میں کافی کسرت کرتی اور تندرست رہتی ہیں۔" ان سب کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے ورزش کی اہمیت پر چھوٹی موٹی تقریر کر ڈالی۔ سانس روک کر سینہ پھلا کر بتانے لگے ــــ کس طرح کسرت کرنے سے کمر پتلی ہو جاتی ہے، سینہ چوڑا ہو جاتا ہے اور جسم کی ایک مثلث کی سی شکل ہو جاتی ہے۔ مجھے انہوں نے صلاح دی کہ اگر میں فری ہینڈ ورزش نہیں کر سکتی تو کم سے کم سانس روک کر سینہ پھلا کر رتی ہی پھلایا کروں۔

ورزش کی اہمیت پر انہوں نے مجھے اتنے لکچر دئے اور بیدی صاحب کے قول کے مطابق بندروں کی طرح کود پھاند کر انہیں طرح کی ورزشیں بتائیں کہ میں بھی ورزش کے ذریعے اپنی بیماری دور کرنے اور کمر پتلی بنانے کی کوشش کر دیکھنے کو تیار ہو گئی۔ یہاں میں یہ بتا دوں کہ نہ اشک موٹے ہیں اور نہ میں، لیکن ان کی کمر تو سانس روکنے اور سینہ پھلانے پر الٹی مثلث کے نچلے زاویے کی سی ہو جاتی تھی اور میری غالباً نہ بنتی تھی۔ کچھ دن تک میں نے بھی کود پھاند کی لیکن ایک تو مجھے صبح جلدی اٹھنے کی عادت نہیں اور پھر کسرت کرنا مجھے نہایت خشک اور اکتا دینے والا کام معلوم ہوتا ہے۔ پھر میری اکتاہٹ کو بھی کوئی فائدہ نہ پہنچا۔ کچھ ہی دن بعد میں نے ہتھیار ڈال دئے اور نہایت عاجزی سے کہا کہ کمر کی مثلث آپ ہی کو مبارک ہو۔ کسی خوبصورتی کے مقابلہ میں تو بیٹھنا نہیں۔ مجھے تو آپ معاف ہی رکھیں۔

اشک جی نے پھر مجھے مجبور نہیں کیا۔ لیکن خود متواتر اچھل کود کرتے رہے۔ وقت ہوتا تو مالش بھی کرتے ورنہ ڈنٹر بیٹھکیں خواہ چھوڑ دیں فری ہینڈ کسرت ضرور کر لیتے۔ کئی بار میں ناشتہ رکھ دیتی۔ یہ قریب قریب ناشتے پر بیٹھ جاتے لیکن پھر کسرت کرنے کا خیال آ جاتا اور "بس چند منٹ کے لئے معاف کرو" کہہ کر بھاگ جاتے اور پیٹ دبا، سینہ پھلا، جسم کی مثلث بنا کر اچھل کود کرنے لگتے۔ اگر اپنے ضبط اور باقاعدگی کی داد [illegible] کبھی کبھی آئینہ دیکھتے تو افسوس ہوتا کہ اتنی باقاعدگی سے ورزش کرنے کے باوجود کتنے پچکے جا رہے ہیں۔ تب بازو کو موڑ کر ابھرے ہوئے پٹھے کی سختی دیکھ کر مطمئن ہو جاتے کہ چربی خواہ نہیں چڑھی لیکن ورزش کرنے سے پٹھوں میں لوہے کی سی مضبوطی آ گئی ہے۔

میں جب سے آئی ہوں میں نے انہیں باقاعدگی سے بلا ناغہ ورزش کرتے دیکھا ہے لیکن اتنی ورزش کے باوجود انہیں آنتوں میں [illegible] رہنے لگی۔ اپنی سنک میں انہوں نے ورزش کی مقدار کچھ اور بڑھا دی اور کسی شریف آدمی کے کہنے پر ابلی ہوئی ترکاریاں کھانا شروع کر دیں۔ اپنی عادت کے مطابق اس بات کو بھی انتہا تک لے گئے۔ نتیجہ یہ ہے کہ پچھلے سوا سال سے بیمار پڑے ہیں۔ وقت پر پتہ چل گیا کہ بیماری معدہ میں نہیں پھیپھڑے میں ہے ورنہ نہ جانے کیا ہوتا ــــ جب علی الصباح اٹھ کر اور سانس روک کر جسم کی مثلث بنایا کرتے تھے اس وقت [illegible]

اس بات کا کافی کہ بستر پر کچھ دیر اور لیٹ کر آرام کر سکے اور اپنی بری تکالیف کی بجائے طاقت ور غذا کھاتے۔ یہ سب معلوم ہوتے ہوئے بھی ایک ایک ملاقات آنحضرت کا چاہتے ہیں لیکن اب اس کی بھی اجازت نہیں کیونکہ اس سے ان کی صحت کو نقصان پہنچتا ہے۔

مجھے پورا یقین ہے کہ اگر یہ بیمار نہ پڑتے تو ان کی شکست ہمیشہ رہتی۔ اس کی دوسری مخالفت انتہا پر پہنچنا —— یعنی مکمل آرام فرمانا بھی ان کے لیے کسی طرح نہ ہوتا۔

آپ وقت سے بیمار ہو کر اٹھاسی برس پانچ ماہ کی عمر میں گرفتار کر کے ادھر آ گئے ہیں۔ وہاں وہ اپنے آخری کام پر مصروف رہتے ہیں لیکن جسم سے آرام سے بیٹھنے کو مجبور ہیں۔ موت کی اس مجبوری نے انہیں تھوڑا بہت فلسفی بنا دیا ہے اور ان کی طبیعت اپنی انتہا پسندی چھوڑ کر میانہ روی سیکھ رہی ہے لیکن وہ میانہ روی سیکھ پائیں گے اور مکمل طور پر صحت مند ہونے پر وہ سیکھ تو رہے ہیں گی۔ اس میں مجھے شک ہے۔

حفیظ ہوشیارپوری

ناصر کاظمی

سنہ ۴۲ء کی بات ہے۔ خاصی سردیاں تھیں۔ رات کا وقت تھا۔ اسلامیہ کالج لاہور میں ایک انٹرکالجیٹ مشاعرہ تھا۔ رنگ رنگ کے طالب علم وہاں موجود تھے۔ بعض جانے پہچانے مقامی و غیر مقامی شاعر بھی تھے۔ سامعین اور اربابِ ذوق سے ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تاجور نجیب آبادی حسبِ معمول کرسیِ صدارت پر بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ ہی سٹیج پہ یوں تو دو تین اور بھی اصحاب تھے لیکن ایک بہت دلچسپ اور عجیب سی چیز بھی تھی۔ گورا سا فولادی رنگ پچکے ہوئے گال، خشک ہونٹ، ریشمی برف سے بال، اکہرا جسم، چھوٹی چھوٹی کنچوں سی آنکھیں، کرسی پہ سے اچکتی ہوئی ہڈیوں کی ایک مالا۔ شاعر مسند پر آکر اپنا کلام سناتا۔ صاحبِ صدر دل بڑھاتے اور داد دیتے لیکن یہ صاحب اپنی ہی دھن میں تھے۔ خود ہنستے اور دوسروں کو بھی ہنساتے۔ شاعر ان کی طرف دیکھتا تو ایک دم سنجیدہ ہو جاتے اور سرگوشی میں چلا کر داد دینے لگتے۔

مشاعرہ ختم ہوا۔ شاعروں کو داد ملی۔ طلبہ کو انعام ملے۔ پہلا انعام جسے ملا اُس کا نام نہیں بتاؤں گا۔ دوسرا انعام اعجاز بٹالوی کو ملا۔ میں عبدالمجید بھٹی کے ساتھ مرعوب ہو کر ہال میں آ کے بیٹھ گیا۔ پھر وہاں کچھ اور لوگ جمع ہو گئے۔ ڈاکٹر تاثیر مرحوم نے حفیظ ہوشیارپوری سے تعارف کرایا۔ میں دنگ رہ گیا۔ خیر یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں۔

حفیظ نے کوئی ڈیڑھ درجن غزلیں سنائی ہوں گی۔ تاثیر صاحب نے آدھا دیوانِ غالب سنا دیا۔ ہاں یاد آیا ان میں کچھ ان کے اپنے شعر بھی تھے۔ ایک غزل داغ کے رنگ میں تھی باقی رنگِ غالب۔ حفیظ نے میری طرف دیکھا اور پھر دیکھا۔ میں نے بھی انہیں معنی خیز نظروں سے دیکھا اور ڈرتے ڈرتے دو ایک غزلیں سنائیں۔

اگلے دن میں سگریٹ لے کر کالج ہوسٹل کی طرف جا رہا تھا کہ وہی عجیب سی چیز ایک میل خورا گرے سا سوٹ پہنے، ٹائی میں گٹھی سی گرہ، دونوں ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈالے دکانوں کے بورڈوں کی طرف دیکھتے ہوئے اردگرد کی چیزوں سے یکسر بے خبر کسی کو ڈھونڈتی ہوئی نہ جانے کدھر سے کدھر کو جلدی جلدی چلتی دکھائی دی۔ جیسے کہہ رہی ہو

ہم سے دیوانے رہیں شہر میں سبحان اللہ
دشت میں قیس رہے کوہ میں فرہاد رہے

سنا ہے حفیظ خود پڑھا لکھا شخص ہے۔ ہوگا ابھی نے تو اُس کے ہاتھ میں آج تک کبھی کوئی کتاب [illegible] دیکھی [illegible] کسی کتب خانے [illegible] دیکھا۔ جب اُس نے ایک دن مجھے یہ بتایا کہ اُس نے گورنمنٹ کالج لاہور سے نفسیات کا ایم اے کیا ہے تو میں [illegible] سا ہو گیا۔ کیونکہ اس وضع قطع کا طالب علم میں نے اس کالج میں آج تک نہیں دیکھا۔ اور یہ نفسیات نہ جانے اُسے کیسے منظور ہو گئی۔ [illegible] حل کرنا بھی تو احساس [illegible] ایک ذمہ دار [illegible] شفیق باپ اور ریڈیو میں ایک ذمہ دار افسر ہے [illegible] بھی بھٹی [illegible] ہو گیا تو میں [illegible] وہ آج تک [illegible] پڑھتے نہیں [illegible] قوالی کی تقریبات [illegible] خیال [illegible] اُن دنوں پریشان [illegible] بہت [illegible] گلیوں کی خاک چھانتا پھرتا تھا۔ [illegible] حفیظ کو [illegible] جب نے مجھے [illegible] دیکھا تھا [illegible] بھی کہنے لگے [illegible] کوئی [illegible] مرن گے [illegible] شمع جلائے [illegible] پڑھا [illegible] نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ حفیظ کھڑا تھا۔ اُس نے پوچھا [illegible] نے کہا [illegible] اور حفیظ بولا [illegible] یہ [illegible] معصوم

[illegible] تک چھپ [illegible] کو

حفیظ میرے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے پھر بھی [illegible] پڑھنے کا کوئی ذوق [illegible] ہے۔ [illegible] تھا لیکن اب مجھے معلوم ہوا [illegible] تھی یہ وہ درد مند انسان ہے۔ وہ [illegible] سے اظہار [illegible] نہیں [illegible] اندازہ کوئی [illegible] ہے۔ جب میں [illegible] حیثیت [illegible] محسوس ہوتا تھا جب غریب الوطن ہو کر یہاں آیا تو اُس نے مجھ سے عملی ہمدردی بھی نہیں [illegible] امداد کی [illegible] سکتا تھا۔ اب سوچتا ہوں کہ [illegible] نوبت کا کتنا احترام کیا! بھلا یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی دوست ہو کر بھی [illegible] یہ بات نہیں [illegible] دوست [illegible] وہ ذرا اذیت پسند ہے۔ دوستوں کو مصیبت میں دیکھتا ہے تو وہ بتلا [illegible] سے مگر اُس [illegible] ہے۔ دراصل وہ اپنے ساتھ بھی یہی کرتا ہے۔ مجھے اُس نے کبھی رسماً بہانا تو نہیں [illegible] یقین کرنے بھی نہیں دیا۔ اور ایک بار ایسی مدد بھی کی کہ میں آج تک اُس کی بدولت چین سے [illegible] گزار رہا ہوں۔

تقسیم ملک سے پہلے جب میں اسلامیہ کالج میں بی اے میں پڑھا تھا [illegible] ہوسٹل کے کمرہ نمبر [illegible] میں رہتا تھا۔ میرا کمرہ ذہن کی طرح [illegible] تھا۔ [illegible] خاندانی [illegible] قائم تھی۔ خوشی برداشت کرنے کی بڑی ہمت تھی اور ہر وقت نئے نئے مضمون کی جستجو رہتی۔ اُن دنوں میں اکیلا رہتا تھا۔ ویسے میں تنہائی [illegible] ادیب اور شاعر لوگ تو کیا ہم جماعتوں سے بھی بالکل الگ۔ ویسے سب مجھے جانتے تھے یہ مجھے اب معلوم ہوا ہے [illegible] کسی شخص کا انتظار کرتا تھا۔ اُن دنوں ایک ہی شخص کا انتظار تھا۔ وہی غالب والا شخص —————— لیتے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے کئی بار کہا کون؟ لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ میں پھر اپنے دھیان میں لگ گیا۔ دستک پھر ہوئی۔ اٹھ کر دروازہ کھولا۔ وہی چیز میرے سامنے کھڑی تھی۔ مجھے کچھ ہنسی سی آگئی لیکن میں ضبط کر گیا۔ اُن کے ساتھ پروفیسر عبدالمجید بھی تھے جن کے ذکر کے بغیر یہ سا حباب کا حلقہ مکمل نہیں ہو سکتا۔

"معاف کیجئے، آپ کو زحمت ہوئی" حفیظ نے بڑے پیار سے کہا۔ میری آنکھیں بھر سی آئیں۔ خوشی بھی ہوئی کہ ایک معروف سا آدمی میرے پاس خود چل کر آیا اور پریشانی بھی کہ انتظار کسی اور کا تھا۔ حفیظ نے حسب معمول وقت کم ہونے کی معذرت کی اور فوراً جیب سے ریڈیو کا کنٹریکٹ نکال مجھے دستخط کرنے کو کہا..... میری عمر اُس وقت سولہ برس ہوگی اور میرے پاس صرف چار یا پانچ غزلیں تھیں [illegible] کہ کسی ادبی مجلس میں سنائی جا سکیں۔ میں کچھ [illegible] سا ہو گیا۔ پھر خیال آیا کہ حفیظ سے میری کوئی دوستی بھی نہیں کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی دنیائے ادب میں مجھے کوئی جانتا ہے۔ یہی سوچ کر میں نے دعوت منظور کر لی۔ وہ دن اور آج کا دن ایسی سینکڑوں ہی دعوتیں مل چکی ہیں بلکہ بعض دفعہ تو ایسی دعوتوں کا انتظار سا بھی رہتا ہے۔ کیونکہ قوم کا سوال ہوتا ہو کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ وہ کتنی بڑی گھڑی تھی جب میں ریڈیو کے مشاعرے میں شریک ہوا۔ نہ میں غزل پڑھتا نہ لوگ مجھے جانتے اور نہ ہی میری زندگی عروس سخن کیلئے رسالے عام ہوتی۔ پھر یہ خیال کہ اور بھی تو کچھ لوگ تھے جنہیں یہ دعوت نامہ ملا تھا۔ لیکن اب اُن کا نام و نشان بھی نظر نہیں آتا۔ کوئی کلرک بن گیا کوئی

افسر ہو گیا کوئی پاگل ہو گیا وغیرہ وغیرہ ۔

آل انڈیا ریڈیو میں حنیف جیسے شخص پروگرام اسسٹنٹ تھا تو بھی وہ سیدھی سادی زندگی بسر کرتا تھا ۔ اُس کے افسر خود چل کر اُس کے گھر سے جاتے تھے ۔ اب ڈائرکٹر ہے ۔ اب بھی وہی حال ہے ۔ جب اُس کے دفتر گیا ۔ چپراسی کو چٹ دی ۔ دروازہ کھلا ۔ سگرٹ پیش کی اور پھر اپنے کام میں لگ گیا ۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے یوں لگا جیسے ڈائرکٹر صاحب سے کوئی دیہاتی رشتہ دار انہیں ملنے آ گئے ہیں پھر اکرم خیال آیا کہ یہ تو وہی حنیف ہے ۔ اتفاق سے دو ہفتے میں نے اُس سے اُس کے دفتر کے متعلق کوئی بات نہیں کی نہ کسی افسر کی تعریف اور نہ ہی برائی ۔ وہ دوسروں کے متعلق بہت ہی کم باتیں کرتا ہے ۔ جاہ و حشمت ہے ۔ صبح نو بجے سے چراغ جلے تک کام کرنا تو جیسے اس کا معمول ہے ۔ دیانتداری اور محنت سے کام کرنا یوں تو اس کی فطرت میں شامل ہے لیکن اس میں میاں بشیر احمد صاحب کا بھی ہاتھ ہے ۔ وہ میاں صاحب کے ساتھ ۱۹۳۷ء میں انجمن اردو پنجاب میں بہ حیثیت اسسٹنٹ سیکرٹری کام کرتا رہا ۔ میاں صاحب اُن کے چہیتے لوگوں میں سے ہیں جنہیں وہ اپنا دوست سمجھنے کے علاوہ ایک نہایت شریف انسان بھی کہتا ہے ۔

حنیف کو پرانی اور نایاب کتابیں جمع کرنے کا بہت شوق ہے ۔ یہ شوق اسے اپنے بڑے بھائی راحل مرحوم سے ورثے میں ملا ۔ اُن کی کتابیں دیکھ کر میں حیران رہ گیا ۔ یہ نہیں سمجھ سکا کہ اتنی کتابیں کس وقت پڑھتا ہوگا ۔ اُس نے اردو فارسی ، اردو کے تذکرے ، پرانے شعراء کے دیوان کے قلمی نسخے جن میں بعض نایاب ہیں ۔ موسیقی ، تصوف ، صرف و نحو اور لسانیات اور بعض تاریخی کتابوں سے اس کی الماریاں اٹی پڑی ہیں ۔ وہ اپنی کتابیں کسی کو نہیں دیتا ۔ بالکل اُسی طرح جس طرح وہ کسی کو قرض نہیں دیتا ۔ مجھے اُس کی یہ بات بڑی بری لگتی ہے ۔ یہ ایک اچھا اصول سہی لیکن اس میں خود غرضی کا ایک پہلو بھی نکلتا ہے ۔ کتابوں سے اُسے بڑی حد تک شغف ہے ۔ میرے خیال میں وہ دولت اور شہرت اور تنگ دامنی بھی کرتا ہے ۔ چھٹی کے دن جب بھی میں نے پوچھا کہ بھائی کہاں چلے ہو تو اکثر یہی جواب ملا چھوٹے بچوں کو کچھ رشتہ داروں سے ملانے گیا تھا ۔ اب کشمیری بازار جا رہا ہوں ۔ شاید کوئی کتاب ہاتھ لگے ۔ ایک دفعہ میں اُس کے یہاں بیٹھا تھا کہ راحل مرحوم کے شاگرد نے پرسے جرأت کا دیوان بھیجا ۔ یہ بڑا کرم اور نایاب نسخہ تھا ۔ اُس کی بڑی بیٹی صبیحہ نے بجلی کا پنکھا بند کر دیا ۔ کہنے لگی "اس کتاب کے اوراق بہت بوسیدہ ہیں آپ پڑھ لیں پھر پنکھا چلا دوں گی" میں نے حنیف کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا ۔ صبیحہ بلا کی ذہین ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اُس کے بغیر حنیف کی شخصیت ادھوری سی رہ جاتی ہے ۔ وہ دراصل صبیحہ ہی کی وجہ سے حنیف کو لوگ ... کہتے تھے ۔ ماں باپ نے تو نام عبدالحنیف رکھا تھا ۔ عبدل حنیف نے خود اڑا دیا ۔ ایک دفعہ میں نے صبیحہ سے پوچھا کہ نی کے کیا معنی ہیں وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی کہنے لگی "ایک" میں نے کہا "ایک چیز" وہ شرما کر بھاگ گئی ۔ صبیحہ کی فارسی دانی کا ایک لطیفہ یاد آ گیا ۔ ایک دفعہ حنیف نے مجھے "نور عالم ، انتخاب شیخ صلاح الدین" کو چاہتے پایا ۔ حنیف نور عالم کو نور قطب عالم کہتا ہے ۔ صبیحہ فوراً بول اٹھی "یہ عالم ہیں یا عالم ! اور یہ قطب ہے یا کتب !" ہم سب حیران رہ گئے ۔ حنیف بھی لفظوں کا رسیا ہے لیکن یوں لگتا ہے کہ اس سلسلے میں وہ اپنی بیٹی کا شاگرد ہے ۔

حنیف بڑی سادگی پسند ، بے تکلف اور بعض اوقات بے معنی باتیں بھی کر لیتا ہے ۔ اس کے لطیفے اتنے خوشگوار ہوتے ہیں کہ اُس کے بڑے سے بڑے عقیدت مند تک اُدھر اُدھر جھانکنے لگتے ہیں ۔ بعض تو روٹھ بھی جاتے ہیں ۔ لیکن مجھے اکثر یہی شک گزرتا ہے کہ یہ شخص بہروپیا ہے ۔ اس کا ظاہر کچھ اور باطن کچھ ۔ لیکن یہ تو منافق کی تعریف ہے ۔ وہ منافق نہیں ۔

جیتے ہیں مگر دیکھ کے دلسوزی کا

یعنی سرِ بزم فروزاں نہ ہو

اُسے تاریخ گوئی پہ بڑا عبور حاصل ہے ۔ اور یہ فن بھی اُس نے راحل مرحوم سے سیکھا ۔ ... دل کو دیکھ کر تاریخ نکال دیگا ۔ آپ کی باتوں میں سے تاریخی فقرے نکال دیگا ۔ میں تو ایک دفعہ اُس کی تاریخ گوئی سے اتنا متاثر ہوا کہ میں نے شادی ... میں سے فوراً چند ایک تاریخیں کہیں ۔

شاعر شہر طرب شاداں شدہ   مرقید سے آزاد تھا ہر حبیب ناصر کاظمی

شادی ہوئی تاریخ ہے پابند ناصر کاظمی

[illegible] نے فرمائی۔ [illegible] / ۱۹۵۲

[illegible] شرکت کرتے ہے۔

حفیظ [illegible] نہیں [illegible] ہے۔ [illegible]

[illegible]

[illegible] حفیظ کی شخصیت [illegible]

[illegible]

حفیظ کی غزل روایت سے آشنا ہے لیکن [illegible] ہے۔ دراصل وہ اپنے آپ کو روایت سے کسی طرح بھی [illegible]۔ غالب [illegible] اس نے ایک [illegible] استعمال بھی کیا ہے۔

نقش ہے غزل میرے دل پہ حفیظ
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

مگر شیخ صلاح الدین نے اسے قائل کر لیا کہ اس پر میر کا بھی اثر ہے۔ شیخ صلاح الدین کا ذکر میں نے یہاں اس لئے کیا کہ وہ ایک ایسا شخص ہے جس [illegible] نہیں [illegible] خواہ وہ کچھ بھی ہو یا اس میں کوئی [illegible] ہو۔

جس زمانے میں حفیظ سے اپنی دوستی ہوئی وہ زمانہ غزل گو شعراء کے لئے بہت برا [illegible] زمانہ تھا۔ [illegible] لیکن حفیظ اپنی روش پر قائم رہا۔ وہ [illegible] کی طرح گھر میں [illegible] بیٹھا رہا۔ اور اس نے اسی کنج تنہائی میں رہ کر بڑے حوصلے سے [illegible] کی۔ [illegible] سے میں اس کا معتقد نہیں [illegible] غزل [illegible] اس کا معارض نہیں ہو سکتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ [illegible] نے اسے عام مقبولیت کے طغرے سے [illegible] محروم [illegible] ہے لیکن اس سے اس کے مقام میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس نے سینکڑوں ہی غزلیں کہی ہیں۔ لیکن یہ اسی کا حوصلہ ہے کہ اس نے ابھی تک صاحب دیوان بننا نہیں چاہا۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ ان دنوں [illegible] پر روایت سے بغاوت کرنے کا بھوت سوار تھا۔ وہ الٹی سیدھی باتیں لکھ کر صرف [illegible] کرنا چاہتے تھے۔ [illegible] ان کے نام لیوا باقی ہیں۔ [illegible] کا یہ حال ہے کہ [illegible] کر کے ہی قانع ہیں۔ اس پورے دور کے جواب میں حفیظ کا یہ شعر کافی ہے۔

بہت بلند ہے اس سے مرا مقام غزل
اگرچہ میں نے محبت کے گیت ہی گائے

مجھے [illegible] حفیظ [illegible] ہے۔ [illegible] ابھی [illegible] پھلیاں نکال رہا ہو۔

ن ۔ م ۔ راشد

عطاء اللہ سجاد

راشد اور میں زندگی میں ایک دوسرے کے اس قدر قریب رہے ہیں اور ہماری رفاقت اس قدر طویل رہی ہے کہ میرے لئے ایک نقاد یا مبصر کی حیثیت سے اس کی ذات اور شخصیت کا تجزیہ کرنا بے حد مشکل ہے۔

راشد سے میری ملاقات آج سے قریباً ستائیس سال قبل دسمبر ۱۹۳۲ء کی ایک شام کو ہوئی تھی۔ غالباً وہ شام بھی دسمبر کی عام شاموں کی طرح بے حد خنک اور ٹھٹھرا دینے والی ہوگی لیکن میرے لئے اس کے تصور میں آسودگی اور راحت کے احساس کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔

ضلع گوجرانوالہ کے ایک معمولی سے قصبہ سکھیکی منڈی میں ہمارے مرحوم دوست اشرف کا مکان تھا۔ اشرف نے ہمارا تعارف کرایا۔ عطاء اللہ۔ نذر محمد۔ میں نے دیکھا نذر محمد گندمی رنگ کا ایک خوب رو نوجوان ہے جس کی لمبی پلکیں اس کے عینک کے شیشوں میں سے بھی نمایاں تھیں۔ جن لوگوں نے گزشتہ پندرہ سال میں راشد سے ملاقات کی ہے وہ شاید میرے اس بیان کو میری حد سے زیادہ نظر کی خود فریبی پر محمول کریں کیونکہ راشد کے چہرے پر آج کل جوانی کی آن طاقت اور عمل کشی کی بجائے ایک درشتی جھلکتی ہے جسے اس کی ٹاٹ سے اور بھی گہرا کر دیا ہے۔

اصل میں راشد نے بے حد حساس طبیعت پائی ہے۔ اپنی ملازمت کے سلسلہ میں وہ کئی بار استعفا داخل کر چکا ہے لیکن وہ کوئی بڑا آدمی نہیں وہ اندر ہی اندر سوچتا اور کڑھتا ہے اور تقریباً ہر بات پر اس کا چہرہ اس کے اندرونی خلفشار سے متاثر ہوتا رہا ہے۔ اس کے اپنے قول کے مطابق یہ غالباً ہمارے سے ایک بار اس کے متعلق (BORN UNHAPPY) یعنی پیدائشی افسردہ دل کا لقب کہی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس طبیعت کا آدمی محفل آرائی کے فن سے صحیح معنوں میں آشنا نہیں ہو سکتا۔ اس کی کم آمیزی یا عدم گرمی بعض لوگوں کے دل میں اس کی طرف سے بے جا طور پر نخوت اور غرور کا ایک احساس پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے باوجود جب وہ اپنے مخصوص حلقۂ احباب میں موجود ہوتا ہے تو کم آمیزی کی یہ حد ٹوٹ جاتی ہے اور مروت و اخلاص کی دلکشی اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔

جن دنوں ہماری ملاقات ہوئی وہ اپنے نام کے ساتھ راشد وحیدی لکھتا تھا۔ جب میرا اس سے تعارف ہوا تو مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہی نذر محمد راشد وحیدی ہے جو نیرنگ خیال میں سلسلہ وار مضامین محبت کے تجربات کا ذکر کرتے ہوئے جب اس نے راشد وحیدی کی ایک نظم کا ذکر کیا ۔۔۔ کا ذکر کیا اس کے چہرے کے ماحول میں شگفتگی پیدا ہو گئی تھی اور اس نے مجھ سے مسکرا کر اقرار کیا کہ وہ نظم میری ہے۔ ہم دونوں نے کئی اصل خیالات سے دوبارہ

[illegible] ایک لڑکی سے محبت ہو گئی۔ راشد نے اس لڑکی کا نام [illegible] معلوم ہو سکا۔ راشد [illegible] خوش ہوا [illegible] شعر [illegible] کتاب [illegible] شخص [illegible] راشد [illegible] ایک [illegible] سے محبت کے [illegible] تھا [illegible] اس نے [illegible] مجموعے میں ایک [illegible] راشد [illegible] کے ایک [illegible] تھا۔ [illegible] اس وقت کی [illegible] سے [illegible] تخیل میں راشد [illegible] نے ایک [illegible] راشد [illegible] شعر [illegible] عشق [illegible] سے [illegible] پاس [illegible] لڑکیاں جنسی [illegible] کرتا [illegible] دیکھتی [illegible] راشد [illegible] ان کی یاد میں راشد نے [illegible] ایک نظم لکھی جس کے چند مصرعے مجھے اب تک یاد ہیں۔

آہ وہ تخیل مخمل کی دوپہر زاروں کے ذخیر

....

ہاں وہ مینے کپڑے سے کہ آنا تھا ہر
اور تعفن چھوڑ جانا ہر کلی ہر پھول پہ
وہ کرشیا کی جین، وہ جیس کا نام تک نہیں
جس کے فقرے بیہودہ جس کی ادائیں بھی

راشد کی پیدائش سن ۱۹۱۰ء میں اس کے آبائی وطن اکال گڑھ میں ہوئی۔ اکال گڑھ پنجاب کے ضلع گوجرانوالہ کا ایک تاریخی شہر ہے۔ لیکن تمام پنجاب کا عشق انگیز اثر راشد کو شاعر تو بنا سکا ہے لیکن اسے رانجھا یا مہینوال نہیں بنا سکا ہے۔ اس کی زندگی میں کوئی ہیر یا سوہنی داخل نہیں ہوئی [illegible] چند جواب خشتیہ نظمیں بخشی ہیں لیکن اس کی کتاب حیات میں معاشقہ کا کوئی باب نہیں۔ البتہ اس نے متوسط گھرانے کے ایک شریف مسلمان نوجوان کی طرح اپنی ہم زاد کے لیے جو اس کی منگیتر تھی اور اب اس کی رفیقۂ حیات ہے چند روز [illegible] نظم لکھی تھی۔ ایک بند مجھے یاد رہ گیا ہے۔

حرمِ عفت و عصمت میں ہے قیام اس کا
طوافِ خانۂ عصمت میں ہے خرام اس کا
نجوم و ماہ سے بڑھ کر ہے احترام اس کا
اسی سے پیار مجھے ہے اسی سے پیار مجھے

راشد افلاطونی عشق کا قائل نہیں۔ اختر شیرانی سے کسب فیض کرنے کے باوجود وہ اس کے اس نظریے سے کبھی متفق نہیں ہوا کہ "[illegible]" اس کی نظم "حزنِ انسان" افلاطونی نظریۂ عشق پر ایک طنز ہے۔ اس کے نزدیک جسم اور روح دونوں کے آہنگ کا نام محبت ہے۔ غالباً دورِ حاضر کا وہ پہلا شاعر ہے جس نے اس جسارت کے ساتھ محبت میں جسموں کے آہنگ پر زور دیا ہے اور محبت کے افلاطونی نظریے کی تضحیک کی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ راشد کی زندگی بھی "اپیکورین" کی زندگی رہی ہے بلکہ اس کے برخلاف وہ ان تمام "نفیس" ([illegible]) پر عمل پیرا رہا ہے جس کی تعلیم اس جیسے لوگوں کو اپنے گھروں میں ملتی رہی ہے۔ البتہ اس نے زندگی میں جنس کی اہم حیثیت کو ہمیشہ ملحوظ رکھا ہے اور جنس کے متعلق اس کا یہ نظریہ ہمارے درمیان کئی [illegible] علمی بحثوں کا موضوع بنا رہا ہے۔ جن دنوں ہم [illegible] میں مقیم تھے راشد نے اپنی مشہور نظم "انتقام" لکھی جس میں ایک مصرع تھا

میرے ہونٹوں نے تجھے پیدا کیا

میں نے کہا اس کی بجائے

میرے خوابوں نے تجھے پیدا کیا

ہونا چاہئے۔ راشد نے کہا اگر میں ہونٹوں کی بجائے خوابوں کہوں تو میرا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔

لاہور میں ہم قریباً تین سال قلعہ گوجر سنگھ میں مقیم رہے۔ میں اور چوہدری اب مسٹر جسٹس محمد یعقوب علی خاں لاء کالج میں پڑھتے تھے اور راشد ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد مولانا تاجور کے نئے رسالہ شاہکار کی ادارت کرتا تھا۔ وہ زمانہ ہمارے لئے تنگدستی اور عسرت کا زمانہ تھا۔ ان سیکڑوں بے مایہ نوجوانوں کی طرح جو لاہور جیسے بڑے شہروں میں حصول تعلیم کے لئے وارد ہوتے ہیں ہم لوگ بھی اپنے لئے راستہ بنا رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ زندہ رہنے کے لئے تگ و دو کر رہے تھے۔ لیکن ان دنوں کی بے فکری، خود اعتمادی، صلاحیت کا ادراک جنہیں تلاش کرتا ہوں تو کہیں نظر نہیں آتیں۔ ہم نے اپنے مکان کا نام دانشکدہ یعنی آشیانہ رکھا ہوا تھا۔ میں لاء کالج میں پڑھنے کے علاوہ صاحبان کے عدالت میں بھی منسلک تھا اور شام کو چھ سے دس بجے تک مسلسل محنت کے بعد دانشکدے میں واپس آتا تو دو فاقہ مستوں کی پھبتیاں میرا استقبال کرتیں۔ تین قہقہے بلند ہوتے اور اس کے بعد تنگی کی ہر چیز مسکراتی ہوئی نظر آتی۔

دانشکدے میں ہمارے نقل مکان کرنے کا پہلا دن تھا کہ شام کے وقت پروفیسر احمد شاہ بخاری تشریف لائے۔ ہماری کتابیں ابھی چارپائیوں پر پڑی تھیں اور بخاری صاحب کو بٹھانے کے لئے اس وقت ہمارے پاس کوئی کرسی نہیں تھی۔ بخاری صاحب نے کتابوں کو چارپائی پر دیکھا تو

چارپائے بروکتابے چند

کی پھبتی کہی۔ راشد نے کرسی نہ ہونے پر معذرت کی اور چارپائی خالی کر دی۔ اب بخاری صاحب جو بیٹھے ہیں تو علم و ادب کے دفتر کھل گئے۔ اتفاقات کے ایک ایک مصرعہ پر داد دی۔ راشد کی تشبیہات کے سلسلہ میں میتھیو آرنلڈ کی تشبیہات کا ذکر کیا۔ اس وقت کی انگریزی شاعری کے رجحانات پر سیر حاصل تبصرہ ہوا۔ راشد نے امریکہ کا ایک رسالہ دکھایا جس میں "اتفاقات" کا انگریزی ترجمہ چھپا تھا۔ انگریزی میں فرمایا "راشد تم سے انصاف نہیں ہوا"

غالباً یہ علمی صحبت دو ڈھائی گھنٹے جاری رہی۔ اور اس کے بعد صرف ایک بار پھر بخاری صاحب کی زیارت دانشکدے میں ہوئی۔

دانشکدے میں اختر شیرانی مرحوم، مولانا تاجور، راجہ مہدی علی خاں اور راشد کے دو ہم جماعت آغا عبدالحمید اور عمر فاروق بھی آیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی مولانا چراغ حسن حسرت بھی تشریف لاتے کیونکہ وہ "احسان" میں میرے رفیق کار تھے اور میں انہیں کھینچ لایا کرتا تھا۔ مولانا تاجور کا ہر معاملے کے متعلق بات کرنے کا اپنا ڈھنگ تھا اور ان دنوں "ہمانی چند کا قدردانی" کے مصداق ان کی باتیں ہمارے لئے کئی ایک ایکٹ کے ڈراموں کا موضوع بن جاتیں۔ راشد کو مولانا ان دنوں غالباً چھتیس روپے ماہوار تنخواہ دیا کرتے تھے۔ مولانا کا تمام کاروبار ان کے برادر نسبتی سلیمان خاں صاحب کے ہاتھ میں تھا۔ اور مولانا ایک مشکل صورت حال سے بچنے کے لئے ہمیشہ سلیمان خاں صاحب کو سپر کے طور پر استعمال کرتے۔ مثلاً اگر وہ راشد کے کسی اداریے یا نظم کی تعریف کرتے تو میں کہتا کہ مولانا بیچارے راشد کی تنخواہ میں بھی اضافہ فرمائیے تو کہتے "بھئی یہ تم نے بڑی مشکل بات کہی۔ اگر راشد کی ترقی ہوئی تو پھر سلیمان خاں بھی مانگے گا۔ اب تم ہی بتاؤ میں اسے کیسے انکار کر سکوں گا۔ وہ میری بیوی کا بھائی ہے۔ نہ بھئی ترقی کی بات اس وقت نہ چھیڑو میں چپکے سے راشد کی تنخواہ بڑھا دوں گا۔"

اگر کسی اخبار یا رسالہ میں مولانا یا "شاہکار" کے متعلق کوئی تنقید شائع ہوتی اور ہم لوگ مولانا سے اس کا تذکرہ کرتے تو مولانا بڑی سنجیدگی سے فرماتے "بھئی یہ تو غنڈوں کی ایک پارٹی ہے پارٹی۔ انہوں نے تو مجھے ختم کرنے کے لئے ہزاروں روپے چندہ جمع کر رکھا ہے"

قلعہ گوجر سنگھ کے قیام کا زمانہ راشد کی شاعری کا بہترین زمانہ تھا۔ اس زمانہ میں اس نے "آنکھوں کے جال" "زوال" اور "انتقام" جیسی نظمیں لکھیں۔ کبھی کبھی اس کی کسی نظم پر بحث کے دوران میں میں اس کی نظم کی پیروڈی شروع کر دیتا۔ یہ اس کی دکھتی رگ تھی اور ایک دن تو اس نے بڑی

ہیں ان کے سوانحی پس منظر سے متعلق تفصیل ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر سال ہمیں طرزِ عمل پر نادانی کا شاخسانہ تھا۔ خود انہی ایام کے متعلق مواد کو اس وقت میں بتایا تھا کہ راشد نے اردو ادب پر شعر و سخن کی کئی نامیہ اصناف طلب نیاز کے مطابق مکمل کئے ہیں۔

راشد ایک بے حد شاداب تخیل کا مالک ہے۔ اس تخیل اپنی مخصوص [illegible] اور انوکھی تشبیہات کے ذریعے وہ ایک معمولی تجربہ کو عظیم نظم کی صورت میں پیش کر دیتے ہیں۔ جب ہم ان کے ایک نیم روشن اور تنگ سے کمرے میں ایک شام کو بیٹھے تھے تو انہوں نے دیکھا کہ اس کے کمرے کی سفید پتھر کی میز کی سطح پر پڑ رہا تھا۔ چند دن کے بعد اس نے اپنی نظم "[illegible]" کے عنوان سے مکمل کر لی جس میں اب یہ مصرعے پڑھتا ہوں تو وہ سب مرقع میری آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔

آہ! تیری مہربان آنکھوں سے جال
میز کی سطح درخشندہ کو دیکھ
کیسے پیمانوں کا عکس پیکراں
اس کی بے اندازہ گہرائی میں بے قید ہوا

"زوال" کا پس منظر ہمارے مکان کے دریچے کا صحن ہے جس میں گوندنی کے ایک درخت کے نیچے سے راشد نے پرندوں کو چرتے دیکھا اور ہمیں ایک ابرِ غم بخشی جو اپنے تاثر میں "زوال" سے ہے۔

لاہور میں ادب کو ذریعۂ معاش بنانے کی سعیٔ لاحاصل کے بعد راشد نے کمشنر ملتان کے دفتر میں کلرکی پر قناعت کر لی۔ یہ اس کی زندگی کا تلخ ترین زمانہ تھا۔ تنگدستی، قلیل تنخواہ، متاہل زندگی کی ذمہ داریاں، جاہل اور نیم خواندہ افسروں کی رعونت اور ملازمت کے لئے اس کی طبیعت کی ناموزونیت ان سب چیزوں نے مل کر اس کی حساس طبیعت پر بے حد اثر کیا۔ اس کی اس زمانے کی نظموں سے بھی وہی تلخی عیاں ہے۔ "شرابی" اور "بے سوادی" اسی عہد کی یادگار ہیں اور "انتقام" عنوان میں غالباً یہ پہلی عشقیہ نظم ہے جو سیاسی پس منظر کے ساتھ لکھی گئی ہے۔

اس زمانے میں راشد خاکسار تحریک میں شامل ہو گیا اور سی۔ آئی۔ ڈی نے کمشنر کو اس کے خلاف رپورٹیں بھیجنی شروع کیں۔ دفتر کا سپرنٹنڈنٹ پہلے ہی اس سے مخالف تھا کہ راشد اس کے سامنے ڈپٹی بن کر نہیں آتا تھا۔ اس نے بھی رنگ آمیزی کی لیکن خوش قسمتی سے کمشنر مسٹر [illegible] دوست [illegible] تھے انہوں نے سی۔ آئی۔ ڈی والوں کو ڈانٹ پلا دی اور راشد سے ان کا رویہ ہمدردانہ ہو گیا۔ اس کے بعد راشد کو ریڈیو میں ملازمت مل گئی۔ ان دنوں آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل مسٹر فیلڈن تھے۔ راشد نے جاتے ہی ان سے کہا

"جناب میں خاکسار تحریک میں شامل ہوں، کیا اس بات کا میری ملازمت پر کوئی اثر پڑے گا۔"

فیلڈن صاحب نے مسکرا کر کہا "تمہارا ارادہ ہمارے کسی سٹوڈیو پر بم پھینکنے کا ہے؟"

راشد نے جواب دیا "نہیں"

"تو پھر جاؤ اپنا کام کرو"

دہلی کے دوران قیام میں بھی راشد کے لئے اس کا حد سے بڑھا ہوا احساسِ عزتِ نفس اور خودداری جس باعثِ زحمت بنے رہے۔ سٹیشن ڈائریکٹر مسٹر ایڈمانی سے مسلسل ملاقاتیں کھٹ پٹ رہی۔ ایک دفعہ ریڈیو کے اعلیٰ افسران نے حکم دیا کہ پروگرام اسسٹنٹ پروگراموں کے نشر کے دوران میں کھانا نہ کھایا کریں۔ راشد نے یہ حکم سنا تو کہنے لگا کہ ہم کوئی رجمنٹ ہیں کہ ہم پر ایسے حکم نافذ کئے جاتے ہیں۔ ایڈمانی صاحب کہنے لگے کہ میں تمہاری یہ بات افسرانِ متعلقہ تک پہنچا دوں گا چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور راشد کو رہنے کے لئے اس وجہ سے [illegible]

رہا۔ اسی طرح ایک دفعہ دہلی کے اسٹور کے چیف انجینیئر سے لڑائی ہو گئی۔ راشد اتفاق سے کمرے میں ایک کرسی پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا۔ انجینیئر صاحب داخل ہوئے اور انہوں نے حکم دیا کہ وہ ٹانگیں پھیلا کر نہ بیٹھے۔ راشد نے ان کی طرف دیکھ کر کہا "آپ تشریف لے جائیے اور اپنا کام کیجئے۔ آپ کو اس بات سے کوئی تعلق نہیں کہ میں کس طرح بیٹھتا ہوں۔" چیف انجینیئر صاحب نے رپورٹ کر دی اور معاملہ انسپکٹر جنرل تک گیا لیکن وہ پوزیشن پر اڑا رہا۔

دہلی کے دوران قیام میں راشد نے اپنی نظم "دریچے کے قریب" لکھی جس میں سیاسی تلخی کا اظہار زیادہ شدت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ راشد کی یہ پہلی نظم ہے جو اس نے براڈکاسٹ کی۔

جنگ عظیم کے دوران میں راشد فوج کے محکمۂ نشر و اشاعت میں کپتان بھرتی ہو کر چلا گیا اور اس عرصۂ ملازمت میں وہ قاہرہ اور مشرق وسطیٰ میں تعینات رہا۔ تہران کے دوران قیام میں اس نے وہ نظمیں لکھیں جو اب "ایران میں اجنبی" کے نام سے اس کے دوسرے مجموعے میں چھپ رہی ہیں۔

فوج کی ملازمت بھی راشد کو راس نہ آئی اور وہاں بھی اس نے افسروں کے جبر و تعدی کے خلاف احتجاج کے طور پر استعفیٰ دے دیا اور ریڈیو کے محکمہ میں واپس آ گیا۔ آج کل وہ نیویارک میں یونائیٹڈ نیشنز (U N O) کے ریڈیو یونٹ میں ڈپٹی ڈائریکٹر کے عہدہ پر تعینات ہے۔ کام اسے بے حد پسند ہے اور وہ اپنی موجودہ ملازمت پر خوش معلوم ہوتا ہے۔

راشد ایک صاف گو انسان اور بے حد مخلص دوست ہے۔ اسے اپنی نفرت یا ناپسندیدگی چھپانے کے لئے ملائم الفاظ کا فن نہیں آتا۔ وہ دوستوں کے وار بڑی خندہ پیشانی سے سینے پر سہہ لیتا ہے لیکن اگر اسے یہ شبہ ہو کہ فلاں گروہ سے فلاں بات اسے ذلیل کرنے کے لئے اور محض حاسدانہ بغض کی وجہ سے کی گئی ہے تو پھر وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینا جانتا ہے۔ دلی میں جب ہمارے ایک مرحوم دوست سے راشد کے لئے میرے دل میں ہمیشہ بے حد محبت اور عزت رہی ہے، راشد کے تعلقات خراب ہو گئے اور انہوں نے ایک کی طرف توپوں کے منہ پھیر دیئے تو راشد نے اپنی معرکہ آرا ہجو "اشتراکی سفر" لکھی۔ یہ نظم ایک ہجو کی حیثیت سے اتنی کامیاب تھی کہ اپنے ہدف سے بھی داد وصول کی۔ کچھ عرصہ کے بعد دونوں دوستوں میں مصالحت ہو گئی اور محبت کے شفاف پانی نے تمام گرد و غبار دھو دیا۔ مرحوم کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے راشد رخصت پر لاہور آیا ہوا تھا اور مرحوم نے کئی بار مجھ سے ذکر کیا کہ راشد اور بیگم راشد تیمارداری کے لئے ایک سے زیادہ بار آتے تھے۔

راشد ایک مخلص دوست، ایک شائستہ لیکن فاش گو انسان ہے۔ وہ اپنی رائے کے اظہار کے لئے مبہم اور نرم الفاظ تلاش نہیں کرتا بلکہ جس انداز میں وہ کوئی بات محسوس کرتا ہے اسی انداز میں کہہ دیتا ہے۔ شاید یہ اس کے کردار کی خامی ہو کیونکہ آج کل زندگی کی قدریں اور اخلاق سانپ کے زہر کی بجائے اس کے حسن پر ندر دینے لگے ہیں۔

احمد علی

سید علی اکبر قاصد

میرے مضمون کا عنوان "احمد علی" بہت ادھورا اور نامکمل سا ہے ——— کبھی ہیر کٹنگ سیلون والے آپ کے سر کے بال زیادہ تراش دیں تو آپ کا چہرہ دو چار دن عجیب اجنبی اجنبی سا لگے گا۔ اسی طرح احمد علی کا نام پروفیسر کے دُم چھلّے کے بغیر عجیب عجیب سا لگتا ہے ——— ہاں یہ ذکر خیر ہے پروفیسر احمد علی کا ——— "انگارے" والے احمد علی ——— "ٹوئی لائٹ اِن دہلی" والے احمد علی ——— لکھنؤ یونیورسٹی والے احمد علی اور حکومت پاکستان کے محکمۂ امور خارجہ والے احمد علی۔

آج سے کوئی پندرہ سال پہلے میرے استاد پروفیسر کلیم الدین احمد نے ایک بھری محفل میں کہا تھا کہ "احمد علی کے افسانوں میں زندگی کا سراغ ملتا ہے اور احمد علی نے تھوڑا ہی لکھ کر ادب میں اپنا ایک انفرادی مقام حاصل کر لیا ہے" ——— اس وقت میرے دل میں احمد علی سے ملاقات کی تمنا ابھری تھی ——— اور طالب علمی و کم عمری کا وہ جذبہ بھی دل میں پیدا ہوا تھا کہ کاش میں بھی احمد علی کی طرح لکھ سکتا ——— میں "احمد علی کی طرح" لکھ تو نہ سکا مگر آج اس کی بجائے "احمد علی پر" لکھ رہا ہوں۔

پانچ برس بیتے ——— میرے دوست سلیم اللہ فہمی ایک شام مجھے احمد علی کے مکان پر لے گئے۔ وہاں پروفیسر احمد علی اور چراغ حسن حسرت مرحوم سے پہلی بار میری ملاقات ہوئی ——— یہ ملاقات میرے لئے ایک ڈرامائی تاثر رکھتی تھی ——— ایک عام پڑھنے والے کی حیثیت سے میرے ذہن نے بھی ان دونوں کی خیالی تصویریں بنا رکھی تھیں ——— چراغ حسن حسرت دُبلے پتلے سے نستعلیق آدمی ہوں گے۔ دھیمے دھیمے باتیں کرتے ہوں گے ——— باتوں کا لہجہ اُن کے اشعار کا سا ہوگا ؎

آؤ حسنِ یار کی باتیں کریں ‏ ‏ ‏ زلف کی رخسار کی باتیں

اور احمد علی پروفیسروں کی طرح ہوں گے ——— خاصے بھاری بھرکم ——— چندیا پر بال کم، چہرے پر فارغ البالی کے آثار ——— مگر یہ پہلی ملاقات ان ذہنی تصویروں کو لے ڈوبی ——— مجھے تھوڑی سی تکلیف ضرور ہوئی لیکن تھوڑی دیر بعد ذہن نے حقیقت سے مطابقت حاصل

کرلی۔ شام کے سائے گہرے ہوتے گئے۔ اور احمد علی کی شخصیت کے نقوش اُبھرتے گئے۔

احمد علی کو پہلی بار دیکھتے ہی سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شخص انسانوں کے ہجوم میں شامل بھی ہے اور ان سے الگ بھی ہے ——— احمد علی صحیح معنوں میں تو خوبصورت نہیں ہیں۔ گو گوری رنگت اور دبیز کمان خوبصورت کہے جاتے ہیں لیکن اُن کے چہرے کے گرد ایک مقناطیسی فضا ضرور ہے۔ فنکارانہ بھی ہے۔ اور آنکھوں کی چمک ان کی شخصیت کا بنیادی عنصر۔ مگر یہ چمک ویسی نہیں جیسی کسی ماہر مسمریزم کی آنکھوں میں ہوتی ہے بلکہ اس میں کچھ اُداسی اور خاکستری کیفیت بھی ملتی ہے ——— شعلے پر راکھ کا غلاف ——— احمد علی کی مخروطی لمبی انگلیاں بھی مرکزِ توجہ بن جاتی ہیں ——— زندگی کے اس سفر میں کتنے ہی لوگوں سے ملا ہوں اور

قامت وچہرہ، وہ وہ دیکھا، کبھی نہ بھولے، یاد رہے

لیکن کسی کی انگلیاں احمد علی کی انگلیوں کی طرح مرکزِ توجہ نہ بن سکیں ——— ابھی پہلی ملاقات کی شام کی بات کر رہا ہوں ——— جب چائے آئی اور سب پینے لگے تو احمد علی بڑی نفاست سے پیالی اُٹھاتے، اپنے ہونٹوں تک لے جاتے اور پھر طشتری میں رکھ دیتے ——— ان کے اس عمل میں کچھ ایسی کیفیت تھی کہ مجھے محسوس ہوا جیسے احمد علی پیدائشی طور پر بت تراش ہیں ——— احمد علی کے سر کے بال بڑے بڑے تھے اور بے ترتیبی میں بھی ایک ترتیب تھی جیسے غزل کے اشعار میں یہ سماں ہوتا ہے ——— اُردو میں باتیں کرتے کرتے انگریزی بولنے لگتے اور لہجہ کا خیال رکھتے ——— پہلی ملاقات نے احمد علی کی شخصیت کے یہ تاثرات پیدا کئے اور یہ آج بھی قائم ہیں۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ ہاں قریب سے دیکھنے کے بعد اضافے ضرور ہوئے ہیں۔

لباس کے معاملے میں احمد علی ان لوگوں سے بہت الگ ہیں جو "جنٹلمین" کہلاتے ہیں، اگر کسی شام کسی ایسے آدمی سے آپ کی ملاقات کرائی جائے جو گہری ہری قمیص کے ساتھ سرخ گہری سُرخ ٹائی لگائے ہوئے (BRUTE AMERICAN CONTRAST) اور کہا جائے کہ ان سے ملئے، یہ ہیں پروفیسر احمد علی ـ تو یہ کسی پریشانی کی بات نہیں، اور اسی لئے یہ بات میں نے آپ سے احتیاطاً عرض کر دی ہے ——— اس ذوقِ لباس کی نفسیاتی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ احمد علی کراچی کی بے رنگ زندگی سے انتقام لے رہے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے، نہ تو موسیقی کی محفلیں جمتی ہیں۔ نہ رقص کی لہریں اُٹھتی ہیں، نہ ہم مشرب کہیں مل کر چار بیٹھتے ہیں ——— اس کی ایک اور نفسیاتی وجہ میری سمجھ میں یہ آتی ہے کہ غالباً احمد علی غیر شعوری طور پر اپنے آپ کو جوان رکھنے اور جوان پیش کرنے کے لئے یہ اہتمام کرتے ہیں ——— اُن کی عمر اب یہی کوئی چوالیس پینتالیس سال ہے، پہلی نظر میں یہ عمر جچتی بھی نہیں لیکن جب ملنے والا اُن سے قریب ہوتا جاتا ہے تو وہ کم عمر معلوم ہونے لگتے ہیں، شوخ کپڑے باتوں میں شوخی، حرکات وسکنات اور جنبشوں میں جوانوں بلکہ نوجوانوں کی سی بے چینی اور قوت کا اظہار، کچھ وارفتگی اور والہانہ پن، اور اسی حسن میں گفتگو کرتے ہوئے چابیوں کے گچھے سے کھیلتے رہنا ——— یوں گردشِ ایام پیچھے کی طرف لوٹ جاتی ہے۔

احمد علی دیکھنے میں خاصے لمبے آدمی ہیں مگر اس لمبائی سے بہت زیادہ ان کے اندر گہرائی ہے، علم کی اور مطالعے کی ——— بلاشبہ وہ ایک بڑے فنکار ہیں، متوازن نقاد اور شگفتہ ادیب، ادب اور زندگی پر غائر نظر رکھنے والے ——— خوشگوار اور دلکش مسکراہٹوں والے احمد علی ہمارے ادب اور کلچر کی تاریخ میں زندہ رہیں گے ———

احمد علی گفتگو کے فن کے بڑے ماہر ہیں ——— جس طرح اچھے بندوقچی کا RANGE بہت وسیع ہوتا ہے اُسی طرح احمد علی کی باتوں کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے ——— جولیس سیزر اپنے بارے میں کہتا تھا کہ ——— "میں آیا ——— میں نے دیکھا ——— اور میں نے فتح کر لیا" ——— احمد علی بھی بڑے فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ "میں آیا ——— میں نے باتیں کیں ——— اور میں نے فتح کر لیا"۔

ایک بڑی ہی بین الاقوامی قسم کی محفل میں، میں بھی شریک تھا اور احمد علی بھی ——— احمد علی کے سامنے پیمانہ و مینا تو نہیں تھے مگر چاروں طرف

خاتون مزید حسین تھیں۔ پھر دیکھئے انداز گفتگو کا اختلاف۔ احمد علی بیک وقت ایک معمر انڈونیشی خاتون، ایک ادھیڑ جاپانی خاتون، ایک نوجوان چینی خاتون اور ایک منگولی یا کسی پہاڑی خاتون سے باتیں کر رہے تھے اور کیسی باتیں؟ ——— انڈونیشیا میں شادی کے نئے رجحانات، جاپان میں اقتصادی بدحالی، چین کے معاشی حالات، چین کا مستقبل ——— پھر احمد علی کو پہاڑی خاتون کی ابروؤں میں سیپئین [illegible] کی جھلک نظر آگئی۔ عجیب! اور وہ آدھے گھنٹے تک سیپئین [illegible] پر گفتگو کرتے رہے ——— کبھی کبھی احمد علی کی گفتگو عجیب انداز کی ہوتی ہے ——— بنا بریں کہ عام تصنیفات و مقالات سے مختلف ایسے موقعوں پر قدامت کا وہ اظہار کریں گے کہ حیرت ہو جائے گی ——— کوئی حیرت سے قریب تھا کہے۔ "اللہ! یہ اشارے کا مصنف پہلا رہا ہے؟" ——— میں سوچتا ہوں کہ اصل احمد علی کون ہے؟ ——— یہ مجھے کہنے دو "یہ اشارے کا افسانہ نگار" بھائی جان (احسن صاحب مرحوم) اور [illegible] کشتی نے ختم کیا، مہر محمد نے پچھلے شمارے میں کسی کا یہ کچھ عجیب دیا کہ ——— "بندے کو خدا پر یہ فوقیت ہے کہ خدا ذات رگ سے آشنا نہیں" ——— میں نے پچھلے کے دو پڑھ لیے وقت سے حضرت یہ شدید اعتراض تھا بھائی جان اور کشتی کہتے کہ یہی کب اتفاق ہے؟ یہ تو کسی کا قول ہے؟ میں نے جواب دیا "آپ جواب دیجئے" ——— ایک دن شام کو احمد علی آگئے اور کشتی، وہ بھائی جان سے الجھ پڑے ——— "صاحب! آپ نے یہ کیا جواب دیا؟ کیا آپ کے لکھنے والے نے خدا کے بلند و برتر کے بارے میں ایک منٹ بھی نہیں سوچا ——— خدا تو علیم و بصیر ہے۔ وہ مانے یہ نہ مانے، وہ سب سے بڑا فنکار ہے وغیرہ وغیرہ" ——— کشتی بڑی معصومیت سے بولے کہ ——— "یہ احمد علی صاحب بول رہے ہیں یا مفتی شفیع؟" ——— احمد علی ہنس پڑے اور بحث ختم ہوگئی لیکن وہ لمحہ بہت قیمتی تھا۔ خدا اور مذہب کے بارے میں احمد علی کے صحیح جذبات سامنے آگئے۔ احمد علی نے دہلی کی روایات کی آغوش میں پرورش پائی ہے ——— وہ روایت شکن ضرور ہیں لیکن اُن کی زندگی اور ان کی تحریروں میں وہ روایات بہر کیف جھلکتی ہیں ——— کہ شاید وہ دلی والوں کی طرح کبوتر بھی اڑا سکتے ہیں۔

احمد علی صرف کبوتر ہی نہیں اڑاتے بلکہ انہیں کئی اور جانوروں سے بھی دلچسپی ہے ——— گو وہ ایک مکان میں رہتے ہیں لیکن یہ مکان بھی ان کے مذاق کا کسی حد تک آئینہ دار ہے ——— چھوٹا سا باغیچہ ——— چھوٹے چھوٹے پتھروں سے بنی ہوئی پہاڑیاں سی بنی ہوئی ——— چھوٹا سا گڑھا گڑھے میں پانی ——— پانی میں رنگین مچھلیاں ——— جالیاں تنی ہوئی ——— جالیوں میں ڈال ——— رنگ برنگی چڑیاں، کبوتر، خرگوش اور ایک مرغ بھی ——— دروازے پر دو مور کھڑے ——— سوانا کے مسعود کی طرح احمد علی شیر اور بکری کو ایک گھاٹ پر پانی تو نہ پلا سکے لیکن یہ صلاحیت ان میں ضرور ہے بلی اور کتے کو رشتۂ رفاقت میں منسلک کر رکھا ہے۔ ایک زمانے میں تو وہ بڑی سنجیدگی کے ساتھ یہ سوچا کرتے تھے کہ بلی اور کتے کو زنجیرِ مناکحت میں باندھا جا سکتا ہے یا نہیں؟ ——— اس سلسلے میں اگر کوئی شکایت ہے تو بس اتنی کہ ہمیشہ کاٹ کھانے والا کتا رکھتے ہیں

عجائبات سے احمد علی کو بہت شغف ہے۔ اُن کا ملاقاتی کمرہ ——— کمرہ کاہے کو ہے ایک بڑا ہال ہے اور داخلے کا دروازہ بیضاوی ہے۔ آپ ملاقاتی کمرے میں پہنچیں گے تو قالین، مجسّموں، تصویروں، ایک بہت بڑے چوبی صندوق اور ایسے ہی الم غلم سامان کو دیکھ کر تھوڑی دیر کے لئے احمد علی کو بھول جائیں گے ——— جب آپ اپنے عالم میں آئیں گے تو احمد علی کی آنکھوں کو مسکراتا پائیں گے ——— "یہ صندوق عہدِ شونگ کا ہے"، "یہ منقش منگ عہد سے چیانگ چانگ سے تعلق رکھتا ہے"۔ وغیرہ وغیرہ ——— احمد علی نے یہ سب سامان اپنے قیامِ چین کے زمانے میں جمع کیا تھا۔ جب وہ پاکستان کے سفارتی نمائندے کی حیثیت سے چین گئے تھے ——— ویسے وہ پہلے بھی انگریزی کے پروفیسر کی حیثیت سے قیامِ پاکستان سے پہلے بھی چین ہو آئے ہیں ——— اور وہ یہ سب سامان اسی بڑے چوبی صندوق میں بھر کر لائے تھے۔ جو اب ان کے کمرے میں رکھا رہتا ہے، بھابی بلقیس (بیگم احمد علی) کا کہنا ہے کہ جب گھر میں زیادہ مہمان آجاتے ہیں، تو احمد علی اسی صندوق پر سوتے ہیں مگر اس احترام و عقیدت سے کہ رات بھر سو نہیں پاتے ——— یہ کمرہ عجائب خانہ بھی ہے اور نگار خانۂ چین بھی، اسی لئے یہاں ٹھہرنا موسم کے

ایمان کے لئے باعث مسرت ہے کہ طبیعت چوری کی طرف ہر وقت مائل رہتی ہے۔

آج کل احمد علی کو ایک ہی دُھن ہے اور وہ ہے مکان بنوانے کی —— یہ دُھن اُن کی تخلیقی قوت سے جولک کی طرح چمٹ گئی —— اُنہوں نے ناظم آباد میں ایک پلاٹ لیا ہے۔ بدقسمتی یا خوش قسمتی سے میرا تعلق یونیورسٹی سے ہے اور احمد علی کا خیال ہے کہ اس کے علاوہ مجھے وہ ماہر تعمیرات بھی سمجھتے ہیں، چنانچہ اب جب بھی ملتے ہیں اور اکثر ملتے ہیں تو مکان کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں، کتابیں پڑھنے کی جگہ وہ جرمنی، انگلستان، فرانس اور سوئٹزرلینڈ کے مکانوں کے نقشوں کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں —— کسی مکان کی چھت پسند آئی تو کسی کا برآمدہ —— بال کی کھال نکالنے میں احمد علی اپنا جواب آپ ہیں۔ اُن کا تذکرۂ مکان اب تو دفتر طلسم ہوشربا بن گیا ہے، میں اہل ہونے کے باوجود احمد علی سے کہہ نہیں پاتا۔ بگڑتے ہوئے آئیں گے —— "بھئی اکبر! —— آخر یہ کیا ہے؟ تم ہمارے مکان کی بالکل توجہ نہیں دیتے۔ کل کوئی پتھر اُٹھا لے گیا۔ اور آج مٹی لے گیا۔ یہ سب کیا ہے؟"——

آج کل بلقیس بھابی اور احمد علی کے درمیان بچوں کے علاوہ اگر کوئی موضوع گفتگو ہے، تو یہی مکان کا سلسلہ —— فرصت کے اوقات میں دونوں میاں بیوی مکان کا نقشہ بناتے رہتے ہیں یا بحثتے رہتے ہیں —— "باتھ روم یہاں ٹھیک رہے گا" —— "بھئی میں اپنا پائیں باغ کے مشرقی گوشے میں بناؤں گا" —— "سامنے کی جالیاں ویسی ہی ہوں گی جیسی" "یا پھر یہ ہوتا ہے کہ میاں بیوی کسی مکان کا لے بیٹھے ہیں۔ چھت احمد علی کو پسند نہیں آئی اور دروازے بلقیس بھابی کو ناپسند ہیں —— یہ سلسلہ اب معمولات کا حصہ ہو گیا ہے۔

احمد علی کی ازدواجی اور گھریلو زندگی بہت خوشگوار ہے، بھابی بلقیس اُن کے مُسلے پن کی تلافی اور تکمیل ہیں، احمد علی کی طرح وہ بھی گفتگو کے فن میں —— اس تسلسل سے بولتی ہیں جیسے کتاب پڑھ رہی ہوں —— شادی شدہ خواتین احمد علی اور بیگم احمد علی سے مل کر اپنے شوہروں سے نالاں ہو جاتی ہیں: "میاں ہو تو ایسا —— بیوی کا کتنا خیال رکھتا ہے، ہر بات مان لیتا ہے، ایک تم ہو کہ میری سنتے ہی نہیں" —— اور شوہر مل کر کہہ اُٹھتے ہیں —— "بیوی میاں پر حاوی ہے" —— حالانکہ ایسا کہنا حقیقت سے خاصہ دور ہے —— احمد علی کے دو بچے عروج اور ارم بہت پیارے اور ذہین ہیں —— ان ناموں میں بھی احمد علی کی دو معصوم تمنائیں چھپی ہوئی ہیں —— ایک بات —— احمد علی کو جب بلقیس بھابی کے سامنے گھر سے باہر رہنے کا بہانہ تراشنا ہوتا ہے تو بہترین ذہانت کا ثبوت دیتے ہیں۔

زمانے کی طرح کراچی کا موسم بھی بدل گیا ہے اور اب کراچی میں آسمان پر بادل چھائے رہتے ہیں اور بارش ہوتی ہے تو ہوتی ہی ہے، فضا کے ابر آلود ہوتے ہی لوگ سیر و تفریح اور پکنک کے لئے گھروں سے نکل پڑتے ہیں لیکن ایسے میں احمد علی کی مصروفیت دلچسپ مکمل طرح پر انفرادیت لئے ہوئے ہوتی ہے، اپنی خاکستری "اوپل" میں اپنے دونوں بچوں کو بٹھا کر —— بغیر نعرہ لگائے —— ویرانے کی طرف نکل پڑتے ہیں، وہاں ان کے بچے مینڈکیاں پکڑتے ہیں اور احمد علی فورس اِن ریزرو (FORCE IN RESERVE) بن کر اپنے بچوں کو مینڈکیوں کی گرفتاری میں کمک پہنچاتے ہیں۔ جب اندھیرا چھا جاتا ہے تو واپسی ہوتی ہے اور ان کے فراک میں کا ماحصل یعنی قسم قسم کی چھوٹی بڑی مینڈکیاں، بڑی احتیاط سے رومال میں لپٹی لپٹائی ان کے گھر آ جاتی ہیں، مینڈکیاں پکڑتے وقت ان کی انگلیوں میں نفاست کے ساتھ نشانہ بھی ہوتا ہے اور پوری پلاننگ بھی —— احمد علی پلاننگ کے بھی بڑے ماہر ہیں۔ اس دلچسپ فن کام میں بھابی بلقیس ان کی مدد تو نہیں کرتیں مگر اظہار ناپسندیدگی بھی نہیں کرتیں —— وجہ ظاہر ہے، ایسے سہانے موسم میں انہیں احمد علی کی دوسری مصروفیتیں پسند نہیں۔

عرصہ سے احمد علی نے کوئی تخلیقی چیز نہیں لکھی —— اُن کی زندگی اور مزاج کو سامنے رکھتے ہوئے جب میں اس بات پر غور کرتا ہوں تو کئی باتیں سمجھ میں آتی ہیں —— ایک تو یہ کہ احمد علی اپنی گزشتہ تخلیقات سے مطمئن ہیں، دوسری بات یہ کہ انہیں کچھ یہ احساس

ز نقادوں نے ان کے صحیح ادبی مرتبہ کا تعین نہیں کیا۔ اور اس احساس میں وہ حق بجانب ہیں —— تیسری بات یہ کہ وہ مروجہ ادبی ماحول
سے مطمئن نہیں، جس میں گروہ بندی اور ادبی لیڈروں کا کرشمہ رہ رہا ہے۔ وہ نقادوں کو ہدف طعن بنائے رہتے ہیں —— ویسے احمد علی بہت
کم گو ہے۔ ان کے ماضی خیالات ابھی بہت کم ہے —— لکھتے جو افسانے مکمل پڑے ہیں —— وہ وقت انہیں لکھنے پر اکساتے
رہتے ہیں۔ اور جب وہ سنجیدگی سے لکھنے کی طرف مائل ہوتے ہیں تو ان کے دوست یا متعلقہ میدان سے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں —— حسن
شاہد صاحب [illegible] صاحب نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ MERNAIDS IN LUCKNOW ناول کا اردو میں ترجمہ کیا جائیگا۔
[illegible] شائع [illegible] جاری کی [illegible] کے افسانوں کا انتخاب [illegible] شائع ہو جائے گا۔ ہر شام دو گھنٹے کام کیا جائیگا۔
کشتی تو رواں کر کے ہندوستان چلے گئے اور سال بھر رہ بیٹھے تو ہے ہی نہ نکلے۔ اب اس کا کیا علاج؟ —— ایک ہی علاج ہے
وہ یہ کہ احمد علی خود ہی دن کے دو چار گھنٹے ادب کے لئے وقف کر دیں۔

احمد علی بہت اچھے، مخلص اور سچے دوست ہیں لیکن وہ اچھے آدمی ہیں۔ دوستوں کے لئے وہ بڑی سے بڑی قربانی کر سکتے
ہیں —— قربانی سے کرنے کے بعد وہ جھینپ تک —— بعض اوقات قربانی یوں ہے کہ اس کے لئے وقت کو قربان کرنا پڑتا ہے۔
یہ ایک ادھوری جھلک ہے احمد علی کی جو باغی ہونے کے ساتھ ساتھ روایت پرست ہے —— جسے پرانی شاعری
بہت پسند ہے —— اور کبیر کے ایک دوہے یا میر کے ایک شعر کے سہارے زندگی کے کتنے ہی لمحے کاٹ سکتا ہے —— جو آجکل
خود پر خاموش ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ خاموشی ایک بڑے ادبی طوفان کا پیش خیمہ ہے۔

اختر انصاری

عزیز عرفی

اختر صاحب کی کیفیت ایک جھیل کی سی ہے۔ خاموش اور پرسکون۔ جس کی سطح پر ہلکی ہلکی لہریں ہوں جو بنتے بنتے ہوئی حلقوں میں بند ہو کر ختم ہو جائیں۔ ساحل پر کھڑا ہوا کوئی شخص پتھر پھینک دے تو تھوڑی دیر کو سکون درہم برہم ہو جاتا ہے۔ ساری جھیل میں لہریں ہی لہریں رقص کرنے لگیں۔ یہ گویا متحرک ہو جائے —— اور پھر اس کے بعد ساکن سطح پر مسکراتا ہوا سکوت۔ وہاں فضا قہقہے مارتا ہوا سمندر معدوم ہے جو اپنی قوی ہیکل و عاشق ہوئی موجوں سے ساحل پر کھڑے ہونے والے خندہ زن تماشائیوں کو دعوت رقص دیتا ہے۔ وہاں پہاڑی ندی کا جوش و خروش اور عزم بھی نہیں جو سنگلاخ چٹانوں کو کاٹتی کھنکھناتی اور اچھلتی اپنی منزل کی طرف دوڑتی رہتی ہے —— وہ تو محض ایک جھیل ہے، پرسکون اور ساکت جس کی سطح کے نیچے ننھی ننھی سرخ و سبز سنہری مچھلیاں تیرتی رہتی ہیں —— حسرتوں کی طرح چپ چاپ رہتی ہیں —— اور پھر ایک زمانہ آتا ہے کہ وہ مچھلیاں مر جاتی ہیں۔ جھیل کی سطح مرتعش ہو جاتی ہے۔ لہریں ساحل سے ٹکرانے لگتی ہیں۔ جیسے وہ ساحل کو توڑ کر نکل جائیں گی اور ایک پہاڑی ندی کی طرح سنگلاخ چٹانوں کا سینہ چیرتی ہوئی اپنی منزل کو پالیں گی —— یعنی پرانی حسرتیں دم توڑتے توڑتے بھی تڑپیں گی —— لیکن پھر جھیل کی سطح اسی طرح ساکت ہو جاتی ہے۔ اور جھیل کا پانی دھیمے دھیمے سرگوشیاں کرنے لگتا ہے۔ کون اس برسوں پرانے سکون کو چھوڑ کر چٹانوں سے ٹکرائے ——

اس طرح یہ کہنا قطعاً وضاحت طلب نہیں کہ اختر صاحب میں دنیا سے لڑنے جھگڑنے کی ہمت نہیں۔ انھوں نے زندگی بھر حسرتوں اور امیدوں کے تاج محل بنائے ہیں۔ مرحوم آرزوؤں کا ماتم کیا ہے۔ لیکن دیوانہ وار نہ گریبان کو چاک کیا اور نہ دامن کو تار تار —— بلکہ ناکامی، مایوسی اور محرومی پر مسکرانے کے لیے ایک چھوٹی سی دو تین کمروں کی جنت تعمیر کی۔ جہاں اب وہ چاروں طرف سے دروازے بند کیے اپنے کمرے میں لیٹے آہستہ آہستہ پائپ پیتے رہتے ہیں۔ آمنے سامنے شیلف میں رکھی ہوئی اپنی "تصانیف" کو، پھٹے ہوئے فرنیچر کو، دیوار پر آویزاں شاہکار تصویروں کو، اپنے گرد پھیلی ہوئی قیمتی اشیا کو دیکھتے رہتے ہیں اور مسکراتے رہتے ہیں۔ انھوں نے دروازوں کے شیشوں پر بھی رنگ کے غلاف چڑھا دیے ہیں کہ مبادا ان کی ناکام حسرتیں جھانک کر رنگ میں بھنگ ملا دیں —— لیکن یہ سب باتیں تعبیر طلب ہیں۔

اختر صاحب نے اپنی زندگی کا ابتدائی حصہ جامع مسجد دہلی کے اطراف کی گلیوں میں گزارا۔ ان کے والد دہلی کے سول سرجن تھے۔ ایک شفیق باپ کی حیثیت سے ان کی خواہش تھی کہ اختر صاحب سول سرجن بن جائیں۔ دوسرے نوجوانوں کی طرح اختر صاحب کی آرزوؤں کے بار آور ہونے کا وقت آیا —— ان کے والد اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اختر صاحب کا مستقبل لرز گیا۔ تصورات کا جھلملاتا ہوا تاج ڈگمگانے لگا۔ لیکن اختر صاحب نے حالات کے سامنے سپر نہ ڈالی۔ وہ اپنے اس قصر پایۂ شاہی کے حصول کے لیے لندن گئے۔ مگر قسمت کے دربان نے محل کے دروازے ہی سے ناکام

[illegible] ــــ اور جب [illegible] کی ہیں پانی مرتی ــــ [illegible] میں ان کی بیوی بچوں ... بہن بھائی بیوی [illegible] کی ورث [illegible] ــــ اختر صاحب [illegible] قسم کے آدمی نے [illegible] کے مسل ... تھے ۔ لیکن [illegible] نے [illegible] کی طرف کبھی توجہ نہیں کی ۔ لہٰذا [illegible] کی تین [illegible] کے بعد [illegible] کچھ دیا ۔ [illegible] اختر صاحب کے [illegible] دوستوں [illegible] ــــ [illegible] روپیہ [illegible] دوستوں کو دے گا ۔ [illegible] کو بھیج سکتے تھے ــــ [illegible] کیا ہے ــــ وہ روپیہ [illegible] میں [illegible] ہیں ۔

" میں [illegible] کے [illegible] میں [illegible] کی مدت [illegible] لہٰذا [illegible] قائم رہا ہے ــــ [illegible] کے [illegible] لکھ [illegible] کا [illegible] ہے ــــ

" FOR SHEER FREEDOM MIND MUST BE FEARLESS. "

چنانچہ یہ حقیقت ہے [illegible] کے [illegible] نے [illegible] سلسلے میں یہی [illegible] بات [illegible] ــــ [illegible] مجھے [illegible] کے [illegible] کے [illegible] بات [illegible] لیکن یہ [illegible] تک [illegible] تکمیل نہیں ہے ــــ "

غیر بیب باتیں [illegible] طور پر [illegible] ۔ [illegible] اختر صاحب کی ابتدائی زندگی کا [illegible] اختر صاحب نے ملازمت کے لئے ہاتھ پیر مارے ۔ لیکن خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی ۔ [illegible] اور جب [illegible] کے لئے تو نہیں [illegible] ۔ جس کی [illegible] ایک [illegible] ([illegible]) [illegible] تھا ۔ لہٰذا انہوں نے سلم یونیورسٹی کے علی اسکول میں کام شروع کر دیا ۔ اس وقت تک ان کے [illegible] اور ان کا یہ یقین تھا کہ [illegible] اسکول سے جلد ہی نجات [illegible] اپنی [illegible] کی تکمیل کر سکیں گے [illegible] لیکن [illegible] اسکول سے [illegible] سکے ۔

ماحول اور واقعات کو اپنی خواہش کے مطابق ڈھالنا کچھ آسان بات نہیں ۔ اختر صاحب کی آمدنی قلیل تھی اور اخراجات زیادہ ــــ [illegible] کی تعلیم اور پرورش ایک طرف ــــ اپنی [illegible] دوسری طرف ــــ [illegible] تھیں ــــ انہوں نے [illegible] اور حسرتوں کا خون کیا ۔ لیکن بہن بھائیوں کی تعلیم اور پرورش سے [illegible] ــــ اختر صاحب کو اسکول [illegible] نکلنے کے مواقع بھی ملے ۔ لیکن ان میں RISK لینے کی ہمت نہ تھی ــــ کیونکہ اختر صاحب کو ابتدا ہی سے [illegible] اور [illegible] نے جکڑ لیا تھا ۔ دوسرے [illegible] FAMILY کی پرورش ان کا [illegible] بن چکی تھی ۔ لہٰذا وہ ہمیشہ [illegible] سے کتراتے رہے اور انہوں نے [illegible] حالات کو اپنا نصیب سمجھ لیا ــــ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اختر صاحب نے اپنی زندگی کے لئے [illegible]

ہے کہ اسے اس سے بلند تر بنانے کی [illegible] ہے — جیسے اختر صاحب کل [illegible] سے تنگ نظری کی [illegible] بدنظر آتی ہے۔

اختر صاحب کو پہلی بار میں نے اس وقت دیکھا جب میں اس اسکول کی پانچویں جماعت میں داخل ہوا — نویں دسویں جماعتوں کو انگریزی پڑھاتا، خالی گھنٹے میں اسکول کے لان پر پائپ منہ میں دبائے ٹہلتے رہنا۔ یہ ان کا روز کا معمول تھا۔ ان کے علاوہ بھی چند پڑھانے اور بڑے عجیب قسم کے اساتذہ سے ہی تھے۔

طلبا کا ایک خاص مشغلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اساتذہ کے متعلق مختلف اوقات میں مختلف زاویوں سے تبصرے کیا کرتے ہیں اور یا ان اساتذہ کا ذکر خیر ہوتا ہے جن سے براہ راست تعلق ہوتا ہے — لہٰذا آٹھویں جماعت تک کے تمام طلبا ان کے متعلق سنتے رہا کرتے لیکن اس کے برعکس ان جماعتوں کے طلبا میں اختر صاحب کو قریب سے دیکھنے کا شوق ہمیشہ رہا۔ اور وہ ہر جماعت میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے گئے۔

میں پانچویں یا چھٹی جماعت میں تھا کہ ایک دن کسی ہم جماعت نے پوری کلاس کو اطلاع دی — "اختر صاحب بہت بڑے شاعر ہیں..." یقین جانیے ہم یہ سمجھے کہ اختر صاحب انگریزی میں شاعری کرتے ہیں اور مدت تک ہم ایک دوسرے سے کہتے رہے — "اختر صاحب انگریزی میں شاعری کرتے ہیں اور ان کی نظمیں لندن کے رسالوں میں چھپتی ہیں —"

اس کی دو وجوہ تھیں۔ پہلی تو یہ کہ اختر صاحب ہمیشہ سوٹڈ بوٹڈ رہتے۔ جوتے کی چمکتی پالش سے لے کر فرانسیسی طرز کے ترشے ہوئے بالوں تک ہر چیز نک سک سے درست! کیا مجال کہ جوتے پر گرد جم جائے یا بالوں کی ایک آدھ لٹ پریشان ہو جائے — اور پھر عام طور پر مشہور تھا کہ اختر صاحب روزانہ سوٹ تبدیل کر کے آتے ہیں۔ اگر پورا سوٹ نہیں تو کوٹ پتلون میں سے ایک چیز تو ضرور — اور اگر اتفاق سے دونوں میں سے کوئی چیز بھی تبدیل نہیں کی گئی تو ٹائی تو یقینی طور پر وہ نہیں ہوگی جو وہ کل باندھ کر اسکول آئے تھے — پھر اس کی مناسبت سے سگریٹ کی بجائے پائپ منہ میں دبائے رہتے — پھر ہم لوگ یہ بھی جانتے تھے کہ اختر صاحب ولایت ہو آئے ہیں — ان وجوہ کی بنا پر ہم لوگ اختر صاحب کو مکمل "انگریز" تصور کرتے تھے — یہ دوسری بات ہے کہ اختر صاحب کو رنگ کی بنا پر بھی انگریزوں سے دور کا بھی واسطہ نہیں، اور ہم لوگوں کا مکمل یقین تھا کہ اختر صاحب گھر کے اندر بیٹھتے کھاتے پیتے — حتیٰ کہ لیٹتے اور سوتے بھی مغربی انداز میں ہوں گے — بلکہ بیوی اور بچوں سے بھی انگریزوں کی طرح ملتے ہوں گے۔ انہی باتوں کے پیش نظر اختر صاحب کے چھوٹے بھائی ارشد — جب میری اور دوسرے ساتھیوں کی ملاقات آٹھویں جماعت میں ہوئی تو ہم لوگ اس سے اکثر اختر صاحب کی گھریلو زندگی کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے — اور وہ اکثر چڑ کر کہتا

"آخر تم لوگ اختر صاحب کو سمجھتے کیا ہو —؟"

جب میں نویں جماعت میں پہنچا تو اختر صاحب کو قدرے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ جب کہ اختر صاحب انگریزی کے استاد کی حیثیت سے کلاس میں تشریف لائے۔

اختر صاحب کا معمول تھا کہ وہ ایک دھیمی سی مسکراہٹ لیے کلاس میں داخل ہوتے — ایک ایسی مسکراہٹ جس میں سنجیدگی کا عنصر کچھ زیادہ ہی ہوتا۔ ہم لوگ تعظیماً کھڑے ہو جاتے — اختر صاحب گردن کے ایک ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کرسی پر بیٹھ جاتے — اختر صاحب کوٹ کی اوپری جیب سے رومال نکالتے — چشمہ اتار کر چہرے کو اچھی طرح صاف کرتے اور پھر چشمہ کو صاف کر کے لگا لیتے — رومال کی خوشنمائی تہ کر کے اسے پھر کوٹ کے اوپر کی جیب میں لگا لیتے — کبھی کبھی ٹائی کی ناٹ

[illegible] — اس کے بعد کتاب [illegible] جاتے [illegible]

[illegible] بیٹھتے ہیں۔ مگر آپ [illegible] میز پر ہاتھوں کا ایک [illegible]
[illegible] — سب پہلے سے [illegible] شاعری [illegible] حقیقت ہے کہ اختر [illegible]
[illegible] ۱۹۵۱، ۱۹۵۲ [illegible] اسی کا تماشہ کرتے [illegible] — اختر صاحب [illegible]
[illegible] — [illegible] اختر صاحب [illegible]
[illegible] — [illegible]
[illegible] اختر صاحب کو بہت شدید [illegible] — [illegible]
[illegible] کتاب میز پر [illegible] — [illegible]
جب اختر صاحب ہماری کلاس کو پڑھا رہے تھے تو [illegible] — [illegible] اختر صاحب [illegible]
اختر صاحب ایسا ہی پڑھاتے رہے — لیکن [illegible]
پڑھانا شروع کر دیا — ہم لوگ متحیر کہ یہ ماجرا کیا ہے اور اختر صاحب [illegible]
[illegible] — تھوڑی دیر بعد جب انسپکٹر صاحبان چلے گئے۔ [illegible]
میں گئے اور کافی دیر تک کھانستے رہے — جب کھانسی تھمی تو بڑے زور سے ہنستے ہوئے کلاس میں داخل ہوئے۔ سب نے خیریت معلوم کی
تو کہنے لگے — "جس چیز سے ڈرتا ہوں وہی سامنے آجاتی ہے — [illegible]
[illegible] اندر قدم رکھا مجھے کھانسی آنے لگی — اب میرے سامنے [illegible]

اسکول نے اختر صاحب کی زندگی پر کافی گہرے نقوش چھوڑے ہیں — اس کے دو پہلو ہیں [illegible] اسکول میں رہتے ہوئے اختر صاحب
کو فاضل وقت بھی کافی ملا — چونکہ ایک اسکول ٹیچر کی مصروفیات بہ نسبت دوسرے شعبہ جات کے ملازمین کے کم ہوتی ہیں۔ سال میں چھٹیاں
بھی کافی ملتی ہیں اور روزانہ کے اوقات میں بھی کافی فرق ہوتا ہے — [illegible] ہمارے معاشرے میں اسکول ٹیچر کی جو وقعت ہوتی ہے
وہ کسی سے پوشیدہ نہیں — دراصل یہ سارا نظام تعلیم نہ اساتذہ کو اچھی تنخواہیں دیتا ہے اور نہ ہماری سوسائٹی ایک اسکول ٹیچر کو ان کی جائز عزت
دیتی ہے۔ گو ان حالات میں اول تو [illegible] شعبہ کو ایسے دماغ ملتے نہیں — اور جو [illegible] مجبور ہو کر آجاتے ہیں مگر ان کی ساری صلاحیتیں کچل
کر رہ جاتی ہیں — لہٰذا اختر صاحب کی حساس طبیعت پر ایک اسکول ماسٹری کی حیثیت کا شدید احساس ہوا۔ ایک مرتبہ اختر صاحب
اپنے کسی عزیز کے یہاں بریلی گئے۔ ایک شام ان کے میزبان نے کسی کلب میں وہاں کے معزز شہریوں سے تعارف کرایا۔ ان لوگوں نے اختر صاحب
کا بہ حیثیت شاعر اور ادیب بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا لیکن جوں ہی ان لوگوں کو معلوم ہوا کہ یہ ایک اسکول ماسٹر ہیں تو ان کے سارے اشتیاق
پر جیسے اوس پڑ گئی —

ایک خط میں اسکول کی زندگی کے متعلق لکھتے ہیں: —

"یہ ۱۱ سال علیگڑھ میں جس ذلت، مصیبت اور پستی کی حالت میں گزارے ہیں ان کی یاد عمر بھر دل میں ناسور ڈالتی رہے گی —"

اس قسم کی باتوں سے اختر صاحب گوشہ نشین ہو گئے۔ اسکول ماسٹری سے وہ کبھی مطمئن نہ ہوئے۔ لیکن اس دنیا سے نکلنے کے لئے انہوں نے
کبھی جدوجہد بھی نہ کی۔ حالانکہ اسکول چھوڑنے کی خواہش ہمیشہ رہی —

... بنیادی وجہ کے علاوہ اختر صاحب کے گوشہ نشین ہو جانے میں چند چیزیں اور بھی کار فرما ہیں ۔۔۔ پہلی وجہ تو یہ کہ اختر صاحب طبعاً منکسر
تھے ۔ لہٰذا جب انہیں اسکول میں ملازمت مل گئی تو اس سے قطع نظر کہ وہ اس سے مطمئن تھے یا نہیں ۔۔۔ انہیں پیٹ بھر روٹی کی جانب سے فراغت ملی ۔
لہٰذا انہوں نے مطالعہ اور تصنیف کے لئے اسکول کے فاضل وقت سے بھرپور فائدہ اٹھایا ۔ ان کی تقریباً تمام ہی تصنیفات اسی دور کی
اختر صاحب کی زندگی میں ناکامی سے بھی ادب کو فائدہ پہنچا ۔ اگر بالفرض اختر صاحب سو سروں میں کامیاب ہو جاتے تو یقینی بات ہے کہ
اختر صاحب کی حیثیت جو اس وقت اردو ادب میں ہے وہ نہ ہوتی ۔ بلکہ ممکن ہے انہوں نے اردو ادب کو دیا ہے وہ نہ دے سکتے ۔

دوسری بات یہ کہ اختر صاحب کی مالی حالت اس قدر اچھی نہ تھی کہ وہ دنیا کے ہنگاموں میں شریک ہو سکتے لہٰذا انہوں نے اپنی قلیل آمدنی کو اپنی گھریلو
زندگی پر ہی خرچ کرنا بہتر سمجھا ۔۔ چونکہ اختر صاحب نے اپنی زندگی کے لئے جو خاکہ مرتب کیا تھا اس کے حصول میں انہیں خارجی طور پر ناکامی ہوئی تھی
لہٰذا اس کی تکمیل اپنی خانگی زندگی میں کرنا تھی ۔۔۔ اور انہوں نے رفتہ رفتہ اپنی ادبی تخلیقات کے ساتھ ساتھ ایک ... میں ... کر کے اپنے گھر
کو (FURNISH) کیا ۔ ایک خط میں اپنے گھر کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"... میری شاعری اور دوسرے ادبی کام کو مشہور ہونا چاہئے تھا ۔ لیکن شہرت نصیب ہو رہی ہے میرے گھر کو ۔ یہ شہرت دور دراز کے
مشہور شہروں تک پہنچ گئی ہے ۔ ماشاء اللہ !"

ادبی تخلیقات کے علاوہ یہی گھر ہے اختر صاحب کی زندگی کا ماحصل ۔ یہاں اپنی تعمیر کردہ اپنی جنت میں اور وہ اپنی اس " جنت " کے تخلیق
خالق کی حیثیت سے ان کمروں میں پڑے رہتے ہیں اور چپ بیٹھے رہتے ہیں ۔

اختر صاحب کی گوشہ نشینی سے جہاں انہیں ادبی کام کرنے کے لئے فراغت ملی اور اپنی حسرتوں اور تمناؤں کی ذاتی طور پر تکمیل کے مواقع ملے وہاں
ایک سب سے بڑا یہ بھی نقصان ہوا کہ وہ اس گوشہ نشینی سے مکمل طور پر آرام طلب اور سست ہو گئے ۔۔۔ ان کی تخلیقی صلاحیتیں ... نیند سو گئیں ۔۔
اختر صاحب کے لئے یہ کہنا کہ وہ فطری طور پر شروع ہی سے آرام طلب اور سست تھے میرے خیال میں غلط ہے ۔۔ جو شخص اپنی تعلیم کے
دور میں ہمیشہ نمایاں طالب علم رہا ہو ۔۔۔ باپ کی موت کے بعد ناموافق ماحول کی پروا کئے بغیر اپنے مقصد کے حصول کے لئے لندن کا سفر کرے اسے
بنیادی طور پر آرام طلب اور سست نہیں کہا جا سکتا ۔ بلکہ یہ وہ بعد کے واقعات اور حالات تھے جن کی وجہ سے اختر صاحب گوشہ نشین ہوئے
اور گوشہ نشینی نے انہیں آرام طلب اور سست بنا دیا ۔ ان کی جدوجہد کرنے کی قوت کو زنگ چاٹ گئی ۔ ان کی حساس طبیعت مسلسل ناکامیوں
اور محرومیوں کی وجہ سے سہم گئی اور مزید مصائب کا مقابلہ کرنے سے ہمیشہ کتراتی رہی ۔۔۔ ان ہی وجوہ کی بنا پر وہ اپنی زندگی میں کسی انقلاب برپا
کرنے کے بجائے انقلاب کے ہمیشہ منتظر رہے ۔۔

اختر صاحب جب تک اسکول میں رہے انہیں تعلیم کے علاوہ علمی دنیا اور آل انڈیا ریڈیو میں جانے کے مواقع ہوتے ۔ لیکن وہ اسکول نہ
چھوڑ سکے ۔۔۔ ایک مرتبہ شاید ۱۹۴۲ء میں آل انڈیا ریڈیو سے کچھ جگہیں مشتہر ہوئیں ۔ اختر صاحب نے بھی درخواست دینا طے کیا ۔ احباب سے
مشورہ کرتے رہے اور سوچتے رہے ۔۔ حتیٰ کہ آخری تاریخ آ گئی ۔ لہٰذا رات کو فیصلہ کیا گیا کہ دہلی جا کر ہی درخواست دی جائے ۔۔
چونکہ ڈاک سے درخواست کا پہنچنا ناممکن تھا ۔ لہٰذا وہ صبح منہ اندھیرے پہلی گاڑی سے روانہ ہو گئے ۔۔۔ اردو بازار میں چند احباب سے
پھر مشورہ کیا ۔ ان لوگوں نے کہا ۔۔ " ارے کس مصیبت میں پڑ رہے ہو ۔۔۔ یہ نوکری تمہارے بس کی نہیں ..." کچھ ریڈیو کی ملازمت
کے واقعات بھی سنائے ۔۔۔ اور اختر صاحب بغیر درخواست دیئے بغیر ملاقات ہوئے واپس آ گئے ۔

اسکول میں رہتے ہوئے وہ ... سے تنگ آ چکے تھے ۔ لیکن ... ان کے لئے پیدا ہو چکا تھا ... شاید ...
نے ایم ... کرنے کا ارادہ کیا ۔۔ ایک دو بار ... شاید ... ...

[illegible] حبیب اللہ صاحب پرنسپل ٹریننگ کالج ڈھاکہ [illegible] اختر صاحب کو ہیڈ ماسٹر صاحب کے ہاں لے گئے [illegible]
[illegible] ایک نظم میں اس کا ذکر ہے۔

۱۹۴۰ء میں [illegible] آپ کو معلوم ہے کہ [illegible] حبیب صاحب کے متعلق [illegible]
[illegible] اسکول [illegible]

[illegible] وقت [illegible] ہوگی [illegible] سے بہت [illegible]
[illegible] آپ کو [illegible] کی ملازمت کی ضرورت [illegible] کامیاب ہو جائیں گے [illegible] اختر صاحب [illegible]
[illegible] بلکہ [illegible] چھوڑ دیتے [illegible] لیکن [illegible] ان سے [illegible]
[illegible] کامیاب ہو [illegible] کامیاب [illegible] یونیورسٹی کے [illegible]

جب اختر صاحب اسکول چھوڑ کر یونیورسٹی پہنچے تو معلوم ہوا [illegible] چھوڑ [illegible] ہیں [illegible]
[illegible] پروگرام مرتب کیا [illegible] کے لیے [illegible]
[illegible] کے لیے [illegible] لیکن [illegible]
[illegible] ٹریننگ [illegible] گئے ہیں۔

شعبۂ اردو سے ٹریننگ کالج [illegible] ہے۔ [illegible] جب شعبہ اردو میں پہنچے تو انہیں [illegible]
[illegible] کی ملازمت مل گئی۔ [illegible] بدقسمتی [illegible] رہتی ہے [illegible] جس سال [illegible]
[illegible] کی وجہ سے [illegible] آ گئی [illegible] اختر صاحب [illegible] واپس [illegible]
[illegible] گئے۔

"میرے معاملے میں ابھی تک کچھ نہیں ہوا۔ جو صورت حال تمہارے سامنے تھی وہی اب تک ہے۔ [illegible]
[illegible] واپس نہیں جاؤں گا۔ اگر شعبۂ اردو میں مستقل تقرر نہ ہوا [illegible] آپ کو [illegible]
[illegible] سے [illegible]"

اس خط میں جو علی گڑھ سے فرار کا ثبوت ملتا ہے۔ وہ ڈاکٹر عندلیب شادانی کی ڈھاکہ یونیورسٹی [illegible] دعوت ہے۔ [illegible] کے متعلق وہ
[illegible] ہے اور شائستہ [illegible] لیکن جب انہیں علی گڑھ سے تعلق [illegible] تو انہوں نے خود ڈاکٹر شادانی کی طرف رجوع کیا ان واقعات کی تفصیل
ان کی زبانی سنیے:

"گرمیوں کی تعطیل میں میں نے ارادہ کر لیا کہ ڈھاکہ چلا جاؤں گا اور شادانی صاحب سے خط و کتابت بھی کی۔ لیکن ایک ماہ سے زیادہ اس ارادہ
پر قائم نہ رہ سکا۔ میرے دماغ پر اس کا بہت برا اثر ہوا۔ دن کی نیند اڑ گئی اور طبیعت ہر وقت بے حد پریشان اور وحشت زدہ رہنے لگی۔
تعطیلات میں شادانی صاحب رام پور آئے۔ میں نے سوچا کہ جب ڈھاکہ جا رہا ہوں تو ان سے ملنا اخلاقی فرض ہے۔ چنانچہ رام پور گیا۔ ان سے گفتگو
کے [illegible] میں نے محسوس کیا کہ میرا وہاں جانا حماقت ہوگی۔ تفصیل ممکن نہیں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جب [illegible] سے پتہ چلا کہ وہاں زندگی خاصی
مہنگی ہے اور مکان نایاب ہیں۔ مجھے بڑی کوشش کے بعد ایک کمرہ [illegible] تو میں نے دل میں کہا کہ کیا میرے دماغ
[illegible] کہ میں دہلی کی جائداد چھوڑ دوں۔ علی گڑھ کا آٹھ دس ہزار کا سامان خاک میں ملا دوں۔ [illegible] زندگی پر لات ماروں اور وہاں جا کر
[illegible] رہنا شروع کر دوں۔ اس وقت میں نے طے کر لیا کہ ہر حال میں یہیں رہوں گا۔ چاہے اسکول ہی جانا پڑے۔ چنانچہ [illegible]

موصوف ذرا جلد ہی سے طبیعت بیماری کی وجہ سے خراب ہو گئی اور میں نہایت خوش طرح ملی گڑھ میں آیا۔ یہاں آ کر معلوم ہوا کہ پرنسپل ٹریننگ کالج جو صاحب میرے معاملہ میں دلچسپی لے رہے تھے اور مجھے اپنے یہاں لے جانا چاہتے تھے لیکن میں نے اس بات کو زیادہ اہمیت نہ دی کیونکہ خورشید کراچی گئے ہوئے تھے اور خیال تھا کہ وہیں رہ جائیں گے اور شعبہ اردو میں ایک جگہ خالی ہو گی پھر کب تک میرا تقرر ملتوی کیا جاتا رہے گا۔ گذشتہ سالوں میں بار بار ایسا ہوا کہ شعبہ اردو میں جگہ خالی ہوئی اور تخفیف میں لے آئی گئی۔ چونکہ خورشید صاحب کے نہ آنے میں میرا فائدہ تھا لیکن وہ واپس آ گئے ——— جب وہ واپس آ گئے تو میں دیوانہ وار حبیب صاحب کی طرف بھاگا۔ . . . بہرحال یکم نومبر سے میرا تقرر مستقل کی حیثیت سے نہیں PROBATION کے لیے کیا گیا ——— دو ہی گذرے ہیں۔ اس پر پتہ چلنے کے بعد میں نے پہلی دفعہ محسوس کیا کہ میں بھی ملازم ہو گیا۔

اب ٹریننگ کالج ہی میں گھر سے ملا ہوا کالج ہے بڑے آرام کی زندگی ہے ——— میں نے ایم ایڈ میں داخلہ لے لیا ہے۔ چند دن میں ختم کر دوں گا۔ اس کے بعد پی ایچ ڈی میں داخلہ لوں گا۔ اور اب اردو کے بجائے ایجوکیشن میں ہی پی ایچ ڈی کروں گا۔

(مکتوب بنام اظہر حسین صاحب)

لیکن شاید آج تک نہ وہ ایم ایڈ کر پائے ہیں اور نہ پی ایچ ڈی۔

اختر صاحب کا روزانہ کا معمول ہے کہ وہ کالج سے آتے ہی غسل خانہ میں گھس جاتے ہیں ——— اس سے پیشتر کہ پسینہ خشک ہو وہ اپنے جسم پر پانی ڈال لیتے ہیں ——— غسل کرنے کے بعد کھانا کھاتے ہیں اور پھر اپنے کمرے میں کرسی پہ چادر تان کر سو جاتے ہیں ——— دن کی نیند اختر صاحب کو رات کی نیند سے زیادہ عزیز ہے۔ رات کو دو ڈھائی بجے سونا تو معمول کی بات ہے مگر اختر صاحب کو رات جاگتے پڑے تو وہ گھر میں رات گزار دیتے ہیں۔ لیکن دن کی نیند ختم کرنے کے لئے دوپہر کا کھانا تو لازمی طور پر ختم کرنا ہوتا ہے ——— سردیوں میں جب اسکول کا وقت تین ساڑھے تین بجے تک ہو جاتا ہے تو اختر صاحب شام چار بجے اسکول سے واپس آ کر سوتے ——— دوپہر کو وہ تین گھنٹے صرف کرتے ہیں۔ کمرے کی صفائی۔ ہر چیز کو صاف کرنے کے بعد اس کی مخصوص جگہ پر رکھنا ان کا فرض ہے ——— کمروں کی صفائی اور چیزوں کی ترتیب کے وقت ہیں۔ اختر صاحب کو ملازم پر بھروسہ ہے اور نہ نوکری پر ——— لہٰذا اس کام کو وہ بڑے انہماک، جوش اور شوق کے ساتھ خود کرتے ہیں۔ صفائی سے فارغ ہونے کے بعد پھر غسل کرتے ہیں اور بالوں وغیرہ کو سنوارنے کے بعد نئے کپڑے پہن کر پائپ سے شغل شروع ہو جاتا ہے ——— چائے آ جاتی ہے اور پھر احباب سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

اختر صاحب سے ملاقات کا یہ مخصوص وقت ہے۔ لہٰذا ہر شخص یہی وقت لے کر آتا ہے مگر کوئی شخص پیشتر آ جائے تو اس سے اختر صاحب کو تکلیف ہوتی ہے اور ——— شخص کو بھی ——— چونکہ ان کے معمولات میں خلل پڑ جاتا ہے وہ کسی سے ملنے کے لئے تیار نہیں ہوتے اور ملنا پڑتا ہے ——— ایسا کرنا پڑتا ہے کہ اختر صاحب سو رہے ہیں یا پھر برآمدے میں بیٹھ کر کافی سے زائد دیر تک انتظار کرنا ہوتا ہے۔

احباب سے ملاقات کا سلسلہ رات کے دس گیارہ بجے تک رہتا ہے ——— اس دوران میں ادبی محفلیں بھی ہوتی ہیں، مشاعرے بھی ہوتے ہیں، خوش گپیاں بھی ہوتی ہیں۔ اختر صاحب اپنی مرحوم حسرتوں اور شکستہ امیدوں کا ماتم بھی کرتے ہیں۔ قسمت کو گالیاں بھی دے لیتے ہیں اور کمرے کی چھوٹی چیزوں کو دیکھ کر ایک فاتح کی طرح مسکراتے بھی ہیں۔

اختر صاحب کی ملاقاتیوں میں اسکول کے طلبہ بھی ہوتے ہیں۔ بی۔ اے اور ایم۔ اے کے بھی ——— یونیورسٹی کے نوجوان لیکچرار بھی ہیں اور پیر کہنہ سال بھی ——— شاعر اور ادیب بھی ہوتے ہیں اور غفور صاحب (لیکچرار ٹریننگ کالج) جیسے فلسفی بھی جو اکثر بیٹھے بیٹھے فلسفے کی گتھیاں سلجھانے میں محو ہو جاتے ہیں اور اختر صاحب منہ میں پائپ دبائے وہ ان کی سنتے رہتے ہیں یا دیگر احباب سے باتیں کرتے ہیں۔

اختر صاحب اپنے احباب کے حلقے میں بہت زیادہ مقبول ہیں۔ وہ شروع کی چند ملاقاتوں میں بہت کم کھلتے ہیں اور ملنے والے کو یہ محسوس کراتے

[illegible] ہے [illegible] ملتے ہیں [illegible] سے ملاقات کرتے ہیں [illegible] بے تکلف [illegible] بہت کم ہو گئے ہیں لہٰذا [illegible] اختر صاحب کے ساتھ [illegible] [illegible] ہیں [illegible] تشریف لے جاتے ہیں [illegible] ان کی [illegible] ہو جاتا ہے۔

[illegible] کے بعد اختر صاحب [illegible] ہیں۔ [illegible] اپنی سستی [illegible] [illegible] ہیں۔

ابھی ہونا ہے کہ دوست احباب نہیں [illegible] [illegible] پہنچ جاتے ہیں [illegible] [illegible] پڑھتے رہے [illegible] کی تصدیق کی۔

[illegible] بہت زیادہ نفاست پسند ہیں۔ ان کی [illegible] زندگی میں [illegible] [illegible] کے بعد گھر سے بہت کم نکلتے ہیں [illegible] کے گھر جانے کا بہت کم موقع ملتا ہے۔ [illegible] ایک دو بار ہی جاتے ہیں [illegible] لیکن جب اختر صاحب گھر سے نکلتے ہیں [illegible] میں شرکت کے لئے یا کسی دوست سے ملنے کے لئے [illegible] چشمے کے شیشوں کو صاف کرنا ان کا سب سے پہلا کام ہوتا ہے [illegible] کو رومال [illegible] کر چمکاتے ہیں۔ چہرہ [illegible] [illegible] ساری شخصیت پر چڑھا ہوا معلوم ہوتا ہے [illegible] اگر جیب میں [illegible] تو وہ ایک ہی [illegible] سے دونوں [illegible] ہیں۔ ان چیزوں سے فارغ ہونے کے بعد [illegible] تب کہیں جا کر بات چیت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

[illegible] اختر صاحب بری طرح بھاگتے ہیں [illegible] بیٹھے ہوئے [illegible] اختر صاحب [illegible] لیتے ہیں۔ اپنے شانے اور کوٹ کو اس طرح [illegible] شروع کر دیتے ہیں جیسے ماتم کر رہے ہوں [illegible] چاروں طرف سے بہتے پسینہ میں شرابور [illegible] ایک ایک روزن کو اچھی طرح بند کر دیتے ہیں [illegible] آ جائیں۔

اختر صاحب کی زندگی میں دو چیزیں نہایت واضح ہیں۔ — مایوسی اور خود فری — مایوسی کی ابتدا ان کی عملی زندگی کے ساتھ ہوئی۔ میرے [illegible] ان کی زندگی میں کچھ ایسے غیر معمولی قسم کے واقعات تو ہوئے نہیں جن کا مداوا ہی نہ تھا — البتہ اختر صاحب کی نازک [illegible] طبیعت نے چھوٹے سے چھوٹے واقعہ کو بھی ایک پہاڑ سمجھا اور ان میں اتنی جرأت نہ ہوئی کہ اس چیز کی [illegible] کرتے۔ کوشش کرتا تو در گذار [illegible]

نے ماں کو پہاڑ پر کر اپنا سر پیٹ لیا۔ قسمت کے گلے لیں ہیں اور دنیا سے مایوس ہو کر گوشہ نشین ہو گئے۔ انہیں یہی گلہ رہا کہ وہ ایک قابل انسان ہیں۔ مگر ان کی طرف توجہ نہیں دی گئی —— لیکن انہیں یہ احساس کبھی نہیں ہوا کہ ہماری سوسائٹی اس شخص کو منہ ہی نہیں لگاتی جو … کے … میں تاجداروں کے درباروں کا طواف نہ کرے۔ خواہ وہ کتنا ہی قابل، عالم فاضل کیوں نہ ہو —— یہی حال ادبی دنیا کا ہے —— انہیں شکایت ادب والوں نے انہیں وہ جگہ نہیں دی جس کے وہ مستحق تھے اور انہیں اکثر و بیشتر نظر انداز کر دیا گیا۔ تو یہاں بھی مرتبہ کا معاملہ ہے —— اختر صاحب … سے جلتے رہے —— رسائل میں … لیکن مشاعروں میں کبھی نہیں جاتے خواہ مشاعروں کے گلے کے قریب ہی ہوتا ہے۔ وہ گروہ بندی کے بھی قائل نہ تھے۔ ایک گروہ یا حلقہ بنا لیتے تو شاید انہیں یہ شکایت نہ ہوتی۔

اختر صاحب کی زندگی میں مایوسی اس قدر سمائی ہوئی تھی کہ وہ ہر کام کی ابتدا ہی سے مایوس ہو کر کرنے لگتے ہیں۔ "چونکہ یہ کام میں کر رہا ہوں یہ کبھی نہیں ہو سکتا"۔ مایوسی اور حسرت کے گلے اختر صاحب کی زندگی میں قدم قدم پہ ملتا ہے

" دوسرے دفعہ میری ہڈی بڑی شدت کے ساتھ چٹخنے لگی اور میں بھی اس ہی جا بیٹھا تھا۔ میں نے … کا ارادہ کیا تھا —— "

خط بنام نظیر حسین صاحب قادر؛

اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں ——

" غالب نے اپنے خطوط میں کہیں اپنی اس خصوصیت کا ذکر کیا ہے کہ میں نے جس سے عشق کیا اس کو مار رکھا اور جب فرمانروا کی شان میں قصیدہ لکھا اس کی سلطنت کا بیڑا غرق ہوا۔ تو بعض غالب کی کوئی بھی خصوصیت تو نہیں … مگر یہ ایک وصف … میں تھا میرے … بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ اس درجہ کا منحوس ہوں کہ جہاں جاتا ہوں اس نحوست کا اثر ساتھ جاتا ہوں —— آپ کو یاد ہو گا کہ آج سے … سال پہلے ۱۹۴۴ء میں جب میں کسی اسکول میں ٹیچر ہو کر آیا تھا تو یہ اسکول گیا پٹا ہوتا اور … کی وہ قرار داد بھی تھی کہ جب کسی طرح مطمئن نہیں ہوتا تھا … INCREMENT دے دیئے جاتے تھے۔ میرے آتے ہی اس کی مالی حالت خراب ہو گئی اور بیرونی استادوں کی ساری … بند رہیں —— اور اس کے بعد جب تک رہیں … وہ اسکول پنپ نہیں سکا اور اس کی مالی حالت گرتی ہی چلی گئی پھر جب میں نے خدا خدا کر کے ایم اے کیا اور شعبہ اردو میں لیکچرار ہو گیا تو میرے تقرر کے بعد ہی … اگست ۱۹۴۷ء کو … آیا، چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ہندوستان تقسیم ہو گیا اور اردو کو اس ملک سے دیس نکالا مل گیا۔ اور شعبۂ اردو دم توڑنے لگا —— گویا میں اردو میں ایم اے کرتا نہ ہندوستان میں اردو کا ستارہ گہناتا۔ اور صاحب! تکلف برطرف میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ دوسری بڑی لڑائی بھی صرف اس لئے لڑی گئی کہ ۱۹۳۹ء تک میری تنخواہ کسی قدر معقول ہو گئی تھی اور سخت ضرورت اس بات کی تھی کہ بنگالی زیادہ سے زیادہ … تاکہ میں بدستور ہمیشہ کا کنگال بنا رہوں —— پھر شاید آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ مجھے خاک دھول سے کس قدر وحشت ہوتی ہے —— آسمان پہ آندھی کا پہلا غبار نظر آتے ہی میرا چہرہ پیلا پڑ جاتا ہے اور غالباً آپ کو یہ بھی معلوم ہو گا کہ ریگستان تیزی کے ساتھ … بڑھتا جا رہا ہے —— آپ کے سر کی قسم اگر میں پہاڑ کی چوٹی پہ سکونت اختیار کر لوں تو وہاں بھی خاک اڑنے لگے —— "

اس سلسلے میں اختر صاحب نے مجھے اس طرح لکھا تھا۔

. . . . [illegible] آیا تھا [illegible] "[illegible]
[illegible] کے متعلق [illegible] ہے ——— [illegible]
[illegible] بار بار اپنے [illegible] سوچتے [illegible]
[illegible] ——— [illegible]
[illegible]

[illegible] مایوسی نے اختر صاحب کی زندگی میں محرومی کا شدید احساس پیدا کر دیا ہے [illegible]
[illegible] سوچتے رہتے ہیں [illegible] اتفاق سے ان کے [illegible] ہے [illegible] ہیں ۔

[illegible] جب اختر صاحب [illegible]
[illegible] ملازم ہونے [illegible] خالی [illegible]
[illegible] کی بات نہیں [illegible]

[illegible] صاحب [illegible]
[illegible]
[illegible] گیا خرید [illegible] ایک مرتبہ [illegible]
[illegible] بیلٹ [illegible]
[illegible] بیلٹ [illegible] حیثیت سے [illegible] ایک دوست کو [illegible]

[illegible] صاحب [illegible] کالج میں بھی PART TIME LECTURER مقرر ہو گئے [illegible]
[illegible] ایک پرانی سائیکل [illegible] ہے [illegible]
[illegible] سائیکل خرید لی [illegible] سائیکل چلانے سے بھی [illegible]
[illegible] رہے ۔

[illegible] مرتبہ بیگم اور میں رائے صاحب امراؤ سنگھ کی دوکان پر کھڑے تھے ۔ [illegible] کا شیشہ پسند آگیا ۔
[illegible] صاحب نے قیمت دریافت کی ۔ جواب ملا ۔ "صاحب یہ تو [illegible] دوکان کی شو کے لئے لائے ہیں فروخت کرنے کے لئے نہیں ——— آج تک
[illegible] سے طلب نہیں کیا ۔" لیکن اختر صاحب بضد اور ہر قیمت پر خریدنے کے لئے تیار ——— لہٰذا خرید لیا ——— اسی طرح اختر صاحب
اپنے [illegible] کی آرائش میں اضافے کئے ہیں ۔

[illegible] صاحب جب بھی کوئی چیز خریدتے ہیں تو سب سے اعلیٰ کوالٹی کی پسند کرتے ہیں ۔ عمدہ اور حسین چیز خریدنا ایک طرح سے ان کی
HOBBY ہے ۔ ان کے سامنے ایک ہی قسم کی اگر دو چیزیں رکھ دی جائیں اور ایک کی قیمت [illegible] ایک کی قیمت زیادہ بتائی جائے تو زیادہ
قیمت کی چیز لینا پسند کریں گے ——— وہ جب کبھی کسی دوکان پر جاتے ہیں تو خاموشی کے ساتھ دوکان کی اشیاء کا جائزہ لیتے رہتے ہیں ۔ وہ [illegible]
[illegible] دوکان دار سے چیزیں کم طلب کرتے ہیں بلکہ مطلوبہ اشیاء کی طرف اشارہ کرتے جاتے ہیں اور دوکان دار پیک کرتا جاتا ہے ——— قیمت
[illegible] ان کے بس کی بات نہیں ۔

اختر صاحب تنگ دست رہتے ہیں لیکن دل ہمیشہ غنی رکھتے ہیں ۔ قرض مانگنے والوں کو وہ شاذ و نادر ہی مایوس کرتے ہیں ۔ پھر اس قرض کی

واپسی کا انتظار ہی کرتے رہتے ہیں ـــــ ایک مرتبہ اسکول کا چپراسی ایک خط بلکہ قتاب تار لے کر آیا کہ آپ کا اسکول واپس لیا جاتا ہے ...
مستعفی ہو جاتے ... ان دنوں اختر صاحب شہید صدر میں آچکے تھے ملازمی معاملہ ... تھا ... کی آخری تاریخیں تھیں جیسے ...
ہی روپے تھے وہ چپراسی کو دے دیتے ـــــ کیونکہ انہیں یہ گوارا نہ تھا کہ چپراسی ایک عرصہ کے بعد گھر واپس آئے اور خالی ہاتھ واپس جائے

اختر صاحب اشتراکیت کے حامی ہیں ـــ انہیں دعویٰ ہے کہ انہوں نے اشتراکیت کو پڑھا ہے، سمجھا ہے اور اسے اپنی فضیلت ...
لیکن اختر صاحب کی اشتراکیت ان کی ذات تک ہی محدود ہے وہ کبھی کمیونسٹ پارٹی کے ممبر بنے اور نہ ان کے کسی جلسے میں شریک ہوئے ...
میں کمیونسٹوں کی گرفتاریاں ... ہی سے بہت سے چند طلباء اور ... گرفتار ہوئے۔ اختر صاحب کو پریشانی لاحق ہوگئی۔ چونکہ ...
... نہیں بلکہ وہ ادیب اور شاعر بھی گرفتار کئے جا رہے تھے جنہیں اشتراکیت سے ہمدردی تھی۔ ایک دن باتوں باتوں میں کہنے لگے ـــ
"نظر بندی سے کوئی ڈر نہیں لیکن بیٹھے بٹھائے سارا اسکول درہم برہم ہو جائے گا ـــ"

مذہب سے اختر صاحب کو کسی قسم کی دلچسپی نہیں۔ وہ عقیدہ اور تقلید کی نماز بھی نہیں پڑھتے۔ لیکن قربانی ضرور کرتے ہیں
وہ لوگوں کی خاطر کرتے ہیں ... حساب کے لئے ... نقطۂ نگاہ سے ... ـــــ وہ دینی مسلمیں ...
کھانا بھی کھا لیتے ہیں ـــــ

محمد علی جناح کی شخصیت کو انہیں ایک دھچکا سا لگا۔ گرہ صاف کرتے کرتے کہتے ہیں وہ بڑی کرسی پر بیٹھ گئے ـــــ لیکن میں نے ...
ہندوستان کے بڑے لیڈر تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے بلکہ انہوں نے کہ وہ ایک "سفیر" تھے

ایک مرتبہ اطہر سیم صاحب قادری نے دعوت افطار کی ـــــ اختر صاحب کو بھی بلایا ـــ ایک صاحب افطار کا وقت ختم ہونے ...
سب نے دریافت کیا "آپ بھی روزے سے ہیں؟" انہوں نے جواب دیا ـــ "یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ میں بے روزہ دار ہوکر آپ لوگوں کے ...
ـ لہٰذا اب آپ لوگ افطار کیجئے میں ... باقی کے ... آپ کا شریک ہوں"

آپ اختر صاحب سے گھنٹوں بیٹھے باتیں کرتے رہیئے۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ رہے گی لیکن دبی دبی سی۔ باطن میں تو دبی ہوئی ...
محفل میں کسی نشست میں بیان نہیں کر سکتے جس سے سامعین کے پیٹوں میں بل پڑ جائیں ـــ لیکن برخلاف اس کے ...
واقعہ یا لطیفہ بیان کیا جائے تو وہ انتہائی لطف لیتے ہیں۔ خوب ہنستے ہیں۔ بار بار بیان کراتے ہیں اور لطف اندوز ہوتے ہیں ـــ

ایک مرتبہ اختر صاحب "... ... " کے سلسلے میں دہلی گئے ـــ میں بھی ہمراہ گیا۔ غازی آباد سے عطا محمد اشفاق جو کہ اب تحصیلدار ہیں ...
جب ... پر ... بھی ہم رکاب ہو گئے ـــ اس دن اختر صاحب بہت خوش تھے ـــ واپسی پر جامع مسجد سے ریلوے اسٹیشن تک ...
... جب ہم لوگ اسٹیشن پر پہنچے تو ریل پلیٹ فارم پر آ چکی تھی حالانکہ روانہ ہونے میں قریب دو گھنٹے باقی تھے ـــ عطا محمد ...
اور ... کا تکیہ بنا کر ... اپنے برتھ پر دراز ہو گئے ـــ اختر صاحب نے اسٹیشن کے باہر شربار ... کی دکانوں پر چاٹ کھانے کا ارادہ ظاہر کیا ـ
میں نے کہا "اس وقت رات کے گیارہ بجے ہیں اور سنا ہے کہ یہاں رات میں مسلمانوں کے لئے نکلنا ٹھیک نہیں ـــ بہتر یہی ہے کہ اسٹیشن پر رہیے
(یہ ۱۹۴۷ء کا واقعہ ہے جب کہ فسادات کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا) لیکن اختر صاحب نہیں مانے کہنے لگے ـــ "ہم لوگ سوٹ پہنے ہوئے ہیں
انگریزی میں بات کریں گے کوئی نہیں پہچانے گا ـــ" بہرحال ہم لوگ اسٹیشن کے باہر پہنچ گئے ـــ اختر صاحب نے خوب مزے لے لے کر چاٹ کھائی۔
ہم لوگوں نے اس دوران میں بہت کم بات کی لیکن جو بات کی وہ انگریزی میں کی۔ مجھے تو کسی حد تک ڈر بھی محسوس ہو رہا تھا لیکن اختر صاحب
بڑے اطمینان سے چاٹ کھاتے رہے ـــــ اختر صاحب نے جب دکان دار کو پیسے دیئے تو وہ کہنے لگا۔
"بابوجی آپ لوگوں نے بڑی ہمت کی ـــــ ویسے تو کوئی بات نہیں۔ لیکن سالے بدمعاشوں کو کون روک سکتا ہے ـــــ آپ لوگ اب

[illegible] ہو چکے

[illegible] مسئلہ میں خاص نظر [illegible] ہے [illegible] سکتے [illegible] صاحب [illegible]

[illegible] پانچ سال قبل سے ہو گیا ہے

[illegible] بات لکھ [illegible] زندگی [illegible]

[illegible] قدم [illegible]

[illegible] افسانوں کی [illegible] زندگی کے [illegible] صاحب [illegible] ہو گئے

[illegible] روشنی [illegible] بڑھاپا [illegible]

[illegible]

صاحب کی زندگی [illegible] ملاقات ہوئی [illegible]

[illegible] اختر صاحب [illegible]

[illegible]

اختر صاحب [illegible]

[illegible] اختر صاحب [illegible]

[illegible]

[illegible] اختر صاحب [illegible]

[illegible] صاحب [illegible] دیکھے

[illegible] سرگوشیاں سننے لگا ہے [illegible]

[illegible] لکھنے کے بعد میں محسوس کرتا ہوں کہ اختر صاحب کی زندگی اور شخصیت کے بہت سے پہلوؤں کی طرف اشارہ بھی نہیں کر سکا ۔۔۔ ان کی ادبی خدمات کا ذکر بالکل نہیں آیا ۔۔۔ [illegible] تو میرے موضوع سے [illegible] کیونکہ یہ ادبی تذکرہ کا موضوع ہے نہیں ۔۔ [illegible] یہ حقیقت ہے کہ اردو کی دنیائے ادب میں اختر صاحب کی حیثیت منفرد ترین ہے ۔۔ منفرد ترین [illegible] لفظ میں نے سوچ کر استعمال کیا ہے اس لئے کہ اختر صاحب اردو ادب میں شاعر، افسانہ نگار اور نقاد کی حیثیت سے مستقل مقام رکھتے ہیں ۔۔۔ ہم سب لکھنے والوں میں متعدد حضرات ایسے ہیں جو دو حیثیتوں سے اعلیٰ درجے کی شہرت رکھتے ہیں ۔۔۔

علاوہ ازیں اس مضمون میں میں اختر صاحب کی ان ذہنی اور نفسیاتی الجھنوں کا ذکر بالکل نہیں کر سکا جنہوں نے کم و بیش سات آٹھ سال سے انہیں معطل کر رکھا ہے اور جن کو بطور عذر کے اختر صاحب نے ایڈیٹروں کے خطوط کا برسوں سے مستقل جواب بنا رکھا ہے کہ یہ انسان کی زندگی کا نازک ترین پہلو ہوتا ہے اور نہایت گہرے اور تجزیاتی مطالعہ کے بغیر اس کے ذکر سے عہدہ برآ ہونا قطعی ناممکن ہے ۔ میں اختر صاحب سے قریبی واقف ہونے کے باوجود اس گہرے اور تفصیلی مطالعے کا دعویٰ نہیں کر سکتا اسی لئے میں نے اس چیز کا ذکر چھیڑنے سے عمداً اجتناب کیا ۔۔ ان دو چیزوں کے علاوہ ۔۔ میرا خیال ہے کہ میں اختر صاحب کی غیر معمولی ذہانت اور ان کے حساس بیدار اور خوبصورت ضمیر کو بھی پورے طور پر بے نقاب نہیں کر سکا۔ جس کا سبب تنگ دامانی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ آخر میں اتنا اور کہوں گا کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ پانچ سال پیشتر تک کی معلومات کی بنیاد پر لکھا ہے ۔۔ پچھلے چند سالوں میں اگر اختر صاحب کی شخصیت کی نئی تہیں نظروں کے سامنے آئی ہوں اور یقیناً آئی ہوں گی تو ان سے میں بے خبر ہوں ! . . .

شاد عارفی

طاہرہ اختر

ننّدن ماموں ـــــ اگر آپ ایسے ہیں نہ تو میں تو عرض کروں کہ یہ ماہرانہ تیرا مزاح شاعر" ر غزل ماہنامہ ادب لطیف لاہور نے انہیں ادبی حلقے احمد علی خان شاد عارفی کے نام سے جانتے ہیں۔ اور یہ سن کر سکتے ہیں کہ ان دو ناموں کے علاوہ موصوف کے دو نام اور بھی ہیں۔ ایک لطف علی خان جو دوسرے پاپا۔ پہلا نام حامد ہائی اسکول کے رجسٹر الف کے ماسٹر کی غلطی کا ممنون ہے جو اسکول کی سازش ختم تک ہوتا رہا اور پھر درخواست دے کر انہیں نام احمد علی خان میں تبدیل کرا دیا گیا۔ مگر اس زمانے کے ساتھی انہیں آج بھی اسی نام سے جانتے ہیں۔ دوسرا نام "پاپا" ننّدن ماموں کے بھتیجوں سے ممنون ہے جو محلہ بھر میں مقبول عام کی سند حاصل کر چکا ہے۔

وہ جو کہا گیا ہے کہ ہر نام اپنے مسمّی پر اثر پذیر ہوتا ہے اس لئے بالکل ٹھیک ہے کہ محلہ بھر کے بچوں اور جوانوں میں ننّدن ماموں پاپا کا کردار اس خوبصورتی سے ادا کرتے ہیں جیسے علی گڑھ کے ابّا علیم طلبا میں گھرے بیٹھے ہوں اور سب یا جوان یہ محسوس نہ کر رہے ہوں کہ ان کے درمیان کوئی ان سے بڑی عمر کا آدمی بیٹھا ہے۔ نصیحت کرنے کا انداز بھی ان کا اپنا انداز ہے جس میں طنز اس طرح شامل ہوتا ہے کہ صاف نظر آتا ہے اور محسوس بھی۔ ـــــ مثلاً کوئی لڑکا بستہ بغل میں دبائے ہوئے پتنگ بازی دیکھنے لگے تو یہ اس سے ہنس کر کہیں گے کہ لاؤ بستہ مجھے دو اور یہ پتنگ اڑاؤ۔ لڑکا جب اس پر کچھ پشیمان ہونے لگے تو یہ کہیں گے ـــــ پھینکو بھی ان کتابوں کو ان میں کیا تفریح ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ پڑھنے لکھنے والوں نے ہمیشہ تیل بیچا ہے۔ جب لڑکا شرمندگی کی حد پر آ جاتا ہے تو یہ اپنا آخری حربہ استعمال کرتے ہیں ـــ کھیلو گے کودو گے ہوگے نواب ـــ اور وہ لڑکا اب اسی میں عافیت سمجھتا ہے کہ سیدھا اسکول پہنچ جائے۔ بلحاظِ تخلص شاد ماموں کو تلخ سے تلخ حالات میں بھی مغموم اور اداس نہیں دیکھا گیا۔ ہنسی ہر وقت ان کے ہونٹوں پر کھیلتی رہتی ہے۔ سنہ ۵۳ء کی ایک طرحی غزل کے مقطع میں انہوں نے اس طرف بہت واضح اشارہ کیا ہے اور یہی ان کا مزاج بھی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

تلخیِ وقت و گردشِ دوراں پہ قہقہے
کچھ شاد نے ہی رنج و محن کا دیا جواب

یہ نہیں بلکہ سبھی باتوں کا جواب دینا انھوں نے اپنے عقیدے میں شامل کر لیا ہے۔ چنانچہ جب ان کی جیب میں تھوڑے سے پیسے ہوتے

ہیں وہ انھیں کسی فقیر کو دے کر اپنی جیب خالی کر دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ ان تھوڑے سے پیسوں کی وجہ سے اللہ میاں دینے کو نہیں

[illegible] جگہ میں مال جمع رہتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ [illegible] سبب پیدا کرے گا۔ [illegible] کوئی نہ کوئی سبب

[illegible] چاہتا ہے اور ان کا کوئی کام اٹکا نہیں رہتا۔ کوئی غلط بات [illegible] نہیں۔ کچھ بات ایسی

[illegible] کی بناوٹوں کی وجہ سے چھوڑ دیں۔ اگر کوئی پوچھے کہ آپ [illegible] پریشان کرنے

[illegible] اپنے اطمینان کے لئے مجھے ایک [illegible] پریشان کرنے

[illegible] کو والد یا [illegible] مطلق ہو تو میرا [illegible] جیسا کہ میرا عقیدہ ہے وہ [illegible] دیا جاتا ہے۔

تو میں یہ کہہ رہی تھی کہ لڈن ماموں [illegible] میں آیا تو [illegible] پیش آ جاتے ہیں۔ اسی سلسلے میں موقع

[illegible] شعر اور یاد آ رہا ہے جس میں انھوں نے زندگی کی دشواریوں کو [illegible] ہے

[illegible] چہرے سے [illegible] بدنام

ورنہ ظاہر بھی رہبر [illegible] سے [illegible]

یہاں میں لڈن ماموں کا ایک شعر [illegible] جاتی ہوں کہ [illegible] سے

دہ سے ہیں

[illegible]

شیخ صاحب [illegible] مسلمان [illegible]

یہ شیخ صاحب کے مسلمان ہونے یا نہ ہونے کی بحث [illegible] آگئی ورنہ میں یہ کہہ رہی تھی کہ [illegible] سے رنج و غم کا سامنا

واقعی طور پر لڈن ماموں نے [illegible] کا مقابلہ کر لیا اور بقول حضرت حالی ان کے لئے بھی رنج و خلفشار [illegible] رہ گئی

لڈن ماموں نے اپنے اوپر دو حملے کئے ہیں کہ [illegible] ان حملوں کی تفصیل طولانی ہے اس لئے میں مختصر طور سے کام لے کر بتا رہا ہوں کہ

ابھی آپ انٹرنس کا سالانہ امتحان ہی دینے پائے تھے کہ ان کے والد محمد عارف اللہ خان کا انتقال ہو گیا۔ گھر کی ساری ذمہ داریاں

ان پر آن پڑیں جنہیں موصوف نے خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ بھیا بھتیجی کے پڑھانے لکھانے شادی کرنے اور والدہ کی خدمت کو

اپنا فرض تسلیم کرتے ہوئے شادی کا خیال ترک کر دیا۔ مگر ۵۹ برس کی عمر میں ان کی والدہ کی آنکھیں جاتی رہیں۔ بھتیجی کی شادی کر دی۔ بھتیجے کو

بی۔ اے بی ٹی کرا کے اس کی شادی کر دی اور وہ سسرال میں رہنے لگا۔ والدہ کی خدمت کے سلسلے میں مجبوراً شادی نہ کرنے کا عہد

توڑنا پڑا اور چالیس سال کی عمر میں شادی کر لی۔ ان کی نظم "نصف بہتر" اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔ لڈن ماموں کی زندگی کا سب سے

بڑا المیہ یہ رہا ہے کہ ان کی اطاعت شعار بیوی ڈیڑھ سال زندہ رہ کر داغ مفارقت دے گئی۔

اگر یہ درست ہے کہ شخصیت کے سلسلے میں کسی شاعر کی جائے پیدائش اور خاندانی حالات معہ اپنے تمام حدود اربعہ کے درج کئے جائیں

تو مجھے یہ لازم آ جاتا ہے کہ اس بارے میں اختصار سے کام لے کر یہ بتاتی چلوں کہ لڈن ماموں کی وجہ یافستان ہے اور آپ ڈوڈال اور

زرطہ قبائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ مزار رام پور میں ہے۔ ان کی نانی رام پور میں پیدا ہوئی تھیں مگر نانی کے والد اور والدہ خالص افغانی تھے اور

نسلاً زرطہ۔ لڈن ماموں کے نانا مولوی سعید علی جن کا ذکر "تذکرۂ کاملان رام پور" میں موجود ہے نواب علاؤالدین خاں والیٔ لوہارو کی خواہش پر

ضیاءالدین ولی عہد لوہارو کے عربی معلم بن کر لوہارو چلے گئے جن کے ساتھ ان کے داماد مولوی محمد عارف اللہ خان یعنی لڈن ماموں کے والد بھی

دارد آگئے اور یہاں تحصیلداری کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ذکی ماموں [illegible] میں وہیں دارد میں پیدا ہوئے۔ ابھی پانچ سال کے تھے کہ نانا اور والد کو ریاست سے پنشن مل گئی اور یہ اپنے وطن رامپور آگئے۔ چنانچہ ذکی ماموں بھی رامپور آگئے۔ عربی فارسی کی تعلیم اپنے نانا اور والد سے گھر پر حاصل کی۔ اردو گھر کی زبان ہے ہی۔ علم حاصل کرنے کی لگن سے تنگ آکر خاندانی روایت سے بغاوت کرتے ہوئے اپنے ماموں کرامت علی خان کے ذریعہ جو اس وقت رامپور میں تھانیدار تھے ۱۲ برس کی عمر میں اسکول میں داخلہ لیا جس پر ذکی ماموں کے والد عرصہ تک ناراض رہے۔ وہ کہتے تھے کہ کرامت علی خان نے میرے لڑکے کو کرسٹان بنا دیا ہے جسے میں کسی طرح معاف نہیں کر سکتا۔ مگر ایک دن ہوا یہ کہ دہلی سے ذکی ماموں کے نام ایک تار آگیا اور یہ دیکھ کر کہ ذکی ماموں نے وہ تار حرف بحرف پڑھ لیا، بہت خوش ہوئے۔ [illegible] زندگی کے [illegible] میں پڑھے سارے [illegible] پڑھ لیا اور کہا میں غلطی پر تھا۔ زمانہ کا تقاضہ یہی تھا جو تم نے کیا اب تم شوق سے انگریزی پڑھ سکتے ہو۔ [illegible] کا اخبار [illegible] "مجھ پر بھروسہ کیجئے" ذکی ماموں نے جواب دیا اور اس بھروسہ کو آخر تک نباہا۔ چونکہ مدرسے سے نہیں علم حاصل کرنے کی ذہنی دلچسپی اس لئے ان کے مطالعہ [illegible] رات گئے تک کتب [illegible] اور ذکی ماموں ہیں اور آپ [illegible] کریں گے۔ [illegible] مطالعہ آج بھی [illegible]۔ حضرت شعر و ادب کی دلچسپی بچپن ہی سے پیدا ہو گئی تھی۔ [illegible] کا ایک [illegible] تجربوں سے ان کا [illegible] مطالعہ [illegible] گردانی کے [illegible] معانی [illegible]۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آج بھی [illegible] کے ساتھ [illegible] خود [illegible] اپنی تمام [illegible] کے ساتھ موجود ہے۔ ذکی ماموں سے [illegible] ظاہر ہوتی ہے کہ انہوں نے بڑے بڑے دیوانوں کا ایک ایک شعر میں [illegible] لیا ہے۔ [illegible] انتخاب تیار کیا ہے۔ [illegible] یہ شعر جس کا مصرعہ ہے [illegible]۔ خاقانی ہند ذوق کے دیوان کا خلاصہ ملاحظہ کیجئے ۔

معمر موذن کے گھر کو اہل جماعت لوٹ لیں
مانگنے ہے کب کوئی جا کر [illegible]

تاریخ اور اس قسم کے دوسرے خشک شعرا کے متعلق کہا کرتے ہیں کہ ان حضرات نے اپنی عمر ضائع کی اور کاغذ بھی ----- زیادہ سے زیادہ ان لوگوں کے کلام سے رسالہ تذکیر و تانیث تیار کیا جا سکتا ہے یا وہ اردو لغت جس میں اشعار کے ذریعہ مثالیں پیش کی گئی ہوں۔ حضرت شاد کا یہ مطلع " سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا" الخ ---- رند کا یہ شعر جس کا آخری مصرعہ ہے "ورنہ دام کہاں ہیں کہاں کہاں صیاد" حد یہ ہے کہ اپنے استاد فصاحت جنگ حضرت جلیل کو اس ایک مطلع کا شاعر کہتے ہیں ۔

نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

اگر آپ حضرت غالب کے دیوان کا خلاصہ چاہیں گے تو صاف صاف کہہ دیں گے کہ وہ تو خود انتخاب ہے، انتخاب کا انتخاب حماقت ہے ہاں اگر آپ یہ پوچھیں گے کہ ان کے نزدیک غالب کا سب سے اچھا شعر کونسا ہے تو کہیں گے ۔

پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

دو چار دن کے بعد آپ اگر پھر یہی سوال کریں گے تو جواب ملے گا ۔

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

اگر آپ [illegible] بہت [illegible] دیں گے تو ارشاد ہوگا۔ اس شعر میں [illegible] اپنے انداز و مزاج پر ہے۔ محبوب سے کہتے ہیں ہم [illegible]
، ہمیں کہ [illegible] تمہاری [illegible] کسی [illegible] مگر [illegible] کامیاں [illegible] جانے [illegible] اندازہ [illegible] کوئی [illegible]
میں رکھی [illegible] اس کے بعد اگر آپ یاد [illegible] پہلے [illegible] غالب کا وہ [illegible] اس شعر کو سب
یاد [illegible] ہی [illegible] جس [illegible] ہوں گے [illegible] گیا ہے۔ حضرت [illegible] کا یہ مقطع
[illegible] پسند ہے ؎

[illegible]

ایک دن کہنے لگے [illegible] اچھا شاعر [illegible]
[illegible] حضرت [illegible] کے [illegible]
[illegible] کہنے لگے [illegible]
[illegible]
[illegible] کے کلام میں [illegible]

بہرحال لڈن ماموں کی شاعری ایک [illegible] کی تلاش ہے۔
شاعر کا اظہار ہوتا ہے [illegible] لڈن ماموں [illegible]
[illegible] صاحب کے [illegible] مشکل ہے [illegible]
[illegible] بہت [illegible] سے [illegible] ہو سکتی ہے [illegible]
[illegible] ایک چھوٹا سا [illegible] یہ
[illegible] شاعر شاد عارفی کا مکان جس میں وہ شعر کہا تھا۔

لڈن ماموں روز غزلیں لکھا کرتے تھے غزلوں کے روپ میں [illegible] کرتے تھے اور اب بھی یہی مشغلہ جاری ہے۔
جیسا میں نے پہلے لکھا لڈن ماموں انتہائی خوددار رنگ چڑھے ہوئے قسم کے آدمی ہیں [illegible] کا اصول
ہے [illegible] کرنا نہیں جانتے۔ صاف دل اور صاف گو ہیں لگی لپٹی کے قائل نہیں۔ خدا اور رسول پر پکا ایمان رکھتے ہیں۔ اس لئے وہ لوگ
جو ان کو دور سے دیکھتے ہیں ان کے متعلق مختلف رائیں رکھتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے وہ کمیونسٹ ہیں کسی کی رائے ہے دہریہ ہیں۔ مگر میری رائے
میں وہ ایک پکے مسلمان ہیں اور شاعر کے علاوہ کچھ نہیں۔ کسی کا احسان لینا گوارا نہیں کرتے۔ رام پور کے اکثر رئیسوں نے ان کی امداد کرنا
چاہی مگر لڈن ماموں نے انکار کر دیا۔ وہ کہتے ہیں اگر رئیسوں سے روپیہ لوں گا تو ان کے خلاف پھر نظمیں کیسے لکھوں گا۔ میری شاعری کا مقصد فوت
ہو جائے گا۔

لڈن ماموں کی باتوں میں بلا کی کشش ہوتی ہے مختلف موضوعات پر بات چیت کرتے جائیں گے مگر درمیان میں لطیفے اور قصے بھی جاری
رکھیں گے۔ لڈن ماموں کبھی اکیلے نہیں رہتے یار دوستوں اور شاگردوں کا مجمع لگا رہتا ہے۔ اگر شعر و شاعری سے فرصت ہے تو شطرنج، چوسر جاری
ہے۔ اس کام سے فرصت ملی تو پتنگ بازی اور کبوتر بازی۔ ان کے پرانے گھر میں بہت سے کبوتر پلے ہوئے تھے۔ کبوتروں، مرغیوں اور کتوں کے
بارے میں بہت کافی معلومات رکھتے ہیں۔ ایک دن میں نے پوچھا لڈن ماموں آپ نے اس قدر کبوتر کیوں پال رکھے ہیں کہنے لگے ان کے

سے گھر کی تنہائی محسوس نہیں ہوتی۔ ـــ زندگی چلتی پھرتی محسوس ہوتی ہے۔

لڈن ماموں زندگی کی معمولی سی معمولی بات اور منظر میں دلچسپی لیتے ہیں اور اسی سے اپنی شاعری کا مواد تیار کرتے ہیں۔ خود اور کتاب و چاند لاو دست کسی کو شاعری کی حیثیت سے نہیں بخشتے۔ ان میں کوئی چار سو میں قسم کی بات دیکھتے ہیں اس کی شان میں قصیدہ کہہ ڈالتے ہیں اور بعد مر جاتے ہیں۔ دسہرہ، گنگا اسنان، مہترانی، نمائش وغیرہ نظمیں اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

لڈن ماموں نے کچھ دن ہوئے ایک غزل لکھی تھی جس کا مطلع تھا ـــ

ہیں از شیخی سے کمارا ہم ہشیار
وہاں حق ہے جیل خانہ میں

یہ شعر ان کی زندگی کی ترجمانی کرتا ہے۔ وہ خدا کو رازق ماننے کی وجہ سے دونوں وقت منہ سے کھاتے ہیں۔ کون رہا ہے کہاں سے آتا ہے؟ وہ جانے جو دونوں جہان کا رازق ہے اور تمہر کے کیڑے کو بھی رزق پہنچاتا ہے۔

سیّد عبدالحمید عدمؔ

شادؔ امرتسری

۱۹۴۸ء کی سردیوں کی ایک شام ہو رہی تھی میں میکلوڈ روڈ پر ایک چھوٹے سے ٹی سٹال میں بیٹھا تھا۔ ناظر بادشاہ خان میرے ساتھ تھے نائب
صاحب ہوئے کہ ان سے ہر شام وہیں ملاقات ہوتی تھی۔ ان کے ساتھ ایک موٹا سا شخص گرم کوٹ پہنے دروازے کھولیوں میں جانے جو رہا تھا
اندر آیا۔ گندمی رنگ، کشادہ پیشانی، چوڑا چکلا جسم اور کچھ بڑھی ہوئی توند جیسے ڈھیلے کپڑے جیسے اس کے جسم پر لٹک گئے ہوں۔
وہ سیدھا کوٹ کے ساتھ نائب صاحب کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور ہنس کر کچھ کہا۔ گردن بھی موٹی تھی جس سے معلوم ہوتا
تھا کہ یہ شخص کسی دن سے نہیں ملا۔ جو مسکرا رہا اور آنکھوں میں ایک معصوم سی چمک تھی۔ میں کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ نائب صاحب نے
سلام کیا تھے اور آتے ہی انہوں نے مجھ سے کہا۔ شادؔ صاحب! آپ ہیں عدمؔ صاحب یعنی سیّد عبدالحمید عدمؔ، اُردو کے مشہور شاعر۔
میں یہ سن کر سوچ سا رہ گیا کہ ان ڈیل ڈول کا شعر سے کیا تعلق ہو سکتا ہے مگر اتنے میں عدمؔ صاحب نے مسکراتے ہوئے ہاتھ بڑھایا "حضور
آپ سے مل کر واقعی خوشی ہوئی" اتنا کہا اور بیٹھ کر سگرٹ پینے لگے۔ میں نے چائے منگانا چاہی مگر عدمؔ صاحب نے پھر مسکراتے ہوئے
کہا "حضور یہ چائے کا وقت نہیں اب تو شام ہو رہی ہے" یہ کہا اور بے ساختہ بے تکلفی سے رادھا طلب انداز میں میری جانب دیکھا۔ نائب
صاحب بھی مسکرا رہے تھے۔ کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ چائے ختم ہوئی تو ہم سب ٹی سٹال سے نکلے۔ باتیں کرتے کرتے اور چلتے
چلتے میکلوڈ روڈ تک پہنچے تو عدمؔ صاحب جھٹ قلعہ گوجر سنگھ کے باہر والی دیسی شراب کی دکان کی طرف لپکے۔ میں اور نائب صاحب
بھی ہچکچاتے ہوئے دکان کے اندر داخل ہوئے۔ عدمؔ صاحب بوتل کو ہاتھوں میں لیے کھڑے تھے اور ان کے چہرے سے کچھ اس قسم کی معصوم
مسرت ٹپک رہی تھی جو ایک بچے کو اس کی پسند کا کھلونا مل جانے پر ہوتی ہے۔ بوتل کو کاغذ میں لپیٹ بغل میں دبا عدمؔ صاحب بولے
"حضور یہیں بیٹھ جائیں؟" میں ان دنوں دیال سنگھ کالج کا طالب علم تھا اور بعض وجوہ کی بنا پر رام موہن رائے ہوسٹل چھوڑ کر دین محمد روڈ پر
ایک دوست کے ساتھ رہتا تھا۔ میرے دوست مسٹر حسن کسی دفتر میں ملازم تھے۔ امرتسر کے تھے اور میرے عزیز دوست۔ میں نے دیسی
شراب خانے میں بیٹھنا مناسب نہ سمجھا اور کہا "عدمؔ صاحب گھر چلتے ہیں" عدمؔ صاحب کو جیسے کسی نے بہشت کی خوشخبری دے دی۔

سبحان اللہ کہا اور ہم گھر کی جانب چل پڑے۔

بوتل کھولی گئی۔ اس سے پہلے میں نے دیسی شراب کبھی نہیں پی تھی مگر قدیم صاحب نے اس خلوص اور بے تکلفی سے دعوت دی کہ مجھے محسوس ہوا کہ یہ ضرور نہیں۔ چند ہی منٹ کے بعد شراب کا اثر ہوا اور قدیم صاحب نے خود اپنا کلام سنانا شروع کر دیا۔ ٹھیک طور پر نہیں کہا جا سکتا اور معلوم نہیں کتنی غزلیں سنا ڈالیں وہ پڑھتے رہے اور شعر ہوتے رہے۔ یہ محفل کافی دیر تک رہی اور آخر قدیم صاحب کی یہ حالت ہو گئی کہ مجھے اور ثاقب صاحب کو انہیں لٹا کر نکلنے میں دو نا پڑا۔

قدیم صاحب سے بظاہر یہ بڑی پہلی ملاقات تھی کہ مجھے کچھ یوں محسوس ہوا کہ وہ میرے بہت پرانے دوست ہیں اور جیسے اصل میں دوسرے روز شام سے قریب ہی گھر گیا تو قدیم صاحب کو موجود پایا۔ میری غیر موجودگی میں وہ میرے دوست اور میرے گہرے ساتھی مسٹر حسن سے نہ صرف اپنا تعارف کرا چکے تھے بلکہ نہایت بے تکلفی سے گفتگو کر رہے تھے اور انہیں اپنی کئی غزلیں بھی سنا چکے تھے۔ مجھے تک بھی قدیم صاحب نے اس طرح آگے بڑھ کر استقبال کیا جیسے وہ صاحب خانہ ہوں اور میں ایک مہمان کی حیثیت سے ان کے گھر آیا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد بوتل میز پر کھل چکی تھی اور اس کی خوشبو سے سارا کمرہ مہک رہا تھا۔ میرے دوست مسٹر حسن (جو آپ بھی میرے ہمسایہ ہیں) شراب بالکل نہیں پیتے مگر پینے والوں کو نہ صرف برداشت کرتے ہیں بلکہ ان کے لئے ساز و سامان فراہم کرنا سعادت سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اب وہ بھی میں کچھ کباب بھی تل کر لے آئے تھے۔ ان دنوں ہمارے اس کمرے میں جس کا نام ہم نے آستانہ رکھا ہوا تھا، شام کو روزانہ محفل آرا ہوتی تھی۔ مختلف قسم کے احباب جمع ہو جاتے تھے۔ ظہیر کاشمیری، سیف الدین سیف، مراتب علی ثاقب، طفیل احمد اور ہمارے ساتھ کے مسٹر خلیل شام ہوتے ہی چلے آتے۔ خوش گپیاں ہوتیں۔ خلیل صاحب لطیفہ بازی اور بذلہ سنجی سے ہمیں خوش رکھتے۔ سیف صاحب کلام سناتے ان سے بحثیں ہوتیں۔ ظہیر کاشمیری سے کمیونزم پر گرما گرم گفتگو ہوتی۔ علم و ادب کی باتیں ہوتیں اور کبھی کبھی شراب کا دور بھی چلتا۔ میرے دوست مسٹر حسن تاش کے بہت شوقین ہیں۔ ان کے بھی کچھ دوست احباب آ جاتے۔ وہ الگ تاش میں مصروف رہتے اور ہم اپنے کام میں مگن گویا یہ کمرہ صحیح معنوں میں سعدی کے اس شعر کی تفسیر تھا ؎

بہشت آں جا کہ آزارے نباشد
کسے را با کسے کارے نباشد

قدیم صاحب کے آنے سے اس روز کی محفل میں ایک نمایاں فرق یہ تھا کہ شراب روز آنے لگی اور اکثر اوقات قدیم صاحب اپنے ساتھ ہی بوتل لے آتے۔ وہ باقاعدہ شام ہوتے ہی دفتر سے سیدھے میرے ہاں چلے آتے۔ دوسرے احباب بھی جمع ہو جاتے۔ قدیم صاحب شراب کے ساتھ ساتھ بیسیوں غزلیں بھی سناتے جاتے۔ ہمیں غزلوں سے اور خود کو شراب سے بے ہوش کرتے۔ قدیم صاحب کا حافظہ بہت تیز ہے اور انہیں اپنی سینکڑوں غزلیں یاد رہتی ہیں اور خاص طور پر شراب پینے کے بعد تو انہیں تمام بھولے بسرے شعر بھی یاد آ جاتے ہیں۔

قدیم صاحب کے سلسلے میں یہ کہنا بالکل بے جا نہ ہوگا کہ شراب کے بغیر ان کی شخصیت بالکل بے معنی ہے۔ اس کے بغیر وہ مجہول اور پژمردہ دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی گفتگو بے جان سی اور رسمیانہ ہوتی ہے یہاں تک کہ وہ کسی بھی حسین شے سے ایسی حالت میں متاثر نہیں ہوتے۔ ان کا ایک شعر اس سلسلے میں سنئے ؎

شراب پی کے مجھے آنکھ کھول لینے دے
ابھی جھجکتے ہوئے رخ کو بے نقاب نہ کر

یوں بھی قدیم صاحب کا علم و ادب کا مطالعہ بہت محدود ہے۔ وہ کسی ادبی یا فنی نظریے یا کسی مکتب خیال کے اصولوں سے پوری طرح

نہیں ہیں۔ وہ اس لئے نہیں کہ انہوں نے کسی نظریہ یا کسی مکتب فکر کے اصولوں سے مطالعہ نہیں کیا ہو، نہ اس لئے کہ وہ [illegible] ... [illegible] ... [illegible] کی شخصیت کا [illegible] ... [illegible] ... [illegible] کہ ان کی شخصیت [illegible] ... [illegible] معصومیت اور سادگی [illegible] ... [illegible]

۱۹۴۸ء کے شروع میں [illegible] ... [illegible] ... [illegible] بیٹھے تھے [illegible] ... [illegible] ... [illegible] جانب ہو گئے۔ مجھے تشویش ہوئی۔ [illegible] ... [illegible] ... [illegible] لگے۔ میں اسی لئے تین چار دن سے نہیں آیا [illegible] ... [illegible] سے کوئی تانگے والے [illegible] ... [illegible] آمادہ کر لیا [illegible] ... [illegible] تانگے والے [illegible] ... [illegible] اور مجھے کوتوالی میں لے گئے۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس کے استفسار پر [illegible] ... [illegible] ایک دوست شاعر [illegible] ... [illegible] آج تاریخ ہے اور آج آپ کو [illegible] ... [illegible] اور شراب واپس مل جائے [illegible] شراب مفت میں حرام ہو جائے گی [illegible] ... [illegible] کے قصہ پاک ہوا۔

اسی قسم کے بیسیوں واقعات ہوں گے جہاں ان کی سادگی اور معصومیت نے کسی [illegible] ... [illegible]

ندیم صاحب کا مزاج بالکل بچوں کا سا ہے۔ وہ بچوں کی طرح ضد بھی کرتے ہیں مگر جلد ہی من بھی جاتے ہیں۔ انہیں جھوٹ بولنا آتا ہی نہیں۔ یہ میں بالکل مبالغہ نہیں کر رہا۔ وہ اگر کبھی کبھار جھوٹ بولنے کی کوشش بھی کریں تو ان کے چہرے سے اس طرح عیاں ہو جاتا ہے [illegible] اس طرح ایک ڈرپوک ہے کہ جھوٹ بولتے وقت چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ پر قابو نہیں رہتا۔ میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ شاید اسی فطری معصومیت کی وجہ سے ان کے شعروں میں صداقت احساس اور خلوص اظہار ہوتا ہے ورنہ ان کی زندگی کا تجرباتی میدان بہت محدود ہے۔ وہ زندگی میں فقط تین کام کرتے ہیں۔ دفتر جاتے ہیں، شعر کہتے ہیں اور شراب پیتے ہیں۔ یہی ان کی زندگی اور کل کائنات ہے۔ زندگی کے بے شمار متنوع پہلوؤں کا مطالعہ کرنا ان کے بس کا روگ نہیں۔ وہ ریاکاری، سیاست بازی اور گروہ بندی سے اس طرح ناآشنا ہیں جس طرح آج کا کوئی انسان نہیں ہوتا۔ وہ فریب کھا سکتے ہیں دے نہیں سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی خاص مکتب خیال کے مقلد نہیں۔ ان کی آزادئ طبع اور آزادئ فکر کسی ضابطے کی متحمل نہیں اور شاید کبھی ہو بھی نہیں سکتی۔ اس آزادی بلکہ آزادہ روی کی وجہ ان کا طبعی لاابالی پن ہے۔ میں نے اکثر غور کرنے کی

کوشش کی کہ انہوں نے شراب نوشی کو اس طرح اپنے آپ پر سوار کیوں کر رکھا ہے مگر کوئی خاص وجہ مجھے نہیں ملی۔ اصل مسئلہ اس کے کچھ یوں ہے کہ زندگی کے بارے میں کسی غیر سنجیدہ سلوک کی آئینہ دار رہے۔ وہ کسی مسئلے پر بھی سنجیدگی سے غور نہیں کرتے۔ ایک عجب قسم کی بے راہ روی اور لاابالی پن ہے جس نے ان کو اپنے دام میں پھنسائے رکھا ہے۔ یہ بے راہ روی اور لاابالی پن اس طرح مستقل صورت اختیار کر چکا ہے کہ قدیم صاحب اس کے اثر سے نکلنا ہی نہیں چاہتے۔ مجھے کئی بار خیال آیا کہ قدیم صاحب نے کہیں یہ ایک مصنوعی لبادہ تو نہیں اوڑھ رکھا۔ لیکن کیا یہ بے راہ روی ان کی زندگی اور ادب کے فن کا کوئی پہلو تو نہیں۔ مگر یہ مجھ پر عیاں ہوا کہ ایسی بات نہیں۔ یہ لاابالی پن اور ایک فنکارانہ وارفتگی ان کی شخصیت کا ایک فطری جزو ہے۔ یہ سُن سنا ہے اس پر بحث نہیں۔ یہ کوئی تصنع نہیں بلکہ اصل ہے۔ مجھ پر یہ حقیقت کچھ اور بھی واضح ہوئی جب میں نے ان کے تصورِ عشق پر غور کیا۔ غور کرنے پر مجھے حیرت ہوئی کہ انہوں نے زندگی میں کبھی عشق نہیں کیا۔ عشق سے میری مراد بالکل وہی مجنوں اور فرہاد کا عشق نہیں بلکہ زندگی کا وہ ایک اور فقط ایک یادگار جذباتی واقعہ ہے جو اکثر اوقات فن کے مضامین و احساسات میں ایک دائمی گداز پیدا کر دیتا ہے۔ کسی سے شدید قسم کا عشق نہ کرنے کا سبب ان کی وہی فطری بے راہ روی اور طبیعی لاابالی پن ہے۔ قدیم صاحب نے کسی سے بھی عشق نہیں کیا مگر پھر بھی وہ ہر حسین چیز کے عاشق دکھائی دیتے ہیں اور یہ احساس اکثر اوقات ہنگامی ہوتا ہے۔ یہ حُسن پرستی اگرچہ ایک محرک قسم کے حساس انسان کی حسن پرستی نہیں تاہم اس حسن پرستی میں وہ تڑپ اور وہ دائمی گداز بھی نہیں جو زندگی میں صحیح عشق کرنے سے پیدا ہوتا ہے اور جس سے ایک گہرا اور ایک دردمندی اور ایک ابدی ناآسودگی پیدا ہوتی ہے جس کی دھیمی دھیمی آنچ میں فن ہر وار آمادہ ہوتا ہے۔ مگر اس دردمندی اور گداز کی غیر موجودگی نے قدیم صاحب کو زیادہ نقصان نہیں پہنچایا۔ انہوں نے اپنے آپ کو آتش سیال کی بھٹی میں ڈال کر کندن بنانے کی کوشش کی ہے جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔

قدیم صاحب کی زندگی بھی منفرد نوعیت کی حامل ہے۔ منفرد میں نے اس لئے کہا ہے کہ بعض اوقات ان کی وارفتگی نے عجیب عجیب گل کھلائے۔ سنہ ۱۹۴۷ء ہی کا ذکر ہے۔ ان دنوں لاہور میں فسادات جیسے ہی خطرناک صورت اختیار کر چکے تھے۔ ایک رات ظہیر کاشمیری اور قدیم صاحب میرے ہاں سو رہے۔ قریب قریب صبح ہونے والی ہوگی کہ کمرے میں شور ہوا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھا تو کمرے میں آگ جل رہی تھی اور کمرہ دھوئیں سے بھرا ہوا۔ ظہیر کاشمیری سب چیخ چیخ کر پکار رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ قدیم صاحب کا تکیہ مکمل جل چکا ہے۔ بستر کی چادر جل رہی ہے۔ یہاں تک کہ قدیم صاحب کے سر کے بال بھی جل رہے ہیں مگر انہیں قطعاً ہوش نہیں۔ آخر بمشکل میں نے اور ظہیر کاشمیری نے قدیم صاحب کو جگایا۔ تکیے کو صحن کے دستی پمپ کے پانی سے بجھایا۔ قدیم صاحب کو یہ معلوم کر کے زیادہ حیرت نہ ہوئی کہ ان کی گردن جل رہی تھی۔ کہنے لگے "حضور ایسا تو کئی بار ہو چکا ہے"۔ یہ کہا اور ایک سگرٹ جلا لیا۔ خیر کچھ دیر بعد سب کے سب پھر سو گئے۔ ابھی مشکل سے آدھ گھنٹہ ہی ہوا ہوگا کہ ظہیر کاشمیری کی آواز پھر گونجی۔ پھر اٹھے تو دیکھا کہ قدیم صاحب کی قمیص جل رہی ہے مگر وہ بالکل بے سُدھ پڑے ہیں۔ پانی کا گلاس ان کی قمیص پر ڈالا گیا مگر انہیں ہوش نہ آیا۔ صبح ہو چکی تھی۔ ظہیر کاشمیری نے کہا کہ اگر میں رات کو نہ جاگتا تو صبح اخبار میں خبر چھپ جاتی کہ سکھوں نے تین شاعروں کو جلا ڈالا۔ اسی قسم کا ایک اور واقعہ ہے۔ انہی دنوں کا ذکر ہے۔ ایک شام قدیم صاحب تشریف لائے۔ ان کے ساتھ الطاف مشہدی بھی تھے۔ دور چلا۔ شراب ختم ہوئی تو الطاف مشہدی کے کہنے پر قدیم صاحب ان کے ساتھ تلاشِ شراب میں نکل کھڑے ہوئے۔ ان کے جانے کے بعد کچھ دیر تک تو میں نے انتظار کیا پھر میں سو رہا۔ صبح سویرے اٹھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ قدیم صاحب لنگڑاتے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ منہ سوجا ہوا، گالوں پر نیلے نیلے داغ، پتلون پھٹی ہوئی۔ میں نے پوچھا حضرت کیا معاملہ ہے؟ الطاف کہاں چلا گیا لیکن چونکہ نشہ بہت تھا کوئی معقول جواب نہ دیا اور لیٹ گئے۔ میں نے ان دنوں سیکرٹریٹ میں عارضی طور پر ملازمت کر لی تھی۔ میں دفتر جانے کی تیاری کر چکا تو نائب صاحب آ گئے۔ اتنے میں قدیم صاحب جاگے اور زور زور سے رونا شروع کر دیا "حضور میں مر گیا۔ حضور میں وفات پا جاؤں گا"۔ نائب صاحب اور میں نے دیکھا تو معلوم ہوا کہ حضرت کو بہت سی چوٹیں آئی ہیں۔ خیر بڑی مشکل سے گھر پہنچایا گیا۔ چند روز بستر ہی پر رہے۔ کوئی دوا وغیرہ استعمال کرنے کی بجائے پانچ روز مسلسل صبح و شام ٹھرا پیا اور ٹھیک ہونے پر بتایا کہ حضور اس رات الطاف مشہدی کے ساتھ انار کلی میں ایک سکھوں کے ہوٹل میں

شباب کی [illegible] سے عدم نے غزل کی شکل سے [illegible]
[illegible]

وارفتگی کے [illegible] کے لئے جیب میں ہے۔ [illegible]
[illegible] وارفتگی کے سبب [illegible] نہیں [illegible] احساس بھی [illegible]
[illegible] لکھتے ہیں۔ [illegible]
[illegible] نہیں [illegible] گھر [illegible]
[illegible]
[illegible] ہو گئے۔ [illegible]
[illegible] کسی [illegible] کمال [illegible] ایک [illegible] نہیں [illegible]
[illegible] ذاتی مستی اور بے حد مشکل سے ملایا [illegible] واقعات ہیں۔ [illegible]
[illegible] پیدا کی ہیں۔ [illegible]
[illegible] کو ختم کر دیا ہے [illegible]
[illegible]
[illegible] نہیں [illegible] نہیں لکھتے [illegible]
[illegible] والوں سے ملتے بھی نہیں [illegible]
[illegible] پیدا کئے ہیں۔ ان کا مشاہدہ اور تجربہ خواہ وہ زندگی کے کسی بھی شعبے سے متعلق ہو [illegible] صحیح ہوتا ہے۔ [illegible]
مشاہدے کی یہ سادگی اور صحت [illegible] مشاہدات کو شعر کی
صورت [illegible] صحت اور خلوص شعر کے [illegible] جز و بن جاتے ہیں اور [illegible] دیتے ہیں۔ ان کا
[illegible] ہے۔ [illegible] نہیں [illegible] ان کی شاعری کا حسن کا [illegible]
اور [illegible] سادگی بیان [illegible] خاص [illegible] گھومتے
[illegible] ہے۔ وہ زندگی کو جیسے دیکھتے ہیں اسی طرح اس کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے اشعار [illegible] سے پاک ہوتے ہیں۔ زندگی [illegible]
[illegible] کے متعلق انھوں نے [illegible] شعر کہے ہیں جن میں [illegible] زندگی کا ایک انفرادی رنگ کی جھلک موجود ہے۔
زندگی سے متعلق چند شعر دیکھئے :

پیتا ہوں حادثات کے طوفان کے لئے — مے ایک گھونٹ ہے غم روزگار کا
زمانے کی رفتار سے تنگ آ کر — عدم کر لیا مے کدے میں بسیرا
مے ہی بہترین چیز ہے اور واقعی حرام — میں کثرت شکوک سے گھبرا کے پی گیا
سو بار لغزشوں کی قسم کھا کے چھوڑ دی — سو بار چھوڑنے کی قسم کھا کے پی گیا
بادہ کشی حرام ہے یا زندگی حرام — تصدیق کر رہا ہوں غم روزگار سے

عدم کی شاعری شراب، حسن اور عشق کی شاعری ہے۔ اس میں اگرچہ کوئی سنجیدہ اور واضح فلسفہ یا انداز فکر نہیں مگر اس کے باوجود ان کی تمام تخلیق میں

ایک ہم عصر شاعر کی طرح ان کی شاعری میں بھی کہیں کہیں ابہام ملتا ہے۔ ان کے ان تصورات کی جگہ جگہ بازگشت ہے۔ قسمت کا ماتم یا زندگی کی تلخیوں کے اشارے موجود ہیں۔ چند شعر سنئے ۔

چھپے ہو حجابات دیر و حرم میں ۔۔۔ مگر بے تکلف نظر آ رہے ہو
بہار و خزاں کو نگاہوں سے دیکھا ۔۔۔ جو دیکھا تو پائے سب زمانے سے
ضمیرِ صدف میں کرن کا مقام ۔۔۔ اٹھے اور کے نشانے تیرے
جب بھی ہوتے ہیں ہم ندیمؔ تنہا ۔۔۔ یاد سے ہم کنار ہوتے ہیں
مرے لیے یہ روایت ہے یا حقیقت ہے ۔۔۔ شاعر ہے وہ جو جہاں کے لیے سجتے ہیں
ایک ہی بار تری شکل کا عرفاں تھا محال ۔۔۔ دوسری بار کوئی آئینہ حیراں نہ ہوا

آج کے شاعروں نے جہاں نئی شعری لوازم کو نظرانداز کر دیا ہے وہاں نغمگی کو بھی کہ شعر کی بنیادی خصوصیت ہے قابلِ توجہ نہیں سمجھا۔ ندیمؔ کے ہاں نغمگی اور روانی مستقل طور پر موجود ہے۔ ان کی شاعری میں ایک طرح کی فضا بنتی ہے جسے محسوس کرتے ہوئے الفاظ اور دلکش ترکیبیں ہی ان کے اشعار کا تار و پود ہیں۔ اشعار میں کہیں کہیں شوخی اور شرارت کے عناصر بھی ملتے ہیں مثلاً ۔

بے خودی میں مری آغوش سے کچھ سے آگے ۔۔۔ ہم مگر کیسے میں شاملِ آغوش نہیں
تخلیقِ کائنات کے دلچسپ جرم پر ۔۔۔ ہنستا تو ہوگا حضرتِ یزداں کبھی کبھی

ندیمؔ صاحب میں ایک بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ شعر بہت کثرت سے کہتے ہیں اور انہیں اس بات کا دھیان نہیں رہتا کہ کون سا شعر اس قابل ہے کہ رکھ لیا جائے اور کون سا حذف کر دیا جائے۔ یوں تو ہر شاعر کو اپنا ہر شعر عزیز ہوتا ہے مگر اس کے باوجود شعراء میں اکثر اس قدر تنقیدی شعور ہوتا ہے کہ وہ کون سے اشعار کو رکھیں اور کن کو حذف کر دیں۔ اردو کے سب سے بڑے شاعر غالبؔ کے اسی تنقیدی شعور نے غالبؔ کو عظیم اور لافانی بنایا ہے۔

ندیمؔ صاحب شعر بہت کثرت سے کہتے ہیں اور بعض اوقات ضعف و پایہ کو بھی چھپانے سے گریز نہیں کرتے۔ ندیمؔ صاحب کی زود گوئی اور کثرت گوئی سے مجھے ایک واقعہ یاد آگیا۔ ۱۹۴۲ء کی بات ہے۔ ایک رات وہ زیادہ تھکے ہوئے تھے اس لئے جلدی سو گئے۔ تقریباً آدھی رات کا وقت ہوگا کہ یونہی میری آنکھ کھل گئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ بجلی جل رہی ہے۔ ندیمؔ صاحب چارپائی پر بیٹھے ہیں۔ ایک ہاتھ میں سگریٹ دوسرے میں پنسل لئے کچھ سوچ رہے ہیں۔ نوٹ بک سامنے تکیے پر پڑی ہے۔ میں پھر سو گیا۔ صبح میں نے پوچھا مولانا رات کیا بات تھی۔ کہنے لگے بھئی یونہی نیند کھل گئی خیال آیا کہ کچھ شعر ہی کہہ ڈالوں۔ مگر فقط سات غزلیں کہہ کر ہی نیند آ گئی۔ اب جو شاعر گھنٹے دو گھنٹے میں سات غزلیں کہہ ڈالے اندازہ کیجئے کہ وہ کس کثرت سے شعر کہتا ہوگا۔ کثرت سے شعر کہنا برا نہیں مگر ان سب اشعار کو من و عن رکھ لینا یقیناً برا ہے۔ وہ جو کچھ کہہ دیں اس میں کانٹ چھانٹ کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ شعر اچھا ہوا برا ہوا بس ہو گیا۔ اب اس پہ مزید غور و فکر کرنا ان کا اصول ہی نہیں۔ اسی وجہ سے بعض اوقات غزلوں میں بہت سے ہلکے شعر بھی ملتے ہیں جنہیں پڑھ کر افسوس ہوتا ہے کہ کاش یہ شعر غزل میں نہ ہوتے۔ مجھے یاد ہے میں نے کئی بار کہا کہ فلاں غزل میں سے فلاں شعر نکال دیجئے۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ ہاں ضرور حذف کر دوں گا۔ مگر جب غزل چھپی تو وہ اشعار موجود تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ انہوں نے آج تک جتنے شعر کہے ہیں وہ انہیں تقریباً سب کے سب زبانی یاد ہیں۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ حافظہ ان کا بلا کا ہے۔ اشعار کہنے کے بعد ان کو یاد ہو جاتے ہیں اس لئے بعد میں اگر وہ چاہیں بھی تو ان اشعار کو حذف نہیں کر سکتے۔ حافظے سے متعلق ایک واقعہ یاد آگیا۔ اتوار کا دن تھا۔ مجھے دفتر سے چھٹی تھی۔ ندیمؔ صاحب صبح ہی تشریف لے آئے۔ تھوڑی دیر بعد سبط صاحب بھی آ گئے۔ ندیمؔ صاحب کہنے لگے "حضور آج چھ سال کا کوئی

[illegible] ترتیب [illegible] حاصل کروں [illegible]
[illegible]
[illegible]
ں چلتے ہیں تاکہ آپ کی شاعری کا بند بست ہو۔

[illegible] صاحب میرے دوست ہیں۔ میں نے ان کی شخصیت اور [illegible] فن کو دیکھنے کی [illegible] کوشش
روایتی انداز اختیار نہیں کیا [illegible] نقاد حضرات [illegible]
[illegible] سادگی [illegible] تصویر آپ کے
[illegible] اگر اس تصویر میں [illegible] صاحب کے [illegible]

جذبی

انور عظیم

- کیا جھک مار رہے ہو؟
جذبی کے متعلق اپنے تاثرات قلم بند کر رہا ہوں۔
- ف: جذبی سے متعلق [illegible] تاثرات [illegible] کے متعلق [illegible] ہو گئی؟

واقعی حد ہو گئی۔ ذرا اس شاعر پر ایک نظر ڈالیے۔ اس کی شخصیت میں کوئی بڑی بات نہیں جو اپنی پہلی جھلک میں لوگوں پر جادو چلا دے، [illegible] ہو جائے۔ اس کی شکل و صورت [illegible] اس کی باتوں کا انداز [illegible] کوئی [illegible] کوئی نیا ولولہ نظر نہیں آتا اگر اس کی [illegible] میں کوئی چیز چمک رہا یا جولان نظر آتی ہے تو وہ اس [illegible] مقابلے میدان سے۔ اس [illegible] دونوں طرف [illegible] بال [illegible] بیچ و سط میدان میں دونوں طرف سے آ کر مل گئے ہیں [illegible] انہوں نے اس میدان کو [illegible] کا احاطہ [illegible] اتنی ہی [illegible] ہیں۔ جذبی کو پہلی نظر میں دیکھیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایک ایسے آدمی کے سامنے [illegible] بیٹھنے کی صلاحیت بالکل مفقود ہے [illegible] شاعر کی شخصیت میں ایک تکلیف دہ [illegible] پیدا کر دی ہے۔ لیکن [illegible] سے باتیں کریں، گھل مل جائیں پھر دیکھیے اس [illegible] افسردگی [illegible] کا ایک [illegible] اور سب کچھ [illegible] لیکن وہاں بھی مایوسی ہوگی [illegible] بڑے بڑے اور [illegible] کی [illegible] اور [illegible] کی پامالی پر [illegible] خیال [illegible] کبھی بھی چھلکا [illegible] لیکن ان سے پہلی بار [illegible] ان کو پہلی بار دیکھنے کے بعد مجھے [illegible] پر [illegible] آیا تھا [illegible] کے جذبات سے [illegible] سوچتا تھا بے چارا اس [illegible] سے کس طرح بچا ہوگا۔ اگر میرا یہ خیال غلط ہے تو [illegible] یہ قیاس صحیح ہوگا [illegible] جذبی [illegible] اور [illegible] کا تختۂ مشق بن گئے ہوں گے۔ اور جذبی نے اپنا سارا [illegible] ایک تختۂ مشق پر نکال لیا ہوگا۔

واقعی جذبی میں اتنی [illegible] اتنی [illegible] جو ان کے فن پر پورے طور پر محیط ہونے میں ناکام رہی ہے؟ کیوں ہے؟ کیا ایک انسان جبلی طور ایسا ہوتا ہے؟ یا سماجی حالات اور زندگی کے [illegible] اس کے مزاج اور اس کی مجموعی شخصیت کی تربیت اور ترتیب کرتے ہیں؟ کیا جذبی محض گھٹا ٹوپ [illegible] کے [illegible] کلبیت کے اندھیرے میں [illegible] ایک افسردہ دل اور انجمن کو افسردہ کرنے والا انسان ہے؟ کیا اس خاکستر کے ڈھیر کے اندر چنگاریاں دبی ہوئی نہیں ہیں؟ کیا اس کی شخصیت میں اس کی [illegible] دنیا کی [illegible] جذبات کی، اس کے شعور اور تجربے کی آئینہ دار اس کی شاعری میں ان چنگاریوں کے [illegible]

[illegible] کی شخصیت سے [illegible] میں لکھا جاتا ہے [illegible] کی شاعری کی پوری ترتیب تحلیل میں [illegible] کی اپنی شخصیت
[illegible] کی [illegible] ہوئی [illegible] نمائیں [illegible] ۔ شاید بہت کم لوگ جانتے
ہیں [illegible]

[illegible] شعر سے نہیں شروع ہوتی شاعری [illegible] حقیقت [illegible] ہے
[illegible] شاعری [illegible] شامل ہوتی [illegible]
[illegible] کے سامنے بھی [illegible] ہوتی ہیں [illegible] انسانی [illegible]
[illegible] میں لیا گیا ۔

[illegible] آج ہمارے سامنے [illegible]
[illegible] موجود تھا [illegible] ادبی [illegible]
[illegible] زندگی میں ایک [illegible] ہو جائیں [illegible] ۔

[illegible] کا خاندان بہت [illegible] سے [illegible]
[illegible] ماحول [illegible] مرتب [illegible] تھے ۔ [illegible]
کام [illegible] لیا ۔ [illegible] خاندان [illegible] شاعری [illegible] ماحول میں ادبی [illegible]
[illegible] معین احسن [illegible] شاعروں [illegible] کے لئے کہا جاتا ۔ میاں
[illegible] زندگی [illegible] کا پہلا
[illegible] اٹھانے ۔ [illegible] اقبال [illegible]
[illegible] کے اس وقت کے [illegible] ہے

[illegible] وجہ [illegible]
[illegible] ہیں [illegible] ہوئے [illegible]
[illegible] سے روشن ہوا [illegible]
[illegible] مزاج [illegible] سر بلند

[illegible] اور [illegible] وغیرہ کی ادبی دلچسپیاں اور [illegible] نظمیں یاد کرنے کا اس قدر شوق [illegible] یہ [illegible] سال کی عمر تک جناب نے تک [illegible]
[illegible] ان دنوں جہانگیر میں قیام تھا [illegible] ساتویں آٹھویں جماعت کی طالب علمی کا دور تھا ۔ صادق رضوی کا شمار ان دنوں استادوں میں ہوتا تھا ۔ ان کے
حامد شاہ جہانپوری [illegible] معین احسن کے گھر والوں کے پڑوسی تھے ۔ ان کے یہاں اس ننھے شاعر کا آنا جانا تھا ۔ ان سے تعلقات کا اثر تھا ۔ حقیقت [illegible]
[illegible] احسن نے ان کی پوری بیاض حفظ کر لی [illegible] ان ہی دنوں باقاعدہ شاعری کا آغاز ہوا ۔ معین احسن نے اپنی ایک غزل دوسرے کے نام سے [illegible]
ایک آدھ شعر پسند کیا ۔ اس طرح معین احسن [illegible] جو اس وقت نویں جماعت میں پڑھتا تھا اور جس کی عمر اس وقت پندرہ سال تھی اپنا تخلص جذبی رکھا ۔
[illegible] زندگی کی پہلی منزل میں بے دھڑک داخل ہو گیا ۔ ان دنوں دنیائے شاعری میں جگر اور فانی کے نام روشن تھے ۔ ان کی غزلوں کا بڑا شہرہ تھا ۔ [illegible]
[illegible] کا رواج نہیں تھا ۔ ایک ایسے زمانے میں ایک ہونہار شاعر نے اپنی فنی زندگی کے ابتدائی دور میں باقاعدہ اصلاح حاصل کرنے کا بیڑا اٹھایا ۔ جذبی
[illegible] معین احسن ملال کے سامنے اپنی طبع آزمائی کے لئے وہی میدان تھا ۔ حامد شاہ جہانپوری نے ملال کی [illegible] رسا کا اندازہ لگایا ۔ ورنہ نہیں اپنے استاد

عاشق دہلی سے رجوع کرنے کے لئے کہا تھا۔ وہ ہر شعر پر شک کرتے تھے ایک ایک لفظ کے [illegible] کرتے تھے۔ وہ بندش چست، الفاظ وغیرہ پر بات کرتے۔ اس کا تیجہ یہ تھا کہ شعر کو بہت احتیاط سے ہی کہنا [illegible] تجربہ کا شاعری سے کیا تعلق ہے، وہ اس کے بعد زندگی کے واقعات کی تشریح کیا کرتے تھے۔ [illegible] اس کے بعد ملال کے استاد نے کہا تمہاری غزلیں دوسرے درجے کے استادوں سے اچھی ہوتی ہیں۔ مگر دماغ خراب نہ ہو تو ـــــ

آگرے میں تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا تو وہاں اردو کے ایک اور شاعر سے ملاقات ہوئی۔ وہ شاعر تھا مجاز۔ مجاز ان کے ہم جماعت تھے۔ [illegible] سائنس کے طالب علم تھے۔ ان دنوں آگرے میں میکش اکبرآبادی وغیرہ کا دور تھا۔ کالج کا پہلا سال تھا۔ شاعری کی ترغیب ملا کرتا وہ نعت پڑھنے کے [illegible] دیا کرتیں۔ ان ہی دنوں ملال کو فانی سے ملنے کا موقع ملا

ایک دن حضرت ہمت کرکے فانی کے یہاں پہنچے تو وہ آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک طرف نوعمر شاگرد ہوتے۔ ان کا عب [illegible] دوسری طرف ایک نوعمر نوجوان [illegible] طالب علم شاعر جس کی ابھی [illegible] بھی نہیں بھیگی تھیں۔ لیکن جسے شاعری کا جنون اس دور کے ایک عظیم المرتبت شاعر کے یہاں کھینچ لایا تھا۔ وہ بڑی محبت اور تپاک سے پیش آئے۔

- کہئے کیا شغل ہے۔ [illegible] سے پوچھا

سائنس پڑھتا ہوں [illegible] وہ الفاظ تھے جو جلدی سے فرفراتی ہوئی آواز کے ساتھ بیس برس ملال کی زبان سے ادا ہو گئے۔

شعروشاعری کا شوق بھی ہے؟

- صاحب بس یوں ہی تک بندی کر لیتا ہوں [illegible] یا کہا۔ [illegible] مشکل سے ملی۔

کچھ سنائیے۔

ملال نے اپنی غزلیں اٹھائیں۔ ان کے سامنے بڑی متانت کے [illegible] کشیدہ قامت [illegible] اچھے لباس میں بیٹھے تھے۔ ان کے [illegible] ان میں بھی مربیانہ شان پیدا کر دی تھی۔

ملال نے اپنی غزل کا پہلا شعر پڑھا

دل کو رونا تھا جستجو میں خسراب — پاس تھی یہاں تو منزل مقصود

فانی نے شعر دہراتے ہوئے دوسرا مصرعہ یوں پڑھا

پاس تھی ورنہ منزلِ مقصود

نوجوان شاعر نے خاموشی سے اصلاح قبول کر لی اور نہایت سعادت مندی کے ساتھ دوبارہ اصلاح شدہ شعر پڑھا (فروری میں یہ غزل اصلاح شدہ شعر کے ساتھ شائع ہوئی ہے)۔

پھر جذبی نے فانی کو ایک اور غزل سنائی ـــــ فروری کی پہلی غزل جس کا مقطع ہے

ضبطِ غم بے سبب نہیں جذبی

جو اس وقت تھا ـــ

ضبطِ غم بے سبب نہیں ہے ملال — خلشِ دل بڑھا رہا ہوں میں

فانی ایک دم سے اٹھ کر بیٹھ گئے۔ بہت داد دی۔ کہنے لگے

بہت سے طالب علم قسم کے شاعر آتے۔ آپ سے استدعا کروں گا ـــ اس خلش کو زندہ و تابندہ رکھئے:

[illegible] پھر چھپا دکھں اوسم ہے۔

[illegible] کے بعد [illegible] جب شاعری کا [illegible]
[illegible] شعر جذبی [illegible] دونوں [illegible]
[illegible] کے سامنے [illegible] شعر بھی شاعر تھے [illegible] دونوں [illegible]
[illegible] ایک [illegible] کی [illegible]

[illegible]

دونوں شاعری کی [illegible] زندگی کے [illegible]

ان دونوں کا ایک دلچسپ واقعہ ہے [illegible] صاحب ہوتے تھے [illegible]
[illegible] ایک دوست [illegible]

[illegible] ہے رات [illegible] ہے
[illegible] آپ [illegible] کیوں [illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible] جذبی [illegible] دونوں [illegible]
[illegible] YES [illegible]

CAN ALON [illegible]

[illegible] دونوں کو جدا جدا ہونا پڑا [illegible]
[illegible] کام بھی ہو گیا [illegible] جذبی [illegible] منتقل ہو گیا۔

یہاں بھی شاعری کا سلسلہ [illegible] جاری رہا۔ کتابیں خوب پڑھی جاتیں [illegible]
[illegible] کون پڑھے؟ نتیجہ ظاہر تھا۔ یہاں بھی [illegible]

جذبی پر اس کے بعد [illegible] وقت آیا [illegible] صاحب [illegible] لینے لگے
[illegible] شعر و شاعری میں تمہاری [illegible] اب چھوڑو [illegible] چپ چاپ پوسٹ آفس وغیرہ میں کام کرو۔

جذبی جب ساڑھے تین سال کے تھے [illegible] سوتیلی ماں کی [illegible] ان کے نوجوان دل کو [illegible]
ابا بھی ان کے مشورے سے متاثر تھے۔ [illegible] نے معاملہ اور بگاڑ دیا تھا [illegible] شروع ہو گئے تھے۔
جذبی کا کہنا ہے "غم عشق گیا [illegible] دونوں طرف سے ایک معصوم اور مبہم عشق [illegible] ۱۹۳۳ء میں
[illegible] کر پھٹ پڑا۔

"ایک شام جب ابا کی نظروں کے پھر جانے کا غم سینے پر ایک بوجھ بنا ہوا تھا۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل تیر رہے تھے ـــــ اگست یا ستمبر کا مہینہ تھا۔
تنہائی ذہنی کوفت کے عالم میں ایک مصرعہ ہو گیا

مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں جینے کی تمنا کون کرے

[illegible] میں غزل ہوگئی۔

اسی غزل نے صدمہ جذبی کو مشہور کیا اور اس کو ایک مقبولیت پسند شاعر کا خطاب دلوایا۔ حالانکہ بقول جذبی یہ غزل میں خاص طور سے [illegible] ہوئی کی بے ساختہ ترجمانی کرتی ہے۔

اس غزل کی اشاعت میں کوئی خاص [illegible] دو سال تک پڑی رہی۔ ۱۹۳۵ء [illegible] کو بھیجی گئی۔ جذبی نے وہی غزل ایجوکیشن میں شائع کی۔

اس غزل کا محرک شاعر کا یہ [illegible] ہوا کہ بیان کیا کہ ایک دن سوتیلی ماں سے سخت جھگڑا ہوا۔ اس جھگڑے نے اس حد تک دل شکستہ کیا کہ گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ [illegible] کے بھائی کے ساتھ حیدرآباد کی طرف چلے گئے۔ ٹرین میں ایک صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ وہ [illegible] ان سے معلوم ہوا کہ [illegible] فوج بھرتی ہو رہی ہے [illegible] زیادہ حصہ مسلمانوں کا ہے۔ جذبی نے ان سے ایک خط لیا اور اس طرح [illegible] آ دھمکے۔ وہاں مہینہ بھر خاک چھانتے رہے [illegible] پیشانی ہو گئی۔ [illegible] تھے۔ جتنے جو پیسے تھے کھانے پینے میں ختم ہوگئے۔ اسی زمانے میں جذبی کے [illegible] ساحل کنارہ ہوگیا تھا۔

سا [illegible] کی [illegible] اور [illegible] جذبی نے اپنے والد کو ایک خط لکھا [illegible] دکھوں۔ پھر [illegible] مصیبت کا دور شروع ہوا۔ تعلیم دہلی میں شروع ہوئی۔ حالات ناقابل برداشت تھے۔ [illegible] کرتے تھے۔ اس دوران میں زبردست علالت کا حملہ ہوا۔ اور اس زمانے میں [illegible] پھر [illegible] گیا۔ جذبی کا [illegible] ہوتا۔ یا تو ممتحن کو نصف نہیں آتا تھا یا [illegible] ناقابل تھا۔

چھ دہی [illegible] لیکن ۱۹۳۰ء میں آخر کامیابی نصیب ہوئی۔ [illegible] میں داخلہ لے لیا [illegible] سخت مخالفت کی اور پھر دہلی واپس آ گئے۔ وہاں [illegible] اور مجاز ریڈیو میں ملازم تھے۔ [illegible] ان کے ساتھ جذبی کا قیام [illegible] مصیبت وہاں بھی منتظر تھی۔ مجاز برطرف کر دئے گئے۔ دونوں کا قیام [illegible] دہلی [illegible] اس زمانے میں جوش بھی دہلی آ گئے تھے۔ وہ [illegible] مقیم تھے اور کلیم [illegible] نکال رہے تھے۔ اس زمانے میں شعر و شاعری کے جنون کے [illegible] ان میں وہ خواہشیں [illegible] کرتا تھا۔ اور اس سے جو وقت بچتا وہ جوش کی صحبتوں میں گزرتا۔

ان ہی دنوں رات کے اندھیرے میں قسمت کا ستارہ نکلا۔ [illegible] میں ایک جگہ [illegible] یہ جگہ ریفریجریٹ میں تھی۔ تین چار مہینے [illegible] گیا۔ پھر وہاں سے بھی [illegible] اور [illegible] ۱۹۴۰ء میں بھوپال پہنچے۔ [illegible] اسکول میں جگہ ملی۔ اس اسکول کا نام ماڈل ہائی اسکول تھا۔ جذبی نے [illegible] کر یہاں دس مہینے تک کام کیا لیکن تنخواہ کا مسئلہ طے نہ ہو سکا۔ یعنی یہی طے نہ ہو سکا کہ تنخواہ ملے گی یا نہیں۔

آخر جی چھوٹ گیا اور یہ شاعر آوارہ لکھنؤ پہنچ گیا۔ وہاں سردار جعفری، سبط حسن وغیرہ نیا ادب نکال رہے تھے۔ اس عالم میں سب ہی تھے۔ سب کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ سردار اور سبط حسن ساتھ رہتے تھے۔ ۱۹۴۱ء تک جذبی [illegible] رہے۔ افلاس اور تنگ دستی کا آفتاب سوا نیزے پر آ گیا تھا۔ یکایک اسکول میں دس مہینے بعد تنخواہ کا مسئلہ حل ہو گیا۔ دس مہینے کی تنخواہ شاعر کی مٹھی میں تھی۔ چھ سو روپے پا کر شاعر کو اتنی خوشی ہوئی کہ بیمار پڑ گیا۔ دو سو تو کھٹ کھاٹ ڈاکٹروں کی نذر ہو گئے۔ باقی چار سو روپے لے کر موصوف علی گڑھ وارد ہوئے۔ اس وقت ایم۔ اے کرنے کی دھن سوار ہوگئی۔ اس زمانے میں ترقی پسندی کی تحریک ابھر رہی تھی۔ اور جذبی کو بھی اس تحریک کا ایک مبہم تصور تھا۔ ترقی پسندی کا معیار جب جوش کی نظمیں تھیں۔ اور اس وقت تک ترقی پسندی کی بنیاد ڈالنے والوں نے وضاحت بھی نہیں کی تھی۔

جذبی نے بھوپال کے دوران قیام میں نصرت ایک مفلس کی نظر میں لکھی تھی۔ اس کے بعد ۱۹۳۸ء میں ایک اور نظم [illegible] لکھی۔

[illegible]

[illegible] آنے کے بعد جذبی کی صحت کافی خراب ہو گئی تھی [illegible] بیٹھے گو تیا [illegible] ایک ایسا حلقہ جو سیاست اور ادب [illegible]
[illegible] تھا [illegible] کرنے کے لئے بے تاب تھا [illegible] ملنے کی تھی باتیں بہت ہوا کی تھیں [illegible] اور جو گو ہو آف میٹ
[illegible] ذاتی تھیں [illegible] سیاست [illegible] ہوتی [illegible] کی مشکل [illegible]
[illegible] وغیرہ تھے [illegible] ہوا [illegible] کی صحبت [illegible]
[illegible] ذاتی [illegible]
[illegible] خیال کا ثبوت [illegible] ہے [illegible]
[illegible]

[illegible] دنیا کو بیگانہ [illegible]

[illegible] ایک [illegible] [illegible] تھا [illegible]
[illegible] تو جیسا کر [illegible] رومانی [illegible]
[illegible] زندگی [illegible] کا [illegible]
[illegible] [illegible] جاسے [illegible] شعلہ سے
لعل سے ٹپکے ہوئے شعلہ [illegible] خون دل [illegible] کو سب [illegible] کی [illegible]
طرح [illegible] ہے ہیں۔

[illegible] کی داستان [illegible] ہندوستان [illegible] محبت کی [illegible] ہے [illegible]
[illegible] جذباتی تجربے کی خوبصورت یادگار ہے [illegible] کے [illegible] ہے۔
[illegible] سے طبیعت اچاٹ ہو چکی تھی [illegible] آ گئے [illegible]
[illegible] شاب پر تھی [illegible] [illegible] چند ناقد [illegible]
[illegible] ہو ملے [illegible] تھا [illegible] سب [illegible] زندگی کی [illegible]
[illegible] دلچسپ گزرے۔

لیکن اس نئی ملازمت کے کر لو [illegible] بعد جلد ہی جذبی کو محسوس ہوا کہ [illegible] : [illegible]
آبادی [illegible] ایک ایرانی الفضل [illegible] تھا۔ حکومت کا خاص [illegible] انگریزی حکومت کا وفادار تھا [illegible]
[illegible] رجحانات اور میلانات کا احساس ہو تو قدم قدم پر روڑے اٹکانے لگا۔ ایک بار [illegible] ہندوستانی انگریز

جناب یہ تو سوویت رنگ ہے:

[illegible] انگریز پروڈکشن کا انچارج تھا اس نے بھی یہی بات کہی [illegible] کے بعد ایک [illegible]
[illegible] جس میں کہا گیا تھا کہ [illegible] زندگی بسر کر رہے ہیں۔ جذبی نے اس کے ترجمے سے انکار کر دیا [illegible]
[illegible] معاملہ بگڑتا گیا۔ جذبی نے [illegible] تنگ آ کر اور اکتا کر تین مہینے کی چھٹی لے لی اور بمبئی چل دیئے۔ وہاں [illegible] اور جعفری کے
[illegible] جذبی کو یہ خیال تھا کہ وہاں فلم کمپنی وغیرہ میں [illegible] ۔ [illegible] وغیرہ نے بڑی ہمت بندھائی [illegible] ہندوستان میں

لکھی جا رہی تھی جو جذبی کی ایک مشہور نظم ہوئی۔

ڈاکٹر ذاکر حسین سے انٹرویو تھا۔ انھوں نے پوچھا: کیا آپ نباہ کر سکیں گے یا نہیں؟

جناب کیوں نہیں کر سکیں گے؟ جواب حاضر تھا۔

جی، ہم چند دن تو رہے یہاں لیکن نہیں جی سکے۔

اس کے بعد جذبی کو وحشت سی رہنے لگی۔ محسوس ہوتا تھا کہ کوئی بات ضرور ہے۔ جذبی کو بھی کا سا جکڑا ہوا ہے۔ شور و غل اور ہنگامہ کھائے جا رہا تھا۔ تنہائی میسر نہیں آتی تھی۔ اسی وحشت کے زمانے میں رشید احمد صدیقی سے ملاقات ہوئی۔ ان سے جذبی نے یہ بیان کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ انھوں نے بلا لیا۔ وہاں سے جذبی سیدھے علی گڑھ آ گئے۔ مستقل طور پر علی گڑھ میں کام کرنے لگے۔ اتفاق سے موقع مل گیا۔ یونیورسٹی میں ملازمت مل گئی۔ تب سے آج تک جذبی اسی علی گڑھ میں زندگی گزار رہے ہیں جس کے بارے میں ایک بار انھوں نے مجھ سے کہا تھا

"یہ ایک کنواں ہے جہاں ہم مینڈکوں کی طرح ایک محدود دائرے میں چکر لگاتے رہتے ہیں۔ جب کوئی مینڈک باہر سے آکر اس میں ٹپک جاتا ہے تو دیر تک کنویں میں کافی چہل پہل ہو جاتی ہے"

یہ بات انھوں نے میرے علی گڑھ آنے پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہی تھی۔

زندگی کا یہ پیچ در پیچ سلسلہ جذبی کو یہاں تک لے آیا۔ جذبی اور ان کو جاننے والے یہ جانتے ہیں کہ ایک شاعر کی زندگی کا مسئلہ یہاں ختم نہیں ہو جاتا۔ صحیح ہے کہ وہ آج بھی یونیورسٹی میں ایک لیکچرر کی حیثیت سے ایک خاموش زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کا اپنا ایک چھوٹا سا گھر ہے جس کے گرد کیاریوں سے سبزی ترکاری۔ وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ ایک اچھے دوست، اچھے شوہر اور شفیق باپ کی زندگی خاموشی سے گزار رہے ہیں۔

صبح آٹھ بجے سے یونیورسٹی کی پڑھائی شروع ہوتی ہے اور اسی وقت سے ان کے فرائض کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یونیورسٹی سے واپس آکر پھر وہی بچے، وہی گھر اور وہی گھریلو تقاضے۔ اس چھوٹے سے گھر میں ایک چھوٹا سا صحن باہر ہے یعنی اس شاعر کا گھر ایسا ہے۔ یہاں جب آپ پہنچیں گے تو ایک ترتیب اور بے ترتیبی سی نظر آئے گی۔ ایک کے آگے ایک کرسی، ایک اس کے آگے ایک معمولی سی میز اور اس میز پر کچھ کتابیں، کبھی چائے کا سامان اور کبھی سگار کا بکس نظر آئے گا۔

میں جب کبھی اچانک جذبی کے یہاں بے تکلف داخل ہوا ہوں تو میں نے اکثر ان کو تنہا پایا ہے۔ وہ میزوں اور کرسیوں سے پرے ایک گوشے میں چارپائی پر دراز یا بیٹھے ہوئے۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں کمرے میں گھس پڑا ہوں اور اس کے بعد شاعر کو میرے آنے کا علم ہوا ہے۔ جی تھی ایسا بھی ہوا۔ ابھی میں باہر ہی ہوں اور ابھی اس کا یقین بھی نہیں ہوا ہے کہ حضرت گھر پر موجود ہیں یا نہیں کہ ان سے نکل چکا ہے کہ تحسین و آفرین کے سے بیسیوں خیر مقدم کے نعرے گونجنے لگے۔

میری عمر اور جذبی کی عمر میں ایک پوری ادبی نسل کا فرق ہے۔ لیکن جذبی نے ایک لمحے کے لئے بھی اپنی عمر کی برتری کا سہارا نہیں لیا۔ اور بعض مباحث ایسے بھی آئے جب میں نے تلخ باتیں کہیں اور سختی سے کہیں۔ لیکن جذبی کے انداز گفتگو اور دوستانہ لب و لہجہ اور برتاؤ میں فرق پیدا نہیں ہوا۔ میں جانتا ہوں اور جذبی بھی جانتے ہیں کہ ان کے بعض کٹر تصورات کو میں ان کے محدود جبر داخلی رد عمل کا نتیجہ سمجھتا ہوں۔

جذبی میں بڑی زندگی ہے۔ مجھے ان سے مل کر کبھی تھکن، اکتاہٹ اور بوریت کا احساس نہیں ہوا۔ میں جب بھی ان سے ملا ہوں، مجھے محسوس ہوا کہ میں ایک مخلص اور ہمدرد دوست سے بات کر رہا ہوں۔ جب اختلاف کی بات ہوتی ہے اصولی ہوتی ہے۔ اور ہم دونوں نے کبھی بھی ایک دوسرے کو حلقہ بگوش اسلام کرنے والی ہٹ دھرمی سے کام نہیں لیا ہے۔ میں نے ان میں وہ لچک بھی محسوس کی ہے جو ایک سنجیدہ اور منطقی گفتگو کو کسی نتیجے تک پہنچانے کے لئے ضروری ہے۔

جذبی کے متعلق یونیورسٹی میں، یونیورسٹی سے باہر علی گڑھ میں اور علی گڑھ سے باہر آپ کو مختلف رائیں سننے کا اتفاق ہوگا۔

جذبی [illegible]؟

جذبی [illegible] ؟

جذبی [illegible]؟

جذبی [illegible]؟

جذبی [illegible] محبت ختم کر دیتے۔

جذبی [illegible] سیدھا کر۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ذاتی زندگی اور شاعری کا اتنا رچا ہوا اور خوبصورت آہنگ بہت کم فنکاروں میں دکھائی دیتا ہے۔

اس وقت جبکہ جذبی کے فن پر ایک سرسری نظر ڈال رہا ہوں تو میں ایسا محسوس کر رہا ہوں کہ میں بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں جو میں نہ کہہ سکوں گا۔

وہ شام بھی مجھے یاد ہے۔ زیادہ دن نہیں بیتے۔۔ سردیوں کا زمانہ تھا۔ میں اچانک علیگڑھ پہنچ گیا تھا۔ باہر [illegible] سنہری چاندنی پھیلی تھی۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے اور ہم مسلسل زندگی کے مختلف مسائل پر بات کر رہے تھے۔ جذبی بہت جذباتی ہو گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ [illegible] دوستی منزل سے آگے بڑھ کر رفاقت کا درجہ حاصل نہیں کرتا، وہ درجہ حاصل کرنے کے لئے مشکل پسند [illegible] خلوص کی ضرورت ہے۔ اس وقت جذبی کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں [illegible] تازہ ہو گئے تھے [illegible] زندگی کے مختلف تجربوں [illegible] شکست [illegible] [illegible]

"وہ مجھ سے محبت کرتی ہے [illegible] چاہتی ہے کہ میں اس سے محبت کروں۔ [illegible] زندگی کی کشمکش میں [illegible]

[illegible] دنیا کمزوروں سے بھری ہوئی ہے۔"

اسی وقت ان کی [illegible] شاید اس کے [illegible] بال ان کی آنکھوں پر آ گئے [illegible] آنکھوں کو [illegible] دیکھو [illegible] وفا نہیں رہے گی۔"

اس ایک جملے [illegible] زندگی کے [illegible]

چند احباب کا تجزیہ ہے کہ جذبی کی شاعری ان کا ذاتی تجربہ ہے کہ ان کی ہر بات ... جذبی کی شاعری ان کی زندگی ... ہے جس میں ... کے ساتھ ... اور
محرومیت کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ یعنی یہ اداسی یہ یاسیت یہ شکست خوردگی ان کی پوری شاعری اور ان کی پوری زندگی پر چھائی ہے۔
جذبی کی اپنی موجودہ زندگی میں موجودہ سماجی نظام کی سفاکیوں سے جو تلخیاں آئیں ان کا سامنا کرتا ہے یہ نہیں کہ شکست تسلیم کرتا ہے ... دوسرے ... پیچھے
پسپائی سے بچنے کی اس فضا میں وہ ایک تماشائی کی طرح کھڑے ہو کر دیکھتے ہیں بلکہ اس سے بیزار ہیں جب اس فضا میں زہر بہت بھر جاتا ہے تو وہ پکار اٹھتے ہیں
یہ انقلاب آئی ہوئی ہے تو ... یہ زندگی تب ہو گی ... انتظار کب تک؟
جذبی اپنا جعفری کی شاعری سے شناسا ہیں۔ وہ کہتے ہیں وہ شاعر جنہوں نے ہوش سے ناتا جوڑا ... جس کا نام ... ہونا ہے ... اپنی ذاتی زندگی میں ... بھی
سے ... شاعر ... ہیں۔ اور اگر وہ ... ہیں تو ... سردار جعفری نہیں۔
کیونکہ ... سب دوستوں کو ... کریں گے ... شدت اور تیغ ... کہیں گے ... جذبی ... سے ... کے اختلافات جتنے بھی ہوں ... برداشت کر
ہی ہے ... انسانیت ... مجھے ... سے ... کسی ... ہیں ... اگر آج ضرورت پڑے تو ... ہی سب سے زیادہ تڑپے گا۔
جب بھی غم روزگار ... دوستی، انسانیت، فرض، عمل اور ... کا ذکر آتا ہے جذبی ... اور ... انسانی ... کا اعلان کیا جاتا ہے ... پاؤں کے
... تصور ... ہیں۔
جذبی سے ملنے ... کسی ... ہے کہ وہ ایک ... آدمی ہیں لیکن ... ماں کا ذکر ... جذبی ... ہیں ... کے سلسلے میں ... گیا
... گیا تھا ... حد تک ... جذبی ... ساتھ ... ہے ... دوستوں ... سے ... کے ... بھی ... نہیں ...
... دوستوں سے ... بالکل دوستوں سے ... ہیں ... اور ... سب کچھ کیا جو وہ کر سکتے تھے۔
کبھی کبھی جذبی پر ایک غیر منطقی ... کا دورہ پڑتا ہے اور وہ ... کو ... رہتے ہیں لیکن یہ محض ... جذباتی کیفیت ہوتی ہے۔
اس جذبی کو ... کہ ... یہ ... میں ... سے ... کی ... ہوتی ہے یا زندگی کی ... دوسرے تجربوں کے متعلق۔
ایک رات ... گیارہ بجے جذبی پر ... میں جانے کا دورہ پڑا ... ان کو ... تھا اس ... بہت ... تھے ... جگر مراد آبادی کے ساتھ نمائش میں گئے
علی گڑھ کی نمائش وہاں کی زندگی میں بڑا اہم ... ادا کرتی ہے۔ رات کافی ... چکی تھی لیکن وہاں کافی ... تھی ... ہر ... پر ... جگر مراد آبادی
جذبی کے نام پر ... لوگوں کو اپنی طرف کھینچ رہے تھے ... ہوں جہاں اس وقت ملک کے دو مشہور شاعر جگر مراد آبادی اور جذبی موجود تھے ... کباب ...
کے ... ہو رہی تھی ... شاعر ... رات ... نمائش ... ایک بجے ... ۔
گھر پہنچ کر بھی دو گھنٹے تک گپ ہوتی رہی ... اس پر بہت خوش تھے ... جگر مراد آبادی سے ... ۔ اب سب ... گئے تھے
جذبی پر ایسے لمحات کم ہی آتے ہیں ورنہ وہ ایک خاموش انسان کی طرح اپنے روزانہ کے معمول کے مطابق فرائض ادا کرتے ہیں ... کہیں ...
ہیں ... گھر میں ... کر کھاتے ہیں ... کتابیں پڑھتے ہیں ... ۔۔۔ ... چارپائی پر بیٹھ جاتے ہیں ... پیتے ہیں
سگار ... تو سگریٹ پیتے ہیں اور سگریٹ سے ... ہیں تو حقہ گڑگڑاتے ہیں ... کمرے کو دھوئیں سے بھر دیتے ہیں۔۔۔ اس دھوئیں میں ... خاموش ...
ملی ہوتا ہے اور تشنگی بھی ... تشنگی خود اپنی زندگی کی ہوتی ہے۔ اور وہ ... زندگی کی ... جس کی پشت ماضی کی طرف ہے اور نظر ... مستقبل کی طرف۔

ابھی ہم دم سے ... کہاں ... ہے ... ابھی تو معرکہ ہائے چمن کچھ اور بھی ہیں۔

جذبی کو راکھ کا ڈھیر سمجھنے والوں سے صرف اتنا عرض کروں گا کہ راکھ کے ڈھیر کو نظر انداز کر کے آگے بڑھ جانے سے پہلے ایک ذرا رک کے اور اس ڈھیر کو کرید کر
دیکھئے ۔۔۔ کون جانے اس کے اندر چنگاریاں دبی ہوئی ہوں جو اگر ہوا لگ جائے تو جنگل کی آگ بن جائیں۔

شکیلہ اختر

صوفیہ فضل

بے حد گھنگھریالے سیاہ بال اور سبز رنگ والی آپا کو ہم نے ہوش سنبھالتے ہی دیکھا۔ تب بھی ان کی طبیعت نہ اُٹھتی تو بس ڈرتے ہی ڈرتے۔ سنا ہے کہ آپا کے آنے سے پہلے دو بھائی پیدا ہوتے ہی چھوڑ کے اس دنیا سے جا چکے تھے اب آپا جو آئیں تو ایک تو لاڈلی اس پر سے پیاری۔ اسی لئے والدین ڈرتے رہتے۔ بچے آپا بس آپا ہی بن بیٹھیں۔

پڑھیں باغ میں کچے پکے آم اور امرود کھاتے کھاتے بیمار پڑ کر جب میں اچھی ہوئی تو آپا نے مجھ کو بڑا کرنے کے لئے یسرنا القرآن پڑھانا شروع کیا۔ جہاں تک نقطوں کی بات تھی ایک دو تین تک کی گنتی میں سنا دیا کرتی مگر کرشمے بڑے اور چھوٹے ہوئے الفاظ جیسی حرف بھی میرے پلے نہ پڑتے تھے اور آپا کو ساتھ ہی ساتھ یہ دھن بھی لگی رہتی تھی کہ ایک ہی دفعہ ساری کی ساری کتاب وہ مجھے ختم ہی کرا دیں۔ جانے یسرنا القرآن کو کس کمبخت نے کیسی اشتعال کی یہ مٹی جیسی کیا کوئی اور دوا اور پھر ہر ایک کو ہی سبب آتا تھا ابھی ابھی دل و دماغ کو سنبھال کر عربی پڑھ رہی تھی کہ بیچ میں صاحب کی برکت ہے جیسے تیسے اس بلا سے ابھی نجات ملی ہی تھی کہ ایک اور مصیبت زبان "کتاب شد" کی سر پر سوار۔ ابھی عربی، اردو اور فارسی کی کشمکش میں دماغ خراب ہی ہو رہا تھا کہ ادھر سر اور پیٹھ پر آپا کے دھموکے پڑنے شروع ہو گئے۔ ہاتھ سے مارتے مارتے جب ان کا دل نہ بھرا تو ایک دن کھینچ کھینچ مارتے مارتے آپا نے اونچی کرسی والے برآمدے سے مجھے نیچے دھکا دے دیا۔ —— پھر تو بس اسی دن سے ہمارے نصیب ہی کھل گئے۔ اماں جان نے صاف طور پر کہہ دیا کہ ایسی پڑھائی سے باز رہو جس سے میری بچی کی جان ہی چلی جائے۔ —— شام تک جب آپا کا غصہ اتر گیا تب انہوں نے بھی یہ مان لیا کہ یہ کتاب ہے ہی فضول۔ آخر آپا نے کھیلتے ہی کھیلتے نو سال کی عمر میں اپنی ساری پڑھائی کیسے ختم کر دی تھی؟ پھر اس دن سے کبھی آپا نے کسی کو پڑھانے کی ہمت نہیں کی۔ اب بھی کسی کسی بچے کی پڑھائی پر بس ہلکی سی نظر ڈال لیتی ہیں۔

شاید آپا کے مزاج میں سب سے پہلی چڑچڑاہٹ ان کے گھنگھریالے بالوں نے ہی پیدا کی ہوگی جو ان کو بے حد ناپسند ہیں اور ان کے بعد دائمی انیمیا کی بیماری نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ ہم سارے بھائی بہنوں میں آپا سب سے زیادہ خلیق، ملنسار، ہنس مکھ اور ٹوٹ کر محبت کرنے والی ہیں مگر کبھی اچانک ایسے ہی ہنستے بولتے آپا کو طوفانی غصہ آ جاتا ہے جیسے پہاڑی علاقوں میں ایک دم بادل اُمڈتے ہیں اور بجلیاں چمکتی ہیں اور پھر

زور کی بارش ہو کر رک جائے تو دھلا ہوا آسمان جیسا نکھرا لگتا ہے بالکل اسی طرح سے وہ بھی ابھی غصے سے بپھری ہوئی تھیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کے ہونٹوں پر پیاری پیاری مسکراہٹ سے چمک سی ہے اور ہم حیرت سے یہ سوچتے رہ جاتے ہیں کہ آپا کا غصہ نقلی تھا یا ان کی یہ مسکراہٹ نقلی ہے۔ کبھی یوں ہوتا ہے کہ اداس اور افسردہ ہیں اور آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی ہیں لیکن اسی وقت اگر کوئی ان سے ملنے کے لئے آجائے تو آپ ان کی بھیگی ہوئی آنکھوں میں ہنسی کی طرح ایک خوبصورت سی مسکراہٹ تیرتی نظر آئے گی اور ان کی آواز میں وہی رنج و غم کا ایک سایہ تک نظر نہ آئے گا۔ وہ ایک ہی حالت میں کسی ہنسی خوشی کی باتیں کرتی ہیں اور دل کھول کر ہنستی ہیں۔

خاندان، گھر یا باہر جیسی بھی محفل ہو آپا، چھا کر رہ جائیں گی۔ حیثیت سے تشبیہ دیہاتی ماحول سے لے کر شہر کی اعلیٰ ترین سوسائٹی تک میں آپا کی قدر، محبت اور عزت یکساں طور پر ہوتی ہے۔ ابھی ابھی آپا اگر ایک دیہاتی کنبے جھونپڑے میں بڑے خلوص کے ساتھ دلچسپ باتوں میں مگن ہیں تو شام کو بہترین ڈرائنگ روم میں نفیس صوفے پر اسی دلچسپی کے ساتھ مزے دار باتوں میں لگی نظر آئیں گی۔ ان کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ بعض دفعہ گھر میں قدم رکھتے ہی گیٹ پر موٹروں کی قطار سے اور ڈرائنگ روم میں سے بڑی بے تکلف اور چہکتی ہوئی آوازیں آ رہی ہیں پھر اچانک دوسرے کمرے میں سے آپا کی آواز آنے لگتی ہے۔ فرق بس اتنا ہی ہوتا ہے کہ آواز کی رفتار اور لہجے میں وہ پہلی سی روانی نہیں رہتی۔ دوسرے کمرے میں کئی عمر رسیدہ خواتین چوکی کے فرش پر بڑے سلیقے سے بیٹھی ہوئی ہیں، چہرے پر سنجیدگی چھائی ہے، برابر کے لوگ بھی اور خاص طور پر آپا بڑی سنبھل سنبھل کر باتیں کر رہی ہیں۔ ٹھیک اسی وقت کچھ لوگ دروازے پر آپا سے کچھ ضروری سی باتیں کرنے کو منتظر ہو جاتے ہیں اور یہ سب کے سب جانتے ہیں کہ آپا کی اخلاق میں ڈوبی ہوئی میٹھی سی آواز ان کی ہر طرح کی امداد کا یقین دلانے والی ہے۔ ڈرائنگ روم اور دوسرے کمرے کے مہمان دوستوں کی تواضع کا خیال کر کے جب آپا دروازے سے باہر برآمدے کے پاس سے گزرتی ہیں تو چند ضرورت مند عورتیں انہیں اپنی دکھیا کہانی سنانے لگتی ہیں اور آپا کبھی ہسپتال اور کبھی کسی کے نام خط لکھ کر ان کو دینے لگتی ہیں یا سپرد کرتے ہیں کرایے کے ساتھ گھر میں اپنی موجود رشتہ داروں سے چندہ کرا کے دو چار روپے فوری طور پر بیٹھنے والیوں اور اداس دکھیاروں میں اگر وقت بچا تو ڈرائنگ روم کے مہمان بیچاریاں پیڈ پر کمرے کا پاپا مل بیٹھنے لگتی ہیں اور دوسرے کمرے کے قدر نشینی ساری کا سیدھا آنچل اوڑھے بیٹھے لوگوں میں یہ دو قسم کی مسترات حیران نگاہوں سے آپا کو ڈھونڈ رہی ہوتی ہیں۔

آپا کی مقبولیت کی کوئی انتہا نہیں۔ ان کو گھر صاف رکھنے کا جنون ہے اور اپنے مہمانوں کے ساتھ اخلاق برتنے کے ساتھ ان کو قسم قسم کی چیزیں کھلانے کی ان پر دھن سوار رہتی ہے۔ اکثر آپا کا گھر مہمانوں کی کثرت سے ایک چڑیا خانہ نظر آتا ہے۔ کئی کئی دور کھانے کھلائے جاتے ہیں اور سب دیکھ کر اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ آپا اپنے گھر کو ربڑ کی طرح کھینچ کر نہ جانے کیسے بڑا کر لیتی ہیں اور سارے مہمان جن کی تعداد کبھی کبھی ۵۰ سے بھی اوپر ہو جاتی ہیں رات کو اپنے اپنے بستروں پر سوتے نظر آتے ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آئے گئے لوگوں سے ان کا گھر خالی رہا ہو۔ اس گھر کی حالت بالکل ویٹنگ روم جیسی ہے۔ ایک بستر ابھی بند ہو رہا ہے کہ گیٹ پر موٹر یا رکشہ رکی اور کئی بستر اور بکس اندر آ گئے۔ پٹنہ بہار کا مرکز ہے سبھی کو یہاں کی ضرورت لگی رہتی ہے۔ پھر بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو بڑے اطمینان سے کہہ دیتے ہیں کہ "ان کا خرچ ہی کیا ہے؟ نہ بال نہ بچہ دو میاں بیوی اور دو چار نوکر چاکر ہیں" جبکہ صاحب مستقل طور پر ان کے ساتھ رہ کر پڑھنے والے بچوں ہی کی تعداد آٹھ آٹھ ہے۔ اس پر سے ادل بدل اور چلا گیا، کبھی ددھیال اور ننھیال کے رشتہ داروں کا تانتا لگا رہتا۔ پھر بھی گھر اکیلا کا اکیلا ہی ہے وہی مہمان داری کے باوجود آپا بیچاری نے بھرے گھر میں ہر ایک سے رکھا ہے اور ان کا بکس ایک غریب کی کٹیا کی طرح ہمیشہ سے خالی کا خالی ہی رہا۔ یہاں تک کہ پہلی بار کپڑے اور لحاف تک کے پیسے اسی چکر میں چلے جاتے ہیں۔ آپا کو ریڈیو کے مضمون اور دو کتابوں اور افسانوں کے جتنے بھی روپے ملتے ہیں وہ سب کے سب بڑے اطمینان سے بجٹ کے بنے ہوئے ہفتوں کی بیلنس چڑھ جاتے ہیں اور اس پر بھی آپا ۲۰ تاریخ کے بعد گھبرائی گھبرائی سی رہتی ہیں۔

تمام دادی آپا کی فطرت کا ایک [illegible] رہا آپا بھر اپنی زندگی کے اس کی خدمت کے لئے وقف ہو جائیں گی، بھلتی وہ

مسائل ہیں۔ ملازموں کی ... تنخواہیں ... ہر مہینے ... بہت سنبھال کر ... جانا چاہا ہو تب ... سنبھالا سامنا ... ہو کر دہی ہے
پورا ... اس ... ان کی پریشانی کا پریشان ہوتا ہے۔

آپا کے دل میں ... کے بارے میں ... سے قطعی ... ہے ... جو اپنے گھر پر تعلقات ہیں سارے ...
سے پہلے ... بڑی ... اور شادی کے پہلے ... کی گزرتے ... ہم ... کے ...
... انہی کی ... کوشش سے ... ایک ... گھر ... ہماری بیویوں کے پاس ... صبح ... میں آپا ...
... کے ... ایک ... کوئی ... کی محبت ہوئی ... محبت ... ہے گھر آپا ایک ...
... محبت ... ایک ... جس کے ... میں جیسی چیزیں لگی ہیں جس کا ... ہے ... ابھی تک ...
... اپنی غیر معمولی محبت ... وقت تک ... جب تک کہ ... ایک ...
دوڑیں ہیں ... کوئی ... پیار ... محبت بھری خدمت ... سکون ... ہے ... ہمیشہ ...
... جہاں وہ ... کی کوششوں کی ... وہاں دو سال ... جب آپا کے پیٹ کا ... پریشان ... تھا آپ چند ہی دنوں کے بعد
... کے ... کرتے ہیں ... کا اچھا خاصا ... اپنے سارے خاندان کے ساتھ آیا ... کی سانس اکثر ...
کے ... سے ... والی آپا بیٹ میں ... پہنچ کر ... دیوار کو ... بچی ہوئی ... ہی ... گئیں
... ساری بات انہوں نے ... کی ... میں ... کر ... ۔

آپا کی طبیعت میں بے حد سادگی ہے۔ ... کی بڑی مجلس ہو جہاں ... آتی ہیں ... اپنے ... کی ... ہر ... ہے وہ ...
... ہوئے کپڑوں میں شریک ہوتی ہیں۔ کسی کی امارت کبھی بھی انہیں مرعوب نہیں کر سکتی ہے اور ... کے ... کو ...
اہمیت دیتی ہیں۔

جس طرح انجمن ترقی اردو کی میٹنگوں میں ان کی شرکت ضروری سمجھی جاتی ہے ویسے ہی ... میں بھی۔ جہاں ... کو ایک بہت ہی ...
... چندہ جمع کرنا اور ... کے مختلف کاموں کی ذمہ داری انہی پر ہوتی ہے وہاں خاندان کے ... رشتے کی تلاش اور شادی کا انتظام بھی ان کے بغیر
نہیں ہو سکتا ہے۔ آپا کے ہاتھوں کے پکے ہوئے باقر خانی اور مرغ مسلم ... اچار ... مربّہ تک بہترین سمجھے جاتے ہیں۔ اسی طرح ...
... گھر میں ... کشنگ ... آپا ہی ... کے ... اور ... چیزوں کے ... انہی کے ذریعے ہم لوگوں تک پہنچتے ہیں۔
... کاموں میں ... سے جلتے ہیں آپا بڑے سکون سے ان کاموں میں لگی رہتی ہیں یہاں تک کہ ... کے ... میں ... کبھی ... کبھی ...
... اور ... بنا کر انہیں دیتی رہتی ہیں۔

آپا کے دل میں محبت اور خدمت کا ایک اتھاہ سمندر چھپا ہوا ہے۔ مگر ان کی طبیعت میں ... چڑچڑاہٹ اور ضد کے ساتھ ...
ہی۔ خاندان بھر میں ان کی جیسی بے لوث محبت اور اخلاص برتنے والی شخصیت نہیں ہے۔ لیکن وہ بے حد جذباتی ہیں اور بات بات پر ان کے آنسو
... پڑتے ہیں۔ ساری مجلسوں میں جہاں لوگ ان کو ... سمجھتے ہیں اور ان کی ہنسنے ہنسانے والی پر لطف اور خلوص بھری باتوں میں ان کی طرف کھنچتے چلے
آتے ہیں وہاں قہقہے پر قہقہے لگانے والی آپا گھر کے اندر پل بھر میں غصے سے ... اٹھتی ہیں۔ گھر کے سارے ملازمین اور بچوں کے لئے بس اتنا ہی کہہ دینا
کافی ہوتا ہے کہ وہ آپا آ رہی ہیں۔ مگر اتنے رعب اور ادب کے بعد بھی سارے لوگ ان پر جان دیتے ہیں۔

ادب اور شاعری سے آپا کو بہت ہی بچپنے سے لگاؤ رہا ہے۔ اماں جان اور ابا جان دونوں کو ادب سے گہری دلچسپی رہی تھی اسی لئے آپا نے ہوش
سنبھالتے ہی ... تخیل، ... ہمایوں، جہانگیر، عصمت اور تہذیب ... دیکھا سب [illegible] ... اسی وقت انہوں نے پہلی بار شعر

کہ انھیں بچپن ہی سے کتابوں کے مطالعہ کا شوق تھا۔ بہت سی چھوٹی باتیں کہ بہت زیادہ محسوس کیا کرتی تھیں۔ آپا کی تعلیم بہت ہی معمولی ہوئی تھی لیکن انھوں نے اپنے شوق اور کوشش سے اپنے مطالعہ کو بہت وسیع کر لیا ہے اور اب وہ دنیا کے بہت سے موضوعات کا علم رکھتی ہیں۔ بیشتر وقت سے وہ دنیا بھر کی تاریخ اور جغرافیہ اور ایسے ہی بہت کار آمد کتابیں پڑھتی رہتی ہیں لیکن ان کو اسلامی ہسٹری پڑھنے کا بہت ہی شوق ہے اور جب پڑھتے پڑھتے ان کو کوئی اچھی چیز مل جاتی ہے تو پھر وہ سیدھی ہم لوگوں کے پاس چلی آتی ہیں اور پھر گھنٹوں انہی باتوں پر تبصرہ ہوتا ہے۔ آپا کو پڑھنے کی لت اس حد تک لگی ہوئی ہے کہ ناشتہ کھانے کے وقت بھی کوئی کتاب ان کے ہاتھ میں رہے گی۔

آپا کا سب سے پہلا افسانہ "رحمت فرشتہ" کے نام سے "ادب لطیف" میں چھپا تھا اور اس کو بہت پسند کیا گیا تھا۔ اسی کے بعد سے آپ نے خود بخود افسانہ نگاری شروع کر دی تھی۔

اب تک ان کے جتنے بھی افسانے چھپتے رہے ہیں وہ سارے کردار ان کی آنکھوں کے سامنے سے گزر چکے ہیں۔ ایک آدھ افسانہ بھی ایسا نہیں جو بات سوچ کر لکھا گیا ہو تو اس طرح کہ نہ قلم ہی چلتا ہے اور نہ کہانی تحریر ہوتی ہے۔ "دیپ" "آنکھ مچولی" اور "مقدر" ان کے تین مجموعے چھپ کر نکل چکے ہیں اور ان افسانوں کے کیریکٹر جیتے جاگتے اور چلتے پھرتے انسان ہیں۔ آپا کے دو افسانے "مظلوم" اور "موسیٰ" میں اتنی زندگی [illegible] گئی ہے کہ ان افسانوں کے چھپنے کے بعد "مظلوم" والی بڑھیا جن جن گھروں میں جاتی گئی لوگ وہیں سے اس کو دیکھ کر پہچان گئے کہ یہ "مظلوم" والی بڑھیا ہے اور اسی طرح سے ہسپتال میں کیبن کی جمعدارنی رہی۔ ایک ایک نشان افسانے میں اس قدر نمایاں ہے کہ اس کو دیکھنے سے بے اختیار موسیٰ کو یاد کرنے لگے اور آج مرنے کے بعد بھی موسیٰ ہمیں زندہ نظر آتی ہے۔

آپا کی افسانہ نگاری کی عجیب عجیب خصوصیتیں ہیں۔ ٹھیک بہن عصمت چغتائی کی طرح کبھی مسہری یا پلنگ پر پیٹ لیٹی ہوئی وہ تکیے کے سہارے لکھتی چلی جاتی ہیں۔ ایک افسانہ ختم ہوا دوسرا شروع ہوا تیسرے کی باری آئی۔ شور ہو رہا ہے، شادی کے ہنگامے ہیں، لڑکیاں جھگڑ رہی ہیں [illegible] دھما چوکڑی مچا رہے ہیں، بلا کی گرمی پڑ رہی ہے، پسینے کے قطرے ٹپک رہے ہیں مگر آپا ہر چیز سے بے خبر اسی انداز میں جھکی ہوئی لکھتی چلی جا رہی ہیں۔ گھر سنسان سا لگ رہا ہے، ہم لوگوں کی سلائی ادھوری پڑی ہوئی ہے۔ ایک ہفتہ دس دن اسی جنونی کیفیت میں جب گزر جاتے ہیں تب پتہ چلتا ہے کہ آپا نے ایک ساتھ چار افسانے لکھ ڈالے ہیں اور جیسے ہی انھوں نے اپنا قلم رکھا ہمارا یہ کام شروع ہو جاتا ہے کہ ان کے لکھے ہوئے افسانے چھپنے چلے جائیں۔ افسانوں کو سنا کر اور ان کی پسندیدگی کے بعد آپا اطمینان کی ایک گہری سانس لے کر ان افسانوں کو اپنے فائل میں بند کر دیتی ہیں اور پھر [illegible] یہ بھول جاتی ہیں کہ انھوں نے کبھی افسانہ بھی لکھا تھا۔ جب مہمان داری، شادی، ہاؤس کیپنگ، خدمت خلق اور شعبہ نسواں سے وقت ملتی ہے تو کبھی [illegible] ایک آدھ افسانہ صاف کر کے کہیں بھیج دیا۔ آپا نے ایک بہت ہی یادگار چیز لکھنی شروع کی تھی "ممرح اور ساحل" ان کی یہ ناول بہار پر بیتی ہوئی ۱۹۴۶ء کی کہانی تھی۔ بہت سے حصے لکھے جا چکے ہیں۔ اس کا ایک حصہ نیا دور کے فسادات نمبر میں "ایک دن" کے نام سے نکل بھی چکا ہے۔ مگر افسوس کہ وہ یادگار چیزیں اب کہیں شائع نہیں ہو سکتی ہیں۔ ان دنوں وہ ایک ناولٹ لکھ رہی ہیں جس کے [illegible] ماہ نو میں چھپ چکے ہیں۔ پہلا حصہ "جلتے ہوئے چراغ" اور ساتواں حصہ "آنسو اور پتھر" کے نام سے۔

آپا کو فطرت نے بہت ہی نرم دل اور درد مند نگاہیں بخشی ہیں جس موڑ پر سے ہم لوگ آسانی سے گزر جاتے ہیں آپا ٹھٹک کر رہ جاتی ہیں اور ان کی نگاہ وہاں پہنچ جاتی ہے جس کو ہم نہیں دیکھ سکتے۔ اگر روز مرہ کے اتنے سارے فضول کام آپا کے سپرد نہ ہوتے تو آج وہ افسانوی دنیا پر چھا کر رہ گئی ہوتیں۔

"آنکھ مچولی" اور "گھر یا ویرانہ" آپا کے اپنے افسانے ہیں اور واقعی جیسا انھوں نے جو سب بہنوں پر کہانی لکھی ہے۔ آپا بچپن سے انیمیا کی مریض ہیں۔ مگر اب خون کی کمی نے خطرناک صورت اختیار کر لی ہے۔ ڈاکٹروں نے ان کو مکمل طور پر ریسٹ کرنے کی تاکید کی ہے مگر باغ کی دیکھ بھال، ترکاریوں کے لگانے اور ان کی کیاریوں اور پھولوں کی دیکھ ریکھ کون کرے گا؟ اسی لئے آپا ڈاکٹروں کی ساری باتوں کو سنی ان سنی کر کے اپنی اسی پرانی ڈگر پر چلتی چلی جا رہی ہیں۔

۴

نواہا زندہ شد در شاخساراں

مولانا محمد علی

ضیاء الدین احمد برنی

محمد علی [illegible] ۱۸۷۸ء [illegible]

[illegible] ذوالفقار علی [illegible]

[illegible] حاصل کی۔

[illegible]

[illegible] حاصل کی۔ [illegible]

[illegible] ہو گئے۔

[illegible] بڑودہ [illegible] ملازمت [illegible]

[illegible] ملازمت [illegible]

[illegible] ملک کی سیاسی حالت [illegible] ہو گئے

بعض باتوں کی وجہ سے وہ بڑودہ کی ملازمت سے دل برداشتہ ہو گئے تھے اور [illegible] انہوں نے دو سال کی چھٹی لے لی اور کلکتہ چلے گئے۔ پنجاب کے لفٹیننٹ گورنر سر مائیکل اوڈوائر ان کے دوست تھے جب انہیں معلوم ہوا کہ محمد علی خالی ہیں تو انہوں نے [illegible] پیش کی۔ اسی طرح ایک دو اور ریاستوں نے بھی انہیں اپنانے کی کوشش کی مگر محمد علی نے ان پیشکشوں کو ٹھکرا دیا اور کلکتہ سے ہفتہ وار اخبار کامریڈ نکالنے کے انتظامات میں لگ گئے۔ کامریڈ کا پہلا پرچہ ۱۴ جنوری ۱۹۱۱ء کو نکلا۔ محمد علی کی پبلک لائف صحیح معنوں میں اسی تاریخ سے شروع ہوتی ہے ۲۰ سال تک ان کی ہنگامہ خیز شخصیت دنیا کے سامنے رہی اور بالآخر ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو لندن میں جہاں وہ برطانیہ کے سامنے ہندوستان کا مطالبہ آزادی پیش کرنے کے لیے گئے تھے، انتقال کر گئے۔ ان کی تمنا تھی کہ وہ غلام ملک میں نہ مریں سو یہ دعا قبول ہوئی اور انہوں نے ایک آزاد ملک میں اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کی۔

محمد علی طالب علمی کے زمانے سے ہی غیر معمولی ذہانت کے لئے مشہور تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اگلے وقتوں کے اساتذہ ہی کی طرح ان کے حافظہ کی یہ کیفیت تھی کہ وہ متعدد شعروں کی غزلیں کی غزلیں زبانی سنا دیتے تھے۔ شیکسپیئر کے ڈراموں کے بیسیوں صفحے انہیں ازبر تھے۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا تھا کہ بار ا گے بیٹھ جاتے تھے اور مختلف شعراء کا کلام سنتے تھے۔ مثلاً "آثار" کی بیسیوں طویل طویل عبارتیں بھی انہیں یاد تھیں۔

ابتدا ہی سے وہ بہت محنتی تھے۔ حالانکہ انہیں علیٰ العموم محنت سے بچا رہا کرتے تھے۔ یہ حالت آخر وقت تک رہی۔ میرے خیال میں انہوں نے کم و بیش کئی ہزار کتابیں پڑھی ہوں گی۔ وہ حکومت اور کانگریس کی شائع کردہ رپورٹوں کو بھی گھنٹوں بیٹھ کر مطالعہ کیا کرتے تھے۔ راتوں کو دیر تک جاگنے کے عادی تھے۔ ۱۹۱۳ء میں انہوں نے لندن ٹائمز کے انتہائی انگریز مضمون نگاروں کی پسند کا جو دندان شکن جواب دیا تھا وہ ایک ہی نشست میں ۲۶ گھنٹوں پر مشتمل تھی، لکھا گیا تھا۔ اس اثنا میں انہوں نے اپنے اوپر خواب و خور حرام کر لیا تھا۔ صرف چائے اور بسکٹ اور کافی پی پی کر وقت گزارا کرتے رہے۔ مجھے وہ سماں اب بھی اچھی طرح سے یاد ہے۔ وہ بستر پر بیٹھے بیٹھے لکھ رہے ہیں، بیسیوں کتابیں ادھر ادھر پڑی ہیں کبھی اس سے اقتباس لیتے ہیں اور کبھی اس سے۔ یہ مضمون نہ صرف انشاپردازی کا بہترین نمونہ ہے بلکہ معلومات اور دلائل کے اعتبار سے بھی وہ اس درجہ کا ہے کہ تحاہ مخواہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ لندن کی گول میز کانفرنس کے دوران میں باوجود علالت کے وہ مطالعہ کرتے رہے۔ بیمار ہیں مگر ملک و ملت کے مسائل پر غور کر رہے ہیں۔ اسکیمیں تیار کر رہے ہیں۔ انٹرویو دے رہے ہیں۔ تقریریں کر رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ انسان کا حافظہ اس حد تک قوی نہ ہوتا تو یقیناً ان کی تقریریں اور مضمون ایسے جامع نہ ہوتے۔ یہ سب ذہانت اور محنت کے کرشمے ہیں۔

علی برادران کی باہمی محبت :

محمد علی کو اپنے بڑے بھائی (شوکت علی) سے غیر معمولی محبت تھی۔ آج کل کے لوگ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ شوکت علی ان سے بہت کام لیا کرتے تھے۔ محمد علی جو بڑے ہو گئے تھے مگر انہیں احساس تھا کہ وہ چھوٹے بھائی ہیں اور اس لئے انہیں بڑے بھائی کا کہنا ماننا چاہئے۔ ایک مرتبہ انہیں "در سگ باش برادر خورد مباش۔ خر باش برادر بزرگ مباش" کی مثل سنائی گئی تو اس کے جواب میں انہوں نے کہا میں سگ بننا پسند کروں گا، لیکن یہ کبھی پسند نہ کروں گا کہ بڑے بھائی خر کہلائیں۔ علی گڑھ میں دونوں بھائیوں کے برادرانہ تعلقات کے چرچے رہا کرتے تھے۔ شوکت علی انہیں چھیڑنے یا غصہ دلانے کی غرض سے یا کبھی کبھار دوسروں کے سامنے اپنی فوقیت کی دھونس جمانے کے لئے ان سے سب کے روبرو جھڑک جھڑک کر کام لیا کرتے تھے۔ مگر وہ اطاعت اور فرمانبرداری کے جذبے کے ساتھ ان کے ہر حکم کی تعمیل کرتے۔

۲۳-۱۹۲۲ء میں جب دونوں بھائی بیجاپور جیل میں محبوس تھے، اس زمانہ کا ذکر ہے کہ شوکت علی کی بعض "حرکتوں" کی وجہ سے حکومت نے ان سے یہ رعایت چھین لی تھی کہ وہ بی اماں سے مل سکیں۔ اس وقت محمد علی نے نہایت ایثار سے کام لے کر اپنے ایک خط میں جو جیل سے لکھا گیا تھا اور میرے پاس سنسر شپ کے لئے آیا تھا) بی اماں کو یوں لکھا:

> "...... میری جنت یا تلواروں کی چھاؤں میں ہے یا آپ کے قدموں کے نیچے ہے۔ تاہم مجھے یہ قبول ہے کہ آپ کو دیکھے بغیر آپ سے ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں۔ مگر یہ ہرگز قبول نہیں کہ میں تو آپ کے دیدار سے سعادت اندوز ہوا کروں اور شوکت کی آنکھیں اس نظارہ کو ترسا کریں۔ وہ ہر حالت میں مجھ سے کہیں زیادہ آپ کی محبت اور اس انعام کے مستحق ہیں۔"

مذکورہ بالا عبارت دنیا کے ہر ادب کے لئے باعث فخر ہو سکتی ہے اس لئے کہ اس میں نہ صرف ماں کا احترام کرنا بہت خوبی سے دکھایا گیا ہے بلکہ بڑے بھائی کی عزت کو بھی جس خوبصورتی سے نبھایا گیا ہے وہ آپ اپنی نظیر ہے۔

انگریزوں سے دشمنی :- اسے آکسفورڈ کا اثر کہئے یا کسی اور سبب پر محمول کیجئے مگر حقیقت یہ ہے کہ محمد علی شروع شروع میں انگریز ...

انہوں نے کہا کہ خلافت کے بہت سے مسلمان لیڈر جو کے ساتھ جیتے ہیں ہندوستان میں پہلے تھے۔ اب سب ختم کے تعلقات خوشگوار ہیں۔ مگر نظر بند کے زمانہ میں ان کی جمعیت نے پتا لگایا ہے شیعہ کے علاوہ بھی اہل انہوں نے فیصلہ کر دیا کہ اب انگریزوں کو نکال کر ہی دم لیں گے۔ گول میز کانفرنس کی تقریر میں بھی یہ جذبہ بے خیالی وہ سب سے پہلے لیڈر ہیں جنہوں نے کانفرنس میں شرکت سے انکار کر دیا کہ یہ منصوبہ چلا ہے کہ ہندوستان کو آزاد کر دے۔ ساتھ ہی انہوں نے انگریزوں کا [illegible] دوسری کانفرنس میں [illegible] حقیقت تھی جو کا مرتبہ [illegible] ہی۔

چنانچہ اس لئے مخالف ہو گئے تھے کہ انہوں نے ملی وقومی تنظیم [illegible] میں [illegible] کے لفٹیننٹ گورنر تھے۔ وہی دوستوں میں لئے مگر جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے مشورہ کے برخلاف وہ [illegible] ہوتے تعصب [illegible] کے خلاف ہو گئے۔ یہ مخالفت [illegible] جب [illegible] دوسرے انگریز دوستوں کی مدد سے [illegible] کا فیصلہ [illegible] مسلمانوں کے حق [illegible] ایک سٹی کی مخالفت کی رنگین مثال ہے۔

[illegible] کراچی میں وہ عدالت میں انگریز سپاہی کی آمد پر کھڑے نہیں ہوتے تھے [illegible] شناسائی تھی۔ آخر ایک دن پوچھ ہی لیا کہ مسٹر محمد علی [illegible] آپ [illegible] آمد پر کھڑے نہیں ہوتے حالانکہ آپ میں خود بخود کھڑا ہو جاتا ہوں۔ محمد علی نے جواب دیا کہ آپ کو [illegible] بات کی فیس ملتی ہے۔

[illegible] معاملہ میں شوکت علی بھی محمد علی کے برابر تھے۔ بمبئی کے مقدمہ میں [illegible] کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا: [illegible] ایک [illegible] کے خلاف تشدد برتنے کا ذکر کرتے ہوئے [illegible] کا خیال کرتا ہوں تو [illegible] راہ میں حائل ہو جاتی ہیں اور میری تلوار کند ہو جاتی ہے۔ [illegible] اصل الفاظ اس وقت میرے سامنے نہیں ہیں۔

کانفرنس:

[illegible] کے باوجود محمد علی گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے۔ ان کی شرکت [illegible] سب سے بڑا مقابلہ تھا۔ وہ اس وقت سخت [illegible] جہاز میں اسٹریچر پر لٹا کر لیجائے گئے تھے۔ روانگی سے پیشتر جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ لندن کیوں جا رہے ہیں تو ان کی زبان سے [illegible] کرنے کے لئے جا رہا ہوں۔ لیکن ایک بیان میں انہوں نے فرمایا تھا کہ حکومت نے [illegible] کا جو دروازہ کھولا ہے میں اسے بند [illegible] چاہتا۔ اس موقع پر کئی ایک اخبارات نے لکھا تھا کہ جب اس کانفرنس میں کانگریس شرکت نہیں کر رہی ہے تو محمد علی کو بھی شریک نہیں [illegible] اردو اخبارات میں مخالفت میں نظمیں بھی لکھی گئی تھیں۔ سنجیدہ اور غیر سنجیدہ دونوں۔ غلام احمد خاں آرزو [illegible] ہندوستان [illegible] نے بھی ایک نظم لکھی تھی جس کے چند اشعار درج ذیل کئے جاتے ہیں:

اللہ کا سپاہی اور گول میز پنچایت

تیرا ہے قول فیصل آزادی کامل — ہندوستان بھر میں جس سے مچی تھی ہلچل
گاہ بھگا خود ہم کو رکھا کے مشغل — وہ ولولہ وہ جذبہ سب ہو گیا معطل

اب دستِ طمع اس کی جانب بڑھا ہوا ہے | جو ارضِ مسلموں کے خون سے رنگا ہوا ہے
اغیار کی حدود پہ کیسا تلا ہوا ہے | لیکن نہ جانے تیری غیرت کو کیا ہوا ہے

آزادیٔ وطن کیا یونہی بے خطر ملے گی؟ | قربانیاں دیئے بن فتح و ظفر ملے گی؟
لندن کے ہوٹلوں میں کیا کوئی منت ملے گی؟ | جیلوں ہی میں ملے گی وہ چیز اگر ملے گی

محمد علی رہبر رکھے، برادر تقریباً سارے راستہ کالی جھنڈیاں لہرائی گئی تھیں۔ محمد علی اسٹریچر پر تھے۔ تماشا دیکھ رہے تھے اور گاندھی جی دوان طرف بیٹھے نے اس واقعہ کی طرف اشارہ بھی کیا تھا۔

مگر محمد علی ان چیزوں سے مطلق متاثر نہیں ہوئے۔ وہ جس چیز کا ارادہ کر چکے تھے وہ اٹل تھی۔

جب محمد علی کانگریس سے علیحدہ ہوئے اس وقت وہ سارے ہندو پریس کے غصہ کا نشانہ بن گئے تھے۔ لیکن مرنے سے چند مہینے قبل لندن میں جب انہوں نے گول میز کانفرنس میں تقریر کی تو ان کی مخالفت کے سارے تار و پود بکھر گئے۔ بمبئی کے سب سے ممتاز قوم پرست اخبار "بمبئی کرانیکل" نے ان کی وفات پر یوں خراجِ تحسین پیش کیا۔ اس کا آخری حصہ ملاحظہ کیجئے:

"مولانا محمد علی کی آخری تقریر ان کی توانائی، عزم، عزیمت و اسپرٹ کا مظہر ہے جو زندگی بھر ان کا نمایاں جوہر رہا...... اگرچہ وہ کانگریس سے الگ ہو گئے تھے لیکن انہوں نے گول میز کانفرنس میں بیچ کر جدوجہد کا یہ اعلان کیا کہ ہندوستان اب غلامی کو برداشت نہیں کرے گا۔ اس عہد سے کسی باوقار کانگریسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ ان کی وفات سے دنیا ایک دلچسپ اور ہنگامہ پرور شخصیت سے محروم ہو گئی ہے۔"

محمد علی کی بے باکی:-

محمد علی ہمیشہ سے بے باک تھے۔ انہوں نے کبھی نتائج و عواقب کی پروا نہیں کی۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے برملا کہتے تھے۔ گول میز کانفرنس میں انہوں نے جو کھری کھری باتیں کہیں وہ ہندوستان کے کسی اور لیڈر نے نہیں کہیں۔ اسی طرح پہلی اسلامی موتمر میں جو حجاز میں منعقد ہوئی تھی انہوں نے بلند گرجدار آواز میں سلطان ابن سعود مرحوم کو مخاطب کر کے صاف صاف کہہ دیا تھا:

"تم اپنے آپ کو اس مقدس سرزمین کا بادشاہ، ملک الحجاز کہتے ہو اور کہلاتے ہو جہاں رسولِ مقبول نے اپنی زندگی بسر کی تھی حالانکہ تمہارے پیشروؤں نے ہمیشہ اپنے آپ کو خادم الحرمین کہا اور کہلوایا۔ تم بھی ان کی تقلید میں اپنے آپ کو خادم الحرمین کہو اور ملوکیت پر جو حضرت معاویہؓ کی سنت ہے ہرگز ہرگز نہ چلو۔"

یہ باتیں ایک سرپھرا ہی کہہ سکتا ہے اور محمد علی اپنے زمانے کا سب سے بڑا سرپھرا تھا۔ اعلائے کلمۃ الحق کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہو گی؟

شانِ مذہبیت:-

محمد علی کی مذہبیت جنون کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ بالفاظِ دیگر ان کا ہر کام (دشمنی و دوستی) اللہ کے لئے تھا۔ نظر بندی کے زمانہ میں جب سپرنٹنڈنٹ پولیس عبدالمجید سی آئی ڈی کے افسرِ اعلیٰ سر چارلس کلیولینڈ کے ایما پر چھندواڑہ پہنچے تاکہ رہا کرنے سے پیشتر علی برادران سے ایک عہدنامہ پر دستخط کرالیں جس میں یہ وعدہ درج ہو کہ وہ غیر آئینی طریقوں اور تشدد سے ہمیشہ محترز رہیں گے تو محمد علی نے اس عبارت میں یہ اضافہ کیا کہ سب سے پہلے مجھ پر اللہ کی اطاعت فرض ہے اور بادشاہِ وقت سے میری وفاداری اس شرط سے مشروط ہے کہ اگر دنیاوی قوانین خدائی احکام سے ٹکرائیں گے تو اس صورت میں میں صرف اللہ کے احکام کی اطاعت کروں گا۔ حکومتِ وقت نے اسے قبول نہیں کیا اور اس لئے دونوں بھائیوں کو مزید دو سال تک قید و بند میں رہنا پڑا۔

[illegible] قرآن [illegible]

قرآن ایک [illegible]

ایک [illegible] کتاب ہے ۔ ۔ ۔ ۔ [illegible]

[illegible] کتاب ہے ۔ ۔ ۔ ۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے [illegible]

[illegible] احادیث [illegible]

نہیں ہے کسی آیت کے بارے میں [illegible]

[illegible] اور اس کے بارے میں [illegible]

[illegible]

[illegible]

محمد علی کے لطیفے :-

[illegible]

[illegible]

ایک مرتبہ مسٹر محمد اسمٰعیل خان [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] دیکھتے ہی [illegible] کہاں سے آگیا [illegible]

[illegible] محمد علی [illegible]

[illegible] نہیں سنا [illegible]

[illegible] میں بھی نقل ہوا تھا۔

جن دنوں اینگلو انڈین اخبارات دربار دہلی میں مہاراجہ بڑودہ کے طرز عمل پر نکتہ چینی کر رہے تھے اس زمانہ میں بڑودہ کا ریذیڈنٹ میک آئی [illegible] تھا جس کا [illegible] تھا اس نے مہاراجہ کے خلاف زہر چکانی میں نمایاں حصہ لیا تھا ۔ ۔ وہ چاہتا تھا کہ مہاراجہ کو بادشاہ کی شان میں بے ادبی کرنے کی غرض سے سخت سزا ملے ۔ اینگلو انڈین اخبارات اور ریذیڈنٹ کی مہم کے جواب میں محمد علی نے اپنے سابق آقا کی حمایت میں کامریڈ میں COB AND HIS COBWEBS کے عنوان سے کئی ایک مضامین لکھے جن میں کاب کی سازشوں کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی تھیں ۔ COBWEB مکڑی کے جالے [illegible] کہتے ہیں ۔ اس میں یہ رعایت رکھی گئی ہے کہ کاب کے دلائل تار عنکبوت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے ۔ محمد علی اس وقت بھی [illegible] پر ہی تھے لیکن سلسلہ مضامین شروع کرنے سے پیشتر انہوں نے استعفیٰ دے دیا تھا تاکہ یہ نہ کہا جائے کہ وہ مہاراجہ کے ملازم ہیں ۔

محمد علی سیاسیات میں "نو چینجر" تھے یعنی وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہندوستانی نمائندے اسمبلیوں میں جائیں اور تضییع اوقات کریں ۔ برخلاف اس کے ایک طبقہ ایسا تھا جو اسمبلیوں میں جا کر تحریکی مہم جاری رکھنا چاہتا تھا ۔ انہی دنوں کا قصہ ہے کہ محمد علی اسمبلی کا تماشا دیکھنے کے لئے پریس گیلری میں جا کر بیٹھ گئے ۔ پنڈت شام لال نہرو نے انہیں دیکھتے ہی کہا "مسٹر محمد علی ! جب آپ یہاں تک تشریف لے آئے ہیں تو پھر نیچے آجائیے" محمد علی نے

برجستہ جواب دیا "میں یہاں اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ آپ کی پستی دیکھوں — [illegible]

I HAVE COME HERE TO LOOK DOWN.

"ہمدرد" کے آخری دور میں محمد علی کو ایک آرٹسٹ کی ضرورت تھی۔ چنانچہ عبدالسمیع خان جو بورڈنگ ہاؤس کے [illegible] کو [illegible] قیام پذیر تھے اس سلسلے میں ان سے ملنے کے لئے گئے۔ محمد علی نے پوچھا کہ کہاں کے رہنے والے ہو؟ سمیع صاحب نے [illegible] کا رہنے والا ہوں۔ محمد علی نے حیرت سے پوچھا کہ کیا سی پی میں بھی آرٹسٹ ہوتے ہیں؟ سمیع صاحب نے برجستہ کہا "آرٹسٹوں کو چھوڑئیے یہی میں موتی پیدا ہوتے ہیں" محمد علی پھڑک گئے اور اس قدر خوش ہوئے کہ انہیں فوراً رکھ لیا۔ محمد علی اس لطیفہ کو [illegible] بعد کو سب سے ان کا تعارف کراتے تو کہتے "یہ سی پی کے موتی ہیں۔"

محمد علی اپنی جانب سے [illegible] بھی سمیع صاحب کو بھی ساتھ لے جاتے تاکہ وہ مختلف لیڈروں کی نشست و برخاست کے انداز کو اسکیچ بنائیں۔ یہ اسکیچ اخبار میں [illegible] ان اسکیچوں کی سرخیاں محمد علی اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے جو بہت ہی [illegible] اور معنی خیز ہوا کرتی تھیں۔ ایک دفعہ بنگالی مسلمانوں کے مشاعرہ تھے ان کے اسکیچ کے نیچے محمد علی نے لکھا: "THE WIT AND WISDOM OF BENGAL" یعنی بنگال کی نکتہ سنجی اور دانشمندی۔ سان صاحب کی تقریریں بہت دلچسپ ہوتی تھیں اور دوران تقریر وہ اپنے مزاح سے لوگوں کو ہنساتے رہتے تھے۔ سر فریڈرک وائٹ کے اسکیچ کے نیچے انہوں نے نام کی رعایت سے لکھا "WHITE MAN'S BURDEN" اس لئے کہ انگریز سیاسی حکمران کہا کرتے تھے کہ خدا نے برطانیہ پر ہندوستان کی حکومت کا بار ہمارے کندھوں پر رکھا ہے اور وہ ہر قسم سے ہر طرح اس دلیل کو اپنے کے قیام کے جواز میں پیش کرتے تھے۔ انگریز (WHITE MEN) اس حکومت کو خدائی امانت سے تعبیر کرتے تھے۔ [illegible] کے اسکیچ کے نیچے انہوں نے لکھا "THE BOMBAY DUCK RESTING" یہ جناح کے [illegible] اس بارے میں غیر معمولی طور پر محتاط رہا کرتے تھے۔ ڈک جنس کو کہتے ہیں جو سفید براق پروں کا پرندہ ہے۔ جناح سے صاف ستھرے لباس [illegible] تک زیب تن کرتی تھی۔ اس ریمارک کی موزونیت کس قدر برمحل ہے۔

محمد علی کی مخالفتیں :-

دارالسلطنت کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ محمد علی بھی کلکتہ سے دہلی آ گئے۔ کلکتہ سے کامریڈ کا آخری پرچہ ۴ ستمبر ۱۹۱۲ء کو نکلا تھا اور دہلی سے اس اخبار کا پہلا پرچہ تقریباً ایک مہینے کے بعد ۱۲ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو شائع ہوا۔ محمد علی کے آتے ہی دہلی کے کرسی نشین لیڈروں نے محسوس کر لیا کہ ایک نجم والا ستارہ افق دہلی پر طلوع ہوا ہے اور یہ کہ اب ان سب کی لیڈری ماند پڑ جائے گی۔ ان کی آمد سے پہلے خان بہادروں اور رائے بہادروں نے لیڈری پر قبضہ کر رکھا تھا مگر ان کے آتے ہی یہ بُت گر کر پاش پاش ہو گئے۔ انہوں نے پہلے کمشنر اور ڈپٹی کمشنر کے خوب ہی کان بھرے کہ اسے دام پورے کر یہاں سے خارج البلد کر دینا چاہئے مگر ان کی کوششیں ناکام رہیں۔ محمد علی نے آتے ہی دو معرکے سر کئے۔ ایک تو انہوں نے قصابوں کی زبردست ہڑتال کو حسن خوبی سے نمٹایا، دوسرے انہوں نے جامع مسجد والوں سے ٹکر لی اور زبردست اور مسلسل جہاد کر کے انہیں مجبور کر دیا کہ نمازیوں کی آسائش کی خاطر مسجد میں قناتیں اور شامیانے لگائیں۔ محمد علی کا مطالبہ عوام کا مطالبہ تھا اور اس لئے جامع مسجد کمیٹی کے ممبروں کا دل پسیجا اور انہوں نے مطالبے کے سامنے ہزیمت خوردگی کے جذبے کے ساتھ سر تسلیم خم کر دیا۔ محمد علی نے ایک بدعت یہ کی کہ آتے ہی جامع مسجد کو اپنی تقریروں کا پلیٹ فارم بنا لیا۔ ان کی آمد سے پہلے یہاں صرف مذہبی تقریریں کی جاتی تھیں۔ غدر میں مسجد کی واگذاری کے وقت منجملہ دیگر شرائط کے یہ شرط عائد کر دی گئی تھی کہ اس میں سیاسی تقریریں ہرگز نہ کی جائیں گی مگر محمد علی نے اس شرط کی مطلق پرواہ نہ کی اور برابر تقریریں کرتے رہے۔ اس کی وجہ سے ان کے مخالفین کو ایک اور موقع مل گیا کہ وہ حکام کو آمادہ کریں کہ وہ محمد علی کو جامع مسجد میں سیاسی کام کرنے سے روکیں۔ مگر اس دفعہ بھی حکام کچھ نہ کر سکے۔ محمد علی کی جولانی میں

[illegible] کے ساتھ [illegible] کے ساتھ اپنی سعودی [illegible] محمد [illegible] خفیہ جامع مسجد
[illegible] اسی [illegible] کے [illegible] سے [illegible] سب
[illegible] گمراہی کے سامنے ہے۔

بعد ازاں بہت سے ایسے مسائل کے سبب ہندوستان کے لیڈر دو حصوں میں بٹ گئے [illegible] جنگ بلقان [illegible] [illegible] تحریک خلافت، [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کی مخالفت میں [illegible] [illegible] تقریباً سب لیڈروں کے [illegible] گئے۔

محمد علی کا ایک [illegible] [illegible] [illegible] جاری ہے [illegible] [illegible] ذکر کروں گا۔ اس جنگ میں [illegible] محمد علی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] مخالفت [illegible] [illegible] مضامین لکھے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] حافظ علی [illegible] [illegible] کے خلاف [illegible] رہا تھا۔

مضامین محمد علی میں ڈاکٹر اقبال کے خلاف چند مضامین ملتے ہیں [illegible] لکھے گئے تھے [illegible] [illegible] اپنی [illegible] تقریر میں کہیں یہ کہہ دیا تھا کہ انہیں ہندوستانیوں پر اعتبار نہیں ہے اور اس لئے [illegible] [illegible] زیادہ تعداد میں تقرر کیا جائے۔ محمد علی بگڑ گئے اور انہوں نے ان کی نظموں کے طویل اقتباسات پیش کر کے پوچھا کہ اقبال [illegible] [illegible] میں یہ تفاوت کیوں ہے؟ محمد علی کا اندازِ تحریر نہایت [illegible] ہے اور پڑھتے وقت یہ معلوم ہوتا ہے کہ مخالفت کے باوجود وہ ڈاکٹر اقبال کے [illegible] ہاتھ سے جانے دینا نہیں چاہتے۔ اقبال بھی محمد علی کا غیر معمولی احترام کرتے تھے۔ "اسیری" اور "وفات" پر اقبال نے برلافانی نظمیں لکھی ہیں وہ ظاہر بتاتی ہیں کہ اقبال کو محمد علی کا کس قدر احترام منظور تھا۔

سرسید کے بعد غالباً محمد علی ایسے لیڈر تھے جنہیں سب سے زیادہ گالیاں دی گئیں مگر وہ ؎
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوئے

پُرآشوب دور:-

یہ حقیقت ہے کہ محمد علی نے بڑا پُرآشوب دور پایا تھا۔ جنگِ طرابلس، جنگِ بلقان اور پہلی جنگِ عظیم ان کے زمانہ میں ہوئیں۔ اس سے قبل روسیوں اور انگریزوں کے ہاتھوں ایران کا گلا گھونٹنے کی کوششیں کی جا رہی تھیں۔ مصر انگریزوں کی غلامی میں تھا۔ طرابلس پر اٹلی نے اپنی کا غاصبانہ قبضہ تسلیم کرلیا تھا۔ افریقہ کی دیگر شمالی ریاستیں فرانس کے پنجۂ استبداد میں تھیں۔ الغرض سارا دنیائے اسلام ایسی ہیجانی کیفیت میں تھی کہ اس کی مثال تاریخِ عالم میں نہیں ملتی۔ تقریباً جب بلقانی ریاستیں ترکوں پر بے پناہ مظالم ڈھا رہی تھیں۔ محمد علی کو ایک ایک کا فکر تھا اور انہوں نے چندہ کر کے طبی مشن روانہ کر کے، ترکوں کی حمایت میں، وفدِ خلافت بھیج کر عالمِ اسلام کے مصائب کو ہلکا کرنے کی امکانی کوشش کی۔ ہندوستان کا

آستانوں کی جدوجہد اس پر مستزاد تھی۔ ایک جان تھی جو دنیائے اسلام کے غم میں اپنے آپ کو گھلائے جا رہی تھی۔ مگر یہ سالہا سال کی قید و بند خدا جانے محمد علی سے کیا کیا کام لیتی۔

ذاتی خصوصیات:۔

پہلی جنگ بلقان میں جو دول عظمیٰ کی سازش کا نتیجہ تھی، ترکوں کی پے درپے ہزیمتوں نے محمد علی کے دل پر بہت چرکے لگائے تھے۔ دوسری جنگ بلقان میں جو لوٹ مار کی تفسیر پر بلقانی اتحادیوں میں برپا ہوئی تھی جب غازی انور پاشا نے دول عظمیٰ کے احتجاج کے باوجود ایڈریانوپل پر بے تحاشا یلغار کر کے قبضہ کر لیا تو جتنی خوشی محمد علی کو ہوئی تھی کسی اور کو نہ ہوئی ہوگی۔ ایڈریانوپل کے قبضہ کا تار رات کو آیا تھا اور وہ سارے مسلمانوں کو اس مسرت میں شریک کرنے کے لئے سیدھے جامع مسجد پہنچے اور وہاں دعا شکر ہو رہی تھی جب ترکوں کو اس کامیابی پر مبارکباد دی گئی تھی اور دول عظمیٰ کی سازشوں کو بے نقاب کیا گیا تھا۔ یہ خبر دوسرے دن اخباروں میں چھپی تھی لیکن محمد علی نے انتظار نہیں کیا اور راتوں رات سارے شہر والوں کو یہ دل خوش کن خبر پہنچا دی۔ وہ رات بھی کیا سہانی رات تھی۔

جب مجاہد شہید گیرالٹی میں پہلے ترقی ۔۔۔ شہید ہو گئے تو پولیس تحقیقات میں بہت کچھ بے جا دخل سے کام لیا۔ جناب احسان الحق جو محمد علی اور خواجہ حسن نظامی دونوں کے دوست ہیں، سیدھے محمد علی کے پاس پہنچے اور انہیں صورت حالات سے واقف کیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ خواجہ صاحب ۔۔۔ میں قلمی جنگ ہو رہی تھی لیکن ذاتی تعصبات کو بالائے طاق رکھ کر انہوں نے دہلی کے ڈپٹی کمشنر بیڈن سے ٹیلیفون پر ایک گھنٹہ تک گفتگو کی اور انہیں معاملہ کے نشیب و فراز سے آگاہ کیا اور زور دیا کہ اس قتل کی پولیس تحقیقات کی جانے اور مجرموں کو قرار واقعی سزا دی جائے۔ محمد علی کے کیریکٹر کی اس بلندی کا ذکر آج بھی میاں احسان بڑے فخر سے کیا کرتے ہیں۔

محمد علی ذیابیطس کے مرض میں مبتلا رہتے تھے۔ مرض کا کما حقہ علاج اس لئے نہیں ہو سکا کہ وہ پرہیز نہیں کرتے تھے۔ بد پرہیز واقع ہوئے تھے۔ وہ آموں کے عاشق تھے لیکن کسی طرح آموں کو چھوڑنے پر رضامند نہ تھے۔ ایک وقت خود بھی آم کھا رہے تھے اور دوسروں کو بھی کھلا رہے تھے کہ دوران گفتگو میں میرے ایک سوال کے جواب میں فرمایا "خواہ جان ہی چلی جائے مگر میں آم کسی حالت میں نہیں چھوڑوں گا۔" بعد کو ڈاکٹروں کے زور دینے سے ۔۔۔ ایک آم روزمرہ پر قناعت کر لی تھی لیکن وہ ایک آم سائز میں کئی آموں کے برابر ہوا کرتا تھا۔

لباس کے معاملہ میں کہتے ہیں کہ ابتدائی دور میں وہ دوسرے محمد علی جناح تھے۔ آخر میں جب انہوں نے اپنی وضع قطع بدل لی اور ڈھیلا ڈھالا پہننا شروع کر دیا اس وقت بھی وہ اچھی قسم کا کھدر استعمال کرتے تھے۔ مدت تک محمد علی کوٹ پتلون ہی میں ملبوس رہے۔ ان کے سابقہ فوٹو آپ اسی سوٹ بوٹ میں ملیں گے۔ وہ انگرکھا اور چوڑی دار پاجامہ بھی زیب تن کرتے تھے۔ ٹوپی سفید رنگ کی بالوں دار استعمال کرتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ان کی ٹوپی میلی ہو گئی۔ جبل پور کے ایک خلافتی کارکن تھے جن کا نام اس وقت میرے ذہن سے اتر گیا ہے۔ وہ اس وقت اجلے بالوں کی نئی ٹوپی پہنے پاس ہی بیٹھے تھے۔ محمد علی نے اپنی ٹوپی اتار کر ان کے سر پر رکھ دی اور ان کی ٹوپی خود پہن لی۔ خلافتی کارکن اس عزت افزائی پر بے حد خوش تھے مگر اردگرد کے لوگ ہنس دئے اور بات آئی گئی ہو گئی۔ یہ حقیقت ہے کہ جو لباس بھی وہ زیب تن کرتے تھے وہ ان پر خوب سجتا تھا۔ تکی مشن میں وہ فوجی لباس میں بھی نظر آتے ہیں۔ اپنے ڈیل ڈول سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کہیں کے کرنل بیٹھے ہیں۔ یہ فوجی لباس بھی انہیں خوب زیب دیتا تھا۔

غالباً ۱۹۱۳ء یا ۱۹۱۴ء کا واقعہ ہے کہ تار کا ہرکارہ ایک ضروری تار بہت تاخیر سے لایا اور جب اس سے پوچھا گیا تو خاطر خواہ جواب دینے کی بجائے اس نے غرانا شروع کر دیا۔ اس پر محمد علی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اسے خوب پیٹا اور پھر خود ہی تار گھر والوں کو ٹیلیفون پر اطلاع بھی کر دی۔ سپرنٹنڈنٹ نے کہا کہ تار بہت دیر پہلے بھیجا گیا تھا، اس نے یقیناً راستہ میں وقت ضائع کیا ہوگا۔ پھر اس نے تار کے دیر سے پہنچنے کی معذرت چاہی اور کہا کہ آپ نے اچھا کیا کہ اسے سزا دے دی۔

ایک دوسرا لطیفہ ہے کہ علامہ [illegible] ظفر علی [illegible] نے [illegible] اپنے یہاں کھانا کھایا
[illegible] اس وقت انہوں نے [illegible] کھانا [illegible] تو [illegible] قبول نہ کروں گا۔ [illegible]
[illegible] کی حزب اختلاف [illegible] "خلافت" کی [illegible] آباد میں [illegible] ہو گیا" [illegible] سے [illegible]
[illegible] محمد علی کی نظروں میں [illegible] کی حیثیت رکھتے تھے

اپنی زندگی میں انہوں نے بہت سوں کو [illegible] اپنے [illegible] پر [illegible] دیا۔ [illegible] دوست [illegible] سے
[illegible] تعلقات [illegible] دوستانہ تھے۔

جب کبھی انہیں روپیہ کی ضرورت [illegible] نواب حمید اللہ خاں بھی ان کی مدد کرتے [illegible] تھے [illegible]
[illegible] مزاج [illegible] ہوتا [illegible]۔

محمد علی بڑا اعتبار [illegible] تھے۔ [illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] دوستوں کے جان نثار دوست تھے اور [illegible] ہے [illegible] دوست [illegible] سے
[illegible] جگل خاں، عبدالماجد دریا بادی، چودھری خلیق الزماں، پروفیسر نواب علی، ڈاکٹر [illegible] مولانا [illegible]
[illegible] عبدالرحمن صدیقی، شعیب قریشی وغیرہ ان میں سے [illegible] محمد علی کے بیشتر [illegible] سے [illegible]
[illegible] کی قابلیت [illegible] وہ آخر وقت تک [illegible] دوست [illegible] ساتھ [illegible] پر علیحدہ ہو گئے
[illegible] سید عبداللہ بریلوی ایڈیٹر "بمبئی کرانیکل" بھی اختلافات کے باوجود [illegible] دوست اور مداح رہے۔

محمد علی کے ایک دوست نے جب ان سے غداری کی، اور [illegible] نے [illegible] جاسوس کی طرف اشارہ کیا ہے، تو
[illegible] کے بیچ میں پڑ جانے سے محمد علی نے ان کا قصور دل سے معاف کر دیا۔ [illegible] ہیں۔ [illegible] معاف کر سکتا
[illegible] بھول نہیں سکتا۔ یہ [illegible] ہے۔

ایک دفعہ محمد علی نے مولانا شبلی کی دعوت کی۔ [illegible] ابھی ختم ہوا تھا۔ اس دعوت میں [illegible] کے علاوہ اور بہت سے دوست
شریک تھے جن میں پشاور کالج کے پروفیسر محمد شفیع بھی تھے۔ دعوت کے اختتام پر مولانا شبلی نے [illegible] اور نظمیں [illegible] اور پھر
ایک تقریر میں محمد علی کی خدمات کو سراہا اور انہیں خراج تحسین ادا کیا۔ اس کے بعد انہوں نے فرمایا کہ آپ جس کسی شخص کے نام میں محمد اور علی کا
اجتماع دیکھیں تو سمجھ جائیے کہ وہ لازمی طور پر زمانہ کا بہت بڑا آدمی ہے، اور اس سلسلہ میں تاریخ اسلام سے اپنے دعوے کے ثبوت میں بہت سے
نام پیش کئے۔ محمد علی سر جھکائے اپنی تعریف سنا کئے اور پھر یکایک بولے "سوائے محمد علی حالی ایڈیٹر [illegible] کا بھی تو ذکر کیجئے" مولانا شبلی نے فوراً
فرمایا کہ "یہ کلیہ کی استثنا ہے" اس پر زور کا قہقہہ پڑا

بہرحال محمد علی کی شخصیت "عجیب و غریب" تھی۔ وہ بیک وقت لیڈر، افسانہ نگار، شاعر، صحافی، مقرر، مورخ اور زبردست انشاء پرداز تھے

لہ چند ہمعصر از مولوی عبدالحق (بہ تغیر الفاظ)

"کام دیتے ہیں ۔ انہیں پڑھتے اور ان کی تحریرات پر غور کرتے ۔ آخری وقت پیماری کے دنوں میں انہوں نے اگر چہ عدم مکھرے کر لئے ہیں مگر ان کے مطالب کے اعتبار سے ان کی اپنی دعا پر ہوتے تھے ۔

ہمارے ساتھ کے بعد محمد علی کی جو کتابیں میرے پاس آخری بار منصور ہو کے لئے آئیں ان میں دیوان غالب کا ایک نسخہ بھی ۔ محمد علی کی عادت تھی کہ وہ پڑھتے وقت اچھے اچھے شعروں پر ایک ' دو یا تین نشانات درج لگا دیا کرتے تھے ۔ جو نسخہ جیل میں ان کے زیر مطالعہ رہا وہ نظامی پریس کا مطبوعہ تھا ۔ بعض بعض جگہ وہ ریمارک بھی لکھ دیتے تھے جو بہت پرلطف اور مکمل ہوا کرتے تھے ۔ ایک دو نمونے ذیل میں دیے جاتے ہیں ۔

غالب کا ذیل کا قطعہ ملاحظہ ہو :

نہ پوچھ اس کی حقیقت حضور والا نے   مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں نکلتے نہ خلد سے باہر   جو کھاتے حضرت آدم یہ بیسنی روٹی

نظامی پریس والے ایڈیشن میں اس قطعہ پر جو شرح درج ہے اس پر محمد علی نے ذیل کے دلچسپ انداز میں نکتہ چینی کی تھی ۔ فرماتے ہیں :

"اس لطیفہ کے آخری حصہ کا ستیاناس کر دیا ۔ حکم ہوا کہ اسے چکھنا تیری خیر
اسی میں ہے کہ جائے سامنے سے دور ہو جا ورنہ کچا چبا جائیں گے ۔ سب سے زیادہ
پرلطف نہ دلا ہوا ہوتا ہے نہ پسا ہوا ۔ نہ بھنا ہوا ۔ نہ پکا ہوا بلکہ کچا برنٹ "

اسی طرح غالب کے اس غیر مطبوعہ شعر پر جو نظامی والے ایڈیشن میں درج ہے :

چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

محمد علی نے ذیل کی عبارت تحریر فرمائی تھی :

"تیور تو کچھ اور ہی کہہ رہے ہیں ۔ مرزا ایسے ہرجائی نہ تھے کہ چند بتوں اور حسینوں
کی یادگاریں ان کا ترکہ ہوتیں مگر ممکن ہے کہ شعر مرزا ہی کا ہے ۔ بہرحال کچھ اچھا شعر
نہیں ہے ۔"

افسوس ہے کہ غالب کا یہ ایڈیشن جامعہ ملیہ لائبریری میں محفوظ نہیں رہا ۔

بہرحال امید نہیں کہ آئندہ محمد علی جیسا کوئی اور سرپھرا لیڈر ہندو پاکستان کی سرزمین سے اٹھے ۔ خدا ان کی تربت پر اپنے انوار کی بارش نازل کرے ۔

مولانا حسین احمد مدنی

رشید الوحیدی

مولانا حسین احمد مدنی ۱۲۹۶ھ ہجری میں یوپی کے ایک چھوٹے سے قصبے بانگرمؤ ضلع اناؤ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد مرحوم مولانا حبیب اللہ صاحب ایک اسکول میں مدرس تھے۔ ابھی مولانا کی عمر بہت کم تھی کہ ان کے والد بانگرمؤ سے آبائی وطن ٹانڈہ ضلع فیض آباد واپس آگئے۔ مولانا مدنی نے ابتدائی پرورش اسی قصبے میں کی۔ یہاں ان کے والد بانگرمؤ مڈل اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ اس طرح آپ کی تعلیم کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔ ابتدائی تعلیم حسب دستور گھر ہی پر شروع ہوئی۔ اس سلسلے میں کسی چھان بین کی ضرورت نہیں مولانا خود اپنی سوانح عمری "نقش حیات" میں تحریر فرماتے ہیں: "والد مرحوم کو بچوں کی تعلیم و تربیت کا بہت خیال تھا ہر بچے کو چار برس کی عمر میں پڑھنے بٹھا دیتے تھے [illegible] ہر جا لحاظ عمر کافی سخت کر دیتے تھے۔" اس طرح مولانا کو آزادی کے ساتھ کھیلنے کا صرف ۴ برس بچپن کا حصہ نصیب ہوا۔ آگے تحریر فرماتے ہیں۔ "جب میں ۴ برس کا ہوا میں نے والدہ مرحومہ کے پاس قاعدہ بغدادی اور سیپارہ پڑھنا شروع کر دیا۔ صبح سات سے ۹ بجے تک تو گھر پر پڑھتا۔ اس کے بعد کھانا کھا کر والد مرحوم کے ساتھ اسکول چلا جاتا۔" آپ کے والد مرحوم بچوں کی تربیت کے خیال سے بچوں کو زیادہ تر باہر کے لڑکوں کے ساتھ کھیلنے کو منع کرتے تھے۔ چنانچہ مولانا اگر کبھی موقع مل جاتا تو اپنے ایک ماموں زاد بھائی کے یہاں جو ان کے گھر کے قریب رہتے تھے چلے جاتے اور گھر میں چھپ کر کھیلتے۔ اگر کبھی شامتِ اعمال سے اس کی اطلاع والد کو ہو جاتی تو خاصی مرمت ہو جاتی۔ اس طرح ماں باپ کے زیر تربیت اور سایۂ عاطفت میں آٹھ برس کی عمر تک وطن ہی میں قرآن شریف (ناظرہ) اور فارسی کی چند کتابیں مثلاً آمدنامہ، دستور الصبیان، گلستاں وغیرہ پڑھ لیں اور اسکول میں ساتویں درجے تک پڑھ لیا تھا۔ اس زمانے کی تعلیم کا معیار نیز فنون کی کثرت کی وجہ سے کہ درجے میں اکثر اقسام ریاضی حساب اقلیدس تاریخ عمومی تاریخ خصوصی مساحت عملی تحریر۔ املا۔ خوشخط شکستہ اردو کورس وغیرہ شامل ہے۔ نیز ان تمام فنون میں مولانا نے اپنی ذہین طبیعت اور والد مرحوم کی تربیت سے بہت اچھی مہارت حاصل کر لی تھی۔ مولانا ابھی تیرہ سال کے ہوئے تھے کہ ان کے (......) والد مرحوم نے جو کہ مذہبی اور دیندار آدمی تھے، مذہبی تعلیم کے لئے انہیں دارالعلوم دیوبند بھیج دیا جہاں انہوں نے رات دن کی محنتِ شاقہ سے اساتذہ

کی توجہ اور شفقت کا رخ اپنی طرف پھیر لیا۔ دیوبند میں عسرت اور تنگی تالیق کی سخت گرانی سے ہمیشہ پریشان رہے تاہم اس کو ایک نعمت خداوندی سمجھا۔ حسب قاعدہ دیوبند کے اہل شہر طلباء دارالعلوم کی صلاح کے خیال سے اپنے گھروں سے کھانا کھلایا کرتے تھے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب نے جو کہ مرحوم شناسی کا جوہر رکھتے تھے۔ انہیں اپنے دامن میں پناہ دی اور ان کا کھانا اپنے گھر سے کر دیا تھا۔ دو وقت صبح و شام مولانا کھانا لینے شہر تشریف لے جاتے اس سے بے نیاز اور سچے طالب علم کی ضروریات بہت محدود تھیں صرف چند کتابیں، چند سے کپڑے اور مٹی کا پیالہ جس میں مولانا اپنا اور اپنے بڑے بھائی کا کھانا لاتے تھے ان کا کل سامان تھا۔ ایک مرتبہ کسی طرح آپ سے کھانا لاتے وقت ٹوٹ گیا آپ وہیں کھڑے ہو کر رونے لگے۔ حضرت شیخ الہند کے والد محترم ادھر سے گزرے رونے کا سبب پوچھا تو آپ نے کہا کہ ایک ہی پیالہ تھا وہ ٹوٹ گیا اب کھانا کس چیز میں لاؤں اور اگر یوں ہی واپس جاتا ہوں تو بھائی ماریں گے۔ انہوں نے تسلی دی اور دوسرا پیالہ خرید کر دیا تو یہ نازک مرحلہ طے پایا۔ آپ کی محنت کا یہ عالم تھا کہ ہفتے میں ۶ دن شب و روز کتابوں میں گھسے رہتے اور ساتویں دن پورا دن رات سو کر گزارتے حتیٰ کہ کھانے تک کا ہوش نہ رہتا صرف پانچوں وقت نماز پڑھنے کے لئے اٹھتے، شادیٔ تحائف بہت کم تھا نیز وہ ترشیدہ سے بچنے کے لئے قلمیں سادی پر استعمال فرماتے تھے آپ کے نزدیک کتاب، درسگاہ، استاد کا ادب، احترام ... سچے علم کے حصول کے لئے ضروری تھی۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ حیرت اور دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ایک مرتبہ شہر میں بھنگیوں نے ہڑتال کر دی شہر کی پریشانی کا عالم قابل دید تھا گندگی کم نہ ہوئی اس پر پاخانے کی سڑاند اور جا بجا کسی راستے کم نہ تھی شیخ الہند نے مولانا سے ... کئی دن سے صفائی نہیں ہوئی ہے ابھی شاید ان کو بھنگیوں کی اس تحریک کا علم نہ تھا۔ مولانا صورت حال سے واقف تھے فوراً تشریف لے گئے اور واپس آئے کہ آکر چپکے چپکے تمام غلاظت ... تھی جو کرنا ... بالکل صاف کر دی ... اس واقعہ کی اطلاع نہ ہو سکی ۱۳۱۶ھ میں مولانا نے والد محترم ہجرت کر کے مدینے تشریف لے گئے وہاں پہنچ کر ... زیادہ مولانا کی کتاب نقش حیات میں بالتفصیل درج ہے بہر حال ذرائع آمدنی کا نقصان اور خرچ کی ضرورت سے مجبور ہو کر ... دوکان کھولی مگر اس کی آمدنی زیادہ تر مکان اور دوکان کے کرائے پر صرف ہوتی۔ آخر مجبور ہو کر اجرت پر کتابت شروع کر دی اور ... کے مطابق درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھنا بھی از حد ضروری تھا۔ چنانچہ حرم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں درس حدیث کا سلسلہ شروع کر دیا ... گھر کی ضرورت کے لئے مشک بھر کر پانی لاتے۔ دن بھر دوسری جگہ مدرسہ دینیات کے علاوہ درس دیتے تھے بعض وقت عسرت کا یہ عالم ... پاؤ مونگ کی دال ایک ہانڈی بھر کر پانی میں نمک ڈال کر ابال لیا اور تھوڑا تھوڑا سب نے مل کر پی لیا اللہ کا شکر ادا کر کے اپنے اپنے کام پر روانہ ہو گئے۔ کبھی تربوز کے چھلکے کو لا کر نمک ملا کر کھاتے اور کبھی سبزی منڈی سے گری پڑی سبزی کو دھو کر ابال کر اس سے تار نفس کے قیام کا سہارا ڈھونڈا۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ پیٹ پر پتھر باندھ کر حرم شریف میں درس دینے کے لئے تشریف لے گئے اس طرح مولانا گوناگوں تکلیفوں اور صعوبتوں سے گزرے اور امتحان میں پورے اترے۔ آخر جب اہل مدینہ سے متجاوز ہو کر حلقہ درس ترک و بخارا، سمرقند، قازان، ترکستان، مصر اور کابل کے طلبہ تک پہنچا تو مولانا نے خدا کے بھروسے پر کسب معاش کے اور ذریعوں کو ترک فرما دیا اور یکسو ہو کر درس حدیث میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ پھر ۱۹ ... سنہ میں حضرت شیخ الہند کے ساتھ گرفتار ... ہوئے اور مالٹا بھیج دیئے گئے۔ شیخ الہند کی تحریک آزادی جو عام طور سے ریشمی خطوط کی تحریک کے نام سے مشہور ہے۔ ہماری قومی زندگی کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے شیخ الہند کا کیا منصوبہ تھا اور ہندوستان کو انگریزوں کے چنگل سے چھڑانے کے لئے انہوں نے کیا اسکیم بنائی تھی۔ برطانوی سامراج کے C — I — D سے دامن بچا کر وہ کس طرح حجاز پہنچے تھے اور وہاں شریف مکہ کی غداریوں کا کس طرح نشانہ بنے تھے۔ یہ بڑی جرأت انگیز مجاہدانہ داستان ہے اور تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہو گئی ہے۔ حجاز میں مولانا مدنی کو جب اپنے استاد محترم کے منصوبے کا علم ہوا تو دل سے ان کے ساتھ ہو گئے۔ یہاں سے

[illegible] شیخ الہند کے بعد مولانا نے ان کے نصب العین کو پوری طرح اپنایا [illegible] کی بڑی بڑی
مولانا [illegible] [illegible] کی شکست
[illegible] چنانچہ [illegible] حضرت شیخ الہند کے رفیق [illegible] اپنے [illegible] انگریز حکام کی [illegible]
[illegible] شیخ الہند [illegible] گرم پانی [illegible] کی وجہ سے [illegible] بہت [illegible] مولانا [illegible] استاد کی اس تکلیف کا
[illegible] آپ ایک [illegible] پانی سے [illegible] لگے رہتے [illegible] سے [illegible] حرارت سے [illegible]
[illegible] رہے بہت دنوں تک یہ [illegible]

[illegible] شیخ الہند [illegible] جس [illegible] [illegible] شیخ [illegible] ایک حریت پسند
[illegible] کی حیثیت سے [illegible]
[illegible] ثابت [illegible] میدان سیاست [illegible]
[illegible] ثابت ہوئی جس سے [illegible] مولانا [illegible]
[illegible] کے عہدے [illegible]
[illegible] سے [illegible] عوام سے [illegible]
[illegible] نے شروع کی تھی۔ چنانچہ مولانا سے شیخ [illegible]
[illegible] ہندوستان چھوڑنے کی صورت میں [illegible] ترقی دی اس کے
[illegible] ہندوستان [illegible]
[illegible] سے میں کسی [illegible] کو قوموں [illegible]
[illegible] پردہ پوشی ناممکن ہے۔ [illegible]
[illegible] مولانا کی زندگی میں [illegible] آپ کا [illegible]
[illegible] کے
[illegible] ۱۲ بجے تک دار العلوم میں طلبہ [illegible] حدیث شریف کا درس دیتے ہیں اس کے بعد [illegible]
[illegible] ۳۰ [illegible] کا ہجوم رہتا ہے جن
مسئلے میں کچھ الجھ رہتے ہیں۔ پھر ۴ بجے [illegible] جاتے ہیں ان کے علاوہ آپ کے یہاں [illegible]
[illegible] مولانا [illegible] جس کے لئے وقت کی کوئی قید نہیں۔
[illegible] خود مولانا وقت دیتے ہیں [illegible] کے معلم و قیام کا [illegible] مولانا [illegible]
ایک ایک ماہ بھی لوگ قیام کرتے ہیں جس میں پاکستان ہندوستان کے علاوہ مدراس کلکتہ بمبئی [illegible] سورت بھی جگہ کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔
مولانا کی محفل میں [illegible] ادیب [illegible] عوام شہری دیہاتی امیر غریب ہر طرح کے لوگ شامل ہیں۔ [illegible] مولانا کی ذات میں اپنے [illegible]
[illegible] ان سے تسکین حاصل کرتے ہیں۔ کوئی مشکلات کا ذکر کرتا ہے جس میں [illegible] مسائل [illegible] ہر طرح کی مشکلیں شامل ہیں اور
مولانا ہر لمحہ نئے مسائل کے لئے اپنے آپ کو تیار رکھتے ہیں کہیں میر و غالب کی [illegible] زیر بحث ہے تو مولانا ایک ایک شعر پر پوری طرح تبصرہ
فرمائیں گے کسی وقت ڈاکٹر اقبال مرحوم کا ذکر آگیا تو ان کے جذبۂ دینی اور خودی کے مسئلے پر سیر حاصل تشریح فرمائیں گے کہیں ابوالکلام کی نثر
موضوع سخن ہے کسی وقت قسطنطنیہ، ٹیونس، مراکش کی موجودہ کشمکش [illegible] الگ [illegible] عنوان بحث بن گئے ہیں دوسرے
وقت آپ کسی دیہاتی سے مصروف تکلم پائیں گے تو ربیع و خریف کی ہونے والی تمام فصلوں میں ہر قسم کے [illegible] پر مفصل اظہار خیال فرمائیں
گے اور اس قدر معلوماتی تبصرہ کر بیٹھے [illegible] بڑا گھاگ کسان اور زمیندار بھی زانوئے ادب تہ کرکے [illegible] کا درس حاصل کرے گا۔ پھلوں
میں بالخصوص آم اور خربوزہ پسند فرماتے ہیں لیکن ان کے انتخاب میں کسی کے محتاج نہیں [illegible] قسموں پر بخوبی تشریح فرمائیں گے [illegible]

خلاق کے سلسلے میں اصل تو آپ کی مجلس میں ہر وقت ایک نہ ایک ظریف الطبع لیا ال جائے گا جو مولانا کی طبیعت کا ایا دیکھ ... ہیں ... اور پھر مولانا کو ایک اچھے ... میں دیکھئے کسی کو کتاب ... سے کسی کو ... ہے کہ ... تو اس کو اسی طرح ... چھیڑیں گے ... زبانی ہی نہیں بلکہ اشارے ... کی تصویر دکھائیں گے اگر کسی نے سلوک اور تصوف کے مسائل چھیڑ دیئے ہیں تو اس قدر وجدانی کیفیت پیدا ہو ... کو شعبہ بزم ... ایک مرتبہ اپنی عبادت اور طاعت پر شک ہونے لگے اور ... ولایت کے ... ایسے ... کی ... سے ... اس طرح حل ہوتے چلے جائیں گے کہ طالب ... تصوف ... قسم کے ... آئے گا۔ غرض کہ ہر قسم کے اذہان کو اپنی ... طبعی ... تجربات اس محفل میں حاصل ہو جاتی ہے۔ مہمانوں کے ... بعض اوقات ... تکلیف وہ صورت اختیار کر لیتے ہیں کوئی ... کر ... بسم اللہ ہے تشریف سے ... کبھی ... شادی وغیرہ ... مولانا کے ... کا اکثر ... رہتے ہیں مولانا کچھ دیر تو ... سمجھاتے ہوئے پھر خوش دلانہ ... آخر ان کے اخلاق کریمانہ ... آپ انکار نہیں ... اور ... میں تاریخ لکھ لی ہوتی ہے ایک ... صاحب تشریف لائے اور آتے ہی پوچھا کہ حضرت موسیٰ کے والد کا کیا نام تھا مولانا نے اس کی ... طرز سوال کو جانپ لیا فرمایا ... بس پھر کیا تھا مہذب اور غیر مہذب گالیاں جس قدر ... یہ شخص ... میں ... کے وقت مولانا نے ساتھ دسترخوان پر کھانا کھلایا ... وہیں قیام کیا ایسے بھی مہمان آتے ہیں جو بقول مولانا ... اصلاح نفس کے لئے آتے ہیں۔ مولانا کو ایک باپ کی حیثیت سے جہاں تک ... سے شاید کوئی شفیق سے شفیق باپ بوجہ کمال محبت و قدرت کے وہ درجہ حاصل نہ کر سکے۔

ابھی ابھی مولانا بمبئی کے طویل سفر سے واپس آئے ہیں اگر کسی ... تو ... سے تشریف لے جائیں گے۔ وہاں سے ... نیچے ہی ... کہ چاروں طرف سے ابا جی ابا جی کا شور بلند ہوا دوسرے لے کر کوئی بچہ پیروں سے چمٹا جارہا ہے کوئی گود سے ... پشت پر چڑھا ... ہی ... رہا ہے مولانا غایت شفقت و محبت سے فرماتے ہیں ... دیکھ تیرے لئے کیا لایا ہوں ... کا شائبہ تک نہیں حیرت ہے اس برداشت پر اور تعجب ہے اس ... دنیا اس طبیعت پر اور اخلاق مصطفوی پر۔ بچوں کو ... بہلا رہے ہیں مگر بچوں کو تو مدت سے بچھڑے ہوئے ابا جی کی ضرورت ہے اور والد محترم ... دیر بعد تو ... وقت سے بھرپور ... سا حصہ بچوں کی ... کے لئے نکالتے ہیں۔ چھوٹے صاحبزادے نے کوئی جلسہ منعقد کیا تو اس کی صدارت بھی ابا جی سے کرانا چاہتے ہیں ابا جی پریشان ہو جاتے ہیں میرے پاس کہاں وقت ... اس وقت ایک شفیق باپ اور چھوٹے ... کا ... جہاں ... اور ... تمام ... متواتر ... سے وقت کا ... فرصت کم ہوتا تو شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کا ... ہو سکتا ہے۔

مولانا کے مکان پر مہمانوں کا ہجوم تو رہتا ہے اس کے علاوہ دارالعلوم میں طلبہ کی امداد کے سلسلے میں مولانا کی طرف سے کھانا ... یہی نہیں کنبہ پروری آپ کا ایک اہم ترین فریضہ ہے اور ... میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو والد مرحوم کے زمانے کی بیوائیں ہیں ... کے ساتھ رہنے والوں میں جس قدر حاجتمند تھے۔ سبھی مولانا کی امداد ... ہیں اور ان کا خرچ مولانا کے ذمے ہے۔ عید الفطر عید الاضحیٰ کے مبارک موقع پہ آج بھی مولانا اپنے محلے کے ہر گھر میں تشریف لے جاتے ہیں اور بڑوں سے بچوں تک کو حسب مراتب عیدی تقسیم فرماتے ہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ کے انتقال کو تقریباً ۴۰ سال کا عرصہ گزرا ان کی صاحبزادیوں کے ساتھ وہ معاملہ ہے جو شاید ایک باپ اپنی بیٹی کے ساتھ نہ کر سکے عید کے مبارک موقع پر اس گھر میں کافی رقم خرچ فرماتے ہیں اور خود بنفس نفیس تشریف لے جاتے ہیں تمام احوال دریافت فرماتے ہیں صاحبزادیوں کے سامنے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اپنے کسی بہت بڑے سرپرست یا باپ کے سامنے ہیں گفتگو میں تابعداری انکساری کا طرز نمایاں رہتا ہے۔

مولانا کو مہمانوں کے علاوہ درخت اور پرندوں سے بھی بہت انس ہے دارالعلوم جیسے عظیم الشان ادارے میں کافی خوبصورت وسیع و عریض باغ صرف مولانا کے شوق اور طلب کا رہین کرم ہے جس میں بہت سے درخت بنگال۔ آسام۔ بمبئی۔ سورت۔ لکھنؤ سے مولانا کے اپنے حبیب خاص کے

مقالات کے ساتھ جس احساس کی آبیاری ہوا خیال ہو اس سے زیادہ خود مولانا رکھتے ہیں۔ مجھ کے سلسلے میں معاملے خصوصی پر سب سے سخت
گیر رہتے ہیں لیکن قصداً اگر کسی نے صدر تک پہنچا اس وقت تو آپ سے برداشت نہ ہوا اور اگر کسی غرض سے یا اتفاقاً کسی نے کوئی
بات ہو گیا تو ایسا خیال نہیں فرماتے۔ ایک بار آپ سے بہت قیمتی پھول منگے آئے مولانا نہیں شوق سے واحد ذہ سب سے انتظام صاحب
کے حوالے کی ہیں کہ آ کر کسی جگہ رکھے گئے ہو گر وہ سے پہلے ... دوپہر تک ختم ہو گئے۔ برداشت اور درگزر کی جو کیفیت اس وقت دیکھنے میں
آئی ... حیرت انگیز تھی۔ اچانک سے ہی کر اٹھایا اور مسکراتے ہوئے کمرے میں تشریف لے گئے اور معمول کے بعد کبھی اس پر اظہار خیال نہ فرمایا۔
بحیثیت مجموعی مولانا کی زندگی بہت حسین [illegible] اور مہذب زندگی ہے جس میں اس شاگرد علم کو سیرۃ [illegible] ہے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی

نعیم صدیقی

کہتے ہیں کہ پاکستان میں تعلیم پھیل رہی ہے، تعلیم کی کمی ہے، افلاس کی کمی ہے ــــــ اور دوسری طرف آدمیوں کی بہتات ہے۔ لیکن [illegible] سب سے خوفناک قحط آدمیوں ہی کا پڑ رہا ہے۔ کوئی قوم اگر آدمیوں کے قحط سے دوچار نہ ہو تو وہ ہر چیز کی کمی کو پورا کر سکتی ہے۔ [illegible] ایک بے پناہ ہجوم، ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہے جو پاک زمین کے حصے میں آیا ہے ــــــ آٹھ کروڑ نفوس! ــــــ ان میں منصب دار بھی ہیں، ایم ایل اے بھی ہیں، صحافی بھی ہیں، ادیب اور اہل فن بھی ہیں، تاجر اور صناع بھی ہیں، سپاہی اور سپہ گر بھی ہیں، لیکن انسان بہت ہی کم ہیں [illegible] قسمت میں بہت لکھے گئے ہیں، لیکن آدمی ہمارے پاس نہیں ہیں! آج بھی ہمارے شہر زندگی کے گرد پیر رومی کا شیخ چراغ ہاتھ میں لئے سرگرداں ہے [illegible] ہے کہ زِ دیو و دد ملولم و انسانم آرزوست! ہو سکتا ہے کہ ہمارے ہاں روایتی مردم شماری کا ریکارڈ کئی کروڑوں کا بوجھ ہو، لیکن اگر ہم اپنے اس کے ہر فرد کو معاشی پیمانوں کو محض بطور مروّت انسان کہنا چھوڑ دیں تو پھر شاید مردم شماری کا سارا اندراج چاول کے ایک دانے پر ہو سکے گا! ــــــ یہ آپ نے سنا ہی ہو گا کہ ماہرین خطاطی چاول کے ایک دانے پر پورا سورۂ یٰسین لکھ دکھاتے ہیں! ہمیں آدمی بننے کیلئے ابھی ارتقاء کی بڑی لمبی اور کٹھن راہ طے کرنی ہے [illegible]۔ آدمی گوشت اور ہڈی کے اس چلتے پھرتے ڈھانچے کو نہیں کہتے جس پر چند اندرونی خواہشات سواری کرتی ہیں۔ آدمی نام ہے شعور اور احساس کا، آدمی نام ہے اصول اور ایمان کا، آدمی نام ہے سیرت اور اخلاق کا۔ اور یہ مخلوق ہمارے ہاں ایک ناقابلِ ذکر قلیت کا مقام رکھتی ہے۔

ابوالاعلیٰ مودودی اسی اقلیت کا ایک فرد ہے ــــــ ایک آدمی!

وہ اگرچہ ایک انقلابی مفکر بھی ہے، ایک سحر طراز ادیب اور خطیب بھی، لیکن اس کی بڑائی کا اصل راز یہ ہے کہ وہ ایک آدمی ہے، ایک ایسا آدمی جو پاکستانی ہجوم میں نمایاں ہے۔ اگر ہم ہمالہ کی کسی چوٹی پر کھڑے ہو کر ارضِ پاک کے آدمیوں پر نگاہ ڈالیں تو شاید پہلی نگاہ اسی شخصیت کے حصے میں آئے گی۔ آخر کیوں؟ ــــــ اس لئے کہ یہ ایک ایسی شخصیت ہے کہ جس کی اہمیت کسی آبائی جاگیر، کسی سرکاری عہدے، کسی خاندانی منصب اور کسی مصنوعی شہرت اور نمائشی پروپیگنڈے کے سبب نہیں، بلکہ محض ایک نظریہ و مقصد، ایک سیرت و کردار اور ایک سرگرمیٔ عمل کے بل پر ہے۔ وہ بڑا آدمی ہے تو فقط اس بنیاد پر کہ وہ ایک آدمی ہے، وہ ایک انسان ہے!

[illegible] ہے مثلاً ہم بہت سے لوگ کو جانتے ہیں جو اب نظام پرست ہیں مثلاً شیخ محمد ایک انقلابی رہنما ہیں جس تنظیم، تحریک
[illegible] ہمیں ما ہیں سکے ساتھ جانتے ہیں مودودی صاحب مذہبی معاملات کے سوال زیر بحث لائے ہیں اسلامی نظام کا سیاسی تصور
[illegible] سیاسی شخصیت کی حیثیت سے بھی پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن رکھا جائے تو کیا یہ بات کوئی جذبہ ہے؟ لیکن یہ
[illegible] ملک کا عوامی پہلو ہے اور وہ پہلو اسلامی معاملات کو عوام کیا جاتا ہے جنہوں نے مرحلے کو دیکھا اور دل کر کے زیر
[illegible] پہنچے پر پروپیگنڈا کا سرچشمہ بنا دیا جاتا ہے۔ اس تحریر میں ایک ان تمام لوگوں کے لیے ایک بار پھر دیا گیا ہے جنہیں یہ پیش کی نہیں ہے کہ
[illegible] ہیں کہ یہ شخص جو یکتا ہے پاکستان میں پیدا ہوا ہے واقف ہے اور جس کا تعلق عراق، مصر، شام اور حجاز
[illegible] ان کا اصل جو نظریہ کیا ہے۔

[illegible] اسی سلسلے میں مولانا سے متعلق ایک بات ہے۔ مولانا مودودی مرحوم کی شخصیت پر ... مختلف طرح جو
[illegible] دیکھنے کو مودودی صاحب سے ملتے ہیں تو ان کی شخصیت مختلف ہوتی ہے۔ ... آدمی ہے اگر ... تو ان کے
[illegible] جا چکے ہو جاتے ہیں۔ لیکن مودودی کی شخصیت اپنے ... سے ... ایک ... ہے کہ
[illegible] مولانا مودودی کی سوانح عمری اس کی پیشانی اور چہرے پر لکھی ہوئی ہے۔ ... سندھی مرحوم ... وطن تشریف
[illegible] پر ریل میں سفر کرتے ہوئے لاہور سے گزرے۔ مولانا مودودی ان سے ملاقات لینے جب ... پر پہنچے ... تو مولانا سندھی
[illegible] تلاش میں تھے۔ مولانا سندھی مرحوم نے دیکھتے ہی خاص طور پر توجہ کی ... اور پوچھا ... سے ملاقات نہ ہونے
[illegible] کے ساتھ استفہامیہ انداز میں فرمایا: "آپ مولانا مودودی ہیں؟" ... چہرے ... ایک لفظ ... شخصیت
[illegible] شخصیت کو پہچان لینے کی یہ حیرت انگیز نظیر سندھی صاحب نے قائم کی ... مودودی کا ظاہر اس کے باطن کا عکس
[illegible] ظاہر و باطن کے درمیان کوئی پیدا کردہ فاصلے نہیں ہیں۔ تصنع اور تکلف کے پردے نہیں ہیں ... ہے۔ وہ دور سے جو کچھ
[illegible] قریب آنے پر بھی اور زیادہ نکھر کر سامنے آ جاتا ہے۔

[illegible] سترہ اٹھارہ برس پہلے کی بات ہے ــــــ اور آج میں ان برسوں کو ... کی ... میں ... کا واقعہ ہے
میں ابھی اپنے گاؤں میں مقیم تھا اور آئندہ زندگی کے متعلق ... لکھنے ... اور زیادہ تر پڑھنے ... میں مصروف!
[illegible] ... دیہی آبادی کے برانچ پوسٹ آفس میں ... کا ... میرے نام ... کوئی اخبار یا رسالہ
[illegible] رسالے میں مولانا کے نام سے جب پہلا مضمون میری نظر سے گزرا تو مضمون نگار ... ابوالاعلیٰ مودودی بڑا ہی عجیب لگا۔ یہ مضمون کسی
[illegible] کا متحمل نہیں تھا۔ لیکن اس میں محض ایک اسلامی ... ــــــ دارالاسلام ــــــ کے عمل قیام کی دعوت دی گئی تھی۔ اس تحریر
[illegible] دلی بیاں کا حسن تو تھا ہی، مگر اس کا تمام تاثر (جو اب تک میری کتاب ذہن کے اوراق پر ثبت ہے) یہ تھا کہ لکھنے والا ان تمام لکھنے والوں
[illegible] مختلف تھا جنہیں میں جانتا تھا اور اس کے اندر بڑا غیر معمولی پن ہے۔ ہمارے ہاں کی روایت کا تقاضا یہ تھا کہ اس ترغیبی مضمون میں ایک
[illegible] ... دھیلی اور دوسرے ... پیش کیے جاتے۔ لیکن نہیں، جذباتیت کے بجائے اس کا مزاج فکری تھا اور اس میں روشن
[illegible] کے ساتھ مشکلات و موانع کو بھی قاری کے سامنے رکھ دیا گیا تھا۔ اس کے باوجود بغیر صحافیانہ اور خطیبانہ لفاظی سے مدد لیے۔ لکھنے والے نے اس

٭ [illegible] کے ایک تخیل کا نقش میرے ذہن نے علامہ اقبال کے ایک خطبہ رخطبے سے اخذ کیا تھا ... کے ساتھ ... پڑھا۔ ... دارالاسلام کو
[illegible] ... کر رہا تھا

میں اس کی پوری ترتیبی روح چھپا رکھی تھی۔ اس مضمون کے پس منظر کے دھندلکے میں ایک نئی قسم کی شخصیت میرے سامنے تھی جسے پہچاننے سے تو میں قاصر تھا، لیکن جس کی جاذبیت نے مجھے محسوس کرتا، انشاؤں میں اپنی جگہ سے ہلا دیا۔ یہ کون آدمی ہے؟ یہ انوکھا سا نام کس کا ہے؟ یہ کیا اسکیم ہے، جس پر سرعت ساعت تھے اور مضمون کو بار بار پڑھا جا رہا تھا۔ والد مرحوم سے ذکر کیا۔ ان کو پڑھ کر سنایا۔ اس رسالے کے مدیر نے اپنے نوٹ میں خود بھی مجوزہ اسکیم سے دلچسپی کا اظہار کیا تھا، لہٰذا ان کو خط لکھا اور خط کے جواب میں سرسری سی ابتدائی معلومات مزید حاصل ہوئیں مگر ان معلومات نے مزید تشنگی پیدا کر دی۔ میرے دل میں اس سے قبل صرف ایک ہی شخصیت سے غیر معمولی دلچسپی کا قرار تھی ——— میرا اشارہ اقبالؒ کی طرف ہے ——— لیکن اب ایک اور متوازی قسم کی شخصیت سے میری دلچسپی کا آغاز ہو چکا تھا ——— بعد میں غائبانہ تعارف کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔

۱۹۳۸ء کے بالکل آغاز میں ہفتہ بھر کا پروگرام بنا کر لاہور آیا اور مدعائے سفر یہی تھا کہ اقبال اور مودودی دونوں سے ملاقات کروں گا بلکہ اپنے اس دور کے ذہن کے مطابق کہنا چاہیے "زیارت"۔ لیکن زیارت صرف علامہ اقبال ہی کی حاصل ہو سکی جو بیک وقت پہلی ہی ثابت ہوئی اور آخری بھی! چند ہفتے بعد اقبال اپنا نغمۂ حیات افروز پورا کر کے ازلی و ابدی فضاؤں کی طرف پرواز کر گئے۔ ۱۹۳۸ء ہی کے وسطی حصے میں مودودی صاحب کو قریب سے دیکھنے کا اشتیاق لیے ہوئے پٹھانکوٹ کا عزم باندھ کر دوسرا سفر کیا۔ غائبانہ تعارف تو اب کافی آگے تک جا چکا تھا، کیونکہ ماہنامہ ترجمان القرآن کے متعدد شمارے نگاہ سے گزر چکے تھے۔ غالباً سیاسی کشمکش حصہ اول کے فکر انگیز مباحث دل و دماغ میں اپنی جگہ پیدا کر چکے تھے اور مولانا کے ساتھ کام کرنے والے ایک کرم فرما سے خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ یہاں اس امر کا ضمناً تذکرہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اگرچہ ایک غیر سیاسی علاقے کا دیہاتی نوجوان تھا اور عملاً پارٹی پالیٹکس سے الگ تھا، لیکن ملک میں مسلمانوں کو انگریزی استبداد اور متعصب ہندو اکثریت کی دو بلاؤں سے جو ہمت آزما کشمکش درپیش تھی اس سے فطری حد تک گہرا ربط رکھتا تھا۔ اپنی پوری قوم کی طرح میں بھی اندھیرے میں تھا کہ اب کیا ہونا چاہیے اور راہ نجات کیا ہے؟ مولانا مودودی کی تحریریں دیکھ کر امید کی ایک کرن ہاتھ آئی کہ شاید یہ شخص صحیح طرز پر سوچ رہا ہے اور ممکن ہے کہ اس کے ذریعے الجھنوں کے اس جنگل سے باہر نکلنے کا راستہ مل سکے جو واقعاتی تاریخ کی صورت میں دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ میری ابتدائی دلچسپی مذہبی سے زیادہ سیاسی تھی۔ لیکن خود اس سیاست کے اندر "مسلم قومیت" کی روح تہ نشین تھی۔ ہاں تو میں گھر سے چلا اور کچھ وقفہ دارالاسلام کی اس نو آبادی میں رہ کر مولانا مودودی اور ان کے خیالات اور ان کی عملی اسکیم کو سمجھنے کا ارادہ لے کر چلا۔ بس والوں نے اپر باری دوآب کی نہر کے کنارے اتارا۔ کچھ دیر کھڑا دیکھتا رہا کہ کوئی دیہاتی آئے اور مزدوری لے کر سامان پہنچا دے۔ آخر اس بستی کا خاکروب "فقیریا" ادھر سے گزرا اور جب اس کو معلوم ہوا کہ مجھے دارالاسلام جانا ہے تو اس نے سوٹ کیس اور بستر سر پر رکھ لیا اور ہم چلے۔ میرا یہ راہنما مجھے بسوں کی سڑک کے بجائے ریل کے پل کے رستے لے گیا جو نیچے سے بند نہیں تھا۔ اور ایک ایک قدم اس کے (غالباً سٹر) سلیپروں پر رکھ کر اسے پار کرنا پڑتا تھا۔ پہلے تو اتنے لمبے پل اور اس کے نیچے شور کرتے اور بپھرے ہوئے دھاں دھاں پانی کو دیکھ کر دل دہل گیا۔ ارادہ کیا کہ واپس ہو کر جرنیلی سڑک کے راستے نہر کو پار کر لوں، لیکن پھر خیال آیا کہ ایک خاکروب کے سامنے مجھے ایسی کمزوری نہیں دکھانی چاہیے۔ چلا مگر دس پندرہ سلیپروں پر لمبے لمبے ڈگ بھرنے کے بعد سر چکرایا۔ بیٹھ گیا۔ لیکن ایک بار پھر اسی ہمت افزا خیال نے سہارا دیا اور پھر فقیریا کے نقوش قدم پر آگے بڑھنے لگا جو بغیر پیچھے مڑ کر دیکھے بے ساختگی سے چلا جا رہا تھا۔ پل پار کرنے کے بعد جھاڑیوں، درختوں اور سبز گھاس کے بنے ہوئے ماحول میں چند کوارٹر دکھائی دینے لگے اور ان کوارٹروں کے درمیان مسجد اپنے میناروں کی دونوں باہیں اوپر کو پھیلائے کھڑی تھی۔ پہلے سے اطلاع تھی اور ایک دوست منتظر تھے۔

نہایا دھویا اور پھر ملاقات کا بے چینی سے منتظر رہا۔ غالباً مغرب کی نماز کا وقت قریب ہوا تو بستی کی مختصر سی آبادی ——— تین چار افراد ——— مسجد کی طرف سمٹنے لگے۔ اذان ہوئی اور اس کی آواز پر قریب کے ایک بڑے کوارٹر سے ایک شخص برآمد ہوا۔ وائل کا کرتہ، لٹھے کا غرارہ نما پاجامہ، سر پر

وہاں پہلی ایک ٹوپی (جو نماز کیلئے گویا خاص تھی) پاؤں میں نائلون یا کے سیاہ رنگ کے سلیپر —— یہ سارا لباس نہایت نکھرا ہوا منظر میں عجیب شان سے نمایاں تھا —— اس سادہ لباس کے ساتھ ایک روشن چہرہ (جلد کی سپیدی نے ساتھ جو سرخی کی ہلکی سی جھلک لئے ہوئے) جس پر سکتہ چند خوبی معیار سے چھوٹی شرعی سیاہ رنگ داڑھی!! —— کسی تعارف کے بغیر پہچان لیا کہ یہ وہی شخص ہے جس کے خیالات سے میں نے تھوڑا سا استفادہ کیا ہے۔ آنے والے نے مسجد میں داخل ہوتے ہی ایک ایسے انداز سے 'السلام علیکم' کہی جو آج تک میں نے کسی اور میں نہیں پایا۔ خود بڑھ کر مجھ کے ساتھ مصافحہ کیا، کھڑے کھڑے دوستوں نے مختصر تعارف کرایا اور چونکہ نماز کھڑی ہو گئی۔ نماز کا امام بھی وہی شخص تھا۔ دلچسپ یہ کہ نماز اور قرأت کا اسلوب بھی بے حد ندرت لئے ہوئے تھا اور اس میں بھی اس شخص کی سیرت کی جھلک موجود تھی۔

اپنے پروگرام کے مطابق دو مہینے کا عرصہ میں نے جنگل کے دامن میں آباد شدہ اسی ننھی سی بستی میں گزارا۔ مولانا مودودی کا بیشتر وقت ترجمان القرآن کی ادارتی ذمہ داریوں، تصنیفی کاموں اور خط و کتابت میں صرف ہوتا۔ مولانا سے ملاقات یا تو نمازوں کے اوقات پر مسجد کے صحن میں ہوتی اور کبھی نماز سے قبل اور کبھی نماز کے بعد بات چیت رہتی۔ یا عصر کے بعد مولانا جب سیر کو نکلتے تو ترجمان القرآن کے منیجر اور کاتب، مولانا صدر الدین اصلاحی، اور میں —— اور کوئی مہمان آ جاتا تو وہ بھی —— سب ساتھ جاتے۔ دین و سیاست کے اہم مسائل پر بحثیں بھی ہوتیں، لطائف بھی ہوتے۔ بستی اور اس کی مقصدی سکیم سے متعلق معاملات بھی چھڑتے۔ ترجمان القرآن اور مرکزی مکتبہ کے امور کا تذکرہ بھی ہوتا اور اہم اور دلچسپ خطوط اور باہر سے آئے ہوئے سوالات اور اعتراضات پر بھی بات چیت ہو جاتی۔ اس بزم متحرک کی دلچسپیاں اور ان کی یادیں تو اب دل و دماغ کا مستقل سرمایہ بن گئی ہیں۔ پھر مغرب کے بعد کا کھانا یکجائی ہو جاتا اور سلسلۂ گفتگو عشاء تک جاری رہتا۔ اس بزم متحرک کا نشہ دو ہی چار دن میں اتنا تیز ہو گیا تھا کہ صبح ہی سے عصر کا انتظار رہتا اور اشتیاق کہتا کہ سورج خدا کے واسطے جلد ڈھلے!

ابتدائی رابطے کے اس دور کی واقعاتی تفصیلات اب کچھ زیادہ محفوظ نہیں ہیں اور نہ گفتگوؤں ہی کا پورا مواد سینے میں رہ گیا ہے۔ البتہ وہ تاثرات میں بیان کر سکتا ہوں جن کو اپنے ساتھ لئے میں بعد کی اسلامی تحریک کے اس چھوٹے سے کیمپ سے رخصت ہوا۔

خیالات ہی کے مطالعے سے میں نے اندازہ کیا تھا کہ یہ شخص مولوی نہیں ہے (یہ بات مولویت کے ہر طرح کے تحقیر آمیز تاثر سے الگ ہو کر محض حقیقت پسندانہ نقطہ نظر سے کہہ رہا ہوں) پہلی بار جو وہ سامنے آئے تو میری نگاہ نے میرے اندازے کی تصدیق کر دی۔ بعد کی ملاقاتوں و گفتگوؤں نے اس رائے کو قطعی بنا دیا۔ مگر حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ یہ شخص مسٹر بھی نہیں تھا۔ وہ مومن اور مسلم اور دین کا مزاج شناس ضرور تھا، مگر اس کے گرد روایتی تقویٰ کی پر تکلف اور بوجھل فضا نام کو بھی موجود نہ تھی۔ وہ آزاد خیال اور وسیع النظر تھا، مگر اس میں وہ لاابالیانہ پن بالکل نہیں تھا جو اسلام تک کی حدود کو پامال کرتا کہیں کا کہیں جا پہنچتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک گفتگو مجھے نہیں بھولتی جب کہ ہماری بزم متحرک میں داڑھی کی بات چھڑ گئی۔ مولانا مودودی کہہ رہے تھے کہ (الفاظ یاد نہیں صرف مفہوم ذہن میں ہے)، داڑھی کو آج جو غیر معمولی اہمیت دے دی گئی ہے اصولاً وہ نظام دین میں نہیں تھی۔ مجھ ایسا رندانہ بدست خود شیو بنانے والا اور داڑھی کے متروک بار گراں سے ڈرنے والا نوجوان یہ الفاظ سن کر مطمئن بھی ہوا اور حیرت زدہ بھی! اسی حیرت کی میں بے اختیار میں نے سوال کیا کہ کیا داڑھی نہیں رکھنی چاہیے؟ جواب ملا کہ میرا مطلب یہ نہیں، رکھنی تو چاہیے لیکن اس کو دینی حلقوں نے جو حد سے بڑھی ہوئی اہمیت دے دی ہے وہ خود دین میں نہیں پائی جاتی —— آج تو ایک مسلمان سے مذہبی حضرات کے ہاں جو اہم ترین اولین مطالبات کئے جاتے ہیں ان میں داڑھی سب سے پیش پیش ہے[1]۔ اس گفتگو سے مجھے یہ بھی اندازہ ہوا کہ یہ شخص متوازن مزاج اور انصاف پسند ہے۔ انصاف پسندی اور توازن کی

[1] اس سلسلے میں یہ بیان کر دینا مناسب ہوگا کہ لباس (مذہبی سہی) پر اور زندگی کے دوسرے پہلوؤں سے متعلق مسائل میں قدامت اور اعتدال پسندانہ مذہبی تصورات اور ان کے خلاف پسندانہ نقطۂ نظر کے درمیان مجھے اس غیر اعتدال کو بدلنے کا موقعہ ملا جو مدتوں سے گھر کر چکا تھا۔ ایسی گفتگوؤں کے زیر اثر غیر شعوری طور پر میرا نقطۂ نظر بدل گیا۔ مگر مجھے اس وقت اس تبدیلی کا پورا شعور نہ تھا۔

بے حد اہم شہادت جو میرے سامنے آئی وہ اس سفر کی یہ پر گزرا لمحہ تھا۔ وہ وقت میرے وائی ایم سی اے کے دن وہی جو مودودی صاحب تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ مطالعہ کی رفتار
تیز سے خاکسار تحریک کے بارے میں جاننے اور سمجھنے کی تحریک پیدا ہو چکی تھی۔ مودودی صاحب سے کہہ دیا میں نے مشرقی صاحب کے نظریہ عسکریت پر ان کے تنقید کے
متعلق رائے معلوم کی۔ اس پر ایک لمبا سلسلۂ گفتگو جاری ہوا جو متحرک ہو چکا۔ مولانا نے نظریۂ ارتقاء کی توضیح کر کے بتایا کہ حقیقت میں علامہ صاحب نے ڈارون کے نظریہ کا
ماحصل لے لیا ہے اور اس پر سے مذہبی اصطلاحات کا جامہ پہنا دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مولانا نے مشورہ دیا کہ ان باتوں کی جانچ کے لیے علامہ صاحب کے اصل
تذکرہ کو دیکھنا چاہیے اور ظاہری طور سے اسے قائم کرنی چاہیے کتابیں مولانا کے پاس موجود تھیں جن میں سے تذکرہ اور اشارات کو میں نے پڑھا۔ دونوں کتابوں پر مولانا
مودودی کے حواشی موجود تھے اور ان کو میں ساتھ ساتھ دلچسپی اور ذوق و تجسس سے پڑھتا گیا۔ ان حواشی میں کہیں زیر بحث اعتراض اور کہیں مختصر تبصرہ یا برملا
عدم اتفاق کا اظہار اور کہیں کہیں فکری مغز شوں پر محنت و سچی گرفت پائی جاتی تھی۔ ان حواشی کو پڑھنے سے مجھے خاکسار تحریک کی بابت سمجھنے کے ساتھ ساتھ مودودی
صاحب کی سیرت کے ایک اہم گوشے کو بھی زیادہ اچھی طرح جاننے کا موقع ملا۔ میرے سامنے اب تک زیادہ تر ایسے ہی لوگ تھے جو نظریاتی اور سیاسی میدان میں اپنے
کے مخالف ہوں لازماً سے مخالف ہوتے ہیں اور جانی دشمن ہو جاتے ہیں، لیکن اس میدان میں مجھے پہلی بار ایک نئے کردار سے تعارف حاصل ہوا۔

یہ بات بھی میں نے محسوس کی کہ ان میں کوئی دنیا ساز قسم کا آدمی نہیں ہے۔ نہ جاہ اور منصب کی طلب ان کی فطرت ہے اس کی شخصیت میں ہے۔ بلکہ یہ ایک اصول و مقصد رکھنے
والے نایاب سرمایہ کی طرح زمانہ کے تغیر کے مقابلے میں رکھتے ہیں۔ مختصر سی معلومات کی روشنی میں یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ اس نے اب تک مقصد کی خاطر قربانیاں دیتے
ہوئے کاٹا ہے اور آئندہ اس کے سامنے معاشی نقصانات اور سیاسی مخالفتوں کے سنگین مراحل ہیں لیکن یہ اپنی منزل سے منہ موڑنے والا نہیں ہے۔

مجھے یہ بھی اندازہ ہوا کہ اس کے سامنے جو کچھ بھی سکیم ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اس کی کوئی صورت میرے ذہن میں متعین نہیں ہو سکی تھی وہ ایک لمبا پروگرام اور
تعمیر اخلاق کا، اور کسانوں کا ساسر جانبی ہے۔ یہ ہتھیلی پر سرسوں جما کر کام کے نتائج کی فصل جلد از جلد کاٹ لینے والوں میں سے نہیں ہے اور نہ جوشیلے پن کا مریض ہے
جو ہماری قوم کا موروثی روگ بن چکا ہے۔

یہ رائے بھی میرے ذہن میں قائم ہو گئی کہ یہ جو کچھ بھی کرنا چاہتا ہے اپنے ارادوں میں مخلص ہے اور اس کی متاع فکر و عمل سطحی کا مال نہیں ہے
سب سے زیادہ مجھے جس چیز نے متاثر کیا وہ میرے جیسے ایک دیہاتی نوجوان کی جس کا علمی یا عملی دینی یا سیاسی کسی بھی لحاظ سے کوئی مقام نہ تھا، مولانا مودودی
کی نگاہوں میں ایک اہمیت حاصل تھی۔ میں نے کسی لمحے یہ محسوس نہ کیا کہ ایک بڑا آدمی کسی اونچے مقام سے مجھے دیکھ رہا ہے اور بڑے آدمیوں کے بارے میں میرا جو کچھ تصور
چلا آ رہا تھا وہ مودودی صاحب کے قریب قطعی طور پر بدل گیا۔ وہاں بعد مراتب کے بجائے میں نے قرب اخوت محسوس کیا۔ یوں یہ حقیقت بھی مجھ پر واضح
تھی کہ مولانا پیران کہن سے نو میدہیں۔ اور بہر جوانان سحل کن حرف مرا کی دعا کے ساتھ قوم کی نئی نسل کی طرف روئے سخن رکھتے ہیں۔

الغرض میرے لئے یہ ایک نیا کردار تھا جس کا عنوان تجویز کرنا مشکل تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا تھا کہ یہ ہمارے مستقبل کا کردار ہے۔ اگلے وقتوں کے
لوگوں کے بالمقابل یہ آنے والے وقتوں کا کردار تھا۔ یہ کردار مرعوب کن نہیں بلکہ جاذبیت دار تھا۔ اس سے ڈر نہیں آتا تھا بلکہ اس کے لئے محبت و احترام
کے جذبات پیدا ہو گئے تھے! ان سارے تاثرات کے ساتھ مودودی کی ذات اور اس کی فکر سے ایک گہرا رابطہ استوار کئے ہوئے میں نے "دارالاسلام" کو
الوداع کہی۔

یہی ہے وہ ایک آدمی جس کی شخصیت کا مطالعہ کرنا پیش نظر ہے۔ مطالعۂ شخصیت کا اصل مقصد اس جوہر سیرت کا سراغ لگانا ہے جس کا پرتو آدمی کی زندگی
کے بعید ترین گوشوں تک جا پڑتا ہے اور جس کے سرچشمے سے زندگی کی کیاری کا ایک ایک ذرۂ خاک سیراب ہوتا ہے۔ کسی کے جوہر سیرت تک پہنچنے کیلئے جب ہم
ذہنی سفر کرتے ہیں تو سب سے پہلے سابقہ "مظاہر شخصیت" سے پیش آتا ہے، اور آگے بڑھیں تو اخلاق اطوار سے دوچار ہوتے ہیں۔ اور سب سے آخر میں جا کر
نظریات و افکار اور اصول و مقاصد دیکھے جاتے ہیں۔ مولانا مودودی کی شخصیت کے فکری پہلو کو تو میں نے ایک الگ مضمون میں پیش کر دیا ہے۔ اخلاق و
اطوار پر یہاں براہ راست بحث کرنے کا ارادہ نہیں، یہاں صرف مظاہر شخصیت کو پیش کرنا مطلوب ہے۔ "مظاہر شخصیت" سے میری مراد آدمی کے وہ خصوصی

ظاہری شخصیت کا خاکہ بھی ملا جلا ہوتا ہے کہ کان، ناک، وضع قطع اور جسمانی خصوصیات کے اندر پائے جاتے ہیں اور جن کے ذریعہ اس کے جوہر اور اس کی سیرت کا کچھ پتہ چلتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ظاہر کا باطن پر اثر پڑتا ہے جس طرح باطن کا ظاہر پر، اور ہم دیکھتے ہیں کہ ظاہری شکل و صورت ہی سے اکثر انسان پہچانا جاتا ہے۔ اپنے معاشرے میں یہ کہاوت بھی مشہور ہے کہ شخصیت کی چھاپ چہرے پر پڑی ہوتی ہے۔ کوئی شخص خواہ کتنا ہی سادہ لباس کیوں نہ پہنے، اس کی وضع قطع اور رکھ رکھاؤ سے اس کی اصل حیثیت کا پتہ چل جاتا ہے۔ اس کے اندر اس کی شخصیت کی روح شامل ہوتی ہے۔ یہ سب علامات شخصیت کی ہیں اور ان کا مطالعہ کر کے کسی شخص کے اصل جوہر کی قدر و قیمت متعین کی جا سکتی ہے اور اس کا اخلاقی مقام متعین کیا جا سکتا ہے۔ جیسے ہم سے حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے۔ آدمی کا دماغ اور اس کے اخلاق و اطوار کے اثرات اور ذہن کے مستورات پر کسی حد تک اس طرح سے مرقوم ہوتے ہیں۔ ظاہر شخصیت کے مطالعہ کی خاص اہمیت یہی ہے کہ اس داستان کو پڑھنے کی کوشش کی جائے جو حسن و صفات کو نقل کیا جاتا ہے اور جسے ہم کہتے ہیں کہ چہرہ پڑھا جا سکتا ہے۔ اسی قدر و قیمت سے شخص ان کے حاصل کرنے اور تو بہت سے اور دوسروں تک منتقل کرنے میں وقت اور خوب صرف کیا کسی معقول آدمی کا مشغلہ نہیں رہا۔

آدمی کا سراپا اس کی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے اور سراپا پر ایک نظر ڈالتے ہی انسانی کردار کا ایک خاکہ ذہن میں آ جاتا ہے جس سے اس کی شخصیت کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے۔ مولانا مودودی کا سراپا، بلکہ وجاہت دار چہرہ کسی بھی ماحول میں ہو ——— خواہ مجلس میں ہوں، دفتر میں ہوں، جلسے میں ہوں، کسی بھی نشست پر بیٹھے ہوں ——— بالکل ممتاز اور نمایاں رہتا ہے اور بتاتا ہے کہ وہ جس شخصیت کا آئینہ دار ہے اس نے تو نئے تقدیریں لکھی ہیں۔ ان کی تصاویر بھی بہت ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مضمون کے آغاز میں مولانا مودودی کی ایک قلمی تصویر پیش کر دی جائے۔ یہ تصویر میں اپنے قلم سے کھینچتا تو اچھا تھا مگر اس میں وقت زیادہ درکار ہے۔ وقت بچانے کے لئے میں اپنے صحافی دوست جناب محمد صلاح الدین کی مرتبہ تصویر مستعار لئے لیتا ہوں:

• چھوٹے بالوں کے پٹے جو بیچ درمیان سے مانگ نکلی ہوئی، ہلکا سا گندمی رنگ، چوڑا ماتھا، آنکھوں پر عینک ہے سیاہ رنگ کے شیشوں کی عینک (یہیں ——— مولانا سفید شیشے استعمال کرتے ہیں۔ ن۔ ص) وجیہ جسم اور مسکراتی ہوئی آنکھیں، چہرہ روشن بلکہ اور سفید داڑھی پر جہاں تہاں سیاہی سرمئی۔ (ابوالاعلیٰ مودودی)

مولانا مودودی ان خوش قسمت بزرگوں میں سے ہیں جن کے قامت پر نظر نہیں جاتی۔ یوں قد بہت چھوٹا نہیں ہے، اور دوسرے بدن کی وجہ سے نظر کو مغالطہ ہوتا ہے لیکن موزونیت اس درجہ کی ہے کہ مودودی صاحب کے سراپا میں کوئی بات کھٹکتی نہیں۔ وہ بہت بدن کے اور موزوں چال چلتے ہیں۔ چال ڈھیلی ڈھالی اور مرزا قسم کی نہیں ہوتی بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص کسی خاص مشن پر جا رہا ہے۔ چال کے بارے میں ابھی دو روز قبل تفہیم القرآن کے حاشیے میں خود مودودی صاحب نے بڑے سلیقے کی بات لکھی ہے ملاحظہ ہو:

• مگر قابل غور پہلو یہ ہے کہ آدمی کی چال میں آخر وہ کیا اہمیت ہے جس کی وجہ سے اللہ کے نیک بندوں کی خصوصیات گنا تے ہوئے سب سے پہلے اس کا ذکر کیا گیا؟ اس سوال کو ذرا تامل کی نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کی چال محض اس کے انداز رفتار ہی کا نام نہیں ہے بلکہ وہ درحقیقت وہ اس کے ذہن اور اس کی سیرت و کردار کی اولین ترجمان بھی ہوتی ہے۔ ایک عیار آدمی کی چال، ایک غنڈے بدمعاش کی چال، ایک

ل کہاوتیں ہمیشہ ایسے پائے گئے ہیں جو بڑے آدمیوں کے مظاہر شخصیت کا پتہ دیتے ہیں۔ حالانکہ اصل چیز یہ ہے کہ کسی ایسے جوہر سے ان کا پیدا کرنا ہے اور اس کے نتیجے میں ہر آدمی کے اپنے مظاہر شخصیت ایک امتیازی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ کسی کی شخصیت کا لباس یوں کر ہم اپنا قد و قامت اس کے مطابق نہیں بنا سکتے۔ بلکہ ہمیں اپنے ہی قد و قامت کے مطابق لباس کا سلیقہ

ٹ آفاقی صاحب نے شاید ان دنوں نہیں دیکھا جب مولانا کی داڑھی بالکل سیاہ تھی اور خوب گھنی تھی۔ اس کے حلقے میں کشادہ پیشانی اور روشن چہرہ عجیب منظر سامنے آتا تھا۔ عجیب بات ہے کہ مرشد کی داڑھی کے بال ہر چیز نسبتاً تیز رفتاری سے سفید ہوئے ہیں۔ اب تو کوئی اکا دکا بال ہی سیاہ رہ گیا ہوگا۔

> عام معاشرہ کی چال، ایک منچلے گنوار کی چال، ایک باوقار مہذب کی چال، ایک غریب مسکین کی چال، اور اسی طرح مختلف اقسام کے دوسرے آدمیوں کی چالیں یکسر ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ ہر ایک کو دیکھ کر بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کس چال کے پیچھے کس طرح کی شخصیت جلوہ گر ہے۔ پس آیت کا مدعا یہ ہے کہ رحمان کے بندوں کو تم عام آدمیوں کے درمیان چلتے پھرتے دیکھ کر ہی بغیر کسی سابقہ تعارف کے الگ پہچان لو گے کہ یہ کس طرز کے لوگ ہیں۔ اس بندگی نے ان کی ذہنیت اور ان کی سیرت کو جیسا کچھ بنا دیا ہے اس کا اثر ان کی چال تک میں نمایاں ہے۔ ایک آدمی انہیں دیکھ کر پہلی نظر میں جان سکتا ہے کہ یہ شریف اور حلیم اور ہمدرد لوگ ہیں، ان سے کسی شر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ (ترجمان القرآن۔ ج ۴۴، عدد ۵)

میرا ذاتی تاثر یہ ہے کہ مولانا مودودی کی چال بظاہر کرتی ہے کہ یہ شخص احساسِ ذمہ داری کے عالم میں کوئی فرض ادا کرنے جا رہا ہے، مگر گھبراہٹ کے انداز سے نہیں پروقار طریق سے۔ ممکن ہے دوسروں کا تاثر کچھ اور ہو، لیکن اتنا بہرحال ہر کوئی محسوس کرے گا کہ "یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ ھَوْنًا" کے معیار پر یہ چال پوری اترتی ہے۔

مودودی صاحب کے سراپا کا ایک جزو اس سے پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ وہ گھر اور دفتر میں رہتے ہوئے کیسا لباس پہنتے ہیں۔ سردیوں میں کھلے پائنچے کا پاجامہ، دھاری دار قمیض اور اونی سویٹر استعمال کرتے ہیں۔ سر پر گرم اونی ٹوپی پہن لیتے ہیں۔ پاؤں میں جرابوں کے علاوہ چمڑے کے موزے بھی ہوتے ہیں اور بالا پوش کا نیلگوں چغہ۔ گلے کا یہ سخت سردی ہو جانے پر سفید رنگ کی اونی قبا بھی اوڑھ لیتے ہیں جسے زیارت سے آتے ہوئے ساتھ لائے تھے۔ باہر جاتے ہوئے تنگ مہری کا چوڑی دار پاجامہ، موسم کے مطابق گرم یا سرد شیروانی اور قراقلی کی جگہ اونچی باڑھ کی سیاہ رنگ ٹوپی استعمال کرتے ہیں۔ گرمیوں میں باہر جانے کا لباس کبھی کبھی شیروانی سمیت بالکل سفید ہوتا ہے اور غالباً اس لباس میں مودودی صاحب کی شخصیت پوری طرح نمایاں ہو جاتی ہے۔ وضو کیلئے لکڑی کی کھڑاویں موجود رہتی ہیں۔ لباس کے تنوع کا دائرہ بہت محدود، ملکی شخصیت کی ترجمانی اور زیبائش کیلئے ہمیشہ موزوں رہتا ہے۔ مودودی کے لباس کے اصل اجزا ہیں ——— صفائی، سادگی اور حسنِ ذوق!!

آدمی جب بات کرے تو پہچانا جاتا ہے۔ نطق سے بڑھ کر اس کا کوئی ترجمان اور مخبر نہیں ہو سکتا۔ نطق شخصیت کے جوہر کی رونمائی ہے۔ آدمی کے جذبات کی اور اس کی حقیقت کی مکمل ناطقہ کی تانت باجی تو زمانے بھر نے راگ پا لیا۔ "تا مرد سخن نگفتہ" والی بات پرانی نہیں ہوئی۔ موضوعات کی پسندیدگی، زبان کا معیار، الفاظ کا انتخاب، لہجہ کا اتار چڑھاؤ، بولنے کی رفتار، آواز کی پستی و بلندی، بات چیت میں جذبات کی آمیزش اور اس کا تناسب، وہ چیزیں ہیں جو پانچ منٹ میں ایک آدمی کی ساری مخفی حقیقتوں کا خود اسی کی زبان کے لاؤڈ سپیکر سے اعلانِ عام کر دیتی ہیں۔ کسی کا ذہنی و علمی معیار کیا ہے، کسی کا ظرف کتنا ہے، کسی کا ذوق کس نوعیت کا ہے، کسی میں سنجیدگی کس حد تک پائی جاتی ہے، کوئی کہاں تک بااصول ہے، یہ اور اسی طرح کے دوسرے بہت سے سوالات ہیں جن کا جواب ایک شخص دو چار فقرے ادا کرتے ہی دے چکتا ہے۔ مگر بسا اوقات خود نہیں جانتا کہ اس نے اپنی کن کن حقیقتوں کو دوسروں کے سامنے رکھ دیا ہے۔

مولانا مودودی کی گفتگوؤں سے میں گزشتہ چودہ پندرہ برس کے زمانے سے بہرہ اندوز ہوتا رہا ہوں۔ مولانا کے اندازِ گفتگو پر چند باتیں جو مستقل تاثرات کی حیثیت میں میرے ذہن میں موجود ہیں، اس موقع پر بیان کرتا ہوں۔

عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے کہ تحریر یا تقریر کے آدمی کو ہم جتنا بلند پاتے ہیں، وہی آدمی مجلسی زندگی میں گفتگو کرتے ہوئے انتہائی پست ہو جاتا ہے۔ مثلاً اس کی تحریر و تقریر میں اصول پسندی اور مقصدیت ہوتی ہے، لیکن اپنی گفتگوؤں میں اس کا بے اصولاپن اور اس کی لامقصدیت صاف صاف نمایاں ہوتی ہے۔ اسی طرح تحریر و تقریر میں جو سنجیدگی اور معقولیت کسی کی شخصیت میں محسوس ہو رہی تھی بے تکلفانہ گفتگو کے ماحول میں ملمع کی وہ ساری چمک دمک غائب ہو کر رہ گئی۔ تحریر و تقریر میں علمیت و تفکر کے کچھ آثار جھلک رہے تھے لیکن گفتگو کے دائرے میں سامنا ہوتے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ وہ سب کچھ تصنع کی کرشمہ سازیاں تھیں۔ اسی طرح تحریر و تقریر میں زبان کے محاسن موجود تھے لیکن بات چیت میں سب غائب! الغرض تحریر و تقریر کا آدمی ہمارے ہاں بالعموم اس آدمی سے بالکل الگ ہوتا ہے، جس سے ہم مصافحہ کرتے ہیں، جس کے ساتھ بیٹھتے اور جس سے بات چیت کرتے ہیں۔ لیکن مولانا مودودی اس معاملے میں اپنی مثال آپ ہیں کہ وہ نہ صرف تحریر و تقریر کے دو گونہ میدانوں میں ایک ہی سی حالت پر رہتے ہیں بلکہ وہ اظہار کے ان وسیع میدانوں سے لوٹ کر جب کبھی عام بات چیت کے نسبتاً محدود دائروں کی طرف پلٹتے ہیں تو بھی اپنی یکسانی کو برقرار

رکھتے ہیں۔ [illegible] مجلسی گفتگو [illegible] عزت کی [illegible] شخصیت
[illegible] اور السلام [illegible] طرح آپ کا عمومی نشست کی [illegible] بات چیت [illegible] کی طرح [illegible] پایا جاتا ہے۔

تیسرے مولانا کی ایک خصوصیت یہ ہے [illegible] جاذبیت پائی جاتی ہے اور جاذبیت کا اثر [illegible] میں اس طرح ملتا ہے کہ [illegible] جاذبیت کیلئے بہت ساری چیزیں [illegible] وہ یہ [illegible] کا متاثر ہو جانا [illegible] جب متاثر ہو جاتی ہے [illegible] کے تمام پہلوؤں [illegible] ساتھ [illegible] اس عالم میں آدمی [illegible] بہت زیادہ [illegible] جاتا ہے [illegible] اپنے آپ کو نمایاں [illegible] اپنے آپ کی حیثیت ہے۔ اپنے آپ کو [illegible] تسلیم کرایا جاتا ہے۔ لیکن [illegible] کے اور لوگوں سے [illegible] جاتا ہے [illegible] مولانا مودودی کو اللہ تعالیٰ نے [illegible] مزاج کی کوشش کبھی نہیں کی [illegible] مولانا مودودی کی [illegible] یا دوسرے ساتھیوں [illegible] بھی نہیں آیا [illegible] مودودی صاحب [illegible] ایک شخص کی مسلسل سنی پڑے اور خود ان کو [illegible] جس میں نہ مودودی صاحب کی شخصیت رکاوٹ بنتی ہے۔ نہ جدید یا قدیم قسم کے مراسم و آداب!

ہمارے معاشرے میں ایک عام روایت بن چکی ہے کہ لوگ اختلافی گفتگو میں [illegible] جھگڑنے پر اتر آتے ہیں۔ [illegible] کے [illegible] نہیں اونچے درجے کے مصنفین، لیڈروں، مذہبی علماء، [illegible] پائی جاتی ہے [illegible] اتنی ہی وافر پائی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں گفتگو کا بنیادی [illegible] اپنی بات دوسرے سے منوا کے چھوڑنے [illegible] ایک [illegible] جو عام طور پر استعمال میں آتا ہے وہ لجاجت کا [illegible] ہے۔ یعنی [illegible] خوشامد کر کے [illegible] کوئی بات منوانا۔ دوسرا [illegible] قوت غضبیہ کو کام میں لانے کا [illegible] ہے۔ یعنی آپ نے بات کہی، نہیں مانی گئی تو پھر [illegible] دہرایا، پھر نہیں مانی گئی [illegible] آواز [illegible] اونچی ہوگئی [illegible] گردن کی رگوں کا ابھار بڑھ گیا ——— آخری حد نہ جانے کیا ہو۔

مولانا مودودی اختلافی امور پر گفتگو کرتے ہوئے ان دونوں طریقوں سے [illegible] ایک تیسرا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ ان کا مقصد افہام و تفہیم کا مقصد ہے یعنی مقصد کلام دوسرے کی بات کو سمجھ لینا اور اپنی بات سمجھا دینا ہوتا ہے۔ بارہا ایسا ہوا کہ مخاطب مولانا کا [illegible] استدلال [illegible] سے نہیں ملا۔ اسی پر قائم رہا۔ یا مولانا کے مقابلے میں کسی دوسرے عالم یا لیڈر کی رائے کو ترجیح دیتا رہا تو ایسے موقعوں پر مودودی صاحب ہمیشہ ٹھنڈے انداز سے یہ کہا کرتے ہیں کہ "آپ چاہیں تو وہ رائے رکھ سکتے ہیں!" ——— اس فقرے نے بارہا مناظرہ پسند لوگوں کی اسکیموں کو درہم برہم کر دیا ہے۔ مولانا مودودی کو مناظرانہ انداز کی گفتگو سے شدید درجے کی نفرت ہے۔ وہ ایسی گفتگو کو اول تو اپنے خاص حکیمانہ اسلوب سے افہام و تفہیم کے مقصد پر لانے کی کوشش کرتے ہیں اور اکثر کامیاب رہتے ہیں۔ لیکن اگر کسی طرح کامیابی نہ ہو تو پھر "قَالُوا سَلَامًا" کی قرآنی ہدایت کے مطابق "حسن فرار" کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

معقول استدلال کو جب کوئی شخص محض ضد اور نامعقولیت یا [illegible] کی وجہ سے رد کر رہا ہو، اور اندازہ ہو جائے کہ بار بار ایک ہی دلائل دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا تو ایسی صورت میں مودودی صاحب بالعموم صاف صاف اعتراف شکست کر لیتے ہیں۔ [illegible] کہا کرتے ہیں کہ "میرے پاس جو دلائل تھے وہ میں نے پیش کر دیئے۔ اگر آپ ان سے مطمئن نہ ہوں تو اپنی رائے پر قائم رہیئے۔ اور کوئی دلیل میرے پاس نہیں ہے" ——— کم لوگ اس طرح اعتراف شکست کر

سکتے ہیں۔

ہر لیڈر اور عالم اور بڑے آدمی کو خبطیوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ خبطیوں سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے خیالات اور جذبات میں توازن نہیں ہوتا اور جن کو اپنے ذہن سے خود آگاہی نہیں ہوتی۔ ان کو اپنے غلط افکار پر کمال کا بڑا حاصل ہوتا ہے۔

اس طرح کے ہر قسم ذہن کے لوگ طرح طرح کے مسائل، قسم قسم کی کہانیاں، رنگ رنگ کی باتیں لے کر مولانا مودودی کو بھی شرف ملاقات سے سرفراز فرماتے رہتے ہیں۔ نوعِ انسانی کی اس صنف سے اگر آپ بحث کرنے لگیں یا ان کے خیالات کو منظم کرنے کی کوشش کے در پے ہو جائیں یا ان کو کہہ دیں کہ ان کے ذہن کا توازن صحیح ہوگا، کرنے کی کاوش میں لگ جائیں تو یہ ان کی جمع اور زیادہ مشتعل ہو تی ہے۔ پھر ان سے گھنٹوں اور ہفتوں گفتگو کرتے رہیے، بلکہ برسوں ساتھ رہ کر دیکھیے یہ اسی حالت پر رہیں گے جس پر تھے۔ مولانا مودودی صاحب ایسے آدمی کو دو چار باتوں سے پہچان جاتے ہیں اور بڑے ہی بردباری اور ایثار سے کام لیتے ہیں۔ بعض اسے کھلا موقع دیتے ہیں کہ وہ بولتا چلا جائے اور خود چپ چاپ بیٹھے سنتے رہتے ہیں۔ کوئی اختلاف نہیں کرتے، کسی چیز کی تردید نہیں کرتے، کسی بات پر تبصرہ نہیں دیتے۔ بلکہ سراپا التفات بن کر رہ جاتے ہیں۔ بجائے خبطی کتنا ہی خبطی کیوں نہ ہو، مقابل سے کسی ردِ عمل کے بغیر گھنٹہ دو گھنٹہ مسلسل بولنے کے بعد آخر ہمت ہار دیتا ہے۔ چنانچہ ان تجربات سے مولانا مودودی کو ہم نے خود گزرتے دیکھا ہے اور ہمیں یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ جو شخص اس شہادت کا نفس سے یوں گزر سکتا ہے اسے جبل اور جاہلی نفرتیں نہیں ہلا سکتے۔

ہم جو اتنی مدت سے مولانا مودودی کے ساتھ ہیں دو باتوں کی شہادت ہم بڑے وثوق سے دے سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ مودودی صاحب کو ہم نے ایک لمحے کے لئے بھی مغلوب الغضب نہیں دیکھا اور نہ آپ کو کبھی غضب آلود الفاظ میں بات کرتے سنا ہے۔ حد یہ کہ جن لوگوں کا لوگوں کا الفاظ اور الزامات اور گالیوں اور دھمکیوں کا زیادہ تر نشانہ مولانا کو ہی بنانا پڑا ہے ان کے ردِ عمل کے طور پر بھی کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مولانا کی زبان کا معیارِ پاکیزگی و سنجیدگی اپنی مقررہ حد سے نیچے گرا ہو۔ بیشمار گھٹیا الفاظ ہیں جن کو ادب اور صحافی گفتگو میں بھی نہیں، اخباری کالموں میں ہر روز استعمال کرتے ہیں۔ لیکن مولانا مودودی کے چمنستانِ تکلم میں ان کا نشان کبھی کوئی جگہ نہیں پا سکا۔ گفت اسالیب ہیں جو ادنیٰ قسم کی جذباتیت نے اپنے اظہار کیلئے وضع کر لئے ہیں اور جانے معززین اور شرفا دان ملت ان کو استعمال میں لاتے ہیں لیکن مولانا مودودی کے چمنِ نطق میں ان کی سمائی قطعاً نہیں! مولانا کے حسنِ ذوق کا شعور رکھنے والے کسی آدمی کے سامنے آپ کوئی لفظ اول کے مدیافت کریں تو وہ آپ کو بتا سکے گا کہ مولانا یہ لفظ بول سکتے ہیں یا نہیں!

ایک شخص جس کی مادری زبان دلی کے شریف گھرانوں کی خاص بولی ہو، پھر اس بولی کو حیدر آباد کی علمی فضا نے سیراب کیا ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے اسلام کے آدابِ اخلاق نے ایک خاص مزاج دیا ہو، اس سے آپ کو کس انداز گفتگو کی توقع کرنی چاہئے؟ ——— حلقۂ یاراں ہو یا مجلسِ بیگانگاں، ہر شعبہ زندگی کے کسیع تر دائرہ میں۔ یا گھر کی چار دیواری کے اندر کا حلقہ، بیوی بچوں سے ربط ہو یا نوکروں اور ملازموں سے، مولانا مودودی کی گفتگو نفاست، سنجیدگی اور پاکیزگی کے معین معیار سے کبھی بھولے سے بھی نیچے نہیں گرتی!

مولانا کے اندازِ گفتگو کے بارے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ بڑے ٹھاٹھ کے ساتھ ایک ایک لفظ ٹھہر ٹھہر کر بولتے ہیں۔ بقول ملک غلام علی صاحب (مولانا کے خاص معاونِ کار) اگر کوئی شخص چاہے تو پوری گفتگو معمولی رسم الخط میں قلمبند کر سکتا ہے۔ یہ اندازِ گفتگو وہی شخص لے کے چل سکتا ہے جو صفتِ تندی، جلد بازی اور ذہنی اضطرابات سے مغلوب نہ ہو۔ مولانا مودودی جیسی شخصیت کا ایک مستقل ابتلا یہ ہوتا ہے کہ طرح طرح کے لوگ آ آ کر ذریعۂ امتحان بنتے ہیں، خبطی، ذہنی الجھنوں کے مریض، خود پسند، تیز زبان، مناظرہ باز، بحثیئے، متضاد غرضیکہ قسم قسم کی مخلوق ایسے لوگوں کو تختۂ مشق بناتی ہے۔ ایسے لوگ بات کر کے مخاطب کا ذہنی سکون درہم برہم کر دیتے ہیں اور ان کے مقابلے میں انضباط کو قائم رکھنا معمولی آدمیوں کے بس میں نہیں ہوتا۔ لیکن مولانا مودودی ایسے لوگوں کی گفتگوؤں کے ریلوں کے درمیان سنجیدگی و وقار کی چٹان بنے اپنے مزاج کو قائم رکھتے ہیں۔ غالباً اس سلسلے کے چند سخت کڑے امتحانات میں سے ایک وہ تھا جب ایک قادیانی پارٹی مولانا پر تبلیغ کرنے دار الاسلام پہنچی تھی۔ اس امتحانِ صبر و وقار کے موقع پر یہ ہیچمدان بھی شریکِ مجلس تھا۔ مگر چونکہ یہ روداد پہلے سے ملک غلام علی صاحب بیان کر چکے ہیں اس لئے انہی سے الفاظ مستعار لیتا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں کہ :

ایک بار [illegible] مولانا [illegible] کی [illegible]
[illegible] رخصت [illegible] دیکھیں [illegible]
[illegible] کی کوشش بھی کرتے
[illegible] تحریکات [illegible] ہیں [illegible]
ہے۔ آخر کار جب [illegible] دیکھا کہ جماعت [illegible] پیمانہ پر [illegible]
[illegible] برداشت کی [illegible]
کریں یا مستعفی ہو کر [illegible] الگ ہو گئے۔ [illegible] (مودودی —— اپنی اور دوسروں کی نظر میں)
مولانا [illegible] دیکھتے ہیں [illegible] معلوم ہوتی ہے۔ [illegible] مولانا گفتگو [illegible]
قسم کی گرمجوشی [illegible] ملتے۔ [illegible] تعریف سے
[illegible] مصافحہ کرتے ہیں [illegible]
سلسلہ چل رہا تھا [illegible]
آپ یہاں سے تشریف لے آئیں۔ مولانا نے [illegible] بس یاد آیا ——
جیل کے زمانے میں تنہائی اور رفقاء [illegible] بعض لوگ مولانا کے طرز عمل کے اس ظاہری پہلو کو سرد مہری سمجھتے ہیں اور
مایوس ہوتے ہیں۔ خصوصیت سے پاکستان [illegible] مولانا کے مزاج کا ایک
ابھرا ہوا پہلو ہے جو علمی کاموں میں انہماک کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ اس مزاج کی [illegible] چنانچہ ملاقات [illegible]
کا یہ حال ہے کہ وہ رفقاء اور ملاقاتیوں سے [illegible] مجلس میں [illegible] بیٹھے بغیر [illegible] —— چاہے [illegible] کام [illegible]
معاملات [illegible] دو آدمی [illegible] اپنے آپ سے [illegible] ایسے آدمی [illegible]
سے یہ خوب باتیں کرتے ہیں مگر [illegible] گپ لڑانے کی صلاحیت ان میں نہیں ہے [illegible] ایسا آدمی [illegible] نہیں
ہو سکتا ——

طبائع اپنے جوہر سیرت کے لحاظ سے اپنا ایک مستقل رنگ رکھتی ہیں۔ کسی میں حزن و یاس، کسی میں [illegible] کسی میں غضب و تنفر، کسی میں سختی و خشونت اور کسی میں [illegible] کا بنیادی رنگ نمایاں دیکھتے ہیں۔ مولانا مودودی کا رنگ طبیعت وقار کے ساتھ شگفتگی کے [illegible] بنا ہے۔ سنجیدہ شخصیتیں جو علمی تحقیقی اور فکری کاوشوں میں منہمک رہتی ہیں بالعموم شگفتگی کا جوہر کھو بیٹھتی ہیں اور نری سنجیدگی آخر کار خشونت بن کر رہ جاتی ہے۔ دوسری طرف شگفتگی کا جوہر جن اشخاص میں پایا جاتا ہے وہ وقار کا رنگ کھو بیٹھتے ہیں۔ مودودی کی شخصیت دونوں جوہر صحیح تناسب کے ساتھ اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ اس لیے حسن اعتدال ضائع نہیں ہوتا۔

مولانا مودودی پر مختلف ادوار گزرے اور گوناگوں مراحل سے سابقہ پڑا۔ لیکن تفریح اور بے تکلفی کے خاص الخاص لمحات میں بھی دامن وقار ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔ اسی طرح جب میں پچھلی تاریخ کو دیکھتا ہوں تو بے شمار واقعات ایسے سامنے آتے ہیں جو ایک پیکر خاکی کے لئے پوری طرح غارت گر سکون ہونے چاہئیں تھے اور ان کا اثر لازماً مودودی کے دل و دماغ پر پڑا ہوگا —— بلکہ کبھی کبھی تو ہم قریبی ساتھیوں کو ان پر رحم بھی آتا —— لیکن ملاقاتوں میں، دفتری اجتماعی کاموں میں مجالس گفتگو میں اور سیر کے اوقات میں جب بھی سامنا ہوا تو ہمیشہ ایک ایسا چہرہ سامنے آیا جس پر گویا ایک غیر مرئی تبسم کی افشاں چھڑکی ہوئی ہو۔ مضمون نگارانہ اور مصنفانہ کاوش کے لمحات ہوں، جماعتی و تحریکی مسائل کی پیچیدگیوں کا دور ہو، مخالفین کی شرارتوں اور اپنوں کی نادانیوں سے

سیاق بر محل کسی بھی حال میں اس پہلو کی شگفتگی کا رنگ نہیں مرجھایا۔ یہ شگفتگی لفظی ہی نہیں بلکہ مزاج کا رنگ پیدا کر دیتی ہے۔ سب جانتے ہیں ہم اس مرقع میں چند شاہیں بیان کرتے ہیں، جن سے مولانا کے مقصود میں اسلوبِ مزاج کا اندازہ ہو سکے گا۔

ایک مذہبی طرز کے ہفتہ وار اپنے اخبار میں کئی برس سے مولانا مودودی پر خدا واسطے کی عنایات فرماتے رہتے ہیں۔ ایک صاحب نے کسی مجلس میں مولانا مودودی سے کہا کہ ایک مرتبہ آپ ان کے بارے میں بھی کچھ لکھتے تو مناسب ہوتا: "میں ان سے بالکل مایوس ہوں" مودودی صاحب ویسے انداز میں کہنے لگے "میں نے ان کی شخصیت کا خوب اچھی طرح مطالعہ کیا ہے۔ اس میں جزم نہیں نہیں ہے بس زیر و زبر ہی زیر و زبر ہے"۔

مرکز کی گاڑی کی چھت پر سامان رکھنے کیلئے ایک مربع شکل کا جنگلہ لگوایا گیا ہے۔ یاد نہیں کب کی بات ہے۔ ہم مولانا کے ساتھ گاڑی کے انتظار میں باہر کی کسی سڑک پر کھڑے تھے۔ دور سے اسی رنگ اور ماڈل کی کوئی گاڑی آتی دکھائی دی۔ کسی نے کہا کہ لیجئے گاڑی آ گئی۔ مولانا نے ایک نگاہ ڈالی اور کہا نہیں —— اس کے سر پر وہ طلائی کھڑ بیرا کا سا تاج نہیں ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد میں پشاور جانے کے لئے مولانا مودودی گاڑی کے انتظار میں ہم کو ساتھ لئے پلیٹ فارم پر ٹہل رہے تھے۔ اور جماعتی اور سیاسی امور پر بڑی اہم گفتگو ہو رہی تھی۔ ایک صاحب میری توجہ کی زد میں آ گئے جو ہمارے پیچھے پیچھے چلتے اور پھر جب ہم ایک سرے پر پہنچ کر مڑتے تو وہ پھر پیچھے ہو لیتے۔ گفتگو میں احتیاط کی ضرورت واضح تھی مگر مولانا ساتھ لگے ہوئے سائے سے بے خبر تھے۔ میں نے توجہ دلانے کی مختلف تدبیریں سوچیں، مگر بالآخر کنایہ ہی اختیار کرنا پڑا۔ انگریزی میں کہا: There is a fifth person behind us. (واضح رہے کہ ہمارا گروپ چار افراد پر مشتمل تھا۔) مولانا نے برجستہ کہا: "نہیں۔ کہنا چاہیے: a fifth - Colamnist"۔

ماہر القادری صاحب نے اپنے ایک مضمون میں ایسا ہی ایک مزاح آمیز نکتۂ لطیف درج کیا ہے۔ جس زمانے میں علمائے کرام دستوری رپورٹ پر مشورت کر رہے تھے، ایک صاحب نے پوچھا: "مولانا علماء کی مجلسِ مشاورت کا کیا رنگ ہے؟" فرمایا: "صبغۃ اللہ!"[1]

(ماخوذ از "مودودی —— اپنی اور دوسروں کی نظر میں")

سنہ ء میں پہلی گرفتاری سے کچھ ہی قبل مولانا نے لائل پور اور جھنگ کا سفر کیا تھا۔ بہت سے لوگ ساتھ تھے۔ میں بھی تھا۔ ایک مقام پر کار کسی گڑھے میں دھنس گئی۔ چودھری محمد اکبر صاحب ظلمت کے باوجود پر تکلف کر کے لوٹے تو مولانا نے پوچھا: "کیا پانی کہیں سے مل گیا ہے؟" چودھری صاحب نے کہا: "نہیں، دوسری طرح کام چلانا پڑا۔" مولانا نے فرمایا: "اچھا تو یوں کہیے کہ ڈرائی کلیننگ کی ہے"۔ (ماخوذ از "مودودی —— اپنی اور دوسروں کی نظر میں")

مرکز کی گلی ذیلدار پارک روڈ سے جہاں ملتی ہے، پہلے وہاں نشیب تھا۔ بعد میں مٹی ڈلوا کر راستہ اونچا کیا گیا جس کی چوڑائی بہت کم تھی۔ ایک دفعہ کہیں سے گاڑی پر آ رہے تھے تو ڈرائیور نے جب گاڑی کو گھمایا، مولانا نے کہا: "دیکھنا بھئی! احتیاط سے کہیں فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ہی نہ ہو جائے"[2] (حوالہ: ایضاً)

ایک لطیفہ —— جو ہے تو پرائیویٹ قسم کا، لیکن شاہکار درجے کا ہے۔ اسے راز نہیں رکھا جا سکتا۔ ایک موقع پر مولانا کی طرف سے چائے دی گئی، بسکٹ اور پیسٹری ساتھ تھی۔ مولانا نے باقر خاں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا: "افسوس ہے کہ ہم باقر خانی کا انتظام نہ کر سکے"! —— حسبِ قہقہہ ہوا۔ (حوالہ: ایضاً)۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس لطیفہ کی موجد اوّل بیگم ملک نصر اللہ خان عزیز مرحوم تھیں۔ ایک بار انہوں نے باقر خاں صاحب سے پوچھا تھا کہ "آپ کی باقر خانی کا کیا حال ہے؟"

زمانۂ جیل کے لطائف میں سے ایک اور شاہکار عرض ہے جو حسنِ تمثیل و تشبیہ کا بھی ایک نادر نمونہ ہے۔ مولانا اختر علی خاں اپنی رہائی کے لئے برہم

---

[1] مسلم سوسائٹی کے مزاج کے بارے میں آیتِ قرآنی ہے: صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً! (ترجمہ: "یہ اللہ کا رنگ ہے! —— اور اللہ کے رنگ سے اور کس کا رنگ بہتر ہو سکتا ہے؟")

[2] آیت ہے: وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ۔

بے چینی سے منتظر تھے اور کبھی کبھی مولانا سے ملاقات بھی ہو جاتی تھی اور ان کی گفتگو سے پوری تسکین حاصل کرتے۔ بعض واقعات پر تو گویا یہ نیا مودودی کی شہادت کا تسلسل ہے۔ لاہور میں خان محمد بعض دوسرے اصحاب کی مالی مدد کرتے رہتے تھے۔ اس حقیقت کو مودودی صاحب نے ایک لطیفہ میں بیان کیا: بات یہ ہے کہ کوئی ایک ٹرک پھنس گیا ہے اور اس کے پیچھے کاریں بھی کھڑی ہیں تو سب رکتے جاتے ہیں اور پورا ٹریفک جام ہو گیا ہے۔ ٹرک تھے کہ ٹریفک رواں ہو۔

لطافت تمثیل و تشبیہ کے سلسلے میں دو تین چیزیں اور قابل ذکر ہیں :

"مطالبات جنت ششم" کی تحقیقاتی عدالت میں ایک تقریب بیان میں مودودی صاحب نے ایک پوزیشن کو حکومت کی زد و قوت کے مقابل واضح کرنے کیلئے ہر ماہ کو بڑی بیان کیا: اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ جیسے ایک شخص سڑک سے ٹریفک میں آ کھڑا ہو اور دوسرا شخص وہاں موٹر سے حادثہ میں ذکر ہے تو اس کی شکایت میں پہلا قصور آ جاتی ہے۔

مولانا کو چوہدری کی تکلیف ہے۔ کسی نے آپریشن کرانے کا مشورہ دیا تو فرمانے لگے: "ایسا آپریشن کرا چکا ہوں مگر گویا کہ دل میں پتھر بنانے کی مستقل فیکٹری کام کر رہی ہے۔"

"فسادات پنجاب" کے سلسلے میں مولانا نے اپنا جو تحریری بیان دیا تھا اس میں ایک جگہ تحقیقاتی کمیشن سے کہا کہ: "یہ بھی ایسا نہیں رہا جو ایک قطعیلہ کی سطح سے بلند سطح پر سوچ سکے ——— جابرانہ طور پر شہری حقوق کی پامالی، جمہوری اصولوں سے بے نیازی، حرص اور قوت کے بے جا استعمال اور سیاسی مسائل اور معاملات سے بالاتر ہو کر ساری صورت حال پر مصالحانہ اقدامات کرنے سے پہلے جانے کی پوری تاریخ بیان ہو چکی جو پاکستان بننے کے بعد سے شروع ہو رہی ہے۔" ایک لفظ تشابیہات کے لطیف تمثیلی استعمال کو دیکھئے!

"جماعت کی تاریخ اور لائحہ عمل" میں ایک مقام پر یہ واضح کرتے ہوئے کہ ہماری اصل کشمکش اشتراکیت، مغربی الحاد، مذہبی بے راہ روی اور ملاحیت کے خلاف ہے، جماعت کے خلاف مہم چلانے والے مولوی حضرات کے بارے میں لکھا ہے کہ "ملاؤں کا مزاج بھی عجیب ہے، بیچ میں کھڑے ہوتے ہیں اور ہم پر بار بار حملے کئے گئے ہیں۔"

ایک خاص عنصر کے اندر مولانا مودودی دستوری مہم کے سلسلے میں کام کرنے کا نقشہ مجلس شوریٰ کے مشورے سے تیار کر رہے تھے۔ رفقاء نے خطرات کی طرف اشارہ کیا۔ مسکرا کر فرمایا: "سانپوں سے کھیلنے جا رہا ہوں! ——— ہاں تھیک ہے، کامیابی نہ ہوئی تو ڈسے جانے کا خطرہ واضح ہے۔"

ماہر القادری صاحب کا بیان کردہ ایک لطیفہ اور ہے جو یاد نہیں کر سکتے ہیں، کہتے ہیں: "مولانا نے اپنے صاحبزادے (غالباً فاروق[1]) کو کراچی میں تعلیم حاصل کرنے کیلئے چھوڑ دیا تھا۔ ایک دن ہم تینوں موٹر میں جا رہے تھے۔ مولانا کے صاحبزادے ان سے شیشوں اور کل پرزوں کا بار بار ذکر کر رہے تھے۔ میں نے کہا کہ ان کو اس فن سے بہت دلچسپی ہے۔ مسکرا کر بولے: باپ مولوی، بیٹا لوہار! ——— اپنی اور دوسروں کی نظر میں!"

"سود" حصہ دوم میں اشتراکیت پر ناقدانہ بحث کرتے ہوئے اس کی "ہیں ڈکٹیٹر شپ" کے بارے میں دو تین صفحے کا ایک نوٹ لکھا ہے۔ اس نوٹ میں ذکر ہے کہ جب کوئی کارکن اپنے گھر پر نہیں پہنچتا تو اس کی بیوی خود ہی سمجھ جاتی ہے کہ پکڑا گیا۔ ... ایک روز یہ ایسا ہوتا ہے کہ اس کا بھیجا ہوا پارسل واپس آ جاتا ہے۔ بس یہی اس امر کی اطلاع ہے کہ اس کا خاوند لینن کو پیارا ہوا۔ ... اس کا فرض ہے کہ اپنی کامریڈی کی طرح اس معاملہ کی بھاپ تک منہ سے نہ نکالے۔ (ص ۲۶۲[2]) ——— "لینن کو پیارا ہوا" اور "کامریڈی" کی لطافت اس موقع پر ہر صاحب ذوق کو محسوس ہوگی۔

ہاں، وہ بھی تو ایک دلچسپ چیز تھی۔ "دارالاسلام" کے دور میں ایک مرتبہ "ترجمان القرآن" کا فرنیچر لاہور سے بذریعہ ریل گیا تھا۔ مرنا اسٹیشن سے اسے دو فرلانگ دور لے جانا تھا۔ بالمعاوضہ حمال کا کوئی قابل عمل انتظام تھا نہیں، اس لئے ہم سب مدیر ترجمان القرآن سمیت اس مہم کو نکلے۔ کرسیاں، میزیں،

---

[1] مولانا کے صاحبزادوں کے ناموں میں فاروق تو بطور ولدیت آتا ہے، یعنی احمد فاروق، عمر فاروق، خالد فاروق و [illegible]۔

[2] پہلے یہ باتیں سرمایہ داروں کا مخالفانہ پروپیگنڈہ قرار دے کر مسترد کر دی جاتی تھیں۔ لیکن اب خود خروشچیف اور بلگانن کے بیانات نے ان کی صداقت ثابت کر دی ہے۔

دوسری چھوٹی چیزیں تو ایک ایک صد آدمیوں کے نصیب ہو سکتی تھیں، لیکن یہ بڑی ماریکا اجتماعی تقریبات تھی۔ سامعین اور حاضرین کی تعداد تقریباً ہزاروں کے گھیرے میں تھی جن میں نوجوانوں کی تعداد بھی شامل تھی۔ وہ کچھ دیر ہی سنتے، کچھ دیر سے سید احمد۔ اس موقع پر غضب کا "عاشق کا جنازہ ہے" دھوم سے نکلے۔

بے شمار یاد رہ جانے والے اور بھول جانے والے واقعات و نکات میں سے یہ چند چیزیں یہاں بے وقت عرض کی جا سکیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مودودی کی شخصیت کے عناصر ترکیبی میں شگفتگی کا کیا مقام ہے۔ اور اس کی اصل تصویر ان کی اخلاقی تصویروں کے مقابلے میں کچھ ہے جو کہ دوسری وقعت جو کچھ معترضوں نے مرتب کیا ہے۔ ان کو ان اخلاقی تصویروں کے ذریعہ جو لوگوں نے مودودی کو دیکھا ہے ان کی نظر میں ایک ایسا کھڑا تھا اور ایک ایسا سخت طبیعت لیا ہوا ہے کہ بسا اوقات وہ اسکی وجہ سے ڈرپوک بچوں کی طرح راتوں کو چونک چونک اٹھتے ہیں۔

ایک صاحب دعوت کو کم سے کم اس دور میں یہ بہت بڑی کمزوری ہوگی کہ وہ قلم سے جادو نہ کر سکتا ہو اور کاغذ کے میدان میں قلم کے تازہ دکھا سکے۔ وہ عیذ دی جو محض زبان کے چٹخارے پر چل جاتی تھی، اس کا دور کبھی کا گزر چکا۔ ایسے بہت سے اہل زبان آج دانتوں میں زبان دابے وہ ورلڈ کو شور رہے ہیں۔ یہ لوگ کاغذ کے میدان میں ہار گئے۔ کیونکہ یہ راہ علم جس طرح فکر کی نفسیات پر ترتیب زبان دکھا سکتا تھا وہ فراہم نہ تھی۔ تقریر کی لیڈری آسان ہے، تحریر کی لیڈری مشکل ہے۔ مولانا مودودی جس دعوت کو لے کے اٹھے ہیں وہ زبان و قلم دونوں کو استعمال کئے بغیر اپنا راستہ نہیں نکال سکتی۔ خدا کی عنایت ہے کہ مودودی کو اس نے قلم کی طاقت سے بہرہ مند کیا۔

قلم سے آدمی جو کچھ لکھتا ہے، اس کے معانی و مطالب سے قطع نظر، محض لکھنے کا ظاہری اسٹائل اور اس کا رسم الخط اول کر کہہ دیتا ہے کہ لکھنے والا کیا ہے، کیا نہیں ہے۔ آدمی کی ہر تحریر میں، خواہ وہ ایک سطر ہی کی کیوں نہ ہو، اس کا اپنا ہاتھ اور اس کا اپنا قلم اس کی شخصیت کے احوال پنہاں کاغذ پر نقش کرتا چلا جاتا ہے۔ ہماری تحریریں گویا ہماری خود نوشت سوانح عمریاں ہیں ——— معنویت کے اعتبار سے بھی اور ظاہری اخلاق کے اعتبار سے بھی۔ چنانچہ نفسیاتی مطالعہ و تجزیہ کا فن اب یہاں تک ترقی کر چکا ہے کہ ماہرین ایک آدمی کے اپنے لکھے ہوئے نام، چند یا دو چار سطروں کے مشاہدہ سے اس کے احوال اندرونی کے تمام ضروری پہلو سامنے لا سکتے ہیں اور ان کے اندازے بالعموم اسی بچاسی فیصد صحیح نکلتے ہیں۔

اسی نقطہ نظر سے مولانا مودودی کی تحریر کا ایک ہلکا سا جائزہ لینا مد نظر ہے۔ یعنی ہم ان کی تحریر کی ادبیت اور اس کی فصاحت و بلاغت پر نہیں، بلکہ اس کے ظاہر پر ایک نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

مولانا مودودی کے لکھنے کا ہمیشہ ایک خاص ماحول ہوتا ہے۔ ان کا لکھنے کا کمرہ ——— جو دفتر بھی کہلاتا ہے ——— دوہری دیواروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اینٹ گارے کی دیواروں کی اندرونی جانب ایک چار دیواری الماریوں کی ہوتی ہے جن میں دینی اور مغربی علوم کی کتابیں مولانا مودودی کی جائے نشست کے چاروں طرف صف بستہ حاضر رہتی ہیں۔ ایک طرف اگر مستند طبع جلدوں کی قطار رہے تو دوسری انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کی جلدیں کھڑی ہیں۔ اس ہاتھ بخاری اور اس کی شروح ہیں تو اس ہاتھ دستوریات اور قانونیات پر اچھی اچھی انگریزی کتابیں ہیں۔ ادھر اگر اسلامی تاریخ پر بیش بہا قدیم عربی لٹریچر ہے تو ادھر یورپ کی مذہبی اور فکری تاریخ سے متعلق انگریزی زبان میں جدید لٹریچر آراستہ ہے۔ اس الماری میں قرآن کی بھاری بھرکم تفاسیر ہیں تو اس الماری میں بائبل سے متعلق سیرت و دنیا کی مجلدات موجود ہیں۔ کہیں فقہ اسلامی کی مستند کتابیں بھی ہیں تو کسی دوسری جگہ انگریزی دور کے کامن لاء پر چیدہ چیدہ تصانیف موجود ہیں ——— وہاں ابن خلدون جلوہ فرما ہیں تو یہاں افلاطون۔ وہ ابن تیمیہ ہیں تو یہ کارل مارکس۔

لکڑی کے فریم میں مرتب کی ہوئی کتابوں کی اینٹوں سے جو چار دیواری بنتی ہے اس کے درمیان ایک جہازی میز پھیلی ہوئی ہے۔ اس جہازی میز پر بائیں جانب کاغذات رکھنے کا چھوٹا سا خانہ دار ریک پڑا ہے۔ ریک کے ساتھ چند کتابیں قطار میں کھڑی ہیں۔ دائیں جانب نئی آئی ہوئی کتابیں، مسودے، پمفلٹ، خطوط وغیرہ رکھے ہیں۔ سامنے ایک لمبا چوڑا گتہ پھیلا ہے اور اس پر کاغذ کا زیر مشق نشست کے بالکل سامنے وسط میں رکھا ہے۔ ان تختۂ نوشت کے

سادگی پسند ہیں۔ آپ نے کاتب کے تحت تختی لے کے ہی ہمیشہ ہو تیار کیے ہیں۔ ان کے کمرے میں ایک پلنگ، چند الماریاں، دو میزیں اور ایک صوفہ
سامنے میز پر کیمرا، ایک پاکستان کا ایک نقشہ ——— مکمل سیٹ ——— ترتیب سے رکھا ہے۔ دو تین شیشے کے پیپر ویٹ بھی
کاغذ دبانے کے لیے ہیں۔ ان چیزوں کو آپ ہمیشہ ترتیب میں رکھا پائیں گے اور ان میں سے ہر چیز اپنی جگہ پر متعین رہے گی۔ اتفاق سے اگر اس ترتیب
کو ذرا بھی فرق کر دیا جائے تو مولانا کا ہاتھ سب سے پہلے اسی چیز کی طرف جائے گا اور اسے پہلی جگہ پر پہنچا دیں گے۔ کسی چیز کا بے ڈھنگے پن سے رکھا ہونا ان کی
طبیعت پر گراں گزرتا ہے۔ کمرے یا برآمدے میں کوئی کرسی ٹیڑھی رکھی ہو، فرش پر بچھی ہوئی چٹائیاں غیر متوازی ہوں، میز پر کے اخبارات بکھرے رکھے
ہوں، وہ نگاہ پڑتے ہی اپنے ہاتھ سے پہلے انہیں ٹھیک کریں گے۔ دو ایک موقعوں پر اس کی وجہ بھی انہوں نے ترتیب پر سنجیدہ مذاق فرمایا۔ ایسی چیزوں سے
واسطے کے ذہن کا بکھرا ہونا واضح ہوتا ہے۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ اگر مطالعہ شخصیت کی صلاحیت رکھنے والا کوئی شخص مودودی صاحب کی عدم موجودگی میں ان کے کمرے میں داخل ہو اور
اُس کمرے کا ماحول صرف پانچ منٹ دیکھنے کا موقع پائے تو وہ مودودی صاحب کی آدمی سیرت تو ضرور صحیح صحیح بتا دے گا۔ اسی ترتیب کی مثال اگر ان کی عمل میں
مودودی صاحب سوچتے اور لکھتے ہیں۔ وہ صبح ناشتے کے بعد اپنے وقت مقررہ پر آ کر کرسی پر بیٹھ جائیں گے۔ بالکل نو بجے اور ٹھیک ساڑھے ہوگا۔ پلنگ بچھا
گے اور دماغ میں فکر و کاوش کا پورا کارخانہ متحرک ہو جائے گا۔ بالعموم ان کا چہرہ بتا دیتا ہے کہ اس وقت وہ کسی مضمون یا کسی مسئلے پر کاوش میں ہیں۔ جب
پورا نقشہ ذہن میں مرتب ہو چکے گا تو وہ قلم اٹھائیں گے ورنہ کبھی قلم نہ اٹھاتے۔ انہوں نے کبھی کچھ نہیں لکھا ——— بلکہ پہلے سے سوچے بغیر کوئی بھی کام
وہ نہیں کرتے۔ کیا عجب کہ وہ سونے اور کھانے کے لیے بھی پہلے سے سوچتے ہوں۔ پورا مواد اکٹھا کر لینے، حوالے جمع کر لینے اور مسئلۂ بحث کی کڑیاں خیال ہی
دل میں جوڑ لینے کے بعد وہ قلم کو حرکت میں لاتے ہیں۔ یوں سمجھئے خود ہی سارا مضمون یا کچھ اور ——— پہلے وہ اسے اپنے دماغ کے اوراق پر لکھتے ہیں، پھر ان
اوراق کو دیکھ دیکھ کر کاغذ پر منتقل کرتے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے لکھنے میں بڑی روانی ہوتی ہے اور زیادہ قطع و برید نہیں ہوتی۔

مولانا کا قلم بھی کاغذ خود واقع ہوا ہے۔ ذوق نفاست کی وجہ سے وہ ہمیشہ اچھے لکھنے اور عمدہ کاغذ پسند کرتے رہے ہیں۔ حد کئی کئی دم یک وقت خوبصورت
رکھے ہیں۔ مگر اب کاغذ کی ——— اور خصوصاً اچھے کاغذ کی ——— نایابی کے سبب سے طبیعت بھی ہیں۔ تاہم اب بھی عمدہ سے عمدہ کاغذ موجود رہتا ہے۔ وہ
فل سکیپ سائز کے پرانے تختے پر لکھنے کے عادی ہیں۔ کاغذ کی چٹوں اور چھوٹی چھوٹی پرچیوں پر کبھی نہیں لکھتے۔

لکھنے سے پہلے وہ شکن ڈال کر داہنی طرف لکھا حاشیہ چھوڑتے ہیں۔ میرے سامنے اس وقت مولانا کے دو قلمی مسودے ہیں۔ ایک ۱۹۴۵ء کا (تقریر
اجتماع شمالی ہند منعقدہ دارالاسلام") دوسرا ماضی قریب کا (ترجمان القرآن کی ایک سابق اشاعت کے اشارات)۔ دونوں مسودوں کا حاشیہ ڈیڑھ انچ
چھوڑا ہے۔ بیشتر تقریباً اتنا ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ ۱۹۴۵ء والے مسودے کے ہر صفحے پر پوری انتالیس انتالیس سطریں ہیں، اور بعد کے مسودے
میں سینتالیس سینتالیس ——— یہ منظم سطر بندی سفید کاغذ پر بغیر زیر سطر کے، ذہن کی اقلیدسی مہارت اور اعصاب پر اس کے انضباط کی دلیل ہے۔
دونوں میں سے کسی مسودے کے اوراق کو ذرا فاصلے پر پھیلا دیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک ہی تحریر کی مشینی نقلیں ہیں۔ قطع و برید بہت ہی کم ہے اور جو
کچھ ہے بھی اس کا زائد از نصف حصہ ایسا ہے جو نظر ثانی کرتے ہوئے ضروری محسوس ہوا ہوگا۔ اوراق میں تمام کی تمام سطریں بالکل سیدھی ہیں۔ زیادہ سے
زیادہ یہ ہے کہ بائیں جانب سے عبارت صفحے کے آخر تک جا کر انچ کے دسویں حصے کی حد تک نیچے کو جھک گئی ہے۔ ہر پیراگراف واضح طور پر الگ سے شروع
ہوتا ہے۔ حروف کی اشکال بالکل یکساں ہیں۔ نقطے، شوشے، علامات اوقاف اور واوین اپنی اپنی جگہ پر لازماً موجود ہیں۔ بلکہ الفاظ ضروری حرکات بھی اپنے
ساتھ لیے ہوتے ہیں۔ حلقہ دار حروف (مثلاً م، ق، و وغیرہ) کے حلقے اندر سے لازماً خالی ہیں جیسے کہ ہونے چاہئیں۔ جہاں کسی لفظ کو کاٹا گیا ہے یا کوئی لفظ
بعد میں بڑھایا گیا ہے وہاں ضروری علامت اضافہ (٨) دی گئی ہے۔ گنتی سطروں کے ... میں اغلاط ملیاں ہیں۔

اس طرزِ تحریر کو دیکھتے ہی جو رائے قائم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ لکھنے والا بہت ہی متوازن مزاج آدمی ہے اور پورا پورا احساسِ ذمہ داری رکھنے والا ہے۔

...درسوں کے حقوق اور احکام کا لحاظ رکھا ہے۔ اس کی زندگی میں ضبط و نظم اور بنا سکا ہے۔ وہ جذباتی آدمی نہیں ہے بلکہ مزاج میں متوازن شخصیت رکھتا ہے۔ وہ مستقل مزاج، صاحب عزیمت اور قوتِ عمل والا ہے۔ یہ اور ایسے ہی دوسرے اہم نتائج انسانی شخصیت و کردار کا ہر ماہر ان سے اخذ کر سکتا ہے۔ یہاں اس کا موقع نہیں کہ ان نتائج کے حق میں یا ان کے مطابق استدلال کیا جا سکے۔ پیش نظر شخصیت خود اس پر گواہ ہے۔ مجھے صحافت کے پیشے میں کام کرنے کی وجہ سے قلم کے رسم الخط دیکھنے اور ... کی عادت سی ہو گئی ہے۔ جو خطوط اور تاثرات وصول ہوتے ہیں ان سے کہیں پہلے کام کرنے والی شخصیت کا اندازہ کرنا پڑتا ہے اور بسا اوقات فائل پر لکھا ہوا چہرہ دیکھ کر ہی ابتدائی تاثر قائم ہو جاتا ہے۔ اونچے اور صاف ستھری شخصیتوں کے رسم الخط کے چند اہم نمونے میری نگاہ میں ہیں مگر یہ شہادت دے سکتا ہوں کہ مودودی صاحب کے طرزِ تحریر کے ہم پایہ کوئی دوسرا نمونہ میرے تجربے میں نہیں آیا۔

تحریر ہی کے سلسلے میں آدمی کے خطوط کا طرزِ انشاء بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مودودی صاحب کے لکھے ہوئے خطوط دیکھنے کا خاص موقع مجھے حاصل رہا ہے۔ ایک زمانے میں ترجمان القرآن اور مرکز جماعت کی ڈاک کا کام مولانا کی نگرانی میں میرے ذمے رہا ہے۔ اُن کی مستقل عادت یہ ہے کہ وہ ڈاک خود دیکھتے ہیں اور پوری توجہ سے دیکھتے ہیں اور مختلف شعبوں کے ناظمین کی رہنمائی کے لیے نشانات لگا کر مختصراً ہدایات لکھ دیتے ہیں۔ جن خطوط میں خود ان کو مخاطب کیا گیا ہو یا اسلام یا جماعت کے متعلق اصولی مسائل دریافت کئے گئے ہوں ان کے جواب وہ اپنے قلم سے لکھتے ہیں یا املا کراتے ہیں۔ وہ کم سے کم جوابی مضمون کا خلاصہ اور اس کی ترتیب زبانی بتا دیتے ہیں۔

اپنے قلم سے لکھے ہوئے خطوط میں مولانا مودودی کی چند مستقل روایات نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہیں۔ وہی حاشیہ چھوڑنے اور پیرے بنانے اور علامت ڈالنے کی باقاعدگی اور سطروں کی سیدھائی اور تحریر کی صفائی خطوط میں اور بھی زیادہ اچھا اسبار پیش کرتی ہے۔ ہر خط کی پیشانی پر تاریخ ضرور درج ہوتی ہے۔ بلا استثنیٰ تمام خطوط کا سرنامہ "محترمی و مکرمی!" (خواتین کے لئے محترمہ و مکرمہ) "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" کے الفاظ پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کے بعد تقریباً ہر جوابی خط کا آغاز عنایت نامہ ملا سے ہوتا ہے۔ خاتمہ ہمیشہ خاکسار ابوالاعلیٰ کے لفظوں پر ہوتا ہے جو خط کے نیچے بائیں کونے میں اوپر تلے لکھے ہوتے ہیں۔ خط کا پتہ ہمیشہ بخدمت شریف جناب کے مقررہ الفاظ سے شروع ہوتا ہے اور زیادہ تر تین سطروں میں مکمل ہوتا ہے۔ شہر یا مقام زیر خط کشیدہ ہوتا ہے۔ خط کے اس نقشے میں شاذ برسوں سے کبھی کوئی تغیر نہیں آیا۔ بے شمار خطوط کے سابق مطالعہ کے بل پر میں یہ کہتا ہوں کہ کسی خط میں مصنوعی ادبیت اور غیر ضروری طور پر مزاح کا استعمال نہیں ہوتا اور نہ غیر ضروری نفسِ مضمون پر غیر ضروری فقروں کا اضافہ کہیں محسوس ہوتا ہے۔ خطوط میں مضمون نگاری کے بجائے زیادہ تر گفتگو کا رنگ پایا جاتا ہے۔ عامیانہ گفتگو کا نہیں عالمانہ گفتگو کا۔

وہ لمبا عرصہ جس میں ڈاک میرے سپرد تھی، بالعموم بعد ظہر میں مولانا کے ہاں جاتا اور کبھی کبھی دفتر میں اور کبھی باہر آم کے بڑے پیڑ کے نیچے نشست رہتی۔ اہم علمی خطوط کے جوابات مولانا خود املا کراتے ——— کبھی آرام کرسی پر بیٹھے اور کبھی ٹہلتے ہوئے۔ کبھی کبھی تو مودودی صاحب مجھ سے خطوط پڑھوا کر پہلے سنتے بھی، لیکن اکثر محض یادداشت کی بنا پر بالکل اسی ترتیب سے جوابات لکھوا دیتے جس ترتیب سے خطوں میں سوالات درج ہوتے تھے ——— اور کمال یہ کہ سوالات آیات اور احادیث اور فقہ کے مباحث سے بھی متعلق ہوتے۔ پھر وہ املا ایسی روانی سے کراتے کہ کسی موقع پر جملے کا تسلسل اور بحث کا ربط نہ ٹوٹتا۔ بیچ میں اگر جانا پڑتا یا کوئی صاحب آ جاتے تو بعد میں آتا پوچھتے کہ آخری فقرہ کہاں تک پہنچا۔ بعض اوقات کچھ خطوط میں اپنی میز پر ہی بھول آتا، لیکن مولانا اچانک کسی خاص خط کے بارے میں دریافت کرتے اور مجھے اٹھ کر وہ لانا پڑتا۔ ہفتہ دو ہفتہ کی آئی ہوئی ڈاک کے ایک ایک خط کا ان کو متعین طور پر خیال رہتا اور اس کا نفسِ مضمون مستحضر رہتا۔ لیکن سارے خطوط املا ہی نہیں کرائے جاتے بلکہ بعض کے متعلق مولانا صرف اشارات دے دیتے اور ان کو لکھنے کی ذمہ داری مجھ پر ڈال دیتے۔ اس احساس ذمہ داری کی وجہ سے میں بھی پوری کاوش اور محنت کرتا۔ یہ مولانا کا ایک مستقل طریقِ تربیت تھا۔

اکثر لوگ شرعی مسائل میں استفتاء بھیجا کرتے۔ ایسے ہر استفتاء کے جواب میں تمہیداً یا خاتمہ پر یہ ضرور لکھواتے کہ میں مفتی نہیں ہوں۔ فتویٰ نہیں دیا کرتا، صرف اپنی معلومات کے مطابق رائے عرض کرتا ہوں۔ فتویٰ مطلوب ہو تو کسی دارالافتاء کی طرف رجوع کیجئے۔ اور رائے مسئلے کی ٹیکنیکل صورت بتا کر

کے بارے میں کسی کا پس منظر و شخصیت کا تعین کرتی۔ خاص بات یہ ہے کہ مولانا مودودی نے کبھی کسی سوال پر خواہ استفسار کرنے والے کا نقطۂ نظر تحقیر یا جھنجھلاہٹ سے خطاب نہیں کیا، بلکہ ایسی چیزوں سے کہ جن کو ہمیشہ امت حق میں معیوب سمجھتے تھے، چاہے ان کے الفاظ اور انداز سخت بھی کیوں نہ ہوں۔ البتہ معاندانہ اور شر پسندانہ سوالوں کا انہوں نے کبھی خیر مقدم نہیں کیا۔ ایسے لوگوں کو ہمیشہ نصیحت کرتے کہ سنجیدہ زبان اور شریفانہ ملاقات کو ترجیح دیں [illegible] وہ نہیں دے سکتے۔ اختلافی معاملات میں بالعموم یہ لکھ دیتے کہ میرا مطالعہ یہ ہے، آپ کو یہ رائے صحیح معلوم ہو تو قبول کیجئے ورنہ جس کی رائے آپ کو صحیح معلوم ہو اسی کو اختیار کیجئے۔ فرقہ وارانہ جھگڑوں کے متعلق خطوط کا بھی وہ خوش آمدید نہیں کہتے تھے۔ وہ سوالات اور جوابات میں لکھتے کہ ان جھگڑوں کے بجائے دین کی اصل حقیقت کو پانے کی ضرورت ہے۔ فقہی اور فروعی اختلافات کے لئے باہم دگر وسیع النظری سے معاملہ کرنا چاہیے۔ مجھے ایک مرتبہ بھی یاد نہیں کہ ان خطوط و کتابت میں مولانا نے کسی کی تکفیر کی ہو یا تفسیق [illegible] —— بلکہ جو وسعت اور رواداری ان میں تھی وہ بھی انتہا میں تھی۔

چنانچہ مجھے ایک طرف اس خطوط نویسی کے زمانے میں مولانا کی سیرت اور مزاج کے مطالعے میں زیادہ قریب سے موقع ملا [illegible]۔ دوسری طرف میری فکری تربیت ہوتی گئی اور نظامِ اسلامی سے متعلق علمی خلش کے دروازے بھی کھلتے گئے۔ شاید میرے سوالات [illegible] اس میں —— ہر شخص آدمی کی طرح مولانا مودودی کے خطوط میں [illegible] مگر کوئی قصیدہ مودودی صاحب کے مزاج یا طرز انداز ہو سکا اور نہ کا ئیں کا رد عمل ہو۔ ایک بے نیازانہ جذبے کا اظہار سامنے آیا۔ اس ڈاک کے سوا جو علمی مسائل یا جماعتی معاملات سے متعلق ہوتی، بقیہ خطوط کو محفوظ رکھنے کا اہتمام مودودی صاحب نے کبھی نہیں کیا ورنہ انبار جمع ہو جاتے۔ اہم محفوظ شدہ خط و کتابت اب "رسائل و مسائل" نامی مجموعے کی صورت میں مطبوعہ ہے۔

ان اشارات سے میں خود نتائج اخذ کرنے کے بجائے یہ کام اس مقالے کے قارئین پر ہی چھوڑتا ہوں۔

ہر صاحبِ دعوت کو زبان کی طاقت کی ضرورت ہے۔ محض قلم کے بل پر ہی کام کئے جا سکتے ہیں مگر عوام کے قریب ہو کر ان کو جیتنے، منظم کرنے اور کسی تحریک کو آگے لے چلنے کیلئے وہ آدمی موزوں نہیں ہو سکتا جو اسٹیج پر آکر گنگ ہو جائے۔ مولانا مودودی گنگ نہیں ہیں، خطیب ہیں۔

میں نے ان کا اولین خطاب دارالاسلام کی مسجد میں جمعہ کے موقع پر سنا۔ ان پڑھے لکھے بہاتیوں کی کثیر تعداد کے اندر تھوڑے سے تعلیم یافتہ لوگ پٹھانکوٹ اور سجان پور کے قصبوں اور قلعہ جمال پور کی مختصری آبادی سے آکر شامل تھے۔ مولانا نے ان دنوں اردو زبان میں خطبات جمعہ کا ایک سلسلہ شروع کر رکھا تھا اور اب وہ کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے)۔ اذان ثانیہ پر وقار سے اٹھے منبر کے (غالباً) پہلے زینے پر کھڑے ہوئے۔ آہستگی اور سادگی سے خطاب شروع کیا۔ —— جیسے لوگوں سے باتیں کر رہے ہوں۔ یہ ستقبل کا ایک بڑا مقرر تھا۔ سیدھے سادے کلمات کا اثر اس خاموش فضا میں پوری طرح نمایاں تھا۔ بعد میں مودودی صاحب نے متعدد مواقع پر کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اعلیٰ درجے کے علمی خطبے دیئے۔ ارکان جماعت کے مختصر اجتماعات میں بار بار تقاریر کیں، سوالات کے جوابات دیئے اور ہدایات دیں۔ آہستہ آہستہ ان کی خطابت آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ پاکستان بننے کے بعد انہوں نے بہت سے بڑے بڑے جلسوں میں تقریریں کی ہیں۔ اور آئے دن یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اب وہ اپنی نوعیت کے بہت ممتاز مقرر ہیں۔

انہوں نے اپنی دعوت کی نوعیت کے لحاظ سے خطابت کے ایک نئے طرز کی بنیاد ڈالی ہے اور پرانے خلافتی مکتبِ خطابت سے الگ ہو کر ایک نیا مکتبِ خطابت استوار کیا ہے۔ مولانا خطابت کو ایک اہم ذمہ داری سمجھتے ہیں اور ضروری قرار دیتے ہیں کہ ایک ایک لفظ پہلے سے غور کرنے کے بعد زبان پر لایا جائے۔ کیونکہ ہزاروں بندگانِ خدا پر اس کا اچھا یا برا اثر پڑتا ہے۔ اور اس سلسلے میں آدمی کو آخرت کی عدالت میں جواب دہی کرنی ہے۔ بے ربط اور منتشر اور موضوع سے آزاد ہو کر پہاڑی نالوں کی طرح جھاگ اڑا اڑا کر بہنے والی تقریر کو وہ تعمیر و تربیت عوام کے لحاظ سے مضر سمجھتے ہیں۔ ان کا سوچا سمجھا ہوا نظریہ یہ ہے کہ ہماری قوم میں سطحی جوشیلے پن کا مرض بڑھ گیا ہے۔ اور اس میں سنجیدہ اور تعمیری دعوت کو جذب کرنے کی صلاحیت کم ہو گئی ہے۔ نیز

خطابت ساحروں نے اس کا مذاق صدمہ کر دیا ہے۔ لہٰذا اب اسے چاشنی اسے جا تقریروں کی ضرورت سے بے نیاز کر دیا ہے۔ میں ایسی تقریر کی گنجائش نہیں ہے جس میں لطیفے، کہانیاں، قوالی، منظوم، شور شرابہ، شعر، اور بلند آہنگی ہو۔ جاہل سامع مکتب خطابت کی تکبیر، سادہ، سنجیدہ، معقول اور متین ذہنیت کی ہوتی ہیں۔ ان کی طرح مخاطب ہوتا ہے۔ مودودی صاحب نے قریب میں سمجھ لی ہیں یہ سرمایہ تقریر نہیں کی جو ایک مسودہ اور معینہ منزل کی جانب آگے بڑھتی ہو اور سیدھی سادی باتیں جو عام فہم انداز میں [illegible] نہ نعروں کی بہار، نہ واہ واہ، نہ [illegible] ضرور باز کا شور، بات کہی اور اسٹیج سے رخصت ہو گئے۔

تقریر کے اس خصوصی اسلوب کے تقاضے سے مودودی صاحب پہلے سے کئی کئی گھنٹے مطالعہ کے تیاری کرتے ہیں۔ سوچتے رہتے ہیں۔ مواد اکٹھا کرتے ہیں۔ پھر اسے لے کر اپنی تقریر کے مطالب کی کڑیاں مختصر اشارات کی شکل میں درج کر لیتے ہیں۔ جب یہ ہو چکتا ہے تو تقریر کے بارے میں "ترود" میں آ جاتے ہیں۔ تقریر کرنے سے پہلے کے تقریر سے وقفے میں ان کے چہرے پر ایک خاص رنگ پایا جاتا ہے جس کو قریب سے جاننے والے ساتھی ہی پہچان سکتے ہیں۔ اپنے انہی اشارات کے ذریعے وہ بعض اوقات تقریر بعد میں کسی کو بٹھا کر لفظ بلفظ کی ترتیب سے املا کرا دیتے ہیں۔ کئی بار ایسا ہوا ہے کہ ایک ہی تقریر مختلف مقامات پر کرنی پڑی تو بالعموم ہر جگہ لفظ بلفظ دہرائی گئی اور اس کی ترتیب میں سر مو فرق نہیں آیا۔

اسٹیج پر تقریر کرتے ہوئے ان کا جو کچھ مخصوص انداز ہوتا ہے اس کے امتیازی خد و خال کو میں نے ایک خاص موقع پر تعمق سے سمجھا۔ جالندھر کے ایک دوست کرداروں کا ڈرامائی چربہ اتارنے میں ماہر ہیں۔ خصوصیت سے مقررین کا تو وہ ریکارڈ بن کر حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ انہوں نے ہمارے اصرار پر ایک مرتبہ بڑی جھجک کے ساتھ مودودی صاحب کی تقریر کا ریکارڈ سنایا۔ اس ریکارڈ کو سننے کے بعد اب میں بآسانی بتا سکتا ہوں کہ مودودی صاحب کے امتیازات کیا ہیں۔ وہ اسٹیج پر زیادہ تر ڈائس کے سہارے کھڑے ہوتے ہیں اور کاغذات سامنے رکھ لیتے ہیں۔ سینے تک کا بالائی حصہ کسی قدر آگے کی طرف جھکا ہوا سا رہتا ہے۔ ایک ہاتھ ——— غالباً بایاں ——— کمر کے پیچھے رہتا ہے۔ دوسرے ہاتھ سے وہ شیروانی کے بٹن سے یا چوغے کو ذرا ذرا چھیڑتے رہتے ہیں۔ یہی ہاتھ کبھی کبھی بڑی آہستگی سے مختصر سی اشاراتی حرکت کرتا رہتا ہے۔ لہجے کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ یہ حرکت تیز یا سست ہوتی ہے۔ تقریر کی ابتدا دھیمی آواز اور انتہائی ٹھہراؤ سے ہوتی ہے اور الفاظ میں شخصیت کا وزن محسوس ہو رہا ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ آواز اور لہجہ چڑھاؤ کی طرف جاتے ہیں، مگر بس ایک متعین حد تک۔ اس حد سے آگے کوئی ایسا جملہ ہی جا سکتا ہے جس کے پیچھے شدت جذبات کام کر رہی ہو۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے اور بہت کم وقفے کیلئے یہ رنگ آتا ہے۔ تقریر پھر اپنی متوقع مقدار اعتدال پر آ جاتی ہے۔ موضوع کے راستے پر مودودی صاحب گویا خط مستقیم چلتے ہیں اور ادھر ادھر کی آوارہ گردی نہیں کرتے۔ تقریر میں دردمندی کی روح ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ انہوں نے دستور اور جمہوریت اور انتخابات اور دوسرے اہم اور پیچیدہ مسائل پر جب کبھی خطاب کیا ہے، اپنی بات کو عام فہم بنا کے پیش کیا ہے اور ہر پیچیدگی کا حسن و خوبی سے تجزیہ کر کے غیر تعلیم یافتہ سامعین تک کو متاثر کیا ہے۔ ان کا انداز تفہیم اپنی مثال آپ ہے۔

اس طرح کی غیر رنگین "اسلوب تقریر" تقریر جس میں مجمع کو اس کی دل پسند ذہنی رنگینی دکھلائی جاتی ہو، دو دو گھنٹے عوام کو بٹھا کر سنانا آسان نہیں۔ اس کے لئے مودودی صاحب نے جلسوں اور اجتماعات کی ایک نئی فضا برسوں کی محنت سے پیدا کی ہے۔ پہلے اپنے رفقا کو اور پھر ان کے ذریعے عوام الناس کو ضبط و نظم اور سنجیدگی اور خاموشی کی تربیت دی ہے۔ "کھیل تماشے" کا عنصر اجتماعات سے بالکل خارج کر دیا ہے۔ خصوصاً پابندی وقت کے معاملے میں ایک نئی روایت قائم کی ہے۔ اس سلسلے میں ایک لطیفہ قابل ذکر ہے۔ گزشتہ کل پاکستان اجتماع کے موقع پر جلسہ عام بھی رکھا گیا تھا۔ لوگ آٹھ بجے سے جہانگیر پارک میں جمع ہو چکے تھے اور کچھ ابھی آ رہے تھے۔ ساڑھے آٹھ بجے مودودی صاحب کی تقریر ہونی تھی۔ اگلی صفوں میں بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے قریب کے دوسرے ساتھی سے پوچھا "وقت کیا ہوا ہے؟" انہوں نے جواب دیا "ابھی آٹھ بج کر سو منٹ نہیں ہوئے ورنہ مودودی صاحب کی تقریر شروع ہو گئی ہوتی۔" بارہا ایسا ہوا ہے کہ کسی مخالف طاقت نے شر پسند عنصر کو تیار کر کے مودودی صاحب کی تقریر میں شرارت کرنے اور جلسہ خراب کرنے بھیجا، لیکن

بعض معترضین کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مولانا مودودی صاحب کی شخصیت اسلامی تحریک کے لئے ہمیشہ ایسی فطری کوشش کا نام بنا رہا۔ اس حقیقت سے بہر حال انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مولانا مودودی (جو اس کے موسس رہے ہیں) اس طرح کے حالات میں کبھی بھی گھبراتے نہیں۔ بلکہ جرأت مندی اور اعتماد کے ساتھ پورے عزم کے ساتھ حوادث کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں اور خدا ان کو ہمیشہ ہی کامیابی دیتا ہے۔

جلسوں میں جا کر وہ سوالات کا جواب خوش دلی سے دیتے ہیں۔ چنانچہ جو پرچیاں آتی ہیں وہ بعد میں امیر کا مرجع ہو جاتی ہیں۔ بڑی خوش اسلوبی سے وہ ان پرچیوں کو ایک ایک کر کے پڑھتے ہیں اور ایک ساتھ ہی حاضر دماغی سے ان کے ایسے برجستہ جواب دیتے چلے جاتے ہیں کہ سامعین عش عش کر اٹھتے ہیں۔ مثال کے طور پر لاہور کے ایک جلسے میں ایک صاحب نے سوال کیا کہ جب دوسری پارٹیوں نے مل کر ایک متحدہ صورت اختیار کر لی ہے تو آپ نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ کیوں بنائی؟ مولانا نے فوراً جواب دیا: "افسوس ہے کہ مجھے ڈیڑھ ہی اینٹ ملی، ورنہ میں سب سے پہلے مسجد بناتا"۔

تقریر کے دوران میں اگر کسی تکلیف کی وجہ سے، وہ وقفہ یا پانی پیتے ہیں۔ نعرے لگائے جانے کو وہ پسند نہیں کرتے۔ بس گوارا کرتے ہیں۔ تقریر کرنے کے بعد چند لمحے سستانے کے لئے کرسی پر بیٹھتے ہیں۔ پھر جلد روانہ ہو جانا چاہتے ہیں۔ لیکن لوگ آ آ کر مصافحہ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ رفقاء راستہ بنانے میں احسان کر کے جلد از جلد بھیڑ سے نکال لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔

میں نے مولانا کی ریڈیائی تقریریں بھی سنی ہیں (احباب مطبوعہ صورت میں ملتی ہیں)۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مولانا مودودی کی آواز ریڈیائی ضروریات کے مطابق بہت ہی موزوں ہے۔ آواز بہت صاف سنائی دیتی ہے، اچھی طرح پہچانی جاتی ہے اور تلفظ کی پوری صحت محسوس ہوتی ہے۔ ریڈیائی تقریروں میں بولنے کی رفتار اکثر اوقات تیز رہتی ہے کیونکہ ... منٹ میں وہ موضوع سے متعلق اپنی پوری بات کہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اب تو مولانا مودودی کو یہ ریڈیو کے ... جانتے ہیں، کیونکہ سیاسی آدمی ہونے کا تصور پاکستان میں یہ تصور ہے جس کے بعد آدمی سے خالص علمی اور فکری دینی استفادہ کرنا بھی ممکن نہیں رہتا۔

سالانہ اجتماع کی تقریر کا بنیادی نقشہ مطالب مجلس شوریٰ کے مشورے سے جناب صدر امیر جماعت ________ خواہ وہ کوئی بھی ________ اسی نقشے کی پابندی کرتا ہے۔ مولانا مودودی اتنی اونچی شخصیت رکھنے کے باوجود اس پابندی سے کوئی استثنیٰ نہیں رکھتے۔ یوں بھی کسی مہم کے سلسلے میں جیسے اور خطابات ہوں تو ان کے لئے بھی مجلس شوریٰ ہی کے اندر باقاعدہ منصوبہ بنتا ہے اور تقریر کے اساسی خطوط متعین ہو جاتے ہیں۔ البتہ فوری، ہنگامی اور متفرق مواقع پر جبکہ جماعت کی پہلے سے بنی ہوئی پالیسی کے اندر کام کرنا ہوتا ہے، مولانا مودودی (اور جو کوئی بھی امیر ہو) تازہ مشورے کے بغیر خطاب کرتے ہیں۔ جماعت کا موسس اور داعی اول بھی اپنی امتیازی شخصیت کے باوجود جماعت کے نظم کی پابندی سے بالاتر نہیں ہے۔

نماز کے بھی کئی رنگ ہیں اور ہر نماز شخصیت کا ترجمان ہوتی ہے۔ مثلاً عامی کی نماز اور خدا ترس کی نماز، بے سمجھے بوجھے کی نماز اور شعوری نماز، زندگی سے ہم آہنگی رکھنے والی نماز اور اس سے تضاد رکھنے والی نماز، جذباتی آدمی کی نماز اور مستقل مزاج شخص کی نماز، عادت کی نماز اور ارادے کی نماز، عامیانہ شخصیت کی نماز اور کسی ممتاز شخصیت کی نماز ایک دوسرے سے بالکل الگ الگ پہچانی جاتی ہیں۔

مودودی صاحب ہمیشہ پابندی سے مسجد میں نماز باجماعت ادا کرتے رہے ہیں، لیکن اب جب سے پتھری کی تکلیف اور نزلے کے پے در پے حملوں نے عمر کے تیسرے مرحلے میں آکر ان کے اعصاب کو مضمحل کر دیا ہے، وہ بیشتر نمازیں مرکز کے لان میں رفقائے مرکز اور ملاقاتیوں سے مل کر ادا کر لیتے ہیں۔ پھر بھی جمعہ کو ضرور محلے کی مسجد (مسجد رسول پورہ) میں جاتے ہیں۔ ہر قسم کے خطیبوں کے خطبے سنتے ہیں اور ہر سطح کے اماموں کی اقتداء کرتے ہیں۔ اس شخص کو جس کے دوستوں اور دشمنوں کے حلقوں میں ہمیشہ چرچے ہیں اور جس کے ساتھ حامیانہ اور مخالفانہ دلچسپیاں رکھنے والے ہزارہا انسان بیرون پاکستان کے مختلف ممالک تک میں پھیلے ہوئے ہیں، اس کو آپ مسجد رسول پورہ کے کسی کونے میں ایک درویش بے نیاز کے انداز سے بیٹھا پائیں گے۔ اس کا رجحان ... اور وہ خطبہ تک کے

ساتھ میں ہوا ہوگا۔ ذرا فجر کی نماز کے بعد وہ باہر نکلتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ایک دوسرا شخص کسی دوسری جگہ پر بیٹھا ہوگا۔

دارالاسلام کی مسجد کی باقاعدہ امامت مودودی صاحب کرتے تھے اور اب بھی مرکز میں جماعت کے اجتماعات کے موقعوں پر وہی مصلے پر کھڑے ہوتے ہیں۔ وضو ہمیشہ گھر سے کر کے آتے ہیں۔ سنتیں بھی گھر سے پڑھ کر آتے ہیں اور کبھی مسجد میں پڑھ لیتے ہیں۔ امامت کیلئے کھڑے ہوں تو سیدھے کھڑے ہوتے ہیں۔ مردانہ جذبات قیام کے ہر منصب میں صاف جھلکتے ہیں۔ نماز کیلئے استقبالِ قبلہ کرتے ہیں تو ان کے اندر ایک خاص طرح کا احساس ذمہ داری پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کی نماز ہمیشہ معتدل ہوتی ہے ــــــ نہ غیر معمولی طور پر طویل نہ جلد بازانہ ــــــ سکون اور وقار اور تمام ارکان میں شروع سے آخر تک جھلکتا ہے۔ قراءت کا انداز بالکل ہی منفرد قسم کا ہے۔ ایک ایک آیت الگ الگ کر کے اور اس کے اجزائے مطالب کو واضح کرتے ہوئے قرآن پڑھتے ہیں۔ لہجے میں ٹھیک معانی و مطالب کے مطابق اتار چڑھاؤ ہوتا ہے۔۔ تو عموماً دوسرے رخ پر جاتے ہیں اور نہ لے لے کر خاص طریق سے عبارت کی طرح آیات پڑھتے ہیں۔ کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے اور وہ ساتھ نماز پڑھنے والوں پر یہ اثر انداز ہوتی ہے کہ جیسے کائنات کے فرماں روا کی خدمت میں کھڑے ہیں اور اپنے جذبات پیش کر کے ہم اس کی طرف سے لطف و عنایات طلب کر رہے ہیں۔ مودودی کی نماز میں وہی نکتہ رسی پائی جاتی ہے جو ان کے علمی کام میں ہے۔ اس میں دلوں کو تڑپا دینے والا ماحول نہیں۔ جو جاری نمازوں پر روز بروز ہوتا ہے۔ اور اس کی وجہ سے اس نماز کی طلب ہی ختم ہو گئی ہے۔ اور اگر اپنے آپ کو گھسیٹ کر لے جائیے بھی تو اٹھا اور بیٹھ کر پڑھ جاتی ہے۔ فرض پڑھنے کے بعد مختصر سی دعا ہوتی ہے اور امامت کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد سنتیں پڑھ کر مولانا مودودی بھی جلسہ گاہ سے الگ ہو جائیں گے اور دوسرے لوگ بھی منتشر ہونے لگیں گے۔ مودودی صاحب نوافل مسجد میں نہیں پڑھتے کیونکہ قرآن و حدیث کے مطابق ان کا نظریہ یہ ہے کہ نفل اجتماعی طور پر اور نوافل اخفاء کے ساتھ ادا کرنے چاہئیں۔ مودودی صاحب کی نماز اور امامت نہ بے جا طور پر طویل ہوتی ہے، نہ بے ڈھنگی اور بے کیف! جا بالغہ عرض کروں گا کہ پہلی نماز جو میں نے مودودی صاحب کے ساتھ ادا کی اس کا ذائقہ پہلے کی تمام نمازوں سے مختلف تھا۔ اس امامت میں نئی شخصیت جلوہ گر تھی۔ نماز اور قراءت کا یہ خاص اسلوب میں نے پہلے بھی اور بعد میں بھی کسی دوسرے میں نہیں پایا اگرچہ دوسرے حضرات کی نماز و امامت میں بھی طرح طرح کی خوبیاں اور اثر انگیزیاں محسوس کی ہیں۔ نماز کو اس میں تصور نماز بناتا ہے اور تصور نماز تصور خدا پر مبنی ہوتا ہے۔ مودودی صاحب کی نماز میں ان کا انقلاب آموز تصور سارا طاری و ساری رہتا ہے۔ افسوس ہے کہ یہ چیز صرف نفسیاتی و روحانی تجربہ سے تعلق رکھتی ہے اور مقالاتی بحثیں اس کی متحمل نہیں ہیں۔

دارالاسلام میں یہاں میں نے دوسرے رفقاء کے ساتھ مولانا مودودی کے حلقۂ درس میں قرآن اور حدیث کا جو مطالعہ کیا ہے درحقیقت اس نے میرے ذہنی سانچے کو بڑی حد تک توڑ پھوڑ کر موجودہ شکل دی ہے۔ مسلسل پانچ برس یہ حلقہ درس ایک اسٹڈی سرکل کے سے انداز پر ہماری ذہنی و اخلاقی تربیت کا ذریعہ بنا رہا ہے۔ درس بہت جگہ ہوتے ہیں، بہت سے بزرگ درس دیتے ہیں لیکن مجبوراً پھر وہی کہنا پڑتا ہے کہ مودودی صاحب کے درس کا انداز بھی بالکل مختلف پایا۔

طریقہ یہ تھا کہ نماز فجر یا نماز عصر کے بعد تمام لوگ حلقہ زن بیٹھ جاتے اور اپنے اپنے مصحف سامنے رکھ لیتے۔ اکثر اوقات ہم لوگ پہلے سے زیر درس آنے والے حصہ کا مطالعہ کر لاتے اور اس کے بارے میں سوالات اور الجھنیں نوٹ کر لاتے۔ مولانا ہلکی آواز سے تعوذ اور تسمیہ کہہ کر آغاز کرتے پھر گزشتہ سلسلہ کلام کا خلاصہ ذہنوں میں مستحضر کر دیتے، پھر اگلی آیات کا معنوی ربط سامنے لاتے۔ اس کے بعد ایک ایک آیت پڑھتے، اس کا سادہ مگر جاندار اور اثر انگیز اور جدید اردوئے مبین میں ترجمہ کرتے، پھر خاص خاص اصطلاحی کلمات کی وضاحت کرتے، جو مغالطے متعلقہ مضمون کے بارے میں عام طور پر پائے جاتے ہیں ان کو صاف کرتے اور آخر میں احکام اور تقاضے واضح کرتے۔ پھر اگلی آیت، پھر اس سے آگے ــــــ اور اسی طرح تقریباً ایک رکوع ہر نشست میں ہو جاتا۔ اس درس میں کبھی بھی صرف و نحو اور منطق اور بلاغت کی ٹیکنیکل بحثوں کا پر تو انہوں نے نہ پڑنے دیا۔ ان کا

مغرب کا عام آدمی ـــــ مصر کا تعلیم یافتہ نوجوان ـــــ کو سمجھانے کا جذبہ اور اسی کی ذہنی سطح پر مسائل اور ان کا تجزیہ پیش نظر رکھتے ہوئے بحث صحیح جدید ذہن کے مسائل کا کوئی بھی تعلق ہوتا تو اس قدر کے ساتھ اس پر ضرور گفتگو کرتے نیز مختلف فقہی نقطہ ہائے نظر کو سامنے رکھ دیتے۔ صاحب درس کے سامنے اصل مطمح نظر یہ تھا کہ قرآن کا انسان مطلوب پیدا کریں اور درس حدیث نے دیا۔ یہ جو ہم نے تفصیل سے نمایاں کریں۔

درس کی ایک ایک آیت اور حدیث پر سوالات کی بوچھاڑ شروع ہوتی۔ سوالات ہر قسم کے ہوتے تھے۔ وہ نئے تعلیم یافتہ ذہن کو بھی لے پیدا کردہ، جدید حلقوں کے اٹھائے ہوئے اعتراضات، زمانے کے جذباتی طرز کے ـــــ اور اکیلا مودودی ان سارے سوالوں کو خندہ پیشانی کے ساتھ چاروں جانب سے سہتے رہتے۔ حکیمانہ و تفہیمانہ اسلوب سے ہر بات کی وضاحت ہوتی چلی جاتی۔ کسی بات کے سمجھنے کے بعد جب بات کا سلسلہ چل نکلتا اور اس کی وجہ سے درس ایک ہی آیت یا حدیث پر رکا رہتا۔ بحث میں نوجوان سامعین تیزی بھی دکھاتے اور بعض اوقات پرانے علماء بھی طرح طرح سے حصہ لیتے۔ مگر صاحب درس ٹھنڈے دل اور زیر بار اصل حقیقت کو نمایاں کرنے کی سعی مسلسل کرتے یہاں تک کہ بالآخر تسکین سی ہو جاتی۔ خصوصیت سے جہاں کہیں معاشی اور سیاسی بحثیں پیدا ہوتیں وہاں بڑی بڑی گرما گرمی پیدا ہو جاتی کمیونسٹ پروپیگنڈے کے پھیلائے ہوئے تصورات مساوات کی بنیاد پر نوجوان خوب خوب الجھتے، بڑی مزاحمت کے ساتھ اور اکثر ایسا ہوتا کہ وہ ایک موقف پر ہماری طرف سے زیادتی ہو جاتی۔ مگر وہ مجسمۂ استقلال نہ کبھی گھبرایا، نہ کبھی بگڑا، نہ ہم سے مایوس ہوا۔ کوئی اور ہوتا تو شاید لعنت ملامت پر اتر آتا، حلقۂ درس سے نکال باہر کرتا یا کم از کم درس ہی کو برطرف کر کے بیٹھ رہتا۔ مگر یہاں تو ہر وہی مسکراتا چہرہ، وہی ٹھنڈا مزاج اور وہی تعلیمی انداز ہمارے سامنے ہوتا۔ باہر سے مودودی صاحب کے نئے نئے عقیدت مند پیری مریدی کی روایات ذہن میں لئے ہوئے آتے اور ہماری بے تکلفانہ اور آزادانہ گفتگو کو غیر شرعی اور غیر مودبانہ سمجھ کر ناک بھوں چڑھاتے۔ کبھی تو حلقۂ درس ہی کو ترک کر دیتے۔ ہم جب بھی اور خود مولانا مودودی ہماری مدافعت کرتے اور ہماری آزادی اور ہمارے حقوق کی وکالت کرتے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بحث فلسفۂ اقتدار کے سلسلے میں بہت طویل ہو گئی تھی۔ اسی طرح ایک مرتبہ اَلسُّلْطَانُ ظِلُّ اللّٰهِ (حدیث) پر خوب خوب دماغ سوزی ہوئی۔ غالباً ایک یحییٰ صاحب تھے اور دوسرا میں تھا جن کو کسی علمی بنیاد کے بغیر اصرار تھا کہ یہ حدیث موضوع ہے اور قابل استرداد۔ مولانا مودودی نے بخلاف ان کے اس کا ایک ایسا مفہوم ہمارے سامنے رکھا جس پر کسی پہلو سے اعتراض وارد نہیں ہوتا تھا۔ ان کا مطالعہ یہ تھا کہ اَلسُّلْطَان کے معنی یہاں بادشاہ نہیں بلکہ حکومت و سلطنت یا حاکمیت ہیں اور حدیث کا منشا، انہوں نے یہ واضح کیا کہ بادشاہت یا حاکمیت یا اقتدار اللہ تعالیٰ ہی کے اقتدار کا ایک پرتو ہے اور جو شخص اس خدائی امانت و عطیہ کو پاکر اس کی اہانت کرتا ہے خدا بھی اُسے ذلیل کرتا ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے علم خدا کا ایک عطیہ ہے اور جو عالم علم کو زرِ نیت کیلئے استعمال کرے وہ مجرم ہے۔ اس مفہوم نے نئے دروازے کھول دیئے۔ مگر حدیث کا جو استعمال ہماری تاریخ میں ہو چکا تھا اور اس کی وجہ سے جو اضطراب عام طور پر نوجوانوں میں پھیلا ہوا تھا اس کی وجہ سے ہم اصرار کرتے تھے کہ ایسی حدیث کو آخر بنائے استدلال بنانا ہی کیا ضرور ہے۔ یحییٰ صاحب تو بڑی صفائی سے یہ کہتے تھے کہ مولانا جب معلوم ہے کہ ہمارے بادشاہوں کے حفظ اقتدار کیلئے دنیا پرست عالموں نے حدیثیں گھڑی اور استعمال کی ہیں تو یہ جانتے ہوئے ایسی حدیثوں کو کیوں لیا جائے۔ صاحب درس نے بڑی مغز ماریوں کے بعد یہ اصول ہمارے ذہن نشین کرایا کہ اگر کوئی حدیث روایت و سند کی صحت رکھتے ہوئے کوئی ایسی تاویل و تشریح قبول کرتی ہو جو دین کے اصولوں اور اس کے مجموعی تاثرات کے مطابق بیٹھ سکے تو محض بلا وجہ اُسے رد کرنے کا کسی کو حق نہیں ہو سکتا ـــــ

بہرحال اس آزادانہ فضا میں ہم نے دین کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ سمجھا۔

درس ختم ہوتا تو ہم سب اپنے اپنے مصحف لے منتشر ہو جاتے۔ کسی دن جاتے ہوئے اپنی کسی بڑی غلطی اور کسی عملی کوتاہی کا شعور و احساس لے کے جاتے اور اس کی اصلاح کا جذبہ موجزن محسوس ہوتا۔ کسی دن دین کی کوئی نئی حقیقت دل کے دامن میں لئے ایک عجیب سی مسرت کے ساتھ ـــــ جسے مسرت علم کہنا چاہیئے ـــــ مسجد سے نکلتے۔ کسی دن ذہن کی کوئی الجھن اور زیادہ پیچیدہ ہو جاتی اور وہ اگلے روز سابق درس کے بارے میں از سر نو بحث چھیڑنے کا محرک بنتی۔ کسی دن مختلف الخیال رفقاء آپس میں بحث کرتے ہوئے نکلتے اور چوبیس گھنٹے میں فرصت کے

موافق پر ہی بحث ہوا۔ مودودی جی جہاں تک کہ مجھے معلوم ہو سکا ہے درس کے سامنے تھا۔ ایسا بھی ہوتا کہ درس کے بعد ہم لوگ مودودی صاحب کو گھیرے میں لے کر بیٹھ جاتے اور دماغ کی ایک ایک بھڑاس نکالتے۔ یہ سب کچھ ہوتا مگر تیزی کے رنگ سے دور انہ فضا کی پاک رکھا۔ کیونکہ بنیادی طور پر ہم سب کا مقصد ایک ہی ہوتا تھا اور سب طالب علم تھے نہ کہ مناظرہ باز۔ نظریات ٹوٹتے اور بنتے، جامد خیالات پگھلتے اور نئی شکل اختیار کرتے۔ شخصیت مکمل طور پر ایک سانچے میں ڈھل رہی تھی۔ ذہنوں میں ہر معاملے کے اندر چڑھاؤ اتار رہتے۔ اور ہم محسوس کرتے کہ ہمارے اندر تخریب و تعمیر کا متوازی عمل جاری ہے۔ ہمارے اندر کا پرانا انسان دم توڑ رہا ہے اور ایک نیا انسان ابھر رہا ہے۔ مذہب کے تنگ آلود موروثی تعصبات اکھڑ رہے ہیں اور ترتیب سوچ کا نیا نقشہ ہمارے دماغ کے سطح پر چمک رہا ہے۔ الغرض ہم نے مودودی صاحب سے جو چیز بھی قبول کی ہے اپنی آزادی رائے کو برقرار رکھتے ہوئے اور اپنی شخصیت کی بنیاد پر قبول کی ہے۔ عقیدت مندی کے ساتھ آمنا و صدقنا شاید کسی ایک امر میں بھی نہیں کہا۔ مودودی صاحب نے بھی اس طریق تعمیر و تربیت کو سوچ سمجھ کر اپنایا تھا۔ وہ دراصل اندھے مرید (followers) نہیں چاہتے تھے کہ جن کا کلاوہ بنا کر وہ اپنی عقیدت کے مالے میں پکڑیں اور ان کو اپنی کرامات کی چراگاہ میں چرا کر ان کے گوشت اور خون سے فائدہ اٹھائیں اور پھر دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے یہ گلہ اپنی اولاد کے لیے بطور ترکہ اور جائداد کے چھوڑ جائیں ——— وہ ایک سوچنے سمجھنے اور اپنے اندرونی جذبے سے حرکت کرنے والی طاقت پیدا کرنے کے اہتمام میں تھے جو اسلامی اصولوں پر ایک نئی دنیا بسانے کا پلٹ اوا کر سکے ہمیں کبھی مغالطہ نہیں ہوا کہ ہم فی الواقع اس گراں بہا کام کے پوری طرح اہل بن گئے ہیں۔ احساس صرف یہ ہے کہ دارالاسلام کی تربیت نے ہمیں ایسے سوچنے سمجھنے والے پیروان اسلام میں ڈھال دیا ہے جن کا سرچشمۂ فکر قرآن و حدیث ہے اور جو اعتماد کے ساتھ مخالفانہ حالات کے مقابلے میں کھڑے ہو کر وہ میں آگے بڑھنے کا راستہ خود بنا سکتے ہیں۔

اس درس کا سلسلہ کبھی کبھی مرکز میں اب بھی جاری رہتا ہے اور اب بھی سوالات اور بحثیں چھڑتی ہیں۔ مگر سچ یہ ہے کہ ہم دارالاسلام کے دور کے درس کو ترس گئے ہیں۔ کتنا اچھا تھا ہمارا وہ زمانۂ ناآشنائی! کتنے ناقابل فراموش ہیں وہ "اجنبیت کے مزے"!

اب اس صاحب درس کی شخصیت کا نقشہ آپ خود اپنے ذہن میں کھینچ سکتے ہیں۔

آئیے اب ذوقیات کے دائرہ کی طرف!

مولانا مودودی کے ذوقیات کا شجرۂ طیبہ چائے اور برفاب سے سیراب ہوتا ہے۔ اور اس کی ٹہنیاں پان کے پتوں سے آراستہ ہیں۔ پان مولانا کے ہاں مسرت و تفریح کا ترجمان ہے اور یہی نازک سا برگ سبز پریشانیوں کے بار ہائے گراں اپنے کف حنائی پر سہارتا ہے۔ لیکن سب سے بڑھ کر یہ کاوش و تفکر کا خاص رفیق ہے۔ دماغ میں جونہی سوچنے کی تحریک ہوتی ہے معاً مولانا مودودی کا ہاتھ ڈبیہ بٹوے کی طرف بڑھتا ہے۔ ادھر زندۂ جاوید "اللہ بابا" ہوتا ہے اور ادھر خیالات ترتیب پانے لگتے ہیں۔ پان چبانے کے لیے جبڑوں کی ہلکی ہلکی جنبش قلزم افکار کی زرخیز لہروں سے بالکل ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ مودودی کی تحریروں میں کوئی شک نہیں کہ پان کے پتے کی سبزی، اس کے کراری پن، چھالیے اور چونے کی تیزی اور زردے کی حرارت انگیز اور تحریک زا لطیف تلخی کے سارے پہلو شریک رہتے ہیں۔

کل ہی مولانا مودودی سے احباب کی مجلس میں (جو سفر حج سے واپسی پر فوراً ہی مرکزی دفتر میں منعقد ہوئی) دریافت کیا گیا کہ کیا پان اس لمبے سفر میں ملتا رہا۔ فرمانے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے خاص انتظام یہ کیا کہ مفتی محمد شفیع صاحب کو ہم سفر بنایا۔ ان کے ساتھ پان کا ذخیرہ تھا اور وہ اسے دیر تک محفوظ رکھنے کا کوئی خاص طریقہ جانتے تھے۔ چنانچہ پان ملتا رہا۔ کوئی چار دن کا فاقہ کیا ہو گا کہ مکہ پہنچ گئے اور مکہ کے بارے میں تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ضمانت ہے ہی کہ یہاں رزق ضرور ملے گا۔ ایک صاحب نے پوچھا: "کیا مولانا! پان بھی رزق کی تعریف میں آتا ہے؟" ——— "اجی واہ، تو کیا روٹی اور سالن ہی کا نام رزق ہے" ——— مودودی صاحب خندہ آمیز انداز سے فرمانے لگے: "اصل رزق تو پان ہے"۔

ایک لطیفہ برقاسمی صاحب نے یوں بیان کیا ہے :

"ایک بار پان کا ذکر چل نکلا۔ میں نے مولانا سے کہا کہ آپ تو بڑے شوق سے مزے لے لے کر تمباکو کھاتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ عالم ہے کہ جیل میں تمباکو چھوٹ بھی جائے تو اس جیل یہ کوئی نہیں کھا سکتا۔ اس کے جواب میں مولانا نے فرمایا کہ نہیں جی پہلے تو میں صاف تھا۔ ایک اعظمی صاحب نے تمباکو کا پان کھلا دیا (میرا خیال ہے کہ غالباً اپنے غلطی سے تمباکو والا پان تھا) اس دن کا لطف مجھے گھما گئی۔ بس اس کے بعد مجھے تمباکو کھانے کی عادت پڑ گئی ———— مگر اس عادت پر اتنا قابو ہے کہ جیل میں جاتا ہوں تو عادت پاس نہیں آتی۔"

(مولانا مودودی ———— اپنی اور دوسروں کی نظر میں)

جیسا جیسے کا واقعہ بھی سن لیجئے جسے میں نے کئی بار مختلف مواقع پر سنا ہے۔ یہی مرتبہ گفتاری (۲۵ اکتوبر ۱۹۶۳ء) کے موقع پر مولانا وطن اور تیاری پر پہنچے پر مولانا رات کے لیے گئے۔ ہم آدمی تین رفقا ساتھ تھے اور دوپہر کے بعد ساتھ پہنچے ہوئے اور بعد میں پان طلب کیا تو میں نے کہا کہ یہ آخری پان کھا لیا جائے۔ پوچھا گیا کہ آخری کیوں؟ ہنستے ہوئے فرمانے لگے "نہیں اب طلاق دے دی ہے۔ پان بھی رہنے کے۔" سب پر خصوصیت چیل پر چھاکر کیا جیل کے بعد بھی یہ طلاق جاری رہے گی؟ تو فرمایا "نہیں یہ طلاق رجعی ہے مغلظہ نہیں۔" اس پر بستہ بھی کچھ سائے دیر تک قہقہہ لگاکر ہنسے۔ یوں یہ شخص ہنستے ہنستے مصافحہ کر کے نامعلوم مدت کی قید کیلئے مسلح پہرے میں جیپ گاڑی کے اندر بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔

(مولانا مودودی ———— اپنی اور دوسروں کی نظر میں)

مولانا کے اپنے لئے پان کی ترکیب وترتیب ایجادی ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس کے اجزا اور اسے تنوع اور ان کی باہمی مناسبت کو دیکھئے۔ کہاں کہاں سے اجزا لاکر جوڑ ملائے جاتے ہیں۔ انسانی ذائقہ محض عقل کی رہنمائی سے کہاں یہ ترکیب پیدا کر سکتا ہے۔

ایک بار جب کہ انگریزی دور حکومت تھا کہنے لگے کہ ان انگریزوں نے یہ عادت ڈال دی کہ تمام مسافر ریلوں اور گاڑیوں کے ڈبوں میں شراب کے پیگ ———— کے اسٹینڈ لگا کر رکھے ہیں جو راستے میں بھی ———— ضرورت ہو تو پیئے پیجئے ———— شراب و پیگ پائی جاتی رہیں۔ لیکن ان کمبختوں کو ہمارے یہاں کا خیال نہیں کہ اگر یہ ان کے لگا دیئے ہوتے تو اسلامی نظام حکومت بھی یا تو نافذ کر دیتے۔ ڈبوں میں پان دان ضرور لگیں گے۔

دارالاسلام کے دور میں مولانا مودودی کے پاس ایک بڑا سا پان دان تھا جس پر نقش و نگار بنا ہوا تھا۔ یہ مرحوم دفتری امور پر بات چیت کے بعد مولانا مجلس شبانہ میں آ بیٹھتے تو پان دان بھی ساتھ آتا جس کو وہ ایک نوع تاریخی حیثیت اختیار کر گیا۔ کبھی کبھار کوئی بعض لوگ باہر سے آتے تو ———— سامنے تو نہیں ———— ادھر ادھر دبی زبان سے کہتے کہ یہ پان دان خلاف شریعت ہے۔ ہم لوگ مسکرا کر رہ جاتے۔ بعض یہ اعتراض کرتے کہ حضرت اسے چاندی کا پان دان سمجھتے رہے تھے اور سونے چاندی کے برتن کو محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کیلئے حرام ٹھہرایا ہے۔ خود پان بھی بعض لوگوں کے فتووں کا ہدف بنے بغیر نہ رہتا۔ کچھ لوگ اسے ناجائز نہیں سمجھتے تھے مگر بڑی لجاجت سے مولانا سے درخواست کر دیتے تھے کہ عام تصورات کا لحاظ کرتے ہوئے آپ اسے ترک کر دیں۔ مگر مولانا مودودی دوسروں کو دکھانے اور دوسروں کو خوش کرنے کیلئے نہ کوئی چیز اختیار کرتے تھے نہ کچھ ترک کرتے تھے۔ ایک پان ہی پر کیا موقوف، کوئی اگر میز کرسی کی نشست پر اعتراض کرتا، کوئی سفید اجلے لباس پر یا اپنے ان کے نظریات کے دھبے ڈال دیتا۔ بلکہ ایک مرتبہ تو ایک مہذب قسم کے مہمان نے دوران گفتگو میں دیوار وں کی سفیدی کو بھی خلاف اسلام قرار دیا۔ مودودی صاحب ان امور میں بحث کرنے کے بجائے ———— خوبصورتی سے طرح دے جاتے۔

ضمناً ایک ضروری بات یاد آئی۔ مولانا مودودی ذوقیات کے معاملے میں گھٹے ہوئے مذہبی ذہنوں کے برعکس بڑے فراخ دل اور عالی ظرف واقع ہوئے ہیں۔ جہاں تصور مذہب ہر ہر چیز پر اعتراض کی انگلی رکھتا ہے۔ خصوصیت سے پان اور چائے اور سگریٹ تو بہت ہی بڑے مظلوم ہیں۔ جماعت میں آنے والوں میں جو لوگ حقہ اور سگریٹ کے عادی تھے ان کی اکثر شامت آتی رہی ہے۔ خصوصاً مرکز میں جا رہنے والوں کو تو کبھی کبھی کسی نو وارد کی

مخالفت سے بہت سابقہ رہتا۔ میں خود اس تلخ تجربے سے گزرتا، مگر میری اور اس طرح کے دوسرے رفقا کی محفوظ پناہ گاہ مولانا مودودی ہوتے۔ وہ کسی مسئلہ کو شریعت کا جزو نہیں مانتے اور نہ ممنوعات کے دائرے کو خواہ مخواہ وسیع کرتے چلے جانے کے قائل ہیں۔ بلکہ ان کا مسلک یہ ہے کہ اباحتِ اصلیہ سے فائدہ اٹھانے کا حق کوئی کسی سے سلب نہیں کر سکتا۔ ابتدا میں احتراماً میں مولانا مودودی کے ساتھ بیٹھ کر سگریٹ نہیں پیتا تھا اور غلط فہمی کے عہد میں جب مولانا کے دفتر میں زیادہ دیر بیٹھنے سے اعصاب میں طلب ہونے لگتی تو چپکے سے ان کے پاندان سے زردہ کے چند ریزے لے کر منہ میں رکھ لیتا۔ مولانا میری مجبوری سے جب آگاہ ہو گئے تو کسی مجلس میں بسلسلۂ حدیث وغیرہ اشارۃً واضح کیا کہ سگریٹ جسے پینا ہو وہ پیئے، اس میں کیا برائی ہے۔ جب سے اب تک مولانا ہمارے سامنے پان کھاتے ہیں اور ہم ان کے سامنے سگریٹ پیتے ہیں۔ کسی طرف سے حملہ ہوتا ہے تو ہم اس پناہ گاہ میں سمٹ جاتے ہیں۔ یوں اب کئی سال کی تربیت سے اس قسم کے جملہ معاملات میں جماعت کی مجموعی فضا انتہائی فراخدلانہ قسم کی ہو گئی ہے اور کوئی بھی اب خردہ گیریاں نہیں کرتا۔

میں نے جیل کی ڈائری میں (جس کے چند ہی اوراق شائع ہوئے ہیں) لکھا ہے کہ اپنی دو روزہ رہائی کے دوران میں مولینا کے خلاف مقدمہ کی روداد سننے ہم فوجی عدالت میں گئے۔ کارروائی ختم ہونے پر ملاقات ہوئی۔ برسبیلِ تذکرہ میں نے بیان کیا کہ سگریٹ چھوڑ دیا ہے۔ مولانا ہنس کر فرمانے لگے: "ایسے نہیں، جیل میں آئیے تو چھوڑ دیجئے، باہر جائیے تو پھر پیجئے، پھر جیل آئیے تو پھر چھوڑ دیجئے۔"

مولانا مودودی چائے سے بھی خاص رغبت رکھتے ہیں۔ لیکن مولانا آزاد کے ذوق سے آپ کا ذوق بالکل برعکس ہے۔ مودودی صاحب اس معاملے میں پنجابی نسخہ کے قائل ہیں، یعنی چائے کی پتی بھی بہت ہو، دودھ بھی بہت ہو، شکر بھی بہت ہو۔ چنانچہ شکر کے تین چمچے آپ کے بڑے پیالے کو میٹھا کرتے ہیں۔ چائے کی گرمی کے ساتھ آپ کو برف کی ٹھنڈک سے بھی گہری دلچسپی ہے۔ ٹھنڈا پانی مولانا مودودی کے دلپسند مشروبات میں سے ایک ہے۔ مگر ٹھنڈے پانی کا مفہوم ان کے ہاں یہ ہے کہ آدھی برف ہو اور آدھا پانی۔ حتیٰ کہ جاڑے میں بھی وہ ٹھنڈے پانی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یاد ہے کہ جب دارالاسلام کے زمانۂ قیام میں راتوں کو پہرے کا انتظام ہوتا تھا اور ڈیوٹی دینے والے گروپوں میں مولانا مودودی کی باری بھی جس رات آتی تھی تو آپ برف کا خاص انتظام کر لیتے تھے — گھنٹے گھنٹے بعد برف کی سل کو ٹھونکنے سے توڑا جاتا اور مولانا خود بھی برفاب پیتے اور دوسرے ساتھی بھی!

کھانوں میں مولانا مودودی کے گھر کا ایک خاص مرغوب کھانا شب دیگ ہے۔ یہ شب دیگ مولانا کی والدہ محترمہ کی ہدایت و نگرانی میں بالعموم عیدالاضحی کے موقعوں پر پکتی ہے اور سارے رفقا مولانا کے ساتھ مل کر کھاتے ہیں۔ واقعی یہ چیز خوب رہتی۔ تقسیم کے بعد شاید ایک بار اس قصۂ ماضی کی یاد تازہ کی جا سکی ہے۔

مودودی صاحب کے ذوقیات کے سلسلے میں کھانے کا ایک دلچسپ فلسفہ سنئے۔ ابھی گذشتہ رمضان میں ہمارے ایک پروفیسر دوست نے سمن آباد میں مودودی صاحب کو دعوتِ افطار دی۔ یہ دعوتِ افطار مکمل کھانے سے کسی قدر زیادہ ثقیل تھی۔ دسترخوان فرش پر بچھا۔ لیکن چھری کانٹا موجود! دو چار دوستوں نے چھری کانٹا اٹھایا، مگر مولانا مودودی نے مشرقی وضع نہ چھوڑی۔ میزبان نے پلاؤ کے قریب چمچہ رکھ کر اپنا مشورہ پیش کیا۔ ساتھ ہی کسی صاحب نے پوچھا "چھری کانٹے سے کھانا اسلامی نقطۂ نظر سے جائز ہے یا نہیں؟" فرمایا "جائز کیوں نہیں، مگر دست و دہن کے درمیان اگر کوئی تیسری چیز حائل ہو جائے تو کھانے کا مزہ غارت ہو جاتا ہے"۔ اب ایک لطیف سلسلۂ گفتگو چھڑ گیا، جملوں اور ہلکی مسکراہٹوں کے ساتھ چل نکلا۔ مودودی صاحب نے باتوں باتوں میں کھانے سے متعلق ایک مکمل فلسفہ پیش کر دیا۔ خلاصہ یہ تھا کہ کھانے کا مزہ محض اس تنہا تاثر کا نام نہیں جو ذائقہ کے ذریعے حاصل ہوتا ہے بلکہ اس میں مختلف حسیات حصہ لیتے ہیں۔ کھانے کا ایک رنگ اور اس کی ایک شکل ہوتی ہے جس سے آنکھیں بہرہ اندوز ہوتی ہیں۔ ایک خوشبو ہوتی ہے جس سے مشام متاثر ہوتا ہے۔ ان کے ساتھ مل کر ذائقہ کی حِس لطف اندوز ہوتی ہے۔ کھانے میں لمس کا بھی ایک حصہ ہے اور وہ ملتا جبھی ہے کہ انگلیاں براہِ راست مس کریں۔ چھری کانٹے اور چمچے سے کھائیے تو لمس کا یہ حصہ غارت ہو جاتا ہے۔

ذوقیات کے دائرے میں اور بہت سی چیزیں قابلِ ذکر ہیں لیکن اس مضمون کیلئے اتنا ہی حصہ کافی ہے۔

بلکہ ہم اسے ٹھیک سمجھتے ہیں کہ آدمی کے ساتھ بس کر ہی اسے جانچا پرکھا جا سکتا ہے۔ خصوصیت سے لیڈروں، وزیروں، علماء، مصنفین اور صحافیوں کو دور سے کبھی جانا ہی نہیں جا سکتا ہے۔ کتابوں اور مقالات، تقریروں اور بیانات میں بالکل دوسرا آدمی جلوہ گر ہوتا ہے جو تمام محاسن و کمالات کا جامع معلوم ہوتا ہے۔ اصل آدمی مستور پردوں کے پیچھے بہت دور تاریکی میں چھپا بیٹھا رہتا ہے اور دنیا کس طرح بے وقوف بنتی ہے۔ شہرت شخصیت کا حجاب اکبر ہے۔ مولانا مودودی کے ساتھ ہم نے رہ بس کر دیکھا ہے۔ ان سطور میں ہم دکھانا چاہتے ہیں کہ وہ رفقاء کے درمیان کس طرح رہتا سہتا اور معاملہ کرتا ہے۔ مطالعۂ شخصیت کا یہی بہترین طریقہ ہے۔

اولین بات یہ ہے کہ مولانا مودودی اپنے ملنے والوں اور کسی طرح کا تعلق رکھنے والوں میں سے ایک ایک فرد کو یکساں اہمیت دیتے ہیں۔ خصوصیت سے ساتھ کام کرنے والے رفقاء چاہے وہ کسی منصب کا مالک ہو اور دوسرے اوصاف کے لحاظ سے کسی بھی درجے کے حامل ہوں سب کے سب ان کی نگاہ میں ایک ہی طرح کی دوستانہ اہمیت رکھتے ہیں اور ایک ہی طرح توجہ حاصل کرتے ہیں۔ اپنے ہر قول اور اجتماعات میں شریک ہونے والے تمام ارکان جماعت پر وہ فرداً فرداً توجہ صرف کرتے رہتے ہیں (اب چونکہ تعداد زیادہ ہو چکی ہے اور شرکائے اجتماع بہت زیادہ ہوتے ہیں اس لئے وہ دور اول والی بات نہیں رہی پھر بھی ہر ایک سے انفرادی ربط رکھنے کی کوشش مولانا ضرور کرتے ہیں)۔ وہ تقریباً تمام ارکان جماعت کو فرداً فرداً نام اور شکل سے جانتے ہیں بیشتر صورتوں میں ان کے ذہنی ارتقاء کے مراحل اور ان کے جماعتی اعمال دیکھتے ہیں، خوبیوں اور کمزوریوں سے باخبر رہتے ہیں، متعلقہ جماعتوں کے حالات کی یاد تازہ رکھتے ہیں۔ کئی کئی سال پہلے جن لوگوں کو کبھی ایک بار دیکھا تھا ان کو دیکھتے ہی پہچان لیتے ہیں اور اسی طرح گزشتہ سلسلۂ واقعات کو مستحضر کر لیتے ہیں۔ گردے کے آپریشن کے بعد ان کا حافظہ اگرچہ متاثر ہوا ہے اور اب کسی کسی موقع پر وہ کوئی چیز یاد لانے کے لئے ذہن کو زور دینے کی کوشش کرنی پڑتی ہے، لیکن متعلقہ افراد کو اہمیت اور توجہ دینے کی خوبی جوں کی توں قائم ہے۔ ہر ایک کو اہمیت اور توجہ دینا خود پسندی، علیحدگی پسندی اور اپنی ذات میں سمٹے رہنے کی عادت کے بالکل نقیض ہے اور مولانا مودودی کی شخصیت کی مستقل جاذبیت کا ایک سبب یہی ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ وہ ہر ایک کو اعتماد میں لیتے ہیں۔ شریک مشورت کرتے ہیں اور ذمہ داریاں سونپتے ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انہوں نے ساتھیوں سے بات چھپانے کی کوشش کی ہو یا ان کے خلاف بے اعتمادی کا اظہار کیا ہو۔ ہمارے ہزار کوتاہیوں کے باوجود مودودی صاحب کی اس افتادِ مزاج میں کبھی کوئی تغیر واقع نہیں ہوا۔ انہوں نے رفقاء کے درمیان کبھی اقرب اور ابعد کا امتیاز نہیں کیا۔ ایک کے خلاف دوسرے کے سامنے کسی طرح کا اظہار ناگواری اور اظہار نفرت نہیں کیا۔ دارالاسلام کے دور سے لے کر اب تک ایسا ہوتا رہا ہے کہ جب کبھی کسی سفر سے آمد ہوئی، کسی ملاقات اور گفتگو اور مشاورت سے فراغت ہوتی یا کوئی اجلاس شوریٰ ختم ہوا تو مولانا مودودی کے گرد رفقاء جمع ہو جاتے ہیں اور بے تکلفی سے باتیں پوچھتے اور باتیں سنتے ہیں۔

مولانا مودودی بہ حیثیت امیر اگرچہ کارکنان مرکز اور باہر کے ماتحت امراء کیلئے نیز خاص طور پر دفتر ترجمان القرآن کے کارکنوں کیلئے افسر کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن برسوں کا تجربہ گواہ ہے کہ انہوں نے کبھی بھی افسرانہ اور تحکمانہ انداز سے نہ کوئی کام کسی کو سونپا ہے، نہ باز پرس کی ہے اور نہ بالادستی کے اظہار کے لئے اس طرح سے نگرانی کی ہے۔ سارا معاملہ دوستانہ انداز سے چلتا ہے۔ اسی دوستانہ انداز کی بات ہے کہ مولانا کے ساتھ رہ کر کام کرنے کا ہر کسی کو شوق رہتا ہے اور کوئی ان کا ساتھ چھوڑ کر جانے پر اس وقت تک آمادہ نہیں ہوتا جب تک جماعتی مصالح کا شدید تقاضا نہ ہو۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مولانا مودودی کے ہاں ہر شخص کو خصوصیت سے رفقاء کو اختلاف اور تنقید کا پورا پورا حق حاصل رہتا ہے علم اصلاح کے معاملات چھوٹے سے چھوٹا آدمی اٹھے گا اور علیحدگی میں مولانا سے ملے گا اور رو در رو ہر بات کہہ دے گا جو اس کے ضمیر کی آواز ہو۔ تنہائی تک ہی محدود نہیں عام مجالس گفتگو میں کوئی رفیق کسی بات پر کہہ دے گا کہ مجھے اس سے اختلاف ہے یا آپ کا یہ نقطۂ نظر فلاں جماعتی اصول سے یا آپ ہی کے فلاں قول سے ٹکراتا ہے۔ اور پھر اجتماع میں ——— رفقاء اٹھ کر بے دھڑک سوالات کریں گے۔ اعتراضات سامنے لائیں گے اور اپنے اختلافات بیان کر دیں گے۔ جماعتی فیصلے ترنظری اختلاف کے باوجود ہر رکن عملاً قبول کرتا ہے، لیکن مولانا کے علمی نظریات اور ذاتی تعبیرات سے اختلافات کئے جاتے اور مسلسل برقرار رہتے

ہیں۔ ہمارے معاشرے میں عموماً جمعیت کا چپڑاسی بھی اہمیت رکھتا ہے اور اس کی وجہ سے کسی بڑی منصب پر آنے والا شخص ایک کونے سے محروم سا رہتا ہے چونکہ سب سے بڑا منصب مرکزی امارت کا ہے۔ اس لئے امیر کو معاملات و مسائل اور تنازعات کے بھاری بوجھ کے ساتھ تنقید کی تیز بوچھاڑ سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ تنقید کے حق کو اسلامی تقاضوں کے مطابق استعمال کرنے کی تربیت پاتے رہنے کے باوجود جماعت میں ہمیشہ ایسے نئے لوگ بھی موجود رہتے ہیں اور بعض دیرینہ ساتھی بھی اپنے مزاج کی وجہ سے اس معاملے میں ہمیشہ نئے رہتے ہیں) جو بے دھڑک یہ سے تنقید کرتے ہیں مگر مولانا مودودی اس بوچھاڑ کا مقابلہ تحمل اور سکون کے ساتھ کرتے ہیں۔ اور ڈانٹ ڈپٹ یا ترش روئی کا کبھی مظاہرہ نہیں کرتے۔ انہوں نے اسلامی اصول کے مطابق اپنی پوری زندگی کو ایک کھلی کتاب کی طرح جماعت کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اس کے کسی بھی صفحے کی کسی بھی عبارت پر ہر رفیق کو اظہار رائے اور تنقید بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ باز پرس کا حق حاصل ہے۔ چنانچہ جماعتی امور سے آگے نکل کر مولانا کے گھر والوں کے بچوں کی تعلیم و تربیت اور دوسرے شخصی معاملات تک پر متعدد بار لوگوں نے کھل کر گفتگو کی ہے۔ زندگی کو اس طرح سب کے سامنے رکھ دینا اور تنقید و اعتراض کا عام حق دے دینا کوئی آسان کام نہیں۔ جسے آسان معلوم ہو وہ اسے ذرا کر کے دیکھے۔ اس مقام تک شاید کوئی لیڈر اور عالم بہت مشکل ہی سے رسائی رکھتا ہوگا۔ اور رفقاء نے جس شخص کو بار بار اعتراضات کی چھلنیوں میں چھان کر، اور تنقید کے چھاج میں پھٹک کر دیکھا ہے وہی اس کو صحیح قدر پہچانتے ہیں۔ مولانا مودودی کو مصنوعی زندگی سے سخت گریز ہے۔ لباس، وضع قطع، اور دوسرے پہلوؤں میں مختلف لوگوں نے ان کو طرح طرح کے مشورے دیئے ہیں، لجاجت سے اصرار کیا ہے، لیکن مولانا نے کسی کو خوش کرنے کے لئے کبھی کوئی ایسی تبدیلی اپنے اندر نہیں کی جس کے لئے دین خود تقاضا کرے اور ضمیر کے اندر سے کوئی تحریک نہ ہو۔ بعض لوگ چاہتے تھے کہ آپ نوافل پڑھا کریں، بعض کا اصرار تھا کہ داڑھی زیادہ لمبی رکھیں، بعض کا مشورہ تھا کہ سر کے بالوں کی صنعت بدل دیں، بعض کا تقاضا رہا کہ اسلوب نگارش اور طرز گفتگو میں تبدیلیاں کریں اور کچھ یہ چاہتے کہ لباس میں پیوند لگایا کریں۔ لیکن مولانا مودودی دوسروں پر اثر انداز ہونے کے لئے کسی ادنیٰ سی ترمیم پر بھی کبھی راضی نہیں ہوئے۔ ساتھ ہی انہوں نے اپنی کسی عادت اور اپنے کسی معمول کو کبھی کسی سے اخفاء میں رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ڈرامائی کردار بننے پر کبھی ایک لمحہ بھی تیار نہیں ہوئے

رفقاء کی عزت نفس کا مولانا کو ہمیشہ خاص خیال رہتا ہے۔ وہ ان کا پورا پورا احترام کرتے ہیں اور اسلامی آداب کے ساتھ ان سے مساویانہ معاملہ کرتے ہیں انہوں نے کبھی کسی رفیق کو ملامت نہیں کی، برا بھلا نہیں کہا، غضبناک ہو کر سخت گیرانہ معاملہ نہیں کیا۔

اس کے معنی یہ نہیں کہ ان کی تربیت سے تغافل برتا ہے۔ تربیت ہمیشہ مدنظر رہی۔ بس اس کا منصوبہ جداگانہ نوعیت کا تھا۔ مولانا مودودی کے طریق تربیت کا ایک جزو تو یہی اعتماد میں لینا، احترام محفوظ رکھنا، ذمہ داریاں سونپنا اور دوستانہ سطح پر معاملہ کرنا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کریم النفس کا مظاہرہ کرتے ہوئے چھوٹی چھوٹی چیزوں پر گرفت نہیں کرتے اور اہم تر کوتاہیوں پر وہ ایک خفیف سے اشارے یا بالواسطہ طور کے ایک جملے کے ذریعے ہنستے مسکراتے احساس دلا دیتے ہیں، اس سے آگے کا معاملہ ہو تو بغیر کسی گرمی کے پاس بٹھا کر تفصیل سے بات سمجھا دیتے ہیں۔ اظہار ندامت پر فراخدلی سے معاف کرتے رہتے ہیں۔ اگر کسی رفیق یا ملازم کی اصلاح سے لمبے تجربے کے بعد وہ بالکل مایوس ہو جائیں ——— اور ایسی صورتیں پورے گزشتہ دور میں شاذ و نادر ہی چار پیش آئی ہیں ——— تو خوبصورتی سے معاملہ ختم کر دیتے ہیں۔ مولانا مودودی کا یہ طویل المیعاد طرز تربیت نتائج کے لحاظ سے بہت ہی کامیاب رہا ہے۔ خصوصاً انہوں نے اپنی بیگم صاحبہ کی زندگی میں جو انقلاب پیدا کیا ہے وہ حیرت ناک ہے۔ ہماری یہ بہن ایک ایسے خاندان سے آئیں جس میں مغربیت تیزی سے چھا رہی تھی مولانا مودودی کی والدہ مرحومہ کے اصرار سے یہ رابطہ قائم ہوا۔ شادی کے بعد جب مولانا مودودی کے نظریات و عزائم زیادہ اچھی طرح واضح ہونے لگے اور پھر جب وہ ایک ایسے راستے کی طرف مڑ گئے جو دنیوی کامرانیوں کے باغ و بہار سے نہیں، بلکہ فقر و فاقہ کے خارزار سے ہو کر گزرتا تھا اور وہ خارزار علاقہ دارالاسلام کی بے رونق اور سادہ دیہاتی زندگی کی صورت میں بالکل سامنے آگیا تو ہماری ان محترم بہن کے سارے خواب درہم برہم ہونے لگے۔ وہ گویا عیش و مسرت کی ایک دنیا سے ایثار و امتحان کی بالکل ایک دوسری دنیا میں منتقل ہو گئیں۔ دل و دماغ میں جو ہلچل ایسے انقلاب سے ہونی چاہیئے تھی وہ ہوئی۔ لیکن مولانا مودودی ٹھنڈے دل سے ایک تدریجی اسکیم کے تحت ان کی دلجوئی کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ وہ کچھ درس سنتے سنتے، کچھ لٹریچر پڑھتے پڑھتے، اور ایک خاص ماحول میں رہتے رہتے آخر کار اپنی جگہ سے ہل

لیکن پھر وہ ایک بار انگلستان میں ... جہاں ... ایک نئی شخصیت پیدا ہو گئی ۔ بالکل اسی طرح مولانا مودودی اپنے کارکنوں کو ...
کی صلاحیت بات پر ... تربیت دینا پسند کرتے ہیں ۔ لیکن ... حرکت کریں تو ایک ... "آئیں —— اٹھیں ——
... " ! —— بس یہی مولانا مودودی کا عملی تربیت ہے جسے وہ بچوں پر استعمال کرتے ہیں

تعلیم ... مولانا مودودی کی شخصیت ... عزیمت و استقلال کی ... ہے ... مولانا کی ذات ... کی ... [illegible]
... اپنی ... چند ساتھیوں میں بھی منتقل کر دیتی ہیں ۔ اور اسی طرح عزیمت و استقلال نے ... [illegible] ... ڈال دیتے ہیں ۔ [illegible]
کے دور ... میں مولانا مودودی ... کی بستی ... [illegible] ... کرتے تھے ... کوئی شخص ...
چھری اور ایک چاقو ... ساتھ لے کر ... جانے ... [illegible] ... دیکھنا ... گھر ... آتے ۔ حالانکہ
... معلوم تھا کہ نفرت و کدورت اور فتنہ و فساد کی ... پیچھے ... ہے ۔ جب وہ فساد شروع ہو گیا ... مولانا مودودی نے
نفس نفیس بستی کی حفاظت کے لئے فوجی نظام ... بہتر ... منظم ... خود وہ اس نظام کے ... تھے ... [illegible] ... ہے ۔

جن دنوں کشمیر کے ... ہمارے خلاف ... [illegible] (جسے جماعت اسلامی سے ...) ایک ...
... اور ... کی ... مولانا سے مشورہ لینے ... [illegible]
مولانا مودودی مزاحاً کہنے لگے ... تو دیکھی کیوں —— صاف صاف کہیے ... —— بس اتنے سے فقرے نے مجھے اور دوسرے
شرکائے مجلس کو ... اور اس وقت میرے ذہن میں ایک مصرع نمودار ہوا —— ... [illegible] ——
کل ... نظر منتقل ہو گئی ۔ پھر جب یہ ہنگامہ ... جوابی ... کرنے کیلئے ... کی طاقت بھی ہم سے چھین لی گئی تو ... کے ... کرکے
... بات ... کی بات ۔ سوال یہ تھا کہ ابتدا کس ... سے کی جائے ۔ مودودی صاحب ... [illegible] ... وہ ...
تھا ۔ ان ... نے جو ... کے اندر ... اس کا آج تک ... [illegible]

اور پھانسی کی کوٹھڑی میں ! —— ... اور ... جاتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ ... کس چیز کی ضرورت ہے ؟ ... [illegible]
دوران کے چند ... کی ۔ یہ تھا اس شخص کا ... جس کے لئے پھانسی کا پھندا تیار ہو رہا تھا ۔ مولانا مودودی نے رحم کی اپیل ... انکار کر دیا تھا اس
سلسلے میں دریافت کرنے پر جو تین وجوہ آپ نے بیان فرمائے ان میں سے ایک یہ تھا کہ اگر میرے جیسے آدمی نے بھی جان بچانے کے لئے رحم کی اپیلیں کرنا شروع
کر دیا تو پھر اس ملک میں غیرت و حمیت کا بالکل خاتمہ ہو جائیگا ۔

اور جب فوجی عدالت میں مقدمہ چل رہا تھا —— مولانا کے وکیل نے ایک راہ یہ سمجھائی کہ آپ ... کے شائع کردہ بیان کو اپنانے سے انکار کر
دیں ۔ لیکن مولانا مودودی کی غیرت نے اس مشورہ کو مسترد کر دیا اور جب عدالت میں پوچھا گیا تو آپ نے ... کہا کہ ہاں ! یہ بیان میرا ہے " !

مولانا اپنے رفقا کے درمیان اس سادہ زندگی کی وجہ سے بھی محبوب ہیں جو ان کا تعلق دوسروں سے مساویانہ اخوت کی بنیادوں پر ... ہے ۔ ان کا
ہمیشہ سادہ رہا اور لباس اوقات تو ان کے کرتے اور پاجامے پر خوبصورتی اور طہارت ... ہم نے دیکھے ہیں ۔ لیکن یہ نمائش فقرے
ہمیشہ خالی پائے گئے ۔ ان کے ہاں کے کھانے بارہا کھانے کا موقع ملا اور دعوتوں میں شرکت کی لیکن کھانا ہمیشہ سادہ پایا ۔ دفتر میں میز کرسی ہمیشہ رہے لیکن صوفوں
اور قالینوں کو کبھی بار نہ مل سکا ۔ کبھی کوئی ماما یا کوئی بچہ گھر میں ملازم رہتا ہے ۔ لیکن تمام کاموں کے لئے نوکروں کا بیڑہ کبھی بھرتی نہیں ہوا ۔ اس سبب سے ...
گھروں میں کئی کئی بار خود ہی اٹھ کر گھر جانا پڑتا ہے اور ... دروازے پر دستک دے کر بلا وا دیتے رہتے ہیں ۔ مولانا مودودی اپنے ہاتھ سے بہت سارے کام کر
لیتے ہیں اور ایسے کاموں کی فہرست بہت دلچسپ ہے مگر تفصیل کا موقع نہیں ۔ یہ سادہ زندگی ان کے لئے رفقاء سے مساویانہ رابطہ رکھنے کو آسان بناتی ہے ——
دارالاسلام میں ہر روز شام کو کبھی کرسیوں پر کبھی چٹائیوں پر اور کبھی کچے پتھروں اور گھاس پر تکلف برطرف کرکے برادرانہ محفل جمتی اور مولانا مودودی اس

میں یکجا ہو کر بیٹھتے ۔ رات کو اجتماعی کھانا ہوتا اور گرمی کی راتوں میں یہ کھانا کھلے میدان میں ہوتا تھا۔ کھانے پر جب کھانا کھاتے ہوئے مزیدار باتیں اور گپ شپ شروع ہو جاتی اور دسترخوان پر حاضرین کو کھانے کا لطف آتا۔ اجتماعی کھانے کی یہ روایت اب بھی باقی ہے ۔ وہ ہوتے تو کھانا اچھا ہو جاتا ۔ اب لاہور میں صرف عید کے موقع پر اس اجتماعی کھانے کی یاد تازہ کی جاتی ہے ۔

اجتماعات کی صورت میں کئی برس تک مولانا ایک عام رکن کی طرح قیام و طعام کے عام انتظام میں حصہ دار ہوتے ۔ فرش پر سوتے اور سب کے ساتھ مل کر کھاتے ۔ اب ان کی صحت کی کمزوری کا لحاظ کر کے ان کے رفقاء نے پرہیزی کھانے کا انتظام شروع کیا ہے اور ان کو اجتماع گاہ میں قیام گاہ کا ایک گوشہ الگ کر کے دے دیا جاتا ہے تاکہ وہاں وہ ضروری امور کیلئے مشورے کر سکیں ، تقریر کی تیاری کر سکیں اور آرام لے سکیں ۔ مگر آرام کہاں ! اسی طرح وہ سفر میں جب بھی رفقاء کے ساتھ جاتے ہیں تو اسی درجے میں سفر کرتے ہیں جس میں سب کے لئے سفر کرنا ممکن ہو ——— اور یہ تیسرا درجہ ہی ہو سکتا ہے ۔ دونوں کل پاکستان اجتماعات (۱۹۵۱ء، ۱۹۵۵ء) میں کراچی تشریف لے گئے تو اسی آخری درجے میں سفر کیا ۔ کسی ایک موقع پر کہیں ان سے کسی ملاقاتی کی جانب سے سوال کیا گیا کہ "میں ! آپ اور تھرڈ کلاس میں ؟" ۔ فرمایا " اگر کوئی چوتھا درجہ ہوتا تو اس میں سفر کرتا "

اندازہ کر لیجئے کہ یہ کیسی شخصیت ہے اور اس کے ساتھ اس کے رفقاء کی وابستگی کس نوعیت کی ہو گی ۔

ہاں ——— اس سادہ زندگی کے پس منظر میں وہ ایثار کام کر رہا ہے جو اس زمانے میں اپنی مثال آپ ہے ۔ جب اپنا نصب العین متعین کر کے آپ زمین کے راستے پر چل پڑے تو بار بار ایسے مواقع آئے کہ ترجمان القرآن سے کبھی ایک حلقے کے خریدار ٹوٹ جاتے ، کبھی دوسرے حلقے کے ۔ لیکن مودودی کے ایمان نے اس ٹوٹ پھوٹ کی کبھی پروا نہیں کی ۔ آخر میں مسلم لیگی حلقوں کے ناراض ہونے کا تو رسالے کی خریداری پر نمایاں اثر پڑا ۔ مگر حق کا یہ سپاہی اپنے موقف سے نہیں ہٹا ۔ حالات کی اس گردش میں بار بار مولانا مودودی فقر و فاقہ کی بالکل سرحد پر جا پہنچتے رہے ہیں ۔ اور دوسری طرف تن تنہا بہت ساری ذمہ داریاں اٹھانے کی وجہ سے رات کو دو دو بجے تک بیٹھ کر کام کرنے کے عادی رہے ہیں ۔ ترجمان کے مقالات کے مجموعے کتابی شکل میں آئے اور دوسری کتابیں شائع ہوئیں تو یہ لٹریچر جو عوام میں مقبول ہوا اور کئی کئی ایڈیشن اب تک نکلے ہیں ۔ آمدنی کا یہ ایک جائز اور وسیع ذریعہ تھا اور اس سے مولانا مودودی اپنے مالی حالات کو ہمیشہ کیلئے مضبوط بنا سکتے تھے ۔ لیکن انہوں نے یہ کتابیں تحریک کیلئے وقف کر دیں ۔ اس وقت دو چار کتابوں کے علاوہ باقی تمام کتابیں جن کی تعداد پچاس ساٹھ کے قریب ہو گی ، سب جماعت اسلامی کی ملک ہیں ۔ اس ایثار کے ساتھ دوسرا ایثار یہ تھا کہ جماعت اور تحریک کے عائد کردہ مختلف فرائض کا بار شروع سے بلا معاوضہ اٹھایا ——— حالانکہ یہ شرعاً اور اخلاقاً ناجائز نہیں تھا کہ مولانا اپنا پورا وقت دیتے ہوئے بقدر کفاف جماعت سے معاوضہ یا کم سے کم وظیفہ لیتے ۔ اس کے لئے اصرار بھی کیا گیا ۔ لیکن وہ قرض اٹھا اٹھا کر تو کام چلاتے رہے ، یہ صورت بالکل قبول نہیں کی ۔

سوچئے کہ ہمارے پاس کتنی ایک مثالیں ایسی موجود ہیں !

اس موضوع کے سلسلے میں ضروری ہے کہ مولانا مودودی کا پارٹ مجلس شوریٰ میں دکھایا جائے جو بیرونی دنیا کی نگاہوں سے بالکل اوجھل ہے ۔

مودودی صاحب ہمیشہ مقررہ وقت پر پہلے سے ایوان (جو بیشتر ان کا دفتر ہی ہوتا ہے) میں موجود ہوتے ہیں ۔ لوگ آتے اور بیٹھتے جاتے ہیں ۔ ماحول بڑا سنجیدہ ہو جاتا ہے ۔ سابق کارروائی پڑھی جاتی ہے ۔ ایجنڈا پڑھا جاتا ہے ۔ اور اکثر اوقات تمام ارکان شوریٰ باری باری اپنے اپنے علاقوں کے تحریکی حالات کے بارے میں معلومات پیش کرتے ہیں ۔ پھر مسائل پر بحث شروع ہوتی ہے ۔ مولانا مودودی بحث کے دوران میں نقطہ ہائے نظر کو سمجھنے کے موڈ میں پرسکون طریق سے بیٹھے رہتے ہیں ۔ ابتدائی عام بحث کے بعد آہستہ آہستہ دو یا زیادہ اختلافی آراء متعین شکل میں سامنے آجاتی ہیں اور ضرورت ہو تو ان کو مولانا مودودی اپنے منفرد تجزیہ کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں ۔ اب ان آراء کے حق میں مختلف افراد (جو کبھی مستقل گروہ بندیوں کی شکل اختیار نہیں کرتے) انفرادی طور پر استدلال کرتے ہیں ۔ بحث اگر انضباط سے ذرا ادھر ادھر ہو تو مولانا ٹھنڈے انداز سے ازسرِ نو تجزیہ کر کے اسے پھر راہ راست پر ڈال دیتے ہیں ۔ اگر لوگ زیادہ بولنے لگیں تو کسی موقع پر یکایک مولانا اٹھیں گے اور مسکرا کر کہیں گے " اچھا حضرات ! آپ بحث جاری رکھئے ، میں ذرا ڈیوڑھی تک ہو آؤں " ۔ اس پر اکثر چہرے مسکرا اٹھتے ہیں اور لطیف تنبیہ انداز کی اس تنبیہ کو سمجھ کر بحث کے بے جا پن کا از خود سدباب کر لیتے ہیں ۔ مولانا مودودی نہ تو اس دوران میں اپنی رائے کو سامنے لاتے ہیں اور نہ کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ پہلے

ہے ... [illegible] ہے جو چاہتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ بحث بہت ہی اہم ہے جبکہ وہ موضوع کی بحث سے بہت کچھ الگ کر دیتے ہیں کہ وہ میں اپنی بات کا
شکل ... بہت ... تعصب سے کچھ دے انہوں نے کبھی کسی بات کو پیش کیا ہے نہ حوالے ... وہ اگر کوئی نقطہ نظر رکھتے ہیں تو وہ بحث کے بعد کسی موقع پر
چھپا نہیں ... [illegible] ... پیش کر دیتے ہیں۔ پھر کچھ وہ اپنے نقطے نظر کو صاف کرتے ہیں اور پھر ان کا نقطہ نظر قبول کیا جاتا ہے۔ اس طرح ...
... فیصلے پاتے ہیں۔ وہ باہمی اختلافی رجحانات کے درمیان جب بحث بہت طویل کھینچ جاتی ہے تو مولانا مودودی ان کے اپنے نقطہ اتفاق ...
... اس خوش اسلوبی سے پیش کرتے ہیں کہ بحث کا موضوع چھٹ جاتا ہے۔ شوریٰ کی تاریخ گواہ ہے کہ وہ ... اپنے پرانے ساتھیوں سے فیصلے ...
... کسی معمولی بلکہ روایت یہ ہے کہ باہمی افہام و تفہیم کے بعد اتفاق رائے اور اطمینان قلب و ذہن کے ساتھ ... معاملات طے پاتے ہیں۔ مجلس شوریٰ میں
... مودودی کا ایک اہم پارٹ یہ رہتا ہے کہ جب بھی بحث کی فضا گرم ہونے لگتی ہے تو وہ ایک تبسم ... سے ... کو ہلکا پھلکا بنا دیتے ہیں۔ حقیقت
... دوسرے لوگوں کو معلوم نہیں ہوتی کہ ہمارے ان تحریکی مسائل پر ... شوریٰ میں ہم بھی ... مخالفت سے بھی گفتگو کرتے ہیں۔ ... ایمان سے باہر
کی طرف سے یہ کوشش کی جاتی ہے کہ وہ پیچھے سے اپنے ہم خیال تیار کرنے والے ادارے ... شوریٰ میں ... کرنے کی کوشش کرتے ہیں ...
کا ... ایوان کے اندر ہی اندر ہوتا ہے۔ اس سبب سے گروہ بندی پیدا ہوتی ہے۔ ... ——— ... کہتا ہے کہ وہ تمام ... کی
... کا حصہ دار ہے اور اس کی رائے ویسی ہی قیمتی اور اس کا استدلال ویسا ہی اہم ہے جیسے ... !

ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص میرے اس مطالعۂ شخصیت میں اچھے ہی اچھے پہلو دیکھ کر مجھ پر قصیدہ گوئی کا الزام رکھے۔ میں کسی کو روک نہیں سکتا، مگر اتنا عرض ضرور
اپنے آپ سے ضرور کہتا ہوں کہ قصیدہ گوئی کے لئے میرا مزاج بنایا ہی نہیں گیا۔ دوسری طرف میرا مزاج یہ بھی نہیں ہے کہ خواہ مخواہ کا تکلف کر کے کچھ عیوب
کسی کے اندر نکالوں۔ مودودی صاحب کی شخصیت کا مجموعی ڈھانچہ بہت ہی صاف ستھرا اور نفیس ہے۔ اس میں کوئی بنیادی اور اہم قسم کی کوتاہی و فساد موجود نہیں
ہے۔ یوں وہ انسان ہیں، رائے قائم کرنے، فیصلے دینے، معاملات کو سلجھانے اور تدابیر اختیار کرنے میں غلطیاں کرتے ہیں، ہم سب ایسی غلطیوں پر ان سے بحث بھی
کرتے ہیں اور اگر ہمارے دلائل مضبوط ہوں تو بہرحال ... قائل ہو کر تبدیلی بھی قبول کرتے ہیں۔ لیکن جہاں تک ان کے اخلاق اور کردار کی ساخت کا تعلق ہے اس میں
کوئی رخنہ تلاش کرنے میں ناکامی ہوتی ہے۔ کمزوریاں ان میں ہوں گی مگر آخر تو یک ... جن میں پڑ کر اپنے رفقاء کے ساتھ ساتھ خود مودودی صاحب بھی تو بنے ہیں۔ اور
وہ تو ہم سب سے پہلے (۱۹۳۲ء میں) اپنی اس سلگائی ہوئی بھٹی میں آ خود پڑے تھے اور اس میں تپتے ہوئے ان کو آج ۲۵، ۲۶ سال ہو چکے ہیں —
——— میں اپنے ضمیر کے سامنے بہرحال مطمئن ہوں کہ میں نے عقیدت مندی کے رنگ سے نہیں، مگر یہ تصویر واقعیت اور حقیقت کے رنگ سے مرتب کی ہے ———
اور اتنی اچھی تصویر سامنے ہونے کے باوجود میں کہتا ہوں کہ مودودی ہرگز کوئی فرشتہ نہیں، وہ معصوم نہیں، وہ انسان ہے، وہ غلطیاں اور کوتاہیاں اور کمزوریاں رکھنے والا انسان ہے۔

مودودی کی شخصیت کا یہ مطالعہ و تجزیہ ختم کرتے ہوئے میں ملک سفیان آفاقی کے چار لفظوں کو دہراتا ہوں۔ "مولانا مودودی کی زندگی اس اعتبار سے دلچسپ
ہے کہ وہ ایک انسان کی زندگی ہے۔" (ابوالاعلیٰ مودودی) اور ان الفاظ ہی کی روشنی میں تعصب کی ان دیواروں پر ماتم کرنا چاہتا ہوں جن کو لوگوں نے خود اپنے
اور مودودی کے درمیان کھڑا کر رکھا ہے اور مخالفانہ پروپیگنڈہ کرنے والوں کو اذن دے رکھا ہے کہ ان دیواروں پر نت نیا پلستر لیپتے رہیں۔ مودودی صاحب
سے جسے اختلاف ہو وہ اختلاف کرے، جو ان کے مذہبی تصور کو غلط سمجھتا ہو وہ اپنا کلامی اور فقہی نقطۂ نظر پورے زور سے سامنے لائے اور جسے ان کے سیاسی
پروگرام سے بعد ہو وہ سیاسی میدان میں ان کا پورا مقابلہ کرے ——— مگر وہ اپنی حیثیت کے انسان اور ایک تاریخی شخصیت ہونے کے لحاظ سے ساری ملت
کی ایک قیمتی متاع ہیں بلکہ انسانی دنیا کے بنیادی سرمایۂ شخصیت و کردار کا ایک جزو !

——— اور ان کی ذات میں علم اور عمل کے کچھ نہ کچھ ایسے پہلو موجود ہیں جن میں سے ہر ایک کی ہمیں ضرورت ہے۔ انہی پہلوؤں تک رسائی حاصل کرنے کا راستہ نکالنے
کیلئے ان کا مطالعۂ شخصیت مفید ہے، ورنہ محض ایک شخص جس کا نام ابوالاعلیٰ مودودی ہے کسی دوسرے سے قابل ترجیح نہیں ہے۔

علامہ مشرقی

غلام جیلانی برق

یہ ۱۹۰۸ء کی بات ہے۔

کہ میرے گاؤں (بسال ضلع اٹک) میں میرے والد صاحب کے مرشد تشریف لائے۔ حضرت والد اظہار عقیدت کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ میں اور میرے ایک بھائی غلام ربانی عزیز ہمراہ تھے۔ ہم نے بھی نذرانہ پیش کیا۔ مرشد نے پوچھا۔ کہ یہ بچے کیا کرتے ہیں۔ حضرت والد نے بتایا کہ سرکاری سکولوں میں پڑھتے ہیں۔ بڑا چھٹی میں اور چھوٹا تیسری میں۔ یہ سنتے ہی مرشد کے تیور بدل گئے۔ جلال میں فرمایا۔ "ان کو آج ہی سکولوں سے اٹھا لو۔ حکم کی تعمیل ہوئی۔ اور ہم دونوں بھائی مسجد میں بھیج دئے گئے۔ جہاں ہم نے چند برسوں کا نصاب ختم کیا۔ تیرہ برس عربی، نحو، فقہ، منطق، فلسفہ، حدیث، تفسیر اور تاریخ پر صرف کئے۔

مسجد کے یہ تیرہ برس میری زندگی میں بہت اہم تھے۔ اوّل اس لئے کہ یہاں مجھے عربی زبان پر قدرت حاصل کرنے کے مواقع میسر آئے۔ اور دوم اس لئے کہ مجھے مُلّا و پیر کی اندرونی زندگی دیکھنے کا موقع ملا۔ چونکہ یونانی فلسفہ پڑھنے کے بعد تقلید کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ اور فکر آزاد ہو چکی تھی اس لئے میں نے اس مذہب کے ہر پہلو پر غور کرنا شروع کر دیا جو مُلّا پیش کر رہا تھا۔ بے شمار شبہات پیدا ہوئے۔ جن کا جواب مُلّا کے پاس موجود نہ تھا۔ رفتہ رفتہ یہ شبہات بے چینی میں بدل گئے۔ اور بے چینی نے بغاوت و الحاد کی صورت اختیار کر لی۔ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۸ء تک میں خلوص دل اور اسلام و قرآن سے باغی رہا۔ نیز امام رسول خدا کی تضحیک اور کتاب اللہ کا مذاق اڑاتا تھا۔ اور مذاق بھی ایسا کہ بڑے بڑے زندیق میرے سامنے کان پکڑتے تھے۔ اور ابلیس مجھ سے پناہ مانگتا تھا۔

میرا الحاد عین شباب پر تھا۔ کہ ایک دن (۱۹۲۸ء) ایک دوست علامہ مشرقی کی مشہور کتاب تذکرہ میرے پاس لائے۔ اور کہا۔ کہ اسے پڑھو۔ شاید تمہارے بعض شبہات کا حل اس میں موجود ہو۔ میں نے نفرت و حقارت سے کتاب کو اٹھایا لیکن چند ابتدائی جملوں ہی نے میری دنیائے دل میں ایک زلزلہ سا بپا کر دیا۔

"دنیا کی سب سے مستحکم اور مروج اشیاء میں سب سے بڑا ازلی مذہب ہے۔ یہ پوجا کیوں ہے۔ یہ جھکنا کیا ہے۔ یہ رسمی عقائد۔ یہ شرعی مراسم۔ یہ برہمن کے قشقے۔ یہ بت پرست کی مورتیاں۔ یہ مسلم کی قربانیاں اور ہندو کے

... ملک کی شدید نادی اور حیاتی کا ہی فدا کیا ہے۔ اصبح تسبیحا بیک ا۔ ملک کے مناسک مجتمعہ ... ملی حیات۔ مستقات۔ تجدید۔ نماز۔ لمبی ڈاڑھیاں۔ مقشرع چہرے۔ تعویذ۔ اصطلاح۔ جملہ ماشتن ... وغیرہ....... جو امراء جاری ہیں...... جن کو ہر شخص نہایت عقیدت والتزام سے کرتا ہے۔ ان کے کرنے کا مجبوبت ... کے متعلق ایک حرف زبان پر نہیں لاتا۔ جاہل اور عالم۔ الغرض انسان سب اس شخص تا معلوم ... سے سمجھیں اور ان کو فلسفہ زندگی کا منتہائے مقصد سمجھتے ہیں...

تعجب ہے کہ مذہب کی طرف اس قدر میلان کے باوجود ابتدائے آفرینش سے آج تک ... کسی نے یہ سوچا ہے کہ فلسفہ شارع کائنات کی منشا کے مطابق ہے اور مذہب کی ... حقیقت کیا ہے! ... علم الطبیعت کے حقائق پر سارا جہان متحد ہے .... دنیا کی مروجہ ... کے انسانی ... ساری دنیا متفق ہو چکی ہے .... لیکن ہندو اور بدھ۔ یہودی۔ عیسائی اور مسلمان نے دین کا اختلاف ... قائم ہے اور رہے گا ... مذاقت کی ... کیفیت کیوں ہے۔ سب کو اس مشترک حقیقت پر جمع نہیں کرتی!......

میرا یقین ہے کہ دنیا کے مختلف پیغمبر جہاں سے آئے تھے۔ ایک ہی پیغام لائے تھے۔ انہوں نے ... ایک ہی چشم تحیر سے دیکھا تھا۔ وہ انسان کو ایک ہی مقام اور منصب سے دیکھ کر ... اٹھے تھے۔ ... اور ... ان کے بدنوں میں ایک ہی راہ سے داخل ہوئی تھیں......... جو کہ مادہ سب کا ایک تھا۔ خدا ... ایک تھی چشمہ ... ایک تھی۔ ... ایک تھا۔ ... پیغام ایک تھا۔ جب تک یہ ... لوگ اس دنیا میں رہے۔ ... کو ... رکھتے رہے۔ سولی پر چڑھ چڑھ کر ... ہو ہو کر خلق خدا کو آمادہ عمل کرتے رہے۔ سب کو ایک نصب العین اور ایک قانون پر متحد کرتے رہے۔ لیکن ان کے بعد جب ... حقیقت شناس لوگوں نے ... کو سنبھالا ... کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ پیغام خدا غلط ... اپنے پیچھے صفیں ... آج ... پر خدائے ... متضاد مذاہب الغرض فساد اور بغاوت ... سے ہے .... یہ مذہب کی ... فی الحقیقت جہالت اور ناشناسی کی ... ہے .... علم اور نبوت کی ضد قطعاً نہیں۔ علم جہاں ہوتا ہے اتحاد و اشتراک پیدا کرتا ہے۔ ... اور ... عمل پیدا کرتا ہے......... اس کے ہوتے ہوئے ... ناممکن ہے...... دو مخالف فریق آج تک اس بات پر نہیں لڑے کہ پانی سیال نہیں۔ آگ ٹھنڈی ہے۔ یا ہر بھاری چیز آسمان کی طرف جاتی ہے .... اسی طرح اگر روئے زمین کے تمام مذاہب علم کی کسوٹی پر پرکھے جائیں......... تو آج ہی نسل انسانی متحد .... ہو سکتی ہے۔"

(تذکرہ علامہ مشرقی۔ آغاز)

میں اس کتاب کو پڑھتا گیا ان انوکھی تشریحات کے متعلق میری دلچسپی بڑھتی گئی۔ یہ بات میرے کانوں میں پہلی مرتبہ پڑی۔

"دنیا کے ... پیغمبر جہاں سے آئے تھے ایک ہی پیغام لائے تھے"

مجھے تو ملاؤں نے یہ سمجھایا تھا۔ کہ پہلے انبیاء کے پیغام نامکمل و ناقص تھے اور ان میں زبردست تضاد و تباین تھا۔ میں حیران تھا۔ کہ ایک خدا نے ایک نسل انسانی کی طرف سینکڑوں متضاد مذاہب کیوں بھیجے تھے۔ اور تمام دنیا کو ... کر ... پر فتنہ و فساد کی آگ کیوں بھڑکائی تھی

علامہ مشرقی نے مجھے پہلی مرتبہ بتایا کہ

"انبیاء نے انسان کو اس زمین پر رہنے کا ڈھنگ سکھایا .... اجتماعی بقا کی راہ دکھائی۔ اقوام کے مدوجزر کے اصول

[illegible] حکومت ... قطعاً بری ثابت کر کے بنیادی سزا کی تقسیم کی۔ آخر میں ... [illegible]

... تک مدہ ... دے لئے۔ نازمانی کرنے والے آنکھوں سے سزا ملتی دکھا گئے۔ ... بھاری تھا ...

انبیاء کی صفات کے ... کا ... ان کی بے مثال بصیرت کے باعث ہوا ...... کمال خبر ... سے ہوا۔ وسیع ...

... سے ہوا۔ تقش کے بام ... تد ... کے ... پر چڑھ کر ہوا۔ زمین سے کئی منزلیں بلند ہو کر بلکہ ستاروں ... کا ...

... کرنا۔ نہیں نہیں۔ آسمان سے اور آسمان پہ بسنے والے خدا سے ہوا۔ وحی اور نبوت سے۔ عجز اور عشق سے۔ تدلی

اور تکلم سے ہوا .... ہر زمانے میں ان انبیا کی بدولت اصل دین کی تجدید و تکمیل ہوتی رہی۔ کوئی مخالف راہ عمل

کوئی نیا دین یا جدا مذہب دنیا کے کسی نبی نے ختم قائم نہیں کیا (تذکرہ صفحہ ...)

ندیم ان کے علاوہ بات کہنے کا طریقہ اس قدر دلنشیں ہر تہوار ... تھا کہ بات دل میں اترتی تھی۔ دور الحاد میں انبیا کے متعلق میری یہ رائے

تھی کہ یہ سب لیڈری کے بھوکے اور دنیوی وجاہت کے شوقین تھے۔ یہ اپنے جلوس نکلوا کر نعرے لگوانا اور پیری مریدی کی دکان چمکا کر دنیا کرنا چاہتے

تھے۔ علامہ نے میرے ان وساوس پہ یوں آگ برسائی۔

"یہ سوال کہ کیا سب رہنمایان خلق اور احبتہ الناس جو اپنی مدت العمر سعی و عمل کے بعد خلق خدا کو ایک راہ پہ لگا گئے تھے

جو اپنی دھن کے اس قدر پکے تھے کہ گردنیں کٹوا گئے۔ مگر اپنی بات کو نہ چھوڑا۔ کیا یہ سب معاذ اللہ جھوٹے اور دغاباز تھے۔ کیا

ان کا تمام ہما ہمی سب مکر و فریب کا جال تھا ...... کیا ان سب کو نفس نے اس قدر دھوکے دیے۔ کما تھا کہ دھوکے

میں جیتے رہے۔ دھوکے میں کٹتے رہے۔ دھوکے میں قوموں کو امن و امان کے فلک الافلاک تک پہنچا گئے۔ اور دھوکے

میں مر گئے .... کیا موسیٰ فی الحقیقت ایک بے علم۔ بدحواس۔ دھنا اور مختل الحواس مجنوں تھا جو فرعون

کی طاغوتی طاقت کے خلاف بر سر علانیہ بر سر پیکار رہا۔ جو اپنی بے سر و سامانی کے باوجود اس کو علی الاعلان ہلاکت کا

اٹل پیغام سناتا رہا۔ جس نے ڈنکے کی چوٹ اسکو اور اس کی قوم کو عذاب کی دھمکیاں دیں ..... کیا عیسیٰ علیہ السلام

محض ایک مرکھلا مریخ۔ سادہ لوح۔ خالی الذہن۔ دنیا و مافیہا سے ناجدا ور بھیڑوں کو چرانے والا گڈریا تھا جس پر قیصر

روم نے افترا باندھ کر اسے واجب القتل قرار دیا تھا ...... جس کی سنجیدہ آنکھوں میں ایسے ہیبت و خوف نظر

آتا تھا .... کیا بدھ علیہ الرحمتہ والسلام جیسا باکمال شخص جس کے پیروؤں کی تعداد آج دنیا کے سب نئے اور

پرانے مذاہب کے ماننے والوں سے بڑھ کر ہے .... فی الحقیقت ایک تپاکش اور نفس کش۔ ایک خشک مغز اور

یبوست آگیں زاہد ہی تھا جس نے تخت سلطنت کو لات ماردی اور باشندگان زمین کو راہ راست پہ لانے کیلئے

وہ اندوہناک مشقتیں جھیلیں کہ سطح زمین جنبش کر کے اٹھی اور قرنوں تک اس لرزش کا اثر پارہ وانگ عالم میں باقی رہا .....

.... کیا وہ سالار انبیا اور ختم الرسل محمد علیہ السلام والصلوٰۃ جس کے آسمان شگاف علم و عمل کو دیکھ کر

... ابدی کا ... سلام و حمار ... زمین پہ ابدالآباد تک ... رہے گا۔ جس کے قانون بقاء و فنا کی تبیین پہ بحر و بر

اور شمس و قمر سلام بھیجتے رہیں گے۔ جس کی قوت تغیر و انقلاب کا اندازہ کر کے ہم تمام ... ان بننے کی دائمی آرزو رہے گی

کیا وہ سرور عالم فی الحقیقت ایک کنج نشیں۔ کملی پوش۔ بے نوا امی۔ نادان نا ... ایک ... زمانہ گریز ... اور فاقہ کش

متقی ہی تھا۔ جس نے اتنی قلیل مدت میں عرب کی بے نام اور گمنام قوم سے علم و عمل کے وہ آتشیں فوارے

اکناف عالم میں رواں کئے کہ دنیا ... ہمیشہ ان کے کارناموں کو ... کرے گی۔ کیا یہ سب کبرائے خلق اور

[illegible] بھر لئے تھے ... [illegible] اعتراضات [illegible] سے حقیقت [illegible]
[illegible] قدر [illegible] آن [illegible] حق [illegible]
[illegible] کا [illegible] تھے ۔ [illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

علامہ [illegible] ۔

اوّل [illegible] ایک [illegible] درست [illegible] شیب و طرف [illegible] ہیں [illegible] آتی [illegible] جو [illegible] بلا رہی ہے۔

دوم [illegible] سے پیدا ہوتا ہے [illegible] جس سے [illegible] فضاؤں اور ہواؤں کو مسخر کر سکتے ہیں [illegible] سکتے ہیں [illegible] سے خوب [illegible] ہے اور اس سے الٰہی حکمت و دانش کے [illegible] کائنات اللہ کی تخلیق [illegible] آب و ہوا [illegible] کیسے بن گیا اور [illegible] اکبر [illegible] ملت اور فرد و فکر [illegible] پہ نہیں بیٹھ سکتا۔

علامہ نے اس [illegible] انتقاد و چند گونہ نظریات پر وہ خرد افروز بحث کی ہے کہ دل لذتِ ایمان سے چھلکنے لگتا ہے۔
سوم: یہ مسئلہ مدتوں سے زیر بحث چلا آتا تھا کہ جب اللہ نے قرآن حکیم میں سینکڑوں مقامات پر صرف مسلمانوں سے خلافتِ ارضی کا وعدہ

کیا تھا، قرآن کی تفسیر بھی ... علماء پر، ان کے مدارس کے مشترکہ حصے پر کیوں گھبراں ہیں۔ "تذکرہ" کا اصل موضوع ہی عمل ہے۔ اس کی تفاصیل [illegible]
[illegible] میں فرماتے ہیں کہ ایمان محض کلمہ زبانی سے ... اور عمل کچھ نہ کرنا ... منافقت کی انتہا ہے۔ ... [illegible]
[illegible] ہوتے ہیں۔ اس کے نتائج ... قومی اقوام اتحاد ... ہو کر رہ گئی ہیں۔ جو تنظیم، محنت، جذبہ، سرفروشی ... [illegible]
[illegible] اب ... گراں ہوتے رہا ہے۔

"جس اُمت میں ... قول کا اسلام محض زبانی موجود ہو ... خدا کا اس کے ... دل کی ... ڈال کر ...
.... طلب اور ... خدا سے ... دے کر ... اس کے ... منظور نظر ...
... اور ... کو بلائے گا .... اگر تعلیمِ خدا ... اسلام ... قرآن ہے ... کچھ
کام اور صرف عمل سے ہو سکتا ہے ... روزے کی تکلیف ... ہو سکتی ہے ... کے لئے ... لا اِلٰہ
قانونِ خداوندی آسانیاں ... کر کے اس مقامِ جلیل کے برقرار رہنے کی اُمید رکھنا ... کام ... نیک اعمال اور عقیدہ
کلمہ اور قومی ... پر اکتفا کر کے ... اور با عزت ... جس طرح اپنے آپ ... مسلمان بنے رہنا
کام چور اور نا بکار اُمت کا شیوہ ہے۔ اُس دانا نے ... کو دھوکہ دینا ہے ... کے ... کرتا ہے۔ ایک
چھوٹے سے چھوٹا آقا بھی اس زبانی جمع خرچ اور لفظی عبادت کی کچھ پیدا نہیں کرتا۔ بلکہ ... زبانی آؤ بھگت ... دیکھ کر
اُسے ملازمت سے برطرف کر دیتا ہے۔ پھر ... شمس و قمر ... کام پر اُجرت یا نعمت کی اُمید رکھنا پوری جہالت ہے
...... بس میری دانست میں اگر ایک شخص اپنے لفظی اور زبانی عقیدے پر عامل نہیں۔ تو اُس کا عقیدہ خدا کی
نظروں میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا .... کہنا اور کر کے نہ کرنا منافقت ہے ... اصلی ... کی ضد ہے ...
قرآن کو گناہ و بیہودہ ہے ... حقیقت کا منہ چڑانا ہے ...... بر خلاف اس کے جو شخص عمل کر رہا ہے ...... وہی
اُس کے حکم اعلیٰ ہونے پر سچا ایمان رکھتا ہے۔ وہی اُس کو صحیح معنوں میں مان رہا ہے۔ وہی اس کو دل سے آقا تسلیم کرتا ہے
وہی مسلم اور مومن ہے .... مسلمانوں کی ... قوم نے آج عمل کی تکلیف ... کو خیرباد کہہ کر عقائد کی
آرام دہ مکاری پر تکیہ کر لیا ہے۔ اور اس ... کے اندر ایک نیا مکر ... پیدا کر لیا ہے۔ کہ نہایت ... سے اس بات کے درپے
رہتے ہیں کہ خدا کو خوش کرنے کے لئے عقائد کو درست کیا جائے۔ اعمال کے درست ہونے پر بحث قطعاً بند ہو چکی ہے۔
گویا ہم سے ... اس لئے چھینے جا رہے ہیں کہ حاکمِ زمین و آسمان کو اس لاڈلی اُمت کے ... پسند نہیں ہے ......
اسلام عمل اور صرف عمل ہے۔ جو عامل ہے۔ اُس کا عقیدہ بھی درست ہے۔ نہیں۔ بلکہ اُسے زبانی عقیدے کی ضرورت ہی نہیں
خالی قول و عقیدہ بہر نوع کچھ نہیں۔ آج کچھ نہیں، کل کچھ نہیں اور ابد الآباد تک کچھ نہیں۔"

(تذکرہ صفحہ ۸۲-۸۶)

۲۰۵ صفحات ... تقطیع، پرمشتمل ہونے پر یہ کتاب از اول تا آخر اسی طوفانی انداز کے ساتھ چلتی ہے۔ قدم قدم پر جدتیں۔ ترجمہ و تشریح کی ندرتیں، رسوم
مناسک کی تنومند تفاصیل اور ضابطۂ عروج و زوال کی ایمان افروز تفاسیر۔ کتاب کو پڑھ کر
ع۔ غل پڑا دنیا میں ... کافر مسلماں ہو گیا

اُس زمانے میں میں اور میرے بڑے بھائی غلام ربانی عزیز (آج کل پروفیسر گورنمنٹ کالج لائلپور) گورنمنٹ ہائی سکول کیمبلپور میں مدرس تھے۔ وہ بھی
"تذکرہ" پڑھنے سے پہلے ... تھے۔ وہ بھی میری طرح اس کتاب سے متاثر ہوئے۔

اور علامہ مشرقی اس وقت گورنمنٹ ہائی سکول ایبٹ آباد میں پڑھاتے تھے۔ خط لکھا کہ میں اور میرے دوست سب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ … چند دوست ساتھ ہوں گے … تو آپ کو تکلیف ہوگی۔ اس لئے آپ ہی یہاں تشریف لے آئیں … علامہ نے جواب میں … سلسلہ لکھتے رہے … تعریف سے … آخر علامہ نے … اور ہمیں اطلاع دی کہ … ستمبر ۱۹۲۱ء کو آپ … ہم … کے قریب ایک … مرحوم … مقصد یہ کہ جب … اطلاع ہو … ساڑھے … بجے کے قریب … صاحب … مکان کے سامنے … اندر سے ایک … خوش پوش، گندمی رنگ … ڈاڑھی … سفید … اور … سفید … مجھے مشرقی کہتے ہیں … الامام … سب بیٹھے … تشریف …

… علمی مسائل زیر بحث آگئے۔ آپ نے جنت … روشنی ڈالی اور فرمایا کہ جنت دو ہیں … ایک جنت ہے جو صرف قرآنی کردار سے حاصل ہو سکتی ہے۔ سلطنت بھی جنت ہے … اور … دولت … وہ بھی جنت ہے … رفیقۂ حیات بھی جنت ہے۔ اسی طرح تکالیف، امراض، پریشانیاں، افلاس، جہالت، … یہ سب جہنم ہیں۔ انسان کی … جنتوں اور جہنموں میں محصور ہے۔ قرآن ایک ایسی زندگی کی تعلیم دیتا ہے جس سے آپ کی زندگی میں بے شمار جنتیں جمع ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جہاں دنیوی آسائشوں کا ذکر کیا ہے وہاں جنات … کا لفظ استعمال کیا ہے اور چونکہ اخروی جنت صرف ایک ہے اس لئے … "جنت" کہا، جنات نہیں کہا۔ آپ نے اخروی جنت سے متعلق فرمایا کہ وہاں داخل ہو کر ہر جنتی کو ایک زبردست مسرت حاصل ہوگی … وہ دائمی … دنیا کی تمام مسرتیں عارضی ہیں۔ ایک شخص کو زندگی کا ایک لاکھ روپیہ انعام ملتا ہے … اصل مسرت … دن کے بعد کم ہو جاتی ہے۔ لیکن جنت کی خوشیاں اور مستیاں لازوال ہوں گی۔ اگر دنیا میں جنسی لذت کے بعض لمحات کو لازوال کر دیا جائے تو … جنت … بن سکتی ہے۔

گفتگو جاری تھی کہ ظہر کی اذان ہوگئی۔ بیٹھک ہی میں صفیں آراستہ ہوگئیں۔ ہم سب مسرور تھے کہ آج ایک عظیم مفکر و مفسر کی قیادت میں نماز ادا کریں گے۔ لیکن علامہ نے یہاں بھی جدت کو نہ چھوڑا۔ اور اپنے نابالغ بچے اکرام کو فرائضِ امامت سرانجام دینے کے لئے آگے کر دیا … پیچھے کی طرف … سب … آگے بڑھا۔ اور پوری صحت سے نماز پڑھائی۔ بعد نماز علامہ مشرقی نے اجازت چاہی اور واپس چلے گئے۔

۱۹۳۰ء میں اسلامیہ کالج لاہور میں مجھے عربی ایم اے کے لئے جانا پڑا۔ اس سال دسمبر کے آخری ہفتے میں مجھے علامہ مشرقی کا ایک خط … سے ملا کہ میں مذاہب کی عالمی کانفرنس میں شامل ہونے کے لئے ہالینڈ جا رہا ہوں۔ فلاں تاریخ (غالباً ۲۰ دسمبر ۱۹۳۰ء) کو شام کے … بجے مجھے … خواجہ فیروزالدین بارایٹ لا کے مکان پر ملو۔ میں چند ہم جماعتوں کے ساتھ وہاں گیا۔ یہ صحبت رات کے … بجے تک جاری رہی۔ ہم نے کھانا بھی وہیں کھایا … اس دوران میں مختلف مسائل زیر بحث آئے۔ میرے حافظے میں صرف چار محفوظ ہیں۔

(۱) اس مرتبہ علامہ نے ڈاڑھی بڑھا رکھی تھی۔ میں نے اس "ملا پن" کی وجہ پوچھی۔ تو کہنے لگے۔ اس کی وجہ ایک فوری جذبہ ہوا ہے۔ بات یوں ہوئی کہ … سر سلیمان مجھے ملنے کے لئے آئے۔ تو آتے ہی بڑے تپاک سے معذرت کرنے لگے۔ …

لہ … میں کھانے کا کوئی وقفہ نہ تھا۔ اس لئے کہ سب … اکرام بھی روزہ دار تھے۔ (برقؔ)

لہ یہ سطور لکھ رہا تھا کہ کسی نے … میرے ہاتھ میں تھما دیا جس میں خواجہ صاحب کی وفات حسرت آیات کی خبر درج تھی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون (برقؔ)

مصافحہ فرمایا۔ کیونکہ میں شیو (SHAVE) نہیں کرتا تھا:

یہ دیکھ کر حضرت بے ساختہ بول اٹھے۔ کیا داڑھی اتنی بڑی چیز ہے۔ کہ ایک مسلمان اس پر ... جائے۔ تو [illegible] سے خالی [illegible] ہے!
اگر انسان [illegible] ہے ... جس کے ساتھ [illegible] ہے تو ایک مسلمان یقیناً ڈاڑھی کے ساتھ دوسروں سے مل سکتا ہے [illegible]
[illegible]

بات سن کر ملک صاحب [illegible] گیا۔

۲۔ فرمایا:-

"اس سال جب گرمیوں میں حسب معمول حکومت پنجاب و ہند کے دفاتر شملہ میں منتقل ہوئے۔ تو صوبائی و مرکزی دفاتر کے مسلمان آئی سی۔ ایس افسروں نے ایک ادبی جماعت بنائی۔ اور مجھ سے التماس کی کہ آپ "تذکرہ" کی باقی نو جلدیں جلد از جلد شائع فرمائیں۔ ساتھ ساتھ پانچ ہزار جلدیں خریدنے کا نہ صرف وعدہ کیا بلکہ بیس ہزار روپے پیشگی ادا کرنے کی پیش کش بھی کی"

"تو پھر آپ نے کیا جواب دیا۔" میں نے پوچھا

فرمایا: "میں نے انہیں لکھا ہے کہ کیا آپ لوگ "تذکرہ" کی پہلی جلد پر عمل کر چکے ہیں"

علامہ کے اس لہجے سے غصہ بھی آیا۔ اور مایوسی بھی ہوئی کہ اگر علامہ صاحب قوم کے عمل کا انتظار کرتے رہے۔ تو پھر ان [illegible] جو "تذکرہ" کے صفحۂ عنوان پر یہ الفاظ درج ہے۔

"قرآن حکیم کے صحیح مقاصد اور اس کے منشور ب اللہ ہونے پر دس جلدوں میں ایک مکمل اور مبسوط عملی تبصرہ کبھی شرمندۂ وفا نہیں ہوگا۔ تذکرہ کی پہلی جلد ۱۹۲۴ء میں نکلی تھی۔ آج پورے تیس برس گزر چکے ہیں۔ علامہ نے چھ جلدوں کے مسودے تیار بھی کئے۔ ان میں سے جلد دوم کا ایک مضمون "گاندھی اور چرخہ" غالباً یہی عنوان تھا میں نے بھی پڑھا۔ لیکن کوئی جلد قوم کے مشتاق ہاتھوں تک تاہنوز نہیں پہنچ سکی۔

۳۔ فرمانے لگے

"ابوالکلام آزاد کی تفسیر جلد میدان میں آرہی ہے۔ سنا ہے کہ آزاد نے نظریۂ عمل "تذکرہ" سے چرا لیا ہے۔ اور علمی بددیانتی کی حد یہ کہ اعتراف تک نہیں کیا:

جب چند روز بعد تفسیر آزاد کی پہلی جلد مجھے ملی۔ اور "مالک یوم الدین" کے تحت علامہ کے مشہور نظریۂ عمل کی تفاصیل پڑھیں۔ تو مسرت بھی ہوئی۔ کہ امام الہند مُلا کے اسلام سے نکل گئے ہیں۔ اور افسوس بھی۔ کہ "تذکرہ" کا احسان مان لیتے تو ان کا کیا بگڑ جاتا۔ بہرحال میری مسرت بہت زیادہ تھی اور افسوس محض رسمی سا۔

۴۔ اللہ کے قول (الہامی صحائف) و عمل (کائنات) کا ذکر چل پڑا۔ تو ایک دلچسپ کہانی سنائی۔ جس کا تعلق انگلستان سے تھا۔
"۱۹۱۰ء کا ذکر ہے۔ کہ اتوار کا دن تھا۔ اور زور کی بارش ہو رہی تھی۔ میں کسی کام کے لئے باہر نکلا۔ تو جامعہ کیمبرج کے مشہور ماہر فلکیات سر جیمز جینس (SIR JAMES JEANS) پر نظر پڑی۔ جو بغل میں انجیل دبائے چرچ کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے قریب ہو کر سلام کیا۔ انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ دوبارہ سلام کیا۔ تو وہ متوجہ ہوئے۔ اور کہنے لگے "تم کیا چاہتے ہو" میں نے کہا۔ دو باتیں۔ اول یہ کہ زور سے بارش ہو رہی ہے۔ اور آپ نے چھاتا بغل میں داب رکھا ہے۔ اگر کوئی مصلحت مانع نہ ہو۔ تو تان لیجئے۔ سر جیمز اپنی بدحواسی پر مسکرائے اور چھاتا تان لیا۔

دوم یہ کہ آپ جیسا شہرۂ آفاق شخص نماز پڑھنے جا رہا ہے۔ یہ کیا بات ہے؟ کہ اس زمانے میں سائنس کے انکشافات اور نئے حقائق نے سب کو تعمیرِ عقل سے باہر نکال دیا تھا اور تعلیم یافتہ طبقہ مذہب کے نام تک سے بیزار ہو چکا تھا۔ میرے اس سوال پر پروفیسر جیمز کھل کر ہنس دیے اور میری طرف متوجہ ہو کر فرمانے لگے: "آج شام کو چائے میرے ساتھ پیجئے۔" میں شام کے وقت ان کی رہائش گاہ پر پہنچا ٹھیک چار بجے لیڈی جیمز باہر آ کر کہنے لگیں "سر جیمز تمہارے منتظر ہیں۔" اندر گیا۔ تو ایک چھوٹی سی میز پر چائے لگی ہوئی تھی۔ لیڈی جیمز نے چائے بنا کر ایک پیالی مجھے دی اور ایک پروفیسر صاحب کو دی۔ پروفیسر صاحب تصورات میں کھوئے ہوئے تھے۔ کہنے لگے۔ تمہارا سوال کیا تھا؟ اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر اجرام آسمانی کی تخلیق۔ ان کے حیرت انگیز نظام۔ بے انتہا پنہائیوں اور فاصلوں، ان کی پیچیدہ راہوں اور مداروں نیز باہمی کشش اور طوفان ہائے نور پر وہ ایمان افروز تفصیلات پیش کیں کہ میرا دل اللہ کی اس داستانِ کبریا و جبروت سے دہلنے لگا۔ اور ان کی اپنی یہ کیفیت تھی۔ کہ سر کے بال سیدھے اٹھے ہوئے تھے۔ آنکھوں سے حیرت و خشیت کی دوگونہ کیفیتیں عیاں تھیں۔ اللہ کی حکمت و دانش کی ہیبت سے ان کے ہاتھ قدرے کانپ رہے تھے اور آواز لرز رہی تھی۔ فرمانے لگے "عنایت اللہ خان! جب میں اللہ کے تخلیقی کارناموں پر نظر ڈالتا ہوں۔ تو میری تمام ہستی اللہ کے جلال سے لرزنے لگتی ہے۔ اور جب کلیسا میں اللہ کے سامنے گر کر کہتا ہوں۔

"تو بہت عظیم ہے۔ تو بہت بڑا ہے"

تو میری ہستی کا ہر ہر ذرہ میرا ہم نوا بن جاتا ہے۔ مجھے بے حد سکون و سرور نصیب ہوتا ہے اور ان لمحوں کے سرور کو محسوس کرتا ہوں۔ عام لوگوں کی صرف زبان عبادت کرتی ہے۔ اور میری ہستی کا ہر ہر ذرہ محوِ تسبیح و تحمید ہو جاتا ہے۔ مجھے عبادت میں دوسروں کی نسبت ہزار گنا زیادہ لذت ملتی ہے۔ کہو عنایت اللہ خان! تمہاری سمجھ میں آیا۔ کہ میں گرجے میں کیوں جاتا ہوں؟

پروفیسر جیمز کی ان تفصیلات نے عجیب کہرام سا میرے دماغ میں پیدا کر دیا۔ میری نگاہ تصورِ قرآن کریم کے طول و عرض کا جائزہ لینے لگی اور ایک دلچسپ آیت سامنے آگئی۔ میں نے کہا

"جناب والا! میں آپ کی روح افروز تفاصیل سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔ اس سلسلے میں قرآن کی ایک آیت یاد آگئی ہے۔ اگر اجازت ہو تو پیش کروں؟" فرمایا "ضرور پیش کرو"۔ وہ آیت یہ تھی۔ ومن الجبال جدد بیض وحمر مختلف الوانها وغرابیب سود۔ ومن الناس والدواب والانعام مختلف الوانه كذلك۔ انما يخشى الله من عباده العلماء

(قرآن)

(وہ دیکھو پہاڑوں میں سفید، سرخ اور سیاہ رنگ کی تہیں موجود ہیں۔ اسی طرح انسانوں، حیوانوں اور دیگر جانداروں کے مختلف رنگ ہماری حکمت کا تقاضا ہیں۔ اور مت بھولو کہ اللہ سے صرف اہل علم ہی ڈرتے ہیں)

"کیا کہا۔ اللہ سے صرف اہل علم ہی ڈرتے ہیں۔ حیرت انگیز۔ بہت عجیب۔ یہ بات جو مجھے پچاس برس کے مسلسل مطالعہ و مشاہدہ کے بعد معلوم ہوئی۔ محمد کو کس نے بتائی تھی؟ کیا قرآن میں واقعی یہ آیت موجود ہے؟ اگر ہے۔ تو میری شہادت لکھ لو کہ قرآن ایک الہامی کتاب ہے۔ محمد ان پڑھ تھا۔ اسے یہ عظیم حقیقت خود بخود کبھی معلوم نہیں ہو سکتی تھی۔ اسے یقیناً اللہ نے بتائی تھی۔ بہت خوب۔ بہت عجیب....! اور سر جیمز کئی منٹ تک اس آیت پر سر دھنتے رہے۔ اور محمد عربی علیہ السلام کی خدمت اقدس میں خراج عقیدت پیش کرتے رہے۔ اسی صحبت میں مجھے یہ خیال پیدا ہوا۔ کہ آج قرآن کو سائنس کی نگاہ سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اور اسی خیال نے مجھ سے "تذکرہ" لکھوایا:

ذرا سلسلۂ اسباب پر غور فرمائیے۔ مشرقی کا بارش میں باہر آنا۔ سر جیمز سے اتفاقاً ملاقات۔ وہ شام کو چائے۔ وہاں وہ معلومات تخلیق و تکوین پر حیرت انگیز بحث۔ وہ مشرقی کے قلب و دماغ کا تلاطم۔ اور وہ "تذکرہ" کا تحمل۔ یہاں شاید یہ ذکر کر دینا بے جا نہ ہو گا کہ میں نے "ایک اسلام" "تذکرہ"

سکندر نامہ ہے۔ اور "معتقداتِ مولانا" میں بھی اسی کتاب کی بعض تفاصیل سے لیا تھا۔

اسی صحبت میں علامہ نے ملازمت ترک کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ میں نے وجہ پوچھی۔ فرمایا۔ "والدہ اکرام بار بار طعنے دیتی ہے۔ کہ تذکرہ کا مصنف اسلام کی دشمن قوموں کی نوکری میں عمر گنوا رہا ہے! یہ بات کچھ سمجھ نہیں۔ چنانچہ آپ نے کچھ عرصہ بعد ملازمت ترک کر دی۔ اور جس کی ترغیب پر ملازمت چھوڑی تھی، وہ والدہ صاحبہ کو چھوڑ گئیں۔

تیسری ملاقات

۱۹۳۷ء میں خاکسار تحریک پورے عروج پر تھی۔ ہندوستان کے طول و عرض میں اندازاً چار لاکھ مسلح رضاکار مصروف "چپ راست" کرتے نظر آتے تھے۔ میں ان دنوں گورنمنٹ کالج ہوشیار پور میں معلم تھا۔ کسی کام کو لاہور آیا۔ تو علامہ سے ملنے کی امنگ اٹھی۔ تانگے پر بیٹھ کر "اچھرہ" جا پہنچا۔ مجھے ایک خاکسار دفتر کی بالائی منزل میں لے گیا۔ یہ تھا علامہ کا خاص کمرہ۔ جس میں نہ کوئی کرسی تھی نہ میز۔ نہ قلم نہ کاغذ۔ فرش پر ایک پھٹی پرانی چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ ایک مقام پر دو مربع فٹ میں چٹائی اڑی ہوئی تھی۔ اور فرش میں یوں گڑھا پڑ گیا تھا۔ جیسے پانی کا قطرہ برسوں ایک ہی جگہ پڑتا رہے۔ اور اس کے نیچے گڑھا بن جائے۔ دس بارہ منٹ کے انتظار کے بعد زینے پر سے قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی۔ اور چند لمحات کے بعد علامہ مشرقی بایں ہیئت نمودار ہوئے۔ کہ سر کے بال بے طرح بکھرے ہوئے اور گریبان کے بٹن کھلے تھے۔ نسواری کھدر کا کرتہ جسم پر۔ اور ویسا ہی ڈھیلا سا پاجامہ کمر میں۔ پاؤں میں ٹوٹی ہوئی چپل۔ میں تعظیماً اٹھا۔ آپ نے خشونت سے بھرپور نگاہ میری صورت، جسم اور انگریزی ٹوپی پر ڈالی۔ بے دلی سے ایک ہاتھ آگے بڑھایا۔ مصافحہ کے بعد اس گڑھے والے مقام پر بیٹھ گئے۔ اور ڈاک پڑھنے لگے۔ کافی دیر کے بعد میری طرف متوجہ ہوئے اور پوچھنے لگے۔ "آپ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں۔" میں نے دیرینہ تعلقات جتاتے ہوئے کیمبرج میں آپ کی آمد کا ذکر کیا۔ تو جھٹ کہنے لگے۔ "وہ ریشمی سوٹ پہن کر بیس ہزار کی موٹر میں مزے اڑانے والا مشرقی فوت ہو چکا ہے۔ آپ کے تعلقات اسی مشرقی سے ہوں گے۔ یہ مشرقی آپ کو بالکل نہیں پہچانتا۔" اور پھر ڈاک پڑھنے میں کھو گئے۔ علامہ کی یہ طرز بہت سے ایک الٹی میٹم تھی کہ یا تو ملازمت چھوڑ کر خاکسار تحریک میں شامل ہو جاؤ۔ اور یا مجھ سے تعلقات منقطع کر لو۔ لیکن میں اتنی بڑی قربانی کے لئے تیار نہ تھا۔ چند لمحات کے بعد میں نے اجازت طلب کی۔ اور یہ تھی علامہ سے میری آخری ملاقات۔ اس کے بعد نہ ملاقات کا موقعہ ملا اور نہ سلسلۂ مکاتبت جاری رہ سکا۔

حالاتِ زندگی

عنایت اللہ خان ۲۵ اگست ۱۸۸۸ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد عطا محمد خان ایک با اثر رئیس اور صاحب علم بزرگ تھے۔ ایف۔ اے تک امرتسر میں تعلیم حاصل کی۔ اور پھر فارمن کرسچین کالج لاہور سے ۱۹۰۶ء میں بی۔ اے حساب کی ڈگری، ۱۹۰۷ء میں ایم۔ اے ریاضی درجہ اول میں پاس کیا۔ اور یونیورسٹی کا پچھلا ریکارڈ توڑ دیا۔ پھر کیمبرج یونیورسٹی کے کرائسٹ کالج میں چلے گئے۔ جہاں ۱۹۰۸ء میں آپ ریاضی کے امتحان میں اول رہے اور فاؤنڈیشن سکالر کا خطاب حاصل کیا۔ ۱۹۰۹ء میں ریاضی ٹرائی پوس اس امتیاز سے پاس کیا کہ "سینئر رینگلر" کا خطاب پایا۔ ۱۹۱۱ء میں "ٹرائی پوس" کے دو اور امتحانات (عربی و فارسی) میں شامل ہو کر درجہ اول حاصل کیا۔ ہر ٹرائی پوس کی میعاد تین برس ہوتی ہے۔ لیکن آپ نے صرف چار برس میں تین "ٹرائی پوس" میں امتیازی کامیابی حاصل کی جس پر لندن کے اخبارات نے آپ کو خراج تحسین پیش کیا۔ ۱۹۱۲ء میں آپ انجینئرنگ کے سب سے بڑے امتحان یعنی مکینیکل سائنس ٹرائی پوس میں شامل ہوئے۔ اور نہایت شان سے کامیاب ہوئے۔ اس پر آپ کو دنیا کے مختلف حصوں سے پیغاماتِ تہنیت موصول ہوئے۔ اور اخبارات نے جلی سرخیوں سے آپ پر شذرات لکھے۔

انگلستان سے واپس آئے۔ تو مندرجہ ذیل اسامیوں پر فائز رہے۔

۱۹۱۳ سے ۱۹۱۶ تک اسلامیہ کالج پشاور کے وائس پرنسپل

۱۹۱۶ سے ۱۹۱۷ تک " " " پرنسپل

۱۹۱۰ سے ۱۹۱۹ تک اسسٹنٹ سیکرٹری تعلیمات حکومت ہند۔

۱۹۲۰ سے ۱۹۳۱ تک مرحوم پرنسپل ٹریننگ کالج، انسپکٹر مدارس، تعلیمات، پرنسپل گورنمنٹ اسلامیہ کالج پشاور

آپ کا ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا ... بنا دیا گیا تھا جب آپ ۱۹۳۱ء میں مستعفی ہوئے تو اس وقت آپ کی تنخواہ دو ہزار کے قریب تھی۔

۱۹۳۱ء میں آپ نے خاکسار تحریک کا آغاز کیا۔ جسے ۱۹۴۰ء میں حکومت برطانیہ نے کچل دیا مگر یہ تحریک ۱۹۴۷ء کے بعد بھی زندہ رہی لیکن صرف مسلم لیگ کے تعاقب میں رہی۔ پھر ۱۹۴۷ء کے بعد ختم ہو گئی۔

تصانیف

علامہ کی تصانیف یہ ہیں۔

۱۔ تذکرہ۔ جس کے متعلق ایک جگہ خود علامہ نے لکھا تھا۔

"ہماری کم از کم ... بہت بڑی کتاب قرآن ہے اور ... تذکرہ۔"

جہاں تک قوموں کے فلسفہ عروج و زوال کا تعلق ہے حقیقتاً تذکرہ دنیا میں سب سے بڑی کتاب ہے۔ تحریر اور مواد ... اس کتاب کی تصنیف ... اور ... مؤخر الذکر تذکرہ کے بعد دوسرے درجے پر آتی ہے۔

۲۔ خریطہ۔ جس کا موضوع یہ ہے کہ شاعر دور زوال کی پیداوار ہے۔ جب قوم ترقی کے انتہائی نقطہ پر پہنچ جاتی ہے تو شاعر مفقود ہو جاتا ہے اور جب زوال شروع ہوتا ہے تو شاعر پیدا ہوتا ہے۔ اس نظریہ پر قوموں کی تاریخ سے یقینی شہادت پیش کی ہے۔ کتاب بہت دلچسپ اور فکر انگیز ہے۔

۳۔ اشارات۔ جس میں خاکسار تحریک کا پروگرام اور کچھ ہدایات درج ہیں۔

۴۔ قول فیصل۔ تذکرہ کے رنگ میں لکھی ہوئی ایک ضخیم کتاب ہے جس کا موضوع حرکت و عمل ہے اور اقتباس درج ذیل ہے

"ہمارا مذہب، ہمارا دین، ہمارا اسلام، ہمارا ایمان سپاہیانہ ہے۔ دنیا کو زیر نگیں کرنے کے لئے ... کی طرح منصوبے بناتا ہے ... [illegible] ... مسلمان نہیں ... اگر ... تو مسلمان نہیں ہو سکتے ...... قرآن ... بادشاہ بن کر بیٹھے۔ بادشاہت ہمارا مذہب ہے۔ اور تم نے مذہب ... اس لئے ہم اپنے مذہب پر چل رہے ہیں ...... تم اگر اس مذہب کو پسند نہیں کرتے تو پہلے قرآن، حدیث اور مسلمانوں کی ... تاریخ کو دنیا سے مٹا دو ... اپنا مذہب چھوڑ دو ... [illegible] ... اور خود غرض ... اسلام ... فریب و مکر کا اسلام ہے۔ ہمارا مذہب وہ ہے ... نتیجہ کیا ... [illegible] ... جس کے ایک ... انگریز دنیا کے بادشاہ بنے بیٹھے ہوئے ... بیٹھے ... کھانے والے ہمارے ملا کو کیا ... ہو گیا ہے۔"[1]

---

[1] پوشیدہ ہیں بیچارے مردوں کی نظر سے
شہباز و فلک سیر کے احوال و مقامات (اقبال)

[illegible] مولانا عصمت نے [illegible] کی ماں لے اسے مولانا [illegible] کیا کہ مولانا [illegible] تھے۔ اس لئے [illegible] سے استفادہ کیا کرتے تھے۔ اس لئے پانی ہونے ہوئے بھی [illegible] ...... [illegible] رسول خدا کے ہر چھوٹے سے چھوٹے عمل کو دین و ایمان کا جزو سمجھتے ہو۔ لیکن ...... [illegible] زندگی ان کے وقت قدر اور تیروں سے مسلح رہتے ...... ان کے [illegible] ان کے [illegible] ...... اور [illegible] کو شمشیر [illegible] کرتے ہو ...... اور [illegible] رسول کے ان اعمال کا نشان [illegible] موجود نہیں ...... رسول خدا سے تمہاری محبت کا ثبوت [illegible] کیا [illegible] ہے۔ کہ جب کوئی شخص [illegible] کی سب سے بڑی زندگی۔ اس کی محبت و موافقت اسی حرکت، عمل اور [illegible] اور [illegible] ...... تو تمہارے [illegible] جسم اور [illegible] پکار اٹھتے ہیں [illegible] ہے۔ تمہارے [illegible] کہ تم [illegible] چھتے ہو [illegible] کر کے اپنا [illegible] ہو۔ [illegible] رسول خدا کے [illegible] ہو ...... کیا [illegible] تمہاری [illegible] ...... ایک [illegible] جیسے [illegible] کے [illegible] جنت کا [illegible] ...... تمہاری [illegible] اور [illegible] کی طرح [illegible] وقت [illegible] کر [illegible] سے [illegible] کر دیتا ہے [illegible] ہے۔ نکاح [illegible] باندھ دیتا ہے [illegible] ...... تمہارے [illegible] کی [illegible] ہے۔ نہیں اسلام [illegible] تمہاری [illegible] کی [illegible] کرنا اور [illegible] ہے ...... [illegible] دین کا [illegible] اور [illegible] کے [illegible] میں گھٹنے سے [illegible] ...... [illegible] اقبال [illegible] نبوت۔

یا العجب

(صفحہ [illegible])

۵۔ مولوی کا غلط مذہب۔ چند سو رسائل پر مشتمل ہے۔ جس میں مولوی کے آسان اسلام پر بڑی طرح آتش باری کی ہے۔

لغزشیں — میرے مضمون کا تعلق علامہ کی ادبی، ثقافتی زندگی سے ہے۔ سیاسی زندگی سے نہیں۔ لیکن یہ مقالہ ان کی سیاسی زندگی کو دیکھے بغیر نامکمل تھا۔ اس لئے مجبوراً چند سطریں کچھ لکھنا پڑا۔

عام دستور یہی ہے۔ کہ جب کوئی مرد کامیاب ہو جاتا ہے۔ تو مورخ اسے بہادر، باتدبیر اور ہوشمند ثابت کرتا ہے۔ اور ناکام ہو جائے تو مورخ اسباب ناکامی پر بحث کرنے بیٹھ جاتا ہے۔ کمال اتاترک کامیاب ہوگیا۔ تو مشرق و مغرب کے مورخین نے اس کی جرات۔ شجاعت۔ تدبر اور جانبازی پر طویل مقالے لکھے۔ دوسری طرف نپولین واٹرلو میں شکست کھا گیا تو اس کی لغزشوں پر بیسیوں کتابیں نکل آئیں۔ یہی حال علامہ مشرقی کا ہے کہ آپ نے عین اس وقت جب خاکسار تحریک کی ہیبت سے برطانیہ کا ایوان تدبر کانپ رہا تھا، دو خطرناک قدم اٹھائے۔ پہلا ۱۹۳۹ء میں۔ جب علامہ شیعہ و سنی کے تصادم کو روکنے کے لئے کئی ہزار خاکساروں کے ہمراہ یوپی میں داخل ہو گئے۔ اور وہاں مسلح پولیس سے مقابلہ شروع کر دیا۔ اس تصادم میں درجنوں خاکسار مجروح و شہید ہوئے۔ اور مشین گنوں نے خاکساروں کی ہمت و استقلال پہ کاری ضرب لگائی۔ دوسرا تصادم حکومت پنجاب سے ۱۹۴۰ء میں ہوا۔ اس زمانے میں دوسری جنگ عالمگیر چھڑی ہوئی تھی۔ اور حکومت برطانیہ چار لاکھ خاکساروں کی فوج کو اپنے لئے ایک خطرہ سمجھتی تھی۔ جنگ میں بعض اوقات حکومتوں کے خزانے خالی ہو جاتے ہیں۔ اور ہر سپاہی محاذ پہ جا پہنچتا ہے ضعف و

[illegible] حکومت [illegible] حکومت نے خاکسار [illegible]
[illegible] حادثہ [illegible] کہ قوم مشرقی [illegible]
[illegible] شہید [illegible] نقصان ہوا۔ علامہ گرفتار
[illegible] مساجد میں [illegible] حکومت نے سب
[illegible] اسی طرح [illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible] پاکستان کے لئے ایک مستقل خطرہ بن چکے ہیں۔ [illegible]
[illegible] جھوٹ اور مکر کی لعنت [illegible]
[illegible] اور تین کی دنیا نے دل برباد ہو چکی ہے۔ وہ سب اپنی آزادی کے دشمن اور دولتِ خداداد پاکستان کے بدخواہ ہیں۔ اگر یہ لوگ باز نہ آئے۔ تو دیر و زود اُن سے دولتِ آزادی چھین لی جائے گی۔

فرض کی آواز

میری یہ محکم رائے ہے کہ علامہ مشرقی میں اصلاح و تعمیر کی بے پناہ طاقت موجود ہے۔ ان کا قلم، لاکھوں دلوں میں نئی زندگی پیدا کر سکتا ہے۔ اُن کی مہیب آواز کروڑوں غفلت زدہ نفوس کو خوابِ غفلت سے جگا سکتی ہے۔ اور ان کی آتشیں تقریریں برباد و ویران دلوں میں ایمان و یقین کی بجھتی ہوئی چنگاریاں بھر سکتی ہیں۔

کیا علامہ صاحب اپنے فرض کو پہچانیں گے؟

نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو
ترس گئے ہیں کسی مردِ راہ داں کے لئے (اقبال)

۱؎ میں نے اس تحریک سے پوری ذہنی وابستگی رکھتے ہوئے اپنے خلوص کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ اس کے باوجود یہ باتیں اگر خاطر ہوں تو معذرت خواہ بھی ہوں۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری

شورش کاشمیری

مولانا ابوالکلام آزاد کے پیرایۂ بیان کو ملحوظ رکھیں تو سید عطاء اللہ شاہ بخاری ۱۸۹۲ء مطابق ربیع الاول ۱۳۱۰ھ میں بمقام پٹنہ عالم وجود میں آئے اور نعمت حیات سے متمتع ہوئے۔ ددھیال کی طرف سے عطاء اللہ اور ننھیال کی جانب سے شرف الدین احمد نام رکھا گیا۔ عوام نے شاہ جی والا پیر کہنا شروع کیا، عقیدت مند صرف شاہ جی کہتے ہیں۔ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے انجمن خدام الدین لاہور کے سالانہ جلسہ میں امیر شریعت کا لقب تجویز کیا، خود بیعت فرمائی۔ ان کے علاوہ پانچ سو علماء نے بھی بیعت کی جن میں مولانا ظفر علی خان مدیر زمیندار بھی شامل تھے۔

اسلاف خاندان بخارا سے ہجرت کر کے وارد ہوئے۔ سلطان زین العابدین والی کشمیر کے عہد میں انہیں بڑا رسوخ حاصل تھا۔ ان کی وفات پر خاندان کی شاخیں ہندوستان کے دوسرے مقامات میں بس گئیں۔ ایک شاخ نے گجرات میں اور دوسری نے پٹنہ میں قیام کیا۔ ——— آپ کے والد بزرگوار کی شادی اسی شاخ کے ایک بزرگ حکیم سید احمد شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی دختر فرخندہ اختر سیدہ فاطمہ اندرابی سے ہوئی۔ آپ ابھی بچے ہی تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی رحلت پر والد پٹنہ سے گجرات چلے گئے اور دوسری شادی کر لی۔ شاہ جی ننھیال ہی میں رہے جہاں نانی مرحومہ نے بیٹی کی نشانی سمجھ کر بڑی شفقت سے پالا۔ آپ کے نانا ابا کا مکان شعر و ادب کی محفلوں کا مرکز تھا۔ شاد عظیم آبادی آپ کی نانی صاحبہ سے ملاقات اور روزمرہ کی صحت کے لئے تشریف لاتے تھے۔ ان کی صحبتوں سے آپ نے بھی استفادہ کیا۔ رفتہ رفتہ شعر و شاعری اور زبان و کلام کا ذوق ابھر گیا ———

نانی صاحبہ کی وفات پر آپ نے پٹنہ سے گجرات کا قصد کیا۔ اثنائے سفر میں موانعات پیش آتے رہے۔ ایک آدھ جگہ ملازمت بھی کی۔ کچھ دنوں بنارس میں چاندی کے ورق کوٹتے رہے حتیٰ کہ امرتسر پہنچ گئے وہاں مختلف اساتذہ سے قرآن، حدیث اور فقہ پڑھی۔ لحن خوش الحان اور خوش الحانی کا یہ جوہر آپ کو نانا مرحوم سے ورثہ میں ملا تھا۔ وعظ شروع کیا تو سارا امرتسر گرویدہ ہو گیا۔ پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر جلیانوالہ باغ امرتسر کو گولیوں کا نشانہ بنایا تو ملک میں ایک طوفان کھڑا ہو گیا۔ مولانا داؤد غزنوی کی تحریک پر آپ نے تحریک خلافت میں شمولیت اختیار کی ——— دیکھتے ہی دیکھتے تمام ملک میں آپ کی خطابت کا شہرہ ہو گیا۔ حتیٰ کہ ہندوستان میں یہ بات متفق علیہ ہو گئی کہ اردو زبان میں آپ سے بڑا کوئی عوامی خطیب نہیں۔

شاہ جی اور خطابت ہم نشین ہیں۔ آپ نے تقریباً تیس یا پینتیس برس زندگی کا زمانہ جھونک کر اس دشت پیمائی میں بسر کئے ہیں۔ برصغیر کی تقریباً دو نسلیں

آپ کے [illegible] ہیں۔ لاکھوں آدمیوں کو آپ کی سیاست سے اختلاف رہا۔ اب بھی اختلاف کرنے والوں کی کمی نہیں لیکن کوئی شخص بھی اس سے اختلاف نہیں کرے گا کہ خطابت ان کی لونڈی ہے۔ وہ بولتے نہیں موتی رولتے ہیں — ان کی برجستہ گوئی، ان کی حاضر جوابی، ان کی بذلہ سنجی، ان کی نکتہ آفرینی، ان کی سادہ دلی، ان کی شستہ گوئی سے دلچسپی غرض — ع

ہزاروں خوبیاں ایسی کہ ہر خوبی پہ دم نکلے

خطابت وہ ایک چیز بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا ہے [illegible] فارسی پر بھی [illegible] تک جیسے [illegible] وہ [illegible] خالی نہیں — ملاحظہ ان کا [illegible] اور [illegible] صحافت [illegible] جا سکتا ہے۔ انہوں نے خطابت اختیار نہیں کی بلکہ خطابت نے انہیں اختیار کیا ہے [illegible] سے نکلتی ہیں۔ [illegible] رنگا رنگ تصویر بناتی ہیں۔ ان کی خطابت کو نگارخانے سے تشبیہ دی جا سکتی ہے — ع

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

ایک خوبصورت وجود میں شعلہ فشاں شباب کی جولانیاں ہیں [illegible] ان کی خطابت میں ہیں۔ انہوں نے سیاست [illegible] بھی عشق ہے۔ انگریزوں سے بھی اور مسلمانوں سے بھی لیکن اکثر ہر دو کی منزلیں ان کی تلاش [illegible] سے نہیں رکی [illegible] کے ٹکڑے [illegible] کی تاریخ کے مختلف مقاموں سے ملتے ہیں — اس وقت ان کی عمر پچاس برس کے لگ بھگ ہے اس ساب [illegible] زندگی کا بیشتر حصہ قید و بند میں بسر کیا ہے — ع

[illegible]

— ان کی بھی محفلیں باغ و بہار ہوتی ہیں — ع

اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

نام پر ان بیت [illegible] لیکن وہ بولنے سے نہیں تھکتے اور آپ سننے سے نہیں تھکیں گے۔ [illegible] گھنٹوں [illegible] تقریر کرتے اور لوگ بیٹھے نقش کالحجر ہو کر بیٹھے رہتے۔ ان کا مضمون زلفِ یار کی طرح پیچ در پیچ [illegible] نہیں ہوتا۔

تنہائی سے انہیں سخت نفرت ہے۔ غالباً اس کا تصور بھی ان کے ہاں نہیں۔ [illegible] سب سے بڑا عوامی خطیب ہونے کے باوجود عوام کو کالانعام سمجھتے ہیں، غالباً ان کا خیال ہے کہ [illegible] ان کے مسلک [illegible] نظریہ [illegible] راگ، مرزائی سیاست اور اسلام احمد کی [illegible] عجیب و غریب پہیلیاں ہیں۔

دوستوں پر غایت درجہ اعتماد کرتے ہیں۔ دشمنوں کو درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھتے [illegible] سیاست [illegible] کے بعد اب سیاسیات سے سخت متنفر ہیں، انہیں انتخاب کے نام سے چڑ ہے، غیبت کرنے [illegible] دشمنی [illegible] دوستی پر ترجیح دیتے ہیں۔ چنانچہ اختلافِ فکر و عمل کے علی الرغم مولانا عبدالمجید سالک، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، سید احمد شاہ بخاری اور صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی دوستی کا دم بھرتے تھے مگر جس زمانے میں مولانا ظفر علی خان، ڈاکٹر شیخ محمد عالم، ڈاکٹر سیف الدین کچلو وغیرہ سے اتحادِ فکر و عمل تھا ان سے دل کی رسم و راہ کا کوئی معاملہ نہ تھا۔

جماعت احرار، سیاسیات میں ان کی مساعی "شکست انجام" کا ثمرہ ہے۔ اب تو خیر حکومت ہی نے اسے خلافِ قانون قرار دے رکھا ہے لیکن ایک زمانہ میں احرار کا طوطی بولتا تھا۔ چودھری افضل حق مرحوم، مولانا مظہر علی اظہر، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ایسے لوگ آپ کے دست و بازو تھے۔ اب وہ سبو ٹوٹ چکا، صہبا چھلک گئی، میکدہ اجڑ گیا، آبگینے کے ریزوں میں تلچھٹ باقی ہے اور بقول اقبال ؎

بیا یک لحظہ با عاماں درآمیز — کہ خاصاں بادہ ہا خوردند و رفتند

[illegible] سے بچوں کی ساتھی سے لے کر پھولوں کی [illegible] تک میں وہ حسن و جمال [illegible] کرتے اور اس پر [illegible] ہیں وہ جذبات کے [illegible] جذبات ہو جاتے ہیں۔ انہیں اخلاق حسنہ سے عقیدت تھا انہیں [illegible] کی اخلاقی [illegible] کی اعلیٰ قدروں کے بیان کی [illegible] ہیں۔ [illegible] سیر و سیاحت میں [illegible] لیکن سیر و سیاحت کے عادی نہیں۔ موٹا جھوٹا پہنتے سادہ غذا کھاتے اور جنسی خوشی [illegible] ہیں۔ اب کچھ دنوں سے علالت [illegible] ہے۔ دوستوں کے بچھڑنے اور بچھڑنے کا سخت رنج ہے۔ فرماتے ہیں۔

"میں اب تو کسی بھی شریف نہیں رہا شریف [illegible] سے ملنے میں لطف آتا تھا۔"

[illegible] خوش [illegible] ان کی [illegible] ہیں۔ گو صوفی مشرب ہیں لیکن مزامیر کے قائل نہیں، صرف گلے کے رس سے لطف اٹھاتے ہیں۔ شعر و شاعری سے انہیں ایک گونہ دلبستگی ہے۔ تمام اساتذہ کے چیدہ چیدہ شعر ازبر ہیں ان کے [illegible] میں [illegible] حاصل ہے کہ کسی اور کو نہیں۔ مولانا آزاد کی طرح ان کے حافظہ کو گرہن [illegible] طبیعت شگفتہ ہو تو کسی [illegible] بھی جاتی ہے۔ یہ [illegible]

وہ اپنی ذات میں [illegible] انجمن ہیں

کبھی [illegible] ان کا قلم بھی ان کے دل کی طرح اللہ کے حضور میں جھک گیا ہے۔ چہرہ پر [illegible] کی صبح [illegible] کی کائنات چار آنکھوں سے [illegible] آنکھیں [illegible] زمانہ [illegible] کی تھی۔ [illegible] شمسواروں کا [illegible] قرآن پڑھیں تو [illegible] یاد آجاتا ہے۔ [illegible] یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے الفاظ میں

"دنیا کسی کے لئے کبھی نہیں [illegible] نصف افسانہ [illegible] اور نصف ماتم [illegible] ہے"

اور اب اس مرحلے میں

مختصر حال چشم و دل یہ ہے
اس کو آرام اس کو خواب نہیں

رحمان

اثر صہبائی

مغربی پاکستان کی گورنمنٹ [illegible] ۔ جون ۱۹[illegible] کو [illegible]
[illegible] نے ایک [illegible] بچے تھے [illegible]
کا بڑا صدمہ سہنے [illegible] صرف آپ کی والدہ ماجدہ تھیں اور آپ [illegible] عظیم [illegible]
[illegible] دونوں بچوں کی کفالت اور تعلیم و تربیت [illegible]
تربیت [illegible] نصیب انسانوں کی قسمت میں لکھی تھی۔ [illegible]
شیخ رحمت اللہ صاحب اپنی محنت اور ہمت کا پھل دیکھنے کے لئے زندہ ہیں۔ [illegible]
[illegible] احسانات کا آپ کو بڑا احساس ہے۔ آپ کی والدہ ماجدہ بھی [illegible] دیکھنے کے لئے
۱۹[illegible] تک زندہ رہیں۔

آپ کی تعلیم وزیرآباد کے ایک مشن سکول میں ہوئی۔ بچپن سے نہایت ذہین و فطین [illegible] تھے۔ [illegible]
[illegible] کو بہت قبل از وقت سنجیدہ بنا دیا تھا۔ رحمان صاحب نے ۱۹[illegible] میں میٹرک کا امتحان [illegible] اور صوبہ بھر میں دوم رہے۔ یہ بہت بڑا
امتیاز تھا۔ اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہو گئے۔ آپ کے [illegible] بھائی رحیم [illegible] ساتھ تھے دونوں
بھائی نہایت بھولے بھالے [illegible] اور سنجیدہ تھے دونوں ذہین اور محنتی تھے۔ [illegible] لیکن دونوں کے لبوں پر ایک
لطیف سا تبسم ہر وقت کھیلتا رہتا تھا۔ دونوں میں بڑی دلکشی اور محبوبیت تھی۔ رحمان صاحب [illegible] کے باعث بہت
ممتاز تھے۔ میں بھی ان ایام میں اسی کالج میں [illegible] کا طالب علم تھا۔ اگرچہ ہم [illegible] ایک دوسرے سے کچھ زیادہ متعارف نہ تھے تاہم میرے دل پر
رحمان صاحب کی قابلیت، ذہانت، سنجیدگی اور کردار کی معصومیت کا نہایت گہرا نقش تھا۔

ایف۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد آپ گورنمنٹ کالج لاہور [illegible] ہو گئے اور بی۔ اے میں HONRS' SCHOOL OF MATHEMATICS

مسلیا اور ... ہوئے۔ دو سال کے بعد ریاضی میں بھی ایم۔ اے بھی کیا۔

... کے بعد آپ نے شعر گوئی اور انشا پردازی شروع کی۔ آپ کے انگریزی ... میں کالج کے میگزین ... میں شائع ہوتے تھے۔ انگریزی کے مشہور پروفیسر مسٹر ... رحمان صاحب کی انشا پردازی سے بہت متاثر ہوئے اور آپ کی حوصلہ افزائی فرماتے رہے۔ ... ہے کہ رحمان صاحب کی توجہ اردو ادب کی طرف مبذول کرانے میں بھی پروفیسر صاحب پیش پیش تھے۔ چنانچہ ۱۹۲۱ء تک ... مگر جب آپ ایم۔ اے میں تھے آپ نے اپنی سب سے پہلی نظم ... لکھی۔ ظاہر ہے کہ ... ادبی حیثیت ... ہو سکتی ہے لیکن یہ اپنی تاریخی اہمیت کے اعتبار سے زندہ رہے گی۔

افسوس کہ ہمارے ملک کے بہترین دل و دماغ حکومت کی مشین کے کل پرزے بننے پر مجبور ہیں۔ تعلیمی اداروں میں ... نہیں۔ علاوہ ... کی قدر ... کے برابر بھی نہیں۔ کوئی ادیب آزادانہ طور پر محض اپنے ادب کے بل بوتے پر عزت کی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اور ... فطری ... اضطراری طور پر ملازمت کے امتحانات کی طرف لپکتا ہے۔ چنانچہ رحمان صاحب بھی آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان میں شریک ہوئے اور ۱۹۲۶ء میں بڑے امتیاز کے ساتھ کامیاب ہوئے۔ مسلمانوں میں اوّل اور ہندوستان بھر میں ... نمبر پر رہے۔ مزید تربیت کے لئے انگلستان چلے گئے۔ وہاں عربی اور فارسی بھی ان کے مضامین تھے۔ ۱۹۲۸ء میں ... اپنے وطن عزیز میں واپس تشریف لائے اور مختلف مراحل طے کرتے ہوئے ۱۹۴۶ء میں لاہور ہائی کورٹ کے اور اکتوبر ۱۹۵۵ء میں مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مقرر ہوئے

کچھ ہمت مرداں ہوتی ہے کچھ بخشش یزداں ہوتی ہے
قطرے ہی سمندر بنتے ہیں ذرّے ہی بیاباں ہوتے ہیں

الغرض۔ اس کے بعد رحمان صاحب سے پھر ایک مدت تک ملاقات نہ ہو سکی۔ کئی سال بعد غالباً ۱۹۴۲ء میں کشمیر میں ان سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ میں ان دنوں وہاں وکالت کیا کرتا تھا۔ ایک دعوت میں ہم دونوں اکٹھے تھے۔ سرسری سی ملاقات رہی۔ اس وقت تک بھی مجھے رحمان صاحب کی شعر گوئی کے متعلق کوئی علم نہ تھا۔

۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان پر مجھے بھی کشمیر سے ہجرت کرنا پڑی۔ اس دور پر آشوب کا تذکرہ اب لاحاصل ہے۔ میں بھی انتہائی پریشانی کے عالم میں سیالکوٹ پہنچا۔ نادار اور بیکار در در ... پھرتا۔ آمدنی کی کوئی صورت نہ تھی۔ تمام کاروبار بند پڑے تھے اور اخراجات پہلے کی نسبت زیادہ تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں اپنے آبائی شہر میں بھی ایک اجنبی تھا۔ وکالت کا کام غالباً ... میں شروع کیا۔ طبیعت میں بے کیفی تھی۔ آزردگی اور شکستہ دلی کے باعث کام کاج میں جی نہ لگتا تھا۔ انہی ایام میں رحمان صاحب کی ایک نظم "... زن" ... پڑھی۔ یہ نظم بہت پسند آئی۔ حیرت تھی کہ اتنی پختہ اور دلآویز نظم رحمان صاحب نے کیونکر لکھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ آپ برسوں سے مشق سخن فرما رہے ہیں۔ ان دنوں آپ ہائی کورٹ کی ججی کے علاوہ کسٹوڈین کا کام بھی کیا کرتے تھے۔ میں نے ایک مختصر سا خط لکھا جس میں ضمناً اس وقت کی ذاتی پریشانی کا بھی کچھ تذکرہ تھا۔ چند دنوں کے بعد آپ نے مجھے سیالکوٹ میں ہی اسسٹنٹ کسٹوڈین مقرر فرما دیا۔ رحمان صاحب کی اس عملی ہمدردی کا مجھ پر بہت گہرا اثر ہوا۔ چنانچہ شکریہ ادا کرنے کے لئے میں لاہور پہنچا۔ آپ نہایت تپاک اور محبت سے ملے اور دیر تک گفتگو فرماتے رہے۔ آپ نے اپنی افسریت کا مجھے مطلقاً احساس نہ ہونے دیا۔ شعر و ادب، سیاست اور زندگی کے دوسرے مسائل پر ایک ... اور مخلص یار دوست کی طرح باتیں کرتے رہے آپ کی ہمدردی اور انسان دوستی کا میرا یہ پہلا تجربہ تھا۔

دل بدست آور کہ حج اکبر است — از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

اس کے چند ماہ بعد مجھے سیالکوٹ کا پبلک پراسیکیوٹر مقرر کیا گیا۔ اس تقرر کے سلسلے میں مجھے آنریبل مسٹر جسٹس ایم۔ آر کیانی یا اکرم

سیالکوٹ [illegible] حکومت پنجاب کے شعبۂ قانون سے [illegible] آپ کی [illegible] جب [illegible]
[illegible] سے کبھی کبھی [illegible] لاہور آ جاتے [illegible] رحمان صاحب [illegible]
[illegible] سے بڑی خوشی ہوتا تھا۔ ان سے [illegible]
[illegible] کی ملاقات [illegible] باعث [illegible]
[illegible] زیادہ قریب سے دیکھنے کے موقعے ملتے رہتے ہیں۔

[illegible] شخصیت کے [illegible] آپ [illegible]
[illegible] سے [illegible] محبت سے [illegible] رحمان صاحب کو
[illegible]
[illegible] رحمان صاحب کو بھی [illegible] ملاقاتیں [illegible]
سے بہت زیادہ طویل اور بے تکلف گفتگو کی [illegible]

[illegible]

[illegible]

رحمان صاحب [illegible] محبت [illegible] سے [illegible] اس [illegible]

[illegible]

سیالکوٹ سے آ کر تو علمی اور ادبی موضوعات پر بڑی دلچسپ گفتگو رہی [illegible]
[illegible] خواہش کا اظہار کیا تو آپ نے [illegible] گرمجوشی سے اس کی تائید فرمائی [illegible]
[illegible] آپ کی [illegible] کے باعث [illegible] لاہور میں ہو گئی۔

دوسروں کے ساتھ نیکی اور احسان کرتے ہوئے رحمان صاحب کی انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ دوسرا شخص ان کے احسان کے بوجھ کو محسوس نہ کرے۔ اس قسم کی لطیف خواہش بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔

[illegible] کے بعد مجھے رحمان صاحب کو اور زیادہ قریب سے دیکھنے کے موقعے ملتے رہے۔ رحمان صاحب کی سب سے نمایاں خصوصیت توازن یا اعتدال ہے۔ ان کے دماغ میں ٹھنڈک کے ساتھ ساتھ تیزی اور ان کے دل میں حرارت کے ساتھ ساتھ سلامتی طبع کا نہایت عمدہ رچاؤ ہے۔ میں نے آج تک آپ کو خفگی یا برہمی کی حالت میں نہیں دیکھا۔ ان کی محبت اور گرمجوشی میں بھی رکھ رکھاؤ اور توازن پایا جاتا ہے۔ ان کے یہاں نہ خودی کا نشہ ہے نہ بے خودی کی لغزش۔ علم و حکمت ہے مگر پندار نہیں، خلوص و محبت ہے لیکن [illegible] دل لگی نہیں، محنت و مشقت ہے لیکن یبوست اور تلخی نہیں، ہمدردی اور [illegible] ہے لیکن نمود و نمائش نہیں، [illegible] اور مذہبیت ہے لیکن تعصب اور تنگ نظری سے کوسوں دور۔

یہ عجیب اتفاق تھا کہ میں جب بھی رحمان صاحب کے پاس جاتا عام طور پر ایک معمر اور مفلوک الحال شخص وہاں ضرور آ جاتا اور اپنے آلام و مصائب کی داستان دہراتا رہتا۔ اکثر اوقات وہ باتیں کرتے کرتے رونا بھی شروع کر دیتا۔ بے چارے کو کچھ ثقلِ سماعت کی بھی تکلیف تھی اس لئے خود بھی چیخ چیخ کر باتیں کرتا اور رحمان صاحب کو بھی اپنی طبیعت کے خلاف کچھ اونچی آواز میں جواب دینا پڑتا۔ میں خود بھی اس کی حالت دیکھ کر متاثر ہوتا لیکن اس کی مسلسل اور کبھی ایک ہی بات کا بار بار اعادہ اور چیختا چلاتا مجھ پر کچھ گراں سا گزرتا تھا۔ البتہ رحمان صاحب اس کی رام کہانی بڑے صبر و سکون، تحمل اور

[illegible] سے [illegible] کی تجربات سے اس کا دل بھر جاتا ہے۔ اس شخص کے لئے آپ نے روزگار دیا کیا۔ مشتاق [illegible] بیٹی [illegible] بات [illegible] اس مرکی [illegible] کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ بعد میں [illegible] صاحب نے اس شخص کا کمانی یوں بیان فرمائی [illegible] اور شریف آدمی ہے۔ تقسیم سے قبل ایک معتبر اور خوشحال انسان تھا۔ اب بوڑھا ہے۔ اوار [illegible] ہے۔ اس کا ایک [illegible] کو میں نے ایک جگہ ملازمت دلا دی تھی۔ [illegible] وہ لڑکا ایک حادثے کا شکار ہو گیا اور اب یہ شخص زندگی کے [illegible] مصائب کا پہاڑ اٹھانے کو تنہا رہ گیا ہے؟

[illegible] میرے دل کے رونگٹے کھڑے ہو گئے [illegible] انسان دوستی کا [illegible]

۲۴ اپریل [illegible] کا [illegible] ہے۔ پہلا [illegible] گرمی [illegible] کوئی [illegible] وقت ہوگا [illegible] اور ساتھ [illegible]

آپ نے سپاہی کو آواز دی۔ [illegible] سب سے [illegible]

[illegible] سپاہی [illegible] ہے۔ یہ مقررہ وقت سے [illegible] سکتا ہے؟

[illegible] اس عظیم اور نہایت مخلص [illegible]

آنچہ [illegible] دارست و مست

[illegible] انسان [illegible]

[illegible] دارد

آپ اب [illegible] کا [illegible] کا صفائی [illegible]

[illegible] مجلس کی [illegible]

بزم اقبال اور [illegible] زبان [illegible] وغیرہ وغیرہ

عام طور پر [illegible] ہے۔ [illegible] ہو کر [illegible] کیا جاتا ہے۔

[illegible] مجلس کے کام سے کوئی دلچسپی ہوتی ہے [illegible] ہوتا ہے۔ ایسے [illegible]

فرائض اپنے [illegible] باعث [illegible] سمجھتے ہیں۔ [illegible] صاحب کی [illegible] جھلی [illegible]

[illegible] آپ [illegible] دلچسپی لیتے ہیں اور ان کے پروگراموں کو کامیاب بنانے میں [illegible] صرف کرتے [illegible]

اپنے ذمے لیتے ہیں اس کو [illegible] دیانت داری سے [illegible] مجلس زبان دفتری کے بعض اراکین نے مجھ سے بیان کیا [illegible] صاحب

اصطلاحات کے ترجمے میں پوری پوری دلچسپی لیتے ہیں۔ ترجمے کے الفاظ [illegible] غور و فکر [illegible] اور اکثر اوقات اپنی طرف سے [illegible] تجویز پیش فرماتے ہیں جو عام طور پر قابل قبول ہوتی ہیں۔ [illegible] کا کام [illegible] اور [illegible] ادائیگی کا احترام ہے کہ

اس کے لئے بھی وقت نکال لیتے ہیں۔

"ادارہ الحمراء" (پاکستان آرٹ کونسل) [illegible] میں قائم ہوا۔ [illegible] صاحب اس کے [illegible] فنون لطیفہ کی ترویج [illegible] کے سلسلے میں نہایت عمدہ کام کر رہا ہے۔ چغتائی اور زین العابدین وغیرہ کی تصاویر کی نمائش کر چکا ہے۔ شعر و نغمہ کی بڑی پاکیزہ اور [illegible] محفلیں منعقد ہوتی رہتی ہیں۔

[illegible] ایک [illegible] اقبال [illegible] اردو میں [illegible] شائع ہو رہا ہے [illegible] ہے۔ یہ کتاب [illegible] یہ کتاب [illegible] شائع ہو چکی ہے (اقبال [illegible]) [illegible] تک پہونچایا ہے [illegible] کی طرف سے [illegible] ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔

[illegible] رحمان صاحب کی شخصیت ہے [illegible] جواب [illegible] لیکن رحمان صاحب اپنی تمام [illegible] پر مل جاتا ہے [illegible] سمجھتے ہیں [illegible]

اگرچہ یہ مسلمان [illegible] اسلامی فقہ سے [illegible] افسوس کی حقیقت ہے کہ [illegible] اسلامی قانون کا مطالعہ بھی انگریزی زبان میں ہی کرتے ہیں۔ [illegible] عربی زبان [illegible] اسلامی فقہ کے اصل ماخذ [illegible] رسائی حاصل کر سکیں [illegible] عربی اور فارسی [illegible] واقف ہیں لیکن آپ [illegible] پر ایک [illegible] جس سے [illegible] صبح کے وقت [illegible] سبق پڑھتے ہیں [illegible] کتاب لکھنے کی [illegible] ضرورت [illegible] تحقیق و جستجو [illegible] خواہش رہی ہے کہ میں فقہ کی کتابوں کو انگریزی [illegible] عربی میں پڑھ سکوں۔

آپ [illegible] اسلامی ہیں اور آپ کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ قانون، تاریخ، ادب و فلسفہ اور [illegible] ماہر [illegible] مطالعہ رہتی ہیں۔ میں نے [illegible] بہت سی [illegible] سب سے پہلے آپ کی میز پر دیکھیں۔ [illegible] کے لیے نہیں ہیں بلکہ آپ ہر کتاب [illegible] غور سے دیکھتے ہیں اور ایک بے لاگ رائے قائم کرتے ہیں [illegible] پوری کتاب پڑھنے کے بغیر ہی اپنا [illegible] رحمان صاحب [illegible] گروہ سے الگ ہیں۔ آپ رائے دینے سے قبل پوری کتاب [illegible] فیصلہ [illegible] آپ کی تنقید بے لاگ ہونے کے باوجود ہمدردانہ اور فیاضانہ ہوتی ہے۔

میں نے اپنی کتاب "بامِ رفعت" کا ایک نسخہ پیش کیا اور تبصرے کی خواہش کی۔ ایک دو ماہ بعد آپ سے ملاقات ہوئی تو خود ہی فرمانے لگے [illegible] میں نے "بامِ رفعت" ایک مرتبہ تو پڑھ لی ہے لیکن تبصرہ لکھنے سے پیشتر میں اس کو دوبارہ پڑھنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ اس کے تقریباً ایک مہینہ بعد رحمان صاحب نے ایک سیر حاصل تبصرہ رقم فرمایا۔

در گرم روی سایہ و سرچشمہ نجویم   با ما سخن از طوبیٰ و کوثر نتواں گفت

آپ کو صرف اپنے کام سے کام ہے۔ آپ کی زندگی ایک پُر وقار، خاموش اور تیز دریا کی طرح ہے۔ نہایت خاموشی اور پوری دیانت داری سے اپنے فرائض ادا کرنے میں منہمک رہتے ہیں۔ میں نے آج تک آپ کی زبان سے کسی کی تنقیص یا مذمت نہیں سنی۔ رحمان صاحب کو عیب جوئی کی نسبت عیب پوشی بہت زیادہ پسند ہے اور پھر آپ ہر شخص میں کوئی نہ کوئی خوبی کا پہلو ڈھونڈھ نکالتے ہیں۔ نمود و نمائش، لاف و گزاف، نمود سامانی، خود نمائی اور غیبت کے دھبوں سے آپ کی تصویرِ حیات یکسر پاک ہے۔

[illegible] شاعری کا آغاز ہوا۔ آپ کی سب سے پہلی غزل ۱۹۱۶ء میں رسالہ "نیرنگ خیال" لاہور میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد کسی نے اس کا ترکلی چیز اشاعت کے لئے بھیج دی [illegible] نہیں ہوئی۔ پھر ایک مدت تک آپ کا کلام [illegible] "دستِ صبا" [illegible] "زنداں نامہ" [illegible] بعد دار، جیاد تھا) میں شائع ہوا [illegible] اس کا علم آپ کے بہت [illegible] حاجب [illegible] علامہ اقبال کی فارسی مثنوی [illegible] اردو [illegible] منظوم ترجمہ [illegible] ۱۹۴۳ء کے کچھ جنگ شروع ہو [illegible] اور خاموشی کے [illegible] ایک [illegible] مرحوم کے کلام کے ترجموں کا سب [illegible] جاتے گا [illegible] صرف [illegible] بیا تصنیع، غزو [illegible] اور [illegible] کے جرمی [illegible]

آپ ۱۹۵۰ء [illegible] پنجاب یونیورسٹی [illegible] مقرر ہوئے [illegible] INTERNATIONAL CO[illegible] [illegible] کے اجلاس میں شرکت کے لئے قاہرہ [illegible] THE ORIENTALIST [illegible] کی [illegible] بہت [illegible] مجھے اس کا علم [illegible] وقت ہوا [illegible] اس مضمون کے سلسلہ میں [illegible] آپ سے تفصیلی ملاقات [illegible] اکثر احباب کو اس کا علم [illegible] ہوا ہوگا [illegible] آپ نے [illegible] کے ساتھ [illegible] البتہ [illegible] میں تو آپ نے [illegible] انکسار [illegible] سے [illegible] ہوں!

آں کسانی [illegible] کردہ اند [illegible]

ریحان صاحب کی روزمرہ زندگی میں [illegible] مزاج ہے [illegible] لباس [illegible] کا کرتہ اور [illegible] کی شلوار استعمال کرتے ہیں [illegible] گفتگو [illegible] عام طور پر [illegible] میں بھی پنجابی میں ہی گفتگو ہوتی ہے۔ کھانا [illegible] سادہ اور [illegible] ہوتا ہے [illegible] کے پابند ہیں۔ تلاوتِ قرآن روز [illegible] ماہِ رمضان میں ایک مرتبہ قرآن [illegible] کرنے میں [illegible] کا شوق ہے اور [illegible] التزام سے کھیلتے ہیں [illegible] کھیل [illegible] یہی وجہ ہے کہ آپ کی صحت ماشاء اللہ بہت اچھی ہے [illegible] زندگی [illegible] تمام تر [illegible] سادگی ہے [illegible] لیکن [illegible] حقیقت میں ریحان ایک [illegible] مسلمان ہے۔

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم [illegible] از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

شرافتِ نفس اور خلوص و وفا آپ کے کردار کی نہایت ہی تابناک خصوصیت ہے۔ ۱۹۲۳ء میں آپ کی شادی آپ کے ماموں جناب شیخ [illegible] صاحب کی لڑکی سے ہوئی۔ افسوس کہ یہ رشتہ نہایت ہی [illegible] ثابت ہوا۔ ۱۹۳۱ء میں آپ کی رفیقۂ حیات ہمیشہ کے لئے آپ سے جدا ہو گئیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اس وقت آپ [illegible] اس [illegible] کی تعلیم و تربیت [illegible] اور [illegible] پر قائم رہے لیکن اس جوان [illegible] آتشیں [illegible] چھوڑ کر [illegible]

اس دور میں آپ نے صرف دو نظمیں لکھیں [illegible] اگرچہ ان کی [illegible] معیاری نہیں [illegible] تاریخ ان میں سنائی دیتی ہے۔ صرف ایک شعر اور وہ بھی فارسی کا [illegible] شعر [illegible]

اے تو ز بنیوز زندگی [illegible] [illegible] از ما [illegible] کجا آمد [illegible]

[illegible] صاحب [illegible] ۱۹۲۲ء میں [illegible] خدا کی قدرت [illegible]
[illegible] دوسری شادی کرنے کی ترغیب دیتے ہیں [illegible] آپ [illegible] تیسری شادی کر لی [illegible]
[illegible] لیکن آپ [illegible] [illegible]
[illegible]
[illegible] آپ [illegible]
[illegible] شکر [illegible]

رحمان صاحب کی [illegible] [illegible] آپ کے
[illegible] محنت کے ساتھ [illegible] رحمان [illegible] اختیار کر لیا ہے
جب آپ واپس [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] مطالبات کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے تھے [illegible]
[illegible] یونیورسٹی [illegible]
سامنے جھک جاتے تو یونیورسٹی کے [illegible] اگرچہ [illegible] آپ [illegible] شہرت اور
[illegible] حاصل کر لیتے اور رحمان زندہ باد کے بھی چند نعرے بلند ہو جاتے۔
دیانت داری اور فرض شناسی رحمان صاحب کو اپنے والد مرحوم سے وراثت میں ملی ہے۔ آپ کے والد محکمہ پولیس میں ملازم تھے۔ تنخواہ کچھ
زیادہ نہ تھی اور کوئی ذریعہ آمدنی نہ تھا۔ بالائی آمدنی سے پرہیز کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کے [illegible] بیوی بچوں کے لئے آسائش کے سامان مہیا
نہ کئے جا سکتے تھے۔ آپ کی بیوی کبھی تنگدستی کا گلہ کرتیں تو آپ فرمایا کرتے "کیا میں ان بچوں کے لئے حرام کا لقمہ مہیا کروں؟"
رحمان صاحب نے فرمایا "ہماری والدہ ماجدہ ہمیں اکثر والد مرحوم کی اس قسم کی باتیں سنایا کرتی تھیں اور میں ان باتوں سے بچپن میں بہت
متاثر ہوا کرتا تھا۔ ایک شریف، ایماندار اور غریب باپ حقیقت میں رحمت الہیٰ ہے! انسانی سیرت اور کردار کی تشکیل و تکمیل ایسے ہی ماحول میں
ہوتی ہے۔"
یہ فقرے رحمان صاحب نے بڑے رقت انگیز لہجے میں ادا فرمائے۔

میں نے پوچھا "آپ کا محبوب شاعر کون ہے؟" فرمایا "میرا محبوب ترین شاعر اقبال ہے۔" علامہ مرحوم سے آپ کو بے پناہ عقیدت اور محبت
ہے۔ مرحوم کے کلام پر آپ کی بڑی گہری نظر ہے۔ بچپن سے پڑھ رہے ہیں۔ خدا معلوم ایک ایک شعر کتنی کتنی مرتبہ پڑھ چکے ہیں۔ آپ کی اس والہانہ
عقیدت کا زندہ جاوید ثبوت "ترجمان اسرار" (اسرار خودی کا منظوم ترجمہ) ہے جو کئی برس کی محنت کا نتیجہ ہے۔ اقبال کے بعض شاہین بچے "آخر مرحوم کے
لئے بدنامی کا باعث ہی ثابت ہوئے لیکن رحمان کی زندگی میں اقبال کی تعلیم متشکل نظر آتی ہے۔ رحمان کے کردار کی تعمیر میں اقبال کے افکار کو بہت دخل ہے۔

"شاعری کے متعلق آپ کا کیا نظریہ ہے ؟" میں نے دوسرا سوال کیا۔

فرمایا: "شاعری کے متعلق میرا نظریہ وہی ہے جو علامہ اقبال مرحوم نے پیش کیا ہے۔ ادب میں فکر، اخلاق اور روحانی اقدار کی بڑی اہمیت ہے۔ میں اپنا نظریہ "بام رفعت" کے تبصرے میں وضاحت کے ساتھ بیان کر چکا ہوں۔"

"بام رفعت" کے تبصرے میں آپ یوں رقمطراز ہیں: "روایتی شاعری جدید قسم کی بھی ہو سکتی ہے اور قدیم طرح کی بھی۔ پرانی روایتی شاعری معروف ہے لیکن نئی روایتی شاعری کی صورت کسی حد تک ترقی پسندی کے غبار نے دھندلی کر دی ہے۔ میرے نزدیک ہر وہ شاعرانہ تصنیف جو خلوص اور احساس پر مبنی نہ ہو بلکہ محض ایک مقبول عام رنگ کی پیروی میں روا رکھی گئی ہو روایتی ہے، خواہ اسے گل و بلبل کے افسانے کی شکل دی گئی ہو اور خواہ "مزدور" یا "میدانِ جنگ" کے عنوان سے جدید رومانوی انداز میں اسے پیش کیا گیا ہو۔ ایسی شاعری درحقیقت شاعری نہیں ہوتی بلکہ قدماء کی اصطلاح میں محض "قافیہ پیمائی" اور جدید طرز کی نظم کے پس منظر میں "آہنگ آرائی" کہلا سکتی ہے۔ حقیقی شاعری وجود میں نہیں آتی جب تک کہ خارجی واردات جذبات کی بھٹی میں پگھل کر قلبی کیفیات میں تبدیل نہ ہو جائیں۔ دوسرے لفظوں میں اس قسم کی شاعری میں فوقی تجربہ کا ضمناً یا براہ راست شامل ہونا چاہیئے۔"

حال ہی میں "حلقۂ ارباب ذوق" کے سالانہ جلسے کے موقع پر رحمان صاحب نے ایک نہایت ہی مختصر عالمانہ، پرمغز اور بصیرت افروز خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا ہے۔ چند اقتباسات بلا تبصرہ پیش کرتا ہوں:

"ادب بحیثیت ادب کا فرسودہ نظریہ اس حقیقت کی روشنی میں مریضانہ ٹھہر سکتا ہے۔"

"میری نظر میں تقلیدی اور بے روح ادب جسے مصنف کے ایقان و اخلاص نے جلا نہیں دی محض ہوائی ہے خواہ روایت گرانی ہی کیا ہے۔"

"اس طبقے کے ادیبوں کا ایک گروہ تحت الشعور اور لاشعور کے گڑے مردے اکھاڑنے کو ہی ادبی خدمت سمجھتا ہے۔ اسی ذریعہ سے عریانی، فحاشی، جنسی کج روی اور رسوا زبانی نے جدید ادب میں راہ پائی ہے۔ افراط و تفریط نے نوبت یہاں تک پہنچائی کہ بعض من چلوں نے بغاوتِ محض کو اپنا شعار بنا لیا۔ سماج سے بغاوت، قانون سے بغاوت، مذہب و اخلاق سے بغاوت، خدا سے بغاوت، ہر بلند آدرش سے بغاوت۔"

"عظیم ادب وہی ہے جس کے پس منظر میں ایک صحت مند نظریۂ حیات، ایک جیتا جاگتا نصب العین کارفرما ہوتا ہے۔"

روایتی ادب کے علمبرداروں کے متعلق فرماتے ہیں:

"یہ لوگ محض دیرینہ یا جدید روایت کی لکیر پیٹ رہے ہیں۔ ان کے پاس کوئی خاص سرمایۂ خیال نہیں۔ ان کا تصورِ ادب سراسر میکانکی ہے، ان کی جدت یا ندرت محض الفاظ کے الٹ پھیر کا نام ہے۔ ان کے ہاں صورت ہے معنی نہیں، جسم ہے جان نہیں، انہیں ایک طرح سے کاروانِ حیات کا پسماندہ غبار کہئے۔"

میں نے پوچھا: "آپ کے نزدیک زندگی کا بہترین نصب العین کیا ہے؟"

فرمانے لگے: "انسان کے لئے بہترین نصب العین وہی ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے۔ اقبالؒ نے اسلام کی نہایت دلکش مگر حقیقی تصویر پیش کی ہے۔ اسلام کی موجودگی میں ہمیں کسی دوسرے نظامِ حیات کی حاجت نہیں۔ اگر ہم لوگ تخلقوا باخلاق اللہ کو پیشِ نظر رکھیں اور سرورِ کائنات فداہ امی و ابی کے اسوۂ حسنہ کو اپنے لئے مشعلِ راہ بنائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم میں پھر صدیقؓ و عمرؓ اور عثمانؓ و علیؓ پیدا نہ ہوں۔ خود اعتمادی اور خدا اعتمادی ہی زندگی

[illegible] ہر انسان کا فرض ہے [illegible] اشتعال کے اثر میں ہے۔ [illegible]
[illegible] صاحب کے [illegible] سے [illegible] بیانی یا [illegible] صاحب کی [illegible]
[illegible] زندگی [illegible] کا ایک سبق آموز [illegible] ہے۔
[illegible] کتاب سے آپ کا سب [illegible] ناز کیا [illegible] پایا گیا۔
[illegible] قرآن پاک سے۔ میں نے اس مقدس صحیفے کو بار بار پڑھا ہے [illegible]
[illegible] ہے زندگی کے [illegible] ہے
[illegible] زندگی [illegible] اور [illegible] اخلاق [illegible]
[illegible] ایک روشن شمع ہے۔ [illegible] اس شمع [illegible] روشنی [illegible]

اسی [illegible] میں پہلے بھی وہ ادیب اور ادیب پر [illegible] ہو گزرے ہیں۔ [illegible] ایک شاعر تھے
اور وہ سب شاعر تھا اور نقاد۔ [illegible]
[illegible] اکثر شاعروں [illegible] تھے۔ بڑے [illegible] خوش [illegible] بزرگ تھے۔ [illegible]
[illegible] دوست اور ادیب پرور تھے۔ آج [illegible] رحمان صاحب کی [illegible]
[illegible] مختلف پہلوؤں کے سامنے [illegible] ہیں معمولی اختلافات سے قطع نظر رحمان صاحب [illegible] صحیح [illegible] مرحوم کے
جانشین ہیں۔

رحمان صاحب ایک اچھے ادیب، بہت اچھے جج اور نہایت ہی اچھے انسان ہیں۔ جب بھی رحمان صاحب کے جاننے والوں میں ان کا ذکر چل پڑتا ہے تو میں اکثر احباب کو ان کی تعریف میں رطب اللسان پاتا ہوں۔ ہر شخص کوئی نہ کوئی [illegible] واقعہ سناتا ہے جس سے ان کے [illegible] کی مانند جھلکتی ہے اور میں اپنے حسنِ انتخاب پر خوش ہو کر زیرِ لب یہ شعر گنگناتا ہوں ؎

ہر کس کہ دید روئے تو بوسید چشمِ من
کارے کہ کرد دیدۂ من بے نظر نہ کرد

حمید نظامی

شورش کاشمیری

پہلی دفعہ حمید نظامی سے ملئے تو آپ کہیں گے یہ باور کرنا محال ہوگا کہ یہی وہ شخص ہے جس کا وجود قصر حکومت کے شہزادوں سے لے کر کافی ہاؤس کے کھنڈروں تک میں زیر بحث رہتا ہے، جو اپنے اخبار میں واشگاف ہونے کے باوصف اپنے وجود میں چھپا رہتا ہے، جس سے وزرا خوف کھاتے اور صحافی حسد کرتے ہیں، جس کی ذات پر پچھلے زیادہ دس برس میں اتنی بے تحاشا تنقید کی گئی ہے کہ اس تمام مواد کو جمع کر لیں تو روایتی بھٹیارخانوں کی بیہودہ آوازوں کا ایک دفتر تیار ہو سکتا ہے، لیکن اس نے اپنے بے حوصلہ نقادوں، کرم فرماؤں اور مخالفوں کی ان بوچھاڑوں کو درخور اعتنا ہی نہیں سمجھا اور حتی الامکان اس بے پرواہی سے انہیں نظر انداز کیا ہے جیسے وہ کوئی وجود ہی نہیں رکھتے ہیں۔ جن حکمرانوں سے اس کی ٹھن گئی ان کا ہر جہت سے تعاقب کیا۔ بالآخر بیشتر چاروں شانے چت ہو گئے۔ کتنوں نے گھٹنے ٹیک دیے اور اکثر اپنا تے نظر آنے لگے۔ اس نے ہر معرکہ میں جم کر مقابلہ کیا، ہمیشہ تنہا لڑا، بارہا زخم بھی کھائے لیکن پیٹھ پر نہیں سینہ پر، کئی دفعہ موت و حیات میں ایک ہی قدم کا فاصلہ رہ گیا۔ غنیم نے شادیانے بجائے لیکن ان کا ایک ققنس کی طرح وہ اپنی خاکستر سے زندہ ہو گیا۔ اس کی دوستی محدود ہے لیکن جس سے ہے چند اصولوں کے تحت ہے اور پکی ہے، دوست اس پر اعتبار کرتے اور اس کی رفاقت میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔

—— دشمنی وہ سخت ہے بلکہ سنگدل، اس کا تیر ہمیشہ نشانہ پر بیٹھتا ہے۔ کوئی وار خطا ہو جائے تو وہ اس سے پژمردہ نہیں ہوتا بلکہ تازہ دم ہو کر دوسرا وار کرتا ہے۔ ایک وار، دو وار، تین وار —— وار ہی وار —— آخر وہ پالا مار ہی لیتا ہے۔ اس کی دوستی میں عزت ہے لیکن اس کی دشمنی میں ذلت۔ اس نے حریفوں کے لئے اپنے لغت سے عفو کا لفظ ہی نکال دیا ہے۔ کسی مرحلے میں بھی وہ دشمنوں سے رحم یا تلطف کا عادی نہیں۔ وہ قبروں تک پیچھا کرتا ہے، اس کے ہاں حریفوں کے کفن بھی نوچ لینے کی چیز ہیں۔

—— ہندوستان میں پاکستان کی جدوجہد کے دو بڑے صحافی سرخیل تھے۔ انگریزی صحافت میں الطاف حسین، اردو اخبار نویسی میں حمید نظامی —— حمید نظامی نے ہمیشہ اپنی اصول جنگ کے تحت ہر حربہ استعمال کیا، نتیجہ معلوم کہ میدان اس کے ہاتھ رہا —— جس سے تاریخ پاکستان کی صحافت میں اس کا نام علامت (SYMBOL) بن گیا۔ تاآنکہ اس نے اپنے گرد پاکستانی اذہان کی ایک بڑی کھیپ جمع کر لی جو میدان جنگ ،

میں قوت برداشت بھی کم ہو گئی ہے۔ انقلاب کے بعد بعض لوگ اقتدار سے جھک گئے۔ بعض نے ساتھ چھوڑ دیا۔ لیکن وہ اپنے ساتھیوں سے بے نیاز نہیں ہوئے۔ بلکہ بعض ان کی ملاقات میں تو خاصے ہو گئے۔

اس عرصہ میں مرحوم لیاقت علی، خواجہ شہاب الدین اور میاں ممتاز دولتانہ ——— یہ تینوں حضرات تھے جن سے ان کی شناسائی کا آغاز ہو گیا۔ سب کیا ہوا تھے وہ ایک اخلاقی ضرورت تھی جیسے ان کے الفاظ میں ——

پھر آئی تیوری کی ٹیس اب حادثے سا ہی نہیں

پھر بھی بھولی بسری سے دوستی جاتی رہی

معلوم کہاں سے آیا اس سے پہلے نظر نہ آتی ہیں خود دو ٹوک سرگرمیوں نے جو کچھ ان بڑے بیت کی طرح اس کے دور ہونے لگے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ وہ خود جو کچھ کر لیا لیکن اس وقت تو سب کر جاتی رہی۔ سامنے صاف ملاقات الگ ہو یا اس سے پہلے میں ادب ہوا۔ جب میں لاہور آیا تو صاحب نہیں بلکہ خواجہ شہاب الدین کو اس حقیقت سے آگاہ بھی نہیں ہوا کہ وزیر رہنے کے دوران میں کس کا کیا حال رہا ——

خواجہ صاحب کا ایک خط حمید نظامی کے نام حال ہی میں چھپ چکا ہے جس میں وہ سب فرماتے ہیں

"یہاں جہاں میں بیٹھا ہوں وہاں دل اور دماغ بری طرح سے فرسودہ ہو چکے ہیں۔ وہ مصروفیت سے تنگ آ چکا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں اکتا گیا ہوں۔ مختصر وقت"

یہ ادھر کی ضرورت میں بیٹھنے کی چیز ہے

میاں ممتاز دولتانہ سے ملاقات بھی ہوئی۔ انہوں نے مدد لینے میں کوئی عار نہ سمجھی۔ وہ معاملہ ان سے ختم ہونا نہ تھا کہ

سانس بھی تو سنبھل میں جو آنے جانے

اور ہوا کار بستہ دل نے جانے مانے

حلقہ یاراں میں بھی حمید نظامی پر نوازش کی۔ گو وہ ان کا دور وزارت ان کے نئے کنٹ ہولڈر تک ایک اخبار بند ہو گیا۔ انہوں نے بند تو کیا لیکن منسوخ کر دیا۔ چھاپنے سے انکاری۔ مجموعہ انتخاب "جناب غالب رحمت اللہ علیہ" کا تذکرہ رہا۔ تاشاؤ لیکن حمید نظامی کے معمولات میں کوئی فرق نہ آیا۔ وقت پر اٹھنا، وقت پر لکھنا، وقت پر کھانا، وقت پر پڑھنا، وقت پر سونا ——— ہفتے میں دو بار سینما، بعض اوقات ڈھلتے دن سیر و پول پہنچ جانا۔ ساتھیوں میں گپ شپ، ہنسنا کھیلنا اور گھر چلے جانا ——— دوستوں سے صرف دوستی کی بات کرنا "اور بس ——— اس سارے سفر میں انہوں نے کبھی دوستوں کو اپنی افتاد صبح و شام سے آگاہ نہیں کیا۔ یہ بار بار دوسرے تاریخوں کے ساتھ ان کے خاص احباب کو بھی اخبار ہی سے معلوم ہوتا تھا کہ گزشتہ روز نوائے وقت پر کیا گزری؟ "ہمارا" کیوں بند ہوا؟ اور "نوائے پاکستان" کیسے از مطبوعات نوائے وقت ہے۔

پھر ان کا یہ "رویہ" اپنے احباب ہی سے نہیں بلکہ اپنے گھر والوں سے بھی ہے۔ گورنر راج کے زمانے میں ان پر مقدمہ دائر کیا گیا کہ بغیر لائسنس کے پستول رکھا ہے، وارنٹ نکلے، گرفتاری ہوئی، ضمانت لی گئی ——— اگلے دن اخبار میں چھپا تو اہلیہ نے حیرت سے استفسار کیا۔ انہوں نے جو جواب دیا ملاحظہ ہو:

"اس کا گھریلو معاملات سے کوئی تعلق نہ تھا اور اب آپ نے اخبار میں پڑھ ہی لیا ہے"

ان کا کہنا ہے کہ وہ اپنے مصائب میں جب اپنی بیوی کو بھی حصہ دار نہیں بناتے جو حقیقتاً ان کی شریک حیات ہے تو پھر بھلا وہ ان لوگوں پر اپنے مصائب کا کوئی بوجھ کیونکر لاد سکتے ہیں جو محض ان کے شریک سخن ہیں ——— وہ انتہائی گہرے ہیں۔ ان کے ہونٹوں سے کسی راز کا نکلنا

[illegible] شکل ہے ان کی آنکھوں [illegible] چشمے کے پیچھے سیاہ خط پڑے رہتے ہیں جیسے کوئی بات [illegible] ——— [illegible]
کی نظروں سے اس [illegible] ہے کہ مدتی [illegible] کچھ نہیں چھپا کر کتاب ہی کیا ہے۔ انہیں غصہ آتا ہے [illegible] [illegible]
پہلی اور خیالات پر بھی۔ اس وقت وہ [illegible] لگتے ہیں؛ ان کے صاف ستھرے ماتھے پر سلوٹیں پڑ جاتی ہیں۔ اگر [illegible]

یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

اور عموماً "سفیروں" ہی کے گریبان ان کے ہاتھوں چاک ہوتے ہیں ——— آج جس گروہ کے ہاتھ میں ملکی سیاست کی باگ ڈور ہے اس کا خمیر رعیت کی خاک میں گندھا ہے۔ ان لوگوں نے انگریزی عہدِ حکومت میں نہ صرف اپنے ہی خاندانوں کو پروان چڑھایا بلکہ اپنے آپ کو [illegible] سمجھا۔ ان کی ساری تاریخ، جمہور المسلمین پر حکومت کرنے کی تاریخ ہے۔ بالخصوص صوبہ پنجاب کے شہ دستانی انگریزوں کے خود کاشتہ پودے ہیں۔ حمید نظامی ان کے خلاف پبلک ایک زبردست چیلنج ہے۔ اس نے زندگی کی مراعات ورثہ میں حاصل نہیں کیں بلکہ جوڑ جوڑ کر بنائی ہیں؛ اس نے معاشرہ کے خلاف جدوجہد کر کے اپنی راہ پیدا کی اور موجودہ مقام حاصل کیا ہے۔

سلطان عبدالحمید نے جزل خلافت کے زمانہ ابتدا، بیان میں کہا تھا۔ اگر خلافت کا تخت مجھے دوبارہ مل جائے تو میں سب سے پہلے تک کے اخبار نویس کو دار پر لٹکا دوں گا ——— یہاں جن خاندانوں کے ہاتھ میں عنانِ اختیار ہے ان میں سے کچھ افراد کی ایک [illegible] اس کی دوست بھی ہے اور وہ ہر جرأت سے بے پروا ہو کر دوستانہ روابط نبھا رہا ہے لیکن ان کے اندرونی خیالات میں ما شاء اللہ طبقاتی [illegible]

جہاں تک اس کے سیاسی خیالات کا تعلق ہے ظاہر ہے کہ وہ تحریک پاکستان کے افق ہی سے طلوع ہوا ہے۔ اس میں اور امرا کے ان خیالات کا کوئی بنیادی ٹکراؤ نہیں، جو ٹکراؤ ہے وہ طبائع اور طبقات میں ہے اسی لئے ارباب اختیار کی انا اس سے ٹکرائی، اور وہ بھی زیر کرنے میں۔ لیکن نظامی ان کی طبقاتی نخوتوں کے خلاف ایک تنقیدی نعرہ ہے۔ وہ غریبوں کے بیٹوں کا انتقام ہے، جو بڑی مدت کے بعد پنجاب کے باقتدار خاندانوں سے برسرِ پیکار ہے ؎

حفیظ اہلِ زباں کب مانتے تھے
بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں

اس نے اپنے فکر و نظر کو ایک خاص سانچہ میں ڈھال لیا ہے اس کی بعض کاوشوں میں اونچے طبقے کے عادات کی ملاوٹ ہے۔ اس خصوصیت نے اس کے گرد و پیش بعض ایسے عناصر پیدا کر دیئے ہیں جو محض تنورِ شکم کی خاطر اس پر گالیوں کا جھاڑ باندھتے ہیں۔ اس وقت اس کی عمر ۳۹ اور ۴۰ سال کے درمیان ہے۔ اس نے زندگی کی عمارت اٹھانے میں ایک ایک اینٹ خود چنی ہے، وہ ان لوگوں میں سے نہیں جو اپنے خاندانوں کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں بلکہ اس کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جن کی وجہ سے ان کا خاندان پہچانا جاتا ہے۔

اس نے اپنے بل پر تعلیم حاصل کی، اسلامیہ کالج لاہور سے بی۔ اے اور ایف سی کالج لاہور سے ایم۔ اے انگریزی کیا۔ پڑھاتا رہا، کماتا رہا اور پڑھتا رہا ———

اس کو صحافی بننے کا شوق شروع سے تھا، اس کی طبیعت کے دروازے ادب و سیاست دونوں کے لئے کھلے تھے، ابتداً مختلف رسائل میں لکھتا رہا۔ "شیرازہ"، "ہمایوں" اور "ادبی دنیا" میں طبعزاد افسانے، ہلکے پھلکے مضامین اور خاکے لکھے۔ کئی تراجم بھی چھپے۔ آخر کار اس کی طبیعت کا ایک مرجع بن گیا، ادھر سیاسیات کا ایسا چسکا پڑا کہ جب طالب علمی میں ۱۹۳۷ء میں مسلمان طلبہ کی سٹوڈنٹس فیڈریشن کا سنگِ بنیاد رکھا اور صدر منتخب ہو گیا۔ ۱۹۴۰ء میں صدارت سے علیحدگی اختیار کر لی، پھر ۱۹۴۲ء میں قائداعظم کے ایما اور دوستوں کے اصرار پر صدر بن گیا۔ اسی اثنا میں کالج کے مباحثوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ زبان پنجابی تھی، خیالات تقریباً منجھے ہوئے تھے۔ بیسیوں مباحثوں میں شرکت کی اور کوئی پندرہ کے قریب انعامی کپ بھی۔

حاصل کرنے [illegible] بعد [illegible] ۱۹۴۷ء [illegible] کیا تو صیغت کا سوال سامنے تھا۔ کچھ عالمی کمال [illegible]
[illegible] محسوس ہوتا تھا۔ [illegible] ایک دوست کے لئے جو آل [illegible] پاکستان [illegible] اوبیات [illegible]
[illegible] ایک [illegible] کر [illegible] آیا اس نے [illegible] دیا۔ اپنے نام سے چھاپا چنانچہ اب تک [illegible]
[illegible] ہو چکا ہے۔

[illegible] کو جب [illegible] وقت [illegible] ایک شخص [illegible] [illegible] قائد اعظم [illegible] اور
[illegible] نامہ ہو گیا پاکستان کے لئے [illegible] نے [illegible] نہیں [illegible] کی شہرت کا
[illegible] اس سے پہلے [illegible] کا [illegible] زیادہ [illegible] تھا مسلمانوں میں صحافی [illegible] ایڈیٹر کے لئے شاعر و
[illegible] ہوتا تھا [illegible] وقت [illegible] سمجھے گئے یا جنھیں [illegible]
[illegible] کے باعث [illegible] اضافی [illegible] تھا [illegible] حیثیت [illegible]
انگریزوں کی برتری سے انگریزی [illegible] اور اردو اخبارات سے [illegible] اور اخبار
[illegible] خاص [illegible] تھے [illegible] وقت نے اس [illegible] پاکستانی انگریزی
[illegible] یا شوق سے پڑھا جاتا ہے [illegible] کے حامی و مخالفت کا [illegible]
یا تعریف کرنے کے لئے اس کو ضرور پڑھتے ہیں [illegible] سیاسیات میں [illegible]
[illegible] پیدا کر لیتا ہے [illegible] تنقید [illegible] ایک عام بحث شروع ہو جاتی ہے — جس سے ایک خاص [illegible] ہو گیا ہے
اور [illegible] پنجاب کے اضلاع میں اس [illegible] کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

[illegible] وقت [illegible] حمید نظامی لازم و ملزوم ہیں، دونوں کی شخصیت [illegible] دوسرے میں پیوست ہے [illegible] دوسرا الگ نہیں سکتا۔
اس کی [illegible] پسند و ناپسند بھی شدید ہے بلکہ سنگین، اسی طرح اس کے مخالف و موافق بھی افراط و تفریط [illegible] — اس کے مخالفوں کی
سب سے بڑی تعداد اسی کے طبقے میں ہے۔ اس کا واحد موجب یہ ہے کہ وہ ان کے طبقے کا [illegible] سے آگے نکل گیا ہے [illegible] اس کے اداریوں میں
[illegible] نام کو نہیں ہوتی۔ چھوٹے چھوٹے فقرے اور [illegible] بات [illegible] کی ادبی حیثیت کمزور ہو سکتی ہے لیکن اس میں ایک
[illegible] ہوتی ہے جس سے ضارب و مضروب دونوں لطف لیتے ہیں۔

اکثر لوگوں میں اس کے متعلق یہ خیال عام ہے کہ وہ مغرور ہے لیکن وہ مغرور نہیں [illegible] عادی ہے، عام لوگوں میں غلط ملط نہیں
ہونا۔ اس کا خیال ہے کہ ہر انسان اس قابل نہیں ہوتا کہ اس سے [illegible] پیدا ہو [illegible] جو لوگ کسی نہ کسی وجہ سے عام ہو جاتے ہیں [illegible]
کی طرح تقسیم ہو کر اپنی عزت کم کر بیٹھتے ہیں۔
وہ ان [illegible] میں بیٹھنے کے بجائے ان کی گالی کھانے میں عزت کو زیادہ محفوظ سمجھتا ہے۔
اور حمید نظامی کی ساری تصویر الفاظ کے انہی [illegible] ہے۔

آغا شورش کاشمیری

محمد وارث کامل (بی اے)

ناموروں کی وہ تصویریں جو دیکھنے [illegible] ذرا نیچے یا اونچی ہوتی ہیں کہیں ناک کی سیدھ میں کہیں ہونٹوں کی کہانی ہونٹوں پر ہوتی ہے۔ آج سے تقریباً [illegible] سال پہلے کسی جوان رعنا کے خرام ناز کو تکنے کا شوق [illegible] ہوتی تھی۔ یہ نوجوان سے میری آنکھیں نہ صرف ایک دو بار بلکہ بار بار چار ہوئیں [illegible] کچھ تو اپنی مرادوں — وحشت اور کچھ اس وجہ سے کہ اس جوان رعنا کی عقیدت [illegible] کسی راہ و رسم یا کسی طرح کے میل ملاپ کی اجازت بھی نہیں دیتی تھیں۔ میرے اس جوان رعنا کے درمیان اجنبیت کی دیواریں حائل رہیں۔ یہ مقدر تھا [illegible] یہ نوجوان سب کون! نظر کے آئینے پر اس نوجوان کے چہرے کے جو نقش ابھر آئے تھے میں تصور میں ہی کبھی ان سے ہم کلام [illegible] ہم کلامی کو بزعم خود تعارف سے تعبیر کرتا رہا حالانکہ اس ہم کلامی اور اس تعارف کی حیثیت ایک طلسم خیال کی سی تھی۔ اس نوجوان کی صحت [illegible] جن خصوصیات کا حسین آمیزہ تھی [illegible] کتابی چہرہ [illegible] آنکھیں ستواں ناک ڈھلکے ہوئے رخسار [illegible] شاداب ہونٹ [illegible] کان کشادہ پیشانی [illegible] دانت [illegible] گردن [illegible] بلکہ عادتاً [illegible] سا رنگ کچھ ہوا تھا [illegible] خاموش لیکن نگاہیں ہر لحظہ گردش میں چہرے پر متانت اور ذہانت سے آنکھ مچولی کھیلتی ہوئی [illegible] قدم [illegible] تھے جیسے [illegible] اور گفتار ایسی (اس کا اندازہ بعد میں ہوا) کہ [illegible] شیشے میں اتر آئے عزم و حوصلہ کی یہ شان (چہرہ کی تراش خراش سے [illegible]) [illegible] شعر کا مفہوم سمجھ لیجئے ؎

ہر چند کوہ سے بھی گراں تر ہے بار عشق
ہمت یہ کہہ رہی ہے کہ تنہا اٹھائیے

شاہی مسجد میں ایک جلسہ کا پروگرام تھا۔ لوگ شہر کے اطراف و اکناف سے اس کثیر تعداد میں جمع ہوئے تھے کہ میدان عرفات کا منظر پیش کر رہا تھا۔ اس اجتماع میں میں بھی شریک تھا لیکن میری حیثیت ایک ایسے تماشائی کی سی تھی جس کی بیدلی نہ اسے درس عبرت دیتی ہے نہ اس کے لئے تسکین ذوق کا سامان فراہم کرتی ہے غالب نے بھی ایسے ہی تماشائی کی ذہنیت کا اس شعر میں ماتم کیا ہے ؎

بیدلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

[illegible] سے میں پنچ کے قریب بیٹھا تھا اور میں جانتا ہوں کہ اس قدر [illegible] اپنے وقت کا کتنا قیمتی سرمایہ صرف کیا تھا۔ [illegible] شورش [illegible] پہلی مرتبہ اپنی تقریر سے پنچ پر ایک [illegible] سیاست [illegible] دیکھا ہے [illegible] نواب زادہ [illegible] کے [illegible] مولانا ظفر علی خاں [illegible] کی [illegible] [illegible] مولانا ظفر علی خاں زندہ [illegible] [illegible] تقریر کی [illegible] [illegible] یک سیرت [illegible] [illegible] [illegible] تقریر سے [illegible] [illegible] سے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ہیں کی تقریر سے [illegible] دیکھے ہیں [illegible] جب [illegible] کو [illegible] [illegible] [illegible] ہے [illegible] ہیں [illegible] سے [illegible] تقریر کی [illegible] کی تقریر سے [illegible] مجھے [illegible] سے [illegible] میں [illegible] عقیدت [illegible] کے بعد [illegible]

[illegible] کی شخصیت [illegible]
کے بعد بھی [illegible] یہ بھی نہیں [illegible]
جو [illegible] خیال میں اس سے [illegible]
کی [illegible] نہیں کی [illegible]

میں [illegible] ان کی تقریر کے دوران کچھ [illegible] [illegible] نوجوان کی تقریر کے خاتمہ پر [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] تھے [illegible] [illegible] [illegible] یہ [illegible] بات چیت [illegible] [illegible] بھی [illegible] ہوئی ہے۔ یہ [illegible] خاندانی [illegible] تھے۔ (یہ صاحب کیپٹن شفیق احمد خان ایم اے [illegible] [illegible] وارث صاحب [illegible] شورش کی تقریر! یہ ہے قابلیت۔ ایک مدت سے ہم دونوں [illegible] [illegible] [illegible] شخصیت [illegible] ہے۔ [illegible] کہا کہ ہم نے [illegible] سے تقریر کر سکیں۔ وارث صاحب [illegible] اس تقریر [illegible] ایک [illegible] [illegible] نوجوان [illegible] امتحان پاس کئے [illegible] اور ہمارے پاس اتنی سندیں [illegible] نظر میں [illegible] [illegible] یہ نوجوان [illegible] [illegible] طرح جانتا ہوں کئی ماہ برابر میری اور اس نوجوان شورش کی [illegible] [illegible] اور زیادہ قریب ہونے کی کوشش نہیں کی۔

اور پھر [illegible] اس کی گود میں لال [illegible] ہوئے ہیں لیکن یہ میرا کہنا کہ میں نے اس سے کچھ [illegible] یہ نوجوان شورش یہ جوان رعنا شورش جس کی کتاب زندگی کا ایک ورق میں نے اوپر کی سطور میں پیش کیا ہے آج صرف شورش نہیں بلکہ آغا شورش کاشمیری ہے۔ آغا شورش کاشمیری ابھی [illegible] سن کو نہیں پہنچے ایک سال کے بعد [illegible] انھیں عزت، وجاہت اور شہرت کی وہ معراج نصیب ہوگی جس پر ان کے اقران و امثال رشک کریں گے یہ کوئی منجمانہ پیشین گوئی نہیں بلکہ ایک پیش قیاسی ہے جو میں نے ان کی عمر کی مناسبت سے کی ہے۔ آغا شورش کاشمیری

نے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو اس ملک دو آزاد ریاستوں کی تشکیل کی۔ اس حساب سے وہ اس گلستان آب و گل کی واحد ہستی ہیں۔ کسے خبر تھی کہ آغا صاحب کی تاریخ ولادت ۲۰ سال بعد ایک نوزائیدہ اسلامی مملکت "پاکستان" کی تاریخ ولادت ثابت ہوگی۔ یہ تاریخی مناسبت بھی قدرت کا ایک عجیب کرشمہ ہے یا پھر یہ ان خدمات کا صلہ کہنا چاہیے جو اس قوم کی سیاسی زندگی کا اوڑھنا بچھونا رہا ہیں۔

آغا شورش کاشمیری نے عملی سیاست کے میدان میں مجلس احرار کے ایک رکن کی حیثیت سے قدم رکھا یہ ۱۹۳۵ء کی بات ہے۔ اس وقت ان کی عمر ۱۵ سال کے لگ بھگ تھی۔ شروع ہی سے زمیندار کا مطالعہ بڑی باقاعدگی سے کرتے تھے۔ وہ اردو ادب کے شہ پارے جو مولانا ظفر علی خاں کے قلم سے نکلتے تھے انہیں بڑے شغف اور بڑے انہماک سے ان کے معانی و مطالب پر غور کرتے اور ان کے محاسن پر سر دھنتے تھے شعر گوئی اور نثر نگاری کی صلاحیتیں بھی ... جو کچھ الہلال و البلاغ کے مطالعے نے ان کے اندر ... پر کچھ اور صیقل کر دیا تھا۔ ایک طرف مولانا ظفر علی خاں کی جذباتیت اور دوسری طرف مولانا آزاد کی ابوالکلامیت دونوں نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور آغا شورش کی شخصیت پر ادب و انشا، شعر و سخن، تقریر و خطابت اور فکر و نظر کے ایسے ... کہ برصغیر کے طول و عرض میں ان کی دھوم مچ گئی۔ برطانوی دور میں جب تحریک آزادی کی مہم زوروں پر تھی تو اس نوجوان خطیب نے ملک کے گوشے گوشے میں شعلہ مقالی اور آتش بیانی کے جھنڈے گاڑ دیئے اس حقیقت سے آغا شورش کاشمیری کے بدترین دشمن بھی انکار نہیں کر سکتے کہ جہاں تک خطابت کا تعلق ہے آغا کا کوئی سہیم و عدیل نہیں ہے۔ اسی سال جب یوم اقبال کی تقریب پر آغا نے تقریر کی تو پورے ہال کی روح کھنچ کر آغا کی آنکھوں میں آگئی تھی۔ آغا کی تقریر [illegible] چیز میں مضمر ہے وہ یہ ہے کہ آغا اپنے خیالات کا اظہار ... کرتے ہیں۔ زبان و دل کی کامل ہم آہنگی کے ساتھ اپنی آواز کی بلندی ... ہے جب آغا شورش کاشمیری تقریر کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذہن پر معانی و مطالب کی بارش ہو رہی ہے ان کے مطالب الفاظ کے تابع نہیں ہوتے بلکہ الفاظ کو یہ ضرورت پیش آتی ہے کہ مطالب کے آگے سر تسلیم خم کریں۔ آغا شورش ایسی زبان لکھتے اور ایسی زبان بولتے ہیں جو عوام کے دل و دماغ کی گہرائیوں پر گھر کر جاتی ہے۔

آغا شورش کاشمیری کو تحریک آزادی میں شرکت کی پاداش میں برطانوی استعمار نے انہیں دس سال ۸ ماہ کی طویل مدت تک قید رکھا۔ آغا نے ایک سال ۵ ماہ قید تنہائی کی سختیاں سہیں۔ ۵ ماہ ۵ دن بھوک ہڑتال کی۔ یہ قید ۲۶ (۱) الف ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت عمل میں آئی تھی۔ اسی طویل المیعاد اسیری کے عالم میں آغا شورش کو غالباً اپنی زندگی میں پہلی بار یہ تجربہ ہوا کہ انسانیت کا معیار کتنا گر چکا ہے؟ انسان اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کے ساتھ کتنا بہیمانہ برتاؤ کرتے ہیں محض عہدہ اور منصب کی ہوس میں لوگوں کا خون کتنا سفید ہو گیا ہے کہ وہ یہ سوچنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ جس شخص کے ساتھ ہم وحشت و درندگی کا سلوک کر رہے ہیں وہ خود اپنی ہی قوم کا ایک فرد ہے؟ بیڑی، ڈنڈا بیڑی، ہتھکڑی، تو بڑے اور ... جیل کے صحن میں تیرتے ہوئے گندے کیڑے یہ ہیں وہ حقیر ہتھکنڈے جو ملک کے ... پر جیل کے حکام نے آغا کے خلاف بڑی بے رحمی کے ساتھ استعمال کئے۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۵ء تک آغا کی زندگی کے دس سال قومی سرگرمیوں سے الگ تھلگ رہ کر بسر ہوئے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ آغا کی سیرت کی تعمیر اسی دس سالہ مدت کا حاصل ہے۔ اگر آغا کی زندگی کے دامن پر قید و بند کی صعوبتوں کے داغ نہ ہوتے تو غالب قیاس یہ ہے کہ ان کی شخصیت کا نقش کبھی نہ ابھر سکتا اور وہ مدت العمر کس مپرسی کی زندگی بسر کرتے۔

آغا شورش کاشمیری کئی سال سے ہفتہ وار چٹان لاہور کے مالک و مدیر ہیں ۱۹۴۶ء میں مجلس احرار نے جب روزنامہ "آزاد" نکالا تھا تو کچھ عرصہ کے لئے اس کی ادارت کے فرائض بھی آغا نے سرانجام دیئے تھے اس وقت تک آپ کے قلم سے جو تصانیف نکل چکی ہیں ان کی فہرست یہ ہے۔

(۱) قیدی کا روزنامچہ (جسے جیل کے حکام نے پنجاب سی آئی ڈی کے مشورہ سے ضبط کر لیا تھا)

(۲) آزاد ہند کے زریں خاطر (۳) اس بازار میں (۴) گفتنی و ناگفتنی (مجموعہ کلام) (۵) پس دیوار زنداں (زیر طبع) (۶) مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری (زیر ترتیب)

آغا شورش کاشمیری ایک خاص طرز نگارش کے مالک ہیں "چٹان" کے قارئین جو قریب پاکستان اور بھارت کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں آغا کے

[illegible] ہے کہ آغا [illegible] ہی بہت سے ساتھ [illegible]
[illegible] آغاز [illegible] ہے

"میں نے [illegible] اس [illegible] شعر [illegible]
[illegible] میری [illegible] اور [illegible] میں [illegible]
[illegible] شاعر [illegible]
[illegible] پیدا [illegible] خود [illegible]
[illegible] وقت میں [illegible]
[illegible] کے [illegible]
[illegible] کر سکتے ہیں [illegible]
[illegible] قریب [illegible] شعر [illegible] خوبصورت [illegible]
[illegible] مجھے [illegible]
[illegible] دیکھنے [illegible]
[illegible] کی [illegible] شورش [illegible]
موضوع [illegible] اور [illegible] جیسے [illegible]
سامنے [illegible] ایک [illegible]

دامان باغباں سے کف گل فروش تک

بکھرے پڑے ہیں سینکڑوں عنوان مرے لئے"

آغا شورش کاشمیری کی [illegible] یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ یہ کہیں ؎

بہت قریب سے دیکھا ہے رہنماؤں کو	بہت قریب [illegible]
[illegible]	[illegible]

آغا شورش کاشمیری کی سیاسی اور ادبی زندگی کے چند پہلوؤں پر توجہ [illegible] تعلق [illegible]
[illegible] کے بارے میں کچھ نہیں لکھا اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اس موضوع کو [illegible] مضمون کی آخری سطریں ذہن پر کچھ [illegible]
نقش چھوڑ جاتی ہیں [illegible] اپنے قارئین پر یہ حقیقت واضح [illegible] نوجوان جس کی زندگی انقلابات کے [illegible]
ماحول میں بسر ہوئی ہے اور جس کے قلم کی جولانیوں نے [illegible] سیاسی رہنماؤں کو [illegible]
اور برائے اظہار کا مالک ہے۔ طبیعت میں بلا کا جوش مزاج میں غضب کی خشونت [illegible] انگاریں ایسی جیسے کسی بلندی
[illegible] چہرے کی تراش خراش میں غیظ و غضب کے جذبات [illegible] تو کچھ مبالغہ نہ ہوگا۔

تیور بدل گئے تو زمیں کانپنے لگی
ابرو کے اک اشارے سے محشر بپا ہوا

اگر یہ عیب ہیں تو آغا شورش کاشمیری کا دامن ان سے ضرور داغدار ہے۔ آغا کی افتاد طبع کچھ ایسی ہے کہ ان سے ان کے بہت سے متعارفین

اکثر یہ کبھی تو آغا جی سے تپاک سے ملتے ہیں اور کبھی وہی بلا کی سرد مہری کا ثبوت دیتے ہیں کہ ملاقاتی اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے ہیں۔ مجھے ان کے قریبی دوستوں سے معلوم ہوا ہے کہ آغا شورش کاشمیری نے کبھی کسی کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔ آغا شورش پنجابی زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ لیکن تقریر و تحریر میں ان کی زبان ابوالکلام صاحب کے سانچے میں ڈھلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ کبھی کبھی ان کے ہوش پر جوش غالب آجاتا ہے لیکن یہ غلبہ صرف چند ساعت کے لئے ہوتا ہے۔ وہ فوراً اپنے جذبات پر قابو پا لیتے ہیں۔ آغا صاحب جب ٹیلیفون پر کسی سے گفتگو کرتے ہیں تو طنز و ظرافت کا ایک دفتر کھل جاتا ہے۔ چٹان کے مالک و مدیر کی حیثیت سے ان کا کردار بہت بلند ہے۔ کاتب، ادارہ تحریر، منیجر اور چپراسی سبھی ان سے خوش اور مطمئن ہیں۔ ان کا برتاؤ ان سب سے برادرانہ ہے۔ یہ کمال ہے اور اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ آغا صاحب نے زمانے کے نشیب و فراز دیکھے ہیں اور ہر رنگ کی زندگی بسر کی ہے۔

---

(۴)

چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

(غالب)

حیدرآباد کی چند شخصیتیں

تمکین کاظمی

[illegible] بائیس سال پہلے میں نے چند شخصی [illegible] لکھے تھے جسے اہل علم نے بہت پسند کیا اور بعض لوگ [illegible]
[illegible] اس طرف توجہ نہ کی۔ البتہ بہت سال مجھے خیال [illegible] روحوں [illegible] شخصی خاکے لکھنے میں
[illegible] طور پر واقف ہوں [illegible] بعض کے متعلق ایک ایک [illegible] ہوں [illegible]
[illegible] نمبر" طبع ہوا اور [illegible] مشکل ہو گیا ہے۔ [illegible]
[illegible] بڑی مشکل سے [illegible] بالآخر [illegible] سعادت [illegible] شخصیات [illegible]
[illegible] ایک طویل خط طفیل صاحب کو لکھا مگر [illegible] نہیں [illegible] ہو گئے۔

گزشتہ مہینے میرے محترم [illegible] نے مجھ سے خواہش کی کہ شخصیات نمبر کے ضمیمے کے لئے [illegible] حیدرآبادی [illegible] فرمائش کی تعمیل کر دی اور انہوں نے [illegible] طفیل صاحب کو بھجوا دیا اور پھر طفیل صاحب نے فرمائش کی کہ حیدرآباد والوں کے خاکے لکھ دوں۔

میری ولادت ۱۹۰۲ء کی ہے اور میرا گھرانا علمی ادبی رہا ہے جس کی وجہ سے بچپن ہی سے مجھے [illegible] اور [illegible] سے واقفیت رہی ہے [illegible] بیشتر شاعروں سے میں بچپن ہی سے مانوس تھا۔ اس طرح [illegible] سینکڑوں بزرگ [illegible] لکھ سکتا ہوں مگر میں نے چند بزرگوں کی ایک فہرست بنائی ہے اور ان کے خاکے پیش کر رہا ہوں۔

شخصیات نمبر میں بعض لوگ مثلاً امجد، مرزا فرحت اللہ بیگ، توحید (?) وغیرہ پیش کئے گئے ہیں، اس لئے انہیں [illegible] مستقل طور پر [illegible] میں نے لکھے ہیں اور وہ [illegible] شائع ہو چکے ہیں اس لئے [illegible] انہیں بھی نہیں لیا گیا ہے۔

علم و ادب [illegible] میں فرقہ واریت مجھے پسند نہیں [illegible] دونوں [illegible] ساتھ [illegible] حیدرآبادی [illegible] غیر حیدرآبادی کا بھی میں قائل نہیں ہوں۔ جو لوگ حیدرآباد آکر بس گئے وہ [illegible] چاہے دو سو سال [illegible] حیدرآبادی [illegible]

شمار کرتا ہوں

مشکل یہ ہے کہ لوگ شخصی خاکے کے ساتھ مستقل تبصرہ اور علم و ہنر کے اقتباس ہی چاہتے ہیں اور ان عنوان کی سوانح لکھ کر نہیں دے سکتا، خاکہ بالکل مستقل چیز ہے اس میں تنقید تبصرہ اور اقتباس کی گنجائش نہیں۔ اس سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ لوگ کسی کے حسن کردار کی عیب پوشی کے لئے تعلقات یا علیحدہ ہو اخلاق یا مذہبی لحاظ سے، گفتنی و ناگفتنی بہر حال بیان کی ہیں سنی اور تنگ آبادی پر بھی ایک مضمون لکھ کر اس میں مسلکی کی "نشر باری" پر بھی روشنی ڈالی تو میرے بزرگوں نے خوب لے دے کی۔ حیران ہوں کہ کیا کروں بقول توفیق حیدرآبادی ـــ

حیراں ہوں یا الٰہی ! آزادوں تو کس کو زادوں

پیمانہ ہاتھ میں ہے میخانہ سامنے ہے!

بہرحال میں یہ کوشش کروں گا کہ جو بھی لکھوں صحیح لکھوں اور لگی لپٹی نہ رکھوں، واقعات ایمانداری اور دیانت کے ساتھ پیش کروں۔

آپ اس حصے میں ایسے بزرگوں کے خاکے ملاحظہ فرمائیں گے جو اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں اور ایسے لوگوں کے خاکے بھی دیکھیں گے جو بفضل تعالیٰ ابھی موجود ہیں۔ میں نے جو عنوان قائم کیا ہے اس کے سب کردار جانتا ہوں، چاہے وہ مرحوم ہوں یا موجود۔ فقط!

علامہ عبداللہ یوسف علی

۱۹۲۰ء میں ضلع گلبرگہ میں مجھے وکلنٹ اسپیشلسٹی کے سپروائزر کی حیثیت سے بھی کام کرنا پڑا ہے۔ میرے تفویض شہر گلبرگہ کی وکلنٹ کی نگہداشت بھی تھی۔ گورنمنٹ کے مہمانوں کا استقبال اور ان کا انتظام بھی بعض اوقات میرے تفویض رہتا ہے۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں بعض مشاہیر سے بھی ملنے کا موقع حاصل ہو گیا، جن میں عبداللہ یوسف علی بھی تھے۔

عبداللہ یوسف علی صدر المہام وزیر مال، صنعت، حرفت و تجارت کی حیثیت سے دورہ پر آنے والے تھے اور میں گورنمنٹ ہاؤس میں ان کا انتظار کر رہا تھا کہ دو تین موٹریں گورنمنٹ ہاؤس کی طرف آتی دکھائی دیں۔ موٹریں بیدر سے آ رہی تھیں اور بیدر کی لال مٹی سے دھول اڑ رہی تھی۔ پہلی موٹر سے ایک کریہہ منظر، متناسب الاعضاء شخص چیک کا سوٹ پہنے ہوئے اترا اور اپنے سوٹ کی گرد جھاڑتا ہوا ادھر ادھر دیکھ کر مجھ سے کچھ پوچھنا ہی چاہتا تھا کہ میں نے خود اس سے سوال کیا "صدر المہام صاحب کہاں ہیں؟" اس نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور پیچھے کی موٹر کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے دوسری موٹر کی طرف رخ کیا تو اس میں باسط جنگ (عبدالباسط خان) نظر آئے۔ علیک سلیک کے بعد میں نے ان سے بھی یہی سوال کیا تو انہوں نے سامنے کی موٹر کی طرف اشارہ کر دیا۔ میں نے ان سے کہا اس موٹر میں صدر المہام تو نہیں ہیں ان کا شوفر ہے تو وہ ہنسے اور موٹر سے اتر کر مجھے ساتھ لے کر پہلی موٹر کی طرف بڑھے اور اس صدر المہام سے جسے میں شوفر سمجھ رہا تھا، میرا تعارف کرایا۔ اس طرح مجھے علامہ عبداللہ یوسف علی سے نیاز حاصل ہوا۔

عبداللہ یوسف علی بیدر سے موٹر پر آئے تھے راستہ بھی ناہموار تھا، اس لئے تکان کا اثر چہرے پر تھا۔ میں نے گورنمنٹ ہاؤس دکھایا۔ اتنی دیر میں ان کے ملازم بھی آ گئے اور وہ غسل خانہ میں چلے گئے۔ غسل سے فارغ ہو کر لباس تبدیل کر کے چائے پینے کے لئے آ بیٹھے تو مجھے بلا لیا اور دیر تک باتیں کرتے رہے۔ باسط جنگ بہادر ان کے ساتھ بہ حیثیت ناظم انجمن امداد باہمی (رجسٹرار کوآپریٹو سوسائٹیز) تھے۔ چونکہ باسط جنگ سے میرے خاندانی مراسم تھے اور والد مرحوم سے انہیں بڑی محبت تھی۔ اس لئے وہ جب کبھی گلبرگہ آتے تو ہمارے ہی مہمان رہتے یا گورنمنٹ ہاؤس میں بھی ٹھہرتے تو ایک دو دن ہمارے گھر پر ضرور رہتے تھے۔

پہلی ملاقات میں علامہ نے ادھر ادھر کی باتیں کیں مگر دوسری تیسری ملاقات سے وہ کھل گئے اور بڑی دلچسپ باتیں کرنے لگے۔ گلبرگہ

[illegible] بھی کا معائنہ کیا اور جہاں [illegible] تھے۔ [illegible]
[illegible] تھے [illegible] کا کیا اصل [illegible] قابل [illegible]
[illegible] بات [illegible] قائل ہو گئے

[illegible] صاحب بھی [illegible] آتے [illegible] کی دعوت [illegible] سے اس لئے [illegible] کی دعوت [illegible]
صاحب [illegible] تو [illegible] طرف سے [illegible] چلنے [illegible] سکتا۔
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

اس نے طریقہ تبلیغ کی وضاحت فرمائی۔

سنٹرل جیل کا معائنہ کیا تو [illegible] جہاں [illegible] بڑی تفصیل سے [illegible] کیا اور بہت پسند فرمایا اور [illegible] معاشرہ میں جرائم اور [illegible] کے ارتکاب [illegible] سزا اور اس کے [illegible] تقریر فرمائی [illegible] ہو گیا۔ ایک [illegible] جو ہر جگہ [illegible] ہر مقام کر [illegible] سکتے۔

[illegible] لاہور کا ملاحظہ کیا [illegible] تم بتا سکتے ہو کہ کئی سو سال سے [illegible] عام [illegible] ہیں [illegible] وجہ [illegible] روحانیات پر ایک افضل تقریر فرمائی اور ثابت کیا کہ روحانی [illegible] نہیں سکتا [illegible] رہے گی۔

لے یہ پہلا موقع تھا۔

گلبرگہ شریف کا بھی پرانا استھان ہے کیونکہ یہاں شہر میں اچا مہاراج کا راج ہے جس کی راجدھانی دور سے ملتی ہے۔ علامہ نے وہاں سماع بھی کیا اور وہاں کے عرس اور درگاہ کی کے متعلق ہندو مسلم جھگڑے کا حال سنا تو فرمانے لگے "بھائی یہ پہلے تمام مسلمانوں کی حکومت تھی اور اب انگریزوں کی ہو گئی ہے۔ یہاں یہ حال ہے کہ مسلمان ہندو وہاں عرس پڑھانے نہیں دیتے جب کبھی ہندوستان آزاد ہو جائے گا اور ہماری حکومت ہوگی تو پھر ہندوؤں کی خیر ہے۔ مسجدوں کی یہ دونوں فرقے ایک دوسرے کے معابد کو ڈھا کر رہیں گے۔"

علامہ کا یہ خیال حرف بہ حرف پورا ہوا۔ شاید اسی کو وہ دیکھ نہ سکے اور ترک وطن کر کے فوت ہو رہے۔

میرے بعض دوستوں ڈاکٹر عالم، ایم اے ایل ایل بی جو ان دنوں علیگڑھ سے ایل ایل بی کر رہے تھے اور عبدالمنعم سعیدی بی اے علیگ۔ جو ان دنوں ایل ایل بی کر رہے تھے انہوں نے خواہش کی کہ علامہ سے انہیں ملاؤں۔ میں نے پہلے ہی سے علامہ سے استدعا کی کہ میرے پاس چائے پر تشریف لائیں اور ان لوگوں سے ملیں وہ فوراً خوشی سے آمادہ ہو گئے اور شام کی چائے پر میرے احباب سے ملاقات کی۔ ڈاکٹر عالم سے سیاسیات پر اور منعم سعیدی سے مذہب پر دیر تک گفتگو فرماتے رہے۔ بعض دوسرے طلباء بھی تھے ان سے بھی دیر تک باتیں کیں۔ ایک طالب علم [illegible] کے ایک غریب خاندان سے تھے میرے پاس رہتے تھے ان سے خصوصیت کے ساتھ بات چیت کی اور دوسرے روز انہیں ملنے [illegible] گیا اور سب لوگوں کے سامنے اپنی طالب علمی کے حالات سنائے کہ کس طرح انہوں نے افلاس اور تنگ دستی میں طالب علمی کی زندگی [illegible] ایک نیک شخص نے ان کی مدد کی۔ اپنے حالات بڑی بے تکلفی سے سنائے اور اپنی افلاس اور تنگ دستی کے اظہار میں کوئی پس و پیش نہیں کیا۔ اللہ اللہ کیا لوگ تھے کتنے حقیقت پسند اور کیسے سچے اور نیک لوگ! میں نے کسی بڑے آدمی کو اتنی صفائی سے اپنی سابقہ زندگی اور [illegible] کہتے نہیں [illegible] ایسے لوگوں پر جو مانگ کر پڑھا ہے وہ بھی ہمیشہ اس کے بیان سے گریز کرتے رہے مگر علامہ نے فخر کے ساتھ سب کچھ سنا دیا اور ابتدائی زندگی کے حالات سننے کے بعد ہم لوگوں کے دلوں میں ان کی عظمت اور زیادہ ہو گئی اور ہم انہیں ایک نمونہ سمجھنے لگے۔

یوں تو علامہ سے بہت سی ادبی و کتابی باتیں نظر سے گزر چکی تھیں مگر سب سے دلچسپ [illegible] یہ تھی کہ انہیں ایک دفتری عہدہ دار کی طرح [illegible] اس ملاقات میں معلوم ہوا کہ وہ بڑی معلومات کے بزرگ ہیں تاریخ یہاں کی بڑی اچھی نظر تھی۔ [illegible] کے گنبد پر دیکھیں تو بڑے مزے سے [illegible] بیان کرنے لگے چونکہ ان دنوں میں نے گلبرگہ کی ایک مختصر تاریخ اور حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کی سوانح عمری مرتب کی تھی اس لئے میری معلومات [illegible] مجھ سے اس خصوص میں علامہ نے گفتگو فرمائی تو بہت خوش ہوئے اور میری معلومات کی بڑی داد دی اور بڑے اچھے مشورے سے سرفراز فرمائے۔ ان [illegible] مذہب پر بھی بڑی گہری نظر تھی اور تصوف سے متعلق بڑی خاص معلومات تھیں اور ایک خصوصیت یہ تھی کہ عربی، فارسی، انگریزی، مرہٹی، گجراتی کے علاوہ کنڑی بھی اچھی طرح جانتے اور روانی سے بولتے تھے۔ عربی، لاطینی اور سنسکرت کے قائل تھے کہ یہ تینوں ام السنہ ہیں بقیہ زبانوں کو انہی سے [illegible] دیتے تھے۔ اردو بڑی صاف اور شستہ بولتے اور [illegible] کا بڑا ذوق رکھتے تھے۔

عبدالمنعم سعیدی ان دنوں آسکر وائلڈ کے ایک ڈرامے کا ترجمہ کر رہے تھے۔ میں نے ذکر کیا تو فرمایا۔ یہ ڈرامہ جس کا ترجمہ کر رہے ہو کوئی خاص چیز نہیں ہے وائلڈ کا ترجمہ کرنا ہو تو اس کے "پکچر آف ڈورین گرے" کا ترجمہ کرو مگر اس سے تم ابھی عہدہ برآ نہ ہو سکو گے اگر ترجموں کی مشق جاری رہے تو دس سال کے بعد اس ناول کا ترجمہ کر سکتے ہو۔

علامہ [illegible] آدمی نہ تھے اور ادب پر بھی خاصا عبور تھا۔ البتہ شاعری سے زیادہ دلچسپی نہ تھی مگر اس سے بے بہرہ بھی نہ تھے۔ اساتذۂ اردو کے کلام سے واقف تھے۔ غالب اور اقبال کے اکثر شعر بھی یاد تھے اور میر کے شعر بھی سنایا کرتے تھے۔

بہرحال گلبرگہ میں ایک ہفتہ علامہ کا قیام رہا اور ان دنوں میں صبح سے شام تک میں ساتھ ہی ساتھ رہا۔ بعض دفعہ رات کے دس دس بجے تک بیٹھے باتیں کیا کرتے تھے۔ میرے حال پر مدت تک عنایات رہیں، واپس جانے کے بعد بھی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ میں جب کبھی حیدرآباد

[illegible] تصویر [illegible] ایک [illegible] کے ساتھ گئی تو ایک تصویر [illegible] تصویر [illegible] کی فرمائش کی ۔ میں نے وہ تصویر [illegible]
[illegible] اس کی کمال [illegible] تصویر ایک نقاشی کو دی [illegible] کی تصویر [illegible] سے کہ اس کی [illegible] نقل بھی کرائی ۔
[illegible] کے بعد میں نے نقاش کی بنائی ہوئی نقل اور فوٹو کی [illegible] پیش کی [illegible] ۔ پھر میں نے وہی اصل تصویر [illegible]
[illegible] پیش کی تو بہت پریشان ہوئے دونوں کو [illegible] دیکھتے ۔ [illegible] نقل [illegible] ہے [illegible]
[illegible] خوب نقل کی ہے ۔ پھر فرمایا کہ میں [illegible] [illegible]
[illegible] تشریف لے گئے ۔

[illegible] اسٹیشن کی حیثیت [illegible] [illegible]
[illegible] ملاقات ہو جاتی تھی [illegible] [illegible]
[illegible] حیدرآباد سے [illegible] ملاقات [illegible] فرمایا [illegible] کے متعلق
[illegible] رہے [illegible]
[illegible] ملاقات [illegible] علامہ [illegible]
[illegible] مضامین کا مجموعہ [illegible] بہت پسند فرمایا [illegible] مضامین بہت پسند
[illegible] کرنے کی [illegible] تذکرہ بھی کیا ۔
[illegible] تحریر فرمایا [illegible] مجھے [illegible]
[illegible] عجیب اتفاق ہے [illegible] فرمایا [illegible] مجھے [illegible] فرمایا [illegible]
[illegible] اور اخلاقی نقاطِ نظر [illegible] بخشے ۔

علامہ کی سب سے زیادہ [illegible] مجھے [illegible] سے [illegible]
[illegible] کی حوصلہ افزائی فرماتے اور بہت مدد دیتے تھے ۔ [illegible] علامہ [illegible] مجھے نیاز حاصل ہوا ہے [illegible]
[illegible] مضامین میرے چھپ چکے تھے جنہیں دیکھ کر علامہ نے میری بڑی ہمت افزائی کی تھی اور بہت سے مفید [illegible] مشورے دیئے تھے جو
میرے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوئے اور انہی کو پیشِ نظر رکھ کر میں نے مضمون نگاری کی ۔
مطالعہ کا طریقہ اور اپنے مفید مطلب مضامین کے نوٹس لینے کے متعلق علامہ نے بڑی عمدہ ہدایات دی تھیں ۔ علامہ نے بڑی تفصیل سے
[illegible] تھا کہ [illegible] پر تو مطالعہ نہ چھوڑو ہر ایک کتاب پڑھو [illegible] اس کے مضامین اپنے دماغ میں محفوظ کیا کرو ۔ کسی بھی
موضوع پر [illegible] مصنفین کی کتابیں یکے بعد دیگرے غور سے پڑھا کرو اور ایک دوسرے [illegible] کیا کرو ۔ کسی موضوع کو [illegible]
پامال نہ سمجھو ، ہر موضوع کا مطالعہ کرو ۔ اس طرح اور بھی بہت سی باتیں علامہ نے بتائی تھیں ۔
حقیقت یہ ہے کہ میرے ابتدائی مضامین جو ایک اٹھارہ سالہ نوجوان کی [illegible] کا نتیجہ تھے دیکھ کر اگر علامہ اظہارِ پسندیدگی نہ فرماتے [illegible]
[illegible] بیانی اور [illegible] زبانی دیکھ کر خاموش ہو جاتے تو میں اس قصے ہی کو ختم کر دیتا مگر علامہ نے میری بڑی ہمت افزائی کی اور مجھ میں خاص [illegible]
اور ہمت پیدا کی جس کا نتیجہ نکلا کہ میں نڈر ہو کر لکھتا رہا اور آج تک لکھ رہا ہوں معلوم نہیں میری طرح علامہ نے اور کتنوں کو انشا پرداز بنا دیا ۔
خداوند عالم علامہ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ۔ آمین !

عبداللہ العمادی

بچپن سنبھالنے کے بعد سے علامہ عبداللہ العمادی کی تصانیف اور مضامین میرے مطالعہ میں رہتے تھے مگر کبھی ان سے مجھے نیاز حاصل نہیں تھا۔ دارالترجمہ کے قیام کے بعد جب عمادی حیدرآباد آئے تو مجھے یہ سعادت نصیب ہوئی اور پہلی ہی ملاقات میں انہوں نے مجھے ایسا گرویدہ کر لیا کہ میں ان کا حلقہ بگوش ہو کر رہ گیا۔ معلوم نہیں کس نے میرا تعارف کرا دیا تھا یا کسی اور نے بہرحال میرا نام سنتے ہی بے انتہا مسرور ہو گئے میرے بعض مضامین کا حوالہ دیا اور فرمایا کہ میں تمہارے مضامین پڑھ کر خوش ہوتا اور تمہارے لئے دعا کیا کرتا تھا۔ تم میرے لئے اجنبی نہیں ہو، میں عرصہ سے تم سے مانوس ہوں۔ ان کی اس شفقت و عنایت کا مجھ پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ میں نے بھی انہیں اپنا شفیق بزرگ اور مربی سمجھ لیا اور یہ شفقتیں وہ آخر وقت تک میرے حال پر مبذول رکھتے۔

عمادی کم رو، کم گو، کم سخن قسم کے بزرگ تھے۔ نیا شخص ان سے مل کر تو انہیں عالم کیا سمجھتا، معمولی سا معقول آدمی بلکہ اجنبی اگر ان کے علمی اور عملی کارناموں سے واقف نہ ہوتا تو انہیں خاطر ہی میں نہ لاتا۔ بظاہر کم گو تھے مگر مسائل علمیہ کے وقت ان کی زبان اور قلم رواں ہوتی۔ جب کھل جاتے تو ان کی طلاقت لسانی ظاہر ہونے لگتی اور ایسے جواہر بکھیرتے کہ سننے والا مالا مال ہو جاتا۔ اس معاملہ کی کسی بات کا شوق ہی نہ تھا۔ کپڑا بالکل معمولی پہن لیتے، کھانا بھی اسی طرح ہوتا، مزاج البتہ رئیسی ہوتی تھی کیونکہ معدہ جانا پہچانا تھا۔ طبیعت میں اس قدر انکسار تھا کہ میں نے اس قسم کے کسی بزرگ میں نہیں دیکھا۔ کوئی اپنی کتاب لا کر ضد کرتا کہ مولانا تقریظ لکھ دیجئے، کتاب الٹ پلٹ کر دیکھی، سرسری طور پر پڑھ لیا اور برداشتہ قلم تقریظ لکھ دی۔ لطف یہ کہ صاحب تصنیف کی تعریف اتنی کہ وہ پھولا نہ سماتا اور آخر میں ایک آدھ فقرہ ایسا لکھ دیتے کہ جاننے والے جان جاتے کہ یہ سب ایک جنتری کی دل افزائی کے لئے لکھا ہے۔ معلومات کا یہ عالم تھا کہ کسی موضوع پر گفتگو کیجئے یہ معلوم ہوتا کہ وہ اس فن کے ماہر ہی ہیں۔ میں انہیں صرف عالم سمجھتا تھا فن تاریخ میں ان کی قابلیت مجھے معلوم ہی نہ تھی۔ ایک دفعہ پوچھا کیا کر رہے ہو تو میں نے عرض کیا "ارسطو جاہ" پر کام کر رہا ہوں۔ آپ نے ارسطو جاہ کا نام اور پورے خطابات بیان کر کے پوچھا۔ وہی ارسطو جاہ؟ میں نے عرض کیا جی ہاں وہی! بس ارسطو جاہ کی کارگزاریاں جو گنانے لگے تو معلوم یہ ہوا تھا کہ میں نے آٹھ دس سال کی محنت سے جو چیزیں جمع کیں وہ عمادی کی زبان کی نوک پر ہیں۔ میں نے حیرت ظاہر کی تو فرمایا چونکہ تم تحقیق کر رہے ہو اور مسلسل اس موضوع پر کام کر رہے ہو اس لئے تمہیں حیرت ہو رہی ہے، تاریخ کے پورے مقامات میری نظر میں ہیں چنانچہ میں نے اپنی یہ کتاب پیش کی تو ملاحظہ فرما کر بڑی داد دی اور جہاں جہاں میں نے تحقیق کی تھی اور جو باتیں میں نے گھر کے مواد اور خانگی اسناد کی بنا پر لکھی تھیں ان کی داد دی کہ یہ کام تم نے بڑا اچھا کیا ہے یہ مواد دوسرا شخص فراہم نہ کر سکتا تھا۔

طبیعت میں استغنا اور درگذر کا مادہ بہت تھا، ہمیشہ اپنی حالت پر قانع رہے اور بڑے سے بڑے مخالف کو بھی کبھی مخالف نہیں سمجھا، ہر ایک کو دوست ہی سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کے مخالفین بھی بہت ہی کم تھے اور جو تھے بھی تو مخالفت کرتے ہوئے شرماتے تھے یہ ان کے کردار تھے جن کی وجہ سے دشمن بھی ان کا دم بھرنے پر مجبور رہتے۔

ارسطو جاہ پر کام کرنے کے لئے میں نے نواب یوسف علی خان (سالار جنگ) کو دشمن بنا لیا تھا چونکہ ارسطو جاہ میر عالم کے آقا اور میر عالم کی زندگی بنانے والے تھے اس لئے ان کی سوانح حیات میں میر عالم کا چہرہ بے نقاب ہو رہا تھا، نواب صاحب نے ابتداءً یہ چاہا کہ میر عالم کے خلاف جتنی باتیں ہیں انہیں قلم زد کر کے شائع کروں مگر میں اس کے لئے آمادہ نہ ہوا تو انہوں نے کوشش کی کہ یہ کتاب چھپنے نہ پائے چنانچہ اپنے فائق اثر سے کام لے کر حکومت سے جو امداد اس کتاب کی اشاعت کے لئے مل رہی تھی اسے رکوا دیا، اس پر بگڑ کر میں نے "منیر النساء" کا قصہ لال کے

مسودہ پھاڑ دیں ... ... کا حق ... پر مالک کے خاندان سے ثابت کر کے میں نے اپنے دل کا غبار نکال لیا تھا۔ میں نے اس کا ذکر کیا تو ...
بڑا اشتیاق ... کہ مجھے دکھاؤ۔ میں نے مسودہ پیش کیا تو یہ کہہ کر رکھ لیا کہ دیکھ کر واپس کر دوں گا۔ دو تین روز کے بعد جب میں نے ... تو
... کی باتیں سننے کے بعد فرمایا اگر تم سے میں کوئی خواہش کروں تو پوری کرو گے؟ میں نے عرض کیا ضرور۔ فرمایا اس مسودے کو ضائع کر دو یعنی
کتاب ہرگز شائع نہ کرنا۔ میں نے بحث شروع کی تو فرمایا تم نے وعدہ کیا ہے۔ پھر حاضرین کو اس کا گواہ کر دیا۔ پھر مجھ سے ... مسودہ لے کر وہیں
چاک کر دیا اور پرزے انگیٹھی میں ڈال دیے ... ... میں ڈال دیے۔ میرے ... سے خوش ہو کر بہت دعائیں دیں اور فرمایا
... بلکہ بڑے گھرانے کی عورت کا نام ... ... سے ... ... عورت خاص ... ... خاندان کو ذلیل کرنا چاہے
ہے۔ بس میں یہ معاملہ ضمنی طور پر آ جانے میں مگر پورے دکن بلکہ سارے ہندوستان کے لیے ذلت کی بات ہے۔ اپنے ذاتی ... ... گے ...
بڑا کیا بات! اچھا ہوا تم نے مسودہ چاک کر دیا۔ خدا تمھیں اس کی جزا دے۔ ... ... معلوم ہوا کہ حمادی ...
یہ مسودہ چاک کروا کر مجھ پر بڑا احسان کیا۔ اگر یہ چھپ جاتا تو بڑی بری بات تھی۔ اس ... ... اپنے ... ... کی زندگی ... ... بنتے۔

مومن خان مومن دہلوی پر میں نے کام شروع کیا تو مجھے بہت سا مواد نوٹ کر دیا اور بڑی دلسوزی سے مشورے دیتے رہے۔ کلیات
مومن کے فارسی کلیات کی نقل میں نے منگوائی تو بہت خوش ہوئے اور کتاب ... ... اور پنسل سے ... ... پر نشانات بھی
لگا دیے۔ باوجود لکھنؤ اسکول کے مقلد ہونے کے مومن کے معترف اور مداح تھے اور مومن کے قصے بڑی دلچسپی سے سناتے تھے۔

علمیت کا یہ عالم تھا کہ دریائے عام شعبہائے علوم پر حاوی تھے اور ہر شعبہ پر گہری نظر تھی۔ عام طور پر پرانے علماء ایک دو شعبوں سے
... ... صرف و نحو میں ... ... حدیث و فقہ میں ... ... مگر حمادی کی نظر سب پر یکساں تھی۔ ادب اور ... ...
... حدیث، فقہ سے لے کر تاریخ، جغرافیہ، طب اور علوم جدیدہ پر یکساں حاوی تھے اور ہر فن پر ایسی گفتگو کرتے معلوم ہوتا تھا کہ ... ...
میں عمر اسی فن میں گزاری ہے۔ ایسے ہمہ گیر عالم کم از کم میری نظر سے ایک دو ہی گزرے ہیں ورنہ میں نے بیشتر علماء کو ایک آدھ فن ہی پر حاوی
پایا ہے۔

حیدرآباد میں ایک بزرگ حکیم ابراہیم جامعہ طبیہ کے پروفیسر تھے جو بڑے دماغ دار اور ذہین تھے۔ ہزاروں شعر نوک زبان تھے۔ شعرائے جاہلیہ،
شعرائے اسلام، شعرائے ایران اور شعرائے ہند کے ہم معنی شعر ہزاروں یاد تھے جنھیں وہ گھنٹوں سنایا کرتے تھے۔ گمان ہی نہیں حافظہ کا کمال تھا۔ حکمت
ذہنی۔ بخلاف ان کے علامہ حمادی باوجود علمیت کے ان سے اچھے حافظے کے مالک تھے۔ قاضی تلمذ حسین نے ریاض خیرآبادی کی غزلیات کا ... ...
سے مقابلہ شروع کیا تھا۔ ایک روز معلوم نہیں قاضی صاحب نے حمادی کو بلا لیا تھا یا وہ خود پہنچ گئے تھے کہ غزلیات کا دور ہو رہا تھا۔ خوش نصیبی
سے میں بھی پہنچ گیا تو حمادی نے کاغذ قلم سے آگے کھسکا دیا۔ اب یہ ہونے لگا کہ قاضی صاحب ریاض کا شعر پڑھنے جیسے سنتے ہی حمادی ...
کا شعر اسی مضمون کا سناتے اور پھر عرب کے دوسرے شعراء کے شعر یکے بعد دیگرے سنا کر اساتذہ عجم کے شعر بھی سناتے، جنھیں سن کر قاضی صاحب
کر دیا جاتا کیونکہ قاضی صاحب کا بہرہ پن اتنا بڑھ گیا تھا کہ چیخنے پر بھی سنائی نہ دیتا تھا۔ البتہ اس کے شعر قاضی صاحب کو بھی یاد تھے مگر دوسرے
شعرائے عرب اور ایران کے شعر لکھ کر یا پڑھ کر قاضی صاحب پھڑکتے جاتے تھے۔

صرف شعر ہی حمادی کو یاد نہ تھے بلکہ وہ عروض پر بھی حاوی تھے اور عروض کی غلطیاں بیشتر اساتذہ کے اشعار سے نکالتے رہتے۔ قاضی تلمذ حسین
نے ریاض کا کلیات چھپوانا شروع کیا تو سب سے پہلے حمادی نے اس کی مخالفت کی کہ اساتذہ طب ... ... چھپا کر رہے ... ... کرنے کی بجائے ریاض
کے کلام کا انتخاب شائع کر دو مگر قاضی صاحب بھی ضدی تھے اور انھیں کچھ ایسی عقیدت یا محبت ریاض سے تھی کہ انھوں نے اتنا ضخیم کلیات
ریاض رضوان چھپا ہی ڈالا۔ اس سلسلہ میں حمادی کے خیالات بڑے ترقی پسند تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہر شخص کے شاہکار ہی منظر عام پر آئیں۔

اور اسے مجروح کیا جائے جو خدا ہی کسی نہ کسی حیثیت سے کار آمد ہو یا اپنا مقام پیدا کر سکتا ہو، رطب و یابس شائع کر کے عوام کو پسند کرنے کا موقع دینا صاحب تصنیف کی عظمت کو کم کرنا ہے کیونکہ دنیا میں ایسے لوگ کم ہیں جو کانٹوں کو ہٹا کر پھول چن سکیں، بیشتر کانٹوں ہی میں الجھ کر پھولوں تک پہنچ نہیں پاتے۔

عمادی اچھا خوش ذوق تھا، شعر کی پرکھ تھی، جوش کے تغزل کے وہ حقیقی قدر داں تھے۔ جوش، فراق، نیاز فتح پوری ہندوستان بھر میں مسلسلہ ... عمادی برابر ان جیسوں کو پڑھتے اور اس ہنگامہ آرائی پر مسکراتے تھے اور ہمیشہ نیاز کی انفرادیت اور اپچ کی مدح کیا کرتے تھے، مصحفی ... کے ذوق شعر کے معترف تھے۔

جوش ملیح آبادی چونکہ عمادی کے دار الترجمہ کے ساتھی تھے اس لئے جوش کا ساتھ بھی زیادہ رہا اور اس قربت کی وجہ سے جوش کی چھوٹی بڑی اور سب اچھی بری باتوں سے بھی زیادہ واقف تھے مگر انہوں نے کبھی بھی جوش سے نفرت نہیں کی اور نہ ہی جوش کو حقارت کی نظر سے دیکھا۔ خوش قسمتی سے ان دنوں میں جوش کے ساتھ زیادہ رہتا تھا جوش کی اکثر رباعیاں میں نے لکھی تھیں کیونکہ جوش ان دنوں فی البدیہہ کہہ کر نہ لکھتے اور میں بھی لکھ لیا کرتا تھا، یہ رباعیاں میں سناتا تو عمادی پھڑک پھڑک جاتے تھے۔

حیدرآباد کے مولوی اور مشائخ طبقے نے جوش کی شکایتیں شروع کیں تو جوش نے رباعی کہی ؎

پھولے ہوئے شکم و بغض سینے والو — خون زمرۂ تہی دست کا پینے والو
تم اہل خرد سے کہیں نہ ٹھہر سکو گے — امداد پہ احمقوں کی جینے والو

یہ رباعی میں نے ملک پر ... چھپا دی، ایک عمامہ پوش بزرگ نے عمادی سے اس کی شکایت کی، میں حاضر خدمت ہوا تو عمادی نے فرمائش کی جوش کا تازہ کلام سناؤ۔ ایک دن پہلے ایک فقیر قرآن پڑھ کر بھیک مانگ رہا تھا اس پر جوش نے فی البدیہہ کہا تھا ؎

اک گدا کی زبان پہ ہے قرآن — واہ کیا شان کبریائی ہے
کل جو زیب تخت شاہی تھا — آج وہ کاسۂ گدائی ہے

میں نے یہ قطعہ سنایا تو عمادی آبدیدہ ہو گئے۔ کہنے لگے اس ملحد کے دل میں کتنی روشنی ہے، پھولے شکم والے قرآن کے الفاظ پڑھتے ہیں اور یہ ملحد اس کی روح تک پہنچ جاتا ہے۔

عمادی میں وسعت نظر خاص تھی وہ قطعاً تنگ نظر نہ تھے، بڑے ہی عالی ظرف اور وسیع النظر تھے۔ جوش انہیں اکثر چھیڑتے۔ کبھی جوش کے ساتھ ڈاکٹر اشرف الحق بھی عمادی کے پاس پہنچ جاتے دونوں مل کر فقرے، پھبتیاں کستے۔ ان کے ساتھ عمادی بھی ہنستے، اشرف الحق کی بزرگی کا اعتبار دیتے اور جوش جوش ان لوگوں کو چلتا کر دیتے اور ان لوگوں کے جانے کے بعد بھی خفگی کا اظہار نہ کرتے تھے۔ کوئی ان کی اس بیہودگی کا ذکر بھی کرتا تو مسکرا کر کہتے یہ بھی ایک رنگ ہے یہ اسی حال میں خوش ہیں اللہ انہیں نیک توفیق دے۔

جوش کے شہر بدر ہونے کا افسوس عمادی کو بھی اتنا ہی ہوا جتنا جوش کے چاہنے والوں کو ہوا، میں جب بھی ملتا جوش کی خیر و عافیت پوچھا کرتے اور ان کے لئے دعا کرتے تھے، عمادی کو لوگ نہایت ہی مذہبی اور متعصب قسم کا ملا سمجھتے تھے وہ ملا کسی طرح نہ تھے اور نہ ان میں وہ تعصب تھا جو مولویوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ عمادی ایک روشن خیال عالم اور اپنے شاگرد سید سلیمان ندوی سے زیادہ وسیع المشرب آدمی تھے، علم کے پکے، اردو ادب کے پرستار اور طالب علموں اور ادیبوں کے سرپرست تھے۔ زمانہ میں کسی میں علمی کیفیت یا ادبی لگاؤ پاتے اس کی دل افزائی کرتے۔ انہوں نے ہزاروں ادیب، سینکڑوں عالم بنائے اور لاکھوں جتنوں کی حوصلہ افزائی کر کے انہیں کارآمد بنایا۔ یہ لافانی خدمت علم و ادب کی عمادی نے کی ہے۔ اب ایسے لوگ کہاں؟

تسکین اور مصحفی

[illegible] تسکین [illegible] عجیب و غریب [illegible] اپنا تخلص [illegible] کرتے تھے پھر [illegible] شاہ [illegible] کے [illegible] تسکین تخلص کرنے لگے۔ [illegible] کی [illegible] اصلاحات [illegible] مومن کی شاگردی کا فخر [illegible] ہے [illegible]۔

تسکین [illegible] شاعر [illegible] شاعر بنایا تھا [illegible] استاد [illegible] اس لئے تسکین نے [illegible] کی پرورش [illegible] کیا [illegible] استاد [illegible] عمر بھر [illegible] بھی [illegible] رہے [illegible] اور [illegible] میں [illegible] رنگ [illegible] رہے۔

[illegible] تسکین [illegible] کرتے تھے اور [illegible] تسکین [illegible] اعتراض [illegible] کے بعد سے پہلے [illegible] مرزا ضیا [illegible] کا [illegible] بہت کرتے تھے [illegible]

تسکین [illegible] شعر [illegible] مرزا ضیا [illegible] غزل سنائی جس میں ایک شعر تھا —

اے مقد بغیر کردہ [illegible]

جام [illegible] جام [illegible]

تسکین نے شعر سن کر ادھر ادھر دیکھا میں ان کے [illegible] مخاطب ہو کر [illegible] تسکین کی طرف [illegible] ہو گئے [illegible] تسکین نے اطمینان سے کہا [illegible] اس [illegible] کے شعر [illegible] ہے —

بصد [illegible] اختیار [illegible] ساقی

بکف [illegible] شدہ جام [illegible]

یہ سننا تھا کہ مرزا ضیا کے غصے کا پارہ چڑھ گیا اور انہوں نے [illegible] جیب میں [illegible] اور [illegible] سے [illegible] خانہ سے چلے گئے۔ یہ قصہ اتنا جلد ہوا کہ [illegible] مرزا ضیا کو روک بھی نہ سکے [illegible] انہوں نے مجھ پر [illegible] اور [illegible] دیئے۔ جب میں پٹ چکا تو تسکین صاحب نے بگڑ کر کہا خواہ مخواہ غریب پٹ گیا استاد! آپ کو کچھ کہنا ہی تھا تو اپنی طرف سے کہتے [illegible] کی طرف سے اس قسم کی باتیں کر کے اسے پٹوا دینا کیا بات ہے؟ جب تسکین نے اطمینان دلایا کہ میں نے کچھ نہیں کہا یہ استاد کی کرامت تھی تب [illegible] غصہ کم ہوا۔

یہ عادت استاد تسکین کی عمر بھر رہی۔ مشاعرے میں بھی کسی نہ کسی کے [illegible] اعتراض کر دیتے اور ہنگامہ برپا کرتے رہتے تھے۔ انتہا یہ کہ ایک کتاب تسکین نے لکھی ہے [illegible] اس میں صرف اعتراض ہی اعتراض ہیں۔ طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ [illegible] کسی نہ کسی کے کلام پر اعتراض کیا ہے بعض اعتراضوں کا جواب بھی خود ہی دیا ہے اور بعضوں کی نوازش کی ہے۔

جس سے خوش ہوتے اس کی داد دیتے اور جس سے خفا ہوتے اس پر کچھ نہ کچھ اعتراض جڑ دیتے تھے چنانچہ داغ کے [illegible] کے بعد

نظیر دہلی بھی آگئے تھے۔ انہیں داغ نے مہاراجہ کشن پرشاد بہادر کے پاس رکھوا دیا تو تحریر نہایت لطف آمیز چنانچہ اور جلیل فصاحت جنگ جو پہلے سے مہاراجہ کے پاس تھے نظیر کی مخالفت کرنے لگے اور ان دونوں نے ترکی کو ہموار کر کے آگے کر دیا چنانچہ ہر مشاعرہ میں نظیر پر فقرے کسے اور داغ پر پھبتیاں اڑائیں۔ داغ چونکہ اس مشاعرہ میں شریک نہ تھے اور نظیر نے غزل پڑھ کر مشاعرہ سے جا کر داغ کو سارا قصہ سنا دیا تھا اس لئے داغ نے مہاراجہ بہادر کو لکھا اور مہاراجہ نے ترکی کی خوب خبر لی اس طرح ترکی کی تنگی قائم ہوگئی اور انہوں نے تنگیں اور آخر کو چھوڑ کر نظیر سے دوستی کر لی اور پھر ایسے دوست بن گئے کہ نظیر کے مرنے تک رفاقت کی بلکہ نظیر کے مرنے کے وقت رو رو کر بدحال ہوگئے، اس طرح ترکی کی دشمنی وقتی ہوتی تھی مگر دوستی کے معنی ترکی کے پاس اعتراض نہ کرنے کے نہ تھے وہ نظیر پر اعتراض کرتے اور سر بیک کی ہنسی اڑاتے تھے۔

مہاراجہ کشن پرشاد ان کے مربی تھے سو روپیہ ماہوار دیا کرتے اور عید بقرعید دیوالی دسہرے پر الگ سلوک کرتے پھر بھی یہ اپنی ضرورت کا اظہار کر کے الگ لے لیا کرتے تھے مگر بار بار اس کے موقع پر نہ چوکتے بلکہ مہاراجہ کی ہنسی بھی اڑاتے تھے مہاراجہ تو مستقل مربی تھے مگر طرب شوستری، صف، شگن جنگ (نواب تاراب)، ضیا یار جنگ طلسمی وکیل، وزیر الدولہ، عبدالجبار خاں آصفی تجلی، محمد علی خاں ناظم، صولت جنگ عابد وغیرہ ہمیشہ ترکی کی مالی امداد کرتے تھے مگر یہ ان لوگوں کو بھی نہ بخشتے بلکہ موقع پر ٹوک ہی دیتے تھے۔

عبدالجبار خاں آصفی بڑے اچھے شاعر اور بڑے عالم تھے ترکی پر بہت مہربان رہتے تھے اور ڈرتے بھی تھے۔ چنانچہ آصفی اکثر کہا کرتے ہیں کہ برعکس نہند نام زنگی کافور کے مصداق "کلیات داری" کا نام ترکی رکھا گیا ہے، جو ترکی کا شیاداری مگر بدفطرت اور نہ ندر ہتے ہیں اس سے آصفی ترکی کو انہی صفات سے متصف پاتے تھے۔

ناصر الملک طوبی شوستری بڑے عالم تھے۔ ایرانی نژاد تھے مگر عربی زبان پر بڑا عبور تھا اور باوجود عجمی ہونے کے عربی پر اتنی قدرت تھی کہ عربی ان کی مادری زبان معلوم ہوتی تھی۔ یہ بھی ترکی کے مربی اور محسن تھے مگر ترکی انہیں خاطر میں نہ لاتے تھے اور ہمیشہ ان پر اعتراض کیا کرتے تھے ایک روز آغا شوستری بیٹھے ہوئے ایرانیوں کی تعریف اور اہل ایران کی فضیلت بیان کر رہے تھے اور ڈینگ مار رہے تھے کہ ایرانی نہایت ہی فہیم ذہین اور ذکی ہوتے ہیں، ان کا دماغ نہایت رسا ہوتا ہے ہر چیز بڑی آسانی سے سیکھ جاتے ہیں چنانچہ ع

عقل و دانش ہمہ با مردم ایراں دادند!

بالکل صحیح کہا گیا ہے، یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ حضور نظام مرحوم کا چوبدار آیا اور کہنے لگا کہ حضور نے یاد فرمایا ہے۔ آغا شوستری نے کہا "ہم چلا، ہم آتا ہے" بس یہ جملہ منہ سے نکلا ہی تھا کہ ترکی بھاڑ کا کانٹا بن کر لپٹ گئے۔ کہنے لگے استاد آپ پندرہ بیس سال سے ہندوستان میں ہیں، اردو ہم اردو بولتے اور سنتے رہتے ہیں اب تک آپ کو اردو نہ آئی۔ ابھی آپ نے فرمایا "ہم چلا، ہم آتا ہے" بخلاف آپ کے ہم ہندوستانیوں نے ایران کی صورت تک نہیں دیکھی نہ تو ایرانیوں سے صحبت رہتی ہے اور نہ ہمارا روزمرہ فارسی ہے۔ پھر بھی ہم صحیح فارسی بولتے، لکھتے، پڑھتے ہیں اور شعر بھی ایسے کہتے ہیں جنہیں سن کر آپ بھی رشک کرتے ہیں، ایسی ٹھوکر یہ زبان تو ہم نہیں کھاتے جیسی ابھی آپ نے کھائی۔ اب فرمائیے ایرانی افضل ہیں یا ہندوستانی؟ اس طرح ترکی کسی کو نہ بخشتے تھے۔

امجد حیدرآبادی جو حیدرآباد کے مشہور اور ہندوستان کے واحد رباعی گو شاعر ہیں ترکی کے شاگرد تھے۔ شاید انہیں اپنی قابلیت کا زعم ہو مگر ترکی اسے برداشت نہ کر سکے بلکہ اپنی شاگردی سے نکال دیا اور اتنے خفا ہوئے کہ اپنے تذکرہ سخنوران چشم دیدہ میں لکھ مارا:

امجد تخلص، احمد حسین نام، حیدرآبادی، اسی سال عمرے دارد، قدرے از عربی واقف

بو یافت بتماشائے چمن مشک شدہ شعر تو در چند خزانی دیدہ ام [illegible]
[illegible] کردہ ام [illegible]

مرزا [illegible] جیسا فاضل نہیں [illegible] ان کو بھی [illegible] وقت میں [illegible] اساتذہ کا کلام
حفظ تھا سکے۔ ایک مشاعرہ میں [illegible] صاحب کے چند شعر مجھے یاد رہ گئے ہیں ؎

یہی نظر تھی تمھارے سبب کو [illegible] | [illegible]
ابھی ہمارے رہتے ہو بجرے کہ بیٹھے | [illegible]
رہنے دو [illegible] | [illegible]

ظاہر ہے کہ جو [illegible] اور [illegible] سے [illegible] اساتذہ کے سامنے [illegible]
کیا [illegible] تنگ [illegible] ان لوگوں کی [illegible] شریف کیا کرتے ہے [illegible]
پنے بھی نہ بچتے بلکہ [illegible]
ان میں خاصا کا [illegible] عیب شرعی سے [illegible] ہے ۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ [illegible] نیک دل اور [illegible] ان کی حالت سے
واقف ہو گئے [illegible] امداد و اعانت کرتے رہتے ہیں [illegible] لوگوں سے [illegible] خود بھی [illegible]
خیرات کے کام کرتے رہے۔ بیشتر حاجتمندوں کو [illegible] کے پاس پیش کر کے امداد دلاتے۔ [illegible]
ہو سکتا کسی سفارش میں دریغ نہ کرتے تھے۔ اعتراض تو وہ اپنے بچوں پر بھی کرتے تھے [illegible]
ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی اپنی قابلیت اور ذہانت [illegible] غرض تھی اس لئے [illegible]
اعتراض کر کے ناک میں دم کر دیتے اور وہ بہت [illegible] اعتراض [illegible] ان کی موجودگی میں کوئی دوسرا کسی پر
اعتراض کرتا تو خود آستین چڑھا کر معترض کے اعتراضوں کا ایسا [illegible] جواب دیتے کہ وہ اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا۔ ہزاروں شعر یاد تھے اور
[illegible] شعر پیش کرنے میں [illegible] کمال تھا [illegible] سیکڑوں شعر سند کے سناتے اسی لئے ہر شخص ان سے ڈرتا تھا [illegible]
میں [illegible] تھا کہ آپ نے کسی پر اعتراض کیا اور اپنی تائید میں دس پندرہ شعر سنا دئے اور کسی نے یہ اعتراض سن کر ایسے ہی [illegible] پر یہی اعتراض
[illegible] موجود رہے تو فوراً معترض سے [illegible] اور اس کے خلاف بحث کرنے لگتے اور اپنی تائید میں اساتذہ کے شعر بھی سناتے جاتے۔
اس طرح [illegible] ان کی [illegible] غرض صرف یہ ہوتی کہ [illegible] رہے اور میں [illegible] والد مرحوم ان کی اس
حرکت پر ہمیشہ [illegible] کرتے مگر وہ ایک نہ سنتے تھے۔

دوسروں پر اعتراض کرتا تو بھی خفا نہ ہوتے بلکہ خوش ہو کر بحث کرتے اور معترض کو قائل کر کے دم لیتے تھے۔ ایک روز [illegible] دیوان خانے
میں بیٹھے ہوئے تازہ غزل سنا رہے تھے۔ مطلع کا دوسرا مصرعہ تھا ؎

رگ لیلیٰ زند آں جا ز مجنوں خوں چکید ایں جا

مجھے چونکہ [illegible] پر اعتراض کرنے کی [illegible] تھا اس لئے میں موقع کا طالب ہی تھا [illegible] مصرع سنتے ہی میں نے کہا استاد [illegible] کے مشہور مصرع

کھلا فصد لیلیٰ نے تو رگ مجنوں کے خوں نکلا

کا ترجمہ ہے [illegible] استاد [illegible] گئے۔ والد مرحوم نے بھی [illegible] بتائی مگر [illegible] دیر کے بعد استاد نے مجھے شاباشی دی کر [illegible] خیال

رکھا کہ جہاں کسی پہلو نظر آئے فوراً کہہ دیا کرو۔ چنانچہ ستارے نے اس کے بعد مشاعروں میں [illegible] اعتراض کرنا شروع کیا۔ اس طرح کہ کوئی شعر کہتا اور آپ کہتے یہ اعتراض وارد ہے یا اعتراض کر دیتا تو اس پر خود صاد فرما دیتے۔ کوئی جواب دینا چاہتا تو آپ بحث کرنے لگتے اور سامنے سند کے شعر پڑھ اور طرح طرح کے بحث کرنے والے کا ناک میں دم کر دیتے۔ [illegible] مخالفت کی اور میں نے مشاعروں میں ترکی کے پاس بیٹھنا ہی چھوڑ دیا۔

ترکی کی یہ شوخی بعض وقت تکلیف دہ بھی ہو جاتی تھی۔ ایک صاحب خان غلام سرور نام تھا کسی آغا صاحب اصفہانی کے تربیت یافتہ تھے، فارسی خوب کہتے تھے، غالباً شرکت تخلص کرتے تھے۔ انہوں نے مشاعرے میں غزل (فوری) شروع کی، ردیف اور قافیہ جہاں میں تھا۔ پھر انہوں نے دوسرے مصرعے میں غزل شروع کی تھی اس سے آگے بڑھے [illegible] ختم ہوتے ہی ترکی نے اسی بحر میں اور اسی [illegible] کا نعرہ بلند کیا۔ لوگوں کو ملل کی شہ ملی، سارا مشاعرہ دہرانے لگا اور ان کی [illegible] سے منزل گونج اٹھی۔ بیچارے شرکت غزل چھوڑ کر مشاعرے سے چلے گئے اور پھر کسی مشاعرے میں نظر نہیں آئے۔

ایک بزرگ شرکت [illegible] تھے، ان کی ایک کتاب ترجمہ رباعیات عمر خیام بھی چھپ چکی ہے۔ انہوں نے ایک دفعہ مشاعرے میں غزل شروع کی، مطلع کا دوسرا مصرع تھا :

شکست تیغ مرغ کیسا [illegible] ہوگی

ترکی نے جھٹ لفظ سے فائدہ اٹھا کر [illegible] سے [illegible] کہ [illegible] ملاحظہ ہو [illegible] کہتے ہوئے مصرع اٹھایا۔ پھر کیا تھا سارا مشاعرہ اسی طرح مصرع دہرانے لگا۔ بیچارے بھی خفیف ہو کر چلے گئے۔ اس قسم کی چھوٹی موٹی شرارتیں بھی ترکی کرتے رہتے تھے جو ان کے شایان شان نہ ہوتی تھیں۔

نثر سے بھی شوق فرماتے تھے اور فارسی اردو دونوں زبانوں میں نثر لکھتے تھے۔ ہر جمعرات کی شام میں ایک مجلس نثر گویوں کی منعقد ہوتی۔ اپنے گھر پر مجلس نثر کرتے اور خود صدارت فرماتے۔ میری جرأت وہاں پہنچنے کی نہ ہو سکی مگر بعض شریک ہونے والوں سے جو کچھ سنا ہے وہ کہا نہیں جا سکتا۔ پھر کہیں اور جعفر زٹلی کی روح بھی شرماتی ہوگی۔

غرض ترکی عجیب و غریب شخصیت کے مالک تھے۔ بچوں میں بچے، بزرگوں میں بوڑھے، جوانوں میں جوان، شاعروں میں شاعر، عالموں میں عالم، چونکہ جہاندیدہ تھے اس لئے دروغ بافی بھی بہت فرماتے تھے۔ مگر یہ صرف تعلّی اور خود ستائی کی حد تک ہوتی تھی، کسی کی غیبت نہ کرتے تھے۔

شاگردوں کی غزل کیا بناتے اس کا اس طرح [illegible] تھے کہ [illegible] پیدا ہو جاتی اس طرح کے الفاظ [illegible] اپنی طرف سے دوسری غزل کہہ دیتے تھے اور پھر لوگوں سے کہہ بھی دیتے کہ فلاں صاحب نے [illegible] غزل کہی تھی میں نے پوری غزل کاٹ کر رکھ دی، خود غزل کہہ دی ہے۔ بعض ہی شاگرد ایسے تھے جن کی غزلوں میں لفظی ترمیم و اضافہ ہوتا تھا مگر یہ بھی کوئی خاص اضافہ اور ترمیم نہ ہوتی تھی البتہ معائب شعری اور عروضی غلطیاں ضرور بتا دیتے تھے۔ اصلاح سخن میں وہ کامیاب نہ تھے چنانچہ ایک دو غزلیں بتا کر میں نے بھی منہ کی کھائی ہے۔

سفید پنجابی شلوار اور سفید کرتہ، ریشمی بٹن کا، گھٹنوں سے نیچے تک پہنا کرتے تھے۔ کرتے پر اکثر صدری پہنتے تھے جو کبھی اور بیشتر [illegible] رنگ کی ہوتی تھی۔ سر پر اکثر کلاہ پر پگڑی باندھتے یا کبھی ٹوپی بھی اوڑھتے تھے۔ سردیوں میں شال رومال بھی باندھ لیتے، سر پر بال لمبے لمبے کانوں تک تھے، داڑھی منڈواتے تھے مگر مونچھیں بڑی بڑی تھیں جو سر کے بالوں کے ساتھ خضاب سے سرخ ہوا کرتی تھیں۔ کانوں میں بندے پہنتے تھے۔ صدری کے جیب میں ایک چاندی کی ڈبیہ گلوری اور [illegible] ہوتی تھی جس کی [illegible] چاندی کا [illegible] کیا کرتے تھے،

شاہ [illegible] کی [illegible] ، [illegible] منسوب تھا۔ خدا بھی [illegible] تھی [illegible] شوق فرمانے لگے۔ غالباً انہوں ہی کہا ہے کہ [illegible] سے [illegible] ہو گئی ۔

میرے والد مرحوم کو ترکی سے بڑا اعتقاد تھا اس کا ایک [illegible] وہ مسائل تقسیم کرنے [illegible] وقت سے پہلے [illegible] [illegible] کی [illegible] کی [illegible] اپنے ہاتھ سے [illegible] کے پاس [illegible] [illegible] [illegible] تک [illegible] لکھ کر [illegible] والد نے اسے [illegible] لکھ لیا [illegible] سے بھائی [illegible] [illegible] [illegible] نہیں [illegible] [illegible] کا قطعہ تاریخ [illegible] [illegible] وہ [illegible] والد [illegible] ہو گئے [illegible] نے [illegible] چند روز ٹھہر چلے [illegible] ترکی صاحب [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ولادت [illegible] [illegible] تاریخ ولادت [illegible] [illegible] ترکی [illegible] سے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] تھیں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ترکی [illegible] [illegible] [illegible] ان کا ایک [illegible] ۔

ترکی تو اپنے [illegible] [illegible] وقت اور سب [illegible] ایک [illegible] سے [illegible] تھے ۔ کسی کی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ہوا تھا ۔ طبیعت میں [illegible] اور سادہ [illegible] تھی ۔

مشاعرے میں پڑھنے کا [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] دوسرے [illegible] شاگرد اور [illegible] کے قریب [illegible] بیٹھتے [illegible] [illegible] [illegible] پڑھنے کا انداز [illegible] ، آواز [illegible] [illegible] [illegible] پڑھتے تھے ۔ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] غزل پڑھتے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] مشاعرے میں رباعی پڑھی ۔

دیکھو برتر کو جو غالب کو نہیں دیکھا ہے
[illegible] کی گر ہے [illegible] تو [illegible]

اور [illegible] برتر کی طرف اشارہ کیا پھر مرزا غلام مصطفیٰ [illegible] کی طرف بتایا ۔

اور ناسخ کی جو صورت کی ہے خواہش [illegible]
ترکی [illegible] کے انداز و ادا کو دیکھو

[illegible] اس طریقے سے سنایا [illegible] ترکی مست [illegible] ہوئے اٹھے اور بائیں پاؤں کے انگوٹھے کے بل [illegible] ہو کر سیدھا پاؤں اٹھا کر ایک چکر لگایا جس کی وجہ سے [illegible] کی طرح پھیل گیا اور مجلس مشاعرہ رنگ برنگی ۔ بہ

ترکی مست کے انداز و ادا

تھے ۔ غرض ایسی ایسی [illegible] مشاعرے میں کرتے کہ لوگ حیران ہو جاتے ۔ [illegible] نامی ایک صاحب ان کے [illegible] تو نہیں [illegible] صاحب [illegible]

مشہور تھے جو ہزل کہا کرتے تھے۔ نہایت مسکین طبیعت پائی تھی۔ فارسی کا اچھا اردو مذاق رکھنے کا بہت شوق تھا اور جمعیت [illegible]
کمال کرتے تھے۔ وہ بھی مصاحب تھے ترکی کے ساتھ رہتے تھے، چونکہ وہ لطیفہ گو اور بذلہ سنج تھے اس لئے خوب گھلی ملی تھی مگر تفضل ترکی [illegible]
تھے ہمیشہ ترکی کو چھیڑتے اور چھیڑتے ہی تھے۔

ایک رات مہاراجہ کی ڈیوڑھی سے ترکی گھر واپس ہو رہے تھے تفضل ساتھ تھے۔ ہری باؤلی کے پاس پہنچ کر ترکی سے کہا، استاد یہاں سید صاحب کا مزار ہے وہاں فاتحہ پڑھ لیں تفضل نے کہا چلئے۔ مزار سڑک کے پاس تھا مگر پھاٹک پر تفضل نے ترکی کو ایک مکان میں داخل کر دیا جہاں چند عورتیں صحن میں سو رہی تھیں۔ ترکی نے زور زور سے فاتحہ پڑھنی شروع کی تو عورتیں نیند سے جاگ کر غل مچانے لگیں۔ سارے محلے والے جمع ہو گئے اتفاق سے مکان میں مہاراجہ کے ایک متوسل کا زنانہ تھا وہ اوپر بنگلے پہنچے انہوں نے نیچے آکر دیکھا تو ترکی نظر آئے پوچھا استاد کیا حال ہے تو کہا، میں سید صاحب کی درگاہ پر فاتحہ پڑھنا چاہتا تھا مجھے رات کو کچھ نہیں دکھائی دیتا ہے اس غرض تفضل نے یہاں پہنچا دیا۔ غرض صاحب خانہ نے قندیل ساتھ دے کر اپنے ملازم کو بھیجا اور ترکی گھر پہنچے۔ ایسی دل لگیاں تفضل بہت کرتے تھے ترکی نے مہاراجہ سے سفارش کر کے محکمۂ نظر جمعیت میں تفضل کو نوکر کرا دیا تھا۔ نوکری معاف تھی، گھر بیٹھے تنخواہ آجاتی تھی۔ ایک مشاعرے میں فارسی طرح تھی "یاد کردہ اند" شاعر کردہ اند تفضل نے نصف اردو نصف فارسی غزل پڑھی۔

وصل کے وعدے پہ اس نے قرار کردہ اند ایک مدت سے تھے امیدوار کردہ اند
وہ لگتے تھے جو آنے ترقیات ساتھ لائے دامن ساری سے گل شیخ مزار کردہ اند

اپنی نوکری کے متعلق بھی ایک شعر کہا تھا پہلا مصرع مجھے یاد نہیں آ رہا ہے دوسرا مصرع تھا
نظر میں نوکر جناب پیشکار کردہ اند

ایک اور مشاعرے میں طرح ہوئی تھی "جواں کن" "بیاں کن" وغیرہ تفضل نے بڑی دھوم دھام کی غزل پڑھی تھی مقطع تھا
تفضل جب کہ تو ہو جائے بڈھا
ذرا بیتے وقت میں جو رو جواں کن

بہر حال ترکی اور تفضل کی خوب گھلتی تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ ترکی فارسی کے بڑے پختہ شاعر اور مشہور شعر کے ماہر تھے مگر اردو میں انہیں کوئی حیثیت حاصل نہ تھی۔ اصولاً انہیں اردو میں شعر نہ کہنا چاہئے تھا مگر اپنی بات دوں کہ عمر بھر اردو کی ٹانگ بھی توڑتے رہے اور ایک دیوان بھی اردو کا چھپوا ڈالا تھا۔

بحیثیت مجموعی نہایت دلچسپ اور قابل شاعر تھے۔ ان ساری کمزوریوں کے باوجود بہت غنیمت آدمی تھے اور اپنی وضع کے ایک ہی تھے۔ ترکی کو انتقال کئے ۳۰ سال ہو گئے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کل ہی مرے ہیں۔ آج کل یہ سلطان شاہی میں مقیم ہیں۔ ان کے مکان کے سامنے اکثر گذرتا ہوں اور وہ مجھے بے تحاشا یاد آجاتے ہیں اور شاید زندگی بھر یاد آتے رہیں گے۔

وجودی شاہ

میں نے نوکری سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کئی بار کی تھی چار دفعہ تو نوکریاں چھوڑیں مگر پھر آخر نوکری ہی کرنی پڑی۔ اسی طرح ۱۹۳۰ء میں بھی میں نے ملازمت قبول کی اور اپنے حساب میں نوکری چھوڑ کر ایک ایک گروپ قائم کیا جس کا نام "ادارۂ علمیہ" رکھا اور جس کی تاریخ سے

[illegible] سید شاہ عبدالقادر صاحب [illegible]
[illegible] کے ناخن بڑھے ہوئے [illegible]
[illegible] شاہ صاحب نے [illegible]
[illegible] ارشاد کو [illegible]
[illegible]
[illegible] شاہ صاحب نے [illegible] شکایت [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] فرمانے لگے [illegible]
[illegible] کتب خانہ آصفیہ [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] شاہ صاحب نے [illegible]
[illegible]
[illegible] پاشا بھائی [illegible]
[illegible] پاشا بھائی پکارا کرتے تھے اس لئے میں بھی حیران ہو گیا کہ حضرت [illegible] پاشا بھائی کیسے [illegible] جب بتایا کہ
[illegible] پاشا میاں [illegible] تو حضرت نے کھڑے ہو کر گلے سے لپٹا لیا اور آب دیدہ ہو گئے۔ [illegible] نے تذکرے کرنے رہے
[illegible]
[illegible] کہنے لگے [illegible]
[illegible] فرماتے تھے۔ کہنے لگے میں وہی پاشا محی الدین ہوں۔ پھر میرے بچپن کا حلیہ اور میرے خاندان
[illegible] اور فرمانے لگے مجھ سے یہی توقعات [illegible] مجھے خلوص پیدا ہو گیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ [illegible] عزیز ہے۔ اب مجھے
چچا پکارنا۔ پھر کیا تھا میں چچا پکارنے لگا۔ یہ تھے میرے شفیق بزرگ سید شاہ محی الدین پاشا قادری وجرودی شمسی۔

وجرودی تخلص فرماتے تھے اور چونکہ حضرت شمس الدین اورنگ آبادی کے مرید اور خلیفہ تھے اس لئے اپنے آپ کو شمسی فرمایا کرتے تھے
۱۹۱۵ء تک بھی یہ حضرت ہمارے پاس آتے جاتے تھے اس کے بعد سے پھر نظر ہی نہیں آئے۔ ان دنوں جب یہ غریب خانہ پر تشریف لایا کرتے
تھے جوان تھے، چہرے پر خشخشی سی داڑھی اور سر پر انگریزی تراش کے بال تھے، دوہرا جامہ، پاؤں میں شو یا پمپ شو ہوتا تھا، سر پر تنگ شوخ
ٹوپی ہوتی اور نئی تراش کی رنگین شیروانی پہنا کرتے تھے۔ گویا اس زمانے کے فیشن ایبل لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ [illegible] اور ظہیر دہلوی کے
ساتھ مشاعرے میں شریک ہوا کرتے تھے۔

اب جو چند سال کے بعد نظر آئے تو اس شان سے کہ سر پر لمبے لمبے بال شانوں پر گرتے ہوئے، منہ پر لمبی داڑھی یک مشت و دوازدہ انگشت
جسم خاصا بھاری بھرکم اور چہرہ [illegible] زمانہ سے جھریوں لیا ہوا، سوا آواز اور بات کرنے کے طریقے کے اور کوئی بات سابقہ نہ تھی۔ بہرحال

اور بزرگ نے بھتیجا بنا لیا اور ایسا بنایا کہ بس ہر وقت حاضر رہنے لگے۔ بعض لوگ نے بیعت ہونے [illegible] سے کہا کہ خواہش مند اور کسی نے خطوط لکھے، کیونکہ حضرت کے پاس ہر قبیل کے لوگ زیادہ آیا کرتے تھے۔

صبح ہی سے ملاقاتی آنے لگتے، مریدین، معتقدین اور ضرورت مندوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ مریدین [illegible] دیتے۔ معتقدین خاص ضرورت کے تحت آتے، مگر ایک جماعت ہر وقت بیٹھی رہتی تھی جو حضرت کی طرف دیکھتی رہا کرتی تھی۔ بعض لوگ کل علیات تعویذ گنڈوں کے لئے بھی آ جاتے اور بعض محض روحانی برکت کی خاطر حاضر ہوتے تھے۔

میں جب بھی پہنچتا حضرت سب کو چھوڑ کر میری طرف متوجہ ہو جاتے، میرے لئے چائے منگاتے یا باہر سے سگریٹ، اور شعر و شاعری، لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی، فقرے، پھبتی، ضلع جگت سے سلسلہ گفتگو شروع ہو جاتا اور بعض وقت بے تکلف لطائف بھی بیان ہو جاتے۔

مریدین اور معتقدین حیران ہوتے کہ حضرت اس نوجوان سے اتنے مانوس کیوں ہیں، مگر وہ فطرت انسانی سے ناواقف تھے۔ حضرت بھی انسان تھے، ہر وقت حدیث، فقہ، مسائل اور وحدت الوجود بیان کرتے کرتے تھک جاتے تھے۔ مریدین اور معتقدین سے دل لگی نہیں کر سکتے تھے اور نہ اس حلقے میں کوئی اس کا اہل ہی تھا، اس لئے اس تفریح کے واسطے انہوں نے مجھے منتخب فرمایا تھا۔ چنانچہ میرے پہنچتے ہی ایک ایک کر کے سب کو رخصت کر دیتے۔ بعض بے تکلف جو رہ جاتے وہ بیٹھے رہتے اور پھر سید شاہ وجودی صاحب فقط وجودی رہ جاتے اور ایک شاعر کی طرح بے تکلف ہو جاتے۔

حضرت شمس الدین صاحب قبلہ نے حیدرآباد میں بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ چشتیہ گھرانے کے بزرگ تھے، خدا جانے کون سے علوم سے لوگوں کو موہنے لگتے۔ جس کے سر پر ہاتھ رکھ دیتے وہ بندہ بے دام ہو جاتا۔ جنہیں طوائفوں کو تائب کرا کر نکاح کرا دیا، چنانچہ ترک جان اور نصیبن وغیرہ جیسی مشہور رنڈیاں حضرت کے ہاتھ تائب ہوئیں اور لوگوں سے نکاح کر کے گھر بیٹھ رہیں۔ بیشتر ہندو خاندان بھی معتقد تھے، چنانچہ شیو راج بہادر، شامی پرشاد وغیرہ کا خاندان پورا معتقد تھا۔ جگن ناتھ پرشاد صاحب بعد کو جمیل الدین احمد بنے، انہی شمس الدین شاہ کے دست گرفتہ تھے، جنہیں بعد میں مولوی محمد حسین صاحب (ناظم ونپرتی) نے تیار کیا۔

اپنے پیر کی طرح وجودی شاہ صاحب نے بھی بڑی خدمت کی، خود مرید کرنے کے خواہش مند نہ تھے۔ لوگ مرید ہونے آتے تو اپنے پیر بھائی نضے میاں یا اپنے خلیفہ نظام الدین وغیرہ کے پاس بھجوا دیتے۔

نہایت ہی نڈر، بڑے بے باک اور فطرتاً باغی تھے۔ حیدری صاحب صدر اعظم حیدرآباد جیسے پیر پرست فقیر دوست اور بزرگ نواز تھے، حیدرآباد کے پیران باصفا حیدری صاحب سے طرح طرح فائدے اٹھاتے تھے۔ میں نے جب یہ دیکھا کہ وجودی صاحب کی کوئی معاش نہیں ہے اور ان کی گزر بسر بڑی تکلیف سے ہوتی ہے تو میں نے کہا حیدری صاحب کو آپ کے پاس پہنچا دیتا ہوں، ان سے اپنے لئے تنخواہ کرا لیجئے اور خانقاہ کے لئے کچھ نقد رقم منظور کرا لیجئے۔ یہ سنتے ہی مجھ پر برس پڑے، خوب بے نقط سنائیں، مگر میں نے بھی ان کا ناک میں دم کر دیا۔

مولوی محمد سجاد صاحب ہماری خاندان کے تاریخ بزرگ تھے۔ مدرسہ دار العلوم میں والد مرحوم اور چچا مولوی سید غلام حسین صاحب مرحوم کے ساتھ پڑھ چکے تھے اور اتفاق سے میرے ہی دفتر کے مددگار رہے، یہ حیدری صاحب کے "روحانی سیکرٹری" تھے۔ یعنی کہ جتنے مولوی، مشائخ، مجذوب وغیرہ حیدری صاحب سے ملتے وہ انہی کے توسط سے ملتے تھے اور یہ جہاں لیجانا چاہیں حیدری صاحب کو لے جاتے تھے۔ اس لئے میں نے ایک دفعہ مولوی سجاد صاحب کو ساتھ لے جا کر وجودی شاہ صاحب سے ملا دیا اور شاہ صاحب نے سجاد صاحب پر وہ رعب گانٹھا کہ سجاد صاحب بس گرویدہ ہی ہو گئے، کہنے لگے "ابی! تمکین صاحب! یہ بزرگ تو بڑے صاحب کمال ہیں"۔ میں نے کہا

[illegible] شاہ صاحب [illegible] آگئے [illegible] صاحب [illegible] کر دیا [illegible] صاحب [illegible] شاہ صاحب [illegible] شاہ صاحب [illegible] صاحب تشریف لائے [illegible] آپ [illegible] ویاں خانہ میں حاضر [illegible] شاہ صاحب [illegible] تفصیل [illegible] حیدری صاحب [illegible] ملازمین [illegible] کیونکہ [illegible] حیدری صاحب تنہا آئے [illegible] وجودی شاہ صاحب سے مل کے گئے مگر [illegible] تیسری دفعہ آنے کے بعد چوتھی بار انہوں نے تکلیف نہیں کی۔ اس کا سبب نہ تو وجودی صاحب نے بتایا۔ حیدری صاحب نے [illegible] سے کچھ کہا [illegible] سمجھتا ہوں کہ حضرت نے کوئی کمال [illegible] دے دی ہوگی جس سے حیدری صاحب رک گئے۔

بہرحال وجودی شاہ میں یہ خصوصیت تھی کہ وہ [illegible] میں نہ لاتے [illegible] ایک تھے۔ اصل بات یہ تھی کہ انہیں سونا بنانا آتا تھا [illegible] جیب [illegible] سونا بنا [illegible] فروخت [illegible] منگوا لیتے، ملازمین کی تنخواہیں، مکان کا کرایہ ادا کر دیتے [illegible] مہمان [illegible] اس کے بعد پھر قرض کا سلسلہ شروع ہوتا [illegible] تنگدستی سے [illegible] جاتے [illegible] خاص [illegible] فروخت کر کے رقم لا دو [illegible] فروخت کرتے۔ دوسرے وقت شاہ عبدالقادر صاحب کے اور میرے [illegible] آٹھ آٹھ تولہ سونا [illegible] کہ فروخت کر دو [illegible] تھا۔ جس دن یہ سونا ہمارے ہاتھ سے فروخت کرایا گیا [illegible] پچیس روپے تولہ فروخت ہوا۔ اس طرح زندگی بھر عمدگی سے گزارا کرتے رہے۔

یہ سونا بنانا انہوں نے کس طرح سیکھا کبھی بھی ظاہر نہیں کیا۔ بیشتر لوگ [illegible] کہ ان سے کیمیا کا نسخہ معلوم کریں گے مگر انہوں نے کسی کو بھی نہیں بتایا [illegible] عراق میں بھی بہت رہ چکے تھے نہ جانے کس سے سیکھا [illegible] دیا تھا [illegible] کی ایک خاتون سے شادی کی تھی جو ساتھ رہتی تھیں۔ کوئی اولاد نہ تھی اکثر مریدوں کے بچوں کو اپنے پاس رکھ لیتے تھے۔

کبھی جی چاہتا تو رنڈیوں کا گانا بھی سن لیتے تھے [illegible] سلسلۂ ابوالعلائی بھی تھا [illegible] کہیں جانے [illegible]

بیٹے، جتنے پیسے ہیں جانے چاہییں اور نفسیات داں تھے۔ حیدرآباد میں مشہور ہو گیا تھا کہ ایک [illegible] سو سال [illegible] یہ
یوسف شریف کے تصرف سے ہوا۔ اسی شہرت کے سلسلے میں ایک مرزی صاحب جو ماما العرب کے خاندان [illegible]
مدرس تھے حضرت سے ملنے کے لیے آئے اور یہی ذکر کیا اور کچھ ایسی گفتگو کی کہ شاہ صاحب کو جلال آگیا۔ جھٹ سے آپ نے [illegible]
آدمی ہو کر واقعی جن بنا لیا اور کہنے لگے سامنے مرزی ایسے لگ رہے ہو بزرگ بن میں ایک ادنیٰ غلام [illegible] کا ہوں، دیکھا ابھی تجھے [illegible]
بنا دیتا ہوں۔ یہ کہتے ہوئے جو آنکھیں نکالیں اور چہرہ خوفناک بنایا تو مرزی ساری شیخی بھول گئے اور جوتیاں چھوڑ کر وہاں سے بھاگ گئے۔
مارے ہنسی کے میرا برا حال ہو گیا اور تھوڑی دیر کے بعد حضرت بھی ہنسنے لگے۔ اس طرح بعض مرتبہ بڑی مزے دار گپیں [illegible] تھے۔

نواب اسمٰعیل خاں، جہانگیر واجد علی آباد، بیگم نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اکثر حیدرآباد آیا کرتے تھے کیونکہ جلیس ملیح الملک سے ان کی [illegible]
تھی۔ ایک دفعہ وہ ملنے آئے تو میں بھی بیٹھا ہوا تھا ان سے میرا تعارف یہ کہہ کر کرایا کہ میرے بھتیجے ہیں۔ بعد میں کہیں ان سے پھر ملاقات ہوئی
تو انہوں نے پوچھا جناب! آپ کے چچا صاحب کہیں اڑ گئے ہیں [illegible] نہ کر سکے اور باتیں کہتے کہتے [illegible]
میں نے کہا: چچے ہی کب تھے جو کہیں بیچ کر سکتے۔ اس پر وہ بہت مسرور ہوئے اور دیر تک شاہ صاحب کا ذکر کرتے رہے۔ وہ جب
کبھی آتے شاہ صاحب سے ضرور ملتے تھے۔

حضرت امجد سے وجودی شاہ کی بہت دوستی تھی۔ سید ابراہیم ادیب، عربی کے پروفیسر اور ماہر ادب الجاہلیہ کے بہت جید عالم تھے
بھی ان کے بڑے مخلص دوست تھے۔ وجودی شاہ کا اور امجد کا قریباً ہر روز کا ساتھ تھا اس لیے دونوں میں بڑی بے تکلفی بھی جاری [illegible]
کو صرفی مجلسی تھی مگر وجودی شاہ ہمیشہ ان سے یہی کہتے کہ امجد تو تھوڑا سا تصوف پڑھ لو اور وہ ہنس کر خاموش ہو جاتے اور سید ابراہیم صاحب
وجودی شاہ سے باقاعدہ مسائل تصوف پوچھا اور سمجھا کرتے تھے۔

مریدوں کی تعداد خاصی تھی۔ کوئی دو تین سو مرید ہوں گے۔ چند خلیفہ بھی تھے۔ خالد [illegible] جان نثار جنگ کو بھی خلافت دی تھی اور خالد میاں ان کے
چہیتے خلیفہ تھے۔ اپنا کتب خانہ بھی انہی کو دے دیا تھا اور وصیت کی تھی کہ خالد میاں کے باغ میں دفنایا جائے چنانچہ خالد میاں نے انہیں اپنے
باغ ہی میں دفنایا اور مقبرہ بھی بنا دیا اور ہر سال بڑی دھوم سے عرس بھی کرتے ہیں۔

حیدرآباد میں زندگی بھر [illegible] ہمیشہ آیا کرتے تھے جب ایک دفعہ ایک بزرگ عوض علی شاہ تشریف لائے جو شاہ صاحب کے پاس بھی آنے
جانے لگے۔ چنانچہ انہوں نے مجھے وہاں اکثر دیکھا اور حضرت سے بے تکلف پایا تو ایک دفعہ میرے سامنے ہی پوچھا کہ یہ کون صاحب ہیں
تو کہا: ایک سلسلے میں یہ میرے پیر ہیں۔ انہوں نے پوچھا کون سا سلسلہ تو کہا: ابلیسیہ۔ وہ حیران ہوئے کہ ابلیسیہ سلسلہ کیسا تو کہا آپ کو
شاید معلوم نہیں کہ معلم الملکوت نے بھی اپنے خلفاء بنائے ہیں چنانچہ یہ انہی کے خلیفہ ہیں اور سلسلۂ ابلیسیہ میں صاحب خرقہ و سجادہ ہیں میں نے
اس سلسلے میں انہی سے بیعت کی ہے۔ عوض علی شاہ یہ سن کر اتنے پریشان ہوئے کہ پھر انہوں نے وہاں آنے کی ہمت نہیں کی۔

اپنے قدیم ملنے والوں اور پرانے دوستوں سے وجودی شاہ کو بڑی ہمدردی تھی چنانچہ ڈاکٹر راحت اللہ خاں کیوریٹر آصفیہ لائبریری کو جو
ان کے قدیم ہمدم اور دوست کے فرزند تھے بہت چاہتے تھے اسی طرح بعض اپنے قدیم دوستوں سے بڑی وضعداری سے ملتے تھے۔

وجودی شاہ کا خاندان بہت بڑا تھا مدراس اور گیر اور نیلور میں ان کے قرابت دار بہت تھے حیدرآباد کے مشہور صاحب قادری
کے گھرانے سے جو تاج محی الدین پاشا کا خاندان کہلاتا تھا قرابت تھی۔ مشہور ہفتہ وار اخبار مخبر دکن مدراس کے اڈیٹر اور مالک سید
عبدالقادر صاحب [illegible] قریبی عزیز تھے۔ اس طرح خاندان بہت بڑا اور پھیلا ہوا تھا مگر وجودی شاہ سب سے دور دور رہا [illegible] رہتے
مجھ جیسوں کی خصوصیت [illegible] وہ [illegible] اور روپیہ پیسہ [illegible] کے عادی نہ تھے بہت ہی سیدھے سادے وضع دار تھے

[illegible] کو کسی کو ہاں کتابیں دیتے ہیں لوگ بیٹے اور پیش بہا [illegible] تھے۔
شہر میں غضب کے تھے وہاں کمل کر لیا تھا۔ اس میں بہت کچھ حصہ ان کے ایک ... صاحب نے دو سال ... کے
... کہ ... بہت زیادہ ہوتی ہیں۔
بہرحال ... شاہ صاحب بہت ... [illegible] ... ہے
ان سے ... ملاقات کا ... نہ ہو سکے۔
کتنا ... عبدالحق ... اور ... زیادہ ... ہے کا
مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی!

مولوی سید محمد یوسف الدین

بعض لوگ اس نام کو پڑھ کر حیران ہوں گے کہ یوسف الدین صاحب کا شخصی خاکہ میں کس طرح لکھ سکتا ہوں کیونکہ ان کا انتقال ہوئے ۴۰ سال ہو گئے اور ان کی وفات کے وقت میری عمر ۱۰ سال کی تھی مگر حقیقت یہ ہے کہ دوسرے ہی واقفیت کی وجہ یہ ہے کہ مولوی صاحب میری والدہ کے حقیقی ماموں تھے۔ میرے نانا سید عبدالرحیم صاحب جو حکومت حیدرآباد کے اول تعلقدار (کلکٹر) اور غالب الملک کے اسٹیٹ کے مہتمم تھے انہوں نے جس وقت انتقال کیا ہے میری والدہ کی عمر تین تھیں انہیں مولوی صاحب نے اپنے پاس بلا لیا اور خود کی نگرانی میں تعلیم دلائی۔ اس طرح شادی ہونے تک والدہ انہی کے پاس رہیں۔ شادی کے بعد اپنے گھر ہونے کے بعد بھی مولوی صاحب ہر ہفتے آیا کرتے اور میں دو دن تک ان کے ساتھ ہی ساتھ رہتا تھا۔

یوسف الدین صاحب کی ولادت اور تعلیم حیدرآباد میں ہوئی تھی مگر عجیب و غریب مزاج انہوں نے پایا تھا۔ باوجود صلاحیت اور خاندانی شرافت کے معمولی ملازمت قبول کر لی اور ترقی کرتے کرتے چند ہی سال میں اول تعلقدار (کلکٹر) ہو گئے۔ حضور ... سر محبوب علی خان شاہ دکن کو آپ پر پورا اعتماد تھا، چنانچہ ... (ریاست) ... اسٹیٹ کی معتمدی ... آپ نے وہاں کے حالات دیکھ کر کچھ اصلاحیں کرنے اور پہلا بجٹ (بجٹ) مرتب کرنے کے بعد معذرت کر لی اور پھر تعلقداری پر چلے گئے۔

مولوی صاحب کی ایک بڑی نفیس ... تھی جس کے رکن ڈاکٹر ... نواب عماد جنگ (مرحوم) نواب رفعت یار جنگ (مرحوم) حاکم ... کاظم علی صاحب معتمد تعمیرات، محبوب علی صاحب کمشنر کروڑگیری (کسٹم) مولوی ... علی صاحب مولوی عبداللہ صاحب عرف کتے والے شاہ صاحب، ملا عبدالقیوم وغیرہ تھے

حیدرآباد والوں میں یوسف الدین صاحب پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے شہر سے دور جنگل میں ... کے قریب ٹولی چوکی قلعہ گولکنڈہ کے راستے میں ایک اونچی پہاڑی پر بنگلہ بنوایا اس کا نام انہوں نے "جبل السلام" رکھا۔ یہ یورپین وضع کی خوشنما کوٹھی اب تک موجود ہے۔

ابتداً یوسف الدین صاحب نے ایک اینگلو انڈین گھرانے میں جو مسلمان ہو گیا تھا شادی کی ان خاتون سے کئی لڑکے ہوئے مگر زندہ نہ رہے بالآخر اپنی بہنوں یعنی میری نانی اور دوسری تین بہنوں کے مجبور کرنے سے حیدرآباد کے ایک امیر گھرانہ میں شادی کی اور ان خاتون کے بطن سے کئی لڑکیاں اور لڑکے ہوئے جن میں سے بیشتر اب بھی موجود ہیں چنانچہ بیگم نواب ولی الدولہ (... پائیگاہ) مرحوم ہی کی ... ہیں اور مولوی نظام الدین حسن صاحب نائب ناظم ... رجسٹریشن ... انہی کے فرزند ہیں۔

مرآباد ایک بہت معمولی مقام ریاست حیدرآباد میں تھا جس کی آبادی کم تھی چونکہ کسی نے بہت شہرت نہیں دی تھی مولوی صاحب نے مرآباد کا بھی جائزہ لیا اور [illegible] کر ایک مفصل رپورٹ مرتب کی اور اس مقام کو سینی ٹوریم بنانے کی تحریک کی۔ یہ رپورٹ [illegible] ہوئی تھی جو قابل دید ہے اس میں مرآباد کے متعلق کوئی بات چھوٹی نہیں وہاں کی پیداوار، زمین کی کیفیت، آب و ہوا، جغرافیائی حالات، جنگلوں سے لے کر وہاں کی جڑی بوٹیوں تک کے نام اور ان کے خواص تک لکھے ہیں اب پچاس سال کے بعد اس کی رپورٹ پر عمل کیا گیا ہے اور مرآباد کو سینی ٹوریم بنا دیا گیا ہے۔

اسی طرح تنگبھدرا پراجیکٹ کا خیال بھی سب سے پہلے یوسف الدین صاحب ہی کو آیا اور انہی نے جرمنی بھی چھوٹی رپورٹ لکھی تھی جو گم ہو گئی تھی اب تک یہ دونوں ادارے کہیں یہ منصوبہ پورا ہوا۔

ریاستیں ہمیشہ سازش کا گہوارہ بنی رہیں۔ چنانچہ حیدرآباد بھی اس سے بچ نہ سکا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ آج سے ساٹھ سال پہلے عثمانی میں ایک منظم سازش یہاں شروع کی گئی تھی ایک محضر بنایا گیا تھا جس میں سلطنت کا روبار سے حضور نظام کی بے رغبتی کا اظہار کر کے خواہش کی گئی تھی کہ یہاں ریجنسی قائم کی جائے اور اس محضر پر حیدرآباد کے بڑے بڑے لوگوں نے دستخط کئے تھے اور یہ محضر وائسرائے کے پاس بھیج دیا گیا تھا۔ مولوی صاحب کو اس کی اطلاع ملی تو انہوں نے سب سے پہلے حضور نظام کو یہ اطلاع پہنچا دی اور پھر اس کے انسداد کی فکر کرنے لگے اس زمانے کا ریزیڈنٹ بھی سازشیوں سے ہمدردی رکھتا تھا اس نے بھی شاید اس [illegible] میں دلچسپی لی تھی اور حیدرآباد کے ریزیڈنٹ سے اس قسم کی کوئی رپورٹ حاصل کی تھی بہرحال وائسرائے نے اس محضر کو معہ شہادتوں کے ساتھ منسلک کر کے اپنی ذاتی رپورٹ کے ساتھ لندن بھجوانے کے لئے سربمہر لفافہ تیار کر لیا تھا اور یہ لفافہ وائسرائے کے میز کے خانے میں رکھا تھا کہ مولوی صاحب نے وہاں پہنچ کر کسی طرح یہ لفافہ حاصل کر لیا اور حیدرآباد واپس ہو گئے مگر مولوی صاحب راستے ہی میں تھے کہ گڑبڑ شروع ہو گئی اور وائسرائے کو معلوم ہو گیا کہ انہوں نے لفافہ حاصل کر لیا ہے چنانچہ ٹیلی گرام دوڑنے لگے اور مولوی صاحب جب حیدرآباد اسٹیشن پر ٹرین سے اترے تو انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ مولوی صاحب نے راستے ہی سے بعض لوگوں کو تار دے دئے تھے اور وقار آباد و بیگم پیٹھ اسٹیشن پر بعض لوگ موجود تھے جنہیں مولوی صاحب نے اپنا اٹیچی کیس دے دیا تھا جس میں وہ لفافہ تھا۔ اس طرح لفافہ حیدرآباد پہنچ کر محفوظ ہو گیا اور مولوی صاحب نے گرفتار کنندگان سے جھگڑا شروع کیا کہ ریاست میں تحویل ملزمین کا قانون چونکہ نافذ نہیں ہے اس لئے ان کی گرفتاری غیر قانونی ہے۔ بہرحال حکومت برطانیہ کو اسی سلسلہ میں تحویل ملزمین کا قانون نافذ کرنا پڑا اور مولوی صاحب کو بھی رہا کر کے ضمانت پر چھوڑ دیا گیا مگر مشکل یہ تھی کہ مولوی صاحب نے جو جرم کیا تھا اس کا اظہار کیا نہ جا سکتا تھا اس لئے چند فرضی الزامات مثلاً وائسرائے گل لارج کے ملازمین کو رشوت دینا وغیرہ کا مقدمہ چلایا گیا مگر پریوی کونسل نے مولوی صاحب کو عزت کے ساتھ بری کر دیا اور حکومت حیدرآباد نے دوران مقدمہ میں جو انہیں معطل رکھا تھا پریوی کونسل کے فیصلے کو دیکھ کر بحال کر دیا اور ایام معطلی کی پوری تنخواہ بھی دلوا دی اور پھر انہیں اعلیٰ تعلقداری (کلکٹری) سے صوبہ داری (ڈویژنل کمشنری) پر ترقی بھی دی گئی۔

بیان کیا جاتا ہے کہ اس محضر کو حضور [illegible] نے ملاحظہ نہیں فرمایا یا ملاحظہ فرمانا بھی چاہا تو مولوی صاحب نے عرض معروض کر کے روک دیا اور پورا محضر بلا لفافہ اسی حالت میں جلا کر خاک کر دیا گیا۔ البتہ چند سرغنے جو اس سازش کے بانی تھے حیدرآباد سے نکال دئے گئے تھے

تہ۔ یہ لہر بلائے ورے بخیر گزشت

یہ تو تھے مولوی صاحب کے سیاسی اور انتظامی کارنامے مگر ان کا سب سے بڑا علمی کارنامہ "خط النسخ/ الستامی" ہے۔ قصہ یہ ہے کہ مولوی صاحب کو اردو رسم الخط کی خرابیوں اور سارے ٹائپ کے بھدے پن کا بہت احساس تھا۔ چنانچہ انہوں نے مدت تک غور و فکر کر کے ایک

[illegible] کے نام سے ستیہ کیا تھا اس سلسلے میں [illegible] کی حیثیت سے [illegible] کیا تھا [illegible]
[illegible] کر [illegible] گیا تھا [illegible] آپ [illegible]
[illegible] گزشت [illegible] کے ساتھ [illegible]
[illegible] کئے گئے تھے [illegible] سے [illegible] کی [illegible]
سے بہت [illegible] اور مولوی صاحب نے خط انسلاکی ٹائپ کی [illegible]

[illegible] مولوی صاحب نے [illegible] صاحب کے ساتھ [illegible] تھا اس لئے [illegible]
[illegible] گورنمنٹ [illegible] میں رہنے لگے [illegible]
[illegible] چند [illegible] حصوں [illegible]
[illegible] مولوی صاحب [illegible] آئینہ بنی تھیں۔

[illegible] ترتیب حروف [illegible] مولوی صاحب نے [illegible]
[illegible] مختلف [illegible]
[illegible] خط انسلاکی [illegible]
[illegible] ٹائپ [illegible]
[illegible] چھپائی [illegible] عبارت خط انسلاکی میں چھپائی تھی۔ اس
[illegible] بہت پسند فرمایا اگرچہ چند مہینوں [illegible] خط انسلاکی [illegible]
[illegible] عام ہو جاتا لیکن بدقسمتی سے [illegible] مولوی [illegible] صاحب کو
[illegible] چند ہی مہینوں کے بعد بیمار ہو گئے اور ان کے گلے [illegible] حیدرآباد [illegible] ڈاکٹر [illegible]
بالآخر مولوی صاحب کو مدراس لے جانا پڑا مگر وہاں بھی علاج [illegible] مایوس ہو کر واپس ہو رہے تھے کہ قیام گاہ سے اسٹیشن
لے جاتے [illegible] پر بٹھا کر ٹرین ہی میں اٹھایا گیا اللہ کو پیارے ہو گئے اور مدراس ہی میں [illegible] حالت میں آسودہ ہوئے۔

خط انسلاکی مولوی صاحب کا کارنامہ ایسا کارنامہ ہے کہ اس پر ہندوستان [illegible] ناز کر سکتا ہے آج جو ٹائپ کی ضرورت محسوس
ہے اور رائج ٹائپ [illegible] ٹائپ اور چھاپہ ٹائپ رائج نہ ہونے سے اردو زبان کو جو نقصان پہنچ رہا ہے اس کا ضرورت کو محسوس کر کے
اردو زبان کے لئے ہندی اور رومن ٹائپ قبول کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں اور اردو رسم الخط کی بے [illegible] پر زور دے رہے ہیں
[illegible] کہ آج سے پچاس سال پہلے مولوی صاحب نے محسوس کیا تھا اور [illegible] قبل از وقت [illegible] کے تحت اس کا حل بھی انہوں نے
نکال لیا تھا۔

مولوی صاحب کے انتقال کے بعد والد مرحوم کو خط انسلاکی سے بڑی دلچسپی تھی مگر یہ حضرت نرے مولوی اور شاعر قسم کے بزرگ تھے،
[illegible] تعلق کی وجہ سے اصلاح [illegible] بھی مقدر میں تھی اس لئے کچھ کر نہ سکے۔ مولوی صاحب کے تین فرزند تھے اور یہ تینوں بھی ان کے انتقال
[illegible] کم رہیں تھے، البتہ مرحوم کی صاحبزادی بیگم [illegible] نہایت قابل [illegible] تھیں جو بفضلہ اب تک موجود ہیں مگر انہیں
[illegible] کے انتظامی امور سے فرصت نہ مل سکی جو اس ٹائپ کی طرف توجہ کر سکتیں۔ بڑے فرزند مولوی سید فضل الدین نے [illegible]
[illegible] کیا، منجھلے فرزند مولوی سید نظام الدین گورنمنٹ [illegible] حیدرآباد کے نائب ناظم ہوئے اور انہیں [illegible]

لیکن یہ بات خود ان کے ذہن میں تھی کہ اردو ٹائپ ایجاد کئے اور نسخ کا جو ٹائپ بنایا گیا ہو ہندوستان اور پاکستان میں ہوا وہ اردو ٹائپ ہے مگر اس میں ہر جگہ اس کی مدد سے اور کرسی کی آفت ہے۔

میں بچپن ہی سے خط انتعالی سے مانوس ہوں میرے سامنے اس کا استعمال ہوتا اور دس بارہ سال کی عمر ہی سے لکھنے لگا اور سیکھ لیا۔ اردو دنیا چونکہ نستعلیق ٹائپ کے چکر میں پھنسی ہوئی تھی اس لئے میں انتظار کر رہا تھا کہ نستعلیق ٹائپ کا دور ختم ہو اور اردو دنیا نستعلیق کی ناکارگی کو اچھی طرح سمجھ لے تو میں اس خط کو پیش کروں، خدا کا شکر ہے کہ اب وقت آگیا ہے اور اردو زبان کے لئے ایک ایسے ٹائپ کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے جو منفرد حروف رکھتا ہو، خوبصورت ہو، پڑھنے میں آسان ہو، جس کا ٹائپ رائٹر بھی بن سکے اور ٹائپ رائٹر بھی عمدہ ہے۔

ان سب خصوصیات کا حامل "خط انتعالی" ہے۔ چونکہ یہاں موقع نہیں ہے اس لئے میں اس خط کو پیش نہیں کر سکتا انشاء اللہ تعالیٰ کسی آئندہ شمارہ میں خط انتعالی پیش کروں گا۔

معاف فرمائیے اس تفصیل میں زیادہ وقت ضائع ہو رہا ہے اور مولوی یوسف الدین کی شخصیت ابھی پردے ہی میں ہے۔ مولوی صاحب سرخ و سپید بزرگ تھے انتقال کے وقت ساٹھ ایک سال کی عمر تھی پر افتادہ، بھاری بھرکم جسم، گول چہرہ، بڑا ہی رعب دار، بھرواں داڑھی، خضاب لگایا جاتا تھا، سر پر انگریزی وضع کے بال، ہمیشہ سیدھی مانگ نکالا کرتے تھے، سر پر صرف منصب داری پگڑی دستار ہوتی، دوسرے ترکی ٹوپی کبھی کبھار پہنتے تھے، طیلسانی رومی ترکی ۱۹۰۰ء سے پہلے میں نے انہیں سوٹ پہنتے ہوئے بھی دیکھا ہے مگر ٹائی نہ لگاتے تھے گلوبند لپیٹ لیا کرتے تھے۔ جس کپڑے کی شیروانی ہوتی اسی کپڑے کی پتلون بھی ہوتی تھی۔ صرف نماز کے لئے عیدین یا جمعہ کو مسجد جاتے تو ڈھیلا ڈھالا پاجامہ پہنتے یا گھر پر پاجامہ رہتا ورنہ ہمیشہ پتلون اور شیروانی پہنا کرتے، گھر میں ململ کا کرتہ اور پاجامہ پہنتے مگر یہ پہنے ہوئے یا تو اندر زنانے ہی میں رہتے یا پھر اندرونی حصے ہی میں اس لباس میں نظر آتے، ڈرائنگ روم میں بغیر شیروانی کے نہیں آتے تھے۔ متانت و سنجیدگی کا یہ حال تھا کہ انہیں کھلکھلا کر ہنستے ہوئے کسی نے بھی نہیں دیکھا البتہ مسکراتے ضرور تھے، گفتگو نہایت مختصر کرتے بلکہ اشاروں سے مطلب ادا کیا کرتے تھے، تحریر اور تقریر دونوں مختصر، تقریر تو ان کی کسی نے نہیں سنی کیونکہ دو چار جملوں ہی میں اپنا مطلب ادا کر دیتے تھے۔

میری والدہ کو بہت چاہتے تھے اور وہ ان کی خدمت میں گستاخ بھی بہت تھیں چونکہ باتیں بہت کرتی تھیں اس لئے مولوی صاحب انہیں طوطی پکارا کرتے تھے، میری ولادت ہوئی تو مولوی صاحب نے میرا نام رکھا "ابو رضا سید مصباح الدین" یہ تاریخی نام تھا اور سنہ ولادت ۱۳۲۳ھ نکلتے تھے۔ مجھے ابو رضا پکارا کرتے تھے کبھی کبھی موڈ میں ہوتے تو طوطا بھی کہتے۔

میری تسمیہ خوانی (بسم اللہ) ہوئی تو مولوی صاحب نے مجھے سوٹ سلوا دیا اور اس کے بعد سے اپنے انتقال تک ہر مہینے مجھے ایک مد سوٹ سلوایا کرتے، اپنے بچوں کے لئے جب کپڑے بنواتے میرے لئے بھی بنوا دیتے اور اپنی لڑکیوں کے لئے جب کپڑے تیار کراتے میری والدہ اور خالہ کے لئے بھی بنواتے تھے۔

میرے نانا سید رحیم الدین صاحب کی جائداد سے جو روپیہ ملا تھا اسے مولوی عبدالباقر خاں وکیل حیدرآباد کے پاس محفوظ کرا دیا تھا۔ جب ضرورت پڑتی میری نانی مجھے بھیج کر وکیل صاحب کے پاس سے روپیہ منگوا لیتیں۔ مولوی عبدالباقر خاں سے مولوی صاحب کی بڑی گہری دوستی تھی کوئی کام ان کے مشورے کے نہ ہوتا تھا، اسی طرح مولوی عبدالغفور صاحب وکیل سے بھی ان کے پرخلوص مراسم تھے انہی مراسم کی وجہ سے مولوی صاحب کی بڑی صاحبزادی مولوی عبدالغفور صاحب کے صاحبزادے سے بیاہی گئیں اور مولوی عبدالباقر خاں صاحب کے فرزند مولوی عبدالباسط خاں (جو بعد کو باسط جنگ ہوئے) کو مولوی صاحب نے دوم تعلقدار بنایا اور پھر صوبہ داری گلبرگہ کی مددگاری پر تقرر کیا تھا۔

مولوی صاحب کی [illegible] سنبھالے ہوئے حال تھا کہ کسی سے کچھ تعلق نہ رکھتے تھے [illegible] جائے کہ [illegible] ایک [illegible] مولوی صاحب بڑے فکر [illegible] شاید [illegible] کی [illegible] ہوا [illegible] جب سب [illegible] دیکھتے کیا ہیں کہ [illegible] ہے اور زندگی کے کوئی آثار نہیں [illegible] مولوی صاحب سے [illegible] معلوم کیا [illegible] سے [illegible] دودھ [illegible] جا رہا ہے [illegible] دودھ [illegible] شیشے [illegible] پرورش ہوئی۔

ایک دفعہ مولوی صاحب [illegible] دورے پر گئے ہوئے تھے واپسی پر [illegible] سے [illegible] اُدھر [illegible] خوب [illegible] مولوی صاحب [illegible] جاتے ہوئے [illegible] ہوا [illegible] مولوی صاحب [illegible] کمرے میں [illegible] تھا اور وہ [illegible] مولوی صاحب پلنگ پر بیٹھے اپنے پاؤں [illegible] دیکھا کہ ماموں جان پلنگ پر بیٹھے اپنے پاؤں آپ [illegible] مجھے اس نے پاؤں دکھ رہے ہوں گے [illegible] نہیں کیا اور اپنے پاؤں آپ دباتے رہے۔

میری نانی جو مولوی صاحب کی پھوپھی بھی اور اپنے بھائی [illegible] مولوی صاحب کے گھر پانی [illegible] تھیں جب میں نے بڑے ہو کر ان سے پوچھا "اماں! آپ ماموں جان کے گھر میں کھانا کھاتی ہیں [illegible] کیوں [illegible] ان کے گھر کا کھانا پانی میرے لئے حرام ہے" [illegible] میں [illegible] سے پوچھا [illegible] کیا چیز ہے مگر کسی نے نہیں بتایا ایک روز جبکہ مولوی صاحب مجھے اپنے ساتھ سکندرآباد لئے جا رہے تھے میں نے خود ان سے [illegible] پوچھا [illegible] حیران ہوئے کہ مسلمان کیا ہوتا ہے پھر میں نے سارا قصہ سنایا اور بتایا کہ اماں نے ایسا کہا ہے تو مولوی صاحب نے [illegible] قہقہہ لگایا اور کہا — فری میسن ایک سوسائٹی ہے جسے فری میسن لاج کہتے ہیں یہ ایک اخلاقی سوسائٹی ہے جس کے رکن وہی ہو سکتے ہیں جو کسی مذہب کے پیرو اور خدا کی وحدانیت کے قائل ہوں۔ میں بھی اسی طرح کا ممبر ہوں [illegible] نے اس سوسائٹی [illegible] مشہور کر دی ہیں۔ یہی بات تمہاری نانی نے بھی سنی ہوگی، چنانچہ سکندرآباد سے واپس آکر مولوی صاحب نے اپنی بہن کو سمجھایا اور وہ اپنے بھائی کے گھر میں کھانے پینے لگیں۔

مولوی صاحب کی وضعداری اور خودداری حیدرآباد بھر میں مشہور تھی کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ [illegible] اور [illegible] تھے اور [illegible] ان کے [illegible] جب کبھی ڈنلپ دورے پر آتے تو مولوی صاحب صوبہ داری کی جھنڈی کی گاڑی اسٹیشن بھجوا دیتے اور [illegible] بیٹھ کر استقبال کے لئے جاتے اور اسٹیشن سے ساتھ لاتے مولوی صاحب اپنے ڈرائنگ روم میں آرام کرسی پر بیٹھے رہتے جب ڈنلپ گھر کے [illegible] میں پہنچ جاتے تو یہ کرسی سے اٹھ کر دروازے تک جا کر ان کا استقبال کرتے اور ہاتھ ملا کر ڈرائنگ روم میں لا کر اپنے برابر آرام کرسی پر بٹھا لیتے اور جب ڈنلپ واپس ہونے لگتے تو بھی انہیں چھوڑنے اسٹیشن نہ جاتے بلکہ گورنمنٹ ہاؤس کے دروازے میں کھڑے کھڑے خدا حافظ کر دیتے تھے۔

کرم خان ... میر منشی مدد مہتمم تعلقدار (ڈپٹی کلکٹر) راجگیر کے دفتر کے تھے کسی سلسلہ میں ان سے خفا ہو کر جواب طلب کیا گیا کہ کرم خان ... ناک ہے" مولوی صاحب نے اس کے جواب میں ٹوٹ کر لکھا کہ کرم خان معمولی شخص ہے اس نے اگر رشوت لی ہو تو اپنی حیثیت کے موافق چالیس پچاس روپے لئے ہوں گے یہ تو قابل درگزر نہیں کی جا سکتی علاوہ ازیں یہ غریب ہندوستانی غیر مہذب ہے اس لئے ... کا اطلاق اس پر نہیں ہو سکتا مہذب ڈاکو وہ ہے جس نے لاکھوں روپیہ قحط کا ہضم کر لیا اور ڈکار تک نہ لی" آخری فقرہ تو بہ چوٹ تھی کیونکہ ... قحط کے انتظامات میں غبن ... روپے بنا رہے کے تھے۔

تحریر اور احتیاط میں مولوی صاحب ضرب المثل تھے خانگی خط بھی سرکاری سیاہی سے نہیں لکھتے تھے، دفتر کا قلم ... سے خانگی کام ... نہ لیتے تھے انہوں نے کبھی سرکاری کاغذ خانگی تحریروں کے لئے استعمال نہیں کیا ایک دفعہ محبوب جنگ کے دورہ پر تھے۔ والد نے انہیں خط لکھا تو چند روز کے بعد جواب دیا اور شروع ہی میں لکھا کہ میں دورہ پر تھا، تمہارا خط وہیں ملا مگر میرے ساتھ لفافے کاغذ نہ تھے اور نہ دفتر مل سکتے تھے۔ تمہیں معلوم ہے کہ سرکاری لفافے یا کاغذ خانگی کاموں کے لئے استعمال نہیں کرتا اس لئے محبوب نگر واپس آ کر جواب لکھ رہا ہوں۔

سلطان نواز جنگ حیدرآباد کے ایک بہت بڑے جاگیردار ہوئے تھے انہوں نے موقوفال سے بہت سا روپیہ لیا تھا اس کا مقدمہ چلتا رہا بالآخر ایک کمیٹی مقرر ہوئی جس کے رکن مولوی صاحب بھی بنائے گئے، سلطان نواز جنگ کی بیوی میرے والد کی حقیقی خالہ تھیں۔ اس لئے والد نے خصوصیت سے مولوی صاحب سے سفارش کی مگر مولوی صاحب نے فوراً ہی ٹکا سا جواب دیا اور والد نے سلطان نواز جنگ کو سنا دیا سلطان نواز جنگ نے اس خوف سے کہ یوسف الدین صاحب میرے خلاف تصفیہ نہ کر دیں حضور نظام سے عرض کیا انہوں نے مولوی صاحب سے فرمایا کہ سلطان نواز جنگ سے رعایت کریں تو مولوی صاحب نے عرض کیا مقدمہ صاف ہے سلطان نواز جنگ سے کوئی رعایت نہیں کی جا سکتی بہتر ہے کہ کمیٹی میں میری شرکت ہی نہ ہو اور میری غیر حاضری میں دوسرے اراکین تصفیہ کر دیں ورنہ میں تو ان سے کسی قسم کی رعایت کرنے کو تیار نہیں ہوں، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور مولوی صاحب کی غیر موجودگی میں مقدمہ کا تصفیہ ہوا اور قرضے کی اقساط مقرر ہوئیں۔

رعب داب کا یہ عالم تھا کہ اول تعلقدار (کلکٹر) ان سے آنکھ نہ ملاتے تھے۔ کبھی کسی کو آپ کے سامنے ... کہنے کی جرأت نہ تھی البتہ تم اور تو کہہ کر مخاطب کر لیتے مگر چھوٹوں کو کبھی تم نہ کہتے تھے۔ ان کا بیٹا سید تاجی آپ ہی سے مخاطب کیا جاتا تھا۔ حیدرآباد کے امراء سے برابر سے ملتے تھے اور کسی سے مرعوب نہ ہوتے تھے۔ نظام الدین حسن بی اے ایل ایل بی چیف جسٹس ہوئے تو نہ جانے کیا بات ہوئی کہ مولوی صاحب سے سخت مراسلت ہونے لگی۔ مولوی صاحب نے اس شدت سے حملہ کیا کہ نظام الدین پریشان ہو گئے اور معافی مانگ کر جان چھڑائی۔

چونکہ مولوی صاحب کے والد حکیم زین العابدین بڑے اچھے طبیب تھے اس لئے انہیں بھی طب سے خاصا لگاؤ تھا اور اس فن کے معلومات بھی خاصے تھے۔ خود ذیابیطس کے مریض تھے اور پرہیز بہت سخت کرتے تھے۔ صحت کے متعلق مشورے بڑے عمدہ دیتے تھے۔ والد مرحوم جگر کی خرابی سے علیل ہو گئے تو انہیں مسلسل ہدایات لکھتے رہے یہ خطوط میرے پاس محفوظ ہیں اور بڑے کارآمد ہیں۔ اردو بڑی اچھی لکھتے تھے۔ ان کی تحریر میں دکنیت کا شائبہ تک نہ تھا مگر بول چال بالکل دکنی تھی البتہ لہجہ دکنی نہ ہوتا تھا ہمیشہ دلی کے لہجے میں بات چیت کرتے تھے۔

مظفر جنگ

اعلیٰ حضرت غفران مکان میر محبوب علی خان شاہ دکن کی ہمشیرہ نواب مظفر جنگ سے بیاہی گئیں اور نواب موصوف کے بھائی نواب

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] ہیں۔

معظم جنگ بہادر عالم فاضل [illegible] ادیب [illegible] بزرگ تھے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] مغرب سے عشاء تک [illegible] تفسیر حدیث [illegible] ادب [illegible] رہتے [illegible]
[illegible] نواب صاحب [illegible] بزرگ تھے [illegible] سفید [illegible]
[illegible]
[illegible]
یہاں حاضری دیتے تھے۔

ڈیوڑھی [illegible] نواب صاحب بیٹھتے [illegible] حاضرین اپنی اپنی حیثیت کے موافق بیٹھ جاتے [illegible] مراتب [illegible] سرفراز ہوتی۔ حاضرین [illegible] رہتے سب لوگ بے تکلف پان کھاتے حقہ پیتے اور باتیں کرتے مگر اس بے تکلفی میں بے ادبی کا شائبہ تک نہ ہوتا۔ ادب آداب [illegible] پیش نظر رہتا۔

خاندانی کتابی ذخیرہ کے علاوہ خود نواب صاحب نے بہت زیادہ کتابیں جمع کی تھیں [illegible] کتب خانے کے تھے جس میں [illegible] جلدوں کی ہزاروں کتابیں تھیں اور بیشتر قلمی مطلا مذہب، معتبر تھیں خود نواب صاحب کو تصنیف و تالیف کا شوق تھا کم از کم پچاس کتابیں خود انہوں نے لکھی تھیں جو اپنے دوستوں کو سنایا کرتے تھے میں [illegible] کی ڈیوڑھی میں کبھی کوئی بات بیکار نہیں ہوتی ہمیشہ علمی ادبی مذہبی گفتگو ہوتی رہتی تھی۔
علاوہ خاندانی جاگیر اور منصب کے عہدہ "صدر الصدور" سے بھی سرفراز تھے اور غالباً صدر المہامی (وزارت) امور مذہبی اسی عہدے کا ضمیمہ تھی۔
اس وجہ سے سارے علماء یہیں جمع ہوا کرتے تھے۔ طالب علموں سے نواب صاحب کو بڑی دلچسپی تھی ان کی بہت مدد کرتے تھے۔ مدرسہ منصب داران میں ایک لڑکا جماعت منشی میں میرے ساتھ پڑھتا تھا یکایک اس نے مدرسہ چھوڑ دیا چونکہ تیز اور ذہین لڑکا تھا اور مجھ سے خاص دوستی ہو گئی تھی اس لئے میں نے اس کا پتہ چلایا اور اس کے مکان پر جا کر ملاقات کی اور مدرسہ نہ آنے کی وجہ دریافت کی تو اس نے کہا کہ اس کے والد نے یکایک انتقال کیا ہے اور چونکہ وہ ملازم تھے اور انہی کی تنخواہ پر خاندان کی گذر بسر تھی اس لئے اب کوئی ذریعہ معاش خاندان کا نہ رہا اور اس کی والدہ چاہتی ہیں کہ وہ اپنے باپ [illegible] ہو سکے تو [illegible] نوکری کرے اس لئے اس نے تعلیم چھوڑ دی ہے۔

یہ حال دیکھ کر بڑی تکلیف ہوئی اور میں نے اسے مجبور کرکے اپنے ساتھ لے لیا اور نواب صاحب کے پاس لے جاکر پیش کیا، میرے حالات سنانے پر نواب صاحب بہت متاثر ہوئے پھر مجھ سے فرمایا کہ اس لڑکے کی ماں کی طرف سے ایک درخواست اور دو بہنوں کی طرف سے دو درخواستیں الگ الگ لکھوا لو اور خود ان سے کہا کہ ایک چٹھی ناظم تعلیمات کے نام لکھ دی کہ اس لڑکے کے نام وظیفہ کا سلسلہ شروع کر دیا جائے۔ جب وہ رخصت ہونے لگا تو پچیس روپے نقد مرحمت فرمائے اور تسلی دلاسا دیا اور فرمایا کہ کل سے مدرسہ جایا کرو۔ تمہاری ماں بہنوں کے نام اور تمہارے نام جو وظیفہ ہوگا ان سب کی مجموعی رقم تمہارے والد کی تنخواہ کے برابر ہو جائے گی چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اس لڑکے نے اطمینان کے ساتھ منشی فاضل کامیاب کر کے تعلیمات میں ملازمت کر لی اور جلد ہی صدر مدرس و ہیڈ ماسٹر بھی ہو گیا۔

مولوی عبدالجبار خان آصفی امر پیلی کے گھر کے سامنے ایک بوڑھا دروغہ رہتا تھا اس کی بڑھیا دونوں آنکھوں سے معذور تھی، دروغہ مر گیا تو مولوی صاحب نے میرے سامنے ہی نواب صاحب سے عرض کیا نواب صاحب نے درخواست پیش کرنے کے لئے فرمایا دوسرے روز مولوی صاحب نے میرے ہاتھ سے درخواست لکھوائی اور خود اس پر تصدیق کی اور پانچ روپیہ ماہوار تنخواہ کی سفارش بھی لکھی اور مجھی کو دیا کہ پیش کر دو۔ میں نے پیش کیا تو درخواست پڑھ کر نواب صاحب نے دس روپیہ ماہوار کی اجرائی کی تجویز کی اور دوسرے مہینے ہی سے تنخواہ جاری ہو گئی۔

نواب صاحب کے انتقال کے وقت کئی صاحبزادے تھے، نواب محب اللہ خاں جو عالی رفاعی کے نام سے مشہور ہوئے بڑے علم دوست اور ادب نواز اور اچھے شاعر تھے مگر طبیعت میں لاابالی پن تھا سیر و شکار میں رہتے تھے۔ ارباب ادب کے نام سے ایک انجمن قائم کی تھی اور اسی انجمن سے ایک ماہنامہ "تحفہ" بھی نکالتے رہے جو ایک دو سال سے زیادہ نہ چل سکا۔ آخر میں عالی رفاعی نے ترک دنیا کر دیا تھا اور تقریباً گوشہ نشین ہو گئے تھے۔

نواب صاحب کے دو اور صاحبزادے نواب سردار جنگ اور نواب قادر جنگ ان کے انتقال کے وقت کم سن تھے۔ بعد کو تحصیل تعلیم کی غرض سے یورپ گئے اور بیرسٹری کر لی، سردار جنگ بہادر اب مجسٹریٹ ہیں اور قادر جنگ بہادر نے [illegible] رہ کر وظیفہ (پنشن) لے لیا ہے۔

مرحوم کی کتابیں نہ تو عالی رفاعی نے چھپوائیں اور نہ سردار جنگ اور قادر جنگ نے، معلوم نہیں مسودے باقی بھی ہیں یا تلف ہو گئے۔

حیدرآباد میں محرم میں جو تماشے اور بے حد خلاف شرع حرکات ہوتی تھیں ان کے سدباب کی طرف سب سے پہلے نواب صاحب ہی نے قدم اٹھایا اور مکہ مسجد میں عشرہ محرم کے خاص خاص ایام میں نمازوں اور وعظوں کا بندوبست بھی شروع کیا، اصلاح میں واعظین مقرر کئے اور حیدرآباد کے مسلمانوں کو حقیقی مسلمان بنانے کی طرف توجہ کی مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا، شرک و بدعت کو لمبی عمر دی گئی تھی اس لئے نواب صاحب کی عمر کم ہو گئی اور انہوں نے ایسے وقت انتقال کیا جب کہ حیدرآباد کو ان کی شدید ضرورت تھی۔ اس خاندان کا علم و فضل انہی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ سچ ہے کہ

فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص

انوار اللہ خان

مولانا انوار اللہ خان المخاطب بہ فضیلت جنگ بہادر مرحوم حیدرآباد کے قدیم علماء میں سے تھے۔ آپ کا خاندان قدیم دکنی تھا اور مشہور بزرگ حضرت شاہ رفیع الدین قندھاری قدس سرہ سے آپ کے خاندان کا تعلق تھا۔ بلحاظ فضیلت و علمیت حیدرآباد میں کوئی عالم آپ کے پایہ کا

[illegible] کے [illegible] آپ کو [illegible] اور [illegible] کی جانب دیا تھا۔ آپ [illegible] کو
[illegible] آپ [illegible]
[illegible] آپ میں تھا جو [illegible]۔

[illegible] "مدرسہ نظامیہ" کو قائم ہوا ہے "مجلس اشاعت العلوم" کی بنیاد آپ نے درس نظامیہ
مدرسہ نظامیہ کی بنیاد ڈالی اور اپنی ساری توانائیاں اس کے لئے صرف کر دیں۔ [illegible] نے بھی اس سے [illegible]
[illegible] سمجھا۔

[illegible] تھے اور [illegible] کی [illegible] تھے [illegible] میں [illegible] کرتے تھے۔ [illegible]
[illegible] اس لئے [illegible] سے [illegible] تھے [illegible] ۔ [illegible]
[illegible] کے [illegible] سمجھتے [illegible]
[illegible] کے ساتھ ہی ساتھ روشن خیال [illegible] بھی [illegible] چنانچہ [illegible]
[illegible]
[illegible] رکھا گیا۔ [illegible] جامع الحسن [illegible] تھے [illegible] العلوم [illegible]
[illegible] اور دارالعلوم سے [illegible] نظامیہ [illegible]
[illegible] نظامیہ چل رہا ہے مگر اس کا [illegible] بھی [illegible] جا رہے ہیں

[illegible] "مجلس اشاعت العلوم" کو قائم کیا تھا۔ اس مجلس سے [illegible] کی کتابیں [illegible]
[illegible] نسبتاً نظامیہ کے زیادہ قائم [illegible]
[illegible] تھا اس کے علاوہ فتنہ قادیانیت کے خلاف بھی مولانا نے کئی کتابیں [illegible]
[illegible] ہے۔ بہرحال عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں میں بہترین کتابیں اس مجلس نے شائع کیں [illegible]

[illegible] کے علاوہ مولانا نے امور مذہبی کے دفتر میں "مدار الافتاء" بھی قائم کر دیا تھا اور اہل خدمات شرعیہ قاضی، محتسب [illegible] وغیرہ
[illegible] وغیرہ کے لئے نصاب تعلیم مقرر کر کے امتحان بھی مقرر کرا دیا تھا جس سے [illegible] کے مذہبی لوگوں کو فائدہ پہنچا [illegible]
[illegible] سکا۔ کیونکہ مولانا کے بعد [illegible] لوگوں کے [illegible] باتوں سے دلچسپی ہی نہ تھی۔

[illegible] والد مرحوم سے مولانا کے مراسم بڑے قدیم اور پرخلوص تھے جس کی وجہ سے مجھ پر بڑی شفقت و عنایت فرمایا کرتے [illegible]
[illegible] حاضر خدمت ہوتا مجھ سے بڑی بے تکلفی کے ساتھ [illegible] چونکہ میں بچپن ہی سے شعر و سخن کا ذوق رکھتا تھا [illegible] کلام
[illegible] تھا اس لئے مجھ سے فرمائش کر کے شعر سنتے اور اگر کوئی اچھا ہوتا تو اپنے شعر بھی مجھے سناتے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ [illegible] شاعر
[illegible] معاف کیجئے میں نے غلط لکھ دیا ہے، "عالم شاعر نہیں ہوتا" اگر وہ شعر کہنے لگے تو [illegible] ضرور ہو جاتا ہے مگر شاعری کی روح غائب
[illegible] صرف موزونیت باقی رہ جاتی ہے خصوصاً عربی ادب کا ماہر اور عربی شعر کا واقف کوئی ہو اور اردو زبان میں شاعری کرنے لگے تو پھر
[illegible] نہیں ہوتی موزوں اردو شعر بھی عربی شعر کی [illegible] اس طرح [illegible] کہ ناموزوں معلوم ہونے لگتا ہے، چنانچہ یہی کیفیت [illegible]
[illegible] کی۔ مولانا کا پایہ علم میں بہت اونچا تھا۔ عربی ادب پر بھی خاصا عبور تھا اسی وجہ سے طبیعت [illegible] ایک قسم کی [illegible] جو شاعری کے

مزاج تھی اس میں شک نہیں کہ مولانا صاف صاف عجیب و غریب شعر کہتے تھے مگر کلام موزوں ضرور ہوتا تھا اور کچھ عجیب بات تھی کہ مولانا کا جو موضوع ہوتا تھا باوجود اس علم و فضل کے مولانا تقریر میں کوئی خاص بات پیدا نہ کر سکے اور نہ تاثرات پیدا کر سکتے تھے کہ کوئی اور کہانی بات کاٹ دیتا تو خاموش ہو جاتے پھر گفتگو ہی ختم فرما دیتے۔ ایک دفعہ میرے سامنے ہی ایک شخص نے کچھ پوچھا اور مولانا اس کا جواب دینے لگے مگر اس نے پورا نہیں ہونے دیا تو مولانا نے خاموشی اختیار کی پھر اس نے بہت کہا کہ فرمائیے مگر کوئی بات ہی نہیں کی اور مخل گفتگو کے خلاف کو چپ کر رہ جانا بحث و مباحثہ و مناظرہ کرنا ان کی طبیعت کے خلاف تھا۔ نہایت متین، خاموش اور بادقار شخص تھے۔ گھنٹوں بیٹھے رہتے علمی کو اس عمدگی سے تحریر فرماتے کہ پڑھ کر جی خوش ہو جاتا تھا۔ تحریر میں زیادہ شگفتگی نہ تھی مگر صاف اور مدلل تحریر ہوتی تھی۔

بدنصیبی سے ایک جماعت حیدرآباد میں ان کی مخالفت پر آمادہ ہو گئی تھی اس سلسلے کے خلاف خاصا پروپیگنڈا ہوا اور بعض اشتہارات بھی نکالے گئے اور مشہور کیا گیا کہ مولانا نے ائمہ متقدمین کے خلاف فتوے دیے ہیں مگر یہ سب غلط تھا۔ مولانا نہایت محتاط اور پابند بزرگ تھے۔

میں نے مولانا کی شاگردی باقاعدہ نہیں کی ہے مگر بہتر فائدہ اٹھایا ہے چنانچہ جب کبھی حاضر خدمت ہوتا کوئی نہ کوئی بحث چھیڑ دیتا۔ پوچھ بیٹھتا اور مولانا اس خوش اسلوبی سے بیان فرماتے کہ اس طرح میرے بہت سے سبق پڑھ جاتا۔

بد قسمتی سے نظامیہ سے کوئی خاص ہستی نہ نکل سکی جو اس دارالعلوم کا نام روشن کرتی ورنہ یہاں سے فارغ التحصیل ہونے والوں میں محمد بادشاہ صاحب مرحوم، سید ذریت شاہ قادری، سید رحیم پاشاہ، قاضی محمد شریف صاحب وغیرہ نسبتاً مولوی رکن الدین اور حکیم مصطفیٰ کے علاوہ نکلے مگر یہ دیوبند کے مولوی شبیر احمد اور مولوی حسین احمد اور ندوہ کے مولانا سید سلیمان، مولوی معین الدین اور مولوی عبدالسلام وغیرہ پر ناز کر سکتا ہے نظامیہ کسی کو پیش کر کے اظہار افتخار نہیں کر سکتا۔ میرے خیال میں یہ اس ملک کی بدنصیبی ہے ورنہ مولانا کی نیک نیتی میں کوئی کلام نہیں، تن من دھن سب نظامیہ کے لئے نثار کر دیا اور چونکہ وہ خود پرانے زمانے کے بزرگ تھے اس لئے اسی طرح کا مدرسہ قائم کر دیا ان کے بعد نظامیہ کے کارپردازوں کو زمانہ کا ساتھ دیتے ہوئے روش بدلنی چاہئے تھی مگر افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔

عبدالجبار خاں آصفی

مولانا عبدالجبار خاں آصفی کا خاندان مار پیدی تھا اور مولانا رام پور ہی سے حیدرآباد آئے تھے۔ پرانی وضع کے عالم اور متقی بزرگ تھے، مولانا حالی اور مولانا شبلی ان کے معتقد تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جید عالم اور مستعد طالب علم تھے، کسی کو خاطر میں لاتے نہ کسی سے دبتے تھے علم و ادب میں بھی پہلوانی فرماتے تھے، مغلپورہ ہی میں میرے مکان کے قریب رہتے تھے۔ والد مرحوم سے بھی دوستی تھی اور میرے خاندان کے بیشتر افراد سے محبت و مروت تھی اس لئے مجھ پر شفقت فرماتے تھے۔ ایک روز میں کتاب بغل میں دابے ان کے مکان کے سامنے سے جا رہا تھا۔ یہ گھر سے نکلے تو میں نے سلام کیا۔ پوچھا کہاں جا رہے ہو؟ میں نے عرض کیا فلاں صاحب کے پاس پڑھنے جا رہا ہوں۔ کیا لے جا رہے ہو؟ میں نے عرض کیا ظہوری ہے۔ فرمانے لگے، بے وقوف! وہ صاحب تجھے ظہوری پڑھا سکیں گے؟ اسے وہ خود پڑھ سکیں گے؟ مجھ سے کس بے وقوف نے کہا کہ اس جاہل سے پڑھے۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا فرمانے لگے کل سے میرے پاس آیا کرو۔ چنانچہ دوسرے روز سے میں نے باقاعدہ پڑھنا شروع کر دیا۔ فارسی کا ایسا طیار عالم میری نظر سے نہیں گزرا۔ ایک دریا تھا جو رواں تھا۔ اس خوبی سے پڑھاتے کہ بغیر یاد کئے سبق ذہن نشین ہو جاتا اور لغات اس عمدگی سے حل کرتے کہ پھر ذہن سے نہ اترنے پاتے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ آصفی مستر اسکول

[illegible] تعلق رہے ۔ ڈاکٹر [illegible] نے بھی ہے اس سے کہ ہم ایسا معلوم ہو [illegible] اگر وقت نکل ہو سکا۔
[illegible] شعر و شاعری کا ایرانی علم و ادب [illegible] اور علوم متفرق [illegible] جمع ہو [illegible] ہے کہ [illegible] آپ کے تذکرے
[illegible] مسلسل تذکرہ لکھنے لگیں گے ۔ کوئی تذکرہ [illegible] ہاتھ میں [illegible] گے [illegible] عشق کی [illegible]
[illegible] لگیں گے اور اگر نصیبی سے کوئی شاعر [illegible] کی خبر نہیں ۔ [illegible] شعر [illegible] پیغمبر [illegible]
[illegible] غزلوں پر غزل کہنے کا بہت شوق تھا ۔ جلے وہ سامنے مثلاً حافظ کی [illegible] سامنے گئے ۔ [illegible] پر حافظ
[illegible] جاتا کہ حافظ نے اس قافیہ کو کس انداز سے باندھا ہے [illegible] کے لیے [illegible] گئے
[illegible] ہے کہ جو غزل کسی کی غزل کہی گئی ہو اسے قافیہ کو خاص طور پر باندھا گیا ہو [illegible] تعریف
[illegible] صفات کا مرتب فرمایا ہے جو مشتاق اور [illegible] کا [illegible] شعر [illegible]
[illegible] کرتے تھے جو فارسی [illegible] کی [illegible] حالی کا [illegible] تھی۔
[illegible] نفیس قالین [illegible] سے [illegible] چار [illegible] عزیزوں اور دوستوں [illegible] ایک [illegible]
[illegible] ہے جو [illegible] ہے اور [illegible] کہ [illegible] لے [illegible]
[illegible] سے تاریخ دکن پکار کر [illegible] سے [illegible] اور [illegible] ہے اس [illegible] کا [illegible] ہے۔
[illegible] کے گفت اور [illegible] کے [illegible] بہت [illegible] کرتے تھے [illegible]
[illegible] اس [illegible] کا [illegible] ہے کہ [illegible]
[illegible] آ جاتے [illegible] اور [illegible] حاجت [illegible] آتے [illegible] کے [illegible] اچھا [illegible]
مہاراجہ کشن پرشاد بہادر بہت چاہتے تھے ۔ [illegible] نے ایک [illegible] کی [illegible] غزل [illegible] اصلاح
[illegible] کے بعد [illegible] اور [illegible] کی اصلاح [illegible] غزل [illegible] سب
[illegible] غزل کے پرچے اتارے ۔ جب یہ اصلاح شدہ غزل انہیں [illegible] تو [illegible] سے [illegible]
[illegible] کے پاس بھجوا دیں [illegible] اپنے [illegible] نہ گئے [illegible] طرح
[illegible] اور [illegible] کر [illegible] خاموش ہو گئے پھر [illegible] نہ گئے [illegible]
[illegible] کی اور بڑی مشکل سے انہیں منایا۔
[illegible] نے انہیں بہت ہو سکا [illegible] کی [illegible] سے واقف [illegible] ان کی غزل [illegible] اور مقطع میں ان کی تعریف کر دیتے ہیں
[illegible] حالانکہ [illegible] کی غزل کے سامنے [illegible] کی غزل پھیکی پڑ جاتی [illegible] اور خود [illegible]
سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ [illegible] ہے [illegible] لگی [illegible] رکھتے تھے ۔ جب خفا ہونے تو [illegible]
[illegible] جاتے اور جب غصہ رفع ہو جاتا تو صاف بھی ہو جاتے تھے ۔ [illegible] فراخ دل بھی خاص تھی ۔ طلباء کی امداد کرتے [illegible] کتابیں دیتے [illegible]
حاجت کی خدمت کرتے [illegible] کی سفارشیں کرتے مگر ساتھ [illegible] کی خدمت بھی کرتے جاتے تھے ۔

عبدالجبار خاں صوفی

مولانا عبدالجبار خاں صوفی ملکاپوری [illegible] حیدرآبادی [illegible] کے [illegible] تھے ۔ [illegible] حیدرآباد کے شرفاء اور [illegible]

خاندانِ شاہی سے قرابت و قربت رکھنے والوں کے لئے قائم کیا گیا تھا، چونکہ وہ مرحوم نے بھی مشاورہ میں تعلیم پائی تھی اور صوفی صاحب نے بھی وہ پڑھے تھے اس لئے جب بھی وہ مطالعہ کی طرف جاتے صوفی صاحب سے ملتے تھے اور ان کے ساتھ ہی … استاد تھے اس لئے مجھ کو مولوی صاحب کی رفاقت حاصل رہا، سلطان … میں میرے احباب اکثر رہتے تھے جن کے لئے میں جایا کرتا تھا اور جب مجھے ملا کرتے صوفی صاحب کو بلا لیا کرتے اور گھنٹوں اپنی علمی مصروفیات کا حال سناتے تھے۔

تذکرۂ شعرائے دکن دو جلدوں میں، تذکرۂ اولیائے دکن دو جلدوں میں اور تاریخ دکن کئی جلدوں میں مرتب کی تھی۔ تذکرے تو مکمل چھپ گئے مگر تاریخ دکن کی ایک ہی جلد طبع ہو سکی۔ مرحوم کو کام کرنے کا ڈھب آ گیا تھا اور بڑا سستا کام کر کے کارسے دام وصول کرتے تھے اس سے کہ وہ چار تذکروں کو سامنے رکھ کر اور چار پانچ آدمیوں کے حالات حاصل کر کے تذکرے مرتب کر دیتے تھے اور انہیں … کر کے ہزاروں روپیہ ان کی چھپائی کے لئے بھی حاصل کر لیا تھا اس طرح خوب فائدہ اٹھایا۔

بڑے تعلی پسند اور پرغرور قسم کے بزرگ تھے۔ ایک دفعہ فرمانے لگے میاں تصنیف و تالیف بڑی مشکل چیز ہے۔ خونِ جگر کھانا تب کہیں کتاب لکھی جاتی ہے۔ میں نے عرض کیا قبلہ ایسی کتاب جیسی کہ آپ نے شعرائے دکن لکھی ہے، حکم ہو تو ایک ہفتے میں مکمل کر دوں۔ یہ سن کر بہت خفا ہوئے۔ میں تو بھاگ کھڑا ہوا مگر آپ نے فوراً مولوی خانی الدین احمد (جو بعد کو فاضل یار جنگ ہوئے) سے شکایت کی چونکہ یہ بزرگ بھی ان کے شاگرد و شیدا معتقد کے قائل تھے انہوں نے میری خوب خبر لی اور مجھے صوفی صاحب کے پاس جا کر معافی مانگنی پڑی۔

نایاب کتابوں کے متعلق ہمیشہ فرماتے کہ میرے پاس موجود تھی طغیانی میں تلف ہو گئی۔ ۱۹۰۸ء میں حیدرآباد کی موسیٰ ندی میں زبردست سیلاب آیا تھا جس میں اکثر مکانات برباد ہوئے اور صوفی صاحب کا مکان بھی شاید گر گیا تھا۔

الا کروہ … کے قطع نظر آدمی قابل تھے عربی فارسی کے فارغ التحصیل تھے، اردو کا مطالعہ بھی اچھا تھا۔ شعر گوئی کا شوق بھی تھا … بھی اچھا تھا۔ معلومات نہایت اچھی تھیں۔ بڑھاپے کے باوجود حافظہ نہایت ہی اچھا تھا اور ہر بات بڑی تفصیل سے سنایا کرتے تھے۔ … کے بڑے بڑے لوگ مثلاً نواب نظامت جنگ صدر المہام مال، نواب … جنگ ناظم کروڑ گیری، نواب فاضل یار جنگ انسپکٹر جنرل وغیرہ ان کے شاگرد تھے جن کی شاگردی پر مولوی صاحب ناز فرمایا کرتے تھے۔

مولوی صاحب کا اصل کارنامہ تاریخ دکن ہے۔ دکن کا تاریخی مواد نہایت مبہم اور منتشر ہے مگر مولوی صاحب نے بڑی محنت سے فراہم کیا اور بڑے ہی سلیقے سے مرتب کیا ہے۔ چونکہ میں بھی تاریخ کا طالب علم ہوں اور تاریخ دکن میرا موضوع ہے اس لئے ان کی محنت کا میں نے اچھی طرح … کیا ہے۔

مختصر یہ کہ مولوی صاحب بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے اور اپنے زمانے کے قابل لوگوں میں سے تھے۔ بیس پچیس کتابوں کے مسودے مولوی صاحب نے چھوڑے ہیں مگر ان کے ورثا نے اس طرف توجہ نہیں کی۔

حکیم وحید الدین عالی

حیدرآباد سے سینکڑوں صاحبانِ فضل نکلے جن میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر حکیم وحید الدین عالی ہیں۔ اتفاقاً حکیم صاحب اور مرحوم … ہم درس رہے ہیں اس لئے ہمارے گھرانے سے دوستانہ مراسم تھے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ میرے … بھائی مولوی …

...ثنا ہی حکیم صاحب کے ساتھ تھے اس سے بھی زیادہ ہوا کرتے ہے۔

...حکیم صاحب نہایت کم گو اور کم سخن تھے۔ نظر آتے تھے مگر مزاج میں ظرافت بھی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی محفل کا رنگ انھیں
...کے مزاج اور اخلاق کا عکس ہوا کرتا تھا مگر ان پر انہیں ملکہ حاصل تھا۔ بڑے بڑے علما ان سے بات کرتے ہوئے جھجکتے تھے
...رہا سہا جو تھا رہتے طبیعت کا یہ عالم کہ

وہ جب پلی ہوئی اس شعر کی یہ زبان تھی

...سی بات معقد کا جواب لکھتے ذرا بھی مشکل کی چند بار کہتے تھے۔ کبھی صاحب قصبہ ہوا کی نہ بیٹھتے کسی ...و دقیق کے مجموعے خوش ہوتے
...اور ذہین تھے

...مولانا عربی شعر کی ایک نہایت عالم اور قابل بزرگ تھے۔ عراق اور ایران میں ...تھی ...علمائے ادب میں ...شمار ہوتے
تھے۔ حضرت غفران مآب ...حیدر ...شاہ رکن الدین ...ہے کہ عربی فارسی میں ...سے شہید حمید الدین حالی
...سامنے ان کا چراغ ہی نہ جلتا تھا۔ عربی شعر ...عربی کی تکمیل ...اپنے والد سے کی تھی اور ایران میں فارسی کی تکمیل کی تھی اور
...خاص ...مادری زبان فارسی تھی بخلاف ان کے حالی نے ...زبان عرب سے تحصیل کی تھی ...عرب کی سرزمین ...
...طبعی مناسبت ...کوشش اور ...کی وجہ سے عربی ادب اور خصوصاً عربی شعر پر اتنے حاوی تھے ... عربی شعر ... تک پہنچے
...تھے۔

حالی کے فرزند حکیم نظام الدین صاحب نے بعض قصائد اور عربی شعر کے چند نمونے شائع کئے ہیں۔ ...حالی کے عربی اور فارسی
...اشاعت ہو جاتی میری ناقص رائے یہ ہے کہ حالی کے جیسا عربی کا شاعر ہندوستان میں ...پیدا نہیں ہوا۔ ...بالکل ...تھی کہ

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

یہ حال عربی کا تھا۔ فارسی میں بھی خوب شعر کہتے تھے خصوصاً نعت بہت کہی ہے مگر افسوس ہے کہ فارسی کلام بھی شائع نہ ہوسکا۔
طب میں بھی غیر معمولی مہارت تھی تشخیص بڑی اچھی کرتے تھے اور نسخہ نویسی میں بھی کمال تھا اور ...سمجھ کر علاج کرتے تھے
طبیب کی حیثیت سے ملازم تھے اور باقاعدہ مطب بھی کرتے تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہوئی تو عربی کی پروفیسری ...منتخب ہوا۔ ابھی
...بھی حاصل نہیں کیا تھا کہ انتقال ہوگیا۔ عمر بمشکل پچاس ہوگی کہ دنیا سے منہ موڑ لیا۔

عجیب و غریب بزرگ تھے۔ فنافی العلم تھے کھانے پینے اور پڑھنے کا شوق ...تھا ...کا مشغلہ تھا جو کتاب پڑھتے
اس پر نوٹ ضرور کیا کرتے۔ چنانچہ والد کے کتب خانے میں بیشتر کتابیں ایسی تھیں جن پر حاشیے ...

ایک دفعہ والد کو درد گردہ ہوگیا اور بڑی تکلیف ہونے لگی حکیم محمود ہمدانی کا علاج ہو رہا تھا۔ مجھ سے راستے میں ملاقات ...
...عرض کیا کہ والد عثمان آباد سے بیمار ہو کر آگئے ہیں۔ درد گردہ ہے اور محمود ہمدانی کا علاج ہے۔ سن کر خاموش ہوگئے۔ دوسرے روز
صبح تشریف لائے نسخہ ملاحظہ کیا نبض دیکھی، تیار رکھنے کے لئے کہا اور جوشاندہ ...پھینکوا دیا خود گھر جا کر دوا بھجوائی۔
دوسرے ہی روز سے تکلیف کم ہونے لگی اور ایک ہفتے میں صحت ہوگئی۔

مشہور ہے کہ حالی مفت دوا نہ دیتے تھے مگر میں نے ہمیشہ ان سے دوا مفت ...لی ہے کبھی مجھ سے دوا کی قیمت نہیں مانگی اور ...
دوا دینے سے انکار کیا البتہ کتاب انھوں نے مجھے بھی نہ دی کئی دفعہ میں نے بعض کتابیں مانگیں مگر وہ ٹالتے رہے نہ تو صاف انکار کیا اور
نہ کتاب دی۔

ملا صاحب بھی اضلاع سے آتے تو حالی سے ملنے ضرور جاتے اور دن بھر حالی کے پاس گزارتے۔ اس کے علاوہ یہ روز حالی صاحب بے چارے گھر آجاتے اور شام تک یہیں ٹھہرتے۔ ملا کو عربی سے شغف نہ تھا اس لئے فارسی شاعری ہی معرض بحث میں آتی اور روز ایک دوسرے کو اپنا فارسی کلام سناتے تھے۔ ملا فارسی بھی کہہ لیتے تھے مگر حالی کی شاعری سے ان کی شاعری کو کوئی نسبت نہ تھی۔ ان کا سرمایۂ فارسی بیس پچیس غزلوں سے زیادہ نہ تھا اور حالی کا یہ حال تھا کہ ایک ایک نشست میں تیس چالیس غزلیں سنا دیتے تھے مگر قصہ دونوں وحشت اور ایک دوسرے کے اشعار کی دل کھول کر داد دیتے تھے۔

حالی کے انتقال سے دو ایک مہینے پہلے کا قصہ ہے کہ حالی صبح صبح تشریف لائے اور شام تک خوب خوب ملا پر کلام پڑھتے رہے پھر ملا سے فرمائش کی، ملا نے ایک نئی غزل سنائی۔ اس شعر پر حالی پھڑکتے رہے اور بہت دیر تک داد دیتے رہے ـ

جور و جفائے آسماں نوحہ بفشرد بلند
وائے بہشت استخواں چرخ چناں زمیں زمیں

ہندوستان میں عربی کا ایسا شاعر کوئی پیدا ہوا ہے اور نہ پیدا ہوگا۔ کاش بھائی حکیم نظام الدین یا چند ملا کا عربی کلام چھپوا دیں اور دنیا کو معلوم ہو جائے کہ ہندوستان نے بھی عربی شاعر پیدا کئے ہیں۔

قطب الدین فاضل

[illegible] حیدرآباد [illegible] مگر صرف دو ہی آدمی ایسے کہ جن کی کیفیت آج بھی یاد ہے، ان کی گرانقدری مسلم اور ان کا احسان حیدرآباد پر رہتا۔ دونوں حکیم حمید الدین ثانی اور حکیم قطب الدین محمود علی فاضل تھے۔

قطب الدین صاحب کا خاندان حیدرآباد کا قدیم خاندان تھا۔ ان کے دادا بھی قطب الدین ہی تھے جو بارگاہ کے خاص لوگوں میں سے تھے اور ان کے والد غیاث الدین بھی بڑے ہی پایہ کے بزرگ تھے جو ہمارے خاندان سے قرابت قریبہ رکھتے تھے۔ غیاث الدین بادشاہ کے تعلقدار اور کلکٹر رہتے مگر جب حضرت محبوب علی شاہ سے بیعت ہوئے تو تعلقداری سے اپنے بڑے بیٹے قطب الدین کے حق میں دست بردار ہوگئے اور پیری مریدی شروع کردی۔ نواب غیاث الدین خاں سے غیاث الدین شاہ ہوگئے اور مرنے تک ایک ہی وضع پر قائم رہے۔ غیاث الدین شاہ [illegible] میری والدہ بھی بیاہی گئی تھیں اس لئے قطب الدین میرے پھوپھیرے بھائی ہوتے تھے اور میرے والد ان کے ماموں لگتے مگر عمر کی یہ حالت تھی کہ بھانجے ماموں سے تین سال بڑی عمر کے تھے اور دونوں ہم درس رہے۔ اس لئے قطب الدین میرے والد کو [illegible] کہنے کے بجائے مسعود میاں کہتے تھے۔

قطب الدین حیدرآباد ہی میں پیدا ہوئے اور تعلیم و تربیت بھی یہیں ہوئی۔ پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل اور منشی فاضل کیا پھر طب اور قانون کے امتحان بھی دیئے۔ ان دنوں حیدرآباد میں جتنے علمی امتحان ہوتے تھے سب میں کامیابی حاصل کی۔ پڑھنے کا شوق جنون کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ ان دنوں طب عربی اور فارسی زبانوں میں پڑھائی جاتی تھی۔ طب کا امتحان دیا تو ایک پرچہ ایسا نفیس حل کیا کہ ممتحن نے درجۂ اعلیٰ کے نمبر دیئے جو اس کے ساتھ لکھی کہ فن طب ... ہو یا نہ ہو تعلق تھا پرچہ طبی نہیں ہے جس کے پورے نمبر میں نے دئے ہیں مگر یہ پرچہ کسی ایسے امیدوار نے حل کیا ہے جو عربی کا فاضل اور زبان پر دسترس رکھتا ہے۔ عربی نثر فصیح با محاورہ اور نفیس لکھی ہے کہ میں نے کسی ہندوستانی کو ایسی عربی لکھتے ہوئے نہیں دیکھا۔ یہ پرچہ قطب الدین کو سررشتۂ طبابت نے اس رائے کی وجہ سے واپس دے دیا تعلیم حال

[illegible] تھا سے مروڑ اور پیچش بھی رہا کرتے تھے۔

تصنیف و تالیف کا شوق ہوا تو کتابیں لکھنی شروع کیں [illegible] مقدمے لکھے اور [illegible] بارگاہ میں مقبول ہوئے یہ مشہور ہوگئے ہے۔ [illegible] بارگاہ [illegible] لطف [illegible] تھے۔

قصیدہ کا بڑا [illegible] ایک دفعہ [illegible] سو شعر [illegible] کر سکتا تھا [illegible] وحید الدین [illegible] کا حال [illegible] محبت تھی [illegible] شاہ دکن نے ایک دفعہ [illegible] سے پوچھا آپ [illegible] بہت سے عالم ہیں مگر قطب الدین سب سے [illegible] حضور نے فرمایا قطب الدین [illegible] الدین خان [illegible] اس وقت تک لطف [illegible] نہیں [illegible] لطف الدین خان سے کہہ دو کہ [illegible] اس جواب سے حضور کچھ ناراض ہوئے مگر [illegible] بارگاہ [illegible] چنانچہ قطب الدین سے [illegible] سال کی عمر [illegible] استعمال کیا۔

[illegible] کی اطلاع جب ان کے والد بزرگوار کو دی گئی تو انھوں نے [illegible] جنازہ [illegible] قطب الدین صاحب [illegible] مکان [illegible] جب جنازہ [illegible] غیاث الدین شاہ صاحب کو اطلاع دی گئی تو وہ اٹھ نہ سکے۔ [illegible] جب وہ اٹھے [illegible] انہیں سہارا دے کر اٹھانا [illegible] چودھری شہاب الدین اور عبدالکریم [illegible] کھڑا نہیں کر سکے۔

بری اطلاع پاکر گر بیٹھ جانا [illegible] ضرور تھا [illegible] غیاث الدین شاہ صاحب کی واقعی کمر بیٹھ گئی تھی گو بعد میں وہ زندہ رہے مگر چلنے پھرنے کے قابل نہ رہے۔

قطب الدین صاحب مجلسی حیثیت سے زیادہ دلچسپ نہ تھے باتیں اکثر [illegible] باتیں کرتے کرتے اپنی دھن میں کھو جاتے اور جھول جھول کر باتیں کرتے جس طرح کہ پرانے مکتبوں میں لڑکے جھول جھول کر پڑھا کرتے ہیں غالباً یہ جھولنے کی عادت انہیں مکتب ہی سے ہوگئی تھی۔

حافظہ غیر معمولی قوی تھا۔ بچپن کی پڑھی ہوئی کتابیں تک ازبر تھیں اور بے تکلف سنایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ مجھ سے پوچھا کیا پڑھتے ہو میں نے جواب دیا سکندر نامہ۔ پوچھا بحری یا بری؟ مجھے معلوم نہ تھا کہ سکندر نامے بحری اور بری الگ الگ ہیں میں نے کہا جو نظم میں ہے تو کہا میاں یہ دونوں ہی نظم میں ہیں۔ تم جس سکندر نامہ کو پڑھ رہے ہو اس کا کوئی شعر سناؤ۔ میں نے شعر سنایا ؎

شنیدم ز پیران دیرینہ سنج
کہ زر زر کشد در جہاں گنج گنج

شعر سن کر کہا یہ سکندر نامہ بری ہے۔ پھر آپ نے سکندر نامے کے شعر سنانے شروع کیے اور تقریباً ڈھائی تین سو شعر ایک سانس میں سنا دیے۔ چند شعر جو میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے میں نے بتائے تو انہیں سمجھا دیا۔

عربی قصائد، فارسی قصائد اور غزلیات اور اردو کلام کا خاصا ذخیرہ موجود ہے، جس میں قصائد اور نظمیں بھی ہیں مگر اشاعت محدود ہوئی ہے
میر حامد علی خان ابوالمعانی، ڈاکٹر سیادت علی خان، ڈاکٹر ولی الدین انہی کے فرزند ہیں۔

قطب الدین صاحب کی کتابوں میں سے شرح شرح محمدی بہت مشہور اور مقبول ہوئی فارسی کتابوں کے علاوہ ان کی دوسری کتابیں چھپ نہیں ہوسکیں۔ مسودات خاندان والے کسی صاحب کے پاس ہیں جو شاید تلف ہو جائیں گے کیونکہ اب کوئی امید ان کی طباعت اور اشاعت کی نہیں ہے۔

محب حسین

مولوی محب حسین یو۔ پی کے باشندے تھے۔ ابتداً حیدرآباد آکر افسر جنگ کے توسط سے فوج کے دفتر میں ملازم ہو گئے اور زمانہ تک لڑکیوں کو پڑھاتے بھی رہے۔ آدمی معقول، پڑھے لکھے اور وضع دار تھے۔ حیدرآباد میں بہت جلد مقبول ہو گئے۔ پردے کے خلاف بڑی شدت کے ساتھ پردے کی مخالفت کرتے تھے، چونکہ ان کی دونوں صاحبزادیاں میری والدہ مرحومہ کے ساتھ پڑھتی تھیں اس لئے ہمارے ان سے خاصے مراسم تھے۔ بچپن میں ایک دو بار یہ لوگ ہمارے گھر آئے اور ہم بھی ان کے گھر جایا کرتے تھے اس آمد و رفت کی وجہ سے میں بھی محب حسین صاحب سے مانوس تھا اور ان سے خوب باتیں کیا کرتا تھا۔ والد مرحوم ان کے مخالف تھے کیونکہ وہ انہیں دہریہ اور نیچری کہتے تھے مگر انہوں نے مجھے کبھی ان سے ملنے کی ممانعت نہیں کی۔

حیدرآباد کی مشہور خاتون صغرا ہمایوں مرزا کو محب حسین نے بہت مشہور کیا۔ اپنے رسالوں "معلم نسواں" اور "مشیر نسواں" میں ان کا پروپیگنڈا کرتے رہے۔ غالباً محب حسین کی بے پردگی کی اسکیم پر کاربند ہونے والی حیدرآباد میں سب سے پہلی خاتون یہی تھیں۔

محب حسین مترجم بھی اچھے تھے۔ مرحوم نواب عزیز جنگ خان بہادر کو سر بھی ہوئے، کی دو بہترین کتابیں "امیر علی ٹھگ" اور "ٹیپو سلطان" اردو میں منتقل کیں۔ یہ امیر علی ٹھگ بڑا نفیس ترجمہ ہے۔ مدتوں تک دو ماہنامے نکالتے رہے اور ان میں اکثر ترجمے شائع کرتے رہے۔ حیدرآباد میں علمی ادبی فضا انہی نے پیدا کی اور یہاں کے نوجوانوں میں علمی کاموں اور ادبی ہنگاموں کا شوق پیدا کیا چنانچہ حیدرآباد کے نوجوانوں کی ایک بڑی جماعت ان کی وجہ سے علم و ادب کی طرف مائل ہو گئی اور انہوں نے خوب کام کیا۔ نوجوانوں میں مباحثوں اور تقریروں کا شوق بھی محب حسین صاحب نے پیدا کیا۔ ان میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ بالکل غیر سیاسی آدمی تھے اور ان کی طبیعت سازش کی طرف مائل نہ تھی اس لئے اطمینان کے ساتھ حیدرآباد میں کام کرتے رہے۔

عربی فارسی جانتے تھے اردو بھی اچھی تھی۔ انگریزی پر اتنا عبور رکھتا تھا کہ اردو میں ترجمہ بڑی عمدگی سے کر لیتے تھے، بانولی بہت سی دلچسپ باتیں کرتے رہتے۔ عبدالحلیم شرر سے بڑا انس تھا اور دونوں میں خوب چھنتی تھی۔

اس زمانے کے فیشن کے مطابق داڑھی منڈواتے تھے۔ کھدر پہنتے اور مولوی صاحب مشہور تھے مگر بالکل غیر مذہبی آدمی تھے۔ کئی ایک کتابیں چھپوائی تھیں۔ اب تو ان کے نام بھی مجھے یاد نہیں ہیں۔ آخر میں بصارت سے محروم ہو گئے تھے اور مرنے تک اسی حال میں رہے۔ ۱۹۲۲ء میں جب میں حیدرآباد آیا تو محب حسین صاحب نے ترجمے اور رقعات محب حسین کی بہت سی جلدیں فروخت کرانے کے لئے مجھے دیں مگر جب ۱۹۲۵ء کے اواخر یا ۱۹۲۶ء کے اوائل میں لندن سے آیا تو اندھے ہو چکے تھے اور دماغ بھی متاثر ہو گیا تھا۔ گلبرگہ میں ایک وکیل تھے حلیم الدین جن سے محب حسین کی ایک صاحبزادی بیاہی گئی تھیں۔ حلیم الدین کے انتقال کے بعد کچھ جائداد (مکان اور زمینیں وغیرہ) ان کی صاحبزادی کے حصے میں آئی تھی۔

سر کے انتظام کے لئے گولکنڈا آیا کرتے تھے۔ اتفاق سے گولکنڈہ سنگ تراشی و نقاشی ... بہت مشہور ہے۔ ان دنوں ... کرتے تھے
... دوست گئے تو عابد نے کچھ نہ مانتے ہوئے ... میں نے کہا صاحب! یہاں قادریہ میں ایک فقیر ہیں جن کا نام ہے عبداللہ اور
... بار آ چکے ہیں۔ چونکہ گولکنڈا میں منیر ... کشش میں ہے اس لئے اسی وقت چلے آئے ... عبداللہ قادری سے ملنے
گئے ... آپ ... لگے ... کہتے ہیں ... عرض کر رہا ہوں
... فقیر نے ایک دفعہ یہاں دیکھا تب آپ ... نہیں ... سے ... پیش ... ہوں گا۔ کہنے لگے
... کا حسن نے پیغمبروں کا دعویٰ کیا ہے۔ جس سے کہا قبلہ ... حاصل ... کرتے ہیں
... کرتے خود آپ بھی ... ہیں۔ ... پہلے ... سے ... اور ... جانے
کے لئے تیار ہو رہے تھے۔

اس طرح دو ایک سال گزار کر ... سے انتقال ہو گیا۔ ... ایک ... صاحب اولاد ہوئی اور ...
... ان کا ایک ... گزشتہ ... پر ہے۔ ... ایک ... مطبوعہ ...
... رسکندرسن ہو گئے میں ... رسالوں میں ... ہیں ... رہتے ہیں ایک ... ایل ایل بی
... وکالت میں ناکام ... ملازمت ... رکھتے ہیں ... سکندرسن ... لڑکیاں ...
... صاحب کی علمی ... ہیں ... علمی ادبی ... قابل ... ہے

عزیز جنگ ولاؔ

مولوی احمد عبدالعزیز المخاطب بہ عزیز جنگ متخلص بہ ولاؔ بڑے قابل بزرگ تھے۔ مولوی یوسف ... سب سے بڑے بیٹے
... موصوف ... بڑے فرزند مولوی غازی الدین احمد المخاطب بہ غازی یار جنگ ... کمسنی ... ہی ...
سے ... ہو گئے تھے۔ ۱۹۲۶ء میں اتفاق سے غازی یار جنگ ... پارلیمنٹ ... ہو گئے ... مولوی علی الدین ...
ناظم عدالت و مجسٹریٹ ... اور مولوی رکن الدین احمد ... وہاں چلے ... سے ... اس طرح تینوں بھائی ایک جگہ
جمع ہو گئے ... ان حضرات کے قیام ... نقیبانہ ... ملاقاتیں ... بھی ... ہو گئے۔

عزیز جنگ بہادر کی ... کے ساتھ ... کا اتفاق ہوتا تھا ... لینے کے بعد ولاؔ نے اپنی زندگی
تصنیف و تالیف کے لئے وقف کر دی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے ایسا ... ایسا ... ایسا ... حیدرآباد
بھر میں کسی کو نہیں پایا۔ ولاؔ مدراسی تھے اور مدراس کے شریف ترین گھرانے ... تھے۔ ... اپنے ... شرافت
... وضعداری میں اپنی نظیر آپ ہے۔ ولاؔ اس ... گھرانے کے ... تشین اور ... تھے۔ ابتدا چھوٹی سی خدمت پر مامور ہو کر
... کرنے اول تعلقداری ... تک پہنچ کر وظیفہ لیا۔ مختلف محکموں میں مامور ... اور جس کام کو بھی انجام دیا ... اور
خوش سلیقگی سے انجام دیا۔

تعلیم باقاعدہ ہوئی تھی، عربی فارسی کی بڑی اچھی استعداد تھی، مطالعہ بھی بڑا اچھا تھا جوانی ہی سے تصنیف و تالیف کا ذوق تھا اور ...
لکھتے تھے چنانچہ کھجور کی کاشت سے لے کر انگور کی کاشت تک ایک ایک کتاب لکھی ہے اور ہر کتاب اپنے موضوع پر مکمل اور ...

خرید کی وتاریخ گوئی پر چونکہ ایک نفیس کتاب کھو دی اس کے علاوہ ۱۹۰۰ء میں تاریخ گوئی سے متعلق کوئی کتاب چھپی ہے جس میں تاریخی مادے درج
جمع کر کے تحفۃ التاریخ، آئینۂ تاریخ وغیرہ ناموں سے لوگوں نے کتابیں شائع کیں مگر فن تاریخ گوئی پر اس کی ابتدا ہی پہلا مؤلف اور اہل ہیں۔
اس کے ساتھ ولا نے قانونِ مال، مخزن عطیات، مصطلحات عطیات وغیرہ پر بیسیوں کتابیں شائع کیں۔ ان کی خوش قسمتی ...
نے ہر کتاب پر صلہ تصنیف دیا اور سرکاری طور پر جلدیں خریدی جاتی رہیں چنانچہ تصنیف و تالیف سے خاصا نفع فائدہ انہوں نے اٹھایا۔
آصف اللغات کے نام سے ایک لغات کی ترتیب شروع کی اور ... کر ساتھ ہی ساتھ چھپواتے بھی رہے اور ... جلد
چھپ چکی ہیں۔ یہ بڑی اچھی اور خاص لغات ... جواب نایاب ہو گئی ہے۔ یہ تمام کتابیں ولا نے اپنے ذاتی پریس میں چھپوائی تھیں۔ ...
اپنے مکان ... ایک پریس قائم کر دیا تھا۔ کاتب اور سنگ ساز بھی ملازم رکھے تھے اور اپنی نگرانی میں چھپواتے رہتے تھے۔

طبیعت میں انتظامی صلاحیت اور نفاست بہت تھی، سلطان پورہ میں ایک مکان اور باغ بنا لیا تھا۔ مکان ...
جدا تو نفیس بنوایا پھر اپنے لڑکوں کے لئے الگ الگ حصے بھی بنوا دئے تھے جن پر چاروں بیٹوں کے لئے چار قطعات الگ ...
یہ چاروں ایک ہی جگہ رہتے تھے "عزیز باغ" ایک نمونے کا مکان تھا اس گھر کے زینے تک باہر نہ جاتے تھے۔ اندر ...
تھا جو اندر ہی کے سے دھلتا تھا اور چاروں بھائی ایک ساتھ ہنسی خوشی رہتے تھے

ولا بہت ہی خوش قسمت بزرگ تھے ان کے صاحبزادے سب کے سب قابل اور کارآمد نکلے، غازی یار جنگ نے عدالت ...
اسسٹنٹ آفیسر کی حیثیت سے وظیفہ لیا۔ محی الدین احمد صاحب ناظم ... ڈپٹی کمشنری ہوئے۔ ... یار جنگ ... ناظم کوتوالی ...
پولیس ہوئے اور اب حضور نظام کے پرائیویٹ اسٹیٹ کی کمیٹی کے چیئرمین ہیں۔ رکن الدین احمد صاحب ترقی کا ... سے
سبکدوش ہوئے اور اب بھی حضور نظام کے پرائیویٹ اسٹیٹ میں کارگزار ہیں۔

ولا کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ عربی، فارسی، اردو زبان میں خوب شعر کہتے تھے۔ اردو کا ایک ضخیم کلیات اور فارسی کا ایک ...
شائع ہو چکے ہیں ... رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سراپائے مبارک بڑا نفیس نظم کیا ہے جو طبع ہو چکا ہے۔

وہ حیدرآباد کی ... حیدرآباد کی ... رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹن اینڈ آئرلینڈ واقع لندن کو نمونۃً ... بھیجیں ...
کے اہل علم نے شکریہ کے ساتھ قبول کیا اور برٹش ... سے "شمس العلماء" کا خطاب بھی پایا تھا۔

ولا نہایت ہی وضع دار اور پابند ... تھے، جن لوگوں سے جس طرح ایک وضع لی تھی اسے آخر تک نباہتے رہے۔ ...
جاتا اگر کوئی ... کا ... ہوتا تو پیش ... اپنے باغ کے آم بھی کھلایا کرتے تھے ورنہ مٹھائی ... ہی جاتی
... ہر ایک کی خیر و عافیت پوچھتے اور پھر ... گفتگو فرمایا کرتے تھے۔ اپنی تصانیف بھی سرفراز کیا کرتے اور اس کے متعلق گفتگو ...
جاتی تو خوش ہوتے تھے

ایک زمانہ ... مجھے کتب خانہ آصفیہ جانے کی عادت ہو گئی تھی۔ کوئی خاص کتاب مطالعہ میں نہ ہوتی تو اساتذۂ فارسی کے دواوین
کا مطالعہ کرتا اور ایسے شعر جن میں محاورات یا خاص خاص محاورات وغیرہ ہوتے نوٹ کرتا جاتا اور ان کو جمع کر کے جب بھی حاضر ہوتا ان کے
پیش کر دیتا۔ میری اس حقیر کوشش سے بہت خوش ہوتے اور مجھے دعائیں دیا کرتے تھے۔ شاید ہی ان میں سے کچھ چیزیں ان کے لئے کارآمد
ہوتی ہوں گی مگر چونکہ میں محنت کر کے جمع کرتا اور ان کا خیال رکھ کر بھیجا کرتا تھا اس لئے خوش ہوتے تھے۔

ولا کی اصولی زندگی اور باقاعدگی ضرب المثل تھی اور لوگ اس پر رشک کرتے تھے۔ یہی جھلک ان کے صاحبزادوں میں بھی ہے چنانچہ
... یار جنگ نے ... سب سے زیادہ اس ... میں حصہ پایا ہے۔

کشن پرشاد شاد

ہز ایکسی لینسی مہاراجہ یمین السلطنت کشن پرشاد بہادر شاد [illegible]
[illegible] مہاراجہ بہادر نے وزارت کی گود میں پرورش پائی اور [illegible]
[illegible] مصاحبت حاصل [illegible]

[illegible] شاعری اور ادب کا ذوق ورثے میں [illegible]
[illegible] ہو گئے۔

[illegible]

[illegible] کی پرورش کرتے اور ہر ایک کو [illegible]

[illegible]

[illegible] کی سرپرستی اور اعانت [illegible]

[illegible]

[illegible] ہوئے۔

[illegible] فارسی اچھی طرح جانتے تھے [illegible] انگریزی سے [illegible]
[illegible] مہاراجہ نے سینکڑوں کتابیں لکھیں [illegible]
[illegible] شعر و ادب سب پر تصنیف [illegible] خود بھی خوب لکھے [illegible]
[illegible] سے مشورہ کرنے لگے۔ [illegible] کے بعد جلیل [illegible] مشورہ کرنے لگے

مہاراجہ بحیثیت انسان بڑے مکمل تھے [illegible]
[illegible] میں نے ہزاروں آدمی دیکھے مگر [illegible]
[illegible] ہے۔

میرے گھر کے سامنے میر پاشا رسیف الملک کی ڈیوڑھی کے افسر [illegible] ہیں ایک کریم الدین نامی نوجوان رہتے تھے بہت ہی معمولی حیثیت کے آدمی تھے۔ واجبی واجبی تعلیم یافتہ تھے۔ ترکی کو اچھا اردو کلام بنایا کرتے تھے۔ ایک روز مہاراجہ کے ایک ملازم نے میرے پاس آکر ان کا پتہ پوچھا میں نے پتہ بتا دیا تو دس پندرہ منٹ کے بعد انہیں ساتھ لئے ہوئے آیا اور میرے سامنے دو سو روپے انہیں دے کر رسید لکھوا لی اور مجھ سے گواہی بھی لکھوالی کہ میرے سامنے یہ رقم کریم الدین کو دی گئی ہے۔ کریم الدین نے رقم لینے کے بعد کہا کہ انہوں نے چھ آٹھ مہینے پہلے مہاراجہ کی خدمت میں ایک منظوم درخواست بھجوائی تھی کہ میں اجمیر شریف جانا چاہتا ہوں، زادِ راہ سے سرفراز فرمایا جائے چنانچہ اب مہاراجہ نے سرفرازی فرمائی ہے۔

چونکہ مہاراجہ اس قسم کی داد و دہش کے عادی تھے اس لئے مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ دو چار روز کے بعد میں حاضر ہوا تو مہاراجہ نے یاد کیا اور انہوں نے پوچھا کیا الدین جو تمہارے گھر کے پاس رہتا ہے کون شخص ہے۔ میں نے اس کے متعلق جو کچھ جانتا تھا عرض کر دیا اور یہ بھی عرض کر دیا کہ استاد ذوق کی طرح وہ غزل بناتے ہیں۔ یہ سن کر مہاراجہ بہت محظوظ ہوئے فرمانے لگے کیا ترکی صاحب اردو زبان کے بھی استاد ہو گئے میں نے عرض کیا وہ ہر زبان کے استاد ہیں۔ فارسی اور اردو دونوں پر انہیں یکساں عبور ہے اور اب تو مشاعروں میں اردو غزل بھی پڑھنے لگے ہیں۔ اس گفتگو کے بعد مہاراجہ ہمارے کمرے میں جا کر ایک کمل لپیٹا ہوا کاغذ لا کر مجھے عنایت فرمایا کہ اسے دیکھ کر واپس کر دو۔ یہ ایک [illegible] جو تہائی سائز کا تھا اور اس پر موٹے قلم سے ایک نہایت بیہودہ شعر مہاراجہ کے متعلق لکھا ہوا تھا جس میں بڑی غلیظ گالی تھی۔ اس مصرع کو دیکھ میں نے کاغذ کے پرزے پرزے کر دیئے اور میرا چہرہ غصے سے تمتما گیا۔ میری یہ حالت دیکھ کر مہاراجہ نے مسکراتے ہوئے فرمایا: یاد ہے کچھ مہینے ہوئے اس شخص نے ایک تحریر بھیجی تھی کہ جمعہ شریف جانا چاہتا ہوں اور وہاں کے لئے اخراجات پانچ سو روپے دیئے جائیں۔ میں نے اس بات پر توجہ نہیں کی۔ ڈیڑھ دو مہینے کے بعد پھر اس شخص نے ایک تحریر بھجوائی جس پر اس نے اس پر بھی کوئی توجہ نہیں کی۔ اب دو مہینے کے انتظار کے بعد اس نے اس طریقے سے یاد دہانی کی ہے یعنی مصرع ہے

ناشاد ہو کر کیوں نہ خاطر شاد کی ؟

ہی گالی تھی۔ دوسرے مصرعے میں اس نے گالی دے کر ہجو کی ہے۔ یہ عام طریقہ ہے شعراء پہلے قصیدہ پیش کرتے ہیں پھر تقاضا کرتے ہیں اور پھر ہجو کرتے ہیں۔ اس غریب نے بھی یہی کیا۔ میں نے عرض کیا بالکل صحیح ارشاد ہوا اگر کسی شاعر نے کسی امیر کی ہجو کی ہے ایسی ہی بات جو ہجو فردوسی سے منسوب کی جاتی ہے وہ بھی ایسی ہی بیہودہ ہے۔ فرمانے لگے تم بھی کہتے ہو اگر وہ فردوسی تھا اور ہم محمود ہیں تب تو

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

بعد کو جب میں نے ترکی سے یہ قصہ کہہ دیا تو انہوں نے کہا مہاراجہ نے مجھے اپنے پاس آنے سے منع کر دیا تھا اور منشی [illegible] کے ذریعہ [illegible] نے سنا بھی دیا تھا۔

غور فرمائیے ایک جنتیت نہ ہے بیہودہ شخص سے ایسی گالی سن کر دو سو روپے دینا مہاراجہ کے کردار کو کہاں پہنچا دیتا ہے؟

ہمارے خاندان کے کسی بزرگ کی شاگردی مہاراجہ کے کسی بزرگ نے کی تھی اس کا لحاظ وہ مرتے دم تک فرماتے رہے اور میں ہمیشہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ وزارت سے علیحدہ ہونے کے بعد مہاراجہ سے جن جن لوگوں نے بے اعتنائیاں کی تھیں اور جو لوگ انہیں سلام کرنے میں ان کا سلام لینے تک کے روادار نہ تھے ان سے جو جو سلوک مہاراجہ نے کئے ہیں میں بخوبی جانتا ہوں۔ صدر اعظم ہوتے ہی ان سب لوگوں نے یورش کر دی، مدحتی قطعے، پھول پان، قصائد، تہنیتیں، تاریخیں پیش کیں اور طرح طرح سے آمد و رفت شروع کر دی اور مہاراجہ اسی طرح ملتے رہے جیسے مدار المہامی کے زمانے میں ملتے تھے۔ پیچھے کے حالات کو انہوں نے بھلا ہی دیا۔ ایسا وسیع القلب اور درگزر کرنے والا شاید ہی پیدا ہو۔

مہاراجہ میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ کبھی کسی کا دل نہ توڑتے اور جو شخص جو بھی خواہش کرتا اس کے تکملہ کا وعدہ کر لیتے اور اپنی حد تک کوشش بھی کرتے تھے۔ اپنے آپ کو انہوں نے کبھی بھی بڑا آدمی نہیں سمجھا۔ ہمیشہ اپنے تئیں حقیر، فقیر، غریب ہی سمجھتے رہے۔ خود نیک [illegible] الطبع تھے اس لئے ہر ایک پر اعتماد کرتے تھے۔ ابتداً ان کی پیشی میں مولوی محمد علی (نبیرۂ مولوی کرامت علی محدث دہلوی) رہے ان پر اتنا اعتماد کرتے تھے کہ سارا کام انہی پر چھوڑ دیا تھا ان کے دستخط دیکھ کر خود دستخط کر دیا کرتے تھے اور محمد علی کا یہ حال تھا کہ انہوں نے بھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا اور ہمیشہ اعتماد بنے رہے۔ اسی وجہ سے لوگ ان کے مخالف ہو گئے چنانچہ لال خان کوتوال نے فرضی خطوط اور جعلی کاغذات بنا کر محمد علی کو شہر بدر کرا دیا اور وہ حیدرآباد سے پونا چلے گئے اور بعد میں احمد نگر جا بسے جہاں ان کا انتقال ہو گیا اور وہیں دفن ہوئے۔ یہ مہاراجہ کی مدار المہامی کے منہ بولتے

[illegible] خطوط کے سلسلے میں [illegible] نواز جنگ [illegible] کے [illegible] ہیں [illegible] کو [illegible] کر دیا تھا اور [illegible] محمد علی [illegible] کرتے تھے [illegible] سے [illegible] ہو گئے [illegible] ہیں [illegible] کو خاصا پریشان کیا مگر [illegible] نواز جنگ بہادر [illegible] تھے اور [illegible] سے [illegible] رہا ہے۔

[illegible] انتقال کے بعد ایک [illegible] جنگ [illegible] کے [illegible] ہے [illegible] صحبت سے [illegible] ایسی صحبت [illegible] ہے۔

[illegible] اور ادب [illegible] کے لئے [illegible] ہے۔

[illegible] دوا دوش [illegible] کو [illegible] اور [illegible] کی [illegible] اور اپنی پریشانیوں کی [illegible] اور اپنی [illegible] کی [illegible] سے [illegible] تھا۔

[illegible] اور [illegible] دیتے ہیں سے [illegible] تھے [illegible] کر دیتے [illegible] سے۔ [illegible] کر جاتے [illegible] جاتے [illegible] اسی طرح [illegible] آ کر [illegible] ترجیب [illegible] دیتے [illegible] ایک ساتھ جایا کرتے تھے اور [illegible] کے کھانے پر [illegible] لئے جانے [illegible] کر [illegible] میں [illegible] اور [illegible] سے زیادہ پچاس روپے ہر [illegible] تھے۔

۱۹۳[illegible]ء میں مجھے ٹائی فائڈ ہو گیا۔ بیرون علالت کی اطلاع ملی تو مکان پر تشریف لائے۔ جاتے جاتے سرہانے کے تکیہ کے نیچے نوٹ [illegible] ایک سو روپے کے رکھ کر تشریف لے گئے۔ اس حالت میں تین دفعہ تشریف لائے اور تینوں دفعہ ہی تکیہ کے نیچے نوٹ چھوڑ گئے۔ روزانہ آدمی کو بھیج کر خیریت دریافت کراتے اور [illegible] حبیب احمد صدیقی [illegible] اسے ڈی سے مددگار ہیں [illegible] الگ روپے بھجواتے اور کہلواتے کہ علاج معقول کریں ضرورت ہو تو اور بھی منگوا لیں۔

میں نے ادارۂ علمیہ کے نام سے ایک بک ڈپو قائم کیا تھا جو عابد روڈ پر تھا۔ جب بھی آپ جاتے تشریف لاتے اور کتابیں لے جاتے، بل بھیجنے سے پہلے رقم آ جاتی۔ میرا چھوٹا بھائی رشید اکثر چلا جاتا اور وہ جب بھی جاتا فرماتے "بھئی وہ کتابیں جو آئی تھیں ان کی قیمت لیتے جاؤ۔" چنانچہ ساڑھے ستر روپے اسی وقت دے دیتے۔ اس طرح کتابوں کی قیمت چار چار دفعہ ادا ہوتی۔ یہ دینے کے بہانے تھے۔ عید، بقرعید، ہولی، دیوالی کوئی تقریب ہو سرفرازی لازمی تھی۔ دیتے وقت اس کی حیثیت نہیں دیکھتے جسے دیکھ رہے ہیں بلکہ اپنی حیثیت پیش نظر ہوتی۔ دل کھول کر دیتے اور پھر شرماتے کہ میں نے کم دیا ہے۔ یہ بات میں نے مہاراجہ کے علاوہ صرف مولانا خورشید علی ناظم دفتر دیوانی میں پائی ہے اور کوئی تیسرا

اس صفت سے متصف نظر نہیں آیا۔

مذہب کے معاملے میں مہاراجہ "گول" تھے۔ صبح اللہ کر پوجا بھی کر لیتے نماز بھی پڑھ لیتے، وصیلی گیان بھی کرتے اور نذر کا شغل بھی ہوتا، ملاں کی جاتا بھی دھوم دھام سے کرتے گیارہویں کی نیاز بھی تزک و احتشام سے ہوتی اور محرم بھی بڑی عقیدت سے منایا جاتا۔ مشائخ کے ہاتھ چومتے، گرو بابا کے پاؤں پڑتے، دونوں طریقوں پر چلتے رہے۔

ایک مسلمان خاتون سے عقد کیا تھا اور ساہیہ میں اپنے آپ کو مسلمان لکھا دیا۔ مرتے وقت وصیت کی کہ ہندو طریقے پر جنازہ اٹھے کیونکہ انہیں باور کرایا گیا تھا کہ اگر آپ نے وقت کوئی وصیت نہ کی اور مسلمان طریقے پر دفن ہوں تو آپ کی موروثی جیشاماں آپ کے خواجہ پرشاد کو نہ ملے گی۔ محض خواجہ پرشاد کی خاطر مہاراجہ نے جتا میں جلنا پسند کیا مگر نصیب خواجہ پرشاد کو صرف پھلنا نصیب نہ ہوا۔ اس میں ایک زنگل کی بالائی منزل پر سے گر کر بیچارہ کی جان گئی۔

جی تو نہیں چاہتا کہ مہاراجہ کا ذکر ختم کروں مگر لکھنا بہت ہے اور وقت کم ہے اس لئے مجبوراً ختم کر رہا ہوں۔

حیدرآباد کے دور لطف کے بزرگوں میں سے میں نے ستاون کا انتخاب کیا ہے یہ وہ ہیں جن سے میں ذاتی طور پر واقف رہا ہوں اور جو باتیں میں نے لکھی ہیں اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں اور اپنے محسوسات کو ایمانداری سے پیش کیا ہے۔

پچھلے دور کے دور کی چند شخصیتوں سے روشناس ہو جائیے یہ دور بڑا لمبا ہے اس میں سینکڑوں بزرگ آتے ہیں مگر میں نے صرف چند کا انتخاب کیا ہے۔

ضیاء یار جنگ

مفتی نور الضیاء اللہ بن المخاطب بہ ضیاء یار جنگ دکن کے قدیم ترفا سے اور حیدرآباد کے عالم فاضل بزرگ تھے۔ اورنگ آباد کے مشائخ گھرانے سے تعلق تھا۔ حیدرآباد ہی میں تعلیم و تربیت ہوئی تھی فارغ التحصیل اور نہایت ذہین بزرگ تھے۔ علم و ادب کے علاوہ قدیم مشاغل پتنگ بازی، شطرنج، شکار، شاعری، کبوتر سبھی کا شوق تھا۔ "تماش بینی" میں بھی مشہور تھے۔ مختلف خوبیاں جمع تھیں۔

یہاں بھی میرے لئے وہی مصیبت ہے جس سے ڈرتا ہوں۔ ضیاء یار جنگ بہادر کی حیثیت حیدرآباد میں وہی تھی جو یو پی میں نواب صاحب جہانگیرآباد یا چودھری محمد علی رودلوی کی تھی۔ اس فن تماش بینی کو انہوں نے فن کی طرح استعمال کیا تھا اور اس میں ماہر کامل تھے مگر تفصیلات نہ تو طفیل صاحب چھاپنا پسند کریں گے اور نہ حیدرآبادی بزرگ پڑھنے کے بعد مجھے زندہ رہنے دیں گے اس لئے ؏

کردم اشارتے و مکرر نمی کنم!

شطرنج دن دن بھر کھیلتے، پتنگ مسلسل لڑاتے مہینوں پتنگوں کے جلسے ہوتے جتنے لوگ شریک ہوتے انہیں کھلاتے پلاتے۔ ان کی عادت کے موافق ہر بات کا خیال رکھتے تھے۔ بڑے مزخرفات، علمی حد تک ایک چلتی پھرتی انسائیکلوپیڈیا تھے۔ مسائل علمیہ سے بھرے ہوئے ؏

اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

بڑے سے بڑا فتویٰ چلتے چلتے لکھوا دیتے، اہم سے اہم مسئلہ شطرنج کھیلتے کھیلتے حل کر دیتے اہم سے اہم مقدمہ کا حقہ گڑگڑاتے ہوئے

[illegible] رہتے۔ اکثر رسائل میں مخفی اور مبلغ کی حیثیت سے بھی کام کیا اور اچھا خاصا نام کمایا۔ گو بڑے بڑے شاعروں سے ان کا [illegible] تعلق [illegible] سوانح کی
[illegible] سے پیسے کی منفعت بھی اس لئے تحائف اور نقدی وغیرہ قبول کر لیتے ہے مگر بلند آواز پر [illegible] سب
[illegible] میں جب سیاست اور ملک ہوگیا تو معاملات بگڑ گئے۔ [illegible] سید یوسف [illegible] صاحب نے [illegible] قتل ہونے [illegible]
[illegible] ہوئی تو ایک روز صبح ناشتہ کر کے والد صاحب [illegible] اس ملک سے قوم بھی [illegible] ہوگیا [illegible]
[illegible] تھے اس لئے دونوں میں بڑی بے تکلفی تھی۔ والد کو [illegible] لئے [illegible] آ [illegible] [illegible]
[illegible] شاہ [illegible] والد کو [illegible] السلام [illegible] ہو گئے [illegible] ملاقات [illegible] سے [illegible]
[illegible] آباد میں فنکاروں کا جلسہ ہوتا تو ان کی بھی یاد فرماتے۔ وہ وہاں [illegible] بڑے خلوص سے [illegible] تھے۔

تقریریں اچھے تھے۔ ایسی اچھی تقریر فرماتے کہ [illegible] ہو جاتا تھا [illegible] [illegible]
[illegible] گو [illegible] [illegible] ہے۔ معاصر کا لحاظ کرنے سے [illegible] [illegible]
[illegible] اور ان کو صحیح رہنمائی کرتے تھے۔

[illegible] کے لئے [illegible] شاہ صاحب فارسی غزل [illegible] بھی کہتے تھے [illegible] [illegible]
[illegible] پڑھتے تھے۔ [illegible] اور [illegible] کرنے کا [illegible] [illegible] صاحب [illegible]
[illegible] [illegible] کے لئے [illegible] صاحب [illegible]
[illegible] کے خلاف [illegible] شروع کی [illegible] [illegible]
[illegible] بگڑ گئے تھے۔ ہر کام کرنا [illegible] ہر بات کے لئے آمادہ تھے۔

اگر [illegible] میں یہ دوسری [illegible] نہ ہوتیں اور وہ صرف علمی ادبی کام میں لگے رہتے تو ملک کے [illegible] ہو سکتے تھے۔
[illegible] بھی انہوں نے ملک کی علمی، ادبی، سیاسی، مذہبی خدمت حاصل کی ہے۔ [illegible] [illegible] کا
[illegible] پس ماندوں کو شعر و ادب سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

غلام حسین داد

آج سے پچاس سال پہلے ایک بڑی اچھی جماعت نوجوانوں کی دکن میں ابھر رہی تھی [illegible] سب سے [illegible] علمی [illegible]
[illegible] حسین [illegible] حضرت علی اور شریف الخاندان تھے، گھر کے بھی خوش حال تھے۔ طبیعت میں جدت [illegible] خدمت کا جذبہ
تھا ساتھ ہی ساتھ علمی ادبی جدوجہد بھی کرتے تھے۔

چھوٹی چھوٹی نظمیں بڑی اچھی کہتے تھے۔ ان دنوں مرلی بانی اور سیتا جی خوب عام تھی، جس طرح مندروں میں دیوداسیاں ہوتی ہیں اسی طرح
حیدرآباد میں ایک طبقہ مرلیوں کا تھا یہ نیچ ذات کی ہوتی تھیں مگر ہوتی غضب کی تھیں۔ ان میں سے کچھ "کارٹون" کی حیثیت سے [illegible]
میں [illegible] کچھ "کمائی" کی حیثیت سے گھر والوں میں نوکر رہتیں اور کچھ صرف "پیشہ" کرتی تھیں مگر یہ سب ہوتی تھیں مرلیاں۔ حیدرآباد کا
نوجوان طبقہ ان سے بہت متاثر تھا۔ بیشتر لوگوں نے ایک ایک مرلی بطور "داشتہ آید بکار" رکھ چھوڑی تھی۔ شرفاء اور امراء کم مگر متوسط
اور ادنیٰ طبقہ بہت زیادہ اس سے متاثر تھا۔ ان دنوں یہ معیوب بھی نہ تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ مرلی ہوتی بھی عجیب تھی۔ ایک وضع اس کے چکر میں

جیسے [illegible] ہوا ۱۹۰۰ اکثر لوگوں نے اپنی بیاہتا بیویوں کو چھوڑ کر دوسروں کو گھر خالی پایا تو اور انہی کے ہو رہے۔ [illegible] کے [illegible]
کا معاوضہ کس [illegible] کچھ نہیں [illegible]۔ سب سے پہلے غلام حسین وحشت نے ایک لمبی نظم کو اور کراؤن ½ سائز کے ۴ صفحوں کی صورت میں بزاعوں کی
میں شائع کی جس کا نام رکھا " مرلی کی بہار" پھر سیندھی خوری پر ایک نظم کی اور "[illegible]" [illegible] چھپوائی۔ اس کے بعد مرلی [illegible]
"[illegible] کی دوستی" وغیرہ قسم کی نظمیں [illegible] عمدہ عمدہ کتابیں [illegible] شائع کیں۔

[illegible] نظمیں [illegible] کی بہت مقبول تھیں۔ [illegible] کے علاوہ عبدالحق [illegible] [illegible] کبھی [illegible] [illegible] [illegible]
ہونے لگے [illegible] کر ایسا نظر پیش کرتے کبھی [illegible] ایک کتاب [illegible] [illegible] گھر چھپوانے اسے [illegible] [illegible]
اور اس کے مطابع [illegible] ہوتے تھے۔ [illegible] کی شادی [illegible] [illegible] وغیرہ بھی لکھے تھے۔ انہیں بھی ایک بڑی
وآو نے کتابی صورت میں چھپوا دیا تھا [illegible] کی شادی پر سہروں کا مجموعہ وآو نے چھپوایا [illegible] [illegible] دوستوں کی [illegible]
بلکہ ملک کی خلافت و [illegible] کی [illegible] رہے تھے [illegible] حیدرآباد میں [illegible] [illegible] وآو نے اپنی تصنیف ہوتی کتابیں کی [illegible]
قیمت رکھ کر لڑکوں کو دینا شروع کیا اور وہ گھوم پھر کر بیچنے لگے اس طرح وآو ہی نے حیدرآباد میں [illegible] پیدا کئے اور بیچنے والے کتب [illegible]
بھی [illegible] کی وجہ سے [illegible] کے ساتھ لوگوں [illegible] آمدنی بغدادی قاعدہ وغیرہ بھی رکھ کر چلتے پھرتے بیچنا شروع کر دیا۔ وآو
نظمیں [illegible] ہوئیں کہ بچے بچے کی زبان پر چڑھ گئیں۔ یہ سلسلہ وآو اور ان کے ساتھیوں نے سات آٹھ سال تک جاری رکھا ہم
ان تمام کتابوں کو اکٹھا کر کے جلدیں بنا لی تھیں مگر میری زندگی "دشت گردی اور صحرانوردی" میں بسر ہوئی اور پھر تیس سال سے حیدرآباد
ہوں بھی تو "محلہ نورد" کبھی کرنل میں تو کبھی سلطان پورہ میں، کبھی عثمان پورہ میں تو کبھی سلطان شاہی میں اس طرح کرایہ کے مکانوں میں رہتے
میری کتابیں دیمک کی نذر ہوئیں اور ادھر سے اُدھر آنے جانے میں الگ ضائع ہوئیں اب ان میں سے ایک کتاب بھی بچی
نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے انہیں حقیر سمجھ کر ان کی حفاظت بھی نہیں کی۔ ہائے کتنے کام کی چیزیں ہم نے برباد کیں۔

بچپن میں یہ نظمیں جیسے جیسے لکھی جاتی تھیں ہم یاد کر لیتے تھے کیونکہ ہمارے دیوان خانہ ہی میں یہ لکھی جاتی تھیں۔ ایک نظم کے چند شعر
آگے ملاحظہ کیجئے، شانِ نزول یہ ہے کہ ایک صاحب بڑی بھول [illegible] گھر بار چھوڑ کر مرلی کے گھر پڑ گئے ہیں اور ان کی بیوی بچے [illegible]
گزار رہے ہیں۔

ماں بے قرار ہے کہ پکانے کو کچھ نہیں ۔۔۔ بچے بلک رہے ہیں کہ کھانے کو کچھ نہیں
بیٹی کے پاس جسم چھپانے کو کچھ نہیں ۔۔۔ گھر کا یہ حال ہے کہ بچھانے کو کچھ نہیں
[illegible] [illegible] بچے کو سودا مرے

. . . .

بہر حال وآو نے ملک [illegible] کی بڑی خدمت کی۔ ایک پریس انہوں نے قائم کر لیا تھا، کتابت کبھی خود کرتے کبھی کسی سے لکھوا لیتے۔ نہایت
مرنجاں مرنج اور ہمدرد منزل کے مالک تھے، مجھ پر بڑی عنایت فرماتے۔ جب کوئی کتاب چھپواتے سب سے پہلے مجھے عنایت فرما
رہتے کہاں تھے مجھے معلوم نہیں کیونکہ ہم کبھی ان کے گھر جاتے ہی نہ تھے۔ یہی آتے اور بہت آتے بلکہ دو دو دن ہمارے پاس ہی رہتے
سعید بن علی مصلی ایک عرب جمعدار والد کے دوست تھے وہ بھی بہت آتے تھے۔ وآو سے ان کی بڑی بے تکلفی تھی۔ دونوں [illegible]
تو آپس میں خوب چھیڑ چھاڑ ہوتی تھی۔ اب تو بہت کم لوگ وآو کو جانتے ہیں مگر ان کو حیدرآباد کبھی بھلا نہیں سکتا۔

عزیز یار جنگ

نواب مشرف جنگ کے فرزند تھے۔ [illegible] شاہ اور [illegible] کے شاگرد تھے۔ [illegible]
[illegible] تھے۔ [illegible] ہوئے۔ [illegible]
[illegible] اور شعر [illegible] [illegible]

[illegible]
[illegible] نے [illegible] [illegible]
[illegible] تب وہ [illegible] [illegible]
[illegible] صاحب نے [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] حاصل [illegible]

[illegible] ظاہر کردی [illegible]
[illegible]
[illegible] اور [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]

وارثوں نے [illegible] پریشان ہو گئے تھے۔ آخر [illegible] اور عزیز یار جنگ ان کے کھانے
اور پینے کے ذمہ دار رہے [illegible] نادان [illegible] [illegible]
[illegible] نادان [illegible] [illegible]
گئے اور بری طرح گرے۔ لوگوں نے پوچھا کہ [illegible] یہ شعر سنایا:

مصحف سے کر چکا جب [illegible] میں گرا
میں نے نظر جو کی [illegible] کہاں ہے؟

نادان کا کلام بہر حال شائع ہی نہیں ہوا اور بہر حال ایک تکیے میں بھر کے رکھے ہے عزیز یار جنگ کے پاس رہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عزیز یار جنگ کے دیوان "ارمغانِ عزیز" میں کچھ حصہ نادان کا بھی ہے، اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ تحقیق طلب ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ ایسا نہ ہوگا کیونکہ عزیز [illegible] اور اچھے شاعر تھے۔

کنگ کوٹھی کے قریب مس ٹیکاشا نے گھر بنا لیا تھا اور ڈاکٹر مس ٹیکاشا سے بڑی دوستی تھی جس کی وجہ سے خود بھی بہت باقاعدہ زندگی بسر کرتے تھے۔ [illegible] میں یورپ کا سفر بھی کیا تھا۔ شعر و سخن کا ذوق بہت تھا، دن بھر اسی کا پرچا رہتا تھا۔ مرنے تک یہی کیفیت رہی۔ [illegible] شعرا [illegible] آرا رہتے۔

اکبر علی

مولوی اکبر علی مدیر صحیفہ کلثوم صاحب نے ابتدا میں دکن کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا تھا مگر وہ ایک سال بھی نہ چلا۔ پابندی سے رسالہ نکالنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ اس لئے رسالہ جلدی بند ہو گیا اور اسے اکبر علی صاحب نے لے لیا۔ چند پرچے ہفتہ وار نکلے اور پھر ۱۹۰۸ء میں نواب میر عثمان علی خاں بہادر کی تخت نشینی کی تقریب میں صحیفہ کو روزنامہ بنا دیا اور اس اخبار کو بڑی عمدگی سے چلاتے رہے۔ اکبر علی حیدرآباد کی سیاست میں تحفظ ذوقی کے حامی رہے۔ وہ نظامت مرکزی کامیاب کے صدر محاسبی میں ملازمت کرلی تھی۔ پھر صحیفہ جاری کیا تو کام چھوڑ دیا اور بڑی محنت سے صحیفہ کو اپنے پاؤں پر کھڑا کیا۔ بڑے پابند وضع اور متین صاحب تھے۔ میرے والد کے دوست تھے اس لئے مجھ پر بڑی عنایت فرماتے تھے۔

۱۹۱۶ء میں جب میں والد کے ساتھ عثمان آباد میں تھا اکبر علی صاحب نے مجھے نامہ نگار بنایا اور اضلاع کی ہفتہ وار خبریں بھیجنے کے لئے کہا۔ میں ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۳ء تک عثمان آباد اور گلبرگہ سے صحیفہ کا نامہ نگار رہا۔ ہر دو چار مہینے کے بعد دو چار روپے کے ٹکٹ اور چھپے ہوئے کارڈ اکبر علی صاحب میرے پاس بھجوا دیا کرتے تھے۔ یہ معاوضہ دیتے تھے وہ نامہ نگاروں کو۔ عام حالات لکھنے میں کام آتے اور ٹکٹ لفافے پوسٹ کرنے میں لگ جاتے۔

۱۹۲۳ء میں جب میں مستقل طور پر حیدرآباد آ گیا تو مجھ سے ترجمہ کی خواہش کی اور میں نے صحیفہ کے لئے ترجمہ کرنا بھی شروع کیا مگر مولوی اکبر علی نے اس کا معاوضہ نہیں دیا۔ عبدالرؤف صاحب بی اے ایل ایل بی جو بعد میں حیدرآباد میں وزیر بھی ہو گئے تھے مدتوں روزانہ تین چار گھنٹے صحیفہ میں بیٹھ کر ترجمہ کرتے رہے مگر مولوی صاحب نے انہیں بھی سوکھی ہی ٹرخا دیا اور کوئی معاوضہ نہیں دیا۔ کاتب پریس مین بھی تنخواہ کے لئے روتے رہتے تھے۔ مولوی صاحب کے کان پر جوں نہ رینگتی۔

صحیفہ ڈائری شائع کرنے کا سامان تھا۔ اٹھایا پھر دہلی اور کلکتہ کے سفر میں حضور نظام کے ساتھ جا کر سفر شاہانہ کا روزنامچہ مرتب کیا اور اس کی طباعت اور اشاعت کے لئے حاصل کی۔ اس طرح آمدنی کے ذرائع بہت محدود پیدا کر سکتے تھے مگر نفقیہ مشاہرہ دینے تو مجبور کرنے والے تھے۔ اس سے زیادہ ہمت نہ کرتے تھے۔ اس طرح بحالت ان کی طبیعت ناسپرد ہو گئی تھی۔ اس حالت کے باعث ان سے سب تنگ تھے۔

اس سے قطع نظر آدمی بڑے ہی پابند اور دھن کے پکے تھے۔ جو بات ذہن میں آتی لکھتے اور بے دھڑک لکھتے تھے کسی قسم کی سزا کا ذرا بھی خوف بھی نہ ہوتا تھا۔ البتہ سر اکبر حیدری کو بہت برا سمجھتے تھے۔ بڑے کے سر اکبر کی مخالفت کے پوسٹر چھپواتے اور خود اپنے ہاتھ سے سیڑھی لگا کر رات بھر حیدرآباد میں کام کروا دیتے پوسٹر لگاتے اور سر حیدری سے روپے بھی پاتے۔

پرانی وضع کے آدمی تھے نئی باتیں نہایت ناپسند تھیں۔ اپنے اخبار میں ایک کالم نسوانی کے نام سے لکھا کرتا جس میں عورتوں کی بے پردگی پر چھپتی تھیں اور بڑے مزے مزے سے عورتوں کی بدکرداریاں چھاپتے تھے۔ آج کل جس طرح صدق جدید لکھنؤ عورتوں کی بیہودگیوں کو مزے لے لے کر لکھتا ہے اسی طرح اکبر علی بھی لکھا کرتے تھے۔ ایک دفعہ یہ خبر ملی کہ کوئی لڑکی اپنے مرید مرشد کے ساتھ فرار ہو گئی مولوی جی نے سرخی بنائی «مشہور سے مشہور» اس طرح بڑے مزے کی چیزیں چھاپتے رہتے تھے۔

بعض خرافات پر بیک دل سے خفا ہوتے اور بڑی عمدگی سے اس کے خلاف لکھتے اور یہ قلمی جہاد مسلسل کرتے رہتے تھے غرض حیدرآباد کے قصر صحافت کے ایک ستون تھے۔ تقریباً چالیس سال تک صحیفہ چلاتے رہے اور بڑی عمدگی سے چلایا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے پرچہ نہ چلا سکے۔ پریس اب تک چل رہا ہے جو انہی کی یادگار ہے۔

[illegible] ادبی ذوق بھی عام تھا [illegible] بھی لکھا [illegible] ایک [illegible] احسان صاحب [illegible]
[illegible] بھی نقل تھا [illegible]

راجیشور راؤ اصغر

حیدرآباد کے مشہور مسلمان شاعروں کے دور میں [illegible]
[illegible] اور ملکی مالیات میں مصروف رہے تھے [illegible]
[illegible] چھپوائی [illegible]
[illegible] ایک انتخاب شعر [illegible]

ابتدا مجھ سے واقفیت [illegible]
[illegible]
[illegible] اور انہی کی معرفت چھپوانے بھی لگے [illegible]
عنایت مجھے [illegible]
[illegible] کتابوں کا مالک [illegible] کے مصنف تھے۔

چونکہ فطرتاً نیک [illegible] تھی اور اپنا پروپیگنڈہ کرنا نہ آتا تھا اس لئے زیادہ مشہور نہ ہو سکے، حساب بھی ایسے [illegible] جو اچھا تے [illegible]
بیچارے تقریباً گمنام رہے۔

مختار احمد

[illegible] اسلامی [illegible] مختار احمد ٹونک کے باشندے تھے مدتوں پہلے حیدرآباد آگئے اور یہیں کے ہو رہے [illegible] علمی خدمات کے صلے میں کچھ تنخواہ بھی مقرر تھی اور ٹونک [illegible] سے سال میں دو تین بار خاص رقم مل جاتی تھی جو یا تو کتابیں خریدنے میں صرف ہوتی یا دعوتوں میں، تنخواہ آتی تو بڑی شاندار دعوت کرتے خود کھاتے دوستوں کو کھلاتے، تنخواہ ختم ہو جاتی تو فاقہ کشی کے [illegible] بھی تیار ہو جاتے، مگر اپنی فلاکت اور تنگ دستی زبان پر نہ لاتے، مجھ سے دوستی اس طرح ہوئی کہ ایک رسالے میں ان کا مضمون چھپا ہوا [illegible] میں مکتبہ ابراہیمیہ میں بیٹھا تھا کہ وہ تشریف لائے، بغیر کسی تعارف کے مجھ سے پوچھا آپ کیا پڑھ رہے ہیں، میں نے رسالہ کا نام بتایا تو پوچھا مضمون کس کا ہے میں نے بتایا، تو پوچھا آپ جانتے ہیں یہ کون ہے میں نے لاعلمی ظاہر کی تو پوچھا مضمون کیسا ہے، میں نے تعریف کی تو کہا میرا مضمون ہے۔ اس کے بعد گھنٹوں تک گپ اڑاتے رہے پھر تو یہ حال ہوا کہ جہاں ملتے روک لیتے۔ بڑی گفتگو ہوتی اور خوب باتیں ہوتیں، جغرافیہ ان کا خاص موضوع تھا۔ اسلامی شہروں کے متعلق بڑی معلومات رکھتے تھے اور اس قسم کے مضامین خوب لکھتے تھے مگر صرف جغرافیہ ہی کی حد تک معلومات محدود نہ تھیں تاریخ اور ادب پر بھی خاصا عبور تھا، عالم و فاضل بزرگ تھے۔

اپنے چھوٹے بھائی مولوی وقار احمد ایم اے، ایل ایل بی مدیر روزنامہ نظام گزٹ کی تعلیم و تربیت انہی کی محنت کا نتیجہ ہے۔ اپنے

ایک جشن شاہ محمد کرنل بشیر جنگ سے تیار کیا تھا مگر قریب سے واضح مفارقت رہا۔ تھی جو اب تمام گزشتہ میں کام کرتے ہیں انہی کے نواسے مشہور مولوی محمد مصطفیٰ (ترجمہ حیدرآبادی) سے قومی دوستی تھی۔ اپنے ایک لڑکے کی شادی ان کی لڑکی سے کی تھی۔

لغات پر بھی محمد صاحب کی نظر بڑی گہری تھی۔ آخر میں وہ تصنیف کی طرف بھی متوجہ ہو گئے تھے۔ دکنی زبان کی ایک لغات بھی مرتب کر رہے تھے۔ اپنے موضوع سے بحث کرتے ہوئے مسائل پر کتابیں لکھے اور فروخت کر دیتے تھے۔ بعض ایسی کتابیں بھی فروخت کر دیں جو دوسروں کے نام سے چھپیں۔ اور ہمیشہ راہ اصلاح میں رہے اچھا سلوک کرتے رہے مگر اپنے شاہ فرخ لے زندگی تکلیف میں بسر کی۔ آدمی وضع دار ہو بہت لکھے ہوئے علمی فراخ دل تھے، دلی جذبہ خوش اخلاقی ساتھی تھی۔ طبیعت میں حسن ... کا سلیقہ نہ تھی۔

مانک راؤ وٹھل راؤ

بیجاگاہ کے جاگیردار اور دہیں ملازم بھی تھے۔ پرانی وضع کے عربی فارسی پڑھے ہوئے بزرگ تھے۔ تاریخ کا دوسرا نظری تھا تاریخ دکن پر نظر گہری تھی۔ بستان آصفیہ کے نام سے ایک سلسلہ شروع کیا تھا جس کی کئی جلدیں چھپ چکی ہیں۔ چونکہ جدید طریقہ تحقیق اور طریقہ ترتیب سے ناواقف تھے اس لئے اپنی معلومات پرانے طریقے پر مرتب کیں اور چھپوائیں۔ مگر مواد خاصا بڑا عمدہ جمع کیا ہے۔ آنے والی نسلیں اس مواد کو اپنے حسب منشا استعمال کر سکتی ہیں جو بڑا کارآمد ہوگا۔

ان میں صوبیدار پرانی کرامات اور قدیم قوم کے بزرگ تھے تعصب و تنگ نظری مطلق نہ تھی۔ تاریخ کو تاریخ ہی کی طرح مرتب کرتے تھے اور واقعات سے تاریخ مرتب کرنے کے قائل نہ تھے۔ سو سال پہلے ایک مورخ غلام ... مدرسہ ... کے پروفیسر تھے۔ انہوں نے ایک مفصل تاریخ یادگار لکھی جس میں مرتب کی تھی۔ ... واقعات مرتب کئے تھے ان کے بعد تاریخ دانی کا مرتبہ ہے۔

مجھے یاد نہیں ہے کہ میری ملاقات راؤ صاحب سے کب ہوئی مگر دو تین سال سے ملاقات ہی رہی جب کبھی حسینی علم کی طرف جانا ان سے ملنا اور وہ جب بھی ہمارے ہاں کی طرف آتے مجھ سے ضرور ملتے لئے تاریخ کی ترتیب کے سلسلے میں مشورہ کرتے تھے۔ ... بڑی پابندی ہی پر ترتیب دیتے تھے۔

کام کرنے کا ڈھنگ بڑا اچھا تھا۔ اخبارات کے کٹنگ بڑے سلیقے سے جوڑ رکھے ہیں اور الگ الگ عنوانات۔ الگ الگ کٹنگ جمع کرتے تھے اس طرح انہوں نے تاریخ مسلسل مرتب کی تھی اور بڑی عمدہ چیز محفوظ کر دی تھی مثلاً حیدرآباد کی طغیانیاں اب جگہ جگہ ردی میں بعض جو اب مستقل بنا دی گئیں جو بڑی اہم تھیں گزشتہ تیس چالیس سال میں ایسا اچھا اور کارآمد کسی نے بھی فراہم نہیں کیا۔

ذات کے برہمن تھے اور پابند مذہب بھی تھے۔ کھانے پینے میں احتیاط کرتے تھے مگر علمی رواداری اور مذہبی بے تعصبی حاصل تھی۔ طبیعت میں انکسار تھا اور بڑی خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ مرنے سے پہلے ایک جلد تیار کر رکھی تھی اور چھپانے کی فکر ہی میں تھے کہ انتقال ہو گیا۔ بہرحال پانچ چھ جلدیں جو انہوں نے چھپوا دیں یہی ان کا بڑا کارنامہ ہے۔

سردار نواز جنگ

آج سے تیس پینتیس سال پہلے آپ نے انگریزی اخباروں میں "سید سردار علی کی کھلی چٹھی" پڑھی ہوگی۔ یہ کھلی چٹھیاں انہی نواب سید سردار علی خاں

خواجہ [illegible] کی [illegible]

[illegible] پیدا ہوئے تھے [illegible] سے [illegible] ہو گئے۔
[illegible] میں [illegible] صاحب [illegible] کان
[illegible] صاحب [illegible]
[illegible] صاحب [illegible]
[illegible] صاحب [illegible]
[illegible] صاحب [illegible]
[illegible] صاحب [illegible] اور مجھ [illegible]
[illegible] کام کرتا رہا [illegible]
رہے مگر [illegible] آخر تک رہے۔

[illegible]
[illegible] سے بھی شائع کی ہے [illegible] انگریزی کے [illegible]
[illegible] شاعر [illegible]

میں [illegible] صاحب کی طرح کا انسان [illegible] فرمائیے [illegible] صاحب [illegible]
[illegible] بھی [illegible] جانتے ہے اور [illegible] گفتگو رہتے تھے [illegible]
ان سے بڑا مشرقی [illegible] کامل [illegible] ہو جاتی [illegible]
شخصیت کو [illegible] دیکھنے [illegible] مطالعہ
کے لیے ایک [illegible] پیش کردوں [illegible] شخصیت [illegible] کے سے
کوئی نام تجویز کریں تو بہتر ہوگا۔

مجھے ان کے پاس کام کرنے کی سعادت نصیب ہوئی ہے اور [illegible] شفقت فرمایا
کرتے تھے اس لیے میں ان سے [illegible]
[illegible] انسان [illegible] میں بدی [illegible] مسلسل نیکیوں کا [illegible] جب اس کی مسلسل نیکیاں دیکھتے [illegible]
گمان کر سکتے ہو یقین پھر بھی نہ کرو۔

یہ تھا ان کا فلسفہ اور اسی پر وہ عمر بھر کاربند رہے [illegible] اور دو چار بد نصیب [illegible] وضعداری کی وجہ
سے دوستی نباہتے رہے وہ بھی دل ہی دل میں ان سے متنفر تھے۔

عربی، فارسی تعلیم بڑی اچھی ہوئی تھی انگریزی کے [illegible] انگریزی [illegible] بڑی صاف
سلیس اور بامحاورہ اردو بولتے اور لکھتے تھے۔ مطالعہ اتنا اچھا کہ تصوف، فلسفہ [illegible]
سب پر یکساں نظر تھی۔ جس موضوع پر گفتگو کرتے یہ معلوم ہوتا کہ [illegible] کے ماہر ہیں [illegible] کے علاوہ [illegible]
معلومات کا بھی یہی حال تھا۔ اجمیر شریف سے واپس ہوتے ہوئے [illegible] ایک روز [illegible] کے کالج اور [illegible]

اڈیا سوسائٹی دیکھنا چاہتا ہوں میں نے جا کر ان لوگوں کو اطلاع دی اور انہوں نے آنے کی اجازت دے دی تو ساتھ لے کر پہنچا ان کو ... اور سوسائٹی کے ممبروں کو ایسا لبھایا کہ سب ان کا کلمہ پڑھنے لگے بعض تو ایسے گرویدہ ہوئے کہ اسٹیشن تک ساتھ ساتھ گئے۔ مجھ سے ... نے بڑی حیرت سے پوچھا کہ تمہارے حیدرآباد میں ایسے قابل لوگ کس طرح پیدا ہوئے یہ تو بڑی غیر معمولی قابلیت اور بہت اعلیٰ درجہ ... ملک میں ... میں نے جواب دیا: آپ لوگوں نے فقط ایک ہی اوسط درجہ کا شخص دیکھا ہے اور صدر المہام لوگ ان سے زیادہ قابل ہیں۔ ... مصلحتاً تھی کی مگر حقیقت یہ ہے کہ پونا والوں کو سردار صاحب نے مسخر کر دیا۔ یہ حال ان کی قابلیت کا تھا۔

انگریزوں کے زمانے میں حیدرآباد کے متعلق بڑی گڑبڑ ہو رہی تھی چونکہ حالات نازک صورت اختیار کر چکے تھے اس لئے حضور نظام کو دہلی بلایا گیا تھا۔ سردار نواز جنگ نے حسن نظامی کو فراہم کر کے دہلی میں حضور نظام کے استقبال کی تیاریاں کرائیں اور اس ٹھاٹھ کا استقبال کرایا کہ انگریز بھی دنگ رہ گئے۔ یہ سارا کھیل سردار صاحب نے حیدرآباد میں بیٹھ کر کھیلا۔ پھر جب حضور دہلی سے واپس ہونے لگے تو حیدرآباد میں جشن اور چراغاں کرنے کی تحریک کی اور سب سے زیادہ خود سردار صاحب نے حصہ لیا۔ ایسے کھیل وہ بیٹھے بیٹھے کھیل لیتے تھے ... گیارہ ... یہ مشکل تھا کہ انگریز سخت ناراض ہو گئے اور ریذیڈنسی ان کی علیحدگی کا مطالبہ کرتی رہی اور انہیں وظیفہ پر سبکدوش ہونا پڑا ... میری آمد و رفت اس زمانے میں بھی سردار صاحب کے پاس تھی اور بیشتر راست میرے سامنے ہوتی رہی اور بعض خط بھی مجھ سے گزرتے تھے اس لئے میں اس واقعہ سے واقف ہوں۔

سردار صاحب کو عبد المقتدر صاحب بدایونی سے بیعت تھی اور ان کا بہت احترام کرتے اور باقاعدہ پاؤں چھوتے تھے مگر ... کے متعلق انہوں نے سفارش کی تو وعدہ کر لیا کہ ان کی سفارش صحیح ہے۔ مگر ان کے جاتے ہی ان لوگوں کو ڈانٹ بتائی کہ پیر کے بلانے ... کو تم نے روپیہ دے کر ہمدرد بنا لیا۔ میں نے ان کے کہنے سے وعدہ تو کر لیا ہے مگر یاد رکھو تمہیں اسی طرح سزا ملے گا۔

بعض لوگوں کو منصب تحصیلداری دے کر بھجواتے پھر بعض لوگوں سے کہہ کر ان کے خلاف درخواستیں دلاتے اور ان درخواستوں کی کارروائی کر کے انہیں تحصیلداری سے ہٹا دیتے۔ یہ لوگ روتے پیٹتے آتے تو ڈانٹ ڈپٹ کرتے اور توبہ تلا کرا کر پھر کسی تحصیلداری پر بھجواتے۔ اس طرح کے کام بہت کرتے اور اس سے خوش ہوتے تھے۔

فصیح جنگ ان کے بڑے مرید، مربی اور ہمدرد تھے جنہیں وہ "حضرت محسنی" لکھتے اور کہتے تھے۔ ایک مرتبہ مشہور ہوا کہ سردار صاحب کو زوال ہونے والا ہے تو فصیح جنگ نے نواب حسین دوست خاں سے میرے سامنے ہی کہا کہ "اے نواب! سردار صاحب کو زوال ہو رہا ہے میں تو اپنا بستر باندھ رہا ہوں، تم بھی اپنی جاگیر کا رخ کرو اب حیدرآباد کی خیر نہیں ہے۔" سردار صاحب بیٹھے ہوئے ہنستے رہے۔

کمال یہ تھا کہ اپنے ماتحتین کو معطل، موقوف، برطرف کرتے یا تبادلہ کرتے سردار صاحب یہ سمجھتے تھے کہ انہوں نے بڑا نیک کام کیا ہے اور خلق اللہ کو اس طرح فائدہ پہنچایا ہے۔

سردار صاحب کی دو خصوصیتوں کا میں قائل ہوں۔ ایک تو یہ کہ شاہ پرست تھے۔ مرتے دم تک شاہ پرست رہے اور دوسری یہ کہ چاہے کسی شخص کے کتنے ہی دشمن ہوں وہ مر جاتا تو اس کے بیوی بچوں سے اخلاقی ہمدردی کرتے۔ بعض لوگوں کا سردار صاحب نے تبادلہ کیا پھر انہیں معطل کیا اور پریشان کرتے رہے اسی پریشانی میں وہ مر گئے تو آپ نے ان کے بچوں کو جیب سے روپے دئے، بیوی کے وظیفے کی کارروائی کی، ذاتی طور پر سفارش کر کے وظیفہ منظور کرایا، بعضوں کے لڑکوں کے تقررات کرائے مگر زندگی بھر وہ لوگ متعجب رہے۔

شیر دل ایسے تھے کہ کسی سے نہ ڈرتے تھے اور ہیبت سے لرزنے کے بجائے تیار ہو جاتے مگر پہل اپنی طرف سے نہ کرتے تھے۔ نہایت ہی سلجھے ہوئے طریقے سے ہر شخص سے پیش آتے اور وہ ذرا بھی بے اعتنائی کرتا تو پھر مقابلہ شروع ہو جاتا اور ایسا نیچا دکھاتے کہ توبہ بھلی۔

[illegible] صاحب [illegible] ملاقات ہوئی [illegible] صاحب کے [illegible] ادبیات سے ان کو [illegible]
[illegible] صاحب سے [illegible] ڈاکٹر صاحب سے کر کر [illegible] سال [illegible] خود [illegible] صاحب سے
[illegible] ادبیات کو [illegible] ڈاکٹر صاحب [illegible] بعد ڈاکٹر [illegible] کے [illegible] ان کی [illegible] صحبت
[illegible] سے ان کا [illegible] شروع کر دیا جائے گا [illegible] انہوں نے جواب دیا کہ [illegible]
[illegible] صورت سے [illegible] سے کوئی اچھا [illegible] صاحب کا [illegible] سمجھا جا [illegible]
[illegible] صاحب سے بہت [illegible] کر [illegible] سمجھے [illegible] مشکل تھا [illegible]
[illegible] کے [illegible] صاحب [illegible]
[illegible] صاحب [illegible] کر [illegible] صاحب [illegible]
[illegible] کیا جاتا ہے [illegible] سب کو [illegible] نے [illegible] کیا یا نہیں [illegible]
[illegible] ادبیات تو [illegible] اور [illegible] ہوگئے
بہرحال [illegible] صاحب کی شخصیت [illegible] عجیب و غریب بزرگ تھے۔

توفیق

دکن میں شاعری کا چرچا مدت سے رہا اور بہت سے شاعر ہوئے اور جس گھرانے کی شاعری پر مشق [illegible] شوق ہو [illegible] رہی ہے ان لوگوں نے اپنا تخلص مقرر کر لیا اور [illegible] تھا جس طرح [illegible] خواہ مخواہ اپنی کنیت رکھ لیتے ہیں اسی طرح [illegible] شعر [illegible] [illegible] کر لیا کرتے تھے اور تخلص کی [illegible] رکھنے کے لئے غزل میں کہہ لیتے تھے [illegible] خواہ مخواہ [illegible] لکھ دیتے۔ ان کے علاوہ بعض ایسے بھی لوگ ہیں جنہوں نے عمر بھر [illegible] کہیں نہ کہیں [illegible] آپ کو شاعر کہتے رہے اور اب تک کہہ رہے ہیں۔ اس [illegible] صرف دکن ہی پر [illegible] ہیں بلکہ ہندوستان اور پاکستان میں بھی [illegible] چند ایسے لوگ بھی پیدا ہو گئے جو واقعی شاعر [illegible] کا شمار کیا جا سکتا تھا ایسے ہی لوگوں میں سید جلال الدین توفیق بھی تھے یہ بزرگ سید نامے [illegible] سادات [illegible] سے تھے۔ پرانی وضع کے [illegible] اور خاصے پڑھے لکھے تھے ضروریات شعری سے باخبر اور عروض و قافیہ پر اچھی نظر تھی [illegible] بچپن سے شعر و سخن کا شوق تھا اور [illegible] مشق تھی۔

طبیعت میں [illegible] تھا [illegible] شعر کہتے اور احتیاط سے کہتے تھے ابتداً شعرائے لکھنؤ کی اتباع کی اور آتش و ناسخ کی پیروی کرتے ہے مگر جلد ہی اسے چھوڑ کر غالب و مومن کی طرف متوجہ ہو گئے اور ان دونوں استادوں کا مطالعہ [illegible] کیا کر خود بھی ان دونوں کی صدائے بازگشت بن گئے اس سے فائدہ تو ہوا کہ وہ ان دونوں استادوں کے رنگ میں بے تکلف شعر کہنے لگے مگر نقصان یہ ہوا کہ اپنا کوئی رنگ پیدا نہ ہو سکا۔

توفیق نے زیادہ کوشش مومن کا رنگ اختیار کرنے کی کی ہے اور ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی ہے مگر تصوف اور اخلاق کی طرف جو [illegible] ہوتے گئے تو غالبیت آ گئی اور زیادہ تر غالب ہی کی پیروی کرتے رہے۔ توفیق فطرتاً شاعر پیدا ہوئے تھے۔ ان کی طبیعت شاعری کے لئے [illegible] مگر مومن کا رنگ ان پر [illegible] تھا اس لئے کہ مومن کے پاس تغزل اور صرف تغزل ہی تھا اور اس کے لئے "رنگین" [illegible] اور [illegible] تھا [illegible] اس لئے مومن کے رنگ میں جو کچھ کہتے گیا مومن کے اپنے الفاظ میں [illegible] تھا اس لئے

اس کی زبان کا سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ قبولِ عام سے بہرہ یاب نہیں ہو سکا۔ غزل کا تمام ہے ... عاشق ... کا محبوبہ کا عشق ہوتا ہے اور اس لئے بھی تغزل پیدا نہ ہو سکا۔ جس طرح آتش و غالب نے مضمونِ عشق کو ادا کرنے کی کوشش کی ہے اسی طرح کہا جاتا ہے اسی طرح توفیق نے بھی صفحے پر بیٹھ کر تغزل بنایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ان کی ناکامی کی ہوئی۔

رہا غالب سا اس کا انداز بیان ہی اور رہا طرز بیدل ہی، وحشت کا توفیق سے کیا ہو سکتا اس لئے اس رنگ میں بھی وہ مسائل تصوف ہی بیان کر کے رہ گئے۔ آدمی جو دماغ دار اور ذہین تھے اگر اپنے دماغ سے مومن و غالب کے تتبع کا خیال دور کر دیتے اور اپنے طرز پر فکر شعر کرتے تو بہت اچھے شاعر بن جاتے مگر وہ اس طرف غور کر ہی نہ سکے۔

توفیق نے ابتدا میں مشاعروں میں بھی شرکت کی اور فرمائشی نظمیں، سہرے اور قصائد بھی کہے مگر بعد میں وہ بہت محتاط ہو گئے تھے جی چاہتا تو غزل کہتے ورنہ نہ کہتے بعض وقت روزانہ مضمون شعر نہ کہتے اور پھر شعر کہنے لگتے تو مسلسل کہتے رہتے۔

والد مرحوم سے توفیق کی دوستی تھی صدر محاسبی میں توفیق کے علاوہ ایک اور شاعر صاحبزادہ حافظ مرزا سراج الدین ضیا گورگانی دہلوی بھی تھے شہزادہ مرزا جیا دہلوی کے فرزند اور داغ کے شاگرد رشید تھے۔ یہ بھی بڑے قابل اور عروض کے ماہر تھے۔ والد مرحوم نے ان سے عروض بھی اور داغ کے انتقال کے بعد انہی سے مشورہ کرتے تھے۔ صدر محاسبی کا دفتر نائب شہر میں سالار جنگ کی ڈیوڑھی میں تھا۔ آتے جاتے میں صدر محاسبی میں جا جا کر پہلے ضیا اور ان کے بعد توفیق سے ضرور ملتا تھا مجھے توفیق سے مل کر خوشی ہوتی تھی کیونکہ نہایت منکسر مزاج متواضع اور بڑے ہی مخلص بزرگ تھے۔ ضیا جتنے بددماغ اور رعونت مآب تھے یہ اتنے ہی نرم خلق اور منکسار تھے۔ کبھی بغیر فرمائش کے شعر نہیں سنایا۔ شعر فرمائش پر بھی سبب معذرت کرنے کے بھی روادار رہتے تھے۔ سلام کا جواب دینا بھی ان کے لئے بار تھا۔ بخلاف ان کے توفیق کا یہ عالم تھا کہ سلام کیجئے تو کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہو جاتے بڑی محبت سے جواب دیتے مصافحہ کرتے اور جب تک توجہ ہو کھڑے رہتے۔ جلدی ہی بات چیت کرتے۔ غزل کی فرمائش کی جائے تو کبھی سنا دیتے کبھی بڑی ہی لجاجت کے ساتھ معافی مانگ لیتے۔

میرے ایک عزیز ہاشم علی مرحوم سے توفیق کے بڑے گہرے مراسم تھے۔ وہ ہاشم علی کے پاس بہت آتے جاتے تھے۔ وہاں گانے بجانے کا چرچا بھی رہتا تھا۔ کبھی کبھار اپنی غزل گا کر بھی سناتے۔ موسیقی سے بھی انہیں دلچسپی تھی اور واقف بھی تھے۔ اپنی غزلوں کی دھنیں خود ہی بنا لیتے اور کبھی کبھار ہارمونیم پر گاتے بھی تھے مگر مخصوص صحبت میں زیادہ لوگ ہوتے تو انجان ہو جاتے۔

اسی زمانے میں ایک روز الفتوں کو بھی اپنا کلام دینا شروع کیا تھا جس کی وجہ سے ان کی غزلیں خاصی مشہور ہو گئیں۔ رنڈیوں سے پبلسٹی کا کام حیدرآباد میں سب سے پہلے داغ نے لیا۔ پہلے غزل کی پبلسٹی کے دو ہی طریقے تھے مشاعرے اور رنڈیاں۔ لوگ مشاعرے میں غزل سن کر اکثر شعر یاد کر لیتے جو مشہور ہو جاتے تھے یا پھر رنڈیاں غزلیں گاتیں تو ان سے سن کر عوام بھی گانے لگتے۔ داغ نے تو ایک دو رنڈیاں ہمیشہ نوکر رکھیں اور ایک قوال کو بھی ہمیشہ نوکر رکھا۔ شام میں رنڈیاں آتیں داغ اپنی تازہ غزل دے دیتے وہ لکھ لیتیں دھن یا تو خود بتلاتے یا وہ خود دھن نکال کر سناتیں تو ترمیم کر دیتے۔ اس طرح غزلیں گا کر سنتے۔ یہ غزلیں داغ کے پاس سے واپس جاتے ہی رنڈیاں اپنی سہیلیوں کو سناتیں سکھاتیں اور دوسرے دن وہ گاتیں ان کے چاہنے والے اور سننے والے ان غزلوں کو گلی گلی پہنچا دیتے اور غزل جس دن کہی جاتی اس کے دوسرے روز شہر بھر میں مشہور ہو جاتی۔ اسی طرح داغ کا قوال رحمت اللہ بھی ان کی غزلوں کی پبلسٹی کرتا۔

توفیق کو داغ کا یہ طریقہ معلوم تھا اس لئے انہوں نے بھی ایسی ہی کوشش کی مگر زمانہ بدل چکا تھا۔ داغ نے انیسویں صدی عیسوی میں اس طرح سے پبلسٹی کا کام لیا تھا مگر بیسویں صدی عیسوی میں رنڈیوں کا زور شور ختم ہو چکا تھا۔ رنڈیوں کی جگہ ناٹک نے لے لی تھی۔ اب وہی چیزیں مشہور ہوتی تھیں جو اسٹیج پر گائی جاتی تھیں۔ علاوہ ازیں ویسی رنڈیاں بھی نہ تھیں اختری جان جیسی، سیماب وش، صاحب جان جیسی الغرض داغ کی غزلیں گانے والی تو تھیں

[illegible] شاعر [illegible] صاف [illegible] تھا [illegible]
[illegible] کے [illegible] ہوتا تھا۔ [illegible] اس کے توفیق [illegible] غالب [illegible]
[illegible] شہرت [illegible] توفیق کی یہ غزل [illegible] ہے

[illegible]

اس سے قبل [illegible] کی یہ غزل مشہور ہوئی ہے

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

[illegible] اسی زمین میں ایک غزل کہی جو حیدر آباد میں خاصی مشہور ہوئی ہے

کبھی پردہ دور ہٹا دیا کہ ادا کبھی ہوں میں [illegible] راز میں — درحقیقت [illegible] ہے حقیقت اور مجاز میں
[illegible] کے جلوے سما گئے یہ کہاں کی [illegible] — [illegible] آ گئے [illegible] نگاہ [illegible]
نہ کروں سلام تو کس کو کروں جو سجدہ [illegible] کروں — ہے خیال بت مرے سامنے [illegible] نماز میں

[illegible] پروپیگنڈے کے خواہشمند نہ تھے مگر اس کے اصول اور طریقے [illegible] جانتے تھے [illegible] ان [illegible]
[illegible] قابل نہیں ہے اسی لئے وہ زیادہ مشہور نہ ہو سکے [illegible] رہے ہے

شہرت [illegible] نرالی سوزِ غم میں جل کے خاک کی
برنگ [illegible] بارود ہستی ہے مرے دل کی

[illegible] عوام کو کیا پسند آتے اس لئے توفیق خاص خاص لوگوں ہی میں مقبول رہے۔
توفیق کے معاصرین میں کیفی اور امجد تھے۔ امجد سے غزل نہیں سنبھلتی تھی اس لئے انھوں نے ابتدا چند نظمیں کہیں۔ اور پھر رباعی پر اتر آئے اور
[illegible] کو رباعی کے لئے وقف کر دیا یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ غزل میں وہ توفیق اور کیفی کا ساتھ نہ دے سکتے تھے۔ کیفی البتہ زمانہ شناس تھے اور
عوام کے نزدیک رہنا چاہتے تھے اس لئے انھوں نے عام فہم اور روز مرہ کے شعر کہنے شروع کئے تھے۔ بلا شبہ توفیق سے زیادہ شہرت
[illegible] حاصل رہی اور اب بھی جس قدر کیفی مقبول ہیں توفیق نہیں ہیں۔
شاگردوں کی کثرت بھی وجہ شہرت ہوا کرتی ہے۔ توفیق اس سے بھی اجتناب کرتے تھے ان کے چند ہی شاگرد تھے جو محدود حلقۂ احباب
[illegible] ساحل سے وہ بھی توفیق کو زیادہ اجاگر نہ کر سکے۔
بہرحال توفیق کو جتنا مشہور ہونا چاہئے تھا اتنی شہرت نہ ہو سکی حالانکہ ان کا ایک دیوان بہت پہلے چھپا پھر اس کا دوسرا ایڈیشن اضافے
کے ساتھ شائع ہوا مگر پھر بھی کوئی بات پیدا نہ ہو سکی۔ دوسرے دیوان پر جو [illegible] میں طبع ہوا ہے [illegible] نے [illegible] اچھا مقدمہ لکھا تھا مگر

ترقی کے وقت تو ثروت قبیت سے ایک انگریزی عینی اخلاقی مشہار ناقب عنفریضی سے لی گئی ... کے ساتھ چھپا کر خوش ہوگئے کہ ناقب سے خیالی ترقی کا قبل ہے۔ تو قبیت صاحب بیچارے بھی صدر اس کے کلک ہی قصاید کی معلومات میں ... بتا تھا کہ ناقب سا تھے خاموش سالی کو سے انھیں یہ معلوم نہیں کہ شاعر کا کلام ایسا کرنی ترقی ہوتا ہے جس پر کلام کے مستند ہونے ... خصوصاً ان کے نہیں۔

بہر حال باوجود ایسی کوشش کے وابستہ بیٹھے ہی صدر عہد کے ترقی حیدرآباد میں زیادہ شہرت نہ پا سکے مگر حقیقت یہ ہے کہ ... بہت خاص شخصیت کے مالک اور بڑے ہی نیک دل بزرگ ہے۔

تجلّی

سید محب الدین نام تجلی تخلص تھا۔ سید ... جنگ کے پوتے اور بخت بلند جنگ کے نواسے تھے۔ والد کا نام سید ... جو ناظم دیوانی صدر حیدرآباد تھے۔ اپنے والد کے انتقال کے تیسرے روز پیدا ہوئے۔ اماں نے منحوس سمجھ کر پہلو سے جدا کر ... جنگ نے اپنے گھر لے جا کر پرورش کی۔ آہستہ آہستہ ماں کو بیگی پر صبر آیا تو بیٹے کو اپنے گھر بلا لیا اور بڑے چاؤ چونچلے سے ... کی۔ تھی کا خود ... کر پیاری ہو گئیں۔ بڑی بہن ... غیاث الدین علی شاہ، اور خالہ ... پال پوس کر پروان چڑھایا۔ جنگ ... غیاث الدین علی ... اپنی نگرانی میں اپنے بیٹے سید قطب الدین محمد علی فاضل کے ساتھ تعلیم و تربیت کی۔

ابتدائی تعلیم مدرسۂ اعزہ میں ہوئی۔ پھر دار العلوم حیدرآباد میں شریک ہو گئے اور وہیں سے فراغت حاصل کی۔ طبیعت ... تصوف کا رنگ غالب تھا نوجوانی ہی میں آغا حافظؔ کے ہاتھ پر بیعت کی اور تصوف ہی کے ہو رہے۔ شعر و سخن کا ذوق بھی تھا اور یہ موسیقی ذوق تھا کیونکہ ... والد دونوں شاعر تھے اس لئے خود بھی شعر کہنے لگے پہلے ... کو اور پھر داغؔ حیدرآباد آگئے تو داغؔ کو کلام دکھانے لگے۔ فارسی ... زبانوں میں فکرِ سخن کرتے تھے ... پہلے ... داغؔ ... کو دکھاتے رہے، ان کے انتقال کے بعد سے ترکی پائی ... کو دکھاتے ... منصب سے سرفراز تھے۔ سید عبدالرحیم اول تعلقدار کی صاحبزادی سے دوسرے مولوی سید محمد یوسف الدین صاحب ... گلبرگہ کی بھانجی ... یوسف الدین صاحب کے کہنے پر نوکری کر لی ابتداً صوبہ داری گلبرگہ میں ... ہوئے پھر ضلع ... کے خزانہ ... ٹریژری آفیسر ... سے عثمان آباد تبادلہ ہوا اور وہاں سے گلبرگہ تبادلہ ہوا اور گلبرگہ ہی میں اللہ کو پیارے ہوئے اور خواجہ بندہ نوازؒ کے پائیں میں آسودہ ہیں ... آٹھ دس لڑکے لڑکیاں ہوئے مگر تین لڑکے باقی رہے ۱۔ راقم الحروف ۲۔ سید رفیع الدین کاظمی ۳۔ سید رشید الدین کاظمی۔ رفیع الدین کو ... ہیں کہ انھوں نے شادی نہیں کی۔ راقم الحروف اور رشید الدین فضل ... اہل و عیال میں مبتلا ہیں۔

تجلی کی نشوونما حیدرآباد میں ہوئی ۱۹۱۰ء تک وہ حیدرآباد ہی میں رہے اور اس زمانے کی سوسائٹی میں خاص رسوخ رکھتے تھے ... داغؔ، توفیقؔ، کیفیؔ، محفوظؔ، رساؔ، ناظمؔ، جلیلؔ، اخترؔ، سہاؔ، ثاقبؔ وغیرہ سے برادرانہ و دوستانہ مراسم تھے، دیوان خانہ ان چند گروں ... تھا رات دن شعر و سخن، نظم و نثر کا چرچا رہتا تھا۔ ۱۹۱۰ء میں گلبرگہ چلے گئے تو بھی تعطیلات میں ہر کچھ دنوں حیدرآباد آجاتے اور پھر ... رہتی، ۱۹۱۲ء میں عثمان آباد تبادلہ ہو گیا تو آمد و رفت کم ہو گئی اور دیر دیر سے حیدرآباد آنے لگے اس طرح حیدرآباد کی صحبتیں چھوٹ ہی گئیں۔

... عثمان آباد، گلبرگہ اور ان ضلعوں کے تعلقات ہیں رہے جہاں جہاں ... تسلیم ... مشاعرے کئے ... اپنے ... [illegible]

[illegible] ہوئی [illegible] کے انتقال کے بعد جب بڑے صاحبزادے کا [illegible] ہو گئے [illegible]
[illegible] گئے [illegible] کے اس نتیجے کو قبول کر جا تا رہا ہے جو وہ پہلے تھا اس طرح ہو کا بہتر [illegible]
[illegible] واقف تھے [illegible] میں [illegible] جو بہت [illegible] سکتی تھی [illegible]
[illegible] کئی کتابیں [illegible] فارسی ہی ہوتے تھے اور [illegible] فارسی میں [illegible] تھا جب [illegible]
[illegible] تھا جنہیں [illegible] خود لکھ [illegible] سے [illegible]
انشا اپنا [illegible] لفظ نہیں لکھ سکتے تھے یا [illegible] تھے۔ حالانکہ فارسی [illegible] اسی حال [illegible] اردو کا بھی تھا
[illegible] میں [illegible] تھے اور ہمیشہ دکنی محاورے استعمال کرتے تھے البتہ [illegible] کے استعمال سے پرہیز کرتے تھے۔
[illegible] نواب مظفر الدین خاں [illegible] کے [illegible] تھے [illegible]
[illegible] خط شکستہ [illegible] اور [illegible] شکستہ لکھنے سے [illegible]
[illegible] خط نہیں لکھے۔

[illegible] خاندان میں سب [illegible] حافظ ہوتے تھے مگر [illegible] جانا تھا اور [illegible] کا [illegible] تھے، والد مرحوم نے دو [illegible] پارے حفظ کئے تھے اس کے بعد چھوڑ دیا [illegible] پڑھنے [illegible] تھے [illegible] صورت میں قرآن دیکھتے ورنہ [illegible] جاتے تھے۔ انتقال سے [illegible] سال پہلے [illegible] حافظ ہونے کا [illegible] پیدا ہو گئی مگر [illegible] رہتے تھے اس کے [illegible] ایک [illegible] مسجد [illegible] تھی آپ نے [illegible] درست کرایا اور [illegible] نماز پڑھنے لگے [illegible] مسجد میں پڑھتے تھے۔ رمضان آیا تو آپ نے اس مسجد میں تراویح کا [illegible] کرنا چاہا۔ ایک حافظ [illegible] مگر [illegible] اطلاع ملی کہ میں نے آپ سے اس مسجد میں تراویح پڑھانے کے لئے کہا تھا مگر اب [illegible] وجوہ سے پڑھا نہیں سکتا۔ آپ کوئی دوسرا انتظام [illegible] پر بہت برہم ہوئے، دوسرا حافظ ملا نہیں۔ مجھ سے کہا تو میں نے کہا آپ خود پڑھیئے۔ آپ کو تقریباً [illegible] پارے یاد ہیں روزانہ دوپہر [illegible] پارہ پڑھ لیجئے اور رات میں سنا دیجئے۔ ترکیب سمجھ میں آگئی [illegible] ایک دوست کو بھی پابند کر دیا کہ تم روزانہ [illegible] خود سے پڑھ لیا کرو اور مسجد میں جب میں پڑھاؤں تو سنتے جانا غلطی ہو جائے تو لقمہ دینا۔ اس طرح تراویح پڑھنے لگے اتفاق سے [illegible] تھا اگر وہ لقمہ دینے کا فرض انجام دینے لگے اور میں [illegible] گیا مگر مرحوم نے اس طرح تیس دن میں تیس پارے ختم کر دیئے اور انہیں اپنے حافظ ہونے کا جو قلق تھا جاتا رہا۔

جوانی میں طب کا امتحان بھی دیا تھا۔ عملی تجربہ [illegible] تھا اور خود دائم المریض تھے جب بھی کوئی حکیم نسخہ لکھتا اس میں کمی بیشی کر کے اور اپنی [illegible] خراب کر لیتے یہ مرض جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی بڑھتا ہی گیا۔

[illegible] رقیق، محبوب [illegible] کے تھے ہر ایک کی بات کا یقین کر لیتے، فوراً بگڑ جاتے اور جلد ہی من بھی جاتے تھے۔ قلبی کیفیت ایسی تھی ذکر و اشغال میں منہمک رہتے تھے اور اوراد و وظائف کے پابند تھے۔ چونکہ مذہبی آدمی تھے اس لئے مجاذیب اور مزارات کے بڑے معتقد تھے [illegible] مجذوب مل جاتا اسے پکڑ کر گھر لے آتے، کھلاتے پلاتے، کپڑے بناتے اور نذر دے کر رخصت کرتے تھے۔ فاتحہ (نذر و نیاز) ہمیشہ ہوتی رہتی [illegible] بڑے اہتمام سے کرتے تھے چونکہ میں ان کے اس طریقے کا مخالف تھا اس لئے مجھ سے خفا ہوتے رہتے تھے۔ بیمار رہنے لگے اور طبیعت بگڑنے لگی تو میں نے حیدرآباد لانا چاہا، کہنے لگے تم مجھے حیدرآباد لے چلنا چاہتے ہو لے چلو، گھر میں مرنے والا ہوں [illegible] خواجہ صاحب کے پائینتی میں دفناؤ گے، اگر ایسا کر سکتے ہو تو لے چلو ورنہ انتظار کرو۔ ڈاکٹر [illegible] ڈاکٹر عبدالرب نے بھی

اس کی تاکید کی کہ جب میں دلی جانے کے لئے تیار نہیں ہوا کیوں [illegible] ہو۔ چنانچہ وہیں انتقال کیا اور خواجہ صاحب کے پائنتی میں [illegible] پچھلے دنوں کلیات کے شائع ہونے میں چاروں کو اکٹھا کر کے ایک دیوان بنایا جو بہت ضخیم ہو گیا اس کی طباعت سے ایک مرتبہ ابو الاعلیٰ [illegible] صاحب [illegible] اور سرورق بھی [illegible] مگر طبع ہی برخاست ہو گیا اسی زمانے میں دیوان کو [illegible] لوگوں سے [illegible] نقوش "نام کی" اس دیوان کا انتخاب میں نے کیا ہے جس کی طباعت کی فکر کر رہا ہوں۔ انشاء اللہ عنقریب شائع ہوگا۔

مرحوم کی شاعری کا یہ حال تھا کہ طبیعت بڑی رواں تھی، بڑی آمد سے شعر کہتے تھے۔ مشق سے محض [illegible] فرضی مضامین ہجر و فراق باندھتے [illegible] سے کہ کوئی بات پیدا ہو سکے [illegible] عشق بھی جاری رکھی [illegible] روز دو دو غزلیں کہہ ڈالتے [illegible] مضمون نکلتے [illegible] قافیے چن لیتے ان کو مصرعوں میں [illegible] کرتے پھر ان [illegible] پڑھتے [illegible] اس طرح غزل کہی جاتی۔ [illegible] لیکن آورد صاف ظاہر ہوتا [illegible] سارا دیوان ایسا ہی ہے۔

آخر عمر میں صحت بہت [illegible] لگے تھے [illegible] شاید سب سے زیادہ رواں تھی۔ [illegible] اپنے حسب حال شعر کہے تھے

دشمنوں سے بھی جھک کے ملتا ہوں — یہ تحمل شعار ہے میرا

[illegible] — [illegible] انسان سے

[illegible] مشکل — [illegible] مشکل

[illegible] معقول — گری مشکل و [illegible] گری مشکل

اپنی امارت اور خاندانی وجاہت کا بڑا خیال رہتا تھا۔ دوستوں اور عزیزوں سے کبھی کوئی کام نہیں لیا [illegible] فصیح جنگ کے سبب [illegible] مگر کبھی فصیح جنگ سے اپنی مستقل [illegible] کے لئے نہیں کہا۔ میں فصیح جنگ کے پاس [illegible] مگر مجھے ہمیشہ منع کرتے رہتے کہ خبردار میرے لئے یا اپنے لئے فصیح الدین سے کچھ نہ کہنا۔

داغ سے والہانہ محبت تھی جب داغ کا ذکر کرتے آب دیدہ ہو جاتے اور اس احترام سے "استاد داغ" کا نام لیتے جیسے [illegible] کا نام لے رہے ہوں۔ اسی طرح مولوی سید یوسف الدین صاحب سے بھی انہیں عقیدت تھی۔

حساب میں بہت کمزور تھے اس لئے تاریخ بھی کہہ نہ سکتے تھے۔ ایک روز بیٹھے ہوئے تاریخ کہہ رہے تھے، میں نے پوچھا کیا [illegible] کہنے لگے جلال لکھنوی کے انتقال کی تاریخ نکال رہا تھا۔ ایک مصرعہ بڑا اچھا نکالا ہے۔ میں نے پوچھا کیا ہے تو کہا "جان کندنی سے [illegible] جلال" میں نے کہا یہ تو وفات کی تاریخ نہیں۔ کہنے لگے پھر کیا ہے؟ میں نے کہا یہ نزع کی تاریخ ہے۔ جان کندنی ہی تو ہے وفات یا انتقال ابھی کہاں! کہنے لگے ٹھیک تو ہے مجھے خیال نہ رہا۔ ان کے استاد بھائی [illegible] حسین [illegible] نے [illegible] تاریخ نام سے ایک کتاب شائع کی تھی جس میں [illegible] الفاظ جملے وغیرہ تھے اسی کی مدد سے بڑی محنت مشقت کے بعد تاریخ نکالتے تھے وہ بھی وفات جا کر جان کندنی ہو جاتی تھی۔

میری مضمون نگاری سے بہت خفا رہتے تھے۔ لاہور کے بعض رسائل میرے نام کے ساتھ "مولانا" لکھتے تھے کوئی مضمون مولانا تمکین کاظمی کے نام سے طبع ہوتا تو دیکھ کر جلتے خفا ہوتے کہتے میاں! ہم نے بڑی محنت کی ہے مگر اب بھی لوگ مولوی کہتے ہیں تو شرم آتی ہے کہ ہم اس لقب کے مستحق نہیں ہیں لوگ غلط اندازہ کر رہے ہیں اور تم ہو کہ بائیس سال کی عمر میں مولانا بن گئے وہ لوگ جو تمہیں مولانا لکھتے ہیں صورت دیکھیں تو کیا کہیں گے!

حضرت [illegible] دہلوی کی شاعری پر میں نے ایک تفصیلی مضمون لکھا تھا جو [illegible] میں چھپا تھا۔ یہ مضمون پڑھا تو بہت خفا ہوئے کہنے لگے [illegible] شاعروں کو ان سے کیا، تم ہو کہ اسے شاعری ثابت کرنے چلے ہو۔ شعر کی تم کو ابھی تمیز بھی نہیں [illegible] استادوں کا کلام

[illegible] ... نے ... [illegible]
[illegible]
[illegible] ... تھے ... [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible] ... سال ... [illegible]

عظمت اللہ خاں

[illegible]
عظمت اللہ خاں سے پہلی ملاقات ... [illegible]
... عظمت اللہ خاں سے ... [illegible]
... کرتے تھے۔
[illegible] عظمت ... [illegible]
عظمت مرحوم ان دنوں ... [illegible]
... شریف ... بیٹھے ہوئے ہیں اور اگر ... بحث ہو رہی ہے ... [illegible]
... نہیں! ... عظمت خاموش ہو گئے ...
... رنگ ... اور صورت ... [illegible]
پر اپنے جواب کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا اور سب لوگ ... بحث صرف ... عظمت کا یہ خیال تھا ... [illegible]
عورت حسین نہیں کہلا سکتی ... کالا ... بالآخر بغیر کسی تصفیے کے ختم ہو گئی ... [illegible]
... بحث بڑی لمبی ہو گئی تھی ... اور مجھ سے ... [illegible]
مجھ سے خاصے بڑے تھے مگر اس روز جو بے تکلف ہوئے تو اتنے کھل گئے کہ اپنی ساری زندگی ... [illegible]
... بہت قریب ہو گئے تھے۔
کا اعتراف کرالیا، اس طرح ہم ایک دوسرے کے ... کام کرنے سے تھکتے نہ تھے ... [illegible]
عظمت نہایت شریف، باوقار، مخلص اور متحمل آدمی تھے۔ محنتی اور کارگذار بھی بہت تھے
بنانے میں تو بس کمال تھا، دفتری کام بڑے انہماک سے کرتے تھے۔ گھر پر کام کرنے کا وقت انہیں نہ ملتا تھا اس لئے کہ لوگ بہت آجاتے
تھے، میں جب گھر سے آتا ان سے ضرور ملتا تھا ایک روز میں نے کہا اپنی نظمیں چھپا دیجئے تو کہنے لگے ایک شرط پر چھپواتا ہوں ... [illegible]
ایک مضمون میری نظموں کے متعلق ... سے لکھو، ورنہ مجھ سے نہ تو نظمیں جمع کرنا ہو سکے گا اور نہ ان پر کچھ لکھنا۔ بات آئی گئی ہو گئی ... [illegible]
کے بعد مجھے خیال ہوا کہ ان کی نظمیں ... چنانچہ میں نے "اردو" اور "علیگڑھ میگزین" وغیرہ سے نظمیں نقل کر لیں اور ایک مضمون عظمت اللہ خاں
اور ان کی شاعری، لکھا ... اس وقت تک عظمت کو عام لوگ نہ جانتے تھے "اردو" پڑھنے والے اور علیگڑھ کے طلباء ہی جانتے تھے

بالیقین اس مضمون کے چھپنے کے بعد بہت سے لوگوں نے [illegible] عظمت اللہ خاں کے [illegible] کہ کسی سنجیدہ کو علمی بجائے میرا مضمون چھپا عظمت نے ہماری ساتھ ایک لمبا چوڑا خط لکھا کہ آپ نے ثابت کر دیا ہے کہ میں شاعر ہوں ورنہ یہاں تو ہر شاعر کو لوگ نہیں مانتے تھے اب سے جو نظمیں تم نے کہی ہیں ان کے پیچھے دیں چھاپتا ہوں۔ اس کے بعد وہ پھر سے اور اُردو کا کام کرنے لگے۔ میں حیدرآباد آگیا تو وہ میسور میں تھے۔ مجھے مراسلت ہوتی رہی آخری خط میرے پاس آیا کہ اب ڈاکٹر نے لکھنے پڑھنے کی اجازت دے دی ہے ایک نظم لکھی ہے وہ بھیج رہا ہوں۔ اس مضمون کا ایک شعر عبدالرزاق نے نقل کر بھی لیا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ انتقال کی اطلاع بھی ملی۔

عظمت کی موت ناوقت ہوئی۔ ملک کو ان کی شدید ضرورت تھی ان کے جیسے مستقل لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔ عظمت کے مضامین سادہ کی نظموں کا مجموعہ دونوں طرح ہو سکتے ہیں مگر ان کے ترجمے نہیں چھپ سکے۔ عظمت نے سینکڑوں کو شاعر اور ایڈیٹر کیا بنا دیا۔ رفیق بیگ نے عظمت ہی کے مشورے سے ٹائپ کا کام کیا اور نمائش میں جاری کیا۔ فرحت اللہ بیگ اپنے مضامین میں عظمت ہی سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ اپنے نام سے مضامین عظمت نے فرحت اللہ بیگ کو بھی دے دیے تھے۔ امجد صاحب عظمت کو رباعیاں لکھ کر دیتے سالوں کو سینے یا مجموعے میں چھپواتے۔ اسی طرح ذہین ہم سے کئی نظمیں لکھ کر عظمت کو دکھایا کرتے، مسعود بیگ، امجد ورعظمت کے لیے تھے، غرض عجیب و غریب آدمی تھے عظمت اللہ خاں :

بعض ایسے لوگ بھی ہوئے مگر ایسے ہو بظاہر بہت قابل شعر تھے

نام کیوں مرے کوئی اللہ کے بندے ہوں گے

بہرحال عظمت ایک شخص تھے جو نظم، نثر، انگریزی، اردو سبھی کچھ ڈھالتے رہتے، زندگی کا رخ، ان کے حصے میں اور سلگتے رہے، دوسروں کے حصے میں آتے۔

نہایت زندہ دل رنجان مرنج آدمی تھے، ململ کا کرتا پہنے کہنیوں تک آستینیں چڑھائے بید کی آرام کرسی میں بیٹھے حقہ یا سگریٹ پیتے جاتے باتیں بھی کرتے شعر بھی کہتے مضمون بھی لکھتے، اصلاح بھی دیتے، مشورے بھی دیتے، سبھی کچھ ہوتا، ہنستے کھیلتے وقت گزار دیتے، خود خوش رہتے اور دوسروں کو خوش کرتے تھے۔

پہلوانی سے لے کر رسم الخط تک، عروض سے لے کر تصوف تک، ڈرامے سے لے کر تاریخ تک ہر موضوع پر بڑی سیر حاصل گفتگو کرتے اور ہر بات کے تجربے بتاتے جاتے تھے، صورت سے نہایت بھولے، بڑے ہی وفادار دوست تھے۔

حکیم شمس اللہ قادری

حیدرآباد کے سب سے پرانے مضمون نگار تھے غالباً حیدرآبادی مضمون نگاروں میں حکیم صاحب پہلے ہیں جو ہندوستان کے اچھے پرچوں میں تحقیقی مضامین لکھتے رہے ورنہ یہاں کے لوگ پہلے تو لکھنے پڑھنے ہی سے ڈرتے تھے اور لکھتے پڑھتے بھی تو حیدرآباد سے باہر کے رسالوں میں چھپوانے سے بھی ڈرتے تھے۔

حکیم صاحب کی تحقیق کے قائل بڑے بڑے لوگ تھے چنانچہ شبلی نعمانی وغیرہ ان کو بہت مانتے تھے۔ حکیم صاحب سے بھی بڑے ہی محنتی اور صاحب ہزاروں کتابیں حافظے میں محفوظ تھیں، حیدرآباد میں اس طرح کے لوگ دو تھے۔ ایک تھے عبداللہ العمادی کتب خانہ آصفیہ میں تھے غالباً اسی محل سے جو شخص ملتا اس سے کتاب کا حوالہ کرتے صفحہ پوچھ لیتے اور سب مضمون حافظے میں محفوظ ہوتا کبھی اگر پوچھا کہ کتاب کا

[illegible] سے پہلے یہ [illegible] 2 [illegible]
[illegible] سے [illegible]
[illegible] صاحب [illegible] صاحب [illegible]
[illegible]

یہاں حکیم صاحب سے بہت خوش ہوتے تھے [illegible] حکیم صاحب نے [illegible]
[illegible] حکیم صاحب سے ناچاقی ہو گئی تھی مگر [illegible] صاحب نے عدالت اردو [illegible]
آثار [illegible] کنات، کتابیات و طبیعیات [illegible] بیشتر [illegible]
[illegible] خدمت کی۔

[illegible] آخر آخر [illegible] صاحب سے [illegible] شروع کر دیا [illegible]
[illegible] بہترین مکان [illegible] ایک بہترین کتب خانہ [illegible] انتقال کیا۔ حکیم صاحب کے
[illegible] طرح چلا رہے ہیں۔

حکیم صاحب کی [illegible] بیٹیاں دونوں تھیں [illegible] ان کی ذات سے [illegible]
[illegible] زیادہ پہنچا ہے اور یہی ان کے [illegible] کے لئے کافی ہے۔

یہ وہ دور تھا جس سے آپ روشناس ہوئے اس دور کے [illegible] بزرگ
میں نے منتخب کئے ہیں وہ ذیل کی فہرست ہے۔
اب تیسرے دور کو ملاحظہ فرمائیے۔ اس دور سے بھی چند شخصیتیں میں نے منتخب
کی ہیں۔

نظامت جنگ

حیدرآباد میں ایک خاندان بڑا مشہور قابل اور دیانتدار گزرا ہے جس کے افراد [illegible] جنگ اول و دوم رخصت یار جنگ وغیرہ تھے۔ نواب سر نظامت جنگ بہادر ایم اے ایل ایل بی۔ بیرسٹر ایٹ لا بھی اسی خاندان کے ایک رکن تھے۔ ابتداً سررشتہ عدالت میں مامور ہوئے پھر صدر المہام سیاسیات اور پولیٹیکل ممبر بھی ہو گئے تھے۔ دیانت داری کا یہ عالم کہ دفتر کا پانی بھی نہ پیتے تھے۔ [illegible] کا یہ عالم کہ عزیزوں اقارب تک سے معمولی ملاقاتیوں کو بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچایا خیر خواہی کا دم بھرتے رہے۔

شادی نہیں کی تنہا زندگی بسر کی۔ چند روز مکانات بنانے کا شوق رہا ہل فورٹ بنوایا اور پھر اسے فروخت کر دیا اسی طرح کئی مکانات اور باغات بنوائے۔ نہایت ہی خاموش [illegible] کم گو [illegible] تھے ابتداً [illegible] انگریزی ادب پر خاصا عبور تھا۔ نظم و نثر دونوں پر حاوی تھے علامہ [illegible] کی اکثر نظموں کو انگریزی میں منتقل کیا تھا۔ خود بھی انگریزی میں نظمیں کہتے تھے۔

حیدرآباد نے جہاں عربی فارسی اور اردو کے شاعر پیدا کئے وہاں انگریزی کے شاعر بھی پیدا کئے ہیں جن میں پہلا نمبر ہے سروجنی نائیڈو کا اور

اردو سوانح حیات جنگ کا ... انگریزی کے ادیب تھے اور شعر بھی انگریزی [illegible] کہتے تھے [illegible]
لکھا کرتے تھے۔

نواب صاحب کے چھوٹے بھائی نواب غیاث الدین احمد ابتدا ضلع [illegible] ہو کر آئے تو ان سے [illegible] وہ بھی تھے
اس لئے ان سے بھی ملنا ہوتا تھا۔ بہت کرم فرماتے تھے اس لئے میں بھی ان سے زیادہ ملتا تھا بلکہ اپنے بڑے بھائی کی طرح سمجھتا،
گو میں سے خوش جنگ سے [illegible] تبادلہ ہو کر [illegible] کے مددگار ناظر ہو گئے، ان دنوں نواب صاحب [illegible]
گنگا کوٹی روڈ پر رہتے تھے اور غیاث الدین صاحب بھی ساتھ رہتے تھے۔ میں اکثر صبح کے وقت ان سے ملنے جایا کرتا تھا، وہاں ڈسپنسری کے سامنے
چبوترے پر آرام کرسی پر بیٹھے اخبار پڑھتے نظر آتے۔ سامنے گلی گوالا بھینس کا دودھ دوہتا رہتا اور نواب صاحب اس طرح بیٹھے اس کی
نگرانی کرتے رہتے۔ ایک لطیفہ مشہور ہے کہ گوالا دودھ دوہتا ہوا ایک تھیلی رکھتا [illegible] اپنے گھر لے جاتا تھا کسی نے
یہ چغلی کھائی اور نواب صاحب کے سامنے شکایت کی کہ اس طرح گوالا روزانہ چوری کرتا ہے۔ نواب صاحب نے [illegible] کر غصے سے
فرمایا یہ تو ہم برسوں سے دیکھ رہے ہیں، آپ نے کوئی نئی بات معلوم کی؟ شکایت کرنے والے کو شرمندگی ہوئی اور معاملہ حسب دستور چلتا رہا۔

اخبار [illegible] ہفتہ وار جاری ہوا تو میں [illegible] کا ذکر کرتا تھا۔ نواب صاحب نے شاید کبھی پڑھ لیا اور اس کا ذکر چھیڑ گئے
مسلسل پڑھتے رہے اور پھر مجھے یاد فرمایا۔ میں نے وقت ملاقات کی درخواست کی تو فوراً ملاقات کی اجازت دی اور [illegible] کے سلسلے پر [illegible]
سے ملنے کے لئے فرمایا۔ ایک روز حسب ہدایت جو آئی تو میں نے بنگلے پر حاضری دی۔ صبح کا وقت تھا وہ [illegible] آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔
میں نے اطلاع دی اور ملاقاتی کو بلایا اور اسی طرح بیٹھے بیٹھے گفتگو فرمانے لگے۔ میں فوراً کرسی [illegible] پسند نہ آئی۔ نصیبی سے وہاں کوئی
بھی نہ تھی ایک اسٹول پر اخبارات رکھے تھے میں نے اخبارات اٹھا کر نیچے ڈال دئے اور اسٹول پر بیٹھ کر گفتگو شروع کی۔ نواب صاحب کو اس طرح
بلا اجازت میرا بیٹھ جانا شاید ناگوار گزرا، باتیں کرتے کرتے خاموش ہو گئے۔ میں نے بھی خاموشی اختیار کی اور دو چار منٹ کے انتظار کے بعد چلا
گیا۔ اس کے بعد مجھے کبھی ان سے ملنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

میرے سالم زادے مولوی محمد محسن صاحب مسند [illegible] نواب صاحب کے قریبی عزیز ہیں ان کی لڑکی کی شادی میں اچانک سامنا ہو گیا تو صورت
دیکھتے ہی نام لے کر مخاطب کیا دیر تک گفتگو کرتے رہے اور شکایت کی کہ آپ ملتے نہیں۔ میں نے اس دن کا واقعہ دہرایا تو مسکرا کر فرمایا
معلوم نہیں کیا بات تھی، مجھے یاد نہیں، مگر پھر بھی میں نے ان کے گھر جانے کی ہمت نہیں کی۔

وظیفہ، پنشن لینے کے بعد بالکل مذہبی آدمی ہو گئے تھے قرآن کی تفسیر بھی لکھ رہے تھے بعض چھوٹی چھوٹی کتابیں بھی لکھی تھیں۔ ایک
انجمن "علم و عمل" کے نام سے قائم کی تھی جس کے لئے ایک مکان اور نقد رقم وقف کی ہے۔

مرحوم میں جو صلاحیتیں تھیں وہ ان کی گوشہ گیری اور بے جا رعاداری کی وجہ سے بروئے کار نہ آ سکیں، برسر خدمت رہنے تک مذہبی خدمت
نہیں کی بلکہ مذہب سے دور دور ہی رہے، وظیفے کے بعد جو مذہبی خدمت شروع کی تھی وہ ان کے شایان شان نہ تھی، معمولی صلاحیتوں کے لوگ
بھی یہ کام کر سکتے تھے، ان سے جو توقعات تھیں پوری نہ ہو سکیں۔

انتہائی نیک، مخیر اور رعادار آدمی تھے بعض قرابتداروں کی مالی امداد بھی کرتے تھے مگر اپنے خاندان کی خوشحالی اور ترقی کی کبھی کوشش نہیں
کی، اتنا بڑا شخص سینکڑوں کو بنا سکتا تھا مگر وہ اپنے خاندان والوں کو بھی نہ بنا سکے اس کو جانبداری سمجھتے تھے، سماجی حیثیت سے بھی ان کو
انہیں کوئی اہمیت نہیں دیتا، ایک انگریزی شاعر کی حیثیت سے حیدرآباد اس پر فخر کر سکتا ہے۔ انگریزی نظموں کے چار پانچ مجموعے طبع ہو چکے ہیں
جو عام طور پر پسند کئے گئے ہیں۔

بہادر یار جنگ

حیدرآباد کے ایک مشہور [illegible] اور ذی وجاہت خاندان سے تھے۔ وہ غیر معمولی شخصیت کے مالک تھے۔ تقریر کا شوق تھا۔ مشہور ہے کہ بچپن میں اپنے والد کے ساتھ [illegible] گئے تو والد نے اپنے دوستوں سے کہا کہ بہادر خاں تقریر کرتے ہیں چنانچہ لوگوں نے مجبور کیا کہ یہ تقریر شروع کریں [illegible] [illegible] [illegible] لوگ [illegible] آپ کے آگے تقریر کا [illegible] [illegible] [illegible] استعمال [illegible] [illegible] [illegible] تقریر میں اشعار بڑی خوش اسلوبی سے کرتے تھے۔

حیدرآباد میں تقریر کے معاملے میں بہت پیچھے تھے۔ [illegible] [illegible] ہمیشہ [illegible] [illegible] [illegible] حیدرآباد میں یہ چند شخص ہی جنہیں قدرت نے فن تقریر سے نوازا تھا۔ [illegible] [illegible] [illegible] آواز ظاہری شخصیت ہی سے حاضرین کو مرعوب کر لیتے اور جب [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کر دیتے تھے۔

ابتدائی تعلیم کچھ زیادہ نہیں ہوئی تھی مگر [illegible] [illegible] محنت سے پڑھیں اور [illegible] [illegible] عربی اور فارسی پڑھائی تھی [illegible] [illegible] [illegible] حیدرآباد [illegible] [illegible] ملتے اور [illegible] کوشش کرتے تھے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] عراق اور ایران کا سفر کر کے آئے تو حیدرآباد میں اپنے مشاہدات بصورت تقریر بیان کرنا شروع کیا۔ اس وقت ان کی تقریریں شروع ہوئیں۔

[illegible] کے چند نوجوانوں نے اتحاد المسلمین کے نام سے ایک انجمن قائم کی تھی [illegible] [illegible] [illegible] انہوں نے یہ دیکھا کہ بہادر یار جنگ غیر معمولی طور پر ابھر رہے ہیں تو اتحاد المسلمین [illegible] [illegible] اور [illegible] اس طرح اتحاد المسلمین سے [illegible] [illegible] انجمن میں جذب ہو گئی اور وہ انجمن میں جذب ہو گئے۔

سیاسی حیثیت سے ملک کا مفاد اور وطن کی محبت ان میں تھی۔ چونکہ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اگرچہ [illegible] سال اور زندہ رہتے تو غیر معمولی لیڈر ہوتے۔ [illegible] [illegible] نہ صرف حیدرآباد بلکہ ہندوستان بھر میں شہرت حاصل کر لی تھی۔ [illegible] بہت پسند کرتے تھے۔

علم و ادب سے بھی شغف تھا۔ ادبی کتابوں اور رسالوں کا مطالعہ بھی کرتے رہتے اور کبھی کبھار شعر بھی کہتے تھے۔ عین جوانی میں [illegible] کی وجہ سے اچانک موت واقع ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ ناوقت موت ہوئی ع

این ماتم سخت است کہ گویند جوان مرد!

احمد محی الدین

حیدرآباد کے قدیم اور شریف خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ [illegible] [illegible] خاندان سے بھی قرابت [illegible] [illegible] خانہ اب تک موجود ہے۔ [illegible] میں حالات تعلیم و تربیت ہوئی، حیدرآباد سول سروس کے لئے کوشش کی مگر انتخاب نہ ہو سکا۔ بد دل ہو کر ملازمت کی کوشش کی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] پسند نہ آئی۔ چند روز نہایت بد دل اور بے قرار رہے۔ [illegible] [illegible] [illegible] صاحب [illegible]

[illegible] کی بلڈنگ کے قریب تھے جہاں کہ ہم رہتے تھے۔ جمعرات کی رات وہاں "یا ما ہو فاضل" کی [illegible] ہوتی تھی
خاص مشاعرہ ہی سمجھئے۔ اسے بڑی [illegible] سیف اللہ صدیقی، احمد محی الدین، ناظم الرحمٰن وغیرہ جمع ہوتے تھے اور [illegible] نواب [illegible] جنگ نے
[illegible] صاحب [illegible] تھا وہ بہت چراغ پا تھے۔ سیف اللہ صدیقی نے انہیں [illegible] کرنے کے لئے ہر جمعرات کی رات کو ایک [illegible]
کبھی [illegible] ہفتہ وار اخبار کی [illegible] مرتب ہوتی "معمہ" نام تجویز ہوتا، ذیلی عنوانات بنائے جاتے اور ایک مکمل خاکہ ایسا تیار ہوتا گویا کل سے اخبار
جاری ہو جائے گا۔ کسی جمعرات کی رات [illegible] نام تجویز ہوتا تو اس کے لحاظ سے "الوقت"۔ ذیلی عنوانات تجویز ہوتے تمام کام زبانی
انجام پاتا۔ کبھی ایک شمارہ [illegible] اور کسی کی تجویز ہوتی اس طرح رات دلچسپی سے گزرتی صبح معین الدین صاحب نہاری کا نفیس ناشتہ کراتے
اور سب لوگ واپس ہو جاتے، چند روز بڑی دلچسپی رہی اس کے بعد جب معین الدین صاحب نے [illegible] کر دی تو جمعرات پارٹی بھی
ختم ہو گئی میں گلبرگہ چلا گیا اور [illegible] چونکہ فرضی تھیں اس لئے سب بھول گئے، چونکہ مجھے گلبرگہ سے ہر ہفتہ حیدرآباد آنے کی عادت تھی
اس لئے ایک دفعہ حیدرآباد آیا تو "خداوند" (عبدالرحمٰن نے سیف اللہ کا نام رکھا تھا اور ہم لوگ انہیں خداوند ہی کہتے تھے) نے فرمایا کہ احمد میاں
نے اخبار نکالنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور "الوقت" کی اجرائی کے انتظامات ہو رہے ہیں مجھ سے ملاقات ہوئی تو احمد میاں نے کہا اخبار نکالنا تو طے
کر چکا ہوں مگر نام سوچ رہا ہوں۔ الوقت مجھے پسند نہیں۔ مخبر دکن، مشیر دکن جیسا نام چاہتا ہوں۔ میں ترکیب ناموں کا مخالف تھا اسی لئے میں نے
اس دکن کے دم چھلے کی مخالفت کی مگر احمد میاں اسی طرف مائل تھے، آٹھ دس روز کے بعد پھر حیدرآباد آیا تو معلوم ہوا کہ "رہبر دکن" نام تجویز
ہوا ہے اور درخواست بھی دے دی گئی ہے چنانچہ منظوری ملی اور "رہبر دکن" بڑی آب و تاب سے نکلا، احمد میاں نے ایسی نیک نیتی سے اخبار
جاری کیا تھا کہ وہ ترقی کرتا ہی رہا اور جنوبی ہند کا سب سے کثیر الاشاعت اخبار ہو گیا۔ سقوط [illegible] ملک کی خدمت کی اور حق یہ ہے کہ حق خدمت ادا
کیا۔ حیدرآباد میں اس وقت دو روزنامے اور نکلتے تھے ایک "صحیفہ" دوسرا "مشیر دکن"۔ یہ دونوں ہی [illegible] کے پرچے تھے۔ ایک کے
ایڈیٹر مولوی [illegible] تھے دوسرے کے پنڈت جی۔ صحیفہ ایسا [illegible] اخبار تھا کہ اشتہار چھاپنا خلاف شرع سمجھتا تھا، کسی جاندار کی تصویر صحیفہ میں طبع ہو ہی نہ
سکتی تھی، مشیر کے پنڈت جی بھی اسی قسم کے کٹر تھے مولوی حبیب احمد [illegible] مشیر کے نگراں تھے مگر مضامین کی حد تک ان کا تعلق تھا [illegible]
سے وہ بے تعلق تھے۔ ایسے زمانے میں ایک روشن خیال اخبار کی شدید ضرورت تھی، اجرائی کے چند سال بعد ہی سے خاص نمبر یعنی سالگرہ نمبر، عید نمبر
وغیرہ نکلنے لگے، جو معرکہ کے ہوتے تھے۔ شہزادگان والا شان کی تصویریں پہلی بار رہبر دکن ہی میں طبع ہوئیں، غرض جتنی جدت ہو سکتی تھی ہوتی رہی، کارکن
بھی بڑے مخلص ملے، احمد میاں کے بھائی یوسف الدین مہتمم تھے، عبداللہ خان پالیسی کنٹرول کرتے تھے اور زیادہ تر وہی اداریہ لکھتے تھے، مترجمین اور
دوسرے کارکن بھی بڑے ہی مستعد اور مخلص ملے اور خوب کام ہوتا رہا، کسی شخص اور ادارے نے اپنے عملے کے لئے اتنی سہولتیں مہیا نہیں کی ہیں جتنی
احمد میاں نے کیں، اپنے عملے کا کوئی آدمی مر جاتا تو وہ تجہیز و تکفین کے مصارف برداشت کرتے اس کے متعلقین کو ماہوار وظیفہ مقرر کر دیتے، تنخواہیں
خاصی فراخدلی سے مقرر کرتے اور وقت پر ادا کرتے، قرضے بھی خاصے دیا کرتے اور دوسری سہولتیں بھی دیتے اس شان کا عملہ برقرار رہتا تھا۔

رہبر دکن جاری کر کے گلبرگہ گئے تو نواب اقبال علی خان مہتمم تعمیرات کے مہمان ہوئے تو میں نے بائیکاٹ کیا اس سے بہت متاثر ہو کر میرے
پاس منتقل ہو گئے دو دن میرے مہمان اور دو دن اقبال علی خان کے مہمان رہے، اس طرح دوستوں کا خیال رکھتے تھے، میں نے خریدار فراہم کئے [illegible]
تجار، عہدہ دار اور محلے والوں کو خریدار بنایا اور اتفاق سے سو خریداروں نے نقد چندہ دے دیا، وی پی کی ضرورتیں اتنی ہی تھیں۔ اس کامیابی سے اتنے
مسرور ہوئے کہ [illegible] اضلاع کا دورہ کیا اور خاصے خریدار ہر ضلع سے فراہم کئے۔

یہ بھی عجیب بات ہے کہ ان کے ایک بیٹے سیف الدین ہوئے اور ابتدائی تقرر گزیٹڈ خدمت پر ہوا اور وہ احمد محی الدین جن کو حیدرآباد میں عیدی صاحب
[illegible] گزیٹڈ خدمت نہیں ملی تھی اپنا انتخاب اور [illegible] ساری گزشتہ گزیٹڈ خدمتیں ملتا رہا۔

[illegible]

[illegible] ہو گئے۔

[illegible] جوش کی ... [illegible] ... بیان کرتے تھے۔

[illegible] صاحب ... [illegible]

[illegible] ایک ... [illegible] ... کا رشتہ ہو ... [illegible]

[illegible] ... [illegible]

[illegible] ... پر پایا جا رہا ہے مگر ...

وہ بات کہ کون کی کتنی کس کے ساتھ!

فانی

فانی بدایونی کو مدت سے پڑھ رہا تھا، ان کی تصویریں بھی رنگین رسالوں میں دیکھی تھیں مگر ان سے ملنے کا اتفاق کبھی نہیں ہوا تھا۔ اتفاق سے ایک روز مغرب کے قریب ایاز بیگ کے ساتھ جا رہا تھا تو ایک دبلے پتلے، متوسط قد و قامت کے شریف آدمی نے مجھ سے جوش ملیح آبادی کے گھر کا پتہ پوچھا۔ اتفاق سے میں جوش ہی کے پاس جا رہا تھا۔ جوش ان دنوں حیدرآباد میں تھے۔ میں نے ساتھ چلنے کی پیشکش کی اور وہ ساتھ ہو لیے۔ مجھے سائیکل پر ساتھ پیدل چلتا ہوا دیکھ کر راستے میں انہوں نے ایک دو معمولی جملے کہے اور پھر خاموش جوش کے گھر تک پہنچ گئے۔ جوش باہر ... [illegible] بیٹھے ہوئے تھے، جوش سے ان صاحب کی شاید کبھی ملاقات ہو چکی تھی مگر جوش نے بھی انہیں پہچانا نہیں۔ ... [illegible] بدایونی ہوں۔ اس طرح معلوم ہوا کہ یہ دبلا پتلا کمزور سا شخص فانی ہے۔ جوش نے بہت زور دیا کہ ان کے مہمان ہو جائیں مگر فانی نے انکار ہی کیا اور نظامیہ ہوٹل کے قیام ہی سے خوش رہے۔ یہ تھی پہلی ملاقات فانی سے۔ اس کے بعد مسلسل ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ مہاراجہ بہادر کے پاس، جوش کے پاس، نظامیہ میں۔ چند روز رہ کر فانی چلے گئے۔ دوبارہ آئے تو نامپلی اسٹیشن کے پاس ... سرائے میں قیام کیا اور پھر ... میں اس مکان میں منتقل ہو گئے جو ... مہاراجہ بہادر نے ان کے لیے مخصوص کرایا تھا۔ یہ قیام مستقل تھا، پھر ... [illegible]

اردو شعرا میں سب سے زیادہ مکمل شاعر میر تھا جس نے سوا شاعری کے کچھ نہیں کیا اور اگر شاعری کے علاوہ کچھ کیا تو فاقہ۔ شاعر ... [illegible] کی شاعری محتاج ہوتی ہے نفسیات کی اور غیر نفسیاتی شاعر، شاعر نہیں کہلا سکتا۔ میر کے بعد کوئی غیر نفسیاتی ... اگر پیدا ہوا تو وہ فانی ہی تھا۔ فانی کو نفسیات سے چڑ تھی، وہ نفسیات کے پیچھے لٹھ لے کر دوڑتے تھے، انہیں دنیا اور دنیوی تعلق سے کوئی سروکار نہ تھا، وہ غزل ... [illegible] ... رونا ان کا روزمرہ تھا، صورت بھی بسورتی ہوئی پائی تھی۔

[illegible] ... مجسم ... مجسم حزن و ملال ...

مجھے راشد الخیری سے بغض للّٰہی تھا اس لیے کہ وہ ... [illegible] ... فانی ... [illegible]

[illegible] ... [illegible]

محبت میں سارا جہاں ... ہے   زمیں ... آسماں ... ہے

باقی رہی حال کی بات۔

انہوں نے اپنی جگہ کیا کہ مصاحبت کی بھی تیاری کر لی تھی پھر اٹھ بیٹھے گئے اور کہنے لگے کہ اب وہ پڑھتے کہ [illegible]
تعلیم کیسے حاصل ہو گی [illegible] اور ایسی شاعری اور سبیل کر دے جائیں گے —

سینہ کوبی سے زمیں ساری ہلا کے اٹھے
کیا علم دھوم سے تیرے شہدا کے اٹھے

کا حال ہے۔

اور کوئی شخص پہرہ تو دینا جانتا تھا، حیدرآباد پہنچا تا کہ فانی ملنے کہتے ہیں [illegible] پہنچا [illegible] بہت سی شعر و ادب کی
مارے سارے عمدہ دار [illegible] کی [illegible] کے عام طور سے نا بزم بن گئے تھے۔

داغ حیدرآباد آئے تو [illegible] غریب کی [illegible] شہر [illegible] ایک [illegible] صاحب سے ملاقات کی
[illegible] ایک کے بچوں کو [illegible] کر دیا [illegible] فانی [illegible]
خیال [illegible] فانی کی طرح [illegible] مگر آج [illegible] فانی کا [illegible]

فانی دکن میں آ کے یہ عقدہ کھلا ہمیں

ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دور

کہ اگر حیدرآبادیوں کو مخاطب [illegible] حیدرآباد والے اپنے وطن اور دکن کو سمجھتے ہیں اور صرف شمالی ہند کو ہندوستان [illegible] داغ کے زمانے میں بھی ایسا
ہی کہتے تھے۔ داغ نے بھی ایسا ہی کہا [illegible] تھا، چنانچہ جب وہ اہلِ وطن کو خط لکھتے تو [illegible] ہندوستان [illegible]
سے لکھتے تھے، داغ اس حقیقت سے واقف تھے [illegible] چنانچہ انہوں نے حیدرآباد میں حیدرآبادیوں کی طرح زندگی
گزاری اور اسی لئے کامیاب بھی ہوئے مگر فانی [illegible] کے حالات سے ناواقف اور صورتِ حال سے [illegible]
یہ شعر نہ ان کی عزت میں اضافہ کر سکا اور نہ حیدرآبادیوں نے ملاقات [illegible] البتہ فانی سے لوگ [illegible] ہو گئے اور اسی لئے [illegible] حیدرآبادی اہلِ وطن
سے نفرت کرنے لگا، بہر حال فانی نے [illegible] زندگی گزاری، آخری زمانے میں ان کے حالات بد سے بدتر ہو گئے تھے [illegible] تھی [illegible]
کے قریب ہی تھا، بیچارہ ان سے بہت [illegible] اور ان کی حالت پر روتا تھا مگر ہم لوگ کیا کر سکتے تھے اور رونے کا کب [illegible]

شام ہجر [illegible] کب تک روئیے!

مجھے فانی سے محبت تھی، ان کے لئے اکثر روتا ہوں، شاید مرتے دم تک روتا رہوں گا، میں دعا کرتا ہوں کہ خدا [illegible] کر
تو غالب، داغ، اکبر و اقبال بنا دے، میر و فانی نہ بنائے، آمین!

فصاحت جنگ

حافظ جلیل حسن جلیل مانک پوری المخاطب بہ نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل القدر امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ امیر رامپور ہی میں تھے کہ
جلیل ان کے پاس پہنچ گئے اور امیر اللغات کا کام کرنے لگے، امیر چاہتے تھے کہ ان کی لغات کے لئے حیدرآباد سے کوئی امداد ملے اور وہ لغات شائع
کر سکیں اسی لئے انہوں نے داغ سے [illegible] آخر نے حضور نظام سے عرض کر کے [illegible] کے نام [illegible] حضور کلکتہ سے واپس [illegible]

[illegible]

اب جلیل منزل سکتا ہے [illegible]

جلیل صاحب نہایت خوش [illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

جلیل [illegible]

ضبط [illegible] سے [illegible] ہے

جب بھی جلیل تشریف [illegible]

[illegible]

[illegible] حال رہا۔ اس [illegible] جلیل سے [illegible] اتفاق [illegible]

[illegible]

[illegible] اپنے [illegible]

[illegible] جلیل کے ایک شاگرد [illegible]

[illegible] استاد جلیل [illegible]

ہے [illegible] چنانچہ اس نے حضرت کے متعلق [illegible] جلیل [illegible]

چنانچہ [illegible] پیش کیا تو جلیل نے پڑھا اور کہا [illegible]

کہا ہے کہ میری غزل میں ایک دو شعر اچھے ہوتے ہیں [illegible]

پھر میرے متعلق پوچھا کہ کون ہے کہاں کا رہنے والا ہے [illegible]

تک بتایا کہ انہیں کسی [illegible] سے آ کر [illegible] جلیل صاحب کے پاس [illegible]

تھا میں [illegible] غور سے دیکھنے لگے میں نے عرض کیا آپ نے پہچانا؟ تو فرمایا [illegible] چہرہ [illegible] دیکھا ہوا ہے مگر یاد نہیں آتا ہے کہ کب اور

کہاں دیکھا ہے۔ میں نے عرض کیا آپ کسی [illegible] سے واقف ہیں؟ یہ سنتے ہی [illegible] چھاتی سے لگایا اور کہنے لگے [illegible] سال کے بعد

[illegible] سال کے بعد

میں [illegible] جلیل منزل کے سامنے ہی رہتا تھا [illegible] یہی حال رہا۔

[illegible] ... پڑھنے کی بھی ... سب ہی [illegible]۔

کسی کی زمین میں ... غزل ... [illegible] ... کسی کی ... [illegible] ... کہتے ہیں ... [illegible]

یہ قول سے ... اور گھر میں لگا دیا ... بہت خفا ہوئے ... [illegible] ... حافظ صاحب ... عاشق ... [illegible] ... [illegible] ... صورت ... بہت ... عاشق تھے ... کی محبت ... [illegible]

حیدرآباد میں ... شاگرد ہیں ... [illegible] ... دیوان ... دیوان صفی کا اب تک نہیں چھپا تاہم سنا ہے کہ دیوان "صفی" کا ... ہے۔

جلیل کے جتنے اور شاگرد ہیں ... شاعرے کرتے رہتے ہیں۔ کاش شاگرد ... [illegible] کی بجائے دیوان چھپوا دیں۔

واقعہ ہے کہ جلیل بہتر سے بہتر غزل کہتے تھے ... اچھا غزل گو کوئی پیدا نہیں ہوا۔

صفی اورنگ آبادی

بہرحال صفی اورنگ آبادی اورنگ آباد دکن میں پیدا ہوئے تھے۔ بچپن ہی میں باپ سے ... حیدرآباد آگئے ... [illegible] پائی۔ باپ ... صاحب ... خوش نویس تھے۔ ... [illegible] ... خوش نویسی میں ملازم ہوگئے ... [illegible] ... حیدرآباد کے مشہور امیر نواب ... بہادر ... صاحبت میں ... نواب ... یار جنگ ... آخر میں خود انہوں نے اپنے شاگردوں سے ... [illegible] ... بسر کرتے تھے۔

ابتدا ... کی شاگردی کی ... حیدرآبادی سے مشورہ کرتے رہے۔ آخر ... کے شاگرد ہوگئے تھے ... [illegible] ... غزل ... [illegible] ... تھے۔

حیدرآباد میں ... شاعر ... عاشق ... غزل ... [illegible] ... تھے۔

[illegible]

علی منظور

[illegible]

ہوش بلگرامی

کیفی حیدرآبادی کے ایک شاگرد تھے۔ راجہ بھوانی پرشاد جو کرشن ہی مدرسہ سعید دار کے بازو "زکی منزل" میں رہتے تھے جو جاگیر ہمسائگی کی وجہ سے بھوانی راجہ سے میری بھی دوستی ہوگئی تھی اور بھوانی راجہ دوست تھے ہوش بلگرامی کے، اس طرح ہوش سے میری دوستی ہوئی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب ہوش زیر تعلیم تھے اور چادرگھاٹ کے دروازے کے قریب رہتے تھے۔

۱۹۴۸ء میں ہوش شہر سے باہر رہے اور یہ ملاقاتیں ہی ختم ہوگئیں۔ ۱۹۵۳ء میں پھر حیدرآباد آگئے تو ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اس بار سالار جنگ میں ہوش کو اتنی نوکریاں ملیں اور ایسے تجربے ہوئے۔ کہ واقعی ہوش اڑ گئے تھے۔ محبت اور عبادت مذہبی میں کامل اور علم مجلس کے ماہر

ہو گئے تھے مگر زندگی [illegible] باقی [illegible]
[illegible] کی [illegible] ہیں کہ پھر [illegible]
[illegible] کرنے لگے۔

[illegible] جوش [illegible]
[illegible]
[illegible] شروع ہو گئے [illegible] ہو گیا [illegible]
[illegible] کامیابی بھی [illegible] لوگوں [illegible]
احوال [illegible] ہو گئے اور جوش [illegible] لگے۔

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] ہوش [illegible]
[illegible]
[illegible] سینکڑوں [illegible] دیکھے [illegible]
اور [illegible] ایک [illegible] ہو گئے [illegible]
[illegible] شروع ہوئی [illegible] مکمل [illegible]
[illegible] چنانچہ [illegible] جوش [illegible]
نے [illegible]

اس وقت آپ انہیں کچھ پہچانتے نہیں مگر یہ [illegible] پریس ایکشن ہونے ہی سے منہ بند کر گھیر لیا۔ خوب روئیں دیں اور انہیں خوش کرنے کے لیے ایک کتاب لکھنے لگے جس میں حضور نظام سے لے کر اپنے بیوی بچوں تک کی مخالفت کی۔ وحشت کے مسودہ سناتے تو لوگ داد دیتے اور یہ خوش ہوتے مگر سنجیدہ لوگوں نے باوجود حالات جاننے کے ان کی کتاب کو پسند نہیں کیا۔ جوش جیسا بلند [illegible] تو انہیں بھی مسودے کا کچھ حصہ سنایا اور جوش نے بھی منع کیا کہ اس کو نہ چھپوائیے۔ بعض احباب مجھے بھی سناتے تھے اور میں نے بھی سخت مخالفت کی تھی مگر کسی کی پیش نہ گئی اور جوش نے کتاب چھپوا ڈالی "مشاہدات" نام رکھا پھر چند سنجیدہ لوگوں سے مشورہ کیا تو انہوں نے بھی منع کیا اور بعض قانونی نقصانات بھی ظاہر کیے جس کی وجہ سے بعض صفحات نکال دیے گئے بعض سطریں حذف کی گئیں اور بے ربط کتاب [illegible] بدتر ہو گئی۔

چند ہی نسخے فروخت ہوئے تھے کہ [illegible] شروع ہو گئی۔ تنقیدیں اور خلاف مضامین چھپنے لگے بعض لوگوں نے عدالتی کارروائی کی دھمکی بھی دی [illegible] کے دور سے چھپے تھے۔ اس کشمکش میں پھر اثر ہوا۔

ستمبر [illegible] میں خود بیمار تھا اکثر [illegible] صاحب فراش ہو گیا۔ ابھی میں بیمار ہی تھا کہ جوش کے خلاف مضامین نکلنے لگے اور میں ان سے ملنے کی فکر میں تھا کہ [illegible] کا خط آیا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ جوش بیمار اور پریشان ہیں [illegible] باوجود علالت کے میں نے [illegible] کو جوش سے ملاقات کی۔ [illegible] نواب [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

یہ دور ہو رہا تھا۔ ان میں سے صرف چند شخصیتیں میں نے انتخاب کی ہیں ورنہ یہ فہرست بڑی طویل تھی۔

پچھلے باب دورِ چہارم کی چند شخصیتوں سے روشناس ہو جائیے اس دور کے حضرات وہ ہیں جو بفضلِ تعالیٰ موجود ہیں اور بیشتر اہم خصوصیات کے مالک ہیں۔ یہ فہرست بھی طویل ہے، چونکہ مضمون بہت لمبا ہو گیا ہے اس لئے میں نے اس فہرست کو مختصر کر دیا ہے۔

مُردوں پر کچھ لکھ دینا آسان ہے مگر زندوں کے متعلق ایمانداری سے لکھنا بہت مشکل ہے اور پھر ان لوگوں کے متعلق لکھنا جو آپ کے دوست بھی بنے ہوں مشکل تر ہے، میں نے کوشش کی ہے کہ اخلاقی جرأت اور ایمانداری سے کام لوں۔ مگر اپنی کوشش میں کس قدر کامیابی ہوئی ہے اس کا فیصلہ آپ ہی کر سکتے ہیں

زین یار جنگ

معمار ملت سید [illegible] المخاطب بہ نواب زین یار جنگ جنہیں سال ہوئے بیات ہو گئے [illegible] سے [illegible]
سکونت زمانے سے [illegible] مستقل ہیں۔ [illegible] آپ نے [illegible] نکلا۔ آپ [illegible]
تعلیم مدرسے [illegible] یورپ سے [illegible] جنگ کی ڈگری لی اور حیدرآباد کی مختلف عمارات بنانا شروع سے آپ [illegible]
عمارات [illegible] حیدرآباد میں [illegible] وزارت [illegible] اس [illegible]
حکومت ہند اور مصر [illegible] کے دریا [illegible] کوشش کی [illegible] اس کام [illegible] عمارات [illegible]
وفات [illegible] آپ ہی کے زیر [illegible] اور جب تک [illegible] انتخاب [illegible] آپ خدمت پر قائم رہے [illegible]
آپ کے [illegible] سعادت [illegible] صاحب نے کامیابی حاصل کی اور [illegible] کام کرتے رہے پھر [illegible] گئے۔

حضور نظام نے خود [illegible] سے میں انہیں آپ [illegible] کی حیثیت سے شریک [illegible] آپ [illegible]
[illegible] وجہ سے آپ ہر وقت ہر طبقے میں مقبول ہیں۔ آپ کی [illegible] کا یہ حال ہے کہ [illegible]
ہیں آپ نے [illegible] کیا ہے [illegible] تعمیر کے سلسلے میں [illegible] اس کے [illegible] تعمیر [illegible]
کی طرف سے [illegible] تعمیر کے نقشے کے سلسلے میں [illegible] عثمانیہ یونیورسٹی [illegible] آپ ہی کے [illegible]
[illegible] نقشہ بھی آپ ہی نے بنایا ہے جس پر [illegible] تعمیر [illegible] ہے۔

بحیثیت انسان آپ جیسے صاحب کمال [illegible] شخصیت کے مالک ہیں [illegible] سے بھی بہت [illegible]
[illegible] تمام [illegible] کے [illegible] ہیں۔ [illegible] آپ [illegible]
[illegible] آپ [illegible] شروع سے ہے اور ہر قسم کی خدمت کرتے رہتے ہیں۔

ستر سال کی عمر میں آپ [illegible] کی سی [illegible] ہمت ہے۔ [illegible] نہیں [illegible] مصروف رہتے ہیں۔ [illegible]
کا مطالعہ [illegible] مشغول اور مصروف رہتے ہیں عملی زندگی آپ کی قابل رشک ہے۔ بچپن سے [illegible] آپ کی فطرت کا مطالعہ [illegible]
ہمیشہ ایک ہی [illegible] ہی رنگ میں دیکھا ہے۔ آپ کی [illegible] شروع سے تھی وہی اب تک ہے۔ [illegible] شفقت [illegible]
[illegible] جاتا ہے۔

سید خورشید علی

[illegible] میں جب [illegible] طغیانی چڑھی اور سیلاب [illegible] والد مرحوم اپنی ایک بہن کے گھر کا حال دیکھنے کے لئے جانے لگے اور میں
بھی ضد کر کے ساتھ ہو گیا جہاں میں نے [illegible] سی نئی چیزیں دیکھیں [illegible] سید خورشید علی صاحب بھی [illegible] کا [illegible] کوٹ [illegible]
[illegible] میں [illegible] والد نے بتایا کہ یہ خورشید علی ہیں اور [illegible] پُرجوش نوجوان ہیں۔ اس کے
بعد میں نے ہر جگہ انہیں دیکھا اور احترام کی نظر سے دیکھا مگر ملاقات کبھی نہ ہوئی تھی۔ ۱۹۲۶ء میں جب میں نے [illegible] حیدرآباد کی سکونت
اختیار کی تو ملازمت [illegible] حیثیت سے [illegible] نصر اللہ خان [illegible] صاحب نے ایک سال [illegible] کر دیا اور [illegible] اور

[illegible]

[illegible] سمجھا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible] ڈاکٹر نذر [illegible] عبدالقادر سروری [illegible] بیشتر [illegible] ہے۔

پندرہ سال سے [illegible] آپ نے [illegible]

[illegible] اب بھی آپ [illegible] کی خدمت میں [illegible]

[illegible] اور بڑی [illegible]

مجھے [illegible] میں بننے کے بعد [illegible] عنایت و شفقت فرماتے ہیں اور میں اپنے بزرگ کی طرح احترام کرتا ہوں [illegible]

خاندان میں ایک ہی بزرگ باقی نہیں رہا ہے مگر مولانا کی ذات کو میں اپنا بزرگ سمجھ کر مطمئن ہوں [illegible] عنایت [illegible]

وہ اب تک مسلسل جاری ہے۔ [illegible] تصنیف و تالیف میں بھی مولانا امداد و اعانت فرماتے رہتے ہیں اور اپنے زریں مشورہ

سے سمجھے فرماتے رہتے ہیں۔

نہایت خاموش کارکن اور مخیر بزرگ ہیں۔ سینکڑوں زندگیاں آپ نے بنا دیں۔ "گپت خاندان" پر ہمیشہ عامل رہے یعنی جو لوگوں کی امداد کی اس طرح کی کہ دوسروں کو خبر تک نہ ہونے پائی۔ بیشتر ایسی ہستیاں آج نام و نمود حاصل کر چکی ہیں جو مولانا کی امداد پر تعلیم و تربیت [illegible]

مولانا ہی نے ان کی زندگی سنواری۔ صرف یہی ایک صفت ایسی ہے جو انہیں ممتاز بناتی ہے۔

میں نے اپنی عمر میں دو ایسے شخص دیکھے جو دے کر شرماتے تھے [illegible]۔ ایک [illegible] بہادر، دوسرے مولانا خورشید علی۔

ان دونوں کا یہی طریقہ تھا کہ اپنی حیثیت سے زیادہ دیتے اور پھر شرماتے کہ کم دیا ہے۔

نرم دل، مروت، بامزاج اور [illegible] طبیعت کے رنگ ہیں۔ غصہ آتا ہے مگر جلد فرو ہو جاتا ہے۔ خفا جلد ہوتے اور معاف بھی جلد کر دیتے

اور پھر سائنس کی ہو جاتی ہیں ... جاتا ہے ہیں ... ہو کر آتے ہو جاتی ہیں [illegible] کے ... [illegible]
مرقع ... سے ... صورت نہیں کی بعض جگہ سے ... [illegible] ... آتی ... [illegible]
والے سے ... ہو کر ... رہے ہیں۔

عبدالرحمٰن خاں

پہلے نظام کالج کے پرنسپل ہوئے اور پھر جامعہ عثمانیہ ... ہوئے۔ شہر کے قابل اور نامور ... ہیں، حیدر آباد کے خاندان سے ہیں۔
سے ڈگری ... کالج میں ... سائنس ہوئے، پھر عثمانیہ یونیورسٹی کے پرنسپل بنے۔ نواب سالار جنگ ... [illegible]
کی صاحبزادی سے شادی کی۔ خان صاحب کے ... سے ... کے ... عبدالرشید خاں ... [illegible]
خان صاحب سے ... شادی کے ... ہوئے ... بیٹے ہی ... ایک ... جامعہ عثمانیہ کے ... [illegible]
... ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر سیادت علی خاں، ڈاکٹر ... علی حیدر، ... آپ ہی کے شاگرد ہیں۔
آپ ہی کے ... ہوئے ہیں سینکڑوں طلباء کی سرپرستی کر کے تعلیم دلائی اور ... [illegible] آپ
کے ... خوش حال، ... اقبال اور مشہور و معروف ہیں۔

... سے آپ کو ذاتی شغف ہے اور ... آپ اب تک ... جا رہے ہیں ... آپ ...
... کے ... میں ... ہوتے ہیں ... مضامین لکھتے ہیں، مضامین چھپاتے ہیں ... [illegible]
آپ ... ہیں ... سمجھے جاتے ہیں اور سارے ... آپ کرتے ہیں۔

چونکہ آپ ... سیاسیات کے ماہر ... تھے ... اس لئے آپ کو قبل ... وظیفہ ... [illegible]
گیا مگر آپ نے اس کا کوئی ... نہ دیا ... میں لگے رہے۔ ... آپ ... ہیں اور اب بھی آپ ... سے ...
... کبھی سائیکل پر بھی آ جاتے ہیں۔ بہرحال خان صاحب بین الاقوامی شہرت کے مالک اور حیدر آباد کی خاص شخصیت ہیں۔

علی یاور جنگ

آپ عالی النسل ہیں۔ آپ کے والد بزرگوار ڈاکٹر ... جنگ بہادر تھے اور آپ کی والدہ ... بیگم صاحبہ نواب ... الملک بہادر
مرحوم کی صاحبزادی تھیں۔ آپ کی والدہ مرحومہ نے حیدرآباد کی نسوانی دنیا میں تعلیم کی ... تھی۔ آج حیدرآباد کی نسوانی ترقی اور تعلیم ...
... ہے۔ بیگم صاحبہ کی ... نتیجہ ہے۔ نواب علی یاور جنگ کی ولادت حیدرآباد ہی میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم و تربیت ... بعد ...
آپ نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے سیاسیات میں ڈگری لی اور حیدرآباد کالج میں ... ہو گئے مگر آپ کو قدرت نے سیاسی گتھیاں سلجھانے
کے لئے پیدا کیا تھا اس لئے آپ ... ناظم اطلاعات ... ڈائرکٹر آف انفارمیشن بیورو بنائے گئے پھر سکریٹری آف ... [illegible] ہوئے اور
... سکریٹری ... کے عہدے پر ... ہو گئے۔
حیدرآباد میں اطلاعات کا ... آپ ہی کے ... ہوا اور حیدرآباد کی ... کا ... آپ ہی نے ... آپ کی ...

[illegible]

[illegible]

[illegible]

سجاد مرزا

[illegible]

[illegible]

اب پھر حیدرآباد واپس ہوگئے ہیں۔

علمی خدمت کا جذبہ آپ میں اتنا ہے کہ حیدرآباد کی انجمن ترقی اردو کے [illegible] کے لئے آپ نے اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی سے ایک کثیر رقم عنایت کی اور دل بڑھا دیا۔ مدتوں تک [illegible] نام سے ایک تعلیمی ماہنامہ نکالتے رہے۔ [illegible] کاغذ چھپاتے اور خط لکھنے کے لفافے کاغذ تک ردی استعمال کرتے تھے۔

بڑی سوجھ بوجھ کے مالک، نہایت ہی دماغ دار اور شگفتہ مزاج، دوست نواز، وضع دار اور حلیم الطبع۔ زندگی میں [illegible] کی ایک خاص وضع رہتی ہے اور جس سے جیسے مراسم ہوتے ہیں اسی طرح آپ ملاقات بھی رکھتے ہیں۔ [illegible] سے سیکڑوں کتابیں لکھوا دیں مگر آپ نے کوئی کتاب اپنے نام سے نہیں چھپوائی۔ نام و نمود سے قطعاً متفق نہیں ہیں۔

کیقباد جنگ

کیقباد آپ کا اسم گرامی ہے آپ کا خاندانی مذہب پارسی ہے پہلے کراچی میں رہتے ہیں۔ حیدرآباد میں پارسیوں کی ملت کے افراد
گولت ملازمت زیادہ یا سے کرتے ہیں۔ آپ کا تعلق بھی حیدرآباد کا تعلیم یافتہ ہے آپ نے مختلف محکموں میں ملازمت کے بعد
بعد نائب معتمد سیاسیات اور پرنسپل جوائنٹ سیکرٹری۔ بعد کو خلیفہ عظمیٰ کی خدمت حاصل کی اور صاحب صدر اعظم کی معیت جنگ میں رہے
کتب خانہ بے نظیر ہے معلومات جدیدہ کا آپ کو شوق ہے بلا شبہ ہے انگریزی ادب کا ذوق ہے صحیح بھاؤ تاؤ سمجھتے ہیں۔ حافظہ
نہایت قوی اور معلومات کا سرمایہ بہت زیادہ ہے۔ فارسی آپ کی مادری زبان ہے اور گجراتی سے بھی واقف ہیں اور صحیح فارسی لکھتے ہیں۔

صاحب عالی کا مطالعہ نے ادبی تحقیق و جستجو کیے۔ مذہب سے آپ کو گہرا لگاؤ ہے اور قدیم صحیفوں کا عمیق
مطالعہ کیا ہے ایک مرتبہ میں نے آپ سے ایک مسئلہ دریافت کیا۔ آپ نے فوراً کتاب نکال کر جواب دیا۔ غلطیاں نظر آئیں تو آپ نے
غلطیاں نوٹ کر کے مجھے دیں اور میں نے حوالہ دیکھا تو واقعی وہ غلطیاں تھیں۔ لطف یہ ہے کہ یہ غلطیاں آپ نے اس میں
اعراب درست کیے سے ہو کر کے نشان لگا رکھے تھے بلکہ ہر لفظ پر نظر رکھی تھی۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ آپ کا مطالعہ کتنا گہرا اور مستقل ہے۔

مجھ سے تیس ایک سال سے برابر ملاقات ہے کتب خانہ میں آمد و رفت رہتی ہے۔ ضعیفی کی وجہ سے بہادر جنگ کے بعد حالت
میں ہلکی ہونے سے بعض اوقات بیمار ہو جاتے ہیں مگر پھر وہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ کئی مہینے سے فرش علالت پر ہیں۔
گزشتہ مہینے میں آپریشن بھی ہوا ہے جو سنا ہے کہ کامیاب رہا مگر ابھی استراحت کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ آپ کے فرزند سے برابر
خیریت معلوم ہوتی رہتی ہے۔ خداوند عالم آپ کو صحت و سلامت واپس لائے۔

مہدی نواز جنگ

حیدرآباد ہی کے شرفاء سے ہیں۔ ابتدائی تعلیم حیدرآباد ہی میں ہوئی اور محکمہ مال میں ملازم ہو گئے۔ غالباً پہلے تعلقدار ہوئے پھر کلکٹر ہوئے اور
مہاراجہ بہادر کے صدر اعظم ہوتے ہی آپ کو معتمد باب حکومت (رجسٹرار) بنا لیا۔ مہاراجہ کے معتمد علیہ کی حیثیت سے کام کرتے رہے آپ
نے جس دیانت، محنت، سلیقہ اور تجربے سے مشغولی کی ہے سارا ملک واقف ہے۔ اس اہم خدمت پر رہ کر سب کو خوش رکھنا ناممکن
تھا چنانچہ بعض حیدری آپ سے خفا ہو گئے اور جب صدارت عظمیٰ پر فائز ہوئے تو آپ کو بڑی آزمائش میں مبتلا کر دیا مگر مہدی نواز جنگ نے
تدبر اور جانفشانی سے ان آزمائشوں سے عہدہ برآ ہو کر دکھا دیا کہ وہ بڑے سے بڑے معرکے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

جب تک ملازمت میں رہے ملک کی خدمت کی پھر خلیفہ عظمیٰ کی خدمت پر سبکدوش ہو کر ملی خدمت کرتے رہے۔ گزشتہ انتخابات
میں دوست احباب نے مجبور کیا تو کانگریس کی طرف سے آپ بھی کھڑے ہو گئے اور منتخب ہو کر عوامی وزارت سے سرفراز ہوئے۔

سابقہ عہدہ کے تین ہی جنگ ایسے ہیں جنھوں نے انقلاب کے باوجود اپنے آپ کو کامیاب و کامران بنا لیا۔ پہلے نواب زین یار جنگ، دوسرے
نواب علی یاور جنگ، تیسرے نواب مہدی نواز جنگ۔ اب وزارت طبابت سے سرفراز اور کارگزار ہیں۔ خدمت ملک بہر حال سمجھی جاتی
ہے۔ اس کے علاوہ نواب سالار جنگ بہادر کے اسٹیٹ کی کمیٹی کے صدر نشین بھی ہیں اور بڑی عمدگی سے اسٹیٹ اور عجائب خانہ کو باقی رکھا ہے۔

[illegible]

ڈاکٹر عبداللطیف

[illegible]

ڈاکٹر سیادت علی خان

آپ مرحوم نواب الدین خان [illegible] حیدرآباد ہی میں تعلیم و تربیت ہوئی۔ [illegible] ایل ایل بی کرنے کے بعد [illegible] یونیورسٹی سے بی سی ایل اور [illegible] حیدرآباد آ کر جامعہ عثمانیہ کے قانون کے پروفیسر ہوگئے۔ پھر سررشتہ عدالت میں منتقل ہوئے اب ہائی کورٹ کے جج ہیں۔

جسٹس ڈاکٹر سیادت علی خان ملک کے ان ہونہاروں میں سے ہیں جن پر ملک ناز کر سکتا ہے۔ عربی، فارسی، اردو، انگریزی پر یکساں عبور ہے۔ مذہب، ادب اور قانون پر یکساں نظر ہے مگر اپنے مخاطب کو اپنی قابلیت سے مرعوب کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ مرنجاں مرنج [illegible] وضع دار آدمی ہیں۔ بزرگوں کا ادب اور چھوٹوں کا وقار ہمیشہ پیش نظر رہتا ہے۔ ان کے والد میرے والد کے [illegible] تھے مگر عمر میں چند سال بڑے تھے اس لیے میرے بھتیجے ہیں مگر ہم عمر، ہم دونوں میں چند ہی مہینوں کا فرق ہے۔

آج کل قانون ہی کی طرف زیادہ مائل ہیں۔ [illegible] بڑی نفیس لکھی ہے جو بہت مقبول ہے اور بہت سی شرحیں لکھی ہیں۔ مضامین خوب لکھتے ہیں مگر آج کل عدالتی مصروفیات کی وجہ سے کم لکھ رہے ہیں۔

ڈاکٹر ولی الدین

آپ جسٹس ڈاکٹر میر سیادت علی خان کے چھوٹے بھائی ہیں۔ حیدرآباد ہی میں تعلیم و تربیت ہوئی۔ منشی فاضل، ایم۔ اے، ایل ایل بی کرنے

کے ممبر تھے۔ گلبرگہ شریف سید ... کا اسم ... ملک کے واپس آ گئے جامعہ عثمانیہ کے شعبہ ... ہیں۔
تصوف کا مطالعہ بڑا گہرا ہے اور آج کل مذہب اور تصوف پر کام کر رہے ہیں۔ ایک مدت سے ... ہیں ...
نیک، ایسی شخصیت کی کمی ہے جو بہت متحمل ہوں۔
خاموش کام کرنے والے ہیں، ہنگاموں سے دور رہتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر آپ کے جاننے والوں میں شوق اور علم حاصل کرنے کا ... ہوتا ہے۔
ہر وقت پتہ ہے وہ مطالعہ اور تصنیف و تالیف میں صرف کرتے ہیں یا جو علمی ہونے کے کام میں مشغول رہتے ہیں اور ... لگے۔

ڈاکٹر نظام الدین

حیدرآباد ہی کے ایک خاندان کے فرد ہیں۔ مولوی فاضل کا امتحان کامیاب کرنے کے بعد بی۔ اے کرنے کے لئے لندن چلے گئے اور وہاں تحقیق کر کے فارسی میں پی ایچ ڈی کیا۔ حیدرآباد واپس آ کر جامعہ عثمانیہ کے فارسی کے پروفیسر ہو گئے۔ حال ہی میں وظیفہ پر سبکدوش ہو گئے ہیں۔

عماد الملک، قطب الدین فاضل، محمد یار جنگ نے ایک ادارہ اشاعت "دائرۃ المعارف" کے نام سے قائم کیا تھا جو اس وقت عربی کی نایاب اور کمیاب کتابیں شائع کر رہا ہے۔ جب اس کا تعلق جامعہ عثمانیہ سے ہوا تو ابتداً پروفیسر الیاس برنی اس ادارے کے ناظم رہے اور پھر ڈاکٹر نظام الدین کے سپرد ہوا۔ ڈاکٹر صاحب عربی سے نہ صرف فارغ التحصیل ہیں بلکہ انہیں عربی زبان اور ادب سے عشق بھی ہے اس لئے انہوں نے بڑی دلچسپی سے دائرۃ المعارف کو چلایا اور اب وظیفہ پر سبکدوش ہونے کے بعد بھی نہایت ہی حسن و خوبی سے چلا رہے ہیں۔

ڈاکٹر نظام الدین بھی نہایت خاموش کام کرنے والے ہیں، نظر اور اپنے کام میں لگے رہتے ہیں۔ ایران والوں نے ... کی یادگار منائی تو حیدرآباد سے بطور نمائندہ آپ ایران بھیجے گئے اور ... کانگریس میں شرکت کی۔ بہرحال آپ ملک کے ایک ... ڈاکٹروں میں شمار ہوتے ہیں۔

مجھ سے پچیس تیس سال سے واقف ہیں۔ دوسرے بہادر ملک کی طرح آپ بھی اپنا پروپیگنڈہ نہیں کر سکتے اور نہ تعلی اور خود ستائی سے لوگوں کو مرعوب کر سکتے ہیں۔ خاموشی سے علمی و ادبی خدمت کئے جا رہے ہیں مگر چونکہ عربی کی نایاب اور کمیاب کتابیں آپ ایڈٹ کر کے چھپا رہے ہیں اس لئے عوام ان خدمات سے ناواقف ہیں۔

ڈاکٹر یوسف حسین خان

مولوی فدا حسین خان وکیل حیدرآباد کے مشہور اور قابل وکلاء میں سے تھے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان انہی فدا حسین خان صاحب کے ہونہار فرزند اور ڈاکٹر ذاکر حسین خان کے بھائی ہیں۔ ولادت اور ابتدائی تعلیم و تربیت حیدرآباد ہی میں ہوئی اور پھر علی گڑھ یونیورسٹی میں شریک ہوئے۔ ترک موالات کے زمانے میں جامعہ ملیہ قائم ہوئی تو آپ اس میں شریک ہو گئے اور وہاں سے لندن جا کر پی ایچ ڈی کیا۔ پھر حیدرآباد آ کر شعبہ تاریخ کے ریڈر ہو گئے۔ آج کل جامعہ عثمانیہ کے تاریخ کے پروفیسر ہیں۔

نہایت زندہ دل، مرنجاں مرنج، قابل اور دلکش شخص ہیں۔ دفتر دیوانی کے کمیٹی ... کی حیثیت سے بھی اچھا کام کیا۔ تاریخ ادب ... پر بھی ...

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

علی گڑھ کی چند شخصیتیں

خلیل الرحمٰن اعظمی

شعر و ادب کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے الفاظ و حروف کے پیچھے چھپے ہوئے غیر فانی تخلیق کے ساتھ فنکاروں کی شخصیت سے دلچسپی لینا ایک فطری امر ہے۔ کوئی کتاب، کوئی شعر، کوئی ڈرامہ، کوئی ناول اور کوئی ادبی تخلیق جب ہم پر اپنی تخلیق کا جادو جگانے لگتی ہے تو اس کے ساتھ ہی ہمارے ذہن میں اس فن پارے کے خالق کا چہرہ ابھرنے لگتا ہے۔ ہر کتاب اور اعلیٰ درجے کی ادبی تخلیق اپنے پڑھنے والے کے ذہن میں بھی ایک طرح کے تخلیقی عمل پیدا کر دیتی ہے اور وہ اسی طرح ہمارا ذہن اس فنکار کی شخصیت اور اس کے خدوخال کی ایک مکمل تصویر بنا لیتا ہے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی دلکش شاہکار سے متاثر ہونے کے بعد ہم اپنے ذہن میں اس کے خالق کی جو تصویر بناتے ہیں وہ اتنی خوبصورت اور دلآویز ہوتی ہے کہ اس کی اصل تصویر دیکھ کر ہمیں کچھ مایوسی سی ہوتی ہے اور دل کو عجیب دھکا سا لگتا ہے۔ شاید اسی لئے رشید احمد صدیقی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "دنیا کی تمام تصنیفات کو ہم صرف منافقت یا کم ہمتی کا نمونہ ہی دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ان تصانیف میں مصنف نے اپنا اصل چہرہ چھپانے کی کوشش کی ہے۔" اسی لئے جس طرح قدیم زمانے کے پیغمبروں اور صوفیوں اور ولیوں اور برگزیدہ ہستیوں کی شخصیت کے گرد انسانی تخیل نے ایک ہالہ سا اور خوبصورت نور بنا رکھا ہے اور مختلف صدیوں اور مختلف ادوار کے انسانوں نے ان کو اپنے زاویے سے دیکھ کر ان کی تصویریں بنائی ہیں اسی طرح بڑے شاعروں اور ادیبوں کی شخصیت کے ذاتی حالات اور ان کے کردار اور شخصیت کے بارے میں ہماری معلومات کا دائرہ محدود ہے ان کی تصویریں بھی صنم گری کی حدود میں آتی ہیں۔ گوتم بدھ، رام چندر، کرشن، مسیح، زرتشت اور دوسرے روحانی پیشواؤں کے مجسمے اور تصویریں ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں ہیں اور ان سب تصویروں میں اصل شخصیت سے زیادہ روایات اور تصورات اور کسی قوم یا کسی فرد کے اپنے ذہن کی پرواز کا عنصر نمایاں ہے۔ قدیم فلسفیوں اور شاعروں کے بارے میں بھی ہم زیادہ تر اسی صنم گری کے شکار ہیں۔ ہومر، کالیداس، فردوسی، دانتے، اور شیکسپیئر وغیرہ کی تحقیقات پڑھ کر ہمارے ذہن میں ان فنکاروں کے جو خدوخال ابھرتے ہیں وہ اصل سے کہاں تک مطابق ہوں گے یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو اکثر ذہنوں کو پریشان کرتا رہتا ہے۔ غالباً یہی جذبہ محرک بنا کر دنیا میں جو لوگ قوم و ملک اور آنے والی نسلوں

[illegible] ذاتی [illegible] شخصیت [illegible]
[illegible]
[illegible]

چند [illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] Subject [illegible]

(Data) [illegible] کی طرح [illegible] کے ساتھ [illegible] اپنے [illegible] کو ایک ایک تار [illegible] دیکھ [illegible] کھلا کر آ [illegible] دیکھو اس شخص کا تماشا دیکھو جس نے معاہدۂ عمرانی کی تشکیل کی ہے۔

اردو زبان میں سیرت و سوانح کی تاریخ ابھی سو برس سے بھی زیادہ کی نہیں ہے۔ "آبِ حیات" پہلی کتاب ہے جس پر محمد حسین آزاد نے قدما کے مشہور شعرا کی تصویریں کچھ اس چابک دستی سے بنائی ہیں کہ ہم انہیں اپنی آنکھوں کے سامنے چلتا پھرتا دیکھ سکتے ہیں لیکن صاحب آبِ حیات کے پاس ماضی کے شعرا کے بارے میں جو مواد تھا اس کی حیثیت "شنیدہ" کی سی تھی، اس میں آزاد کی طبع اور ذہانت نے اتنی رنگ آمیزی کی ہے کہ یہ نقوش دلآویز ہونے کے باوجود افسانہ طرازی کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ غالباً اسی لئے موجودہ دور کے ایک ذہین افسانہ نگار نے ایک بار لکھا تھا کہ اردو کے پہلے افسانہ نگار محمد حسین آزاد ہیں اور افسانہ لکھنے کا ڈھنگ میں نے "آبِ حیات" سے سیکھا ہے۔ خالص سیرت نگاری میں اولین حیثیت حالی کی ہے لیکن حالی نے "یادگارِ غالب" اور "حیاتِ جاوید" دونوں کتابیں اس اعتقاد کے ساتھ پیش کیں کہ ابھی ہمارے ملک کی اخلاقی حالت اس قابل نہیں ہے کہ بڑے آدمیوں کی تصویر کا ہر رُخ پیش کیا جائے یہی وجہ ہے کہ بعد میں چل کر جب

غالب کے سوانح نگاروں نے ان کی شراب نوشی، قماربازی، آزادہ روی سے بحث ضرور کی لیکن اس پہلو کو ہمیشہ ایک نقص سمجھ کر بیان کیا اور "غالب کے مرید" حالی، "یادگار" لکھتے وقت اتنا ہی کہہ سکے۔ شبلی نے علانیہ کہہ دیا تھا کہ حیات جاوید "کتاب المناقب" و مدح سرائی ہے لیکن خود شبلی کے سوانح نگار سید سلیمان نے اپنے ممدوح کی شبلی "بازیہ" کے معاشقوں اور شبلی کے واقعات کو چھپانے کی کوشش کی اور جب دوسرے لوگوں نے مختلف ذرائع سے شبلی کے پرائیویٹ خطوط کو مرتب کر کے شائع کیا اور حیات معاشقہ کے بعد نفسیات داں کر ادیب ماہر پرستاران شبلی بھی برہمی پر مجبور ہو گئے۔ شیخ عطاء اللہ نے جب اقبال نامہ مرتب کر کے اس کی پہلی جلد کی اشاعت میں اس بات کو روک دی گئی کہ اقبال کے عقیدت مندوں میں ایک کھلبلی مچ گئی اور کتاب سے ان خطوط کو خارج کرا دیا گیا جن سے اقبال کی شخصیت یا عظمت پر کوئی دھبہ آ سکتا ہو۔

اب ادھر کچھ دنوں سے ہمارے یہاں ادبیات کا یہ تصور تبدیل ہو رہا ہے۔ غالباً سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنا تجزیہ کرنے کی جرأت کی ہے اور کس حیثیت سے "اعمال نامہ" اس صنف ادب کا شاہکار ہے۔ اب نقوش کے ایڈیٹر محمد طفیل نے یہ فریضہ اپنے اوپر عائد کیا ہے کہ ہماری روایات کی رو سے ادبی شخصیتیں جو ہمارے درمیان موجود ہیں ان کے پیچھے پیچھے مختلف زاویوں سے ہر قسم کے انکشافات مرتب کریں اور وہ حضرات جو ہماری محفلوں سے رخصت ہو چکے ہیں لیکن ان کا کوئی نہ کوئی ہم صحبت اب بھی زندہ ہے ان کے سینے میں دفن کئے ہوئے سارے رازوں کو صدق اخلاص سے وہ بس دبے ہوئے خزانے کو باہر نکالے تاکہ وہ منظر عام پر آ جائیں۔ لیکن یہ کام ہے ذرا مشکل بڑے جان جوکھوں کا ہے۔ کیونکہ قدم قدم پر بال سے باریک راستے پر چلنا ہے اور قدم قدم پر مشاہیر کی تاریخ پیدائش، تاریخ وفات اور ان کے کارناموں کا بیان کر دینا اور ان کی معاملات کا حال مزے لے کر بیان کرنا اور اس طرح چالیس صفحے سیاہ کر دینا محض بے مضمون نگاری، سوانح کا سامان فراہم کر دے۔ ادب نفسیات داں کو شخص و عہد کے سمجھنے میں مدد دینے کا موقع دے گا لیکن اس سے اصل مقصد کہاں تک پورا ہوگا۔ یہ سوچنے کی بات ہے۔ لیکن مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں ہے۔

میں یہ کام ایمانداری سے کرنا چاہوں تو مجھے متعدد وجوہ سے ترک کرنا پڑے گا۔ اول تو یہ کہ جن لوگوں کے بارے میں میرے بہت سے نقوش و تاثرات ذہن پر ہیں ان کی حیثیت اس تصویر کی سی ہے جو اس کیمرے سے کھینچی گئی ہو جو قریب قریب زاویۂ تصویر سے باہر (Out of Focus) ہو۔ دوسرے یہ کہ بعض باتیں ایسی ہیں جنہیں بیان کرنے میں "خوف فساد خلق" کا اندیشہ ہے۔ میں ایک معمولی دنیا دار آدمی ہوں حق کا نعرہ لگا کے منصور کی طرح دار پر چڑھنے کا مجھ میں حوصلہ نہیں۔

طفیل صاحب کا اصرار ہے کہ میں علی گڑھ والوں پر قلم اٹھاؤں لیکن مجھے بار بار یہ احساس ہوتا ہے کہ علی گڑھ کی علمی ادبی شخصیتوں اور یہاں کے مشاہیر سے میرا واسطہ اس طرح پڑا ہے کہ کسی کو صرف دور سے سڑک پر چلتے پھرتے دیکھا ہے۔ کوئی صاحب نئی سائیکل یا خوبصورت کار میں میرے پاس سے گزر گئے ہیں۔ کوئی صاحب اسٹیج پر تقریر کرنے یا تحقیقی و علمی مقالہ پڑھنے آئے ہیں اور علم و ادب کا دریا بہا کر چلے گئے ہیں۔ کسی صاحب کے کلاس میں ایک طالب علم کا بھیس بنا کر کہیں پچھلی صف میں بیٹھا ہوا دیکھتا رہا ہوں۔ کسی کو کسی ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے گل افشانی گفتار کرتے اور اپنے احباب میں ہنستے بولتے دیکھ لیا ہے کسی سے بطور عقیدت ملنے گیا ہوں اور اس کے آراستہ ڈرائنگ میں ڈرا سہما بیٹھا رہا ہوں اور ہر وقت یہ اندیشہ لاحق ہو رہا ہے کہ کہیں کسی شیشے کی نازک شے سے ٹکرا جاؤں اور مجھے خفت اٹھانی پڑے۔ کسی کے پاس اپنی نوکری کے لئے سفارش نامہ یا کسی دوسرے بڑے آدمی سے ملنے کے لئے تعارفی خط لکھوانے گیا ہوں اور چند منٹ باادب باملاحظہ بیٹھ کر واپس آ گیا ہوں۔ گیارہ سال کی زندگی میں علی گڑھ کے ان صاحبان جاہ و جلال کے گھروں کے اندر جھانکنے کا بھی موقع نہیں ملا اور نہ ہی استری کئے ہوئے صاف ستھرے ملبوس سے ہٹ کر شب خوابی کے لباس یا لنگوٹ باندھ کر ورزش کرتے یا اپنے بیوی

[illegible]

[illegible]

[illegible] اسی طرح آباد [illegible] [illegible] علیم [illegible]

[illegible] کے [illegible] پہنچے [illegible] اپنے [illegible] ڈال دیتے [illegible] ایک [illegible] ہے جب

اس کی [illegible] تھی لیکن اس عرصے میں یہاں سے کیا کیا [illegible] اٹھے جنہوں نے اردو زبان ادب کا [illegible] اپنے قالب میں کر لیا۔

تہذیب الاخلاق اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی ترتیب و تدوین سید کے مبارک ناخنوں [illegible] ہوتی تھی۔ حالی نے مقدمہ شعر و شاعری [illegible] کے بنگلے پر بیٹھ کر لکھا تھا۔ شبلی نے [illegible] کے لکھے ہوئے [illegible] سرسید کے بنگلے [illegible] مرتب کیا تھا۔ نذیر احمد، ذکاء اللہ، محسن الملک، وقار الملک، وحید الدین سلیم اور [illegible] کی [illegible] سڑکوں پہ چلتے پھرتے [illegible] کے پاؤں کی آہٹ ابھی تک [illegible] کلاس روم میں آج [illegible] نظر آتے ہیں [illegible] کہیں عبد الحق، حمید الدین فراہی، محمد علی، شوکت علی، [illegible] علی، عبد الرحمن بجنوری، حسرت موہانی، فانی بدایونی، [illegible] ظفر علی خاں، اقبال سہیل، سجاد حیدر [illegible] طالب علم بن کر بیٹھے ہیں۔ [illegible] مولانا سلیمان اشرف، مولانا ابوبکر محمد شیث اور مولانا احسن مارہروی [illegible] علم و ادب کے [illegible]

[illegible] کے ساتھ ملاقاتیں کی ہیں لیکن جب انہیں اس حیثیت سے کوئی [illegible]
[illegible] احسان اللہ صدیقی، خواجہ احمد عباس، مجاز، جاں نثار اختر، [illegible] کے نام [illegible]
کردیے ہیں۔ اب کچھ ایک آوازیں یہاں گونج رہی ہیں۔

اس تحریر کا لکھنے والا آج سے گیارہ سال قبل ۱۹۳۸ء میں ایک کم سواد طالب علم کی حیثیت سے علی گڑھ میں داخل ہوا تھا [illegible] علی گڑھ کو تعمیر کرنے کے بعد بھی اسی بستی کا ہو [illegible] اس کی نسل [illegible] علی گڑھ کی مٹی کہاں سے [illegible] کہ اب [illegible] تلاش کے [illegible] وہ توفیق [illegible] خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں [illegible] ان کو دیکھنے والے ان کے بعد بھی ملیں گے [illegible] چہروں کو قدرے قریب سے دیکھا ہے ان کے بارے میں مختصراً لکھتا ہے۔

نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم

علی گڑھ اسٹیشن سے اترتے ہی سید کی بستی کی طرف جانے کے لئے [illegible] دو سڑکیں جاتی ہیں۔ ایک یونیورسٹی روڈ دوسری [illegible] اب اس سڑک کا نام تقسیم ہند کے بعد [illegible] روڈ ہوگیا ہے لیکن [illegible] صرف روڈ [illegible] ہوتے ہوئے بھی [illegible] روڈ ہی کہتے ہیں۔ مڑنے پر پہلے تو ایک فرلانگ آگے جا کر نواب چھتاری کی کوٹھی سے متصل [illegible] نواب صاحب مرحوم [illegible] کوٹھی کے مقابل ایک شاندار [illegible] عمارت ملے گی جس پر "حبیب منزل" کندہ ہوا ہے۔ یہ نواب صدر یار جنگ کی کوٹھی ہے۔ علی گڑھ میں اتنی وسیع اور پرشکوہ عمارت شاید ہی دوسری [illegible] نواب صدر یار جنگ بھیکم پور ضلع علی گڑھ کے رہنے والے تھے اور شروانیوں کے مشہور خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہاں انھوں نے [illegible] نام سے ایک بستی بسائی جس کا نام حبیب گنج [illegible] ان کا کتب خانہ جو ہندوستان کے نادر ترین کتب خانوں میں سے ہے دیکھنے [illegible] علی گڑھ کی اس کوٹھی کی تعمیر سے متعلق یہاں یہ روایت مشہور ہے کہ جس زمانے میں نواب صاحب مرحوم حیدرآباد میں صدر الصدور امور مذہبی کے مشیر اعلیٰ تھے اسی دوران میں ایک بار دربار نظام دکن کسی وجہ سے آپ پر عتاب نازل ہوا۔ وہاں سے علیحدہ ہو کر حبیب گنج چلے آئے اور اپنے علمی مشاغل میں مصروف ہوگئے لیکن نظام دکن نے جب محسوس کیا کہ انہیں اپنے اس رویہ پر نظرثانی کرنی چاہیے تو [illegible] سال کے بعد دوبارہ نواب صدر یار جنگ کو اسی عہدے پر مامور کیا اور اسی عرصے کی تمام [illegible] حیثیت عنایت فرمائی۔ اسی رقم سے نواب مرحوم نے "حبیب منزل" تعمیر کرائی اور وہاں سے سبکدوش ہونے کے بعد ان کا مستقل قیام علی گڑھ میں رہنے لگا۔ اب یہ مکان ہندوستان کے تمام مشاہیر علم و ادب کی جولاں گاہ تھا۔ نواب صاحب نہ صرف اس دور کے زبردست عالم اور صاحب تصنیف بزرگ تھے بلکہ ان کی شخصیت ایک ادارہ کی تھی۔ وہ مشرقی تمدن کا آخری اور بے مثال نمونہ اور علم و فضل کا مجسمہ تھے۔ ہندوستان کی کوئی قومی و مذہبی تحریک ایسی نہ تھی جس کے وہ روح رواں نہ رہے ہوں۔ ندوۃ العلماء، ایجوکیشنل کانفرنس اور علی گڑھ یونیورسٹی تینوں آپ کی قیادت سے مشرف ہو چکے ہیں۔ آخر عمر تک مسلم یونیورسٹی کی دینیات کی فیکلٹی کے ڈین بھی تھے۔ حسن اتفاق سے علی گڑھ آتے ہی مجھے مرحوم کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع مل گیا۔ میں بچپن ہی میں نواب صاحب کے علم و فضل اور ان کی عظمت سے واقف ہو چکا تھا۔ میرے والد مولوی محمد شفیع صاحب مرحوم نے علامہ شبلی نعمانی اور مولانا حمید الدین فراہی کے ایماء سے بیسویں صدی کے اوائل میں ایک عربی درسگاہ مدرسۃ الاصلاح کے نام سے سرائے میر (اعظم گڑھ) میں قائم کی تھی اور مسلمانوں کی معاشرتی و تمدنی اصلاح کے لئے ایک انجمن اصلاح المسلمین کی بنیاد بھی رکھی تھی اس درسگاہ سے نواب صاحب مرحوم کو بھی دلچسپی تھی یہی وجہ ہے کہ جب میں اعظم گڑھ سے علی گڑھ کے لئے روانہ ہونے لگا تو مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے مجھے نواب صاحب کے نام ایک تعارفی خط دیا اور یہ فرمایا کہ علی گڑھ جا کر سب سے پہلے نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہونا۔ اس زمانے میں نواب صاحب

[illegible] ... صاحب کے یہاں ... [illegible]
[illegible] ... نواب صاحب ... [illegible] ... اس وقت کے بعد ... [illegible]
[illegible] ... نواب صاحب کی شرافت ... [illegible]
[illegible] ... نواب صاحب کے یہاں تمام ... [illegible]
[illegible] ... وہاں ایک ... [illegible] ... صاحب کے ... [illegible]
کے یہاں جاتا ... [illegible] ... حضرت نواب صاحب کے یہاں ... [illegible]
اپنے مکانوں میں ایسی ... [illegible] ... اس معاملے میں کسی قسم کا فرق نہیں آیا۔

نواب صاحب کا جب بھی ذکر آتا تو علی گڑھ والے اس بات پر بہت افسوس کرتے کہ ان کے خاندان میں اب کوئی ان کی جگہ سنبھالنے والا نہیں آیا۔ مرحوم کے بڑے صاحبزادے غائب ہو گئے ہیں اور مستقل طور پر ... [illegible] ... دوسرے فرزند عبید الرحمٰن خاں صاحب شروانی آج کل ... [illegible] ... کے زیر ... [illegible] ... عبید الرحمٰن صاحب کے صاحبزادے جن کو نواب صاحب سے ... [illegible] ... عربی کے استاد ہیں۔ ان کو پڑھنے لکھنے سے مزید دلچسپی ہے ... [illegible] ... خدا کرے نواب صاحب کی روایات کو زندہ رکھنے میں کامیاب ہوں۔

سنہ ۱۹۵۰ء میں علی گڑھ ہی میں نواب صاحب کا انتقال ہو گیا۔ ایسے لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے مرنے سے مشرقی علم و فضل اور وضعداری کا آخری چراغ گل ہو گیا۔

مرحوم جہاں مذہبی علوم، تاریخ و فلسفہ اور فقہ اسلامیہ کے زبردست عالم تھے وہاں شعر و ادب کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ میر حسن کا تذکرہ اور دیوان خواجہ میر درد کی ترتیب و تدوین اور ان کے مقدمے ان کی یادگار ہیں۔ شاعر بھی تھے اور حسرت تخلص کرتے تھے۔ "کلام حسرت" کے نام سے ان کے کلام کا مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔ مرحوم کی خط و کتابت حالی و شبلی سے لے کر پچھلے دور کے تمام مشاہیر ادب اور علما سے تھی اور ان کے کتب خانے میں یہ ذخیرہ محفوظ ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی خلوت پسند طبیعت نے اپنے افکار و خیالات کے اظہار کے لئے مولانا شروانی کو اپنا مخاطب بنایا اور احمد نگر کے ایام نظر بندی میں جو خطوط لکھے وہ "غبار خاطر" کے نام سے شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ ان خطوط کی اشاعت نے نواب صدر یار جنگ کی شخصیت کو اور بھی دلکش بنا دیا اور ابوالکلام کا یہ حبیب سارے ملک کا حبیب بن گیا۔ کاش ہندوستان کے اہل علم مولانا شروانی کے نادر کتب خانے سے صحیح طور پر استفادہ کر سکیں کیونکہ اس مرحوم نے جس عرق ریزی سے یہ موتی چن چن کر اکٹھے کیے ہیں ان کی قدر و قیمت کا پہچاننا موجودہ نسل کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

خان بہادر شیخ عبداللہ

میرس روڈ پر میرس منزل سے چند ہی قدموں کے فاصلے پر ایک مکان ہے جس کا نام ہے عبداللہ [illegible] گرلس کالج کے احاطے میں ہے۔ اس میں [illegible] سال کے ایک [illegible] صحت کے بزرگ [illegible] ہوگی۔ انہیں علی گڑھ والے پیار سے "پاپا" کہتے ہیں۔ یہ شیخ عبداللہ ہیں [illegible] قوم کی تعلیم نسواں کے ابتدائی معماروں میں۔ سرسید نے جب علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم قائم کیا وہ تو صرف مردوں کی تعلیم [illegible] قدامت پرستوں نے ان کی مخالفت کی [illegible] دنیا کو معلوم ہے۔ ظاہر ہے [illegible] لیکن عورتوں کی تعلیم کے سلسلے میں [illegible] کی تعلیم کے لئے بنیاد ڈالنے کا [illegible] شیخ صاحب کے ہاتھوں ہوا۔ شیخ عبداللہ [illegible] کشمیری برہمن تھے [illegible] مشرف بہ اسلام ہو کر علی گڑھ کی درسگاہ میں داخل ہوئے تھے اور سرسید [illegible] تربیت [illegible] گرلس کالج کی بنیاد ڈالی اور تعلیم نسواں کی تحریک [illegible] خاتون [illegible] کے اس کام میں ان کی رفیقہ [illegible] نے بڑا ہاتھ بٹایا۔ سب سے پہلے خود شیخ صاحب نے اپنی [illegible] اور [illegible] کو [illegible] نہیں [illegible] مخالفت کا طوفان [illegible] ان کی صاحبزادی رشید جہاں نے [illegible] افسانہ نگاری شروع کی۔ [illegible] کے [illegible] نے اس طرز میں ان کا ساتھ دیا [illegible] افسانہ نگاری اور ترقی پسند [illegible] تحریک میں ایک [illegible] حیثیت [illegible] سجاد ظہیر [illegible] علاوہ ان دونوں میاں بیوی کی کہانیاں بھی ہیں جو قدامت پرستی کے خلاف بغاوت کا ہمارے ادبی سرمایے میں [illegible] دوسری صاحبزادی ممتاز جہاں تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد گرلس کالج کی پرنسپل ہو گئیں۔ انہیں سے علی گڑھ [illegible] خورشید جہاں بھی شیخ صاحب کی لڑکی ہیں جنہوں نے ایک زمانے میں [illegible] کے نام سے فلمی دنیا میں شہرت حاصل کی تھی۔ ان کے صاحبزادے محسن عبداللہ بھی ایک عرصے تک فلم سے وابستہ رہ چکے ہیں۔ محسن [illegible] بیوی یعنی شیخ صاحب کی بہو شاہدہ خاتون بھی فلمی دنیا میں چلی گئیں اور [illegible] کے نام سے اداکاری کے کمال دکھائے۔

مسلم گرلس کالج نے آہستہ آہستہ اپنے قدم جمائے اور ہزاروں مسلم خواتین اس کالج سے تعلیم پا چکی ہیں۔ عصمت چغتائی بھی اسی [illegible] کی پروردہ ہیں۔ ان کے بیشتر افسانے اور ان کا مشہور ناول "ٹیڑھی لکیر" یہیں کے مشاہدات پر مبنی ہے۔

شیخ صاحب باوجود پیرانہ سالی کے ایک دلکش شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کے چہرے پر ایک عجیب طرح کی نرمی اور معصومیت ہے۔ چہرے پر داڑھی نہیں ہے لیکن مونچھیں موجود ہیں۔ اب جھک کر اور آہستہ آہستہ چلتے ہیں۔ لڑکوں کی باتیں بڑے انہماک سے سنتے ہیں اور ضرورت مندوں کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے ہیں۔ وہ گرلس کالج کی تمام بچیوں سے باپ کا سا برتاؤ رکھتے ہیں اور اپنی بیٹی ممتاز جہاں کے کام میں اب تک ہاتھ بٹاتے ہیں۔ یونیورسٹی میں ہر سال سرسید کے یوم وفات کے موقع پر ایک جلسہ ہوتا ہے جس میں شیخ صاحب کا شریک ہونا ضروری ہے۔ اس موقع پر ہر سال وہ ایک تقریر کرتے ہیں اور سرسید کی باتیں کر کے آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں ان کی خدمات کے اعتراف میں ان کی جوبلی منائی گئی۔ اس سلسلے میں یونیورسٹی کے اندر اسٹریچی ہال میں بھی ایک جلسہ ہوا۔ شیخ صاحب نے جو تقریر کی اس کا ایک فقرہ بہت ہی دلچسپ تھا۔ طلبا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ "جس جگہ آج تم بیٹھے ہوئے ہو انہی کرسیوں پر کبھی پیچھے میں بھی بیٹھا کرتا تھا اور میری طالب علمی کے زمانے میں جب کوئی بڑا آدمی آتا تھا تو سوچا کرتا تھا کہ کیا کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ میں بھی اسٹیج پر آ کر تقریر

[illegible]

خان بہادر حبیب اللہ خاں

[illegible]

ڈپٹی صاحب اب کافی ضعیف و ناتواں ہو گئے ہیں۔ [illegible] ان کے بڑے بیٹے مولوی محمود الحسن صاحب [illegible] مولوی محمد [illegible] صاحب [illegible] اور ڈپٹی صاحب کے پرائیوٹ سیکرٹری بھی۔ [illegible] اور ترکی ٹوپی میں ملبوس ہوتے ہیں۔ نماز جمعہ کے بعد سر سید کے مزار پر فاتحہ پڑھتے ہیں [illegible] وقت تک مستند نہیں سمجھی جاتی جب تک ڈپٹی صاحب اس کی تصدیق نہ کر دیں۔ یونیورسٹی نے ان کی خدمات کے اعتراف میں انہیں [illegible] کی ڈگری بھی دی ہے۔

مولوی محمد مقتدیٰ خاں شروانی

یہ بزرگ بھی اسی سال کے لگ بھگ ہوں گے۔ نورانی داڑھی اور مقدس چہرہ، سر پر چوگوشیہ ٹوپی اور ہاتھوں میں پشمینہ کا بنا ہوا ایک جبہ۔

جس میں ان لوگوں کے کالمات چھپتے ہیں۔ یہ علی گڑھ کے "ذائقہ" ہیں۔ سر سید علیگڑھ میگزین کی ... اس کا انتظام مرحوم انہیں کے سپرد رہا۔ وہ جب انہیں مسلم یونیورسٹی گزٹ کی ادارت ملی تو آپ ہی کے سپرد ہوئی۔ ان کے کام اس مقدمے کے لئے ... جب وہ اپنی ادارت ہی کو مقدم ... یونیورسٹی پریس کی کتابیں کتابت و طباعت کے لحاظ سے بہت پہلے قائم کر چکی تھیں۔ نواب اسحق خاں مرحوم نے ایک زمانے میں ... کی طباعت کی ... آپ ہی کے اہتمام میں شائع کرتے تھے اور جس کام کے لئے ایک الگ شعبہ قائم ... ۔ مولوی عبد الحق صاحب ... دہلی سے نکالتے تھے تو اس کی طباعت علی گڑھ میں محمد مقتدی خاں شروانی کے اہتمام میں ہوتی تھی ... بھی ان کے اہتمام میں ... پریس میں چھپا کرتا تھا۔

فارسی و اردو کتابوں کی ... طباعت و اشاعت کے اہتمام کے علاوہ مقتدی صاحب خود بھی ... کے مالک ہیں اور متعدد علمی و تاریخی کتابوں کے مصنف ہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے کتب خانوں میں جو مخطوطات و نوادر ہیں وہ سب آپ کی نظر میں رہتے ہیں۔ اور اس پیرانہ سالی میں بھی وہ ان کی اشاعت اور ترتیب و تدوین کے منصوبے بناتے رہتے ہیں۔ ... میں جب ایم۔ اے کرنے کے بعد مسلم یونیورسٹی گزٹ کی ادارت کا کام میں نے سنبھالا تو اس کا بہت بڑا حصہ ... دفتر میں تشریف لاتے اور بڑی مسرت کا اظہار کیا اور اس کی ترتیب و اشاعت سے متعلق اپنے تجربات بیان کرتے رہے۔ اس وقت ... ایسا ... اب تک قائم ہے۔ اب بھی جب کہیں راستے میں نظر آ جائیں گے تو رک کر گھنٹوں باتیں کریں گے، اپنے تجربے سے کچھ کام کی باتیں بتائیں گے اور اپنے اشاعتی منصوبوں کی تفصیلات بتائیں گے۔ ان کے اس ذوق، شوق اور محنت کو دیکھ کر ہم نوجوانوں کو شرم آتی ہے۔

ایک زمانے میں علی گڑھ میں انجمن ترقی اردو کے اہتمام میں ایک اردو کانفرنس ہوئی تھی جس میں خطبہ دیتے ہوئے مولانا سید سلیمان ندوی نے محمد مقتدی خاں شروانی کی خدمات کو بہت سراہا تھا اور کہا تھا کہ یہ شخص واقعی اس قابل ہے کہ اردو زبان کی ایک اکیڈمی یا ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا جائے اور اس کی باگ ڈور ان کے سپرد کر دی جائے۔

محمد مقتدی خاں شروانی یہاں کے اخبار "علی گڑھ" اور "جمہور" میں مزاحیہ اور ظریفانہ مضامین بھی لکھتے رہتے ہیں۔ ان کا اچھا اسلوب نگارش ہے۔ ان مضامین پر "مکش" لکھا ہوتا تھا۔

وہ جب کسی سے باتیں کرتے ہیں تو ان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ کہے جائیں اور دوسرا ہمہ تن گوش ہو کر سنتا رہے۔ سننے والا اگر بے صبر ہے اور بیچ میں اپنی کوئی بات چھیڑ دیتا ہے یا انہیں کچھ بتانے لگتا ہے تو وہ فوراً ٹوک کر "معلوم معلوم" کہیں گے اور اگر اس پر بھی وہ بولتا رہے تو "معلوم معلوم معلوم" بہت تیزی سے کہنا شروع کر دیں گے۔ یہاں تک کہ وہ بے چارہ گھبرا کر خاموش ہو جائے گا اور پھر انہی کی سننے لگے گا۔

شروانی خاندان کے شجرہ اور اس کی تاریخ سے بھی آپ کو خاص دلچسپی ہے اور اس سلسلے میں کئی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ نواب مزمل اللہ خاں شروانی کی سوانح حیات بھی مرتب کر رہے ہیں اور آج کل جب ملتے ہیں تو سر موضوع سے اسی کا ذکر کرتے ہیں۔

منشی نجم الدین

چھوٹے قد کے ایک خستہ حال معمر بزرگ ہیں جن کی اہمیت سے علی گڑھ کے پرانے لوگ واقف ہیں۔ یہ سر سید کے ملازم تھے۔ ان کی وفا شعاری اور خدمت گذاری کی وجہ سے سر سید انہیں بہت عزیز رکھتے تھے اور پیار سے "میرا ٹٹو" کہا کرتے تھے۔ چنانچہ یہ نام ایسا چلا کہ اب تک انہیں "سر سید کا ٹٹو" کہا جاتا ہے۔ ان کے پاس سر سید، حالی، شبلی، محسن الملک، ذکاء اللہ، راس مسعود وغیرہ کی تصانیف موجود ہیں جو خود

[illegible] علی گڑھ [illegible] تھی۔ [illegible]
[illegible] ایک [illegible] صاحب [illegible]
[illegible] ایک [illegible] ہو گئے [illegible]
[illegible] علی گڑھ [illegible]
[illegible] ہیں۔

مولوی اکرام اللہ خاں ندوی مرحوم

بہت [illegible] خاں کے [illegible] ہوئے [illegible]
تھے۔ [illegible]
[illegible] صاحب [illegible] کے [illegible]
تھے [illegible]
[illegible] تھے [illegible]
تھے۔ [illegible]
انتقال ہوا اور یہیں سپرد خاک [illegible]۔

سلطان حیدر جوش

اُردو کے افسانہ نگاروں کے دورِ اولیں [illegible] میں [illegible] تھے۔ علی گڑھ کے گریجویٹ تھے [illegible] کے عہدے پر فائز رہے
[illegible] تھا لیکن ریٹائر ہونے کے بعد علی گڑھ میں سکونت اختیار کر لی تھی جس زمانے میں میں نے انہیں دیکھا ہے ان کی عمر کافی ہو چکی تھی
لیکن چہرے پر وہی [illegible] اقبال کی طرح [illegible] بیٹھے تھے اور لکھنے میں [illegible] مصروف رہتے تھے۔ [illegible] میں مصروف رہتے تھے
سر کے بال تقریباً غائب ہو چکے تھے اور داڑھی آخر عمر تک منڈاتے تھے۔ سنا ہے پہلے [illegible] کے قریب کہیں رہتے تھے لیکن
آخر عمر میں میرس روڈ کی ایک کوٹھی "حامد منزل" میں قیام پذیر تھے۔ ایک بار [illegible] صدیقی کے ساتھ ان سے ملنے گیا۔ [illegible] اندازہ ہوا کہ
تقریباً بہرے ہو چکے ہیں۔ صدیقی صاحب کان کے پاس چلا چلا کر ان سے کچھ باتیں کرتے رہے اور میں خاموش بیٹھا رہا۔ کئی سال ہوئے
علی گڑھ ہی میں انتقال ہو گیا۔ ان کے صاحبزادے [illegible] حیدر صاحب [illegible] اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے بعد میں پاکستان چلے گئے
اور اب سنا ہے کراچی میں ہیں۔ جوش صاحب کی [illegible] کتابیں [illegible] ہیں۔

ظفر عمر

"نیلی چھتری" اور "بہرام کی گرفتاری" کے مصنف ظفر عمر علی گڑھ کے پرانے گریجویٹ تھے۔ وطن [illegible] ضلع بلند شہر تھا۔ ان کے نام کے سلسلے
میں ایک روایت یہاں سننے میں آئی کہ اصل نام ظفر علی تھا۔ ان کے باپ کو کسی شیعہ بزرگ نے طعنہ دیا کہ حضرت آپ سنی ہیں لیکن "علی" کا

پیچھا نہیں چھوڑتے۔ ان کے باپ نے مختصر عمر تمام کیا۔ علی گڑھ سے فارغ ہونے کے بعد پولیس کے محکمے میں ملازم ہو گئے اور یہیں کا تجربہ نمایاں نظر آتا ہے۔ ان کے جاسوسی ناول اسی زمانے کے تجربات پر مبنی ہیں۔ ان ناولوں نے اچھی مقبولیت حاصل کی اور ان سے اچھی آمدنی ہوئی کئی ناولوں کے نام پر علی گڑھ میں انہوں نے ایک بڑا مکان بنوایا "منزل جعفری" ... تینوں لڑکیاں شمشاد ... سے شہر کی طرف جانے والی سڑک پر ہیں۔ "منزل جعفری" میں خود رہتے تھے۔ ایک بار دوسرے ... دیکھنے کا موقع ملا جب وہ ... مستقل ... پر ہی مقیم رہتے ... آخر عمر میں ... پنشن سے بس ... ہجرت ... تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے اور وہیں انتقال ہو گیا۔

پروفیسر عبدالعزیز میمن

اس وقت ہندوستان اور پاکستان میں جن مسلم الثبوت ادیب و محقق ہیں ... عربی ادب کے سلسلے میں آپ کا نام خاص طور پر عزت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ آپ کی بے شمار کتابیں ... حضرت ... تحسین وصول کر چکی ہیں۔ ہندوستان میں ... معدودے چند ... ادیب ... ہوں گے۔ میمن صاحب ... کے رہنے والے ہیں۔ تعلیم ... درسگاہوں میں ... حاصل کی ... کے نام ... تھے ان کے پاس ہے۔ مختلف ... خدمت ... سے مستعفی ... ہو چکے ہیں ... ان کی خست اور کنجوسی بھی میمن صاحب سے منسوب کی جاتی ہے ... آنے والا شخص پہچان بھی نہیں سکتا ... دبلا پتلا جسم ... ہلکی خشخشی داڑھی اور چوڑی ... پاجامہ ... ایک پرانی چھوٹی سی سائیکل ... ہوئے نظر آئیں گے۔ سائیکل پر ... بازار سے ... ضروریات کی چیزیں خود ہی کرائیں گے اور ... ایک ایک پیسے پر گھنٹوں تکرار کریں گے۔ ایک بڑا سا مکان بھی ... ہے۔ اور اس کے مختلف حصے کرائے پر اٹھا رکھے ہیں۔ کرایہ اس سختی سے وصول کرتے ہیں ... سود خوار پٹھان یا قرض بھی اس طرح نہ وصول کرتا ہوگا۔ نہ صرف روپے پیسے کے معاملے میں بلکہ علم کے معاملے میں بھی ان کا بخل اسی درجے کا ہے۔ ان سے کسی سلسلے میں استفادہ کرنا اور کچھ معلوم کر لینا یا اپنی ریسرچ کے سلسلے میں مدد لینا آسان کام نہیں۔ میرے علم کے مطابق اب تک اس مقصد میں محض ان کے شاگرد مختار الدین آرزو صاحب کامیاب ہوئے ہیں۔ مئی جون کی چلچلاتی دوپہریں میمن صاحب ان کو ریسرچ میں مدد دینے کے لئے بلاتے تھے لیکن آرزو صاحب کو بھی کام کرنے کی وہ دھن تھی کہ دو سال تک بلا ناغہ حاضری دیتے رہے اور کام ختم کر کے چھوڑا۔

میمن صاحب ویسے کافی ظریف اور بذلہ سنج آدمی ہیں اور ادھر ادھر کی باتیں خوب مزے لے لے کر کرتے ہیں جہاں کسی نے ذرا بھی کوئی علمی مسئلہ چھیڑ دیا تو فوراً لپیٹ گئے "ارے حضرت آپ کن دھندوں میں پڑ گئے چھوڑئیے اس کو بتائیے کشمیر کے سلسلے میں پاکستان نے اب کیا بیان دیا ہے؟" میمن صاحب کے مکان میں نہ تو کوئی آراستہ ڈرائنگ روم ہے۔ اور نہ ہی بیٹھنے کا کوئی کمرہ۔ کھری چارپائی پر بیٹھے ہوئے حقہ گڑگڑاتے رہتے ہیں۔ تمباکو بڑا اچھا پیتے ہیں اور طرح طرح کے تمباکوؤں کو ملا کر تجربہ کرتے رہتے ہیں۔ اپنے شاگردوں سے تمباکو اور امین آباد لکھنؤ میں کاکوری کے یہاں کی بنی ہوئی خوبصورت چلموں کی فرمائش کرتے ہیں۔ شام کو ان کی نشست احمدی نابینا اسکول

[illegible]

[illegible] ہیں۔

[illegible]

[illegible] ہیں۔

پنڈت حبیب الرحمن شاستری

[illegible]

جنہیں مولوی مشتاق حسین صاحب [illegible] اسسٹنٹ [illegible]

[illegible] کرتے ہیں [illegible] سے بہت کم ملتے ہیں

مولانا ضیاء احمد بدایونی

دیوان مومن کے شارح و مرتب مولانا ضیاء احمد بدایونی فارسی و عربی کے زبردست عالم و محقق اور اسلامی فقہ و تصوف فلسفہ و منطق اور عروض و بیان کے مسلم الثبوت ماہرین میں سے ہیں۔ آپ کا شمار ہندوستان کے ان چند علماء میں ہوتا ہے جن سے آئے دن ہمارے محقق و نقاد اور علمی و ادبی کام کرنے والے استفادہ کرتے رہتے ہیں۔ علی گڑھ میں جب کوئی علمی مسئلہ حل نہیں ہوتا تو مولانا کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اور وہ اسے باتوں باتوں میں پانی کر دیتے ہیں۔ یہاں کے ایک نوجوان اور ذہین ادیب مولانا کے تبحر علمی کے اس لئے قائل نہیں تھے کہ انہوں نے [illegible] کتابوں کی تصنیف نہیں کی ہے اور نہ کسی پیشہ ور مصنف کی طرح نام کمایا ہے۔ ایک بار یہی حضرت جو غالب پر ریسرچ کر رہے تھے۔ وہ فارسی کے

سخن شعراء کے تقابلی مطالعہ کے سلسلے میں اپنی ذات کے علاوہ ملک کے متعدد مشہور [illegible] جب مولانا کے پاس تشریف لے گئے تو مولانا نے چند غزلوں میں ساری دقتیں حل کر دیں اس کے بعد صاحب [illegible] لگتے تھے۔ وہ تو ایک شخص فیض قدس کا گھر ہے: اس تخلیہ میں جہاں ان صاحب کی ذات اور مولانا کے تبحر علمی کا پتہ چلتا ہے وہیں ان سے سچے اور چال ڈھال کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ پچاس سال سے زیادہ عمر ہو گی، تو زندگی آئی ہے۔ مشرقی وضع قطع اور چھوٹی سی [illegible] ہاتھوں میں چھڑی چلتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ [illegible] سب سے ہیں اور مسکراتے جا رہے ہیں۔

مولانا بدایوں کے ایک علمی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ شرافت و وضعداری اور [illegible] علم و [illegible] آپ کو ترکہ ملا ہے۔ مولانا جو ہمارے بیشتر علماء [illegible] کو [illegible] سے [illegible] پھر بھی نہیں گیا ہے۔ مولانا شبلی کے طرز کی نعتیہ نظمیں بھی لکھتے ہیں اور [illegible] ان کی نظموں کا مجموعہ "تجلیات" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ علی گڑھ کے [illegible] کے جلسوں میں رشید صاحب کے اصرار سے اپنی غزلیں ترنم سے پڑھتے ہیں۔ انہیں جب [illegible] معصومیت سے پڑھتے سنتا ہے تو بے ساختہ مرحوم حسرت موہانی کی یاد آ جاتی ہے۔

علی گڑھ میں اپنا ذاتی مکان [illegible] بیت الحبیب کے نام سے بنوایا ہے۔ مکتبہ قادری میں بیٹھے ہیں اور ہر وقت مطالعہ میں مشغول رہتے ہیں۔ افسوس ہے کہ ان کی اولاد میں بھی کوئی ان کا جانشین نظر نہیں آتا۔

خواجہ منظور حسین

علی گڑھ کے ان چند فرزندوں میں ہیں جن پر علی گڑھ نے ہمیشہ ناز کیا ہے۔ ان کے علمی وقار اور تنقیدی نظر کا نہ صرف ہندوستان کے ادیب اعتراف کرتے ہیں بلکہ انگلستان اور فرانس وغیرہ میں ان کا قول سند مانا جاتا ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ اور ای۔ ایم۔ فارسٹر جیسے مشہور [illegible] Elmira Fray [illegible] of Dream خواجہ صاحب کے نام معنون کی ہے۔ [illegible] نے چین کی بہترین کہانیوں کو پہلی بار اردو میں خواجہ صاحب کے ہی ایماء سے منتقل کیا اور انہی کے نام اپنی کتاب "زندہ چین" کا انتساب کیا۔ آل احمد سرور جیسے فاضل نقاد خواجہ صاحب کے تربیت یافتہ ہیں۔ ان کی کتاب "تنقیدی اشارے" خواجہ صاحب کے نام معنون ہے۔ پروفیسر وقار عظیم نے "نیا افسانہ" کے نام سے جو کتاب لکھی ہے اس میں بہت کچھ خواجہ صاحب کی رہنمائی کو دخل ہے جس کا انہوں نے اپنے دیباچے میں اعتراف کیا ہے۔

علی گڑھ میں خواجہ صاحب شعبۂ انگریزی کے صدر تھے۔ آکسفورڈ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے علی گڑھ کو اپنا مستقر بنایا تھا اور یہیں اپنا ذاتی مکان بدر باغ میں بنوایا تھا۔ ان کی شادی یہیں کے پروفیسر ایم۔ ایم۔ شریف (سابق صدر شعبہ فلسفہ) کی صاحبزادی سے ہوئی تھی اور اس طرح پر میاں افتخار الدین اور احمد شاہ بخاری پطرس کے ہم زلف ہوتے ہیں۔ دہلی کے شرفاء میں سے ہیں۔ ان کے اسلاف میں سے ایک باکمال شخص نو رجم صاحب گزرے ہیں جن کا ذکر اشرف صبوحی نے اپنی کتاب "دلی کی چند عجیب ہستیاں" میں کیا ہے۔

خواجہ صاحب خوبصورت آدمی ہیں۔ گورا چٹا رنگ، میانہ قد، [illegible] شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ عام طور پر پہنتے تھے۔ گفتگو میں انگریزی کا ایک لفظ بھی استعمال نہیں کرتے تھے۔ ان کی زبان دہلی کی خالص ٹکسالی زبان ہوتی تھی۔ ان کو میں نے صرف ایک بار انگریزی میں تقریر کرتے ہوئے سنا ہے۔ جب ای۔ ایم۔ فارسٹر علی گڑھ آئے تھے اور یونین ہال میں خواجہ صاحب نے ان کا خیر مقدم کیا تھا۔ شعبۂ انگریزی کی "ریڈنگ لٹریری سوسائٹی" میں خواجہ صاحب ہر سال کسی نہ کسی موضوع پر ایک دقیق مقالہ انگریزی میں پڑھتے تھے۔ اس مقالے کو سننے کے لئے لوگوں کو کتنا اشتیاق ہوتا تھا اور کتنے مشاہیر اس مجلس میں موجود ہوتے تھے اس سے علی گڑھ والے خوب واقف ہیں۔

[illegible] صاحب کے کئی مضامین [illegible] ایک مجموعہ شائع ہو چکا ہے جس کی بابت ذکر [illegible]
[illegible]

یہ وہ مضامین ہیں جن کے ساتھ وہ اس زمانے میں علی گڑھ میں [illegible] ہے کہ جب خواجہ صاحب یہاں تھے ان [illegible]
[illegible] خواجہ صاحب [illegible] آپ نے شعر [illegible]
[illegible] کے سبب [illegible] خواجہ صاحب سے [illegible]
[illegible] بڑی صاحب [illegible]
[illegible] خواجہ صاحب [illegible]

اسی دوران خواجہ صاحب نے کئی مستقل کتاب شائع نہیں کی [illegible] خواجہ صاحب [illegible] ہیں۔ وہ
[illegible] سے سب سے پہلے [illegible] اور [illegible] مستقل [illegible]
[illegible] اور اردو کے [illegible] خواجہ صاحب کے [illegible] دیکھے جا سکتے ہیں۔ [illegible]
[illegible] شائع نہیں [illegible] صورت میں شائع نہیں ہو [illegible] خواجہ صاحب [illegible]
[illegible] چیزوں سے [illegible] نہیں ہو سکتے۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی [illegible]
اشاعت کے لئے [illegible] یہی سبب ہے [illegible] کتاب [illegible]
اگر خواجہ صاحب کسی طرح چھپانے کے لئے آمادہ ہو جائیں تو میرا خیال ہے [illegible]
[illegible] کی گپ شپ اور ان کی باتیں سن کر علی گڑھ کے بہت سے طالب علم اور [illegible]
خواجہ صاحب کا [illegible] دیکھئے کہ وہ ایک جگہ سے نہیں بلکہ [illegible]
اپنی طالب علمی کے زمانے میں خواجہ صاحب علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر تھے۔ اس زمانے کے میگزین دیکھنے کے قابل ہیں۔
خواجہ صاحب کے اس دور کے مضامین اب بھی اچھے طرز انشاء اور [illegible] کی چیز ہیں۔ سجاد انصاری
صاحب کے عزیز ترین دوست تھے۔ اردو میں اپنی نوعیت کے اکیلے مصنف اور فکر انگیز مضامین [illegible] خواجہ صاحب کی تحریک سے [illegible]
گئے جنہیں خواجہ صاحب نے ان کی وفات کے بعد محشر خیال کے نام سے مرتب کر کے شائع کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر یہ کتاب [illegible]
مرتب ہو کر شائع نہ ہو گئی ہوتی تو آج اس جواں مرگ ادیب کو کوئی نہ جانتا۔

۱۹۴۷ء میں خواجہ صاحب پاکستان چلے گئے اور آج کل گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل ہیں۔ سنا ہے اقبال پر ایک [illegible]
لکھی ہے اور اسے شائع کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں۔ کاش وہاں کے لوگ [illegible] خواجہ صاحب سے [illegible]
[illegible] ہو جائیں۔

قاضی عبدالغفار

"لیلیٰ کے خطوط" کے جواں طراز اور جواں نگار مصنف جب تقسیم ہند کے بعد انجمن ترقی اردو (ہند) کے سیکرٹری ہو کر علی گڑھ تشریف لائے
ہیں وقت ان پر خزاں کا عالم تھا۔ صحت جواب دے چکی تھی اور طبیعت بجھ سی گئی تھی پھر بھی شائستگی و نفاست اور تہذیب و شرافت کا
[illegible] ان کو دیکھ کر کسی ایسے شخص کا گمان ہوتا تھا جو ابھی ابھی [illegible] آیا ہو [illegible] کا ہلکا سا نشان بھی نہ ہو۔ اپنے لباس

مسعود [illegible] کے مشورے سے قاضی صاحب بھی مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح ایک [illegible] ادیب [illegible] کے صحت نامزد [illegible] وضع پسند تھے اور [illegible] کے امیر۔ اقبال [illegible] بہ حد اور [illegible] سے کام لیتے [illegible] قریب [illegible] اس کی تجربہ کی اور ان کی شخصیت کا ایک جلوہ [illegible] ان کی نرمی اور [illegible] ضرورت اور [illegible] انجمن [illegible] وہ قاضی صاحب کی [illegible] زندگی میں [illegible] یہی وجہ تھی [illegible] صحت کے [illegible] بستر پر بیٹھے بیٹھے انجمن کا کام کیا کرتے اور [illegible] سے خطوط کا جواب خود دیتے۔ [illegible] اپنے ساتھ کام کرنے والوں کا اعتماد [illegible] نوجوان ادیبوں کی ہمت افزائی اور ان کے لئے ہر طرح [illegible] قاضی صاحب کا [illegible] کے دل میں پہلے [illegible] میں تقریر نہیں کی۔ آج سے کئی سال پہلے [illegible] میرا مضمون [illegible] تھا [illegible] بہت [illegible] یہی تعریف کی اور [illegible] فقط [illegible] تنقید کی ہے [illegible] ہی فقط نصرت [illegible] کے کلام [illegible] مرتب [illegible] انجمن سے شائع [illegible] انجمن کی [illegible] طرح سے طبع کراؤں گا۔ [illegible] مرتب [illegible] قاضی صاحب [illegible] صحت کا [illegible] زیادہ وقت [illegible] میں [illegible] انجمن کی [illegible] بت آئے۔

[illegible] ترقی پسند مصنفین کی طرف سے [illegible] قاضی صاحب [illegible] بازار شوق [illegible] کی آمد سے موقع پر [illegible] قاضی صاحب نے صدارت کی [illegible] گزشتہ کی امارت کا [illegible] ان سے ایک مضمون گزشتہ کے لئے لکھنے کو کہا۔ [illegible] قاضی صاحب نے یہ فرمائش پوری کی [illegible] کے [illegible] کے چند اساتذہ نے آج سے دو سال قبل ایک [illegible] رسالہ "فکر و نظر" کے نام سے شائع کرنے کی اسکیم بنائی اور اشاعت کے لئے [illegible] چندہ کیا۔ اس رسالے کے لئے قاضی صاحب نے سب سے پہلے چندہ دیا اور انجمن کی طرف سے "فکر و نظر" کے لئے اشتہار بھی دے دیا۔ [illegible] امارت کا [illegible] قاضی صاحب نے خود اپنے بیان کیا۔ اس موقع پر انہوں نے ایک پرتکلف دعوت بھی کی۔ [illegible] کے قریب [illegible] تھا اور [illegible] کرتا تھا۔ قاضی صاحب نے [illegible] چیزیں میری طرف بڑھا دیں [illegible] اپنی ضعیفی اور علالت کی وجہ سے مرغن غذائیں ہضم نہیں کر سکتا لیکن میں نے آپ نوجوانوں کی دعوت اس لئے کی ہے کہ خود آپ کو کھاتے دیکھ کر مجھے ایک تسکین سی ہوتی ہے۔ علی گڑھ میں ہر سال ایک آل انڈیا مشاعرہ ہوتا ہے۔ جس میں مشاہیر شعراء تشریف لاتے ہیں اس موقع پر قاضی صاحب کے یہاں ایک دعوت اور شعر و شاعری کی نشست ضرور ہوتی تھی۔ [illegible] علی گڑھ کے شعراء کو بھی [illegible] اتنی ستھری شعر و سخن کی بزم میں نے کہیں اور نہیں دیکھی۔

قاضی صاحب کا وطن مراد آباد میں تھا۔ علی گڑھ کالج کے تعلیم یافتہ تھے اس کے بعد صحافتی دنیا میں داخل ہوئے اور مولانا محمد علی کے ساتھ ہمدرد و کامریڈ میں اور پھر مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ کلکتہ میں کام کیا۔ خود بھی کئی اعلیٰ درجے کے اخبار نکالے جس میں "جمہور" اور "صباح" کلکتہ سے اور "پیام" حیدرآباد سے نکلا اور صحافت نگاری کی تاریخ میں ایک نمایاں مثال قائم کی۔ قاضی صاحب کے قلم سے ایک سطر بھی ایسی نہ نکلتی تھی جو ایک مخصوص طرز نگارش کی حامل نہ ہو۔ اس درجہ کے صحافی اردو زبان میں کم ہی گذرے ہیں۔

علی گڑھ میں ان کا قیام صاحبزادہ آفتاب احمد کی کوٹھی "آفتاب منزل" کے ایک حصے میں تھا۔ ان کے ڈرائنگ روم اور خوابگاہ وغیرہ میں جانے کا بارہا اتفاق ہوا۔ وہاں نادر ترین کتابوں کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد کی جوانی کی تصویر، سر [illegible] (جو قاضی صاحب کے خسر تھے)

[illegible]

[illegible]

ڈاکٹر ذاکر حسین

[illegible]

[illegible] ذاکر صاحب بڑے بڑے خیالات اور [illegible] مقصد [illegible]

[illegible] وہ [illegible] کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا [illegible] مستقل مزاجی سے [illegible] بہت [illegible] چھوٹے چھوٹے کام [illegible] چھوٹی چھوٹی [illegible] معمولی مطالبات ہیں انہیں حقیر سمجھ کر نظر انداز کر جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں جو شخص ان چھوٹے چھوٹے کاموں کے کرنے کا سلیقہ [illegible] نہیں رکھتا وہ بڑے بڑے کام بھی نہیں کر سکتا اور نہ ہی بڑی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔

ذاکر صاحب کی ایک اور چیز سے میں بطور خاص متاثر ہوں اور وہ ان کا لکھنے کا طریقہ ہے۔ ذاکر صاحب گرچہ پیشہ ور ادیب نہیں لیکن مزید تاہی کبھی کبھی مضمون یا خطبہ لکھتے لیکن ان کی ایک ایک سطر میں ان کا طرز نگارش عجیب جادو جگاتا ہے۔ میرا خیال ہے ذاکر صاحب ایک صاحب طرز ادیب ہیں اور ان کی اس خصوصیت کو ہمارے بڑے بڑے پیشہ ور ادیب اور نقاد نہیں پہنچے جنہوں نے ادب ہی کے لئے عمریں گزاری ہیں۔ ان کا لکھنے کا انداز خالص تخلیقی ادب کا سا ہے۔ عموماً اس وقت لکھتے ہیں جب پانی سر سے گزرنے والا ہو لیکن ان کی تحریر میں ایک

شخصیت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ [illegible] ذاتی [illegible] تعلق ہو [illegible]
خط کے ایک سینے [illegible] ۔ اگر اس پر [illegible] چھپا ہو [illegible] ملا۔ [illegible]
ہے [illegible] شعبہ [illegible] اپنا [illegible]
[illegible] سے [illegible] ان کی تقریر [illegible] جاتے تو [illegible] اور جب [illegible]
گفتگو میں خود [illegible] بیٹھا [illegible] کی مشق [illegible] ان کے [illegible]
ڈاکٹر صاحب [illegible]
پر بھی خاص [illegible] لکھتے ہیں [illegible] شعر و تصوف [illegible]
[illegible] اس موضوع [illegible] تقریر [illegible] لکھنے [illegible]
باتیں [illegible] کے [illegible] قسم [illegible] سے حاصل [illegible]
سے متعلق کسی کی باتیں سن کر [illegible] شخص سے [illegible] پوچھنے کے بعد [illegible]
دیکھا [illegible] کسی [illegible] ڈاکٹر صاحب [illegible] نہیں ہیں۔

علی گڑھ کے استعداد [illegible]
محمد حبیب، ڈاکٹر [illegible] سے [illegible] نہیں جاتے [illegible]
نہیں ہیں اور اگر [illegible] ڈاکٹر صاحب نے [illegible] موجود [illegible] ان کے [illegible]
کرنے [illegible] رشید [illegible]
یہاں کے استاد ان کے [illegible] نسلوں کے لئے کچھ نہیں چھوڑنا چاہتے

رشید احمد صدیقی

رشید صاحب کے مضامین [illegible] زمانے میں چل گیا تھا جب میں [illegible] اسکول کا طالب علم تھا اور [illegible]
کہ ان کے مضامین علی گڑھ کے بارے میں پڑھ پڑھ کر میں علی گڑھ کا گرویدہ ہو گیا تھا اور یہی مضامین مجھے یہاں کھینچ کر لائے۔ رشید صاحب کی تصویر
مضامین رشید میں دیکھ چکا تھا اور ان کی شخصیت کے بارے میں ذہن طرح طرح کے نقوش بناتا رہتا۔ [illegible] سے [illegible]
پرنسپل بشیر احمد صدیقی صاحب نے جو رشید صاحب کے عزیز اور [illegible] جانی تھے مجھے تعارفی خط دیا لیکن علی گڑھ میں اس تعارفی خط کا رشید صاحب
پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا سوائے اس کے کہ انھوں نے کہا کہ میرے پاس صرف اسی [illegible] آ جائیے گا۔ جب آپ کو ذیلی سوسائٹی سے قرض کی ضرورت
ہو۔ اس قرض کی مجھے کئی بار ضرورت پڑی اور رشید صاحب کے یہاں جانا پڑا۔ گھر پر بار بار جاتا اور واپس آ جاتا کیونکہ اول تو مکان اس قدر
[illegible] ہے کہ دروازے سے گھر کے اندر باوجود چلانے اور دروازہ کھٹکھٹانے کے آواز نہ پہنچتی دوسرے یہ کہ اگر کوئی لڑکا یا مالی برآمد بھی ہوا
تو اس نے فوراً جواب دیا کہ رشید صاحب گھر میں نہیں ہیں۔ ناچار پھر شعبۂ اردو کا چکر لگاتا اور وہاں بھی موجود نہ ہوتے تو شعبۂ اردو کے
چپراسی میاں خاں کی ہدایت کے بموجب بشیر الدین صاحب لائبریرین کے کمرے میں جاتا۔ یہی اکثر کامیاب ہوتا اور رشید صاحب بغیر کچھ [illegible]
جاتے اور درخواست پر رقم مطلوبہ کی منظوری لکھ کر مجھے کہتے کہ اسے خاں صاحب (عبد المجید خاں آفس سپرنٹنڈنٹ ذیلی سوسائٹی) کے پاس
لے جائیے۔ چنانچہ اس کے بعد ذیلی کے فارم کی خانہ پُری اور رقم کی ادائیگی کا چٹ حاصل کرنے میں خاں صاحب کے مرہون [illegible]

[illegible] ایک [illegible] کی [illegible] ہے [illegible]

[illegible] کی صلاحیت [illegible] ہے۔

رشید صاحب کی شخصیت [illegible] ہے [illegible]

[illegible] رشید صاحب کے جیسے کوئی [illegible]

رشید صاحب [illegible]

[illegible] رشید صاحب [illegible]

[illegible]

رشید صاحب سے قریب آنے کے بعد [illegible] ان کی شخصیت میں [illegible] کرنے لگا۔ [illegible] ایک مزاح نگار ہیں۔ [illegible] حیثیت سے نہیں تھا۔ میرا ارادہ فلسفہ یا معاشیات میں [illegible] کرنے کا تھا۔ [illegible] رشید صاحب [illegible] ذہین [illegible] معلومات چاہے امتحان کے لئے کام نہ آتیں لیکن زندگی [illegible] رشید صاحب [illegible] کے بستان [illegible] رشید صاحب کی گل افشانی گفتار دیکھنے کے قابل ہوتی۔

رشید صاحب کی ایک خصوصیت کا میں نے اندازہ لگایا [illegible] ہر طرح ساتھ دیتے ہیں چاہے وہ کتنی ہی غلطیاں کرے اور غیر ذمہ داری کا مرتکب ہو۔ اس [illegible] ڈپارٹمنٹ کے چپراسی میاں خاں [illegible] صاحب [illegible] اساتذہ اور طالب علم بھی شامل ہوتے۔ وہ کہتے ہیں کہ میرے دوست کے مقابلے میں اگر حضرت جبریل بھی آسمان سے اتر کر آئیں تو میں دوست ہی کی حمایت کروں گا۔
رشید صاحب صحیح معنوں میں ایک تخلیقی فنکار ہیں۔ [illegible] زیادہ ان کی توجہ زندگی کے مشاہدات پر ہوتی ہے۔ [illegible] انسانی ذہن کو [illegible] احساس [illegible] اور قوت [illegible] ان [illegible] بہت زیادہ

ڈاکٹر [illegible] کے ساتھ [illegible] کی تحقیق [illegible] ہیں۔ [illegible] سے [illegible] کی [illegible] ہے [illegible]
[illegible] کی [illegible] کی [illegible] کا [illegible] رکھتا ہے [illegible]
[illegible] کتب [illegible] ہیں [illegible]
[illegible] ہیں [illegible] کے [illegible]
صاحب [illegible] جاتے ہیں۔

[illegible] صاحب [illegible] دیکھتے ہیں [illegible]
[illegible] ہیں [illegible] بھی [illegible]
[illegible] ہیں۔

رشید صاحب [illegible] ہیں [illegible]
[illegible] ہیں [illegible]

ڈاکٹر عبد العلیم

ڈاکٹر عبد العلیم [illegible] ہیں [illegible] شخصیت [illegible]
سوچنے [illegible] کے جسم کا ایک [illegible]
ہوتا ہے [illegible] خوبصورت [illegible]
[illegible]
وہ کسی مجلس میں بیٹھے [illegible] ہوتے ہیں [illegible] قیمت [illegible]
ہوتے ہیں [illegible] بیٹھے [illegible] باتیں کریں گے [illegible]
علیم کا اصل جوہر ان کی تقریر [illegible] تنقید و بحث [illegible]
[illegible] کے بارے میں [illegible] ہو سکے۔

ڈاکٹر علیم یونیورسٹی میں شعبہ عربی کے صدر [illegible] علوم اسلامی کے نگران [illegible] درست نہیں [illegible]
ادیب یا محقق ہیں جیسا کہ علامہ عبد العزیز [illegible] صاحب نے جرمنی سے عربی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری [illegible] ڈاکٹر صاحب [illegible]
درحقیقت وہ ایک ماہر تعلیم ہیں اور انہوں نے کسی ایک موضوع میں اختصاصی حیثیت حاصل کرنے کے بجائے اپنے علم کا دائرہ وسیع رکھا۔
یہی سبب ہے کہ انہیں فلسفہ و نفسیات، تاریخ و معاشیات، سیاسیات و علم مدن، شعر و ادب، اور لسانیات پر یکساں عبور ہے اور ان پر
سے ہر ایک پر بڑی پختگی سے [illegible] سکتے ہیں۔ انہوں نے اردو میں بہت کم تنقیدی مضامین لکھے ہیں لیکن یہ مضامین اپنی گہرائی اور جامعیت
کے اعتبار سے بڑی بڑی کتابوں پر بھاری ہیں۔ آج اردو میں کوئی ایسا ادیب نہیں جو اتنے کم صفحات لکھنے کے باوجود ادبی دنیا میں اتنی وقعت و
احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو۔

تنظیمی صلاحیت اور کسی ادارے کی نگرانی و رہنمائی کے لئے علیم صاحب بہت موزوں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب سے انہوں نے علی گڑھ
میں شعبہ عربی کی باگ ڈور سنبھالی اس کے نصیب جاگ گئے اور اس وقت سارے شعبوں میں یہی شعبہ سب سے زیادہ ترقی کر رہا ہے اور

[illegible]

آل احمد سرور

[illegible]

[illegible]

شعر و شاعری کے اعتبار سے سرور صاحب خوش انداز [illegible] قد [illegible] شیروانی [illegible] چہرہ [illegible] [illegible]

[illegible] انسٹی ٹیوٹ [illegible] پروفیسر [illegible] کے علاوہ قاضی عبدالغفار مرحوم کے بعد انجمن ترقی [illegible] اس میں شک نہیں [illegible] ہو رہا ہے۔

علمی تنقیدی مضامین کے علاوہ آل احمد سرور صاحب نے پھر شاعری کی طرف توجہ کی ہے اور پچھلے سال اپنا مجموعۂ کلام "ذوقِ جنوں" شائع کر چکے ہیں۔ اب مشاعروں میں بھی شرکت کرنے لگے ہیں اور اپنا کلام تحت اللفظ سناتے ہیں۔

معین احسن جذبی

جذبی صاحب ۱۹۴۲ء میں اُردو میں ایم اے کرنے کی غرض سے علی گڑھ تشریف لائے ایم اے کرنے کے بعد کچھ دنوں کے لئے

[illegible] آج کل دہلی میں نائب مدیر کی حیثیت سے کام کرتے ہیں لیکن ۱۹۴۰ء میں مستقل طور پر [illegible] ۱۹۴۱ء میں شعبۂ اردو میں لکچرر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہو گیا۔ میں اسی سال [illegible] جذبی صاحب کی شاعری کا بہت دنوں سے پرستار تھا اور انہیں دیکھنے اور ان سے ملنے کی بڑی آرزو تھی۔ کچھ دنوں تک [illegible] کے واسطے [illegible] کے توسط سے میں جذبی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جذبی صاحب سے ملنے کے بعد تھوڑی دیر کے لئے میرے ذہن کو کچھ دھچکا سا لگا کیونکہ میں نے ان کی جو خیالی تصویر بنا رکھی تھی وہ اور کچھ تھی۔ ان کی شخصیت اور ان کے طرز گفتگو سے مجھے کچھ مایوسی سی ہوئی لیکن چار چھ ملاقاتوں میں یہ احساس ہونے لگا کہ جذبی صاحب ایک سیدھے سادے بے تکلف اور مخلص آدمی ہیں وہ اپنے ملنے والوں پر اپنی شاعری یا اپنی قابلیت و ذہانت کا رعب نہیں جماتے اور نہ ہی اس پر اپنی شخصیت کو مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں جو آدمی اچھا اور معقول نظر آتا ہے خوش دلی سے دوستانہ اور برابر کی سطح پر تعلقات پیدا کر لیتے ہیں۔ چاہے وہ طالب علم ہی کیوں نہ ہو اس کے لئے چائے منگاتے ہیں اور سگریٹ پیش کرتے ہیں اور بے دھڑک پوچھ بیٹھتے ہیں "کہیے حضرت کوئی عشق وشق بھی" وغیرہ وغیرہ۔ ان کی اسی طرز ادا نے بہت جلد علی گڑھ کے نوجوانوں کو جو ادب کی دنیا کے پیاسے تھے آہستہ آہستہ ان کے گرد جمع کر دیا۔ اختر [illegible] مرحوم، قاضی سلیم، صفدر عباس نیبی، سید منہاج الدین، نور بخش نادری، ریاض الدین قیصر، باقر مہدی، مقصود حسینی۔ ہم سب کی ایک ٹولی سی بن گئی اور کچھ دنوں میں جذبی صاحب کے ایما سے اور ان کی رہنمائی میں ہم لوگوں نے یہاں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی [illegible] صاحب اس کے پہلے سکریٹری منتخب ہوئے۔ وہ زمانہ واقعی عجیب زمانہ تھا۔ نئی نئی کتابوں اور نئے رسالوں کی تلاش رہتی اور جذبی صاحب کی ڈاک میں کوئی چیز آتی ہم سب اسے چاٹ جاتے۔ لکھنے کا جنون تھا اور [illegible] کے [illegible] سیاہ کئے جاتے۔ انجمن کے جلسے المرا میں ہوتے جو اس زمانے کا ایک خوبصورت ریستوران تھا۔ ہر جلسے میں حاضرین کی چائے، برفی اور نمک پاروں سے تواضع کی جاتی۔ جذبی صاحب کی وجہ سے انجمن کے ہر جلسے میں خواجہ منظور حسین صاحب تشریف لاتے، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی، ڈاکٹر مسعود حسین اور [illegible] انصاری وغیرہ بھی آنے لگے۔ باہر سے مولوی عبدالحق صاحب، قاضی عبدالغفار، حیات اللہ انصاری، اختر حسین رائے پوری یا کوئی بھی ادیب آ جاتا تو جذبی صاحب اسے انجمن کے جلسے میں کھینچ لاتے۔ اس موقع پر ہم سب یوسف صاحب کو فوری جلسہ کے لئے [illegible] ممبروں کو اطلاع دینے کے لئے بڑے شوق سے سارا علی گڑھ چھان مارتے۔ اس زمانے میں یہاں کی انجمن ترقی پسند مصنفین ہی سب سے بڑا ادبی مرکز اور شعر و سخن کی نشست بن گئی۔ اس میں جو مضامین پڑھے جاتے، جو تنقیدیں ہوتیں اور جو جو بحثیں آپس میں ہوتیں [illegible] کئی دن تک یہ چرچا رہتا۔

جذبی صاحب ہم لوگوں کے یہاں بعض اوقات ہوسٹل میں پہنچ جاتے اور اس وقت جو بھی مل جاتا سب کے سب [illegible] کلب کے کمرے میں جہاں ان کا قیام تھا آتے اور اپنے نوکر خدا علی کو چائے بنانے کے لئے آواز دیتے اور پھر گپ شپ، شعر و شاعری اور شخصیات پر گفتگو چھڑ جاتی۔ جذبی صاحب شعر و ادب سے متعلق اپنے نظریات اور تخلیقی عمل سے متعلق اپنے ذاتی تجربات بیان کیا کرتے اور ہم لوگوں کو اپنی نظم و نثر کو زیادہ سے زیادہ مؤثر اور خوبصورت بنانے کے لئے مشورہ دیتے۔ ان کی گفتگو میں اکثر خواجہ منظور کے اقوال کا حوالہ ہوتا۔ کبھی کبھی مجاز، سردار جعفری، سبط حسن، مخدوم، اختر حسین رائے پوری، فیض، تاثیر، راشد، میراجی وغیرہ کا ذکر چھڑ جاتا اور پچھلی صحبتوں کا ذکر بڑے لطف سے کرتے۔ ان مشہور ادیبوں کی پرائیویٹ زندگی، ان کی آپس کی چشمکیں، ان کا خلوص و محبت اور ان کے ساتھ گزرے ہوئے لطیفے جذبی صاحب کا خاص موضوع ہوتے۔ اب یہ اندازہ ہوا کہ جذبی صاحب بہت ہی دلچسپ اور باغ و بہار آدمی ہیں، ان کے پاس اتنے تجربات اور اتنی باتیں ہیں کہ تمام زندگی ختم ہو جائے نہ آئیں۔ ان صحبتوں کے علاوہ [illegible] ہم [illegible]

[illegible]

[illegible] ... کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے ... [illegible] ... ایک ایسا مکان مل گیا ہے ... [illegible] ... بچوں سے بے انتہا پیار کرتے ہیں۔ ادھر کئی سال سے مسلسل ... [illegible] ... ہے جس کی وجہ سے شعر کہنے کی رفتار اور بھی کم ہو گئی ... [illegible] ... میں آ سکتے تھے غم جاناں اور غم دوراں۔ جذبی نے ایک تیسرا غم ایجاد کیا ہے ... [illegible] ... نے نجات حاصل کر لی ہے کیونکہ ... [illegible] ... مکمل ہو گیا ہے۔

اختر انصاری

جن لوگوں نے اختر انصاری کے رومانی قطعات اور "درد بھری" ... کی غزلیں پڑھی ہیں۔ وہ اختر انصاری کو دیکھتے ہیں تو یقین نہیں آتا کہ یہی ہیں۔ بھاری بھرکم آدمی ہیں اور اعلیٰ درجے کا سوٹ پہنتے ہیں اس لئے بادی النظر میں گمان ہوتا ہے کہ کوئی آئی سی ایس قسم کے آدمی ہیں۔ جس زمانے میں پہلی بار ان کے مکان احاطہ میڈیکل (?) ہاؤس میں ان سے ملنے کے لئے سید یوسف حسین کے ہمراہ گیا تو اختر صاحب مسلم یونیورسٹی سٹی ہائی اسکول میں ٹیچر تھے لیکن ان کا آراستہ ڈرائنگ روم اس پر گواہ (?) تھا ... کے شاہکار رنگا رنگ شیشے کی بنی ہوئی ... وضع اور فیشن کے فرنیچر۔ ایک قیمتی کتب خانہ جس میں ضخیم کتابیں اور تمام مشہور رسالوں کے مکمل فائل

دیکھ کر یہ حلقہ رہ گئے یعنی یونیورسٹی میں کسی شعبہ سے شعبہ پر [illegible] اس ملازمت [illegible] کیا تھا۔ [illegible] ایک [illegible] ٹیلیفونگ [illegible] بچے ہوئے [illegible] تھے اور دیکھتے ہیں [illegible] کے بعض اعلیٰ [illegible] بھی۔ اختر صاحب یونیورسٹی میں [illegible] کے لکچرر ہو گئے اور تعلق سے ایم اے [illegible] پڑھا تھا۔ اس زمانے میں [illegible] ہونے کا موقع ملا [illegible] ایک ہونہار شاعر کی حیثیت سے [illegible] اختر صاحب [illegible] کا شکار ہیں۔ [illegible] وہ [illegible] کے خواب دیکھا کرتے تھے اور اسی غرض سے [illegible] گئے ہوئے تھے [illegible] حالات کے انتقال سے خاندان کا شیرازہ بکھر گیا اور [illegible] ایم اے بھی نہیں کیا تھا [illegible] اسکول کی نوکری کے [illegible] ذکر [illegible] اختر صاحب نے اسے اچھے [illegible] اس طرح [illegible] اسکول کی [illegible] ان کی تحقیق ایک تقریباً ختم [illegible] ہو گئی اور [illegible] کامیاب ترین شاعر و افسانہ نگار اور تنقید [illegible] ادبی حلقوں سے غائب ہونے [illegible] اختر صاحب کو اس کا بہت احساس تھا لیکن ان کے مطالعے اور تحصیل علم میں کمی نہیں آئی [illegible] کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے [illegible] اسکول کے گمنام ٹیچر نے دنیائے علم و ادب کے شاہکاروں کا استیعاب [illegible] کیا ہے۔ [illegible] کے متعلق [illegible] بڑی بڑی یونیورسٹی کے اعلیٰ درجے کے پروفیسروں کے بس کی بات نہیں۔

یونیورسٹی میں آ جانے کے بعد اختر صاحب کی زندگی میں ایک گونہ تبدیلی ہوئی لیکن ابھی اس نئی عمارت کی پوری بنیاد بھی [illegible] اختر صاحب کی شعبہ اردو میں ملازمت ختم ہو گئی [illegible] ٹریننگ کالج میں انہیں ایک لکچرر شپ ملی تھی [illegible] انہوں نے بڑی [illegible] جانفشانی سے کام کیا اور کالج میں مقبولیت حاصل کی اور ایک مدت تک اس بات کی کوشش بھی کی کہ اپنے [illegible] جمع کر کے کھوئی ہوئی ادبی زندگی کو دوبارہ واپس لائیں۔ اس مقصد میں انہیں [illegible] بہت کامیابی ہوئی ہے اور ادھر کم ایسی چیزیں لکھی [illegible] گئے [illegible] نشان ہے [illegible] کے نام سے اپنی آپ بیتی بھی لکھ رہے ہیں جس کے بعض اجزاء سننے کا مجھے موقع [illegible] اس میں شک نہیں کہ مکمل ہونے پر یہ قابل قدر ادبی تحفہ ہوگا۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں

مسعود صاحب ذاکر صاحب کے بھتیجے اور قائم گنج کے پٹھان ہیں لیکن ان کے مزاج میں ایسی نرمی اور ٹھنڈک ہے جو [illegible] ہی ملتی ہے۔ وہ ہندوستان میں لسانیات کے چند مسلم الثبوت ماہرین میں سے ہیں اور اس موضوع پر پیرس سے ڈی لٹ۔ کر چکے ہیں لیکن ان تمام مرحلوں سے گزرنے کے بعد بھی وہ اس نرمی پر کوئی پردہ نہ ڈال سکے۔ ان کا مزاج خالص ہندوستانی ہے۔ ادھر انہوں نے اپنی شعری تخلیقات کا مجموعہ "دونیم" کے نام سے شائع کر دیا ہے اسے پڑھنے کے بعد میرا کچھ ایسا اندازہ ہے کہ ان کے کلام میں گیتوں کا حصہ سب سے زیادہ جاندار ہے اور "روپ بنگال" ان کی ایک کامیاب تخلیق ہے۔ مسعود صاحب نے ابتدا میں اپنی شاعری میں ہندوستانی کلچر کے چند عناصر کو سمونا اور ایک رسیلی زبان کا تجربہ شروع کیا تھا اس سے ادھر وہ کچھ ہٹ سے گئے ہیں لیکن اس طرز کو اگر پورے طور پر پھلنے پھولنے کا موقع ملے تو مسعود صاحب کے ہاتھوں اردو شاعری میں زبردست اضافہ ہو سکتا ہے۔ مسعود صاحب نے ہندی اور سنسکرت ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور بنگالی زبان سے بھی واقف ہیں اور یہ سارے اثرات ان کی شخصیت میں رچ گئے ہیں اس لئے اس نوع کی شاعری کے لئے ان سے زیادہ کوئی موزوں نہیں۔

مسعود صاحب [illegible] اچھی خاصی کتابیں ہیں۔ اور جیسا قلمی زمانہ [illegible] تھا۔ [illegible] صاحب [illegible]
اتنا مستقل [illegible] مستقل [illegible] مسعود صاحب کے حصے میں آیا ہے۔ [illegible]
[illegible] کسی [illegible] بات [illegible] ہوئے۔ اصل [illegible] شاید [illegible] نہیں ہے۔
[illegible] مسعود صاحب کی شخصیت [illegible] مسعود صاحب نے [illegible] کسی کو ذاتی [illegible]
[illegible] نہیں بتایا۔

مسعود صاحب [illegible] اور [illegible] وفات [illegible] کی [illegible]
[illegible] ہیں۔ [illegible] اور [illegible] ہوتے [illegible]
[illegible] ہیں [illegible] سے صاحب [illegible]
[illegible] پہلے [illegible] سمجھتے ہیں۔ [illegible]
[illegible] ہو گئے ہیں۔ [illegible] سے شامل نہیں [illegible] کے [illegible] ہیں۔ [illegible]
[illegible] کا [illegible] نہیں [illegible]

[illegible] ۱۹۰۰ء میں [illegible]

ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو

علی گڑھ میں آرزو صاحب کی شہرت پہلے پہل ان مضامین کے سبب ہوئی [illegible] تحقیقی رسالوں جیسے
سے [illegible] رسالوں میں شائع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ [illegible] معروف [illegible] [illegible]
[illegible] دنیا میں [illegible] کی تاریخ ادب اردو [illegible] ایک [illegible] تحقیق کا ذوق [illegible] صاحب [illegible]
[illegible] صاحب کی صحبت میں ملا۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز [illegible] سے ہوتا ہے جب [illegible] پٹنہ کے [illegible]
اس زمانے میں آرزو صاحب پٹنہ کے [illegible] ایک [illegible] شاعر کی حیثیت سے [illegible] ہوئے [illegible] مترجم [illegible]
[illegible] ہوتے۔ غزلیں [illegible] سے سابقہ پڑا [illegible]
[illegible] تحقیق کی طرف آ گئے۔ قاضی صاحب کا آرزو صاحب پر گہرا اثر ہے۔ [illegible] آرزو صاحب کو [illegible]
ان کی شخصیت کی مکمل تشکیل علی گڑھ آنے سے قبل ہو چکی تھی یہی وجہ ہے کہ یہاں آنے کے بعد آرزو صاحب کے [illegible] کام میں
کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ البتہ علی گڑھ میں انہیں اپنے کام کے لئے ایک وسیع میدان ملا اور [illegible] تحقیق کے نتائج [illegible] اشاعت [illegible]
کا موقع بھی۔ ان کا قول ہے کہ ایک جگہ [illegible] رہا [illegible]

آرزو صاحب بقول [illegible] زبردست "گورکن" ہیں۔ پرانی کتابوں اور قلمی نسخوں کی تلاش کا ایسا چسکا ہے جو کہیں بھی ساتھ
نہیں چھوڑتا۔ ایک بار اورینٹل کانفرنس [illegible] میں مجھے ان کے ساتھ شریک ہونے کا موقع ملا [illegible] موقع پر مخطوطات و نوادر کی ایک
نمائش بھی ہوئی تھی۔ اس وقت ان کا ذوق و شوق اور انہماک دیکھنے کے قابل تھا۔ مسلم یونیورسٹی کی لائبریری کا ایک ایک [illegible]
نے [illegible] ڈالا ہے اور یہاں کہیں کوئی قیمتی خزانہ دبا پڑا ہے۔ اس کی ان کو اطلاع ہے۔ ابھی دو سال قبل راک فیلر فاؤنڈیشن کے اسکالرشپ
پر عربی میں [illegible] یونیورسٹی گئے تو جرمنی، فرانس اور دوسرے ملکوں میں [illegible] سے متعلق [illegible] مواد [illegible]

آخر کار بہت کچھ ساتھ لے کر آئے۔ [illegible] آج کل میں ماہ نامہ "ہما" کا ایک مستند [illegible] کے [illegible] ہو اسی پریس میں [illegible] - جو تحقیق کی حد سے آنند کا قدیم ترین خط قرار دیا گیا ہے۔ یہ تو محض ایک روایت ہے۔ [illegible] بھی دریا کا [illegible] ہیں۔

باوجود محقق ہونے کے آنند صاحب خشک [illegible] قسم کے آدمی نہیں۔ ان کی شخصیت میں بڑی رنگا رنگی اور [illegible] لطف لینے کی بڑی صلاحیت ہے۔ محفلوں اور دعوتوں میں شریک ہونا، رقص، مصوری اور موسیقی کا ذوق بھی رکھتا [illegible] چاندنی راتوں میں ٹہلنا اور ریستورانوں میں بیٹھ کر احباب کے ساتھ نفیس چائے اور سگریٹ پینے کا سلیقہ بھی آنند صاحب کو آتا ہے۔ [illegible] صاحب کے اندر مزاح کی حس بہت بڑھی ہوئی ہے۔ وقت پر ان کے فقرے خوب سوجھتے ہیں۔ ان کی گل افشانی گفتار سے میں چند ہی واقف ہیں۔ جس زمانے میں مسلم یونیورسٹی گزٹ کا ایڈیٹر تھا اور میرا قیام [illegible] ہال میں تھا اسی زمانے میں [illegible] تعلقات بڑھے اور [illegible] قربت ہوئی کہ آنند صاحب مستقل میرے ساتھ قیام پذیر ہو گئے اور دو سال تک اسی طرح گزرے ہیں۔ [illegible] ایک ایک لمحہ [illegible] کا [illegible] ایک دوسرے کے سمجھنے میں گزرا ہے۔ [illegible] ہال روڈ پر میرا اور مشتاق حسین صاحب [illegible] کے ساتھ وابستہ ہو گئے تھے اور Paying Guest کی حیثیت سے رہنے لگے۔ [illegible] کی عجیب و غریب ہستیوں میں سے ہیں۔ ان کی شخصیت خدمت خود اپنی [illegible] میں ایک ادارہ سے کم نہیں۔ اگرچہ انہوں نے [illegible] کام نہیں کیا لیکن ان کے علم، ان کی ذہانت اور ان کی سوجھ بوجھ کے سب قائل ہیں۔ [illegible] ہے۔ وہ [illegible] کا خلوص، مہمان نوازی اور دوست نوازی ہے۔ [illegible] ہال روڈ پر تمام کی محفل جمتی تھی جس میں مشتاق صاحب [illegible] اور [illegible] آنند صاحب کے علاوہ [illegible] حنیف خاں [illegible] شامل [illegible] ہوتے۔ [illegible] اور دنیا بھر کے مسائل پر بحث مباحثہ ہوتا۔ ایسے موقعوں پر آنند صاحب کے لطیفے اور [illegible] محفل میں [illegible] ہوتے تھے۔ [illegible] باقی رہتا۔

[illegible] سے واپسی پر آنند صاحب نے ایک [illegible] مکان [illegible] لے لیا ہے اور اب [illegible] اہل و عیال کے مقیم ہیں۔ دو بچے طارق اقبال اور خالد اقبال بڑے پیارے ہیں۔

آنند صاحب مستقل مزاج سے آدمی ہیں۔ [illegible] اپنی [illegible] کا ایک شعر بھی [illegible] نہیں چھوڑا ہے اور ہر طرح سے کامیابیوں کی امید ہے۔

مسعود علی ذوقی

اختر انصاری صاحب کے [illegible] ایسے شخص ہیں جو ایک زمانے میں اپنی فطرت نگاری اور رومانی نظموں اور گیتوں کے لئے مشہور تھے۔ ان کی تخلیقات "ہمایوں" اور "نیرنگ خیال" میں بڑے اہتمام سے شائع ہوتی تھیں۔ انہوں نے شاعری کی بساط بہت جلد [illegible] دی۔ کوئی مجموعہ مرتب کر کے نہیں چھپوایا۔ اس لئے آج ادب کے طالب علم ان کا نام تقریباً بھول چکے ہیں۔ ذوقی صاحب ایک [illegible] اور [illegible] آدمی ہیں اور آج کل مسلم یونیورسٹی ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہیں۔ ڈرامے کے ڈائرکشن سے بھی شغف رکھتے ہیں چنانچہ ایک زمانے میں نیاز فتحپوری کے ساتھ مل کر ایک فلمی کمپنی کھولنے کی اسکیم بنائی تھی جو کامیاب نہ ہو سکی۔ فلم کے سلسلے میں کئی سال تک بمبئی میں قیام رہ چکا ہے اور متعدد فلموں کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر رہ چکے ہیں جن میں محبوب کی فلم "[illegible]" [illegible] بلادیں اور گزشتہ

[illegible] میں منظور صاحب [illegible] زیب [illegible]
[illegible] ہیں [illegible] کے [illegible]

ڈاکٹر محمد عزیز

تاریخ وسطی ہند کے مصنف ڈاکٹر محمد عزیز بہار شعبہ تاریخ کے استاد ہیں۔ ڈاکٹر [illegible] سے [illegible]
[illegible] سے شائع ہو چکا ہے
[illegible] صاحب ایک [illegible] مزاج [illegible] ہیں [illegible]
[illegible] اور [illegible] نہیں سکتے۔ [illegible] ہیں [illegible]
[illegible] ہیں۔ [illegible] سے پہلے [illegible] نہیں [illegible]
[illegible] ہیں۔ [illegible] ہیں [illegible]
[illegible] ہیں۔

اسلوب احمد انصاری

شعبہ انگریزی میں استاد ہیں اور خواجہ منظور حسین کے قریبی شاگرد اور تربیت یافتہ [illegible] خواجہ صاحب [illegible] اسلوب صاحب نے
[illegible] اور اس میں شک نہیں کہ خواجہ صاحب نے [illegible] اعتبار
سے اسلوب صاحب [illegible] اسلوب صاحب نے [illegible]
[illegible] سے تعلقات [illegible] متاثر [illegible] ہیں [illegible]
[illegible] حاصل [illegible] زندگی [illegible]
[illegible] شخصیت اور زندگی کے بعض نقوش [illegible] اسلوب صاحب [illegible] کا نام نہیں
[illegible] چند سالوں میں انہوں نے اپنے آپ [illegible] ہے۔ [illegible] ہیں [illegible]
[illegible] ہے۔ [illegible] اور قہقہہ لگانے لگے ہیں [illegible] شکایت ہے کہ
[illegible] گئے ہیں۔ [illegible] ہے۔ [illegible] اسلوب
صاحب آہستہ آہستہ کتابوں کے اس بھاری بوجھ کے نیچے سے نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں جس نے ان کی قابلیت [illegible] تو بے انتہا
اضافہ کر دیا تھا لیکن شخصیت کا سارا رس چوس لیا تھا۔ عنقریب انگریزی ادب کی [illegible] تعلیم حاصل کرنے آکسفورڈ جا رہے ہیں۔ امید
ہے وہاں یہ توازن مکمل ہو جائے گی۔

اسلوب صاحب ادب کے معاملے میں کسی رو رعایت کے قائل نہیں۔ خواجہ منظور کی طرح وہ ہر تخلیق کا معیار اور اس کی سطح دیکھتے ہیں اور اس کے تخلیقی عناصر اور رنگ و آہنگ سے متاثر ہوتے ہیں۔ ان کو خود بھی شہرت کی کوئی خواہش نہیں اور نہ ہی ان لوگوں سے بالکل مرعوب ہوتے ہیں جن کا ادبی دنیا میں ڈنکا بجتا رہتا ہے۔ اسلوب صاحب کے نزدیک ایسے لوگ ادنیٰ درجے کے اشتہار باز ہیں۔ ایک نوجوان ادیب کا ذکر ہو رہا تھا جو [illegible] سے اپنی تصانیف کی تعداد میں اضافہ کر رہے ہیں اور اپنی صلاحیتوں کو کسی ایک مرکز پر متعین کرنے کے

بہانے اپنے ذہن کو جیبوں کی دکان کی طرح چاروں کے مال سے بھر رہا ہے۔ اس کے نتیجے میں مضامین اور تبصروں کا ذکر چھوڑ اسلوب صاحب کا کہ صاحب جیسا ادیب یا انشاء نگار کے مال ہو جائیں گے جو دیدۂ ریزے منسلک ہو یا کسی مشہور رسالے کی نیچے سے ان کے تاکہ اس کے ذریعہ اپنی پبلسٹی کرا سکیں۔ یہ لوگ ادیب یا آرٹسٹ نہیں ادبی کباڑیے ہیں۔ در حقیقت اسلوب صاحب لکھتے لکھتے یہ دستبرداریت یا اس طرح کتاب کا مصنف بننے کی کبھی ہوس نہیں ہوئی۔ میری خواہش بھلا کیا ہے میں زندگی میں جو مضامین کتاب کیوں نہ چھوڑ جاؤں لیکن اپنے ضمیر کا خون نہ کروں۔

اسلوب صاحب نے بلاشبہ اپنے سارے مضامین میں محنت کا حق ادا کیا ہے اور ایک بار بھی اکثر ہاتھ سے جانے بار لکھنے لگے کہ ایک شاعر نے مجھ سے محض اس لئے بہت تعلقات بڑھائے کہ اس پر میں مضمون لکھ دوں۔ ورنہ اپنے مضمون میں عظمت عطا کروں جو خود ان کے اپنے خیال کے مطابق انہیں ملنی چاہئے۔ اس پر میں نے لب کر جتنی بھی اس طرح کا کام کرتا ہوتا تو ایسے ذی رتبہ لوگ بہت ہوتے ہیں جن کی تعریف اور قصیدہ خوانی کر کے یا شعر بنا کر مادی منفعت حاصل کر سکتا ہوں۔ میں نے آپ کا یہ انتخاب کیوں کروں گا۔

اسلوب صاحب ۱۹۴۳ء سے لکھ رہے ہیں۔ ان کا پہلا قابل ذکر مضمون رسالہ جامعہ میں "اقبال کا ذہنی ارتقاء" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اس عرصے میں کوئی اور پیشہ ور یا تجارتی ادیب و اشتہار باز ہوتا تو نہ جانے کتنی کتابیں اس کی بازار میں بکتیں لیکن اسلوب صاحب کا یہ حال ہے کہ برسوں میں کہیں ایک مضمون لکھیں گے اور اسے بھی بہت غور و فکر اور نظر ثانی کے بعد چھپنے کے لئے دیں گے۔ یہ کہ رسالوں میں ایک لمبے وقفے کے بعد ان کا کوئی مضمون شائع ہوتا ہے۔ زیادہ ان کا نام دیکھ کر عام قاری نظر انداز کر دیتا ہے یہ الگ بات ہے۔ لیکن کچھ نہیں چھپتی ان کا کوئی مضمون ایسا نہیں جو سرسری یا صحافتی انداز کا ہو۔ اسے اہل دل اور اہل علم نے ذوق سے پڑھا میرا خیال ہے اسلوب صاحب کی یہ روش انہیں ادب میں دیرپا مرتبہ دلائے گی۔ ان کی کتابیں چاند کی چاندنی ثابت ہوں گی۔

اسلوب صاحب کا وطن سہارنپور ہے اور آزاد انصاری کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک خوب صورت اور وفا شعار بیوی کے شوہر اور دو معصوم بچوں کے باپ ہیں۔ گھریلو زندگی پرسکون ہے۔

منیب الرحمٰن

آٹھ سال انگلستان میں رہنے اور وہاں سے فارسی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لینے کے بعد دو سال پہلے اپنی پرانی درسگاہ علیگڑھ میں وارد ہوئے جہاں سے انہوں نے فارسی کے علاوہ تاریخ میں بھی ایم اے کیا تھا۔ منیب صاحب جب علی گڑھ سے انگلستان گئے تھے تو اپنی شاعری کی وجہ سے مشہور تھے۔ انہوں نے اُردو شاعری میں جدید میلانات اور ہیئت کے نئے تجربوں کو آگے بڑھانے میں بڑا سرگرم حصہ لیا تھا لیکن واپس آئے تو اسکالر بن کر۔ شاعری سے زیادہ ریسرچ پر زور دینے لگے اور جب اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں ان کا تقرر ہو گیا تو وہ اور بھی آہستہ آہستہ شاعری سے دور ہوتے گئے۔ انہوں نے اپنے کلام کا کوئی مجموعہ مرتب نہیں کیا ہے۔ اپنی پچھلی نظموں کو ناقابل اشاعت سمجھتے ہیں اور نئی نظم لکھنے کی انہیں فرصت نہیں۔

منیب صاحب ایک دلکش شخصیت کے مالک ہیں۔ قد و قامت، جسم، رنگ اور چہرے کے نقوش ہر اعتبار سے علی گڑھ کی اصطلاح میں انہیں "سویٹ" کہا جا سکتا ہے۔ اپنے والد اکرام حسین صاحب ریٹائرڈ آئی جی اور اپنے بڑے بھائی حفیظ الرحمٰن صاحب ہیڈ میڈیکل آفیسر مسلم یونیورسٹی کے ساتھ اپنی خوب صورت اور شاندار کوٹھی "گل رعنا" میں رہتے ہیں اور اس کا ایک حصہ انہی کے لئے مخصوص

[illegible] ہے۔ [illegible] اور [illegible] کے معتقد ہیں۔ [illegible]
[illegible] قائم کر سکتے ہیں۔ [illegible] صاحب [illegible]
[illegible] کرتے تھے۔

ڈاکٹر عشرت حسین انور

فارسی اور فلسفہ میں ایم اے ہیں اور خیال کیا جاتا ہے [illegible] فلسفے [illegible] ڈاکٹریٹ [illegible] [illegible] گئے تھے جہاں [illegible] ہو گئے۔ [illegible] [illegible] اس کتاب سے [illegible] امتحان [illegible] حضرت [illegible] [illegible] تصانیف [illegible] [illegible] مشرق و مغرب کے [illegible] فلسفیوں [illegible] [illegible] اقبال کی مثنوی [illegible] خودی کا جواب [illegible]

عشرت صاحب ایک [illegible] ہیں [illegible] ہوتے ہیں۔ [illegible] مستقل [illegible] [illegible] زیادہ [illegible] [illegible] رہتے ہیں [illegible] حسن کا [illegible] M. [illegible] کہتے تھے۔ [illegible] [illegible] ہیں۔

ڈاکٹر محمد حسن

علی گڑھ میں تو [illegible] [illegible] [illegible] یونیورسٹی دونوں سے [illegible] وقت لکھنؤ کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ اصل وطن مرادآباد ہے اور [illegible] خاندان سے تعلق ہے۔ [illegible] تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد عرصہ تک صحافت کے پیشے میں رہے۔ [illegible] یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں استاد ہیں۔

محمد حسن صاحب ایک ذہین و طباع آدمی ہیں، وہ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں کے ادب پر [illegible] مقالات لکھتے ہیں۔ رقص، موسیقی، مصوری اور دوسرے فنون پر بھی مضامین لکھتے رہتے ہیں۔ ریڈیائی ڈرامے اور فیچر [illegible] پر تبصرے اور مختلف موضوعات پر تقریریں [illegible] لکھنؤ اور دوسرے ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر ہوتی رہتی ہیں۔ ہندی ادب کی تاریخ بھی لکھی ہے اور ہندوستانی جمالیات پر کام کرنے کا ارادہ ہے۔ علی گڑھ میں انہوں نے ایک اردو تھیٹر کی بھی بنیاد ڈالی جس نے پچھلے سال علی گڑھ میں اور یہاں سے باہر [illegible] مختلف [illegible] اسٹیج کیے۔ [illegible] خود ہی لکھتے ہیں، ڈائرکٹ کرتے ہیں اور اسٹیج پر ایکٹر کی حیثیت سے بھی آتے رہے ہیں ــــ محمد حسن صاحب ایک مرنجاں مرنج اور با اخلاق آدمی ہیں۔ لکھنؤ میں ان کی صحبتیں مجاز [illegible] اور شوکت صدیقی وغیرہ کے ساتھ رہتی تھیں۔ اس زمانے کے لطائف و ظرائف بڑے مزے سے سناتے ہیں۔ [illegible] علی گڑھ میں آنے کے بعد اگرچہ [illegible] لیکن [illegible] لکھنؤ کی نسبت یہاں زیادہ اچھی ہے۔

بہار کی چند ادبی شخصیتیں

شاہ ولی الرحمٰن کاکوی

* [illegible] نقوش سے [illegible] بہار سے [illegible] متعلق [illegible] مضمون [illegible]۔ انہوں نے موضوع کی وضاحت نہیں کی [illegible] بھی ادیبوں میں شامل ہیں یا نہیں [illegible] شعراء کو بھی اس فہرست میں شامل کر لیا ہے کیونکہ ادبیات میں شاعری بھی شامل ہے۔

مخدوم شیخ شرف الدین احمد بہاری

آپ کا نام تاج فقیہ [illegible] مخدوم [illegible] صاحب [illegible] یحییٰ منیری کے صاحبزادے تھے۔ شیخ [illegible] تذکرۂ شعرائے [illegible] شیخ شہاب الدین سہروردی (متوفی [illegible]ھ) [illegible] آپ کا مزار بھی درگاہ [illegible] میں [illegible] موجود ہے۔ مخدوم بہاری [illegible]ھ میں پیدا ہوئے اور [illegible]ھ میں وفات پائی۔ آپ [illegible] شاہ آباد اور [illegible] (چھوٹا ناگپور) کے جنگلوں اور پہاڑوں میں [illegible] ریاضت [illegible] آپ کی پیدائش منیر میں [illegible] ایک قصبہ ہے اور بہار شریف میں وفات پائی جہاں آپ کی درگاہ [illegible] خلائق ہے [illegible] ہر سال عظیم الشان عرس ہوتا ہے۔ آپ سے کچھ اردو اقوال بھی منسوب ہیں مثلاً [illegible] وغیرہ۔ لیکن آپ کے علم و فضل کا اصل تماشا آپ کے فارسی مکتوبات ہیں جن میں اسرار تصوف پر مدلل بحثیں ہیں۔ آپ علوم ظاہری و باطنی میں کمال رکھتے تھے۔ آپ کے علم زاد بھائی مخدوم شاہ شعیب (متوفی [illegible]ھ) نے مناقب الاصفیا کے نام سے ایک کتاب فارسی میں لکھی۔ آپ کا مزار شیخ پورہ (ضلع مونگیر) میں ہے۔

قاضی سید عنایت اللہ مونگیری (سال پیدائش ۱۰۰۵ھ) فتاویٰ عالمگیری کی تدوین میں شریک تھے۔ ملا غلام یحییٰ (متوفی [illegible]ھ) ضلع پٹنہ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کی قابلیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انہوں نے میر زاہد پر حاشیہ لکھا۔ یہ مرزا مظہر جان جاناں (متوفی [illegible]ھ) کے مرید تھے۔ اسی قبیل کے سیکڑوں علماء و فضلا بہار میں تھے جن کا ذکر نظر انداز کرتا ہوں۔

مرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی (۱۰۵۴ھ - ۱۱۳۳ھ)

مرزا بیدل [illegible]ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کی جائے پیدائش میں اختلاف ہے۔ کوئی بخارا کہتا ہے کوئی لاہور، کوئی دہلی، کوئی اکبرآباد۔

[illegible]

[illegible] بیدل کا پایۂ شاعری بلند ہے [illegible] فارسی [illegible] کے ساتھ [illegible] بیدل [illegible] غالب نے [illegible] بیدل کی [illegible]

[illegible]

[illegible]

بیدل [illegible] فلسفہ [illegible] بیان [illegible] ہیں [illegible]

نم است [illegible] کشد [illegible] / [illegible]

[illegible] / [illegible]

[illegible] / [illegible]

[illegible] / [illegible]

ز نشاط قدح مستی [illegible] رنگ می جوشد / [illegible]

تجدید ناز آشفتۂ رنگ لباس آئینت / بے پردگی [illegible] حسرت نقاب [illegible]

ہر جا بروں جوشیدۂ خود را بخود پوشیدۂ / [illegible]

کعبہ بکعبہ (?) [illegible] دیر / [illegible]

بیدل آں شعلہ کہ در بزم [illegible] گرم است / یک حقیقت ز ہر ذرہ آئینہ تاباں شدہ است

ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نرفت رنج خمار ما / چہ قیامتی کہ نمی رسی ز کنار ما بکنار ما

بیدل اردو میں بھی شعر کہتے تھے لیکن صرف دو شعر مشہور ہیں جن کو میر نے نکات الشعراء میں درج کیا ہے —

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم میں / اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم میں

جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا　　پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم ہیں

مولوی میر حسن متوفی [illegible] بیدل کے مذہب [illegible] فارسی میں شعر کہتے تھے مرزا محمد حسین قتیل متوفی [illegible] نے فارسی میں اردو شعراء کا ایک تذکرہ لکھا۔ شاہ کمال علی کمال متوفی [illegible] (مجمع [illegible])

کے بیٹے [illegible] تھے ۔ دیوان اردو کے علاوہ فارسی [illegible] ان کے مکاتیب کا مجموعہ ہے ۔ حضرت عشق عظیم آبادی کا انتقال [illegible] سے [illegible] دیوان کے علاوہ تصوف میں چند رسالے بھی تصنیف کئے ۔ یہ بزرگ مرزا محمد علی فدوی کے استاد تھے اور [illegible] سے [illegible] نے اصلاح لی تھی ۔ نواب علی ابراہیم خان خلیل عظیم آبادی متوفی [illegible] ایک [illegible] ادیب مورخ اور [illegible] کے گزرے ہیں۔ ان کا تذکرہ گلزار ابراہیم [illegible] اردو شعراء کا ایک بلند پایہ مستند تذکرہ ہے [illegible] خلاصۃ الکلام اور [illegible] ان کی تصنیف ہیں [illegible]

[illegible] دیا [illegible] ہے　　یہاں [illegible] کہتے ہیں وہاں [illegible] ہے

سید غلام حسین خان [illegible] بڑے پائے کے مورخ اور ادیب تھے ۔ انہوں نے [illegible] کئی کتابیں لکھیں جن میں سیر المتاخرین فارسی زبان میں ہندوستان کی تاریخ تین جلدوں میں ہے [illegible] کا ترجمہ انگریزی میں بھی ہو گیا ہے ۔ [illegible] حسین آباد پٹنہ [illegible] تھا ۔ یہ شاعر بھی تھے اور شیخ علی حزیں سے [illegible] کہتے تھے ۔ [illegible] عظیم آباد میں بھی اردو [illegible] سے [illegible] ہوتے تھے ۔ ان کا انتقال [illegible] میں ہوا۔ ان کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

نیست [illegible] آتش [illegible] را　　دل [illegible] را

[illegible] میں [illegible] کئی　　عمر [illegible] کی [illegible] میں کئی

بلبل کو [illegible] سے باندھیے　　بلبل [illegible] سے باندھیے

شیخ [illegible] عشقی عظیم آبادی نے [illegible] اردو شعراء کا ایک تذکرہ فارسی میں لکھا ۔ انہی کے شاگرد آغا حسین قلی خان عاشق عظیم آبادی نے دو جلدوں میں فارسی شعراء کا تذکرہ لکھا جس کا نام نشتر عشق ہے ۔

شیخ غلام علی راسخ عظیم آبادی

راسخ اردو زبان کے اچھے غزل گو اور مثنوی نگار تھے ، شاد عظیم آبادی نے لکھا ہے کہ راسخ [illegible] میں پیدا ہوئے لیکن [illegible] نہیں [illegible] [illegible] کی تحقیق ہے کہ [illegible] کے لگ بھگ پیدا ہوئے تھے ۔ [illegible] راسخ کا دیوان شائع ہوا تھا جو اب ناپید ہے ۔ انہوں نے فدوی سے اصلاح لی تھی مگر لکھنؤ جا کر میر سے مستفید ہوئے ۔ [illegible] میں وفات پائی ۔ انتقال سے چند سال قبل ایک رسالہ لکھا جس کا نام [illegible] ہے یہ رسالہ [illegible] غیر مطبوعہ ہے ۔ راسخ کے چند اشعار یہ ہیں ؎

[illegible] سے ہے بیتابی جی کو راہ نہیں کچھ بھاتا ہے　　دیکھئے کیا ہو [illegible] دل [illegible] ہے

عقل [illegible] ، امانت تو نہ آئی کچھ کام ،　　اب [illegible] اپنا کریں کے [illegible] سودائی کو

تا خواب مرگ ذکر تھا ان کا زبان پر ،　　نیند آئی ہمیں تو اسی داستان پر

نہیں ہوش [illegible] پر کچھ [illegible] شکست تو انہوں پہ ہے　　جنہیں [illegible] جلسے [illegible] بے خبری ہی

اشعار مثنوی

کیا کہوں آہ محبت کیا ہے　　کیا کہوں اس میں مصیبت کیا ہے

عشق [illegible] | [illegible]
[illegible] | [illegible]
[illegible] | [illegible]
[illegible] | [illegible]
[illegible] | [illegible]
[illegible] | [illegible]
[illegible] | [illegible]

[illegible]

[illegible] قصہ [illegible] ہے [illegible]

[illegible] کی نثر [illegible] کرتے ہیں ؎

[illegible] | [illegible]
[illegible] | [illegible]

اس سلسلے میں [illegible] شاہ [illegible] شاہ [illegible] غالب [illegible] کی کتاب [illegible] شائع ہو چکی ہے۔ شاہ [illegible] شوق [illegible] مثنوی [illegible] وغیرہ۔

سید فرزند علی صفیر بلگرامی (۱۲۴۹ھ - ۱۳۰۷ھ)

[illegible] پیدائش مارہرہ میں ہوئی۔ بچپن میں بلگرام آئے اور کچھ ہی دنوں کے بعد آرہ اپنے والد کے ساتھ چلے گئے، وہیں کے ہو رہے۔ [illegible] شاعر کی حیثیت سے [illegible] انہوں نے رشک اور [illegible] (تلامذۂ ناسخ)، غالب اور میر [illegible] سے اصلاحیں لیں۔ [illegible] کلیات شائع نہ ہو سکا۔ بہت پرگو شاعر تھے۔ [illegible] نثر نگاری میں خاص درجہ رکھتے تھے۔ رشحات صفیر، ترجمۂ بوستان خیال، چشمۂ کوثر، تحقیق اللسان، مردم دیدہ، اور جلوۂ خضر (تذکرۂ شعرائے اردو) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ کہنہ مشق استاد تھے اور شاگرد بنانے کا خاص شوق تھا۔ کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

خاک سے میری بگولا جو پیدا ہونے کو ہے | یہ غبار [illegible] آسمان ہونے کو ہے
بادۂ عشرت [illegible] جس نے جام لیا | [illegible] جرأت ساقی نے کی [illegible] تھام لیا
کسی حالت میں [illegible] نہیں نقصان رندوں کا | جو شیشہ ٹوٹ جاتا ہے تو پیمانہ ہو جاتا ہے

مولانا حکیم عبدالحمید پریشاں (۱۲۵۱ھ۔۱۳۲۲ھ)

آپ نہایت ذی علم بزرگ تھے۔ طبابت میں خاص مہارت حاصل تھی۔ [illegible] تھے۔ [illegible] میں آپ کے [illegible] بھی [illegible] کے [illegible] فارسی اور اردو [illegible] شعر کہتے تھے۔ شاد عظیم آبادی سے باہم قلمی جنگ رہی۔ آپ کے دو چار اشعار فارسی و اردو کے [illegible]

قیامت اعتماد [illegible] ہے تاب | بسکہ تجھ ناز [illegible] ہے تاب
دست بستہ [illegible] رسیدن کوتاہ | پائے بخشندہ [illegible] دویدن [illegible]
ہماری آنکھوں کو حاصل [illegible] جانتے ہیں | پریشاں کی پریشانی [illegible] سبب بنتے ہیں
مرگ مرگ [illegible] زندگی [illegible] | کون سی صورت میں بہبود چراغ کشتہ ہے

خان بہادر سید علی محمد شاد عظیم آبادی

آپ ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۲۷ء میں وفات پائی۔ عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم کے بعد آپ نے ابتدائے شباب ہی سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ [illegible] قدیم زبان کے لحاظ سے یقیناً قابل احترام ہیں۔ [illegible] جذبات و احساسات کی شدت و صداقت [illegible] شاعری کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ نے [illegible] ترک کر کے [illegible] رنگ تغزل اختیار کیا۔ آپ کا کلام [illegible] میں انفرادی شان نمایاں ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اب بھی اک عمر پہ جینے کا نہ انداز آیا
زندگی چھوڑ دے پیچھا مرا میں باز آیا

اسیر جسم ہوں معیاد قید لا معلوم
یہ کس گناہ کی پاداش ہے خدا معلوم

سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

چشم سیہ میں سرمہ دے زلف سیاہ میں شانہ کر
قتل جہاں کے واسطے تازہ پھر اک بہانہ کر

اہل ہوس بھی ہو چلے آئے حریف میکشاں
پیر مغاں الٹ دے خم بند شراب خانہ کر

وہ عالمگیر جلوہ اور وہ حسن مشترک تیرا
خدا جانے ان آنکھوں کو مری کس پہ شک تیرا

جہاں سے کھینچ [illegible] سے چھپ رہنا
بڑا گناہ یہاں ہے الگ سب سے رہنا

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

نہ آئینے کا قصہ ہے نہ حال شانہ کہتے ہیں
حقیقت میں جمال یار کا افسانہ کہتے ہیں

تہ مکاں کی حد کب کوئی بشر سمجھا
اسی قدر ہے حیرت ہے جس قدر سمجھا

لیں حبابوں کا نہ دل توڑ خدارا اے موج
انہی قطروں کی بدولت تو ہے دریا تیرا

[illegible] مجھے سجدہ کا حوصلہ دیا
جس کی طلب تھی ساقیا اس سے کہیں سوا دیا

[illegible]

[illegible] ... شعر [illegible] ...

[illegible]

[illegible] ... بہت [illegible]

[illegible] ... شاعری [illegible]

[illegible] ... تنقیدی مضامین [illegible] ...

کتاب لکھی ہے جس کا نام [illegible] ...

ارشد [illegible] ...

سے آپ کے [illegible] ...

نواب نصیر حسین خیال ۱۸۶۴-۱۹۳۴ء

نواب نصیر حسین خیال عظیم آباد کے مشہور شاعر تھے۔ آپ نے ابتدائے شباب ہی سے [illegible] اردو [illegible] ۔ آپ نے ایک رسالہ ادیب [illegible] ۔ [illegible] آپ [illegible] شاعر [illegible] آخری سال [illegible] بند ہو گیا۔ آپ کو سیاسی و تعلیمی امور سے بھی دلچسپی تھی [illegible] ۔ [illegible] کی صدارت کی [illegible] ایک [illegible] خطبہ دیا [illegible] آپ نے [illegible] اردو زبان کی خدمت [illegible] ۔ آپ کی تصانیف میں [illegible] داستان [illegible] شائع ہو چکی ہیں [illegible] ۔ آپ [illegible] محمد حسین آزاد کا پرتو تھا اور آپ کی [illegible] ایک خاص درجہ [illegible] کے علاوہ آپ کے [illegible] مضامین [illegible] بھی قابل ذکر ہیں [illegible] آپ کا کلام [illegible] شائع ہو کر [illegible] ۔

سید عبدالغفور شہباز عظیم آبادی (متوفی ۱۹۰۸ء)

[illegible] سلطنت [illegible] ایک [illegible] اخبار جاری [illegible] تھا [illegible] ۔ [illegible] میں نواب [illegible] خان [illegible] سے پرنسپل [illegible] ۔ [illegible] بعد حیدرآباد پہنچے [illegible] ۔ [illegible] انجام دیتے [illegible] ۔ علامہ جمال الدین افغانی سے بھی [illegible] ۔ تصانیف و مضامین [illegible] ۔ [illegible] شہباز [illegible] کی ادبی صلاحیت بھی [illegible] ۔ [illegible] کے مضامین شائع ہوتے تھے [illegible] ۔ [illegible] نظیر کی سوانح عمری بھی [illegible] ۔ نواب [illegible] ۔ [illegible] ایک ادیب تھے۔ اُن کے [illegible] مضامین [illegible] چھپتے تھے۔ [illegible] شہباز نے خیالات آزاد کے نام سے شائع کیا [illegible] سوانح عمری بھی لکھی [illegible] خیالات شہباز [illegible] ۔ [illegible] شہباز نے [illegible] پر ایک نظم لکھی۔

کہیں [illegible]   کہیں [illegible] کا
غرض [illegible]   [illegible] زمینوں کا

[illegible]

شہباز کی ایک رباعی [illegible]

[illegible] نقش [illegible]   [illegible]
اک [illegible]   [illegible]

۱؎ مضمون سید شبیہ الحق صاحب [illegible]

خان بہادر سید ظہیر الدین احمد ۱۸۶۲ء - تخمیناً ۱۹۳۳ء

[illegible]

[illegible] ہو گئے۔

علامہ سید سلیمان ندوی ۱۳۰۲ھ - ۱۳۵۰ھ

علامہ [illegible] علامہ شبلی کے خاص تربیت یافتہ اور منشی تھے۔ [illegible] میں علامہ شبلی کی [illegible] ندوی [illegible] سیرۃ النبی [illegible] علمائے ہند میں سے [illegible] علمی حیثیت [illegible] مضامین اور تصانیف [illegible] شائع ہوئے [illegible] آپ کی تحریریں [illegible] تصانیف [illegible] سیرۃ عائشہ، خیام [illegible] خطبات [illegible] عربی زبان [illegible] مضامین لکھتے تھے۔

علامہ ندوی کے سلسلے میں مولانا سید [illegible] ایک عالم و ادیب تھے۔ [illegible] ضلع پٹنہ [illegible] جامعہ عثمانیہ حیدر آباد کے شعبۂ دینیات کے صدر رہے۔ آپ نے مذہبی، علمی، ادبی موضوعوں پر بہترین تصنیفات یادگار چھوڑے ہیں۔

مولوی مسعود عالم ندوی [illegible] عربی ادب [illegible] استعداد بہت اچھی تھی [illegible]

۱؎ آپ کے صاحبزادے سید [illegible] الدین [illegible] ان کی [illegible] پاکیزگی ذوق [illegible]

۲؎ [illegible] اسلوب کے [illegible] مضمون نگاری پر بھی قادر ہیں۔

سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد [illegible] میں [illegible] پہلے [illegible] میں ایک رسالہ جاری کیا جس کا نام [illegible] تھا۔ اس کے بعد وہ اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں شعبۂ عربی کے فہرست نگار مقرر ہوئے۔ انہوں نے انگریزی میں عربی کے مختلف مخطوطات کی فہرست کی ایک جلد مرتب کی جو شائع ہو چکی ہے۔ [illegible] ایک کتاب [illegible] شائع ہو چکی ہے۔ [illegible] کے سلسلہ میں [illegible] ساتھ قابل ذکر ہیں۔ [illegible] رسالوں میں شائع ہو چکی ہے۔ [illegible] ندیم اور [illegible] میں شائع ہوئے۔ ایک زمانہ میں [illegible] کے ایڈیٹر تھے اور کئی سال تک اس خدمت کو انجام دیا۔ [illegible] ایڈیٹر بھی رہے۔ آجکل [illegible] شمس [illegible] پٹنہ کے [illegible] ہیں۔

افسانہ نگاری میں بھی [illegible] ہے۔ شاعری صرف [illegible] ہے [illegible] محمد [illegible] سے ایک [illegible] شائع کیا جس کا نام [illegible] ہے۔ [illegible] کی اشاعت کی [illegible] علی سجاد عظیم آبادی کا ذکر بہت [illegible] ہے۔ [illegible] شاعر بھی تھے اور [illegible] [illegible] کی شادی [illegible] ہوئی تھی [illegible] افسانے بھی [illegible] ہیں [illegible] ان کی زبان [illegible] ہے۔

موجودہ دور میں [illegible] پروفیسر [illegible] ڈاکٹر [illegible] قابل ذکر ہیں۔ [illegible] عظیم آبادی [illegible] بھی [illegible] مختصر افسانے [illegible] رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں [illegible] بھی کرتے ہیں۔ [illegible] ممتاز اور [illegible] حیثیت کے مالک ہیں [illegible] ہے۔ ان کے [illegible] شائع ہو چکے ہیں۔ فن تنقید میں [illegible] تحقیق و تنقید [illegible] قابل تحسین ہیں۔ [illegible] رسالوں میں خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ [illegible] کے رہنے والے ہیں [illegible] نظمیں [illegible] شباب ہی سے لکھتے تھے۔ [illegible] ۱۹۱۲ء میں جب [illegible] سے جاری تھا [illegible] افسانے بھی [illegible] ندیم [illegible] شائع ہونے لگے۔ [illegible] افسانے [illegible] ہو چکا ہے۔ ایک کا نام [illegible] ہے۔

ڈاکٹر عظیم الدین احمد پی ایچ ڈی مرحوم۔

ڈاکٹر عظیم [illegible] نے بی اے تک تعلیم پٹنہ میں [illegible] عربی و فارسی میں کافی بصیرت رکھتے تھے۔ اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں شعبۂ عربی کے فہرست نگار مقرر ہوئے۔ اس کے بعد حکومت سے وظیفہ حاصل کر کے جرمنی گئے اور وہاں "لسانیات" میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لے کر ہندوستان واپس آئے۔ پہلے پنجاب یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ تقریباً ۲ سال کے بعد وہاں سے پٹنہ واپس آئے اور پٹنہ کالج کے شعبۂ عربی و فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ آپ علیگڑھ [illegible] پیش [illegible] ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر صاحب شاعر بھی تھے۔ آپ کی نظموں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے جس کا نام "گل نغمہ" ہے۔ اس میں آپ کے لائق [illegible] عظیم الدین احمد صاحب [illegible] ایک بصیرت افروز مقدمہ بھی شامل ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو قرآن پاک سے خاص ذوق تھا اور اس کا انہوں نے گہرا مطالعہ کیا تھا۔ قرآنی آیات اس قدر یاد تھیں کہ کلاس کے لیکچروں میں اور اپنی تقریروں میں برجستہ پیش کر دیتے تھے۔ قرآن پاک کی تفسیر بھی لکھ رہے تھے جو تمام نہ ہو سکی۔ آپ کی ادارت میں پٹنہ کالج سے ایک قابل قدر رسالہ نکلا جس کا نام "معاصر" ہے۔ یہ رسالہ ابھی تک جاری ہے۔ اس میں ڈاکٹر صاحب کے تین قابل قدر مضامین شائع ہوئے تھے۔ "میر تقی میر کی شاعری پر ایک نظر"، "ناسخ عظیم آبادی" اور "فلسفۂ عشق مجازی"۔

سید [illegible] احمد بلگرامی

[illegible]

[illegible] کتاب "[illegible]" اردو ترجمہ کیا جس کا ایک نسخہ علامہ سلیمان ندوی کی کتاب [illegible] میں [illegible] ہے۔

قاضی عبدالودود بار ایٹ لاء عظیم آبادی

قاضی صاحب عظیم آباد کے ایک رئیس خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ ابتدائی تعلیم کے بعد کچھ دن [illegible] تعلیم پائی پھر علی گڑھ [illegible] اینگلو اورینٹل کالج میں داخلہ لیا۔ اس کالج کے ٹوٹ جانے کے بعد میٹرک اور ایف اے اول درجہ میں پاس کیا اور ۱۹۲۲ء میں [illegible] کے ساتھ بی اے کی ڈگری لی۔ ۱۹۲۲ء میں انگلینڈ جا کر بی اے کینٹب اور بیرسٹر ہوئے۔ ۱۹۲۶ء میں [illegible] واپس آ کر علم و ادب کی خدمت میں مصروف رہے۔ قاضی صاحب کو بچپن ہی سے کتب بینی کا شوق ہے۔ ذہانت اور حافظہ اعلیٰ درجہ کا ہے۔ فارسی و اردو کا مطالعہ بڑا وسیع ہے اور وہ صحیح معنی میں ایک گراں پایہ مستشرق کی حیثیت رکھتے ہیں۔ معلومات کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ انہیں فارسی و اردو ادبیات کا ایک چلتا پھرتا [illegible] دائرۃ المعارف کہنا چاہیئے۔ انہیں تحقیقات کا ذوق فطرت سے عطا ہوا ہے اور بلاشبہ وہ موجودہ دور کے محقق اعظم ہیں۔ علمی و تحقیقی مضامین کا انہوں نے ایک انبار لگا دیا ہے۔ یہ مضامین ملک کے مختلف رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ اگر تمام مضامین کو کتابی شکل میں شائع کیا جائے تو کئی ضخیم جلدیں تیار ہو جائیں۔ قاضی صاحب کی تحقیقات کے کچھ نمونے درج ذیل ہیں۔ [illegible] آرزو کا سال ولادت مصحفی کے تذکرہ "عقد ثریا" میں

۱۹۲۰ء [illegible] میں نے قاضی صاحب سے ملاقات کی تو انہوں نے [illegible] [illegible]
روز دل عجیب [illegible] ہے۔ [illegible] کا سال وفات پیدا ہو گیا تھا۔ قاضی صاحب نے [illegible] [illegible]
بتایا [illegible] اور ہجرت کی تاریخ وفات [illegible] قاضی صاحب کی تحقیق [illegible]
[illegible] صاحب کو یقین تھا کہ [illegible] تھا۔ قاضی صاحب نے دلائل سے ثابت کر دیا [illegible]
غالب کا زائچہ غلط تھا۔

قاضی صاحب [illegible] کے سلسلے میں ڈاکٹر [illegible] کا ذکر بھی ضروری ہے [illegible] صاحب [illegible]
[illegible] تحصیل علم کی [illegible] سے [illegible] حاصل کرنے کے بعد [illegible]
ایم اے اور [illegible] کی ڈگریاں [illegible] پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے وظیفہ پا کر ولایت [illegible] مغرب کے [illegible]
ہو کر [illegible] صاحب [illegible] شائع ہوتی رہتی ہیں۔ [illegible]
[illegible] وفات [illegible] اس وقت [illegible]
شکل میں احوال غالب [illegible] کے نام سے چھپ گیا ہے۔

کلیم الدین احمد

کلیم الدین احمد [illegible] ڈاکٹر عظیم کے [illegible] ہیں۔ [illegible] ایم اے کی ڈگریاں حاصل کیں [illegible]
[illegible] میں ولایت [illegible] یونیورسٹی سے [illegible] پاس کر کے وطن واپس آئے [illegible] پٹنہ کالج کے [illegible] آج کل پٹنہ [illegible]
ہیں۔ کلیم الدین نے [illegible] کی قدر و قیمت میں اضافہ کر دیا ہے [illegible] تنقیدی مضامین [illegible]
سب سے پہلے ان کی معرکۃ الآرا کتاب "اردو شاعری پر ایک نظر" [illegible] اس کے بعد "اردو تنقید پر ایک نظر" [illegible]
گئی۔ یہ سب کتابیں اردو میں ہیں۔ انگریزی میں بھی [illegible] شائع ہو چکی ہے [illegible] "[illegible] اینڈ لٹریری کریٹیسزم" ہے۔ کلیم الدین صاحب اردو شاعری کے [illegible] تسلیم نہیں کرتے۔ وہ
شاعری کے سرمایہ کو مغربی عینک سے دیکھتے ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ وہ غزل گوئی کو نیم وحشی صنف قرار دیتے ہیں۔ غزل گوئی وہ صنف ہے جس
نے فارسی میں حافظ اور اردو میں غالب کو بقائے دوام کا خلعت دیا ہے۔ اس لیے کلیم صاحب کا [illegible] ارشاد قابل سند نہیں ہو سکتا۔
اسی طرح اردو تنقید کو بھی وہ اقلیدس کا خیالی نقطہ [illegible] قرار دیتے ہیں [illegible] یہ ارشاد بھی قابل تسلیم نہیں۔ کلیم صاحب میں ایک
عیب یہ بھی ہے کہ اپنے والد ماجد کے کلام پر تنقید کرنے میں انہوں نے بغیر جانبداری سے کام نہیں لیا۔ "اردو شاعری پر ایک نظر" میں ان کی
تیغ قلم سے تقریباً ہر شاعر کا کلام مجروح ہو گیا لیکن ڈاکٹر عظیم کا کلام اس کی زد سے محفوظ رہا۔ ایسی روش ایک نقاد کے دامن کا
بدترین داغ ہے۔

پروفیسر جمیل مظہری

جمیل مظہری ضلع سارن (صوبہ بہار) کے باشندے ہیں۔ ۱۹۳۱ء میں ایم اے کرنے کے بعد ان کی ادبی و صحافتی زندگی کلکتہ کی فضا

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] چند اشعار [illegible]

[illegible]

جمیل کے ساتھ پروفیسر ابن حسین رضوی کا ذکر بھی اہم ہے [illegible] بیان نصیحانہ و شاعرانہ ہے [illegible] عظمت و حیرت ہے۔ رضوی کے چند رنگین اشعار سنیے۔

اس انقلاب قدم قدم پہ حیات نو کا مدار ہے [illegible]
[illegible]
ہم تو شگفتہ سری سے [illegible] اپنا

اس سلسلے میں پرویز شاہدی اور تابش عظیم آبادی کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ دونوں حضرات عظیم آباد کے باشندے ہیں۔ پرویز شاہدی کا شمار ترقی پسند شعرا میں ہے ان کے افکار میں رعنائی اور فنکاری کروٹ کروٹ کر رہی ہے۔ ان کی شاعرانہ صلاحیتوں سے [illegible] شاعری پر ان کی شاعری کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کی غزلیں اور نظمیں رسالوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اس وقت میرے سامنے ان [illegible] کرنے سے مجبور ہوں۔

آرزو عظیم آبادی حضرت شاد عظیم آبادی کی یادگار ہیں۔ یہ ایک شاعر ہیں اور نثر میں بھی بلند پایہ رکھتے ہیں۔ بہت بلند استعداد رکھتے ہیں۔

سہو قلم سے میں نے جمیل مظہری کی شاعری کا ذکر نہیں کیا۔ وہ ایک ذی علم جدید ... ہیں۔ مرثیوں کی ... وہ قدیم و جدید رنگ کے شاعر ہیں۔ وہ نثر نگاری پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ چنانچہ مرزا ... کی مشہور کتاب "اصلاحِ سخن" کے جواب میں انہوں نے "ایضاحِ سخن" ایک کتاب لکھی جس پر علامہ سید ... شاہ ... نے معارف میں تبصرہ کیا تھا۔

شوق نیموی کے شاگردوں میں ضیا عظیم آبادی مرحوم بھی صاحبِ طرز ... ہیں۔ انھوں نے بڑی پختہ طبیعت پائی تھی اور ان کے کلام کا ... شائع ہوا تھا ... نایاب ہے۔ ان کی شاعری کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ان کے ایک شعر پر جس کا مصرعہ ہوتا ہے، جناب کلیم عاجز ... اس شعر پر ... دیکھتے ہیں ؎

اس جنس ہنر کی ہے قدر دل میں ہمارے
بھولوں کو اتارو ہیں جب سارا عالم ہوتا ہے

صحافتی دنیا میں بھی ... گمنام نہیں ہے۔ ... میں ... ریختہ ... کی طرف سے "اخبار الاخیار" نام ایک ... جاری ہوا تھا جو ہفتہ میں ... شائع ہوتا تھا۔ اس کے اڈیٹر منشی ... علی خاں تھے۔ پٹنہ سے ایک ظریفانہ اخبار "پنچ" جس کا نام ... تھا اسی طرز کا ... مخصوص حیثیت رکھتا تھا۔ اس نے ... سال تک ظرافت کے پھول کھلائے۔ اس کے اڈیٹر منشی عبدالکریم تھے۔ نواب ... سید ... کی ادارت میں پٹنہ سے "ادیب" نکلتا تھا جس میں کئی ادبی مضامین شائع ہوتے تھے۔ چند اور اخبارات و رسائل کے نام یہ ہیں۔ "اتحاد" (ادارت ... زیر ادارت سید منظر علی ندوی مرحوم) "حسن و عشق" ... (زیر ادارت عبدالباری ساقی ... بعد میں ... "صبح"، "ندیم"، "سہیل" وغیرہ۔ رسالہ "تہذیب" پٹنہ، "معیار" پٹنہ، "معاصر" پٹنہ، "ندیم" گیا، "وفیق" ... "ندیم" ابھی کی ادارت میں جاری ہوا۔ ریاست ... اس کے بعد حسن امام وارثی اور محی الدین ندوی اڈیٹر ہوئے۔ اس پرچہ نے ۱۵-۱۶ سال تک اُردو کی خدمت کی۔ ... پایہ کا رسالہ تھا۔ اس کی زندگی نے وفا نہ کی۔ قاضی عبدالودود صاحب اس کے اڈیٹر تھے۔ ان کا نام ہی اس کے معیار کا ضامن ہے۔ "معاصر" اب تک جاری ہے۔ اس میں زیادہ تر قاضی عبدالودود صاحب، کلیم الدین صاحب، اختر اورینوی صاحب، حسن عسکری صاحب کے مضامین شائع ہوتے ہیں۔ حسن عسکری صاحب پٹنہ کالج میں شعبۂ تاریخ کے پروفیسر ہیں۔ ادب ... کا ماخذ تاریخی معلومات کا مخزن ہے۔ وہ ... انگریزی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں بلکہ فارسی کتابوں کا بھی۔ اخباروں میں "آواز" "صدائے عام" (زیر ادارت نظیر حیدر صاحب وکیل) اور "ساتھی" (زیر ادارت غلام سرور جو ایک نوجوان ادیب ہیں) جاری ہے۔

یہ مقالہ کچھ طویل ہو گیا ہے لیکن موضوع ہی اتنا وسیع تھا کہ اس سے زیادہ اختصار ممکن نہ تھا۔

بہ گلشن ... (نظیری کی شعر)
عندلیب آشفتہ تر می گوید این افسانہ را

ؔ۱ بہار ... عظیم آبادی نے جاری کیا تھا جو ایک خوش فکر ترقی پسند شاعر ہیں۔ اس کی ادارت ضیا عظیم آبادی کرتے تھے۔

سرحد کی ادبی شخصیتیں

سید فارغ بخاری

صوبہ سرحد کی ادبی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ایسی بے شمار ادبی شخصیتیں نظر آتی ہیں جن کی حیثیت مسلّم ہے۔ جنہوں نے اپنے اپنے دور میں نمایاں کارنامے انجام دیئے اور اپنے ناموں کو اجاگر کیا اپنے فن میں مہارت [illegible]۔ ان میں بڑی بڑی قد آور شخصیتیں بھی ہیں جو کسی طرح سے بھی پہچانی نہیں جاتیں۔ انہوں نے ایک دور افتادہ اور پسماندہ ماحول میں رہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو منوانے کے لئے کوئی نہ کوئی راہ نکال ہی لی۔

عنوان کے اعتبار سے یہ موضوع نہایت وسیع ہے اتنا وسیع کہ اگر ہر ایک کی شخصیت پر الگ الگ مقالہ لکھا جائے [illegible] کے لئے وقت کم ہے جب بھی شاید اس عنوان کی وسعت کا حق ادا نہ ہو سکے کیونکہ اس میں موضوع صرف اردو شعر و ادب تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ اس میں پشتو، فارسی اور ہندکو زبانوں کی ادبی شخصیتوں کا ذکر بھی ناگزیر ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف تین چار صدیوں میں پھیلی ہوئی اور وہ بھی بیسیوں شخصیتوں کے تفصیلی جائزے کا بھی یہ مختصر مضمون متحمل نہیں ہو سکتا۔

اس صورت میں میں نے موضوع کو سمیٹنے کی غرض سے اپنے لئے ایک درمیانی راہ تلاش کی ہے وہ یہ کہ ان حضرات کو میں ان حضرات کے ذکر تک محدود رکھوں جن سے میں نہ صرف بالمشافہ مل چکا ہوں بلکہ ان سے نیازمندانہ مراسم کا شرف بھی حاصل رہا اور نہایت قریب سے ان کی شخصیت کے مطالعہ کا موقع بھی ملا۔

مضمون کو زیادہ جامع اور مکمل طور پر پیش کرنے کی غرض سے میں نے ایک تدبیر یہ سوچی ہے کہ پشتو، فارسی، ہندکو زبانوں اور خود اردو کے قدیم اساتذہ کی اولوالعزم شخصیتوں کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے گذر جاؤں اور صرف اردو کے ادیبوں اور شاعروں ہی کا تذکرہ کروں۔

پشتو ادب کی تاریخ تقریباً دو ہزار سال پرانی ہے اس لمبے چوڑے عرصہ میں اس نے ہزاروں شاعر اور ادیب پیدا کئے انہیں نہایت دقت نظر سے دیکھا جائے جب بھی سینکڑوں ایسی گرانمایہ ادبی شخصیتیں نظر آتی ہیں جنہیں کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

بیرونی دنیا تو صرف خوشحال خان خٹک اور رحمان بابا کے ناموں ہی سے واقف ہے اس میں شک نہیں کہ پشتو ادب کی تاریخ میں ان دو [illegible]

اردو ادب کا آغاز سرحد میں بیسویں صدی عیسوی میں ہو چکا تھا۔ لیکن [illegible] صاحب [illegible] شاعر [illegible]
[illegible] نے بیشتر فارسی شعر [illegible] میں لیکن [illegible] دکنی [illegible] مقام حاصل ہے۔
اس کے علاوہ جدید پشتو [illegible] ایک عظیم شاعر [illegible] ہے۔
دوسرے دور میں [illegible] سرحدی [illegible] پشتو [illegible] شاہ قادر [illegible] سرحدی [illegible]
برق گجراتی [illegible] قابل قدر [illegible] تصنیف کر رہے ہیں۔

شائق سرحدی

خصوصاً شائق سرحدی کو [illegible] انقلابی [illegible] کی حیثیت سے [illegible] مقام حاصل ہے۔ حالی کی طرح انہوں نے سب سے پہلے [illegible] قدروں سے بغاوت کا [illegible] کر کے دکھایا انہوں نے غزل کو نیا موڑ دینے کی کوشش کی۔ اس کی آواز اس وقت [illegible] ابھی [illegible] پہلی جنگ عظیم کا آغاز تھا [illegible] کے بعد ہندوستانی عوام کو [illegible] آغاز میں کبھی جاگ [illegible] ہوا تو [illegible] اور غلامانہ ذہنیت کا احساس [illegible] انقلاب [illegible] انقلابی تحریک موجود [illegible] شائق نے [illegible] شاعری کا موضوع بنایا انہوں نے [illegible] شاعری [illegible] قدروں سے انحراف کر کے [illegible] رجحانات [illegible] غزل کی کایا پلٹ کر دی۔

شائق ایک مکتبہ فکر ایک تحریک ایک ادارہ تھا [illegible] ماحول میں ایسی انقلابی مشعل روشن کی جسے رجعت پسند [illegible] مخالفتوں کے جھکڑ بھی نہ بجھا سکے

مولانا عبدالرحیم پوپلزئی

مولانا عبدالرحیم پوپلزئی اسی مکتبہ فکر کا ایک بیباک نمائندہ تھے۔ علم و فضل ترکے میں پایا۔ علمائے عصر سے حدیث، فقہ اور تفسیر کی تکمیل کرنے کے بعد دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے جہاں شیخ الہند علامہ محمود الحسن صاحب سے کسب علم کیا۔ ۱۹۱۲ء میں فارغ التحصیل ہو کر پشاور پہنچے تو اپنے استاد گرامی کے مشورے سے سیاسیات میں حصہ لینا شروع کیا۔

ان کی شخصیت بڑی دلآویز، بڑی جاذب نظر اور بڑی ہمہ گیر تھی۔ وہ بیک وقت ایک عالم اجل، شعلہ نوا مقرر، انتہائی جرأت مند صحافی، بے خوف رہنما، بلند پایہ ادیب اور ایک انقلابی شاعر تھے۔ آپ کی تمام عمر قید و بند میں گزری۔ دوران اسیری ہی میں پلورسی کا عارضہ ہو گیا۔ ۱۹۴۲ء میں رہا ہو کر آئے تو بستر علالت پر ایسے پڑے کہ پھر اٹھ نہ سکے اور آخر ۱۹۴۳ء کو اس دار فانی سے رخصت ہوئے۔

آپ سرحدی عوام کے محبوب رہنما تھے۔ اپنی عمر کا غالب حصہ انگریز سامراج کے خلاف جنگ آزادی میں گزارا۔ سرحد میں نوجوان بھارت سبھا اور کانگرس کے بانی مبانی تھے۔ صوبہ سرحد کا نوجوان طبقہ آپ کے خیالات سے بے حد متاثر تھا۔ میں نے طالب علمی کے زمانے میں انہیں کبھی منبر پر خطبہ دیتے دیکھا تو کبھی خاکساروں کے جلوس کی قیادت کرتے پایا اور کبھی کسی عظیم الشان عوامی اجتماع کے سامنے دھواں دھار تقریر کرتے نظر آئے۔

سیاسی الجھنوں اور قید و بند کے مصائب نے آپ کو شعر و سخن کی طرف متوجہ ہونے کا کم موقع دیا تاہم انہوں نے جو کچھ کہا وہ فیض کی طرح

[illegible]

سائیں احمد علی

[illegible]

[illegible]

[illegible] زبان و روزمرہ کے [illegible] تھے [illegible] بات چیت [illegible]
کوئی غلط لفظ استعمال کرتا تو برہمی سے ٹوک دیتے۔

حیات سرحد کا تیسرا دور [illegible] جن کی [illegible] شخصیت
[illegible] انہوں نے سب سے پہلے پشاور میں پبلک مشاعروں کا آغاز کیا [illegible] تبلیغ ایک نہایت موثر ذریعہ ثابت ہوا
[illegible] بزم سخن کی بنیاد رکھی جس میں [illegible] تمام منتشر قوتوں کو یکجا کر دیا [illegible] کوششوں کا نتیجہ تھا کہ شاعروں
[illegible] وہ بزم سخن [illegible] ایک ایسی شمع روشن ہوئی کہ سرحد کے گوشے گوشے سے ادبی [illegible] ان کے گرد جمع ہونے لگے
سائیں کے شعری [illegible] اور ان کی عظمت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے [illegible] سرگرمیوں کو اجتماعی شکل [illegible]
[illegible] کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ آپ عروض سے بھی واقف تھے اور فن شاعری پر بھی پوری دسترس رکھتے تھے۔ [illegible]
پیشہ شعراء آپ کی عظمت کے قائل تھے اور ان میں سے اکثر آپ سے مشورۂ سخن بھی لیتے تھے۔

آخر عمر میں طبیعت میں تلخی اور چڑچڑاپن آگیا تھا بہت کم بولتے تھے۔ دور دور سے لوگ شوق ملاقات لئے آتے لیکن بسا اوقات بیٹھے بیٹھے
رہ جاتے کسی کو جرأت نہ ہوتی کہ انہیں بلائے یا سلسلۂ گفتگو چھیڑے —— کبھی موڈ میں ہوتے تو شعر سنانے لگتے تو بھی کسی کو داد دینے یا
داد لینے کا حوصلہ نہ ہوتا —— کوئی بھولے سے داد دے بیٹھتا تو فوراً سوال کرتے۔ بتاؤ کیا ہے؟ —— شعر سنانا بند کر دیتے اور اس
کی وہ خبر لیتے کہ آئندہ کے لئے بیجا داد دینے سے وہ ہمیشہ کے لئے توبہ کر لیتا

انہیں نمود و نمائش سے نفرت تھی وہ ہمیشہ خاموشی سے سنانا اور سننا پسند کرتے —— خود بھی بہت کم داد دیتے۔ چپ چاپ سر
جھکائے سنتے جاتے —— کبھی غلطی ہوتی تو سر اٹھا کر معنی خیز نظروں سے دیکھتے اور فوراً اصلاح کر دیتے —— کبھی کوئی شعر پسند آتا تو سر
ہلا دیتے بس یہی ان کی سب سے بڑی داد تھی۔

سائیں کا درس سخن رات دن جاری رہتا وہ آخر عمر میں چوراسی پہنچنے لگے تھے عمر کی زیادتی کے باعث قویٰ مضمحل ہو گئے اور عناصر میں اعتدال

تھا۔ گو گشتی کے پاس چند ایک شخص دوست صاحب سندی کی ملازمت کے رستے جو پاک پہنچے سب سے ... کا ہی اپنی جگہ ملا رہا۔

اُردو میں غالب اور فارسی میں بیدل کی ہیں حافظ اور نظیری سے بہت متاثر تھے۔ اور ... کے بہت سے شعر اُن کو یاد تھے جنہیں وہ گفتگو میں نہایت سلیقے سے چسپاں کرتے۔ ان کی بحر میں ان کا درجہ بہت بلند تھا۔ بیدل اور نظیری کے وقت طلب اشعار آپ کے پاس لاتے اور آپ سنتے ہی صرف چند اشاروں سے مشکل سے مشکل شعر کو صاف کر دیتے۔

لباس نہایت سادہ پہنتے۔ معمولی کپڑے جسے کا ہوتی۔ بالکل ہندوؤں کی طرح پہنے رہتے لیکن ایک دوپٹا رکھتے تھے۔

بظاہر معاش کا کوئی ذریعہ نہ تھا لیکن آخر وقت تک بڑی شان سے وقت گزارتے رہے۔ ۱۲ اپریل ۱۹۴۲ء کو انتقال ہوا۔ بیدل کی مزار پر آنکھیں ہم خوب ... شیخ حبیب صاحب کی زیارت کے پاس ... کے سامنے سپردِ خاک کیے گئے۔

بیدل پشاوری

میرزا محمد خان بیدل پشاوری سرحد میں اپنے دور کے اردو اور فارسی کے نامور شاعر تھے۔ سرحد کے قدیم شعراء میں تنہا خوش نصیب شاعر ہیں جن کا دیوان ان کی زندگی میں مرتب ہو کر شائع ہو گیا۔ دیوان ... سے ہی وہ پہلے سرحدی شاعر ہیں جنہیں ہندوستان کے مشاہیر شعراء حضرت ... حضرت جگر ... حضرت ... اور حضرت نوح ناروی نے ان کے دیوان کی اشاعت پر خراجِ تحسین پیش کیا۔

اردو فارسی دونوں زبانوں کے بلند پایہ شاعر تھے فنِ شاعری میں بھی درک حاصل تھا۔ کلام ہموار ہے ان کی شاعری خاص داخلی شاعری ہے کلام میں تعلّی اور خود ستائی بھی ہے۔ گو ان کے جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ چیز ان کی طبیعت میں جذب ہو چکی تھی اپنے معاصرین کو تو گویا کیا وہ غالب اور اقبال کو خاطر میں نہ لاتے۔ ہر ایک کے سامنے برملا ان پر نکتہ چینی کرتے اور اپنے آپ کو ان سے بہتر اور بلند شاعر ظاہر کرتے ——— ممکن ہے اقتضائے عمر کے باعث آخر وقت میں یہ بات ان کی طبیعت میں پیدا ہو گئی ہو۔

بیدل نے طویل عمر پائی۔ آخر میں ان کا دماغ تقریباً ماؤف ہو چکا تھا بعض اوقات بڑبڑاتے اور بیابان گلی کرتے ہوئے بازاروں میں گھومتے نظر آتے ——— راستے میں جو بھی ملتا اسے با آوازِ بلند اپنے اشعار سنانے لگتے۔ ہر شعر پر داد طلب کرتے اور دوسرے شعراء کا مضحکہ اڑاتے۔ یہ چیز اتنی بڑھ گئی کہ دوستوں نے ان سے ملنا جلنا ترک کر دیا۔ مگر جب کے ملنے والے انہیں دیکھتے تو کترا کر نکل جاتے ——— مشاعرہ میں کھڑے ہو کر سنانے لگتے تو بس سناتے ہی چلے جاتے، لوگ اکتا جاتے، منتظمین تنگ آ جاتے لیکن آپ کو ذرا احساس نہ ہوتا۔ کوئی ٹوک دیتا تو ناراض ہو کر چلے جاتے۔ یہاں تک کہ انہیں مشاعروں میں مدعو کرنے سے گریز کیا جانے لگا۔ سادگی ان کے کلام کی بڑی خوبی اور تعلّی بڑا عیب تھا۔

آپ نے ۱۰ اپریل ۱۹۴۲ء کو پشاور میں انتقال کیا اور وزیر باغ کے قریب دفن ہوئے۔ قاضی تقاضائے روحی نے قطعہ تاریخِ وفات کہا۔

سالِ رحلت روحی آشفتہ حال　　گفت بیدل شاعرِ شیریں مقال

ھ ۱ ۲ ۵ ۸

رعنا کاظمی

اگر انسانی طبائع میں ذہنی وراثت کو واقعی کوئی دخل حاصل ہے تو مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ شعر و ادب سے میری طبیعت کا لگاؤ در حقیقت میرے ننھیال کا عطیہ ہے یوں تو ددھیال میں علم و فضل کی کمی نہ تھی لیکن وہاں شعر و سخن کا رسیا کوئی نظر نہیں آیا۔ برخلاف اس کے ننھیال میں جہاں

[illegible]

[illegible] نظر آتے ہیں۔

[illegible]

[illegible]

[illegible] نہیں سنا [illegible]

[illegible]

جگر کاظمی

[illegible] یہاں کے بیشتر مشہور شعراء آپ کے حلقۂ تلامذہ میں ہیں۔
یہ پیسے دوسرے شاعروں میں ہیں جو [illegible] برس کی عمر میں [illegible] ہیں [illegible] نہیں [illegible] اس حقیقت سے
[illegible] حضرت ضیا جعفری اور رضا کاظمی کے نام قابل ذکر ہیں۔ خود [illegible] مشکل نہیں [illegible]
[illegible] نہیں کر سکتا کہ شعر و سخن کی طرف میرا رجحان انہی کی توجہ کا رہین منت ہے۔ [illegible]
شاعری کی جانب میں نے کوئی اور [illegible] اختیار کیا ہوتا۔ [illegible] جب [illegible]
[illegible] شاعر نکلا [illegible] خوشی کے [illegible] ——
جگر صاحب یہاں کے ادبی، علمی اداروں بزم سخن کے مؤسسین میں سے ہیں اور یہاں کے ادبی مشاعروں میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔
اُردو کے علاوہ فارسی کے بھی بلند پایہ شاعر ہیں خصوصاً اس لئے کہ گزرے زمانے میں بھی قصیدہ کی صنف آپ ہی کے دم قدم سے یہاں زندہ ہے۔
جگر صاحب ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے نو برس کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ماموں کے ہمراہ کلکتہ چلے گئے جہاں مدرسہ
عالیہ میں پانچ سال تک پڑھتے رہے۔ ۱۹۰۸ء میں تعلیم چھوڑ کر دہلی کی طرف کا رخ کیا —— [illegible] ہونے کی وجہ سے سال بھر دہلی میں
رہے۔ پشاور پہنچ کر چند دن قیام کیا اور پھر ایک عزیز کے ہمراہ کشمیر جا پہنچے جہاں فارسی عربی کی تعلیم مکمل کی۔
کلکتہ میں قیام کے دوران میں حضرت شمس کلکتوی سے اصلاح لیتے اور مشاعروں میں شامل ہونے لگے ان دنوں وہاں آغا حشر مرحوم کی وجہ سے
ادبی ہنگامے زوروں پر تھے جگر نے ان صحبتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا —— دہلی پہنچے تو ایک دن پھرتے پھراتے ایک مشاعرے میں جا پہنچے
جو مشاعرہ حضرت داغ دہلوی کی صدارت میں ہو رہا تھا آپ نے اجازت لے کر غزل پڑھی ایک شعر پر داغ مرحوم نے چونک کر جگر کو دیکھا اور پوچھا
"کہاں کے رہنے والے ہو" آپ نے بتایا "سرحدی ہوں" —— یہ سن کر انہیں بڑا تعجب ہوا اور بڑی تعریف کی اپنے برابر بٹھایا اور فرمایا ——

ہم تو سمجھتے تھے سرحد پشتونوں کا ملک ہے وہاں اردو کون جانتا ہی نہ ہوگا۔ لیکن تبادلہ زبان و ذوق سے [illegible] صحیح سمجھ آیا
نظم و نثر بے تکلف لکھتے ہیں اور خوب سلیس گفتگو کرتے ہیں ——— یہ ادنیٰ درجہ کے آدمی ہیں۔ طبیعت میں [illegible]
بنتے سنورتے ہیں لیکن صحبت [illegible] سے بہت جلد دور ہو جاتے ہیں ——— شاعری سے دلچسپی [illegible] صحت پر
ہیں اور اس سلسلہ میں تکلیف سے بہتر زندگی کا گزشتہ اور احباب کو دیکھ لیتے ہیں۔

جگر صاحب جب دفتہ [illegible] آپ نے معاصرین سے صرف کامیابی حاصل کی ہیں۔ آپ نے سرحد میں اردو کی ترقی کے سلسلہ میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ایسے وقت میں جب کوئی شخص یہ کوشش کرے کہ یہاں کا ماحول تیرہ و تار تھا ——— آپ نے عظیم الشان مشاعروں کے ذریعے لوگوں میں اردو ذوق پیدا کیا اور ترقی کی راہیں [illegible] ہیں بلند مقام پر نظر آتا ہے اس میں آپ کا ساقی کی سعی کا غالب حصہ ہے۔

قاضی محمد عمر قضاؔ

قاضیوں کے مشہور گھرانے میں پیدا ہوئے۔ علم و فضل ترکہ میں پایا۔ شعر و سخن کا ذوق گھٹی میں پڑا تھا۔ بچپن سے مدرسہ و مکتب سے فارغ التحصیل ہو کر تمام عمر شعر کہتے اور حقہ پیتے گزر گئی۔ والد کی وفات کے بعد ایک معقول جائیداد ترکہ میں پائی۔ ساری عمر کوئی دھندا نہ کیا۔ جائیداد ہے اسی مشغلے میں تمام جائیداد پھونک ڈالی حتیٰ کہ رہائشی مکان تک نہ رہا۔ کتابیں جمع کرنے کا شوق جنون کی حد تک رہا ——— ان کی لائبریری میں فرانسیسی، انگریزی، عربی، فارسی، انگریزی، پشتو اور اردو کتب کا ایک نہایت قیمتی ذخیرہ موجود ہے ان میں بڑے بڑے نادر نسخے بھی ملتے ہیں۔
ابتدا میں کھیل، سواری اور شطرنج کا بہت شوق تھا لیکن شاعری کے شوق نے باقی تمام شوق بھلا دیئے۔

قضاؔ عالم فاضل شخص ہیں اور اہل علم کی قدر کرتے ہیں لیکن نقادانہ طبیعت سے کوئی شخص بھی محفوظ نہیں رہتا۔ ان کی عمر اس وقت ۸۰ برس ہے سماعت جاتی رہی، بصارت کمزور ہو گئی، اعضا مضمحل ہو گئے لیکن دل و دماغ محفوظ ہیں۔ ہوش و حواس قائم ہیں ——— اب بھی باتوں میں وہی نکتہ رسی، وہی شناس اور وہی لذت ——— مادری زبان ہندکو ہے لیکن ہمیشہ اردو بولتے ہیں یہاں تک کہ گھر پر بھی اردو ہی میں باتیں کرتے ہیں ——— صاف اور شستہ اردو ——— کوثر میں دھلی ہوئی زبان ———

قضاؔ نہایت مشاق اور ممتاز شاعر ہیں انہیں ادبیات سرحد کی تاریخ میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے ——— وہ اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ اصناف سخن میں صرف غزل کو اپنایا اور اسے عروج پر پہنچایا۔

قضاؔ کو ہم سرحد کا غالب کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ غالب کی طرح انہیں اپنے فارسی کلام پر ہمیشہ ناز رہا اور اردو مجموعے کو بے رنگ سمجھتے رہے لیکن اُن کی شہرت و عظمت کا باعث یہی اُردو مجموعہ ثابت ہوا ——— غالب کی طرح بیدل اور نظیری سے بے حد متاثر ہیں اس لئے اوائل میں طبیعت نہایت دقت پسند تھی اور طرز بیدل میں ریختہ لکھنے کو اپنے ندرت سخن کی معراج سمجھتے تھے چنانچہ ابتدائی غزلوں میں اُن کا یہی مرغوب انداز ملتا ہے۔

یک جہاں جلوہ محو اضطراب ضبط دل
قائم انتظار اے قضاؔ ہر آئینہ سیماب تھا

لیکن رفتہ رفتہ سادہ اور سلیس زبان میں غزل کہنے لگے زبان اور محاورہ پر عبور حاصل تھا یہ اسلوب اتنا مقبول ہوا کہ انہوں نے اپنے لئے منفرد مقام حاصل کر لیا ؎

آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی ——— ہے ربط ان کے ناز کو ناآشنا کے ساتھ

[illegible] گوہر نایاب گئے   [illegible]
[illegible]   [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کاپی پر منتقل کر دیتے ہیں۔

[illegible]

غلام محمد غوثی سرحدی

۱۹۳۲ء میں تعلیم ادھوری چھوڑ کر گھر سے نکلا اور تلاش معاش میں دلی ہوتا ہوا کلکتہ جا پہنچا۔ وہاں پشاور کے جواں سال شاعر اختر آصفی کے ذریعے غلام محمد غوثی سے تعارف ہوا۔ آپ صحافی بھی ہیں شاعر بھی اور عروضی بھی ——

بیس برس کی عمر میں اپنے وطن مالوف پشاور کو چھوڑ کر کاروبار کے سلسلہ میں کلکتہ چلے گئے اور وہیں کے ہو رہے۔ غزل کے شاعر ہیں۔ غزل قدیم رجحانات کی آئینہ دار ہے۔ آغا حشر مرحوم اور وحشت کلکتوی کے جلیسوں میں سے ہیں۔ نہایت ثقہ قسم کے بزرگ ہیں۔ نشست خیالات رکھتے ہیں۔ شروع ہی سے کانگریس کے ساتھ تھے اور آج بھی ان کی وضع داری اور اصول میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بارہا قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلیں۔ تمام عمر بنگالہ [illegible] میں گزری —— صوفی منش بھی ہیں اور رند مشرب بھی —— ان کی زندگی عجیب ہنجار سے گزری۔ کبھی سونے چاندی میں کھیلے ہیں تو کبھی فقر و فاقہ سے دو چار ——

خوش پوش اور خوش ذوق انسان ہیں۔ ہر وقت فکر سخن میں گھرے نظر آتے ہیں۔ میری ذہنی تربیت میں غوثی صاحب کا بڑا حصہ ہے۔ اگرچہ میں نے

صرف چند ابتدائی غزلیں ہی ہیں جن سے رسالہ کا کام چلتا رہا ۔ نقش کر جو بنے اور سب سے پہلے ۔۔۔ سے مشتہر کرنے کا انہی کے سر ہے ۔

۔۔۔ پشاور سے آئے ۔ انہوں نے یہاں کی ادبی محفلوں میں شرکت کا سلسلہ شروع کیا اور پھر ادبی زندگی کا آغاز کیا ۔ وہ پشاور سے وابستگی اختیار کی اور مشاعروں میں باقاعدہ حصہ لینے لگا ۔

اس وقت یہاں کی ادبی جماعت بزم سخن کہلاتی تھی ۔ وہ ایک چھوٹی سی جماعت تھی جس کے ساتھ یہاں کے ادبی اور دوسرے حلقے کے لوگ وابستہ تھے ۔ اس کے صدر محمد شاہ برق تھے ۔

محمد شاہ برق

برق صاحب نہایت پرگو اور حاضر دماغ واقع ہوئے ہیں ہمیشہ مشاعرے میں گئے اور بیٹھے بیٹھے غزل کہہ لیتے ہیں ۔ وہ قریب دو برس کی عمر سے کراچی آگئے اور واپسی پر ایک سوز میں رہے ۔۔۔ تاہم شعر و سخن کے مشغلے میں گزرتے ۔ وہ بزم سخن کے بالا خانے یا میر عباس مرحوم کے قہوہ خانے میں جا بیٹھتے جہاں احباب جمع ہونے لگے اور بحثیں ہوتیں ۔ اساتذہ کے اشعار کی جانچ اور شعرا کے کلام پر اصلاح ہوتی ۔ یہاں تک کہ ایک بحث شروع ہوتی اور آپ گرہ لگایا کرتے ۔ یہ سلسلہ ایک عرصہ تک قائم رہا ۔ اب گوشہ عزلت اختیار کر لیا ہے اور ادبی حلقوں سے بالکل کنارہ کش ہو گئے ہیں ۔

حسن ملکہ اور طلسماتی کبھی چائے پیتے اور بے تحاشا شعر کہنے کی وجہ سے بدنام تھے لیکن اب صرف کثرت چائے نوشی کا اثر رہ گیا ہے ۔

خالص مکی

مائرہ ادبیہ میں ایک سفید ریش بزرگ کبھی کبھار تشریف لاتے تھے ۔ ضعیف العمر دائم المریض لیکن زندہ دل سنجیدہ اور باذوق ۔۔۔ معلوم ہوا وہ یہاں کے مشہور ساتذہ میں سے ہیں اور انہیں خالص مکی کہتے ہیں ۔

وہ شعر و غزل کا شوق مرحوم سے حاصل تھا ۔ شاعری میں تو اپنی نظیر آپ تھے ۔ طبیعت وقت پسند تھی ۔ بیدل نظیری اور غالب سے بہت متاثر تھے اور انہی کی تقلید میں خود بھی فارسی اردو معروف زبانوں میں نہایت الجھے ہوئے شعر کہتے تھے لیکن بظاہر ہر سن کے بڑے مداح تھے یہاں تک کہ اس کی صحبت میں غالب کی مدح سے بھی دریغ نہ کرتے ۔

خالص کے اصل حریف حسن کے ہمعصر جگر کاظمی تھے ۔ ابتدا ہی سے ان میں رنجش اور یہ چشمک آخر تک قائم رہی ان کا سب سے بڑا مشغلہ ایک دوسرے کی مخالفت کرنا تھا ۔ خالص جہاں بیٹھتے جگر پر کڑی تنقید کرتے اور جگر ہر ملنے والے سے خالص کی شکایت کرتے ۔۔۔ لیکن خالص فوت ہوئے تو سب سے زیادہ قلق جگر کو ہوا وہ رو رو کر کہتے تھے خالص کے اٹھ جانے سے ہماری شاعری ختم ہو گئی اور یہ حقیقت ہے کہ خالص کی وفات کے بعد جگر بالکل گوشہ نشین ہو کر رہ گئے ۔

خالص آزاد مشرب اور وسیع النظر انسان تھے ان کے والد اہل سنت والجماعت سے تعلق رکھتے تھے ۔ ہوش سنبھالا تو اہل حدیث بن گئے بڑھتے بڑھتے اثنا عشری ہوئے ۔ بمبئی میں کہیں سے خواجہ کا اثر ہوا اس سے متاثر ہوئے ۔ کچھ دن عیسائیت کی طرف رجحان رہا ۔ پھر ۔۔۔ صاحب کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور آخر میں سب بندھن توڑ کر بالکل آزاد ہو گئے ۔ نہایت خوش مذاق اور صاف گو واقع ہوئے تھے اپنی اس مذہب ۔۔۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

آخر عمر میں صحت جواب دے گئی۔ [illegible] ۔۔۔۔

[illegible]

ناصر کی شعر فہمی ان کی سب سے بڑی خصوصیت تھی۔ [illegible]

[illegible]

فروری [illegible] میں پشاور میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے۔

رضا حسین رضا ہمدانی

انہی دنوں میں رضا ہمدانی سے میرا تعارف ہوا جس نے آگے چل کر ایسے قریبی تعلقات قائم ہونے کہ ہماری رفاقت دوستوں کے حلقہ میں ضرب المثل بن گئی اور ہم ایک دوسرے کے نام سے پہچانے جانے لگے

رضا ہمدانی سے میری پہلی ملاقات بزم سخن کے ایک مشاعرے میں ہوئی اور پھر یہ ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھتا ہی بڑھتا چلا گیا ۔۔۔ میں نے ان [illegible] میں بھی طرح سخن میں [illegible] دیکھا ۔۔۔ رضا کی دوکان پر ہر وقت شعراء کا جمگھٹا لگا رہتا اور وہ اپنے [illegible] روزی کے [illegible] میں مصروف۔

رضا بزم سخن کا جنرل سیکرٹری تھا۔ بزم کا حقیقی دفتر رضا کی دوکان ہی تھی معاشی دھندے کے بعد ان کا سارا وقت ادبی خدمت کی نذر ہو جاتا۔

ایک مدت تک رضا کی انگلیاں نوکِ سوزن سے چھلنی ہوتی رہیں ۔۔۔ [illegible] اور معاشی آسودگی اس کے دامن میں ناقابل رفو سوراخ بناتی رہی۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ روزگار سے گلو خلاصی کر کے [illegible] گیا۔ یہاں بھی ہم مشرب احباب کا جمگھٹا رہنے لگا۔ [illegible] یہ سلسلہ کب تک چلتا۔ آخر اس نے اس ملازمت سے بھی [illegible] میں ایک چھوٹی سی تمباکو کی دوکان کر لی۔ چھوٹی سی آزاد ریاست ۔۔۔ جس میں شاعری زیادہ ہوتی اور دوکانداری کم ۔۔۔

ملک ادیب اور بزم سخن کا باہمی چپقلش، شاعروں ادبیات کے جائزے اور تحریک گرنے والے صاحب پہ ملیں ان کا انہیں کچھ وہاں کی بیماری جنوں کے بعد پھر رضا کی صحبت و صلح کی حیثیت کا یہ عالم تھا کہ جب خاندان کے ماحول ہی اس کی انگلینڈ ——— ناظم الفرقت و ادب کے ساتھ وابستہ تھا۔ اور رضا سے بھی قریبی انس تھا ——— ہم دونوں بزم و رسالے کے مرحلے پر بہ وقت بیٹھتے اور کئی مہینے بعد کی سرحد کو پہونچ گئے ——— اس تحفے کو نبھانے کے لئے ہم نے ایک ملک جماعت بنانے کا فیصلہ کیا اور سرحد میں ایسے بزم کو اور دائرہ ادب سے قطع تعلق کر کے دبستان کا سنگ بنیاد رکھا۔ جب رضا کی ابتدا سرگرمیاں مشاعروں کے سلسلہ جاری کر شہر و اشاعت کا سبب اختیار کر گئیں ماہنامہ نغمات ہفتہ وار شباب اسی بابا کی یادگاریں۔

جب معاشی بحران نے عروج پر پہنچا تو رضا نے بیرونِ سرحد میں پشاور سے ہجرت کر کے راولپنڈی کو جا بسایا۔ وہاں بھی اپنے شاگردوں کے ساتھ پھر شاعرانہ جلسے اور ہفتہ وار شباب کا اجرا کیا۔ اور جب شباب بند ہو گیا تو رضا کی جان ساعت کو ذریعہ معاش بنانے کی کوشش کی وہاں بھی ہمراہ رہے۔ چنانچہ انجمن ترقی اردو راولپنڈی کی صدر جو بی سیسن صدر ہوئے۔ انتظام و انصرام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ وہاں کلکیری سالہ ادبی پرچہ رضا ہی کے تہ دوش قمر کا نتیجہ تھی یہ سمجھ میں اردو کی ایک مجلس کا سیاپہ ہے۔

دوسری جنگ عظیم کا ریو بہاں ملک کے اخراجات سمیٹ رہے گئی وہاں اس نے ہمیں وطن لوٹنے پر کسایا اور جب ہم پشاور پہنچے تو پھر وہی معاش کا سوال اپنی بھیانک صورت میں ہمارے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اسی زمانے میں ہم دونوں نے طبی کا جی اشتراک اور کچھ عرصہ بعد ——— قرطاس و قلم کی بجائے جسم انسانی کے زخموں کو دور کرنے لگا۔

آج غیر شاعروں کا رضا و ڈاکٹر کی حیثیت سے جانتی ہے اب وہ طبابت سے تو بے نیاز ہے لیکن شعر و ادب سے بے نیاز نہیں ——— سنگ میل کا جو اس نے نصب کیا اس کے تخلیقی جذبے میں سنگ گراں نہ بن سکا۔ چنانچہ اس وقت وہ بے شمار کتابوں کا مصنف ہے۔

رضا کی شاعری میں مقصد بھی ہے اور فن بھی ——— دل کی باتیں بھی ہیں اور دماغ کی بھی ——— ادب کی چاشنی بھی ہے اور حسن کی رعنائی بھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں وہ خلوص ہے جو شعر کو تصنع اور تقید سے پاک اور منزہ رکھنے میں مدد دیتا ہے۔

رضا ادبیات سرحد کا ایک ناقابل فراموش باب ہے وہ بچہ رفیق مخلص تھا۔ اور ان تھک ادبی کارکن ہے ——— وہ سادہ وضع سادہ دل اور سادہ نثر افسانہ ہے اس کی ادبی خدمات کا پلہ بہت بھاری ہے اس نے یہاں ادب جدید میں نہایت اہم پارٹ ادا کیا ——— وہ سب سے پہلا سرحدی ادیب ہے جس نے پشتو لٹریچر کو اردو دان طبقے سے متعارف کرایا یہی کارنامہ اس کا نام زندہ رکھنے کو کافی ہے لیکن اس کے علاوہ بھی اس نے بہت کام کیا اس کی نظم و نثر تحقیقات بے پایاں ہیں وہ گزشتہ پچیس برس سے خدمت ادب میں منہمک ہے وہ گلشن ادب کا ایک سدا بہار پھول ہے ایک مکتبۂ فکر ہے، ایک تحریک ہے ———

جعفر علی جعفری

جعفری کو میں نے دیکھا تو وہ نابینا تھے لیکن کہتے ہیں کچھ عرصہ پہلے ان کی آنکھیں اچھی بھلی تھیں دکانداری کرتے تھے اور ان کی دوکان پشاور کے شعراء کا سب سے بڑا مرکز تھی۔ بینائی کے ساتھ وہ دکان بھی جاتی رہی لیکن اس حادثے نے ان کے شعری ذوق کو مضروب کرنے کی بجائے اور جلا دی اور وہ پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر شعر و سخن میں دلچسپی لینے لگے۔

جعفری بزم سخن کے فدائی تھے اور اس بزم کی تمام تر سرگرمیاں انہی کی مرہون منت تھیں۔ مشاعروں کے لئے پنڈال سجانا، شعراء کو بلانا، دعوت نامے تقسیم کرنا ——— غرض کہ سب کچھ جعفری ہی کو کرنا پڑتا۔ اس کے علاوہ وہ تمام نو آموز شعراء کے کلام کی اصلاح بھی کرتے اور مشاعروں کو کامیاب بنانے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] جعفری کی زندہ دلی کا جنازہ اس دن نکلا جس دن ان کی جوان سال اکلوتی لڑکی اچانک فوت ہو گئی اس زخم نے جعفری کی زندگی کو یکسر بدل دیا۔ اور ان کا دل یک لخت دنیا اور دنیا کے ہنگاموں سے اچاٹ ہو گیا ادبی محفلوں میں جانا چھوڑ دیا اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔
جعفری نے تقریباً دو برس کی طویل علالت کے بعد جون ۱۹۵۸ء کو وفات پائی۔

ضیا جعفری و عبدالودود قمر

دائرہ ادبیہ میں یوں تو بہت سے نوجوان ادیب موجود تھے لیکن ضیا اور قمر اس ادارے کی روح رواں تھے انہوں نے بزم سخن سے بغاوت کر کے دائرہ کی بنیاد رکھی اور اپنی ان تھک کوششوں سے اسے انتہائی عروج تک پہنچایا۔ جس دائرہ ادبیہ میں آیا تو ضیا اور قمر کا طوطی بول رہا تھا۔ اس وقت سرحد کے طول و عرض میں نئے اور پرانے اچھے اچھے لکھنے والے موجود تھے لیکن ان دو شخصیتوں کے سامنے سب کے سب طفلِ مکتب

[illegible] معلوم ہوتے تھے۔

ضیا اور [illegible] ادبیات سرحد کا ایک سنہری باب ہے [illegible] ان کی سرگرمیاں اتنی منفعت ثابت نہ ہوتیں [illegible] نے بے نظیر کام کیا ——— یہ ٹھیک ہے [illegible] بغاوت کر کے جدید رجحانات [illegible] ہمواری اور نئے لکھنے والوں کی صحت مند تربیت سے ان کے [illegible] اور بلند نگاہی کے جذبے کو [illegible]۔

ضیا اور [illegible] کی ملاقات [illegible] تھی [illegible] ضیا بھی [illegible] تھے دونوں ایک دوسرے [illegible] گھائل ہوئے [illegible] دونوں [illegible] تھے [illegible] دونوں [illegible] شعر و ادب کے [illegible] نے قدرت [illegible] کو بھی [illegible] دونوں نے ایک ہی [illegible] دوسرے کے [illegible] تھے۔

ضیا اور [illegible] ایک دوسرے سے علیحدہ [illegible] دیکھے [illegible]۔ [illegible] ہوئے [illegible] ادب [illegible] کے ساتھ [illegible] بھی ہے [illegible] سے [illegible] اور لکھنے کی ترغیب [illegible] کی ہے [illegible]۔

ضیا [illegible] حیثیت [illegible] چھپے [illegible] کا [illegible] ہے وہ [illegible] کوشش [illegible] سے [illegible] بھی نصیب [illegible] پر [illegible] بنایا ———

ضیا کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی [illegible] ہے۔ وہ صرف [illegible] بھی ہیں اور [illegible] بھی ——— [illegible] بھی [illegible] ان کے ہاں [illegible] بھی ہے اور زندگی کے [illegible] مسائل بھی ——— [illegible] ان کے [illegible] بھی ہیں اور مقصد کے شیدائی بھی ———

ضیا کی زندگی اور فن میں جتنی مطابقت پائی جاتی ہے وہ شاید ہی کسی اور فنکار کو نصیب ہوئی ہو ——— [illegible] ہونے کے باعث [illegible] روزمرہ زندگی میں ایک صلح کل انسان ہیں ——— [illegible] سے گھل مل کر [illegible] خلوص و محبت سے پیش آتے [illegible] ——— اسی طرح ادب میں بھی وہ ایک [illegible] کی شخصیت رکھتے ہیں وہ [illegible] کسی مخصوص [illegible] عقیدہ نہیں رکھتے کسی ایک مکتبہ فکر سے وابستہ نہیں ہوتے۔ کسی خاص عقیدت [illegible] عقیدہ نہیں رکھتے۔

ضیا کی ایک بڑی صفت ان کی وسیع النظری ہے وہ تنگ نظری [illegible] تعصب [illegible] جھوٹی وضع داری کے قائل نہیں [illegible] ضدی ہیں نہ خود غلط ——— اس چیز نے ان کے من کو بڑا [illegible] اور انہیں [illegible] بنا دیا۔ انہوں نے جو کچھ کہا سوچ سمجھ کر کہا۔ خلوص اور دیانت داری سے کہا ———

ضیا کی [illegible] زندہ دلی اور بذلہ سنجی ضرب المثل بن چکی ہے [illegible] سنجیدہ نہیں رہ سکتے [illegible] ان کی کمزوری بھی ہے اور خوبی بھی ——— وہ علمی گفتگو میں بہت دلچسپی لیتے ہیں، گھنٹوں بولتے ہیں لیکن سنجیدہ سے سنجیدہ بحث کے دوران میں ایک آدھ فقرہ ایسا کہہ جاتے ہیں جس سے بحث کی ساری سنجیدگی درہم برہم ہو کر رہ جاتی ہے۔ در اصل زیادہ سنجیدہ فضا میں اُن کی روح گھٹنے لگتی ہے ان کی طبیعت میں مزاح بہت ہے اور جب انہیں مزاح کا موقع [illegible] یا کوئی [illegible] فقرہ ان کے ذہن میں [illegible] تو [illegible] ان کے بس کا روگ نہیں ہوتا۔

ضیا محفل کی جان، مشاعروں کی رونق اور ادبیات سرحد کے بوستان کا [illegible] ہیں۔

نذیر مرزا برلاس

[illegible]

[illegible] کی تیاری میں منہمک ہیں۔

سردار عبدالرب نشتر

نشتر صاحب کو شاعر کے طور پر کم اور سیاسی رہنما کی حیثیت سے زیادہ لوگ جانتے ہیں [illegible] ایک قدآور [illegible] کے مالک ہیں۔ طالب علمی کے زمانے میں بزم سخن سے [illegible] اور شعر و ادب [illegible] سیاست کے جھلے نے انہیں ادب سے چھین لیا۔ پھر بھی جب تک پشاور میں رہے [illegible] شعر بھی کہتے رہے اور ادبی حلقوں میں بھی شریک ہوتے رہے۔ [illegible] اکبر الہ آبادی مرحوم سے بذریعہ خط و کتابت مشورہ کیا کرتے تھے۔

شروع میں نیشنلسٹ خیالات رکھتے تھے اور کانگرس کے سرگرم کارکن تھے۔ بعد میں نظریات میں انقلاب رونما ہوا اور بعض دوسرے نیشنلسٹ مسلمانوں کی طرح کانگرس کو متعصب ہندوؤں کی جماعت سمجھ کر اس سے کنارہ کش ہو گئے اور مسلم لیگ میں شامل ہو کر مسلمانوں کی علیحدہ ریاست کے قیام کے لئے کوشش کرنے لگے۔

انہوں نے ایک وکیل کے طور پر اپنی زندگی کا آغاز کیا اور ترقی کرتے کرتے حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر پہنچ گئے۔ پاکستان کے چوٹی کے رہنماؤں میں شمار ہوتے ہیں ـــ فارسی، انگریزی، اردو اور پشتو کے نہایت اعلیٰ مقرر ہیں۔ اب ادھیڑ عمر ہو چلے ہیں لیکن بانکپن نہیں جاتا۔ آنکھوں کی چمک اور چہرے کی شگفتگی برقرار ہے۔ انہیں دیکھ کر یہ بات بے حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ شاعر

کے لئے باعث مسرت و افتخار ہے۔

میر ولی اللہ

میر صاحب ضلع ہزارہ کی ممتاز ادبی شخصیت ہیں۔ وہ ادیب، محقق اور مستند افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے جو کچھ لکھا وہ علم و ادب [illegible] اور [illegible] سے [illegible] خدمت ادب کی [illegible] شگفتہ اور [illegible] لکھتے ہیں [illegible] کے [illegible] ہیں اور [illegible] بہت [illegible] ہوتی ہے [illegible] کی بحالی [illegible] برقرار ہے۔

[illegible] مسائل پر [illegible] ان کے علاوہ [illegible] اپنے علم و فضل سے انہوں نے [illegible] ہے۔ آپ انگریزی، فارسی، عربی اور [illegible] کا مطالعہ رکھتے ہیں۔ وہ پہلے [illegible] ہیں جنہوں نے ادبی حلقوں اور متحدہ ہندوستان کے [illegible] کے [illegible] روشن [illegible] ادبی [illegible] پہنچ چکے ہیں۔

میر صاحب کی شخصیت [illegible] ہے۔ آپ [illegible] ایک [illegible] کامیاب [illegible] لکھتے ہیں۔

میر صاحب [illegible] غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔

میر صاحب [illegible] قسم کے [illegible] ہیں جو تمام اصناف ادب پر [illegible] ہیں اور سب سے اہل محفل پر چھائے ہوئے ہیں۔

آپ [illegible] پسند کرتے ہیں اور [illegible] فرصت کے اوقات میں تصنیف و تالیف کا محبوب مشغلہ ہے۔

وحید المؤرخین حاجی سرمدی

راولپنڈی کے قیام کے دوران میں جس بزرگ سے ملنے کا اتفاق ہوا وہ بڑی نستعلیق قسم کی شخصیت کے مالک تھے۔ ملتے ہی [illegible] جب ختم چند تاریخیں ارشاد فرمائیں اور ہمیں بغیر کسی تعارف کے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ آپ ہی وحید المؤرخین حضرت حاجی سرمدی ہیں۔ ابتدا میں گورنمنٹ ہائی سکول [illegible] میں معلم رہے پھر ہیڈ ماسٹر کے عہدے پر راولپنڈی تبادلہ ہوا اور اسی سرزمین کو اپنا مسکن بنایا وفات بھی وہیں پائی۔

نہایت پرگو واقع ہوئے تھے عمر بھی طویل پائی غزلوں نظموں کا بے پناہ ذخیرہ ترکے میں چھوڑا لیکن بدقسمتی سے کوئی مجموعہ چھپ نہ سکا۔

حاجی سرمدی مرحوم اپنے دور کے ممتاز شاعر تھے لیکن ان کی شہرت ایک تاریخ گو کے طور پر ہوئی تاریخ گوئی میں انہیں مہارت تامہ حاصل تھی۔ برصغیر پاک و ہند کی مشاہیر شخصیتوں نے انہیں بیسویں صدی کا سب سے بڑا تاریخ گو تسلیم کرتے ہوئے وحید المؤرخین کا خطاب دیا۔

جن حضرات کو حاجی مرحوم سے شرف نیاز حاصل ہوا ہے وہ اس امر کی تائید کریں گے کہ فی البدیہہ تاریخ کہنے میں آپ کس قدر ماہر واقع ہوئے تھے۔ باتوں باتوں میں یوں بے تکلف تاریخ کہتے جیسے پہلے ہی سے مادے نکال رکھے ہوں جو کوئی ملنے جاتا اس کی آمد پر برجستہ تین چار تاریخیں کہہ ڈالتے۔ آپ نے دنیا کی مشاہیر شخصیتوں کے متعلق ایسی بے مثال تاریخیں کہیں جو اردو ادب کے گراں بہا ذخیرے کے طور پر محفوظ رکھنے کے قابل ہیں آپ نے نثری طور پر بھی بے مثال تاریخیں یادگار چھوڑیں۔ آخر عمر میں فن تاریخ گوئی پر ایک بلند پایہ کتاب بھی لکھ رہے تھے جسے مکمل کرنے کی موت نے فرصت نہ دی۔

ذوالفقار بخاری

[illegible]

[illegible]

[illegible]

دیکھنے میں کچھ معصوم سے لگتے ہیں [illegible] —— [illegible]

[illegible] رہتے ہیں۔

[illegible] —— ایک ہی نشست میں غزل کہتے ہیں، بے تکلف لکھتے ہیں، جب چاہیں لکھتے ہیں اور خوب خوب لکھتے ہیں۔ [illegible] موزونیت، بندش اور اسلوب کا خیال رکھتے ہیں، اشعار کو [illegible] بٹھانے میں انہیں خاص کمال حاصل ہے

فہمیدہ اختر

[illegible] گھرانے کی چھوٹے قد کی یہ نوجوان خاتون ادبی حیثیت سے بہت اونچی شخصیت رکھتی ہیں۔ حلقۂ نسواں کی بہت بڑی افسانہ نگار ہیں۔ ادبی ذوق گھٹی میں پڑا تھا۔ طالب علمی کے زمانہ ہی سے علم و ادب میں دلچسپی لینے لگیں۔ لیڈی گریفتھ گرلز ہائی اسکول ہی سب سے پہلی ادبی انجمن بزمِ ادب کی بنیاد رکھی اور اس کی جنرل سیکرٹری مقرر ہوئیں۔

سرحد میں خواتین مسلم لیگ کی بنیاد پڑی تو ادب کو خیرباد کہہ کر سیاست میں حصہ لینے لگیں اور قیامِ پاکستان کے سلسلہ میں ان تھک کام کیا۔ [illegible] میں ادارۂ تعمیرِ نو میں شامل ہونے سے ادبی جنون پھر تازہ ہوا اور چند ایک اچھے افسانے پیش کرنے کے بعد پھر سیاست کی بھول بھلیاں میں کھو گئیں۔ لیکن ایک عرصہ تک سیاست کے خارزار میں بھٹکنے کے بعد احساس ہوا کہ ان کی قربانیوں کا اثر ایک خاص طبقہ کی چار دیواری میں مقید ہے

چاہتا ہے۔ وہ ملک و قوم کی سربلندی کے ہر نقش [illegible] وہ مسائل [illegible] کی موقع پر [illegible] سب کی [illegible] چنانچہ انہوں نے [illegible] حب الوطنی سے [illegible] بہت مقبول ہوئیں۔

انہوں نے [illegible] مضامین [illegible] کی [illegible] ہے۔

نثار عزیز

[illegible]

قتیل شفائی

قتیل [illegible] اس وقت [illegible] وہ اس وقت شعر [illegible] کی بات ہے۔ وہ [illegible] کی ملازمت [illegible]

تھوڑے وقفہ بعد ہی قتیل کا نام اخبارات اور رسائل میں نظر آنے لگا۔ وہ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ چوٹی کے شاعروں میں شمار ہونے [illegible] اس ابتدائی حالت کو نہ بھولا یہی وجہ ہے کہ آج تک ہم سے مخلصانہ تعلقات جن کے وہ قائل ہیں۔

قتیل کی منفرد شخصیت میں اس کی خود اعتمادی کو بڑا دخل ہے۔ وہ بہ خود غلط انسان نہیں اپنی کمزوریوں کا بھی اسے احساس ہے لیکن اپنی خوبیاں بھی اس سے ڈھکی چھپی نہیں۔ وہ محنتی ہے ذہین ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ حوصلہ مند بھی ہے۔ اسے موجودہ مقام تک پہنچنے میں بڑی جگر کاوی سے کام لینا پڑا۔ قدم قدم پر ناکامیوں سے سابقہ پڑا لیکن وہ مایوس نہ ہوا اور ایک دفعہ جو قدم آگے بڑھایا اسے کسی قیمت پر بھی پیچھے نہ ہٹایا۔

قتیل دوستوں کا دوست اور دشمنوں کا دشمن ہے وہ منافقت نہیں جانتا۔ صاف دلی اور صاف گوئی اس کی وہ خصوصیات ہیں جو بسا اوقات اس کے لئے بڑی نقصان دہ بھی ثابت ہوئیں لیکن مقتضائے طبیعت کے باعث وہ ان چیزوں کو ترک نہ کر سکا۔

قتیل کی شاعری کی ابتدا بھی گیتوں سے ہوئی اور شاید اس کی انتہا بھی گیتوں ہی پر ہو وہ نغز گو بھی ہے۔ اور خوب نویس بھی۔ اس کا مزاج گیتوں کے لئے بنا ہے وہ حسن اور رومان کا شاعر ہے گیتوں کا شاعر ہے اس کی غزلوں نظموں میں بھی گیت ہی بنتے بنتے نظر آتے ہیں۔

قتیل کے گیتوں کی نمایاں خصوصیت ان کی رفعت اور گہرائی ہے اس کے گیتوں میں دیہات کے الھڑ اور سادہ باشندوں کے بے لوث اور خالص جذبات و احساسات کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں اور ان میں وہ ملکی مزاج ملتا ہے جو اردو شاعری کی دوسری اصناف کو فارسی کی تقلید کی وجہ سے نصیب

[illegible] ہے۔

[illegible] ہے۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ہیں۔

[illegible]

[illegible] ہیں۔

موسےٰ خان کلیم

سب سے پہلے ۱۹۶۳ء میں ماہنامہ "[illegible]" کے سلسلہ میں ان کا نام سننے میں آیا۔ انہی دنوں نہ صرف ان کا نام سنا بلکہ انہیں دیکھنے کا اتفاق بھی ہوا۔ وہ خود ڈیرہ اسمٰعیل خاں سے چل کر ملنے کی سعادت حاصل کرنے کے لئے پشاور آئے۔ ڈیرہ جیسے دورافتادہ مقام سے ایک بلند پایہ ادبی پرچے کا اجراء کلیم ہی کا کام تھا اس پرچے کو کامیاب بنانے کے لئے انہوں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا لیکن اس ناسازگار ماحول میں وہ پرچہ زندہ نہ رہ سکا اور وہ بمشکل تمام سال بھر تک زندہ رہ سکا۔

نام موسیٰ خان تھا تخلص کلیم اختیار کیا، پرچہ نکالا تو وہ بھی "[illegible]" ـــــ ان تمام دماغوں سے ان کے کلاسیکل ذوق کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

[illegible] پشاور سے ایم اے کیا اور [illegible] منصب پایا

علم [illegible] مطالعہ وسیع ہے اور [illegible] —— اقبال اور غالب سے بہت متاثر [illegible]

[illegible]

شعر کم اور نثر زیادہ [illegible] تحقیقی مضامین لکھتے ہیں [illegible]

مضطر تاتاری

پشاور کے جدید شعراء میں سب سے پہلے میرا تعارف مضطر ہی سے ہوا لیکن یہ حقیقت ہے کہ بہت بعد میں معلوم ہوا کہ وہ بالکل [illegible] ہے۔ اس انکشاف نے صرف مجھے ہی نہیں بڑے بڑے لوگوں کو چونکا دیا۔ کیونکہ اس کی گفتگو، اس کے کلام اور اس کے مبلغ علم [illegible] سے یہ بات ظاہر نہیں ہوتی کہ وہ سرے سے پڑھنا لکھنا جانتا ہی نہیں۔ چنانچہ جب ندیم قاسمی صاحب پر یہ راز کھلا تو انہوں نے کہا —— "یہ شخص اگر پڑھا لکھا ہوتا تو بڑے بڑے نقادوں کی کرسیاں خالی کرا لیتا۔"

مضطر —— ساغر، عدم اور مجروح کا شاگرد بھی ہے اور صحبت یافتہ بھی —— اس کی شاعری کی ابتدا [illegible] سے ہوئی —— جب جوش اور اقبال کے ساتھ [illegible] شاعری کا تعلق رہا۔ اور انہیں شاعروں سے وہ متاثر بھی نظر آتا ہے —— سب سے پہلے مضطر نے [illegible] دائرہ ادبیہ کے مشاعرہ میں پڑھی اس نظم کی [illegible] اہل [illegible] نے اسے [illegible]

مضطر نظم کا شاعر ہے یہ کہنا کہ [illegible] غزل سے ہوتی ہے مضطر کے [illegible] ہوتا ہے۔ کیونکہ اس نے تمام [illegible] نہیں کی۔

مضطر ایک مخلص دوست اور سچا فنکار ہے۔ اس نے تمام [illegible] وہ ایک [illegible] ہے۔ [illegible] نعرہ —— وہ ادبیات سرحد کے [illegible] کا خود رو پھول ہے۔ [illegible] ہے، ایک گیت ہے۔

فارغ بخاری[1]

فارغؔ سے میرا تیس برس کا ساتھ ہے۔ ہم دونوں اخبارات و رسائل میں مل کر کام کرتے رہے۔ ادبی اداروں میں ایک ساتھ حصہ لیا۔ تصنیف و تالیف میں رفیق کار رہے۔ اور روزمرہ کی زندگی میں اتنا قریب رہا کہ اب تو ایک دوسرے کے بغیر زندگی کا تصور بھی محال نظر آتا ہے۔

اس عرصہ میں جہاں تک میں نے فارغ کا مطالعہ کیا وہ مجھے ایک بہت بڑا شعبدہ باز نظر آیا۔ وہ جو کچھ بظاہر دکھائی دیتا ہے درحقیقت ویسا نہیں بلکہ ذرا غور سے دیکھئے تو اسے بالکل اس کے برعکس پائیے گا۔ دراصل اسے لوگوں کو دھوکا دینے میں لطف آتا ہے اسی لئے اس نے اپنی شخصیت کو کتنے ہی مصنوعی خولوں میں چھپا رکھا ہے۔ مثال کے طور پر اس کا قد جتنا چھوٹا ہے شخصیت اتنی ہی بڑی ہے۔ وہ جتنا بڑا فنکار ہے اس سے کہیں زیادہ بڑا انسان ہے۔

فارغ کو پہلی نظر میں دیکھ کر انسان کو خاصی مایوسی ہوتی ہے۔ خشک سا قد، بے ڈھنگا سا ناک نقشہ، نہ گفتگو میں کوئی کشش اور شکل و صورت میں جاذبیت، نہ میل جول میں رغبت —— کیا یہی وہ فارغ ہے جس کی نظمیں لوگ جھوم جھوم کر پڑھتے ہیں جس کی تحریروں سے حکومت کو بغاوت کی بو آتی ہے، جو پوری ایک درجن کتابوں کا مصنف ہے وہ کتابیں جنہیں پڑھ کر اس کی عظمت کا عظیم و حکیم مجسمہ ذہن [illegible]

---

[1] فارغ بخاری پر رضا ہمدانی نے لکھ کر اس سلسلے کو مکمل کر دیا۔ (مرتب)

[illegible]

فارغ [illegible] شعبہ [illegible] ان میں کام کرنے کی قوت [illegible] صلاحیت ہے کہ بہت [illegible] تو [illegible] طنز و مزاح [illegible] مضامین وغیرہ [illegible] فارغ [illegible] اخبارات و رسائل [illegible] سوانح [illegible] جیسے [illegible] بعد تصنیفات و تالیفات کا خیال ہوا تو شاید قلیل عرصے میں متعدد کتابیں لکھ ڈالیں۔

اگر آپ جلدباز واقع نہیں ہوئے اور پہلے ہی لمحے ان کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں قائم کر لیجیے تو دوسرے ہی لمحے سے بے تکلف پائیے گا اور پھر لمحہ بہ لمحہ اس مصنوعی سنجیدگی کے چھلکے اترتے جائیں گے اور ان میں سے ایک ایسی بھولی اور دلآویز شخصیت ابھرنے لگی جسے آپ گھرنا چاہیں بھی تو نہ بچا سکیں۔ اس جادو کو توڑنے کے لئے جس چیز کی ضرورت ہے [illegible] عام طور پر لوگ اپنی تعریف سے خوش ہوتے ہیں لیکن فارغ پر یہ تجربہ کبھی نہ کر دیجیے گا ورنہ اس کا موڈ اور زیادہ بگڑ جائے گا۔ کیونکہ اسے خوشامد سے بے حد چڑ ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ وہ جلد از جلد کھل جائے اور کھل کر اصلی فارغ سامنے آ جائے تو چپکے سے کوئی ادبی بحث چھیڑ دیجیے یا پھر شام کے بعد اسے ملئے۔ کیونکہ رات کے چوبیس گھنٹوں میں یہی ایک ایسا وقت ہے جب وہ اس موڈ میں ہوتا ہے جس کے متعلق غالب نے کہا ہے۔ ع پھر دیکھیے انداز گل افشانی گفتار۔ ایک دفعہ اسے چھیڑ دیجیے اور چپ بیٹھیے وہ یوں چہکنے لگے گا جیسے محفل میں طلسمی مٹھائی بانٹ رہا ہو۔

فارغ کو اپنی شخصیت بنانے کے لئے بڑے پاپڑ بیلنے پڑے ہیں۔ وہ بچپن ہی سے بڑا حساس واقع ہوا تھا اسی شدت احساس کے

باعث اس نے اپنے والد مرحوم کی وفات کے بعد بھائیوں پر بوجھ بنا گوارا نہ کیا اور تعلیم ادھوری چھوڑ کر کوئی معاش میں لگ گیا وہ دلی، لکھنؤ، کلکتہ اور دوسرے شہروں میں گھومتا رہا ——— اس نے صرف پندرہ سال کی عمر سے اپنی زندگی کا آغاز کیا ——— پھر کبھی کباڑیوں کی تو کبھی بہی کھاتے لکھتا رہا، کبھی منیم بنا تو کبھی کلرک، کبھی [illegible] کا [illegible]، بار کیا تو کبھی کارخانوں کی ہیچوں، کبھی کتابوں کا دھندا چلایا تو کبھی صحافت کو ذریعہ معاش بنایا، لیکن اس کی بیتاب صفت طبیعت کو کسی بھی سکون نہ ملا ——— آخر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پھر سے عمر کے لئے جدوجہد شروع کر دی اور [illegible] کی قوت [illegible] اس کی مشکل کو بجھا تار ہا۔

آج اس کی زندگی بہت حد تک منظم ہو چکی ہے لیکن اب بھی وہ عالم ہے کہ [illegible] وہ ایک آزاد [illegible] حیثیت سے اپنی ذہنی صلاحیتوں کو ایک جال کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ [illegible] اخبار کے دفتر میں ایک [illegible] کے سامنے [illegible] تو [illegible] بات سمجھتے ہیں ایک شاعر اور مصنف کے لئے [illegible] ہوتا ہے

فارغ زندگی کی [illegible] سے [illegible] ہے [illegible] ہے۔ [illegible] ذہنی [illegible] کبھی [illegible] رہا ہے آ گئے [illegible] لیکن [illegible] [illegible] رہتا۔

[illegible] جب [illegible] کی زندگی [illegible] وہ ایک لکھنے سے محروم ہوا [illegible] جیل سے اس نے مجھے جو خط لکھے ان میں [illegible] قید کی صعوبتوں کا بھی بھول کر بھی ذکر نہ [illegible] کیا [illegible] [illegible] [illegible] رہتا جیسے اسیری کے [illegible] وہ نہیں [illegible] رہا ہوں۔

فارغ جیل میں بھی [illegible] اس نے معروف [illegible] [illegible] ادب [illegible] مختلف کتابوں کا مطالعہ کیا اور وہ بہت قیمتی کتابیں لکھیں [illegible] [illegible] نظموں [illegible] کا مجموعہ [illegible] جس میں جیل کی آپ بیتی ہے

فارغ اپنی نظروں میں صبح کا [illegible] اور کوئی [illegible] [illegible] ہے لیکن [illegible] حقیقت سے [illegible] واقف ہیں کہ وہ اصل [illegible] کی تاریکی کا دلدادہ ہے ——— دن کو تو وہ اپنی زندگی کا حصہ ہی نہیں سمجھتا کیونکہ اس وقت تو اس نے محض نان و نفقہ کے حصول کی خاطر سے محنت و مزدوری کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ [illegible] رات کو وہ صرف اپنی طبیعت کا [illegible] ہے [illegible] [illegible] بھی [illegible] نہیں [illegible] [illegible] [illegible] بڑی بڑی منفعت بخش [illegible] کو ٹھکرایا [illegible] معاشی وسائل پر لات ماری [illegible] کہ وہ اس کی دولت پر ڈاکہ ڈالنا چاہتے تھے۔ رات ہوتے ہی وہ [illegible] العنان بادشاہ کی [illegible] اپنا [illegible] شروع کر دیتا ہے۔ جس اہتمام سے وہ رات کی دیوی کا استقبال کرتا ہے اس کے چرنوں میں عقیدت کے پھول چڑھاتا ہے۔ اور جب پوری رات کی دیوی کی عبادت میں معروف ہوتا ہے تو بسا اوقات صبح کے تڑکے تک یہ ریاضت جاری رہتی ہے۔

فارغ کو دوستوں سے بڑا پیار ہے لیکن تنہائی اسے دوستوں سے بھی زیادہ عزیز ہے [illegible] کاغذ، قلم اور کتابیں مہیا کر دی جائیں تو شاید تمام عمر بھی وہ تنہائی سے نہ گھبرائے گا۔

حسن، شراب اور شعر ——— فارغ کی تین سب سے بڑی کمزوریاں ہیں۔ اس کی ان کمزوریوں سے بعض مہاسی دوستوں نے بڑے بڑے فائدے اٹھائے ہیں۔ وہ بت شکن کہلاتا ہے اور واقعی اس نے بڑے بڑے بتوں کو توڑا بھی ہے۔ سب سے پہلے تو اس نے اپنے خاندان کے اس روایتی بت کو توڑا کہ مسندوں پر بیٹھ کر آباء کے نام کی سوداگری کرو اور سادہ لوح مریدوں سے روپیہ بٹور کر عیش کرو لیکن جہاں محنت کا نام آئے وہاں صاف انکار، اس کا خیال ہے کہ سیدوں نے اپنے آپ کو برہمن کی طرح کی کوئی ہستی سمجھ رکھا ہے جو مزدوری کرنا کسر شان سمجھتے ہیں، فارغ کو چونکہ شروع ہی سے روایتی باتوں سے چڑ تھی اس لئے اس نے محنت مزدوری کو کبھی عیب نہ سمجھا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible] کسی قسم کا [illegible] سے نہ ہو سکی [illegible]

[illegible]

فارغ کی اپنی طبیعت کے تلون کا اندازہ [illegible] ذریعہ معاش ہی کو لیجئے [illegible] مختلف مقامات کا سیر [illegible] اسی طرح [illegible] اس نے [illegible] منظومات میں غزل، نظم، رباعی، قطعہ، مرثیہ، سہرا، منظوم [illegible] گیت [illegible] مضمون، تنقید، ڈرامہ، ناول [illegible] ہر شعبے پر ہاتھ مارنے کی کوشش کی۔

زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی اس کے تلون کا یہی عالم ہے۔ لیکن جب ہم [illegible] تعلق کی مستقل مزاجی اور وفاداری [illegible] دیکھتے ہیں تو اس کی شخصیت کے اس واضح تضاد پر سخت حیرت ہوتی ہے۔

دراصل فارغ دوہری شخصیت کا مالک ہے۔ ایک اس کی انفرادی شخصیت ہے دوسری اجتماعی ۔۔۔ لیکن ان دونوں متضاد شخصیتوں میں اس نے کچھ اس خوبصورتی سے سمجھوتہ کر رکھا ہے کہ ان کے درمیان کسی قسم کے تصادم کا امکان نہیں رہا۔ اسی طرح جس طرح اس کے نام "سید میر احمد شاہ" اور اس کے تخلص "فارغ بخاری" میں۔

انتظاریہ

سرسید احمد خاں

(شیخ محمد اسماعیل پانی پتی)

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ملاقات ہوئی [illegible] ہاتھوں سے [illegible]
[illegible] قبول کیا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

میں نے خواب نما [illegible] دیکھے تھے [illegible] کمروں میں سے گزرتے ہوئے ایک بڑے کمرے میں آئے جو مجھے بہت وسیع معلوم ہوا [illegible] بڑے دروازے پر خس کی ٹٹی لگی ہوئی تھی اور پنکھا چل رہا تھا [illegible] کھینچنے والا نظر نہ آتا تھا۔ کمرے میں بہت سی خوبصورت کرسیاں [illegible] وضع کی رکھی ہوئی تھیں اور خس کی خوشبو کے ساتھ کوئی اور خوشبو بھی وہاں موجود تھی جو بہت اچھی معلوم ہوتی تھی۔ خس کی ٹٹی کے قریب ایک میز پر جس کی پوشش سبز تھی بہت سے کاغذ اور کتابیں اور کچھ چمکتی ہوئی چیزیں نہایت سلیقے اور خوب صورتی سے رکھی ہوئی تھیں۔ میز کے قریب ہی کرسی پر ایک بھاری بھرکم آدمی۔ سفید سر، سفید ڈاڑھی، سفید لباس۔ موٹے موٹے پاؤں اور ان میں سلیپر جیسے قالین کے ٹکڑے معلوم ہوتے تھے۔ شیر کا سا کلہ [illegible]

[illegible]

سید صاحب [illegible] باتیں کرتے [illegible] دونوں [illegible] بھی [illegible] بیٹھے تھے۔ [illegible]
[illegible] بیٹھ گئے تھے [illegible] سید صاحب [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] سید صاحب نے [illegible]
[illegible]
[illegible] شاید [illegible]

یہ دونوں بزرگ باتیں بھی کرتے جاتے تھے اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد قہقہے بھی لگاتے تھے۔ سید صاحب نے کچھ [illegible] والا کر دیئے جب وہ ان کو پڑھنے لگے تو سید صاحب لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد سید صاحب نے لکھتے لکھتے قلم ہاتھ سے رکھ دیا اور ایک چھوٹے سے بکس کی طرف ہاتھ بڑھا کر بڑی بےتابی [illegible] سید صاحب نے بکس میں سے ایک چروٹ نکال کر [illegible] اور جب [illegible] کے قریب [illegible] تو مجھ کو [illegible] چہرہ اور بھی عظیم الشان اور خوفناک معلوم ہونے لگا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ خس کی خوشبو کے علاوہ جو خوشبو کمرے میں پھیلی ہوئی تھی وہ چروٹ کی تھی۔

اس آواز اور چہرے کا نقش دل پر ہونے ہی میں سید صاحب سے ڈرنے لگا اور یہ اُسی خوف کی ابتدا تھی جو ہمیشہ قائم رہا۔ جو خود غائب کبھی دل سے نہ گیا۔

گھر کے بیرونی حصے میں سید صاحب کی نشست تھی جس کے قریب ہی ایک کمرہ مہمانوں کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ ہمیں سب سامان ملا گیا تھا۔ کچھ دیر سید صاحب کے پاس بیٹھ کر جب والد صاحب اس کمرے میں آئے تو ہم دونوں بھائی بھی ان کے ساتھ تھے۔ کمرے میں [illegible] کا [illegible] تھا۔ سب سے عجیب تھا کہ بلا اجازت کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائیں۔ [illegible] جو آئینہ دار خوبصورت میز رکھی تھی اس پر کچھ چیزیں شیشے کی رکھی تھیں۔ [illegible] دشمنی تھی کہ جوں ہی میں نے ہاتھ [illegible] کسی چیز کو ہاتھ لگایا اور وہ آپ سے آپ ٹوٹ کر گر پڑی تھی۔

شام ہوئی تو سید صاحب [illegible] کوٹھی کے سامنے ہی ایک طرف کو باغ تھا اس کے بیچ [illegible] تھا اس پر بہت سی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کرسیوں پر بیٹھ کر سید صاحب اور ہمارے والد باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد [illegible] صاحب نے مجھے [illegible] ہم دونوں [illegible] منہ کھولو تو میں نے منہ کھول دیا [illegible] منہ میں ڈال دیا [illegible] میں نے [illegible] جلدی سے منہ بند کیا اور کچھ پان کھا [illegible] بات ہے۔

جب کچھ رات ہو گئی تو آدمی نے آکر کہا کھانا میز پر ہے۔ ہم سب لوگ اٹھے اور کھانے کے کمرے میں آگئے۔ یہاں [illegible] آنکھوں کے لیے عجیب و غریب منظر تھے۔ میز پر بہت سفید چادر۔ چینی کے برتن۔ شیشے کے گلاس۔ چاندی کے چمچے [illegible] کے دستے کی چھریاں میز پر رکھی تھیں۔ میز پر دو [illegible] لیمپ [illegible] تھے۔ پنکھا چل رہا تھا۔

اس سامان کو دیکھ کر مجھے اپنے گھر کا دسترخوان [illegible] برتن اور [illegible] یاد آیا۔ میری والدہ دسترخوان ہمیشہ اجلا بچھایا کرتی تھیں [illegible] تھا۔ [illegible] برتن تانبے کے قلعی دار ہوتے تھے۔ چینی کے برتن خاص خاص کھانوں کے لیے یا جب کوئی مہمان آتے تو [illegible] شیشے کے گلاس صرف گرمیوں میں رمضان شریف میں افطار کے وقت نکالے جاتے تھے۔ [illegible] ان کی [illegible] چاندی کے [illegible] کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے تھے۔ گھر کا [illegible] اگرچہ [illegible] سمجھا جاتا تھا مگر اس کی [illegible] روشنی ان لیمپوں کی صاف اور تیز روشنی کے سامنے کیا حقیقت رکھتی تھی۔

باتیں کرتے اور قہقہے لگاتے سب لوگ میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ [illegible] سفید پوش [illegible] اور ایک بہت بڑی لمبی داڑھی کا دبلا پتلا سرکا مگر بے حد چست [illegible] اور تیز خانساماں طرح طرح کے کھانے سامنے لاتا تھا۔ اور سب لوگ چمچوں سے حسب ضرورت کھانا اپنی رکابی میں نکال کر کھاتے تھے۔ ہم دونوں بھائیوں کی [illegible] میں [illegible] نے خود ہاتھ سے کھانا نکال کر دیا کھانے کے ذائقہ کی نسبت میں نے غور نہ کیا مگر یہ یقینی ہے کہ وہ گھر جیسا نہ تھا۔ اور سچی بات یہ ہے کہ میں نئی نئی چیزوں کے دیکھنے میں ایسا مصروف تھا کہ کچھ سمجھ ہی میں نہ آیا کہ کیا کھا رہا ہوں۔

جب ہم دونوں کھانا کھا چکے۔ تو سید صاحب نے ایک نوکر سے کہا کہ "ان بچوں کو ان کے پلنگوں پر لے جا کر سلا دو۔"

صبح ہوتے ہی چڑیوں کی آواز پر آنکھ کھلی۔ میں بے انتہا خوش تھا۔ جتنی چیزیں اب تک دیکھی تھیں ان کی نسبت بیسیوں سوال والد سے کرتا تھا۔ اور بار بار پوچھتا تھا کہ الٰہ آباد میں یہ سب چیزیں ہوں گی یا نہیں۔ والد کبھی تو جواب دے دیتے تھے۔ کبھی ہنس کر چپ ہو جاتے تھے۔

والد نے علی گڑھ میں دو دن قیام کیا۔ پھر الٰہ آباد روانہ ہو گئے اور دوسرے دن سورج ابھی نہیں نکلا تھا کہ وہاں پہنچ گئے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] عاتم لیڈروں کی ست نے پیدا کیا تھا تو شاید [illegible] ہوتا۔

[illegible] مختصر [illegible] بہر حال عملی [illegible] ہندستان کے ساتھ اپنے تعلقات [illegible] مغربیت سے لوگوں [illegible]
[illegible] اشخاص میں سے ایک تھے یعنی ان کی ذات میں بیک وقت بہت سے گن [illegible] جمع ہو گئے تھے۔ وہ [illegible] ایک [illegible]
[illegible] ادیب بھی تھے۔ جہاں انہوں نے مسلمانوں کو تعمیر کی طرف [illegible] اپنے [illegible] زندگی
جہاں انہوں نے مدرسۃ العلوم مسلمانان قائم کیا۔ وہاں سائنٹفک سوسائٹی اور آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بھی بنیاد ڈالی۔ ایک طرف انہوں نے
مسلمانوں کی تعلیمی رہنمائی کی تو دوسری طرف انڈین کانگریس سے مسلمانوں کو دور رکھا۔ یہ ایسی [illegible] مسلمانوں [illegible] سے بڑا لیڈر بھی اس دعویٰ سے اپنے دامن کو نہ
[illegible] سرسید کی حقائق بین نگاہ نے پہلے ہی نظر میں نہایت عاقبت اندیشی سے تاڑ لیا تھا کہ کانگریس کبھی بھی مسلمانوں کی حقیقی ہمدرد نہیں ہو سکتی۔ اس نے سرسید
[illegible] مسلمانوں کو اس سے الگ رہنے کی بڑے زور سے تلقین کی۔ یہی حقیقت تھی جو ہمارے [illegible] بڑے تلخ تجربوں کے بعد آخر میں ظاہر ہوئی
[illegible] ایک ایک کرکے کانگریس سے نکل گئے۔ ایسے ہی موقع پر اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید کتنا بلند نگاہ، عاقبت اندیش اور صائب الرائے
انسان تھا۔

ہمارے بہت سے سیاسی لیڈر مذہب سے بالکل کورے ہوتے ہیں۔ اور ہمارے حیثیتِ مذہبی رہنما سیاست میں صفر محض کا درجہ رکھتے ہیں۔

اتفاقاً ایک بار سرسید [illegible] ملاقات کو گئے [illegible] ایک بار [illegible] تھے [illegible] پر بھی بہت [illegible] کرتے تھے [illegible] مولوی سید [illegible] ایک [illegible] تھے جو ایک [illegible] ایک کتاب احادیث سے [illegible] ہے۔ انھوں نے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ہے [illegible] ہے [illegible] ہے۔

[illegible] مسلمانوں کے [illegible] انقلاب برپا ہو رہے تھے [illegible] جنگ سے پہلے مسلمانوں کے [illegible] ہندوستان میں اُن کی عظیم الشان سلطنت [illegible] تقاضوں کے [illegible] تھے۔ تعلیم اور تہذیب [illegible] ادب [illegible] سرسید احمد خاں [illegible]

جب غدر کا [illegible] مسلمانوں پر جو گزرنا تھا وہ بھی گزر گیا تو [illegible] سرسید احمد خاں [illegible] قوم کو جھنجھوڑنے اور جگانے کے کام میں مصروف ہو گئے۔

انھوں نے سب سے اول مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کی طرف توجہ دلائی۔ جس کے بغیر اس زمانے میں اُن کی حیثیت [illegible] تھی۔ [illegible] نے اپنے وطن کی حالت دیکھ کر اپنی قوم کو غیرت دلائی اور اُس کے نونہالوں کے لئے علی گڑھ میں ایک مدرسہ قائم کیا۔ [illegible] اس مدرسے سے [illegible] ہندوستان میں تعلیم و تہذیب کی روشنی پھیلی اور مسلمانوں میں اپنے دیگر اہل وطن کے دوش بدوش کھڑے ہونے کے قابل ہو سکے۔

اس مدرسے کی ابتدائی ترقی کا اندازہ اس امر سے لگائیے کہ [illegible] میں اس کے رجسٹر میں طلبہ کی تعداد صرف [illegible] تھی۔ مگر صرف دس گیارہ سال کے عرصہ میں چار سو تک پہنچ گئی۔

مدرسۃ العلوم مسلمانان کے قیام کے بعد سرسید نظم اردو کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوئے۔ چونکہ خود شاعر نہ تھے (اگرچہ آہی تخلص کے ساتھ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

سرسید ایک سورج تھے [illegible] روشنی [illegible] چاند تھے [illegible] ستارے [illegible] کی روشنی [illegible]

مولانا حالی نے ۱۹۰۱ء میں بمقام [illegible] سرسید کی [illegible] کے موقع پر ایک تقریر [illegible] انجمنیں، سوسائٹیاں، سبھائیں اور کانفرنسیں قائم ہوئی ہیں۔ جس قدر [illegible] نے ملک کے اطراف و جوانب میں [illegible] اردو، ہندی اور سنسکرت میں [illegible] تصنیف [illegible] ملک میں شائع ہوئے ہیں۔ اگر غور کر کے دیکھا جائے تو یہ سب اسی ایک محسن [illegible] یعنی سرسید [illegible] کی تحریک کے کرشمے ثابت ہوں گے۔

سرسید کی شخصیت میں سب سے بڑا عنصر مسلمانوں کی خیر خواہی اور ہمدردی تھا۔ وہ جرأت و ہمت کے پیکر اور قومی خیر خواہی و ہمدردی کا مجسمہ تھے۔ [illegible] کے کہنے میں انہوں نے کبھی [illegible] جان و مال اور عزت و آبرو کے نقصان کی پروا نہ کی۔ ۱۸۵۷ء کا واقعہ مسلمانوں کے لئے ایک عذاب [illegible] قیامت صغریٰ سے کم نہ تھا۔ جس کے بعد انگریزوں کی نظر میں مسلمان سے زیادہ کوئی قوم مجرم [illegible] نہ تھی۔ اس وقت انگریزوں کے نزدیک

مسلمان [illegible] اس وقت مسلمانوں کے حق میں [illegible] [illegible] بڑے سالار [illegible]
[illegible] ہو [illegible] اس سے قصہ [illegible] بے پروائی سے [illegible]
[illegible] اسباب بغاوت ہند [illegible]
[illegible]
حقیقت [illegible] وقت [illegible]

[illegible]

والسلام

[illegible]

[illegible] ہمت نہ ہاری مگر خود بیمار ہو کر [illegible] کتب خانہ نیلام کر دو [illegible] ایک کراچی [illegible]
[illegible] بھیجا۔ پھر اپنے خاص خاص دوستوں کو لکھا [illegible] اس سلسلے میں اپنے دوست نواب محسن الملک کو خط لکھا کہ میں نے مصمم
ارادہ کر لیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں کتاب لکھی جائے۔ اگر تمام [illegible] خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے قابل ہو جاؤں تو بہتر ہے۔ قیامت میں یہ کہہ کر پکارا جاؤں گا کہ اس فقیر مسکین احمد کو جو اپنے نانا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر فقیر ہو کر مر گیا حاضر کرو۔ ماخذ [illegible]

[illegible] ہیں۔ حضرت [illegible] کے کام [illegible]

[illegible] بہت [illegible] ایک [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] تھا۔

ایسا ہی جب انھوں نے [illegible] تفسیر لکھنی شروع کی تو اس وقت بھی اتنی محنت و مشقت برداشت کی جس کی [illegible] بیٹھے
رہتے تھے۔ جب [illegible] زیادہ [illegible] قرآن [illegible] ڈاکٹر [illegible] رہتے تھے

[illegible] تصنیف و تالیف کے وقت کامل سکون چاہتے ہیں [illegible]
[illegible] لکھتے ہیں کہ مجھے بہت سے دوستوں سے [illegible] کثرت [illegible] چہرے [illegible]
[illegible] بیٹھا ہوں [illegible] سرسید کے متعلق مولانا
حالی لکھتے ہیں کہ ملاقاتی آدمیوں اور مختلف کاموں کے ہجوم میں ان کے خیالات منتشر نہ ہوتے تھے ان کے دفتر [illegible] جہاں بیٹھ کر کام کرتے تھے
صبح سے شام تک وہاں ہر قسم کے لوگ برابر آتے جاتے رہتے تھے۔ ہر وقت دوستوں اور ملاقاتیوں اور ساتھ کام کرنے والوں کا مجمع رہتا تھا
اسی ہجوم میں جہاں وہ اور سب کام کرتے تصنیف و تالیف کا دشوار کام بھی وہیں لے کر بیٹھتا تھا۔ مشکل سے مشکل مضامین جو کہ اکثر جمہور کی
رائے اور مذہبی خیالات کے برخلاف ہوتے تھے اور جن میں قدیم علماء اور مصنفین پر نکتہ چینی کرنے کی ضرورت [illegible] غور و خوض کرنے کی ضرورت
ہوتی تھی ان کے لکھنے میں کبھی نہیں دیکھا کہ وہ خیالات کے مجتمع کرنے کے لئے کسی علیحدہ کمرے میں جا کر بیٹھے ہوں [illegible] لوگوں کو اپنے پاس سے اٹھا

بیاہ میں [illegible] کے پاس بیٹھنے سے تنگ دل ہو گئے ہوں ۔ یا لوگوں کے خوش ہونے کے انتظار میں خصوصاً عزیزوں یا بزرگوں [illegible]
سب ان کے خدمت چاہت رکھتے ہیں ۔ ہم نے خود دیکھا ہے کہ احباب جمع ہیں [illegible] دلچسپ بیٹھے یا مجلس چل رہی [illegible]
خاص طور پر ایک [illegible] آدمی [illegible] ہو جاتا ہے [illegible] اپنے [illegible] مستغرق ہے [illegible]
دوستوں کے حسن و حکایت سے متعلق خوب ہیں مگر ۔

حدیث میں آتا ہے کہ [illegible] جواب [illegible] ہدایت [illegible]
لکھتے ہیں کہ [illegible]
خطوط [illegible] اپنے [illegible]
[illegible] تعلق [illegible]
[illegible] صحیح [illegible] کئے جا سکتے ہیں ۔

[illegible] جواب لکھنے [illegible] اپنے دوست نواب محسن [illegible]
[illegible] ایک خط لکھا [illegible] دوستی [illegible] خود نوشتہ [illegible]

مخدوم و مکرم من

[illegible] سید [illegible] محبت [illegible]
[illegible] حقیقت [illegible] اب آپ [illegible]
[illegible]
حقیقی بھائی [illegible] ایسا ہی [illegible]
[illegible] آپ یقین کیجئے [illegible] اپنے بھائی [illegible] قریب [illegible] سمیع اللہ خاں [illegible]
[illegible] دوستی و محبت [illegible]
[illegible] محبت [illegible] دوستی کا تعلق [illegible]
نہیں ہے ۔ [illegible] محبت [illegible]
[illegible] تو اس شخص کو [illegible] ایمان سمجھتا ہوں
جو دوست کی نسبت یہ خیال کرے [illegible] خلاف دوستی و محبت کے کوئی بات کی [illegible] میں تو دوست کی [illegible]
کو بھی دوستی پر محمول کرتا ہوں [illegible] درحقیقت دوستی ہی کے سبب سے وہ بات ہوئی ہے ۔ مگر جب کہ حقیقت میں خلاف محبت اور
دوستی کے کوئی بات ہو تو پھر شیشۂ محبت جو نہایت نازک ہے کسی طرح ثابت نہیں رہ سکتا ۔ آپ خیال کیجئے کہ محبت اور دوستی ایسی
سخت [illegible] چیز ہے کہ کسی طرح [illegible] ٹوٹ سکتی اور کوئی اس کو نہیں توڑ سکتا ۔ مگر وہ نازک بھی ایسی ہے کہ باریک سے باریک شیشہ
اور حباب کو بھی اس سے نسبت نہیں ہے ۔ وہ [illegible] اور ہزاروں صدموں سے بھی نہیں ٹوٹتی اور ایک ادنیٰ سی خلاف محبت کے
بات کرنے سے ٹوٹ جاتی ہے ۔ اور جوں جوں محبت زیادہ بڑھتی ہے اس کی نزاکت زیادہ ہوتی جاتی ہے ۔ مولوی سمیع اللہ خاں کو اب
میں اپنے بھائی سے کم نہیں سمجھتا مگر [illegible] میرے دل میں ہوا وہ اب تک کم نہیں ہوا ۔ پھوٹ جاوے وہ آنکھ جو کسی کو دیکھے اس نگاہ سے
جو اس کے دل میں نہیں ہے ۔ گل جاوے وہ زبان جو وہ کہے جو اس کے دل میں نہیں ہے ۔ ٹوٹ جاوے وہ ہاتھ جو وہ لکھے جو اس کے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

سو میری قسمت ہے [illegible] خدا نے [illegible]

[illegible] مولویوں [illegible] تخصیص [illegible]

[illegible] کتاب تصنیف کرنے [illegible]

[illegible] پہنچنے والے تھے [illegible]

[illegible]

[illegible] پہنچایا ہے [illegible]

[illegible] اسلام کے حق میں [illegible]

[illegible] خدا اس گناہ سے سب مسلمانوں کو بچا لے [illegible]

پیارے دوست کو سب سے پہلے ۔ آمین ۔ ثم آمین ۔ ثم آمین ۔

آپ کا [illegible] غلام [illegible] احمد ۔ روز جمعہ تاریخ [illegible]

[illegible] ... [illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ۲۹ [illegible]

[illegible]

واہ جناب واہ [illegible] ایک ہی وقت [illegible] آپ کا انصاف [illegible] ملاقات نہیں ہوئی [illegible] اجلاس [illegible] ملاقات [illegible] اگر [illegible] آپ ملاقات پسند نہیں کرتے [illegible] اجلاس [illegible] تشریف لائیں [illegible] اجلاس [illegible] اجلاس کے [illegible] اجلاس سے تشریف [illegible]

[illegible]

[illegible]

مضمون بہت طویل ہو گیا اور میں نے ابھی تک [illegible] کی شخصیت کے متعلق بہت ہی کم بیان کیا ہے۔ گنجائش ہوتی تو [illegible] کی محبت، شفقت، زندہ دلی و خوش طبعی، [illegible] ذہانت و طباعی، [illegible] سادگی و دلیری، عزیزوں کے ساتھ مہربانی، دوستوں کے ساتھ برتاؤ، نوکروں کے ساتھ تعلق، سیر چشمی و فراخ حوصلگی، مستحقین کی امداد و دستگیری، [illegible] جوانمردی و بہادری، فیاضی و [illegible] طلب علم کا ذوق و شوق، انتقام و خصومت سے پرہیز، [illegible] سے اجتناب، عالی ظرفی و عالی حوصلگی، عفو و اغماض کی عادت [illegible]

[illegible]

خان بہادر مولوی بشیر الدین

حسام الدین راشدی

[illegible]

[illegible] ثقل سماعت [illegible] [illegible] تھی۔

طلبہ سے [illegible] [illegible] مولوی صاحب [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] سے بڑے ذاتی معاملات اور دوستوں کے متعلق [illegible] نہ کر سکے۔

مظفر محمد (مصنف نیلی چھتری) [illegible] جب میں [illegible] داخل ہوا تو چونکہ [illegible] کی اجازت نہ تھی۔ اس لیے لڑکے بیروں سے تیزی سے منگوایا کرتے تھے۔ مولوی صاحب کو دیکھ کر میں نے سمجھا کہ یہ بھی ملازم ہیں اور ان سے سگریٹ لانے کے لیے کہا۔ چونکہ ثقل سماعت کی وجہ سے سن نہ سکے تو میں نے روپیہ ان کے ہاتھ پر رکھ کر سگریٹ کا اشارہ کیا جس کے جواب میں اس سالے کا نمبر رسید کیا کہ چودہ طبق روشن ہو گئے۔ بس چپکا رہ گیا۔ مولوی صاحب نے فوراً سپرنٹنڈنٹ کو بلا کر حکم دیا کہ یہ لڑکا سگریٹ پینے کا عادی ہے اب سے

[illegible]

دسترخوان پر بیٹھے مگر [illegible] یہ کہہ کر آپ [illegible] [illegible] دیانت
بادل ناخواستہ کچھ کھایا کچھ نہ کھایا [illegible] [illegible] کے بعد تمام
کرنے پر معلوم ہوا کہ ہر پیالے پر نقوش بنانے کا مسئلہ زیر غور ہے [illegible]
تک کھانا نہیں کھایا۔

کھانے کے بارے میں ان کی یہ لاپرواہی آخر تک قائم رہی۔ تازہ و باسی کی خود دسترخوان طلب کرنے سے بلکہ بعض اوقات جب کہا جاتا کہ
کھانا تیار ہے تو چونک سے پڑتے تھے۔ اچھا کھانا کم [illegible] کرتے تھے [illegible] وہ بے چون و چرا کھا لیتے۔ کچے پکے
کی جب تک بتایا نہ جائے پتہ ہی نہیں چلتا کہ کیا کھا رہا ہوں۔ مسائل ہی ایسے پیچیدہ سامنے آ جاتے ہیں کہ اس طرف خیال کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔
لیکن چائے کے معاملے میں حالت بالکل جداگانہ تھی۔ اس کے لئے نہ کوئی وقت مقرر تھا نہ مقدار جب جی چاہا پی لیتے اور جتنی چاہتے پیتے۔ آخر میں بہت کم
کر دی تھی مگر پھر بھی لمبی لمبی پیالیوں کا اوسط ہو جاتا تھا۔

باوجود اس انہماک کے خصوصی کا بہت پاس تھا۔ جب کبھی جلسہ تقاریر ہوتے [illegible] سے معلوم کرتے ان کی اور ساری [illegible] کی خیریت دریافت کرتے۔ اگر کوئی مرجاتا تو اس کی تعزیت کرنا اور جو پیدا ہوتا اس کا [illegible] کر پیار کرنا ضروری سمجھتے۔ [illegible] لگ جاتے اور [illegible] استقلات سے زیادہ [illegible] ہوجاتا تو [illegible] پیدا کر رہے تھے اس لئے [illegible] کسی زمانہ میں بھی کم نہیں ہوئی۔ [illegible] دوست بھی تو [illegible] ہمیشہ [illegible] اپنے دوست کے ساتھ۔ بعض اوقات [illegible] دوست [illegible] رنجش ہوتی [illegible] دونوں کو باہم [illegible] کرنے کی کوشش کرتے اور اگر [illegible] نہیں ہوسکتے کہ [illegible] [illegible] کے تعلقات [illegible]

کانگریسی دوستوں کے ساتھ [illegible] اور [illegible] پیشہ ہونے کے ساتھ ان سے تعلقات یکساں خوشگوار اور استوار رہے۔ [illegible] کو کبھی ذاتی دوستی میں حارج نہ ہونے [illegible] جو لوگ [illegible] ان کی دل سے عزت کرتے [illegible] البتہ سخت متنفر رہتے [illegible] نہیں [illegible] ان میں [illegible] حالات کا مقابلہ کر [illegible] شکست کو شکست سمجھ کر [illegible] اور خود دوستی بھی۔

مولوی صاحب کی [illegible] سب کی حیثیت [illegible] ان کو اپنے [illegible] سے لے کر [illegible] کی کامیابی کے ساتھ [illegible] ضروریات کا خیال رکھتے گئے اور [illegible] سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن [illegible] بچوں پر ہی نہیں بلکہ اولاد کی اولاد پر بھی [illegible] تعلیم [illegible] لڑکوں [illegible] کی نگرانی کرتے اور اگر کوئی [illegible] ہوجاتا تو اس نے [illegible] اپنے اخلاق سے کام لیتے تھے۔ مولوی صاحب نے دو لڑکے [illegible] لڑکیاں تھیں اور سب کو [illegible] انھوں نے ان سب کو اعلیٰ تعلیم دلائی [illegible] علی گڑھ کالج کے مغربی ماحول میں [illegible] بیٹے اور [illegible] جس سے دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی تھی۔ لڑکیوں کو بھی معمولی [illegible] پہننے اور زیور کے استعمال کی اجازت نہ دیتے تھے۔ جب ان کی شادی ہوئی تو اس بات کا خاص خیال رکھا [illegible] جائے۔

ان کی زندگی کا سب سے [illegible] اور وہ بھی [illegible] عالم شباب میں۔ مولوی صاحب ان تمام حادثات کو انتہائی صبر و سکون سے برداشت کرتے رہے۔ آخر میں بڑے صاحبزادے بشیر احمد مرحوم کے انتقال پر جب بھی [illegible] کی تو کہتے گئے یہ سب [illegible] کے [illegible] ادا کرتے [illegible] لیکن انسان کو [illegible] پر بھی تو اختیار نہیں۔

مولوی صاحب کو اپنی تمام اولاد میں [illegible] سے بہت محبت تھی۔ جب انہوں نے [illegible] اے پاس کرلیا تو ان کو بی۔ٹی کرا کے اسکول میں سیکنڈ ماسٹر مقرر کردیا۔ اس سلسلہ میں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ مولوی صاحب [illegible] بالاتر رہے۔ اپنے رشتہ داروں کو [illegible] میں جگہ تو دیتے مگر ان پر کڑی نگرانی رکھتے اور سب سے زیادہ کام لیتے تھے تاکہ وہ [illegible] اور تجربہ کار ہو کر اعلیٰ مدارج حاصل کرسکیں۔ جس زمانہ میں [illegible] کے خلاف [illegible] کی [illegible] کی گئی۔ جواب طلبی ہوئی تو مولوی صاحب نے لکھا کہ جس تنخواہ پر [illegible] کام کر رہے ہیں اگر اس مشاہرہ پر اسی قابلیت کے استاد آپ مجھے دلا سکیں تو میں آج ہی سابقہ خدمات کا اعتراف کئے بغیر آپ کے حکم سے ان کو برخاست کردوں گا۔ [illegible] آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اسکول میں سب سے زیادہ کارگزار یہی استاد ہیں۔ یہ دندان شکن جواب [illegible] کو بھی خاموش ہوجانا پڑا اور مخالفین کو بھی سانپ سونگھ گیا۔

مولوی صاحب کا خیال تھا کہ بشیر [illegible] کو اپنا جانشین بنائیں اور مرتے وقت [illegible] اسکول کو ان کے سپرد کر جائیں لیکن افسوس کہ [illegible]

۱۳۱۵ ——

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

امیر مینائی

اسمٰعیل احمد مینائی

کہا جاتا ہے کہ شعر کی پیدائش کا … ہے مگر امیر مینائی کے یہاں معاملہ بالکل برعکس تھا … خود ان سے …
نامہ … ہے … ہر عجب شعر پر …

مکیں ہو جو نظیر دو فقیر عشق ہیں … اور …
ابھی نوجوان ہی تھے کہ حضرت میاں امیر شاہ سے بیعت کی اور ان کی نظر کیمیا اثر کے فیض نے مس کو سونے میں تبدیل کر دیا۔ …
کا واقعہ خاصا عجیب ہے۔ خاندانی تعلق کے باعث امیر مینائی … حضرت شاہ …
شرف … وقت سے ملنے جلنے کا موقع ملا تھا۔ امیر مینائی کی سعادت مندی کو دیکھ کر ان میں …
شامل ہو جائیں مگر امیر مینائی … حضرت مخدوم صاحب کی جانب سے … بشارت ہو چکی تھی … شکل و صورت اور …
وابستہ ہونا ہے۔ … انہوں نے کوشش کی … ایک مدت … کہ حال سے ان کو اپنی جانب کھینچ لیں۔
مخدوم صاحب … ایک روز … بعد مغرب امیر مینائی حسب معمول مزار مبارک پر حاضر ہوئے تو دیکھا کہ ایک بزرگ
منہ لپیٹے مزار مبارک کی جالی سے لگے بیٹھے ہیں ——— ان کو حضرت … تھی … انتظار کیا کہ یہ فارغ ہو جائیں تو خود بیٹھیں مگر وہ بزرگ
… بیٹھے ہی رہے … ادائے نماز کے لئے … وہاں سے … دیکھا کہ وہ حضرت
نماز بیٹھے ہی …
مستقل بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کا معمول تھا کہ مزار مبارک کے داہنی جانب سرہانے سے متصل بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ اس جگہ پر وہ بزرگ ڈٹے بیٹھے تھے۔ غرض ان کو بڑی الجھن ہوئی۔ … کچھ دیر گزاری بالآخر مغرب کا وقت آگیا تو پھر مسجد چلے گئے۔ وہاں سے جب فراغت پاکے آئے تو دیکھا کہ وہ صاحب اپنی جگہ سے ہلے تک نہیں ہیں۔ اب تو ان سے نہ رہا گیا، پاس جاکے کہا کہ حضرت کیا نماز مغرب کے لئے بھی مسجد نہ جائیے گا۔ انہوں نے منہ کھول کر ایک نظر امیر مینائی کو سر سے پاؤں تک بغور دیکھا اور فرمایا "میاں امیر! اب بھی نہیں پہچانا؟" یہ الفاظ سن کر ان کا عجیب حال ہو گیا۔ اب جو غور کرکے دیکھتے ہیں تو وہی شکل و صورت اور وہی حلیہ جو خواب میں ان کو دکھایا جا چکا تھا ——— بس پھر کیا تھا بیتاب

[illegible]

سنہ [illegible] میں [illegible] بیٹا ہوئے [illegible] یہاں سے مرزا [illegible]

[illegible] ہے۔

ہر کہ در آمد [illegible] | [illegible]

لکھنؤ میں [illegible] وقت سے [illegible] کی طلب کی تعمیل کی [illegible]

[illegible] ذکاوت کے باعث [illegible] میں [illegible] مقرر ہوئے [illegible]

[illegible] پر فائز ہوئے [illegible]

[illegible] سے یکجائی ہوئی اور [illegible]

[illegible] شاگرد عزیز یوسف علی خاں والی ریاست رامپور کے ایماء امیر پر اپنے مرشد کے وطن ریاست رامپور آ کے رہنے لگے یہیں

[illegible] کی لڑکی اور [illegible] خان سفیر ریاست کی بیٹی سے شادی ہوئی اور یہیں پہلے مفتی عدالت و اُستادِ شاہ پھر

اُستادِ شاہ و مقرب خاص اور اخیر میں صدر نشین مجلس تدوین امیر اللغات رہے۔ اور یہیں سے بظاہر امیر اللغات کو پورا کرنے کی دُھن کے

[illegible] (۷۳) سال کی ضعیف العمری میں اِن کو کھینچ کر [illegible] اگست [illegible] حیدرآباد دکن لے گئی۔ وہ وہیں سپردِ خاک کر دیئے گئے جہاں وہ

درگاہ یوسف صاحب شریف صاحبؒ کے احاطے میں قیامت کی نیند سو رہے ہیں۔ تعویذ پر سامنے انہی کے شاگرد جلیل کا قطعۂ تاریخ

مرقوم ہے۔

امیر کشورِ معنی امیر مینائی | خدا کے عاشقِ صادق و دو نبی کے فقیر
گئے جو خلد بریں کو تو اُن کی تربت پر | لکھا جلیل نے "یہ روضۂ جنابِ امیر"

غزل ———— ۱۲۹۸

اور شعر پڑھا اور کی داد ملی یہ ... جو حضرت میں گئے دل ۔ کہنے والے ... بے اختیار کیسی ہے۔

یہ مزار پہ حباب فاتحہ پڑھ لیں ‌ ‌ ‌ پھر اس قدر بھی ہمارا نشاں رہے نہ رہے

مولوی عبدالحسن ... نے یہ بیان کیا تھا کہ جب حیدرآباد پہنچا ... تو داغ ... تیر کے مرشدوں پر فاتحہ خوانی ...
بیٹھا ... درگاہ ... کے قریب ... کی ... کا مزار ... قبہ مبارک کے سامنے ... کیا ... فاتحہ پڑھ ... پھر خیال ... [illegible]
... ہوا ... کوشش ... فاتحہ پڑھ ... کوشش کرنے ... کبھی ... قبر ... آگے بڑھ گیا ...
... نے ... کی ... میر ... کے ... ہیں ... واپس جاؤ ——— میں واپس ... شہر ... [illegible]
... جب ... سے ... قبر ... بیت پر نظر پڑی ... بے اختیار ... فاتحہ پڑھ ... [illegible]
مزار پر ... سب ... شعر ...

... حقیقت ... شعر ... فقیر منش ... اور ... کا مسلک ... کے ... کا ... میں ... کی شخصیت ... [illegible]
... کی ... ہے ... رہیں گے ——— ... آپ ... چلے ... سب ... سے ... ہو کے ... [illegible]
... لکھنؤ چلے گئے تھے ... ایک ... کا ... ایک ... رخصت ... گئے ... [illegible]
... کی ... میں ... کر ... نے ... یہی حضرت ہے ——— ... واپس ہو گئے ... [illegible]
نے جب ... ہے ... کیا ... کوشش ... کی ... مرحلے میں ... اس میں ... [illegible]
... معاشرے کے معاملات ... ایک بار کسی گلدستہ میں داغ کی غزل شائع ہوئی

بتاں ... جو ... منزل میں رہتے ہیں ‌ ‌ ‌ ... کی جان ... ہیں ... کے دل میں ... رہتے ہیں

بیٹے اور شاگرد ... ہو گئے کہ حضرت ... میں غزل ہونی چاہئے حضرت ... جب ... پڑھ گیا تو ... [illegible]
——— مجھے ... داغ کا ہمعصر سمجھتی ہے ان کی غزل پر غزل کہی جائے تو کیا ... یہاں حالت یہ ہے کہ ...
غزل نہیں کہی ہے ... غزل تو غزل ایک شعر کا جواب ہونا مشکل ہے ——— میں اس زمین میں شعر کہہ کر ... [illegible]
——— یہ تو ایک واقعہ تھا ... دو چار حضرات ہی کو معلوم ہوا ... نے اس کے بعد ... داغ ... سے ... متعلق ہی لکھا۔

آئیں ابھی غزل ہے داغ کی جس کا یہ مصرعہ ہے ‌ ‌ ‌ ... معجزہ ... کے بیٹھے ہیں

بعض رسائل میں کبھی کبھی ان کے خلاف مضامین شائع ہوتے تھے یا چند حضرات ... اعتراضات ان کے کلام پر وارد کرتے تھے ...
اور جو ... شاگرد اس پر سخت برہم ہوتے اور جواب لکھنے کی تیاریاں ... سے شروع ہوتیں مگر خود ان کو جب اطلاع ہو جاتی ...
منع کر ہر ایک کو روک دیتے۔

ہر کہ ... دریں راہ ... خارے نہد از دشمنی ‌ ‌ ‌ ... باغ عمرش ... بشگفد بے خار باد

داغ جب دوسری مرتبہ حیدرآباد ... گئے تو امیر سے ملنے ... آتے۔ جلال کو خبر پہنچی تو وہ بھی لکھنؤ سے آگئے امیر ہی کے یہاں ...
روانگی سے پہلے شام کو ایک مختصر سی صحبت شعر و سخن منعقد ہوئی، جلال کے بعد داغ نے غزل شروع کی۔ سوائی کا شیدائی کا ———
جب یہ مصرعہ پڑھا ہو گیا ... حسن سے کچھ اور ہی رنگ ——— تو جلال نے جھوم کر کہا واہ نواب مرزا خاں ... کیا مصرعہ
کہا ہے ———

ہو گیا ... حسن سے کچھ اور ہی رنگ ——— پھر ارشاد ہوا واللہ اعجاز ہے اعجاز ——— تعریف نہیں ہو سکتی———

دل بلبلے کے عالم ہو گئے —— [illegible] تو غزل [illegible]
[illegible] —— امیر مینائی نے کس قدر [illegible]

مصرع: [illegible]

[illegible] —— [illegible] —— [illegible] دیکھ کر [illegible]

[illegible]

[illegible] نواب [illegible] صحبت [illegible] تھے۔

[illegible] برس [illegible] کے [illegible]

[illegible] تک۔

[illegible] —— [illegible]
[illegible] امیر مینائی [illegible] —— [illegible]

[illegible] —— [illegible] —— [illegible]

[illegible] خلد آشیاں [illegible]

[illegible] خلد آشیاں [illegible] امیر مینائی کے فیض صحبت سے خلد آشیاں [illegible] صرف ایک پہلو پر مشتمل [illegible] صرف دو حضرات کے اثر سے تھا امیر مینائی اور مولانا ارشاد حسین صاحب رحمۃ جن سے خلد آشیاں بیعت بھی تھے —— صوم و صلوٰۃ کے سختی سے پابند تھے، پہلے پہلے مسجد میں جا کر جماعت سے نماز ادا کرتے تھے پھر محل ہی کے اندر ادا کرنے لگے اور آخر میں [illegible] کے عارضے کے باعث اکثر پلنگڑی پر بیٹھے بیٹھے پڑھتے تھے۔

[illegible] خلد آشیاں کا تمام کلام [illegible] کے بارے میں بھی تابدار و درخشاں ہے اور یہاں بھی امیر مینائی کے ہاتھ کا عکس صاف جھلکتا ہے، حضرت ان کے استاد ہی نہیں مشیر و مقرب خاص تھے۔ اور گو ان کی افتاد مزاج بالعموم منکسرانہ و مصالحانہ تھی، اور مولانا عبدالحق کی طرح شمشیر برہنہ کبھی نہ تھے تاہم حق گوئی کا محل آ جائے تو پھر چوکنے یا طرح دے جانے کی عادت بھی نہ تھی، خلد آشیاں کے بعد جب فرش آشیاں بھی جلد ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اور نواب حامد علی خاں کی کم سنی کے باعث رنگینی کا دور دورہ

پھر بھی انگریزی کا سبب تھا کہ [illegible] امیر صاحب پر بھی آفت آئی یعنی یہ بات طے ہو گئی۔ اور دفتر سے گھٹنا گویا [illegible]
کا معاوضہ [illegible] دفتر کے لوگ جیسے [illegible] کاتب صحیح وغیرہ کی تنخواہیں تک [illegible] نہیں ہو سکی تھیں۔ بلکہ بعضوں نے جزوی
سمیٹنے کی کوشش کی [illegible] پہلے تھے مگر وہ صاحب پر سوریت کا شکار ہو گیا تھا لئے امیر صاحب کے
کسی طرح [illegible] بڑا [illegible] سے بھی کے باوصف [illegible] سال [illegible] بھار و بنگال کا ایک دورہ کیا۔ پٹنہ میں حبیب
کے پاس ٹھیرے اور [illegible] سے حاضرین [illegible] وہاں [illegible] گئی [illegible] آزادی اور واقعہ بھی ہے
[illegible] کسی کی [illegible] تھی جو [illegible] ——— [illegible] آئے ——— وہ
گاؤں پچاس سال [illegible] جاتے تھے کہ امیر صاحب [illegible] ایسا کہہ [illegible] آمادہ کر دیا۔ اس [illegible]
مار ڈالے گئے اور نواب [illegible] ہو گئے۔ [illegible] کسی طرح سے ان کی خبر مل گئی کہ حضرت [illegible] کی تبدیلی [illegible]
اور ان کے اجازت سے [illegible] ہیں۔ [illegible] دوستی [illegible] صحبتیں [illegible] ہوا نہیں ہوئی تھیں [illegible]
کہاں کی حیات [illegible] کوشش ہی نہیں ——— [illegible] ریاست [illegible] وقت [illegible] غرض دو دفتر [illegible] امیر اللغات کی ترتیب
کرنے پر مامور ہوئے۔ امیر [illegible] جانے کی اجازت [illegible] امیر مینائی [illegible] پوچھتے تھے کہ کسی [illegible] ایک بار [illegible] لکھنؤ [illegible]
اور وہ آتے تھے ——— [illegible] ایک دن انہوں نے [illegible] انہوں نے [illegible] سے ان کی گفتگو [illegible] قائل ہو گئے ——— [illegible]
شرط یہ کی [illegible] ہو جاتا [illegible] وہاں سے واپس [illegible] آپ جائیے ——— انہوں نے دریافت کیا کہ آپ کی [illegible]
کی انتظام کس کے سپرد رہے گا [illegible] کوئی سرپرست ہو گا ——— غرض ان کی یہ خواہش تھی کہ امیر اللغات کے [illegible]
پیدا ہو جائے [illegible] کہ یہ انتظام سلطنت کے [illegible] دریافت کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا حضرت آپ [illegible] میں سب
[illegible] انتظام [illegible] نظم و نسق [illegible] ——— حضرت نے جواب دیا کہ نواب صاحب آپ کی موجودگی [illegible]
تھا جو اب آپ کی غیر موجودگی میں بہتر ہوگا ——— [illegible] اٹھنے لگے تھے [illegible] بیٹھ گئے [illegible] حضرت [illegible]
کرنے والے اور سرکار کے اقبال سے سب ٹھیک رہے گا [illegible] بات کہنے والا [illegible] آپ کے سوا کوئی نہیں۔ پہلے ہی میں
اس کا [illegible] تھا کہ آپ یہاں سے جائیں۔ اب تو کسی طرح آپ کو جانے نہ دوں گا بلکہ میرے واپس آنے پر امیر اللغات کے لئے کوئی مناسب
انتظام بھی کر دیا جائے گا ——— اس ایک واقعے سے ان کی صاف گوئی کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ کتنا نازک وقت تھا، امیر اللغات کی ناؤ
ڈگمگا رہی تھی، والیٔ ریاست نہ ان کی جانب ملتفت تھا نہ ان کے کام کی جانب، بظاہر مصلحت اندیشی، تملق کی خواستگار تھی، مگر انہوں نے سچی
بات کہنے میں کوئی تامل نہیں کیا ———

تعلی ایک ایسی صنف مزاح کرتا ہے جو اساتذہ فارسی کے کم و بیش ہر شاعر کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ امیر مینائی کے کلام اور ان کے کوائف
حیات میں مگر اس "عجائب سرگزاں" کے بڑے نادر و دلپذیر نمونے ملتے ہیں۔ مرزا محمد تقی ہوس لکھنؤ کی بلحاظ شاعری کا ایک بڑا مہرہ تھے۔
جناب امیرؑ کی منقبت میں ان کا ایک قصیدہ خلد آشیان نے ان سے یا کسی اور سے سنا اور بہت پسند کیا اور بعد مغرب جو اجتماع
ہوتا تھا اس میں بار بار مزے لے لے کر اس کی بیتیں دہرائیں، اور بالآخر یہاں تک کہہ دیا کہ "اب منقبت میں ایسا قصیدہ کہنا اور اس زمین
میں کسی کے بس کی بات نہیں۔" امیر مینائیؒ کو خدا جانے کس وجہ سے یہ بات بہت شاق گزری، اور دوسری شام کو جب سب جمع ہو چکے تو عرض
کیا کہ ایک نیا قصیدہ لکھا ہے پیش کرنا چاہتا ہوں، خلد آشیاں نے پوچھا کہ قصیدے کا موضوع کیا ہے، کہا منقبت جناب امیرؑ ——— اور
زمین وہی ہے جو مرزا محمد تقی ہوس کے قصیدے کی ہے۔ خلد آشیاں اور سارے حاضرین ہمہ تن گوش ہو کے سننے بیٹھے۔ انہوں نے پڑھنا شروع کیا۔

[illegible]

اس شعر پر خلد آشیاں نے ہاتھ پکڑ لیا اور کہا ”حضرت جب میں نے دعویٰ کیا تھا کہ منقبت میں آپ سے [illegible] میں کسی کے بس کی بات نہیں تو آپ کو مستثنیٰ کر دیا تھا —— آپ تو سب کچھ کہہ سکتے ہیں“ ——

ایک مرتبہ خلد آشیاں نے طرحی مشاعرہ کیا —— ”دیباے حسن و عشق کا رنج و محن ہوا“ میر مینائی نے جو غزل کہی تھی وہ مشاعرے سے پہلے خلد آشیاں کے ایما پر ان کو سنائی۔ اُن کو پسند نہ آئی تو کہا کہ ”حضرت معلوم ہوتا ہے اس غزل کے لکھنے میں آپ کا جی نہیں لگا“ —— مشاعرے میں تقریباً مہینہ بھر باقی تھا۔ حضرت نے روزانہ ایک غزل اسی زمین میں کہہ کر نواب صاحب کو سنانے کا معمول کر لیا۔ انتیسویں روز جب یہ مطلع پڑھا۔

جس غنچۂ لب کو چھیڑ دیا خندہ زن ہوا　　　جس گل پہ ہم نے رنگ جمایا چمن ہوا

تو خلد آشیاں نے کہا ”حضرت ہم غریبوں کے لئے بھی تو کچھ کہنے کو چھوڑ دیجئے“ حضرت مسکرائے اور سلسلہ ترک کر دیا۔ مگر بعد کو ریاض کے استفسار پر کہا کہ —— ”بخدا اگر نواب نہ روک دیتے تو مشاعرے کے روز تک اسی طرح غزلیں کہتا رہتا“ ——

اُن کی شاعری محض بتقاضائے زمانہ تھی، جو ہر کمال رکھتے تھے جس فن کو لیا پامال کر دیا۔ اُس عہد میں شعر کہنا شرفا کا شعار اور وقار تھا۔

انہوں نے بھی اس کو اختیار کیا اور ایسا ہی کیا۔ بات یہ ہے کہ اپنے معاصرین میں سے کسی سے دب کے نہ رہے۔ زبان و لغات کی خصوصیت سے ان کی تحقیق و تلاش سر آنکھوں پر مگر امیر مینائی نے شعر میں کسی سے کمتر تحقیق و تلاش میں کسی کے دریل اور پھر بھی مسلّم کر چھوڑا۔ اپنے عہد کے اعتبار سے اُن کو ممتاز و منفرد کر دیا۔ ان کے نعتیہ قصائد، داغ کے دیوان میں ملتے ہیں نہ جلال کے کلیات میں۔ اور نعت گوئی کا انتخاب ان کے علاوہ ——— جب کوئی ان کا سا کامیاب و معتبر قادر الکلام اُن کے عہد میں ——— جلال و داغ کے لئے وہ اب اُن کی شاعری اُن کی ناموس کا سرمایہ تھی، امیر مینائی کے شاعرانہ علاوہ دیگر حیثیات بھی دیکھی جائیں تو بھی وہ نامور رہیں گے۔

اُن کے ذوق و استعداد و کتب بینی سے اُن کے دو ہزار شاگردوں، تصانیف کی یادوں اور تذکرہ نویسوں کی معلومات مندرجہ ذیل محنت کے طفیل اہلِ ذوق اچھی طرح واقف ہو چکے ہیں۔ مگر کم لوگوں کو معلوم ہے کہ سرزمین لکھنؤ کا یہ اور ستارہ گردوں ... کا بھی ایک تابناک ستارہ ہے، اور جیسے میر تقی میر کا تذکرہ نکات الشعراء فارسی زبان میں اُردو شعراء کے متعلق پہلی مستند تصنیف ہے امیر مینائی کا تذکرہ انتخاب یادگار غالباً بزبانِ اُردو شعراء کا ایسا تذکرہ ہے جس کو شاعر اور شعر کے متعلق ایک فرد واحد نے مرتب کیا ہو۔ اس تذکرے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عربی، فارسی، اُردو اور ... کے مخصوصوں کا حال ...

انہوں نے ۱۳ اکتوبر سنہ ۱۹۰۰ء کو ... سال کی عمر میں وفات پائی اسی طرح اس کے ... عرصہ عرطس کو پہنچ کر مرے مگر ... ہی بیمار ہو جانے ... ایک ہفتے میں وفات پا جانے سے اُن کے انتقال کے بارے میں بہت سے لوگ ... یہ خلوص بے جا ہے ... ان کی موت اُن کی عمر کو طرح طرح ... بعض مسائل اور ضرورتوں سے اعتبار سے قبل جگہ آج تک ... ہے، اُردو زبان و ادب کے معیار بنے ہیں، جہاں داغ کی رنگینیاں اور طولِ وصل کی ... تذنیباں بھی ہیں ... سے آتے جاتے سے، وہ نظر و اخبار کا ... آسان ہے لیکن ان کی آبیاری آسان نہیں، کبھی ... پہنچنے کے لئے خونِ دل صرف کرنا پڑتا ہے اس لئے جو فکر و شعور، علم و فضل کی کسوٹی پر زر کامل عیار نہ نکلیں ان کی کاوش سے شجرِ اُردو کا پروان چڑھنا معلوم ———

امیر مینائی اپنے عہد کے افاضل میں تھے۔ زبان دانی اُن کی میراث تھی، علم و فضل ان کا سرمایہ اور ان دونوں کے امتزاج صحیح نے اُن کی پاکیزہ ہستی میں زبانِ اُردو کی لغت تیار کرنے کے لئے سب سے موزوں اور مستند محقق کو پالیا تھا۔ متین کا لفظوں سے بالقصد استعمال کیا ہے امیر مینائی نے امیر اللغات میں اُردو کے تمام اساتذہ کے کلام سے سند میں شعر دیے، مگر اپنا ایک شعر بھی پیش نہیں کیا۔ حضرت اکبر الٰہ آبادی نے اُن سے ایک بار دریافت کیا کہ "منشی صاحب، جب آپ نے داغ و جلال، منیر و تسلیم کے اشعار سے سند لی ہے تو اپنے اشعار سے استناد میں کیا قباحت تھی، اُستادی اور استناد میں تو آپ کا پایہ ان سب پر بھاری ہے۔" حضرت نے فرمایا کہ "ایسا کرنے میں کبر کا پہلو پیدا ہوتا تھا" اور میری اپنی دانست میں یہ بات تقاضائے دیانت کے بھی خلاف تھی اگر میں خود ہی ایک لفظ کے معنی و محلِ استعمال کی صراحت کروں اور خود اپنے ہی شعر یا مصرعے سے اس کا ثبوت بہم پہنچاؤں ———

مجھ سا ہیچمدان، ہیچمدان، پھر اُن کی امداد، قدرتی طور پر مجھ کو یہ بات لکھتے ہوئے تامّل ہوتا ہے، لیکن دیانت کے ساتھ جو رائے قائم ہو اس کو بیباکی سے بیان نہ کرنا بھی حق گوئی کی توہین ہے، میری دانست میں اُن کے بعد سے اب تک، زبانِ اُردو کو اُن سے اچھا کیا اُن سا یگانۂ عصر بھی، لغت کے کام کے لئے نہیں ملا اور یہی باعث ہے کہ میں اُن کی لغات ادھوری سے رہی، معذور طبعی ملتے ہوئے نظری ہی نہیں اہلِ نقطۂ نظر سے بھی اب تک اُن کا ماتم گسار ہوں، لغت کے شعبے میں آصفِ زبان، فرہنگِ آصفیہ، نور اللغات، اور انجمن ترقی اُردو کی ڈکشنری کی موجودگی کے باعث تہی مایہ نہ سہی، مگر اس کی کم مائیگی پر کسی صاحب نظر کو کلام ہو سکتا ہے، گذشتہ پون آدھی صدی میں اُردو زبان و ادب کا دامن مخلص

[illegible] امیر اللغات [illegible] جلیل [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

...

[illegible] شعلۂ مستعجل بود

میری رائے میں امیر اللغات اُن کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ جس کی آب و تاب کو ناتمامی کا داغ اور نصف صدی کی ترقیاں بھی مدھم نہیں کر سکیں

اسی لئے میں نے اُس کے بیان کو اُن کے تذکرے میں زیادہ جگہ دی ہے۔

مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی

مولوی محمد اسلم سیفی

مولانا اسمٰعیل میرٹھی کی ولادت ۱۲ نومبر ۱۸۴۴ء [illegible] دونوں حساب سے [illegible] سال ہوئی۔ اُن کی پیدائش شہر میرٹھ میں [illegible] ۱۸۵۷ء میں [illegible] گئے۔ یہ تاریخی تبدیلی شہر میں [illegible] سے عمل میں آئی تھی۔

جب مولانا کا خاندان قصبہ [illegible] میرٹھ کی آبادی [illegible] کے مطابق [illegible] تھی۔ [illegible] ایک [illegible] خاندان [illegible] کے پاس [illegible] ہو گئی۔ [illegible] انگریزوں کے تسلط [illegible] گزر چکے تھے [illegible] کے دستور کے مطابق ابتدائی تعلیم مکتب میں ہوا کرتی تھی۔ اسمٰعیل کے بڑے بھائی [illegible] بیٹھتے تھے اور [illegible] درس و تدریس کا شغل رہتا تھا۔ ابتدائی کتابیں ان سے پڑھ کر [illegible] مکتب میں جا داخل ہوئے۔ ان کے والد بہت خاموش اور نرم آمیز بزرگ تھے اور اپنے [illegible] احوال میں اجنبی تصور کرتے تھے ——— بچپن کے احوال کا اور اس وقت کی زندگی کا پتہ نہیں چلتا۔ مولانا اسمٰعیل کی یہ خصوصیت دیکھنے میں آئی ہے کہ جو کام کرتے تھے اس پر کامل توجہ دیتے تھے۔ چنانچہ فن خطاطی ایک استاد کامل سے سیکھا اور خود بھی اس میں کمال حاصل کیا۔ مرزا رحیم بیگ فارسی کے مشہور استادوں میں شمار ہوتے تھے۔ مولانا کو بھی فارسی زبان میں دل بستگی انہی کی صحبت میں حاصل ہوئی۔ اُن کے فارسی کلام کی خوبی ان نظموں سے ظاہر ہوتی ہے جو کلیات اسماعیل میں درج ہیں۔ مثلاً مثنوی [illegible] اور بہت سی فارسی نظمیں جن میں غزلیں قصائد اور قطعات ہیں۔

۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو ہندوستان میں غدر کا واقعہ پیش آیا۔ اس کی ابتدا میرٹھ ہی سے ہوئی۔ اس وقت اسماعیل کی عمر ۱۳ سال تھی۔ اس ہنگامہ کی اہمیت کو کچھ کچھ سمجھ سکتے تھے۔ بہرحال اس کے اثرات کا تذکرہ زبان زد خاص و عام رہا۔ اسی زمانہ میں نارمل اسکول میرٹھ میں قائم کیا گیا تھا۔ اس میں پرائیویٹ طالب علم بن کر ایک سال تعلیم پائی۔ چند شفیق اساتذہ سے مستفید ہوئے۔ خاص کر علم ہندسہ [illegible] استاد سے۔

جو حالت میں نے مشاہدہ کی اس وقت مولانا کی عمر ۶۴ سال کی تھی۔ ایک نہایت متین اور خاموش زندگی شخص معلوم ہوتے تھے۔ گھر میں کتنا ہی بچے شور و غل مچائیں، خواہ عزیز و اقارب مرد اور عورتیں جمع ہو جائیں اور پوری بلند آوازی سے بات چیت ہوتی ہو مگر وہ سر کے نیچے ہاتھ رکھے

[illegible] طلب علم کے لئے [illegible] ملت اسلامیہ کے نام [illegible] بڑی قوت [illegible] عالی [illegible]
[illegible] بعد [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] تھے۔

[illegible]

[illegible] رہتے تھے

[illegible]

میں سمجھتا ہوں [illegible] تصوف [illegible] مثنوی [illegible] شیخ کے وصل کے بعد [illegible] تذکرہ [illegible] مولانا شاہ گل حسین [illegible] کتاب [illegible] قریب [illegible] ہے۔

مولانا گرامی [illegible] فلسفہ کے مضامین [illegible] پسند کرتے تھے۔ [illegible] بہت متاثر تھے۔ اپنی نظموں میں [illegible] مضامین بہت زور شور سے [illegible] ہیں۔ [illegible] سرسید [illegible] مثنوی لکھی [illegible] دوسری بانگ درا اور تیسری مسلمان اور انگریزی تعلیم ہے۔ یہ سب نظمیں کلیات میں ہیں [illegible] مولانا کی زندگی پر تصوف کا رنگ آخر وقت تک غالب رہا۔

کچھ پتہ نہ تھا۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب سے تلمذ کس طرح حاصل ہوا۔ مگر خود [illegible] اعتراف [illegible] استاد کی [illegible] فارسی غزلیں کہیں اور ان کا ذکر بھی کیا کرتے تھے۔

اہل و عیال اور دیرینہ احباب کے ساتھ حسن سلوک کرتے تھے اور مالی امداد بھی در پردہ کیا کرتے تھے۔ غصہ کا اظہار یا تیز کلامی کبھی نہیں کرتے تھے۔ اگر بہت ناراض ہوتے تو کلام کرنا ترک کر دیتے تھے۔ بہت سے مسودے ان کے میرے پاس ہیں۔ جن میں ایک میر تقی میر کی کلیات کا انتخاب ہے۔ اور اسی طرح اپنے مشہور استاد کے کلام کا بھی

میں ان کے نقوش میں سب سے بڑا نقش یہی جانتا ہوں کہ وہ ہر وقت کام کرتے رہتے تھے اور کبھی دعویٰ استادی نہیں کیا۔

غزل گوئی [illegible] ایک [illegible] مولانا [illegible] کی ادبی [illegible] انہوں نے [illegible] کے [illegible] کی [illegible] کے [illegible] وقت تک [illegible]

[illegible]

[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]

اس [illegible] ہے۔ [illegible]

[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]

۱۹۱۰ء [illegible] میں ایک جلسہ منعقد ہوا [illegible] کے موقع پر [illegible] وزیر [illegible] کی دعوت دی [illegible] اس موقع پر [illegible] ایک بزرگ سادہ لباس میں [illegible] عمر ۷۵ سال [illegible] تعظیم کے واسطے کھڑے ہو گئے [illegible] تمام ممبران [illegible] اس موقع پر [illegible] مناسب نہیں خیال کرتے [illegible] جواب دیا [illegible] تمام معززین [illegible] خواہش ہے کہ یہی موقع [illegible] ہے۔ [illegible] حضرات خاموش رہ گئے اور یہی رائے پسند خاطر رہی۔ یہ مولانا اسمٰعیل تھے۔

انہوں نے [illegible] سال کی ریسرچ کے بعد جو نصاب اُردو طلبہ کے واسطے مرتب کیا تھا وہ آج تک مقبولِ خاص و عام ہے۔ اسی نے ان کا نام اب تک روشن ہے۔ یہ ادبی خدمت ان کی یادگار رہے گی۔

سر تیج بہادر سپرو

ڈاکٹر سید اعجاز حسین

[illegible] وکالت شروع کی۔ [illegible]

تیج بہادر سپرو اسی شہر کے باشندے تھے جہاں [illegible] ۔ [illegible] پسند آتی کہ مرتے مرتے اس کا چھوڑنا گوارا نہ ہوا یہاں تک کہ ۱۹۴۹ء میں یہیں انتقال ہوا۔

کشمیری پنڈت بھی تعلیم یافتہ تہذیب کے گرویدہ ہوتے ہیں لیکن تیج بہادر سپرو میں اس کا لگاؤ عشق کے درجہ تک تھا۔ وہ مسلمانوں کی طرز معاشرت، نشست و برخاست، زبان و تاریخ سے بے حد دلچسپی رکھتے تھے۔ کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا سب کچھ اسلامی تہذیب کا مرقع تھا۔ چنانچہ ان کے یہاں ایک باورچی مسلمان ضرور رہتا اور وہ عموماً وہی چیزیں اپنے دسترخوان پر دیکھنا چاہتے تھے جو امراء یا مسلمان روساء کے یہاں ہوتی تھیں۔ غالباً اسی کا نتیجہ تھا کہ اردو زبان سے بے پایاں محبت کرتے تھے۔ شغف اتنا زیادہ تھا کہ وہ اردو کی کسی برائی کو سننا گوارا نہ کرتے تھے۔ وہ اتنی شستہ اور پاکیزہ اردو بولتے تھے کہ میں نے کم لوگوں کو اس زمانہ میں اتنی اچھی اردو بولتے سنا ہے۔ شام کو روزانہ ان کے یہاں دربار ہوتا تھا اس میں خاص خاص لوگ شریک ہوتے تھے اس جلسہ میں عموماً اردو الفاظ، محاورات، شعر و شاعری پر گفتگو ہوتی تھی ان کی رائے اور سوجھ بوجھ ہمیشہ قابلِ احترام ہوتی تھی۔

[illegible] کے مشہور شعرا [illegible] ایک وقت تھا [illegible] کلام [illegible] پہچانا [illegible] سے [illegible] ملک بھر [illegible] شعر و شاعری کا [illegible] کرتے تھے۔ کبھی کبھی شاعر یا خود [illegible] کرتے [illegible] کے ساتھ [illegible] نہایت [illegible] سے [illegible] رہتا۔

[illegible]

[illegible] اس سے پریشان رہتے تھے [illegible] ہے۔

بیج بہادر سپرو [illegible] اس وقت کو یاد کرتا ہوں [illegible] ہے کہ جب وہ میں نے جب [illegible] کے لئے [illegible] سات سال تک مجھے [illegible] اس لئے کہ [illegible] کیا۔ باوجود اس کے [illegible] نہیں ہونے دیا۔ ان کی [illegible] اور عملی زندگی میں ہر شخص کو یہ محسوس کرنے پر مجبور کرتی تھی کہ وہ نہایت ایماندار اور با اصول آدمی ہیں۔

تیج بہادر سپرو نہایت حساس اور نازک مزاج آدمی تھے۔ عام طور سے مشہور تھا کہ ان کا مزاج نہایت ہے وہ ذرا سی بات پر خفا ہو جاتے ہیں۔ ترش مزاج اور ذرا سی بات پر خوش ہو جانے والے آدمی [illegible] باوجود احباب پرستی اور وضعداری کے وہ اپنے معاملہ میں کبھی فرق نہیں آنے دیتے تھے۔ ہمیشہ کوٹھی کے برآمدے میں سوتے تھے۔ [illegible] بجے صبح بیدار اخبار آجاتا تھا اور وہ پڑھنا شروع کر دیتے تھے پھر قانونی کتابوں اور کاغذات کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ یہاں تک کہ ہائیکورٹ کا وقت آجاتا تھا۔ وہاں کی بحث و مباحثہ سے فارغ ہونے کے بعد گھر آکر ناشتہ وغیرہ کر کے ادبی و علمی کتابوں سے دن بھر کی کوفت دور کرنے کی کوشش کرتے۔ لوگ آتے رہتے وہ ملتے رہتے باتیں کرتے رہتے اور موقع ملتا تو پھر کتاب زیر نظر کا مطالعہ شروع ہو جاتا اکثر ایسا ہوتا کہ روز آنے والوں کو بھی کتابیں اٹھا کر دے دیتے کہ پڑھئے دیکھئے کتنی اچھی کتابیں ہیں۔ اس طرح صحبت کو بغیر لطف کئے ہوئے خود بھی مطالعہ کرتے اور بات کرنے والوں کو بھی چپ کرا دیتے۔ جیسے جیسے عمر بڑھتی جاتی تھی صحت خراب ہوتی جاتی تھی مگر باوجود علالت کے بھی مزاج کی شگفتگی کبھی نہ گئی۔ کبھی کبھی دوست احباب ان کو رائے دیتے کہ حضور آپ کچھ ورزش کیا کیجئے تاکہ صحت قائم رہے تو ہنس کر جواب دیتے کہ "اللہ نے مجھے ہر طرح کی عافیت دی ہے میں اپنے پر ایک نئی ورزش کرنے کی کیوں بڑھا لوں۔ خواہ مخواہ کی بیہودہ محنت اختیار کروں کون سی عقلمندی ہے۔ رہا صحت قائم رہنے کا سوال سو وہ خود ہی قائم رہے گی۔ خداداد چیز ہے خدا خود اس کی

[illegible]

لالہ سری رام دہلوی

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ

لالہ سری رام دہلوی [illegible] ریاست والی [illegible] سے تھے۔
[illegible] ۱۸۷۵ء کو پیدا ہوئے۔ [illegible]
[illegible] ایم اے کا امتحان پاس کیا [illegible] کے عہدہ پر مقرر ہوا۔ [illegible]
اس ملازمت سے استعفے دے دیا۔ شعر و ادب کا شوق [illegible] مخزن میں ادبی مضامین لکھے [illegible]
زمانہ طالب علمی میں شائع کر چکے تھے۔ [illegible] کے دیوان [illegible] کے حقوق اشاعت بھی حاصل کئے [illegible]
[illegible] ضمیمہ [illegible] شائع کیا۔ مرزا محمد تقی بیگ [illegible] اور [illegible] شاگرد ذوق کے دیوان کو بھی
[illegible] رکھتے تھے لیکن فرشتہ [illegible] کتابوں کو جمع کرنے کا بے حد شوق تھا۔ ان کے ذاتی کتب خانہ میں عربی
اردو اور ہندی کی [illegible] بیش قیمت کتابیں تھیں۔ ان کے علاوہ سینکڑوں مخطوطات [illegible] اعلیٰ ترین خطاطی کے
نمونے اور لاتعداد [illegible] ان کی وفات کے بعد بنارس ہندو یونیورسٹی کو بطور میراث دے گئے ہیں۔ تعصب یا تنگ
کی ہوا انہیں چھو تک نہ گئی تھی۔ [illegible] شاعروں کی [illegible] مدد کرنا اپنا فرض جانتے تھے۔ ان کی مایۂ ناز تصنیف خمخانہ
کی پہلی جلد ۱۹۰۸ء میں شائع ہوئی۔ ۵ مارچ ۱۹۳۰ء کو جب ان کی موت ہوئی وہ اس کی چار جلدیں شائع کر چکے تھے۔ [illegible]
جلد [illegible] کمیٹی نے ان کی وفات کے بعد شائع کی اور کہا جاتا ہے کہ چھٹی جلد ۱۹۴۷ء کے فسادات میں ضائع ہو گئی۔

میرے مرحوم لالہ سری رام سے نہایت دیرینہ تعلقات تھے۔ عرصہ تیس سال تک میں ان کی صحبت سے فیض یاب رہا۔ ۱۹۲۳ء میں [illegible]
مہاراجہ [illegible] کے ہاں بطور پرائیویٹ سیکرٹری کے میری خدمات تفویض تھیں۔ مہاراجہ صاحب بنارس یونیورسٹی کے
سابقہ چانسلر تھے۔ جلسہ تقسیم اسناد کا خطبہ پیش کرنے کے لئے وہ بنارس گئے۔ گھسیا ([illegible]) کا عارضہ انہیں پہلے سے تھا، وہاں

[illegible] حکیم اجمل خاں صاحب [illegible] [illegible]
[illegible] صاحب [illegible] [illegible]
[illegible] کے قریب ہے [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] صاحب کی [illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] کے [illegible]

[illegible] تھے [illegible] تھے [illegible]
[illegible] صحبت [illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

اور [illegible] مستقل [illegible] دہلی [illegible]
[illegible]
[illegible] ہوتے تھے [illegible]
[illegible]
[illegible] چاہا [illegible] چھوڑتے تھے [illegible]
[illegible]
[illegible] کرتے تھے۔

افسوس ہے [illegible] کے ساتھ ساتھ [illegible] میں [illegible]
لالہ صاحب [illegible] باتیں کیا کرتے تھے۔ اپنے احباب [illegible] واقعات زندگی کی [illegible] کرتے تھے [illegible]
کی قدرت زبان پر حیرت ہوتی تھی۔ بات بات میں اردو کے برموقع اشعار موتیوں کی طرح [illegible] چلے جاتے تھے۔ [illegible]
اور ہزاروں اشعار ان کی نوک زبان پر تھے۔ [illegible] کسی کا شعر [illegible] ہیں ان سے [illegible]
لالہ صاحب اعلیٰ خاندان سے تھے اور اس پر انہیں بجا طور پر فخر تھا۔ اپنے [illegible] پیارے لال آشوب [illegible]
کے لئے ذکر ہوا کرتا تھا جو پیارے لال آشوب کرباشندگانِ دہلی نے پیش کیا تھا۔ اس خطبہ میں غالب کی لکھی ہوئی چند سطریں بھی درج ہیں جن میں غالب نے پیارے لال آشوب کی خدمات کو سراہا ہے۔ جہاں ایسا موقع ہوتا لالہ صاحب بڑے جوش و خروش سے اپنے حسب نسب اپنے خاندان کی شہرت اور مستقل جائداد و املاک کا ذکر کرتے تھے اور اس قسم کے افتخار نے انہیں معمولی اور چھوٹی چیزوں سے بے نیاز کر دیا تھا لیکن اسی نے ان میں احساس برتری اور تنگ دلی بھی پیدا کر دی تھی۔ دہلی کی مشہور ہستی حکیم اجمل خاں اور ان کے عزیزوں [illegible]

[illegible] ادبی نشستیں منعقد ہوتی تھیں، لیکن خلوص سے اپنے مراسم اور تعلقات کو بڑی محبت سے نباہ کرتے تھے۔ کیفی صاحب دہلی میں ان کی روشنی میں قیام کیا تھا۔ صاحب ذوق حضرات کا لالہ صاحب کے یہاں اکثر مجمع رہتا اور اس میں دہلی کے معزز لوگ آتے تھے جن پر کیفی لکھنے پڑھنے کا کام کرتا تھا۔

لالہ سری رام شعر و ادب سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ یہ ملازمت ملک کی خدمت سے ان پر ترک کر دیا تھا۔ صحت کی خرابی کی وجہ سے صحت کے تقاضوں نے بھی ان کی [illegible] ترک کرا دیا، عام لوگوں سے ملنے سے معذور تھے اور شعر و ادب کے گوشے میں خانہ نشین ہو گئے۔ مصوری سے شغف اور علمی نسخوں کا جمع کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے۔ یہ تمام ادب فارسی، ہندی، اردو کی زینت بنے ہوئے ہیں جس میں لالہ صاحب سے ایک خاص شغف منسوب ہے۔

لالہ صاحب اردو زبان و ادب کے دوستوں میں تھے۔ ان کی تصنیف خمخانۂ جاوید ایک یادگار کارنامہ ہے اور اردو ادب میں اس کی حیثیت انسائیکلوپیڈیا کی ہے۔ اس تالیف کے سلسلے میں لالہ صاحب نے کئی ادیبوں اور اہل علم حضرات کی خدمات حاصل کیں جیسے ان کے یہاں مہمان رہے۔ [illegible] سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ لالہ صاحب کی وفات کے بعد بھی ان کی [illegible] پنڈت کیفی لالہ صاحب کے دل کا حد درجہ دل تھے۔ [illegible] مولوی تجمل کے ساتھ وہ بعد اکثر دقت گزارتے تھے لیکن افسوس یہ کام پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکا۔ [illegible] ادب کے لئے یہ ایک ناقابل بیان نقصان ہے۔ لالہ صاحب کی وفات کے کئی سال بعد پنڈت کیفی نے خمخانۂ جاوید کی ایک جلد شائع کی لیکن پچھلی جلدوں سے مقتبس [illegible] جلد ہے۔ نہ وہ اگلا سا معیار ہے نہ ادبی چاشنی۔ خمخانۂ جاوید کی باقی جلدیں اب طبع نہیں ہو سکتیں اور اس طرح لالہ صاحب کا وقف شرمندۂ تکمیل نہیں ہو سکا۔ کیفی صاحب مستقل طور پر لالہ صاحب کے ہاں رہتے تھے اور ان کے مشورہ سے خمخانۂ جاوید مرتب کرتے تھے۔ گویا ناقہ [illegible] لالہ صاحب ان کے خاص معاون تھے لیکن افسوس کہ ما کی تنہ [illegible] ان کی مدد تو بھی سے لالہ صاحب کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا اور ان کے وقف کا صحیح مصرف نہیں پایا گیا۔

لالہ سری رام دریا دل تھے لیکن ان کی فطرت میں مصلحت کوشی داخل تھی۔ جو کچھ وہ دیتے تھے اس کا حساب بھی چاہتے۔ یہی وجہ ہے کہ حساب کتاب میں وہ بڑی احتیاط برتتے تھے۔

ان کی عمر کے آخری سال بیماری کے رنج و غم اور عذاب میں بسر ہوئے۔ خانگی تنازعوں نے ان کی خوشیوں کے سوتوں پر خاک ڈال دی تھی۔ اس دوران میں وہ ذرہ ذرہ سے مجھے نہایت درد بھرا خط لکھا کرتے۔ یہاں وہ تبدیل آب و ہوا اور علاج معالجہ کے لئے تشریف لے گئے تھے۔

ان کی شخصیت بڑی دلچسپ تھی۔ تہذیب، شائستگی اور ذہانت کا وہ خلاصہ تھے۔ ایک وضعدار ہندوستانی شریف کی تمام صفات ان میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ ان کا حلقۂ احباب وسیع تھا۔ بڑی بڑی ہستیوں سے اور ہندوستانی ریاستوں کے راجاؤں سے راہ و رسم پیدا کرنے اور ان سے تعلقات استوار کرنے کا بڑا شوق تھا۔ خوش سلیقہ، خوش اطوار اور خوش گفتار تھے لیکن مزاج نازک اور زود رنج تھا۔ جب غصہ آتا تو طبیعت قابو سے نکل جاتی۔ ضبط، میانہ روی اور اعتدال جو متوازی شخصیت یا اچھی سوسائٹی میں ہوتا ہے ان کے ہاں کم تھا۔ ان کے دوستوں کا دائرہ بھی محدود تھا اور ان کی دنیا میں صرف خواص کا گزر تھا۔

ان کی وفات پر مرزا عزت اللہ بیگ نے ایک نہایت مؤثر مضمون لکھا تھا۔ پنڈت کیفی نے بھی اپنے ذاتی تجربات کی روشنی میں لالہ صاحب پر مضمون لکھے ہیں جو ان کی شخصیت کا عمدہ مطالعہ پیش کرتے ہیں۔

اپنی تمام خامیوں اور خوبیوں کے باوجود لالہ سری رام دہلی میں اپنے زمانہ کی نمایاں شخصیت تھے۔ وہ اردو کے بے مثل مربی تھے اور اردو پر ان کے احسانات بھلائے جانے کی چیز نہیں۔ ان کی موت دہلی اور اردو کے لئے ناقابل تلافی نقصان ہے۔ آہ! ع آں قدح بشکست و آں ساقی نماند۔

سید علی بلگرامی

غلام پنجتن

اردو [illegible] نے [illegible] میں [illegible] تو بہت [illegible] ہے [illegible] کے ساتھ علمی [illegible] تو [illegible]
[illegible] کمیاب ہے جتنی [illegible] کے [illegible] میں [illegible] زندگی [illegible] بے لوث رحمت [illegible] کی [illegible] نوعیت
[illegible] دینا چاہی مگر ان کے متعلق مفید اور [illegible] کی [illegible] حیثیت رکھنے [illegible] کے ساتھ [illegible] جیسے
[illegible] کی معقول [illegible] معلومات [illegible] رکھتے ہیں [illegible] کے ساتھ [illegible] [illegible] بات
[illegible] زندگی میں کیا چیز کیا اہمیت رکھتی ہے۔ [illegible] گزرے ہوئے زمانے [illegible] سے [illegible]
کے بس کی نہیں رہتا اور یہ بھی ہوتا ہے کبھی عمر کی بات [illegible] میں [illegible] وقت [illegible] ہے۔
جو عقیدت کی آنکھ ایک ہی رخ دیکھتی ہے۔ کہا جاتا ہے [illegible] تاریخ سے [illegible] مشکل ہے۔ [illegible] تاریخ
لکھنے کے لئے ریکارڈ بھی ہوتا ہے اور یادداشتیں بھی۔ لیکن کسی ایک شخص کی سوانح حیات تو [illegible] ہے جو ذاتی طور [illegible] زمانہ
گزرتا جاتا ہے ایسے لوگ کم ہوتے جاتے ہیں اور وہ وقت بھی آ جاتا ہے کہ ان میں سے کوئی باقی ہی نہیں رہتا۔ دورِ گزشتہ کے مشاہیر کے حالات
معلوم کرنے کا شوق تو دو چار کو ہوتا ہے مگر ایسے مواقع نہیں تھے کہ وہ یہ شوق پورا کر سکیں۔ موجودہ دور میں کچھ ایسی ہوا چلی ہے اور روش
کچھ ایسی مقبول ہوئی ہے کہ پچاس برس پہلے ہم سے جو بزرگ جدا ہو چکے ہیں ان کا تذکرہ ہی کیا۔ مظہر الحق۔ سر علی امام جسٹس شاہ دین۔
سر محمد شفیع۔ مولانا محمد علی۔ حکیم اجمل خاں۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کو یاد نہیں کیا جاتا۔ ایسے میں کار پردازانِ نقوش کا پرانے مٹتے ہوئے
نقوش کو ابھارنا قابلِ ستائش ہے گو مجھ ایسے نالائق محض سے کچھ اس سلسلے میں توقع رکھنا محض اس وجہ سے ہو سکتا ہے کہ ع

اصل کی سبھی لیکن نسبت تو ہے اعلیٰ سے

سب جانتے ہیں کہ واجد علی شاہ کو مٹیا برج میں لے جانے کے دوسرے سال جب بہادر شاہ ظفر کو رنگون پہنچا دیا گیا تو اودھ و مرہ

شمال و مغربی صوبہ جات اور پنجاب کے بہت قریب ہو گئے۔ حیدرآباد کی اس وسیع مملکت میں ایسے مسلمان گھرانے بھی تھے جن کو عدالت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ان میں سے ایک سادات بلگرام کا وہ گھرانہ تھا جس میں سید علی ۱۸۵۱ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد سید زین الدین حسین صاحب کمشنری بہادر [illegible] گورنر جنرل کے دربار میں نواب وزیر آف اودھ کے وکیل [illegible] تھے۔ زین الدین حسین صاحب نے اپنے سعادت مند بیٹوں سید حسین، امداد حسین اور زین الدین حسن کو کلکتہ کے مدرسہ عالیہ میں جو وارن ہیسٹنگز نے قائم کیا تھا تعلیم دلائی۔ یہ مدرسہ انگریزی زبان ہونے کے علاوہ علوم مشرقیہ کے عالم بھی تھے۔ آگے چل کر ان صاحبزادوں کو انگریزی سرکار میں ملازمت بھی مل گئی۔ [illegible] گورنر جنرل کے مشرقی زبانوں کے ترجمان (Oriental Interpreter) کی حیثیت سے [illegible] ایجنٹ ہو گئے۔ صوبہ بہار میں ڈپٹی [illegible] خدمت کے صلہ میں شمس العلماء کا خطاب پایا۔ [illegible] بلگرامی [illegible] ۱۸۵۸ء میں ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ سے [illegible] ریاست حیدرآباد میں [illegible] تھے۔ ان کے بڑے بھائی سید حسین عماد الملک نے کلکتہ یونیورسٹی سے ۱۸۶۶ء میں [illegible] امتحان پاس کیا تھا۔ اسی سال سید علی فارسی و عربی تعلیم مکمل کر کے انگریزی مدرسے میں داخل ہوئے۔ دو سال انہوں نے [illegible] کی تعلیم پائی تھی [illegible] پٹنہ کالج سے [illegible] کلکتہ یونیورسٹی سے [illegible] بی اے میں ان کی اختیاری زبان سنسکرت تھی۔ دو سال [illegible] تحصیل [illegible] رڑکی [illegible] انجینئرنگ کی تعلیم [illegible] داخل ہو گئے۔ نواب سرسالار جنگ نے ۱۸۷۶ء میں یورپ کا سفر کیا تو سید علی کے بڑے بھائی نواب سید حسین بلگرامی بھی ہمراہ تھے۔ اس سفر میں جو کچھ انہوں نے دیکھا اس سے متاثر ہو کر [illegible] حیدرآباد سے چند ہونہار نوجوان [illegible] انگلستان تعلیم کے لیے روانہ کیے جائیں جو واپس آ کر ریاست کے مختلف عہدوں کو سنبھال سکیں۔ ایک ایرانی نوجوان مرزا مہدی [illegible] جو اسسٹنٹ انجینئری کے امتحان میں کامیاب ہو چکے تھے ان کے ہمراہ تھے۔ ان کو [illegible] رائل اسکول آف مائنز میں داخل کر دیا اور جب ہندوستان [illegible] سید علی کو رڑکی سے بلا کر اپنے اسٹاف میں ملا [illegible] اور پھر تکمیل تعلیم کے لیے انگلستان بھیج دیا جہاں انہوں نے ۱۸۷۹ء میں لندن یونیورسٹی کا امتحان [illegible] درجہ میں [illegible]۔ اس امتحان میں [illegible] اختیاری زبان جرمنی اور فرانسیسی تھی۔ انہوں نے کیمسٹری، طبیعیات، معدنیات اور ان کے متعلقہ مضامین کی تعلیم [illegible] سال میں ختم کر لی۔ [illegible] ذہانت و قابلیت کے تحسینی سرٹیفکیٹ [illegible] ایسے باکمال پروفیسروں سے لے کر انگلستان چھوڑ [illegible] فرانس، اسپین ہوتے ہوئے [illegible] زبان سیکھنے [illegible] قیام کیا۔ سنسکرت اور بنگالی تو پہلے ہی سے جانتے تھے۔ حیدرآباد میں [illegible] مرہٹی اور تلنگی بھی سیکھ لی۔ ان کا حافظہ بڑا زبردست تھا، جو ایک دفعہ پڑھ لیتے بھولتے نہ تھے۔ فرانسیسی زبان میں بے تکلف باتیں کرتے تھے۔ اور قلم برداشتہ لکھتے تھے۔ جس زبان کی کتاب بیٹھے بیٹھے ایک ہی نظر میں معنی و مفہوم سمجھ لیتے تھے۔ چودہ زبانیں ایسے لہجے میں بولتے تھے کہ یہ سب گویا ان کی مادری زبانیں ہیں۔ بنارس کے پنڈتوں کو ان کے سنسکرت کے لہجے میں [illegible] شاستری کی جھلک نظر آتی تھی اور ان کے تلفظ پر بیاس جی کا شبہ ہوتا تھا۔ یورپ سے واپسی پر وہ [illegible] جنرل معدنیات مقرر کر دیے گئے۔ انہوں نے اور مرزا مہدی خاں نے جو ان سے ایک دو سال پہلے واپس آ چکے تھے مل کر باکمال ضلع ورنگل اور [illegible] میں معدنی تحقیقات شروع کی۔ جب ان کی رپورٹ پر عمل کا وقت آیا تو وہی ہوا جو ہوتا چلا آیا ہے بقول اکبر الہ آبادی ؎

کچھ قدر نہیں اس کی پرستش ہی نہیں اس کی   لیڈر کی لیاقت بھی مفلس کی جوانی ہے

سرسالار جنگ نے جو ریاست کی خوش انتظامی اور مالی فلاح کے منصوبے باندھے تھے اس میں رکاوٹیں تو انہی کی زندگی میں پیدا ہو گئی تھیں ان کے بعد یہ کیسے گوارا ہو سکتا تھا کہ سید علی اور مرزا مہدی ایسے کثیر المعلومات نوجوانوں کو سرزمین دکن سے سونا اگلوانے کی اجازت

[illegible] حال۔ [illegible] ہوتا [illegible] — ان کی [illegible] آدھی — [illegible] حالت [illegible] ——— مفلوک
[illegible] خدمات سے محروم کر دیا گیا۔ [illegible] تو حال [illegible] کے عہد میں [illegible] ملازمتوں [illegible]
— [illegible] بیٹھ گئے اور سید علی [illegible] تعلیمات اور [illegible] پڑھاتے رہے۔ [illegible] میں جنگ ختم ہوئی [illegible]
[illegible] یونیورسٹیوں میں [illegible] کے پروفیسر ہوگئے۔ [illegible] دونوں سے [illegible] کی پالیسی نے [illegible]
[illegible] سے قریبی [illegible] زبان [illegible] حاصل کیں۔

[illegible] سید علی [illegible] حاصل [illegible] تھے [illegible] یونیورسٹی کے قیام کی تحریک [illegible]
[illegible] بیٹھے ہوئے گزشتہ سے [illegible]
[illegible] سے تعلیم دینا چاہتی ہے جس سے [illegible] دیسی زبانوں [illegible] موجود ہیں۔ [illegible]
[illegible] زبان کی شکل [illegible] تصور [illegible] سید [illegible]
[illegible] ذکر [illegible] کے ہاتھ [illegible] تکمیل سے پہلے
[illegible] صاحب نے [illegible] سنسکرت [illegible]
[illegible] امتحانات کے لئے جنہیں [illegible]
[illegible] زیادہ ہی۔

[illegible] جنگ ثانی اور [illegible] سر آسمان جاہ کی وزارت [illegible] زندگی [illegible]
حالات [illegible] خیال [illegible] مستحق [illegible]
[illegible] ہوتا ہے۔ [illegible] یونیورسٹی کے بی اے کے [illegible]
[illegible] گئے تھے لیکن انہوں نے فیس داخل کر کے امتحان کی تیاری شروع کر دی [illegible] چھوڑ چکے
تھے امتحان میں بیٹھے اور یونیورسٹی بھر میں اول آکر طلائی تمغے اور یونیورسٹی کے اسکالرشپ کے [illegible] نے ایک
[illegible] معاملات پر مسٹر [illegible] ایک پمفلٹ شائع کیا تھا۔ ایک گروہ کا خیال [illegible] پمفلٹ [illegible] جس کے دو
[illegible] سید علی بلگرامی اور محمد صدیق ایڈیٹر کہے جاتے تھے شائع [illegible] فتح نواز جنگ [illegible]
[illegible] زندگی کے متعلق جو واقعات بیان کئے گئے ہیں [illegible] اس ریاست میں سوائے عماد [illegible] اور سرور الملک کے [illegible]
[illegible] آسمان جاہ کی وزارت کے حامیوں میں سے تھے۔ اس لئے سوا سرور الملک کے [illegible] کسی نے نہیں [illegible] اس مقدمے کی پیروی کے لئے
[illegible] کی طرف سے [illegible] کے مشہور بیرسٹر مسٹر [illegible] نارٹن جو اس زمانے میں مدراس میں وکالت کرتے تھے اور بمبئی کے مشہور [illegible]
[illegible] گئے۔ یہ مقدمہ ایک کمیشن کے سامنے ۱۹۲۲ء میں بڑے زور شور سے چلتا رہا۔ یہی مقدمہ حقیقت میں فتح نواز جنگ کو حیدرآباد سے
نکالے جانے اور سر آسمان جاہ کی وزارت کے ٹوٹنے کا پیش خیمہ ہوا۔ ۱۹۱۹ء یا ۱۹۲۰ء میں جب میں یوپی میں وکالت کرتا تھا ایک مقدمے
میں میرا اور مسٹر نارٹن کا اور [illegible] آنا ہوا تھا۔ اس مقدمے میں مسٹر محمد [illegible] انصاری بیرسٹر کے (جو بعد کو ہائی کورٹ کے جج ہوئے) جونیئر
کے طور پر کام کر رہا تھا۔ اکثر ہم تینوں کی تفریحی صحبتیں رہتی تھیں۔ مسٹر نارٹن بڑے بذلہ سنج اور ہنس مکھ تھے۔ ان میں گورے کالے کی تفریق
کا مادہ بہت کم تھا۔ وہ اکثر ان صحبتوں میں بڑی شخصیتوں کا بالنسلی تفریق کے مذاق اڑاتے رہتے تھے [illegible] اور اس زمانے کی "گندی سیاست"
کا تذکرہ کرتے ہوئے نارٹن نے کہا کہ اگر سید علی بی اے کا امتحان دے کر حیدرآباد واپس نہ آتے اور کلکتے ہی میں رہ جاتے تو وہ بہت

جلد کلکتہ [illegible] میں نمایاں مقام حاصل کر لیتے۔ ان کا حافظہ قوی اور ذہن تیز اور مطالعہ وسیع تھا۔ انہیں بیسیوں برس کے [illegible] بحیثیت [illegible] کے واقعات معلوم رہے ہوں گے [illegible] پراگندہ خیالی سے ان کا دل اچاٹ نہ ہوتا ہو [illegible] معیار پر وہ قانون پیشہ [illegible]

وہ ریاست میں [illegible] شعبے کے [illegible] سے [illegible] ان کی علمی خدمات [illegible] حضرت [illegible]

[illegible] میں ذکر کیا [illegible] یونیورسٹی نے ان کو [illegible] انہوں نے ایک [illegible]

[illegible] عربی [illegible] علامہ [illegible] کرامت حسین صاحب [illegible]

[illegible] میں [illegible] کے [illegible] مضامین شائع ہو چکے تھے [illegible]

پیڈولنس کا ترجمہ [illegible] کا [illegible] متعلق [illegible] [illegible] کی [illegible]

[illegible] روپیہ ملا۔

[illegible] سید علی صاحب [illegible] پیشاور [illegible] اشاعت [illegible]

علمی کاموں [illegible] مدد بھی کی۔ انہوں نے [illegible] رشتہ [illegible] قائم کر لیا [illegible]

[illegible] بہت سی کتابیں [illegible] ترجمہ [illegible] انہوں نے [illegible] بحیثیت [illegible] رشتہ [illegible]

[illegible] سے [illegible] روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کرایا [illegible]

[illegible] کے لئے [illegible] منظور [illegible] کے حوالے کر دی۔

[illegible] انہوں نے ایک [illegible]

پڑھا انہوں نے [illegible] کا ترجمہ [illegible]

[illegible] کے پروفیسر ہو گئے تو [illegible]

متعلق بھی [illegible] شروع کی تھی مختلف نسخے اور [illegible] کے حوالے یا اقتباسات تھے اور [illegible]

[illegible] کا ترجمہ [illegible] کرتے تھے [illegible] تعداد [illegible] ہندوستان آتے کہ جب [illegible]

[illegible] ہو گئے تو ان کی [illegible] یونیورسٹی کا [illegible] بنانے میں مشغول ہو گئے [illegible]

نے اس کے مرتب کرنے کے لئے یورپ اور مصر کی یونیورسٹیوں کے طریق [illegible] اور تعلیمی نصاب کا مطالعہ کیا۔ [illegible]

[illegible] زیادہ زندہ رہ سکے۔ بہت [illegible] یونیورسٹی سے متعلق [illegible] یہ تو [illegible] بات تھی کہ [illegible]

چانسلر ہوتے۔ [illegible] دونوں ان پر بھروسہ کرتے تھے۔

تمدن ہند اور تمدن عرب ان کے دو بڑے شاہکار ہیں جو ان کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔ ان دونوں کتابوں کا مصنف [illegible]

لیبان ہے۔ یورپ میں یہ دونوں کتابیں [illegible] اور [illegible] کی یادگار ہیں اور [illegible] مستند ہیں۔ ان کتابوں

کا ترجمہ انہوں نے [illegible] سے کیا [illegible] پڑھ لیتے تھے پھر قلم اٹھا کر اپنی زبان اردو میں لکھنا شروع کر دیتے تھے اور پھر [illegible]

نہیں کہ مصنف کا منشا فوت ہو جائے۔ ان ضخیم کتابوں کو پڑھتے وقت یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ یہ کسی کتاب کا ترجمہ دوسری زبان سے

اردو میں ہے۔ انہیں ہند کے پرانے تمدن سے بڑی دلچسپی تھی۔ [illegible] کے مشہور غاروں کی جن میں بعض تو اس وقت مٹی میں دبے ہوئے تھے۔

بڑی چھان بین کی اور ان پر گائڈ کے طور پر ایک کتابچہ لکھا جس [illegible] ان لوگوں کو جنہوں نے پرانی یادگاروں کی تحقیق کی بڑی رہنمائی

ہوئی۔ انہوں نے فارسی اور سنسکرت کی تعلیمی [illegible] کا تقابل کیا اور اس پر ایک پورا رسالہ لکھا۔ حیدر آباد کی اقتصادی حالت اور یہاں کے

[illegible]

[illegible]

[illegible] کتابوں کا [illegible] ترتیب۔ انہیں کسی

[illegible] جس [illegible] مستقل [illegible]

[illegible] شائع [illegible]

[illegible] کا شوق [illegible] نہیں [illegible]

[illegible]

[illegible] حیثیت [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] وقت [illegible] سید [illegible] صاحب [illegible]

[illegible] سید [illegible] صاحب [illegible]

[illegible] شروع [illegible]

[illegible]

[illegible] اس کتاب [illegible]

[illegible] اس میں کامیاب ہو چکا۔ کیمبرج یونیورسٹی میں ان کی جو منزلت و توقیر تھی اور ان کی [illegible] بڑی شہرت تھی اس کا اندازہ

اس سے ہو سکتا ہے کہ کیمبرج کی لائبریری میں ایک پرانی کتاب [illegible] تھی [illegible]

اس قصہ [illegible] سید [illegible] مزید [illegible] تقسیم ہو چکے تھے۔ [illegible] صاحب کے پاس

[illegible] تھا جن کا اس سبجکٹ سے تعلق تھا۔ سید [illegible] صاحب سے جب اس کتاب کا تذکرہ آیا تو انہوں نے یہ کہہ کر کہ آپ [illegible] مجھ سے

زیادہ مستحق ہیں یہ کاپی ان کے نذر کر دی۔ انہیں مصر کی پرانی تاریخ پر ایک نایاب کتاب ہاتھ آگئی۔ انہوں نے اس کے حصے رائل ایشیاٹک

سوسائٹی کے جرنل میں طبع کرانا شروع کر دیے۔ انہوں نے کلام پاک کا ایک ایسا انڈکس بنوانا چاہا کہ جس کے ذریعہ سے ہر موضوع پر جو آیت

جس سورت میں ہو آیت اور سورت کے حوالے سے مل سکے۔ اسی طرح سے انہوں نے عربی مصنفین کا نام وار ایک انڈکس حیدرآباد ہی میں

بنوانا شروع کیا تھا۔ جس سے ہر مصنف کی تحقیقات کا پتہ چل سکے۔ ان دونوں کو ان کا ارادہ جلد [illegible] طبع کرانے کا تھا مگر یہ کام بھی جوں

کا توں ہی رہ گیا۔

شرافت کا یہ اثر تھا کہ بچہ جس ماحول میں پرورش پاتا ہے، اس کا اثر غیر شعوری طور پر اس کے عادات و خصائل پر ضرور پڑتا ہے
سید علی اپنے وطن ٹانڈہ سے دور ایک شریف خاندان کے گھر میں پیدا ہوئے تھے۔ سنہ کی شروع میں دو چار برس کے بعد جب ان
کی عمر چودہ برس کی تھی یہ ... بچپن کی ... محبت ہو گئی ... پندرہ برس کا سید اور ... طالب ہوتا ہے
جس محلے میں یہ تھے اس کے دروازے محض خوشحال خاندانوں کی ... پڑھے لکھے ہوتے تھے۔ بچپن میں انھیں اپنی خاندانی وجاہت کا احساس ہو
چکا تھا پھر ان کے ... ان کی ... ہندوستانی ... سوت پر ... گیا۔ جس ...
جو ان کے لڑکے بگڑا کرتے تھے ان کے ہونے کے بعد ... ان پر ... وقت ... غالب تھی ...
پر بھی ... کے معنی ... شہرت میں ... چونکہ انھیں ...
کا منہ دیکھنا پڑا تھا اور ... ان کے ... گھر سے ...
... ان ... صبر ... بند ... ہو
... دو ... ان ... کی بات ... مرتے ... دور ...
ان راستوں کو ... طلب ... ان کے محل ... کی طرف ... جب ...
معروف ... ان کے گھر پر ... صاحب ... کی طرف ...
تھے اچھے پہنتے تھے اچھے مکان میں رہتے تھے۔ ان کا اخلاق وسیع تھا مگر ... ان کو ... آتی تھی ...
کے یہاں آتا ہی رہتا تھا ... ان کے پاس ... زبان میں ...
کی بیگم صاحبہ ... ان کی ... شوہر کی ... شوہر کے مہمانوں کے ...
کھانے اپنی نگرانی میں پکواتیں ... ان کے ساتھ گئیں ... ہندوستان ...
تھا آج تک ان کو محبت ... یاد کرتے ہیں ... ترک کیا جس طرح ...
وہاں بھی پیا کیں۔ سید علی صاحب جب تک حیدر آباد میں برسر خدمت رہے۔ جہاں اہل غرض نے ان کو گھیرا ... ہوتے تھے
سفارش کرنے سے دریغ نہ کرتے تھے۔ بعض وقت تو اس بارے میں وہ حد سے زیادہ بڑھ جاتے تھے۔ مولوی خدا بخش خاں جن کی ...
لائبریری مشہور ہے۔ وہاں وکالت کرتے تھے درجہ دوم کی سند تھی۔ حیدر آباد میں ایک مقدمے کے سلسلے میں آئے سید علی صاحب ...
کے والد دونوں سے ان کی ملاقات تھی اسی وجہ سے وہ مولوی صاحب کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ انھوں نے خواہش کی کہ ...
درجہ اول کی سند مل جائے تو اچھا ہے۔ سید علی صاحب نے کہا کہ یہ کیا بڑی بات ہے اور مولوی میر افضل حسین صاحب چیف جسٹس سے
پاس گئے اور پرانے تعلقات جو ان کے خاندان کے مولوی خدا بخش سے تھے وہ بھی بیان کئے میر صاحب نے ان کو سوکھا جواب دے دیا
جب مولوی خدا بخش خاں صاحب کو یہ علم ہوا تو ان کو افسوس ہوا اور سید علی صاحب سے معذرت چاہی کہ آپ کو میری وجہ سے ایسا جواب
سننا پڑا۔ سید علی صاحب نے کہا نہیں مولوی صاحب میں آپ کو ایک نہ ایک دن یہاں کا میر مجلس کرا کر رہوں گا۔ چنانچہ جب وقار الامراء
کا دور شروع ہوا تو مولوی خدا بخش میر مجلس ہو کر ہی رہے۔ نواب سر عقیل جنگ بہادر کہتے تھے کہ میں حیدر آباد سے بیزار ہو کر بمبئی جانے والا
تھا۔ ملازمت کے وعدے تو بہت سے ہوتے مگر پورا ایک بھی نہیں۔ ایک دن میں اپنے چچا سید علی صاحب سے ملنے گیا اور ان کی دریافت
پر کہا کہ کل بمبئی جا رہا ہوں۔ انھوں نے کہا کیوں۔ سید عقیل نے کہا کہ میں بمبئی میں جا کر خود نوکری تلاش کروں گا۔ انھوں نے کہا کہ ایک دن اور ٹھہر
جاؤ اگر تم کو ملازمت نہ ملے تو جہاں دل آئے چلے جانا۔ کل صبح بیگم بیٹھی میں مجھے وقار الامراء کی ڈیوڑھی میں ملو۔ چنانچہ صبح میں گیا۔ چچا بھی آئے

[illegible]

[illegible] سید [illegible] صاحب مرحوم اپنے [illegible] کی طرح مذہباً شیعہ تھے۔ ان کی [illegible] نہ تھی۔ [illegible]
[illegible] کرتے تھے [illegible] جلتے تھے [illegible] سے دور بھاگتے تھے۔ ان کی نظر میں مذہب اخلاق کی ایک جیسی زندہ
حقیقت تھی جس کا اظہار انسان کے اخلاق [illegible] میں متواتر ہوتا رہتا ہے ان کے خیال کے مطابق انسان [illegible] جاتا ہے [illegible]
اس کے درمیان [illegible] مذہب ہے۔ مذہب یہ ہے کہ [illegible]
کے تابع کر دیا جائے۔ ان کو یہ دیکھ کر افسوس ہوتا تھا کہ اسلام کی [illegible] مسلمانوں کے [illegible] ہو رہی ہے۔ جب [illegible]
کی [illegible] سے علیحدہ ہو کر واپس آئے تو اس کے کچھ دن پہلے ہی نواب وقار الملک اور [illegible]
کے درمیان [illegible] کے علی گڑھ کالج میں اختیارات و اقتدار کے متعلق سخت جھگڑا چل رہا تھا در حقیقت [illegible] کے باعث
شیعہ کالج بنانے کی تجویز پیدا کرائی گئی تھی۔ جب ان سے یہ تمام اندرونی باتیں بیان کی گئیں تو انہوں نے اس تحریک کو نہایت [illegible]
کہا۔ ایک دفعہ سے فرمانے لگے کہ تمہیں معلوم ہے کہ علی گڑھ کالج میں صرف ایک ہی مسجد کیسے بنی۔ جب سر سید اقامت خانے کا
کلاسوں اور دوسرے ہالوں کا نقشہ تیار کرا رہے تھے تو بورڈنگ کے احاطہ میں دو مسجدیں بنوانا چاہتے تھے میرے بھائی نے اس
کی سخت مخالفت کی اور سید صاحب سے کہا اگر آپ ہی شیعہ سنی طلباء سے ایک مسجد میں نماز نہ پڑھوا سکے تو جب یہ یہاں سے
تعلیم پا کر نکلیں گے تو آپ کے مشن کا کیا حال ہوگا۔ سر سید نے فوراً ہی دو مسجدوں کا ارادہ ترک کر دیا۔ لکھنؤ کے ایک ان کے بڑے
بارسوخ دوست نے انہیں آل انڈیا شیعہ کانفرنس کی صدارت کے لئے لکھا کہ آپ شیعہ ہیں، عالم ہیں، صاحب مال و جاہ ہیں اس

عہدے کو قبول کر کے شیعہ قوم کی بہبود کیجئے۔ آپ نے جواب دیا کہ ملا کر میں شیعہ ضرور ہوں مگر متعصب نہیں ہوں۔ علاوہ ازیں میں حکومت سے وابستہ ہوں میں اس قسم کی کانفرنسوں کو پسند نہیں کرتا۔ مسلمانوں کے لئے ایک آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس موجود ہے۔

ان کی طبیعت روکھی پھیکی نہ تھی مزاح کی طرف مائل بھی تھا۔ ایک دن نواب صاحب کی درگاہ میں نماز پڑھنے گئے وہاں سے جو درگاہ میں داخل ہوتے ہی مرثیہ [illegible] دیکھ کر مجاوروں نے انہیں گھیر لیا انہوں نے کہا کیوں گھبراتے ہو میں تو والی ہوں۔ مولوی عبد الحق صاحب بیان کرتے تھے کہ ایک دفعہ وہ مولانا شبلی، خواجہ [illegible] وغیرہ ان کے یہاں بیٹھے ہوئے تھے مولانا شبلی نے سید علی صاحب [illegible] کر کے بادشاہ عبد الصمد [illegible] نے ایک کتاب شیعوں کے خلاف چھپی ہے شیعوں کا حضرت [illegible] کی عداوت لیں سے [illegible] صاحب سے جواب [illegible] لکھنے کا سوال نہیں ہے انہوں نے جلدی آدمی حلفت [illegible] کے وہ کیسے انہوں نے جواب دیا [illegible] ہوتے تو سب ہمارے امام ہی کی پرستش کرتے۔ اگر اس طرح آپ کی سلطنت بھی ہوا تو آپ لیا کرتے۔ ایک مولوی صاحب نے آپ سے ایک کلیات کتاب حق [illegible] مروت کے واسطے [illegible]۔ کیا کتاب نکالی [illegible] دیکھنے لگے اور کتاب [illegible] ہے مگر جلد [illegible] کے پڑھنے کی ہے۔ مولوی صاحب نے [illegible] کہ کر ہاتھ کھینچ لیا۔ آپ [illegible] کر رہے تھے ایک دن کچھ ڈاکٹری [illegible] قوم کا حال سنا رہے تھے ایک صاحب نے کہا کلیتہً مر رہی ہے۔ اس صحبت میں ایک [illegible] چشمہ لگائے مولوی صاحب بھی اتفاق سے موجود تھے مسکرا کر ان کی طرف اشارہ کر دیا۔

[illegible] ۳ مئی ۱۹۱۱ء کی رات میں کھانا کھانے کے بعد وہ [illegible] ہمدردی کے مکان میں ہنس کر اٹھ بیٹھے رہے [illegible] بیگم صاحبہ اور اپنی بچی رفیعہ بیگم [illegible] ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے [illegible] کے [illegible] میں۔

"آسمان سے ملک الموت بن کر ایک تارہ ٹوٹا جس کی روشنی سے سب کی آنکھیں [illegible] ہو گئیں مگر ان کے دل جو [illegible] ہی ان کی حرکت قلب بند ہو گئی۔ ہوا اور چند منٹ پہلے اپنے فرزندان سے ہنس بول رہے تھے وہ چیخ چیخ کر رونے لگے جو گھر ابھی عشرت کدہ بنا ہوا تھا وہ ماتم کدہ بن گیا"

منشی سجاد حسین

ایڈیٹر اودھ پنچ

ممتاز حسین جونپوری

منشی سجاد حسین ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئے یہ وہی زمانہ ہے جس میں اودھ کے [illegible] اور مظلوم [illegible] ہو چکی تھی [illegible] ساتھ ایک سنجیدہ مذاق پیدا کیا [illegible] انگریزوں نے [illegible] قیصر کے [illegible] رخصت [illegible] اور [illegible] مٹیا برج میں [illegible] ان کے جانے کے بعد [illegible] لٹ گئی اور [illegible] ہو گئے۔ [illegible] ایک برس بعد [illegible] نے پوری کردی۔

یہ تھا وہ سیاسی پس منظر جس میں اودھ پنچ کے ہونے والے ایڈیٹر منشی سجاد حسین نے آنکھ کھولی جہاں تک [illegible] کا تعلق ہے۔ اس وقت اردو زبان نئے نئے خیالات کو اپنا چکی تھی اور اس پر انگریزی اثرات نمایاں ہو چکے تھے۔ [illegible] تحریکوں [illegible] حالات کی [illegible] نے ادبی حلقوں پر غور و فکر کی راہیں کھول دی تھیں۔ منشی سجاد حسین نے اسی فضا میں پرورش پائی اور بڑے ہوئے۔ [illegible] سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

ان کے مورث اعلیٰ یوں تو بارہ بنکی کے مشہور اور مردم خیز قصبہ ردولی شریف سے تعلق رکھتے تھے لیکن [illegible] کی کشش انہیں کاکوری شریف کھینچ لائی تھی۔ یہ دونوں بہت پرانی اسلامی بستیاں ہیں اور اسلامیان ہند کے لئے یکساں باعث عقیدت و احترام۔ منشی سجاد حسین ایک اونچے اور معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد شیخ منصور علی ڈپٹی کلکٹر اور ماموں نواب [illegible] حسین لکھنؤ کے مشہور نامی وکیل تھے جو بعد میں ریاست حیدرآباد کی عدالت العالیہ کے چیف جسٹس ہو گئے تھے۔ منشی صاحب نے ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں اپنے ماموں کے پاس ہی پائی اور اردو فارسی پر عبور کے علاوہ عربی میں بھی شد بد حاصل کی۔ اس زمانے میں لکھنؤ برباد ہو چکا تھا لیکن شرفا کے خاندانوں میں بڑی ٹکسالی زبان بولی جاتی تھی۔ بیگمات کی زبان اور محاورات مستند تھے چنانچہ منشی سجاد حسین کو بچپن ہی سے اچھی زبان سیکھنے اور اچھی اردو پڑھنے کا موقع ملا اور یہی وجہ تھی کہ وہ جوانی ہی میں زبان کے زبردست مشّاق تسلیم کئے جانے لگے۔ ان کی طبیعت شروع

ہی سے بڑی چہل پہل تھی۔ پرانے زمانے کے سرری سجادوں کی ضد اور شرر ناجنس کے سینے میں کیا بھرتے۔ یہ لڑکے اپنے استادوں کو سبق پڑھنے میں پریشان کرنے میں تل دے جایا کرتے تھے۔

۱۸۹۳ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کر کے اور کالج میں ایف اے تک پڑھ کے بھاگ نکلے اور نینی تال میں نوجیوں کو فوٹو پڑھانے پر مقرر ہو گئے۔ لیکن جلد ہی گوراشاہی نخرے اور نوجیوں کی صحبت سے دل اچاٹ ہو گیا اور لکھنؤ کی یاد ستانے لگی۔ آخر کار ایک دن نوکری پر دو حرف بھیج کر گھر چلے آئے۔

مضمون نویسی کا شوق بچپن ہی سے تھا اور چاکے دیں اور بہنسے مذاکر کی بھی تھے چنانچہ دوسری نوکری کا خیال ترک کر کے دربار کے منشی مقرر ہو گئے۔ ذہنی طور پر جیسے تھا ویسے کے انگریزی ادب کے مطالعے پر منحصر تھا ہی "لندن پنچ" کی طرز پر ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ سے ہفت روزہ "اودھ پنچ" نکالا اور اسے چھاپنے کے لئے "شام اودھ" کے نام سے ایک چھاپہ خانہ بھی قائم کیا۔ اس زمانے میں ان کا کچھ عرصہ لکھنؤ کے محلہ میں رہے پھر گور گنج منتقل ہو گئے۔

یہ وہ دور تھا جب کہ سودا کی ہجو اور انشاء کی ظرافت اور سید انشاء کے چٹکلوں کی جگہ پھکڑ پن کا مذاق لکھنؤ کی محفلوں میں عام تھا۔ ظرافت کا رنگ و ملک معقول نہیں ہوتا تھا اور زبان و محاورات اور پھبتی بنانے والے ادب کا چرچا لکھنؤ کے بچے بچے سے اہل زبان تھا اور سوا ملامت سمجھنے والے گلی کوچوں میں تشبیہ اور استعارے بناتے پھرتے تھے پنچ کے اب بھی ڈیوڑھیوں کی محفلوں اور محفلوں کی بگڑی بگڑی ہوئی ظرافت اور پھبتی کی شکل میں لفظوں کی نمک پھینکی جاتی تھی۔ چائے خانوں میں بھی مزاح و ظرافت کی دوکان لگائے کئی تکیوں پر بیٹھے رہتے تھے۔

یہ تھا اس زمانے کا لکھنؤ جب منشی سجاد حسین نے ظرافت کا نیا معیار پیش کیا اور انشاء پردازی ادب میں ایک نئی طرح ڈالی۔ انہوں نے مزاح کے پردے میں زبان اور محاورات کی اصلاح پر سارا زور قلم صرف کر دیا اور اس کوشش میں اخلاقی اور سیاسی مقاصد بھی پیش نظر رکھے۔ اس لحاظ سے انہیں ایک ایسے سپاہی سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جس نے اپنے قلم سے جہاد کیا اور ملک کی آزادی اور قوم کی فلاح کے لئے مذاق ہی مذاق میں وہ کچھ کر دکھایا جو بڑے بڑے سیاسی لیڈروں سے نہ ہو سکا تھا۔

منشی سجاد حسین کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک ایسی ادبی اقلیم میں ظرافت کا اعلیٰ معیار قائم کیا جہاں پھکڑ پن اور ابتذال کا سکہ رائج تھا۔ منشی سجاد حسین نے مذاق اور ظرافت میں سنجیدگی اور توازن پیدا کیا اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ ملک کے گوشے گوشے سے چوٹی کے مزاح نگار شاعروں اور ادیبوں کو ڈھونڈ کر انہیں دنیا سے روشناس کرایا۔

"اودھ پنچ" کے سماجی، سیاسی، اقتصادی، علمی اور ادبی مضامین نے دیکھتے دیکھتے معاشرے میں انقلاب برپا کر دیا اور ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہلچل سی مچ گئی۔ یہاں تک کہ اکبر الٰہ آبادی بھی "اودھ پنچ" کے جادو سے محفوظ نہ رہ سکے۔ وہ اس وقت تک قصبۂ کڑا کے مشہور استاد وحید مرحوم سے سنجیدہ غزلوں پر اصلاح لیتے تھے لیکن "اودھ پنچ" ہی کے زیر اثر پرانا خرقہ و جبہ دور پھینک اور دنیا زوسی رنگ تغزل چھوڑ کر دریائے ظرافت میں غوطہ زن ہو گئے۔

اکبر مرحوم کا پہلا منظوم خط ۱۸۷۷ء ہی کے اودھ پنچ میں شائع ہوا۔ جس میں انہوں نے بڑے پرجوش طریق پر "اودھ پنچ" کا خیر مقدم کیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے ظرافت کا چولا پہنا۔ اکبر مرحوم اودھ پنچ کے لئے نثر میں مضامین بھی لکھتے تھے۔ جو کبھی ان کے اپنے نام سے اور کبھی فرضی ناموں سے شائع ہوتے تھے۔ اودھ پنچ میں شائع ہونے والا اکبر کا منظوم خط بعد میں ان کے دیوان میں بھی شامل کیا گیا اور اسے کسی شک و شبہ کے بغیر اکبر کی ظریفانہ شاعری کا سنگِ بنیاد کہا جا سکتا ہے۔

[illegible] ——— ۱۹۳۳

[illegible] کے دوستوں [illegible] بہترین [illegible] ہے۔ [illegible]
[illegible] سید اکبر حسین [illegible] پنڈت [illegible] نواب [illegible] منشی [illegible]
[illegible] شامل تھے۔

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible] منشی سجاد حسین [illegible]
[illegible] شامل تھے۔ [illegible]
[illegible]

[illegible] سجاد حسین [illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible] منشی سجاد حسین [illegible]
وغیرہ میں جلد [illegible]

اردو صحافت میں کارٹونوں کے ذریعے اخبار [illegible] منشی سجاد حسین ہی نے [illegible]
[illegible]
[illegible]

منشی سجاد حسین کا جسم [illegible] رنگ گندمی اور چہرہ گول تھا۔ چہرے پر [illegible] موجود تھی۔ ان کے [illegible]
بے تکلف دوستوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ منشی سجاد حسین کا مزاج [illegible] سے بھی زیادہ سادہ تھا۔ عام طور پر [illegible] کی نیت
پہنتے تھے۔ پاجامہ کبھی چھوٹے پائنچوں کا ہوتا تھا کبھی بڑے کا۔ چہرے سے شگفتگی برستی تھی۔ لہجے میں نرمی اور مٹھاس تھی۔ [illegible] کے
تھے۔ [illegible] اپنی گوناگوں خوبیوں کے باعث ہر فرقے اور طبقے میں یکساں مقبول تھے۔

ایک بار ایک اخبار کے ایڈیٹر پر مقدمہ چلا۔ یہ صفائی کے گواہ تھے۔ مستغیث کے وکیل نے پوچھا کل کی گواہی کے بعد جب آپ اپنے
وکیل سے ملے تو کیا باتیں ہوئیں۔ انہوں نے کہا جانے دیجئے یہ نہ پوچھئے۔ وکیل صاحب نے جواب دینے پر اصرار کیا تو کہنے لگے "آپ کے متعلق
فرماتے تھے کہ ایسا ایسا بیوقوف بنایا ہے کہ بایدوشاید" ساری عدالت ہنس پڑی اور وکیل صاحب شرما کے بیٹھ گئے۔

منشی سجاد حسین بڑے نڈر، مستقل مزاج اور قانع انسان تھے۔ روپے پیسے کی ذرا بھی پروا نہ کرتے تھے۔ جو کچھ لکھتے بیباکی اور دلیری
سے لکھتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ انہوں نے ایک ریاست کی بدنظمی کے متعلق پے در پے مضامین لکھے۔ اس ریاست میں ان کے کچھ عزیز
بھی اچھے عہدوں پر فائز تھے۔ چنانچہ انہیں بھی ایک اعلیٰ عہدہ پیش کر دیا گیا لیکن وہ صاف انکار کر گئے اور اپنے مسلک سے ذرا بھی انحراف گوارا نہ کیا۔

منشی سجاد حسین بڑے پکے کانگریسی اور کانگریس کے بڑے جوشیلے رکن تھے۔ ۱۸۸۷ء میں نیشنل کانگریس میں شامل ہوئے تھے اور مرتے دم تک یعنی ۱۹۱۵ء تک اس کے ممبر رہے۔ ان کے کانگریسی دوستوں میں بڑے بڑے ادیب اور ہندو وطن پرست شامل تھے جن میں پنڈت شیو نارائن بہار، رتن ناتھ سرشار، [illegible] اودھ اخبار اور دوسرے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ جو اودھ پنچ کے لکھنے والوں میں [illegible] محمد آباد ان کے بڑے مخلص دوست تھے۔ منشی سجاد حسین اور اودھ پنچ نے ایسے نازک وقت میں کانگریس کی مدد اور اس کی اشاعت میں جو کام کیا وہ [illegible] اودھ پنچ کا خواب نہ دیکھا ہو اس وقت تک اس کا [illegible] سامنے ہر شخص قومی رنگ میں ... تھا اور لکھنؤ میں تو کانگریس کی مخالفت میں ایک باقاعدہ انجمن "نیو کانگریس" کے نام سے کام کر رہی تھی جس کو منشی صاحب اور ان کے ساتھیوں نے ختم کر کے کانگریس کا ساتھ دیا۔

۲۰ دسمبر ۱۸۹۱ء کو لکھنؤ میں کانگریس کا جلسہ ہونے والا تھا۔ اس کے مقابلہ میں اینٹی کانگریس والوں نے بھی ایک جلسے کا اعلان کر دیا اور ایک اشتہار شائع کیا جس میں لوگوں سے شرکت کی اپیل کی گئی تھی۔ اس اشتہار میں بدقسمتی سے "مستقلین" کا ذکر آگیا تھا۔ اس پر منشی سجاد حسین اور ان کے چلبلے طبیعت کے مزاح نے ایک معرکہ کا مضمون لکھا۔ بچارے مخالفوں کو لینے کے دینے پڑ گئے۔

اینٹی کانگریس والوں نے لکھا تھا "اس جلسے میں گورنمنٹ کے خیرخواہ، پبلک کے افراد اقربا، احباب اور متعلقین کے ساتھ شرکت فرمائیں۔"

جواب میں منشی سجاد حسین کے مضمون کی چند سطریں ملاحظہ ہوں:—

"اس نیاز مند کو تعجب ہے اینٹی کانگریس نے متعلقین کو جو تکلیف دی ہے اس کا مقصد کیا ہو [illegible] کچھ بھید نہیں کھلتا کہ وہ متعلقین جلسے میں موجود ہوں۔

[illegible] جانتے ہوں گے کہ متعلقین [illegible] اور بیگم [illegible] جس طرح ہمیشہ گھر اور گھر کے جھگڑوں میں اکثر تعلق ہوتا ہے یہاں بھی دیکھیں گے۔ جب سارا گھر شریک ہوگا تو ضرورت کا سامان بھی ہمراہ ہوگا تو ہم پیش خدمتیں، شیرخوار بچہ، جس کے ابھی ٹیکہ لگا ہوگا، بھیڑ کا گہوارہ، پاندان، حسینی، تاج، مرغ، بکری کا بچہ، چند خرگوش، ابھی چوہے، طوطے کا پنجرہ (خاص اس مصلحت سے آئے گا کہ بولنے والے کی بولیاں یاد کرے) باورچی خانہ کا دیگ، ان کے صاحبزادے، نعوذ باللہ [illegible] کا پلا، لینڈی کتے کا پلا، چھوٹی صاحبزادی کی گڑیا کا بچہ، کبوتروں کی کابک، مرغی کا ٹاپا، بٹیروں کے تھیلے، بیگم صاحبہ کا پاندان، طشت، تسلا، ڈھکنے، گیرے، [illegible] سب ہی ہوا چاہئیں۔"

اس مضمون سے نہ صرف منشی سجاد حسین کے ندرت قلم اور انشاپردازی کا پتہ چلتا ہے بلکہ اس زمانے کے لکھنؤ کی زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

اودھ پنچ میں جب بھی اس طرح کا مضمون شائع ہوا تو دھوم ہو گئی۔ منشی سجاد حسین کی ایسی دھاک بندھ گئی تھی کہ ہر شخص ان سے ڈرتا تھا لیکن آخر عمر میں ایسا باغ و بہار آدمی بھی فالج سے لاچار ہو کر سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ منزل سوکھتا گیا اور بالآخر دنیا سے بیزار ہو کر ایسا گیا کہ پھر لوٹ کر نہ آیا۔

آخری عمر میں انہوں نے کانگریس کے اجلاس کے لئے صدر استقبالیہ کی حیثیت سے ایک خطبہ لکھا جو ان کی بیماری کے سبب چکبست سے پڑھوایا گیا۔ مرنے سے پہلے یہ اعزاز بھی شاید انہیں آخرت کے خوف سے ملا لیا گیا، ورنہ زمانے نے ان کی ناقدری ہی کی۔

اگر وہ انگریزوں کی چاپلوسی کرتے تو کم از کم خان بہادری کا روکھا سوکھا خطاب تو لے ہی مرتے۔ مگر ان کے کردار کی عظمت اور قناعت کا یہ عالم تھا کہ تمام عمر انگریز عہدہ اور خطاب دکھاتے رہے لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ انہیں قانون کی گرفت سے بچا رکھنے کا بھی بڑا سلیقہ تھا یہی وجہ تھی کہ وہ انگریزوں اور حکومت پر بڑی سے بڑی چوٹ کرنے کے باوجود کبھی قانون کی گرفت میں نہ آسکے۔ البتہ قدرت کے قانون کی گرفت سے وہ نہ بچ سکے اور قضا کا فرشتہ انہیں سب سے بڑی عدالت میں پیش کرنے کے لئے اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔

مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی

ڈی جانسن

[illegible] بات ہے کہ میں [illegible] شعر و سخن [illegible] ایک شاعر کی حیثیت سے [illegible]
نہایت محدود تھا۔ میرے [illegible]

[illegible] صاحب [illegible] شعر کہنے کی مشق [illegible] تھے۔ [illegible]
مجھے حکیم سید [illegible] صاحب شگفتہ مرحوم [illegible]
تھے اور میں انگریزی پڑھتا تھا۔ شگفتہ مرحوم مجھ سے دو تین برس چھوٹے تھے [illegible] خود بھی لکھنے کی کوشش کرتے تھے۔
کوئی باقاعدہ استاد [illegible] مجھ سے مشورہ کر لیا کرتے تھے [illegible] عقیدت تھی۔

میں نے لکھنؤ چھوڑا اور اس کے بعد مجھے معلوم نہیں کب شگفتہ صاحب نے عزیز صاحب کا تلمذ اختیار کیا۔ بہرحال انہوں نے ایسے
استاد کے فیوض سے خوب مستفید [illegible] حاصل کی۔

بہتیرے شعر عزیز صاحب کے میں نے ان سے سنے [illegible] اس زمانے میں سنے جب عزیز صاحب [illegible] تو
نہیں ایک قصیدہ [illegible] کا مطلع جو شگفتہ مرحوم نے سنائے تھے اب بھی یاد ہیں:

(۱) فراقِ یار میں گھٹ کر لبوں پہ اب تو جاں آئی — [illegible] دل چھوڑ [illegible] شکیبائی
(۲) میاں [illegible] ہے دم پڑا ہے تیرا شیدائی — [illegible] آج اعجازِ مسیحائی

یونہی میری طالب علمی کے [illegible] لکھنؤ میں گزر گئے لیکن میں اور جناب عزیز ایک دوسرے سے [illegible] نومبر
سنہ ۱۹۲۲ء [illegible] اس عرصے میں [illegible] شاعر کی حیثیت سے جانا جا چکا تھا [illegible] ان کا تو ایک مجموعہ بھی گل کدہ کے نام سے شائع ہو گیا جو انہوں
نے سنہ ۱۹۱۹ء کے لگ بھگ مجھے بھوپال میں بھیجا۔ میں اس زمانے میں نوکری کے سلسلے سے بھوپال ہی میں مقیم تھا

اگر کسی اخلاق کے وقت کچھ اور نہیں، صرف یہی ایک بات ضرور [illegible] پتہ کا پتہ لگانے کی زحمت گوارا کی۔ مرحوم تصنیف مجھے مرحمت فرمائی، اور [illegible] ذاتی تعارف کیا [illegible] اور محبت بھی شامل تھی۔ آخر میں ان کے دامن محبت کی وسعت ثابت ہوتی ہے — ہر چند کہ اس ذیل میں اور بھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔

[illegible] ہے کہ [illegible] ان سے [illegible] صاحب [illegible] کی زندگی اور [illegible] کا استقلال [illegible] کی قصیں سے [illegible] صاحب [illegible] لکھنؤ [illegible] ملیح آبادی اکسیر [illegible] لکھنؤ اور مجذوب [illegible] ادب شامل ہیں — [illegible] کی محبت، حسن خلق، انسانیت [illegible] معلوم ہوتی ہیں [illegible] وہ کبھی فراموش نہ ہو سکے۔

غرض نومبر ۱۹۲۶ء [illegible] جوش [illegible] تالیف [illegible] لکھنؤ کے بعد [illegible] ہے۔ اور عزیز صاحب [illegible] جوش [illegible] آگرہ سے [illegible] مجھے بھی جوش صاحب [illegible] لے گئے [illegible] عزیز صاحب [illegible] جوش صاحب نے میرا تعارف ان سے کرایا [illegible] مرحوم نے مجھے اور میں نے مرحوم کو دیکھا، بڑے تپاک سے [illegible] مجھے بھی دلی مسرت حاصل ہوئی [illegible] غزل [illegible] پڑھ کر مسدس مغفور [illegible] مختصر سی [illegible] صحبت [illegible] لے گئے اور میں اپنی قیام گاہ پر آیا۔

دوسرے دن [illegible] اپنے مکان پر [illegible] صاحب نے مجھے اور [illegible] اور جناب عزیز [illegible] دن کا کھانا اور دیر تک شعر خوانی ہوتی رہی [illegible] [illegible] محفل رہی۔

میری رخصت ختم ہوئی۔ تیسرے دن میں آگرہ [illegible] کے بعد [illegible] لکھنؤ کو اس قدر جلد چھوڑنا شاق گزرا، بہت شاق۔

اس کے بعد لکھنؤ کے بعض مشاعروں اور کبھی کبھی دوسرے مقامات کے مشاعروں میں ملاقاتیں ہوئیں اور ہمیشہ، ہر دفعہ ان کی خوش کرداری کی عظمت دل میں بڑھتی گئی۔ ان کی محبت، مروت، حسن اخلاق اور نیک نفسی کا سکہ زیادہ نمایاں ہو کر بیٹھتا گیا۔ تا آنکہ ۱۹۳۳ء میں میری طلبی ریاست محمود آباد سے ہوئی اور میں چند روز کے لئے وہاں چلا گیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب جناب عزیز راجہ صاحب محمود آباد کو ادبیات اردو و فارسی کی تعلیم دینے پر مامور[1] تھے۔ اس طور پر کبھی کبھی مجھے بھی ان سے ملنے کی مسرت حاصل ہوتی رہتی تھی۔

درمیان میں میں پھر آگرہ چلا گیا اور ۱۹۳۵ء میں ریاست جھالاوار [illegible] کے لئے بھیج دیا گیا۔ جھالرے جانے سے پہلے چند روز محمود آباد میں قیام رہا مگر عزیز صاحب مغفور وہاں سے جا چکے تھے۔ اور اپنے وطن میں علالت [illegible] رہے تھے۔

صاحب فراش نہ تھے مگر نقاہت بڑھ گئی تھی۔ اسی حال میں ایک روز راہ میں ملے اور یہ میری ان کی آخری ملاقات تھی جس کے چند ہفتوں کے بعد ۲۹ رجون ۱۹۳۵ء کو یہ چراغ جس سے محفل شعر و ادب منور تھی ہمیشہ کے لئے گل ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مرحوم کے پس ماندگان میں تین لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں، لیکن ان میں باپ کا وارث شاعری سب سے چھوٹے فرزند مرزا محمد جعفر حیات لکھنوی

---

[1] عزیز صاحب مرحوم کو غالباً ۱۹۲۷ء میں مہاراجہ سر محمد علی محمد خاں صاحب بہادر کے۔ سی۔ ایس۔ آئی والیٔ محمود آباد نے اس خدمت کے لئے منتخب فرمایا تھا، اس وقت سے آخر عمر تک یہی شغل رہا۔

[illegible] سے [illegible] حضرت [illegible] [illegible] خوب شرکت کی ہیں [illegible]
[illegible] شعر [illegible] کا [illegible] ہے [illegible]
[illegible] منقبت [illegible] ہیں۔

عزیز صاحب [illegible]
[illegible]
[illegible]

نہایت [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

عادات و اخلاق [illegible]
[illegible]
[illegible]

شاگرد اور ان کے ساتھ خصوصی برتاؤ اور شفقت [illegible] عزیز صاحب [illegible]
[illegible] (۲) [illegible] صاحب [illegible] (۳) [illegible]
[illegible] (۴) [illegible] صاحب [illegible] لکھنوی (۵) [illegible] صاحب [illegible]
(۶) گوپی ناتھ صاحب امن لکھنوی (۷) [illegible] صاحب [illegible] لکھنوی (۸) [illegible] صاحب لکھنوی [illegible] لکھنوی (۱۰)
[illegible] صاحب [illegible] مرزا تصدق حسین صاحب صدق [illegible] ہیں [illegible] حضرت حیثیت ان کے
شاگردوں میں ممتاز ترین درجہ رکھتے ہیں [illegible] صاحب [illegible] ان سے میرا تعارف تو کبھی نہیں ہوا لیکن
[illegible] رسائل میں ان کا کلام [illegible] ہے، وہ بھی عزیز صاحب کے ممتاز شاگردوں کی صف میں آتے ہیں [illegible] بھی [illegible] رہتے ہیں۔ ان
کا کلام مدارس کی بعض نصابی کتابوں میں بھی داخل ہے [illegible] وہ ہیں [illegible]

ابھی تھوڑے دن ہوئے [illegible] ملاقات ہے ان سے بارہا عزیز صاحب مغفور کا ذکر آیا [illegible] ایسی محبت سے یاد کرتے ہیں جیسے کوئی اپنے شفیق باپ یا
مربی کو یاد کرے۔ جوش صاحب قوم کے پٹھان ہیں اور ایسی باتوں میں یوں بھی کوئی مادّی لطف یا منفعت نہیں [illegible] انہیں کبھی رنج و خلوص
کے ساتھ استاد کو یاد کرتے نہیں دیکھا، باقی سب کو تو ان کی شفقت اور استادانہ کمالات کا ذکر کرتے ہوئے [illegible] دیکھا ہے

[illegible] صاحب کا انتقال حضرت عزیز مرحوم کی حیات ہی میں ہو گیا، لیکن مسلم یونیورسٹی کے ایک [illegible] کہ میں نے کمال
احترام و عقیدت اور خلوص و محبت سے عزیز صاحب کا ذکر کرتے ہوئے ان کی استادی پر بیانات کرتے ہوئے اور ان کی اصلاحوں کی مدح سرائی
کرتے ہوئے سنا ہے، معلوم نہیں عزیز صاحب کا ان کے سامنے انتقال ہوتا تو اس صدمے کو وہ کیونکر برداشت کر سکتے۔

خاندان عزیز صاحب لکھنؤ کے ایک عالی نسب مغل خاندان سے تھے، ان کے والد میرزا محمد علی صاحب کا شمار اس زمانے کے اکابر علماء

[illegible] صاحب تصانیف تھے۔ ایک کتاب [illegible] اسلام [illegible] مشہور تصنیف ہے۔ منشی [illegible] صاحب [illegible]
[illegible] صاحب [illegible]۔ [illegible] مرزا [illegible] لکھنؤ کے عاشق [illegible] مشہور [illegible] تھے [illegible]
تھے۔ [illegible] بیشتر [illegible] مطلب [illegible] بلا [illegible]۔

علم و فضل اور شاعری

شاعری کا [illegible] ہندوستان [illegible] پاکستان کے گوشے گوشے میں شہرت [illegible] [illegible] کے درجات [illegible] البتہ علم و فضل کے [illegible] معلوم نہ ہوں گے۔ [illegible] صاحب [illegible] کے مستند عالم اور عربی کے منتہی [illegible] تھے۔ [illegible] عربیت [illegible] ہے۔ [illegible] فضیلت علمی کے ساتھ [illegible] شعر و سخن نے [illegible] علماء و فضلاء اور شعراء [illegible] میں ممتاز رکھا۔

اس مضمون میں [illegible] خصوصیات [illegible] زندگی [illegible] کی مراد [illegible] خارج ہوگی۔ اس لئے حضرت [illegible] صاحب [illegible] شاعری کے [illegible] تھے [illegible] حسن [illegible] تھے [illegible] بھی [illegible] نسبت سے ناقص ہوگی۔ [illegible] مضمون کا [illegible] [illegible] کوشش [illegible] [illegible] ہو جائے گا۔

خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی

خواجہ شمس الدین

ہمارے لکھنؤ نے ایسے ایسے باکمال اور زندہ دل لوگ پیدا کئے کہ اب ان کی مثل و نظیر ڈھونڈے سے بھی نہ ملے گی۔
... تھا اپنے رنگ میں بے مثل تھا، جس نے جو وضع و قطع اور جو طور طریقہ ... حسن اخلاق، خوش ... کی
وضعداری تو یہاں کے شرفا کی گھٹی میں پڑی تھی۔ نفاست طبع، مروت، رواداری اور سیر چشمی عام تھی ... یہاں کا ادنیٰ ... چھپا نہ رہتا
سات پردوں میں چھپا کر رکھا گیا ہے۔ یہاں کے رنگ ڈھنگ، اشارے ... لطافت و خوش ... تغیر و حقیقت
کے انقلاب نے یہاں کے خصوصیات کا رنگ بدل دیئے ہیں اور کیا عجب ہے ... کے بعد لکھنؤ ... میں ہو جاتا
چلا آتا ہے وہ ختم ہو جائے۔ لکھنوی خصوصیات کے حامل کثرت یہاں نظر آتے تھے کہ دیکھتے دیکھتے صفحہ ہستی سے مٹ گئے اور جو چند باقی ہیں
مٹتے جا رہے ہیں۔ لیکن یہ بے انصافی نہ ہوگی اگر ہم ان مشاہیر کو دل سے بھلا دیں اور ان کا تذکرہ ... لکھنؤ کی تہذیب و ثقافت
اور علم کی چلتی پھرتی ہستیوں پر لکھنؤ بجا طور سے فخر کر سکتا تھا۔ ایسے ہی حضرات میں ایک نہایت قابل قدر شخصیت مرحوم خواجہ عبدالرؤف
صاحب عشرت کی بھی تھی۔ جن کے ادبی خدمات اور علمی و لسانی کمالات پر میں اس وقت روشنی ڈالنا نہیں چاہتا کہ یہ ایک مستقل کام ہے جس کے
واسطے کافی وقت اور فرصت درکار ہے بلکہ میں ان کے ذاتی اور شخصی حالات اور ان کے اخلاق و عادات پر مختصراً کچھ لکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کیا
تھے اور کن صفات کے انسان تھے۔ اردو نثر پر کی انہوں نے جو گراں قدر اور عظیم الشان خدمتیں کیں وہ ارباب ادب ... سے پوشیدہ
نہیں ہیں۔ اردو کا وہ کون سا رسالہ یا اخبار تھا جس میں ان کے مضامین کثرت کے ساتھ شائع نہیں ہوئے اس کے علاوہ ان کی تصانیف تا ...
خود گواہ ہیں کہ مرحوم وہ کام کر گئے جو دوسرے نہ کر سکے۔ ان کی سیرت کے متعلق مجھے قلم اٹھانے میں دشواری محسوس نہیں ہوتی وہ میرے ماموں
تھے اور میری حقیقی بڑی بہن (اللہ ان کا سایہ عاطفت دیر تک قائم رکھے) ان کو منسوب تھیں۔ والد مرحوم خواجہ قطب الدین ...
پالیسی لکھنؤ کے شاگرد بھی تھے اور ان کو مثل باپ کے سمجھتے تھے۔ میں نے جب سے آنکھیں کھولیں اور ہوش سنبھالا ان کو یکساں رہتے

اعلیٰ خانساماں ہیں تھے اور جو کسی عادل مرحوم صفا نے تاس پاس کی مسجد رکھا ہوں کی بردر دکان لگی تھی اس کے تمام انتظامات اور کام ہیں اور ان کے پیچھے بھائی خواجہ غلام محمد مرحوم کے زیر نگرانی کرتے تھے۔ وہ بھی بڑے نیک و صاحب دل تھے۔ علاوہ ازیں مسجد تحصیل کی مسجد کے پیچھے ایک تھوڑا بڑے مرتبے کی مکان تھی ہمیشہ سے وابستہ تھا تمام چوک اور بازار چوک سے ملحق تھیں۔ تیسرے پہر سے دس بجے رات تک چوک کی گرم بازاری کا وقت تھا۔ تین بجے سے پیشتر چھڑکنے کے بہشتی اکبری دروازے سے گول دروازہ تک پانی کا چھڑکاؤ کرتے تھے کہ زمین ٹھنڈی رہے اور گرد و غبار بیٹھ جائے۔ پھر سے شہر کے اشراف و روسا اور لکھنؤ کے زندہ دل نوجوان اور ہر فن کے اہل کمال تفریح، ملاقات احباب، خرید و فروخت کے لیے یہاں آتے تھے۔ مختلف دوکانیں ان کی نشست گاہ تھیں مختلف شعبے کے اہل علم و ادب اور چیدہ حضرات کی سب سے بڑی نشست گاہ خواجہ صاحب کی دوکان تھی۔ وقت گروہ کا نہ ... سے دوکانداری تو بند ہو جاتی تھی۔ اور اہل علم کا ایک مجمع ہوتا تھا جس میں اکثر جایا کرتا تھا۔ مولانا شرر، مرزا محمد تسلیم، آغا حشر کاشمیری، رشید مولا صاحب عروج، عارف، حسرت موہانی، ادیب، مرزا محمد عسکری، شاد، عزیز لکھنوی، وسیم اور ... تھے اہل سخن اور شعر ادا کرتے تھے۔ خواجہ صاحب مرحوم کہتے تھے کہ مولانا محمد حسین آزاد مصنف آب حیات بھی جب لکھنؤ آتے تھے تو آتے تھے۔ ... یہ میرے دیکھنے نہیں وہ چشمدید ... مولانا شبلی اور ابوالکلام آزاد کے متعلق بھی کہتے تھے کہ ان کی دوکان ان حضرات کی نشست گاہ رہ چکی ہے۔ یہاں بیٹھ کر شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا۔ الفاظ و محاورات کی تحقیق ہوتی تھی اور زبان کے مشکل مسائل حل ہوتے تھے۔ محرم ... شب ... تھی نو محرم کی ... چوک کی رونق ... مرثیہ خوانوں کی ... اور تعزیوں کے جلوس نکلنے سے بہت بڑھ جاتی تھی خود صاحب کو ۱۰-۱۲ بجے شب تک دوکان کھلی رکھنی پڑتی تھی۔ دو آنے ... کی خاطر ملاقات بھی ... رہتے تھے ... میاں ... تھی بھئی کے ... کی سفید ... کی ... شہر بھر میں مشہور تھیں۔ وہ خود تو پان بہت ہی کم کھاتے تھے مگر دوسروں کو ... سے رغبت کرتے تھے میں ان کا ... تھا اور وہ بیحد ... تھے مگر جب میں ان کی دوکان پر جاتا اسی وقت ... کر بلا دیتے تھے۔ خواجہ صاحب والد تھے اور مجھ کو بہت چاہتے تھے۔ میرا بچپن کا زمانہ تھا۔ اکثر ضد کر بیٹھتا تھا اور ہر بات کی ضد کر بیٹھتا تھا۔ ... پورا کرتے تھے۔ ان کی والدہ مرحومہ جو شاہی زمانہ کی تھیں مجھ سے بیحد محبت کرتی تھیں جمعہ کی چھٹی میں اکثر ان کے پاس جا کر رہتا تھا تو بڑی میری خاطر داری اور ناز برداری میں لگی رہتی تھیں۔ راتوں کو شاہی دستروں کے قصے سنایا کرتی تھیں اور میں بہت شوق سے سنا کرتا تھا۔ میرا مرغوب چیزیں خود اپنے ہاتھ سے پکا کر کھلاتی تھیں۔ خواجہ صاحب اور ان کے بھائی خواجہ غلام محمد اپنی ماں کے بیحد مطیع اور فرماں بردار تھے۔ اور اس وصف میں میں نے آج تک کسی شخص کو ان کے برابر نہیں پایا ہر کام ماں سے پوچھ کر اور ان کے اشارہ پر کرتے تھے۔ ان کی جدائی کے خیال سے شہر کے باہر کہیں نہیں جاتے تھے۔ خواجہ صاحب مرحوم کو لکھنؤ سے باہر سفر کرنے کا بہت کم اتفاق ہوا۔ لکھنؤ کے لوگ یوں بھی سفر کرتے بہت گھبراتے ہیں اور وہ تو پورے لکھنوی اور شرفائے لکھنؤ کے صفات کے زبردست حامل تھے۔ ایک مرتبہ کسی نے پٹنہ میں ان پر کوئی مقدمہ دائر کر دیا اور ان کے نام سمن جاری کرا دیا جس کی جواب دہی کے لئے ان کو پٹنہ جانا پڑا۔ کیا بتاؤں کہ پٹنہ تک جانا ان کو کیسا کھلا ہے اور اس کے لئے کتنے سامان کئے ہیں کہ شاید حج کے سفر کے لئے بھی کوئی اتنے سامان نہ کرتا۔ وہاں پہنچے تو پٹنہ کے قدر شناس لوگوں نے ان کی حد سے زیادہ آؤ بھگت کی۔ آنریبل خواجہ محمد نور صاحب نے اپنا مہمان بنایا اور وہاں کے اکابر و امراء نے ان کی بہت عزت اور تکریم کی۔ بڑے بڑے بیرسٹروں اور وکیلوں نے ان کے مقدمہ کی مفت پیروی کی۔ ان کے اعزاز میں مشاعرے ہوئے اور دعوتیں ہوئیں۔ آخر مقدمہ میں کامیاب ہو کر گھر واپس آئے۔ اہل عظیم آباد کی اس قدر دانی اور محبت کو ہمیشہ یاد کیا کرتے تھے۔ لکھنؤ کے لوگوں کا جذبۂ حب وطن واقعی قابل تعریف ہے اور خدا معلوم یہاں کی زمین میں کیسی مقناطیسی کشش ہے کہ یہاں کے قدیم باشندوں کا تو کیا ذکر باہر کے لوگ آ جاتے ہیں تو لکھنؤ سے جانے کو ان کا دل نہیں چاہتا۔

اس سے لکھنؤ والوں نے شعر و ادب میں بہت اضافے کیے۔ خواجہ صاحب بات کے بہت پکے [illegible] تھے۔ [illegible]
[illegible] سے ملنے والوں کے جو معاملات [illegible] ہو گیا۔ [illegible] وقت [illegible]
[illegible] کے زمانے میں اکثر بیمار [illegible]۔ [illegible]
[illegible] ہوئے [illegible]۔ [illegible]
[illegible] کے ساتھ [illegible] اپنے [illegible]
[illegible] وقت میں [illegible]
بہت [illegible] کے پابند تھے۔ صبح [illegible] تبدیلی [illegible]
[illegible] کسی کا ایک پیسہ [illegible] باقی نہ [illegible]۔ [illegible] بہت [illegible]
بھی نہایت تیز تھے اور پیدل چلنے سے کبھی تھکتے نہ تھے۔ [illegible]
[illegible] اور [illegible] سارے شہر کے [illegible] دیکھے اور [illegible] کے خصوصیت
اور تاریخ سمجھانے [illegible] لکھنؤ کا واقف کار ان سے بڑھ کر کوئی نہ تھا۔ [illegible] لکھنؤ کے تمدن، معاشرت اور تاریخ کے متعلق انہوں نے
بے شمار مضامین لکھ ڈالے۔ ان کی روایتیں بیان [illegible] لگے اور [illegible] لوگ [illegible] بیٹھتے تھے ان سے [illegible]
پوچھتے اور یادداشت کے طور پر لکھ لیتے تھے۔ پھر انہی یادداشتوں سے مضامین مرتب [illegible] شاہی [illegible]
کے اکثر چشم دید حالات بیان کیا کرتی تھیں۔ خواجہ صاحب کو لکھنؤ سے [illegible] کی زبان سے [illegible] بے حد [illegible] ہے جس کے
معاشرت اور تمدن سے اور یہاں کے باشندوں اور یہاں کی [illegible] سے بے حد عشق تھا۔ یہاں کے قدیم حالات جاننے کی ہمیشہ فکر رہتی تھی۔
افسوس یہ ہے کہ انہوں نے یہاں کے متعلق مختلف عنوانوں پر مضامین تو بے شمار لکھے جو تمام ہندوستان کے اخبارات و رسائل میں برابر شائع
ہوئے مگر کوئی مستقل کتاب ترتیب نہ دی۔ اب ان مضامین کا کہیں پتہ نہیں۔ کتاب ہوتی تو محفوظ رہتی۔ لوگ ان کے مضامین کے بے حد گرویدہ تھے۔
اور رسائل و اخبارات کے ایڈیٹر [illegible] ہمیشہ ان سے [illegible] ملک بھر کے رسائل و اخبارات ان کے پاس ہمیشہ مفت
آیا کرتے تھے جن کے پڑھنے کا بھی ان کو موقع نہ تھا۔ اکثر ان میں سے بند کے بند ہی [illegible] ہوتا تھا۔ [illegible] شرر صاحب مرحوم نے یوں تو ہر موضوع پر
مضامین لکھے ہیں لیکن اودھ اور لکھنؤ پر انہوں نے جو مضامین تحریر کیے وہ بے حد مقبول ہوئے اور ان کو خود بھی اس موضوع پر زیادہ دلچسپی تھی اور بڑے شوق
و ذوق سے اس پر قلم اٹھاتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب ان کا ایک مضمون قدسیہ بیگم ملکہ محبوبہ نصیر الدین حیدر [illegible] شائع ہوا اور غالباً زمانہ کانپور میں وہ
نکلا تھا تو تمام ملک میں اس کی دھوم مچ گئی اور بہت سے اخبارات و رسائل نے اس کو نقل کیا۔ اسی طرح غازی الدین حیدر بادشاہ کے جشن [illegible] کا
مضمون تھا۔ ایک مضمون بادشاہ نصیر الدین حیدر پر بھی لکھا تھا جن کے عہد میں لکھنؤ کا [illegible] تھا۔ ان کی دکان [illegible] کے پرانے اور جہاں دیدہ لوگوں
کی سب سے بڑی نشست گاہ تھی ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو عہد شاہی کا تماشا تیس تیس چالیس چالیس برس کی عمر تک دیکھے ہوئے تھے۔ خود ان کی
والدہ عہد شاہی کی تھیں۔ ان لوگوں سے تمام حالات پوچھ کر قلم بند کرتے جاتے۔ اسی لیے ان کی معلومات بے حد وسیع تھے اور جب کسی عنوان پر قلم اٹھاتے
تمام مسائل کا حق ادا کر دیتے۔ مولانا شرر مرحوم نے بھی لکھنؤ کے تمدن پر بہت لکھا ہے مگر خواجہ صاحب کے معلومات اور مضامین ان سے بہت زیادہ تھے۔
شرر مرحوم کو لکھنؤ سے باہر رہنے کا بیشتر اتفاق رہا ہے اور جہاں تک ہمارا خیال ہے وہ مضافات لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ خواجہ صاحب چند روز کے سوا
کبھی لکھنؤ سے باہر نہ نکلے اور ان کی ولادت لکھنؤ کے مشہور محلہ احاطہ خانساماں میں ہوئی۔ خانگی تفکرات سے ہمیشہ آزاد رہے۔ اولاد کا جھگڑا نہ تھا۔
گھر کا سارا کام والدہ کے ذمہ تھا جو بڑی منتظم اور محنتی تھیں۔ انگریز افسروں کو اردو پڑھانے کے چند ٹیوشن بیش قرار تنخواہوں پر جب سے مل گئے تھے۔

خدمت ... مرحوم کو بھی ترک کر دی تھی۔ اس ملک میں اپنی زندگی دوران کار ہمیشہ اردو کی حمایت ... انجمنوں کے
معاملہ اور تصنیف و تالیف، تحریر مضامین میں صرف کرتے تھے اور ... کے متعلق معلومات ... بہت زیادہ ... کے پسند
نہ رات کرتے۔ مضامین جو رسائل و اخبارات کو بھیجتے ان کا کوئی معاوضہ نہ لیتے۔ شوق تھی ... [illegible]
پھیلاتے ... ایسے ... [illegible] ... تھے جب ... کسی کام میں مشغول ... [illegible]
... کسی ... [illegible] ... کسی کے سامنے ... [illegible]
... [illegible] ... [illegible]
بھی نہ جاتے تھے مگر اس کے بعد ... [illegible] ... سب سے ... [illegible]
سے جو کچھ پڑھتے رہتے تھے ... [illegible] ... بات میں ذرا
آسانیاں ... [illegible] ... جواب لکھ ... [illegible] ... کے بارے میں
کی زبان یا شاعری کے متعلق ... [illegible] ... مضامین اور تالیفات مرتب ... [illegible] ... بہت سے کام تھا۔
... رہے۔ ... بیماری کی تکلیف ... [illegible] ... پڑتے چلے گئے ... [illegible] ... علالت بڑی
... [illegible] ... کی ... [illegible] ... بہت خراب ... [illegible]
... مرحوم ... [illegible] ... خراب ہونے لگے۔ ان کی ایسی خدمت ... [illegible]
کی ... [illegible] ... اس عالم فانی سے رخصت ہوگئے ... [illegible]
... [illegible] ... قبرستان کے ایک گوشہ میں ... قیامت
تک کے لئے محو خواب ہو گیا۔

اے میرے ... [illegible] ... تیرے ایسے چاہنے والے ... تمام ملک میں تیری نیک نامی کو اس طرح پھیلانے والے اب کہاں پیدا ہوں گے
کیا لوگ تھے ... [illegible] ... دیکھتے دیکھتے غائب ہوگئیں ؎

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

(میرؔ)

مولانا صفی لکھنوی

ممتاز حسین جونپوری

مولانا سید علی نقی صفی ۲ جنوری ۱۸۶۲ء کو لکھنؤ کی شعر و ادب نواز سرزمین میں پیدا ہوئے۔ اس وقت وہاں شعر گوئی کے علاوہ شاہان اودھ کے درباروں میں پرورش پاتے ایک صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد گو سلطنت ختم ہو چکی لیکن ادبی فضا کی خصوصیت بحال تھی۔

مولانا صفی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے لکھنؤ کی شاعری میں اصلاح اور ادب میں انقلاب پیدا کرنے کا وہ کام اپنے ہاتھوں میں لیا جو دہلی اور پنجاب میں حالی اور آزاد نے انجام دیا۔ وہاں ان حضرات کی باتوں کو لوگ جیسے ادب پسند عوام اور سرکار کی امداد میسر تھی۔ لیکن وہاں کی کوششوں کا اثر لکھنؤ پر نہیں پڑ سکا تھا۔ اس ضمن میں مولانا صفی نے جو کوششیں کیں ان میں وہ بہت بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔ اس کے ثبوت میں ہم بعض دستاویزی شہادتوں کے علاوہ ان چشم دید گواہوں کو پیش کریں گے

جنھوں نے انیسویں صدی عیسوی میں دبستان لکھنؤ کی آخری بہار دیکھی اور جو آج بیسویں صدی کا تین چوتھائی حصہ دیکھ کر ستائش کی طرح جملہ سمجھتے ہیں۔ اس ضمن میں مولانا صفی کے کارناموں سے اردو ادب کی تاریخ خالی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ صفی نے خود اپنے ساتھ ناانصافی کی ہے۔

مولانا صفی ایک خاموش اور عافیت پسند شاعر تھے۔ آپ ایک گمنام حاتم کی طرح اردو ادب کو بہت کچھ دے گئے لیکن بہت کم لوگ آپ سے روشناس ہو سکے۔ مختلف اصناف میں آپ نے ایک لاکھ سے زیادہ شعر کہے ہوں گے لیکن آج یہ سب قارئین کے خزانے کی طرح نایاب ہیں۔ چھ سال کی جانفشاں محنت کے بعد آپ نے عمر خیام کی بارہ سو رباعیوں کی صحت کر کے ان کا منظوم ترجمہ کیا۔ اور تصویروں کے نقشے بنائے لیکن ایسی منہ بولتی تصویریں بھی آج زیور طباعت سے آراستہ نہ ہو سکیں۔ آپ کی زندگی کا بڑا حصہ ایسی تاریک گمنامی میں گزرا کہ مفلس آپ لکھنؤ کے مشاعرے کے لئے غزل کہتے اور دوسروں کو دے دیتے۔ وہ لوگ مشاعروں میں پہنچ کر یہی غزلیں اپنے نام سے سناتے اور واپس آکر چپکے سے مولانا صفی سے ان دادوتحسین کا ذکر کرتے تھے۔

تلامذۂ صفی

صفی نے ساری زندگی اُردو ادب کی خدمت میں بسر کی ہے اور ان کے اہم تلامذہ کا شمار ان کی اپنی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ آپ کے ایک ممتاز شاگرد مرحوم نے اس کا اعتراف اپنے ایک شعر میں کیا ہے کہ :

اس کا شاگرد ہوں میں جس کا نہیں ہمسر کوئی

مولانا صفی نے درس و تدریس کو اپنا پیشہ نہیں بنایا۔ مشق و مزاولت سے فراغت حاصل کرنے کے بعد آپ نے ۱۸۹۰ء میں محکمۂ دیوانی کی ملازمت کر لی اور پنشن لینے کے بعد سے جس سے کہ محکمہ ہو گئے۔ آپ کا دیوان آپ کی وفات کے بہت دنوں بعد چھپا اور اس وقت کوئی ایسا شخص نہ تھا جو تاریخ اُردو ادب کے مؤرخین کے سامنے صفی کی حقیقی شخصیت کو پیش کرتا اور ان کے تاریخی کارناموں پر روشنی ڈالتا۔ بات کتنی ہی افسوسناک کیوں نہ ہو بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ تاریخ ادب اُردو مرتبہ رام بابو سکسینہ میں بھی اصلاح زبان کے سلسلے میں مولانا صفی کے شاگردوں اور پھر ان شاگردوں کے شاگردوں کا ذکر بہت کم ہے بلکہ انتہائی حیرت اور حیرت کا مقام ہے کہ اس میں صفی کا کہیں ذکر نہیں۔ اس کی ہر چند تردید مولانا حسرت موہانی نے اپنے رسالہ اُردوئے معلیٰ میں اور مرزا جعفر علی خاں اثر نے اپنی ایک تحریر میں کی ہے۔ وہ تفصیل ذکر آئندہ آئے گا۔

لکھنؤ کی ادبی روایت اور ادب کے رشک اور اصلاحات کی داستان بہت طویل ہے۔ مشہور یہ ہے کہ ناسخ نے الفاظ کی تراش خراش اور استعمال میں ندرت پیدا کرنے کے سلسلے میں بڑا کام کیا ہے۔ اور ان کے ذی علم تلامذہ نے بھی ترتیب لغت میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ لکھنؤ سکول کے تیسرے رنگ کی اصلاح کے لئے مولانا صفی نے بھی ناسخ اور ان کے تلامذہ کی طرح خدمات انجام بھی دی ہیں۔ ذیل میں دونوں اساتذہ کا شجرہ پیش کیا جاتا ہے۔

ناسخ (مصلح صحت و تعدیل الفاظ)

- رشک (مؤلف لغت اُردو)
  - جلال لکھنوی (مصنف رسالہ تذکیر و تانیث و رسالہ عروض)
    - آرزو لکھنوی (مصنف نظام اُردو)
- صبر
- خواجہ وزیر
- منیر شکوہ آبادی (مرتبہ تیرہ دفاتر نثر وغیرہ)
  - شہید جونپوری (محقق)

صفی (مصلح طرز تخیل قدیم)

- مولانا عزیز
  - اثر لکھنوی
  - جوش ملیح آبادی
  - معال
- ظریف لکھنوی (مبلغ و نشر زبان معترضہ نگ)
- صغیر مرحوم (انجینیئر علیگڑھی)
- حامد (بیرسٹر) (آپ انگریزی شاعری میں لارڈ ٹینی سن کے شاگرد تھے)

[illegible]

[illegible]

[illegible] ... کے علاوہ ادب کے تمام شعبوں ... مولانا صفی کی عظیم ترین شخصیت کے قائل ہیں۔

صفی کی شخصیت میں شاعری کے وسیلے ... ان کی داخلی صلاحیتوں کے ... ملک و قوم کی ... سماج و ترقی کے ادبی گوشے تھے ہیں۔ آپ نے لوگوں کے ذہنوں میں ... جذبہ پیدا کیا۔ اپنی نظموں کے ذریعے کئی رفاہی منصوبوں کی داغ بیل ڈالی۔ کالج اور سکول کھلوائے یتیم خانہ قائم کرایا اور صنعتی ترقی کے لئے لوگوں کو عمل اقدام کی طرف مائل کیا اور یہ حقیقت ہے کہ آپ نے جو قومی نظمیں لکھی ہیں۔ ... فن کی تمام پابندیوں اور خوبیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور ان کی شعری قدر و قیمت کے پیش نظر ہندوستان کے کسی شاعر نے ان سے بہتر نظمیں نہیں کہی ہیں۔ آپ کی نظموں کے مجموعے "نغمۂ جگر" اور "صحیفۂ القوم" ہمارے اس دعویٰ کا روشن ثبوت پیش کرتے ہیں۔

مولانا صفی نے ملک کے مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والے بڑے بڑے پیشواؤں اور رہنماؤں کی منظوم سوانح عمریاں بھی لکھی ہیں اور ایک لحاظ سے اردو میں یہ کام سب سے پہلے آپ ہی نے شروع کیا۔ اس کے علاوہ مولانا نے قومی نظموں میں کارنامہ تاریخی اور جغرافیائی حالات کا ذکر بھی "پتری ہندی" کے عنوان سے شروع کیا۔ جیسا کہ آپ نے خود کہا ہے ؎

نظم میں تاریخی و جغرافیائی پتریاں　　اس کی ہندی کا موجد میں ہوں واقف ہے جہاں

مولانا صفی اردو کی طرح فارسی کے بھی بڑے زبردست ادیب اور شاعر تھے۔ ... سے پہلے سدا شاگردوں کو سناتے لیکن آپ

کی شخصیت کی عظمت کا یہ اندازہ اس وقت ہوا جبکہ ان کے ایک شاگرد ... [illegible] ... کے مرید [illegible] شدہ کلام پر ایک وقت مختلف انداز سے اصلاح دیا کرتے تھے ... ان کے مرنے کے بعد بھی ... شخصیت کا اصل [illegible] ایک ترانہ [illegible] مرحوم [illegible] ترانے کا مطلع پڑھا [illegible] اقبال ... اس وقت [illegible] گئے اور جب تک [illegible] پڑھتے رہے اقبال سر جھکائے کھڑے رہے ۔ اس ترانے کے چند شعر یہ ہیں :-

نغمے ہی اگر نغمہ وبا کر جو دیں گے — مشرق کا سر [illegible] مغرب سے [illegible]
دھارے ہی زمانے کے [illegible] — بچھڑے ہوئے پانی میں ہم آگ لگا دیں گے
ایمان ہو یا ترک [illegible] — کیا خوف [illegible] سے اسلام [illegible]
اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے — اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے

اس [illegible] نظم کے جواب میں [illegible] کی طرف سے بھی ... شاعری [illegible] ایک نظم شائع کی گئی [illegible] سے بھی [illegible] ڈالا گیا ۔ لیکن [illegible] بہار کی عظمت ... آپ نے ایک اس سے بھی زیادہ [illegible] نظم کہی جسے [illegible] نے چھپنے نہ دیا ۔ البتہ [illegible] مرحوم نے جواب میں "[illegible]" کے عنوان سے ایک بڑی دلچسپ نظم لکھی ... "[illegible]" [illegible] اس [illegible] ہے ۔

ایک باکمال اور [illegible] ... ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے ۔ اگر وہ نہ بڑے شاعر ہوتے [illegible] شاعری کو محسوس کرنے اور [illegible] کی صلاحیت نہ رکھتے اور ہندوستان شاعری کی [illegible] نہ کرتے تب بھی ان کی ذات اتنی ہی [illegible] قابل ستائش ہوتی ۔ دراصل ان کی شخصیت کئی جدا جدا شخصیتوں کا مجموعہ تھی ۔

انہوں نے عربی اور فارسی پر عبور حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ انٹرنس تک باقاعدہ انگریزی ، حساب ، جغرافیہ اور تاریخ کی تعلیم حاصل کی تھی ۔ اس کے علاوہ سرکاری ملازمت ، [illegible] کام [illegible] آرام اور دیگر ضروریات سے جو وقت بچ رہتا تھا وہ اسے کسی نہ کسی [illegible] کے مطالعہ میں صرف کرتے تھے ۔ کتب بینی میں آپ کی ہمہ وقت مصروفیت کی تصویر کشی مشہور [illegible] اور ادیب [illegible] صاحب نے اس طرح کی ہے :-

"کسی وقت بھی کوئی پہنچے — وہ مرحوم کو کسی نہ کسی کتاب کا مطالعہ کرتا ہوا پاتا تھا ۔ اکثر وہ مطالعے میں اتنا مستغرق ہوتے تھے کہ جب تک بالکل قریب نہ پہنچ جائے آنے والے کو آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتے ۔ مگر جونہی آنکھ پڑ جاتی ان کا شگفتہ چہرہ پھول کی طرح متبسم ہو جاتا اور چمکتی ہوئی پُر بصیرت آنکھیں اس طرح [illegible] لگا دیتیں گویا انہوں نے اس سے عمدہ منظر کبھی دیکھا ہی نہ تھا ۔"

مولانا [illegible] ہمیشہ سیر و شکار ، تفریح ، دوستوں کی کثرت ملاقات ، گپ بازی ، میلوں ، جلسوں اور کھیل تماشوں سے الگ تھلگ رہے ۔ آپ سے میرے مراسم کم و بیش سات سال کے رہے اور اکثر مجھے ان کے یہاں منزل رہنے اور ساتھ زندگی بسر کرنے کا اتفاق ہوا ۔ ادبی ذوق اور [illegible] معاملات میں بھی میں ان کا ہم مشرب اور ساتھی رہا ۔ بہت سے علمی و ادبی مباحث میں بھی تبادلۂ خیال اور بڑی بے تکلفی سے گفتگو کا موقع ملا ۔

اس طرح میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مرحوم کی زندگی کا کوئی گوشہ مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے ۔ میرے نزدیک مولانا کی زندگی ایک پُرسکون تالاب یا جھیل کی مانند تھی جس کی سطح ہمیشہ ہموار اور دلکش رہتی ہے ۔ اور جہاں تک میں جانتا ہوں وہ ایک انتہائی مضبوط کردار کے حامل فرد تھے ۔ یہاں تک کہ ان کے قدم جوانی کی عام [illegible] کے عالم میں بھی نہیں بہکے ، غالباً یہی وجہ تھی کہ [illegible] سال کی عمر میں بھی ان کے چہرے پر جھریوں کا نام و نشان تک نہ تھا ۔ اور ان کے چہرے کا نکھار آج کل کے بیشتر نوجوانوں کے [illegible] رخسار اور [illegible] پر حسنہ ذرہ رہا تھا ۔ اس کے باوجود تمام دنیاوی امور [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ... کے لئے اس نظم کو نصاب میں داخل کر دیا۔ اس نظم کا عنوان [illegible] ہے اور پہلا شعر یہ ہے ـــ

[illegible]

یہاں نظم کی ظرافت اور پردہ ہی پردہ میں اظہار خیال پر تبصرہ کا ذکر کرنا مقصود نہیں بلکہ صرف مولانا کے اعلیٰ اخلاق اور منکسر المزاجی کی طرف اشارہ کرنا چاہتا تھا۔

مولانا صفی نے طب، فلسفہ، اور حکمت غرض کہ سبھی کچھ پڑھا تھا اور اگر وہ شاعر نہ ہوتے تو کسی اور شعبہ میں اپنی عظمت کا لوہا منوا کر رہتے۔ لیکن یہ بھی ان کے کردار کی عظمت ہی کا ایک پہلو ہے کہ انہوں نے [illegible] خاموشی کے ساتھ [illegible] دیا۔ وہ نور کا ایک ایسا سرچشمہ تھے جس سے بیسیوں آفتاب پیدا ہوئے لیکن خود انہوں نے اپنے آپ کو تاریکی اور گمنامی میں رکھنا پسند کیا۔ مولانا صفی لکھنوی پرانے بزرگوں کے اخلاق اور وضعداری پر مبنی شخصیت کا نمونہ تھے۔ آج کل ریڈیو اسٹیشن جا کر غزل یا نظم پڑھنا معیوب نہیں سمجھا جاتا لیکن مولانا صفی اس میں شاعری جیسے پاکیزہ فن کی اہانت تصور کرتے تھے اور زیادہ روپیہ کی ترغیب کے باوجود کبھی گھر سے نہ نکلے۔ منتخب اشعار کا معاوضہ دے کر اشاعت کی اجازت حاصل کرنے کی بارہا خواہش ظاہر کی گئی لیکن وہ عزت اور احتیاج کے باوصف ہمیشہ ایک گوشہ نشین فقیر کی طرح ہاتھ سمیٹے بیٹھے رہے اور دست سوال دراز نہ کیا۔

مرتے رہے پھر آنجہانی مہاراجہ بیکانیر کے متعلق [illegible] آنجہانی کی [illegible] ہاں دو سے
بچھاڑیں مگر ان کی غیرت نے گوارا نہ کیا اور یہی وجہ تھی کہ ان کی وفات [illegible] کے دنوں کے مرنے کے بعد بھی [illegible]
تھے ان کا بیان شائع کرنے کا شرف حاصل کر رہا تھا۔

مرحوم زندگی بھر ہر قسم کے دو مردوں پر در ذلے سے گزر کرتے رہے۔ ان کی وفات پر [illegible] آتا ہے
ان کا خصوصی طبیعت اور وضع داری کا ان اشعار میں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

طویل عمر اور بیماری کی حالت رہنے کے ہر قسم کے سوا کسی اور کا نام نہ تھا۔ مگر ان کی سب کی خوبی ذکر ہے
راحت اور سکون میسر آ جاتا تو اس کو شرم کہہ کر دیتے۔ [illegible] رہتے تھے کہ [illegible]
جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں وہ مختلف مسلکوں اور ذوق رنگ کے لوگوں سے بہت زیادہ [illegible] سے باخبر تھے۔ وہ
لکھنؤ کے پرانے نوابوں اور شرفا کی خاص خاص صحبتوں کا ذکر یوں کرتے تھا۔ میرے ایک وضع دار ساتھی [illegible]
ذکر فرماتے تھے کہ اس میں تقاضے کے سوا ساز خودی سے کوئی۔ بیٹا تھا۔ بے تکلف ہاں مرتب [illegible] صاحب کو [illegible]
تھے کسی کے سامنے جھکتے تھا کسی کے ہاتھ میں تھے۔ کسی کے زور پر رنگی اور کسی کے چہرے پر ستارہ [illegible]
اور مزاح بھلے لگے۔ یہ بھی ہم مذاق تھے۔ اور پرانے لکھنؤ کی صحبتوں کا ایک نقشہ آنکھوں کے سامنے آتا۔

صفی پوری عمر کسی کے مزاج سے واقف اور ایسی صحبتوں سے باخبر تھے لیکن انھوں نے تمام عمر کسی سا ذکر ہاتھ نہ اٹھایا۔ اس کے بعد
وہ ایسی صحبتوں کا نقشہ تاریخ کے ورق پر اتارنے کے لیے ایک انتہائی یادگار، جاوداں اور زندہ جاوید شعر چھوڑ گئے ہیں ؎

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

اس شعر پر میں نے اپنی ضعیف العمر نواب صاحب کو بارہا یاد شباب میں سر دھنتے اور آنسو بہاتے دیکھا ہے۔

مولانا صفی ہمیشہ شیروانی، اونچی دیوار کی ایرانی ٹوپی، قمیص اور چھوٹی مہری کا پاجامہ اور بوٹ پہنتے تھے۔ پان بہت کم کھاتے تھے اور
حقے کے عادی تھے اور کبھی کبھی سگریٹ بھی پی لیتے تھے۔ تمام عمر مسکرات سے دور رہے کبھی کبھی نماز پڑھتے اور روزے رکھ لیتے
تھے۔ مجالس اور میلاد کی محفلوں میں کم جاتے تھے۔ نہایت غیر متعصب، نرم طبیعت اور آزاد خیال تھے۔ مذہب میں ریاکاری کو بہت برا سمجھتے
تھے اور نکتہ چینی اور اظہار رائے میں بڑے بے باک تھے۔ بعض شاعروں کی طرح تعلّی، دوسروں کی بدگوئی یا منقبت کبھی ان کا شعار نہ تھا۔ بہت
ملنسار، خلیق، وضع دار اور نرم دل تھے اور سب کے شریک درد رہتے تھے۔ مرزا جعفر علی خاں اثر نے آپ کی وفات پر ایک مسدس
نظم صفی کے کردار اور شخصیت کے متعلق کہی تھی جس کے چند شعر یہ ہیں:-

وضع صفی نہ پوچھو اک رند پارسا تھا
بیگانہ بھی تھا سب سے پر سب سے آشنا تھا

خلق خدا کی خدمت مقصد حیات کا تھا
اس کے سوا نہ کوئی مطلب نہ مدعا تھا

بدلہ بدی کا نیکی دشمن کو دینے والا
اس منزلت کا شاعر کیا کوئی دوسرا تھا

خلق حسن نے اس کے دل کو فزوں تھی سے
ہر کہ و مہ کو اپنا گرویدہ کر لیا تھا

صدق و خلوص و ایثار اس کی سرشت میں تھے
جو قول یا عمل تھا بے ریب و بے ریا تھا

ظاہر سے تھی زیادہ باطن کی تابناکی
عارف تھا خود نگر تھا صالح تھا باخدا تھا

غیرت کی پاسداری شیوہ تھا اس جری کا
ایمان حیا کو سمجھا وہ صاحب حیا تھا

[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

بہر حال اردو ادب کے لئے یہ بات [illegible]
[illegible]
سامنے معلوم ہوتے ہیں ؎

یہ صلہ ہے عمر بھر کی محنت برباد کا
سننے بیٹھے ہیں وہ افسانہ دل ناشاد کا

تاجور نجیب آبادی

محمد وارث کامل

علی سائیں کی مسجد کے عقب میں جہاں اپنے آخری موڑ پر چھٹ رہ رو دم توڑتی ہوئی نظر آتی ہے کچھ نئی وضع کے مکانات بنے ہوئے۔ انہی مکانات میں ایک وہ مکان بھی ہے جو ایک مدت تک شمس العلماء علامہ تاجور نجیب آبادی کی قیام گاہ بنا رہا ہے۔ علامہ سے میری ملاقات اسی مکان کے ایک کمرے کے برآمدہ میں ہوئی تھی جب ۱۹۴۲ء کے موسم گرما کا شباب ڈھل چکا تھا لیکن پھر بھی اس کی منہ زوری سے دن کو بھی جہاں شب کی سیاہی کا گمان تھا، اس بلا کی گرمی اور اس قیامت کا حبس تھا کہ دم گھٹا جاتا تھا۔ علامہ نے چارپائی پر بیٹھے اپنے بھاری بھر کم جسم کی ایک ارتعاشی حرکت سے میرا خیر مقدم کیا اور کسی تمہید کے بغیر مجھ پر طنز و ظرافت سے بجھے الفاظ کے تیروں کی بوچھار کر دی۔

"اچھا تو آپ ہیں میرے ہم وطن مولانا محمد وارث کامل جی۔ خوب خوب، ماشاء اللہ! آپ تو بڑے مستعد دکھائی دیتے ہیں۔ مولانا! آپ کافی عرصہ سے لاہور رہ رہے ہیں کبھی بھولے سے بھی آپ نے ادھر کا رخ نہیں کیا۔ میرے جیسے ڈیل ڈول کا آدمی جو دوش ہوا پر ہے، گراں بار ہوا، ہو کہاں کہاں جائے اور کس کس سے ملے؟ یہ کچھ عمر کے تقاضے بھی تو ہوتے ہیں۔ آپ بہت عمر میں کہیں چھوٹے ہیں آپ کا یہ اخلاقی فرض تھا کہ مجھ سے اولین فرصت میں ملتے۔ تاجور برا ہی سہی لیکن اتنا برا تو نہیں کہ اچھے اس کے پاس بھی نہ پھٹکیں۔ مولانا میں تو آپ کی یاد ہی کا ادنیٰ ہوں، سالہا سال پہلے میں نے دارالعلوم دیوبند سے فضیلت کی سند لی ہے۔ میں نے خود ہی بلایا تو آپ تشریف لائے۔ مولانا! سچ تو یہ ہے کہ ہمارے بارے کی ملاقات پھر بھی آپ شکریے کے مستحق ضرور ہیں۔"

میں نے علامہ کی یہ گفتگو خاموشی کے ساتھ سنی اور آخر میں اپنے غلط رویے پر معذرت طلب کی۔ علامہ سے میری ملاقات شاہکار کی ادارت کے سلسلہ میں تھی۔ اگر یہ ماہنامہ پہلے کی طرح علامہ کی ملکیت ہوتا اور کسی شیخ الہ دین کے ہاتھوں میں اس کی باگ ڈور نہ ہوتی تو میں اس ادارہ

[illegible] آکسفورڈ [illegible] ۱۹۳۳ [illegible]
[illegible] وقت [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] شاعر [illegible]

غضب کی بات [illegible]
[illegible] نہیں [illegible] جلتے ہیں
خدا [illegible]
[illegible]

علامہ [illegible] دونوں [illegible] مجلس گرم [illegible] ایک بحث چھڑ [illegible] اقبال [illegible] تقاضا کر رہا ہے [illegible] سے متعلق [illegible] اس بحث کا آغاز [illegible] حضرت احسان دانش [illegible] [illegible] ایک [illegible] دو [illegible] [illegible] ان کا استقبال [illegible] نشست [illegible] سے تھے [illegible] احسان کے میز [illegible] جانے کی [illegible] پیالیاں سے [illegible] اس سے [illegible] علامہ نے [illegible] پیالیوں پر ایک [illegible] نظر ڈالی اور [illegible] کے ساتھ اس [illegible] گلاس کا [illegible] پاش پاش کر ڈالا۔ احسان صاحب [illegible] ان کی طبیعت پر نشست و برخاست کا یہ جارحانہ عمل گراں نہیں گزرا بلکہ [illegible] ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ احسان صاحب کی اس [illegible] نے علامہ کے غصے کا پارہ کچھ اور تیز کر دیا۔ بولے:

تو اب بھی اپنے آپ کو شاعر اور ادیب کہتا ہے۔ تجھے اس بات کا مطلق احساس نہیں کہ تو نے ادب میں تیرا کیا مقام ہے۔ ایسی بھی کیا کور ذوقی کہ روز مرہ کے استعمال کی چیزیں بھی تیرے گھر میں نہیں۔ یہ بھی پیالیاں کیا اس قابل ہیں کہ ان میں کسی مہمان کو چائے پلائی جائے۔ بھونڈی اور بھدی پیالیاں [illegible] [illegible] تیرے ذوق کی کائنات [illegible] اچھے کپڑوں میں دیکھنا چاہتا ہوں اور اس ٹھاٹھ کے ساتھ کہ تیرے گھر میں ہر چیز سلیقے کی [illegible]۔ جا ابھی نیا سیٹ لا۔

چائے کے سیٹ کا مسئلہ تو حل ہو گیا اور ہم سب نے چائے پی بھی لی لیکن اس دوران میں جو لطف [illegible] سے باہر ہے۔ علامہ کی زبان سے جو فقرہ بھی نکلتا تھا کبھی طنز و ظرافت کی چاشنی لیے ہوتا اور کبھی قند و نبات کا مزہ دیتا۔ علامہ نے اس دعوت کی تقریب میں معاشرتی زندگی کے نشیب و فراز پر اس بالغ نظری کے ساتھ اپنے خیال کا اظہار کیا کہ ہم عش عش کر اٹھے ہم میں سے جب کوئی لب کشائی

کو ملامت کرتے تو علامہ تمنا عمادی پر ترکیبیں بھی ان کے دوست پر اور کبھی ترکیب کی تلاش و حصول کے سلسلے کے ساتھ تبصرہ کرتے تھے یا سید ذکا علامہ سے مولانا عبدالحق کے ایک جلسہ میں پنجاب ... مولانا کا ... تھا۔

علامہ: یہ ... کی ناواقفیت اور نافہمی ہے کہ ... کاش ... ہیں۔

علامہ: اللہ ... مولانا ... واقفیت اور نافہمی، ... ترکیب ... کہ ... کیا ہے ... مستقل ... کے ... ہو ... ہم ... ہیں ... نشست ... ہے ... بات ... کشادہ ... کرتا ہے ... ہوتا ہے ... کہ ... ہو گیا ہے ... عجلت سے ... اور ... کرتا ہے ... ہوں ... چاہیے تھا ... ہیں ... ہیں۔

احسان صاحب زبان کے محاورے کی ... بولا کرتے ہیں ... علامہ کے ... پر ہیں چل گئے ... ایک وقت سے خطابت ... زبان کھلتی ہے تو جو ... سامنے ... نہیں ... کوئی ... نہیں ... کی نشست و برخاست اور محاورے ... صرف تحریر ہی میں نہیں بلکہ تقریر میں بھی ... ہے۔ علامہ سے میری گفتگو ... اور میں کچھ کہہ رہا تھا کہ ... میری ... علامہ ... کسی لفظ ... گرفت نہیں کر سکا۔ ... اتفاق کہ ... میری زبان سے یہ جملہ نکل گیا ... سنبھال ... بہت ... پسند ... تھے۔ ...

سنبھال: یہ کیا کہا آپ نے۔ یہ کس زبان کا لفظ ہے ہماری نظر سے تو آج تک یہ لفظ نہیں گزرا۔

میں: علامہ جدید نثر جدید پر تو آپ نے بھی سنبھال لکھا ہوگی۔

علامہ: مولانا، آپ نے غلط ... کیا ہے۔ یہ لفظ 'سنبھال' نہیں ... ہے۔ کچھ کہئے آپ۔ اہل زبان ہوتے ہوئے ایسی فاش غلطی، آپ تو پنجاب آنے ہی ... ہو گئے ہیں۔ نہیں، ... اپنی زبان کو ... سے محفوظ رکھا ہے۔ دوسروں پر اپنی زبان کے نقش بٹھانے ہیں کسی کی زبان ہم پر اثر انداز نہیں ہوئی ... میر و سودا، مصحفی و انشا، آتش و ناسخ، غالب و ذوق، انیس و دبیر، داغ و امیر، جوش و جگر، سیماب و احسان، اختر و ماجد کی زبان ہے اور پنجابی وارث شاہ اور بلھے شاہ کی زبان۔ ہر زبان کے استاد الگ الگ ہیں۔

اس صحبت کے جو نقوش میں نے اپنے حافظے کی مدد سے زیب قرطاس کئے ہیں ان سے علامہ کی معاشرتی، اخلاقی اور ادبی زندگی کے بہت سے پہلو نمایاں ہو جاتے ہیں۔ تاریخ ادب میں ان کا جو مقام ہے اسے سمجھنے کے لئے ہمیں علامہ کی چند خصوصیات پر نظر ڈالنی ہوگی اور وہ بھی ذیلی سرخیوں کے ساتھ تاکہ بعد میں کسی تذکرہ نویس کو زیادہ کاوش نہ کرنی پڑے۔

علامہ فارسی اور عربی علوم میں اتنی کامل دستگاہ رکھتے تھے کہ ان کے اساتذہ کو بھی ان کے تبحر علمی پر ناز تھا۔ مجلہ دیوبند، القاسم، میں اس بالغ نظر فاضل دیوبند کے جو مضامین کسی دور میں اشاعت پذیر ہوئے ہیں۔ ان سے اگر کہیں دقت نظر کا ترشح ہوتا ہے تو کہیں جدت فکر نمایاں کرتی ہے۔ علامہ کو قدرت نے ذہن رسا ... میسر آتا تو نہ معلوم وہ اپنے علمی ذوق کی تسکین کا سامان کس بلند پیمانے پر بہم پہنچاتے۔ "میری نجی اور ادبی زندگی" کے عنوان سے علامہ نے ۱۹۶۰ء میں جو سلسلۂ مضامین سپرد قلم فرمایا تھا۔ اس میں ایک جگہ یہ الفاظ بھی نظر آتے ہیں

"مدت مدید سے اس فکر میں ہوں کہ قسمت موجودہ افکار لاحاصل سے رہائی بخشے تو ادب العرب،
کے نام سے چند مجلدات میں ادب عربی (نظم و نثر) پر ایک ضخیم تصنیف سرانجام دے کر اسے زندگی
کی راہ سفر منزل کے لئے منزل راہ زندگی بنا لوں ...... دیوبند میں بہت دلپسند مضامین شروع

[illegible]

[illegible]

اپنے خطوط میں اکثر وہ ایسے ہی جذبات کا اظہار کرتے ہیں:

عزیز گرامی قدر [illegible]

[illegible] پردیس میں بیٹھے ہوئے ہزاروں دعائیں [illegible] دماغ میں منتشر خیالات [illegible] ہو رہا ہے دل میں ایک خلا سا محسوس کرتا ہوں [illegible] ہو رہا ہے۔ تم یاد آتے ہو، تمہاری والدہ یاد آتی ہیں۔ تمہاری دادی اور تمہارے چھوٹے بچے یاد آتے ہیں۔

اپنے بعض معاصرین کے بارے میں رقمطراز ہیں:

علم و ادب کا صرف طوفان پانچ سال کے بعد [illegible] ادب کی بے کراں وسعتوں میں بہہ گیا۔ اکثر معاصرین نے اپنے اپنے ظرف و حوصلہ کے مطابق [illegible] مگر ان کی زمین [illegible] کچھ یا سخت جانی انہیں اس طوفان سے بچالے گئی [illegible] میں بہت فطرت [illegible] معاصرین کی حاسدانہ [illegible] حیرت [illegible] ہماری ادبی [illegible] کئے ہوئے ہے" ادبی دنیا کے [illegible]

[illegible] منتخب میں اردو شاعری [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
نواحی اور خوش اخلاق کے ساتھ سر کلام [illegible]
حزن کی بہت سادہ سا ترقی کر [illegible] جو ان کے بڑھاپے اور جوانی میں تبدیلی نہ کر سکا لیکن

"جو آکے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا"

کے مقولہ کو حزن کے حق میں بھی غلط ثابت کر دیا۔ حزن کے بعد علامہ تاجور نے [illegible] کی امامت سنبھالی [illegible] اس سے [illegible] وہ اس مختصر مدت میں ان کی ادبی شہرت کے آفتاب کی شعاعیں ملک کے گوشے گوشے میں پہنچ چکی تھیں۔ علامہ نے [illegible] زندگی کے تیسرے دور میں خود اپنے رسالہ کا اجرا کیا۔ یہ رسالہ "ادبی دنیا" ۱۹۲۹ء میں شعر و ادب [illegible] ۱۹۳۲ء میں [illegible] شاہکار [illegible] رسالہ نکالا۔ علامہ نے [illegible] اخبار بھی جاری کیا تھا جس کے ذریعہ آپ ملک کے کونے کونے میں [illegible] خدا، مذہب، وطن اور بنی نوع انسان کی محبت [illegible] محبت پیدا کرنا چاہتے تھے [illegible] رسالہ ناز جبیں، آفتاب اردو (لدھیانہ) اور رسالہ تاج الکلام نجیب آباد کے مدیر رہ چکے تھے۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ آج پاکستان کے طول و عرض میں جو اردو رسالے جتنے اخبارات و ماہنامے جاری ہیں ان ادبی محاسن کا سہرا علامہ تاجور نجیب آبادی کے سر ہے [illegible] کے بارے میں علامہ نے جو نظریہ پیش کیا ہے کہ جو شخص بھی [illegible] ایجاد کرتا ہے اس کے اعمال پر اس کے منفی یا مثبت اثرات کی پرچھائیں ضرور پڑتی ہے اس کی رو سے بلا شائبہ مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے۔ اخبارات و رسائل میں جو اچھوتی بندشیں، لطائف و ظرائف، پرشوکت الفاظ، زبان کے محاورے اور ادب و تنقید کے سانچے میں ڈھلے ہوئے اشعار جہاں کہیں بھی دیکھنے میں آتے ہیں، زبان حال سے علامہ کی عظمت کی گواہی دیتے ہیں اور علامہ کی بارگاہ میں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں ؎

تیرے نازک لبوں سے سیکھا ہے
ہم نے انداز مسکرانے کا

علامہ کی شاعرانہ خصوصیت کو میں نے اس لئے آخر میں جگہ دی ہے تاکہ ان حضرات سے جو میرے مخاطب ہیں یہ حقیقت مخفی نہ رہے کہ علامہ اپنی اس خصوصیت کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے تھے۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ مدت العمر میں اپنے کلام کا ایک مختصر سا مجموعہ بھی شائع نہ کر سکے۔ علامہ کا بیشتر غیر مطبوعہ کلام ایسے شعراء کی تحویل میں ہے جو علامہ کے شاگرد ہیں یا عقیدت کیش۔ خدا کرے کہ ان [illegible] شعرا کا پردہ داری ہو اور علامہ کا یہ غیر مطبوعہ کلام پوری دیانت و امانت کے ساتھ منظر عام پر آئے۔ علامہ اتنے خوش اخلاق اور اتنے خوش فہم نہ ہوتے تو کسی کو بھی دستبرد کی جرأت نہ ہوتی۔ علامہ کا مزاج کچھ اس انداز کا تھا جس کی آئینہ داری نشاط کے اس شعر سے ہوتی ہے ؎

سلطنت بیچتے ہیں ذرہ کشاں خاک کے مول
ہے یہاں سایہ ہما کا خس و خاشاک کے مول

علامہ تاجور نجیب آبادی کے نام و نسب کے بارے میں اس دور کے ادبا کو بہت کم معلومات ہیں اس لئے میں انھی کی زبانی چند

شہادت کے بیانات۔

[illegible]

[illegible] ۔ جب کبھی ... کے ساتھ ... [illegible]

علامہ [illegible] ... لکھا ہے کہ ... [illegible]

[illegible] ... وہاں سکھ کالج کی پروفیسری ان کے حق میں زحمت نہیں [illegible] ثابت ہوئی ایک تو اس لئے کہ انہوں نے ماحول کا غلط اثر قبول کر لیا دوسرے اس لئے کہ ان کے تعلقات ان مسلمان شاگردوں سے شدید ہو گئے تھے جو اگر چاہتے تو علامہ کو زہر کے اس اعلیٰ ترین مقام تک پہنچا سکتے تھے جس کی بلندی تک [illegible] کا گمان بھی نہیں آ سکتی تھی۔

اگر کہا جائے کہ ذوق کی عجیب ذہنیت پر مجھے یہ بات کہنے میں بھی تعلق کرنے تامل نہیں کہ اس عجیب کا دماغ بھی علامہ کے دامن پر تھا علامہ یہ ذوق اتنا بالغ تھا کہ بعض دفعہ خیال انھیں ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ ان کے ایک ہم وطن مولوی صاحب کسی ضرورت سے ان کے پاس آئے تھے بیچارے کو [illegible] نے دیکھا کہ جب تک وہ علامہ کے پاس بیٹھے رہے، علامہ کی تیوری چڑھی رہی [illegible] سوچتے تھے کہ یہاں تو کہاں آ مرا، [illegible] تو خانۂ اقدس مخصوص تھا۔ ناچار [illegible] اس قابل کہاں کہ اس پر بیٹھیں وہیں بیچارے مولوی صاحب پر علامہ کی بے رخی کا نفسیاتی اثر پڑا اور انہوں نے بددل ہو کر رخصت چاہی علامہ نے [illegible] کی گنجائش کے ساتھ نہیں الوداع

[illegible]

[illegible] سے کہا شکریہ [illegible]

[illegible]

[illegible] مطالبہ کیا [illegible]

میں نے اپنے [illegible] حقیقت [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] پیغام [illegible]

[illegible] جیسے [illegible] بھی کم ہوں گے

[illegible] ہمیں کریں گے یاد !

دل شاہجہانپوری

شبنم رومانی

[illegible]

دادا جی کی طرف سے جو دل صاحب ہی [illegible] [illegible] [illegible] طرح ملک مانتے
تھے۔ [illegible] ہیں [illegible] اشعار [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] جاتے ہیں جیسے [illegible] زمین [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ان کے مجموعی
[illegible] گویا کسی [illegible] کیا کرتی تعریف کرتا ہے [illegible] [illegible] تاروں سے
سیکھتے ہیں [illegible] شاگرد کی اتنی عزت کرتے ہیں [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] بیں اعتبار الملک کہتے ہیں۔

ہاں ایک خوبی ایسی ضرور ہے جو دل صاحب میں نہیں ہے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] تو پھر قدرت کو ذہین انسان پیدا کرنے کی ضرورت باقی نہ رہتی اور اس کا مشن پورا ہو جاتا۔ [illegible] [illegible]
[illegible] ہی رہا تھا:

> وہ باتیں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
> اتنے مغلوب الغضب اور دل صاحب [illegible] [illegible]

دل صاحب کی نشوونما ایسے ماحول میں ہوئی جہاں دن رات شکار کے پروگرام بنتے تھے [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] کر [illegible] [illegible] جاتے تھے لہٰذا ان دونوں مشاغل سے آپ کو بھی دلچسپی رہی ہے۔ [illegible] شکار کا شوق [illegible] بندوق [illegible]
نہیں [illegible]۔ [illegible] کا سامان ساتھ ہی رہتا تھا۔ [illegible] میں طرح طرح کے [illegible] ہوتے تھے، صبح [illegible] جماعت جنگل میں [illegible]
[illegible] اور پھر سب لوگ شکار کھیلنے نکل جاتے تھے۔ گاؤں کے لوگ جمع ہو کر جنگل کا جھاڑا کرتے تھے۔ [illegible] نکل کر بھاگتے تھے، بندوقوں کی
گولیاں [illegible] [illegible] [illegible]۔ شام کے وقت جو شکار مارا جاتا اس کا گوشت مختلف طریقوں سے پکایا جاتا۔ کوئی بھاری کباب پکاتا

گولا رکھ لی [illegible] میں سب لوگ ایک ساتھ ہی بیٹھ کر کھانا کھاتے اور جنگل میں جل مل رہتے۔ آپ کا نشانہ بہت صاف تھا بلکہ آپ نشانہ لگانے میں ماہر تھے۔ شکار کیا ہوا ہرن کے گوشت کے ٹکڑے ہزاروں میں سے کسی کو ملتے۔ بہت [illegible] سب لوگ پاس ہی بیٹھے تھے۔

ایک شکار میں آپ نے ایک بہت بڑا سانپ مارا۔ وہ اس قدر بھاری بھر کم تھا کہ اس کا اٹھانا مشکل ہو گیا۔ آپ کے ساتھ بسم اللہ خاں صاحب بھی تھے۔ آپ نے ان سے کہا

"میں اس کا منہ پکڑتا ہوں تم دم پکڑو"

جب وہ بھی [illegible] تو سانپ نے [illegible] دل صاحب سنبھل نہ سکے اور گر پڑے۔ خاں صاحب نے [illegible] شاہجہان پور کے پٹھانوں کا [illegible] خاں صاحب کی [illegible] دل صاحب نے کہا "میں پھر بھی چھوڑتا ہوں آپ منہ پکڑیئے" خاں صاحب [illegible] جسم کا پورا زور ڈال کر سانپ کو [illegible] دل صاحب نے بھی [illegible] اس کی گردن کو زور کا جھٹکا دیا تو خاں صاحب دیکھتے رہ گئے۔

دل صاحب [illegible] ریاست کے ناشتے [illegible] بہت [illegible] میں جان بچ گئے ہیں۔ [illegible] ایک دن وہ [illegible] کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ وہ خاں صاحب کے تعلق سے آپ کے پاس سے گزری آپ نے گولی چلا کر اسے گرا دیا۔ [illegible] بہت بگڑے [illegible] شکار کیوں مار دیا۔ شاہجہان پور کے شکاری [illegible] دل صاحب [illegible] آپ [illegible] شکاری صاحب کو مار کر [illegible] رات کسی کو [illegible] شکاری صاحب نے [illegible] دل صاحب [illegible] گئے ——— دل صاحب کی [illegible] جان بچ گئی۔

ایک مرتبہ شکار کے سلسلے میں آپ نینی تال کی ترائی تشریف لے گئے۔ جاڑوں کا موسم تھا۔ [illegible] جنگل میں لکڑی کے [illegible] آپ وہیں ٹھہرے تھے۔ [illegible] صبح صبح آپ [illegible] شکار کے لئے جاتا تھا۔ وہ [illegible] جب آتا تھا تو صرف [illegible] کے جسم پر ہوتی تھی آپ نے اس سے پوچھا ——— "اس سردی میں کیونکر بسر ہوتی ہے؟" اس نے جواب دیا "کپڑے مجھے ملتے [illegible] ہوں اور بدن سینکتا ہوں۔" آپ نے کاٹھی رکھوا دی۔ وہ [illegible] سمجھا اس سے کوئی غلطی ہو گئی ہے۔ دل صاحب کی آنکھوں میں آنسو [illegible] اپنی اچھی اور گرم قمیص اتار کر اسے دے دی اور کہا: "اسے پہنو اور گھر واپس چلو تاکہ میں دوسرے کپڑے پہن لوں ———"

میرے ایک خالو ظہیر الدین خاں [illegible] کوتوال تھے اور تقریباً پندرہ سال وہاں رہے۔ جب باہر سے ان کے یہاں مہمان آتے [illegible] میں خوب خاطر ہوتی تھی۔ ہر [illegible] چاہتا تھا کہ سامان دے دے جائے۔ [illegible] تھا کہ کوتوال کو مزاج پایا تھا شاہانہ ——— کرایہ [illegible] پانچ [illegible] لیتے دس ——— یہی حال کچھ دل صاحب کا ہے۔ وہ [illegible] بھی ہیں اور جب کوئی [illegible] نکلتا ہے تو جو مزدور ان کے پاس کام کرتے ہیں ان میں ہمیشہ جھگڑا ہوتا ہے ——— اور ہر مرتبہ دل صاحب کو جھگڑا چکانے میں بڑی دقت پیش آتی ہے۔

دل صاحب کا کلام سب سے پہلے "پیام یار" میں چھپا تھا۔ یہ پرچہ لکھنؤ سے نکلتا تھا۔ اس میں اکثر امیر و داغ بھی شرکت فرماتے تھے۔ اسی کے مطالعہ سے آپ کو شعر و سخن کا ذوق ہوا۔ رفتہ رفتہ اس ذوق نے یہاں تک زور باندھا کہ آپ نے خود شعر کہنا شروع کر دیا۔ ایک بار "پیام یار" میں طرح نکلی "جگر دیکھ لینا، نظر دیکھ لینا" اس میں آپ نے بھی غزل کہی تھی جس کا ایک شعر اب بھی محفوظ ہے۔ یہ شعر [illegible] کا ہے

چلا ہے ابھی تیر مژگاں کسی کا!
ذرا اپنا اپنا جگر دیکھ لینا

دل صاحب کی نوعمری کا زمانہ تھا کہ حکیم سید جعفر حسین صاحب بغرض علاج شاہجہان پور تشریف لائے۔ موصوف صاحب نظر شاعر بھی تھے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] صاحب [illegible] دل صاحب [illegible]

[illegible]

علاوہ ازیں [illegible] میں شاہجہانپور میں ایک دینی و تعلیمی کانفرنس ہوئی تھی جس میں سرسید احمد خاں [illegible] مشتاق حسین [illegible] نواب محسن الملک وغیرہ تشریف لائے تھے۔ [illegible]

[illegible]

[illegible] دل صاحب [illegible]

منشی صاحب کسی استاد کی اصلاح کے بعد [illegible] ہوگئی۔ [illegible] مسلّم الثبوت تھے۔ امیر مینائی، داغ دہلوی اور جلال لکھنوی۔ حضرت امیر کا پایہ باعتبار علم و فن سب سے بلند تھا اس لئے آپ نے انہی کو استاد منتخب کیا۔ منشی صاحب ان دنوں دربار رامپور سے وابستہ تھے۔ غزلیں ان کے پاس اصلاح کے لئے جاتی تھیں اور وہ نظر ثانی فرما کر واپس کر دیتے تھے۔ استاد اور شاگرد میں پہلی ملاقات [illegible] میں ہوئی جب دل صاحب اپنے ماموں کے ہمراہ [illegible] گئے۔ وہاں سے واپسی پر منشی صاحب کی زیارت کے لئے رامپور روانہ ہوئے۔ چونکہ بغیر اطلاع گئے تھے لہٰذا براہ راست منشی صاحب کی خدمت میں حاضر نہیں ہوئے۔ صبح کو حاضر ہوئے۔ صدر دروازہ کے اندر دو دروازے تھے ایک زنانخانے کا دوسرا نشست گاہ کا۔ نشست گاہ بالائی منزل پر تھی وہاں حضرت جلیل مانکپوری موجود ملے۔ جلیل صاحب نے آپ کی آمد کی اطلاع کر دی۔ حضرت فوراً تشریف لائے اور بہت محبت سے گلے لگایا۔ فرمایا: "یہاں کیوں نہیں قیام کیا؟" مگر دل صاحب کے عذر معقول پر چپ ہو گئے اور پھر شعر و ادب اور علم و فن پر گفتگو شروع ہو گئی۔

دل صاحب وہاں سے جائے قیام پر واپس آئے ہی تھے کہ معلوم ہوا جلیل صاحب تشریف لائے ہیں۔ باہر آکر دیکھا تو جلیل صاحب تشریف فرما تھے۔ ایک ملازم بھی ساتھ تھا۔ شیرینی کی ایک سینی اس کے سر پر تھی۔ جلیل صاحب نے فرمایا: "قبلہ و کعبہ نے یہ شیرینی اور دس روپے نذر کو بھیجے ہیں۔"

۱؎ دل صاحب کا اصلی نام حکیم ضمیر حسن خاں ہے۔

[illegible]

[illegible] صاحب نے [illegible] شاگرد [illegible] کی خدمت میں [illegible] پیش کر [illegible]
[illegible] صاحب نے [illegible] منشی صاحب [illegible] کا [illegible] میں [illegible] بہ [illegible]
[illegible] کے بعد [illegible] صاحب نے روپے واپس کر دیئے اور [illegible]
استاد نے فرمایا [illegible] سے [illegible] ہے کہ [illegible] شاعروں میں [illegible] مستقبل بہت [illegible] ہوگا۔

اس سلسلہ میں حضرت داغ کا [illegible] منشی صاحب سے فرمایا۔ [illegible] خوش کرنے کے [illegible]
جی چاہتا ہے کہ [illegible] ۔ [illegible] کوئی [illegible] رکھتا ہے۔ [illegible] کا شعر [illegible] سکتے ہے

[illegible] حسرت [illegible] سے نکلا

[illegible] شا [illegible] زبان سے نکلا

ولی صاحب نے [illegible] ایک [illegible] کی [illegible] کے مسئلہ پر تفصیل سے بحث کی گئی تھی
[illegible] صاحب [illegible] تشریف لائے تھے اور [illegible]
[illegible] سے [illegible] سے [illegible] ہو گئے تھے۔

[illegible] ولی صاحب نے [illegible] کر [illegible] سے [illegible] کے [illegible] میں بات چیت شروع کی۔ [illegible]
والی ایک [illegible] رہتے تھے وہ بھی کسی پریس کے ایجنٹ تھے۔ [illegible] نے مطالعہ کے [illegible] ایک دن کے لئے کتاب مانگی۔ [illegible]
[illegible] کر کتاب [illegible] کر دی۔ دوسرے دن واپس [illegible] حافظ صاحب غائب۔ [illegible] دن غائب [illegible] دن غائب
دن غائب [illegible] صاحب کو فکر لاحق ہوئی [illegible] ایک دوست [illegible] حسین خان مرحوم سے ذکر کیا۔ [illegible] صاحب [illegible]
اور [illegible] تھے فوراً آپ [illegible] حافظ صاحب کے [illegible] کیا [illegible]
[illegible] دوسری [illegible] تیسری [illegible] سے [illegible] حاصل [illegible] آخر [illegible] خان نے
[illegible] کے ساتھ [illegible] کیا تو اندر سے حافظ صاحب کی آواز آئی "کون بدتہذیب ہے؟" [illegible] خان نے [illegible]
[illegible] معلوم ہو جاتا ہے۔ حافظ صاحب غصہ میں بھرے ہوئے باہر نکلے اور [illegible] خان صاحب [illegible] خالص [illegible]
[illegible] نے کان پر ہاتھ دھرے۔ قریب تھا کہ [illegible] ہو جائے [illegible] خان صاحب نے کہا [illegible] صاحب کی کتاب واپس کر۔
حافظ صاحب [illegible] ہوئے [illegible] اور کتاب لا کر پھینک دی۔ "یہ لو اپنی کتاب۔"

ولی صاحب کو صوفیائے کرام سے گہری عقیدت رہی ہے۔ آپ کے نانا حافظ احمد حسین خان صاحب سلسلہ قادریہ چشتیہ کے بہت
بلند پایہ بزرگ گزرے ہیں۔ ان کی بارگاہ میں اکثر باریابی حاصل رہتی تھی۔ ان کا مخصوص قوال [illegible] جو بعد کو ملک میں بہت مشہور ہوا اس کے ریاض
تربیت میں ولی صاحب کا کافی ہاتھ رہا اور اس کو بہت سا کلام [illegible] کر حفظ کرایا۔ ایک مرتبہ اس نے [illegible] پر [illegible] کے سجادہ نشین کو جبکہ وہ شغل
[illegible] رہے تھے آپ کا یہ مطلع سنایا۔

رنگ لایا ہے یہ ضبطِ الفتِ گیسوئے دوست
آخر اپنے پیرہن سے پھوٹ نکلی بوئے دوست

[illegible] کہ [illegible] کی [illegible] کر [illegible] اور دیر تک عالم رقص و وجد میں رہے۔ جب ذرا ہوش آیا تو [illegible] سے [illegible] یہ شعر

[illegible]

[illegible] جو کچھ آپ لکھتے ہیں بہت صاف [illegible]

[illegible]

[illegible] صاحب [illegible]

[illegible] حاشیے پر [illegible]

[illegible]

[illegible] ہوتے تھے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

وؔل صاحب کے [illegible] بہت [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] صاحب کے خلاف بہت پروپیگنڈہ کیا [illegible]

میں لے سکیں۔

لکھنؤ میں سوائے دو ایک حضرات کے باقی سب وؔل صاحب کے دوست تھے۔ [illegible] محمد عسکری قیس مرحوم نے آپ کی دعوت کی۔ بعد طعام محفلِ شعر منعقد ہوئی۔ تمام حضرات نے ایک ایک غزل پڑھی۔ وؔل صاحب سے [illegible] سات غزلیں سنی گئیں۔ بعد ختم محفل پروفیسر شاداں مرحوم نے فرمایا: "یہ آپ کا امتحان تھا۔ [illegible] سے صرف ایک غزل اچھی کہہ سکتا ہے یا آپ واقعی اچھا کہتے ہیں۔ خدا کے فضل سے آپ اس امتحان میں کامیاب ہوئے اور مخالفین کو شکست نصیب ہوئی۔"

اس کے بعد آپ کو "بہارِ ادب" کا رکن بنا لیا گیا اور ہر سال مشاعرے میں بلائے جانے لگے۔ مشاعرہ وسطِ سرما میں ہوتا تھا۔ ایک سال مشاعرہ "افضل محل" میں ہو رہا تھا۔ وؔل صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ حضرت صفیؔ، عزیزؔ، یگانہؔ، آرزوؔ وغیرہ کے علاوہ حضرت شہید کچھلی شہری اور ساغرؔ دہلوی بھی شریک تھے۔ غضب کی سردی پڑ رہی تھی، مشاعرہ اپنے شباب پر تھا کہ یکایک کسی نے بجلی کی روشنی بند کر دی اور پنکھے کھول دیئے۔ ۔۔۔ دیکھ کے

[illegible] ——— دل صاحب کے پاس کمبل تھا انہوں نے وہی پیش کیا پاس ہی [illegible]
[illegible] ہے؟" آپ نے نماز کیوں نہیں ادا [illegible] کمبل ہی لے لیا۔ [illegible]
[illegible] دیکھنے کے ہے ——— عجیب حالت تھی [illegible] تھا۔ [illegible] ایک [illegible]
[illegible] اس واقعہ نے مشاعرہ [illegible] ہو گئے تھے۔

[illegible] ایک مشاعرے میں بھی ایک [illegible] شاعرہ تھے۔ دل صاحب کے علاوہ بڑے مشاہیر شعرا شریک تھے۔ [illegible] صاحب نے [illegible] اس لئے بہت سے [illegible] پاس نہیں [illegible] ہو گئے۔ قریب [illegible] یہ مشاعرہ شروع ہوا۔ [illegible] حفیظ جالندھری [illegible] جب انہوں نے [illegible]

[illegible] شعر [illegible]

[illegible] کے شعروں نے وقتاً [illegible] رنگ [illegible] جب [illegible] گئے ہیں تو [illegible]

[illegible] ادب کی [illegible] تھا [illegible] شعر [illegible] کلام پڑھتے ہیں اس کے بعد [illegible] شعر خوانی [illegible] مشاعرہ میں [illegible] صاحب [illegible] تھے۔ [illegible] بیٹھے تھے۔ جب [illegible] صاحب نے نظر اٹھا کر [illegible] صاحب [illegible] جناب [illegible] صاحب کے قریب ہی بیٹھے تھے [illegible] دل صاحب [illegible] دل صاحب نے [illegible] کا یہ شعر پڑھا ـــ

تیغ تک کھینچ لیا [illegible]
[illegible] کے ساتھ تھا

تو [illegible] صاحب نے نظر اٹھا کر دل صاحب کو دیکھا۔ [illegible] صاحب [illegible] دل صاحب کہے ——— آپ کے شعر کی [illegible] ہے"

حضرت بیباک شاہجہان پوری [illegible] سے دل صاحب کی [illegible] تھی۔ اکثر مشاعروں میں ساتھ ساتھ جاتے اور ساتھ ہی ساتھ [illegible] کرتے تھے۔ بیباک صاحب شاعر ہونے کے علاوہ [illegible] جس شعر پر داد دے دیتے تھے بدیا یہ سمجھ لیا جاتا تھا مگر صاف گو اور مغلوب الغضب بھی تھے اس لئے لوگ ان سے بہت ڈرتے تھے۔ [illegible] ایک مشاعرہ میں دل و بیباک کے علاوہ سیف شاہجہانپوری بھی شریک تھے۔ سیف صاحب بیباک میاں سے [illegible] ہونے سے [illegible] پرواز تھے۔ بعد مشاعرہ دل صاحب، بیباک میاں اور سیف صاحب سے نواب التفات رسول نے فرمایا کہ ڈپٹی کمشنر اور جج ضلع آپ لوگوں کا کلام سننا چاہتے ہیں۔ یہ حضرات انگریز ہیں۔ انہوں نے اردو نظم نہیں سنی لہٰذا آپ شام کو تشریف لا کر اپنا کلام سنائیں۔ جب روانگی کا وقت آیا تو سیف صاحب نے جانے سے انکار کر دیا اور برجستہ کہا "میں وہاں جا کر مسخرہ بننا نہیں چاہتا"۔ دل صاحب اس وقت تو خاموش ہو گئے اور بیباک میاں کے ساتھ التفات رسول صاحب کی قیام گاہ پہنچے۔ ڈپٹی کمشنر اور جج ضلع کو اپنا کلام سنایا۔ چونکہ وہ اردو سے ناواقف تھے لہٰذا ایک مترجم نے انگریزی میں اشعار کے معنی ان کو سمجھائے۔

واپس آ کر جب دل، بیباک اور سیف اکٹھے ہوئے تو دل صاحب نے چھیڑا ——— "کیوں سیف صاحب! جب آپ ولایت درزی کی دکان پر جا کر اس کو اپنی غزلیں سناتے ہیں جو بالکل جاہل ہے تو آپ کے لئے فخر کی بات ہوتی ہے مگر جب ایک ڈپٹی کمشنر جس کے اجلاس میں آپ دست بستہ کھڑے ہوتے ہیں آپ کو نہایت احترام سے اشعار سننے کے لئے مدعو کرتا ہے تو آپ انکار کر بیٹھتے ہیں کہ میں مسخرہ بننا نہیں چاہتا"۔ یہ سننا تھا کہ بیباک میاں آگ بگولا ہو گئے "کیوں بے سیف کے بچے! تو نے یہ کیا سمجھ کر کہا، کیا ہم مسخرے ہیں، بخدا کی قسم اگر تو شاہجہانپور [illegible]

[illegible]

[illegible]

شاہجہاں پور کے ایک آل انڈیا مشاعرے میں [illegible]

[illegible]

سیماب صاحب نے [illegible]

دل صاحب نے برجستہ جواب دیا [illegible]

جب فیاض صاحب نے مقطع پڑھا ؎

فیض سے فیاض پہنے ہیں جناب دل سے ہم

تو سیماب صاحب بہت شرمندہ ہوئے اور معافی مانگ لی۔

الٰہ آباد کی کسی تقریب میں دل صاحب شریک تھے۔ [illegible] جعفری [illegible] قریب ہی بیٹھے تھے۔ دل صاحب نے جعفری صاحب سے پوچھا: "آپ مجھ سے واقف ہیں؟"
جعفری صاحب نے فوراً جواب دیا: "کیوں نہیں، آپ تو ہر وقت میرے بائیں پہلو میں دھڑکتے رہتے ہیں۔"

کانپور کے ایک مشاعرے میں جب دل صاحب کا نمبر آیا تو ناظم مشاعرہ نے کہا: "آپ حضرتِ دل ہیں جو عاشق کے پہلو میں رہتے ہیں؟"
دل صاحب نے برجستہ کہا: "اب تو معشوقوں کی مٹھی میں رہتا ہوں۔"

مرادآباد کے ایک مشاعرے میں دل صاحب بھی مع ایک شاگرد کے مدعو تھے۔ آپ کو مشاعرے سے قبل ایک میزبان کی تحویل میں دے دیا گیا۔
صبح سے دوپہر تک ملنے والوں کی آمد و رفت جاری رہی۔ دل صاحب چونکہ لمبا سفر طے کر کے آئے تھے اس لئے بھوک نے بہت پریشان کیا۔

تو انہوں نے کہا نا غلط فہمی ہوئی۔ جب وہ چلے گئے تو آپ سے عرض کیا ہوا۔ یہ سن کر کہ وہ پوچھ رہے تھے کہ کیا اللہ آپ کو ایک روپیہ دو ایک بوریا لے آؤ۔"

میزبان صاحب سے ساتھ بہت حیران ہوئے۔ وہ پوچھ رہے تھے ہم وال صاحب سے۔ پھر کہنے لگے کہ "ان کو ایسا لے آؤ کہ پی کر لیٹیں اور تو اللہ کو بھی بس کر۔"

اس پر میزبان بہت شرمندہ ہوئے اور دسترخوان بچھا دیا گیا۔

سہارنپور کے ایک مشاعرے میں والؔ صاحب اور نوح صاحب ساتھ ساتھ شریک ہوئے۔ بعد مشاعرہ جلدی جلدی گاڑی پکڑنے کے لئے نکلے تو والؔ صاحب بیاض وہیں بھول گئے۔ بیاض کو دیکھ کر وہ بہت سخت پریشان ہوئے۔ بہت تلاش کی گئی مگر بیاض نہ ملی۔ اسی میں ان کا قیمتی کلام تھا۔ تمام ضلع میں اطلاعات بھیج دی گئیں۔ بیاض نہ ملی تو سخت صدمہ نازل ہوا اور جو بیاض واپس کرے اس کو انعام دیا جائے گا۔

دوسرے دن سفر جاری رہا۔ دیوبند کے یہاں مشاعرہ تھا۔ والؔ صاحب کی باری آئی تو انہوں نے مشکل چند شعر پڑھے۔ جب مشاعرہ ختم ہوا کسی نے کہا: "آپ کی بیاض مل گئی ہے۔"

والؔ صاحب خوشی سے اچھل پڑے [illegible]

جواب ملا ——— "جی ہاں، مگر وہ ایک رقاصہ کے پاس ہے اور اس کی خواہش ہے کہ والؔ صاحب میرے یہاں تشریف لائیں اور کلام سنائیں پھر بیاض ان کو پیش کی جائے گی۔" والؔ صاحب سوچ پر مجبور کرنے لگے تو نوح صاحب نے ان کے حکم کی تعمیل کی۔

سب برائیوں سے خانے میں ہوتا ہے [illegible] میں بھی جلتا ہوں

[illegible] رقاصہ سے یہاں جانے سے کیا گریز ———

وقت مقررہ پر حسب حال نوح صاحب اور والؔ صاحب وہاں پہنچے۔ بڑے تکلف سے چائے پلائی گئی۔ اپنے ہاتھوں سے بنا کر رقاصہ نے والؔ صاحب کو چائے پیش کی۔ والؔ صاحب تھے کہ شرم سے دوہرے ہوئے جا رہے تھے اور نوح صاحب آنکھوں کے کونے دبا کر شرارت پر اکسا رہے تھے۔ چائے کے بعد شعر خوانی ہوئی اور ماشاءاللہ بڑے اعزاز سے بیاض والؔ صاحب کو پیش کی گئی ——— بیاض کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں بے ساختہ آنسو آ گئے اور بیاض رقاصہ کے ہاتھ سے چھوٹ پڑی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ بیاض کسی لڑکے نے مشاعرہ گاہ سے اٹھائی تھی اور بازار میں اسے بیچنے لے گیا تھا۔ اس کی گمشدگی کی باقاعدہ رپورٹ لکھی جا چکی تھی اور پولیس سرگرم تلاش تھی۔ اتفاق سے رقاصہ کا بھائی ادھر آ نکلا اس نے لڑکے سے کہا: "میاں صاحبزادے یہ کتاب میرے حوالے کر دو ورنہ گرفتار ہو جاؤ گے۔" لڑکا یہ سنتے ہی بیاض پھینک کر بھاگ کھڑا ہوا۔

والؔ صاحب انکساری و سادگی کے مجسمہ اور وضع کے اتنے پابند ہیں کہ خواہ کتنا ہی وقت گزر جائے تا ختم مشاعرہ نہیں اٹھتے۔ جب کسی بیرونی مشاعرہ میں شریک ہوتے ہیں تو میزبان پیچھا نہیں چھوڑتے اور بہ اصرار اپنے یہاں ٹھہراتے ہیں۔ الہ آباد کے ایک مشاعرے میں شرکت کے لئے آپ گئے تو پروفیسر ضامن علی کے مہمان ہوئے۔ پروفیسر صاحب کے اصرار پر ایک ہفتہ تک قیام رہا۔ اسی دوران میں ایک اور شاعر آ کر ضامن صاحب کے یہاں ٹھہرے۔ والؔ صاحب اور وہ ایک ہی کمرے میں سوئے۔ نصف شب کے قریب انہوں نے والؔ صاحب کو جگایا کہ "شمالی ہوا مجھے تکلیف دیتی ہے کسی ترکیب سے میرے پلنگ کا رخ تبدیل کرا دیا جائے۔" لہٰذا ضامن صاحب کو جگایا گیا۔ ملازم کو سوتے سے اٹھوایا گیا اور ان کے

[illegible] صاحب [illegible] کی زبانی [illegible]

دل صاحب [illegible] آپ [illegible]
[illegible]
[illegible] دل صاحب [illegible] تھے۔

گزشتہ سال [illegible] مشاعرہ [illegible]
[illegible] صاحب کے [illegible]
[illegible] صاحب [illegible] مشاعرہ [illegible]
[illegible] جوش ملیح آبادی [illegible] دل شاہجہانپوری [illegible]
[illegible] دل صاحب [illegible]
[illegible] دل صاحب [illegible] آپ [illegible]
آپ [illegible] ہیں۔

دل صاحب [illegible] مشہور ہیں۔ مگر دل صاحب نے اپنے [illegible] آپ [illegible]
[illegible] مشاعرہ [illegible] آپ [illegible]
[illegible] مشاعرہ [illegible] دل صاحب [illegible]
اور [illegible] نوح صاحب [illegible] جگر صاحب [illegible] دل صاحب [illegible]
جوش صاحب [illegible] شاہجہانپور [illegible]
استاد حضرت دل کے شہر [illegible] دل صاحب نے شاہجہانپور [illegible] شاہجہانپور اسی لئے مشہور ہے کہ وہ دل صاحب کا وطن ہے۔

اوائل [illegible] ۱۹۳[illegible] میں سردار [illegible] سنگھ اور سید [illegible] محمد رضا [illegible] شاہجہانپور تشریف لائے تھے۔ ان دنوں آموں کی فصل تھی۔ دل صاحب [illegible] حضرات کو اپنے باغات کے آم کھلائے۔ [illegible] صاحب [illegible] آموں کا ذکر جلیل صاحب اور داغ صاحب نے اپنے اشعار میں کیا ہے وہ سب حضرت دل کے باغات میں موجود ہیں۔

دل صاحب آموں کے عاشق صادق ہیں۔ فصل [illegible] میں آپ اپنے احباب کو [illegible] کے لئے لے جاتے ہیں [illegible] اور [illegible] کے آم کھائے جاتے ہیں، شکار کھیلا جاتا ہے اور شعر پڑھے جاتے ہیں۔

آپ کے ایک دوست آم کھانے باغات میں تشریف لے گئے۔ وہ بمبئی آم سے سخت نفرت کرتے تھے کہتے تھے "بمبئی تو ایسا آم ہے کہ اس کو چھیل کر پیشاب کر دینا چاہئے"۔ دل صاحب کے کانوں تک بھی ان کی یہ بات پہنچی آپ نے ایک خوب تیار بمبئی چھیل کر ان کو دیا۔ انھوں نے مزے لے لے کر کھایا اور بہت تعریف کی۔ نام پوچھا تو دل صاحب نے کہا "[illegible]" بہت حیران ہوئے تو آپ نے فرمایا [illegible]!

مگر تعلیم کے متعلق سلیقہ چاہیے جس وقت سے فرصت پاکر کیا جائے تو یقیناً مفید ہوگا:

آپ کا شغل طب صرف رفاہِ عام کے لئے ہے۔ خاص خاص مجربات آپ خود تیار کر کے مفت تقسیم کرتے ہیں۔ لوگوں کے مکانوں پر جا کر بھی دیکھتے ہیں مگر کبھی کسی سے کوئی معاوضہ نہیں لیتے۔ ایک بار ایک انگریز کو جو ہولناک مرض میں مبتلا تھا آپ کے علاج سے صحت ہوگئی اس نے پانچ سو روپے بطور نذرانہ پیش کئے مگر آپ نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا کہ وہ شرما گیا اور جب تک بیٹھا رہا معافی مانگتا رہا۔

جس طرح بڑے بڑے رئیس اور حکام آپ کے یہاں آتے اور آپ کو اپنے یہاں عزت سے بلاتے ہیں ——— مگر آپ ان کی تقریبات میں بھی اسی شان سے شریک ہوتے ہیں جس شان سے اپنے عزیزوں کے ساتھ ان کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں۔

مشاعروں کے سلسلہ میں شہادت دینے کی ضرورت نہیں۔ ایک ایک قدم کے لئے ڈٹے رہے ہیں۔ ملک کے مشاہیر شعراء میں اکثر حضرات کے لئے ان کے مشاعرہ سے وابستگی رہی ہے۔ آج جس قدر اول کے شعراء تو محدود رہ گئے ہیں زیادہ طلب کر چکے ہیں۔ زمانے میں مشاعروں کے لئے نئی شہرت اور سلطانی و دستوری ہونے کے سبب کئی ہم عصر شعراء کو بھی مدعو کرتے۔ مشاعرہ کے بانی و سرپرست و شعراء گیارہ حامی رہے۔ ابتداء پانچ سو روپیہ مع صرف بیشتر شعراء کی کوششوں سے جاتے تھے۔ بیسیوں شعراء بھی اس میں مبتلا ہیں مگر دل صاحب نے قرآن و دین کی بیکاری کو ترک دیا۔ آپ نے مشاعرہ سے بھی کچھ فائدہ نہیں لیا۔ یہاں تک کہ بعض بعض جگہ آپ اپنی جیب سے کرایہ اور دعوت صرف کرنے تشریف لے گئے۔ نواب اقتصادات سول صاحب نے ہر چند آپ کو زادِ راہ دینا چاہا مگر آپ نے کبھی قبول نہیں کیا۔ ایک مرتبہ بہت مجبور کیا تو آپ نے فرمایا ——— آپ مجبور کرتے ہیں تو لئے لیتا ہوں مگر آئندہ آؤں گا نہیں ——— یہ سن کر اقتصادات رسول صاحب بہت شرمندہ ہوئے اور لفافہ واپس لے لیا۔

دل صاحب آج بھی شاہجہانپور میں ہیں۔ زمینداری جو ان کا ذریعہ آمدنی تھی، حق سرکار ضبط کی جا چکی ہے۔ بقیہ اراضی قریب قریب ختم ہو چکی ہے۔ صبح کو مطب کے بعد اصلاح و تصحیح کا شغل اور شام کو لوگوں سے ملنا جلنا اب بھی جاری ہے۔ اب بھی شاہجہانپور کی کسی شاہراہ پر ٹہلنے کی چھڑی ہاتھ میں پھنسائے ہاتھ پشت پر باندھے اور سر جھکائے بے نیازانہ گزرتے ہوئے لوگ انہیں دیکھتے ہیں تو ادب سے ایک طرف ہٹ جاتے ہیں۔ مگر کبھی سلام کا موقعہ نہیں پاتے۔ کتنوں ہی نے مجھ سے کہا: "کاش ہم کبھی دل صاحب کو پہلے سلام کر سکتے۔" دل صاحب خود سلام کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں شاید وہ سارا ثواب خود ہی لوٹنا چاہتے ہیں۔

انقلاباتِ زمانہ نے انہیں نیم جان کر دیا ہے مگر وضع کی پیشانی پر شکن نہیں آئی۔ ان کے بڑے صاحبزادے شبیر حسن خان جن کی عمر تیس سال کے قریب ہے وکالت کرتے ہیں۔ چھوٹے صاحبزادے شفیق حسن خان ونجیس کے قریب ہیں گھر کا کاروبار سنبھالے ہوئے ہیں اور پچھلے چند برسوں سے شعر بھی کہنے لگے ہیں۔ کبھی کبھار ان کی غزلیں نگار اور ہندوستانی ادب میں نظر آ جاتی ہیں۔

چلتے چلتے حقِ شاگردی بھی ادا کر دوں۔ میں ان سے بہت قریب رہا ہوں اور میرا ایمان ہے کہ وہ مکمل انسان ہیں اور مکمل استاد بھی۔ انہوں نے کبھی مصرعہ کاٹ کر مصرعہ اور شعر کاٹ کر شعر نہیں لکھا۔ ان کی اصلاح شاگرد کی استعداد کے مطابق ہوتی ہے کبھی کسی مبتدی کا شعر آسمان پر نہیں پہنچاتے اس کو خود آگے بڑھنے کا سبق دیتے ہیں۔ شعر میں جتنی فنی اور اسلوبی احتیاطیں وہ برتتے ہیں کسی نے نہیں برتیں۔ اپنے تلامذہ کے خیال کی بلندی اور پستی، رنگِ کلام اور اندازِ بیان پر وہ اپنے نظریات کا غلاف کبھی نہیں چڑھاتے۔ ان کے تلامذہ میں جہاں خالص کلاسیکی شعراء ملتے ہیں وہاں خالص انقلابی، رومانی اور ترقی پسند بھی۔ وہ ہر ایک کو اس کے اپنے اندازِ فکر کے مطابق راہ دکھاتے ہیں۔ ان کا اصولِ اصلاح یہ ہے کہ شعر میں فنی خامی یا زبان و بیان کا سقم نہیں رہنا چاہیے۔

ان کی اصلاح اتنی باریک اور اتنی نازک ہوتی ہے کہ سمجھئے اور دیکھتے رہ جائیے۔ بطور مثال ایک شعر پر ان کی اصلاح نقل کرتا ہوں شعر تھا۔

جس کو فطرت نے دی ہستی ہے نازاں [illegible]

گل زدہ ہے اس کی [illegible] ہوتے ہیں

آپ نے [illegible] میں [illegible] کر [illegible] شعر [illegible] [illegible]

جو فطرت نے دی ہستی پہ ہے نازاں [illegible]

گل زدہ ہے اس کو [illegible] ہوتے ہیں

[illegible] صاحب کے [illegible] بہت [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] صاحب اب [illegible] کہیں گے [illegible]

[illegible] فطرت [illegible]

[illegible]

فلک پیما

میاں بشیر احمد

میرے محترم نے چند روز ہوئے مجھے لکھا کہ میں اپنے عزیز ترین دوست میاں عبد العزیز فلک پیما مرحوم پر چند خیالات کا اظہار کروں۔ پہلے تو کچھ عرصہ میں اس فرمائش پر گھبرایا۔ میں نے سوچا کہ فلک پیما پر لکھنا بڑا مشکل کام ہے۔ فلک پیما کے خیالات کو سمجھنے کے لئے بڑی فلسفیانہ فہم درکار ہے۔ ان کی گوناگوں شخصیت اور ان کے کردار کا نقشہ کھینچنے کے لئے بڑے تامل اور تدبر اور تفکر کی ضرورت ہے۔ ان مختلف وجوہ سے میں آج کل اس قابل نہیں کہ یہ دشوار کام اپنے ذمے لے سکوں۔ میں نے دل میں فیصلہ کیا کہ میں یہ کام نہیں کروں گا [illegible] اتنے بڑے شخص اور ایسے دوست کی شان کے شایان کچھ لکھ سکوں تو لکھوں ورنہ نہ لکھ سکوں تو محبت و عظمت کے حضور میں گستاخی اور بے ادبی ہوگی کہ لکھنے کا عزم بھی کروں۔ پھر ایک دن یک لخت دل میں ایک بجلی سی دوڑ گئی اور معلوم ہوا کہ فلک پیما پر میں بہت کچھ لکھ سکتا ہوں بلکہ صفحے سیاہ کر سکتا ہوں اور جب کر سکتا ہوں تو حیف ہے کہ ایسا نہ کروں۔ انسانی محبت کا تقاضا ہے اور دوست کی مدح کا امر ہے کہ میں ایسا کروں میں نے اپنے آپ سے وعدہ کر لیا کہ وقت نکالوں گا اور اطمینان سے لکھوں گا اور اس لکھنے سے اور اس محنت سے فائدہ بھی اٹھاؤں گا اور لطف بھی۔ ان کی کتاب "مضامین فلک پیما" جو اب نایاب ہے اسے پڑھوں گا سمجھوں گا سر دھنوں گا اور لکھوں گا۔ میری طرف ان کے سینکڑوں خطوط ہیں۔ بڑے پرائیویٹ اور بے تکلف اور بے تحاشا۔ ان میں انسانی جذبات کی لہریں ہیں علمیت کے موتی ہیں فلسفے کے ہیرے ہیں۔ ان کو دیکھوں گا پرکھوں گا اور دوں کو دکھاؤں گا۔ کس قدر شاندار کام ہوگا۔ پھر ان ہزاروں ملاقاتوں پر ایک نگاہ ڈالوں گا جو پہلی ان کی ہوئیں۔ انہیں یاد کروں گا دل کے کانوں سے سنوں گا اور شکریے کی زبان سے دوستوں اور ہم جنسوں کو سناؤں گا اور مزے لوں گا واہ! کس قدر پُر لطف کام ہوگا!

لیکن صد حیف کہ فرصت نہ ملی پر نہ ملی حالانکہ مجھ سے آدمی کی بات، یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ "فرصت ہی نہیں ملتی" [illegible] کے؟ پھر کس قدر شرم کی بات ہے کہ میں نے کچھ دیکھا ہزاروں کاموں کے اندر جیبوں بے شمار مصروفیتوں اور بے معنی "مصیبتوں" اور "[illegible]"

[illegible] ہے چہرہ [illegible] بت کے نہیں [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] پڑھتے ہی دل نے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] اور ان کی شخصیت [illegible] سب کچھ [illegible]

[illegible] DECENCY [illegible]

[illegible] خوشی کو جہاں دیکھتے ہیں [illegible]

[illegible] قدم قدم پر بکھری ہوئی اور مسکراتی ہوئی

مسلمانوں کی [illegible] روحانی قربانی کا [illegible]

[illegible] اور خوبصورتیوں کا [illegible] معاشرتی حلقوں میں کائنات کی

ان کا [illegible] علیحدہ ہو کر [illegible] ایک تمدنی پہلو کا

[illegible] بڑی خوبیوں اور خوشیوں کو ایک دوسرے میں دیکھو اور دکھاؤ۔ زندگی کا ایک ہی پہلو ہے اور وہ پہلو [illegible] ہے

منفرد ہے لیکن وہ مرت [illegible] زندگی نہیں!

ایک دفعہ مجھے اپنے ایک خط میں لکھا کہ بشیر! مجھے جتنا رنج زیادہ ہوتا ہے اتنا ہی میں اور زیادہ ہنستا ہوں۔ میں نے اُن کی زندگی کا

اس خیال کی تصویر پایا جیتی جاگتی بولتی چالتی تصویر۔ اکثر اپنی غم پسندی میں مجھے اُن کا یہ فقرہ یاد آ گیا اور اس سے نہ صرف میری افسردگی بند ہو گئی

بلکہ میں بھی بے اختیار ہنس دیا اور اپنے افکار کو بھول گیا۔

میں نے کوئی دیکھا کہ فلک پیا ایک عیش پسند اور تن پرست آدمی تھے۔ جب ایک [illegible]
کہ [illegible] ایک عجب عالم تھی کہ وہ بہت معروف اور مشغول اور جاہل تھے۔ [illegible] بہترین سال [illegible]
وہ [illegible] کلام لکھتے ہیں اور [illegible] سے [illegible] پر [illegible] ہے۔ [illegible]
کے [illegible] کبھی [illegible] اور [illegible] لکھنے کے مشتاق تھے۔ وہ [illegible] کی باتوں سے [illegible]
سنجیدہ باتیں اور [illegible] کاموں میں گزریں۔ مگر ایک بڑی بات یہ تھی کہ [illegible]
[illegible] اور متانت نے کبھی ان کے دل و دماغ پر قبضہ نہیں کیا۔ وہ کبھی سنجیدگی اور متانت اور [illegible]
نے ان سے بھی زندگی کی خوشی کا کام لیا۔ خوشی جو ایک وقت سادہ اور [illegible] ہو گئی تھی:

[illegible] وہ [illegible] اور [illegible] نے کائنات اور زندگی کے فلسفے کی گتھی [illegible]
[illegible] اُن سے [illegible] فلسفے [illegible] کچھ سیکھتا ہے۔ وہ مجھے اپنی [illegible] کتابوں کا [illegible]
[illegible] کرتے ہیں۔ [illegible]
چل رہی ہے [illegible]:

[illegible] سے [illegible] کچھ لکھیے۔ [illegible] میری مضمون [illegible] اب بھی [illegible]
[illegible] میں مضمون نگار نہیں بننا چاہتا۔ مصنف بننا یا مشہور ہونا چاہتا ہوں۔ مجھے [illegible]
تمہارے [illegible] لکھوں گا [illegible] لکھوں گا۔ میں نے [illegible] کے بعد جب [illegible]
نقاب کشائی ہوئی تو [illegible] کچھ لکھئے [illegible] مجھے اجازت [illegible] جیسے میں نے فلک پیا کو
اپنے لئے Patent (مخصوص) [illegible] کی بات [illegible]
میں محبت کے لئے لکھتا ہوں کیونکہ میں محبت کے لئے جیتا ہوں۔ [illegible] لکھوں اور کس طرح لکھوں [illegible]
نہیں۔ غنیمت ہے کہ [illegible] آزاد خیال [illegible] دل و دوست کی بات کچھ لکھ دیا تو اس سے [illegible] آزادی [illegible] اور زندگی
کی ذرا سی جھلک دیکھ لی۔

سے اس مضمون میں میں نے فلک پیا کے ادبی کارنامے پر نظر ڈالی۔ لیکن اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ وہ اردو کے [illegible] تھے جنہیں اب تک بہت کم لوگوں نے سمجھا ہے اور جن کی [illegible] ابھی تک نہیں ہوئی:

مالک رام

مختار الدین احمد

یہ میرا قاہرہ میں دوسرا دن تھا

[illegible] سے دوست [illegible] مصر [illegible] مباحث [illegible] میں مصروف [illegible]
[illegible] مالک رام صاحب سے [illegible] تھا [illegible]
کی ملاقات کرائی تھی۔ ایک صاحب [illegible] مجھ سے [illegible] گفتگو [illegible] انہوں نے
[illegible] تھا [illegible]
[illegible] مالک رام صاحب کے [illegible]
[illegible] صاحب [illegible] رہے تھے [illegible]
میں [illegible] اسکندریہ فوراً پہنچو۔

دوسرے دن میں نے قاہرہ سے [illegible] مصری اخبارات [illegible] ڈبے میں بیٹھ گیا [illegible]
سے [illegible] اسکندریہ سے قریب ہوتا جا رہا تھا میں ہم سفروں سے گفتگو کرتا [illegible] پڑھتا [illegible]
مالک رام صاحب کے خصائل و عادات کی بابت سوچتا اور تصویریں بناتا رہا۔

ٹرین اسکندریہ پہنچی تو پلیٹ فارم پر [illegible] آدمی [illegible] مالک رام تھے۔ معانقے مصافحے کے بعد ہم لوگ
ان کے فلیٹ کی طرف چلے جو اسٹیشن کے پاس ہی تھا۔ اسی شام اسکندریہ کے [illegible] ان کے ایک دوست نے بہت سے لوگوں کو
ڈنر پر بلا رکھا تھا۔ مالک رام اپنے [illegible] سامان [illegible] شہر کی سیر کرتے رہے اور اسکندریہ اور مصر کی [illegible] زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے
ہم [illegible] ایم [illegible] کے دفتر پہنچے۔ [illegible] انہوں نے کچھ حصہ نہ لیا [illegible] خاموش تماشائی کی طرح تقریریں سنتے رہے۔ لیکن [illegible] تقریروں کے
بعد [illegible] پتہ چلا کہ [illegible] بہت [illegible] مصری سوسائٹی میں انہوں نے اچھی خاصی جگہ بنا لی ہے۔
ڈنر کے [illegible] عیسائی بھی تھے لیکن [illegible] تعداد مسلمانوں کی تھی۔ [illegible] کے ساتھ [illegible] خاص کا سلسلہ بھی

[illegible] ہمارے [illegible] رہے۔ جب ہماری میز پر پہنچے تو ملک رام صاحب [illegible] نے [illegible]
[illegible]۔ انہوں نے [illegible] مگر [illegible] انہیں [illegible]

میں نے رخصت کے بعد [illegible] آپ [illegible] جائیں گے۔

مصر میں [illegible] سے [illegible] کرتے ہیں [illegible] پہنچے [illegible] ہماری میز پر [illegible] صاحب [illegible] تھے۔ میں نے [illegible] شروع [illegible] صاحب کی [illegible] آئی تھی [illegible] اور [illegible] دوستوں نے [illegible] میری [illegible] ملک [illegible] پہ [illegible] گزشتہ [illegible] سے [illegible] رہی ہیں

رخصت کے بعد [illegible] پہنچے۔ یہاں پہلے [illegible] سے [illegible] میری [illegible] خوب [illegible] کے مطالعہ کے [illegible] آتے [illegible] میں [illegible] ہیں [illegible] انہوں نے [illegible] کتابیں [illegible] کر [illegible] میں [illegible] مشکل [illegible] کے پاس [illegible] کے [illegible] میں [illegible] کرتے رہتے ہیں [illegible] دوستوں [illegible] کتاب [illegible] دیتے ہیں [illegible] کتاب [illegible] قیمت [illegible] ایک صاحب سے انہوں نے ایک کتاب [illegible] کتاب [illegible] مجھے [illegible]

ان دنوں آپ [illegible] آپ [illegible] نسخہ [illegible] داستان [illegible] کے
لئے [illegible] آپ نے [illegible] کتاب [illegible] آپ [illegible] آپ اس
[illegible] دیتے ہیں —— آپ کی یہ روش مجھے آئندہ آپ
کو زحمت دینے میں مانع ہوگی۔

وہ اپنے دارالمطالعہ میں بیٹھے کئی رات کے [illegible] دکھاتے رہے اور [illegible] باتیں کرتے۔ [illegible] دوسرے دن صبح کی چائے پی کر ایک دو اصحاب سے ملاقات کرائی۔ [illegible] میں ہم لوگ تازہ مطبوعات دیکھتے رہے۔ [illegible] کا ایک پشتارہ ساتھ آیا۔ [illegible] کتابیں میں اپنے ساتھ [illegible] جاتیں [illegible] قیمتیں وہ میری طرف سے بعد میں چکاتے رہے۔

مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ دفتری [illegible] عجیب قسم کی غیر ادبی مصروفیات کے باوجود وہ کتنا وقت ادبی و علمی مضامین لکھنے کے لئے کس طرح نکال لیتے ہیں۔ وہ ذکرِ غالب پر نظرِ ثانی و اضافہ کر رہے تھے۔ امام احمد بن حنبل پر ایک مفصل اور جامع کتاب لکھنے کا منصوبہ بنا رہے تھے، بعض مضامین [illegible] کے [illegible] ان کا [illegible] تھا۔ پھر بھی جب میں نے غالب کے سلسلے میں اپنے [illegible] گنجینۂ غالب کے لئے [illegible] موضوعات کا انتخاب ان کے لئے کیا تو وہ بلاتکلف ان پر مضامین لکھنے کو تیار ہو گئے اور انہوں نے جلدی اپنا وعدہ پورا بھی کر دیا۔

چند روز [illegible] گھنٹے ساتھ گزارنے کے بعد جب اُن سے رخصت ہوا تو ایسا محسوس ہوا جیسے ہم کئی برسوں سے ایک دوسرے سے واقف ہیں۔

ملک رام صاحب سے میری یہ ملاقات جولائی [illegible] کو ہوئی لیکن ان سے میرے تعلقات پہلے سے تھے اور میں ان سے واقف تو بہت عرصے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

میں نے انھیں مضمون لکھتے ہوئے [illegible] دیکھا [illegible] [illegible] مستقل [illegible] بات [illegible] [illegible] لکھتے ہیں [illegible] [illegible] [illegible] مضامین جو انھوں نے مختلف [illegible] پر لکھے ہیں بہت دلچسپ ہیں اور ان مضامین میں طرزِ تحریر بہت شگفتہ ہے [illegible] [illegible] جو مضمون انھوں نے لکھا ہے وہ سب سے بہتر ہے۔

نادی بشیر صاحب [illegible] اور قدیم روایات کے دل دادہ [illegible] مروت والے ہیں۔ علمی کام میں یا دوسرے جہاں تک ان سے ممکن ہو سکتا ہے وہ دوسروں کو مدد دینے پر تیار رہتے ہیں۔ جب بھی انہیں کسی کتاب یا کسی مخطوطے کے عکس کے لیے لکھا [illegible] عکس ہی بھجوا دیا اور قیمت بھی نہ لی۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب کو جوالیقی کی المعرب کی ضرورت تھی۔ یہاں بہت تلاش کی [illegible] [illegible] صاحب کو لکھا۔ کتاب چھپ کر فوراً بازار سے ناپید ہو گئی تھی۔ انہوں نے بڑی مشکل سے کہیں سے ڈھونڈ کر ایک نسخہ [illegible] ڈاکٹر [illegible] کی خدمت [illegible] صدیقی صاحب سے ان کے تعلقات کی ابتدا غالباً یہیں سے ہوئی ہے۔ کتابیں [illegible] ضرورت اور اہمیت کا خیال کر کے کبھی کبھی ایک [illegible] قرض [illegible] کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ایک طالب علم کو کچھ روپوں کی ضرورت پڑی [illegible] انہیں [illegible] ہزار روپے بھجوا دیے [illegible] تعلیم کی تکمیل [illegible] واپسی کی [illegible] جی چاہے واپس بھیجئے جی چاہے نہ بھیجئے۔

یہی نرمی اور مروت کہیں کہیں ان کے تحقیقی مضامین میں بھی جھلکتی ہے۔ کبھی کبھی ان کی تحقیق پر ان کی فطری نرمی اور صلح مندی غالب آجاتی ہے۔ یہ

اپنے یہاں یہ مصنفین کو ہے۔ مسودہ اس قدر غلط ہوتے ہیں، کہتے جاسکا کہیں اور انہیں پاس رکھا جاتا ہے یہ ہے کہ [illegible] صاحب کے متعلق ایک مضمون شائع کیا تھا ... کے متعلق ایک خط میں لکھتے ہیں:

> "کاش ... غالب بہت سے متعلق نہ لکھتے۔ آخر انہیں یہ مضمون لکھنے کی کیا ضرورت تھی ... خصوصاً ہندوستان کی حکومت انتقال پر ... وقت سے فائدہ ... میں ... جو ایک عذر بھی ہے ... یہ خود مدیر کی صحت و تحقیق کا تقاضا ہے۔"

غالب کی تحریروں کا ماس ... ہے جب بھی ... پر مضامین لکھتے ہیں ... بھی ... بہت ایسی ہی واقعہ ہوتے ہیں ... کسی مسئلہ پر اختلاف کیا تو انہوں نے بھی ... تو پھر سے ... اپنی رائے میں تبدیلی بھی کر لی۔

ڈاکٹر صاحب کے دوسرے ایڈیشن کا ایک نسخہ انہوں نے قاضی عبدالودود صاحب کو بھیجا اور ان سے ... مسلول تبصرہ معاصر میں شائع ہوا۔ تبصرہ بھی ... بعد بھی ... کے تحقیقات ... اسی طرح غالب ... ناظم ... کے ... پر ... صاحب نے بعض امور سے اختلاف کیا ... بعض باتوں پر ... سکے لیکن بعض غلطیاں انہوں نے فوراً ... اس کی تصحیح کر دی۔

... میں نفاست اور سلیقے سے ... قائل ہیں ... صاف ستھرے مکان میں رہتے ہیں ... آپ ... پائیں گے۔ بہت اچھے کاغذ پر ... خط لکھتے ہیں ... اپنی کتابیں اور مضامین صاف ستھرے ... چھپواتے ہیں ... کی مطبوعات بھی ... صاف ستھری دیکھنی چاہتے ہیں۔ ... غالب نمبر کے مطالعے کے بعد انہوں نے مجھے لکھا:

> "غالب نمبر کچھ ... موصول ہوا ... شکریہ ... یہ آپ نے کیا ... کاغذ ... معشوق ہر حال معشوق ہے لیکن ... کے مطابق نہ ہو تو ... ہو جاتی ہے۔ یہی بات ... نمبر پر صادق آتی ہے۔ اتنی محنت سے مضمون جمع کیے، اتنا خرچ کیا اور ... کاغذ ... کر دیا ہے۔ یقین ہے کہ آپ نے کچھ نسخے نسبتاً اچھے کاغذ پر بھی شائع کیے ہوں گے۔ اگر میرا گمان صحیح ہو تو ایک نسخہ اس کا مرحمت ہو۔"

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

> "کتابت کی غلطیاں اتنی ہیں ... اور کیفیت کے لحاظ سے ... حیرت ہوتی ہے۔ ... کتابت میں یکسانی بھی نہیں رہ سکی۔ رنگدار بلاک ... سب مخدوش ہو گئے اور انہیں پڑھنا تک محال ہے۔ یہ آپ کو سوجھی کیا! آخر انہیں سرخ رنگ میں چھاپنے سے فائدہ ہی کیا تھا۔ جتنے بلاک کالی روشنائی میں چھپے ہیں بالکل معقول ... ہیں۔ ایسے ہی دوسرے بھی چھاپ دیے ہوتے۔"

اپنا مضمون ... رسالہ اردو ادب میں دیکھ کر لکھتے ہیں:

> "اردو ادب کے دونوں پرچے اور میرے مضمون کی دوسری قسط کے دس نسخے موصول ہوئے۔ ... شکریہ ..."

[illegible] سے [illegible]
[illegible] کے ہیں:

بھائی صاحب [illegible]
[illegible]
دوسری ایک جگہ مرزا الفاظ سے کہا گیا ہے۔ [illegible]
بنا دیا جائے۔ [illegible]
[illegible] ڈھنگ [illegible]

ایک جگہ یوں ہی [illegible]:

میں نے اپنے پچھلے خط میں اپنے مضمون سے متعلق [illegible]
گزارش [illegible]
[illegible] اور لکھنؤ میں [illegible]

وہ [illegible] ڈھنگ [illegible] جیسے آپ سے [illegible]
[illegible] اسے کام [illegible] لیں گے"

جب ان کا مضمون [illegible] پہنچتا تھا تو [illegible] پر خاص [illegible] غالب کی [illegible] دیکھا جائے حضرت کی [illegible]
[illegible] جیسے ۹، ۱۱، ۱۳ وغیرہ [illegible]
[illegible] لکھے جائیں۔ اس [illegible] وغیرہ۔

خط و کتابت میں باضابطگی پر بہت زور دیتے ہیں۔ جواب میں تاخیر ہو تو غضب ہو جاتا ہے:

[illegible] خطوں میں [illegible] زیادہ [illegible] کسی بات
نہیں ہوتی کہ کوئی خطوں کے جواب نہ دیں

ایک مرتبہ ان کے ایک خط کے جواب میں مجھ سے تاخیر ہوئی۔ انہوں نے فوراً لکھا:

میں نے اتنے دن آپ کو خط نہیں لکھا اس کی دو وجہیں تھیں۔ اول تو یہ کہ میں اپنے شغل [illegible] کی [illegible] کے
انتظار میں رہا، دوسرے یہ کہ میں نے خیال کیا کہ میرا خط کہیں بار خاطر نہ ہو [illegible] جب کوئی مجھے [illegible]
میرے خط کا جواب نہیں دیتا تو غلط یا صحیح مجھے یہ خیال گزرتا ہے کہ میں مخل اوقات و مخل مصروفیت ہو رہا ہوں۔

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

بھائی   آج یہاں عید ہے اس لئے عید مبارک کہتا ہوں۔ آپ کے وہاں تو غالباً کل ہوگی۔ بار خاطر
ہوں بار خاطر نہیں بننا چاہتا۔ آپ نے اتنے دن خط نہیں لکھا میں نے بھی مخل صحبت ہونا پسند نہ کیا۔

خطوط کثرت سے لکھتے ہیں اور بڑے شگفتہ انداز میں، چند ٹکڑے دیکھئے:

آپ سنیے لطیفہ۔ آپ نے اپنے آخری خط پر پتہ لکھا۔ عربی میں [illegible] البرید [illegible] الاسکندریہ اور مصر تک
آپ کے وہاں ڈاک خانہ والے [illegible] کر دیا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ کسی افسر اعلیٰ سے استصواب

لیکن اس حال میں بھی شعر لکھتا رہا Try Barred بیٹھا ہوں کے ملے اور ... [illegible]
کتابوں کے بہت چھوٹے سے بستہ پہنچا گیا۔ وہاں آخر عنوان بیہ حال ہے میں نے دو ان کا ... [illegible]
سکتے ہیں یہ ہو بہو اس کی۔ بلکہ یقین ہے کہ آپ دیکھ کر لیں گے کہ یہ حضرت اس قدر ستائش کے مستحق ہیں
جو بہت کم ہیں جنہوں نے قبول کیا ذکر شکل کو کتابی ترتیب دی۔ غالب کو دلی کی طرح میں داخل کیا تھا لیکن
عزت اسی طرح ہے کہ آئندہ ہمیشہ انگریزی میں لکھا جائے۔
اس مقالہ پر انہیں کچھ ہے جو ڈاکٹر ایسٹ ... [illegible] ایک خط میں لکھتے ہیں:

"کاش کہ آپ میری موجودگی میں یہاں آتے تو جو ... [illegible] لیکن آپ نے ... [illegible]
سبب کیا ہے کہ یہاں پر چھوٹے سامان ہو رہے ہیں۔ ... [illegible] کے بعد ... [illegible]
ہی ہے جیسے کسی نے ... [illegible] بھیجے ہیں سب بنارس میں۔ قیام کے خرچ سے متعلق کیا لکھوں۔ میرے
خیال میں ... [illegible] سو روپے ماہانہ میں اچھا خاصا چل سکتا ہے بشرطیکہ آپ قیمتی سامان خریدنا شروع
کر دیں۔ پھر ہم ... [illegible] نہیں کرنے دیں گے۔ اگر آپ فیصلہ کر لیں کہ ... [illegible] آنا چاہتے ہیں تو
ممکن ہے کہ میں بھی آپ کی حکومت میں کچھ مدد کر سکوں۔ یہاں کچھ ... [illegible] لیکن آپ کا یہاں آنے
سے مقصد کیا ہے۔ اگر غالب اور دوسرے کلاسیکوں کی سیر طلب ہے تو یہ واقعی معقول بات ہے
لیکن اگر آپ چاہیں کہ یہاں آکے کچھ کام کریں تو مجھے اس کا یقین نہیں۔ لکھنے کو ملی ... [illegible]
لیکن کیسی عربی! مجھے یقین ہے کہ آپ ان کی ... [illegible] عربی ... [illegible] گے۔ ... [illegible]
... [illegible] چھوٹے بڑے عالم و جاہل ... [illegible] البتہ لکھتے ... [illegible]
ہیں... ہاں کتب خانوں کی بات دوسری ہے۔ ایسی ایسی نادر کتابوں کے قلمی نسخے پڑے ہیں کہ
دیکھنے سے دل ... [illegible] ہو جائیں۔ لیکن ... [illegible] افسوس ہے کہ ان سے استفادہ کرنے والا کوئی نہیں۔
اگر آپ کو سیر کا شوق ہو تو ضرور تشریف لائیے ...

مرغ دل قفس کو چھوڑ کر اے شاد یہ کہتا جاتا ہے
آتا ہے جو تم کو آ جاؤ ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم"

میری یورپ سے واپسی کے وقت وہ دہلی میں مقیم تھے۔ ان کا خط آیا کہ دلی ہو کر جاتے وقت مجھ سے ملتے ہوئے جانا۔ میں نے انہیں راستے ہی
سے تار دیا اور دلی کی آمد کے وقت سے انہیں مطلع کیا ہے۔ میرے جہاز کے پہنچنے سے پہلے وہ دلی کے ایروڈروم پر موجود تھے۔ جب تک کسٹم وغیرہ
کے جھگڑے نہ چکے وہ انتظار میں کھڑے رہے۔ گھر پہنچ کر ڈرائنگ روم میں بیٹھے۔ ان تمام کتابیں اور رسالے اٹھے پڑے تھے۔ کچھ یورپ کی داستان
سنی، کچھ مل ایسٹ کا تذکرہ رہا۔ زیادہ تر وہ میرے علمی کاموں کے متعلق پوچھتے رہے۔ پھر ان اساتذہ کے متعلق جن سے یورپ میں ملنے ملانے کے مواقع
ملے۔ پھر ہندوستان سے بات دہلی تک پہنچی۔ شاعر انقلاب کی ہجرت، ... [illegible] صاحب کی "خلافت" کا ذکر ہوتا رہا۔ پھر ذاکر صاحب سے ملاقات کا
حال اور انجمن ترقی اردو کی داستان سناتے رہے۔

کھانے کے بعد ہم لوگ صرف غالب پر گفتگو کرنے بیٹھے اور ہم دونوں نے ایک وقت پوچھنا اور سنانا شروع کیا کہ غالب کے متعلق اب تک کیا
نئی اطلاعیں ہم لوگوں نے حاصل کی ہیں۔ کیا کیا نئے خطوط اور تحریریں ہم لوگوں نے دستیاب کی ہیں اور کیا کیا نئی کتابیں مرتب کرنے اور شائع کرنے کے

[illegible] حکومت [illegible] باتیں [illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible] ایک [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

آپ نے بھی تو یہ نام [illegible] مسلمانوں کی [illegible] صاحب

[illegible] دہلی [illegible] شاہ [illegible]

[illegible] شاہ [illegible]

اس وقت [illegible] مرحوم [illegible] ان کا تعلق [illegible] خاندان [illegible] ہے۔

اگر [illegible] مسلمانوں سے [illegible]

مولوی [illegible] مولوی [illegible] پرشاد کی طرح [illegible] ہو جائیں گے۔

احسان دانش

محمد وارث کامل

علم و فن کی ہنگامہ خیز راہوں میں شہسواروں کی جو ٹولیاں رہی ہیں جو اپنے اسلاف کے نقش قدم پر اس شان سے چلتے ہیں کہ ان کی انفرادیت نے منزل کے کسی موڑ پر بھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑا ——— یہ ہے وہ سوکھ [illegible] پر شک میں [illegible] (۱۹ [illegible] نے ہے [illegible] تھا۔ دوسری نظر میں انفرادیت ہی ایک ایسا جوہر ہے جس کے [illegible] میں کسی شخص کی عظمت کے خدوخال نظر آ سکتے ہیں۔ تاریخ کے صفحات پر جن شخصیتوں کے نقوش کچھ ابھرے ہوئے سے دکھائی دیتے ہیں یہ وہی منفرد شخصیتیں ہیں۔ جو زندگی کی تیرہ و تار راہوں میں ہر قدم پر روشنی کے مینار نصب کرتی رہی ہیں۔ ہر دور میں ایسی شخصیتوں کا سراغ ملتا ہے۔ لیکن کچھ تو زمانے کی قدر ناشناسی کے باعث اور کچھ اس سبب سے کہ قدرت اپنے ہر کرشمہ کی نمائش کے سلسلے میں کچھ زیادہ بیاض واقع نہیں ہوئی ہے۔ ایسی شخصیتیں جہاں کہیں اور جب کبھی منظر عام پر آتی ہیں تو اتنے پردوں میں لپٹی ہوئی آتی ہیں کہ عوام کی اچٹتی نگاہیں ان شخصیات کے ان خلوت کدوں میں باریابی پا سکیں جہاں کمالات کے دفینے گڑے ہوئے ہیں

آج جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ احسان دانش کی تاریخ ساز شخصیت کا جوہر ہنگامہ خیز جلوتوں کے باوصف راز درون پردہ ہے تو میں کبھی کبھی ششدر رہ جاتا ہوں۔ میری حیرت میں کچھ اور اضافہ ہو جاتا ہے اس چیز سے کہ آسمان شہرت کے اس کوکب درخشاں کی تابانیوں پر ظلمتوں کے اتنے غلاف چڑھے ہوئے ہیں کہ اس کے حاشیہ نشین بھی کبھی اسے عریاں نہیں دیکھ سکے۔ احسان دانش کی پراسرار شخصیت دراصل نتیجہ ہے عوام کے ذوق تجسس میں کمی کا۔

احسان دانش کا منفرد کردہ اس دور کا انسان ہے جس دور میں مغز و پوست، عرض و جوہر، صورت و حقیقت، لفظ و معنی اور روح و مادہ ایک ہی پیمانے سے ناپے اور ایک ہی ترازو میں تولے جاتے ہیں۔ اس دور میں سطح پر تیرتے ہوئے خاشاک کی تو قدر و قیمت ہے لیکن اگر وقعت نہیں تو اس گوہر شب چراغ کی نہیں جس کے دامن میں دریا کا اضطراب بھی محو ہو جاتا ہے۔

احسان دانش کے بارے میں اتنا تو سب جانتے ہیں کہ یہ کاندھلہ (مظفر نگر یو پی) کا ایک شاعر مزدور ہے۔ ایک ایسا شاعر جس نے افلاس کی گود میں آنکھیں کھولیں اور ۱۹۱۳ء کی اس جنگ عظیم کے پر آشوب ایام میں سفر حیات شروع کیا۔ جس کے شعلے مشرق سے مغرب تک

[illegible] ہندوستان [illegible] فی الحال ادھر [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] شروع [illegible] زندگی [illegible]

[illegible] حالت [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] پہلے [illegible]

[illegible]

پھر بھی سوچ رہے ہیں کہ کیا کیجیے

اصل دنیا احسان دانش سے متعارف [illegible] احسان [illegible] کے شعرا [illegible] ہوتا ہے [illegible] نظم و نثر میں [illegible] [illegible] متعلقات [illegible] [illegible] احسان کے وہ اصل کارنامے ہیں [illegible] ترقی پسند شعرا [illegible] زندگی کا شاعر سمجھتے ہیں اور یہ اس لیے کہ احسان دانش نے اپنی اور دوسروں کی زندگی سے [illegible] ترقی پسند شعرائے ادب کی تحریرات سے مل گئے ہیں [illegible] اصلاحی، تعمیری اور اخلاقی ادب کے علمبردار ادیب و شاعر بھی احسان کو اپنے رنگ کا شاعر سمجھتے ہیں [illegible] احسان کے کلام کا غالب عنصر اصلاح، تعمیر، اخلاق اور انسانیت کے موضوعات ہیں۔

رجعت پسند شعرا جن کا اوڑھنا بچھونا ادب برائے ادب ہے، احسان دانش کے کلام پر اس لیے رشک کرتے ہیں کہ اس نے اُردو ادب کو ایسی اچھوتی بندشیں، ایسے انوکھے استعارات اور ایسی نرالی تشبیہات دی ہیں [illegible] کے شعرا اور اساتذہ مجتہد شاعر بھی خراجِ تحسین ادا کریں تو تھوڑا ہے۔ عوام احسان دانش پر اس لیے جان چھڑکتے ہیں کہ ان کے اشعار میں خود ان کی زندگی بول رہی ہے۔ ایسے ان پڑھ لوگ جو احسان دانش کے سیدھے سادے شعر بھی نہیں سمجھ سکتے ان پر احسان کے چہرۂ [illegible] کا جادو چل جاتا ہے۔

دیکھنے میں آیا ہے کہ احسان دانش کے پاس ہر مکتبۂ خیال اور ہر مدرسۂ فکر کے ادیبوں، شاعروں، صحافیوں، مصوروں اور فن کاروں کی نشست و برخاست رہتی ہے۔ زندگی کے دوسرے شعبوں سے تعلق رکھنے والے حضرات بھی آتے جاتے رہتے ہیں۔ ملاقاتیوں کا تانتا صبح سویرے سے لگتا ہے اور کافی رات گئے تک یہ سیلاب ختم نہیں ہو پاتا۔ پہلے پہل جب مجھے ملاقاتیوں کا یہ بے پناہ ہجوم دیکھنے کا اتفاق ہوا تو مجھے یہ خیال آیا کہ احسان صاحب کی یہ کمتی فوج بڑے بڑے معرکے سر کرتی ہوگی اور آڑے وقت میں اس فوج کے سپاہی اپنے سپہ سالار کے ساتھ ہر قسم کا تعاون بھی کرتے ہوں گے۔ لیکن چند ہی روز کے تجربے نے مجھ پر یہ حقیقت منکشف کر دی کہ [illegible]

خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم

مجھ پر یہ راز آشکار ہو گیا کہ اس کمی زیع کے بعض سپاہیوں کا ان سے بھی کی نسب سالاسے [illegible] احسان صاحب کے [illegible] ایسے [illegible] تعداد ان لوگوں کی ہوتی ہے جو کسی نہ کسی مقصد یا کسی نہ کسی غرض سے آتے ہیں اور جب تک ان کی غرض پوری نہیں ہو جاتی احسان صاحب کے سر پر آسیب کی طرح سوار رہتے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ احسان صاحب ہر ملاقاتی سے خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آتے ہیں اور پہلی ہی ملاقات میں کچھ اس بے تکلفی کے ساتھ باتیں کرنے لگتے ہیں [illegible] اجنبیت و غیریت کا احساس نہیں ہونے پاتا بلکہ یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ ملاقات برسوں پرانی ہے [illegible] کے پیچھے اصرار کے باوجود بھی یہ کبھی نہیں ہوتا کہ احسان صاحب انہیں اپنے کلام سے بھی محفوظ فرمائیں۔ خود بھی کوئی نہ کوئی شعر سنانے پر تیار ہو جاتے ہیں [illegible] شائع کرنے میں انہیں مطلق کوئی تامل نہیں ہوتا۔ اگر کوئی جعلساز ہو تو بعد پر معلوم ہوتا ہے تو پہلے روائتی [illegible] زمین چھوڑ دیتے ہیں۔ [illegible] مرض کے [illegible] دھن [illegible] پڑھتے [illegible] عاشق ہے [illegible]

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کراچی سے ایک [illegible] کے عادی صرف [illegible] احسان صاحب سے ملنے آئے۔ احسان صاحب سے [illegible] کا عام قاعدہ ہے [illegible] تو اضع [illegible] شعر [illegible] ہے جب انہوں نے کسی غزل یا غزل [illegible] کی تو [illegible] کے گرویدہ ہو گئے [illegible] بھی [illegible] احسان صاحب [illegible] نے اس [illegible] کی خاطر احسان صاحب [illegible] مجھ [illegible] تسلی [illegible] حسن [illegible]

بے [illegible] جو [illegible] کہاں [illegible]

[illegible] گئے [illegible] نہیں ہے

احسان صاحب کو [illegible] بہت قریب سے دیکھنے سے ان کی معلومات کا حاصل [illegible] صاحب [illegible] نہیں۔ البتہ ۱۹۲۵ء میں انہوں نے پرائمری کا امتحان [illegible] پاس کیا [illegible] میں احسان صاحب نے قرآن پڑھا اور ایک [illegible] حافظ محمد مصطفےٰ سے پڑھا۔ پرائمری میں جب یہ زیر تعلیم تھے تو انہیں منشی عبدالرحیم صوفی آبادی کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ یہ مرحوم مذکر استاد بھی اچھا خاصا علمی ذوق رکھتے تھے۔ قاضی محمد ذوقی صاحب [illegible] کی ہی صوفی کی توجہ سے احسان صاحب کے دل میں شعر گوئی کا ولولہ پیدا ہوا اور یہ ولولہ کچھ اس انداز کی تھی کہ اس کی بدولت ان کی [illegible] کے آگے [illegible] ذہنی [illegible] سے پردے سرکتے چلے گئے اور یہاں تک کہ ایک وقت آیا جب [illegible] جو ہر قابل کی نکھار کے لئے تربیت [illegible] ساتذہ [illegible] عبارتوں سے اور کبھی [illegible] زبان سے تشفی کر لیتے۔ احسان صاحب نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں خواجہ عزیز الحسن مجذوب کی آنکھیں دیکھیں۔ یہ شاعر بھی تھے اور صاحب دل مجذوب سالک بھی۔ ان کے اشعار میں بلا کا تیکھا پن ہوتا تھا۔ احسان صاحب پر ان کی نظر پڑی تو آنکھوں آنکھوں میں حریف مئے مردافگن عشق بنا دیا۔

اسی دور میں شمس العلماء علامہ تاجور نجیب آبادی نے ان کے اندر زبان و بیان کی شوخیاں سمو دیں۔ ان کی صحبت کا سب بڑا اثر احسان صاحب کی شاعری پر یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ ان کے کلام کو شرف قبول کی سند مل گئی۔ لطف ادا، شوکت الفاظ، جودت فکر، معاملہ بندی اور نفز گفتاری کے جو محاسن احسان صاحب کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ ان پر بہت بڑی حد تک تاجور کے حسن نظر کی چھاپ ہے علامہ تاجور احسان صاحب سے کافی محبت کرتے تھے اور ان کے ہر قسم کے ناز نخرے بھی سہتے تھے۔ احسان صاحب علامہ تاجور سے کچھ اتنے بے تکلف ہو گئے تھے کہ بعض اوقات خود ان کے منہ پر انہیں کھری کھری سنا دیتے تھے لیکن اپنی اس افتاد طبع کے باوصف احسان صاحب نے فرق مراتب کا لحاظ ہمیشہ رکھا۔ اگر کبھی کسی نے احسان صاحب کی موجودگی میں علامہ تاجور کے خلاف زبان کھولی تو پھر ان سے رہا نہیں گیا۔

[illegible]

[illegible]

کہ جب میں کسی کا یہ شعر پڑھتا ہوں

[illegible]
[illegible]

احسان صاحب بہت دھن کے پکے اور [illegible]
غرض ہم دونوں [illegible] کچھ ستاروں کی جھرمٹ میں چاند کی چاندنی دعوت نظارہ دے رہی تھی۔ مولانا مودودی نے مسکراتے ہوئے [illegible] میں نے احسان صاحب کا تعارف کرایا تو مولانا [illegible] دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اچھا ہوا یہ ملاقات آج ہو گئی۔

باتوں باتوں میں جوش کا موضوع چھڑ گیا۔ احسان صاحب شعر سے [illegible] کے بزرگ اس موضوع پر حاصل تبصرہ کیا کہ سامعین (جن میں مولانا نصر اللہ خاں عزیز بھی شامل تھے) اور خود مولانا مودودی انگشت بدنداں رہ گئے

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے
ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

علامہ سید سلیمان ندوی سے احسان صاحب کی ایک ملاقات بڑے عجیب عنوان سے ہوئی تھی۔ احسان صاحب اور علامہ دونوں ٹرین میں سفر کر رہے تھے اور بیٹھے بھی تھے پاس ہی پاس۔ لیکن نہ معلوم احسان صاحب کن خیالات میں ڈوبے ہوئے تھے کہ انہیں علامہ کی موجودگی کا احساس بھی نہ ہو سکا۔ علامہ نے خود ہی مہر سکوت توڑی اور بولے، احسان صاحب، آخر اس نیازمند سے کیا خطا سرزد ہو گئی ہے کہ اسے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا جا رہا۔ احسان صاحب یہ ان بولتے ہوئے نقوشِ سلیمانی کو اٹھا کر فوراً باادب ہو بیٹھے اور پہلے معذرت

کے انداز میں صبر و ہدایت سے خلق کے ساتھ عہد سے معروف ہو سبب ۔ [illegible]
[illegible] تو عہد رخصت ہونے لگی اس عالم میں کہ ہو مسلسل بارش ہو رہی تھی ۔ عہد نے اپنے سر پر چادر ڈال لی اور ان کو [illegible]
لیا ہوئے ہوں کمال ہنسی تمام عہد سے حالی اور پھر یہاں عمارت جا پہنچتی ہے جس [illegible] کا [illegible]
حفاظت کا یاد رہا [illegible] کی یاد تازہ کر رہا تھا ۔ اور ہوں کی شخصیت دنیا کو یہ پیغام دے رہی تھی کہ

بے جی ہی کچھ ہے جہاں میں مسافر
دنیا کے تو عمر کو جو عالم میں نہ دیکھیں

مولانا عبد الماجد دریابادی کے احسان صاحب سے بچپن سے مراسم تھے پچھلے دنوں جب مولانا عبد الماجد دریابادی کی وفات
ان صاحب سے نہ ہو سکی مولانا کو اس پیر کا ملال رہا ۔ چنانچہ جس سے اپنی سرگزشت اور بعض خصوصیت کے ساتھ یہ لکھا کہ دو بڑی
شخصیتوں سے دل ملنے کی حسرت رہ گئی ان میں ایک حضرت احسان دانش ہیں اور دوسرے ڈاکٹر [illegible] ۔ مولانا
کی ناتوانی بڑھتی سے دعا و فضلا پہنچے ہیں اور شعروادب یکن یہ احسان صاحب کی خوش قسمتی ہے کہ وہ نہیں اس [illegible]
میں اور جب بھی ان سے ملے تو بڑی محبت و خلوص کے ساتھ ملے ہیں

مولانا شبیر احمد عثمانی بڑی ہمت اور شخصیت کے مالک تھے علوم عربیہ میں ان کو کمال حاصل تھا ۔ ان کی احترام خود مصر کے علماء
صحیح مسلم کی شرح اور دوسری علمی تصانیف ہیں مولانا سے ان کو بھی کے ساتھ ہے کہ ان کے ساتھ رہا ۔ مولانا تحریر و تقریر دونوں میں یکساں ملکہ رکھتے تھے
ان صاحب کی جب ان سے پہلی ملاقات ہوئی تو مولانا نے کلام کی فرمائش کی ۔ احسان صاحب نے [illegible] ایک تازہ نظم
شروع کر دی ۔ ایک تو نظم میں خود ان سے پہلے شعر پر ذوق کا عالم اور پھر اس پر مستزاد یہ کہ احسان صاحب کے گلے کا سوز بھی
[illegible] دیتا ہے مولانا شبیر احمد عثمانی پر رقت طاری ہو گئی اور شعر کے ختم تک یہی کیفیت رہی ۔

یہ تو یاد نہیں پڑتا کہ احسان صاحب کبھی مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی سے بھی ملے ہیں یا نہیں ، البتہ یہ بات ضرور ہے کہ مولانا
احسان صاحب سے اچھی طرح متعارف تھے ، احسان کے کلام سے بھی ۔ مولانا نے ایک دفعہ [illegible] کے موضوع پر منعقدہ ایک
جلسے میں تقریر کی تو ان کی زبان پر احسان صاحب کا یہ شعر بار بار آیا ؎

اس قدر کردوں گا مادر کی محبت کو بلند
دل کے ٹکڑوں کو شہادت کی دعا دینی پڑے

بہاول پور کے ایک عالم دین مولانا احمد یار بہاول پوری کسی بزم سماع میں شریک تھے قوالوں نے احسان صاحب کی ایک مشہور غزل
شروع کر دی جب وہ اس شعر پر پہنچے ؎

زخم پر زخم کھا کے جی اپنے لہو کے گھونٹ پی
آہ نہ کر لبوں کو سی عشق ہے دل لگی نہیں

مولانا پر اس بلا کی وجدانی کیفیت طاری ہوئی کہ جان بحق تسلیم ہو گئے ۔

اوپر کی سطروں میں جو کچھ میں نے تحریر کیا ہے یہ احسان صاحب کی زندگی کا عریاں پہلو ہے اس پر تھوڑی بہت واقفیت کے بعد ہر
شخص کچھ نہ کچھ روشنی ڈال سکتا ہے لیکن ان کی وہ خصوصیات جن پر ابھی ابھی پردے ہیں کہاں کسی کے علم میں آ سکتی ہیں ۔ میں اس مضمون کے آخری حصے
میں نقاب کشائی کا یہ اہم فریضہ سر انجام دینے کی جسارت کرتا ہوں ۔

[illegible] حضرت احسان دانش صاحب . جیسا ہوں . بہائی صاحب مجھے بھی اپنی دانست میں [illegible] ہیں [illegible] ہے کہ بہت کم لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ احسان صاحب کا اصل نام قاضی احسان الحق کاندھلوی ہے . ان کے [illegible] قاضی [illegible] کے [illegible] تھے اور ان ذوق سلیم کا نمونہ خود احسان صاحب ہیں . احسان صاحب [illegible] کے [illegible] ہیں اور [illegible] مجاب [illegible] باغ و بہار وغیرہ [illegible] کر [illegible] تھے [illegible] کے دوسرے بزرگ بھی ذوق سماعت کا نمونہ تھے [illegible] ہیں [illegible] احسان صاحب کے نام کے سلسلہ میں ایک عجیب لطیفہ [illegible] احسان صاحب کے [illegible] شاگرد ہیں ۔ احسان صاحب کی موجودگی میں کہ حضرت صاحب اگر خود چاہیں تو قاضی احسان الحق کاندھلوی کے شاگرد ہو جائیں کو بہت خوشی سے [illegible] ۔

حضرت صاحب [illegible] قاضی [illegible] نے بہت سے دیکھے ہیں ۔ [illegible] قاضی [illegible] شعر میں [illegible] شعر [illegible] تعلیم دے سکتا ہوں ۔

میں نے نہایت متانت کے ساتھ کہا ۔ [illegible] بات تو [illegible] آپ میرے [illegible] احسان صاحب کی طرف [illegible] ہوگئے ، ایک دو سیکنڈ کی دیر مجھے [illegible] ۔ [illegible] حضرت صاحب پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ احسان دانش ہی قاضی احسان الحق کاندھلوی ہیں تو ان پر گھڑوں پانی پڑ گیا

۲ . احسان صاحب کا شجرۂ نسب شیخ [illegible] ۔ [illegible] سے اور شیخ کا سلسلہ حضرت ابو بکر صدیق ہم تک پہنچتا ہے ۔ اس نسب اور اس نسبت سے احسان صاحب شیخ صدیقی ہوتے ہیں ۔ [illegible] قصبہ [illegible] یو ۔ پی کے [illegible] سنہ [illegible] میں [illegible] سے ہندوستان کو اپنے علوم و فنون سے فیض یاب کر رہے وہ خاندان ہے جس کے [illegible] خواجہ شہاب الدین سہروردی کی سلسلۂ سہروردیہ [illegible] امام سعد [illegible] ہیں جن کے مشہور محدث قطب جندی نے [illegible] کیے ۔

قاضی [illegible] ربانی [illegible] سلسلہ چشتیہ خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی کے پیر بھائی ہوئے ہیں ۔ [illegible] سے اکبر کے دین الٰہی کی شدید مخالفت کی تھی ۔ [illegible] سلسلۂ قضاۃ کے [illegible] سے تھے ۔ قاضی شہاب الدین [illegible] علوم دینیات میں حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے شاگرد اور [illegible] اور میر درد ، سودا کے ہمعصر شاعر باکمال تھے ۔ اسی سلسلہ کی [illegible] ہیں تذکرۂ طبقات الشعراء میں قدرت اللہ شوق نے ان کا تذکرہ کیا ہے ۔ مولوی محمد حسین عرقی جو شوق دہلوی کے شاگرد اور صاحب دیوان شاعر ہوئے ہیں ، اپنے زمانے کے باکمال بزرگ تھے ۔ ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم بھی اس باغ و بہار خاندان کے گل [illegible] ہیں ([illegible] صدیقی کنٹرولر پاک ملٹری اکاؤنٹس مرحوم ڈاکٹر بجنوری کے داماد ہیں) میر و سودا کے معاصر قائم چاندپوری بھی قاضیوں کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں ۔ یو ۔ پی کے وزیر حافظ محمد ابراہیم اور مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی بھی اسی خاندان کے [illegible] ہیں ۔ مختصر یہ ہے کہ احسان صاحب یعنی قاضی احسان الحق کاندھلوی جو آج کل شاعری کے پردے میں چھپے ہوئے ہیں ایک ممتاز اور علم پرور خاندان کے فرد ہیں ۔

۳ ۔ احسان صاحب کی شخصیت ایک چیستان بن کر رہ گئی ہے اور وہ اس لئے کہ یہ نہ صرف خلق بلکہ خلقی اعتبار سے بھی مجموعۂ اضداد واقع ہوئے ہیں ۔ احسان صاحب شاعر بھی ہیں اور اس کے ساتھ ہی ناشر بھی ہیں ، ادیب بھی ہیں ۔ لیکن ایسے ادیب کہ ان کے ادب پر نقد و نظر کا خول چڑھا ہوا ہے ۔ کبوتر بازی کا چسکا بھی ہے اور حسن پرستی کی لت بھی ۔ بنوٹ بھی ہیں اور گھر یلو بھی ، طب ، تصوف ، اسلامیات فلسفہ ، نفسیات ، سائنس ، انسانیت سے متعلق جو ذخیرۂ علم و ادب ہے اس پر بھی ان کی دسترس ہے ۔ ان کی پوری زندگی کردار ہی کردار

[illegible] ان کا بیشتر وقت [illegible] کے [illegible] وقت [illegible]
[illegible] مرنے [illegible] خوریکی ذوق [illegible] کی زندگی [illegible] سوسائی کی [illegible] ایک دو بار
[illegible] احسان صاحب [illegible] گزشتہ سالوں میں احسان صاحب کو [illegible]
[illegible] احسان صاحب کی [illegible] احسان صاحب [illegible] ۔ [illegible] میں صاحب نے [illegible] کی بھی [illegible]

احسان صاحب [illegible] ہو چلے [illegible] کے [illegible] احسان [illegible] کسی [illegible] بھی [illegible] احسان صاحب [illegible] کا [illegible] احسان صاحب [illegible] اور جس [illegible] چاہے [illegible] باتیں کرتے کرتے احسان صاحب [illegible] بھی کچھ پایا ہے سب [illegible] کوئی کام نہیں کر سکا [illegible] ۔

[illegible] آسمان [illegible] ہوتا ہے
[illegible] وقت خالی [illegible] جاتی ہے

احسان صاحب کی زندگی [illegible] سادہ [illegible] ملک کسی تجارت میں کامیاب نہیں ہوئے [illegible] قرض [illegible] جس سے بظاہر ان کی معاشی زندگی [illegible] مکتبہ دانش [illegible] لفظوں میں [illegible] کی شکست [illegible] ۔ مکتبہ دانش کی [illegible] ہیں۔ اس لیے کہ دیکھنے میں آیا ہے کہ اکثر کتابیں [illegible] دانش [illegible] دیے جاتے ہیں۔

۴۔ جیسا کہ میں نے کہیں وسط مضمون میں کہا ہے کہ احسان صاحب [illegible] کی مزید وضاحت اس سے ہو سکتی ہے کہ جب سے ان کا باطنی رابطہ حضرت حافظ تفضل حسین [illegible] سے قائم ہوا ہے ان کی زندگی اصحاب صفہ کی سی زندگی بن گئی ہے۔ زمین یا تخت پر سوتے ہیں۔ صرف ایک وقت کھانا کھاتے ہیں۔ اور وہ بھی بہت سادہ۔ ہر جمعرات کی صبح کو گورستان میانی جاتے ہیں۔ اور گھنٹوں مخصوص انداز میں نا تو خواں رہتے ہیں۔ شام کے وقت حضرت داتا گنج بخش رح کے مزار پر بلا ناغہ حاضری دیتے ہیں۔ احسان صاحب کا عقیدہ یہ ہے کہ میں زندہ مزارات کی عظمت کا قائل ہوں۔ پختہ مزارات سے ہجوم سے مجھے نفرت ہے۔ عورتوں کے مزار بھی میرے نزدیک وقعت نہیں رکھتے۔

احسان صاحب [illegible] ہر شعر کے [illegible] ہیں۔ [illegible] بھی دوست [illegible] کسی سے [illegible] دشمنی [illegible] ہے [illegible] سے بھی دشمنی نہیں رکھتے [illegible] ان کا تعلق ہے۔ احسان صاحب [illegible] سب سے بڑی [illegible] شاعری [illegible] بہت سے [illegible] صاحب کی [illegible] شہرت کے [illegible] عالم [illegible] دوستی [illegible] [illegible] کا کہنا ہے [illegible] [illegible] [illegible] ہوں۔

[illegible]

احسان صاحب [illegible] ہوتے ہیں [illegible] تو [illegible] وقت آئے گا۔ احسان صاحب [illegible] کے باوجود [illegible] صاحب جو ہم سے ہمکلام ہیں وہ احسان [illegible]

ان کمزوریوں کے باوجود احسان صاحب بہت کچھ ہیں۔ [illegible] آج بھی ان سے مشورہ لیتے ہیں ان کے شاگردوں کی فہرست بہت طویل ہے

احسان صاحب کے تعلقات تمام شاگردوں سے دوستانہ ہیں [illegible] احسان صاحب کبھی کسی شعر کو اپنا شاگرد نہیں بتاتے اور جب ان سے اس کا سبب پوچھا جاتا ہے تو نظیری کا یہ شعر پڑھ دیتے ہیں ۔

طائرے نیست کہ از تار رهش بر پا نیست
صید یک مرغ نہ کردم رسن دام بسست

احسان صاحب اس قدر کی شاگردی اُستادی کے قائل نہیں اور وہ اس دور کے شاگردوں کی طرح رنگ بدلتے ہیں اور اپنی زندگی کے ہر موڑ پر ایک نئے اُستاد سے اپنا رشتہ جوڑ لیتے ہیں۔ اس دور میں کالجوں اور اسکولوں کی طرزِ تعلیم نے شاگردی کا معیار باقی رکھا ہے نہ اُستادی کا۔ جہاں وہ ہر سال کے بعد اُستاد بدلتے ہوں وہاں کیسی شاگردی اور کہاں کی اُستادی۔ شاگرد تو وہ ہوتے تھے جو عمر بھر کسی ایک اُستاد کے ہو رہتے اور نظر اُٹھا کر بھی دوسری طرف نہ دیکھتے۔ تاریخ میں ایسے شاگردوں اور ایسے استادوں کے واقعات ملتے ہیں جن کے رشتے اتنے مستحکم ہوتے تھے

کے دوڑ کے تمام حالات مرتب ہو چکے تھے۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے [illegible] ایک رسالہ [illegible] بھی [illegible]
تھا کہ وہاں سے دیوبند پر محبوبی کر اس سلسلہ کی خدمت بجا لائیں اور قوم و ملت کے خزانے ورثے کے [illegible] اور صاحب [illegible]
کر دیں، [illegible] کے [illegible] میرے خیال میں ان کا یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا۔

عبدالرزاق کانپوری

ابوالخیر مودودی

انیسویں صدی کے آخری دہائی کی یادگاروں میں تھے۔ ایسے ماحول میں پرورش پائی جس میں داستانیں، مرثیے، [illegible] تحفۂ چار درویش، تحفۃ العشاق [illegible] دفتری زندگی [illegible] سے بڑی شوق سے پڑھی جاتی تھیں [illegible] بیان میں داستان کی شان پیدا کر دیا۔ شعر کی آنکھ [illegible] ماحول میں [illegible] کے نئے تقاضے [illegible] تھے [illegible] کا ذوق تاریخ کے مطالعہ میں منتقل ہو گیا۔ طبیعت [illegible] بیچاروں کو اپنے مذاق سے [illegible] بنا لیا اور [illegible] مرحوم ہو گئے۔

ان کے آباؤ اجداد فرخ آباد (صوبہ متحدہ) کے رہنے والے تھے۔ [illegible] ہندوستان کے ہنگامے کے بعد ان کے والد منشی [illegible] نے کانپور کو وطن بنا لیا۔ نسباً فاروقی تھے۔ [illegible] زمانے کا اثر تھا [illegible] انگریزی [illegible] پڑھے [illegible] اور اپنے زمانے کے نامی گرامی [illegible] تھے۔ اس تقریب سے [illegible] کا مستقل [illegible] تھا

عبدالرزاق صاحب [illegible] پیدا ہوئے [illegible] سید تھے۔ فتح پور [illegible] آباد [illegible] ان کی زمینداری تھی [illegible] فتح پور میں ہوئی۔ وہیں مکتب پڑھا اور [illegible] وہیں سے ہوش [illegible] کہتے تھے، فتح پور میں ایک نامور [illegible] مولوی حسن علی تھے۔ انہوں نے بسم اللہ پڑھائی، پھر انہی کے مکتب میں فارسی عربی پڑھی۔ [illegible] ان کے فرزند مولوی ظہور الاسلام [illegible] قائم کیا تھا۔ [illegible] علاقے میں بڑے نامور اور [illegible] عالم تھے، جب ندوہ کی تحریک نے جنم لیا تو اس کے سرگرم [illegible] میں ان کو بھی شامل کیا گیا تھا۔ تحصیل [illegible] فارسی کے ایک ادیب منشی امام علی تھے۔ سکندر نامے تک ان سے فارسی ادبیات پڑھیں۔ عربی متوسطات سے فراغت پائی تھی کہ مولوی ظہور الاسلام صاحب نے اپنے مدرسہ میں فارسی، حساب اور ابتدائی درجے کی عربی پڑھانے کا کام سپرد کر دیا۔ والد نے یہ کہہ کر یہ تعلق منقطع کرا دیا کہ میں تم کو ملا بنانا نہیں چاہتا۔ اب [illegible] کانپور آ گئے۔ یہاں [illegible] سب [illegible] پڑی۔ چھ سات برس یہ مصیبت جھیلی، پھر [illegible] میں سررشتہ داری مل گئی اور دس برس تک کاروبار رہی۔ ان [illegible] میں منشی رحمت اللہ [illegible] کی ذات دلچسپی کا واحد سہارا تھی۔ اس [illegible] نے طبیعت میں شگفتگی پیدا کی۔ ندوۃ العلماء کے ناظم اول مولوی محمد علی صاحب مونگیری سے تھوڑی سی حدیث پڑھی، اور مدرسہ فیض عام

کے مجموعہ میں [illegible] حالی کی [illegible] میں [illegible] کی [illegible]
[illegible] کی تکمیل کا [illegible] کتاب [illegible] میں [illegible]
[illegible] کے [illegible]
[illegible]

ان دنوں [illegible] کے قصے [illegible] بیان کرتے [illegible] ایک [illegible] کے سامنے [illegible] کی آنکھوں کے سامنے [illegible] ان کی کوئی موجود نہیں۔ جب کوئی پرانی بات [illegible]

علی گڑھ تحریک سے بہت متاثر تھے۔ سید صاحب کے [illegible] اور ان کی [illegible] بڑے چھوٹے سب لوگوں سے ان کی [illegible] رہی تھی۔ تاریخی ذوق کی وجہ سے [illegible] علامہ شبلی [illegible] تھا۔ جب [illegible] علامہ شبلی [illegible] علی گڑھ میں [illegible] ان کے بیان [illegible] علامہ شبلی سے [illegible] سرسید کی خدمت میں بھی [illegible] سید کی ذات [illegible]۔ [illegible] میں لکھنؤ میں ایجوکیشنل کانفرنس کا دوسرا اجلاس تھا۔ [illegible] علامہ شبلی نعمانی نے مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم [illegible] پڑھ دیا۔ اس سے مجھ کو تاریخ اسلام کے مطالعے کا شوق ہوا۔ چند سال گزرے تھے کہ [illegible] سے حکیم محمد علی کا ناول "جعفر و عباسہ" نکلا [illegible] میں آیا کہ اس کی تردید میں ایک مضمون لکھوں [illegible] میں نے [illegible] شبلی صاحب کو بھی [illegible] علامہ شبلی [illegible] الانتقاد [illegible]

عبدالرزاق صاحب دم بھر کو خاموش ہو گئے۔ ذہن نے کچھ ڈھونڈنا [illegible] مجھ کو [illegible] جاہلانہ رسالے یاد آگئے۔ [illegible] علامہ شبلی نعمانی نے [illegible] تاریخ کا ذخیرہ [illegible] علوم سے استفادہ [illegible] تھے [illegible] یہ سب [illegible] لوگ کر رہے ہیں۔ [illegible] میاں تم لوگوں کا [illegible] میں [illegible] سید صاحب کی یہ بات سن کر میں زمین میں گڑ گیا ——— عبدالرزاق صاحب نے کہا: یہ مولانا شبلی صاحب کے جوہر کی بات تھی۔ [illegible] کوئی بھی جوہری [illegible]

میں نے بطور تفنن عرض کیا: [illegible] آپ نے بھی رسائل شبلی کے [illegible] میں پڑھا ہوگا! ——— خوش مذاقی ان کے چہرے پر لہرائی ——— مگر یہ فطری بات تھی۔ عبدالرزاق صاحب نے کہا: جب آدمی اندھیرے سے دوپہر کی تیز روشنی میں دفعتاً آئے تو چکاچوند ہی جاتا ہے!

الہلال کا مصنف اپنے اصلی قد و قامت سے زیادہ بلند بالا ہو گیا۔ دماغ نے اس کے لئے ایک جگہ [illegible] ——— [illegible] ان جگہوں کی [illegible]

لہ :- عبدالرزاق صاحب علامہ شبلی کو اکثر [illegible] کے ساتھ یاد کیا کرتے تھے۔

[illegible]

[illegible]

عبدالحلیم صاحب [illegible] اور مصنف [illegible] کی ادبی [illegible] بھی [illegible]

عبدالحلیم صاحب [illegible] جو بہت کم وقت تک [illegible] بھی اور [illegible] کی قدر شناسی [illegible] ان کے تعلق [illegible] ان سب کا ذکر [illegible] اور تنقیدی [illegible] بڑی خوبی [illegible] تصنیفات کے [illegible] رحمت اللہ [illegible] زندگی کے میدان میں وہ منزل [illegible] مرتبے کو پہنچے [illegible] نظام الملک [illegible] قدر افزائی کی — جس کی قدر [illegible] اس عہد کے بڑے بڑے علما [illegible]۔ لیکن اس قدر افزائی پر بھی ان کو اتنا فخر نہ تھا جتنا کہ رسالے [illegible] پہ گفتگو میں جب ان کا ذکر آجاتا تو ایک خوشی سے آواز میں گداز پیدا ہو جاتی۔

انہوں نے عمر بھر کی محنت سے [illegible] اور مصنفوں سے [illegible] تاریخ اسلام اور تاریخ [illegible] پر حاشیے اور منشی رحمت اللہ کی [illegible] کے لئے تاریخی مضامین کے انبار [illegible] نظام الملک طوسی [illegible]۔ تصنیف «البرامکہ» اور آخری تصنیف «یاد ایام» پڑھی اور چھپی۔ وہ بھی افسانہ یا فسانہ، یہ بھی افسانہ یا فسانہ — ایک داستان ہے جس کی داستانیں ہیں جو [illegible] چلی آتی ہیں۔ آپ بیتی کی ایک داستان میں افسانہ یا فسانہ ایک داستان ہے۔ نواب مرزا داغ کی صحبت میں تین گھنٹے میں نے ایک

لے «یاد ایام» اس وقت میرے سامنے نہیں ہے چند پرچوں کے اوراق ۱۹۲۲ء میں مرحوم نے بھیجے تھے ان میں سے کچھ ورق کاغذوں میں مل گئے یہ اقتباس انہی اوراق سے ماخوذ۔ «یاد ایام» تقسیم سے تھوڑی مدت پہلے چھپی تھی مرحوم نے لکھا تھا کہ یہ میری عمر کی یادگار ہے یہ یادگاری نسخہ حیدرآباد میں [illegible]

[illegible] کے شاہ پیر [illegible] [illegible]
چند برس [illegible] تھے اور [illegible] سال ، لکھنؤ کے بالکل [illegible] کر دیا تھا ، [illegible]
[illegible] ہے کہ [illegible] سے [illegible] شاعری [illegible]
[illegible] ہوئی ، [illegible] صورت [illegible] ——
اب [illegible] ہوئی؟

[illegible] ایک تھی ، [illegible] جو [illegible] سے [illegible] تھا جس میں امراء کے [illegible] تھیں [illegible] پر [illegible] سپاہیوں کا پہرہ تھا ، ایک کمرے میں پولیس افسر [illegible] تھے ۔ ملاقات کا [illegible] جس [illegible] کے پاس [illegible] ایک [illegible] تھا ۔ جب میں نے مرزا داغ سے ملاقات کی خواہش کی تو اس نے وقت ملاقات کا مدعا طلب کیا ، چند کاغذ [illegible] کئے گئے اور [illegible] ایک گھنٹے کے بعد مرزا صاحب کا جو [illegible] ان کی ذاتی [illegible] پر [illegible] جانے کی اجازت ہوئی ۔ [illegible] نظر آئے [illegible] شاندار تھے ، ہر ایک کے دروازے پر سرخ زرد رنگ کی [illegible] پر [illegible] میں صاحب بارگاہ کا نام لکھا تھا [illegible] منٹ کے بعد [illegible] فصیح الملک مرزا داغ کا نام نظر آیا [illegible] بارگاہوں کے قریب ہی [illegible] جس میں حضور نظام خواب راحت میں تھے [illegible] کی [illegible] آواز آ رہی تھی ۔ ایک پہرہ [illegible] اور [illegible] اندر [illegible] کی ۔ آہستہ آہستہ چلتے [illegible] کہ [illegible] آواز [illegible] تک کسی طرح نہیں جا سکتی تھی [illegible] کی [illegible] صائب کا یہ شعر پڑھا اور [illegible] کو [illegible] مخاطب کر کے پڑھا ؎

اے صبا برگ [illegible] غنچہ [illegible] بستہ پا
پاسبان گل [illegible] خوابیدہ است

الحمد للہ ، منزل ختم ہوئی اور داغ کی بارگاہ تک پہنچ گئے ۔ [illegible] دروازے پر ایک چوبدار نے جس کی زرد مخمل وردی پر طلائی [illegible] کام تھا [illegible] اور ہم لوگ اندر داخل ہوئے ، پہلے کمرے میں بٹھائے گئے جس میں ایرانی قالین کا فرش تھا اور کرسیاں سیاہ رنگ کی تھیں چند منٹ کے بعد طلبی ہوئی ۔ [illegible] جب تیسرے میں پہنچے تو دیکھا ایک بزرگ [illegible] کی چوب تھام کر بڑھے استقبال کو آ رہے ہیں ۔ چلنے میں معذور تھے اور پنڈلیوں پر گرم اونی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں ، عرق النسا میں مبتلا تھے ۔ [illegible] رنگ سیاہ اور چہرے پر [illegible] کے داغ تھے ۔ بارگاہ کا یہ حصہ نہایت آراستہ تھا ، ایک جانب چاندی کا پلنگ بچھا ہوا تھا ۔ وسط میں قیمتی ایرانی قالین تھا ، ذرا ہٹ کر چاندی کی ایک [illegible] انگیٹھی میں آگ دہک رہی تھی ، مرزا صاحب نے کھڑے ہو کر مصافحہ کیا ، پھر ہمارے اصرار پر فرش پر بیٹھ گئے ۔ [illegible] نام تو پہلے ہی معلوم ہو چکے تھے ، اب نام بنام تعارف ہوا ۔ بیٹھتے ہی میری طرف [illegible] بڑھایا ، شغل فرمایئے ۔ میں نے عرض کیا : پیر و مرشد [illegible] نے اس آگ سے مجھے اب تک محفوظ رکھا ہے ۔ فرمایا کہ اس کا [illegible] بھی موجود ہے ، اجازت ہو تو ایک جام پیش کیا جائے ۔ اس [illegible] پر خوب ہنسی رہی ۔ میری کتاب البرامکہ ۱۸۹۶ء میں شائع ہو چکی تھی ، اور مرزا صاحب پڑھ چکے تھے ۔ اس کتاب کے مضامین پر گفتگو ہوتی رہی ، اس کے بعد سلطان سنجر سلجوقی کے متعلق مجھ سے چند سوالات کئے ، میں نے جواب عرض کیا ، بہت خوش ہوئے اور [illegible] دعوت دی ، پھر فرمایا کہ اپنی تصویر [illegible] بھیجنا ۔ میرے بعد منشی رحمت اللہ رعد سے مخاطب ہوئے اور فرمایا کہ جناب رعد ! آپ تو میرے ہم مشرب ہیں کچھ اپنا کلام سنایئے ۔ رعد نے معذرت کی کہ مسدس حالی پڑھنے کے بعد شاعری سے تائب ہو چکا ہوں ، تاہم دو تین غزلیں سنائیں ، اس کے بعد موجودہ شاعری پر مناظرہ شروع ہوا ، ڈیڑھ گھنٹے کی بحث کے بعد یہ طے ہوا کہ اگرچہ ہماری شاعری [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ایک تنہا کمرہ [illegible]

[illegible] میں بیٹھے تھے [illegible]

[illegible]

• بر سبیل تذکرہ ——— کہانی میں ایک کہانی۔

• میرے مرحوم دوست شمس العلماء شبلی نعمانی نے مجھ سے بر سبیل تذکرہ فرمایا کہ حیدرآباد میں عید کے دن میں داغ سے ملنے گیا، اور [illegible] شعر پڑھا [illegible] کہ ملاقات کے کمرے میں یکایک ایک سامنے سے کھڑکی کا پردہ اٹھا [illegible] کہ کوئی پری [illegible] دیوار میں بیٹھے کی [illegible] شباب [illegible] اس پاس [illegible] جلا تھا [illegible] مرزا صاحب بھی [illegible] اور بولے کہ [illegible] دیکھا [illegible] میرے پاس کوئی [illegible] جاتی تھی نہ واپس جا سکتی تھی۔ یکایک آپ نے مرزا صاحب [illegible] وہی سے سنتے ہی بس پھر کیا [illegible] غائب ہو گئی [illegible] اس طرح کا عکس پڑا اور داغ نے اس [illegible] فی البدیہہ شعر تصنیف کر دیا۔ افسوس ہے میں وہ نادر شعر بھول گیا، مگر اس کا مضمون ابو نواس کے اس شعر سے ملتا جلتا تھا۔

رفتہ رفتہ [illegible] من شکیبا [illegible] والعقل [illegible]

اس روایت سے ظاہر ہے کہ داغ کے کلام میں شوخی اور عشق و محبت کی رنگینیاں اسی قسم کے لوازم اور خارجی اسباب سے پیدا ہوئی تھیں۔ موصوف نے اپنے خلوت کدے کو ایک پرستان بنا رکھا تھا۔ قلعہ معلیٰ میں بچپن سے جوانی تک اسی ماحول میں پرورش پائی تھی، یہ بات دوسروں کو کہاں میسر ہو سکتی ہے وہ ایک مصور تھے جو پریزادوں کی تصویر بالکل کھینچ دیتے تھے۔ ایک داستان کتابوں سے اور ایک داستان مصنفوں سے! یہ تھے عبدالرزاق صاحب!— [illegible] کا اس میں [illegible] کی ملاقات۔

اصغر گونڈوی

صغیر احمد صدیقی

۱۹۳۳ء کا ذکر ہے میں الٰہ آباد یونیورسٹی میں ایم۔ اے کا طالب علم تھا۔ [illegible] میں نے ایک بسیط مضمون بعنوان "چکبست پر ایک تنقیدی نظر" لکھا۔ [illegible] صاحب نے مشورہ دیا کہ یہ مضمون [illegible] ادارے کو جو الٰہ آباد ہی سے جو ایک [illegible] رسالہ ہندوستانی نکالتا ہے اس میں چھپوا یا جائے۔ اصغر مرحوم اس وقت اس رسالے کے مدیر تھے۔ میرے ایک دوست جو اصغر مرحوم سے واقف تھے مجھے ان کے پاس لے گئے۔ اس زمانے میں وہ [illegible] میں رہتے تھے [illegible] بالا خانہ [illegible] نشست گاہ میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔

تھوڑی دیر میں اصغر صاحب تشریف لائے۔ درمیانہ عمر کے بزرگ [illegible] لانبا قد۔ قد سے ملتا ہوا سانولا رنگ۔ چہرہ [illegible] خوبصورت فرنچ کٹ داڑھی، آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک۔ لانبا کرتا اور چوڑی دار پاجامہ پہنے ہوئے [illegible] روشن [illegible] صاف [illegible] نکھرے نکھرے [illegible] ایک خفیف [illegible] صدیقی معلوم ہوتا تھا کہ نیکی اور شرافت کے بوجھ سے پیدا ہو گیا ہے۔ متانت اور وقار کے ساتھ چہرہ پر ایک تبسم [illegible] پذیرائی لیے ہوئے۔ مختصر یہ کہ شخصیت میں وہ جذب اور کشش جو اجنبیت اور بیگانگی کے احساس [illegible]

معمولی رسم تعارف کے بعد میں نے وہ مضمون ان کی طرف بڑھا کر درخواست کی کہ اپنے رسالے میں اس کو جگہ دیں۔ مضمون کو یہاں وہاں سے دیکھ کر بولے کہ یہ زبان اور طرز بیان آپ کے شعبۂ اردو کا نہیں معلوم ہوتا۔ میں نے عرض کیا "جی ہاں شعبہ سے ابھی تک مستفید نہیں ہو سکا ہوں۔ جو کچھ آپ کے سامنے ہے اپنی کاوش کا نتیجہ ہے۔" کہنے لگے کہ "ہمارے یہاں تو بورڈ آف ایڈیٹرس ہے۔ وہ فیصلہ کرے گا کہ مضمون شائع کیا جائے یا نہیں۔ معاوضہ دیا جاتا تھا اب بند کر دیا گیا ہے۔ البتہ یہ تجویز ہے جو ابھی منظور نہیں ہوئی ہے کہ پھر معاوضہ دیا جائے۔ آپ چند روز بعد تشریف لائیے تو میں بتا سکوں گا کہ فیصلہ کیا ہوا۔"

میں چند روز بعد گیا تو انہوں نے کہا کہ مضمون اگر آپ چاہتے ہیں تو چھپ سکتا ہے مگر معاوضے کا مسئلہ ہنوز طے نہیں ہوا ہے۔ یہ کہہ کر انہوں نے مسکراتے ہوئے مضمون میری طرف بڑھایا۔ میں نے دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایڈیٹوریل بورڈ کے ایک بزرگ نے جو مجھ سے بخوبی واقف تھے اور مجھ پر بڑی شفقت فرماتے تھے بعض حصوں کو حذف کرنے کے لیے نشانات لگا رکھے تھے۔ مجھے بہت ناگوار ہوا۔ میرے

[illegible] ہے۔ [illegible] سے [illegible] [illegible] کے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ہی مرحوم سے [illegible] بیٹھ [illegible] تک [illegible] جا سکتے ہیں۔

حضرت اصغر حسین اصغر گونڈوی [illegible] میں پیدا ہوئے۔ [illegible] ابتدائی تعلیم [illegible] سے آگے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] انتقال [illegible] [illegible] اور [illegible] کی [illegible] [illegible] ایک [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] انفرادی مانے جاتے ہیں۔

اصغر صاحب کی ابتدائی زندگی باقاعدہ تعلیم و تربیت سے نا آشنا رہی۔ جوانی میں وہ بے راہ ہو گئے اور طبیعت میں [illegible] جو لوگ جانتے ہیں وہ جانتے ہیں [illegible] [illegible] ان کی زندگی کے آخری تیس سالوں میں ان کو قریب سے دیکھا ہے [illegible] [illegible] اپنے [illegible] [illegible] زندگی کی ایک فضا [illegible] ۔ ——— کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اپنے سینے سے واقعی آتش [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ان کے [illegible] [illegible] سبب تھی کہ وہ خود لغزش [illegible] سنبھل چکے ہے۔

قصہ مختصر ایک دن آیا جب اصغر نے محسوس کیا کہ [illegible] تشنگی کو قابل برداشت [illegible] ہے اور وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر [illegible] شیخ کی تلاش میں روانہ ہو گئے۔ یہ سراغ ملا تھا شیخ محمد عمر صاحبؒ کے جو قاضی عبدالغنی صاحبؒ کے پیر بھائی تھے اور تھانہ بھون میں رہتے تھے۔ مراد آباد پہنچ کر انہوں نے لوگوں سے پتہ پوچھا تو انہوں نے قاضی صاحب کی طرف اشارہ کیا کہ یہ شیخ محمد عمر کا صحیح پتہ بتا سکیں گے۔ قاضی صاحب اس وقت پلیٹ فارم کے ایک گوشہ میں نماز پڑھ رہے تھے۔ یہ ان سے پتہ پوچھ کر ہی گاڑی کے ڈبہ میں آ کر بیٹھ گئے۔ کوئی چیز خرید کر پیسے گن رہے تھے جو کچھ ہاتھ سے چھوٹ کر پلیٹ فارم پر گر پڑے ٹھیک اسی وقت قاضی صاحب ادھر سے گذرے انہوں نے نہایت بے تکلفی سے کہا کہ ذرا میرے پیسے اٹھا دیجئے۔ قاضی صاحب نے نہایت فراخ دلی سے یہ خدمت انجام دی۔ پیسے چن کر ان کے ہاتھ پر رکھے اور خود بھی اسی ڈبے میں بیٹھ گئے۔ گاڑی جب منزل پہنچی تو قاضی صاحبؒ اتر پڑے اور ساتھ ہی ساتھ اصغر صاحب بھی۔ قاضی صاحب نے کہا بھی کہ آپ کو تو آگے جانا ہے مگر اصغر صاحب نے جواب دیا کہ میں نے ارادہ بدل دیا ہے آپ کے ساتھ چلوں گا۔

میں سمجھتا تھا مجھے ان کی طلب ہے اصغر — کیا خبر تھی وہی لے لیں گے سراپا مجھ کو

قاضی صاحبؒ نے اسی وقت اپنے ایک مرید تہور علی صاحب تحصیلدار گونڈہ کو تار دیا کہ تفضل حسین صاحب کو مطلع کر دیں کہ ان کا لڑکا میرے پاس آ گیا ہے۔

مرحوم اصغر صاحب قاضی عبدالغنی صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان کے [illegible]

[illegible] ہمیشہ کے لئے۔

سب سے نہاں ہو کے ملے اب مرا دیدار [illegible]

تم نے جسے بھلا دیا آکے مری نگاہ میں!

حقیقت اور معاملہ حیثیت کا جو اصغر صاحب کی صحبت کی انتہائی [illegible] دیکھنے سے کچھ [illegible] انقلاب ہوا اس کا اندازہ آپ یہی نشاط روح اور سرود زندگی کے صفحات سے کیا جا سکتا ہے جس میں ایک شعر بھی ایسا نہیں ہے جو تہذیب و متانت کے پاکیزہ تر معیار سے گرا ہو۔ صرف نظر سے اتنے مکمل طور کی کوئی دوسری نظیر اردو ادب کی تاریخ میں شاید ہی مل سکتی ہے۔ اصغر کی زندگی [illegible] کی شخصیت نے ایک نیا موڑ [illegible] آخری لمحات تک وہ حیثیت سے اور ہر حیثیت سے ایک صاحب نفس و حال رہے۔

گذشتہ ماحول جب سے تو پھر ان کا دامن پکڑ لیا۔ وہ زندگی بھر اپنی پوری طاقت سے ان کو اپنی طرف کھینچنے کے لئے تیار رہیں کشمکش شروع ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جگر تائب ہو کر ان کی نئی زندگی کے شریک ہو گئے۔

اصغر صاحب کو اپنے پیر سے والہانہ شیفتگی تھی اکثر حاضری دیا کرتے۔ قاضی صاحبؒ بھی ان کے ساتھ خصوصیت برتتے [illegible] کہا کرتے تھے۔ ایک دن ان سے کہا کہ تہجد کے وقت تمہاری آواز نہیں سنائی دیتی۔ تم بھی اٹھ کر ذکر کیا کرو۔ چنانچہ دوسرے دن سے انہوں نے بھی اسی طرح ذکر کرنا شروع کیا۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں آواز گلوگیر ہو گئی اور شدت گریہ سے مجبور ہو کر [illegible]۔ پھر جب اس کا یہی نتیجہ ہوا تو ذکر کرنا ترک کر دیا۔ ایک دن قاضی صاحبؒ نے پھر کہا کہ بھائی اصغر تمہاری آواز نہیں سنائی دیتی تو جواب دیا حضرت کیا کروں۔ مجھ پر رقت طاری ہو جاتی ہے اور میں ناکام رہ جاتا ہوں۔ قاضی صاحبؒ نے فرمایا اچھا تم ذکر نہ کیا کرو۔ میں مجبور ہوں فرض و واجب اور سنت کے ترک کی اجازت نہیں دے سکتا لیکن ان کے علاوہ جملہ عبادات ترک کر دینے کی اجازت دیتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی نے اصغر مرحوم کو کبھی اوراد و وظائف میں مستغرق نہیں پایا۔ وہ صوم و صلوٰۃ کے پابند ضرور تھے مگر اس میں کوئی غلو نہیں تھا اور نہ دوسروں سے اس معاملہ میں سخت گیری کرتے تھے۔ خود تعینی ہی عبادت کرتے [illegible] کی انتہائی گہرائیوں کے ساتھ۔

اپنی زندگی کے آخری زمانے میں جب [illegible] صاحب [illegible] تھے یہ آرزو تھی کہ [illegible] قاضی صاحبؒ کے مزار پر حاضری دیں۔ طبیعت سنبھلی تو روانہ ہو گئے۔ مجھے ساتھ لے لیا۔ میری [illegible] سے واقف تھے۔ راستے میں مسکرا کر بولے [illegible] آپ [illegible] صوم و صلوٰۃ کی ہے۔ آپ کیا کریں گے؟ میں نے کہا وہاں پہنچ کر پڑھنے لگوں گا۔ کہنے کو تو میں کہہ گیا مگر کچھ متفکر سا ہو گیا۔ مسکرا کر [illegible] ہے؟ میں نے دبی زبان سے پوچھا "فجر کی نماز وہاں کس وقت پڑھی جاتی ہے؟" ہنستے ہنستے کہنے لگے فجر کے وقت۔ میں نے عرض کیا ایک فجر کا وقت وہ کہلاتا ہے جسے میں رات کا پچھلا پہر کہتا ہوں جب تارے آسمان پر اپنی پھیکی تابانی سے جلوہ گر ہوتے ہیں۔ نیچے کافی اندھیرا ہوتا ہے آنکھیں [illegible] پاؤں کہیں ڈالئے پڑتا کہیں۔ ہے دوسرا وقت وہ ہے جسے عرف عام میں صبح کہتے ہیں یعنی طلوع آفتاب سے کچھ قبل جبکہ اچھا خاصا اجالا [illegible] رہتا ہے۔ ہنس کر بولے "آپ جماعت میں شامل ہوں طلوع آفتاب سے کچھ قبل ہی پڑھ لیں تو بہت ہے"۔ بہرحال [illegible] پہنچ کر [illegible] شدید خنک رات تھی۔ میں گہری نیند سو گیا اٹھا تو دن کافی چڑھ گیا تھا۔ مولانا [illegible] نے کپڑے [illegible] بیٹھے تھے۔ میں اپنا کمبل اوڑھے ہوئے تھا اور اس پر مولانا کا کمبل پڑا ہوا تھا جو نماز کو جاتے ہوئے انہوں نے میرے اوپر ڈال دیا تھا۔ [illegible] کہا کرتے تھے کہ کبھی کوئی آسانی سے نماز نہیں پڑھ سکتا۔ نماز تو [illegible] کے بعد [illegible] اپنے پیر کا انتہائی ادب و احترام کرتے تھے اور اس تعلق کا [illegible] ذکر بھی کرتے تھے۔ اپنے کلام میں بھی کہیں واضح طور پر اشارہ [illegible]

[illegible]

[illegible] تھی۔

اصغر صاحب کی عادات و خصوصیات [illegible] کے ساتھ [illegible] تھا۔ وہ زندگی کے ہر [illegible] سے
بچتے [illegible] ہوتے تھے۔ یہ چیزیں ان کی شاعری [illegible] ہوا کرتی تھیں۔ زندگی کے
[illegible] کی شخصیت کا ثبوت دیتے تھے۔ [illegible]
[illegible] مغفرت [illegible] آپ کی
[illegible] بعض حضرات [illegible] آپ کی [illegible]
[illegible] کے سبب [illegible]
[illegible] آپ [illegible] صاحب کو [illegible]
[illegible] آپ [illegible]
[illegible] انگریزی بھی
جانتے ہی نہ تھے۔ انگریزی کی باقاعدہ تعلیم تو حاصل نہیں کی تھی [illegible] بعد میں اصغر صاحب نے اصرار
[illegible] کے پاس [illegible] محمد سلیمان مرحوم [illegible] ایک انگریزی کتاب [illegible]
[illegible] حاصل کرنے کے [illegible]
[illegible] جس کی [illegible] ان کا ضمیر [illegible] زندگی میں [illegible] ثبوت دیتے تھے۔ [illegible] زندگی کی
ایک ہزار [illegible] چھپائی تھیں [illegible] کے سبب [illegible] تھیں۔ ایک
[illegible] کے حوالے [illegible] سب [illegible]
میں کوئی دخل نہیں رکھتا۔ اس [illegible] ظاہر ہے۔

اصغر کی شخصیت کے جو خدوخال اوپر نمایاں کئے گئے ہیں وہی بالکل [illegible] ان کے کلام میں بھی ملتے ہیں۔ [illegible] اصغر صاحب میں ان
کے مزاج کی نفاست اور پاکیزگی، ہر موضوع اور [illegible] وہی مخصوص اور منفرد طرز فکر [illegible] سے [illegible] کی کوشش۔ اصغر کم کرتے۔
غزل گو شعراء میں شاید ان کی واحد مثال ہے کہ جو سوچتے تھے اور محسوس کرتے تھے وہی اور اتنا ہی کہتے تھے۔ محض قافیہ و ردیف کے مطالبوں
سے مجبور ہو کر یا عشق و [illegible] کے [illegible] کچھ نہ کہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام سے ان کا فلسفۂ زندگی آسانی سے اخذ کیا جا سکتا ہے
اور [illegible] جو کچھ کہتے تو صرف اپنے کو [illegible] رہتے۔

ان کے کلام کے مخصوص موضوع اور مضامین کی بنیادی ہم رنگی پر ایک صاحب نے کہا کہ مولانا آپ کے یہاں تنوع نہیں بلکہ ایک
[illegible] ہے۔ جواب [illegible] جب تک وہ چیز معیار کے مطابق [illegible] ہے۔ میری [illegible] ایک ہی طرح کا [illegible]

جب تک یہ سلسلہ جاری رہا ہر ماہ کا سالانہ جلسہ ہوتا رہا ہے۔ اس مجلس میں شعرا کا کلام سنایا جاتا تھا اور
کھانے کی بھی بڑی کثرت سے اشیا بٹتی ہیں۔

وہ شعر کے بڑے پابند رہتے تھے اور شاعر کی حیثیت سے اپنے کو پیش کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ مشاعروں میں بلانے پر بھی کم جایا کرتے تھے اور اگر کبھی شرکت کرتے بھی تھے تو آخر میں سنانا پسند نہ کرتے، شاعرانہ وقعت و شان کے منافی سمجھتے تھے۔ دوسروں کو شاعری کی ترغیب دینے کے لئے طرح طرح سے مدد کرتے تھے۔ مشاعروں سے ان کی گریز پائی کا ایک مذاق تجربہ مجھ کو بھی ہے۔ ۱۹۳۰ء کا ذکر ہے، الہ آباد میں مشاعرہ منعقد ہو رہا تھا میں نے طرح بھی بھیج دی اور انھوں نے غزل بھی کہی۔ مجھے یقین تھا کہ میری سفارت سے اصغر صاحب کی مشاعرہ میں شرکت ضرور حاصل ہو جائے گی مگر جب وقت آیا اور میں نے کہا کہ چلئے تو اصغر صاحب نے صاف انکار کر دیا اور یہ سنجیدہ انکار جس میں شاعرانہ تکلف کا شائبہ بھی نہ تھا میں اس انکار پر بہت متحیر ہوا۔ پھر میں نے کہا کہ غزل آپ نے کہی بھی تو ہے کہیں پڑھنے کا بھی ہے یا نہیں۔ غرض یہ طے ہوا کہ کسی سے پڑھوا دیا جائے۔ میں نے واپس آکر احباب کو خوشخبری دی کہ اصغر صاحب نہیں آسکیں گے تو لوگوں کو بڑی مایوسی ہوئی اور مجھے طعنے دیئے گئے کہ کس طرح کی پیچ و شرم کی روش اپنے سامنے رکھے آئے۔ میں واپس ہوا اور مشاعرہ کی نشست کا وقت آیا میں پہنچ کر شیروانی کھونٹی پر ٹانگی اور کہا کہ اب تو نہ جاؤ گے، جب کہ مرد ناگہاں پہنچا اور یہ ارادہ ہے میں نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔ رخصت ہوا، پھر جب اس مشاعرہ کا وقت آیا تو اسی وقت جو اس سے پہلے میں بیری ہو رہی ہے لوگوں کو خواہش ہو رہی تھی، تب میں جو ملیں واپس ہو گا، جب تک خدمت میں حاضر ہوں گا۔ اصغر مرحوم بادل ناخواستہ تیار ہو گئے، محفل میں آکر ڈائس کے پیچھے ایک کونے پر بے پروائی سے بیٹھ گئے۔ جب ان کی باری آئی تو غزل جناب حفیظ جالندھری کو پڑھا دی۔ انھوں نے ڈائس پر کھڑے ہو کر مطلع پڑھا۔

وہ نغمہ بلبل رنگیں نوا اک بار ہو جائے
کلی کی آنکھ کھل جائے چمن بیدار ہو جائے

اس شعر تحسین و آفرین محفل سے جو جلد ہوا تو حفیظ صاحب نے اس داد کو جو انہیں مخاطب کرکے دی جا رہی تھی دونوں ہاتھوں سے سمیٹ کر اصغر صاحب کی طرف پھینکنا شروع کیا۔ پھر کیا تھا لوگوں کا اصرار، بڑھا اور صدر مشاعرہ مرحوم بہادر یار جنگ نے بھی درخواست کی کہ اصغر صاحب ڈائس پر تشریف لائیں، کشاں کشاں لائے گئے۔ بہت خاموشی اور وقار سے چہرے پر ایک خفیف سا تبسم لئے بیٹھے رہے۔ وہ شاعرانہ ادائیں کہ "یہ شعر ملاحظہ کیجئے گا"، "ذرا غور کیجئے گا" یہ شعر شاید کسی قابل ہو، ان میں کہاں۔ مرصع غزل تھی۔ ہر شعر پر محفل جھوم جاتی تھی۔ یہ کبھی کبھی تسلیم کر لیتے مگر داد طلب انداز سے نہیں۔

اصغر مرحوم وسیع المشرب اور کثیر الاحباب تھے۔ ان کی صحبت میں ہندو بھی شریک ہوتے اور مسلمان بھی۔ آزاد خیال حضرات بھی اور بہت ہی متشرع و متقشف قسم کے بزرگ بھی۔ سب کو ان کی ہم نوائی پر ناز تھا۔ اپنے احباب سے بہت خلوص و محبت سے پیش آتے تھے۔ صحبتیں بہت دلچسپ اور مفید ہوتی تھیں۔ موضوعات گفتگو سنجیدہ اور وسیع ہوتے۔ مذہب و فلسفہ، شعر و ادب سبھی پر خیال آرائی ہوتی تھی۔ اصغر مرحوم خوش مذاق کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ طبیعت بذلہ سنج پائی تھی اور گفتگو کا انداز بہت دلنشیں تھا۔ خود ہنستے اور دوسروں کو بھی ہنساتے۔ ان کی صحبتوں کی فضا بہت شگفتہ و پرسکون ہوتی اور کوئی بے کیف نہ ہونے پاتا۔

ان کے احباب متعلقین کو کبھی مایوس، پریشان، ملول یا افسردہ نہیں پایا۔ یہ بھی قاضی صاحب کا فیض روحانی تھا کہ اصغر صاحب ہر حال میں کاسہ خالی اور شگفتہ رہتے تھے۔ یہی نہیں ان کی طمانیت، آسودگی اور سکون ان کے ہم نشینوں میں بھی منتقل ہو جاتا۔ آپ کبھی الجھن یا پریشانی میں ہوں کہ اگر اصغر صاحب کے پاس تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے آئے تو دل و دماغ کی فضا بدل گئی۔ حیرت تو اس پر ہے کہ ادھر احساس کئے کہ وہ خود حل

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

منشی محمد الدین فوق

محمد عبداللہ قریشی

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد دلی اور لکھنؤ کے اردو ادب کے چند ٹوٹے ہوئے ستارے گردش میں آکر لاہور آئے۔ ان میں مولانا الطاف حسین حالی - مولانا محمد حسین آزاد - مولانا فیض الحسن سہارنپوری اور … خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان بزرگوں کی … سے نئی کی فصلیں جائیں اور اس طرح سرزمین پنجاب سے رنگ اور ادبی سعادت اور تہذیبی وثقافتی نعمتوں سے پہلی مرتبہ واقف ہوئے جو اس سے پیشتر دلی سے نکل کر اودھ - مرشد آباد - عظیم آباد (پٹنہ) اور حیدر آباد دکن میں جا کر بٹ گئی تھیں۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ پنجاب میں پہلی پود کے لوگوں نے حالی - آزاد - فیض الحسن اور ارشد وغیرہ … ہوئے تھے … پشت پر تھا۔ ان بزرگوں کے بعد جو لوگ پیدا ہوئے ان میں سر عبدالقادر - علامہ اقبال - ظفر علی خان - احمد حسین خان - مولوی ظفر علی خان - چودھری خوشی محمد ناظر - میر غلام بھیک نیرنگ - میاں شاہ دین ہمایوں - مولوی محبوب عالم - مولوی انشاء اللہ خان - مولوی محرم علی چشتی - پنڈت … خان شمیم اور منشی محمد الدین فوق وغیرہ کا نام سرفہرست ہے۔ یہ … وقت بھی کمال فن کے اعتبار سے ضرور … تھے - اور آج بھی اس میدان میں ان کا کوئی مد مقابل نظر نہیں آتا۔ مولانا ظفر الملک علوی مدیر الناظر لکھنؤ جو ۱۹۲۵ء میں لاہور آئے پنجاب میں اردو کی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> "اب سے پچیس تیس سال قبل منشی محمد الدین فوق اور میر غلام بھیک نیرنگ کے سوا شاید کوئی تیسرا پنجابی شاعر ایسا نہ تھا جس کا کلام پنجابی کی معمولی غلطیوں سے پاک اور جس کی انشا صحیح اردو میں شمار ہونے کے لائق ہو - مولانا ظفر علی خاں صاحب اس وقت اہل پنجاب میں شمار نہیں کیے جا سکتے تھے۔ مگر نئی نسل نے بہت سے ایسے اہل قلم پیدا کر دیے ہیں جن کی نظم و نثر اہل زبان کے معیار پر اگر نہیں تو زبان دانوں کے معیار پر ضرور پوری اترتی ہے اور آثار ظاہر بتاتے ہیں کہ ایسے اصحاب کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا رہے گا۔"
>
> (نیرنگ خیال لاہور بابت اگست ۱۹۲۵ء)

منشی محمد الدین فوق فروری ۱۸۷۷ء میں موضع کوٹلی ہرنارائن (ضلع سیالکوٹ) میں پیدا ہوئے اور بارہ ستمبر ۱۸۹۰ء کو لاہور پہنچ گئے

ایک۔ جس نے ایک صحافی، ایک ادیب، ایک مورخ اور ایک شاعر کی حیثیت سے قدر [illegible] ختم ہو [illegible] پہنچنے کے [illegible] جو کشمیر کی ادبیات میں [illegible] نہیں [illegible] فوق [illegible] سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ ثابت ہوں گے اور منشی صاحب کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔

منشی صاحب سے میرا تعلق کافی پرانا تھا جس وقت میں خود بھی کالج کا طالب علم تھا۔ اس وقت میرا [illegible] ایک مشغلہ ہوتا تھا۔ مولانا تاجور نجیب آبادی نے میری طرح کچھ نوجوانوں کے لیے [illegible] کر رکھا تھا کہ شعر و ادب کی شخصیتوں سے ملاقاتیں کرائیں [illegible] ملا صاحب کے [illegible] ساغر نظامی نے مجھے [illegible] ہے۔ مولانا تاجور صاحب سے ان کے بہت زیادہ دوستانہ تعلقات تھے۔ اس لیے ان کے ہاں [illegible] منشی صاحب سے ملنے گیا۔ وہ کشمیری دروازہ کے اندر ایک مکان میں اقامت گزیں تھے۔ یہ مکان اس [illegible] کے قریب تھا جہاں سے [illegible] کتاب و سب سے پیارا [illegible] اخبار [illegible] شائع کیا کرتے تھے [illegible] کے علاوہ ایک [illegible] تشریف فرما تھے۔ درمیانہ قد [illegible] گندمی رنگ [illegible] صحت [illegible] باوقار چہرہ [illegible] داڑھی [illegible] تھے۔ سادہ لباس، سر پر ترکی ٹوپی۔ یہ وہی شخصیت تھی جس نے مجھے [illegible] متوجہ کر لیا [illegible] تاجور صاحب نے ان الفاظ میں ان کی جان پہچان کرائی: کیا آپ انہیں نہیں جانتے؟ یہ آپ کے [illegible] مشہور [illegible] اور مورخ منشی محمد الدین فوق ہیں:
یہ میری اور منشی صاحب کی پہلی ملاقات تھی

اس کے بعد میں نے تاجور صاحب، ساغر نظامی اور [illegible] کے اعزاز میں دعوت کی۔ جس میں [illegible] پروفیسر تاثیر، پروفیسر محمد علم الدین سالک، حکیم یوسف حسن اور دیگر دوستوں کے علاوہ منشی محمد الدین فوق بھی شریک تھے۔ اس محفل میں مختلف موضوعات پر باتیں ہوئیں سب نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ اور پہلی ملاقات میں منشی محمد الدین فوق کے متعلق میرے دل میں [illegible] پیدا ہوا تھا وہ گہرا ہو گیا۔ اور یہی تعلق خاطر مجھے آہستہ آہستہ ان کے قریب لے گیا۔

منشی صاحب شیرانوالہ دروازہ کے باہر رہتے تھے۔ جب تک اخبار کشمیری جاری رہا نیچے دفتر میں بیٹھتے تھے۔ اس کے بعد مکان کی بالائی منزل میں اپنی نشست کے لیے ایک کمرہ مخصوص کر لیا تھا۔ جس کی بڑی بڑی الماریوں میں ہر قسم کی کتابیں بھری رہتی تھیں۔ ان میں ان کی ذاتی تصانیف بھی تھیں اور دوسری کتابیں بھی۔ منشی صاحب کو کتابیں جمع کرنے کا اتنا شوق تھا کہ لاہور کے تمام اخبار نویسوں میں مولوی محبوب عالم مدیر پیسہ اخبار اور مولوی انشاء اللہ مدیر وطن کے بعد آپ ہی کی ذاتی لائبریری قابل ذکر تھی۔ جس میں ہر سال مفید کتابوں کا اضافہ ہوتا رہتا تھا۔

میرا معمول تھا کہ ہفتہ میں ایک بار ضرور ان کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ پریشانی دور ہو جاتی تھی ان کی صحبت سے بشاشت [illegible]۔ جی گھبراتا تو وہاں چلا جاتا اور ان کی پر لطف باتوں سے غم غلط ہو جاتا۔ خالی الذہن جاتا تو معلومات کے ایسے نادر و لطیف نکتوں سے بہرہ مند واپس آتا جو شاید ورقوں کے مطالعہ یا مشاہدہ سے حاصل نہ ہو سکتے۔ خوش ہوتا تو وہاں مزید جاتا اور جب کبھی اداس ہوتا تو وہاں جاتا۔ جب واپس آنے کی اجازت چاہتا تو اٹھنے نہ دیتے۔ چائے، لسی، شربت، جو کچھ ہوتا اس سے تواضع کرتے اور اگر کسی وجہ سے میرے جانے میں ناغہ ہو جاتا تو دوسرے دن خود میرے ہاں تشریف لاتے اور نہ آنے کا سبب دریافت کرتے۔ ان کے اس معمول میں [illegible] تک فرق نہ آیا۔

فوق صاحب کے پاس اٹھنے بیٹھنے سے کشمیر کی محبت میری رگ رگ میں سما گئی اور میں دن رات کشمیر کے خواب دیکھنے لگا۔ میں ہر سال کشمیر جاتا۔ پروفیسر محمد علم الدین سالک اکثر میرے ساتھ ہوتے۔ کبھی وہ نہ جاتے اور میں اکیلا ہوتا تو فوق صاحب مجھے ہر دن کا [illegible] لکھتے رہتے۔

گئے ہوں کچھ کھا لیا ہو لکھتے کسی عزیز یا دوست کے ہاں وہ رسمی تو کے ذریعہ لے کر لیکھ کے ساتھ لے جاتے تھے۔ ساتھ کچھ نہ کچھ مثلاً سیب۔ ناشپاتی۔ انار۔ بادام۔ اخروٹ وغیرہ بھی رکھتے۔ بچوں کے لئے کھلونے بھی ساتھ ہوتا تھا۔ اخروٹ مرغوب کا موسم وہ پھل کرتے کہ بچے ساتھی ہوں گے تیمار تو کسی عزیز کا ہے تو ان کے لئے مریضان غریب کو اشعوں پر چڑھاتے اور بچے کھلاتے۔ اس طرح جب وہ وہاں پہنچتے تو سب میں مرجھائی ہوئی طبیعتیں کھل اٹھتیں۔ یہ شوق کی حالت۔ ان کی شخصیت کی ایک امتیازی شان تھی۔

ذوق صاحب اپنے گھر میں نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے رہن سہن کے انداز میں کوئی خصوصیت نہ تھی۔ ان کی زندگی باقاعدہ اور باوقار تھی۔ عام طور پر علی الصبح بیدار ہو جاتے تھے صبح کی سیر ان کی پرانی عادت تھی جسے انہوں نے سالہا سال تک ترک نہ کیا۔

لکھنے پڑھنے کے سلسلے میں بھی وہ کوئی خاص اہتمام نہ برتتے تھے۔ کبھی میز کرسی پر بیٹھ کر۔ کبھی پلنگ پر اور کبھی چٹائی پر ہی چاند پوش یا زمین پر بچھا کر تصنیف و تالیف کا شغل جاری رکھتے تھے۔ البتہ یہ عادت قابل ذکر ہے کہ جب وہ کوئی کتاب پڑھتے تو یونہی سرسری طور پر پڑھ کر ایک طرف نہ رکھ دیتے تھے بلکہ اس میں سے قابل استعمال مواد پر نشان لگاتے جاتے تھے۔ کس موضوع پر کونسی چیز استعمال ہو سکتی ہے؟ اس بارے میں ان کی نظر بہت گہری تھی۔ انہوں نے الگ الگ تھیلے بنا رکھے تھے جن میں الگ الگ مضامین کے تراشے جمع کرتے رہتے تھے پھر جب کوئی کتاب لکھتے تو ان تراشوں اور یادداشتوں کی وجہ سے حوالے تلاش کرنے میں انہیں کوئی دشواری نہ ہوتی مہینوں کا کام دنوں میں ختم ہو جاتا۔

گھر والوں سے ان کا سلوک بہت مشفقانہ تھا۔ انہوں نے تین شادیاں کیں۔ پہلی دونوں بیویاں صاحب اولاد تھیں۔ تیسری سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ یہ ایک ایسا معاملہ تھا جسے خانگی جھگڑوں کے لئے معقول وجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ذوق صاحب کی زندگی میں یہ جھگڑے بہت زور شور سے سر اٹھاتے تھے لیکن ان کا ذہنی توازن ایسے حالات میں برقرار رہتا تھا اور وہ ہر ایک کے ساتھ منصفانہ برتاؤ کرتے تھے۔

ذوق صاحب ہنگامہ خیزیوں سے الگ اپنے گوشۂ عافیت میں رہ کر خاموش کام کرنے کے علاوہ خلوص و محبت۔ استقلال و ہمت۔ ظرافت و شوخی اور جذبۂ ایثار و ذوق خدمت کی دولت سے مالا مال تھے ؎

بہت لگتا تھا جی صحبت میں ان کی — وہ اپنی ذات میں اک انجمن تھے

ان کی خندہ جبینی۔ حاضر جوابی۔ خوش اخلاقی۔ خوش مذاقی اور خوش مزاجی کی وجہ سے ان کے پاس بیٹھنے اٹھنے میں خاص لطف حاصل ہوتا تھا۔

یہ باتیں کچھ بڑھاپے ہی سے خاص نہیں تھیں۔ ان کے تمام دوست اور ملنے والے ان کی شگفتہ مزاجی سے متمتع ہوتے تھے۔ وہ بچپن ہی سے ہنس مکھ تھے ایسی بات بناتے اور اس قسم کے برجستہ فقرے چست کرتے تھے کہ بس مزا آجاتا تھا۔ خود سنایا کرتے تھے کہ جب وہ گجرال کا پرائمری سکول پاس کرنے کے بعد انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے لئے قصبہ جالکے کے مڈل سکول میں داخل ہوئے تو بورڈنگ ہاؤس میں رہتے تھے۔ بورڈنگ کی زندگی عام طور پر شرارتوں سے بھری ہوتی ہے۔ دن رات دل لگی، تفریح اور ہنسی مذاق کے سینکڑوں پہلو نکلتے رہتے ہیں۔ لڑکے عجیب عجیب حرکتیں کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ استادوں سے دو دو ہاتھ کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔

ایک رات بورڈنگ ہاؤس میں رہنے والے لڑکوں کو شرارت جو سوجھی تو انہوں نے ایک تماشا کیا۔ کوئی استاد بنا۔ کوئی شاگرد۔ ایک لڑکے نے سبق سنانا شروع کیا اور غلط پڑھا۔ ماسٹر نے ٹوکا اس نے پھر غلط پڑھا۔ استاد نے بنچ پر کھڑا کر دیا۔ اس کے بعد ایک طالب علم نے دوسرے طالب علم کو چھیڑا۔ اس نے ماسٹر سے شکایت کی۔ ماسٹر نے ایک کو جرمانہ کیا اور دوسرے کو رجسٹر سے نام خارج کرنے کی دھمکی دی پھر

[illegible] جب [illegible] ... [illegible]

[illegible] نہیں، [illegible] ہو گئے۔

فوق صاحب کی طبیعت [illegible] ... [illegible] ... فوق صاحب [illegible] ... [illegible]

[illegible] ... آپ نے [illegible] میں پڑھا ہے ؎

[illegible] ... [illegible]

[illegible] ... [illegible]

مولوی صاحب نے [illegible] جواب [illegible] ... فوق نے ؎

بڑھاپے کی [illegible] سے [illegible] ... [illegible]

۱۹۰۳ء کا ذکر ہے فوق صاحب پیسہ اخبار کے دفتر میں ملازم تھے۔ تنخواہ اس وقت دس روپیہ ماہوار تھی۔ بعد میں تو انہوں نے اس سے کہیں زیادہ مشاہرہ پر خود ملازم رکھے اور لاہور اور کشمیر میں بہت سی جائیداد بھی پیدا کر لی۔ بہر حال جیسا عام پرائیویٹ دفتروں کا دستور ہے تنخواہیں دس پندرہ دن بعد ملازم کو روپیہ دو روپے پیشگی [illegible] جو مہینے کے آخر تنخواہ سے وضع ہو جاتے تھے۔ ایک دفعہ اکاؤنٹنٹ نے تمام ملازمین کے خرچ کی فہرست بنائی۔ ان میں فوق صاحب سے پانچ روپے [illegible] تھے یا زیادہ سے زیادہ روپے لے چکے۔ اکاؤنٹنٹ نے اعتراض کیا۔ فوق صاحب نے کہا آپ لکھ دیجئے۔ [illegible] مولوی محبوب عالم کے چھوٹے بھائی عبدالعزیز منیجر تھے۔ ان کے پاس فہرست پیش ہوئی۔ وہ فوق صاحب کے نام پانچ روپے دیکھ کر چونک اٹھے۔ انہیں بلایا اور کہا آپ اس سے پہلے تین روپے لے چکے ہیں۔ اب یک مشت پانچ کس طرح مل سکتے ہیں۔ کہا کسی نے بھی پانچ روپے [illegible] اس وقت ایک روپیہ سے زیادہ نہیں ملے گا۔ فوق صاحب نے کہا ایک روپیہ کیا۔ میں تو آج تنخواہ قبول کرنے کو بھی تیار ہوں۔ لیکن خواہش صرف یہ ہے کہ ایک مرتبہ زندگی میں پانچ روپے اکٹھے دیکھ لوں۔ منشی عبدالعزیز صاحب ہنس پڑے اور ایک کی بجائے پانچ روپے دے دیئے۔

اس واقعہ سے بھی یہ پتہ چل سکتا ہے کہ ابتدا میں فوق صاحب کی مالی حالت کیا تھی اور کس [illegible] سے انہوں نے ترقی کی۔

لالہ دینا ناتھ حافظ آبادی جو ہندوستان کے اخبار نویسوں میں بڑے کامیاب اخبار نویس اور جرنلسٹ تھے۔ پیسہ اخبار کے دفتر میں فوق صاحب کے ساتھ کام کرتے تھے۔ انہوں نے [illegible]ء میں اخبار ہندوستان جاری کیا جس سے ان کی بہت شہرت ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے ہمالہ اور دیش وغیرہ اخبار بھی نکالے۔ ایک روز فوق صاحب ان سے ملنے گئے۔ وہ ایک گول میز کے گرد چھ سات آدمیوں کے ساتھ بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ ان میں دو وکیل بھی تھے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ فوق صاحب نے مزاج پرسی کے بعد پانی طلب کیا۔ لالہ دینا ناتھ نے کہا۔ پانی تو ہے مگر گھڑے کا [illegible] ہے۔ فوق صاحب نے کہا۔ کوئی پروا نہیں۔ تمہارا [illegible] تو نہیں۔ لالہ دینا ناتھ نے جب آپ

[illegible]

[illegible] تھا۔ اب [illegible] اخبار [illegible] ہر [illegible] بھی [illegible]
[illegible] جب سے [illegible] صاحب [illegible] وجہ سے [illegible] آئے [illegible]
[illegible] فوق صاحب کے برجستہ اور بیباک تبصرے کی داد دی۔

فوق صاحب سیر و سیاحت کے بڑے شوقین تھے۔ ساری زندگی کا بیشتر حصہ سفر میں کٹا۔ کشمیر تو [illegible] ہر سال غایت انہماک سے جاتے۔ کئی کئی ہفتے وہاں رہتے۔ اکثر گاؤں [illegible] کئی مقامات کی سیر کرتے۔ وہاں کے حالات [illegible] کرتے اور اپنے تجربات و مشاہدات سے [illegible] حضرات کو فائدہ پہنچاتے۔

کشمیر کے علاوہ انہوں نے وسط ہند، راجپوتانہ اور کاٹھیاواڑ کی ریاستوں مثلاً [illegible] ناگور، بیکانیر [illegible] وغیرہ نیز دہلی، بھوپال، بنگال اور [illegible] کے بھی متعدد سفر کئے۔ یوں سے ان کے دوستوں کا حلقہ وسیع ہو گیا اور اخبار کو بھی فائدہ پہنچا۔

فوق صاحب بڑے محنتی تھے۔ شعر گوئی کا شوق تو قدرت کی طرف سے ودیعت ہوا تھا جس کی وجہ سے پڑھائی کی طرف [illegible] کم رہا تھا۔ چنانچہ [illegible] میں مڈل کا امتحان دینے کے بعد جو اس وقت [illegible] کا استحقاق تھا۔ سیالکوٹ میں [illegible] کام سیکھنا [illegible] پھر وہاں سے کسی اچھی ملازمت کی توقع پر [illegible] کا رخ کیا اور [illegible] کوششوں سے [illegible] کے پاس ملازمت حاصل کی۔ جہاں [illegible] کی ہم نشینی میسر آنے سے [illegible] خوب شعر و شاعری کے چرچے رہے۔ جب [illegible] کا شیشہ ٹوٹ گیا [illegible] [illegible] کو اپنے بڑے بھائی کے پاس لاہور چلے آئے۔ یہاں پیسہ اخبار کے دفتر میں ملازمت مل گئی جو چار سال تک رہی۔ اس عرصہ میں اخبار نویسی کی مزید مشق کے لئے [illegible] رہے اور اخبار عام اور خاص [illegible] میں مضامین بھی لکھتے رہے۔ ان کے [illegible] ہفتہ [illegible] ذیل چار اخبار خود مرتب کرتے تھے۔

(۱) کوہ نور جو پنجاب کا سب سے پہلا اردو ہفتہ وار اخبار تھا اور جس کے آخری ایڈیٹر فوق صاحب تھے۔
(۲) گلزار ہند جو اگست ۱۹۰۱ء میں جاری ہوا۔
(۳) آفتاب پنجاب جو ۱۹۰۵ء یا ۱۹۰۶ء میں بند ہوا۔
(۴) [illegible] گزٹ جو منشی محمد جان قریشی نے عشرہ وار جاری کیا۔

اسی زمانے میں آپ نے شالامار باغ کی سیر ایک چھوٹی سی کتاب لکھی۔ اس سے حوصلہ اتنا بڑھا کہ کتابوں کی تصنیف و تالیف کا [illegible] چسکا لینے لگا۔ چونکہ ان دنوں ناولوں کی گرم بازاری تھی۔ آپ نے بھی انار کلی۔ نیم نصیب۔ عصمت آرا اور [illegible] وغیرہ چند ناول لکھے جن سے شہرت پر لگا کر اڑنے لگی۔ اور مالی حالت بھی اچھی ہو گئی۔

اکتوبر ۱۹۰۶ء میں آپ نے پیسہ اخبار کی ملازمت ترک کر کے زیر [illegible] اپنا اخبار اور پریس جاری کیا۔ اس اخبار کا نام پنجۂ فولاد تھا پہلا پرچہ صرف پچیس تیس کی تعداد میں چھاپا گیا جس کا افتتاحیہ یہ تھا:-

"خدا کے گھر پر سرکار کا قبضہ"

مضمون اس شاہجہانی مسجد کے متعلق تھا جو [illegible] کی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ اور لاہور ریلوے اسٹیشن کے قریب ہونے کی وجہ سے اس وقت محکمہ ریلوے کے قبضے میں تھی۔ ریل والوں نے اس میں ٹریفک سپرنٹنڈنٹ کا دفتر قائم کر رکھا تھا۔ اخبار کے [illegible] پر تمام اخبار نویس دنگ رہ گئے۔ آخر رفتہ رفتہ دیگر اخبارات بھی اس معاملے میں ہمنوا ہوئے اور لارڈ کرزن نے پبلک آواز سے متاثر ہو کر اس مسجد کو واگزار کر دیا۔ آج کل یہ مسجد آباد ہے اور اس پر محکمہ آثار قدیمہ کا بورڈ لگا ہوا ہے۔

[illegible] ۔ [illegible] چھپائی [illegible] تھے۔ [illegible] کے نام [illegible]
[illegible] کر دیا [illegible] تھے۔ باقی [illegible] تقسیم ہو [illegible]
[illegible]
اخبار [illegible] جاری [illegible] میں ہفتہ وار ہو گیا۔ [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
فوق صاحب کا اپنا بیان ہے:-

"ایک شخص [illegible] پتا چلا کہ [illegible] چند روز [illegible] کے بعد [illegible]
[illegible] ساتھ ہوتا تھا اور ایک محمود [illegible] کے نام [illegible] اخبار نکالنا چاہتے ہیں [illegible]
[illegible] مجھے [illegible] کے ساتھ [illegible]
[illegible] اس کی تفصیل یہ ہے کہ [illegible]
اور [illegible] اخبار [illegible]
[illegible]
[illegible] اخبار [illegible] جان کے [illegible]
[illegible] اخبار [illegible] ایک شعر [illegible]

اخبار بند ہو رہے ہیں [illegible] اے فوق اب [illegible]

۱۹۰۴ء میں [illegible] ایک اخبار [illegible] جاری کیا [illegible] فوق صاحب کے سپرد تھی۔ چنانچہ [illegible] کے ساتھ اس اخبار کو بھی چار ماہ تک نہایت قابلیت سے چلاتے رہے۔ مگر بعد میں [illegible] سے مجبور ہو کر اس سے الگ ہو گئے۔

۱۹۰۵ء میں میاں جان محمد گنائی نے کشمیری گزٹ کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا۔ جسے تین سال تک فوق صاحب مدیر اعزازی کی حیثیت سے مرتب کرتے رہے۔ آخر چوہدری جان محمد گنائی کی وفات کے ساتھ اس رسالے کا خاتمہ ہو گیا۔ البتہ اس [illegible] رسالہ کشمیری [illegible] نکل آیا جس کے ایڈیٹر خواجہ کمال الدین بی اے مسلم مشنری انگلستان اور اسسٹنٹ ایڈیٹر فوق صاحب تھے۔ یہ رسالہ [illegible] تک جاری رہا۔ اس کے بند ہوتے ہی ۱۹۰۶ء میں آپ نے ماہنامہ کشمیری میگزین جاری کیا جو غالباً پنجاب [illegible] سے پہلا رسالہ ہے جس نے ہاف ٹون بلاک تصاویر چھاپنے کے علاوہ خاص نمبر نکالنے کی جدت شروع کی۔ چنانچہ اس کا [illegible] نمبر [illegible] کے ایڈیٹروں کے حالات زندگی سے متعلق شائع ہوا تھا۔ اب تک ایک یادگار تاریخی پرچہ تصور کیا جاتا ہے۔

[illegible] میں کشمیری میگزین نے ماہوار سے ہفتہ وار اخبار کشمیری کی شکل اختیار کی۔ اور اپنی مفید اور کارآمد تحریروں سے اہل خطہ میں [illegible] کی۔ اس اخبار نے کشمیر میں بیگار کے مظالم کے خلاف آواز اٹھائی اور متواتر کئی سال تک پرزور مخالفت کر کے اس [illegible]

کے علاوہ ہندوستانی ریاست جموں و کشمیر میں ... کا قیام۔ زمیندار، ساہوکاروں کا ... اور ... کی تحریک [illegible] ... ہر قدم پر ... کی وجہ سے ... لیکن ... سب [illegible] ... مسلمانوں کو ... مل چکا ہے۔ اس اخبار کی کوششوں سے مسلمانوں کو حکومت کی طرف سے ... شروع ہوئے۔ کشمیری ... کی تعداد ... کے ... اس اخبار نے ... کام نہیں کیا ... جب ... تھے ... کے پاس ... رہتے تھے۔ اب ہر شخص ... ہوا ... اور کہتا ہے کہ ... کشمیری مسلمان ... کشمیریوں کا ... یہ بات کہ کشمیری ... کا قیام بھی فوق صاحب ہی کی تحریک کا نتیجہ ہے ... فوق صاحب پچاس ساٹھ سال پیشتر ... نظم و نثر میں ... کہا کرتے تھے وہ اب ... نظر آتا ہے۔

اخبار کشمیری کے ساتھ ساتھ فوق صاحب نے یکے بعد دیگرے طریقت اور نظام وغیرہ ... رسالے جاری کئے ... کی خدمت کرکے بند ہو گئے۔

فوق صاحب گو ریاست میں مرنا اور جینا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن ... کے سلسلے میں ان کا احساس بہت گہرا تھا۔ وہ ان لوگوں میں تھے جو مسلمانوں کی زبوں حالی سے ہمیشہ پریشان رہتے تھے۔ بالخصوص کشمیری مسلمانوں کی ابتری ... شاہی غلامی ... ان کے ... کا باعث تھی۔ وہ خود کشمیری تھے۔ اس لئے بھی انہیں کشمیریت سے والہانہ عشق تھا۔ انہوں نے ساری عمر کشمیر اور کشمیریوں کی خدمت کی۔ کشمیری تعلیم ... اخلاق میں پست اور تہذیب و تمدن میں دنیا نے ... سمجھے تھے۔ فوق صاحب نے انہیں تعلیم کا شوق دلایا۔ اعلیٰ دنیاوی ترقیوں سے آگاہ کیا۔ ان کی سوئی ہوئی قوتوں کو جگایا۔ اور ان کو ترقی یافتہ قوموں کے برابر کھڑا کرنے میں اپنی زندگی وقف کر دی۔

فوق صاحب اعتدال کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ انہوں نے تخریبی کاموں میں الجھنے کو کبھی پسند نہ کیا۔ اختلاف عقائد کی بنا پر کسی فرقے کو برا بھلا نہ کہا۔ تمام عمر تعمیری اسکیموں کو سوچنے میں مشغول رہ کر اپنے آپ کو ایک ایسا ناصح ثابت کیا جو حاکم و محکوم کو بہتر مشورہ دے سکتا تھا۔ ان کا منشا صرف یہ تھا کہ کشمیریوں میں واقفیت عامہ ترقی کرے۔ ان کے خیالات روشن ہو جائیں اور وسعت علم پر ان کی نظریں وسیع ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ توقعات ان کی زندگی ہی میں پوری ہو گئیں۔ اور کشمیر میں ایک وسیع ذہنی، سیاسی اور جسمانی انقلاب پیدا ہو گیا۔

فوق صاحب نے کشمیر کے متعلق بہت سی کتابیں لکھیں جن میں تاریخ کشمیر، مشاہیر کشمیر، خواتین کشمیر، رہنمائے کشمیر، حکایات کشمیر، ... کشمیر، تاریخ اقوام کشمیر، اور تاریخ بڈشاہی وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ ان کتابوں کے لکھنے سے انہوں نے کشمیر کے بھولے ہوئے افسانے نوجوانوں کو سنائے۔ کشمیریوں کے شاندار کارناموں سے قوم کو روشناس کیا اور کشمیر کا نام ساری دنیا میں روشن کر دیا۔

اس ادبی اور تاریخی کام کے علاوہ فوق صاحب نے کشمیری مزدوروں کو منظم کرنے اور ان کی پریشانیاں دور کرنے کے سلسلے میں بھی قابل قدر خدمات انجام دیں۔ غالباً ان کی انہی بے لوث خدمات کا تاثر تھا کہ علامہ اقبال انہیں مجدد کشمیر کہا کرتے تھے۔

فوق صاحب کی دیانت فکر اور پابندی وضع کا پایہ اتنا بلند تھا کہ اگر وہ کشمیر کے چکر سے نکل کر اپنے محدود دائرے کو وسعت دیتے تو ہندوستان کے بہترین اخبار نویسوں اور مصنفوں کی صف میں شمار ہوتے۔ لیکن اس صورت میں وطنی تاریخ کی تدوین کا کام معرض التوا میں پڑ جاتا کیونکہ اس دائرے میں بھی ان کا نعم البدل دستیاب ہونا مشکل تھا۔ پھر بھی جب ہم ان کی تصانیف ... میں تذکرہ علمائے لاہور، یاد رفتگاں (تذکرہ صوفیائے لاہور)، حیات داتا گنج بخش، تاریخ سیالکوٹ، تذکرۃ الصالحین، مہاراجہ رنجیت سنگھ، شالامار لاہور اور فتح ملتان وغیرہ پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ لاہور اور پنجاب کی تاریخ کے متعلق بھی ان ...

بھی صحافی [illegible] مسلم [illegible] جہاں خدمات انجام دیں [illegible] سے منسلک رہے ہیں۔
اس میں شک نہیں کہ ذوق صاحب انگریزی زبان سے [illegible] واقف رہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ [illegible]
خود ہی لکھتے ہیں ؎

انگریزی زبان ہی سے ہو ناواقف تم — اے ذوق [illegible] اخبار [illegible]

اس میں [illegible] فارسی بھی بقدر ضرورت ہی جانتے تھے لیکن تجربہ اور مشق سے انہیں اخبار نویسی کا ڈھنگ خوب آتا تھا۔ [illegible] میں [illegible] پیدا کر دینا ان کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ تھا۔ تاریخ کے مختلف واقعات بھی آپ [illegible] اور [illegible] کر [illegible] والا پڑھنے والوں مزے لیتا رہتا تھا۔ اس لحاظ سے انہیں تاریخ اور صحافت کا مجمع [illegible]۔ حضرت احسان [illegible] فرماتے ہیں ؎

ذوق کی مضمون نگاری میں کشش ہے جس قدر — خود بخود ہوتے ہیں [illegible] اخبار پر

یہی وجہ ہے کہ آپ کا دفتر ہمیشہ اخبار نویسی سیکھنے والوں کا [illegible] رہا ہے۔ بہت سے [illegible] سے [illegible] مختلف [illegible] ادب و صحافت پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ لیکن [illegible] چند [illegible] خاص [illegible] قابل ذکر ہیں۔

(۱) چوہدری رحمت علی [illegible] جو بعد میں انگلستان چلے گئے اور جنہوں نے "پاکستان" کا تصور [illegible] پیش کیا۔
(۲) تاثیر [illegible] (۳) ملک [illegible] جو بعد میں [illegible] (۴) سید [illegible] (۵) ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی جنہوں نے بعد میں اخبار [illegible] جاری کیا اور آج کل انگلستان میں ہیں۔ (۶) [illegible] (۷) [illegible] جو [illegible] خیال - شاہکار [illegible] اور اخبار ریاست دہلی کے بھی ایڈیٹر رہے۔ (۸) [illegible] (۹) [illegible] (۱۰) [illegible] بی اے وغیرہ۔

ذوق صاحب محض تخلص ہی کے ذوق نہ تھے۔ بلکہ فطرتاً شاعر تھے اور غزل، نظم، قصیدہ، مرثیہ، رباعی وغیرہ تمام اصناف سخن پر حاوی۔ ان کے کلام کے دو مجموعے "کلام ذوق" اور "نغمۂ گلزار" چھپ چکے ہیں۔ کلام ذوق کے [illegible] ہوئے ایک لفظ کا اضافہ کرنا بھی مشکل ہے۔

"کلام ذوق بلاشبہ قابل داد ہے۔ جب خیالات اچھے ہوں تو کلام کیوں نہ اچھا ہو۔ کلام ذوق میں فطری آمد [illegible] شوخی کا اظہار بھی۔ [illegible] برجستہ ہیں۔ بغیر تکلف کے کلام کا [illegible] ہے۔ اور اثر پیدا کرنا ایسے ہی شاعر کا کام ہے۔ بعض اشعار سے دلچسپ رندانہ رنگ قطرہ [illegible] کی طرح ٹپک رہا ہے۔ کئی اشعار گنجینۂ معانی ہیں۔ اخلاق و محبت [illegible] کی بھی کمی نہیں۔ بعض اشعار پر تو جی چاہتا ہے کہ داد دوں اور دوڑوں۔ بہت سے اشعار میرے حسب حال ہیں۔ نیچرل کیفیتوں کے اظہار اور کشمیر کے نظاروں میں خوب جوش دکھایا ہے اور [illegible] کے شان نزول نے تو آپ کی [illegible] کا رتبہ بہت بلند کر دیا ہے۔"

محسن الملک

ڈاکٹر سید محمود

نواب محسن الملک کی شخصیت کو اچھی طرح سے سمجھنے کے لیے پہلے ان باتوں کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے جس سے ان کی ذہنی نشوونما ہوئی اور جو ان کے کارناموں میں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ اس سلسلے میں [illegible] پہلے یہ جن کو انھوں نے [illegible] ہیں سے غیر معمولی شخصیتوں کی [illegible] ان کے ذاتی صفات اور خصوصیات کے علاوہ [illegible] زبردست اثر ہوتا ہے [illegible] وہ سامنے رکھتے ہیں [illegible] اصول زندگی اور لائحہ عمل مرتب کرتے ہیں۔

نواب محسن الملک جن کا اصلی نام سید مہدی علی تھا ۹ دسمبر ۱۸۳۷ء کو اٹاوہ کے ایک مشہور سادات خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے نانا میر [illegible] محمود علی ایک زبردست عالم اور صدر الصدور کے عہدے پر فائز تھے۔ [illegible] ریاست ٹونک میں منصب وزارت پر بھی سرفراز رہے تھے۔

ان کی ابتدائی تعلیم اس زمانے کے دستور کے مطابق [illegible] کتب کے علاوہ [illegible] علماء کے حلقہ درس میں ہوئی جہاں انھوں نے عربی، فارسی اور حدیث و تفسیر میں اچھی دستگاہ حاصل کر لی۔ انگریزی تعلیم انھوں نے باقاعدہ نہیں حاصل کی تھی مگر اپنی غیر معمولی ذہانت اور مشق و مزاولت سے اچھی خاصی لیاقت پیدا کر لی تھی۔ یہاں تک کہ وہ انگریزی اخبار وغیرہ بے تکلف پڑھ اور سمجھ لیتے تھے۔

انھوں نے سولہ سترہ برس کی عمر میں دس روپیہ ماہوار سے ملازمت شروع کی اور رفتہ رفتہ سررشتہ داری اور تحصیلداری کی منازل طے کرتے ہوئے ڈپٹی کلکٹری کے درجے تک پہنچ گئے جو اس وقت مسلمانوں کے لیے معراج ملازمت تھی۔ [illegible] اس قدر [illegible] تو معمولی ہی لیکن ان کے جیسے [illegible] اور ماہر نظم و نسق کے لیے [illegible] تھی۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ایک وقت میں ہیوم [illegible] ان کے بالادست افسر تھے جو بعد میں انڈین نیشنل کانگریس کے بانی ہوئے اور جنھوں نے ان کی قابلیت کے متعلق کہا تھا کہ باوجود ایسی اعلیٰ درجے کی لیاقت اور کارگزاری اور ضلعے کیا صوبے کے انتظام کی صلاحیت رکھنے کے ابھی تک وہ ڈپٹی کلکٹری کے عہدے سے آگے نہیں بڑھ سکے ہیں۔

لیکن انھیں ابھی اپنے اصلی جوہر دکھانے کا موقع کہاں ملا تھا؟ اس لیے ۱۸۷۴ء میں انگریزوں کی ملازمت سے مستعفی ہو کر انھوں نے نظام حیدرآباد کے یہاں ملازمت کر لی۔ انھوں نے وہاں پہنچ کر انتظامی امور میں ایسا درک دکھلایا کہ سرسالار جنگ سے لے کر انگریز ریذیڈنٹ تک سبھی ان کے معترف ہو

[illegible] گئے اور [illegible] سیاسیات [illegible] سے متعلق ہو گئے۔ اس [illegible] حکومت [illegible]
۲۳ مارچ [illegible] میں [illegible] جنگ [illegible] انقلاب [illegible] زمینوں [illegible] ریاست کے [illegible]
[illegible] وہ [illegible] سیاسیات سے متعلق ہونے کی وجہ سے [illegible]
انھوں نے [illegible] میں ہندوستان کی [illegible] آمدنی [illegible]
[illegible] انھوں نے مسلمانوں کی مختلف [illegible]
[illegible] تعلقات میں [illegible]
کران کے بعض [illegible]

[illegible]

[illegible] محسن الملک کو ایک [illegible]

[illegible]

ان کی صحت چونکہ خراب ہو چکی تھی اس لئے [illegible]
محسن الملک کو [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
کو پیش کیا تھا۔

غرضکہ وہ ملک کی [illegible] بن گئے [illegible]
[illegible] ہوئے۔

نظام حیدرآباد ان کو [illegible]
کی وجہ سے محسن الملک اور سر آسمان جاہ دونوں کو [illegible] رہے۔

جب انھوں نے حیدرآباد چھوڑا تو خواص اور عوام دونوں کو [illegible] حیدرآباد میں ملک الشعراء کے سینے
دلی جذبات پر قابو نہ پا سکے اور بے اختیار کہہ اٹھے ؎

مہدی کو اگر [illegible] کہتے ہیں — یا محسن ملک [illegible] کہتے ہیں
زیبا ہے کہیں محسن عالم اسے داغ — جو چاہئے کہنا وہ کہاں کہتے ہیں

اس خیر کا انسان کوئی ہو تو سہی — ذی مرتبہ ذی شان کوئی ہو تو سہی
ہر شخص کو ملحوظ ہے خاطر [illegible] — یوں دل کا نگہبان کوئی ہو تو سہی

ایک طرف تو محسن الملک اپنی ملازمت کے سلسلے میں انتظامی امور میں دلچسپی اور حصہ لیتے رہے دوسری طرف سرسید احمد خان سے ان کے تعلقات

کالج منتقل ہو گئے۔ یہ شروع ہی سے سرسید کے خاندان [illegible] معتقد رہے تھے بلکہ سرسید کی تحریک [illegible]
[illegible] اس وقت [illegible] ملک ہے۔

سرسید کی زندگی ہی میں وہ [illegible] تہذیب الاخلاق میں [illegible]
[illegible] تحقیقی [illegible] کی ضرورت [illegible]
[illegible] جس کے لکھے ہوئے ان کے [illegible]

محسن الملک نے کانفرنس میں ۱۸۸۶ء سے شرکت کرنی شروع کی اور اسی سال [illegible] اور تحقیقی مقالے پڑھے [illegible]
میں ہندوستان [illegible] ہندوستان کے سیاسی مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہونے لگی [illegible] سرسید [illegible] محسن الملک کی [illegible]
بیداری کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

وہ جیسا کہ [illegible] سرسید کے علمی اور اصلاحی مشن [illegible]
میں وہ کالج کے [illegible] سب سے [illegible] گئے۔

سرسید کا انتقال ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو ہوا۔ اس وقت کالج مالی پریشانیوں میں گھرا تھا [illegible] سرسید میموریل فنڈ قائم کر کے اپنی [illegible]
سے نجات دلائی اور کالج کو یونیورسٹی بنانے کا مسئلہ قوم کے سامنے پیش کر دیا۔

سرسید کے بعد ان کے صاحبزادے جسٹس سید محمود سکرٹری ہوئے [illegible] کے باعث اس عہدے سے علیحدہ ہو گئے اور ۱۸۹۹ء میں نواب
محسن الملک کو یہ عہدہ پیش کیا گیا۔

اس کے بعد [illegible] کی حیثیت [illegible] سرسید کے جانشین ہو گئے [illegible]
جوش و خروش کے ساتھ [illegible] گئے۔

۱۹۰۰ء میں اردو ہندی کا قضیہ پھر [illegible] نے یو پی میں [illegible] دیگر علاقوں میں ہندو مسلم تعلقات میں تلخی پیدا کر دی۔

انہوں نے ایک طرف گورنمنٹ سے [illegible] اس مسئلے پر [illegible] دوسری طرف مسلمانوں کو صاف اور کھلے لفظوں میں سمجھایا کہ [illegible]
کے فوائد اور اغراض کے خلاف [illegible] ہونے سے احتراز کریں۔ انہوں نے [illegible] مسلمانوں کی طرف سے حکومت میں پیش کیا [illegible]
[illegible] سیاسی بے چینی کی گویا عکسی تصویر ہے۔ نواب محسن الملک کی زندگی کا آخری دور ہندوستان کی تاریخ سیاست کا ایک اہم باب ہے اور ہندوستان
کی جنگ آزادی کا ایک ایسا موڑ ہے جسے سمجھے بغیر کوئی آنے والی سیاسی تحریکوں کا صحیح تجزیہ نہیں کر سکتا۔

یہی زمانہ تھا جب میں علی گڑھ [illegible] انگلش اسکول میں داخل لیا گیا۔ میں نے شروع ہی سے علی گڑھ کی سیاسی اور ادبی سرگرمیوں میں دلچسپی لینی شروع
کر دی۔ کیونکہ میرا مطالعہ عمر کے لحاظ سے وسیع تھا اور میں مولانا حالی، شبلی نعمانی اور مولوی نذیر احمد کی بیشتر تصانیف پڑھ چکا تھا مسدس حالی کا ایک بڑا حصہ
اور بہت سی دوسری قومی نظمیں مجھے یاد تھیں۔ ان سب باتوں کے علاوہ میں آتے ہی یونین کلب کے مباحثے کی [illegible] میں شامل ہونے لگا جہاں پہلے ہی
سال میں اسکول کے طلبا میں اول رہا اور کالج کلاسوں کو ملا کر پانچواں [illegible] مقرر مانا گیا۔

یہی وجہ تھی کہ کالج کے لائق اور ممتاز طلبا ہی نہیں بلکہ اساتذہ بھی مجھے اپنی صحبتوں میں شرکت کا شرف بخشنے لگے اور جلد ہی میری رسائی نواب
محسن الملک تک بھی ہو گئی۔

جو لڑکے ان دنوں کالج کے ممتاز طلبا میں تھے اور جن کے ناموں سے آج بھی علیگڑھ کی تاریخ روشن ہے ان میں عبدالرحمن بجنوری (جو اس وقت
[illegible] درجے میں تھے)، تصدق احمد خان شیروانی (جو مجھ سے دو تین درجے آگے تھے) اور قاضی تلمذ حسین (جو اس وقت کالج میں تھے) خاص طور پر

[illegible]

نافل ہو گیا۔

ان لوگ [illegible] کے ساتھ میں نواب محسن الملک کے یہاں حاضر ہوتا۔ [illegible] نواب صاحب کبھی ملنے میں [illegible] بیٹھ کر [illegible] پوچھتے [illegible] نہایت محبت اور شفقت سے [illegible] تعلیم کے متعلق [illegible] تو سب لوگ بھی [illegible] کبھی کبھی سیاست پر گفتگو کرتے [illegible] کبھی طلباء کی [illegible] کرتے [illegible] بڑی شفقت سے کہتے کہ تمہاری قوم ابھی ان حالات کو سمجھتی نہیں ہے [illegible] مسلمان [illegible] مجھ کو نواب صاحب سے کبھی کبھی گفتگو کرنے اور بعض وقت [illegible] کے متعلق [illegible] کرتے [illegible] اس وقت محسن الملک [illegible] گفتگو [illegible] سے [illegible] بہت [illegible] جو شخص ہیں [illegible] یہ بھی [illegible]

ان ہی دنوں یعنی [illegible] میں نواب صاحب نے [illegible] اور علی گڑھ [illegible] وسیع کرنا [illegible] قومی تعلیم اور قومی [illegible] مسلمانوں کے [illegible] ایک جلسے میں [illegible] تقریر کی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ مسلمانوں کی [illegible] سلطنت [illegible] حاصل ہو سکتی ہے لیکن ملی سلطنت کی [illegible] سلطنت کا [illegible] خوب [illegible] ملی سلطنت کا [illegible] [illegible]

میں لی ہو گی اس ایک خطیبانہ جملے سے [illegible]

سنہ ۱۹۰۳ء میں [illegible] کالج میں [illegible] سوسائٹی [illegible] عبد الرحمن [illegible] تصدق احمد خاں شیروانی [illegible] مولانا ظفر علی خاں [illegible] ان میں صرف عبد الرحمن اور [illegible] زندہ ہوں [illegible] سوسائٹی کا مقصد یہی اسلام [illegible] اور ہندوستان سے انگریزوں کو نکالنا تھا۔ طلباء کی یہ جماعت [illegible] کسی [illegible] تھی۔ [illegible] بہت [illegible] مسلمانوں [illegible] ہندوستان سے [illegible] نکالنے کی کیا تدبیر ہو سکتی ہے؟ یہ جماعت [illegible] کالج کے طلبا کے [illegible] انگریزوں کے خلاف پروپیگنڈا کرتی [illegible] ایک موقع پر سرسید کی قبر پر جاکر اس بات کا حلف اٹھایا تھا کہ ہم لوگ جب تک انگریزوں کو ہندوستان سے نکال [illegible] میں سے تقریباً ہر ممبر اپنی قسم پر قائم رہا۔

مسٹر [illegible] اس وقت ہیڈ ماسٹر تھے۔ یہ صاحب بہت بدزبان تھے اور ان کی بدزبانی کی وجہ سے طلبا ان سے بہت ناراض تھے۔ ایک روز طلبا کسی کام سے ان کے پاس گئے، انہوں نے طلباء کو (Herd of Pigs) سوروں کے گلے کہہ کر اپنے بنگلے سے نکلوا دیا۔ اس پر طلباء میں بڑی برہمی پھیلی۔ نواب صاحب تک شکایت پہنچی لیکن اس وقت کے حالات کے لحاظ سے وہ انگلش اسٹاف کو ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔ [illegible] آپس کے

[illegible]

[illegible] کبھی نواب صاحب کے ساتھ [illegible]

وہ بھی چاہتے اور کبھی غصہ میں [illegible] تو اکثر مجھے سامنے بٹھا کر سمجھانا شروع
کرتے تھے: تو سمجھتا ہے کہ میں ایک پیسہ کا آدمی ہوں، انگریزوں سے ڈرتا ہوں [illegible] انگریزوں کا خوشامدی ہوں۔ وہ کہتے تھے کہ [illegible] الفاظ زبان سے
نہیں کہتا لیکن تیرے دل میں [illegible] کمزور نہیں ہوں اور نہ انگریزوں کا خوشامدی ہوں
مگر تیری قوم ابھی ان خیالات کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں ہے۔ [illegible] نے ہندی کا اجراء کیا تھا تو اس وقت
اردو ڈیفنس کمیٹی کا میں صدر بنایا گیا تھا اور مسلمانوں کے بڑے بڑے جلسوں میں [illegible] ان سے حکومت ڈر گئی۔ میرے خلاف خود کالج کے
ٹرسٹیوں اور بڑے بڑے مسلمانوں نے شکایتیں کیں [illegible] تو ٹرسٹیوں کے جلسے میں کارروائی رد ہو گئی [illegible] ٹرسٹیوں نے مجھے اردو ڈیفنس کمیٹی
سے استعفا دینے پر مجبور کیا۔ جب تیری قوم کا یہ حال ہے تو پھر ان میں [illegible] خیالات [illegible] کی گنجائش کہاں ہے؟ میں جانتا ہوں کہ ہندوؤں
کے جھگڑے سے انگریز فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن مسلمانوں میں اب تک سیاسی شعور نہیں پیدا ہوا ہے کہ اس بات کو سمجھیں۔ جب یہ شعور پیدا ہو جائے گا
تو دیکھنا وہ تیری کانگریس سے کبھی پیچھے نہیں رہیں گے۔ پھر کہتے [illegible] کیا تو نہیں جانتا کہ ۱۸۵۷ء میں کیا ہوا؟ اس تحریک نے جسے انگریز وہابی تحریک کہتے ہیں
انگریزوں کے خلاف کیا کیا کام کئے۔ ابھی چند برس پہلے تک انگریز مسلمانوں کے سخت خلاف تھے، سرسید اور ان کے ساتھیوں کی مسلسل کوششوں سے

[illegible]

[illegible]

[illegible] ... ملتوی کریں

[illegible]

[illegible]

[illegible] ... جاتے تھے۔

[illegible]

[illegible] ... مصداق بن گیا ؎

[illegible]

[illegible]

جب جارج پنجم اپنی ولی عہدی کے زمانے میں ہندوستان میں بغرض سیر و سیاحت آئے تو ٹرسٹیان کالج کی کوششوں کے باوجود علیگڑھ آنا ان کے پروگرام میں شامل نہ کیا گیا لیکن نواب صاحب نے سر آغا خان کے ذاتی اثر و رسوخ سے فائدہ حاصل کرکے آخر کار انہیں [illegible] کو علی گڑھ بلوا ہی لیا۔ ان کی آمد کی یادگار میں سائنس اسکول کے قیام کا اعلان ہوا اور ولی عہد کی موجودگی میں سر آدم جی پیر بھائی (بمبئی) نے ایک لاکھ دس ہزار روپے کا عطیہ دینے کا تار بھیجا۔ پرنس آف ویلز نے اسٹریچی ہال اور کالج کلاسز کا معائنہ کرکے یکی پارک اور بورڈنگ ہاؤس کے چھ کمروں کو بھی ملاحظہ فرمایا جس میں سے ایک کمرہ میرا بھی تھا۔ اس میں شہنشاہ جرمنی اور کچھ ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں کی تصویریں بھی تھیں۔ ولی عہد نے پوچھا کہ کیا تم جرمنی کے بادشاہ کو پسند کرتے ہو؟ میں نے

جب سپاہی [illegible] ... [illegible]

[illegible] ... امیر حبیب اللہ خان والی افغانستان [illegible] ...

[illegible] ... [illegible]

[illegible] ... [illegible]

نواب محسن الملک نے برجستہ ... کے یہ اشعار پڑھے ـ

فلا ان الالہ ذو ولد	فیا ان الرسول له صحاب
[illegible]	اور رسول کے [illegible]
ما علی اللہ والرسول معا	[illegible]

[illegible] ... سمجھ سکتے ہیں ...

امیر افغانستان نے فرمایا کہ ... [illegible] ... متعلق سوالات کئے اور ... [illegible]

تب ترشیلوں نے ... [illegible] ... ہو سکتا۔ اس جواب سے نواب صاحب ... [illegible]

امیر افغانستان نے یہ نصیحت کیا ... [illegible] ... پابند رہیں جس طرح ... [illegible]

آخر کو جب وہ الماری دکھائی گئی جس میں قرآن پاک ... [illegible] ... متلاشی ہوں کہ بچے قرآن پڑھتے ہیں یا نہیں۔ اس بات پر چار لڑکے پیش کئے گئے تو کہنے لگے کہ میں آپ کے منتخب لڑکوں کا امتحان لینا نہیں چاہتا بلکہ میں خود لڑکوں کا انتخاب کروں گا۔ ... کی مسجد میں انہوں نے نماز ظہر ادا کی اور اس کے بعد ... تشریف لائے ... ایک طالب علم علی الدین نامی کو اپنے قریب بلا کر بٹھایا اور فرمایا کہ قرآن مجید میں سے جو کچھ یاد ہو سناؤ ... اتفاق سے قاری اور خوش الحان تھا۔ اس نے نہایت خوش الحانی کے ساتھ بعد تعوذ و تسمیہ سورۂ عمران کی یہ رکوع تلاوت کرنی شروع کی:

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ ... الخ

دو چار ہی آیتوں کی تلاوت کے بعد ایک عجیب پُراثر سماں بندھ گیا اور ہر شخص پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ ادھر شاہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور قطرے ڈھلک ڈھلک کر رخسار اور داڑھی تک بہنے آئے۔ رکوع ختم ہونے تک کئی رومال آنسوؤں سے تر ہو چکے تھے۔

امیر افغانستان ... کر نہایت جوش میں اللہ اکبر کہتے ہوئے اور بار بار کبھی عربی کبھی فارسی اور کبھی انگریزی میں فرمانے لگے ... [illegible]

[illegible] : They are lions [illegible]

[illegible]

[illegible] صاحب [illegible] کی [illegible] سے [illegible]

[illegible] صاحب [illegible] مسٹر گوکھلے [illegible]

[illegible] صاحب نے عرض کیا کہ [illegible] ہال میں [illegible] آپ [illegible]

[illegible] پیشکش منظور کرلی

اس وقت سرپرنسپل نے کہا:

[illegible]

[illegible] میں کوئی شک نہیں کہ [illegible] جناب [illegible] ہیں۔

اس کا بر جستہ جواب دیا: [illegible]

[illegible] I am a [illegible] king

بے شک میں [illegible]

اسٹریچی ہال میں [illegible] پیش کیا گیا [illegible] سے مزین تھا۔

[illegible] کی تقریر بہت مختصر تھی [illegible] انہوں نے [illegible] کہا کہ [illegible]

مختصر طور پر بیان کئے۔ [illegible] کی دعوت [illegible] جس [illegible]

وہیں انہوں نے بیس ہزار روپے [illegible] اور [illegible] سالانہ وظیفہ [illegible]

عطیات دئے۔

ابھی جوش و خروش کم نہیں ہوا تھا کہ مسٹر گوکھلے علی گڑھ تشریف لائے۔ اس وقت [illegible] موجود تھے۔ انہوں نے مسٹر گوکھلے کو فوراً طلباء کی طرف سے کالج میں آنے کی دعوت دے دی۔ پرنسپل [illegible] اس بات [illegible] مسٹر گوکھلے کو لکھا کہ آپ کو طلباء نے بغیر میری اجازت کے مدعو کر لیا ہے۔ اس پر بھی آپ تشریف لائیں [illegible] تعلیمی [illegible] گفتگو کریں گے۔ جب طلباء کو معلوم ہوا تو انہیں بہت غصہ آیا۔ مسٹر گوکھلے نے پرنسپل کو جواب دیا کہ آپ کے کہنے کے مطابق میں صرف تعلیمی مسائل پر طلباء سے گفتگو کروں گا۔ آپ مطمئن رہئے۔

طلباء میں ایسا جوش و خروش تھا کہ وہ چاہتے تھے کہ شہر جاکر جہاں مسٹر گوکھلے ٹھہرے ہوئے تھے ان کی گاڑی خود کھینچ کر لائیں۔ بڑی مشکل سے انہیں اس بات سے روکا گیا۔ لیکن جب مسٹر گوکھلے کی گاڑی کالج کے صدر دروازے پر آئی تو طلباء نے ان کی گاڑی کھینچی۔ جس جوش و خروش کا اظہار کیا گیا تھا [illegible] مسٹر گوکھلے کو مسلمان نوجوانوں کا سیاسی جوش دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور [illegible] ان کے ہر ہر لفظ سے دلی جذبات کا اظہار ہو رہا تھا اور ہر ہر جملے پر تالیوں کی گونج اٹھتی تھی اور مشکل سے روکی جاسکتی تھی۔

مسٹر گوکھلے نے وعدے کے مطابق صرف تعلیمی مسائل پر گفتگو کی لیکن اس انداز سے گفتگو کی کہ ان کی ساری تقریر سیاست وقت کی تفسیر تھی۔ آخر میں انہوں نے کہا کہ ملک کے ایک خادم کی جو عزت افزائی علی گڑھ میں ہوئی ہے اس سے مجھے امید ہو گئی ہے کہ آزادی میں اب زیادہ دیر نہیں ہے۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ مسلمان نوجوان بیدار ہو چکے ہیں اور کیسی آگ ان کے سینوں میں چھپی ہوئی ہے۔

[illegible] ہندوستانی [illegible] مسلمانوں [illegible] تھا۔

[illegible] مسٹر آرچبولڈ [illegible] نواب محسن الملک نے [illegible] کی سخت الفاظ میں مذمت کی [illegible] سیاسی [illegible] اپنا [illegible] کے ساتھ ہمدردی رکھتا وہ اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ [illegible] صاحب [illegible] سیاسی [illegible] میں نہایت اہم تقریر کی تھی اور مسٹر آرچبولڈ [illegible] نہایت شاندار [illegible] [illegible]

پرنسپل اور انگلش اسٹاف کو طلبا کا یہ مظاہرہ جو بہت ناگوار ہوا۔ [illegible] انگلش اسٹاف اور طلبا کے تعلقات [illegible] اور خراب ہو گئے نواب محسن الملک نے [illegible] کے وقت اسے [illegible] جو کچھ کہا تھا وہ [illegible] ہو گیا۔ ظاہر [illegible] معلوم ہوتا تھا کہ نواب صاحب انگلش اسٹاف سے بہت مرعوب ہیں اور انگریزوں کے خلاف ایک لفظ بھی سننا پسند نہیں کرتے [illegible] اور طلبہ [illegible] شامل [illegible] مقصد [illegible] ہوتا جا رہا تھا۔

اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ ۱۹۰۶ء میں [illegible] ایک [illegible] سوسائٹی قائم کی تھی جس کا مقصد [illegible] انگریزوں کو کسی صورت سے ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کیا جائے۔ اس سوسائٹی [illegible] ۱۹۰۷ء [illegible] کسی [illegible] بات رہتی۔

حکومت نے علیگڑھ [illegible] کالج بنا [illegible] کر دیا جائے۔ ۱۹۰۷ء کا واقعہ ہے۔ نواب محسن الملک کو جب یہ معلوم ہوا [illegible] انہوں نے اس تجویز کی نہایت شدید مخالفت کی اور [illegible] اس تجویز کا منشا [illegible] معلوم ہوتا ہے حکومت غالباً چاہتی ہے کہ علیگڑھ کو [illegible] تعلیم [illegible] کر دیا جائے تاکہ مغربی علوم و فنون سے جو شورش ہندوستان میں پیدا ہوئی ہے اس کے اثرات [illegible] پرنسپل مارلین نے [illegible] کی کوشش کی کہ حکومت کا منشا نہیں ہے بلکہ حکومت اس کو ایک مکمل مسلمانوں کا دارالعلوم بنانا چاہتی ہے لیکن محسن الملک کی شدید مخالفت کے باعث یہ تجویز کھٹائی میں پڑ گئی۔

نواب [illegible] جب [illegible] سیاسی مسائل [illegible] بحث شروع کر دیتے تو وہ [illegible] باتوں کو [illegible] کرتے ہوئے فرماتے کہ گھبراتے کیوں ہو۔ بہت جلد [illegible] طلبا [illegible] ایسے خیالات [illegible] ہو جائیں گے گو اس وقت شاید میں زندہ نہ رہوں گا۔ سرسید کا بھی دراصل یہی منشا تھا اور میرا بھی یہی ہے کہ [illegible] ملک کے [illegible] پیدا ہوں لیکن آہستہ [illegible] سے کام لینا ہی وقت اور مصلحت کا تقاضا ہے۔ ابھی ہماری قوم میں [illegible] کی صلاحیت نہیں ہے۔

عجیب اتفاق کہ مسٹر [illegible] کو [illegible] کے [illegible] بعد علیگڑھ کی [illegible] فروری ۱۹۰۷ء کو ایک ایسا واقعہ ہو گیا کہ اس نے طلباء کی صف میں ہیجان برپا کر دیا۔ راجہ غلام حسین سے جو کالج کے ایک ممتاز طالب علم تھے ایک پولیس کانسٹیبل کا جھگڑا ہو گیا۔ ایسے جھگڑے ہمیشہ ہی ہوا کرتے تھے مگر مسٹر مارلین ہمیشہ طلباء کا ساتھ دیتے تھے اور ایسے معاملات رفع دفع کرا دیا کرتے تھے۔ یہ بات کالج کی تقریباً روایت بن چکی تھی لیکن جب راجہ غلام حسین کے معاملے میں سپرنٹنڈنٹ پولیس نے پرنسپل آرچبولڈ سے شکایت کی تو انہوں نے بلا سوچے سمجھے راجہ غلام حسین کو کالج سے خارج کر دیا۔

انگلش اسٹاف اور طلباء میں کشیدگی تو پہلے ہی سے تھی۔ یہ واقعہ گویا کھلم کھلا جھگڑے کا شاخسانہ بن گیا۔ طلباء میں جوش اور غصہ کی لہر پھیل گئی اور انہوں نے بہت زور و شور کے ساتھ احتجاج کا نعرہ بلند کر دیا اور جلسے کرنے شروع کر دیئے۔ اس پر کالج کے انگلش اسٹاف کا غصہ اور بھڑک اٹھا

[illegible] کالج [illegible] نہیں [illegible] سمت کا [illegible] طلبہ [illegible] اسلامی [illegible] کے [illegible] الفاظ استعمال کئے۔ شاہ محمد خان شیروانی [illegible] ایک [illegible] یہ [illegible] پڑھنے [illegible] کر تم زندگی کے ساتھ احسان کرتے ہیں [illegible] گستاخی کرنے [illegible] لوگ [illegible] [illegible] کو [illegible] کرسکتے ؟

اس واقعے سے [illegible] طلباء کی [illegible] ہو گئے ہیں [illegible] چنانچہ گھبراہٹ میں انہوں نے پولیس کو اطلاع [illegible] کی [illegible] حفاظت کے [illegible] کی اذیت پہنچانے کا [illegible] یہ اتفاق تھا کہ [illegible] گیا تھا۔ چاروں طرف [illegible] گئے [illegible] رہے مگر [illegible] لگ گئے۔

طلباء کے وفود مختلف [illegible] ہو گئے اور نواب وقار الملک [illegible] پاس [illegible] نہیں [illegible] نواب وقار الملک [illegible] بیانات سے بہت متاثر ہوئے [illegible] مصلحت برتتے ہیں میں ہرگز کوئی مصلحت نہیں برتوں گا۔۔۔ طلباء [illegible] کے ساتھ [illegible] نواب محسن الملک [illegible]

ابھی اس کامیابی پر طلباء بہت خوش تھے لیکن جب [illegible] طلباء [illegible] گئے۔ طلباء نے [illegible] نواب محسن الملک کا جادو [illegible] گیا۔

ایک خفیف واقعے سے طلباء [illegible] اس نے نواب محسن الملک کو [illegible] کالج سے [illegible] شیروانی اور [illegible] بھی تھا۔

ابھی طلباء کی اسٹرائک جاری تھی کہ ایک دن نواب صاحب نے [illegible] متاثر ہوئے اور ان سے [illegible] طلباء نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے [illegible] نواب صاحب [illegible] اور ایک خط اپنے ہاتھ سے تحریر کیا جس کی [illegible]

اس فقرے نے اور اس خط کے پورے مضمون نے طلباء پر جادو کا اثر [illegible] نواب صاحب نے [illegible] کے [illegible] چکے تھے۔
طلباء اب تک دوران اسٹرائک میں بھی نواب صاحب [illegible] کے ساتھ [illegible] ہیں اور ہمت کو راہ نہیں دے رہے ہیں لیکن ان کے [illegible] طریقے پر طلباء کی [illegible] تحریر کے [illegible] طلباء کے ساتھ ان کی محبت ٹپکتی تھی۔ اس خط سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ علم نفسیات کے کتنے بڑے ماہر ہیں۔ [illegible] پرانے طالب علموں کی نصیحتیں نہ کرسکی تھیں۔۔۔

ظاہراً تو یہ طلبائے کالج کی ایک اسٹرائک تھی لیکن حقیقتاً علی گڑھ کے طلباء کی یہ اسٹرائک مسلمان قوم کی سیاست کی سنگ بنیاد تھی۔ اس اسٹرائک کے بعد ہی مسلم لیڈروں نے محسوس کرلیا کہ اب مسلمان نوجوان پرانی سیاسی پالیسی سے بیزار ہو چکے ہیں [illegible] ضروری ہو گیا ہے کہ ان کے لئے ایک سیاسی

پیش ختم ہوا جاتے، جب وہ اسلام میں مہم انگیز بنیاد رکھ گئے۔

مسٹر آرنلڈ کے بعد ... سید محمود جو ناظم ... صبح کے وقت ان کی کوٹھی پہنچے۔ اس وقت نواب صاحب ذکر میں مشغول ہو رہے تھے۔ نواب صاحب نے ہم لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا یہ تو سب خود باقی ہو اور بہت نوکروں کو بھی باقی کہدیا ہے۔ تم سب بیٹھ کے ... ہو رہے ذکر میں ... ان سے پوچھا گیا کہ حضور کیا بات ہے تو فرمانے لگے کہ مجھے رات میں پانی دو بجے کی سخت حاجت ہے کل رات صرف گلی روان کا پیمانہ ذکر تھا جو ہو گیا رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ تو جا کر ذرا ہاتھ کے اس بہرے کو جو پرنسپل کی کوٹھی میں رہتا ہے بھیج دے اور اس سے کہہ کہ میں اس کو کچھ انعام دوں گا۔ میں نے اس بہرے کو دعا دی طرح بلایا لیکن اس نے آنے سے صاف انکار کر دیا۔ تب مجھ کو غصہ آیا اور میں نے کہلوایا کہ کل صبح میری کوٹھی سے نکل جائے۔ آج صبح کو بہرے نوکروں نے جب اس کو مکان سے نکل جانے کو کہا تو بولا کہ جاؤ سرکار سے کہو کہ کیا رات کی بات ابھی تک اب تک یاد ہے؟ ——— نوکر بھی بچوں کی طرح مجھ کو نہ سمجھتے ہیں۔ جب ہم سبھوں نے پوچھا کہ پھر کیا ہوا؟ تو فرمایا کہ جیتا کیا میں چپ ہو گیا۔

اس ایک واقعے سے نواب صاحب کی مروت، نیکی اور شرافت کا پتہ چلتا ہے جس سے لوگ ان کا ناجائز فائدہ بھی اٹھایا کرتے تھے۔

ان تھک محنتوں اور کالج کی ... مسٹر آرنلڈ اور دیگر پیچیدگیوں سے شملہ میں نواب صاحب کو کافی صدمے پہنچائے مگر باوجود ان تمام باتوں کے وہ قوم کی خدمت کرنے سے باز نہ آئے۔ ان کی آخری علالت کا واقعہ بھی اس امر کا کافی ثبوت ہے کہ انہوں نے خدمت قوم میں جان دے دی۔ آخر ستمبر ۱۹۰۷ء میں وہ دہلی سے معاملات کی اسکیم میں مسلمانوں کے حقوق کی توسیع وغیرہ کے لیے ملاقات کرنے شملہ تشریف لے گئے تھے وہیں وہ زبردست طور پر علیل ہو گئے ... اپنے خاص ڈاکٹر کو معالجہ کے لیے مامور کیا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا اور ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۷ء کو ۹ بجے شام اس حقیقی محسن الملک اور خادم قوم نے ... اپنی زندگی کا اجر حاصل کرنے کے لیے ... فرمایا کہ زبان وحی کا یہ قول سچا ہے کہ:

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِين (خدا نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا)

حالی نے چند رباعیات میں نواب محسن الملک کی زندگی کی تصویر کھینچی ہے اس کو بھی سن لیجئے ؎

دم بھر نہ کبھی جان کو آرام دیا
خدمت کے لیے قوم کی مر مر کے جیا
پیری بھی نہ سد راہ اس کی نہ مرض
صدیوں کا تھا جو کام وہ برسوں میں کیا

پیری میں جوانی کو کیا مات اس نے
آرام پہ اپنے ماری لات اس نے
تدبیر سے محنت سے دکھا دی سب کو
کالج کی ترقی میں کرامات اس نے

مدراس میں سوتوں کو جگایا جا کر
غل علم کا بہار میں مچایا جا کر
بھائی بھائی مرتی جہاں قوم میں تھی
واں آب حیات ان کو پلایا جا کر

مکتبہ چٹان کی ایک اور پیشکش

شورش کاشمیری کے قلم سے

سید عطاء اللہ شاہ بخاری

(نفسیاتی مطالعہ و سوانحی خاکہ)

اردو زبان کے سب سے بڑے عوامی خطیب کی پرشور زندگی کے لیل و نہار کی سرگزشت جس میں نصف صدی کے سیاسی حالات کی عکسی تصویریں جا بجا نظر آتی ہیں

——— شاہ جی کے خاندانی حالات

——— شاہ جی کے ذاتی واقعات

——— شاہ جی کے تحریکی معرکے

——— شاہ جی کے جماعتی کارنامے

——— شاہ جی کے انتخابی ہنگامے

(خطیب کی کہانی ادیب کے قلم سے)

سوانحی خطوط کا نیا پیرایہ ——— اور ——— سیاسی حالات کا نیا جائزہ

(زیر طبع)

مکتبہ چٹان - ۸۸ میکلوڈ روڈ - لاہور

بے حد چمک دینے والا سن لائٹ
کپڑوں کو سفید اور اُجلا دھوتا ہے
SUNLIGHT SOAP
سن لائٹ
صابن

تلو

[illegible]نس میں اب وٹامن اے کے
[illegible] بین الاقوامی یونٹس شامل کر دیئے گئے ہیں
آپکی توجہ کیلئے تلو کی چند اہم خصوصیات

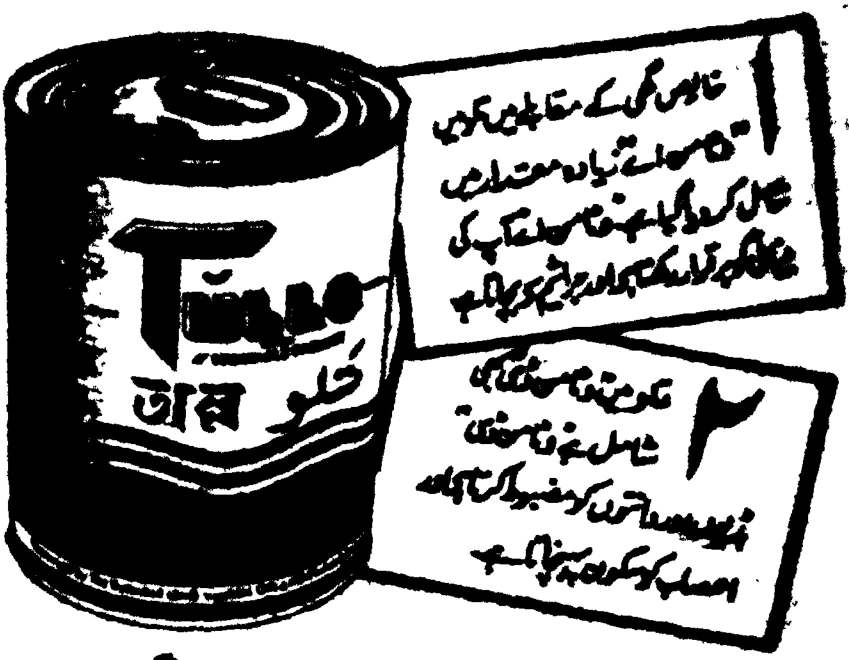

تلو بالکل خالص تازہ اور محفوظ ویجیٹیبل گھی ہے

آپ تلو پر مکمل بھروسہ کیجئے۔ تلو میں ہر چیز بہتر پکتی ہے

یہ نئے خوشنما رنگین ۱۰ پاؤنڈ ۵ پاؤنڈ اور ۲ پاؤنڈ
کے سربند مکمل کے ہوئے ٹینوں میں دستیاب ہوتا ہے

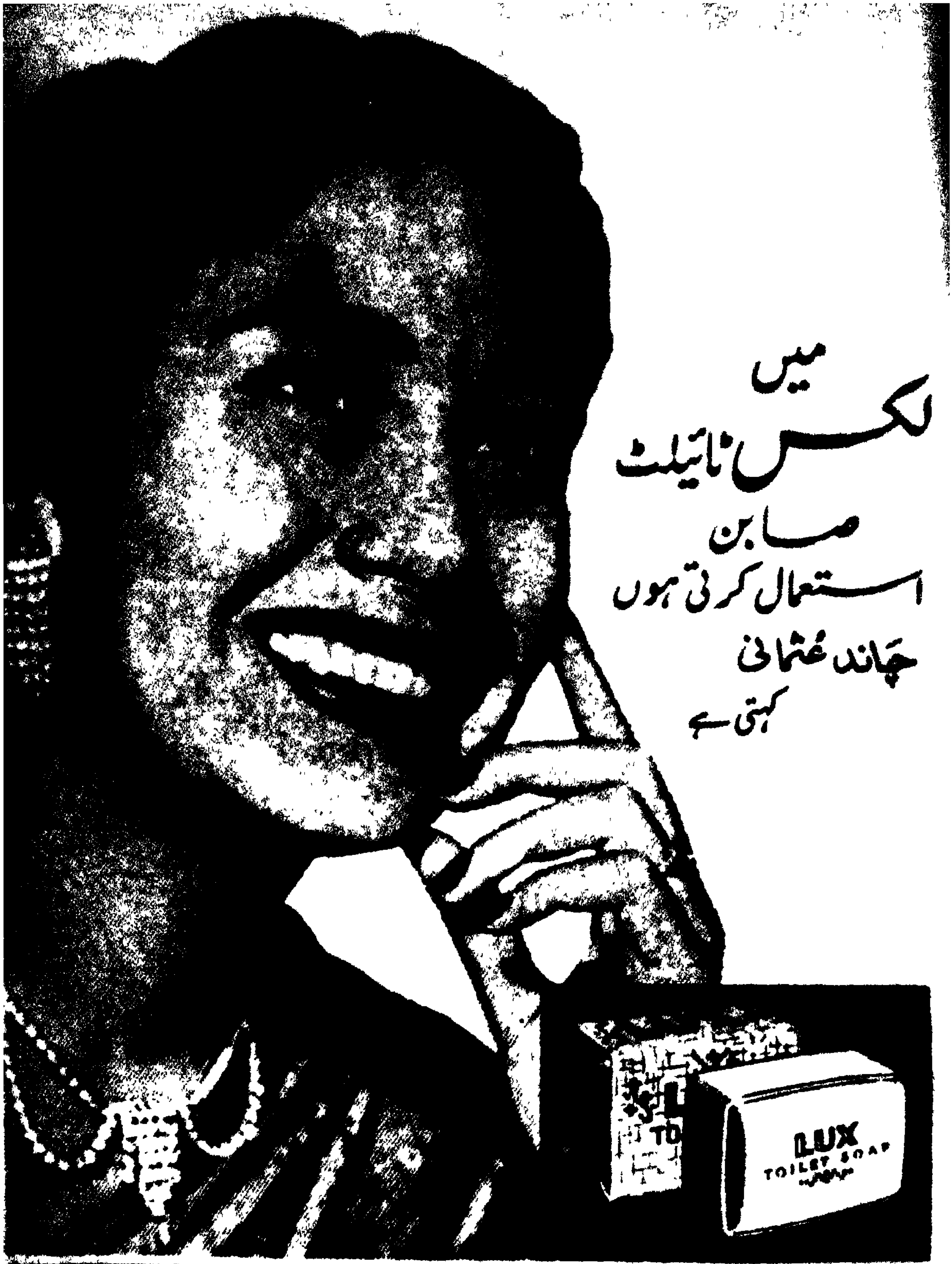
میں
لکس ٹائیلٹ
صابن
استعمال کرتی ہوں
چاند عثمانی
کہتی ہے
LUX
TOILET SOAP

ان کی تندرستی اہم شے
اسی وجہ سے میں ہمیشہ ڈالڈا
سے کھانا تیار کرتی ہوں
اتنے ہی وٹامن جتنے کہ اصلی گھی میں
ہمیشہ محفوظ اور پاک و صاف
ڈالڈا برانڈ وناسپتی
کھانوں کو بہتر بناتا ہے

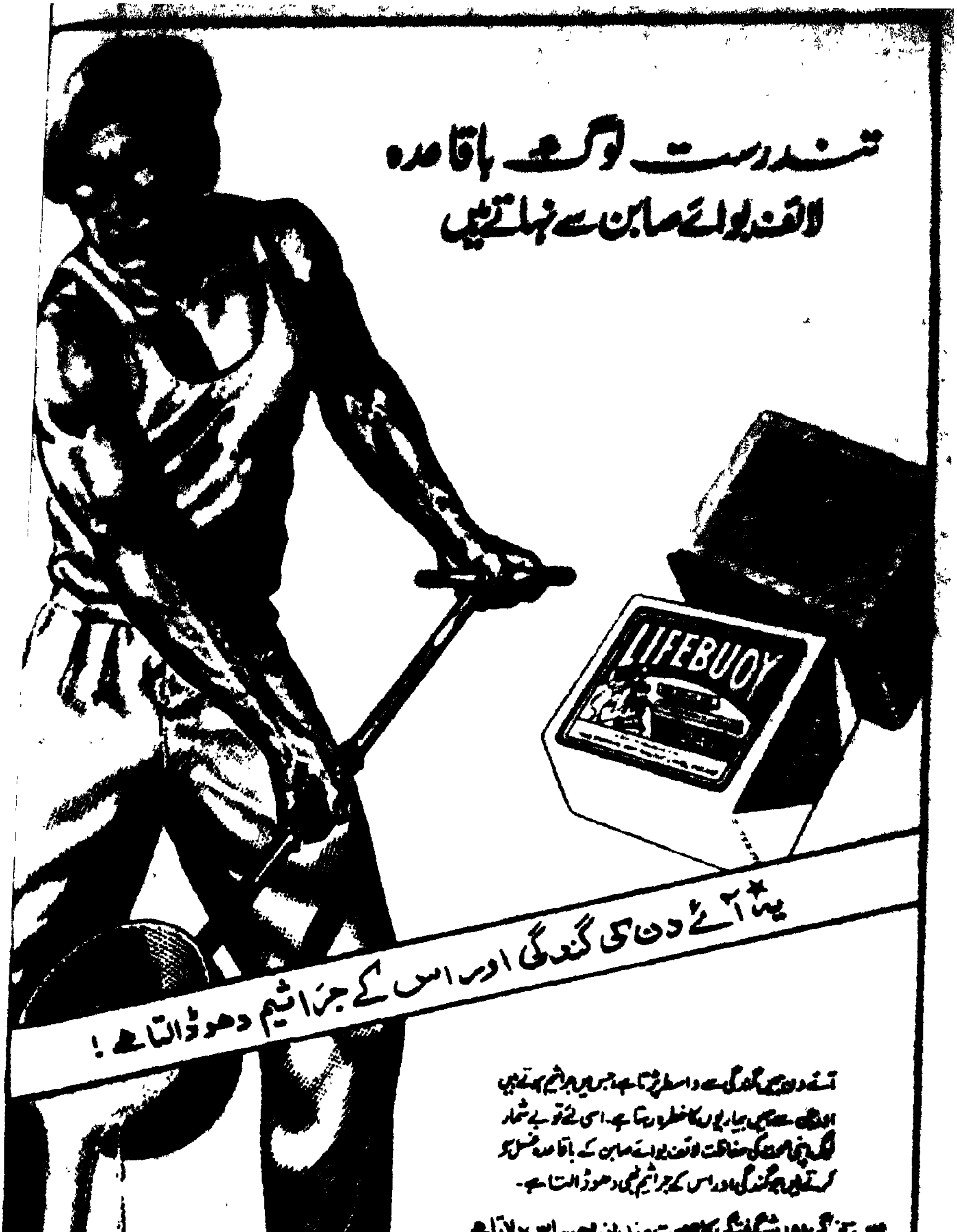

(محمد طفیل پرنٹر پبلشر و ایڈیٹر نے اشرف پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کیا۔)

آپ کو مال کس جگہ چاہیے؟
ہر طبقہ کے خریداروں
کی سہولت کے لئے برماشیل
نے ملک کے ۹۵ اہم مقامات پر
اپنے ڈپو کھول رکھے ہیں جہاں سے
ضرورت کے وقت فی الفور رسد
حاصل کی جا سکتی ہے۔ پٹرولیم کی مصنوعات
کے نقل و حمل اور ذخیرہ اندوزی کے سلسلہ میں برماشیل کا وسیع
تجربہ اور کامل انتظام ملک کے گوشہ گوشہ میں بکفایت تقسیم کاری
کا ضامن ہے
برماشیل
رقی پاکستان کا ایک حصہ ہے

مکاتیب نمبر

زندہ اور مرحوم مشاہیر ادب کے ہزاروں
نادر و نایاب علمی ، ادبی اور سیاسی خطوط

★

ادبی دستاویزوں اور سیاسی نشیب و فراز کی یکجا تاریخ

چار جلدوں میں پیش کی جا رہی ہے

★ پہلی جلد میں مرحوم مشاہیر ادب کے خ[illegible] گے۔ جس میں غالب، سر سید، حالی، محسن الملک، وقار الملک، [illegible] نذیر احمد، محمد حسین آزاد، اقبال، حیدر یار جنگ، شبلی، سلیمان ندوی، پریم چند، مولانا محمد علی، گاندھی اور قائد اعظم ایسے غیر فانی لوگوں کی تاریخی نوعیت کی دستاویزیں ہونگی۔

★ دوسری جلد میں زندہ مشاہیر ادب کے خطوط ہوں گے۔ جس میں ابوالکلام، بابائے اردو، ظفر علی خان، نیاز فتحپوری، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک، رشید احمد صدیقی، جوش ملیح آبادی، جگر مراد آبادی، فراق گورکھپوری، حفیظ جالندھری، فیض احمد فیض، عصمت چغتائی، کرشن چندر اور احمد ندیم قاسمی ایسے زندہ رہنے والے شاعر اور ادیبوں کے خطوط ہوں گے۔

★ تیسری جلد میں بھی مرحوم مشاہیر ادب ہی کے خطوط ہوں گے۔ ادارۂ نقوش کی خواہش ہے۔ کہ تمام سرمایہ جو خطوط کی شکل میں ادھر ادھر بکھرا پڑا ہے۔ وہ تمام کا تمام یکجا کر دیا جائے۔

★ چوتھی جلد میں ادارہ کے تمام تاریخی نوعیت کے مطبوعہ خطوط کا انتخاب ہوگا۔ تاکہ خطوط کے سلسلہ میں نقوش کا یہ کام حرف آخر کا درجہ رکھے۔

★ یہ کام بڑی ذمہ داری کا ہے۔ جسے ادارہ نقوش تمام تر امکانات کو پیش نظر رکھتے ہوئے سر انجام دے گا۔

نمائش

ہمارے پاس تمام ہی بڑے بڑے زندہ اور مرحوم مشاہیر کے اصلی خطوط موجود ہیں۔ اس لئے ادارۂ نقوش کا ارادہ ہے۔ کہ وہ لاہور میں اصلی خطوط کی نمائش بھی کرے۔

منیجر نقوش لاہور